تشریحات، تسہیل اور اضافۂ عنوانات کے ساتھ ایک بے مثال تشریح

زبان وبیان کے نئے اسلوب میں

عین الہدایہ جدید

افادات: مولانا سید امیر علی رحمۃ اللہ علیہ

تشریحات، تسہیل وترتیب جدید

مولانا محمد انوار الحق قاسمی مدظلہم
استاذ ہدایہ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ

مقدمہ
استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

پیش لفظ: مولانا مفتی نظام الدین شامزئی مدظلہم

تقریظات: مولانا احسان اللہ شائق استاد ہدایہ جامعہ حمادیہ کراچی و مولانا عبداللہ شوکت صاحب دار الافتاء جامعہ بنوریہ کراچی

دار الاشاعت
اردو بازار ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

تشریحات، تسہیل اور اضافۂ عنوانات کے ساتھ ایک بے مثال تشریح

زبان وبیان کے نئے اسلوب میں

جلد دوم

کتاب الصلوٰۃ

افادات: مولانا سید امیر علی رحمۃ اللہ علیہ

تشریحات، تسہیل و ترتیب جدید

مولانا محمد انوار الحق قاسمی مدظلہم
استاذ ہدایہ مدرسہ عالیہ ڈھاکہ

مقدمہ
استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب
صدر وفاق المدارس العربیہ پاکستان

پیش لفظ: مولانا مفتی نظام الدین شامزئی مدظلہم

تقریظات: مولانا احسان اللہ شائق استاد ہدایہ جامعہ حمادیہ کراچی و مولانا عبداللہ شوکت صاحب دارالافتاء جامعہ بنوریہ کراچی

دارالاشاعت
اردو بازار، ایم اے جناح روڈ
کراچی پاکستان 2213768

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی دارالاشاعت کراچی
کمپوزنگ : مولانا طاہر صدیق صاحب
طباعت : ۲۰۰۳ء احمد پرنٹنگ پریس، کراچی۔
ضخامت : ۶۸۰ / صفحات

بیت القرآن اردو بازار کراچی
بیت العلوم 20 نابھہ روڈ لاہور
کشمیر بکڈپو۔ چنیوٹ بازار فیصل آباد
کتب خانہ رشیدیہ۔ مدینہ مارکیٹ راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
بیت الکتب بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال کراچی

ادارۃ المعارف جامعہ دارالعلوم کراچی
ادارہ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی لاہور
مکتبہ سید احمد شہیدؒ اردو بازار لاہور
مکتبہ امدادیہ ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان
ادارۂ اسلامیات موہن چوک اردو بازار کراچی
ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ B-437 دیب روڈ لسبیلہ کراچی

فہرست مضامین

عین الہدایہ جلد دوم (کتاب الصلوٰۃ)

☆☆☆☆

باب صفة الصلاة

فرائض الصلاة ستة: التحريمة لقوله تعالى ﴿وَ رَبَّكَ فَكَبِّر﴾ والمراد به تكبيرة الافتتاح، والقيام لقوله تعالیٰ ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْن﴾ والقراءة لقوله تعالى ﴿فَاقْرَئُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾.

ترجمہ:-صفت نماز کا باب، نماز میں فرائض چھ ہیں، نمبرا۔ تحریمہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے اور تم اپنے رب کی بڑائی بیان کرو، اس تکبیر سے مراد نماز شروع کرنے کی تکبیر ہے، نمبر ۲۔ قیام کرنا ہے، اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے کہ تم اللہ تعالیٰ کے لئے خضوع یا خاموشی کی حالت میں کھڑے ہو جاؤ، نمبر ۳۔ قراءت کرنا ہے اس فرمان خداوندی کی وجہ سے کہ قرآن سے تم اتنا پڑھو جتنا تم کو آسان معلوم ہو۔

توضیح:-باب نماز کی صفت میں، نماز کے فرائض، تحریمہ، قیام، قراءۃ

باب صفة الصلوة...... الخ

یہ باب نماز کی صفت کے بیان میں ہے:ف۔ یہاں صفت سے مراد نماز کے ذاتی اوصاف ہے۔ف۔اس صفت کے بیان میں فرائض، واجبات اور سنتیں (یعنی ہر وہ کام جو نماز میں کرنے کے) ہیں۔

فرائض الصلاة ستة: التحريمة لقولہ تعالى ﴿وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾......الخ

نماز کے فرائض چھ ہیں۔ف۔ جو یہ ہیں (۱) تحریمہ (۲) قیام (۳) قراءت (۴) رکوع (۵) سجود (۶) قعدہ اخیر، ان فرائض میں سے کچھ افعال تو رکن ہیں جو اصل نماز کے داخلی اجزاء ہیں اور کچھ افعال شرائط فرضی ہیں، اب ان میں سے ہر ایک کی فرضیت کی دلیل اور تفصیل ذکر کی جارہی ہے۔م۔

اول تحریمہ جو عام مشائخ کے نزدیک رکن نہیں ہے بلکہ شرط ہے۔ع۔ مگر جنازہ کی نماز میں رکن ہی ہے۔ش۔ بظاہر اسے شرائط نماز میں شمار کرنا چاہئے تھا مگر اس کا بہت زیادہ تعلق قیام کی حالت سے ہوتا ہے اس لئے وہاں ذکر نہیں کیا گیا ہے، اس تکبیر کو تحریمہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے نماز میں اپنے اوپر بہت سی چیزوں کو حرام کرنا ہوتا ہے اس کی فرضیت اس فرمان باری تعالیٰ سے ہے ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾ خاص اپنے رب کی تم بزرگی اور بڑائی بیان کرو، اس سے مراد تکبیر افتتاح یا افتتاحی تکبیر یعنی نماز شروع کرنے کی تکبیر ہے۔ف۔ اسی بناء مفسرین نے اس پر اجماع کیا ہے:ع۔ تکبیر کو تحریمہ کہنا مجازا ہے، کیونکہ تحریم خود تکبیر نہیں ہوتی ہے بلکہ اس سے تحریم ثابت ہوتی ہے، اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ بالاجماع تکبیر کا حکم خارج نماز فرض نہیں ہوا ہے لہٰذا نماز کے اندر کی فرضیت مراد ہوئی، اس طرح جہاں تک ممکن ہو اس نص کو اپنی حقیقت پر باقی رکھا گیا ہے اور یہی لازم ہے۔

اور اس کی دوسری ابوداؤد کی یہ حدیث ہے مفتاح الصلوة الطهور و تحريمها التكبير و تحليلها التسليم، یعنی نماز کی کنجی طہور اور تحریم اس کی تکبیر ہے تحلیل اس کی تسلیم ہے، امام نوویؒ نے احکام میں اس حدیث کی اسناد کو اچھا کہا ہے۔ف۔ اس طرح تکبیر تحریمہ ایسا فرض ہے جو شرط ہے ہر نمازی پر خواہ نمازی امام کی حیثیت سے ہو یا مقتدی ہو، یا منفرد ہو، بشرطیکہ اس کے کہنے پر وہ قدرت بھی رکھتا ہو، اسی بناء پر گونگے اور امی...... پر کہنا واجب نہیں ہے، اور معتبر یہ ہے اس تکبیر کے کہتے وقت عظمت خداوندی کا ارادہ کرے، اور فرض نمازوں میں جب کھڑے ہونے کی طاقت ہو تو اس تکبیر کے کہنے کے لئے معتبر یہ ہے کہ کھڑے ہونے کے ساتھ تکبیر کہی جائے (بیٹھے ہوئے نہیں) اور فرض نماز میں کھڑے ہونے کی طاقت نہ ہو یا نفل نماز ہو تو بیٹھ کر بھی

تکبیر کہنی جائز ہے اور یہ تکبیر خواہ عربی زبان میں ہو یا فارسی وغیرہ کسی بھی زبان میں ہو اصح قول یہی ہے، مگر اس میں اللہ کا نام ہونا ضروری ہے اگرچہ صرف اللہ کا نام ہی ہو، اصح قول کے مطابق، اور عربی زبان میں لفظ تکبیر سے ہو یا تسبیح اور تہلیل سے (مثلاً سبحان اللہ یا لاالہ الا اللہ) ہو، اگرچہ (ان الفاظ سے کہنا اللہ اکبر کی بہ نسبت) مکروہ بھی ہے، اسی طرح اللہ کا کوئی سا بھی پاک نام لینا اصح قول کے مطابق کافی ہے، اگرچہ صرف لفظ اللھم ہو، لیکن اللھم اغفرلی یا بسم اللہ الرحمن الرحیم سے افتتاح نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ان سے خالص ذکر مراد نہیں ہوتی ہے، مزید ضروری مسائل بعد میں ان شاء اللہ ذکر کئے جائینگے۔ م۔

دوم: القیام دوسرا فرض قیام ہے۔ ف۔ یعنی کھڑے ہو کر پڑھنا یعنی اس کے لئے جو کھڑے ہونے اور سجدہ کرنے پر قادر ہو۔ ت۔ فرض نمازوں میں (کھڑے ہو کر پڑھنا فرض)۔ ع۔ اور وتر میں۔ الجوہرہ۔ اسی طرح اس نماز میں بھی جو فرض کے حکم میں (ملحق بفرض) ہو جیسے نماز نذر میں۔ د۔ اور فجر کی سنتوں میں بالاتفاق جیسا کہ الخلاصہ میں ہے۔ ش۔ اور جو شخص قیام تو کر سکتا ہو مگر سجدہ نہیں کر سکتا ہو، یا سجدہ کر سکتا ہو مگر زخم بہتا ہو اور معذور نہ ہو تو اس کے لئے بیٹھ کر اشارہ کرنا بہتر ہے، اور کبھی بیٹھنا ہی واجب ہوتا ہے جیسے کسی معذور کے کھڑے ہونے کی صورت میں طہارت ختم ہو جاتی ہو اور بیٹھے رہنے سے ختم نہ ہوتی ہو مثلاً کھڑے ہونے سے پیشاب آ جاتا ہو یا کھڑے ہونے سے چوتھائی جسم ستر کا کھل جاتا ہو، یا کوئی شخص کھڑے ہو کر کچھ قراءت نہ کر سکتا ہو یا اس سے وہ رمضان کا روزہ نہیں رکھ سکتا تو اس پر بیٹھ کر پڑھنا واجب ہے، اگر مسجد میں جماعت سے پڑھنے کی نیت سے جانے کی صورت میں کھڑے ہو کر پڑھنے کی صلاحیت نہ رہتی ہو اور بیٹھنے پر مجبور ہو تو گھر ہی میں کھڑے ہو کر پڑھنا چاہئے، اسی قول پر فتویٰ دینا چاہئے۔ د۔ مگر مجتبیٰ میں کہا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ جائے اور بیٹھ کر پڑھے۔ ط۔ س۔

خلاصہ یہ ہے کہ اصل قیام فرض ہے، اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے کہ ﴿وَقُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِینَ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ کے واسطے خضوع یا خاموشی کی حالت میں کھڑے ہو۔ ف۔ لہٰذا قیام کا حکم فرض ہے اور چونکہ بالاجماع نماز کے ماسوا کسی اور موقع میں کھڑا ہونا فرض نہیں ہے لہٰذا اس حکم کو نماز ہی کے لئے خاص کر کے فرض ہونے کا حکم کیا جائے گا، اور نفل نماز اس حکم میں نہیں ہے کیونکہ وہ تو بندہ پر لازم ہی نہیں ہے، حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ نماز میں باتیں بھی کرتے تھے یہاں تک کہ ﴿وَقُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِینَ﴾ کا حکم نازل ہوا، اور ہم لوگ کلام کرنے سے روک دیئے گئے، سوائے ابن ماجہ کے تمام صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے۔ مع۔ قیام سے مراد اتنا کھڑا ہو جانا ہے کہ اس کی حالت میں دونوں ہاتھ سیدھے کرنے سے گھٹنے نہ پائے جائیں، بغیر عذر کے ایک پاؤں پر کھڑا ہونا مکروہ ہے، اور عذر کی حالت میں مکروہ نہیں ہے۔ الجوہرہ۔ السراج۔

سوم: القراءۃ تیسرا فرض قراءۃ قرآن پاک ہے، اس فرمان خداوندی کی وجہ سے ﴿فَاقْرَءُوا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ یعنی قرآن سے اتنا پڑھو جتنا تمہارے لئے پڑھنا آسان ہو۔ ف۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوئی، نمبر ا۔ یہ ہے کہ پڑھو، اس سے نماز ہی میں فرض ہوا کیونکہ بالاجماع نماز کے علاوہ کسی دوسرے موقع میں فرض نہیں ہے، نمبر ۲۔ یہ ہے کہ فرض اسی قدر ہے کہ وہ آسان ہو۔ م۔

قراءۃ قرآن صرف اسی شخص پر فرض ہے جو پڑھنے پر قادر ہو، اور یہ قراءۃ امام اور منفرد کی نماز میں رکن ہے اور متقدی کی نماز میں زائد ہے، کیونکہ اس کا کوئی خلیفہ نہیں ہے، جیسا کہ شامی میں ہے، کتنی قراءت آسان سمجھی جائے گی تو امام اعظمؒ کے نزدیک قول اصح کے مطابق ایک چھوٹی آیت ہے، جیسا کہ الخلاصہ میں ہے، مگر شرط یہ ہے کہ ایک ہی کلمہ نہ ہو، مثلاً مدھامتان، کیونکہ قول اصح میں یہ کافی اور جائز نہیں ہے، جیسا کہ ظہیریہ اور شرح المجمع لابن الملک اور السراج اور الفتح میں ہے، پھر صرف مقدار فرض پر ہی اکتفاء کرنے سے گنہگار ہوگا۔ الصدر۔ کیونکہ پوری سورہ فاتحہ اور کچھ دوسری بھی واجب ہے۔ م۔

اگر کوئی آیۃ الکرسی جیسی ایک بڑی آیت کو تھوڑا تھوڑا کر کے دو رکعتوں میں پڑھے تو عام مشائخ کے نزدیک اصح قول کے مطابق جائز ہے۔ الکافی۔ المنیہ۔ قراءۃ کی حد یہ ہے کہ صحیح حروف زبان سے ادا کرے اور خود اسے سنے، کیونکہ عام مشائخ کے

نزدیک جائز نہیں ہے۔الحیط۔اور یہی مختار ہے السراجیہ۔اور یہی صحیح ہے۔النقایہ۔

اسی انداز سے ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا، اور طلاق اور عتاق کے مسائل میں انشاء اللہ کہہ کر استثناء کرنا اور ایلاء، اور بیع میں بھی ضروری ہے، المحیط، یہاںتک کہ اگر حروف تو صحیح ہوں مگر خود بھی نہ سن سکے تو ذبیحہ وغیرہ واقع نہ ہوگا۔م۔ پھر فرض نماز میں قراءۃ کرنے کی جگہ صرف دو رکعتیں ہیں المحیط، خواہ وہ فجر نماز کی ہوں یا مغرب کی، یا باقی اور نمازوں کی ہوں، اسی طرح وہ دو رکعتیں پہلی ہوں یا آخری ہوں یا پہلی دو رکعتوں میں سے کوئی ایک ہو اور دوسری دو میں سے کوئی ایک ہو، ابوالکلام۔ یہاںتک کہ اگر ایک ہی رکعت میں قراءۃ کی تو نماز فاسد ہوگی، الشمنی، اور وتر و نفل کی تمام رکعتوں میں قراءۃ فرض ہے، المحیط، سوتے ہوئے قراءت کرنی اصح قول میں جائز نہیں ہے، الظہیریہ، سوائے عربی کے فارسی وغیرہ میں بالاتفاق محققین بالاجماع جائز نہیں ہے، یہی قول اصح ہے اور اسی پر فتویٰ ہے، جیسا کہ المجمع وغیرہ میں ہے، ظاہر المذہب میں صرف دو رکعتوں میں قراءت فرض ہے اور باقی رکعتوں میں فرض نہیں ہے، لیکن دلیل کے اعتبار سے باقی رکعتوں میں وجوب کا تقاضا ہے، مزید تفصیل بیان کی جائے گی۔م۔

والركوع والسجود لقوله تعالى ﴿وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾ والقعدة في آخر الصلوة مقدار التشهد، لقوله عليه السلام لابن مسعودؓ حين علمه التشهد: اذا قلت هذا او فعلت هذا فقد تمت صلاتك، علق التمام بالفعل قرأ اولم يقرأ.

ترجمہ:-اور رکوع و سجود کرنا اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا کہ تم رکوع کرو سجدہ ادا کرو، اور نماز کے آخر میں تشہد کی مقدار بیٹھنا، رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے جو آپ نے عبداللہ بن مسعودؓ کو فرمایا تھا اس وقت جبکہ انہیں تشہد سکھایا تھا کہ تم نے جب یہ کہہ لیا یا کرلیا تو تمہاری نماز پوری ہوگئی، اس میں آپ نے نماز کے تمام ہونے کو فعل تشہد پر معلق کیا ہے کہ وہ تشہد کو پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

توضیح:-رکوع اور سجود، قعدہ اخیرہ، ترتیب ارکان، نماز کا مکمل ہونا، ایک رکن سے دوسرے رکن کی جانب منتقل ہونا، مقتدی کا امام کی متابعت، امام کو صحیح جاننا مقتدی کا امام سے پیچھے رہنا، وقت اقتداء امام اور مقتدی کا رخ

والركوع والسجود لقوله تعالى ﴿وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا﴾.....الخ

اور چوتھا فرض رکوع کرنا اور پانچواں سجدہ کرنا اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے اِرْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا یعنی رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ف۔ بعض نسخوں میں وَارْكَعُوْا واو کی ابتداء کے ساتھ ہے مگر یہ کاتب کی غلطی کی وجہ سے ہوا ہے، اور اس سے حکم بالاتفاق نماز میں فرضیت کا ہے۔م۔ رکوع کی حد یہ ہے کہ ہاتھوں کو بڑھانے سے گھٹنے پائیں جائیں۔السراج۔ اور بیٹھنے کی صورت میں سر زانو کے مقابل ہو جائے، ابوالسعود۔د۔ش۔ اور مکمل سجود یہ ہے کہ پیشانی اور ناک دونوں رکھی جائیں، اور اگر کوئی کسی عذر کی وجہ سے صرف کوئی ایک رکھے تو بلا کراہت جائز ہے، اور اگر کسی عذر کے بغیر فقط پیشانی رکھے تو بالاتفاق جائز ہے مگر مکروہ ہے، اور صرف ناک پر سجدہ کرنا صاحبینؒ کے قول کے مطابق جائز نہیں ہے اور اسی پر فتویٰ بھی ہے، اور اگر کوئی نہ رکھ سکے تو اس سے سجدہ ساقط ہو جائے گا وہ صرف اشارہ سے سجدہ کرے، جیسا کہ خزانۃ المفتین میں ہے، سجدہ کے لئے ایک شرط یہ بھی ہے کہ ہر پاؤں میں سے کم از کم ایک انگلی زمین پر ضرور رہے۔د۔ ورنہ سجدہ بالکل باطل ہو جائے گا۔م۔

ساری امت کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ پہلے سجدہ کی طرح دوسرا بھی فرض ہے، الزاہدی۔ جیسا کہ ساری امت کا ہر نماز کی تعداد رکعات کے بارے میں اجماع ثابت ہے، البحر، ایسی گھاس اور روئی وغیرہ جس پر پیشانی اور ناک جم جائے اور اس کا حجم معلوم ہوتا ہو تو اس پر سجدہ کرنا جائز ہے ورنہ نہیں، عرابہ اگر بیل پر ہو تو اس پر سجدہ کرنا جائز نہ ہوگا اور اگر زمین پر ہو تو جائز ہوگا،

جیسے کہ تخت پر جائز ہے، جیسا کہ خلاصہ میں ہے، گیہوں اور جو پر سجدہ کرنا جائز ہے، لیکن کاکن، چنواں اور کودوں اگر بورے میں بند ہوں تو جائز ہوگا ورنہ نہیں، السراج، نمازی کی پیٹھ پر سجدہ جائز ہے اور غیر کی پیٹھ پر نہیں ہے، نمازی کی ران پر سجدہ کرنے کے بارے میں مختار یہ ہے کہ عذر کی وجہ سے ہو تو جائز ہوگا ورنہ نہیں، نمازی کے گھٹنے پر کسی حال میں بھی سجدہ جائز نہیں ہے جیسا کہ الخلاصہ میں ہے، نمازی کی ہتھیلی اگر زمین پر ہو تو قول اصح میں جائز ہے۔ التبیین۔

مردہ کی پیٹھ پر رکھے ہوئے نمدہ پر سجدہ کرنا اس وقت صحیح مانا جائے گا جبکہ میت کا حجم محسوس نہ ہوتا ہو ورنہ صحیح نہ ہوگا، محیط السرخسی۔ اگر قدموں کی جگہ سے سجدہ کی جگہ سے ایک یا دو کچی کھڑی اینٹوں تک اونچی ہو تو اس پر سجدہ جائز ہوگا ورنہ جائز نہ ہوگا، الزاہدی، کچی اینٹ کا اندازہ ایک ہاتھ کی چوتھائی ہے۔ السراج۔ ہاتھ سے مراد کہنی تک ہے۔ م۔ حجت میں ہے کہ اگر کسی کے سجدہ کی جگہ پر کانٹے یا شیشے کے ٹکڑے پڑے ہوں اس لئے وہ اپنا سر وہاں سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھ کر سجدہ کرے تو جائز ہوگا اور اسے ایک ہی سجدہ شمار کیا جائے گا، التاتارخانیہ، مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر پہلی جگہ پر تین بار تسبیح کہنے کے انداز سے پورا سجدہ نہ کیا ہو تو ایک سجدہ شمار ہی ورنہ دو سجدے شمار ہونے چاہئے۔ م۔

اگر سجدہ کرتے وقت دونوں پاؤں زمین پر نہ رکھے گئے تو سجدہ صحیح نہ ہوگا، پاؤں کی انگلی بھی رکھی نہ گئی ہو تو ادا نہ ہوگا اور اگر ایک پاؤں رکھ دیا تو بلا عذر مکروہ ہوگا، شرح المنیہ للامیر، قدم رکھنے میں انگلیوں کے ساتھ رکھنا مراد ہے اگرچہ ایک ہی انگلی ہو، اور اگر جگہ کی تنگی کی وجہ سے کوئی انگلیوں کے بجائے صرف ایک پشت قدم رکھ دے دوسری نہ رکھے تو تمام نماز صحیح ہوگی جیسے ایک قدم پر کھڑا ہونا جائز ہوتا ہے، الخلاصہ یعنی عذر کی وجہ سے جائز ہے ورنہ مکروہ ہے، السراج۔ م۔ اگر کسی نے سوتے ہوئے سجدہ کیا تو وہ سجدہ کا اعادہ کرے، اور اگر رکوع یا سجدہ میں سو گیا تو اس کی اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ محیط السرخسی۔

والقعدة فی آخر الصلوة مقدار التشهد، لقوله علیه السلام لابن مسعودؓ حین علمه التشهد......الخ

اور چھٹا فرض وہ تشہد کی مقدار میں قعدہ ہے جو نماز کے آخر میں ہو۔ ف۔ خواہ نماز فرض ہو یا نفل ہو، تشہد یعنی التحیات سے **عبده ورسوله** تک۔ اور یہی صحیح ہے، یعنی تشہد سے مراد اس کی ابتداء سے آخر تک ہے اور صرف شہادتین نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی تنہا امام سے پہلے عبدہ ورسولہ تک پڑھ کر گفتگو کرلے تو اس کی نماز پوری ہوگئی۔ الجوہرہ۔ **لقوله علیه السلام**...... اس دلیل کی بناء پر کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو التحیات (**عبده ورسوله** تک) سکھلائی تو فرمایا کہ تم نے جب یہ کہہ لیا یا اسے کرلیا تو تمہاری نماز پوری ہوگئی۔ ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ کہہ لیا تو پوری ہوگئی یا کرلیا تو بھی پوری ہوگئی۔ ف۔

علق التمام بالفعل قرأ اولم یقرأ...... الخ

اس فرمان میں آپ نے اس کے کرنے پر نماز کے پورا ہونے کو معلق کردیا ہے خواہ اس کا کچھ حصہ بڑھا ہو یا نہ پڑھا ہو۔ ف۔ تو معلوم ہوا کہ پڑھنے کی مقدار بیٹھنا فرض ہے، واضح ہو کہ مصنف ہدایہؒ نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ **اذا قلت هذا وفعلت هذا** کا جملہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک کلام ہے، اور بعضوں نے یقین کے ساتھ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف التحیات پڑھائی ہے، اس کے بعد ابن مسعودؓ نے لوگوں سے اس حدیث کو بیان کرتے وقت مذکورہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا کر کہا ہے، لیکن ہم یہ واضح کردینگے کہ اول تو بڑھا کر کہنا اس بات کی دلیل نہیں ہوتی ہے کہ واقعہ حدیث میں یہ جملہ موجود نہیں ہے، دوسرے یہ کہ بڑھا کر بیان کرنے سے کچھ نقصان بھی نہیں ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ابوداؤد کی حدیث جو عبداللہ بن محمد النفیلی سے مروی ہے اور امام احمد کی حدیث جو الفضل بن دکین سے مروی ہے اس میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث التحیات کے آخر میں اضافہ کرکے ساتھ اس طرح ہے کہ **اذا قلت هذا او قضیت هذا فقد قضیت صلا تك ان شئت ان تقوم فقم وان شئت ان تقعد فاقعد** یعنی التحیات للہ سے عبدہ

ورسولہ کے بعد یہ جملہ بھی زائد ہے کہ جب تم نے یہ کہہ لیا یا یہ کر لیا تو تم نے اپنی نماز پوری کر لی، اس کے بعد اگر کھڑے ہونا چاہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اگر بیٹھے رہنا چاہو تو بیٹھے رہو، اس حدیث میں کہیں اس بات کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ **اذا قلت ھذا او قضیت ھذا الخ** کا جملہ خود حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مقولہ ہے، اور دار قطنی کی روایت میں اوقضیت کی جگہ اوفعلت ہے جیسا مصنفؒ نے لکھا ہے، البتہ شبابہ بن سواء نے زہیر بن معاویہ سے عبدالرحمٰن بن ثابت نے جس سے مفصل روایت کی ہے کہ یہ جملہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے کلام کا حصہ ہے۔

اور نوویؒ نے کہا ہے کہ تمام حفاظ حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ یہ جملہ مدرج ہے یعنی عبداللہ بن مسعودؓ کے کلام کا حصہ ہے جو حدیث کے کلمات سے مل گیا ہے، عینیؒ نے اس مدرج کا جواب دیا ہے کہ اس طرح بھی تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ کلام خود آن حضرت ﷺ کا بھی مقولہ ہے اور ابن مسعودؓ نے کبھی تو حضرت ﷺ کا کلام بیان فرمایا ہے، اور کبھی اسی کو اپنی طرف سے بیان فرما دیا ہے۔

بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس بیان سے تمام روایت میں مطابقت اور موافقت اچھی طرح ہو جاتی ہے، اور کسی طرح کی ظاہری مخالفت باقی نہیں رہ جاتی ہے، ابن الہمامؒ نے اس کی تائید میں کہا ہے کہ اگر یہ جملہ مدرج بھی ہو یعنی ان کی اپنی طرف سے بڑھایا ہوا ہو تو اس پر زیادہ سے زیادہ یہی کہنا ہوگا کہ یہ جملہ موقوف ہے یعنی خود ابن مسعودؓ کا مقولہ ہے، جبکہ ایسے مسائل میں موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔

ف۔ اور اس سے استدلال کا طریقہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جملہ پر نماز کا مکمل ہونا معلق کیا ہے یعنی جب یہ ہو جائے تب نماز تمام ہے تو اس عبارت کو اس طرح مقدر ماننا جائے گا کہ **اذا قلت ھذا وانت قاعدہ او فعلت القعود ولم تقل فقد تمت صلاتک** یعنی جب تم نے **التحیات للہ الخ** کو کہا اس حالت میں کہ تم بیٹھے رہو یا تم بیٹھے ہی رہے حالانکہ کچھ نہیں کیا تو بھی تمہاری نماز پوری ہو گئی، اس سے معلوم ہوا کہ (لفظیا) قول سے متعلق ہے یعنی کہا یا نہ کہا؟ اور فعل سے متعلق نہیں ہے، کیونکہ فعل تو بہر حال ثابت ہے خواہ پڑھے یا نہ پڑھے تو بہر حال ثابت ہے، لہٰذا نماز کا تمام ہونا بھی دو باتوں پر موقوف ہوا پڑھے یا پڑھے، لیکن بیٹھنا تو پڑھنے کی حالت میں بھی موجود ہے، اس طرح بیٹھ جانا ہی حقیقتاً مشروط ہے کیونکہ بیٹھ کر پڑھنا تو اجماع کی دلیل سے ثابت ہے، اب نماز کا تمام ہونا اسی فعل پر موقوف ہوا، اور اس کی فرضیت اس حدیث مذکور کی وجہ سے نہیں ہے کیونکہ فرض تو وہ ہے جو کسی قطعی دلیل سے ثابت ہو جبکہ یہ حدیث خبر واحد ہے، بلکہ اس کی فرضیت اس دلیل قطعی یعنی فرمان باری تعالیٰ ﴿اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ سے ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نماز کو اس کی تمام شرائط اور ارکان کے ساتھ ادا کرو، اور چونکہ یہ بیان و فرمان مجمل ہے اور یہ حدیث مذکور اس کے ایک جزو یعنی قعدہ اخیر کا بیان ہے، اور قاعدہ ہے کہ جب مجمل قرآن کا بیان کسی حدیث واحد سے ہوتا ہے تو اس سے حاصل شدہ تفصیل بھی قرآن ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے، یہی صحیح ہے، اس طرح یہ ہوا کہ قعدہ جو نماز میں فرض ہے یہ بھی قرآن ہی سے ثابت ہوا۔

اس بات پر اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ مذکور دلیل کی وجہ سے تو التحیات پڑھنی بھی فرض ہو جائے، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس کا پڑھنا فرض نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ قراءت کا فرض ہونا قرآن میں مجمل نہیں ہے کیونکہ اس کی فرضیت کی آیت ﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ میں خود منْ بیانیہ موجود ہے یعنی صرف قرآن کا پڑھنا فرض ہے (کسی اور چیز کا پڑھنا فرض نہیں ہے)۔ مع۔ اب قعدہ اولیٰ کو فرض نہ ماننے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی حدیثیں پایہ ثبوت کو پہونچ چکی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے غلطی سے قعدہ چھوٹ جانے کی صورت میں آپ اس کی ادائیگی کے لئے دوبارہ نہیں لوٹے ہیں اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ وہ فرض نہ تھا اگر ایسا ہوتا تو یاد آتے ہی آپ اس کی ادائیگی کے لئے دوبارہ ضرور لوٹ آتے۔

اسی طرح قراءت فاتحہ اور طمانیت کو فرض نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے فرض کہنے کی وجہ سے قراءت قرآن میں جو

سہولت من جانب اللہ دی گئی ہے اس کا منسوخ ہونا لازم آجاتا، ایسی طرح بہت سے ایسے افعال جنہیں سنت کہا جاتا ان کو فرض نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ثبوت میں جتنے دلائل ہیں ان میں سنتوں کے ہی دلائل پائے گئے ہیں اور دلائل قطعیہ نہیں پائے گئے اس لئے ہم انہیں بھی فرض نہ کہہ کر سنت کہتے ہیں۔ مف۔ واضح ہو (کہ رکن اور فرض میں کچھ فرق ہے اس طرح سے) کہ ہر رکن تو فرض ہوتا ہے مگر ہر فرض کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ قعدہ اخیرہ فرض ہو کر رکن بھی ہے یا نہیں تو محیط اور ایضاع میں ہے کہ یہ قعدہ بھی دوسرے فرضوں کی طرح ایک رکن نہیں ہے، یہی قول امام شافعیؒ اور احمد وغیرہم رحمہم اللہ کا ہے، امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سنت ہے، کیونکہ کسی چیز کا رکن وہ ہوتا ہے جس سے اس چیز کی تفسیر ہوتی ہے جبکہ نماز کی تفسیر میں صرف قیام، قراءت، رکوع و سجود آتا ہے اور قعدہ سے اس کی تفسیر نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ عینی میں ہے۔

اور نہایہ میں ہے کہ اسی بناء پر اگر کسی نے قسم کھائی کہ میں نماز نہیں پڑھوں گا تو قیام، قراءت، رکوع و سجود کے بعد سر اٹھاتے ہی وہ حانث ہو جائے گا، قعدہ اخیرہ کی ادائیگی پر موقوف نہ ہوگا، اور سراجیہ میں ہے کہ جو کوئی اس کی فرضیت کا منکر ہوگا وہ کافر نہ ہوگا، مگر بدائع میں کہا ہے کہ وہ رکن تو ہے مگر رکن اصلی نہیں ہے بلکہ رکن زائد ہے، اور صحیح یہ ہے واللہ اعلم کہ وہ فرض ہی ہے بلکہ نہایہ میں کہا ہے کہ اس کی تحقیق اس طرح ہے کہ یہ قعدہ عمل کے اعتبار سے تو فرض ہے مگر اعتقاد کے اعتبار سے فرض نہیں ہے کیونکہ خبر الواحد سے اس کا ثبوت ہوا ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وتر ہے، اور چونکہ قعدہ واجب کے درجہ میں ہے اسی لئے اس کا منکر کافر نہیں ہوتا ہے، اسی بناء پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ امام مالکؒ، زہری اور ابو بکر الاصم کے نزدیک یہ سنت ہے سوائے سلام کہنے کے اندازے کے۔ مع۔

اور متون کی بعض کتابوں میں بعض مسائل سے استنباط کر کے امام صاحب کے نزدیک خروج بصنعہ کو بھی فرض شمار کیا گیا ہے، یعنی نماز کے تمام کام ختم کرنے کے بعد اپنے کسی اختیاری کام سے نماز سے باہر ہو جانا، تنویر میں بھی اس کو فرض ہی کہا ہے، لیکن ہندیہ میں ہے کہ خروج بصنع المصلی کسی طرح فرض نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے، التبیین، العینی، اور بہت سی کتابیں، اور زیلعی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ امام اعظمؒ اور صاحبینؒ سب کے نزدیک وہ بالاتفاق فرض نہیں ہے، مجتبیٰ میں کہا ہے محققین اسی کے قائل ہیں۔ د۔

اب کچھ اور فرائض بھی قابل ذکر ہیں:

نمبر ا۔ مثلاً قیام کو رکوع سے اور رکوع کو سجود سے مقدم کرنا یعنی فرائض میں ترتیب کرنا بھی فرض ہے۔

نمبر ۲۔ نماز کو مکمل کرنا۔

نمبر ۳۔ ایک رکن سے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونا کیونکہ ان چیزوں کے بغیر نماز نہیں ہوتی ہے اس لئے یہ چیزیں بھی فرض ہوئیں۔ مف۔

نمبر ۴۔ مقتدی پر فرض ہے کہ فرائض میں اپنے امام کی اتباع کرے۔ د۔ اگر واجب اور سنت کاموں میں امام کی اتباع نہ ہو سکے بلکہ چھوٹ جائے تو بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔ ش۔

نمبر ۵۔ مقتدی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے امام کی نماز کے صحیح ہونے کا یقین رکھے۔ د۔ اسی بناء پر اگر امام نماز تو حقیقت میں صحیح ہو رہی ہو مگر کسی وجہ سے مقتدی امام کی نماز کے غلط ہونے کا یقین کرتے ہوئے بھی اس کی اتباع کر رہا ہو تو مقتدی کی نماز فاسد ہوگی، مثلاً امام نے تحری کر کے ایک رخ پر نماز شروع کی مگر مقتدی کی رائے میں وہ غلطی پر ہو تو فقط اسی مقتدی کی نماز فاسد ہوگی، حقیقی مقتدی کی اقتداء شافعیؒ امام کے پیچھے صحیح ہوگی یا نہیں اس کی بحث انشاء اللہ عنقریب بالتفصیل آئے گی۔

نمبر ۶۔ مقتدی اپنے امام سے آگے نہ بڑھ جائے یعنی ایڑیاں امام سے آگے بڑھی ہوئی نہ ہو۔
نمبر ۷۔ اقتداء کرتے وقت اسے یہ معلوم نہ ہو کہ امام کا رخ اس کے رخ کے خلاف ہے۔ د۔ یہ بات پہلے گذر چکی ہے۔

نماز وقتی اور قضاء

نمبر ۸۔ جو شخص وقتی نماز پڑھ رہا ہو اس پر قضاء کا پہلے ادا کرنا اس وقت لازم نہ ہو۔
نمبر ۹۔ عورت اس کے قریب اس طرح نہ ہو جس سے نماز فاسد ہوتی ہے۔

نمبر ۱۰۔ تعدیل ارکان رکوع میں اس کے بعد اس سے کھڑے ہونے میں، سجدہ کرنے میں، دونوں سجدوں کے درمیان (بیٹھنے یا) جلسہ کرنے میں فرض عملی ہے، یہ قول امام ابو یوسف امام شافعی امام مالک اور امام احمدؒ کا ہے اور عینیؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہی قول مختار ہے اور اسی کو ابن الہمامؒ نے بھی قبول کیا ہے، تعدیل کرنے سے مراد یہ ہے کہ تمام اعضاء میں سکون آجائے اور بندھن اور جوڑوں کی حرکت ختم ہو جائے اس کے پائے جانے کے لئے کم از کم ایک مرتبہ تسبیح کی گنجائش ہو، تسبیح سے مراد مثلاً سبحان ربی الاعلی کہنا ہے، جیسا کہ عینی اور النہر میں ہے، اور امام اعظمؒ و امام محمدؒ کے نزدیک رکوع و سجود اور ہر رکن اصلی میں اعتدال واجب ہے، اور یہی صحیح ہے، المنیہ، اور رکوع سے اٹھتے وقت اور سجدوں کے درمیان جلسہ میں ان کے نزدیک واجب نہیں ہے، فقہاء کا اسی پر اتفاق ہے، جیسا کہ الظہیریہ اور الکافی میں ہے، مگر محیط میں رکوع کے بعد قیام ترک کرنے کی صورت میں بغیر کسی اختلاف کے سجدہ سہو کرنے کو واجب بتایا ہے۔ ع۔ م۔

توضیح از مترجم

اب بندہ مترجم کے نزدیک مذکورہ فرائض میں سے اکثر واجبات ہیں، اور ان کے فرض کہنے پر دلائل پیش کرنا مشکل ہے، جس کا کچھ بیان آئندہ آئے گا، واضح ہو کہ فرائض کے ادا کرتے وقت ہوش گوش کا رہنا بھی ضروری ہے یعنی ادا کرنے والا بیدار و ہوشیار ہو، اسی بناء پر اگر کسی نے سوتے ہوئے کوئی فرض ادا کیا تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، اصح قول کے مطابق اگرچہ وہ فرض قراءت ہو یا قعدہ اخیرہ ہو، در مختار میں ہے کہ اس میں غفلت سے کوئی نقصان نہ ہوگا، اسی بناء پر اگر جاگتے ہوئے مگر بدخیالی کے عالم میں بھی کوئی فرض ادا کر لیا تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔

بندہ مترجم کا کہنا ہے کہ اس طرح بدخیالی میں پورے فرائض بھی کوئی ادا کر لے تو بھی نقصان نہ ہوگا، لیکن یہ فتویٰ صرف ظاہری طور پر ہے یعنی ظاہر میں اس کے ذمہ سے فرض ساقط کا فتویٰ دیا جائے گا، مگر دیانتداری کے فتویٰ کے مطابق اس کے حصہ میں وہی ہوگا جو اس نے ہوش اور عقل و سمجھ کے ساتھ کیا ہوگا، جیسا کہ فتح القدیر میں حدیث سے استدلال کیا ہے، اس کے بارے میں بہت سی احادیث مروی ہیں، لہٰذا بہتر اور صحیح یہی ہے کہ غفلت کے ساتھ نماز ادا ہونے کے جواز کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا چاہئے، یا یہ حکم دینا ہی نہیں چاہئے۔ م۔

سوتے ہوئے میں جو رکن ادا کیا گیا ہو اس کو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہے ورنہ نماز باطل ہوگی، لہٰذا اگر سوتے ہوئے میں رکوع یا سجدہ ادا کیا ہو تو اسے دوبارہ کرنا چاہئے، اور اگر رکوع یا سجدہ کرتے ہوئے کوئی سو گیا ہو تو اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہوگی، جیسا کہ محیط السرخسی کے حوالہ سے ذکر کیا گیا ہے، اور حدیث میں ہے کہ جو کوئی بندہ نماز میں بے اختیار ہو کر سو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں پر بڑائی اور خوشی کا اظہار کرتا ہے، واضح ہو کہ رکن ہو یا واجب ہو دونوں کے ترک ہونے کی صورت میں اس کا اعادہ واجب ہے، مگر رکن کو نماز ہی میں اعادہ کرنا ضروری ہے ورنہ نماز باطل ہو جائے گی، واجب چھوٹ جانے کی کمی سجدہ سہو ادا کر لینے سے پوری ہو جاتی ہے، اور اگر سجدہ سہو کے ذریعہ نقصان کی کمی پوری نہ کی جاسکی تو چونکہ ارکان ادا کئے جا چکے ہیں اس لئے نماز کا کچھ وجود مانا جائے اس کا اعادہ کرنا واجب ہوگا ورنہ وہ گنہگار ہوگا۔ م۔ یہاں تک فرائض کا بیان ہوا۔

قال وما سوى ذلك فهو سنة، اطلق اسم السنة وفيها واجبات كقراءة الفاتحة وضم السورة معها ومراعات الترتيب فيما شرع مكررا من الافعال.

ترجمہ:-اور فرمایا کہ نماز کے مذکورہ افعال کے ماسوا جو کچھ ہیں وہ سب سنتیں ہیں، یہاں پر ماتنؒ نے لفظ سنت ذکر فرمایا ہے جبکہ ان میں کچھ واجبات بھی ہیں، مثلاً سورۃ فاتحہ پڑھنا، اس کے ساتھ کوئی سورۃ ملانا، اور ایسے افعال کے درمیان جو مکرر مشروع ہیں ان میں ترتیب کا بھی خیال رکھنا۔

توضیح:- سنن اور واجبات نماز، اعادہ نماز میں نئے مقتدی کے اقتداء، سورہ فاتحہ کو چھوڑ کر قرآن پڑھنا، سورہ فاتحہ میں سے کچھ چھوٹ جانا، کچھ دوسری سورہ ملانا، دوسری سورہ ملانے کے لئے رکعتوں کو متعین کرنا، فرض نماز کی آخری رکعتوں میں سورہ ملانا

قال وما سوى ذلك فهو سنة..... الخ

مذکورہ افعال کے ماسوی دوسرے افعال سنت ہیں۔ف۔یعنی وہ فرض اور ارکان نہیں ہیں، بلکہ وہ سب سنت سے ثابت شدہ ہیں اگرچہ وہ واجب اور سنت ہوں، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے اطلق اسم السنة الخ ماتنؒ نے لفظ سنت کہا ہے اگرچہ ان افعال میں سنتوں کے علاوہ واجبات بھی ہیں۔ف۔یعنی وہ افعال جن کے چھوٹ جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی ہے مگر سجدہ سہو لازم آتا ہے خواہ قصدا چھوڑا ہو یا بھول کر، اور سجدہ سہو نہیں کیا تو نماز کا اعادہ کرنا واجب ہے، اور یہی حکم مکروہ تحریمی ہونے کی صورت میں بھی ہوتا ہے یعنی ادا کئے ہوئے فرض کا اعادہ کرنا ضروری ہوتا ہے، قول مختار یہی ہے۔د۔ش۔اگر کسی نئے شخص نے ایسے شخص کی اقتداء کرلی جو اپنی نماز کا اعادہ کررہا ہو تو اس کی اقتداء درست نہ ہوگی۔ع۔

كقراءة الفاتحة .....الخ

جیسا کہ پوری سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے۔ف۔یہ حکم امام اور منفرد یعنی تنہا پڑھنے والے کے لئے بھی، لہٰذا اگر کسی نے قرآن پاک میں سے ایک پوری رکوع یا اس سے بھی زیادہ قراءت کرلی مگر سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا، المجتبیٰ، ایک قول یہ ہے کہ اگر سورح فاتحہ سے زائد آیتیں چھوڑدے گا تب سجدہ سہو واجب ہوگا اس بناء پر نصف سے کم چھوڑنے سے واجب نہ ہوگا، لیکن قول اولیٰ ہے۔م۔د۔

وضم السورة ...... اور سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی دوسری سورہ بھی ملانا واجب ہے۔ف۔اگر کوئی سورہ ہو تو بہتر ہے، اور اگر چھوٹی تین آیتیں ہوں یا ان کے برابر ایک آیت بھی ہو تو بھی کافی ہے، جیسا کہ النہر میں ہے، اس سے بھی کم ملانا مکروہ تحریمی ہے، سورہ فاتحہ کو دوسری تمام سورتوں سے پہلے پڑھنا بھی واجب ہے، النہر، یہانتک کہ دوسری سورہ کا کوئی حرف بھی سورہ فاتحہ سے اتنا پہلے پڑھ لے جس میں ایک رکن ادا ہوسکے تو سجدہ سہو لازم ہوگا۔ش ط۔نیز سورہ فاتحہ اور دوسری سورہ کو بھی فرض کی پہلی رکعتوں میں متعین کرنا واجب ہے، مگر سنت اور وتر کی تمام رکعتوں میں پڑھنا واجب ہے، البحر۔ت۔د۔فرض نمازوں کی آخری رکعتوں میں سورہ ملانا مکروہ تحریمی نہیں ہے، اور یہی قول مختار ہے۔د۔

فرض کی رکعت میں فاتحہ کو مکرر کرنا، سورہ فاتحہ بھول کر کوئی دوسری سورہ پڑھنا

فرض کی پہلی دو رکعتوں میں سورہ ملانے سے پہلے دوبار سورہ فاتحہ پڑھنے سے سجدہ سہو واجب ہوگا۔ط۔لیکن امامت کرتے ہوئے کسی مجبوری سے ایسا ہوجائے تو جائز ہے، جیسا کہ اسی فصل میں اس کے متعلق بیان آتا ہے۔م۔اور اگر سورہ پڑھنے کے بعد سورہ فاتحہ کو بار بار پڑھا یا پچھلی دو رکعتوں میں سورہ سے پہلے مکرر کیا تو سجدہ سہو لازم نہ ہوگا، ط، اگر کوئی شخص پہلی یا دوسری رکعت

میں بھول کر سورہ فاتحہ نہ پڑھ کر کوئی دوسری سورہ پڑھ گیا بعد میں اسے یاد آیا تو وہ از سر نو سورہ فاتحہ پڑھ کر کوئی اور سورہ ملائے، یہی ظاہر الروایۃ ہے، المحیط، جس نے عشاء کی پہلی دونوں رکعتوں میں سورہ پڑھی مگر سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو آخری رکعتوں میں سے اسے فاتحہ دوبارہ نہیں پڑھنی چاہئے، اور اگر پہلی دونوں رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھی تو آخری رکعتوں میں فاتحہ اور سورہ دونوں بلند آواز کے ساتھ پڑھے یہی صحیح ہے، الہدایہ، اور اگر پہلی رکعتوں میں کچھ نہیں پڑھا ہو تو بھی بالاتفاق یہی حکم ہے لیکن سجدہ سہو ادا کرلے، قاضی خان.

ومراعات الترتیب فیما شرع مکررا من الافعال......الخ

اور ترتیب کی رعایت رکھنی واجب ہے یعنی قراءت اور رکوع کے درمیان۔ د۔ فیما شرع مکررا الخ ان افعال میں جو مکرر مشروع ہوئے ہیں۔ ف۔ وہ افعال خواہ رکعت میں مکرر ہوں جیسے دو سجدے۔ ف۔ د۔ ط۔ خواہ پوری نماز میں مکرر ہو جاتے ہوں، جیسے نماز کی رکعتیں کہ ان رکعتوں کی شمار ترتیب واجب ہے جبکہ جماعت سے ادا کی جارہی ہو کیونکہ مقتدی ہونے کی صورت میں مجبوراً یہ ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، جیسے کہ مسبوق کی نماز میں۔ الفتح۔ مسبوق اپنے امام کی فراغت کے بعد اپنی نماز پوری کرتا ہے تو ہمارے نزدیک اس کی پہلی رکعت ہوتی ہے، اگر اس کے لئے بھی دوسروں کی طرح ترتیب فرض ہوتی تو وہ آخری نماز ہوتی، التبیین، اسی بناء پر چار رکعتوں کی نماز میں ایک رکعت ملنے سے پہلی دو رکعتوں میں سورہ ملا کر پڑھنی ہوتی ہے، اور آخر میں صرف فاتحہ پڑھی جاتی ہے، ش۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ترتیب کے مسئلہ میں چار صورتیں ہوتی ہیں

نمبر ا۔ پوری نماز میں صرف ایک مرتبہ فرض ہو جیسے قعدہ اخیرہ۔

نمبر ۲۔ ہر رکعت میں ایک بار فرض ہو جیسے قیام۔

نمبر ۳۔ پوری نماز میں متعدد بار ہو جیسے رکعتیں۔

نمبر ۴۔ ہر رکعت میں متعدد بار ہو جیسے سجود۔ اس بناء پر پہلی صورت میں ترتیب شرط یعنی فرض ہے لہٰذا قعدہ اخیرہ کے سلام سے پہلے یا سلام کے بعد مگر ایسا کوئی کام کرنے سے پہلے جس سے نماز فاسد ہوتی ہو مثلاً گفتگو کرنی یاد آجائے کہ میں نے آیت سجدہ تلاوت کی ہے مگر سجدہ ادا نہیں کیا ہے تو وہ اسی وقت اسے یعنی سجدہ ادا کرلے اور قعدہ کا بھی اعادہ کرلے اور سجدہ سہو بھی کرلے، اور اگر رکوع یاد آیا تو اسے اور اس کے بعد کے تمام کام کرلے، اور اگر قیام یا قراءت یاد آجائے کہ اسے کرنا بھول گیا ہوں تو پوری رکعت ادا کرلے۔ الفتح۔

اور قعدہ کے بعد یاد آنے کی صورت میں قعدہ کا بھی اعادہ ضروری ہے کیونکہ جو سجدہ نماز کے اندر ادا کیا جاتا ہے خواہ وہ نماز کا سجدہ ہو یا تلاوت کا ہو اس کو ادا کرنے کی وجہ سے اس سے قبل کا پڑھا ہوا تشہد بے اعتبار ہو جاتا ہے، البتہ سہو کا سجدہ کرنے سے تشہد کو بے اعتبار کر دیتا ہے لیکن اس کا قعدہ باقی رہ جاتا ہے اور باطل نہیں ہوتا ہے، اسی بناء پر اگر کوئی سجدہ سہو سے فارغ ہوتے ہی اگر سلام پھیر دے تو نماز فاسد نہ ہوگی بخلاف نماز یا تلاوت کا سجدہ کرنے کے بعد از سر نو قعدہ کئے بغیر فوراً ہی سلام پھیر دے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ د۔ کیونکہ اس صورت میں قعدہ اخیرہ نہیں پایا گیا جو کہ فرض ہے۔ ش۔ اور دوسری صورت میں کہ ہر رکعت میں صرف ایک بار فرض ہو ان میں بھی ترتیب شرط ہے یعنی فرض ہے جیسے قیام اور رکوع سے سر نہیں اٹھایا تھا تو پہلا سجدہ فی الفور ادا کر کے اس رکوع کو بھی دہرالے جس میں سجدہ نہ کرنا یاد آیا ہے، اور اگر سر اٹھانے کے بعد یاد ہو تو یہ رکوع ادا ہو چکا اس کے دہرانے کی ضرورت نہیں رہی، جیسا کہ قاضی خان میں ہے، ملخص الفتح۔

الحاصل جو افعال کے ہر رکعت میں مکرر نہیں ہیں جیسے قیام اور رکوع یا پوری نماز میں مکرر نہیں ہے، مثلاً اخیر کا قعدہ تو ان میں باہم ترتیب رکھنا فرض ہے، اسی بناء پر قیام سے پہلے رکوع یا رکوع سے پہلے سجدہ کرنا جائز نہیں ہوتا ہے، اسی طرح اگر کوئی

تشہد کی مقدار بیٹھا پھر یاد آیا کہ اس پر ایک سجدہ یا اس طرح کی دوسری چیز واجب باقی ہے تو وہ قعدہ بیکار ہو جائے گا۔ التبیین۔ اور جو کام مکرر ہی ثابت اور مشروع ہو خواہ پوری نماز میں مکرر ہو مثلاً رکعتیں یہ ہر رکعت میں مکرر ہو مثلاً سجدے تو ان میں بھی یقیناً ترتیب واجب ہو گی، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔

والقعدة الاولى وقراءة التشهد فى الاخيرة والقنوت فى الوتر وتكبيرات العيدين والجهر فيما يجهر فيه والمخافتة فيما تخافت فيه، ولهذا يجب عليه سجدتا السهو بتركها، هذا هو الصحيح.

ترجمہ:- اور قعدہ اولی، اور قعدہ اخیرہ میں تشہد کی مقدار بیٹھنا، اور نماز وتر میں دعا قنوت اور عیدین کی زائد تکبیریں، اور جن میں قراءت جہر سے ادا کی جاتی ہیں ان کو جہر سے ادا کرنا، اور جن میں آہستہ قراءۃ کی جاتی ہے انہیں آہستہ ہی ادا کرنا (چونکہ یہ سب واجب ہیں) اسی لئے ان کے ترک کر دینے سے سہو کے دو سجدے کرنے واجب ہوتے ہیں، یہی قول صحیح ہے۔

توضیح:- قعدہ اولیٰ، قراءۃ تشہد، نصف سے کم تشہد چھوڑ دیا، لفظ سلام، دعاء قنوت، تکبیرات عیدین قراءت آہستہ اور زور سے پڑھنا، دن کے نوافل، تنہا نماز پڑھنے والا، اور اس کی اقتداء، وجوب سجدہ سہو

والقعدة الاولى وقراءة التشهد فى الاخيرة......الخ

اور واجبات میں سے ہے پہلا قعدہ ف، یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سنت ہے، اور یہی قیاس کا زیادہ تر تقاضا بھی ہے، اور وہ قول امام طحاویؒ اور کرخیؒ کا ہے، اور متاخرین کے نزدیک واجب ہے، اور محیط میں کہا گیا ہے کہ یہی اصح ہے۔ ع۔ نفل نماز میں بھی اصح قول کے مطابق واجب ہے، د، یعنی کسی نے ایک ساتھ چار یا چھ رکعتوں کی نفل کے لئے نیت کی اور سب کو ادا کیا تو اصح قول کے مطابق آخری قعدہ تو فرض ہے کیونکہ نفل کی دو رکعت ایک مستقل نماز ہے۔

اس جگہ یہ وہم ہو سکتا ہے کہ نفل نماز خود شئے زائد اور غیر لازم ہوتی ہے مگر شروع کرنے سے وہ لازم ہوئی ہے تو اس میں فرض قعدہ کس طرح آگیا، تو جواب یہ ہو گا کہ اس کے فرض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس فرض یا رکن کا وجود نہ ہو تو اس نفل کا وجود ہی نہ ہو گا اور اس نماز کا وجود ہونا ضروری نہیں ہے۔ م۔ اس جگہ مصنفؒ نے صرف قعدہ اولیٰ کا تذکرہ فرمایا ہے مگر اس میں کچھ پڑھنے یا قراءت کرنے اور نہ کرنے کے بارے میں کچھ بھی تذکرہ تک نہیں فرمایا ہے، مگر سجدہ سہو کے بیان میں اس کا تذکرہ فرمایا ہے کہ التحیات کی قراءت بھی اس قعدہ میں واجب ہے، اور سراج میں کہا ہے کہ یہی صحیح ہے اور محیط السرخسی میں کہا ہے کہ یہی اصح ہے۔ ھ۔

اگر کسی نے التحیات سے عبدہ ورسولہ تک پڑھ کر اللهم صلى على محمد تک اور بھی بڑھا دیا تو سجدہ سہو واجب ہو گا، اگر کوئی مسافر امامت کر رہا ہو، اور حدث ہو جانے کی وجہ سے اس نے کسی مقیم کو اپنا قائم مقام امام بنا دیا تو اس مقیم کے لیے اس کا درمیانی قعدہ اپنے امام کی نیابت کی وجہ سے بجائے واجب کے اب فرض ہو گیا۔ مگر یہ عذر خاص کی وجہ سے ہوا ہے۔ د۔

وقراءة التشهد فى الاخيرة ......الخ

اور قعدہ اخیرہ اگرچہ فرض ہے مگر اس میں تشہد پڑھنا واجب ہے۔ ف۔ جیسا کہ اصح قول کے مطابق قعدہ اولیٰ میں تشہد پڑھنا واجب ہے، زاہدی نے کہا ہے کہ تشہد کے پڑھتے وقت اس کے معانی کا اپنی طرف سے نیت رکھنا ضروری ہے، گویا وہ خود اپنی طرف سے اللہ تعالیٰ کے لئے التحیات کہتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ اور اولیاء اللہ پر اپنی جانب سے سلام کہتا ہے، ھ، حدیث میں ہے کہ جوں ہی نمازی السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين کہتا ہے تو زمین و آسمان میں جتنے بھی صالح بندے ہوتے ہیں ان سبھوں کو یہ سلام پہونچ جاتا ہے، اور صالحین میں فرشتے وغیرہ بھی شامل ہوتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کو وہ ضرور پہونچتا ہے لہذا ادب بجا آوری کا پورا پورا خیال رکھنا چاہئے، م۔

اگر تشہد پڑھتے وقت اس کے نصف سے کم کو نہیں پڑھا تو اس پر سجدہ سہو واجب ہوگا، اور یہ حکم جیسے فرائض واجبات کے لئے ہے ویسے ہی نوافل کے لئے بھی ہے، یعنی ہر قعدہ کے لئے ہے، یہی حکم ہے، یہی اصح ہے، البحر۔ط۔د۔ع۔ واضح ہو کہ لفظ سلام استعمال کرنا واجب ہے، الکنز۔ف۔ یہانتک کہ اگر کوئی السلام علیکم کہنے پر قادر ہو تو دوسرا کوئی لفظ اس کے قائم مقام نہیں کہا جاسکتا ہے۔ش۔اصح قول کے مطابق دوسرا اسلام واجب ہے، البرہان۔

پہلی مرتبہ السلام علیکم کہنے میں لفظ السلام کہتے ہی یعنی علیکم کہنے سے پہلے نماز کا تحریمہ ختم ہو جاتا ہے اس بناء اس وقت اگر کوئی اس کی اقتداء کی نیت کرلے تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، یہی قول مشہور اور اسی پر جوہرہ اور برہان میں اعتماد کیا ہے، اور شارح تکمہ میں دوسرے سلام پر تحریمہ ختم ہونے کو صحیح کہا ہے۔م۔د۔

والقنوت فی الوتر...... الخ

وتر میں قنوت پڑھنا واجب ہے۔ف۔ قنوت سے مراد مطلق دعاء ہے۔د۔اسی بناء پر اگر **اللھم انا نستعینك الخ** یاد نہ ہو تو **اللھم اغفرنی** یا اور کوئی دعا بھی کہہ لینا کافی ہے۔م۔ش۔ قنوت کے واسطے بھی تکبیر کہنا واجب ہے، اسی بناء پر اس کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے، الزیلعی ش۔

وتکبیرات العیدین والجھر فیما یجھر ......الخ

اور عیدین میں زائد تکبیریں بھی واجب ہیں۔ف۔جو کہ قول مختار کے مطابق چھ ہیں۔م۔اور قول صحیح میں یہ چھ واجب ہیں اسی بناء پر ان کے چھوٹ جانے سے سجدہ سہو واجب ہوگا، التبیین، اسی طرح ان میں ہر ایک مستقل واجب ہے۔د۔اور ایام تشریق کی تکبیریں بھی واجب ہیں، الطحاوی۔ **والجھر فیما یجھر فیہ والمخافتۃ فیما تخافت فیہ ....الخ**

جن نمازوں میں جہر کرنا واجب ہے، **ان میں جہر کرنا یعنی باآواز بلند سے قرأت کرنا واجب ہے۔ف۔ امام کے لئے ان نمازوں میں جہر کرنا واجب ہے۔** فجر نماز کی دونوں رکعتوں میں، اور مغرب وعشاء کی پہلی دو رکعتوں میں، اسی طرح جب ان نمازوں کی قضاء جماعت کے ساتھ ادا ہو رہی ہو، اس بناء پر ان میں سے کسی کو بھی آہستہ سے پڑھنے سے اور جمعہ عیدین میں اسی طرح تراویح اور وتر جماعت سے پڑھنے کی صورت میں جہر کرنا واجب ہے، زور سے پڑھنے کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ عام عادت کے مطابق پڑھنے سے دوسرے کو سنا سکے، اور اس کی کم سے کم مقدار خود سننا ہے، اسی قول پر اعتماد ہے، المحیط، اور یہی صحیح ہے، الوقایہ، اور عام مشایخ نے بھی اسی قول کو قبول کیا ہے، الزاہدی، بندہ مترجم نے عام عادت کے مطابق کی قید اس لئے لگائی ہے کہ اگر کوئی دوسرا شخص اس کے منہ کے پاس لگا کر بے تکلف سن لے تو اس کا کوئی اعتبار نہ ہوگا اور تعریف میں فرق نہ آئے گا۔

والمخافتۃ فیما تخافت فیہ......الخ

اور جن نمازوں اخفاء واجب ہے ان میں اخفاء کرنا ہی واجب ہے۔ف۔ جن کی تفصیل یہ ہے کہ امام کے لئے مغرب کی تیسری رکعت، اور عشاء وظہر اور عصر کی آخری دونوں رکعتوں میں اگرچہ حج کے دنوں کے عرفہ کے مقام میں ہو، اسی طرح اگر ان کی قضاء میں بھی آہستہ پڑھنا واجب ہے، اسی بناء پر ان میں اگر کسی نے کسی حال میں قراءت جہر سے کی تو بھی سجدہ سہو لازم آئے گا، قاضی خان، اسی طرح دن کے وقت میں نفل نمازوں میں بھی اخفاء واجب ہے، الزاہدی، یہانتک امام کے لئے احکام بیان کئے گئے، اور تنہا پڑھنے والے کے لئے یہ حکم ہے کہ جن نمازوں میں امام پر اخفاء واجب ہے ان میں تنہا پڑھنے والے پر بھی اخفاء واجب ہے، اور جن نمازوں میں امام پر جہر کرنا واجب ہے تو تنہا پڑھنے والے کے لئے ان میں اختیار ہے یعنی وہ جس طرح آہستہ یا زور سے پڑھنا چاہئے اسی طرح سے پڑھے لیکن جہر کرنا ہی افضل ہے، یہی صحیح قول ہے، جیسا کہ قاضی میں ہے۔

اور خلاصہ میں اصل سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص جہری نماز مثلاً فجر کی آہستہ آہستہ پڑھ رہا تھا، اس نے پوری سورہ فاتحہ یا تھوڑی سی پڑھی تھی کہ کسی دوسری شخص نے آکر اس کی اقتداء کرلی، تو اب اس پر یہ لازم ہو گیا کہ وہ سورہ فاتحہ

کو دوبارہ زور سے پڑھے، البحر، یہ مسئلہ اس بات کی دلیل بنتی ہے کہ فرائض کی پہلی رکعتوں میں سورہ ملانے سے پہلے سورہ فاتحہ کو دوبار مکرر پڑھنا اس مجبوری میں جائز ہے، اسے اچھی طرح ذہن نشین کر لیں۔ م۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جتنی باتیں اب تک ذکر کی گئیں وہ سب واجبات میں سے ہیں، اور صرف سنت نہیں ہیں۔

ولهٰذا يجب عليه سجدتا السهو بتركها، هذا هو الصحيح......الخ

اسی وجہ سے ان میں سے ہر ایک کے چھوٹ جانے سے مصلی پر سہو کے دو سجدے واجب ہو جاتے ہیں، ف۔ پس مبسوط کا قیاس غیر صحیح قول ہوا کہ عیدین کی تکبیروں اور قنوت کے ترک سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا، اسی طرح قعدہ اولیٰ تشہد بھی چھوڑنے سے سجدہ سہو لازم نہیں آتا ہے، کیونکہ یہ سب (ادعیہ اور) اذکار ہیں، مذکورہ مسئلہ نے اس بات کو دفع کر دیا کہ قیاس کرنا اس مقام پر بے محل اور متروک ہے، اور صحیح قول استحسان کا ہے یعنی یہ کہ واجبات میں سے ہیں، اور ان کے ترک سے سجدہ سہو بھی لازم آتا ہے، اور محیط میں بصراحت کہا ہے کہ اگر کوئی شخص رکوع سے نہ اٹھے تو اس پر سجدہ سہو واجب ہے اور اس مسئلہ میں کسی اختلاف کو بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ مع۔

یہ روایت بھی اس قول کے موافق ہے کہ تعدیل ارکان واجب ہے، اسی مسئلہ میں قومہ یعنی رکوع سے سیدھا کھڑا ہونا اور جلسہ یعنی دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا بھی داخل ہے، اس کا بیان گذر چکا ہے، البتہ جمعہ اور عیدین کے سجود سہو میں... بہت بھیڑ ہونے کی وجہ سے اس کی ادائیگی سے منع کیا گیا ہے، جیسا کہ عنقریب آئے گا۔ م۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ جب مذکورہ باتیں واجبات میں سے ہیں تو ان باتوں کو سنت کیوں کہا گیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ لفظ سنت اصطلاحی حقیقی معنی میں نہیں کہا گیا ہے۔

وتسميتها سنة في الكتاب لما انه ثبت وجوبها بالسنة.

ترجمہ:- اور متن کتاب میں مذکورہ واجبات کہنا اس بناء پر ہے کہ ان کا وجوب سنت سے ہی ثابت ہے۔

توضیح:- بقیہ واجبات نماز، واجبات کو سنت کہنے کی وجہ، واجب اور فرض کو اپنے مواقع میں ادا کرنا، فرض قراءت کو پورا کر کے نماز سوچتا رہا پھر رکوع کیا، رکوع کیا اور یاد آیا کہ سورہ نہیں ملائی رکوع دو اور سجدہ تین کئے دو رکعت یا چار ہونے سے پہلے قعدہ، دو فرض یا فرض واجب کے درمیان زیادتی، مقتدی کا چپ رہنا متابعت امام

وتسميتها سنة في الكتاب لما انه ثبت وجوبها بالسنة......الخ

اور متن کتاب میں واجبات کو سنت کا نام دینا عموم مجاز کے طور پر ہے۔ ف۔ کیونکہ ان کا وجوب سنت سے ثابت ہے۔ ف۔ اسی لئے مذکورہ واجبات کو سنت کی طرف منسوب کر دیا ہے، خلاصہ بحث یہ ہوا کہ ماتنؒ نے کتاب میں سب سے پہلے چھ فرائض مثلاً تحریمہ وغیرہ شمار کئے جو قرآن وحدیث سے قطعی طور پر ثابت ہیں، ان کے بیان کرنے کے بعد نماز میں تمام کئے جانے والے افعال کو سنت کہا ہے جس کا مطلب یہ لیا ہے کہ یہ وہ افعال ہیں جو دلیل سنت سے ثابت ہوئے ہیں، اور ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو سنت کی دلیل سے ہی واجب ہوئے ہیں ایسے کہ ان کے چھوڑ دینے سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے اور نہ کرنے کی صورت میں نماز دوبارہ پڑھنی ہوگی تاکہ پہلی ناقص پڑھی ہوئی نماز کامل ہو جائے ورنہ وہ فاسق اور گنہگار ہوگا، اور کچھ افعال مسنون اور کچھ آداب ثابت ہوئے ہیں یعنی ان کے کرنے میں ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے میں گناہ بھی نہیں ہوتا ہے بشرطیکہ اس کی عادت نہ بنالے اور معمولی بھی نہ سمجھے، واضح ہو کہ فی الحال افعال مسنونہ کا بیان شروع نہیں ہوا ہے کیونکہ ابھی تک کئی واجبات کا بیان باقی رہ گیا ہے۔ میں مترجم ان بقیہ واجبات کو ذکر کر رہا ہوں تاکہ آئندہ جب نماز کی پوری کیفیت بیان کی جائے اس میں ہر فعل کو فرض،

واجب، سنت اور ادب کی حیثیت سے سمجھ لیا جائے، وہ باقی واجبات یہ ہیں:

نمبر ا۔ ہر فرض اور ہر واجب کام کو اپنے موقع اور محل پر ادا کرنا، اس بناء پر اگر کوئی فرض قراءت کر لینے کے بعد کسی سوچ میں پڑ گیا پھر دیر سے رکوع کر لیا تو رکوع میں تاخیر کرنے کی وجہ سے اس پر سجدہ سہو واجب ہو جائے گا، اسی طرح اگر رکوع کر لیا اس کے بعد اسے یاد آیا کہ میں نے سورہ نہیں ملائی ہے، اس لئے کھڑے ہو کر اس نے سورہ ملالی تو اسے دوبارہ رکوع کر کے سجدہ سہو کرنا ہو گا۔

۲۔ یہ ہے کہ دو رکوع اور تین سجدہ نہ ہوں ورنہ سجدہ سہو واجب ہو گا، لیکن اگر کوئی رکوع پورا نہ ہو سکا اس لئے اسے دوبارہ ادا کیا ہو تو وہ ایک ہی شمار ہو گا، اسی طرح اگر سجدہ کی جگہ کنکریا کانٹے ہوں اس لئے وہاں سے سر اٹھا کر دوسری جگہ رکھا اور سجدہ کیا تو یہ بھی ایک ہی شمار کیا جائے گا۔

نمبر ۳۔ دو رکعت یا چار رکعت ہونے سے پہلے قعدہ نہ کرنا کیونکہ اگر ادائے رکن کی مقدار قعدہ کر لیا تو سجدہ سہو لازم ہو جائے گا۔

نمبر ۴۔ دو فرض یا ایک واجب اور ایک فرض کے درمیان کسی قسم کی زیادتی نہ کرنا یہانتک کہ بالکل خاموش بھی نہ رہنا اتنی دیر جو قابل اعتبار ہو سکے۔

نمبر ۵۔ مقتدی کو خاموش رہنا واجب ہے یعنی قراءت نہ کرنی اگر اپنے ارادہ سے قراءت کر لی تو بقول اصح اس کی نماز فاسد نہ ہو گی، اسی طرح اگر سہواً قراءت کر لے تو اس پر سجدہ سہو بھی لازم نہ ہو گا۔ ش۔

نمبر ۶۔ ایسی تمام باتوں میں جن میں ائمہ کرام کے نزدیک اجتہاد شرعی گنجائش ہو تو ان میں مقتدی پر امام کی اتباع لازم ہے، مثلاً امام نے عیدین کی نماز میں ہر رکعت میں پانچ پانچ تکبیریں کہیں یا سلام کرنے سے پہلے سجدہ سہو ادا کر لیا یا وتر میں رکوع کے بعد قنوت پڑھی تو ایسی تمام باتوں میں امام کی اتباع واجب ہے، مگر جن باتوں کے منسوخ ہونے کا قطعی طور سے ثبوت موجود ہو ان میں اس کی اتباع ضروری نہیں ہے مثلاً امام نے نماز جنازہ میں پانچ یا اس سے زیادہ تکبیریں کہیں تو چار سے زائد میں متابعت نہیں کرنی چاہئے، یا اس کام کی سنت نہ ہونے کا قطعی ثبوت ہو جیسے نماز فجر میں امام نے قنوت پڑھی تو بھی متابعت نہیں کرنی چاہئے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آگیا ہو جیسا کہ آئندہ اپنے مقام میں اس پر بحث ہو گی، نمبر ۷۔ ہاتھوں اور گھٹنوں کو رکھ کر سجدہ کرنا، جیسا کہ ابن الہمامؒ اور البحر کا قول ہے۔

نماز میں سنتوں کی تفصیل

یہ سنتیں بہت سی ہیں جن میں چند یہ ہیں، نمبر ا۔ تحریمہ کے وقت دونوں ہاتھ اٹھانا، اور خلاصہ میں ہے کہ اگر کوئی ہاتھ نہ اٹھانے کی عادت بنالے تو وہ گناہگار ہو گا، نمبر ۲۔ انگلیوں کو ان کی عام حالت پر کھلی چھوڑنا۔

نمبر ۳۔ تکبیر کہتے وقت سر نہ جھکانا، نمبر ۴۔ امام کو ضرورت کے مطابق بلند آواز سے تکبیر اور **سمع الله لمن حمده** اور سلام کہنا، بلا ضرورت زور سے چلانا مکروہ ہے، اگر پہلی تکبیر یعنی افتتاحی تکبیر کہتے وقت اگر صرف عوام کو مطلع کرنا ہی مقصود ہو تو کسی کی نماز نہ ہو گی، نمبر ۵۔ ثنا یعنی **سبحانك اللهم وبحمدك الخ** کہنا، نمبر ۶۔ **اعوذ بالله من الشيطان الرجيم** کہنا، نمبر ۷۔ **بسم الله الرحمن الرحيم** کہنا۔

نمبر ۸۔ آمین کہنا، نمبر ۹۔ ثنا سے آمین تک چاروں چیزوں کو آہستہ کہنا، نمبر ۱۰۔ داہنے ہاتھ کو بائیں پر رکھنا نمبر ۱۱۔ ہاتھوں کو اسی طرح ناف کے نیچے باندھنا، نمبر ۱۲۔ رکوع کی تسبیح کہنا، نمبر ۱۳۔ رکوع میں دونوں گھٹنوں کو پکڑنا، نمبر ۱۴۔ انگلیوں کو کھلی رکھنا، نمبر ۱۵۔ سجدوں کو تکبیر سے اٹھتے وقت تکبیر کہنا، نمبر ۱۶۔ ہاتھوں کی انگلیوں کو سجدوں میں ملا کر رکھنا، نمبر ۱۷۔ مردوں کو تشہد

پڑھنے میں بایاں پاؤں بچھا کر رکھنا، نمبر ۱۸۔ درود پڑھنا، اور امام شافعیؒ کے قول کے مطابق ادنی مقدار فرض ہے، نمبر ۱۹۔ ایسی دعا مانگنا جو بندوں سے نہ مانگی جاسکتی ہو۔

نمبر ۲۰۔ سلام کرتے وقت دائیں اور بائیں طرف منہ پھیرنا، ان کے علاوہ اور بھی سنتیں ہیں۔

سنتوں کے علاوہ کچھ آداب بھی ہیں یعنی ایسے کام جن کے نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے لیکن ان کا کر لینا بہتر اور افضل ہے، ان میں سے چند یہ ہیں، نمبر ۱۔ کھڑے ہونے کی حالت میں سجدہ کی جگہ پر، رکوع کی حالت میں قدم کی پشت پر اور سجدوں کی حالت میں ناک کے نتھنوں پر اور بیٹھے رہنے کی حالت میں اپنی گود پر اور سلام پھیرتے وقت، اِدھر اُدھر دونوں مونڈھوں پر نظر رکھنی اور، نمبر ۲۔ جمائی روکنا اگرچہ دانتوں سے ہونٹ پکڑ کر ہو، ورنہ بائیں ہاتھ کی پشت کو منہ پر رکھ کر، نمبر ۳۔ تحریمہ کے لئے مردوں کو آستینوں کو ہاتھوں سے نکالنا، جبکہ سردی کے مجبوری نہ ہو۔

نمبر ۴۔ حتی الامکان کھانسی کو روکنا کیونکہ بلا عذر کھانسنا مفسد صلوۃ ہے، اس لئے عذر کی حالت میں بھی احتیاط کر کے روکنا، نمبر ۵۔ امام اس وقت نماز شروع کرے جبکہ اقامت پوری ہو جائے، اور یہی مذہب معتدل ہے۔ شرح المجمع۔ اور یہی قول اصح ہے۔ الخلاصہ۔ البحر وغیرہ۔ ت۔ م۔ د۔ آئندہ نماز کی پوری کیفیت جس میں فرائض، واجبات، سنن اور آداب کا پورا خیال رکھتے ہوئے نماز ادا کرنے کا طریقہ مذکور ہے، چنانچہ اس طرح کہا ہے۔

واذا شرع فی الصلوة، كبر لما تلونا، وقال عليه السلام: تحريمها التكبير، وهو شرط عندنا خلافا للشافعي حتى ان يحرم للفرض كان له ان يؤدى بها التطوع، وهو يقول انه يشترط لها ما يشترط لسائر الاركان وهذا اية الركنية.

ترجمہ:۔ اور جب نماز شروع کرنا چاہے تو تکبیر کہے اس آیت پاک کی وجہ سے جس کی تلاوت ہم پہلے کر چکے ہیں، اور اس بناء پر بھی کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس نماز کی تحریم تکبیر ہے، اور یہ تکبیر ہمارے نزدیک شرط ہے، اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے اسی بناء پر اگر کسی شخص نے فرض نماز ادا کرنے کے لئے احرام باندھا تب بھی اس کے لئے یہ جائز ہے کہ اسی نیت سے نفل ادا کر لے، اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے لئے بھی وہ تمام شرطیں ضروری ہیں جو دوسرے ارکان کے لئے ہوتی ہیں، اور یہ چیز اس کے رکن ہونے کی علامت ہے۔

توضیح:۔ مسنون طریقہ سے نماز ادا کرنے کا پورا طریقہ، تکبیر تحریمہ

واذا شرع فی الصلوة، كبر لما تلونا...... الخ

اور جب نماز خواہ فرض ہو یا نفل شروع کرنا چاہے۔ ع۔ تو تکبیر کہے۔ ف۔ عام علماء کا یہی قول ہے۔ ع۔ اور دونوں قدموں کے درمیان چار انگلیوں کا فاصلہ رکھے۔ الخلاصہ۔ ھ۔ اس آیت کی دلیل کے پیش نظر جو ہم نے پہلے تلاوت کی ہے، ذکر کی ہے، یعنی وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ، اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تحریم نماز کی تکبیر ہے۔ ف۔ یہ حدیث پانچ صحابہ کرامؓ سے مروی ہے، جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہؒ کی حدیث جو حضرت علیؓ سے مروی ہے، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس باب میں اصح اور احسن ہے، اور عبد اللہ بن عقیل راوی کی امام بخاریؒ سے توثیق نقل کی ہے، اور نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور الحاکمؒ نے بھی حضرت ابو سعید الخدریؓ سے اس حدیث کی روایت کی ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ مسلمؒ کی شرط کے مطابق یہ حدیث صحیح ہے۔ مع۔ اگر نمازی امام کی حیثیت سے ہو تو یہ تکبیر زور سے کہے۔ م۔

وهو شرط عندنا خلافا للشافعي حتى ان يحرم للفرض...... الخ

یہ تکبیر ہم احناف کے نزدیک شرط ہے، یعنی ان چیزوں میں سے ہے جو نماز کے لئے نماز سے پہلے ہی فرض ہوتی ہے،

برخلاف امام شافعیؒ کے۔ف۔ کہ ان کے نزدیک رکن ہے، مگر ہم احناف اس کی رکنیت کے لئے کوئی دلیل نہیں پاتے ہیں اس لئے اسے فرض شرط قرار دیتے ہیں۔

حتی ان یحرم للفرض کان له ان یؤدی بها التطوع......الخ

یہانتک کہ جو کوئی فرض نماز کی نیت سے تحریمہ باندھے تو اس کے لئے یہ بات جائز ہے کہ اسی تحریمہ سے نفل ادا کرلے۔ف۔ اگرچہ اس طرح فرض سے اپنی نیت بدلنا اور خارج ہونا مکروہ ہے، السراج، اور نفل کی نیت سے تحریمہ باندھ کر دوسری نفل ادا کرنی بلا کراہت جائز ہے۔د۔ لیکن فرض کے تحریمہ پر دوسرا فرض ادا کرنا بالاجماع نہیں ہے یا نفل کے تحریمہ پر فرض ادا کرنا جائز نہیں ہے۔السراج۔

لہٰذا اگر تحریمہ رکن ہی ہوتا تو فرض کے تحریمہ سے نفل نماز ادا نہ ہوتی، الحاصل تحریمہ ایسا رکن نہیں ہوا جو نماز کے اندر داخل ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نے ایسی حالت میں تکبیر کہی کہ اس کے ہاتھ میں نجاست تھی، اور تکبیر سے فارغ ہوتے ہی وہ پھینک دی، یا ستر کھلا ہوا تھا اور تکبیر سے فارغ ہوتے ہی معمولی عمل سے اسے چھپالیا یا زوال آفتاب ظاہر ہونے سے پہلے تکبیر شروع کی اور اس سے فارغ ہوتے ہی زوال ظاہر ہو گیا، یا قبلہ سے دوسری طرف منہ پھیرا ہوا تھا اور اس سے فارغ ہوتے ہیں قبلہ رو ہو گیا تو تمام صورتوں میں نماز جائز ہو گی، اور شرح الائمہؒ نے کہا ہے کہ ظہر کے تحریمہ پر عصر کی بناء کرنا اور نفل کے تحریمہ پر فرض کی بناء کرنا یا اس کے برعکس، اور ادا کے تحریمہ پر قضاء کا تحریمہ کرنا جائز ہے۔ع۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک تحریمہ کے رکن نماز کے ہونے کی وجہ سے کوئی صورت بھی جائز نہ ہو گی۔

وهو يقول انه يشترط لها ما يشترط لسائر الاركان وهذا اية الركنية....... الخ

وہ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کہنے کے لئے وہ تمام باتیں شرط ہیں جو دوسرے ارکان کے لئے شرط ہوتی ہیں۔ف۔ جیسے استقبال قبلہ، اور ستر عورت اور پاک ہونا، نیت کا ہونا، وقت کا ہونا۔ع۔ **وهذا آية الخ** اور یہ دلیل اس بات کے لئے کافی ہے کہ اس میں بھی رکن کی علامت پائی جاتی ہے۔ف۔ اس مذکورہ شبہ کا جواب یہ ہے کہ مذکورہ شرطیں تحریمہ کے واسطہ نہیں ہیں، جیسا کہ مذکورہ مسائل سے معلوم ہو چکا ہے۔م۔

ولنا انه عطف الصلوة عليه فى قوله تعالى ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾ ومقتضاه المغايرة، ولهٰذا لايتكرر كتكرار الاركان ومراعاة الشرائط لما يتصل به من القيام.

ترجمہ:-اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اس آیت پاک وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى کہ اپنے رب کا نام ذکر کیا یعنی اللہ اکبر کہا پھر نماز پڑھی اس میں تکبیر پر نماز کا عطف کیا گیا ہے، اور اس عطف کا تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں میں یعنی معطوف کے درمیان مغایرت پائی جائے، اسی لئے تکبیر بار بار نہیں کہی جاتی ہے جیسا کہ دوسرے ارکان مکرر کئے جاتے ہیں، اور شرطوں کی رعایت صرف اس کے واسطے کی جاتی ہے جو تکبیر سے متصل ہے یعنی نماز کا قائم ہونا۔

توضیح:-نماز کی شرطوں کی رعایت کرنا

ولنا انه عطف الصلاة عليه فى قوله تعالى ﴿وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى﴾...... الخ

ترجمہ سے مفہوم ظاہر ہے، **ومقتضاه الخ** اور عطف کا تقاضا یہ ہے کہ معطوف علیہ اور معطوف دونوں دو چیزیں ہوں ایک نہ ہو۔ف۔ کیونکہ اگر دونوں ایک ہی ہوں تو عطف بے فائدہ ہو گا، مثلاً زید اور زید آیا تو زید اول معطوف علیہ اور زید معطوف ہے مگر بے فائدہ کلام ہے، بلکہ دونوں علیحدہ علیحدہ ہونا چاہئے۔ت۔ یہاں اور خاص پر عام کا عطف بھی نہیں ہو رہا ہے، اس طرح یہ بات معلوم ہو گئی کہ تکبیر اور چیز ہے اور نماز علیحدہ چیز ہے، مگر شرط ہے۔

ولهٰذا لایتکرر کتکرار الارکان ......الخ

اسی بناء پر یہ پہلی تکبیر (تحریمہ) مکرر نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ دوسرے ارکان مکرر ہوتے ہیں۔ف۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ تکبیر تحریمہ رکن نہیں ہے، یہاں یہ ایک اعتراض ہو سکتا ہے کہ ارکان کا مکرر ہونا تو ضروری نہیں ہے، تو مترجم کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ ارکان ہر رکعت میں قیام، رکوع اور سجود اپنے اپنے محل و موقع میں مکرر ہوتے ہیں جبکہ تکبیر اپنا محل پائے جانے کے باوجود مکرر نہیں ہوتی ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ تحریمہ رکن نہیں ہے، اور اس میں دوسرے ارکان کی شرائط کے پائے جانے کی وجہ سے اسے رکن کہنا تو اس شبہہ کا جواب گذر چکا ہے کہ یہ شرطیں تحریمہ کے واسطہ نہیں ہوتی ہیں۔

ومراعاة الشرائط لما یتصل به من القیام......الخ

اور شرائط کی نگہداشت صرف قیام نماز کے لئے ہے جو تکبیر سے متصل ہے۔ف۔ اس لئے اگر پہلے سے طہارت اور ستر عورت وغیرہ شرطوں کا خیال نہ رکھا گیا ہو تو تکبیر کے بعد قیام نہیں ہو سکتا ہے اس لئے فاصلہ اور فرق کرنا پڑے، اس لئے قیام سے پہلے ان شرطوں کا خیال رکھا گیا ہے، خاص تکبیر کیلئے وہ شرطیں عائد نہیں کی گئی ہیں، اس طرح یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ تکبیر شرط ہے اور رکن نہیں ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ تکبیر ہمارے نزدیک شرط ہے، اس شخص پر جو قدرت رکھتا ہو، اور محیط میں ہے کہ امی اور گونگے نے اگر نیت سے ہی نماز شروع کر دی تو ان کے لئے یہ جائز ہے کیونکہ ان کے اختیار میں جو چیز تھی وہ انہوں نے پوری کر دی۔ انتہی۔ اور ان دونوں کے لئے زبان ہلانا بھی واجب نہیں ہے کیونکہ الفاظ مخصوصہ کے ساتھ زبان ہلانا تو واجب ہے، اور وہ دونوں جب سے مجبور مان لئے گئے تو اس کی جگہ پر اب کسی دلیل کے بغیر زبان ہلانے کو واجب کہنے کا حکم نہیں دیا جا سکتا ہے۔ الفتح۔

حاصل یہ ہے کہ اصل واجب نیت کے ساتھ اللہ اکبر کہنا تھا اور جب امی اور گونگے اس کو ادا نہیں کر سکتے ہیں تو ان کے لئے صرف نیت ہی باقی رہ گئی ہے، اور نیت کے ساتھ صرف زبان ہلانے کو بھی واجب نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے ایک مستقل حکم چاہئے، جو موجود نہیں ہے۔

بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ دلی ارادہ سے ہی نیت کرنا واجب ہے اسی بناء پر اگر کسی کے دل میں ارادہ کی پختگی نہ ہو اس کے لئے صرف زبان سے الفاظ کہہ لینے کو جائز کہنا بلکہ دلیل ہے جیسا کہ در مختار وغیرہ نے مجتبیٰ سے لیا ہے، اچھی طرح سمجھ لو، اور جس شخص کو فرض کی ادائیگی کے وقت کھڑے ہونے کی قدرت حاصل ہو اس کے لئے کھڑے ہونے کی حالت میں ہی تکبیر ضروری ہے، اور اس کے بغیر جائز نہ ہو گی، اگر کسی نے امام کو رکوع کی حالت میں پایا اس لئے وہ شخص جھکے ہوئے تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں چلا گیا، تو اگر اس نے اتنی جھکاؤ کی حالت میں تکبیر پوری کی کہ وہ قیام سے زیادہ قریب تھا اور رکوع کی حالت سے زیادہ دور تھا تو اس کی نیت صحیح ہو گی ورنہ نہیں۔ الفتح۔

اور اگر اس تکبیر سے رکوع کی تکبیر کی نیت کی ہو تو نیت لغو قرار دی جائے گی۔د۔ اور اگر لفظ اللہ قیام کی حالت میں کہا اور لفظ اکبر رکوع کی حالت میں تو بالاتفاق اس سے نماز شروع نہ ہو گی۔ی۔ج۔ اور اگر اقتداء کی نیت کرتے ہوئے لفظ اللہ تو امام کے ساتھ کہا مگر لفظ اکبر اس سے پہلے کہہ دیا تو قول اصح کے مطابق اقتداء صحیح نہیں ہوئی۔د۔ اگر امام کی تکبیر سے بے خبری کے عالم میں کسی نے تکبیر کہی تو اگر اس کے گمان میں یہ تکبیر امام کی تکبیر سے پہلے ہو گئی ہے تو اقتداء صحیح نہیں ہے ورنہ جائز ہے۔ المحیط۔

لفظ اللہ یا لفظ اکبر کے حروف اول الف میں قصداً مد کے ساتھ کہنا کفر ہے ورنہ مفسد صلوۃ ہے جیسا کہ اصح قول کے مطابق لفظ اکبر کی باء کو مد کر کے اکبار کہنا ہے۔د۔ بندہ مترجم کہتا ہے کہ مذکورہ مسئلہ میں کفر کا حکم لگانا مشکل ہے بالخصوص ایسی صورت میں کہ عام طور سے پاک و ہند وغیرہ کے لوگ کو اس کے اصل معنی یا بدلے ہوئے معنی کا کچھ پتہ نہیں ہے، اور معنی معلوم ہونے کی صورت میں اگر اس طرح کہنے سے مقصود خوش آوازی وغیرہ ہو تو مکروہ تحریمی ہے، ورنہ کفر ہے، کہ کہنے والے کو حقیقت میں اللہ

تعالیٰ کے بارے میں شک ہوایا اس کے اکبر ہونے کے بارے میں یعنی مکمل اعلیٰ ہونے کے بارے میں شک ہوا ہے، لہٰذا اس سلسلہ میں اس .... طرح کہنا بہتر ہے کہ اگر کسی نے مد سے شک کا ارادہ کیا ہو تو کفر اور اگر عمداً ہو یا خطاءً ہو تو مفسد نماز ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، م۔

نماز کے شروع ہونے کا تعلق نیت کے ساتھ ہی تکبیر کہنے سے بھی ہے، کسی ایک کے پائے جانے سے نہیں ہے، اس شخص کے لئے جو قدرت رکھنے والا ہو، اور عاجز اور گونگے اور امی اس سے مستثنیٰ ہیں، ت، گونگے اور امی کو قراءت کے بارے میں زبان ہلانا بھی لازم نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے، د۔ خلاصہ مسائل کا یہ ہوا کہ جب کوئی نماز کا ارادہ کرے تو نیت کے ساتھ بتائے ہوئے صحیح طریقہ سے تکبیر بھی کہے۔

ویرفع یدیه مع التکبیر وهو سنة لان النبی علیه السلام واظب علیه وهذا اللفظ یشیر الی اشتراط المقارنة وهو المروی عن ابی یوسف والمحکی عن الطحاوی والاصح انه ویرفع یدیه اولا ثم یکبر، لان فعله نفی الکبریاء عن غیر الله تعالی، والنفی مقدم.

ترجمہ:- اور تکبیر کہنے کے ساتھ ہی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے، اور یہ سنت ہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس پر ہمیشگی کی ہے، مذکورہ لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ دونوں کاموں کو ایک ساتھ ہونا شرط ہے، اور یہی قول ابو یوسف سے مروی اور امام طحاویؒ سے منقول ہے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو اٹھالے اس کے بعد تکبیر کہے کیونکہ اس کے ہاتھوں کے اٹھانے کا عمل اللہ تعالیٰ کے غیر سے بڑائی کی نفی کرتا ہے، اور نفی مقدم ہوا کرتی ہے اثبات سے۔

توضیح:- تکبیر کہنے کے ساتھ ہی دونوں ہاتھوں کو اٹھانا بھی ہے

ویرفع یدیه اولا ثم یکبر، لان فعله نفی الکبریاء عن غیر الله تعالی، والنفی مقدم......الخ

اور مرد تکبیر کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے، اور یہ کام یعنی ہاتھوں کو اٹھانا سنت ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی ہے۔ وهذا اللفظ...... الخ اور یہ یعنی مع التکبیر کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دونوں کام یعنی تکبیر کہنی اور ہاتھوں کو اٹھانا ایک ساتھ ہونا شرط ہے۔ ف۔ یعنی دونوں ملے ہوئے اور ایک ساتھ ہوں، مگر اس شرط کہنے پر خواہر زادہ اور امام صفار نے اسے کمزور قول بتایا ہے۔ ع۔

وهو المروی...... الخ

اور امام ابو یوسفؒ سے بھی یہی مروی ہے۔ ف۔ یعنی یعقوب بن ابراہیم سے جو کہ امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد تھے، اور امام طحاویؒ سے بھی یہی قول مروی ہے۔ ف۔ الطحاوی سے مراد امام ابو جعفر احمد بن محمد سلامہ ازدی الطحاویؒ ہیں، اور محکی سے مراد یہ ہے کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ طحاویؒ ایسا ہی کرتے تھے یعنی تکبیر کے ساتھ ہی اپنے ہاتھوں کو اٹھاتے تھے، اور یہی قول امام احمدؒ کا اور امام مالکؒ کا یہی مشہور مذہب ہے۔

والاصح...... الخ

لیکن اصح مذہب یہ ہے کہ پہلے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے اس کے بعد تکبیر کہے۔ ف۔ عام مشائخ کا اسی پر عمل ہے۔ ف۔ مبسوط میں کہا ہے کہ اکثر مشائخ اسی پر عامل ہیں۔ ع۔ کیونکہ اس نمازی کے ہاتھ اٹھانے کا فعل اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہر چیز سے کبریائی کی نفی ہے۔ ف۔ یعنی کانوں پر ہاتھ رکھنے والے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا تمام چیزوں میں سے کسی میں بھی بڑائی نہیں ہے، پھر تکبیر کہنے سے اللہ تعالیٰ کے لئے کبریائی کا اثبات ہے۔ ع۔

والنفی مقدم...... الخ

اور یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ نفی اثبات سے پہلے ہوتی ہے۔ ف۔ جیسا کہ کلمہ توحید میں ہے، کہ پہلے لا الہ سے نفی ہے پھر الا اللہ سے اثبات ہے، اسی طرح یہاں بھی ہے۔

مگر یہاں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ کلمہ توحید میں تو نفی واثبات دونوں کو زبان سے ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے مجبوراً بقدر ضرورت نفی مقدم کی گئی ہے کیونکہ دونوں کو بیک وقت بولنا ممکن نہیں ہے، مگر موجودہ مسئلہ میں تو فعل سے نفی اور قول سے اثبات ہے اس طرح بیک وقت نفی واثبات دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ مع۔

اور جواب یہ ہے کہ مصنفؒ کی مراد یہ ہے کہ نفی کا اثبات پر مقدم ہونا بہتر ہے تاکہ بندہ سب سے پہلے ماسوائے ذات خداوندی کے تمام چیزوں سے کنارہ ہو جائے اور ساری چیزیں اس پر حرام ہو جائیں، کسی چیز کا بھی اس میں دخل اور تعلق باقی نہ رہے، پھر تکبیر سے اللہ تعالی کی بڑائی اور عظمت بھر جائے، اور اسی کی موجودگی اور اسی کے دربار میں اپنی عبادت ادا کرے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ یہاں گفتگو صرف اس بات میں ہے کہ اس میں کون سا طریقہ اولیٰ ہے، کیونکہ کسی بھی صورت کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے، جیسا کہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

اب چند باتیں اور بھی قابل ذکر ہیں، نمبر ا۔ کیا ہاتھ اٹھانا سنت ہے، نمبر ۲۔ اس کی کیا کیفیت ہے، نمبر ۳۔ مرد کہاں تک ہاتھ اٹھائے اور عورت کہاں تک اٹھائے، نمبر ۴۔ تکبیر کے الفاظ کیا ہیں، نمبر ۵۔ یہ تکبیر زبان عربی کے ساتھ مخصوص ہے یا نہیں، نمبر ۶۔ کن الفاظ سے تکبیر جائز نہیں ہے، اس مقام پر یہی صحیح ہے کیونکہ اسی تکبیر سے نماز کی ابتداء ہوتی ہے، اگر یہی تکبیر درست نہ ہوگی تو پوری نماز ہی باطل ہو جائے گی۔ م۔

اب بیان کی ہوئی باتوں کی تفصیل اس طرح ہوتی ہے کہ نمبر ا۔ ہاتھ اٹھانا سنت ہے، اور یہی صحیح قول ہے، اور ابو حنیفہؒ سے اس کی تصریح بھی پائی گئی ہے، اور جمہور علماء کا یہی قول ہے، اگرچہ بعض فقہاء اس کے وجوب کے بھی قائل ہوئے ہیں، یہانتک کہ خود ہمارے مذہب میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ ابن الہمامؒ نے خلاصہ سے نقل کیا ہے کہ اس کے ترک کر دینے سے بعضوں کے نزدیک نمازی گنہگار ہوگا، لیکن قول مختار یہ ہے کہ اگر ہاتھ نہ اٹھانے کی کوئی عادت بنالے تو گنہگار ہوگا، ورنہ نہیں۔ انتہی۔

گویا اس طرح دونوں قولوں میں توفیق و تطبیق ہو گئی۔ مف۔ پھر دلائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس حدیث میں بھی رسول اللہ ﷺ کی نماز کا بیان ہے اس میں ہاتھوں کے اٹھانے کا بیان ہے، یہانتک کہ ابن المنذرؒ نے دعویٰ کے ساتھ کہا ہے کہ سارے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ہاتھ اٹھاتے تھے، اور اس ہمیشگی کے باوجود یہ واجب نہیں ہے، جیسا کہ امام السرخسی کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اعرابی کو واجبات نماز بتاتے ہوئے ہاتھوں کو اٹھانا نہیں بتایا ہے۔ ع۔ اور مقررہ قاعدہ ہے کہ ضرورت کے وقت بیان نہ کرنا یا اس میں کوتاہی کرنی جائز نہیں ہے، تو اگر یہ رفع بدین واجب ہوتا تو اس اعرابی کو بھی ضرور بتاتے۔ ف۔

بندہ مترجم کا کہنا ہے کہ عینیؒ نے اس دلیل کو کمزور بتلایا ہے، لیکن اس کمزوری کی کوئی وجہ نہیں بتائی ہے، اس طرح ہمیشگی سنت کی دلیل ثابت ہوئی، اور وجوب ثابت نہ ہوا، لیکن کافی کے حوالہ سے عنقریب فتح القدیر میں وجوب کی ترجیح کا بیان ہوگا، نمبر ۲۔ ہاتھوں کے اٹھانے کی کیفیت اس طرح ہوگی کہ ہاتھوں کو کانوں کے مقابل تک اٹھانا چاہئے، یہانتک کہ دونوں انگوٹھے دونوں کانوں کے لو کے مقابل ہو جائیں، التبیین، اسی حالت میں تکبیر کہنی چاہئے، عام مشائخ کا یہی قول ہے۔ المحیط۔

انگلیوں کے پوروں کے حصہ کانوں کے لووں کے مقابل ہوں، التبیین، تکبیر کے وقت سر نہ جھکائے۔ الخلاصہ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی اس حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر کہتے تو انگلیوں کو کشادہ چھوڑ دیتے تھے، اس کی روایت ترمذی نے اپنی کتاب جامع میں اور ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں کی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ انگلیوں کو اپنی عام حالت پر ڈھیلا چھوڑ دینا چاہئے اور ملانا نہیں چاہئے، جیسا کہ شیخ الاسلام خواہر زادہؒ نے کہا ہے۔ ع۔ یہی معتمد ہے۔ المحیط۔

اگر کوئی تکبیر کہنے کے بعد ہاتھ اٹھائے تو ادا نہ ہوگا، اگر کسی وجہ سے بتائی ہوئی مسنون حد تک ہاتھوں کو نہ اٹھا سکے تو کانوں سے اونچا یا نیچا جس قدر ممکن ہو اٹھانا چاہئے۔ التبیین۔ حدیث میں روایت اس طرح سے بھی ہے کہ کان یکبر عند کل خفض و رفع،

یعنی رسول اللہ ﷺ جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہتے تھے، اس روایت کی تائید ابو یوسفؒ کی روایت سے ہوتی ہے کہ ہاتھوں کا اٹھانا اور تکبیر کہنا دونوں ایک ساتھ ہی ہونی چاہئے، اسی قول کو شیخ الاسلام اور صاحب التحفہ اور قاضی خانؒ نے بھی پسند کیا ہے۔

اور نسائیؒ کی حضرت ابن عمرؓ سے مروی حدیث میں اس طرح ہے کان یرفع یدیه حذو منکبیه ثم یکبر، یعنی رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے مقابل تک لاتے پھر تکبیر کہتے تھے، یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ ہاتھوں کو اٹھانا مقدم اور تکبیر کہنا مؤخر ہے، عام مشائخ کا یہی قول ہے، اسی قول کو مصنفؒ نے صحیح کہا ہے، اور حضرت انسؓ کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ آنحضرت ﷺ نے پہلے تکبیر کہی پھر ہاتھ اٹھائے، اور حدیث کا یہی ظاہر مفہوم حضرت براء بن عازب اور ابو وائلؒ سے بھی مروی ہے ابن الہمامؒ نے ان تینوں احادیث میں اس طرح توفیق دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ تینوں کام کئے ہیں مگر مصنفؒ نے جو صورت بیان فرمائی ہے اس کے مقابلہ میں دوسری صورت اولیٰ قرار پائی ہے، انتہی مختصراً۔

اور ترجیح کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث صحاح ستہ وغیرہ میں مروی ہے، اگرچہ اس سے ہاتھوں کو پہلے اٹھالینے کا ثبوت نہیں ملتا ہے مگر نسائی کی روایت کے بیان سے باقی کتابوں کی روایتوں سے بھی یہی مراد ظاہر ہو گئی، غور کرلیں، سب کا ماحصل یہ ہوا کہ تینوں صورتوں میں سے ہر ایک صورت کا جائز اور مسنون ہونا ثابت ہوتا ہے ہے البتہ مصنفؒ نے جو صورت بیان فرمائی ہے وہ سب میں اولیٰ ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

اب تیسری بات کی تفصیل باقی ہے کہ ہاتھ کہاں تک اٹھائے جائیں، تو جواب اولیٰ یہ ہے کہ اس حکم میں عورت اور مرد کے لئے علیحدہ علیحدہ حکم ہے، اور مزید تفصیل آرہی ہے۔

ویرفع یدیه حتی یحاذی بابهامه شحمة اذنیه، وعند الشافعی یرفع الی منکبیه، وعلی هذا تکبیرة القنوت والاعیاد والجنازة، له حدیث ابی حمید الساعدی قال: کان النبی علیه السلام اذا کبّر رفع یدیه الی منکبیه، ولنا روایة وائل بن حجر والبراء وانس ان النبی علیه السلام کان اذا کبّر رفع یدیه حذاء اذنیه.

ترجمہ:-اور مرد اپنے ہاتھوں کو اتنا اٹھائے کہ اس کے دونوں انگوٹھے اس کے دونوں کانوں کے لو وں تک پہونچ جائیں، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں مونڈھوں تک پہونچ جائیں، یہی اختلاف قنوت، عیدین اور جنازہ سب کی تکبیروں میں ہے، ان امام شافعیؒ کی دلیل حضرت ابو حمید الساعدیؓ سے یہ منقول حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں تک اٹھاتے تھے، اور ہماری دلیل حضرت وائل بن حجرؓ اور البراء اور انسؓ کی مروی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ جب تکبیر کہتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں کانوں کے مقابل تک اٹھاتے۔

توضیح:-رفع یدین مع تکبیر

ویرفع یدیه حتی یحاذی بابهامه شحمة اذنیه......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ محاذی ہونے یا لووں تک پہونچنے کا مطلب یہ ہے کہ کان کی لو سے انگوٹھا چھو جائے۔د۔ واضح ہو کہ بعض حدیث میں محاذات سر سے اور کسی میں کان سے اور کسی میں کندھے سے ہونی معلوم ہوتی ہے جس سے اختلاف ظاہر ہوتا ہے مگر ان میں موافقت اور توجیہ کی آسان صورت یہ ہے کہ ہاتھوں کے انگوٹھے جب لو کے مقابل ہوں گے تو یقیناً انگلیاں اوپر کے سر کے مقابل ہوں گی اور ہاتھ کا نچلا حصہ کندھوں کے مقابل ہو جائے گا، مزید تفصیل بعد میں آتی ہے، اس توجیہ سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ محاذی ہونے کے معنی اپنے ظاہر پر باقی ہیں اور اس سے چھونے یا انگلی لگانے کا جو طریقہ رائج ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے۔م۔

وعند الشافعی یرفع الی منکبیه، وعلی هذا تکبیرة القنوت والاعیاد والجنازة......الخ

اور امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں کاندھوں تک ہاتھوں کو اٹھایا جائے، مطلق نماز کے رفع یدین کے سلسلہ میں جو اختلاف ابھی احناف و شوافع کا گذرا، یہی اختلاف دعاء قنوت، عیدین اور جنازہ کی نمازوں کی تکبیروں کے موقع میں بھی ہے۔

له حديث ابى حميد الساعدى قال: كان النبى عليه السلام اذا كبّر رفع يديه الى منكبيه......الخ

امام شافعیؒ کی دلیل حضرت ابو حمید الساعدیؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر فرماتے تو دونوں ہاتھ دونوں کندھوں تک اٹھاتے تھے۔ف۔ دوسری حدیث میں ہے جعل یدیه حذاء منکبیه یعنی اپنے ہاتھوں کو اپنے کندھوں کے مقابل کر دیتے تھے، اور جب رکوع کرتے تو اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں کے پکڑنے کا پورا موقع دیتے (مضبوطی سے پکڑ لیتے) پھر پیٹھ کو حصر کر لیتے (جھکا دیتے) پھر جب سر اٹھاتے تو بالکل سیدھے کھڑے ہو جاتے یہانتک کہ ریڑھ کی ہر ایک گرہ اپنی اپنی جگہ پر پہونچ جاتی، پھر جب سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھ بغیر بچھائے ہوئے رکھتے پاؤں کی انگلیوں کے سروں کو قبلہ رخ رکھتے، پھر جب دو رکعت پر بیٹھتے تو بائیں پاؤں پر بیٹھتے اور دایاں پاؤں کھڑا رکھتے، پھر جب آخری رکعت پر بیٹھتے تو بایاں پاؤں آگے کرتے اور دوسرے کو کھڑا رکھتے اور سرین پر بیٹھ جاتے تھے۔ الفتح۔ اس حدیث کو مسلم کے علاوہ تمام صحاح والوں نے ذکر کیا ہے، اب اگر اس حدیث سے یہ مراد لی جائے کہ ہاتھ کا نچلا حصہ کندھے کے مقابل تھا تب صحیح ہے، اور اگر یہ مراد ہو کہ انگوٹھا کندھے کے مقابل تھا تو اس کی مقابل دوسری حدیثیں بھی ہیں جن سے مصنفؒ نے استدلال کیا ہے۔

ولنا رواية وائل بن حجر والبراء وانس ان النبى عليه السلام كان اذا كبّر رفع يديه حذاء اذنيه......الخ

اور ہماری دلیل حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث ہے۔ف۔ کہ آپ ﷺ نے تکبیر کہی ہے اور دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کے مقابل رکھا، اس کی روایت مسلم، ابوداؤد، نسائی، طبرانی، اور دار قطنی نے کی ہے۔ع۔ والبراء ...... اور براء بن عازبؓ ہے۔ف۔ کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے تو دونوں ہاتھوں کو اتنا اٹھاتے کہ دونوں کانوں کے مقابل ہو جائے، احمد، اسحٰق، دار قطنی اور طحاویؒ نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ع۔ وانس اور حضرت انسؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر کہتے تو دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کے مقابل تک اٹھاتے۔ف۔ در حقیقت یہ روایت حضرت براء کی ہے، اور حضرت انسؓ کی روایت اس طرح پر ہے آپ نے تکبیر کہی اور اپنے انگوٹھوں کو دونوں کانوں کے محاذی کر دیا، حاکم نے اس کی روایت کی ہے، اور حاکم نے کہا ہے کہ شیخین کی شرط پر صحیح ہے، اس میں کوئی علت یا عیب نہیں جانتا ہوں۔ع۔

اور بیہقیؒ نے حضرت انسؓ کی حدیث کی روایت سنن کبریٰ میں اس طرح کی ہے، **كان اذا فتح الصلوة كبر ثم رفع يديه حتى يحاذى بابهاميه اذنيه** یعنی جب نماز شروع کرتے تو تکبیر کہا کرتے پھر دونوں ہاتھوں کو اتنا بلند کرتے کہ دونوں کانوں کے محاذی کر دیتے، ابوالفرح ابن الجوزیؒ نے کہا ہے کہ اس اسناد کے سارے راوی ثقہ ہیں، اور در حقیقت ان راویتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، کیونکہ انگوٹھوں کو کان کی لو سے محاذی کرنے کو بھی اس طرح بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ ہاتھوں کو کندھوں کے محاذی کیا اور کبھی اس طرح کہ کانوں سے محاذی کیا کیونکہ ہتھیلی کے آخری حصہ پہونچے سمیت کندھے سے محاذی یا قریب ہوگا اور خود ہتھیلی کان کے مقابل ہو گی، پس جس نے انگوٹھوں کو کانوں کی لو سے مقابل کہا اس نے بہت سی تحقیق کے ساتھ روایتوں میں مطابقت پیدا کر دی ہے، لہٰذا اسی کا اعتبار واجب ہو گا، اور معارضہ ختم ہو جائے گا۔ف۔

ولان رفع اليد لإعلام الاصم، وهو بما قلناه، ومارواه يحمل على حالة العذر، والمرأة ترفع يديها حذاء منكبيها هو الصحيح، لانه أستر لها.

ترجمہ:- اور اس لئے بھی کہ ہاتھ کو بلند کرنا کان کے بہرے کو خبر دینے کے لئے ہے، اور یہ خبر اسی طرح بہتر طریقہ سے ہو گی جو ہم نے بیان کی ہے، اور وہ جو دوسرے نے روایت کی ہے وہ عذر کی حالت پر محمول ہو گی، اور عورت اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے مقابل تک اٹھائے گی، یہی قول صحیح ہے، یہ اس لئے کہ یہی طریقہ عورت کے لئے زیادہ ستر پوشی کرنے والا ہے

توضیح:- تکبیر تحریمہ کے وقت عورت کہاں تک ہاتھ اٹھائے

ولان رفع الید لإعلام الاصم، وھو بما قلناہ...... الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔جب امام اپنے ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے گا تو کانوں سے نہ سننے والا آنکھ سے یہ کیفیت دیکھ کر جان لے گا کہ امام نے نماز شروع کر دی ہے اور اسے دیکھ کر وہ خود بھی تکبیر کہے گا، اس جگہ اگر کسی کو یہ وہم ہو کہ اس سے پہلے مصنفؒ نے ہاتھوں کے اٹھانے کا فائدہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ماسوا ہر چیز سے کبریائی کی نفی کرنی ہے، اور اب فائدے کی دوسری بات فرمارہے ہیں جواب یہ ہے کہ کبریائی کی نفی تو اس کا باطنی فائدہ ہے جبکہ ہاتھ اٹھانا بہرے شخص کو خبر دینا اس کا ظاہری فائدہ ہے، اسی لئے خود اس بہرے پر بھی ہاتھ اٹھانا لازم کیا گیا ہے اس وجہ سے کہ شاید وہ خود ہی امام ہو یا اس لئے کہ شاید اس کے پیچھے والے اسے دیکھ کر مطلع ہو سکیں جیسے کہ زور سے تکبیر کا سب سے بڑا فائدہ تو اللہ تعالیٰ کی بڑائی کا اظہار ہے علاوہ ازیں یہ بھی فائدہ ہے کہ مقتدیوں کو نماز شروع کئے جانے کی یا امام کے تحریمہ باندھنے کی اطلاع دینی ہے، حالانکہ اس کی اصل غرض ہرگز یہ نہیں ہوتی ہے، یہانتک کہ اگر کسی کی یہی غرض ہو تو اس کا تحریمہ درست نہ ہوگا، جیسا کہ گذر گیا ہے، اس تفصیلی بیان سے نہایہ اور تاج الشریعہ کے سوالات اور اعتراضات ختم ہو گئے، فاحفظہ۔م۔

ومارواہ یحمل علی حالۃ العذر......الخ

اور امام شافعیؒ نے اپنے استدلال میں ابوحمیدؓ کی روایت جو نقل کی ہے کہ کندھے تک ہاتھوں کو اٹھائے وہ عذر کی حالت پر محمول ہوگی۔ف۔یعنی کسی مجبوری کی وجہ سے ہاتھ پورا نہ اٹھایا اور کمی کی اگرچہ کانوں تک اٹھانا ہی کامل ہے۔م۔طحاویؒ نے بیان کیا ہے کہ وائل بن حجرؓ نے بیان کیا ہے کہ پھر میں دوسرے سال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ لوگ گاڑھی چادریں کمل کی قسم کے دستانے پہنے ہوئے تھے اور وہ لوگ کمبلوں کے اندر سے ہی ہاتھ اٹھاتے تھے، اس حدیث میں وائلؓ نے یہ بتادیا ہے کہ ان لوگوں کا صرف احادیث کے درمیان مطابقت بیان کر دی، جس کی وجہ سے سارا اختلاف ختم ہو گیا، اور عذر پر محمول کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔مف۔

اور میں کہتا ہوں کہ ان تکلفات کی کچھ ضرورت نہیں ہے کیونکہ احادیث دونوں طرح کی ثابت ہیں بلکہ ابن عبدالبرؒ کے بیان میں ہے کہ کانوں سے اوپر تک بھی ثبوت ہے اور آثار صحابہ و تابعین بھی ہر ایک طور پر محفوظ مشہور ہیں جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ہر طرح کی گنجائش ہے۔مع۔

اور میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی اظہر ہے، لیکن ان طریقوں میں کون سا طریقہ اولیٰ ہے تو ہمارے نزدیک وہی طریقہ اولیٰ ہے جو بیان کیا گیا ہے جس کی پہلی وجہ وہ ہے جو مصنفؒ نے توجیہ کرتے ہوئے بیان کی ہے، اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس میں ساری صورتیں آجاتی ہیں، پھر آستینوں وغیرہ سے ہاتھوں کو نکالنا مستحب ہے اس روایت کی وجہ سے جو طحاویؒ نے وائل بن حجرؓ سے ذکر کی ہے۔م۔اب عورتوں کے سلسلہ میں بحث کی جاتی ہے کہ وہ کہاں تک ہاتھ اٹھائیں گی - اس لئے فرمایا والمرأۃ الخ اور **عورت** ———— اپنے ہاتھوں کو اپنے مونڈھوں کے مقابل تک اٹھائے گی۔ف۔محمد بن مقاتلؒ نے ہم احناف سے یہ روایت کی ہے، اور شوافع کا بھی یہی قول ہے۔ع۔

ھو الصحیح، لانہ أستر لھا......الخ

یہی طریقہ عورت کے لئے زیادہ پردہ ہونے کے مناسب ہے، اور غیر صحیح روایت میں جو کہ حسنؒ سے اور امام اعظمؒ سے ہے کہ عورت بھی مردوں کی طرح کانوں تک ہاتھ اٹھائے، اور تحفہ میں ہے کہ عورت کا مسئلہ ظاہر الروایۃ میں مذکور نہیں ہے۔مع۔ اب امر چہارم کا بیان ہے کہ تکبیر کے الفاظ کیا ہوں۔

فان قال بدل التکبیر: اللہ اجل، او اعظم، او الرحمن اکبر، او لا الہ الا اللہ، او غیرہ من اسماء اللہ تعالی، اجزأہ عند ابی حنیفۃ و محمد.

ترجمہ:-اب اگر نمازی نے تکبیر یعنی اللہ اکبر کہنے کی بجائے اللہ اجل یا اللہ اعظم یا الرحمٰن اکبر یا لا الہ الا اللہ یا اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے اس کے علاوہ کہدیا تو بھی اس کی نماز جائز ہو جائے گی، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک۔

توضیح:- تحریمہ کے وقت تکبیر کہنے کی بجائے
اللہ اجل یا اعظم یا لاالہ الا اللہ کہنا

فان قال بدل التکبیر: اللہ اجل، او اعظم، او الرحمن اکبر...... الخ

اگر اللہ اکبر کے عوض اللہ اجل یا اللہ اعظم کہا۔ف۔یعنی اسم ذات خداوندی کو اپنے حال پر مبتدا رکھا اور اکبر خبر کی جگہ کوئی اور تعظیمی کلمہ مثلاً اجل، اعظم، اور اعلیٰ وغیرہ کے کہا تو طرفین کے نزدیک جائز ہے یا الرحمن اکبر اللہ اکبر کے عوض الرحمن اکبر کہا۔ف۔یعنی اللہ جو اسم ذات ہے اس کے عوض الرحمن یا الرحیم وغیرہ اسمائے صفات میں سے لایا اکبر کو جو اللہ کا صفتی نام ہے اپنی جگہ پر رکھا تو بھی طرفین کے نزدیک جائز ہوگا، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ مبتدا اور خبر موجود ہو مثلاً اللہ اکبر، اللہ اعظم، الرحمن اکبر یعنی اللہ برتر ہے یا الرحمن برتر ہے، اور اگر فقط اللہ یا الرحمن یا الرب یعنی رب العالمین کہا اور اس میں زیادہ کچھ نہیں کہا تو در المختار میں لکھا ہے کہ نماز شروع نہ ہوگی، یہی مختار ہے، اور ہندیہ میں لکھا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک شروع ہو جائے گی۔التبیین۔اور یہی صحیح ہے۔الزاہدی۔تجرید میں یہ روایت حسنؒ کی بیان کی گئی جو انہوں نے امام اعظمؒ سے بیان کی ہے، اور ظاہر الروایۃ کی بناء پر یہ خبر معتبر ہے۔

اور اگر کوئی حائضہ عورت پاک ہوئی ایسی نازک وقت میں کہ اس میں وہ صرف اللہ کہہ سکے تو ظاہر الروایۃ کی بناء پر اس وقت کی نماز اس پر فرض نہ ہوگی، لیکن حسنؒ کی روایت کے مطابق امام اعظمؒ کے نزدیک فرض ہو جائے گی۔مف۔اور اگر کسی نے صرف خبر اکبر یا اعظم یا اجل کہا یعنی اس سے پہلے لفظ اللہ مبتدا نہیں کہا تو بالاجماع اس نماز کا شروع ہونا نہیں مانا جائے گا، الجوہرہ۔

او لا الہ الا اللہ...... الخ یا نمازی نے تکبیر کہنے کی بدلے لا الہ الا اللہ کہا۔ف۔تو بھی طرفین کے نزدیک نماز صحیح ہوگی، اسی طرح تسبیح یا تحمید سے یعنی سبحان اللہ یا الحمد للہ کہنے سے بھی اور دوسرے ایسے کلمات سے بھی جن سے صرف اللہ تعالیٰ کی صرف بزرگی کا اظہار ہوتا ہے کہ ان سے بھی یہی حکم ہوگا۔التبیین وغیرہ۔اور یا کلمہ تکبیر کے علاوہ دوسرے کلمات مثلاً کلمہ تہلیل، تسبیح، تحمید اور تبارک وغیرہ جیسے کلمات سے جو خالص تعظیمی کلمات ہیں ان سے نماز شروع کرنی مکروہ ہے یا نہیں، تو امام سرخسیؒ نے کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے، اور تحفہ وذخیرہ میں کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ مکروہ ہے کیونکہ اس نے عام مشہور و معمول بہ سنت کو چھوڑ دیا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اولیٰ ہے، لیکن عینیؒ نے کہا ہے کہ قدوریؒ نے بھی مکروہ کہا ہے، اور ہندیہ مین محیط و ظہیریہ سے یہی نقل کیا ہے، اور قاضی خان میں اس کو حسنؒ کی روایت سے امام اعظمؒ کا قول بیان کیا ہے۔

مترجم کا کہنا ہے کہ ذخیرہ کی دلیل کہ اس نے سنت متواتر کو چھوڑ دیا ہے، غور کرنے کے قابل ہے، کیونکہ اس نے لا الہ الا اللہ کہہ کر سنت مشہور اللہ اکبر کہنے کو بالکل چھوڑ کر بھلا نہیں دیا ہے بلکہ اس کی جگہ پر ایسا جملہ استعمال کر لیا ہے جو جائز ہے، پھر اسے مکروہ کہنے کی صورت میں کیا تحریمی ہے، چنانچہ در مختار میں اسے ظاہری دلیل کی بناء پر مکروہ تحریمی کہا ہے لیکن التبیین میں خلاف اولیٰ ثابت کیا ہے، یعنی یہ کہ مکروہ تنزیہی ہے، اور یہی قول اوفق واظہر ہے، واللہ اعلم۔م۔

او غیرہ...... الخ یا مذکورہ بالا ناموں کے علاوہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے کسی اور نام سے شروع کیا تو امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کے نزدیک صحیح ہے۔ف۔اور اظہر واصح بھی یہی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ہر ایسے نام سے نماز شروع ہو جاتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے

خالص ناموں میں سے ہو مثلاً اللہ الرحمٰن وغیرہ یا ایسے ناموں میں سے ہو جو مشترک نام ہو مثلاً الکریم، الرحیم وغیرہ، کرخیؒ نے یہی ذکر کیا ہے، مرغینانیؒ نے اسی کا فتویٰ دیا ہے، الزاہدی، اور مصنفؒ کا قول اوغیرہ من اسماء اللہ تعالیٰ، عام ہے کہ وہ نام مفرد ہو یعنی فقط اللہ تعالیٰ کا کوئی نام خاص ہو جو صرف اسی کے لئے بولا جاتا ہو یا مشترکہ ہو کہ اس کے علاوہ کسی مخلوق کے لئے بھی بولا جاتا ہو، صرف ایسا نام ہی ذکر کیا اور اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا اور خواہ مبتدا اور خبر دونوں کے ساتھ کہا ہو جیسے الرحیم اعظم یا اللہ اکبر، تو اسی طرح عام کہنے کا تقاضا یہ ہوا کہ اگر صرف اللہ کہا یا صرف الرب بغیر زیادتی کے کہا تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق نماز شروع ہو جائیگی مگر صاحبینؒ کے نزدیک شروع نہ ہوگی۔ الفتح

میں کہتا ہوں کہ مصنفؒ کے کلام کا یہ مطلب نکالنا کہ نام صرف مفرد ہو یا خبر کے ساتھ ہو نماز شروع ہو جاتی ہے، اور ظاہر الروایۃ کے مطابق نہیں ہوتی ہے اور صاحبینؒ اس کے مخالف ہیں، پھر مصنفؒ کہاہے کہ امام اعظمؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہوتی ہے تو قطعی طور سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ معنی مفرد کے مراد نہیں ہیں کیونکہ مفرد تو امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

اب یہ سوال کہ مفرد نام سے نماز شروع ہوتی ہے یا نہیں؟ تو زاہدی نے جائز کو صحیح قرار دیا ہے، لیکن در مختار میں ناجائز ہونے کو قول مختار کہا ہے، اور یہی اقوی ہے۔ لیکن ہندیہ میں ہے کہ اگر کسی نے اللھم کہا تو فقہاء کے نزدیک نماز شروع ہو جائیگی۔ الخلاصہ و قاضی خان اور یہی اصح ہے۔ المحیطین۔ تو شاید اللھم کو اسم جامع تعظیم کے واسطے اور معنی کے اعتبار سے مرکب جملہ قرار دیا گیا ہے، اسی بناء پر محیط السرخسی میں ہے کہ اگر مصلی نے اللھم اغفرلی کہا تو چونکہ یہ خالص تعظیمی کلمہ نہیں ہے بلکہ اس میں بندہ کی اپنی حاجت بھی ملی ہوئی ہے اس لئے اس سے ابتداء صحیح نہ ہوگی، اور محیط میں کہاہے کہ اگر استغفر اللہ یا اعوذ باللہ یا انا للہ یا لاحول ولا قوۃ الا باللہ یا ماشاء اللہ کہا تو نماز شروع نہ ہوگی۔ ھ۔ د۔

پھر کلمہ تعظیم خالص ہونے کے باوجود ایک شرط یہ بھی ہے کہ اس کی مراد بھی تعظیم کی ہو، اسی بناء پر ہندیہ میں ہے کہ اگر کسی نے تعجب کے طور پر سبحان اللہ کہا اور اس میں خلوص تعظیم کا ارادہ نہیں کیا یا تکبیر وغیرہ سے مراد موذن کا جواب دینا ہو تو بھی کافی نہ ہوگی، التاتارخانیہ، اور اگر باسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا تو نماز شروع نہ ہوگی، التبیین، اور اگر اللہ اکبر کہتے ہوئے شروع میں مد کے ساتھ کہا تو بالاتفاق شروع نہ ہوگی۔ التاتارخانیہ بحوالہ الصیر فیہ، اور اگر اللہ اکبر کاف فارسی کے ساتھ کہا تو شروع صحیح ہو جائے گی۔ المحیط۔

پھر تکبیر کہنے میں جو کھڑے ہونے کی بھی شرط ہے وہ فرض نمازوں کے لئے اور وہ قدرت اور اختیار کی صورت میں ہے کیونکہ نوافل میں قدرت کے باوجود بیٹھ کر بھی تکبیر کہنی درست ہے، جیسا کہ محیط السرخسی میں ہے، اور مقتدی کو چاہئے کہ امام کے تحریمہ کے ساتھ ساتھ تحریمہ باندھے، یہ امام اعظمؒ کے مسلک میں ہے مگر صاحبینؒ کے نزدیک امام کے تحریمہ کے بعد اپنا تحریمہ باندھے اور اسی قول پر فتویٰ بھی ہے، المعدن، اور صحیح قول یہ ہے کہ بالاتفاق دونوں طریقے جائز ہیں، اور یہ اختلاف صرف اولیٰ ہونے میں ہے۔ التبیین۔ اگر مقتدی نے امام کے ساتھ اللہ کہا لیکن امام سے پہلے اکبر کہہ دیا تو فقیہ ابو جعفرؒ نے کہاہے کہ اصح یہ ہے کہ بالاتفاق نماز شروع نہ ہوگی، اسی طرح اگر امام کو رکوع میں پایا، پھر اللہ تو قیام کی حالت میں مگر اکبر رکوع کی حالت میں کہا تو اس کی نماز بھی شروع نہ ہوگی، اور اس بات پر اجماع ہے کہ اگر امام کے کہنے سے پہلے مقتدی نے اللہ کہدیا تو اظہر الروایات میں اس کی نماز شروع نہ ہوگی۔ الخلاصہ۔

اگر امام سے پہلے تکبیر کہدی ہو، اس لحاظ سے صحیح قول یہ ہے کہ اگر اقتداء کی نیت کی ہو تو نماز شروع نہ ہوئی اور اقتداء کی نیت نہ ہو تو اس کی ذاتی نماز شروع ہو جائے گی، محیط السرخسی، اس سے پہلے جن کلمات سے تکبیر کا جائز ہونا بیان کیا گیا ہے وہ سب امام اعظم اور محمدؒ کا قول تھا، امام ابو یوسفؒ کا قول اب ذکر کیا جارہا ہے۔

وقال ابویوسف: ان كان يحسن التكبير لم يجز الا قوله الله اكبر، او الله الأكبر، و الله الكبير، وقال

الشافعي: لا يجوز الا بالاولين، وقال مالك لا يجوز الا بالاول، لانه هو المنقول، والاصل فيه التوقيف، والشافعي يقول ادخال الالف واللام ابلغ في الثناء، فقام مقامه، وابويوسف يقول ان افعل وفعيلا في صفات الله تعالىٰ سواء، بخلاف ما اذا كان لا يحسن، لانه لايقدر الا على المعنى.

ترجمہ:-اور امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ اگر وہ تکبیر کو پورے طور پر ادا کر سکتا ہو تو سوائے تین جملے اللہ اکبر یا اللہ الکبیر کے کسی دوسرے جملہ سے جائز نہ ہوگی، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ صرف پہلے دونوں جملوں سے ابتداء صحیح ہوگی اس کے علاوہ کسی اور سے نہیں، اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ صرف پہلے ہی جملے سے نماز شروع ہوگی کسی اور جملے سے نہ ہوگی کیونکہ صرف یہی منقول ہے، اور اصل اس میں سماع پر ہی موقوف ہے، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اس جملہ میں الف اور لام کا داخل کرنا ثناء کے موقع میں بہت زیادہ بلیغ ہے، لہٰذا یہی بات منقول ہونے کے قائم مقام سمجھی جائے گی، اور امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ وزن افعل اور فعیل دونوں اللہ تعالیٰ کے صفات کے موقع میں برابر ہیں، بخلاف اس شخص کے جو زبان سے تکبیر کو اچھی طرح ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور وہ صرف اس کے معنی ادا کر سکتا ہو۔

توضیح:-کن کن الفاظ سے نماز شروع کی جا سکتی ہے؟ اس میں اماموں کا اختلاف اور ان کے دلائل

وقال ابويوسف: ان كان يحسن التكبير لم يجز الا قوله الله اكبر......الخ

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس شخص کے لئے جو تکبیر کو عمدہ طریقہ سے ادا کر سکتا ہو اس کے لئے صرف مذکورہ تین جملوں سے ابتداء صحیح۔ف۔اور اگر اچھی طرح نہ کہہ سکتا ہو تو اللہ کے کسی بھی نام اور تسبیح و تہلیل سے جائز ہے، یہاں مصنفؒ نے ابو یوسفؒ کے قول میں تکبیر کے صرف تین جملے بیان کئے ہیں اور یہی تین بدائع، مفید، اسبیجابی، تحفہ اور ینابیع میں مذکور ہیں، لیکن مبسوط میں ایک چوتھا جملہ اللہ کبیر بھی کہا ہے، اور یہی تحقیق ہے، اور ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق بھی کہا گیا ہے کہ اصح قول یہ ہے کہ اصح یہ ہے کہ اگر تکبیر کہہ سکتا ہو تو اسے چھوڑ کر تسبیح وغیرہ سے ابتداء کرنی مکروہ ہے، اور سرخسیؒ نے کہا ہے کہ اصح یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ع۔

وقال الشافعي: لا يجوز الا بالاولين......الخ

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ مذکورہ بالا چار میں سے صرف پہلے دو سے جائز ہے۔ف۔یعنی امام ابو یوسفؒ کے چار میں سے صرف پہلے دو اللہ اکبر یا اللہ الاکبر سے جائز ہے، باقی کسی سے جائز نہیں اور شوافعؒ کے نزدیک یہی قول اصح ہے، اور اگر اس طرح کہا اللہ اجل یا اعظم یا اللہ اکبر کبیراً یا **الله اكبر من كل شئى** تو امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، اسی طرح اس قول اصح کے مطابق اللہ الجلیل اکبر بھی جائز ہے، اور اگر یوں کہا **الله الذى لا اله الا هو الملك القدوس الاكبر** تو شوافع کے نزدیک بغیر کسی اختلاف کے جائز نہیں ہے۔ع۔

وقال مالك لا يجوز الا بالاول، لانه هو المنقول، والاصل فيه التوقيف......الخ

اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ صرف اول لفظ یعنی اللہ اکبر سے جائز ہے اور کسی دوسرے سے جائز نہیں ہے۔ف۔اور یہی قول امام احمد و داؤد ظاہریؒ کا بھی ہے۔ع۔کیونکہ یہی منقول ہے اور اس میں اصل توقیف ہے۔ف۔یعنی منقول میں واقف کرانے سے معلوم ہونا یہی اصل ہے، اور نقل سے صرف اللہ اکبر کا ہی علم وو قوف ہوا ہے لہٰذا اسی لفظ سے جواز ہوا ہے، اس قول کی تائید کرنے والی طبرانی میں رفاعہ بن رافعؓ کی حدیث ہے کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور اس نے نماز پڑھی۔ آخر تک۔ یہ وہ حدیث ہے کہ جس نے بری طرح نماز پڑھی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کو تعلیم دی، پس اس روایت میں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کسی آدمی کی نماز پوری نہیں ہوتی یہاںتک کہ وہ وضوء کرے اور وضوء کو اپنے مواضع، میں رکھے یعنی جہاں جس طرح دھونا چاہئے

اس طرح دھوئے پھر قبلہ کے سامنے ہو کر کہے اللہ اکبر اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور قرآن میں سے جو چاہے پڑھے پھر کہے اللہ اکبر آخر حدیث تک۔ فع۔

عینیؒ نے جواب دیا ہے کہ اس سے تو نماز کے قبول ہونے کی نفی ہے مگر جواز ثابت ہے کیونکہ اسے نماز تسلیم کیا گیا ہے۔ مع۔
میں کہتا ہوں کہ اس بناء پر تکبیر واجب ہوگی، مزید گفتگو باقی ہے۔ م۔

والشافعي يقول ادخال الالف واللام ابلغ في الثناء، فقام مقامه...... الخ

اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ۔ ف۔ کہ بیشک منقول اللہ اکبر ہی ہے مگر اللہ الاکبر بھی جائز ہے کیونکہ لفظ اکبر کے شروع میں لام تعریف یعنی الف لام لگانے سے مقصود اللہ کی تعریف اور مبالغہ کرنا ہے لہٰذا الاکبر بھی اکبر کے قائم مقام ہوا، اور ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ فعیل اور افعل دونوں وزن اللہ تعالیٰ کی صفات میں برابر ہیں۔

ف۔ یعنی افعل کے وزن پر اسم تفضیل ہے اور فعیل فاعل کے معنی میں ہے اس لئے اکبر اسم تفضیل اور کبیر فعیل کے وزن پر ہونے کی بناء پر معنی ہوں گے کہ اکبر سب سے بڑا اور کبیر بڑا اس طرح اگرچہ فرق ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں افعل سے مراد یہ نہیں ہو سکتی ہے کہ دوسروں میں بھی اگرچہ بڑائی ہے مگر اللہ تعالیٰ میں ان سب سے زیادہ بڑائی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کی صفتوں سے کسی کو کوئی مناسبت ہی نہیں ہے، اور زیادتی اور کسی کا اعتبار مخلوقات میں ایک دوسرے کے درمیان ہوتا ہے جیسے زید افضل ہے یعنی بکر سے اور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے جو صفت ہے اس سے یہ مراد ہوتی ہے کہ اس میں یہ صفت ایسی ہے کہ کسی کو اس صفت میں نہ شرکت ہے نہ مشابہت ہے پس جبکہ کسی بھی چیز کو اس سے کچھ مناسبت نہ ہوئی تو اس کی شان میں افعل التفضیل کے صیغہ سے بھی یہی مراد ہوگی کہ اس میں یہ صفت ہے ایسی خاص صفت ہے کہ کسی مخلوق کو اس میں اس کے ساتھ کچھ بھی مناسبت ہی نہیں ہے، اور یہی معنی جب فعیل یعنی کبیر علیم و خبیر وغیرہ کہے تو اس کی مراد ہو جاتی ہے اس کی ایسی بزرگی و علم و آگاہی و واقفیت ہے کہ کسی مخلوق کو اس کی اس صفت میں اس کے ساتھ کچھ نسبت ہی نہیں ہے لہٰذا دونوں الفاظ کے معنی اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں برابر ٹھہرے۔

اگر یہ کہا جائے کہ عالم و کریم و عظیم و حکیم وغیرہ الفاظ تو مشترک ہیں کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی شان میں بھی بولتے ہیں اور مخلوقات کے حق میں بھی بولتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ مشترک ہونے سے صرف یہ مراد ہے کہ یہ لفظ مشترک ہے اور اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ اس کے معنی میں بھی کچھ شرکت ہے، یہانتک کہ اگر کوئی ان میں اللہ اور اس کی مخلوق کے درمیان معنی میں شرکت کا خیال کرے گا تو وہ کافر ہوگا، اس بناء پر جب کسی مخلوق کو علیم کہا جاتا ہے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ ہے وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ تو اس میں وہ علم مراد ہوتا ہے جو ہمارے درمیان مشہور ہے اور ہے، اور جب اللہ کی شان میں علیم کہتے ہیں تو یہ اس کی ایک صفت خاصہ ہے کہ اس صفت میں اس کے ساتھ کسی کو کوئی مشابہت نہیں ہے، اور یہی مکمل تحقیق ہے جس پر سارے اولیاء سلف وخلف قائم ہیں۔

وابويوسف يقول ان افعل وفعيلا في صفات الله تعالىٰ سواء......الخ

اور امام ابو یوسفؒ کی مراد اس جملہ سے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتیں یکساں ہیں یہ ہے کہ ان میں کمی و بیشی نہیں ہے اور نہ کسی مخلوق سے کوئی مشابہت ہے، اس لئے اس کی شان میں اکبر سے جو صفت مراد ہے وہی کبیر سے بھی مراد ہے، اس میں کوئی فرق و کمی بیشی نہیں ہے، البتہ مخلوق سے متعلق یوں کہا جائے کہ زید کی تین اولاد میں سے عمرو اکبر ہے تو اس کی مراد یہ ہوگی کہ وہ اس صفت میں اپنے تمام بھائیوں میں سب سے بڑا ہے حالانکہ اپنے باپ زید کی بہ نسبت وہ اکبر نہیں بلکہ اصغر ہے، اور یہ بات جب معلوم ہوگئی تو اللہ تعالیٰ کی شان میں اکبر و کبیر دونوں صفتیں برابر ہوئیں، لہٰذا دونوں کا استعمال جائز ہوا۔

بخلاف ما اذا كان لا يحسن، لانه لا يقدر الا على المعنى...... الخ

برخلاف اس شخص کے جو اسے اچھی طرح ادانہ کر سکتا ہو۔ف۔یعنی اللہ اکبریا اللہ الا کبریا اللہ کبیر یا اللہ الکبیر نہیں کہہ سکتا ہو تو وہ اس لفظ کے کہنے پر قادر نہ ہوا اس لئے اس کے حق میں صرف معنی کا اعتبار ہوگا، کیونکہ اس کو معنی کے سوالفظ کی ادائیگی پر قدرت نہیں ہے۔ف۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے بندے پر صرف اس کی قدرت کے مطابق ہی کسی وجوب کا حکم دیا ہے، لہذا ایسے بندے پر یہی لازم ہوا کہ تعظیم کے معنی ادا کرے اس سے جس طرح بھی ممکن ہو، اس لئے اس حالت میں امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق تسبیح و تہلیل وغیرہ جن کا ذکر ہوا سب جائز ہو جائے گی، اور جب تک قدرت ہو اس وقت تک کبیر کے ماسوا دوسرا کوئی لفظ جائز نہ ہوگا، اور طرفینؒ کے نزدیک قدرت کے باوجود بھی جائز ہیں اگرچہ کراہت ہی ہو۔

ولهما ان التكبير هو التعظيم لغة، وهو حاصل، فان افتتح الصلوة بالفارسية، او قرأ فيها بالفارسية، اوذبح وسمى بالفارسية، وهو يحسن العربية اجزأه عند أبى حنيفةؒ، وقالا لا يجزيه الا فى الذبيحة، وان لم يحسن العربية اجزأه.

ترجمہ:-اور ان دونوں (طرفین) کی دلیل یہ ہے کہ تکبیر کے لغوی معنی تعظیم کے ہیں اور وہ حاصل ہے، اس لئے اگر فارسی زبان میں نماز شروع کی یا فارسی میں قراءت کی یا ذبح کرتے وقت فارسی میں بسم اللہ کہی، جبکہ وہ عربی میں بھی اچھی طرح کہہ سکتا ہو تب بھی ابوحنیفہؒ کے نزدیک یہ سب چیزیں جائز ہوں گی، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک فارسی میں کہنا صرف ذبح کے موقع میں جائز ہوگا البتہ عربی میں اچھی طرح نہ کہہ سکتا ہو تو صحیح ہوگا۔

توضیح:-فارسی میں نماز شروع کی یا قراءت کی، یا ذبح کے وقت فارسی میں بسم اللہ کا ترجمہ ادا کیا

ولهما ان التكبير هو التعظيم لغة، وهو حاصل......الخ

اور ان دونوں کی دلیل یہ ہے کہ تکبیر لغت میں فقط تعظیم ہے۔ف۔اسی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ یعنی جب مصری عورتوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو اس کی تکبیر کی یعنی اس کی تعظیم کی اور بہت بزرگ جانا، اسی طرح دوسرے موقع میں فرمان باری تعالیٰ ہے، وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ یعنی اپنے رب کی خالص تعظیم کرو، وھو حاصل اور یہ تعظیم حاصل ہے۔ف۔یعنی ہر ایسے لفظ سے جو تعظیم کا فائدہ دیتا ہو یہ معنی حاصل ہیں اس لئے اس سے شروع کرنا جائز ہے، پھر نفس تکبیر کا ہونا اور پایا جانا ہی واجب نہیں ہے کہ اللہ کے بعد صرف اکبر ہی اس کی صفت لازمی ضروری ہو بلکہ دراصل واجب تو اللہ تعالیٰ کی تعظیم ہے جو تمام جسم وجان وزبان سے ہو جائے۔

اس سے ہم نے یہ بات جان لی کہ ایسے تمام الفاظ جو ثناء وعظمت کے لئے مفید ہوں ان سے نماز شروع ہو گی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى یعنی اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کیا پھر نماز پڑھ لی، اور نام الٰہی کو ذکر کرنے کے لئے اللہ اکبر کہنا ضروری نہیں ہے بلکہ یوں بھی کہا جا سکتا ہے اللہ اکبریا الرحمٰن اکبریا الرب اعظم کیونکہ ان سبھوں میں یہ بات درست پائی جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا ہے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا، یعنی اللہ تعالیٰ کے واسطے اسماء حسنیٰ ہیں اس لئے ان میں سے کوئی بھی نام لے کر پکارو، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الہ الا اللہ، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال کروں اس وقت تک کہ وہ کہیں لا الہ الا اللہ، مکمل حدیث صحیح حدیث کی کتابوں (صحاح) میں موجود ہے۔

اب اگر کسی نے لا الہ الا الرحمن، کہا تو وہ مسلمان ہے، جب اصل ایمان میں کسی بھی نام کو لینا صحیح ہے تو فروع نماز وغیرہ میں دوسرا نام لینا کیوں صحیح نہ ہوگا، اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ کہ ابوالعالیہؒ سے پوچھا گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کس چیز سے نماز شروع کرتے تھے تو فرمایا کہ توحید و تہلیل و تسبیح سے، شعبیؒ سے ایک روایت بیان کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے

جس نام سے بھی تم نماز شروع کرو تمہارے لئے کافی ہے، اس کی طرح ابراہیم نخعیؒ سے بھی روایت کی گئی ہے، اور ابراہیم تیمیؒ سے مروی ہے کہ تہلیل یا تسبیح یا تکبیر جس کسی سے نماز کا افتتاح کیا جائے کافی ہے اور حکمؒ نے اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ ان میں سے کسی سے بھی تکبیر کی بجائے افتتاح کیا جائے کافی ہے، مع، لیکن یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ان باتوں سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ فی نفسہا ان الفاظ سے افتتاح کر لینا جائز ہے، جیسا کہ فرمان خداوندی ﴿فَاقْرَؤُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ سے مطلق قراءت قرآن کا جائز ہونا معلوم ہوتا ہے، اس کے باوجود سورہ فاتحہ کا پڑھنا واجب ہے، اسی لئے کافی میں ہے کہ نص سے اللہ اکبر ہی کہنے کی کوئی خصوصیت نہیں معلوم ہوتی ہے، البتہ حدیث سے یہی ثابت ہے، اسی لئے اس پر عمل واجب ہے، یہانتک کہ ایسے شخص کے لئے اس کا ترک مکروہ ہے جو صحیح طریقہ سے عربی میں کہہ سکتا ہو جیسے کہ قراءۃ کے ساتھ سورہ فاتحہ اور رکوع و سجود کے ساتھ تعدیل کا حکم ہے، الفتح کا خلاصہ ختم ہوا۔

اس کلام سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ چونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ تکبیر سے ہی افتتاح کیا ہے اس کی مخالفت کبھی نہیں کی لہذا اسی سے افتتاح واجب ہے، تو اسی پر اعتماد کرنا لائق ہے۔ الفتح۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ لفظ مخصوص سے تکبیر کرنا واجب ہے، اور اسے چھوڑنا مکروہ تحریمی ہے۔ م۔

اب پانچویں بحث یہ کرنی ہے کہ کس زبان میں تکبیر جائز ہے تو ابو یوسفؒ کا قول اس بارے میں ظاہر ہے کہ وہ تکبیر کی تخصیص فرماتے ہیں، اور مصنفؒ نے فرمایا فان افتتح الخ یعنی اگر فارسی زبان میں نماز شروع کی۔ ف۔ مثلاً یوں کہا خدائے بزرگ، یا فارسی ہی میں قراءت قرآن کی۔ ف۔ یعنی فارسی زبان میں لفظاً لفظاً اور حرفاً حرفاً مثلاً ضنک کا ترجمہ تنگ اور جزاء کا ترجمہ پاداش و آفرین وغیرہ کیا، او ذبح الخ یا جانور ذبح کرتے ہوئے فارسی میں ترجمہ۔ ف۔ مثلاً بنام خدائے بزرگ کیا۔

وهو يحسن العربية اجزأه عند أبى حنيفة...... الخ

حالانکہ وہ شخص عربی میں کہہ سکتا تھا۔ ف۔ یعنی وہ عربی میں تکبیر و قراءت اور تسمیہ سے عاجز نہیں تھا، تو کیا اس طرح کرنے سے ایسی نماز صحیح ہو گی یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے، یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے البتہ ذبح کرنے کے لئے فارسی اور اس کے علاوہ ہر زبان میں بالاتفاق جائز ہے۔ م۔ یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ عربی زبان میں کہہ سکتا ہو، کیونکہ اگر عربی زبان میں ادا نہیں کر سکتا ہو تو بالاتفاق فارسی ہی میں مذکورہ ساری باتیں جائز ہوں گی۔ ف۔ اب ایک سوال یہ باقی رہ گیا کہ امام ابو حنیفہؒ کیا اسی قول پر آخر تک قائم تھے جو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے یا کسی وقت اس سے رجوع بھی کر لیا تھا، تو عنقریب اس کی بحث آئے گی۔

اما الكلام فى الافتتاح فمحمد مع ابى حنيفةؒ فى العربية، ومع ابى يوسف فى الفارسية، لان لغة العرب لها من المزية ماليس لغيرها، واما الكلام فى القراءة فوجه قولهما ان القران اسم لمنظوم عربى كما نطق به النص، الا ان عند العجز يكتفى بالمعنى كالايماء، بخلاف التسمية لان الذكر يحصل بكل لسان.

ترجمہ:- تو نماز شروع کرنے کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو یہ ہے کہ زبان عربی میں کہنے کی صورت میں امام محمدؒ امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ ہیں اور فارسی زبان سے کہنے میں وہ یعنی امام محمد امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہیں، کیونکہ زبان عربی کو ایک خاص فضیلت حاصل ہے جو کسی اور زبان کو حاصل نہیں ہے، اور تلاوت قرآن کے سلسلہ میں گفتگو اس طرح ہے کہ صاحبین کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نام ہے عربی کلام کا، جیسا کہ خود قرآن نے اس کو واضح الفاظ (نص) میں بیان کیا ہے، البتہ عاجزی اور مجبوری کی صورت میں صرف معنی پر ہی اکتفاء کر لیا جا سکتا ہے جیسا کہ اشارہ بخلاف بسم اللہ کہنے کے کیونکہ ذکر تو ہر زبان میں حاصل ہو جاتا ہے۔

توضیح:- قراءت وغیرہ فارسی زبان میں کہنے کے سلسلہ میں ائمہ کے دلائل

اما الکلام فی الافتتاح فمحمد مع ابی حنیفۃؒ فی العربیۃ.....الخ

افتتاح یعنی تکبیر تحریمہ کے بارے میں تفصیلی گفتگو اس طرح سے ہوتی ہے کہ امام محمدؒ عربی زبان سے ادا کرنے میں امام اعظمؒ کے شریک ہیں اس طرح سے کہ امام محمدؒ کے نزدیک بھی ہر تعظیمی کلمہ کے ساتھ عربی میں افتتاح جائز ہے، لیکن فارسی زبان سے ادا کرنے میں وہ امام ابو یوسفؒ کے ساتھ ہیں، یہانتک کہ عربی کے سوا کسی بھی دوسری زبان میں تکبیر کہنی امام محمدؒ کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، کیونکہ عربی زبان کو جو خصوصی فضیلت حاصل ہے وہ کسی دوسری زبان کو نہیں ہے۔ ف۔ محیط میں ہے کہ قرآن کے نظم و ترتیب کے مطابق اس کو فارسی میں پڑھنا جنبی اور حائضہ کو جائز نہیں ہے، امام ابو بکر محمد بن الفضلؒ نے فرمایا ہے کہ ائمہ کا یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ کوئی شخص بے اختیار طور پر عربی کے ماسوا کسی بھی دوسری زبان میں پڑھ گیا ہو تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، اور اگر کوئی شخص عربی نظم والفاظ کو چھوڑ کر فارسی وغیرہ میں قراءت کرے تو وہ زندیق و بددین ہے جو قتل کا مستحق ہے یا دیوانہ ہے جس کے علاج کی ضرورت ہے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تاویل بہت عمدہ ہے اور فخر الاسلامؒ نے کہا ہے کہ وہ شخص اگر اپنے دین کے معاملات میں متہم نہ بھی ہو تو بھی اس کا یہی حکم ہوگا، اس اختلافی بحث کا ماحصل یہ ہوا کہ اگر ایک شخص نماز میں تلاوت قرآن کر رہا ہو اور بے اختیار اس کی زبان پر قرآنی الفاظ و ترتیب کے مطابق فارسی زبان کے الفاظ جاری ہو گئے تو امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد نہ ہوگی بشرطیکہ یہ شخص ایک سچا مسلمان معلوم ہوتا ہو اور اس کے متعلق نفاق وغیرہ کی تہمت نہ ہو، مگر صاحبینؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ م۔

تمام ائمہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ ایمان لانے کے لئے توحید و رسالت وغیرہ کا اقرار اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لینا اور سلام اور جواب سلام پر زبان میں جائز ہے، جیسا کہ الینابیع میں ہے، اسی طرح حج کے احرام وغیرہ کا تلبیہ اور آمین کا بھی حکم ہے۔ ت۔ چھینکنے والے کا جواب جس زبان میں دیا جائے بلا تامل جائز ہے۔ م۔

واضح ہو کہ عینیؒ نے روضہ سے نقل کیا ہے کہ اگر توریت، انجیل اور زبور میں سے تسبیح و تحمید و تہلیل کی جگہوں کو پڑھا تو بھی جائز ہے ورنہ جائز نہیں ہے، در مختار میں اسی قول کو ذکر کیا ہے، لیکن شافعیہ کے قول کے مطابق یہ عاجزی کے وقت کا حکم ہے، اور ہمارے نزدیک صحیح قول وہی ہے جو عینیؒ نے نقل کیا ہے کہ توریت و انجیل و زبور سے پڑھنا مطلقاً جائز نہیں ہے خواہ عربی میں پڑھ سکتا ہو یا نہیں کیونکہ وہ کتابیں قرآن نہیں ہیں، امام محمدؒ، نے بھی اسی قسم کی تعلیل بیان کی ہے، اور یہی صحیح ہے کیونکہ ہمارے علماء اصول اس بات پر متفق ہیں کہ قول اصح کے مطابق قرآن نظم اور معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے، اور وہی قرآن ہے جو ہمارے رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا ہے، اس بناء پر اب کسی دوسری کتاب سے پڑھنا جائز نہیں رہا، علاوہ ازیں چونکہ ان کتابوں میں ردوبدل اور تحریف بھی کافی ہو چکی ہے اس لئے اب ان میں سے کسی پر اعتماد باقی نہیں رہا، لہٰذا کسی طرح بھی دوسری کتابوں کا کوئی حصہ پڑھنا جائز نہیں ہے۔ م۔

کافی میں ہے کہ وہ قراءتیں جو متواتر نہیں بلکہ شاذ ہیں ان کو بھی نماز میں پڑھنے سے نماز فاسد نہ ہوگی، فع کیونکہ ان کے قرآن ہونے میں شک ہے اور شک کی وجہ سے فساد نہیں ہوتا ہے، النہر، اور چونکہ وہ قراءت بے اعتبار ہوئی اس لئے علاوہ دوسری قراءت کرنی ہوگی۔ الفتح۔

اور اگر ایسی قراءت پڑھی جو موجودہ عام قرآن پاک میں نہیں ہے جیسے قراءۃ ابن مسعودؓ یا قراءۃ ابی بن کعبؓ تو قول اصح یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوگی، لیکن یہ قراءت شمار میں نہ آئے گی۔ ع۔ یعنی اس کے علاوہ اور بھی قراءت ہونی چاہئے۔ الفتح۔

قراءۃ سبعہ بلکہ عشرہ (مشہور سات قاریوں والی یا دس قاریوں والی) تو مشہور اور متواتر ہیں ان کا پڑھنا بالاتفاق جائز ہے، اور ان کے علاوہ جو دوسری قراءتیں ہیں وہ قراءۃ شاذہ ہیں، اور بالاتفاق ان پر کوئی حکم جاری نہیں ہوتا ہے، حاصل کلام یہ ہے کہ اگر امام اعظمؒ سے ان کے اپنے قول سے رجوع کرنا ثابت نہ ہو تو ان کے قول کے مطابق فارسی کی قراءت اور دوسرے اذکار میں یہ تفصیل ہے جو ذکر کی گئی، لیکن تحقیق یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا تھا۔

واما الکلام فی القراءۃ الخ اور قراءت کے سلسلہ میں تفصیلی گفتگو یہ ہے کہ صاحبینؒ کے قول کی دلیل یہ ہے کہ قرآن نام ہے عربی کلام کا جیسا کہ خود قرآن نے اس کی تصریح کی ہے۔ف۔ یعنی فرمان باری تعالیٰ قرآنا عربیا غیر ذی عوج، اور اسی طرح کی دوسری آیتیں بھی ہیں، جن میں سب سے زیادہ تصریح ہے یہ وہ آیت پاک ہے ﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾، اس میں قرآن کو خلاف اعجمی بیان فرمایا ہے، نیز نماز میں فرض قرآن کی قراءت ہے اور قرآن عربی صحیح ہے لہٰذا عربی ہی کی قراءت فرض ہوئی ہے۔

الا ان عند العجز یکتفی بالمعنی کالایماء، بخلاف التسمیة لان الذکر یحصل بکل لسان......الخ

البتہ مجبوری اور عاجزی کے وقت بخلاف جانور کے ذبح کرنے میں اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے کے، کہ اگرچہ قدرت ہو پھر بھی ہر زبان میں ذکر ہو سکتا ہے۔ف۔ خواہ عربی جانتا ہو یا نہیں، اسی طرح حاکموں کے دربار میں ہر زبان میں گواہی دی جا سکتی ہے، آپس کے وہ معاملات جو شرعی قسم کے ہوں اسی طرح قرآن پاک میں شوہر اور اس کی بیوی کے درمیان جو لعان کا معاملہ کبھی سامنے آجاتا ہے وہ بھی غیر عربی میں کیا جا سکتا ہے۔ع۔

ولابی حنیفةؒ قوله تعالی ﴿وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ ولم یکن فیها بهذه اللغة، ولهٰذا یجوز عند العجز، الا انه یصیر مسیأ لمخالفة السنة المتوارثة، ویجوز بای لسان کان سوی الفارسیة هو الصحیح، لما تلونا، والمعنی لایختلف باختلاف اللغات، والخلاف فی الاعتداد، ولاخلاف فی انه لافساد، ویروی رجوعه فی اصل المسئلة الی قولهما وعلیه الاعتماد، والخطبة والتشهد علی هذا الاختلاف، وفی الاذان یعتبر التعارف.

ترجمہ:۔اور ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ قول خداوندی ہے وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ یعنی یہ قرآن اگلی کتابوں میں موجود تھا، حالانکہ یہ مسلم ہے کہ ان کتابوں میں یہ عربی لغت نہ تھی، اسی لئے مجبوری کے وقت میں بالاتفاق جائز ہے، مگر یہ کہ ایسا کرنے سے سنت جاریہ کی مخالفت کی وجہ سے مکروہ تحریمی سے کم برا کرنے والا ہوگا، اور فارسی زبان کے سوا جس زبان میں بھی ہو تو جائز ہے، یہی صحیح ہے اس آیت پاک کی وجہ سے جو ہم نے تلاوت کی، اور زبان کے بدل جانے سے معنی نہیں بدلا کرتے ہیں، ان ائمہ کرام کے آپس کا اختلاف اس نماز کے شمار میں آنے کے بارے میں ہے کیونکہ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف ان میں نہیں ہے کہ اس سے فساد نہیں ہوگا، اور یہ روایت بھی کی گئی ہے کہ امام اعظمؒ نے اصل مسئلہ میں اپنے دونوں شاگردوں (صاحبین) کے قول کی طرف رجوع کر لیا تھا، اور اسی پر اعتماد ہے، اور خطبہ دینے اور التحیات پڑھنے کے معاملہ میں اسی قسم کا اختلاف ہے، اور اذان کے بارے میں تعارف کا اعتبار کیا جائے گا۔

توضیح:۔خطبہ وتشہد واذان عربی کے سوا دوسری زبان میں دینا، فارسی میں قرآن پڑھنا

ولابی حنیفةؒ قوله تعالی ﴿وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ ولم یکن فیها بهذه اللغة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، قرآن پاک اگلی کتابوں میں الفاظ کے اعتبار سے نہ تھا لہٰذا بلا شبہ ان میں معنی کے اعتبار سے تھا یعنی مفہوم سب کا ایک ہی تھا، البتہ یہ قرآن نام ہے نظم اور معنی دونوں کا، اور اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ امام اعظمؒ نے صاحبین کی طرف رجوع کر لیا تھا، الفتح، پھر امام اعظمؒ کے فرمان کے مطابق کیا فارسی ہی کی خصوصیت ہے جواب یہ ہے کہ خصوصیت نہیں۔

ویجوز بای لسان کان سوی الفارسیة هو الصحیح، لما تلونا، والمعنی لایختلف باختلاف اللغات......الخ

اور ہر زبان خواہ وہ کوئی بھی ہو جائز ہے سوائے فارسی کے، اور یہی قول صحیح اس دلیل آیت کی بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کردی ہے۔ف۔اس سے مراد یہ آیت پاک ﴿وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ﴾ ہے۔ والمعنی لایختلف اور معنی مختلف نہیں ہوتے ہیں اگرچہ الفاظ بدلے ہوئے ہوں۔ف۔اس بناء پر ترکی ہندی وغیرہ ہر زبان میں جائز ہے۔ع۔ حسامیؒ وغیرہ نے یہی ذکر کیا ہے، اور محققین بھی اسی کے قائل ہیں، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ یہی صحیح ہے۔

والخلاف فی الاعتداد، ولاخلاف فی انه لافساد......الخ

اور اختلاف تو صرف اس کے شمار میں آنے (اہمیت اور مرتبے) میں ہے کیونکہ نماز کے اندر فساد نہ آنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ف۔ یعنی امام صاحب اور صاحبین کے درمیان غیر زبان میں قراءت کرنے کے سلسلہ میں جواز و عدم جواز کا جو اختلاف ذکر کیا گیا ہے یہ اختلاف اس بارے میں ہے کہ غیر زبان میں قراءت معتبر ہوگی یا نہیں حتی کہ امام صاحبؒ کے نزدیک فرض قراءۃ ادا ہو جائے گا، البتہ برا ہوگا، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک فرض ادا نہ ہوگا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ غیر زبان میں قراءت سے نماز فاسد نہ ہوگی، ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ نجم الدین نسفیؒ اور قاضی خان نے لکھا ہے کہ صاحبین کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی۔

ویروی رجوعه فی اصل المسئلة الی قولهما، وعلیه الاعتماد......الخ

اور شیخ ابو بکر الرازی وغیرہ نے روایت کی ہے کہ امام اعظمؒ نے اصل مسئلہ میں صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کیا ہے اور اسی پر اعتماد ہے۔ف۔ اور اسرار میں ہے کہ میرا بھی قول مختار یہی ہے، اور تحقیق میں ہے کہ عام محققینؒ نے یہی اختیار کیا ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔ ابو المکارم۔ اور یہی اصح ہے۔ المجمع۔ کیونکہ ابو حنیفہؒ کا قول بظاہر قرآن کے مخالف ہے کیونکہ خود نص میں قرآن کا وصف عربی مذکور ہے۔ التلویح۔

والخطبة والتشهد علی هذا الاختلاف......الخ

اور خطبہ اور تشہد میں بھی ایسا ہی اختلاف ہے۔ف۔ امام اعظمؒ کے نزدیک عربی کے علاوہ دوسری زبان میں بھی جائز ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے۔

وفی الاذان یعتبر التعارف......الخ

اور اذان میں تعارف معتبر ہے۔ف۔ اگر فارسی اذان کو سننے والے یہ سمجھیں کہ یہ اذان ہے تو جائز ہے ورنہ نہیں، اس کی روایت حسنؒ نے ابو حنیفہؒ سے کی ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ یہ اذان مطلقاً صحیح نہیں ہے، اور خطبہ کی طرح دعائے قنوت اور نماز کے تمام اذکار میں اختلاف ہے جیسا کہ عینی وغیرہ میں ہے، درمختار میں دعویٰ کیا ہے کہ ہر زبان میں تکبیر کا جواز تاتار خانیہ سے معلوم ہوتا ہے جیسا کہ تلبیہ کہنا جائز ہے، اور یہی اظہر ہے، مگر مکروہ تحریمی ہے، جیسا کہ کافی کے حوالہ سے فتح القدیر سے معلوم ہوا، اور قول معتمد یہ ہے کہ فارسی زبان میں قراءت بالاجماع جائز نہیں ہے، اور اظہر واصح یہ ہے کہ اگر قراءت کرلی تو نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ اگر عربی میں بالکل نہ پڑھ سکتا ہو۔

مسئلہ:۔اگر کوئی شخص فارسی میں مکمل کلام پاک لکھنا چاہے تو اسے منع کیا جائے گا، مگر ایک دو روایت لکھنے میں منع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر قرآن پاک لکھ کر اس کے نیچے ہر حرف کا ترجمہ لکھا تو جائز ہے، جیسا کہ الکافی کے حوالہ سے فتح القدیر میں ہے، اصل کلام تکبیر میں تھا۔

وان افتتح الصلوة باللهم اغفرلی لاتجوز، لانه مشوب بحاجتة، فلم یکن تعظیما خالصا، وان افتتح بقوله اللهم، فقد قیل یجزیه، لان معناه یا الله، وقد قیل لایجزیه، لان معناه یا الله امنا بخیر، فکان سؤالا، قال ویعتمد

بیدہ الیمنی علی الیسری تحت السرۃ، لقولہ علیہ السلام ان من السنۃ وضع الیمین علی الشمال تحت السرۃ.

ترجمہ:- اور اگر اللھم اغفرلی کہہ کر نماز شروع کی تو نماز صحیح نہ ہوگی کیونکہ اس کہنے میں تعظیم کے ساتھ اپنی غرض (مغفرت) بھی ملی ہوئی ہے، اس لئے یہ جملہ خالص تعظیم کا نہ ہوا، اور اگر صرف اللھم کہہ کر نماز شروع کی تو ایک قول میں جائز ہو جائے گی اس لئے یہ لفظ معنی کے اعتبار سے یااللہ کے ہے، اور ایک قول میں جائز نہ ہوگی، اس لئے کہ یہ یااللہ آمنا بخیر کے معنی میں ہے (یعنی یااللہ ہماری بھلائی کا ارادہ کر لے) اس طرح یہ سوال ہو گیا، اور مصنفؒ نے کہا اس کے بعد اپنے داہنے ہاتھ کو اپنے بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھ لے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ سنت میں سے ہے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ کے اوپر ناف کے نیچے رکھنا۔

توضیح:- اللھم اغفرلی سے نماز شروع کرنے کا حکم، نماز میں دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر ناف کے نیچے رکھنا، حدیث سے ثبوت

وان افتتح الصلوۃ باللھم اغفرلی لاتجوز، لانہ مشوب بحاجتۃ، فلم یکن تعظیما خالصا......الخ

اور اگر اللھم اغفرلی سے نماز شروع کی تو جائز نہ ہوگی۔ف۔ جیسا کہ **استغفر اللہ واعوذ باللہ وانا للہ وماشاءاللہ ولاحول ولاقوۃ الا باللہ وبسم اللہ** سے جائز نہیں ہوتی ہے۔ الحیط۔ع۔ف۔ تع غیرہ۔ **لانہ مشوب الخ** کیونکہ اس میں کہنے والے کی حاجت بھی ملی ہوئی ہے اس لئے یہ کلمے خالص تعظیم کے نہ ہوئے۔ف۔ اسی لئے اگر ذبح کے وقت بھی اپنی حاجت کے الفاظ ملا کر کہے تو ذبح صحیح نہ ہوگا۔ت۔ اور اگر صرف اللھم سے نماز شروع کی تو کہا گیا ہے کہ اس سے شروع کرنا صحیح ہے۔ف۔ جیسا کہ یااللہ سے صحیح ہے۔ت۔

وقد قیل لایجزیہ، لانّ معناہ یا اللہ امنا بخیر، فکان سؤالا، قال ویعتمد بیدہ الیمنی......الخ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے صحیح نہیں ہے، کیونکہ اس کے معنی ہیں کہ اے اللہ ہمارے لئے خیر کا قصد کرے، لہٰذا یہ جملہ سوال کا ہوا، ف، اس طرح اس سے خالص تعظیم نہیں پائی گئی، لیکن پہلا قول اصح یعنی جائز ہونے کا ہے، جیسا کہ محیط میں ہے،ع۔ **قال ویعتمد الخ** اور مصنفؒ نے فرمایا کہ رفع یدین اور تکبیر سے فارغ ہونے کے بعد **یعتمد** اعتماد کرے یعنی ید ک وتکیہ کرلے۔ف۔ تاکہ آرام ہو تکبیر سے فارغ ہونے کے فوراً بعد۔ الحیط۔د۔ن۔ھ۔ **بیدہ الیمنی الخ** دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر اس طرح رکھے کہ وہ ناف کے نیچے رہیں۔ف۔ مصنف ہدایہؒ نے لفظ **یعتمد** فرمایا ہے یعنی اعتماد یا ٹیک رکھے اور ہندیہ میں ہے کہ بہت سے مشائخ نے اس بات کو بہتر سمجھا ہے کہ اس سے گرفت بھی ہو اور رکھنا بھی پایا جائے۔ الخلاصہ۔ اور یہی صحیح ہے۔ المصفی۔ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ دائیں ہتھیلی کو بائیں ہتھیلی کی پشت پر رکھے اور دائیں انگوٹھے وکلمہ کی انگلی سے پہونچا پکڑلے۔ الخلاصہ۔ن۔

لقولہ علیہ السلام ان من السنۃ وضع الیمین علی الشمال تحت السرۃ......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ سنت سے ہے ناف کے نیچے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھنا۔ف۔ بندہ مترجم کہتا ہے کہ بظاہر یہ عبارت اس طرح تھی لقول علی ان من السنۃ الخ اس جگہ ناسمجھ کاتبوں نے علی کو حرف جار سمجھا مگر بے ربط جان کر لقولہ علیہ السلام کر دیا، کیونکہ یہ کلام خود ظاہر ہے کہ یہ صحابی کا ہے اس طرح سے کہ یہ بات سنت سے ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کی سنت سے ہے نہ یہ کہ حضور ﷺ نے خود ہی فرمایا ہے، اب حضرت علیؓ سے جو قول مروی ہے اس کا بیان یہ ہے کہ یہ روایت سنن ابی داؤد کے اس نسخہ میں ہے جو ابن داسہؒ کی روایت سے موجود ہے۔ زیلعی۔ اور اسے امام احمد، دار قطنی اور بیہقی نے بھی روایت کیا ہے، نوویؒ نے کہا ہے کہ اس روایت کے ضعیف ہونے پر تمام ائمہ متفق ہیں۔ مفع۔

لیکن مصنفؒ ابن ابی شیبہ میں ابراہیم بن ادہم البلخیؒ جو اولیاء مشائخ میں سے ہیں کے واسطے سے ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا مرفوع حدیث سے ثابت ہے، اور اس کی اسناد میں کوئی کلام نہیں ہے البتہ صرف اتنی سی بات ہے کہ علقمہؒ نے ابن مسعودؓ سے سنا ہے یا نہیں، تاہم اس میں ترمذیؒ کی شہادت کافی ہے کہ سماع ثابت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روایت صحیح ہے، اور حق بات یہ ہے کہ صرف ہاتھ باندھنا ہی مسنون ہے البتہ کہاں اور کس طرح باندھا جائے کہ وہ ناف کے نیچے رہیں یا سینہ پر رہیں تو قول مختار کے مطابق ناف کے نیچے باندھنا ہی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ ترمذیؒ نے قبیصہ بن ہلب عن ابیہؓ روایت کی ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ ہماری امامت فرماتے تو بائیں ہاتھ کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے تھے، اس کے بعد ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور اس پر صحابہ و تابعینؒ اور ان کے بعد کے اہل علم کا عمل ہے، کہ ان کے نزدیک آدمی نماز میں اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے، اور بعض علماء نے کہا ہے کہ دونوں ہاتھوں کو ناف کے اوپر رکھے، اور بعضوں نے کہا ہے کہ ان کو ناف کے نیچے رکھے، ان سب باتوں کی ان کے نزدیک اجازت اور گنجائش ہے، ترجمہ ختم ہوا، اس تفصیل میں ترمذیؒ نے گویا اس بات کی شہادت دی ہے کہ صحابہ و تابعین میں سے اہل العلم کا عمل اس طرح تھا کہ اپنے علم سے وہ لوگ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنے کو دیکھتے تھے۔ م۔

وهو حجة على مالك فى الارسال، وعلى الشافعيؒ فى الوضع على الصدر، ولان الوضع تحت السرة اقرب الى التعظيم، وهو المقصود، ثم الاعتماد سنة القيام عند ابى حنيفة و ابى يوسفؒ حتى لايرسل حالة الثناء، والاصل ان كل قيام فيه ذكر مسنون يعتمد فيه، ومالا فلا، هو الصحيح فيعتمد فى حالة القنوت وصلوة الجنازه ويرسل فى القومة وبين تكبيرات الاعياد.

ترجمہ:- اور یہ حدیث ہماری دلیل ہے امام مالکؒ کے خلاف ارسال یعنی ہاتھ چھوڑ کر کھڑے رہنے میں، اسی طرح امام شافعیؒ کے بھی خلاف دلیل ہے سینے پر ہاتھ باندھنے میں، اور اس لئے بھی کہ ناف کے نیچے ہاتھ باندھنا تعظیم کے بہت زیادہ قریب ہے جبکہ یہی مقصود ہے، پھر اعتماد یعنی ہاتھ کو ہاتھ پر رکھنا یہ کھڑے ہونے کی سنت ہے امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک، یہانتک کہ ثناء کی حالت میں بھی ارسال نہیں کیا جائے گا، اس سلسلہ میں قاعدہ یہ مقرر ہوا ہے کہ ہر وہ قیام جس میں ذکر مسنون ہو اس میں اعتماد کیا جائے اور جس میں ذکر مسنون نہ ہو اس میں اعتماد نہ کیا جائے، یہی مسلک صحیح ہے، اس بناء پر قنوت کی حالت میں اور جنازہ کی نماز میں بھی اعتماد کیا جائے گا اور قومہ میں اور عیدین کی تکبیروں کے درمیان ارسال کیا جائے گا۔

توضیح:- عورتوں کا سینہ پر ہاتھ باندھنا، قنوت میں ہاتھ باندھنا، نماز جنازہ میں، تکبیرات عیدین میں ہاتھ چھوڑنا

وهو حجة على مالك فى الارسال......الخ

امام مالک جو کہ تکبیر کے بعد ہاتھ باندھنے کے قائل نہیں بلکہ اس کو چھوڑ لٹکا کر کھڑے رہنے کے قائل ہیں ان کے اس مسلک کے خلاف احناف کے حق میں مذکورہ اثر ہے جو کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے۔ف۔ کیونکہ امام مالکؒ کا مشہور مذہب یہ ہے کہ ہاتھ چھوڑ دینا چاہئے، مگر ابن المنذرؒ نے مالکؒ سے ہاتھ باندھنا نقل کیا ہے لہٰذا ان کے نزدیک ہاتھ لٹکانا پسندیدہ اور مختار ہے لیکن باندھنا بھی جائز ہے، اور اوزاعیؒ کے نزدیک چھوڑنا اور باندھنا دونوں طریقے برابر ہیں، لیکن عام علماء کے نزدیک باندھنا ہی مختار ہے، ہاتھوں کے باندھنے کی دلیل میں دوسری بھی صحیح مرفوع حدیثیں موجود ہیں، مثلاً بخاری میں حضرت سہل بن سعدؓ کی حدیث اور دار قطنی وغیرہ میں حضرت عباسؓ اور ابن عباسؓ کی حدیث اور ترمذی و ابن ماجہ وغیرہ میں قبیصہ بن ہلبؓ کی حدیث

ہے۔

وعلی الشافعیؒ فی الوضع علی الصدر......الخ

اور اثر مذکور امام شافعیؒ کے مسلک کے خلاف بھی ہماری دلیل ہے سینہ پر ہاتھ باندھنے کے سلسلہ میں۔ف۔کیونکہ اس اثر سے نص صریح کے طور پر مسنون ہونا ثابت ہے جس کی تائید اہل علم صحابہ اور تابعین کرام کی شہادت سے ہوتی ہے، اس کے علاوہ ابن ابی شیبہؒ کی حدیث بھی ہے جس کی اسناد بالکل صحیح ہے اور اس میں کوئی ایسا ضعف نہیں ہے جس کا جواب اور دفاع نہ ہوتا ہو، یہانتک کہ امام احمدؒ نے بھی اس کی روایت کی ہے، ہاں سینہ پر ہاتھ باندھنا بھی ثابت ہے، چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز پڑھی پس آپ نے اپنے دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھے ہوئے سینہ پر رکھا، ابن خزیمہ نے اپنی صحیح میں اس کی روایت کی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ حضرت وائلؓ کی یہ حدیث تو یقینی طور پر صرف ایک نماز اور ایک واقعہ کا اظہار ہے، اور صرف اس قدر ثبوت سے سنت کا ثبوت نہیں ہوتا ہے، جبکہ اثر مذکور میں سنت ہونے کی تصریح موجود ہے، لیکن سینہ پر ہاتھ رکھنے کی حدیث کی اسناد قوی ہے، چنانچہ معمولات مظہریہ میں مذکور ہے کہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ سینہ پر ہاتھ باندھتے اور کہتے کہ اس کی حدیث قوی ہے۔

ولان الوضع تحت السرۃ اقرب الی التعظیم، وھو المقصود...... الخ

اور عقلی دلیل ایک یہ بھی ہے کہ ہاتھوں کو ناف کے نیچے رکھنے میں تعظیم کی زیادتی کا اظہار ہے، اور اس موقع میں تعظیم ہی مقصود ہے۔ف۔بالاتفاق عورتوں کو ان کی چھاتیوں یا سینہ پر ہاتھ باندھنا چاہئے، جیسا کہ منیہ میں ہے۔ھ۔ت وغیرہ۔اور یہی حکم خنثیٰ مشکل کا بھی ہے۔ف۔خلاصہ یہ ہے کہ مذکورہ دونوں طریقے ہی ثابت ہیں اور دونوں طریقوں پر صحابہ اور تابعین کرام کے زمانہ میں عمل ثابت ہے، اس بناء پر جس نے جس عمل سے زیادہ تعظیم سمجھی اسی پر عمل کیا اور اسے ترجیح دی ہے اور اب بھی جس طریقہ میں زیادہ تعظیم سمجھے اسی پر عمل کرے، البتہ ائمہ احناف سے ان کا مختار اور پسندیدہ مسلک ناف کے نیچے ہی ہاتھوں کا باندھنا ثابت ہوا ہے، لہٰذا جہاں آدمی چاہے اپنا ہاتھ رکھے وہ مختار ہے۔

لیکن اصل سنت وہی طریقہ ہے جس کا ذکر ہوا یعنی زیر ناف باندھنا، اور مصنف ہدایہؒ کے کلام سے بھی اسی بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے، چنانچہ اس کی عبارت یہ ہے **ثم الاعتماد الخ** کہ ہاتھون کے باندھنے کا جو طریقہ ذکر کیا گیا ہے وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک کھڑے ہونے کی سنت ہے، اسی لئے ثناء پڑھنے کی حالت میں بھی ہاتھوں کو چھوڑنا چاہئے۔ف۔اور امام محمدؒ کے نزدیک یہ سنت قراءت کی ہے (یعنی قراءت کے وقت ہاتھ باندھنا سنت ہے) اس لئے قراءت سے پہلے ثناء پڑھتے وقت ہاتھ چھوڑے رہنا چاہئے۔

والاصل ان کل قیام فیه ذکر مسنون یعتمد فیه، ومالا فلا......الخ

اس ہاتھ باندھنے میں اصل یہ ہے کہ ہر قیام۔ف۔خواہ حقیقۃً ہو جیسے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا یا حکماً ہو جیسے مجبوری کی وجہ سے بیٹھ کر پڑھنے والا، یا نفل نماز پڑھنے والا جو بیٹھ کر پڑھ رہا ہو، کہ یہ سب بیٹھنے کی صورت میں بھی کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے حکم میں ہیں، لہٰذا ایسا جو بھی قیام ہو **فیه ذکر الخ** جس میں کوئی ذکر مسنون ہو۔ف۔اور اس قیام کو قرار بھی ہو (کہ کچھ دیر تک کھڑا رہنا پڑے) ت۔تو ایسے قیام میں ہاتھ باندھنا مسنون ہے اور جس قیام میں ایسی صفت نہیں پائی جاتی ہو اس میں ہاتھ باندھنا مسنون نہیں **ھو الصحیح الخ** یہی قول صحیح ہے۔ف۔شمس الائمہ حلوائیؒ نے یہی بیان کیا ہے۔

فیعتمد فی حالة القنوت وصلوۃ الجنازہ ویرسل فی القومة وبین تکبیرات الاعیاد......الخ

لہٰذا قنوت پڑھنے کی حالت میں ہاتھ باندھے رہنا چاہئے۔ف۔کیونکہ یہ قیام ہے اور اس میں قرار بھی، اور اس میں دعاء قنوت ذکر مسنون بھی ہے، لیکن اگر کسی کو قنوت نہ آتی ہو تو صرف اللھم اغفرلی ہی کہلے تو ایسی صورت میں چونکہ دیر تک کھڑا

ہونا نہیں ہوگا یا قرار نہ ہوگا اس لئے اب ہاتھ بھی چھوڑے باندھنے کی ضرورت نہ ہوگی۔م۔ وصلوة الجنازة...... الخ اور جنازہ میں ہاتھ باندھ لے۔ف۔ یعنی چاروں تکبیروں میں ہاتھ باندھے رکھے، لیکن قومہ یعنی رکوع سے اٹھنے کے بعد ہاتھ چھوڑدے۔ف۔ یعنی رکوع سے سر اٹھانے میں اگرچہ تھوڑی سی تسبیح ہے مگر قرار نہیں ہے اس لئے ہاتھ چھوڑے رکھے، اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ صلوۃ التسبیح کی ہر نقل و حرکت میں تسبیحات دیر تک پڑھی جاتی ہیں تو کیا ہاتھ باندھ لئے جائیں، جواب، چونکہ اصول کے مطابق قرار پالیا گیا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ ہاتھ باندھ لئے جائیں۔

ويرسل في القومة وبين تكبيرات الاعياد......الخ

اور عید کی تکبیروں کے درمیان بھی ہاتھ چھوڑے رکھے۔ف۔ یعنی چھ زائد تکبیروں کے کہتے وقت ہر دو تکبیر کے درمیان ہاتھ چھوڑدے، کیونکہ ان کے درمیان ذکر مسنون نہیں ہے، لیکن اگر ذکر تو نہ ہو مگر قیام طویل ہو تو بھی باندھے جائیں، السراج، د، اس بیان سے صلوۃ التسبیح کے قومہ میں ہاتھ باندھنے کی تائید ہوتی ہے، اور جمعہ کے خطبہ کے وقت ہاتھ باندھنے کی دلیل میں نہ کوئی حدیث موجود ہے اور نہ کوئی اثر ہے، اگرچہ طحاویؒ نے داخل کیا ہے، الحاصل ہاتھ اٹھاکر تکبیر کہہ کر ہاتھ باندھ لے۔

ثم يقول سبحانك اللهم وبحمدك الى اخره، وعن ابى يوسف انه يضم اليه قوله انى وجهت وجهى الى اخره، لرواية على ان النبى عليه السلام كان يقول ذلك.

ترجمہ:- پھر کہے **سبحانك اللهم وبحمدك** آخر تک اور ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ اس کے ساتھ **انى وجهت وجهى** آخر تک کو بھی ملالے، حضرت علیؓ کی اس روایت کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ ایسا ہی کہا کرتے تھے۔

توضیح:- بعد تکبیر تحریمہ سبحانک اللھم پڑھنا، انی وجہت وجہی پڑھنا

ثم يقول سبحانك اللهم وبحمدك الى اخره......الخ

ہاتھ باندھنے کے بعد یہ مکمل دعا یا ثنا پڑھے **سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك**، اور بعض روایات میں...... یوں بھی ہے **وتعالى جدك وجل ثناء ك ولا اله غيرك**، لیکن جل ثناءک کا جملہ نہ اصل میں ہے اور نہ نوادر میں ہے۔ الحیط۔ لہٰذا اس جملہ کو فرائض میں نہیں پڑھنا چاہئے۔ھ۔ لیکن امام محمدؒ نے اپنی کتاب الجمع علی اہل المدینۃ میں جل ثناءک کا جملہ بڑھایا ہے۔ع۔ اسی کا نام ثنا ہے، یہ ثنا ہر ایک نمازی پڑھے خواہ وہ امام ہو یا مقتدی ہو یا مفرد ہو، جیسا کہ التاتارخانیہ میں ہے، لیکن جب امام قراءت کرنا شروع کردے تو پھر مقتدی خاموش رہے کچھ نہ پڑھے۔ت۔ اکثر بڑے علمائے کرام کا یہی قول ہے، جن میں سے چند کے نام یہ ہیں حضرت ابو بکر الصدیقؓ و عمرؓ، ابن مسعود، نخعی اور احمدؒ وغیرہم رحمہم اللہ اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ تابعین وغیرہم میں سے اہل علم کا اسی پر عمل ہے۔ع۔

وعن ابى يوسف انه يضم اليه قوله انى وجهت وجهى الى اخره......الخ

ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ مصلی اس ثناء کے ساتھ یہ دعاء بھی ملائے **انى وجهت وجهى الخ**۔ف۔ اس دعا کا نام توجہ ہے اور اس کی پوری تفصیل عنقریب آئے گی، مصنف ہدایہ کے کلام میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بقول ابو یوسفؒ اولی یہ ہے کہ سب سے پہلے ثنا کہے پھر توجہ (**انى وجهت**) کہے، اور صاحب الدرایہ نے بھی اس قول کی تصریح کردی ہے۔

لرواية على ان النبى عليه السلام كان يقول ذلك......الخ

حضرت علیؓ کی اس روایت کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ یہ کہا کرتے تھے۔ف۔ لیکن اس کے کہنے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ ﷺ ان دونوں نمبر ۱۔ ثنا، نمبر ۲۔ توجہ کو ایک ساتھ کہا کرتے تھے۔فع۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جب اس بات کی

روایت ثابت ہو گئی کہ ثناء بھی کہنی چاہئے، اور توجہ بھی کہا کرتے تھے تو از خود ان دونوں کو جمع کرنا لازم آ گیا۔

البتہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ فرائض اس کے کہنے کا تو ذکر نہیں پایا گیا ہے اس لئے شاید تہجد کی نماز میں کہا کرتے ہوں گے، جیسا کہ مصنفؒ نے محمول کیا ہے کہ محمد بن سلمہ کی حدیث میں ہے کہ جب نفل پڑھنے کو کھڑے ہوتے تو کہتے اللہ اکبر انی وجہت وجہی الخ، نسائی نے اس کی روایت کی ہے، لیکن صحیح ابن حبان و سنن ترمذی اور طبرانی میں حضرت ابو رافعؓ کی حدیث سے اس کو نماز مکتوبہ یعنی فرض نماز میں نقل کیا ہے، جیسا کہ الحصن میں ہے، اس سے اس بات کی تصریح ہو گئی کہ نفل ہی کی کوئی تخصیص نہ تھی، اور یہ پوری حدیث مسلم اور ترمذی نے حضرت علیؓ سے بھی اسی طرح روایت کی ہے کہ تکبیر کے بعد کہتے تھے:

﴿وجهت وجهي للذى فطرالسموت والارض حنيفا وما انا من المشركين، ان صلوتى و نسكى و محياى و مماتى لله رب العالمين، لا شريك له وبذلك امرت وانا من المسلمين﴾ (بعض روایتوں میں: وانا اول المسلمين) اللهم انت الملك لا اله الا انت ربى وانا عبدك ظلمت نفسى واعترفت بذنبى، فاغفرلي ذنوبى جميعا انه لايغفر الذنوب الا انت، واهدنى لاحسن الاخلاق، لايهدى لاحسنها الا انت، واصرف عنى سيئا لا يصرف عنى سيئا الا انت، لبيك وسعديك والخير كله فى يديك والشر ليس اليك، انابك واليك تبارك وتعاليت استغفرك واتوب اليك.

بعض مشائخ نے کہا ہے کہ (انا اول المسلمين) کہنے سے نماز فاسد ہو گی کیونکہ یہ جھوٹ ہے، بحر الرائق میں کہا ہے کہ یہ قول مردود ہے کیونکہ بعض صحیح روایت میں انا اول المسلمين بھی آیا ہے، اور فتح القدیر میں صحیح حدیث سے ذکر کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ رکوع کرتے تو یوں فرماتے، اللهم ركعت وبك امنت ولك اسلمت خشع لك سمعى وبصرى ومخى وعظمى وعصبى. ف۔ اس روایت کو مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے ذکر کیا ہے۔ ع۔

اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو فرماتے سمع الله لمن حمده ربنا ولك الحمد حمدا كثيراً طيباً مباركا فيه. م. ع. اور فرماتے اللهم ربنا لك الحمد ملاء السموات والارض وملأ مابينهما وملأ ماشئت من شئى بعد۔ ف۔ اهل الثناء والمجد احق ماقال العبد وكلنا لك عبد لامانع لما اعطيت ولا معطى لما منعت ولاينفع ذا الجد منك الجد، اس کو بھی مسلم، وابوداؤد اور نسائی سے روایت کیا ہے۔ ع۔

اور جب سجدہ کرتے تو کم از کم تین بار تسبیح کہتے۔ م۔ اور فرماتے اللهم لك سجدت وبك امنت ولك اسلمت سجد وجهى للذى خلقه وصوره وشق سمعه وبصره تبارك الله احسن الخالقين. ف. مسلم وابوداؤد و نسائی نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے۔ ع۔

میں کہتا ہوں کہ تکبیر افتتاح کے بعد یہ بھی وارد ہے کہ اللهم باعد بينى وبين خطاياى كما باعدت بين المشرق والمغرب، اللهم اغسل خطاياى بالماء والثلج والبرد، اس کی روایت بخاری و مسلم وابوداؤد و نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے، اس کی مزید تفصیل آئندہ آتی ہے، بعض صحیح روایتوں میں ان دعاؤں کی زیادتی بھی آئی ہے اللهم نقنى من الذنوب كما ينقى الثوب الابيض من الدنس۔ م۔

اور جب دونوں سجدوں کے بیچ میں بیٹھتے تو فرماتے اللهم اغفرلى وارحمنى وعافنى واهدنى وارزقنى واجبرنى، ترمذی وغیرہ۔ ع۔ م۔ اس کے بعد التحیات اور درود صحاح حدیث میں متعدد الفاظ سے مروی ہیں، اور آخر میں سلام سے پہلے اس طرح کہتے اللهم اغفرلى ما قدمت وما اخرت وما اسررت وما اعلنت وما اسرفت وما انت اعلم به منى انت المقدم وانت المؤخر لا اله الا انت۔ ف۔ ع۔ مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے کچھ کلمات کو تبرک کے خیال سے ذکر کرتا ہوں، تاکہ انہیں فرائض میں

نہیں بلکہ نوافل میں پڑھ کران سے برکت حاصل کی جائے الحاصل ثنااور توجہ کوایک ساتھ جمع کرتے تو کہتے سبحانك اللهم وبحمدك وتبارك اسمك وتعالى جدك ولا اله غيرك، وجهت وجهي الى الله رب العالمين، لہٰذااسی طرح کہنااولی ہے۔ الفتح۔ جس طرح ابویوسف جمع کرتے ہیں اسی طرح اسحٰق کے نزدیک بھی ثنااور توجہ کوجمع کرنا بہتر ہے۔

ولهما رواية انس ان النبى عليه السلام كان اذا افتتح الصلوة كبّر وقرأ سبحانك اللهم وبحمدك الى اخر ولم يزد على هذا.

ترجمہ:-اوران دونوں یعنی امام ابوحنیفہؒ اورامام محمدؒ کی دلیل حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز شروع کرتے تو تکبیر کہتے اور یہ پڑھتے سبحانک اللہم وبحمدک آخر تک اوراس سے زیادہ نہیں کیا۔

توضیح:- حنیفہ کے دلائل

ولهما رواية انس ان النبى عليه السلام كان اذا افتتح الصلوة كبّر ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، زیادہ نہیں کیا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت انسؓ نے اس سے زیادہ کچھ بیان نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ اس کے بعد کچھ اور جملہ نہیں ہے، پھراس میں دوطرح سے گفتگو ہوتی ہے۔

نمبرا۔ یہ کہ اگر حضرت انسؓ نے اس سے زیادہ بیان نہیں کیا تواس سے یہ لازم نہیں آتا کہ رسول اللہ ﷺ زیادہ پڑھتے بھی نہ تھے۔

نمبر ۲۔ یہ کہ دار قطنیؒ نے حدیث کو مرفوعاً روایت کیا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اس کے راوی ثقہ ہیں، حالانکہ اس کا اس طرح انکار کیا گیا ہے کہ اسناد میں حسن بن علی بن الاسود ہیں جوایک ضعیف راوی ہیں، نیز ابن ابی حاتم نے اپنے والد ابوحاتم الرازی سے نقل کیا کہ یہ حدیث جھوٹی ہے اس کی کچھ اصلیت نہیں ہے، لیکن طبرانی کی کتاب الدعاء میں اس کی متابعت موجود ہے،اور ابن حجرؒ نے اس کی پرزور تائید کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ متابعت بہت عمدہ ہے۔ م۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اسے بیہقیؒ نے حضرت انسؓ وعائشہؓ وابوسعید خدریؓ وجابرؓ وعمرؓ اور ابن مسعودؓ سب سے مرفوعاً روایت کی ہے، البتہ عمروابن مسعودؓ سے موقوفاً روایت کی ہے،اور دار قطنیؒ نے کہا ہے کہ عمرؓ سے انہیں کا قول محفوظ ہے،اور صحیح مسلم میں مروی ہے کہ حضرت عمرؓ سبحانک اللہم الخ بلند آواز سے پڑھتے تھے،اور ابوداؤداور ترمذیؒ نے حضرت عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کرکے کہا ہے کہ یہ ضعیف ہے،اور دار قطنیؒ نے حضرت عثمانؓ سے نیز سعید بن منصورؒ نے حضرت ابوبکرؓ سے موقوفاً روایت کی ہے۔ الفتح۔

پس حق یہ ہے کہ صحابہ کرام کی ایک جماعت سے موقوف روایت بھی صحیح ہے،اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ابوداؤدؒ نے ابوسعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب رات کے وقت اٹھتے تو تکبیر کہتے پھر کہتے **سبحانك اللهم وبحمدك**، تین بار اور **تبارك اسمك وتعالىٰ جدك و لا اله غيرك**، پھر کہتے **لااله الا الله**، تین بار، پھر **الله اكبر كبيرا** تین بار، پھر **اعوذ بالله السميع العليم من الشيطان الرجيم من همزه ونفخه ونفثه**، پھر قراءت پڑھتے،اس کی روایت ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کی ہے،اور ترمذی نے کہا ہے کہ اس باب میں یہ حدیث اصح اور بہت زیادہ مشہور ہے۔ ختم۔ علی بن علی بن یخاد بن رفاعہ کو وکیع اور ابن معین اور ابوزرعہؒ نے ثقہ کہا ہے، ان کا ثقہ کہدینا بہت ہی کافی ہے۔ الفتح۔

اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اصل میں **سبحانك اللهم وبحمدك** الخ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اگرچہ تہجد ہی میں ہو۔ م۔ اور جب حضرت ابوبکروعمرؓ جیسے اکابر صحابہ کرام سے فرائض میں ثابت ہوا کہ **سبحانك** الخ سے شروع کرتے، یہانتک کہ حضرت عمرؓ اس کی تعلیم کی غرض سے اسے زور سے پڑھتے، لہٰذا یہ اس بات کی دلیل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری

اور اکثری عمل یہی تھا، چنانچہ اسی پر اعتماد ہے اگرچہ سند کے اعتبار سے دوسرے اذکار کا ثبوت قوی ہو، پس کبھی اسناد کے اعتبار سے غیر مرفوع پر بھی ترجیح دی جاتی ہے، اس وقت جبکہ ایسے قرینے موجود ہوں کہ یہ عمل واقعتاً رسول اللہ ﷺ سے ثابت اور اس پر مداومت بھی رہی ہے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تکبیر کے بعد تھوڑا سکتہ کرتے پھر قراءت کرتے ایک موقع پر میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، میں نے دیکھا کہ آپ تکبیر اور قرآت کے درمیان سکوت کرتے ہیں تو آپ اس موقع میں کیا پڑھتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ میں یہ کہتا ہوں **اللهم باعد بيني وبين خطاياي كما باعدت بين المشرق والمغرب اللهم نقني من خطا ياى كما ينقي الثوب الابيض من الدنس، اللهم اغسلني من خطاياي بالماء والثلج والبرد**، اس کو بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے، لہذا یہ ذکر تو سب سے زیادہ قوی ثابت ہوئی، کیونکہ صحیحین یعنی بخاری اور مسلم دونوں کی یہ روایت ہے، پھر بھی چاروں اماموں میں سے کسی نے بھی صرف اسی ذکر کو معین سنت نہیں کہا ہے، بحوالہ الفتح۔

ومارواه محمول على التهجد، وقوله وجل ثناؤك يذكر في المشاهير فلا ياتي به في الفرائض والاولى ان لاياتي بالتوجه قبل التكبير ليتصل النية به، هو الصحيح.

ترجمہ:- اور امام ابویوسفؒ نے جو روایت پیش کی ہے وہ تہجد کی نماز (نوافل) پر محمول ہے، اور ثنا میں وجل ثناءک کا جملہ احادیث مشہور میں نہیں پایا جاتا ہے اس لئے اسے فرض نمازوں میں نہیں کہنا چاہئے، اور اولیٰ یہ ہے کہ تکبیر سے پہلے توجہ نہ کہے تاکہ نیت تکبیر سے مل جائے، یہی صحیح ہے۔

توضیح:- انی وجہت آخر تک کی دعا فرائض میں نہیں بلکہ نوافل میں پڑھنی چاہئے

ومارواه محمول على التهجد، وقوله وجل ثناؤك يذكر في المشاهير ......الخ

امام ابویوسفؒ نے جو روایت کی ہے وہ تہجد پر محمول ہے۔ف۔ یعنی نفل میں انی وجہت وجهی الخ پڑھتے تھے۔ف۔ اب تحقیقی بات یہ ہے کہ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے ثناء مذکورہ کے علاوہ جو دوسرے اذکار منقول اور صحیح ثابت ہوئے ہیں وہ بھی فرائض میں پڑھے جاسکتے ہیں مگر کبھی کبھی کیونکہ جماعت کی نماز میں ان پر ہمیشگی کرنی مکروہ ہے، یہ کراہت اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ ثابت نہیں ہیں، بلکہ اس لئے مختصر سی دعا پڑھنے کا جو حکم مسنون ہے اس کی مخالفت لازم آتی ہے، اسی طرح اگر فرض نماز تنہا پڑھتے ہوئے بھی ان اذکار کو پڑھ لے تو کوئی حرج نہیں ہے، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ احناف ان اذکار کو فرائض میں اس لئے نہیں پڑھتے ہیں کہ ان کے خیال میں ان کا ثبوت صحیح نہیں ہے (حالانکہ ان کا بھی بعض روایات سے ثبوت ملتا ہے) تو لوگوں کا ایسا خیال صحیح نہیں ہے بلکہ ان کا وہم ہے بلکہ جس طرح اتفاقیہ پڑھنے کا ثبوت ہے اسی طرح اتفاقیہ پڑھنے کو ہم بھی مانتے ہیں، البتہ اس پر التزام کرنے کو ہم منع کرتے ہیں اس وجہ سے کہ یہ خلاف سنت ہے ہاں سنن اور نوافل میں پڑھنا مستحب ہے۔

صحیح ابوعوانہ اور سنن نسائی میں ثابت ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز نفل پڑھنے کو کھڑے ہوتے تو فرماتے **الله اكبر وجهت وجهي للذي الخ**۔مف۔ اور صحیح ابن حبان اور ترمذی کی حدیث جو ابورافعؓ سے مروی ہے اس میں لفظ فرض موجود ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب فرض نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو **وجهت وجهي للذي الخ** پڑھتے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فرض اور نفل دونوں نمازوں میں پڑھتے تھے اس لئے میری بیان کی ہوئی تحقیق سے سارے اوہام ختم ہو گئے۔

حاصل تحقیق یہ ہے کہ ہمیں صحیح حدیثوں سے کئی اذکار معلوم ہوئے جنہیں رسول اللہ ﷺ تکبیر کے بعد پڑھتے تھے ہم

نے دوبارہ تحقیق کی کہ ان میں سے کون ساذکر ایسا تھا جسے ہمیشہ کہتے ہوں تو معلوم ہوا کہ خلفائے راشدین اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے قول وفعل سے فقط سبحانك اللهم الخ ملا اسی کی تصریح ابو سعیدؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے مل گئی تو یہ معلوم ہو گیا کہ اسی پر آپ کی مداومت تھی اور یہی آپ کا معمول تھا تو لامحالہ دوسرے اذکار اس کے ساتھ اتفاقی تھے ،اور ہم ہمیشہ ایسا نہیں کر سکتے کہ ان اذکار کو بھی اس سبحانک کے ساتھ ملالیں کیونکہ جماعت کی قراءت میں احادیث کثیرہ سے تخفیف کرنا ثابت ہوتا ہے، پس قراءت میں تحقیق کا حکم ہے تو یقینی طور سے ذکر ودعاء کو طویل کرنا مکروہ اور خلاف سنت ہوا ساتھ ہی بعض صحیح حدیثوں میں آپ کا فرائض میں بھی وجہت وجہی پڑھنا ثابت ہوا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی کبھی جماعت میں بھی پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن ان اذکار کا سبحانك الخ کے ساتھ جمع کرنے کا ثبوت نہیں ہے اس لئے اولی یہ ہوا کہ صرف وجہت وجهي الخ پڑھے یا فقط اللهم باعد بيني الخ پڑھے اور جب تنہا ہو یعنی جماعت نہ ہو تو جمع کرنا بہتر ہے۔ واللہ تعالے اعلم۔م۔

واضح ہو کہ متن کے کلام میں پوری ثناء اس طرح کی تھی سبحانك اللهم وبحمد ك وتبارك اسمك وتعالى جدك وجل ثناء ك ولا اله غيرك، اسی بناء پر ماتن نے یہ بھی فرمایا و قولہ وجل ثناء الخ اور اس کا قول وجل ثناءک مشہور روایتوں میں مذکور نہیں ہے۔ف۔ بلکہ امام محمدؒ نے کتاب الحجہ علی اهل المدینہ میں تصریح کے ساتھ لکھا ہے فلایتاتی بہ کہ اس کو فرض نمازوں میں نہ کہے۔ف۔ یعنی فرض نمازوں میں ثناء پڑھتے وقت یہ لفظ جل ثناءک نہ پڑھے کیونکہ اتنا پڑھ لینے سے اتنی مقدار پر عمل ہو جاتا جتنی مقدار سنت ہے اور قابل اعتماد بھی ہے ساتھ ہی تخفیف کے حکم کی رعایت جو اولی اور احوط ہے اس پر بھی عمل ہو جاتا ہے، لیکن جنازہ کی نماز میں اس زائد کو ذکر کر لینا جائز ہے، جیسا کہ در مختار میں ہے والاولی الخ اور اولی یہی ہے کہ تکبیر سے پہلے توجہ نہ پڑھی جائے، تاکہ نیت اور تکبیر میں اتصال ہو جائے یعنی درمیان میں انی وجهت فاصل نہ ہو ہوا لصحیح الخ یہی صحیح ہے۔ف۔ اور بعض متاخرین کے نزدیک جائز اور ابو اللیث فقیہ کا یہی مذہب مختار ہے، وفیہ نظر، م، کیونکہ فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ بالاجماع اسے نفل میں پڑھنا جائز ہے، ع، پھر ثناء مذکور پڑھنے کے بعد فرمایا۔ (آئندہ)

ويستعيذ بالله من الشيطان الرجيم، لقوله تعالى ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ﴾ معناه اذا اردت قراء ةالقرآن، والاولى ان يقول استعيذ بالله ليوافق القرآن، و يقرب منه اعوذ بالله، ثم التعوذ تبع للقراء ة دون الثناء عند ابى حنيفةؒ ومحمدؒ، لما تلونا حتى يأتي به المسبوق دون المقتدى، ويؤخر عن تكبيرات العيد خلافا لا بى يوسفؒ.

ترجمہ:- اور اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم پڑھے اس فرمان خداوندی کی وجہ سے کہ تم جب قرآن پڑھو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ چاہو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم جب قرآن کے پڑھنے کا ارادہ کرو اس موقع میں بہتر یہ ہے کہ یوں کہوں استعیذ باللہ تاکہ الفاظ قرآن کی موافقت پائی جائے اور اسی کے قریب اعوذ باللہ کہنا بھی ہے پھر یہ تعوذ قراءۃ کے تابع مانی گئی، اور ثناء کے تابع نہیں مانی گئی ہے امام ابو حنیفہ اور محمدؒ کے نزدیک اس آیت کی بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، اس بناء پر اس تعوذ کو مسبوق تو کہے گا لیکن مقتدی نہیں کہے گا، اور عید کی تکبروں سے اسے مؤخر کرے گا، اس میں ابو یوسف کا اختلاف ہے۔

توضیح:- ثناء کے فوراً بعد اعوذ باللہ پڑھنا چاہئے

ويستعيذ بالله من الشيطان الرجيم، لقوله تعالى ﴿فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللهِ ...... الخ

اور اللہ تعالے کی پناہ چاہئے شیطان مردود سے اس جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کام کے لئے کوئی خاص لفظ مقرر نہیں ہے بلکہ معروف ومعلوم جو طریقہ ہے اسی کے مطابق اعوذ بالله من الشيطان الرجيم کہے، اس فرمان الٰہی کی وجہ

سے کہ **فاذا قرات الخ** کہ جب تم قرآن پڑھو تو اللہ تعالی کے ساتھ پناہ تلاش کرو شیطان مردود سے۔

معناہ اذا اردت قراءۃ القرآن......الخ

یعنی **اذا قراءت** کے معنی یہ ہیں کہ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرو۔

ف۔ کن الفاظ سے استعاذہ کرنا چاہئے؟ تو ائمہ قراءت میں سے ابو عمرو اور عاصم اور ابن کثیرؒ نے **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھنا پسند کیا ہے، ہمارے ائمہ احناف نے اور اکثر اہل علم نے اسی قراءت کو قبول کیا ہے اسی طرح امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہی افضل ہے، لیکن حفصؒ نے **اعوذ باللہ العظیم من الشیطان الرجیم** پڑھنا پسند کیا ہے، اور امام احمدؒ نے اسی کے آخر میں **ھو السمیع العلیم** بڑھادیا ہے، اور حمزہؒ نے **استعیذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھنے کو پسند کیا ہے، اور اور ابن سیرینؒ کا بھی یہی قول ہے، ان اقوال میں سے ہر قائل کی دلیل میں آثار موجود ہیں، اور مجتبیٰ میں ہے کہ حمزہ کے قول پر فتویٰ ہوگا، اور مصنفؒ نے کہا ہے والاولی الخ، استعاذہ کرنے میں اولی یہ ہے کہ یوں کہے **استعیذ باللہ من الشیطان الرجیم**، تاکہ قرآن کے موافق ہو جائے۔ ف۔ کیونکہ فاستعذ باللہ فرمایا گیا ہے، لیکن اکثر اخبار اور آثار میں **اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم** منقول ہے، اسی پر مصنفؒ نے کہا ہے۔

و یقرب منہ اعوذ باللہ......الخ

اور استعیذ کہنے کے قریب ہی اعوذ کہنا بھی ہے۔ ف۔ الخلاصہ کا مذہب مختار یہی ہے، اور اسی پر فتویٰ دیا جائے، الزاہدی، اس سے پہلے حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث میں یہ بات گذر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے **اعوذ باللہ السمیع العلیم من الشیطان الرجیم** پڑھا ہے، بعض مشائخ نے اسی طرح پڑھنا پسند کیا ہے، اس کے پڑھتے وقت آہستہ پڑھنا سنت ہے، اگر شاگرد استاد کو سنا رہا ہو تو اس کے لئے استعاذہ کرنا مسنون نہیں۔ الذخیرہ۔ یہ (آہستہ پڑھنا بھی) اکثر اسلاف کے نزدیک سنت ہے۔

ثم التعوذ تبع للقراءۃ دون الثناء عند ابی حنیفۃؒ و محمدؒ...... الخ

پھر تعوذ یعنی **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم** پڑھنا ترا قرآن کے تابع ہے ثنا کے تابع نہیں ہے امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اس آیت پاک کی بناء پر جسے ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں۔ ف۔ یعنی **فاذا قراءت القرآن الخ** یعنی خود پڑھنے کا ارادہ کرے وہ تعوذ پڑھے لہذا تعوذ قراءۃ کے تابع ہوا، **حتی یاتی بہ** یہانتک کہ اسے مسبوق تو پڑھے گا مگر مقتدی نہیں پڑھے گا۔ ف۔ مقتدی سے ایسا شخص مراد ہے جس کے امام کے پیچھے کوئی رکعت نہ چھوٹی ہو، اور چونکہ ہمارے نزدیک مقتدی پر قراءت لازم نہیں ہے اس لئے یہ تعوذ بھی نہیں پڑھے گا بلکہ صرف ثناء پڑھ کر خاموش ہو جائے گا، اور مسبوق وہ شخص ہے جو امام کے پیچھے اس وقت شریک ہوا ہو جبکہ کم از کم ایک رکعت امام پڑھ چکا ہو اور امام سبقت کر چکا ہو، تو ایسا شخص امام کے سلام کے بعد کھڑا ہو کر اپنی چھوٹی ہوئی نماز پوری کرے گا، اور اپنی قراءت کے واسطے تعوذ پڑھے گا۔

ویؤخر عن تکبیرات العید خلافا لابی یوسفؒ ......الخ

اور امام عید کی تکبیروں کے بعد تعوذ پڑھے گا، یہ قول امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا ہے جیسا کہ مصنفؒ نے بیان کیا ہے، کہ بعض کتابوں میں ہے، مگر عام کتابوں میں مثلاً مبسوط اور منظومہ وغیرہ میں امام ابو حنیفہؒ کا ذکر نہیں ہے، بلکہ صرف امام محمدؒ کا قول مذکور اور متن کی کتابوں میں بھی یہی قول مذکور ہے۔ ھ۔ **خلافا لابی یوسفؒ** ابو یوسفؒ کا قول اس کے مخالف ہے، ف، کیونکہ ان کے نزدیک تعوذ ثناء کے تابع ہے، یعنی جو شخص **سبحانک اللھم الخ** پڑھے گا وہ تعوذ بھی کرے گا، کیونکہ تعوذ کرنے کا مقصد وسوسہ کو دور کرنا ہے، بعض مشائخ نے اسی قول کو اصح کہا ہے، مثلاً خلاصہ کے مصنفؒ نے کہا ہے، اسی قاعدہ کے مطابق مقتدی بھی تعوذ کرے گا، اور مسبوق دوبارہ کہے گا، پہلی بار نماز میں شریک ہوتے وقت دوسری بار اس وقت جب وہ اپنی بقیہ نماز پوری کرنے لگے، یہ بات خلاصہ میں مذکور ہے، الفتح۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بات غور طلب ہے کہ مسبوق اسے دوبارہ پڑھے، کہ اس کو دوسری بار پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، اس لئے صحیح قول وہی ہے جو ہندیہ میں نقل کیا گیا ہے کہ تعوذ کرنے کا موقع ابتداء نماز ہے، اور دوسرا کوئی موقع نہیں ہے، اس لئے اگر کسی نے نماز شروع کی اور وہ تعوذ کرنا بھول گیا یہاںتک کہ سورہ فاتحہ پڑھنے لگا، تو اب وہ تعوذ نہیں کرے گا، الخلاصہ، نماز کے علاوہ دوسرے مقام میں تلاوت کرتے وقت بالاتفاق زور سے تعوذ کرنا چاہئے۔ع۔ پھر تعوذ کرنے کے بعد تاخیر نہیں کرنی چاہئے بلکہ بسم اللہ بھی فوراً کہہ لینا چاہئے۔ت۔

ویقرأ بسم الله الرحمن الرحيم، هكذا نقل في المشاهير ويسربهما لقول ابن مسعودؓ : اربع يخفيهن الامام وذكر من جملتها التعوذ والتسمية وآمين.

ترجمہ:- اور پڑھے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مشہور احادیث میں ایسا ہی منقول ہے، اور ان دونوں کو آہستہ کہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ چار باتیں ایسی ہیں جنہیں امام آہستہ کہے، ان میں سے تعوذ، تسمیہ اور آمین کو ذکر کیا۔

توضیح:- تعوذ کے بعد تسمیہ بھی کہنا، اور دونوں کو آہستہ کہنا، آہستہ یا زور سے کہنے کے دلائل

ویقرأ بسم الله الرحمن الرحيم، هكذا نقل في المشاهير...... الخ

تعوذ کے بعد بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی نماز پڑھے۔ف۔ سوائے مقتدی کے یعنی ان ہی الفاظ سے کہے، اس میں کوئی تغیر نہ کرے۔م۔ هكذا نقل الخ، مشہور حدیثوں میں ایسا ہی مروی ہے۔ف۔ کہ رسول اللہ ﷺ خود بھی اور آپؐ کے صحابہ کرام بھی پڑھا کرتے تھے، واضح ہو کہ آئندہ جو یہ بحث آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ کو زور سے پڑھتے تھے، یا آہستگی کے ساتھ یہی احادیث اس بات کو بھی ضرور ثابت کرتی ہیں کہ آپ ﷺ خود بھی پڑھتے تھے، لہٰذا دلائل میں احادیث کو ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

پھر بسم اللہ کہنے کے سلسلہ میں چار بحثیں آتی ہیں:

نمبر۱۔ بسم اللہ قرآن میں سے ہے یا نہیں، نمبر۲۔ یہ سورہ فاتحہ میں سے ایک آیت ہے یا نہیں، نمبر۳۔ اس کے علاوہ اور دوسری سورتوں کی بھی آیت ہے یا نہیں، نمبر۴۔ اس کو سورہ فاتحہ کے ساتھ زور سے پڑھنا چاہئے یا نہیں۔ع۔ درحقیقت یہ چوتھی صورت دوسرے مسئلہ کی شاخ ہے کیونکہ اگر یہ سورہ فاتحہ کی آیت ہے تو جب بھی سورہ فاتحہ زور سے پڑھی جائے گی اسے بھی زور سے ہی پڑھنا چاہئے، کیونکہ اس بات کے کوئی معنی نہیں نکلتے ہیں کہ ساری صورتیں زور سے پڑھی جائیں اور یہی آیت آہستہ پڑھی جائے۔

واضح ہو کہ سورہ نمل کی آیت وَاِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمَانَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ بالاتفاق آیت کا جزء ہے اور پوری آیت نہیں ہے، نیز بالاجماع قرآن کا حصہ ہے، اس کے ماسوا ہر سورہ کی ابتداء بھی بسم اللہ لکھی ہوئی ہوتی ہے، اس طرح عینی کے کلام کا ماحصل یہ ہے کہ ہمارے علمائے احناف کا صحیح مذہب یہ ہے کہ وہ بھی قرآن کا حصہ ہی ہے لیکن وہ صرف ایک آیت ہے جو تمام سورتوں کی ابتداء میں ایک سورہ کو دوسرے سے ممتاز رکھنے اور فصل دینے کے لئے لکھی جاتی ہے لیکن کسی سورہ کی جزء نہیں ہے، الظہیر یہ، اور چونکہ اس کے متعلق یہ شبہ پایا جاتا ہے کہ یہ پوری آیت نہ ہو اس لئے صرف اسی کو نماز میں پڑھنے اور اس پر اکتفاء کرنے سے امام صاحبؒ کے نزدیک بھی فرض قراءت ادا نہ ہوگی۔ الجوہرہ۔ شک کی وجہ سے، اور جنبی اور حائضہ کو قرآن کی نیت سے اسے پڑھنے سے احتیاط کی بناء پر اور حرمت کو حلت پر ترجیح دینے کے خیال سے ممانعت کا حکم دیا جاتا

ہے۔ میں کہتا ہوں کہ تنویر میں اسی قول کو مذہب قرار دیا ہے، اور تحقیقی نظر میں یہی قول صحیح اور محقق ہے جیسا کہ آئندہ معلوم ہو جائے گا۔

اس بناء پر پہلے دوسرے اور تیسرے مسئلوں کا جواب ہو گیا کہ یہ ایک آیت ہے اور قرآن کا حصہ ہے صحیح قول کے مطابق، مگر فاتحہ یا کسی اور سورت میں سے نہیں ہے، اور شافعیہؒ کے نزدیک ان کے صحیح مذہب کے مطابق یہ فاتحہ اور اس کے علاوہ سورہ کا ایک جزء ہے، یہی قول عطاء، زہری، ابن المبارک، ابن کثیر، عاصم، اور کسائی کا ہے، اور حمزہؒ نے کہا ہے کہ یہ خاص کر سورہ فاتحہ کا جزء ہے، جیسا کہ عینیؒ نے بیان کیا ہے، مختصراً یہ کہ حمزہؒ کا مذہب یہ ہوا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ایک مستقل آیت ہے اور فاتحہ کا جزو بھی ہے، مگر باقی سورتوں سے پہلے اس سے پہلے کی سورت سے علیحدہ کر کے بتانے کے لئے ہے، کسی سورہ کا جزو نہیں ہے، اور مجتبیٰ میں بیان کیا ہے کہ اسبیجابیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے اکثر مشائخ بھی اسی کے قائل ہیں کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزو ہے۔ مع۔ لیکن یہ دعویٰ تحقیق کے خلاف اور غیر صحیح ہے، اور قول صحیح وہی ہے جو ہم نے ماقبل میں ذکر کر دیا ہے۔ م۔

• بسم اللہ کو ہر رکعت کے پہلے پڑھنا چاہئے۔ المحیط۔ اسی پر فتویٰ ہے، الحجہ، فاتحہ اور سورہ کے درمیان نہیں پڑھنا چاہئے۔ الوقایہ۔ اور یہی صحیح ہے۔ البدائع والجوہرہ۔ کیونکہ یہ فصل کے لئے ہے جبکہ سورہ کو ملانے کا حکم ہے، ایسا ہی کہا گیا ہے، لہذا سورہ سے پہلے بسم اللہ نہیں کہنا چاہئے، کیونکہ اس وقت سورہ کو ممتاز کرنا مقصود نہیں ہے، اب اس کی مزید بحث عنقریب آئے گی۔ م۔ اب صرف چوتھے مسئلہ کا جواب باقی رہا لیکن وہ بھی اس بحث کے ضمن میں خود بخود نکل آیا، کہ ہمارے نزدیک بسم اللہ کو بھی تعوذ کی طرح زور سے نہیں بلکہ آہستہ ہی کہنا چاہئے، مگر شافعیؒ کے نزدیک زور سے کہنا چاہئے، اسی بناء پر مصنفؒ نے کہا ہے۔

ویسر بهما لقول ابن مسعودؓ : اربع یخفیهن الامام وذکر من جملتها التعوذ والتسمیة وآمین......الخ

کہ بسم اللہ اور تعوذ دونوں کو آہستگی کے ساتھ پڑھنا چاہئے، **یقول ابن مسعودؓ** حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے اس قول کی بناء پر کہ چار چیزیں ایسی ہیں جن کو امام آہستہ کہے ان میں سے تین یہ ہیں تعوذ، تسمیہ، اور آمین، ف۔ اور چوتھی چیز تحمید ہے، یعنی **ربنا ولك الحمد**، مگر اس کا بیان کہیں بھی ابن مسعودؓ کے قول سے نہیں ملا ہے، البتہ ابن ابی شیبہ نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ وہ تعوذ، **بسم اللہ وربنا لك الحمد** کو آہستہ پڑھتے۔ زیلعی۔ ہاں ابن ابی شیبہ نے ابراہیم نخعی سے ان چاروں چیزوں کے آہستہ کہنے کو بیان کیا ہے۔ ف۔ اور عبدالرزاقؒ نے پانچویں چیز **سبحانك اللهم الخ** کو زیادہ بیان کیا ہے، معلوم ہونا چاہئے کہ ان چاروں چیزوں کو ثابت کرنے کے لئے اس اثر مذکور کے علاوہ صحیح احادیث اور بھی موجود ہیں جنہیں بعد میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

وقال الشافعی یجهر بالتسمیة عند الجهر بالقراءة لماروی ان النبی علیه السلام جهر فی صلوته التسمیة.

ترجمہ:- اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ نماز میں قراءت کو زور سے پڑھنے کی صورت میں بسم اللہ کو بھی زور سے کہنا چاہئے اس روایت کی وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی نماز میں بسم اللہ کو زور سے کہا ہے۔

توضیح:- امام شافعیؒ کے نزدیک تسمیہ میں جہر کرنا

وقال الشافعی یجهر بالتسمیة عند الجهر بالقراءة....الخ

امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ جب قراءت میں جہر کرے تو تسمیہ میں بھی جہر کرے۔ ف۔ مبسوط میں کہا ہے کہ یہ اس بناء پر کہ ان کے نزدیک تسمیہ فاتحہ کا جزو ہے، اور باقی سورتوں کا جزو ہے یا نہیں اس میں دو قول ہیں۔ ن۔ ان کے مذہب میں قول اصح یہ ہے کہ باقی سورتوں کا بھی جزء ہے، جیسا کہ عینی میں ہے، اسی لئے مصنفؒ نے یہ بیان کیا ہے کہ قراءت خواہ سورہ فاتحہ کی ہو یا

کسی اور سورہ کی بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے ہی کا حکم بیان کیا ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ علامہ سیوطیؒ نے اتفاق میں اور ابن حجر نے فتح الباری میں بہت سی روایتیں ذکر کی ہیں جن میں سورہ فاتحہ کی سات آیتوں میں بسم اللہ بھی ایک آیت شمار کی گئی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان روایتوں میں اس بات کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ بسم اللہ جو آیت ہے وہ ساتویں آیت ہے بلکہ صرف اتنا ہے کہ یہ بھی ایک آیت ہے، اس لئے اس روایت کی مناسب تاویل کرنی ضروری ہوئی جو یہ ہے کہ بسم اللہ ایک آیت ہے، اور سورہ فاتحہ علیحدہ سات آیتیں ہیں کیونکہ جن احادیث سے آہستہ یا زور سے پڑھنے کے حکم کا ثبوت ہوتا ہے ان میں سے بسم اللہ کو آہستہ اور سورہ فاتحہ کو زور سے پڑھنے کا ثبوت ہوا اس سے یہ بات بالتصریح معلوم ہوئی کہ بسم اللہ اس سورہ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، پھر بھی امام شافعیؒ نے بسم اللہ کو زور سے پڑھنے کا حکم دیا ہے، اس حدیث کے پیش نظر کہ **ان النبی ﷺ جهر فی صلوته بالتسمیه** یعنی نبی کریم ﷺ نے اپنی نماز میں بسم اللہ کو زور سے پڑھا ہے۔ف۔

لیکن اگر یہ روایت صحیح بھی ہو جائے تو بھی اس سے یہ نہیں ثابت ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے ہمیشہ ہی ایسا کیا ہے، اب اگر ایک مرتبہ بھی آہستہ سے پڑھنے کا ثبوت ہو جائے تو لازم آئے گا کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ میں داخل نہیں ہے، حالانکہ یہاں تو بسم اللہ کو زور سے پڑھنے کی روایت کے ثابت ہونے میں بھی تامل ہے اور گفتگو ہے، اور دار قطنی نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ایسی کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے جس سے بسم اللہ کو زور سے پڑھنا ثابت ہوتا ہو، اور ابن حجرؒ نے بھی اس بات کا اقرار کیا ہے، اس موقع کی تحقیق اور تفصیل یہ ہے کہ بسم اللہ کو جہر کے ساتھ پڑھنے کے سلسلہ میں حضرت ابوہریرہ، ابن عباسؓ، علی، ام سلمہ، عائشہ، ابن عمر، بریدہ، عمار، جابرؓ سے نیچے طبقہ کی کتابوں میں چند احادیث موجود ہیں، عینیؒ نے ان تمام کو تفصیل کے ساتھ ذکر کر کے سب میں بحث کی ہے، اور ابن حجرؒ نے بھی ان سبھوں کو نصب الرایہ وغیرہ میں ذکر کیا ہے، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ صحابہ میں سے کئی اہل علم حضرات کا جہر بسملہ پر عمل بھی ہے۔الخ۔

اور ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان اور نسائی میں نعیم المجمر سے روایت ہے کہ میں نے ابوہریرہؓ کے پیچھے نماز پڑھی تو انہوں نے پہلے بسم اللہ پڑھی پھر ام القرآن یعنی سورہ فاتحہ پڑھی یہانتک کہ **ولا الضالین** پر پہونچے تو آمین کہی پھر سلام کے بعد فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے کہ میں اپنی اس نماز کی ادائیگی میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بہت زیادہ مشابہ ہوں، میں کہتا ہوں کہ اس حدیث کو حاکم و دار قطنی نے روایت کر کے صحیح کہا ہے، جیسا کہ عینی میں ہے۔م۔اور ابن خزیمہؒ نے کہا ہے کہ اہل معرفت کے نزدیک اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ف۔ عینیؒ نے جواب دیا ہے کہ نعیم المجمرؒ نے ابوہریرہؓ کے تقریباً آٹھ سو شاگردوں میں سے ثقات کے خلاف یہ روایت کی ہے۔مع۔ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ حقیقت میں ابوہریرہؓ نے زور سے بسم اللہ کہی ہو کیونکہ آہستہ کہنے کی صورت میں بھی قریب کے مقتدی کو آواز سنائی دیتی ہے۔

ف۔جیسا کہ صحیح مسلم میں ظہر کی نماز کے تذکرہ میں ہے راوی نے کہا ہے کہ آپ نے **سبح اسم ربك الاعلی** پڑھی، اور اس پر مزید یہ بھی ہے کہ ایک مرتبہ مقتدیوں میں سے کسی نے پیچھے کچھ پڑھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا خالجنیہا (اس نماز میں کسی نے مجھے خلل میں ڈال دیا ہے) اس سے یہ بات صراحۃ یہ معلوم ہوئی کہ کسی نے کچھ پڑھا تھا اور آپ نے اس کی قراءت سنی تھی، ایک دوسری روایت اور بھی ہے جس میں صراحۃ جہر کرنے کا ذکر ہے، وہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جہر کے ساتھ بسم اللہ کہی ہے، حاکم اور دار قطنی دونوں نے اسے صحیح کہا ہے۔

ف۔لیکن یہ مرسل صحیح ہے، ورنہ دوسری مرفوع روایت میں عبداللہ بن عمرو بن حسان راوی ضعیف ہیں، اور دار قطنی کی دوسری روایت میں ابوالصلت راوی ضعیف ہیں، بہر صورت کسی صورت سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ رسول اللہ

ﷺ نے ہمیشہ ہی بسم اللہ زور سے کہی ہے بلکہ صرف اتنا سا ثبوت ملتا ہے کہ کبھی کبھی زور سے بھی کہہ لینا جائز ہے، تو اب یہ سوال ہوتا ہے کہ جہر کر لینا لوگوں کو سکھانے اور بتانے کے لئے جائز ہے یا تلاوت کے طور پر بھی جائز ہے، جواب یہ ہے کہ ہمیں آپ کا عام طریقہ یہ معلوم ہوا کہ بسم اللہ کو آہستہ ہی پڑھا کرتے اور جہر نہیں کرتے تو اس حدیث کو تعلیم پر محمول کرنا ہی زیادہ بہتر ہوگا۔ م۔

بعض حفاظ (حدیث) نے تو یہ بھی کہدیا ہے کہ بسم اللہ کو زور سے پڑھنے کے سلسلہ میں جتنی حدیثیں مروی ہیں ان میں سے ہر ایک حدیث ایسی ہے جس کی سند میں گفتگو ہوئی ہے (یعنی ان پر پورا اعتماد نہیں ہے) اسی لئے مسند احادیث کی چاروں کتاب والوں اور امام احمدؒ نے بھی بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے کی کوئی حدیث بھی اپنی کتابوں میں روایت نہیں کی ہے، حالانکہ ان کی کتابوں مین ضعیف احادیث بھی موجود ہیں، شیخ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے کہ روایت دار قطنیؒ کا یہ قول ہم تک پہنچا ہے کہ جہر بسملہ میں رسول اللہ ﷺ کی کوئی حدیث بھی صحیح نہیں ہے، اور دار قطنی سے مروی ہے کہ انہوں نے مصر میں جہر بسملہ کے بارے میں ایک رسالہ تصنیف کیا تو بعض مالکی عالم نے انہیں قسم دلاتے ہوئے یہ بات کہی کہ اگر ان احادیث میں کوئی بھی درجہ صحت تک پہونچی ہوئی ہو تو آپ ہمیں وہ بتادیں، تو انہوں نے جواب دیا کہ بسم اللہ کو جہراً ادا کرنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے تو ہمیں کوئی صحیح حدیث ملی ہی نہیں، البتہ صحابہ کرامؓ سے جو روایتیں ملی ہیں ان میں سے کچھ صحیح اور کچھ ضعیف ہیں۔ عف۔ ابن حجرؒ نے ان آثار کو بیان کر دیا ہے اور دار قطنیؒ کے قول کو باقی رکھا۔ م۔

حازمیؒ نے کہا ہے جہر بسملہ کی روایت اگرچہ کئی افراد صحابہ سے مروی ہیں مگر ان میں سے اکثر ایسی ہیں کہ ان میں ایک نہ ایک علت ضرور موجود ہے، اور طحاویؒ اور ابن عبد البرؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ بسم اللہ کو جہراً پڑھنا اعراب کی قرائت ہے۔ اور ابن عباسؓ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی جہراً بسم اللہ نہیں پڑھی ہے یہاں تک کہ آپ کی وفات ہوگئی، اس کے مطابق حضرت ابن عباسؓ کی دونوں روایتوں میں تعارض پایا گیا۔ ف۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کبھی بھی بطور قراءت بسم اللہ جہراً نہیں پڑھی ہے، البتہ تعلیم کی غرض سے کبھی کبھی اس کا جہر کیا ہے، اس طرح دونوں روایتوں کا تعارض ختم ہو گیا، اسی بناء پر مصنف نے فرمایا ہے (آئندہ)۔

قلنا هو محمول على التعليم، لان انساً اخبر انه عليه السلام كان لايجهر بها.

ترجمہ:- ہم نے (امام شافعیؒ کے جواب میں) کہا کہ وہ روایت تعلیم پر محمول ہے کیونکہ حضرت انسؓ نے خبر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ کو نماز میں جہراً نہیں پڑھتے تھے۔

توضیح:- احناف کے نزدیک بسم اللہ کو جہراً نہ کہنے کے دلائل

قلنا هو محمول على التعليم، لان انساً اخبر انه......الخ

ہم یہ کہتے ہیں کہ بسم اللہ کو جہراً پڑھنا لوگوں کو سکھانے کی غرض سے تھا۔ ف۔ اول تو جہراً پڑھنے کا مکمل ثبوت نہیں ملتا ہے اور اگر اس کا ثبوت ہو جائے تو بھی اسے تعلیم پر محمول کیا جائے گا یعنی آپ کے جہر کرنے کا مقصد یہ بتانا تھا کا عوام یہ جان لیں کہ اس موقع پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے۔

ف۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ اس کے برعکس کیوں نہیں کہا جاتا ہے کہ آپ عوام کو بتانے کے لئے آہستگی کے ساتھ بسم اللہ کہدیا کرتے تھے کہ آہستہ پڑھنا بھی جائز اور صحیح ہے تو جواب یہ ہوگا کہ اخفاء کا ثبوت نہایت صحیح کثیر احادیث سے ہوتا ہے اس لئے اس کی تاویل نہیں کی جا سکتی ہے، حازمیؒ نے کہا ہے کہ بسملہ کے اخفاء کی حدیثیں ایسی نصوص صریحہ ہیں کہ جن میں تاویل کرنے کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے لان انساً الخ کیونکہ حضرت انسؓ نے ہمیں بتایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بسم اللہ الخ

کو جہراً کے ساتھ نہیں پڑھتے تھے۔
ف۔ صحیح مسلم میں حضرت انسؓ سے صریح روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمانؓ سب کے پیچھے نماز پڑھی مگر میں نے ان میں سے کسی کو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو پڑھتے ہوئے نہیں سنا، میں مترجم کہتا ہوں کہ بخاریؒ نے بھی ایسی ہی روایت کی ہے۔م۔
اس روایت کا مطلب ہر گز یہ نہیں ہے کہ وہ بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے بلکہ ان کی مراد یہ تھی کہ اس طرح بسم اللہ نہیں پڑھی کہ میں سن لیتا یعنی انہوں نے بسم اللہ میں جہر نہیں کیا، کیونکہ حضرت انسؓ سے ہی دوسری روایت میں انہوں نے تصریح کی ہے کہ **فکانوا لا یجھرون بسم اللہ الرحمن الرحیم**، یعنی یہ حضرات بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہنے میں جہر نہیں کرتے تھے، یہ روایت امام احمدؒ و نسائیؒ کی ہے، مگر سند میں امام بخاریؒ کی شرط کے مطابق ہے، اور اس سے بھی زیادہ روایت یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرات ابو بکر و عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی اور وہ سب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو آہستگی کے ساتھ کہتے تھے، یہ ابن ماجہ کی روایت ہے، اور صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت انسؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ وابو بکر و عمرؓ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں اسرار کرتے تھے یعنی آہستہ پڑھتے تھے۔
اور طبرانیؒ نے کہا ہے کہ **حدثنا عبداللہ بن وھیب حدثنا معتبر بن سلیمان عن ابیہ عن الحسن عن انسؓ ان رسول اللہ ﷺ کان یسر بسم اللہ الرحمن الرحیم وابابکر وعمر و عثمان وعلیاً** یعنی انسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر و عمر و عثمان و علیؓ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو سراً پڑھا کرتے تھے۔ف۔ یہ اسناد بہت عمدہ ہے۔م۔ ابن عبد البر اور ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ یہی قول حضرات ابن مسعود، ابن الزبیر، عمار بن یاسر اور عبداللہ بن مغفلؓ اور حکم و حسن بن ابی الحسن و شعبی و نخعی و اعمش و زہری و مجاہد و قتادہ و عمر بن عبد العزیز و اوزاعی و حماد و عبداللہ بن المبارک وابو عبید و احمد و اسحٰق کا ہے۔
ف۔ اور ترمذیؒ نے عبداللہ بن مغفلؓ کی حدیث عدم الجہر کے بعد کہا کہ اسی پر اہل علم میں سے اکثر اصحاب رسول اللہ ﷺ کا عمل ہے جن میں ابو بکر و عمر و عثمان اور علیؓ اور دوسرے بھی ہیں، الخ، اور عبداللہ بن مغفلؓ نے اپنے بیٹے کو زور سے بسم اللہ کہتے ہوئے سنا تو فرمایا خبردار! اسلام میں بدعت مت نکالو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ وابو بکر و عمر اور عثمانؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے اور ان میں سے کسی کو بھی جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوئے میں نے نہیں سنا ہے، اس کی روایت ترمذی، نسائی اور ابن ماجہؒ نے کی ہے۔
واضح ہو کہ حاکم و دار قطنیؒ نے صحیحین کی اس حدیث کی مخالفت کی ہے جو کہ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے اربعہ سب بسم اللہ کو زور سے پڑھا کرتے تھے، پوشیدہ نہ رہے کہ اگر اس کی اسناد صحیح ہوتی تو یہ حدیث، کہ حضرت انسؓ کی اس حدیث کے مخالف نہ ہوتی جس میں جہر نہ کرنے کی روایت ہے اور اسے شیخین یعنی بخاری و مسلم، نسائی، احمد، صحیح ابن خزیمہ، ابن حبان، دار قطنی، طبرانی، ابو یعلی اور دوسروں نے صحیح سندوں کے ساتھ کئی کئی سندوں سے روایت کی ہے، اس کے مقابلہ میں جو جہر کی روایت ہے اس کی اسناد ہی معلول ہے، اس سے اس دعویٰ کی تحقیق ہو گئی کہ بسم اللہ کو جہر نہ کرنا ہی اصل ہے، اور حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سورتوں کے درمیان حد اور فصل نہیں پہچانتے تھے یہاں تک کہ آپ پر بسم اللہ نازل ہوئی (اس سے یہ معلوم ہو جاتا تھا کہ اس سے پہلے کی سورہ ختم ہو کر اس کے بعد نئی سورہ شروع ہو گئی ہے) اس اثر صحیح سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت بسم اللہ کا نزول ہوا ہے لہٰذا یہ قرآن کی ایک آیت ضرور ہے اور چونکہ سورتوں کو فصل کرنے اور ایک کو دوسرے سے امتیاز کرنے کے لئے نازل ہوئی ہے اس لئے یہ آیت کسی سورہ کی جزء نہیں ہے اسی لئے اسے جہر سے پڑھنا بھی نہیں ہے۔
عینی میں ہے کہ ایسی حدیثیں جو استدلال کے قابل ہیں وہ بہت ہیں ان میں سے ایک حدیث صحیح مسلم میں حضرت

ابوہریرہؓ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صلوۃ یعنی سورہ فاتحہ میرے اور میرے بندوں کے درمیان نصفانصف تقسیم کی گئی ہے یعنی اس کا نصف میرے بندے کا ہے، اور میرے بندے کے لئے وہی ہے جو اس نے مانگا، بندہ کہتا ہے **الحمدللہ رب العالمین** تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندے نے میری حمد کی، بندہ کہتا ہے الرحمٰن الرحیم، اللہ فرماتا ہے بندہ نے میری ثناء کی بندہ کہتا ہے **مالك یوم الدین** اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری بندگی کی، بندہ کہتا ہے **ایاك نعبد وایاك نستعین**، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میرے اور میرے بندہ نے میری بندگی کی، بندہ کہتا ہے **اهدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیهم غیر المغضوب علیهم ولا الضالین**، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ سب آیات میرے بندہ کے واسطے ہیں۔

ابن عبدالبرؒ نے فرماتے ہیں کہ اس حدیث نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جزو نہیں ہے بلکہ اس سے خارج ہے، اور یہ حدیث ایسی صریح ہے جو کسی تاویل کا بھی احتمال نہیں رکھتی ہے، اور بسم کا فاتحہ سے خارج ہونے کے بارے میں مجھے اس سے بڑھ کر اس سے زیادہ واضح حدیث معلوم نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ اس سورہ کو دو حصوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے کہ اس کی ابتداء بسم اللہ سے نہیں بلکہ **الحمد للہ** سے ہے اور ایاک نعبد پر نصف یا مجموعۃ تین آیتیں ہوئیں جو اللہ تعالیٰ کی تعریف میں ہیں، اور درمیان کی ایک آیت ایاک نعبد اللہ اور بندے کے درمیان کی مشترک ہے اور آخر کی تین آیتیں خالص بندہ کے لئے ہوئیں، جن کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا ہے **هؤلاء لعبدی** کہ یہ سب آیتیں میرے بندے کے واسطے ہیں، اس میں لفظ ھؤلاء جمع کے لئے جو کم سے کم تین کے لئے بولا جاتا ہے، ایسی ہی روایت ابوداؤد اور نسائی میں صحیح اسناد کے ساتھ موجود ہے، اس میں امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق تقسیم صحیح نہیں ہوتی ہے کیونکہ اگر **انعمت علیهم** پر ایک آیت شمار نہ کریں تو بندہ کے واسطے صرف دو اور باقی چار سب اللہ تعالیٰ کے واسطے ہوں گی، اور اگر انعمت علیہم پر آیت شمار کریں تو آیتیں کل آٹھ ہو جائے گی، بہر حال حدیث میں تو نصفانصف کی تصریح موجود ہے، یہ سب اس کے خلاف صورتیں ہیں۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دار قطنی میں بسم اللہ سے شروع ہے اس طرح سے کہ جب بندہ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندہ نے مجھے یاد کیا، آخر تک، اس کا جواب عینیؒ نے اس طرح دیا ہے کہ اس روایت میں عبداللہ زیاد بن سمعان ایک راوی ہے جو کذاب ہے، مالک، ہشام بن عروہ، احمد، ابن معین، ابن حبان، ابوداؤد اور نسائی اور دوسرے ائمہ نے اس کو کذاب اور متروک ہے ایسی صورت میں یہ کس طرح جائز ہوگا کہ صحیح مسلم وغیرہ کی روایت کو اس روایت سے بدل دیا جائے، اسی طرح استدلال کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ سورہ **تبارك الذی** کی فضیلت کے سلسلہ میں صحیح میں ایک روایت ہے کہ ایک روایت ہے کہ ایک ایسی سورہ ہے جس میں تیس آیتیں ہیں اس نے اپنے پڑھنے والے کی طرف سے یہانتک جھگڑا کیا کہ اسے چھڑا لیا، اس سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ تمام سورتوں میں آیتیں شمار کرنے والے تمام لوگوں نے سورہ ملک کو بغیر بسم اللہ کے تیس آیتیں ہی شمار کی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بسم اللہ اس کا جزو نہیں ہے۔

واضح ہو کہ ہم نے احادیث میں جن سے جہرا پڑھنے کا ثبوت ہوتا ہے اور ان احادیث میں جن سے سرا پڑھنے کا ثبوت ہوتا ہے اس طرح تطبیق نہیں دی کہ اس سے تعلیمی مقصد کے بغیر بھی جہر کرنا جائز ہو، کیونکہ ایسا کرنا اسی وقت ممکن ہوتا کہ جہر کرنے کے سلسلہ کی ایک بھی حدیث اس درجہ صحت تک پہنچتی اور اب میں یہ بھی کہتا ہوں کہ جہر کرنے کے سلسلہ کی وہ ساری حدیثیں جن کو ابن حجر اور دوسروں نے اکٹھا کر دیا ان کا کثرت طرق یا بہت سی اسناد کے ساتھ پائی جانے والی یہاں اس لئے سود مند نہیں ہو سکتی ہیں کہ وہ سب صحیح اور صریح حدیثوں کی مخالفت ہیں، مثلاً حضرت انسؓ نے خلفاء راشدین کے بارے میں یہ خبر دی ہے کہ انہوں نے کبھی بھی جہر نہیں کیا ہے، اور یہ روایت صحیح ہے، لیکن حاکم اور دار قطنیؒ نے حضرت انسؓ سے ہی یہی

روایت کی ہے کہ خلفائے راشدین کبھی بھی بسم اللہ کو جہراً ادا نہیں کرتے تھے، اور یہ روایت صحیح ہے اور انسؓ سے ہی حاکم اور دار قطنی نے ان خلفائے راشدین سے ہی ہمیشہ جہر کرنے کی روایت کی ہے۔ حالانکہ ان کا راوی کذاب ہے ایسی صورت میں اس میں قوت کس طرح آسکتی ہے، جبکہ روافض کا کذب اور ان کا غلو اس میں مشہور ہو چکا ہے۔

اس مسئلہ میں حاکم نے انتہائی سستی سے کام لیا ہے اور یہ ظاہر بھی ہے، ان کی اسی کوتاہی برتنے کی بناء پر ابن دحیہؒ نے حاکم کی روایت قبول کرنے سے احتراز کرنے پر سخت تاکید کی ہے کیونکہ وہ صریحاً غلطی کیا کرتے بلکہ موضوع روایتوں کو بھی صحیح کہدیا کرتے اس لئے ان کی تقلید کرنے والے آفتوں اور فتنوں میں مبتلاء ہو جاتے، اسی طرح سے دار قطنی نے بھی اپنی کتاب میں ایسی ہی ضعیف وغیرہ روایتیں بھر دی ہیں، جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی ہیں، ایک مرتبہ انہوں نے مصر میں رہ کر اپنے دوستوں اور ماننے والوں کی فرمائش پر بسم اللہ کو جہر سے پڑھنے کے متعلق مکمل ایک رسالہ مرتب کر دیا تو کسی مالکی عالم نے انہیں قسم دیتے ہوئے کہا کہ اس پورے رسالہ میں کوئی بھی حدیث اگر صحیح ہو تو ہمیں بتادیں تو جواب دیا کہ اس سے متعلق ہمیں رسول اللہ ﷺ سے کوئی روایت نہیں ملی ہے، حالانکہ یہی حدیثیں ہیں جو حضرت انس وابن عباس وعلی وعمار وابن عمر وابو ہریرہ وام سلمہ و جابر اور عائشہؓ سے مروی ہیں جو حضرت انسؓ اور دوسروں سے مروی صحیح حدیثوں کے معارض ہیں، اور خطیبؒ نے تعصب اور تجاہل کرنے میں حد کر دی ہے کہ جان بوجھ کر موضوع احادیث کو بھی بغیر بیان کے معارضہ میں پیش کر دیا ہے۔

سروجی نے ابن الجوزیؒ سے نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ خطیب بغدادیؒ کی جرح و تعدیل پر کسی کو اعتبار نہیں ہے، اسی طرح نوویؒ سے بھی تعجب ہے کہ انہوں نے کس طرح ایسی احادیث سے استدلال کیا ہے، حالانکہ ایسے ہی لوگوں کی احادیث کے بارے میں یہ کہتا ہی عمدہ شعر کہا گیا ہے **ان کنت لاتدری فتلك مصیبة، وان کنت تدری فالمصیبة اعظم**، یعنی اگر تم ایسی مجہول روایتوں پر مطلع نہ ہو سکے تو یہ ایک ہی مصیبت ہے، اور اگر تم ان کی خرابیوں پر واقف ہو گئے تو تمہاری مصیبت بہت بڑھ گئی، یہانتک عینی کی عبارت کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔

اور میں مترجم نے اپنے مقدمہ میں حدیث کے طبقات و درجات بیان کر دئے ہیں ان کے سمجھ لینے سے یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو جائے گی کہ ایسی احادیث پر واقف ہونے کی صورت میں مصیبت بڑھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے متقدمین محدثین نے ان کی باطنی خرابیاں اور ان کی بیماریاں جان لینے کے بعد انہیں چھوڑ دیا تھا، مگر بعد والے جو ان کی خرابیوں سے غافل ہوں اگر ان احادیث کو چھوڑ دیں تو ایک مشکل اور نہ چھوڑیں تو دوسری مشکل ہے، اسی لئے شیخ المشایخ مولانا عبد العزیزؒ نے اور ان کے والد شاہ ولی اللہؒ نے تنبیہ کر دی ہے کہ اس طبقہ کی حدیثوں کو لے کر صحیح حدیثوں کے مسائل میں تغیر نہیں کرنا چاہئے، بالخصوص اعتقادی مسائل میں ان سے کسی مسئلہ کو ثابت کرنا بڑی غلطی ہے اور علامہ سیوطیؒ اور دوسرے کے لئے یہی کتابیں ماخذ ہیں۔

الحاصل بسم اللہ میں جہر کا نہ ہونا ثابت ہے، یہاں تک کہ طحاویؒ نے نخعیؒ سے روایت کی ہے کہ بسم اللہ کو زور سے پڑھنا بدعت ہے، میں کہتا ہوں کہ حضرت عبد اللہ بن مغفلؓ کی حدیث میں بھی یہی مذکور ہے، اسی لئے ہم نے کہا ہے کہ اگر جہر کرنے کی کوئی روایت ثابت ہو تو اس بات پر محمول کیا جائے گی کہ یہ تعلیم کی غرض سے ہے، اور اس مسئلہ میں آخری تحقیق یہی ہو گی کہ اس کو آہستہ پڑھنا ہی سنت ہے، اس تحقیق کو اچھی طرح یاد رکھو، واللہ اعلم، دوسری بات یہ ہے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزو نہیں ہے، اور نہ ہی کسی بھی سورہ کا جزء ہے البتہ قرآن کی آیت ضرور ہے اور بسم اللہ کو آہستہ پڑھنا ہی سنت ہے۔

ثم عن ابی حنیفه انه لایاتی بها فی اول رکعة کالتعوذ، وعنه انه یاتی بها احتیاطا، وهو قولهما ولایأتی بها بین السورة والفاتحة الاعند محمد، فانه یأتی بها فی صلوة المخافتة، ثم یقرأ فاتحة الکتاب وسورة، او ثلاث آیات من ای سورة شاء، فقراء ة الفاتحة لاتتعین رکنا عندنا، وکذا ضم السورة الیها.

ترجمہ:- پھر ابو حنیفہؒ سے منقول ہے کہ بسم اللہ کو ہر رکعت کے شروع میں کہے جیسا کہ تعوذ کو ہر رکعت کی ابتداء میں کہتے

ہیں، اور ان۔۔۔ سے ہی یہ بھی مروی ہے کہ احتیاطاً ہر رکعت میں کہدیا کرے، یہی قول صاحبینؒ کا ہے، اور بسم اللہ کو سورہ فاتحہ اور سورہ کے درمیان کہے، البتہ امام محمدؒ کے نزدیک اسے سریہ نمازوں میں کہنا چاہئے، پھر سورہ فاتحہ پڑھے اور اس کے ساتھ کوئی ایک سورہ یا کسی بھی سورہ کی تین آیتیں پڑھ لے، اس طرح ہمارے ہاں سورہ فاتحہ کا پڑھنا ہمارے نزدیک رکن کی حیثیت سے لازم نہیں ہے، اسی طرح اس کے ساتھ سورہ ملانا بھی ہے۔

توضیح:۔ بسم اللہ کو ہر رکعت کے شروع میں کہنا، ثناء کے بعد کسی دوسری سورہ کا پڑھنا

ثم عن ابی حنیفه انه لایاتی بها فی اول رکعة کالتعوذ......الخ

پھر امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے۔ف۔ جو حسنؒ کے واسطہ سے ہے۔ف۔ کہ بسم اللہ کو صرف ایک مرتبہ نماز شروع کرتے وقت پڑھے۔انه لایاتی الخ یعنی بسم اللہ کو اعوذ باللہ کی طرح ہر رکعت کے شروع میں نہ کہے۔

وعنه انه یاتی بها احتیاطا......الخ

اور ابو یوسفؒ کی روایت سے ہے۔مع۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ بسم اللہ کو ہر رکعت کی ابتداء میں احتیاطاً کہہ دیا جائے۔ف۔ کیونکہ اس کے بارے میں مختلف احادیث اور آثار موجود ہیں، کہ بسم اللہ سورہ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں، یہانتک کہ علماء اجتہادات بھی بہت مختلف ہیں، اس لئے اگر فی الواقع وہ فاتحہ کا حصہ ہو تو اس کے نہ پڑھنے سے سورہ فاتحہ بھی پوری ادا نہ ہوگی اور اس کا اعادہ واجب ہوگا۔ف۔ اگرچہ قول صحیح و محقق یہی ہے کہ یہ جزو فاتحہ نہیں ہے، مگر یہ فیصلہ اجتہادی ہے اس لئے اس کے خلاف یہ احتمال باقی رہ جاتا ہے کہ اس تحقیق میں تھوڑی سی خطاء باقی رہ گئی ہو۔

وهو قولهما......الخ

اور صاحبینؒ کا قول ہے۔ف۔ اور عینیؒ نے فقیہ زاہدی کا قول نقل کیا ہے کہ بالاتفاق اسے پڑھنا ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک احتیاطاً واجب ہے، اور امام اعظمؒ کی بھی ایک روایت یہی ہے، لیکن حسنؒ سے جو روایت موجود ہے اس کے مطابق واجب نہیں۔ مع۔ لیکن بحر الرائق میں اس روایت کو اس لئے ضعیف کہا ہے کہ اس سے متون کی مخالفت ہوتی ہے، اور مجتبیٰ زاہدی میں ہے کہ نماز کے علاوہ بھی یہی صحیح ہے کہ بسم اللہ پڑھ لینا واجب ہے۔

میں کہتا ہوں کہ دلیل کا تقاضا تو یہی ہے کہ احتیاط مذکور واجب ہو، جیسا کہ مخفی نہیں ہے، پھر میں نے نہر الفائق میں دیکھا ہے اس میں لکھا دیکھا ہے کہ حق بات تو یہ ہے کہ دلیل میں غور کرنے سے یہی بات واضح ہے، لیکن سرسری طور پر مذہب اور متن کی کتابوں میں دیکھنے سے واجب نہ ہو تاہی زیادہ راجح ہے، اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ دلیل کا تقاضا تو یہ ہے کہ سورہ کے ساتھ بھی بسم اللہ پڑھنا مسنون ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ حسنؒ کی روایت جو امام اعظمؒ سے ہے یہی ہے، کیونکہ جس طرح سورہ فاتحہ ابتداء سے انتہاء تک پڑھی جاتی ہے دوسری سورتیں اس طرح نہیں پڑھی جاتی ہیں، اور سورتوں میں سے کچھ حصوں یا آیتوں کا چھوڑ دینا مضر نہیں ہے، لیکن اختلاف کے خیال سے اور قرآن پاک کی رعایت سے مستحب ہے، اور تنویر میں کہا ہے کہ نمازی ہر رکعت کی ابتداء میں بسم اللہ پڑھ لیا کرے، اگرچہ جہری نماز ہو، لیکن سورہ اور فاتحہ کے درمیان بسم اللہ کہنا مسنون نہیں ہے اگرچہ سری نماز ہو، اور اگر پڑھ لے تو بھی بالاتفاق مکروہ نہیں ہے۔

ولایاتی بها بین السورة والفاتحة الاعند محمد......الخ

اور بسم اللہ کو سورہ فاتحہ کے درمیان نمازی نہ کہے،، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک سری نماز میں بسم اللہ کہہ لینا چاہئے۔ف۔ اور حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے کہ سورہ سے پہلے پڑھ لینا بہتر ہے، جیسا کہ عینی میں ہے، اور یہ بات عام ہے کہ جہری نماز ہو یا سری سب میں پڑھنا اولیٰ ہے اس صورت میں جبکہ سورہ شروع سے پڑھی جائے، لیکن ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول

اللہ علیہ السلام دوسری رکعت کے لئے اٹھتے تو بغیر سکوت کئے ہوئے الحمد للہ سے قراءت شروع کر دیتے یہ روایت مسلم کی ہے، بظاہر اس روایت کی مراد یہ ہے کہ آپ اتنی دیر سکوت نہیں کرتے جس میں سبحانک وغیرہ پڑھی جا سکتی ہے، جبکہ بسم اللہ کے لئے سکوت کرنے کے کوئی خاص مقدار نہیں ہوتے ہے۔ واللہ اعلم۔ م۔

ثم یقرأ فاتحۃ الکتاب وسورۃ، ......الخ

پھر بسم اللہ سے فارغ ہوتے ہی بغیر توقف کے نمازی سورہ فاتحہ شروع کر دے۔ ف۔ جبکہ وہ مقتدی نہ ہو (یعنی امام ہو یا تنہا پڑھ رہا ہو) یعنی جتنی قراءت کرنی واجب ہے اسے مکمل اور پوری پڑھے ایک تشدید بھی اس کی نہ چھوڑے، اس بناء پر اگر "اِیَّاکَ نَعْبُدُ" میں کوئی شخص بغیر تشدید کے تخفیف کے ساتھ اِیَاکَ پڑھ لے گا تو عام مشائخ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، مگر مختار مذہب یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی۔ الخلاصہ۔ ع۔ پھر آمین کہے، اور اس کے کہنے میں سنت یہی ہے کہ آہستہ کہے، آمین مد کے ساتھ اور تشدید کے ساتھ پڑھنا سخت اور بڑی غلطی ہے، اس کے باوجود ایسا پڑھ لینے سے نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ یہ قرآن کا لفظ نہیں ہے، اسی پر فتویٰ بھی ہے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل اور مصلی امام ہو یا مقتدی۔ التبیین۔ السراج۔ م۔ وسورۃ اور کوئی سورہ پڑھ لے۔

او ثلاث آیات من ای سورۃ شاء......الخ

یا جس کسی سورہ میں سے چاہے تین آیتیں پڑھ لے۔ ف۔ لیکن اگر چھوٹی تین آیتوں کے برابر بڑی ایک یا دو آیتیں ہوں تو کراہت تحریمی نہیں رہے گی لیکن کراہت تنزیہی باقی رہے گی اور یہ کراہت اسی وقت دور ہوگی جب مقدار مسنون پڑھی جائے۔ ع۔ د۔

فقراء ۃ الفاتحۃ لاتتعین رکنا عندنا، وکذا ضم السورۃ الیھا......الخ

قراءۃ قرآن اگرچہ رکن ہے مگر اس کے لئے سورہ فاتحہ کو ہی پڑھنا بحیثیت رکن کے متعین نہیں ہے اور اسی حال اس کے ساتھ سورہ ملانے کا بھی۔ ف۔ بلکہ یہ دونوں چیزیں واجب ہیں، اسی بناء پر ان کے ترک سے اعادہ واجب ہے، برخلاف رکن کے کہ اس کے چھوٹ جانے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے کیونکہ کسی چیز کے لئے جو چیز رکن ہوتی ہے وہ اس کی ذات کا قوام ہوتی ہے یعنی اس کی اصلیت اور بناوٹ میں شامل ہوتی ہے، لہٰذا جیسا کسی رکن کا وجود نہ ہوگا تو وہ شئی ہی نہ ہوگی، لیکن واجب کے نہ ہونے یا اس کے چھوٹ جانے سے اصل شیء پوری ہو جائے۔ م۔

شیخ ابو بکر الرازیؒ نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ صرف سورہ فاتحہ پڑھ لینے سے نماز جائز ہو جاتی ہے۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابو ہریرۃؓ سے صرف سورہ فاتحہ پر نماز میں اکتفاء کر لینے کے مطابق پوچھا تو جواب دیا کہ یہ سوال خود رسول اللہ علیہ السلام سے بھی کیا گیا تھا تو فرمایا تھا کہ جب سورہ فاتحہ پوری کر لو تو وہی کافی ہے اور اگر اس سے کچھ زیادہ کر لو تو افضل ہے، جیسا کہ رزین کی روایت تیسیر میں ہے، چنانچہ سورہ فاتحہ یا کوئی بھی سورہ کوئی رکن نہیں ہے۔

خلافا للشافعی فی الفاتحۃ، ولمالک فیھما له قوله علیه السلام: لا صلوۃ الا بفاتحه الکتاب وسورۃ معھا، وللشافعی قوله علیه السلام: لا صلوۃ الا بفاتحۃ الکتاب.

ترجمہ:- امام شافعیؒ کا اختلاف ہے سورہ فاتحہ کے بارے میں اور امام مالکؒ کا اختلاف ہے فاتحہ اور سورہ دونوں کے بارے میں، امام مالکؒ کی دلیل رسول اللہ علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ نماز نہیں ہوتی ہے مگر فاتحہ الکتاب اور اس کے ساتھ ایک اور سورہ ملانے سے، اور امام شافعیؒ کی دلیل رسول اللہ علیہ السلام کا یہ فرمان ہے کہ نماز نہیں ہوتی ہے مگر فاتحہ الکتاب سے۔

توضیح:-امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مسلک اور ان کی دلیل

خلافا للشافعی فی الفاتحۃ، ......الخ

فاتحہ کے بارے میں امام شافعیؒ نے اختلاف کیا ہے۔ف۔یہانتک کہ اگر کوئی اِیَاکَ کو عمداً یعنی جان کر بغیر تشدید کے پڑھے گا تو اس پر کفر کا فتویٰ ہوگا، کیونکہ بغیر تشدید کے "ایاک" کاف خطاب کے بغیر اِیا و ایاء و اَیاۃ و اِیاۃ کے معنی آفتاب کی روشنی کے ہیں مصباح اللغات، انوار الحق قاسمی، سورج یا دھوپ کے ہیں، اور اگر کوئی بھول کر یا معنی سے ناواقفیت کی بناء پر پڑھے گا تو اس پر سجدہ سہو لازم آئے گا، تتمۃ الشافعیہ۔ع۔

واضح ہو کہ امام شافعیؒ جو فاتحہ کو رکن کہتے ہیں وہ اسی معنی میں ہے جسے ہم وجوب کہتے ہیں، یہانتک کہ وہ ثبوت فاتحہ کو قطعی نہیں کہتے ہیں، البتہ اتنی بات ہے کہ وہ فرض یا رکن کو کچھ قطعی ہونے کے ساتھ مخصوص نہیں کرتے، اس طرح ہم میں اور ان میں تحقیق کے مطابق اختلاف کی اصل جگہ یہ ہے کہ جس چیز کے ترک سے نماز فاسد ہوتی ہے کیا اس چیز کا ایسا ہونا ضروری ہے جس کا ثبوت قطعی دلیل سے ہو یا ایسا ہونا ضروری نہیں ہے تو شافعیہؒ نے کہا ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے، کیونکہ نماز مجمل ہے، اسی بناء پر اگر کسی حدیث سے کوئی چیز اس میں ثابت ہو اور کوئی دوسری دلیل ایسی نہ ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ چیز اس کی حقیقت میں سے نہیں ہے تو وہ چیز اس کی حقیقت میں سے رکن ٹھہرائی جائے گی، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نماز اصلی قطعی ہے اس قطعی کے ساتھ ایسی جہر ملائی جائے جو قطعی الثبوت نہ ہو بلکہ ظنی الثبوت ہو اس کے ترک سے فساد ہونا ظنی ہوگا، حالانکہ جب نماز شروع ہوئی اس وقت وہ صحیح شروع ہوئی، اور افعال یقینی ہوئے اس لئے اس ظنی سے اس قطعی کا بطلان نہ ہوگا۔

ولمالک فیھا......الخ

اور امامؒ نے فاتحہ اور سورہ دونوں میں اختلاف کیا ہے۔ف۔یہ نسبت امام مالکؒ کی طرف درست نہیں ہے، کیونکہ مذہب مالکیہ کی کتابوں میں سے ایک کتاب، کتاب الجواہر ہے اس میں لکھا ہے کہ امام مالکؒ کے نزدیک سورہ ملانا سنت ہے، اور مجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ کسی نے بھی سورہ ملانے کو رکن کہا ہو۔ مع۔

له قوله علیه السلام: لا صلوة الا بفاتحه الکتاب وسورة معها......الخ

امام مالکؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ نماز نہیں ہے مگر قراءت فاتحہ اور اس کے ساتھ سورہ ملانے سے، یہ حدیث ابن عدیؒ نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے، اور ایک روایت میں ہے کہ فاتحہ اور جو میسر ہو، اور ایک روایت میں ہے کہ فاتحہ کتاب اور اس کے ساتھ کچھ اور کے بغیر نماز کافی نہیں ہے، ایک روایت میں ہے کہ فاتحہ و سورہ خواہ فرض نماز ہو یا کچھ اور ہو، ترمذی نے بھی اس کی روایت کی ہے، مگر محدث عبد الحق دہلویؒ نے اسے ضعیف کہا ہے کیونکہ اس کے ایک راوی طریف بن شہاب السعدی ہیں، اور ابوداؤد کی روایت میں ابو سعیدؓ سے اس طرح مرفوعاً ہے کہ ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم فاتحہ کتاب اور جو میسر ہو پڑھیں، اور اس کی روایت کی ہے ابن حبان واحمد وابو یعلی اور دار قطنی نے، اور اسی معنی میں ابن ابی شیبہ واسحق بن راہویہ اور طبرانی وغیرہ نے بھی روایت کی ہے، اور اسی کے مانند طبرانی سے عبادہ بن الصامت سے اور ابن عدی نے عمران بن حصین سے، اور ابو نعیم نے تاریخ اصبہان میں ابو مسعود انصاری سے روایتیں کی ہیں۔

اور ابوداؤد کی وہ حدیث جس میں رفاعہ بن رافع کی جس میں اس اعرابی کی نماز کا بیان ہے جس نے مسجد میں آکر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں بری طرح نماز پڑھی، اس لئے آپؐ نے آخر میں اس کو تعلیم فرمائی اس طرح کہ پھر تکبیر کہو پھر پڑھو ام القرآن اور جو چاہو، اور احمدؒ نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ مع۔ اور صحیح میں فاتحہ کے بعد واو نہیں ہے بلکہ ام القرآن فصاعداً یعنی فاتحہ اور اس سے زیادہ ہے، الحاصل ابو سعیدؓ کی حدیث یعنی سندوں سے خود درجہ حسن پر ہے اور زیادتی اسناد کی وجہ سے اس میں اتنی

قوت آگئی کہ صحت کے درجہ پر پہونچ گئی ہے، لیکن امام شافعی فاتحہ کی طرح سورہ کو رکن نہیں کہتے ہیں اسی لئے اس کے ترک ہو جانے پر نماز میں فساد نہیں مانتے۔م۔ وللشافعي الخ اور امام شافعیؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ نماز تو فاتحہ الکتاب ہی ہے۔ف۔ یہ حدیث صحاح ستہ کے علاوہ ابن حبان اور سنن دار قطنی وغیرہ میں صحیح سندوں سے مروی ہے۔

ولنا قوله تعالىٰ ﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ والزيادة عليه بخبر الواحد لايجوز، لكنه يوجب العمل فقلنا بوجوبهما.

ترجمہ:-اور ہماری دلیل اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کہ قرآن میں سے جتنا تم کو آسان معلوم ہو پڑھو، اور اس فرمان صریح پر خبر واحد کے ذریعہ زیادتی جائز نہ ہوگی، لیکن خبر واحد ہے، عمل کرنے کو واجب کر دیا ہے، اس لئے ہم نے دونوں کے وجوب کو کہا ہے۔

توضیح:-احناف کی دلیل، جس کسی کو سورہ فاتحہ اور دوسری کوئی سورت یاد نہ ہو

ولنا قوله تعالىٰ ﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾...... الخ

یعنی قراءت قرآن کے مسئلہ میں ہم نے قطعی دلائل میں غور کیا تو قرآن پاک میں یہ آیت ملی ﴿فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کہ قرآن میں سے جو آسان ہو پڑھو۔ف۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن ہی سے پڑھو کسی اور جگہ سے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ جو آسان معلوم ہو، اور یہ ایک آیت بھی ہے اور تین آیتیں بھی ہیں، یہانتک کہ قرآن ہونا ثابت ہو جائے، پس اس آیت میں کوئی بات بھی مجمل نہیں ہے، اس کے علاوہ ہمیں حدیث سے بھی معلوم ہوا کہ سورہ فاتحہ پوری اور کچھ زائد کے بغیر نماز ناقص ہوتی ہے، لیکن یہ حدیث مشہور قطعی نہیں ہے۔

والزيادة عليه بخبر الواحد لايجوز...... الخ

اور خبر واحد یعنی غیر مشہور حدیث کے ذریعہ قرآن پر زیادتی کرنی جائز نہیں ہے۔ف۔ کیونکہ زیادتی جائز مان لینے سے پورا قرآن متغیر ہو جاتا ہے، اس طرح علم سے قرآن ہی کی مقدار فرض ہے۔ لكنه الخ لیکن حدیث نے عمل کو واجب کیا ہے۔ف۔ یعنی پوری قراءۃ سورہ فاتحہ پڑھا کرو۔

فقلنا بوجوبهما......الخ

اس بناء پر ہم نے کہا کہ پوری فاتحہ اور کچھ زائد سورت پڑھنے پر عمل کرنا واجب ہے، اس حد تک کہ اگر یہ واجب ترک ہو جائے تو سجدہ سہو کر کے کمی پوری کر لو، اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ پوری سورہ فاتحہ اگرچہ دلیل ظنی سے ثابت ہے لیکن وہ رکن قراءت ہو گئی، اس لئے اس کے ترک ہو جانے سے نماز نہ ہوگی، اور ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ ظنی رکن سے قطعی باطل نہیں ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث سے تو فاتحہ سے بھی زائد پڑھنا واجب ثابت ہوتا ہے تو اس کو بھی رکن کہنا چاہئے، وہ کیوں رکن نہیں ہوا، لہذا حق اور صحیح بات یہ ہوئی کہ آسان مقدار میں پڑھنا فرض ہے خواہ وہ مقدار فاتحہ میں سے ہو یا قرآن کے کسی بھی حصہ سے ہو، اور عملی واجب پوری سورہ فاتحہ اور تین آیت کی مقدار پڑھنا ہے۔

اگر یہ وہم ہو کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث **لاصلوة لمن لم يقرأ بفاتحه الكتاب** یعنی اس شخص کی نماز نہیں ہے جس نے فاتحہ الکتاب نہیں پڑھی تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ فاتحہ نہ پڑھنے والے کی نماز ہی نہیں ہوئی (تو اس نماز کے اعادہ کرنے کا کیا فائدہ ہوگا) جواب یہ ہے کہ ایسی نماز کے نہ ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ مکمل نہیں ہوئی ہے، اسی لئے اس کا اعادہ کرنا واجب ہوتا ہے، اور اعادہ نہ کرنے والا فاسق ہوتا ہے، پس ایسی نماز کا پڑھنا اور نہ پڑھنا برابر ہے۔

اس تفصیل کی بناء پر تو وہ نماز ہی نہیں ہوئی، اسی دوسری حدیث ہے **لاايمان لمن عهد له** یعنی جس کا عہد نہ ہو اس کا

ایمان نہیں ہے، حالانکہ اہل السنۃ کا اس بات پر اجماع ہے کہ عہد توڑنے بلکہ کسی کو قتل کرنے سے بھی کوئی کافر نہیں ہوتا ہے، تو جس طرح اس جگہ ایمان کا ہونے سے اس کا مکمل نہ ہونا مراد ہے اسی طرح نماز میں بھی فاتحہ نہ پائے جانے سے مکمل نہ ہونا مراد ہے، پس اس سے نماز کا نقصان مراد ہوا، اس جگہ یہ مراد ہرگز نہیں ہو سکتی ہے کہ وہ نماز ناقص طور پر بھی ادا نہ ہوئی کیونکہ یہ بات ابوداؤد اور صحیح مسلم کی حدیث کے صریح مخالف ہے۔

اس حدیث میں ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ **من صلی صلوۃ لم یقرأ فیھا بام القرآن ھی خداج غیر تمام الخ** یعنی جس نے فاتحہ کے بغیر نماز پڑھی تو وہ نماز ناقص ہوگی اور پوری نہ ہوگی، یہ سن کر ہم نے پوچھا اے ابوہریرہؓ ہم تو اکثر اوقات امام کے پیچھے ہوتے ہیں (اس لئے فاتحہ نہیں پڑھ سکتے ہیں) تو انہوں فرمایا اے فارسی انسان! تم اسے اپنے دل میں پڑھ لیا کرو، کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو پڑھتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ صلوۃ یعنی سورہ فاتحہ میرے اور میرے بندے کے درمیان نصفانصف تقسیم کی گئی ہے، آخر حدیث تک۔

یہ وہی حدیث ہے جسے ہم نے بسم اللہ کے جزء فاتحہ نہ ہونے میں بیان کی ہے، یہ حدیث بخاری کے علاوہ پانچوں ائمہ محدثین نے بیان کی ہے، اس حدیث سے تین باتیں ثابت ہوئیں، اول یہ کہ فاتحہ چھوٹ جانے سے نماز ناقص ہوتی اور بالکل باطل نہیں ہوتی ہے، دوم یہ کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزء نہیں ہے، سوم یہ کہ صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں ہر شخص کو یہ بات معلوم تھی، کہ امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے ہیں، اور ابوہریرہؓ کا جواب یہ نہیں ہوا کہ امام کے پیچھے ہونے سے کیا نقصان ہے، امام کے پیچھے تو پڑھا کرتے ہیں، بلکہ یہ کہا کہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو، اس سلسلہ میں ہم آئندہ بحث کریں گے، اللہ سے ہی توفیق کے ہم طالب ہیں۔

اگر کسی کو فاتحہ اور سورہ یاد نہ ہو اس کے باوجود وہ یاد کرنے کی کوشش نہ کرے تو اسے معذور نہیں کہا جائے گا، لیکن جب تک یاد نہ ہو جائے اس وقت تک ظاہراً اس کا حکم یہ ہوگا کہ وہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر پڑھا کرے، ابوداؤد کی اس روایت کی بناء پر کہ اعرابی سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس طرح اللہ نے تمہیں وضوء کرنے کا حکم دیا ہے اسی طرح وضوء کرو پھر تکبیر کہو پھر اگر تمہیں کچھ قرآن یاد ہو تو اسے پڑھو ورنہ اللہ تعالیٰ کی حمد کرو تکبیر کرو اور تہلیل کرو، الحدیث۔م۔

واذا قال الامام وَلَا الضَّآلِّیْنَ قال آمین، ویقولھا المؤتم لقولہ علیہ السلام: اذا امّن الامام فامّنوا، ولا متمسک لما لکؒ فی قولہ علیہ السلام: اذا قال الامام ولا الضالین فقولوا آمین من حیث القسمۃ، لانہ قال فی آخرہٖ فان الامام یقولھا، قال ویخفونھا لما روینا من حدیث ابن مسعودؓ.

ترجمہ:- اور جب امام ولا الضالین کہے تو خود بھی آمین کہے، اور مقتدی بھی وہی کہے، رسول اللہ ﷺ کی اس فرمان کی وجہ سے کہ جب امام ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، اور امام مالکؒ کے لئے اس حدیث میں کوئی دلیل نہیں ہے جس میں فرمایا ہے کہ جب امام کہے ولا الضالین تو تم لوگ آمین کہو تقسیم کے اعتبار سے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے آخر میں یہ بھی فرمایا ہے کہ امام بھی تو یہی کہتا ہے، کہا، اور وہ لوگ آمین کو آہستہ کہیں گے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی اس حدیث کی وجہ سے جس کی ہم نے روایت کی ہے۔

توضیح:- آمین کہنا، اس کی حدیث سے دلیل، آہستہ آمین کہنا، حدیث سے دلیل

واذا قال الامام ولا الضالین قال آمین......الخ

اور جب امام ولا الضالین کہے تو خود بھی آمین کہے۔ف۔ تو بلا توقف آہستگی کے ساتھ، اور مقتدی بھی آمین کہے۔ف۔ آہستہ کہے اگرچہ سری نماز میں سنے۔ المحیط۔ اگر جمعہ اور عیدین کی جیسی نمازوں کی واسطہ سے سنے یا دوسرے مقتدی سے سنے، السراج۔

لقوله عليه السلام: اذا امّن الامام فامّنوا......الخ

اس حدیث کی بناء پر۔ف۔ یہ حدیث پوری اس طرح ہے **اذا امن الامام فامنوا فانه من وافق تامينه تامين الملائكة غفرله ماتقدم من ذنبه**، یعنی جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کے موافق ہو جائے گا، اس کے اگلے سارے گناہ بخش دیئے جائیں گے، اس کی روایت السنہ نے کی ہے۔

امام مالکؒ نے کہا ہے کہ فقط مقتدی آمین کہے اور امام نہیں کہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **انما جعل الامام ليؤتم به فاذا كبر فكبروا واذا قرأ فانصتوا واذا قال ولاالضالين فقولوا آمين** یعنی امام تو اسی واسطے سے بنایا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے اس لئے تم اس کی مخالفت نہ کرو، اور وہ جب تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو اور وہ جب پڑھے تو تم خاموش رہو اور وہ جب ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو، مسلم وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے۔

اس حدیث سے امام مالکؒ نے یہ دلیل نکالی ہے کہ اس میں امام اور مقتدی دونوں کے عمل تقسیم کر دیئے گئے ہیں اور ہر ایک اپنا اپنا کام کرے چنانچہ امام کا کام قراءت مکمل کرنی ہے اور مقتدی کا کام ہے آمین کہنا، لیکن مصنفؒ نے اس تقسیم کے عمل کو قبول نہیں کیا بلکہ رد کر دیا ہے، دوسری حدیث کی موجودگی کی بناء پر وہ یہ ہے کہ **اذا امن الامام فامنوا** کہ جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو اس میں مقتدی کے ساتھ امام کا کام بھی آمین کہنا بتایا گیا ہے۔

ولامتمسك لما لكؒ في قوله عليه السلام: اذا قال الامام ولاالضالين فقولوا آمين......الخ

اور امام مالکؒ نے اس حدیث سے جو دلیل اخذ کی ہے تقسیم عمل کی وہ مناسب نہیں ہے کیونکہ جس حدیث میں ہے **اذا قال الامام ولاالضالين فقولوا آمين** کہ امام جب ولاالضالین کہے تو تم آمین کہو کیونکہ اس کے آخر میں فرمایا ہے **فان الامام يقولها**، کہ امام بھی آمین کہتا ہے۔ف۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ تقسیم عمل کا دعوی مراد نہیں ہے۔

ابن الہمامؒ نے اس پر یہ ایک اعتراض کیا ہے کہ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے جو یہ فرمایا ہے **واذا قال سمع الله لمن حمده فقولوا ربنا ولك الحمد**، یعنی جب امام **سمع اللهلمن حمده** کہے تو تم کہو **ربنا ولك الحمد**، اس میں بھی تقسیم مراد نہیں ہونی چاہئے کہ امام صرف **سمع الله لمن حمده** کہے اور مقتدی صرف **ربنالك الحمد** کہے حالانکہ رسول اللہ ﷺ سے **ربنا ولك الحمد** بھی کہنا ثابت ہے اس بناء پر امام کو دونوں جملے کہنا ثابت ہوتا ہے البتہ مقتدی کے لئے صرف ایک جملہ **ربنا ولك الحمد** کہنا ثابت ہے، حالانکہ اس موقع پر یہی کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر بھی تقسیم عمل ہے، اس کی مزید تفصیل عنقریب آئے گی، الحاصل فاتحہ کے ختم پر ہر ایک کو خواہ امام ہو یا مقتدی یا تنہا پڑھنے والا آمین کہنا چاہئے۔

قال ويخفونها

اور سب لوگ آمین کو آہستہ کہیں۔ف۔ آمین کہنے پر تو سب کا اتفاق ہے، کہ ہر ایک کو کہنا چاہئے، البتہ کیفیت میں اختلاف ہے کہ آہستہ کہنا چاہئے یا تو زور سے چنانچہ ہمارے نزدیک آہستہ ہی کہنا سنت ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ کا عمل اور آپ کا حکم آہستہ کہنے کا تھا، اور یہی اصل ہے۔م۔

اور امام شافعیؒ کا قول جدید یہی ہے اسی طرح امام مالکؒ کا بھی ایک قول یہی ہے۔ع۔ **لما روينا الخ** اس دلیل کی بناء پر جو ہم نے ابن مسعودؓ کے کلام کی روایت کی ہے۔ف۔ بسم اللہ کو آہستہ کہنے کے سلسلہ میں، لیکن ابن ابی شیبہؒ نے ابراہیم نخعیؒ سے اس کی روایت کی ہے، اور امام محمدؒ نے آثار میں ابو حنیفہؒ عن حماد عن ابراہیم عن بن ابی مسعودؓ کی اسناد سے روایت کی ہے، کہ جو شخص بسم اللہ کو جہر کہے، یہ سن کر ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ یہ فعل تو گنواروں کا ہے، اور نہ ابن مسعودؓ خود جہر کرتے اور نہ ان کے شاگردوں میں سے کوئی جہر کرتا، یہ اثر اس بات کو بتا رہی ہے کہ ابراہیمؒ نے اسے ابن مسعودؓ سے قبول کیا ہے، اور یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ابن مسعودؓ نے بسم اللہ کو جہرا کہنے پر اسے گنواروں کا کام اس لئے کہا ہے کہ اعرابی اور دیہاتی کو تعلیم دینے کی غرض سے آپ نے

کبھی کبھی جہرا کہدیا ہے تا کہ یہ لوگ ہر دعا و کلام کے کہنے کے موقع کو یعنی کب کون سی دعا کرنی اور پڑھنی چاہئے، بعد میں ان دیہاتیوں نے ان باتوں کو ہی اپنا معمول بنالیا ہے۔

اور عبد الرزاقؒ نے بھی اپنے مصنف میں ابراہیم نخعیؒ سے روایت کی ہے کہ پانچ چیزیں ایسی ہیں جن کو امام آہستگی کے ساتھ پڑھے وہ یہ ہیں: **سبحانك اللهم الخ**، تعوذ، تسمیہ، آمین اور **ربنا لك الحمد**، یہ اثر صحیح اور قولی ہے، اور یہی اثر یہ بات بھی بتاتی ہے کہ ان چیزوں میں امام کے لئے یہی اصل ہے اگر چہ دوسرے آثار اس کے مخالف بھی ہیں، جیسا کہ بخاریؒ نے تعلیقا عطاء سے یہ ذکر کیا ہے کہ ابن الزبیرؓ اور ان کے بعد کے اماموں سے میں نے آمین کو جہر سے کہتے ہوئے سنا ہے، یہ اثر فعلی اور عملی، ہے، لیکن جہر کرنے کے جائز ہونے میں کسی کو گفتگو یا اختلاف نہیں ہے، مگر اصل آہستہ کہنا ہے۔ م۔

ولانه دعاء فيكون مبناه على الاخفاء والمد والقصر فيه وجهان والتشديد فيه خطاء فاحش.

ترجمہ:- اور اس لئے بھی آمین کو آہستہ کہنا چاہئے کہ یہ ایک دعاء بھی ہے اس لئے اس بنیاد خفاء پر ہو گی اس کے پڑھنے کے دونوں ہی طریقے ہیں یعنی الف کو مد اور قصر، لیکن میم کی تشدید بڑی غلطی ہے۔

توضیح:- آمین کو آہستہ کہنے کی دلیل حدیث سے اور عقل سے

ولانه دعاء فيكون مبناه على الاخفاء...... الخ

اور اس وجہ سے آمین دعاء ہے، لہذا اسے آہستہ ہونا ہی چاہئے۔ف۔ مگر امام شافعیؒ کے قول قدیم میں جو کہ شوافع کا مذہب بھی ہے، اور یہی قول امام احمدؒ کا بھی ہے کہ امام اور مقتدی سب زور سے آمین کہیں، واضح ہو کہ ابن الہمامؒ نے فقط وائل بن حجر کی وہ حدیث جس میں شعبہؒ سے آمین کو آہستہ کہنے اور سفیانؒ سے آمین کو بالجہر ذکر کے حضرت شعبہؒ کی روایت کی خطاء اور دار قطنی کا سفیانؒ کی روایت کو ترجیح دینا ذکر کر کے کہا ہے کہ اگر اجتہاد کرنے کا مجھے کچھ بھی حق ہوتا تو میں ان دونوں روایتوں میں اس طرح توفیق دیتا کہ شعبہؒ کی روایت میں آہستہ کہنے کا جو ذکر ہے اس کے معنی واقعۃ بالکل آہستہ کہنے کے نہیں ہیں بلکہ آواز کو ذرہ پست کر لینے کے ہیں یعنی آمین کو کچھ پست آواز سے اس طرح کہا کہ اسے صرف پہلی صف والوں نے سنا مگر زور سے نہیں چلائے، اور سفیان کی روایت میں بلند آواز سے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آواز بالکل آہستگی سے نہیں نکالی بلکہ اتنی آواز سے کہی جسے فقط پہلی صف والوں نے سنا اس طرح دونوں روایتوں سے ایک ہی مفہوم نکل آیا اور آپس میں کوئی اختلاف نہیں رہا، اور اسی طرح دونوں روایتیں ہی صحیح ہو گئیں، فتح القدیر کی عبارت کا یہ مختصر ہے۔

اس تقریر سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ وائلؒ کی دونوں روایتوں سے جہر کرنا ہی ثابت ہے، لیکن میں کہتا ہوں کہ مذکورہ توجیہ صرف اسی صورت میں درست ہو گی جبکہ روایت میں (**خفض بهما صوته**) کے الفاظ ہوں کیونکہ اس کے معنی ہوئے آواز پست کی لیکن ان روایتوں میں جہاں **اخفى بها صوته** کے الفاظ ہیں ان میں توجیہ مذکور درست نہ ہو گی، کیونکہ اس میں صراحۃ اخفاء کا لفظ ہے، پھر میں انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ آج کل اس مسئلہ میں انتہائی افسوس کی حد تک فساد برپا ہے اور بجائے ایمان اخوت والفت پائی جائے اور اتفاق واتحاد قائم رکھنے کے جو ہمارے لئے واجب ہے ہم صرف ایسی حرکتوں میں مبتلاء ہیں جن پر غیر قومیں ہمارا مذاق اڑاتی ہیں آپس میں ایک دوسرے پر کفر کے فتوی جاری کرتے ہیں اور جہر واخفاء پر حرام اور انفاق وغیرہ کے فتوے جاری کرتے ہیں، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ کی توفیق کے ساتھ اس مسئلہ کی حتی الامکان تحقیق کروں، معلوم ہونا چاہئے کہ نماز میں فاتحہ کے بعد آمین کہنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

نمبر ۲۔ اس کے زور سے کہنے یا آہستہ کہنے کے جواز میں بھی کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

نمبر ۳۔ اگر جاہلوں اور گنواروں اور سیکھنے والوں کی تعلیم کی غرض سے زور سے کہا جائے تو بھی اس میں کسی کا اختلاف نہیں

ہے۔

نمبر ۴۔اب اختلاف صرف اس صورت میں باقی رہے گا کہ اگر کسی وقت تعلیم اور کسی ضرورت کے بغیر زور سے کہا جائے، اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا عام اور اصل عمل جہر کا تھا یا اخفاء کا، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ لفظ آمین قرآن کا لفظ نہیں ہے یہانتک کہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ اگر کوئی یہ کہے کہ لفظ آمین قرآن کا لفظ ہے تو وہ مرتد ہے، اور اس بات میں بھی اتفاق ہے کہ اس کا پڑھنا مسنون اور صرف مسنون و مرغوب ہے اور واجب نہیں ہے، اسی بناء پر اگر کوئی نمازی اپنی نماز میں اسے نہ کہے بلکہ چھوڑے تب بھی اس کی نماز جائز ہوگی، اور اسے انتہائی اہتمام کے ساتھ کہنا بھی مسنون ہے، اور یہ کہ یہ دعاؤں میں سے بلکہ ایک دعا ہے کیونکہ اس کے لفظی معنی ہیں قبول کرلے، اور سورہ فاتحہ بھی ایک مستقل دعا ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حدیث قدسی کہہ کر فرمایا ہے ولعبدی ماسألنی یعنی فاتحہ کی تقسیم کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے اور میرے بندے کے لئے وہ ہے جو اس نے مانگا یعنی اس نے جو دعا کی، اور فاتحہ کی آخر میں آمین کہنا قبولیت کی مہر ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص بہت ہی گڑگڑا کر دعا کر رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اس دعا پر مہر لگادو آپ سے سوال کیا گیا کہ کس چیز سے اور کس طرح؟ تو آپؐ نے فرمایا آمین کہہ کر، اور جب اس نے آمین کہہ کر ختم کی تو آپ ﷺ نے فرمایا اب قبولیت واجب ہوگئی۔

پھر نفس دعاء کی اصل اور اس کا ثبوت یہ نص قرآن ہے ﴿اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْیَۃً﴾ ہے، اور ہم ایسے مفسرین کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتے ہیں جو اپنے مذہب کی تاکید کے لئے قرآن پاک کے معانی میں تکلفات سے کام لیں، کیونکہ آیت مذکورہ ظاہر ہے اس میں کسی قسم کا اجمال نہیں ہے، اگر آمین کے بارے میں بھی صرف اسی آیت پر مدار ہو تو کوئی شبہ نہیں ہے کہ آمین کو آہستہ ہی کہنا چاہئے۔

نیز حدیث میں ہے کہ حج کے دنوں میں رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو جو زور سے تکبیر اور تلبیہ کہتے تھے ناراضگی کے اظہار کے طور پر ایسا کرنے سے منع فرمایا ہے یہ وجہ بتاتے ہوئے کہ **انکم لا تدعون اصمَّ ولا غائبا**، کہ تم اپنی دعا میں کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکارتے ہو، حالانکہ حج کے دنوں میں تلبیہ کہنا ایک عام اعلان اور بتانا ہے تاکہ محرم اور غیر محرم میں کوئی فرق اور امتیاز باقی رہ جائے اسی لئے اسے جہراً کہنا مطلوب ہے اس کے باوجود آواز یا چلا کر کہنے سے روک دیا گیا ہے، پھر کئی آیتوں سے آہستگی سے مناجات کرنے کا حکم پایا جاتا ہے، اس طرح احادیث بھی بے شمار اسی مضمون کی پائی جاتی ہیں، پھر بھی جب ان حدیثوں سے جہراً آمین کہنے کا ثبوت قائم کیا جاتا ہے تو یہ بات لازم آئی کہ ان تمام احادیث جہریہ اور سریہ کے درمیان مطابقت پیدا کی جائے، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ دعاء کی مقبولیت بڑی ہی اہم بات ہے، اور اس کے لئے بڑے ہی اہتمام کی بھی ضرورت ہے، رسول اللہ ﷺ نے جو کہ اپنی ساری امت کے لئے بہت ہی شفیق و رحیم تھے اس لئے آپ کی خواہش تھی کہ ساری امت جنتی ہو جائے، اسی لئے آپ ﷺ نے امت کی تمام عبادتوں میں اچھی ہی باتوں کی تعلیم فرمایا کرتے تھے، ان ہی باتوں میں آمین کے بارہ میں اپنے عمل اور قول دونوں سے ترغیب و تحریض اور تعلیم کو جمع فرمادیا۔

جیسا کہ صحاح ستہ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے قال رسول اللہ ﷺ **اذا أمن الامام فامنوا (صحاح سته) فان الملائكة تقول آمين (بخاری) فان الامام يقول امين (عبدالرزاق) فانه من وافق تامينه تامين الملائكه غفر له ماتقدم من ذنبه (صحاح سته)** یعنی جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ فرشتے آمین کہتے ہیں اس لئے جس کا آمین کہنا فرشتوں کے آمین کہنے کے موافق ہوتا ہے اس کے اگلے سارے گناہ بخش دئے جاتے ہیں اس حدیث میں قولی فرمان ہے اس کا فائدہ ایک بڑی نعمت ہے، اور کچھ ائمہ کرام نے اپنے اجتہاد سے یہ سمجھا کہ اس فرمان رسول سے آپ کی مراد یہ ہے کہ آمین کو آہستہ کہو اور بعض نے یہ سمجھا کہ آہستہ نہیں بلکہ زور سے کہنا چاہئے، ان کی دلیل یہ کہ حدیث میں صراحۃً فرمایا گیا ہے اذا امن

الامام امام جب آمین کہے، اور یہ بات اسی وقت معلوم ہو گئی کہ امام زور سے آمین کہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث سے آمین کا آہستہ کہنا ثابت ہوتا ہے، توجہ سے سننا چاہئے کہ یہ حدیث صحیحین وغیرہ میں بہ سند الزہری عن سعید بن المسیب عن ابی ہریرۃؓ مروی ہے، اور سنن نسائی و مصنف عبدالرزاق و صحیح ابن حبان میں صحیح سندوں سے اسی کی مانند یعنی الزہری عن ابی ہریرۃؓ اس طرح ہے کہ قال رسول اللہ ﷺ **اذا قال الامام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین تقولوا آمین فان الملائکۃ تقول آمین وان الامام یقول آمین فمن وافق تامینہ تامین الملائکۃ غفرلہ ماتقدم من ذنبہ**، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب امام کہے **غیر المغضوب علیھم ولا الضالین**، تو تم کہو آمین کیونکہ ملائکہ آمین کہتے ہیں اور امام آمین کہتا ہے اس لئے جس کا آمین کہنا ملائکہ کے آمین کہنے کے موافق ہو جاتا ہے اس کے اگلے گناہ بخش دئے جاتے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ ولا الضالین تک زور سے پڑھے گا اس کے بعد ہی آہستہ سے آمین کہے گا تو وہ جب ولا الضالین کہے تو بعد ہی تم آمین کہو اور بتلادیا کہ امام بھی آمین کہے گا، اور چونکہ امام کا آمین کہنا مخفی تھا اس لئے دوسری روایت میں تصریح کردی ہے کہ اس کے کہنے کا وہی وقت ہے جب وہ ولا الضالین پورا کرلے۔

حاصل یہ ہے کہ مقتدیوں کا آمین کہنا اس وقت مقرر کیا کہ جب وہ امام سے ولا اضالین سن لیں تو اس وقت امام کا آمین کہنا اور مقتدیوں کا آمین کہنا بیک وقت ہو جائے گا کہ وہ آہستہ سے آمین کہے گا، یہی مراد پہلی روایت کی بھی ہے کہ جب وہ آمین کہے تو تم آمین کہو، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس روایت کی مراد یہ نہیں ہے کہ وہ زور سے آمین کہے گا تو تم بھی سن کر آمین کہو، بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ آمین کہنے سے موافقت کرو کہ جس وقت وہ کہے اسی وقت تم بھی کہو پھر چونکہ وہ آہستہ کہتا ہے تو کس طرح معلوم ہوتا اسی کو بتلادیا کہ جب وہ ولا ضالین کہے، اگر یہ مراد نہ ہو تو دونوں روایتیں ایک دوسرے کی مخالف ہو جائینگی، اس طرح سے کہ اذا امن الامام سے یہ مطلب نکالے گا کہ جب اس کے آمین کہنے کی آواز سن لو تب تم کہو، اور ولا الضالین سے یہ مطلب نکالے گا کہ کہ جب ولا الضالین سن لو تو آمین کہو، اور ان دونوں پر عمل ایک آمین میں متعذرہ، تو قطعی بات یہ ہی ٹھہری جو ہم نے بیان کردی ہے، اور جب یہ فرمایا کہ وان الامام یقول آمین تو معلوم ہو گیا کہ امام بھی کہے گا اگرچہ سنائی نہ دے، اور اگر ظاہری لفظ اذا امن امام فامنوا ہو تو مراد امام کی متابعت آمین کے کہنے میں ہو گی لیکن دوسری حدیث کے یہ خلاف ہے جس میں فرمایا گیا ہے **انما جعل الامام لیؤتم بہ الخ** پھر آخر میں ہے **واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین**، اور وہ جب ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو، یہ حدیث صحیح مسلم وغیرہ میں ہے جو اوپر گذر چکی ہے۔

اس طرح یقینی طور سے یہ دلیل ختم اور باطل ہو گئی کہ امام کا کام آمین بالجہر کہنا اس حدیث سے صراحۃ ثابت ہے، بلکہ امام کا آمین بالخفاء (آہستہ کہنا) اس حدیث سے یقینی ثابت ہے، کیونکہ امام کی آمین کہنے کی آواز سے موافقت کرنا نہیں بیان کیا ہے حالانکہ آمین کی مد کے سنتے ہی موافقت ہو سکتی ہے، اور یہ معلوم ہے کہ آمین کہنے میں امام سے سبقت کرنا بے ادبی ہے، پس امام اخفاء کرے گا، تو ولا الضالین کے بعد مقتدی آمین کہے گا اگرچہ امام کہنے سے پہلے ہی فارغ ہو جائے، اور اس بات پر صراحۃ تنبیہ فرمادی ہے کہ امام بالکل خاموش کھڑا نہیں رہتا ہے بلکہ وہ آہستگی کے ساتھ آمین کہتا ہے، اور اگر امام کا جہراً ہی کہنا مقصود ہوتا تو اس کی تامین کہنے کی یعنی یہ کہنے کی مطلقاً ضرورت نہ تھی کہ وہ بھی آمین کہے گا، اور صرف فرشتوں کا آمین کہنا بیان فرمادیتے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث سے بھی بالتصریح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ آمین آہستہ ہی کہنی چاہئے، اور اصل آیت سے بھی اس کی تحقیق ہو گئی، اور یہی اصل حکم ہے، لیکن اس بات سے بالکل انکار نہیں ہے کہ جہر کرنا بھی جائز ہے بالخصوص تعلیم کے وقت، یہاںتک کہ اگر مقتدیوں کی کئی صفیں ہوں اور وہ سب نئے نمازی ہوں اور سب کو تعلیم دینا اور سنانا مقصود ہو تو اتنے زور سے امام آمین کہے کہ سب سن لیں، چنانچہ ابن ام الحصین نے ایک صحابیہ عورت سے روایت کی ہے کہ اس عورت نے رسول اللہ ﷺ

کے پیچھے نماز پڑھی تو جب آپ ﷺ نے ولاالضالین پڑھا تو اس قدر بلند آواز سے آمین کہی کہ اس عورت نے خود بھی جو عورتوں کی صف میں تھی سن لیا، اس کی روایت اسحٰق بن راہویہ نے کی ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ اس چھوٹی سی مسجد میں مردوں کی بڑی جماعت کے بعد عورتوں کی صفیں یقیناً بہت دور ہونگی۔

ابوہریرہؓ سے ایک اور روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب غیر المغضوب علیھم ولاالضالین کی تلاوت کی تو اس کے بعد آمین کہا، یہانتک کہ پہلی صف میں جتنے صحابہ تھے سبھوں نے یہ آواز سن لی، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور ابن ماجہ نے اس روایت کے بعد اور اتنی زیادہ روایت کی ہے کہ ان کی آواز سے مسجد گونج جاتی تھی، اس کی روایت ابن حبان نے اپنی صحیح میں اور حاکم نے اور دار قطنی نے بھی اس کی روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے، اور بیہقیؒ نے سب سے بڑھ کر اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے، لیکن اس سے پہلے ہم یہ ذکر کر چکے ہیں کہ عینیؒ نے بشیر بن رافع راوی کے ضعف کی وجہ سے اس حدیث میں بحث کی ہے، اور نسائیؒ نے صحیح سند کے ساتھ وائل بن حجر کی حدیث روایت کی ہے، پھر بیان سے فارغ ہونے کے بعد کہا ''آمین'' اس کے ساتھ ہی اپنی آواز بھی بلند کی، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، مگر یہ بعض اوقات لوگوں کی تعلیم اور موافقت کی غرض سے ہے، اور خود وائلؓ نے آمین کے آہستہ کہنے کی روایت ہے، چنانچہ ترمذیؒ نے اسکی شعبہ عن سلمہ بن ہسیل عن حجر ابی العنبس کی سند سے کی ہے کہ وائلؓ آمین کہا کہ اس کے کہتے ہوئے اپنی آواز پست کی، اور ایک روایت میں ہے کہ آمین کہتے ہوئے اپنی آواز میں اخفاء کیا، ترمذیؒ نے بخاری سے اس حدیث کی روایت کے بعد سفیانؒ کی حدیث کا اصح ہونا اور شعبہؒ کی حدیث کا کئی جگہ سے خطاء کرنا بیان کیا ہے۔

اس میں پہلا اعتراض یہ ہے کہ حجر ابی العنبس کہا جبکہ حجر بن عنبس صحیح ہے جیسا کہ سفیان کی روایت میں ہے عینیؒ نے جواب دیا ہے حجر بن عنبس کی ابوالعنبس اور ابوالسکن دونوں ہی کنیتیں ہیں، اور ابن حبان نے کتاب الثقات میں دعوی کے ساتھ کہا ہے حجر بن عنبس کی کنیت مثل اپنے باپ کے نام کے ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ نے اصابہ فی اسماء الصحابہ میں اس کا اقرار کیا ہے، چنانچہ کہا ہے کہ حجر کو ابن قیس کہتے ہیں اور کنیت ابوالسکن تھی اور اس کو حجر ابی العنبس بھی کہتے تھے، وہ ثقہ ہے اور کوفی و حضرمی ہے، اس کو ابن حبان نے ثقات (معتمد علیہ لوگوں) میں شمار کیا ہے، اور ابن معین نے کہا ہے کہ وہ شیخ ثقہ اور کوفی ہے، اس سے ابوداؤد و ترمذی اور بخاری نے روایت قبول کی ہے، اور تمام محدثین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ صحابی نہیں ہے۔ انتہی مختصراً۔ اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ شعبہؒ نے اس کے بارے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

دوسرا یہ اعتراض کہ حجر ابوالعنبس اور وائل بن حجر کے درمیان علقمہ بن وائل کو زیادہ کیا، حالانکہ علقمہ درمیان میں نہیں ہے، اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ چونکہ حجر ابوالعنبس کی خود وائلؓ سے ملاقات ثابت ہے اس لئے علقمہ کو زیادہ کرنا ایک ثقہ کی زیادتی ہے، اور اس میں کوئی نقصان نہیں ہے (کہ بغیر ملاقات اور ذکر کے بھی روایت درست تھی)۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ علل کبیر میں بخاریؒ سے نقل کیا کہ علقمہ اپنے والد کی وفات سے چھ ماہ...... پیدا ہوئے ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا اگر یہی بات درست ہے تو اس سے انقطاع لازم آتا ہے۔

• مگر میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض بھی درست نہیں ہے، کیونکہ علقمہ ثقہ ہیں اور عام علماء ان کو حجت کہتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت ہے کہ ابوالعنبسؒ نے شعبہؒ سے یہ اور دوسری روایت وائلؓ سے علقمہؒ کے واسطہ سے آمین کے اخفاء کی روایت کی ہے، اس کی تائید کرنے والی یہ ہے کہ ابوداؤد طیالسی نے شعبہ سے دوسری روایت سفیان ثوریؒ کی روایت کے بیان کی ہے، بس حاصل کلام یہ ہوا کہ ایک تو یہ ابوالعنبس نے وائلؓ سے بلاواسطہ سے اس جہر کی روایت میں ذکر کیا ہے، دو ابوالعنبسؒ نے علقمہ کے واسطہ سے وائلؓ سے اس اخفاء کی روایت کی جس کو شعبہ نے ترمذی کی روایت میں اور احمد، دار قطنی و حاکم و ابویعلی الموصلی و طبرانی و ابوداؤد

طیالسی کی روایتوں میں ذکر کیا ہے، اس طرح یہ بات بالتصریح معلوم ہوگئی کہ وائلؓ کا مطلب آمین بالجہر کی روایت سے یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کبھی بالجہر کہتے سنا اور کبھی بالسر سنا ہے، اور شعبہ نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔

تیسرا اعتراض یہ ہے کہ شعبہ نے "واخفی بھا صوته" کہا حالانکہ اصل میں وہ "مد بھا صوته" ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس کی تعیین اور تحقیق کا معلوم ہونا تو روایتوں پر ہی موقوف ہے، اس کے بغیر یہ کیسے معلوم ہو گیا کہ اس سے مراد اخفاء نہیں ہے اور صرف جہر کرنا ہی ہے، ہم نے تو ابھی یہ وضاحت کے ساتھ یہ بات کہدی ہے کہ دونوں ہی مراد ہیں، اور یہ بات کیوں کر کہی جاسکتی ہے کہ صرف ایک ہی اخفاء یا جہر مراد ہے، البتہ ایک ہی نماز میں دونوں باتیں ادا نہیں ہو سکتی ہیں، اور وائلؓ نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے مختلف دنوں میں اور مختلف نمازوں کی جماعت میں شرکت کی اور جہر اور سر کی دونوں یہی باتیں دیکھیں اور سنیں اس لئے کبھی ایک کی اور کبھی دوسرے کی روایت کی۔

اب اس شبہ کا جواب کہ ابن الہمامؒ نے جو یہ کہا ہے کہ دار قطنی وغیرہ نے سفیانؒ کی روایت کو ترجیح دی ہے اس طرح سے شعبہ کے مقابلہ میں سفیان کا حفظ زیادہ تھا اس لئے سفیانؒ کی روایت کو ترجیح ہونی چاہئے، تو میں جواب دیتا ہوں کہ یہ شبہ دو طرح سے غلط ہے اول یہ کہ ترجیح کی ضرورت تو تعارض ہونے اور ایسے وقت میں پیش آتی ہے جبکہ ان میں تطبیق کی صورت نہ ہو، ہاں جو مذہب اختیار کر لے اس کی تائید اور حمیت کے لئے زبردستی تعارض کر لینا ہماری دینی تعلیم اور علماء ربانی سے بہت دور کی بات ہے، دین تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور اس کے رسول پاک ﷺ کی ہدایت سے ہے اور مجتہدوں کے اجتہادات تو صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کی اصل سنت وہدایت معلوم ہو جائے، اسی لئے یہ بات جاننی بہت ضروری ہے کہ مجتہد نے کسی مسئلہ میں کسی ماخذ یا قرآن سے اسے حاصل کیا ہے، یہانتک کہ اگر کسی مسئلہ میں صحیح ماخذ معلوم نہ ہو سکے تو جو صحیح ہو اس کو بسر و چشم مان لینا چاہئے، ہمارے تمام علماء متقدمین اور متاخرین وائمہ واولیاء اور مشائخ کا بھی یہی مسلک رہا ہے، اور باقی باتیں تعصب اور حمیت کی تو اپنے نفس کی خوشنودی اور خود رائی ہے اس کو اگر کسی نے نہ پہچانا تو اب عزوجل کو وہ کیا پہچانے گا، **نعوذ باللہ من شرور انفسنا۔**

دوسری وجہ یہ ہے کہ شعبہؒ فن حدیث میں امیر المؤمنین ہیں اس کی تحقیق کے لئے وکیعؒ وغیرہ کے اقوال علل ترمذی میں دیکھیں، مجھے تو یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی ہے (کہ سفیان کو شعبہ پر ترجیح حاصل ہے) اللہ تعالیٰ ہی تو علیم اور خبیر ہے۔

اب ساری بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ آیت کریمہ سے آمین کو آہستہ کہنا ہی ثابت ہوتا ہے، اور صحاح ستہ کی قولی حدیث کہ **اذا امن الامام فامنوا** اور صحیح مسلم وغیرہ کی قولی حدیث **واذا قال ولا الضالین فقولوا آمین** سے بھی اخفاء ہے کا حکم ثابت ہوتا ہے، اور وائل بن حجرؓ کی فعلی حدیث اور ابراہیم نخعی وغیرہ کی قولی حدیث سے بھی وہی حکم ثابت ہوتا ہے، البتہ آمین بالجہر کے سلسلہ میں ابوہریرہؓ ووائل بن حجرؓ کی فعلی حدیث اور ابن الزبیرؓ کا فعل اثر موجود ہے البتہ مجھے کسی ذریعہ سے بھی اس کے لئے کوئی صحیح حدیث قولی نہیں ملی ہے، اس لئے حق اور انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ آمین بالسر کو ہی ترجیح دینی چاہئے، البتہ بالجہر کہنا بھی ممنوع نہیں بلکہ جائز ہے بالخصوص ایسی صورت میں جہاں جاہلوں کو تعلیم دینی اور بتلانا مقصود ہو، یا کوئی نیک اور دیندار امام کسی سے اپنی موافقت چاہتا ہو، اس بات کے کہنے کا مجھ پر انکشاف ہوا ہے، اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے۔ **وهو اعلم بالصواب.** م.

والمد والقصر فیه وجهان......الخ

آمین میں مد اور قصر دونوں صورتیں جائز ہیں۔ یعنی لغت میں لفظ آمین کو دونوں طرح سے پڑھنا صحیح ہے، نمبرا۔ آمین الف کو مد کے ساتھ پڑھنے میں یاسین کے وزن پر ہے، خلاصہ میں کہا ہے کہ فقہاء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے۔ ھ۔ نمبر ۲۔ اور بغیر مد کے قربن کے وزن پر ہے، اس موقع پر کہا گیا ہے کہ میم کو الف اور یاء کے درمیان امالہ کر کے بھی پڑھنا جائز ہے۔

والتشدید فیه خطاء فاحش......الخ

اور میم کو تشدید کے ساتھ پڑھنا بڑی سخت غلطی ہے۔ف۔ کیونکہ اگر الف کو مد اور میم کو تشدید کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کے معنی ہوں گے قصد اور ارادہ کرنے والے جیسا کہ فرمان باری تعالیٰ میں ایک جگہ ہے آمین البیت الحرام (شروع سورہ انعام) اس طرح پڑھنے سے آمین کہنے کی سنت ادا نہ ہوگی، تو کیا نماز فاسد ہو جائے گی، جواب یہ ہوگا اگر یہ ضالین کے وزن پر الف کے مد اور میم کی تشدید کے ساتھ ہو تو صاحبینؒ کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی، اور اسی پر فتویٰ ہے۔ع۔

اور اگر ضامن کے وزن پر ہو یعنی الف مد کے ساتھ اور میم بغیر تشدید کے کسرہ کے ساتھ اور یاء کو حذف کر کے تو بھی نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر الف بغیر مد کے ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی، اسی طرح اگر یاء کو حذف کرتے ہوئے میم کو تشدید کے ساتھ خواہ الف کو مد ہو یا نہ ہو تو نماز فاسد ہوگی۔م۔د۔ش۔

نماز پڑھتے وقت نمازی کو ایک قدم پر بوجھ دے کر کھڑا ہونا چاہئے پھر دوسرے قدم پر بوجھ دینا چاہئے کہ ایسا کرنا افضل ہے اس بات کے مقابلہ میں کہ دونوں قدموں پر بیک وقت وزن دیا جائے، کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ سے صلوۃ الاثر میں ایسا ہی بالتصریح مذکور ہے، اور ابو یوسفؒ سے اس کے خلاف کوئی روایت نہیں پائی گئی ہے۔ع۔ اور یہی قول اصح ہے، علی المذہب۔م۔ اس کے بعد مصنفؒ نے کہا ہے۔

قال ثم یکبّر ویرکع، وفی الجامع الصغیر ویکبّر مع الانحطاط، لان النبی علیه السلام یکبّر عند کل حفض ورفع، ویحذف التکبیر حذفا، لان المد فی اوله خطأ من حیث الدین لکونه استفهاما، وفی اخره لحن من حیث اللغة، و یعتمد بیدیه علی رکبتیه، ویفرج بین اصابعه، لقوله علیه السلام لأنسؓ: اذا رکعت فضع یدیك علی رکبتیك وفرّج بین اصابعك، ولا یندب الی التفریج الا فی هذه الحالة لیکون امکن من الاخذ، ولا الی الضم الا فی حالة السجود، وفیما وراء ذلك یترك علی العادة.

ترجمہ:۔ مصنفؒ نے کہا، پھر تکبیر کہے اور رکوع کرے، اور جامع صغیر میں ہے کہ جھکنے کے ساتھ ساتھ تکبیر کہے، کیونکہ نبی کریم ﷺ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر فرماتے تھے، اور تکبیر کو اچھی طرح حذف (قصر) کرے کیونکہ تکبیر کے شروع میں مد کے ساتھ کہنا دین کے اعتبار سے بڑی خطاء ہے، کیونکہ ایسا ہونے سے معنی کے اعتبار سے وہ جملہ سوالیہ ہو جاتا ہے اور آخر میں مد دینے سے لغت کے اعتبار سے غلطی ہو جاتی ہے، اور رکوع میں اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے دونوں گھٹنوں پر زور دے اور اپنی انگلیوں کے درمیان کشادگی رکھے، اور سواء اس حالت کے کسی وقت بھی اپنی انگلیوں کو کشادہ نہ رکھے کیونکہ اس وقت انگلیوں کی کشادگی سے گھٹنوں کو پکڑنے میں زیادہ قوت ملتی ہے، اسی طرح سواء سجدہ کی حالت کے کبھی انگلیوں کو ملا کر نہ رکھے، اور ان حالتوں کے علاوہ بقیہ حالتوں میں انگلیوں کو ان کی عام حالت پر چھوڑ دے۔

توضیح:۔ رکوع کرتے وقت تکبیر کہنا، تکبیر کے اول یا آخر میں مد نہ کرنا
رکوع کے وقت گھٹنوں کو پکڑ لینا، اور انگلیوں کو کشادہ رکھنا، حدیث سے دلیل
رکوع کے وقت دونوں پہلوؤں سے ہاتھوں کو علیحدہ رکھنا، حالت سجدہ میں انگلیوں کو ملانا

قال ثم یکبّر ویرکع، وفی الجامع الصغیر ویکبّر مع الانحطاط......الخ

مصنفؒ نے کہا ثم، پھر یعنی قراءت مکمل کر لینے کے بعد، قول اصح کے مطابق۔ مجتبیٰ۔ کسی توقف کے بغیر، یکبر۔ تکبیر کہے اور رکوع کرے۔ف۔ سیدھے تکبیر کہنی اور بعد میں رکوع کرنا، یہی صحیح مذہب ہے۔ الخلاصہ۔ وفی الجامع الخ، اور جامع صغیر میں ہے کہ جھکتے ہوئے تکبیر کہے۔ف۔ اس طرح تکبیر کہنے کی ابتداء ہو جھکاؤ شروع کرتے ہوئے، اور رکوع میں پہونچتے ہی اس کی

انتہاء ہو جائے یعنی تکبیر کہنی ختم کر دے۔ المحیط۔ طحاویؒ نے کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے، معراج الہدایہ۔

لان النبی علیہ السلام یکبّر عند کل حفض ورفع...... الخ

یہ حدیث کہ کان النبی علیہ السلام یکبر عند کل خفض ورفع و قیام وقعود و ابوبکر و عمر کے الفاظ کے ساتھ عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کی ہے، یعنی رسول اللہ ﷺ تکبیر کہا کرتے ہر جھکتے، اٹھتے اور کھڑے ہوتے اور بیٹھتے وقت اسی طرح حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ بھی، نسائی اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، پھر ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، ان کے علاوہ احمد، اسحٰق، دار قطنی، ابن ابی شیبہ اور طبرانی نے بھی روایت کی ہے، اس کی تائید صحیحین کی حدیث ابوہریرہؓ سے اور موطا کی مرسل حدیث حضرت علی بن الحسین یعنی زین العابدینؒ سے ہوتی ہے، اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وفات تک بغیر کسی تغیر و تبدل کے آپ کا طریقہ عمل یہی رہا۔ مع۔

اور یہ اس بات پر نص ہے کہ جامع صغیر کا قول صحیح ہے جیسا کہ طحاویؒ نے کہا ہے، اور اسی پر اعتماد ہے، اور میں نے کہ در مختار نے بھی اسی کو قبول کیا ہے، اگر قراءت کے آخر میں کچھ لفظ یا حرف باقی تھا اور رکوع میں جاتے ہوئے اسے پورا کر لیا تو اصح قول کے مطابق ایسا کرنا مکروہ ہوگا۔ ش۔ قراءت کرتے ہوئے اس کے آخری حرف کو لفظ اکبر سے نہیں ملانا چاہئے، لیکن اگر ملا لیا تو مکروہ نہ ہوگا۔ التاتار خانیہ۔ امام کو چاہئے کہ رکوع وغیرہ کی تکبیر کہتے ہوئے اپنی آواز بلند کرے، یہی ظاہر الروایت ہے، اور اصح ہے۔ الخلاصہ۔

ویحذف التکبیر حذفا......الخ

تکبیر کہنے میں اچھی طرح حذف یعنی قصر کرے۔ ف۔ یعنی اس طرح کہے کہ لفظ اللہ میں سب سے پہلے حرف الف کو صرف فتحہ کی آواز دے (مدنہ کرے) اور لام کو مد کرے (ذرا کھینچے) کہ یہی طریقہ صحیح ہے۔ ف۔ اور ہاء کو صرف پیش کی آواز دے (واو کی آواز نہ ہونے پائے) اس حرف پر جزم یا سکون کرنا غلط ہے، پھر لفظ اکبر میں بھی پہلے حرف کو معمولی سا فتحہ دے (مدنہ کرے اور کاف کو بھی صرف سکون دے کہ تشدید کی آواز پیدا نہ ہو، قاسمی) اور ایک نقطہ والے حرف باء کو بھی صرف فتحہ کی آواز دے (کہ مد کی آواز پیدا نہ ہو) اور آخری حرف راء کو جزم دے۔ م۔

لان المد فی اولہ خطأ من حیث الدین لکونہ استفھاما...... الخ

کیونکہ تکبیر کی ابتداء یعنی لفظ اللہ کے پہلے حرف کو مد کرنا دینی اعتبار سے غلط فعل ہے، کیونکہ اس سے استفہام یعنی سوالیہ جملہ بن جاتا ہے۔ ف۔ اس آواز کی وجہ سے معنی ہوں گے کیا اللہ ہے اسی طرح اکبر میں بھی پہلے حرف کو مد دینے سے سوالیہ جملہ معنی ہوں گے کیا وہ اللہ بڑا ہے، اگر ایسا عمداً کہے گا تو مشائخ اس کے بارے میں کفر کا اندیشہ کریں گے یہی حکم لفظ اکبر کے پہلے حرف کو مد کے ساتھ پڑھنے میں معنی ہوں گے کہ کیا وہ بڑا ہے، اور نماز میں ایسا پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ الخلاصہ۔ مگر حق بات وہی ہے جو مصنفؒ نے کہی ہے کہ ایسا کہنے سے غلطی تو لازم آئے گی مگر کفر لازم نہ آئے گی۔ عینی۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی صحیح ہے، جیسا کہ میں نے اس سلسلہ میں اوپر مکمل بحث کر لی ہے، جواب میں ہمارے اور مصنفؒ کے درمیان موافقت پائے جانے کی بناء پر اللہ کی حمد ادا کرتا ہوں۔

وفی اخرہ لحن من حیث اللغۃ...... الخ

اور تکبیر کے آخر میں مد کرنا لغت کے اعتبار سے لحن ہے۔ ف۔ یعنی خطاء ہے، کہ اکبر کو اکبار پڑھنے سے نماز فاسد ہو گی، اصح قول کے مطابق یہی حکم ہے۔ م۔ ع۔ اور باء یا راء کو مد کرنا خطاء ہے۔ ف۔ پھر یہ بات معلوم ہونی ضرور ہے کہ تمام صحابہ کرام، تابعین اور دوسرے تمام علماء کرامؒ کے نزدیک یہ ساری تکبیریں سنت ہیں، مگر ایک روایت میں ہے کہ احمد اور ظاہریہ کے نزدیک واجب ہیں، بغویؒ نے کہا ہے کہ ساری امت میں بالاتفاق یہ سب سنت ہیں۔ مع۔

ویعتمد بیدیه علی رکبتیه، ویفرج بین اصابعه......الخ
اور اپنے دونوں ہاتھوں سے دونوں گھٹنوں (پر ٹیک لگانے یعنی مضبوطی کے ساتھ پکڑلے)۔ف۔کہ یہی سنت ہے۔م۔یہی صحیح ہے۔البدائع۔ویفرج الخ اور اپنی انگلیوں میں کشادگی رکھے۔ف۔کہ یہ مستحب ہے لیکن حضرت عبد ابن مسعودؓ کے نزدیک دونوں ہاتھ ملا کر دونوں گھٹنوں کے بیچ میں رکھے، اور جمہور کے نزدیک کسی وقت یہی طریقہ تھا مگر بعد میں منسوخ کر دیا گیا ہے۔

لقوله علیه السلام لأنسؓ: اذا رکعت فضع یدیك علی رکبتیك وفرّج بین اصابعك......الخ
یعنی رسول اللہ ﷺ نے اپنے خادم انسؓ سے فرمایا کہ اے لڑکے! تم جب رکوع کرو تو اپنے دونوں ہاتھوں کو گھٹنوں پر رکھو اور اپنی انگلیوں کے درمیان میں کشادگی کرو۔م۔وارفع یدیك عن جنبیك اور اپنے ہاتھوں اپنے بازوؤں سے اٹھالو، طبرانی نے اس کی بہت تفصیل کے ساتھ روایت کی ہے، اور احمد، ترمذی، اور ابوداؤد نے اسے بحوالہ ابو مسعودؓ بیان کیا ہے، اور طبرانی اور ابن حبان میں ابن عمرؓ کے توسط سے ہے، اور بخاری میں ابو حمید الساعدی سے یہ حدیث ہے، اور ابوداؤد میں ابن رافعؓ سے ہے، اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ اور دوسروں کے درمیان بھی اختلاف نہیں ہے، اور معصب بن ابی سعدؓ نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ میں نے رکوع میں اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں گھٹنوں کے درمیان رکھا تو میرے والد سعد بن ابی وقاصؓ نے مجھے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ ہم لوگ ایسا کرتے تھے مگر اس سے ہمیں منع کر دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ ہم اپنے ہاتھوں کو اپنے گھٹنوں پر رکھا کریں، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔

ولا یندب الی التفریج الا فی هذه الحالة لیکون امکن من الاخذ......الخ
اور اس جانب یعنی انگلیوں کو کھلی رکھنے کی ترغیب صرف اسی حالت یعنی رکوع میں گھٹنے پکڑے ہوئے حالت میں دی گئی ہے تاکہ اچھی طرح ان گھٹنوں کو پکڑا جا سکے، ولا الی الخ اسی طرح انگلیوں کو ملا کر رکھنے کی بھی ترغیب نہیں دی گئی ہے مگر صرف اس سجدہ کی حالت میں۔

وفیما وراء ذلك یترك علی العادة......الخ
اور ان دو حالتوں کے علاوہ بقیہ تمام حالتوں میں انگلیوں کو ان کی اپنی عام حالت پر رکھا جاتا ہے۔ف۔یعنی عام عادات کے مطابق انگلیاں جس حالت میں رہتی ہیں وہ ویسی ہی رکھی جائیں، ملانے یا کھولنے کی بہتری کی ترغیب نہیں دی گئی ہے، اور تکبیر تحریمہ کے وقت حدیث میں جو آیا ہے کہ انگلیاں کھلی رکھتے تھے تو اس سے مراد یہ ہے کہ وہ مٹھی نہیں باندھتے تھے۔مع۔

ویبسط ظهره لان النبی علیه السلام کان اذا رکع بسط ظهره، ولا یرفع رأسه ولا ینکسه، لان النبی علیه السلام کان اذا رکع لایصوّب رأسه ولایقنعه، و یقول: سبحان ربی العظیم ثلاثا، وذلك ادناه لقوله علیه السلام اذا رکع احدکم فلیقل فی رکوعه سبحان ربی العظیم ثلاثا وذلك ادناه، ای ادنی کمال الجمع.

ترجمہ:۔اور اپنی پیٹھ کو ہموار یا دراز کرے کیونکہ نبی کریم ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنی پیٹھ کو برابر اور ہموار کر لیتے تھے، اور اپنے سر کو نہ تو اٹھا کر رکھے اور نہ ہی نیچے کی طرف جھکائے، کیونکہ نبی کریم ﷺ جب رکوع فرماتے تو اپنے سر کو نہ تو جھکا دیتے اور نہ ہی اسے اٹھا کر رکھتے، اور اس رکوع میں نمازی یوں کہے سبحان ربی العظیم تین بار اور یہ کم سے کم مقدار ہے یعنی کمال جمع کی ادنی مقدار ہے۔

توضیح:۔رکوع میں پیٹھ ہموار رکھنا، حدیث سے اس کی دلیل، سر کو اونچا یا نیچا نہ رکھنا حدیث سے دلیل، رکوع میں سبحان ربی العظیم کہنا، حدیث سے دلیل

ویبسط ظهره لان النبی علیه السلام کان اذا رکع بسط ظهره......الخ

اور اپنی پیٹھ کو ہموار رکھے۔ف۔ یہانتک کہ اس کی پیٹھ پر پانی کا بھرا ہوا پیالہ رکھدیا جائے تو وہ ٹھہرا رہے، الخلاصہ۔ **لان النبی الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنی پیٹھ کو مبسوط یعنی برابر ہموار کرتے تھے۔ف۔ وابصہ ابن معبد کی حدیث میں ہے **سوی ظهره حتی لوصب علیه الماء لاستقر** یعنی آپ اپنی پیٹھ کو اتنی ہموار رکھتے کہ اگر اس پر پانی بہایا جاتا تو ٹھہر جاتا، ابن ماجہ نے اس حدیث کی روایت کی ہے، اور حضرت براءؓ کی حدیث میں ہے **اذا رکع بسط ظهره واذا سجد وجه اصابعه قبل القبلة**، یعنی جب رکوع کرتے تو اپنی پیٹھ کو ہموار کر لیتے اور جب سجدہ کرتے تو اپنی انگلیاں قبلہ کی جانب متوجہ کر لیتے تھے، اس کی روایت ابوالعباس محمد بن اسحٰق نے کی ہے۔السراج۔ اور طبرانی نے حدیث وابصہ کی طرح ابن عباس اور ابو برزہ اسلمی سے روایت کی ہے۔فع۔ وہ انگلیاں خواہ ہاتھ کی ہوں یا پاؤں کی۔م۔ اس رکوع کی حالت میں سر کو کس طرح رکھنا چاہئے، اس کے جواب میں فرمایا ہے:

ولا یرفع رأسه ولا ینکسه، لان النبی علیه السلام کان اذا رکع لایصوّب رأسه ولایقنعه......الخ

کہ اپنے سر کو نہ اونچا رکھے اور نہ جھکائے۔ف۔ یعنی سرین یا چوتڑ سے سر تک پورے حصہ کو ہموار رکھے، الخلاصہ۔ **لان النبی الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ جب رکوع کرتے تو اپنے سر کو نہ جھکائے رکھتے اور نہ اٹھاتے۔ف۔ یہ بات ابو حمید ساعدیؓ کی طویل حدیث میں ہے، اس کی روایت ترمذی نے ساتھ ہی اس کی تصحیح بھی کی ہے، اور ابن حبان نے بھی روایت کی اور صحیح مسلم میں ام المؤمنین صدیقہؓ کی حدیث میں اور بخاری میں بھی یہ معنی موجود ہیں۔مع۔ اور یہ بات مکروہ ہے کہ مرد اپنے گھٹنوں کو کمان کی طرح جھکا ہوا رکھے، لیکن عورت اپنے رکوع میں تھوڑی سی جھکی ہوئی ٹیڑھی رہے گی، اور ہاتھوں کو عمود یا ستون کی طرح سیدھا نہ رکھے، اور نہ انگلیاں کھول کر اپنے گھٹنے پکڑے بلکہ ہاتھوں کو اپنی طرف دبا کر اور گھٹنوں پر رکھے۔ اور انہیں جھکا دے، اور بازوؤں کو پہلو اور بغل سے علیحدہ کر کے نہ رکھے۔الزاہدی وغیرہ۔

ویقول: سبحان ربی العظیم ثلاثا، وذلك ادناه ......الخ

اور رکوع کی حالت میں تین مرتبہ **سبحان ربی العظیم** کہے۔ف۔ یعنی میرا رب پاک اور بڑی عظمت والا ہے، یہ تسبیح ہر شخص پڑھے خواہ مرد ہو یا عورت، **وذالك الخ** اور اتنا پڑھنا تسبیح کی کم سے کم مقدار ہے۔ف۔ عام اہل علم کے نزدیک رکوع میں ہی تسبیح پڑھنے کا طریقہ ہے جو تین مرتبہ سے کم نہ ہو۔

لقوله علیه السلام اذا رکع احدکم فلیقل فی رکوعه سبحانَ ربی العظیم ثلاثا وذلك ادناه......الخ

مذکورہ تسبیح اور مقدار ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت پائے جانے کی بناء پر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک مرفوعاً حدیث ہے کہ تم میں سے کوئی جب رکوع کرے تو اپنے رکوع میں اس طرح کہے **سبحان ربی العظیم** تین مرتبہ اور یہ اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ف۔ **واذا سجد فلیقل سبحان ربی الاعلی ثلاث مرات وذلك ادناه**، اور جب سجدہ کرے تو تین مرتبے **سبحان ربی الاعلی** کہے اور یہ اس کی کم سے کم مقدار ہے۔

ای ادنی کمال الجمع......الخ

یعنی کمال جمع کی کم سے کم مقدار ہے۔ف۔ مبسوط سرخسی میں ہے کہ حدیث میں وذلک ادناہ جو کہا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس سے کم مقدار کہنا جائز نہیں ہے، کیونکہ رکوع اور سجدہ تو اس تسبیح کے بغیر بھی صحیح اور جائز ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ اس کو مکمل کرنے یا اس میں کمال حاصل کرنے کی کم سے مقدار یہی تین بار کہنا ہے، اور مبسوط خواہر زادہ میں ہے کہ اس سے مراد جمع کی کم سے کم مقدار ہے، کیونکہ جمع کا کم سے کم عدد تین ہے، اور عینیؒ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے حدیث میں اس بات کا تو کوئی اشارہ یا دلالت نہیں ہے کہ اس سے جمع مراد ہے، لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ اس سے سنت کامل ہونا مراد ہے، البتہ اس کمال میں کمتر کا عدد تین ہے یا کمال تسبیح کا کم از کم تین بار ہونا ہے، (اور زیادہ کی حد نہیں ہے) مع۔

میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ گہری نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذلک ادناہ میں ضمیر غائب کی وہ نہیں ہے جسے اضمار قبل الذکر کہا جاسکے کہ مرجع ذکر کئے بغیر ضمیر استعمال کی گئی ہے جیسا کہ قول مذکور کا متکلف یہی مطلب نکال کر اعتراض کیا گیا ہے، بلکہ ضمیر کا مرجع رکوع یا سجود ہے جس کی بحث ہو رہی ہے، یعنی رکوع میں تین مرتبہ کی تسبیح ادنی مقدار ہے، البتہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ رکوع میں یہی مقدار اعتدال کے لئے ضروری ہے، اس لئے ہم پہلے یہ بتاچکے ہیں کہ قول صحیح کے مطابق امام ابویوسف کا یہی قول ہے، اور یہی قول مذہب مختار بھی ہے، اس موقع پر عام طور سے جو یہ کہا جاتا ہے کہ اعتدال کی کم از کم مقدار صرف ایک تسبیح کی مقدار ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ رکوع و سجدہ کے علاوہ دوسرے مقام میں ادنی مقدار ایک تسبیح ہے، کیونکہ دونوں سجدوں کے درمیان جلسہ رکوع یا سجدہ جیسا کوئی فرض رکن نہیں ہے بلکہ دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا جسے جلسہ کہا جاتا ہے وہ تو محض اس لئے ضروری ہےکہ دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان اور اعتدال پائے جانے کی وجہ سے ایک بڑے سجدہ کو دو سجدہ کہا جاسکے، یہی بات بلا تکلف حق ہے۔ واللہ اعلم۔

اور یہ تسبیحات بلاشبہ سنت ہیں، اور تین بار تسبیح کہنا تو صرف فرض رکوع کی مقدار کامل کا اندازہ کرنے کے لئے ہے۔ م۔ اگر کسی نے تسبیح ایک بار کہی یا بالکل نہیں کہی تو مکروہ ہوگی، امام محمدؒ سے ایسا ہی منقول ہے۔ ف۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ خلاصہ میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ ھ۔ اب مذکورہ جملہ سے یہ مراد ہو کہ نمازی تین تسبیح کی مقدار ٹھہرا ہا مگر ایک بار بھی تسبیح نہیں کہی یا صرف ایک یا دو بار تسبیح کہی تو ترک سنت ہوا جس سے کراہت تنزیہی لازم آئے گی اور اگر یہ مراد ہو کہ اتنی دیر ٹھہرا بھی نہیں بلکہ پہلے سجدہ سے اٹھنے کے بعد فوراً ہی دوسرے سجدہ میں چلا گیا تو کراہت تحریمی لازم آئے گی، اسی بناء امام ابویوسفؒ کے قول مختار کے مطابق اسے دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا، لیکن در مختار میں لکھا ہے کہ تسبیح چھوڑنے یا کم کرنے سے کراہت تنزیہی لازم ہوگی۔

مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حکم اس وقت دیا جائے گا جبکہ رکوع اتنی دیر کر لیا ہو جتنی دیر رکوع کرنا واجب ہے، کیونکہ اس قول کی اس قول سے مخالفت لازم آئے گی جس میں طمانینت کو فرض قرار دیا گیا ہے۔ م۔ اور لکھا ہے کہ رکوع یا سجدہ کو اس خیال سے طویل کرنا کہ آنے والے نمازی بھی اس رکوع یا سجدہ میں شرکت کرلیں، اگر اس نیت سے ہو کر نمازی یا جماعت میں شرکاء کی کثرت سے خدا کی رضامندی ہوگی اور ثواب زیادہ ملے گا تو بالاتفاق ایسا کرنا مکروہ نہ ہوگا، مگر ایسا کرنا بہت ہی کم اور شاذ و نادر ہوتا ہے جبکہ ریاکاری کہلائی جاتی ہے، اور اگر کسی جاننے والے شخص کی شرکت کے لئے ایسا کیا ہو تو مکروہ تحریمی ہے ورنہ نہیں۔ د۔

میں کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں عینیؒ نے بہتؒ سے اختلافات ذکر کئے ہیں، اور در مختار سے جو قول نقل کیا گیا ہے وہ فقیہ ابواللیث کا ہے کہ آنے والے شخص کو پہچان کر اکی شرکت کے خیال سے نماز کو طویل کیا ہو تو مکروہ ہے ورنہ مضائقہ نہیں ہے، شامیؒ نے اس میں "مضائقہ نہیں" ہے کے جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے، کہ ایسا نہ کرنا یعنی طول نہ دینا ہی افضل ہے، اور ذخیرہ میں ابوحنیفہؒ ابن ابی لیلیٰؒ اور محمدؒ کا قول یہ لکھا ہے کہ مطلقاً مکروہ ہے، لیکن کتب صحاح میں بعض احادیث ایسی منقول ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی پہلی رکعت کو دراز فرماتے تھے خود ان راوی صحابی نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک آپ ایسا اس واسطے کرتے تاکہ آنے والے بھی اس میں شامل ہو جائیں تو اس قسم کی حدیث بھی اس بات پر محمول ہے کہ اگر خلوص تقرب الی اللہ مقصود ہو تو بالاتفاق مکروہ نہیں ہے۔ م۔

امام مالکؒ کی طرف جو یہ بات منسوب ہے کہ وہ رکوع و سجود میں تسبیح پڑھنے کے قائل نہیں ہیں، یہ ہرگز صحیح نہیں ہے بلکہ ان سے تو فرضیت کے قائل ہونے کی بھی روایت ہے، شرح الکنز للسی میں ایسا ہی منقول ہے، اور امام اعظمؒ کے شاگرد ابو مطیع البلخی بھی تین تسبیح فرض ہونے کے قائل ہیں، رکوع و سجود میں قرآن پاک پڑھنا چاروں ائمہ کے نزدیک مکروہ ہے، ذخیرہ میں ہے کہ تین تسبیح سے زیادہ کرنا افضل ہے مگر تین، پانچ، سات وغیرہ طاق عدد ہونا چاہئے، لیکن یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو تنہا نماز پڑھ رہا ہو، کیونکہ امام کو زیادہ دیر تک نہیں پڑھنا چاہئے کہ مقتدیوں کو اکتاہٹ اور پریشانی محسوس ہونے لگے، شرح الطحاوی

میں ہے کہ امام تین چار بار کہے، مگر میں کہتا ہوں کہ چار کی بجائے پانچ بار ہی کہہ لے تو زیادہ بہتر ہو تاکہ طاق عدد بھی ہو جائے۔ م۔ تحفہ میں ہے کہ امام جبتک سر نہ اٹھائے اس وقت تک مقتدی تسبیح پڑھتا رہے، اور اگر مقتدی تین بار بھی تسبیح کہنے نہ پائے اور امام سر اٹھالے تو امام ابواللیثؒ نے کہا ہے کہ وہ امام کے تابع ہے یعنی وہ بھی فوراً سر اٹھادے تین پوری کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مع۔ اسی طرح سجود میں بھی امام کی اتباع واجب ہے۔ ت۔

اور اگر مقتدی ہی نے پہلے اپنا سر اٹھالیا تو وہ امام کی متابعت کے خیال سے دوبارہ رکوع کرنا ضروری ہے ورنہ مکروہ تحریمی کا مرتکب ہوگا، ایسی صورت میں بظاہر دو رکوع ہو جانے سے بھی ایک ہی رکوع شمار ہوگا، دو نہ ہوں گے، اور اگر مقتدی نے اپنا تشہد پورا نہیں کیا تھا کہ امام تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا یا آخری قعدہ میں ہونے کی وجہ سے سلام پھیر دیا تو مقتدی اس تشہد کو پورا کرلے۔ اور اس نے بھی امام کا ساتھ یا یعنی تشہد کو ناقص ہی چھوڑ دیا مکمل نہیں کیا تو بھی جائز اور درست ہے، اور اگر مقتدی تشہد کے بعد درود اور دعا میں مشغول تھا کہ امام نے سلام پھیر دیا تو فوراً اس کی اتباع میں سلام پھیر دینا چاہئے۔ ت۔

اگر کوئی شخص شریر اور ضرر رساں ہو اس کے ظلم و شر سے بچنے کے لئے امام رکوع کو طویل کردے تاکہ وہ بھی شریک ہو کر خوش ہو اور ضرر نہ پہونچائے تو مکروہ نہ ہوگا، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ غور طلب ہے، جس نے امام کو رکوع کی حالت میں پالیا اسے وہ رکعت مل گئی، اور قومہ یعنی رکوع سے کھڑے ہونے کی حالت میں ملا تو وہ رکعت نہیں ملی بلکہ چھوٹ گئی، میں کہتا ہوں کہ حدیث سے یہی ثابت ہے، اور عنقریب یہ بحث آئے گی، امام کو رکوع میں پانے والے مقتدی کو چاہئے کہ پہلے تکبیر تحریمہ کہے پھر رکوع میں امام کے ساتھ شریک ہو جانے کے لئے دوسری بار تکبیر کہے، اور اگر صرف تکبیر تحریمہ یعنی پہلی تکبیر پر ہی اکتفاء کیا اور رکوع میں جانے کی دوسری تکبیر نہیں کہی تو بھی نماز صحیح ہوگی، کیونکہ رکوع میں جانے کی تکبیر تو مستحب ہے، صحابہ کرام کی ایک جماعت مثلاً عمرؓ وغیرہ اور تابعین میں مثلاً سعید بن المسیبؒ وغیرہ کی اور باقی تینوں فقہاء کرام وغیرہم سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

مذکورہ حکم اس وقت ہے جبکہ اس نے پہلی تکبیر سے تکبیر تحریمہ کی نیت کی ہو، اگر اس نے اس تکبیر سے رکوع میں شریک ہونے کی ہی نیت کی ہو تو ہمارے نزدیک یہ بھی جائز سمجھی جائے گی، یعنی اس کی نیت لغو قرار دی جائے گی اور وہی تکبیر تحریمی فرض کی جائے گی، المحیط والمرغینانی، لیکن امام احمدؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگی، لیکن اگر مقتدی نے اپنی اس تکبیر سے رکوع یا تکبیر تحریمہ میں سے کسی کی بھی نیت نہیں کی تو امام احمدؒ کے نزدیک بھی جائز ہوگی، اور اگر دونوں باتوں کی نیت کی ہو تو بالاتفاق جائز ہوگی، ذخیرہ میں ہے کہ اگر مقتدی اپنے امام کو پہلے یا دوسرے سجدہ میں پائے تو اسے چاہئے کہ ثناء پڑھ کر سیدھا سجدہ میں چلا جائے۔ مع۔ تاکہ شیطان ذلیل ہو، اور اگر کسی نے رکوع میں اعتدال و طمانینت نہیں کی تو طرفین کے نزدیک نماز جائز ہوگی، لیکن یہ قول مختار نہیں ہے، اور طبقہ مقلدین میں اکثر کے قول کے مطابق طمانینت کی مقدار صرف ایک تسبیح ہے، اور قول اصح یہ ہے کہ تین تسبیح کی مقدار ہے، اس قسم کے سارے مسائل گذر چکے ہیں۔

ثم یرفع رأسه و یقول سمع الله لمن حمده، ویقول المؤتم ربنا لك الحمد، ولا یقولها الامام عند ابی حنیفةؒ، وقالا یقولها فی نفسه لما روی ابوهریرة ان النبی علیه السلام کان یجمع بین الذکرین، ولانه حرّض غیره فلاینسی نفسه، ولابی حنیفةؒ قوله علیه السلام: اذا قال الامام سمع الله لمن حمده قولوا ربنا لك الحمد، هذه قسمة وانها تنافی الشرکة، ولهٰذا لایاتی المؤتم بالتسمیع عندنا، خلافا للشافعی، ولانه یقع تحمیده بعد تحمید المقتدی، وهو خلاف موضوع الامامة، وما رواه محمول علی حالة الانفراد.

ترجمہ:۔ پھر امام (رکوع سے) اپنا سر اٹھائے اور کہے سمع الله لمن حمده، اور مقتدی کہے ربنا لك الحمد، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس جملہ کو امام نہیں کہے گا، لیکن صاحبینؒ نے کہا ہے کہ امام بھی یہ جملہ (ربنا لك الحمد) کو کہے گا مگر آہستگی

کے ساتھ اپنے دل میں، اس بناء پر کہ ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ نبی کریم ﷺ دونوں ذکروں کو جمع کرتے اور ایک ساتھ کہا کرتے اور دوسری عقلی وجہ یہ ہے کہ جبکہ امام نے اپنے مقتدیوں کو اس ذکر کے کہنے پر آمادہ کیا تو وہ خود کو نہیں بھول سکتا ہے اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم کہو ربنا لك الحمد اس طرح یہ تقسیم عمل ہوئی جو شرکت کے منافی ہے، اسی بناء پر ہمارے نزدیک مقتدی تسمیع (سمع الله لمن حمده) نہیں کہتا ہے، اور اس وجہ سے بھی (امام نہیں کہتا ہے) کہ امام کی تحمید مقتدی کی تحمید کے بعد ہی واقع ہوگی جو شان امام کے خلاف ہے، اور ایسی جو روایت موجود ہے وہ انفرادی حالت پر محمول ہے۔

توضیح:- رکوع سے سر اٹھاتے ہوئے سمع الله لمن حمده کہنا، مقتدی کا ربنا لك الحمد کہنا

ثم يرفع رأسه و يقول سمع الله لمن حمده...... الخ

رکوع اطمینان سے کر لینے کے بعد اپنا سر اٹھائے اور سمع الله لمن حمده کہے۔ ف۔ حمدہ میں ۂ کو سکتہ کے ساتھ کہے جیسا کہ فوائد حمیدیہ میں یہ ثقات سے منقول ہے یا ہاء کنایہ ہے۔ ع۔ اگر کہنے والا امام ہے تو بالاتفاق امام اسے کہے۔ المحیط۔ اور جہر بھی کرے۔ م۔ اور اگر مقتدی ہو تو وہ بلا خلاف فقط ربنا لك الحمد کہے۔ المحیط۔ اور آہستہ کہے۔ م۔ اور اگر تنہا پڑھنے والا (منفرد) ہو تو قول اصح یہ ہے کہ سمع پورا اور ربنا پورا دونوں کو کہے۔ المحیط۔ اسی قول پر اعتماد ہے۔ التاتار خانیہ۔ اور زور سے یا آہستہ میں دونوں باتوں کا اسے اختیار ہے کہ جس طرح چاہے کہے۔ م۔ رکوع سے اٹھتے ہوئے ابتداء کرے لیکن جب سیدھا کھڑا ہو جائے تب ربنا لک الحمد کہے، یہی قول اصح ہے، القنیہ۔ ان دونوں ذکروں میں سے ہر ایک کو اپنی مقررہ جگہ پر کہے اگر کوئی چھوٹ جائے تو اسے بعد میں نہ کہے، جیسا کہ التتمہ کے حوالہ سے التاتار خانیہ میں ہے۔ ھ۔ اگر کسی نے لِمن کو لمدِ کہدیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ والواجیہ۔ د۔ حمدہ کے ہاء کو جزم کرے۔ التاتار خانیہ بحوالہ الحجہ۔

ويقول المؤتم ربنا لك الحمد......الخ

اور مقتدی ربنا لک الحمد کہے۔ آہستہ۔ م۔ احادیث صحیحہ میں ایسا ہی مروی ہے، اس کے الفاظ کئی طرح منقول ہیں چنانچہ ربنا لك الحمد اور ربنا و لك الحمد اور اللهم ربنا لك الحمد اور اللهم ربنا ولك الحمد بھی منقول ہیں، ذخیرہ میں ہے کہ اللهم ربنا و لك الحمد کا جملہ افضل ہے۔ مع۔ اس کے بعد بغیر واو کے پھر بغیر اللہم کے افضل ہے۔

ولايقولها الامام عند ابی حنيفةؒ......الخ

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس ذکر کو امام نہ کہے، لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام بھی اسے آہستگی کے ساتھ کہے۔ ف۔ یہی قول اصح ہے۔ القنیہ۔ لما روی الخ کیونکہ ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ آں حضرت ﷺ دونوں ذکر کو جمع کرتے تھے۔ ف۔ جیسا کہ کہا ہے کہ پھر رکوع سے سر اٹھانے کے وقت کہتے۔ سمع الله لمن حمده، پھر سیدھے کھڑے ہونے کی حالت میں کہتے ربنا و لك الحمد، پھر تکبیر کہتے اس وقت جب سجدہ کے لئے جھکتے، جیسا کہ صحیح میں ہے، یہی مفہوم صحیح بخاری میں عبد اللہ بن عمرؓ سے اور صحیح مسلم میں عبد اللہ بن ابی اوفیؓ سے ثابت ہیں۔ مع۔

ولانه حرّض غيره فلا ينسى نفسه......الخ

اور اس کی عقلی وجہ یہ تھی کہ جب امام نے دوسرے یعنی اپنے مقتدی کو اس ذکر کے کہنے پر آمادہ کیا تو وہ خود کو کیوں بھولے گا۔ ف۔ یعنی امام نے جب سمع الله لمن حمده کہا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس نے اللہ کی حمد کی اللہ تعالیٰ نے اس کی تعریف سن لی، کہنے کا مقصد یہ ثابت ہوا کہ تم لوگ ایسا ضرور کہو، لہٰذا وہ خود بھی اسے ضرور کہے گا، اور خود کو اس فضیلت سے محروم نہ رکھے گا۔ ع۔ م۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ کہنے سے مراد رسول اللہ ﷺ کا فرمانا ہو کہ خود آپ نے دوسروں کو رغبت دلائی چنانچہ آمین کی

فضیلت جیسی اس میں بھی فضیلت مروی ہے کہ ملائکہ کی موافقت کی وجہ سے بخشش ہو جاتی ہے، اس لئے وہ خود بھی کہتے ہیں۔ت۔

ولابی حنیفۃؒ قوله علیه السلام: اذا قال الامام سمع الله لمن حمده قولوا ربنا لك الحمد......الخ

اور ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ جب امام سمع الله لمن حمده کہے تو تم ربنا لك الحمد کہو، کیونکہ جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے موافق ہے تو اس کے اگلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کی روایت بخاریؒ اور مسلم نے ابو ہریرہؓ سے کی ہے۔ف۔ اور یہ امام اور مقتدی کے کے درمیان تقسیم ہے، اور تقسیم ہونا شرکت کے منافی ہوتی ہے، لہٰذا امام کی اس میں شرکت نہ ہوگی۔

ولهٰذا لایاتی المؤتم بالتسمیع عندنا، خلافا للشافعی...... الخ

اسی وجہ سے ہمارے نزدیک مقتدی سمع الله لمن حمده نہیں کہے گا، بر خلاف امام شافعیؒ کے۔ف۔ اگر کوئی یہ کہے کہ اسی طرح حدیث میں یوں بھی ہے اذا قال الامام ولاالضالین فقولوا آمین میں بھی تو تقسیم عمل لازم آتا ہے اس لئے چاہئے کہ امام ولاالضالین تک کہے تو مقتدی آمین کہے، اور امام نہ کہے، جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک ہے، جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ امام نہ کہے مگر دوسری حدیث سے چونکہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کو بھی کہنا چاہئے اس لئے امام بھی کہتا ہے، مترجم کہتا ہے کہ پھر یہاں بھی دوسری دلیل مذکور بالا سے معلوم ہوا۔

ولانه یقع تحمیده بعد تحمید المقتدی، وهو خلاف موضوع الامامة......الخ

اور یہ وجہ بھی ہے کہ امام کا حمد (ربنا لك الحمد) کہنا مقتدی کے کہہ لینے کے بعد ہی ہوگا اور یہ وضع امام یعنی شان امامت کے خلاف ہے۔ف۔ چاہئے کہ پہلے امام کہتا، مگر اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ یہ متابعت کی چیز نہیں ہے جیسے کہ سمع اللہ بالاتفاق متابعت کی چیز ہے کہ اس کی اتباع ہی میں ربنا لك الحمد کہا جاتا ہے، لہٰذا امامت کو دخل نہ ہوا، ومارواہ الخ اور ابو ہریرہؓ جو حضرت علیہ السلام سے جمع کرنے کی روایت کی ہے، کہ آپ دونوں کو کہا کرتے تھے، تو یہ روایت اس صورت پر محمول ہوگی جب آپ تنہا نماز پڑھ رہے ہوں گے۔

والمنفرد یجمع بینهما فی الاصح، وان کان یروی الاکتفاء بالتسمیع، ویروی بالتحمید والامام بالدلالة علیه اتی به معنی، قال ثم اذا استوی قائما کبّر و سجد، اما التکبیر والسجود فلما بینا، واما الاستواء قائما فلیس بفرض، وکذا الجلسة بین السجدتین والطمأنینة فی الرکوع والسجود، وهذا عند ابی حنیفة ومحمد، وقال ابویوسفؒ یفترض ذلك کله، وهو قول الشافعی، لقوله علیه السلام: قم فصل فانك لم تصل، قاله لاعرابی حین اخف الصلوة.

ترجمہ:-اور تنہا نماز پڑھنے والا دونوں کو جمع کرے گا، قول اصح کے مطابق، اگرچہ صرف سمع اللہ کہنے کی روایت بھی مروی ہے، اسی طرح صرف ربنالک الحمد کہنے کی بھی روایت موجود ہے، اور امام بھی اسے کہے گا کیونکہ اسی نے دوسروں کو کہنے پر آمادہ کیا ہے۔ کہا۔ پھر امام جب رکوع سے سیدھا کھڑا ہو جائے تو وہ تکبیر کہے اور سجدہ میں چلا جائے، اس موقع پر تکبیر کہنے اور سجدہ کرنے کی وجہ وہی حدیث ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، لیکن سیدھا کھڑا ہونا تو فرض نہیں ہے، اسی طرح دو سجدوں کے درمیان بیٹھنا، اور رکوع و سجود میں طمانیت اختیار کرنا، یہ حکم امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سارے کام فرض ہیں، یہی قول امام شافعیؒ کا بھی ہے، رسول اللہ علیہ السلام کے اس فرمان کی وجہ سے کہ کھڑے ہو اور نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، یہ حکم آپؐ نے ایک ایسے اعرابی کو دیا جس نے نماز پڑھی تھی مگر نماز میں تخفیف کی تھی (یعنی جلدی جلدی پڑھ

لی تھی)۔

توضیح:- تنہاپڑھنے والادونوں کہے، رکوع سے اٹھنے کی حالت، سجدہ کی کیفیت، وسجدوں کے درمیان بیٹھنا، حدیث سے دلیل

والمنفرد یجمع بینهما فی الاصح، وان کان یروی الاکتفاء بالتسمیع......الخ

اور تنہا نماز پڑھنے والاان دونوں ذکر کو جمع کرے اصح روایت کے مطابق۔ف۔یہ روایت حسنؒ نے ابو حنیفہؒ کے حوالہ سے ذکر کی ہے جیسا کہ ہمارا مذہب ہے، اور مصنفؒ نے کہاہے کہ یہی روایت اصح ہے اور ایک روایت میں ہے کہ **فقط ربنا لك الحمد** پڑھے، قاضی خان نے کہاہے کہ اکثر مشائخ اسی کے قائل ہیں، اور مبسوط میں کہاہے کہ یہی قول اصح ہے، اور شرح الاقطع میں کہاہے کہ صحیح یہ ہے کہ منفرد دونوں کو جمع نہ کرے، اور صدر شہیدؒ نے جامع صغیر کی شرح میں ذکر کیاہے کہ **منفرد سمع الله الخ** کہے۔مع۔ مصنفؒ نے امام اعظمؒ کی طرف اس روایت کو اصح کہاہے جس میں جمع کرنے کا بیان ہے، **وان کان الخ** اگرچہ امام اعظمؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ **منفرد فقط سمع الله لمن حمده** کہنے پر اکتفاء کرے، اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ **فقط ربنا لك الحمد** پر اکتفاء کرے۔

والامام بالدلالة علیه اتی به معنی...... الخ

اور خود امام نے بھی حمد کو ادا کیاہے اگرچہ لفظا نہیں کہا بلکہ معنی کہاہے اس طرح سے کہ مقتدی کو کہنے پر آمادہ کیاہے۔ف۔ کیونکہ نیکی کو بتانے والااس کے کرنے والے کے مثل سمجھا جاتاہے **الدال علی الخیر کفاعله** کے قاعدہ کے مطابق، پھر اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ یہ ذکر مسنون ہے، اور قومہ یعنی رکوع کے بعد کھڑا ہوجانا اور کھڑا رہنا، اور رکوع کرنے میں اعتدال کرنا تو اس میں اختلاف ہے، کیونکہ امام ابو یوسفؒ کا قول اظہر یہ ہے کہ ایک تسبیح کے اندازے سے قومہ کرنا واجب ہے لیکن اعتدال کرنا فرض ہے۔ واللہ اعلم۔

قال ثم اذا استوی قائما کبّر و سجد، اما التکبیر والسجود فلما بینا......الخ

مصنفؒ نے کہاہے کہ پھر جب سیدھا کھڑا ہوجاوے۔ف۔ یعنی رکوع سے اٹھ کر جسے قومہ کہا جاتاہے تو **ربنا لك الحمد** کہے اگرچہ امام ہو اصح قول کے مطابق۔ع۔د۔ پھر تکبیر کہے سجدہ میں جاتے ہوئے۔ محیط۔د۔ اور سجدہ کرے۔ف۔ یعنی مشہور طریقہ کے مطابق پیشانی زمین پر رکھے۔ **اما التکبیر الخ** تکبیر کہنے اور سجدہ کرنے کی دلیل تو وہی ہے جو اوپر بیان کی جاچکی ہے۔ف۔ کہ رسول اللہ ﷺ ہر جھکاؤ اور اٹھاؤ میں تکبیر کہتے، اور **وارکعوا واسجدوا** کی آیت سے رکوع اور سجدہ فرض ہوا ہے۔

واما الاستواء قائما فلیس بفرض......الخ

اور رکوع سے سیدھا کھڑا ہونا تو یہ فرض نہیں ہے، اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان جسے جلسہ کہا جاتاہے، اور خود رکوع وسجود میں طمانینت بھی فرض نہیں ہے، اور یہ سب امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک فرض نہیں ہیں۔ف۔ لیکن قول محقق کے مطابق اس کے نزدیک واجبات میں سے ہیں، اور یہی اصح ہے۔م۔

وقال ابویوسفؒ یفترض ذلك کله، وهو قول الشافعی......الخ

اور ابو یوسفؒ نے کہاہے کہ یہ سب باتیں فرض ہیں اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ف۔ فقیہ ابو اللیثؒ نے فرمایاہے کہ یہ اختلاف امام محمدؒ کی کتاب میں مذکور نہیں ہے۔ اور نہ اسرار میں ہے، لیکن ہم نے یہ بات فقیہ ابو جعفر سے حاصل کی ہے کہ یہ ابو یوسفؒ کے نزدیک فرض ہیں۔ع۔

لقوله علیه السلام: قم فصل فانك لم تصل، قاله لاعرابی حین اخف الصلوة......الخ

اس دلیل سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ایسے اعرابی سے فرمایا تھا جس نے نماز بہت تخفیف (یعنی جلد بازی) کے ساتھ پڑھی تھی، کہ تم پھر جاکر نماز پڑھ لو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی، اس نے جیسی نماز پہلے پڑھی تھی ویسی ہی پھر پڑھی تھی، پھر رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر سلام کیا تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ تم پھر سے نماز پڑھ لو کہ تم نے نماز نہیں پڑھی ہے، پھر تیسری اس نے کہا کہ اس ذات پاک کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ میں اس سے بہتر اور نہیں جانتا ہوں اس لئے آپ بہتر پڑھنے کا طریقہ مجھے سکھادیں، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تم جب نماز کے لئے کھڑے ہو تو تکبیر کہو پھر قرآن سے جو تمہیں یاد ہو اس میں سے جو آسان معلوم ہو پڑھو پھر رکوع کرو یہانتک کہ رکوع کی حالت میں اطمینان حاصل ہو جائے، پھر سر اٹھاؤ یہانتک کہ کھڑے ہونے کی حالت میں اعتدال حاصل ہو جائے، پھر سجدہ کرو یہانتک کہ سجدہ کی حالت میں تم مطمئن ہو جاؤ، پھر سر اٹھاؤ یہاں تک کہ بیٹھنے کی حالت میں مطمئن ہو جاؤ، پھر پوری نماز اسی طرح ادا کرو، یہانتک کہ مکمل ہو جائے۔ الفتح۔

یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی اور نسائی بھی روایت کی ہے، اور ان میں سے ایک روایت کے آخر میں یہ جملہ بھی ہے **فان فعلت هذا فقد تمت صلوتك وما انتقصت من هذا فانما انتقصته من صلوتك** یعنی اگر تم نے اس طرح نماز پڑھ لی تو تمہاری نماز پوری ہو گئی، اور جو کچھ تم نے اس میں سے کم کیا وہی اس نماز میں سے کم کیا۔ الزیلعی۔ ان روایات میں سے بعض میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس اعرابی کی نماز پڑھنے کو نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے، اور وہ سلام کے بعد بیٹھ گیا تھا۔ اسی روایت کی بناء پر مصنفؒ نے لکھا کہ کھڑے ہو کر پڑھو۔ الخ. خلاصہ کلام یہ ہوا کہ یہ حدیث اس بات پر صراحۃ دلالت کرتی ہے کہ اعتدال و طمانینت کرنا ضروری ہے، اب یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ ضروری فرض کی حد تک ہے یا واجب، اس بناء پر امام ابو یوسفؒ و شافعیؒ کا قول ہے کہ یہ فرض ہیں۔

ولهما ان الركوع هو الانحناء والسجود هو الانحفاض لغة فيتعلق الركنية با لادنى فيهما وكذا فى الانتقال اذ هو غير مقصود و فى اخر ما روى تسمية اياه صلوة حيث قال وما نقصت من هذا شيئا فقد نقصت من صلاتك ثم القومه والجلسة سنة عندهما.

ترجمہ:- اور ان دونوں کی دلیل یہ ہے کہ رکوع کے معنی جھکنا ہیں اور سجود نام ہے جھکنے کا باعتبار لغت کے، اس لئے رکنیت کا تعلق ان دونوں میں کم سے کم مقدار سے ہوگا، اسی طرح ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے میں بھی کیونکہ یہ بات مقصود اصلی نہیں ہے، اور اس حدیث میں جو بھی آخر میں بیان کی گئی ہے اس میں بھی ایسی حالت کا نام نماز ہی رکھا ہے اس طرح سے کہ اس میں یہ فرمایا ہے کہ بتائے ہوئے طریقہ میں سے جتنا بھی تم نے کم کیا وہ تم نے اپنی نماز میں سے کم کیا ہے، پھر قومہ اور جلسہ سنت ہے ان دو ائمہ کے نزدیک۔

توضیح:- دلیل حدیث سے، قومہ و جلسہ

ولهما ان الركوع هو الانحناء والسجود هو الانحفاض لغة ......الخ

ان دونوں یعنی امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ۔ ف۔ آیت پاک وَارْكَعُوا وَاسْجُدُوا میں نماز کے دو اجزاء یعنی رکوع اور سجود کے کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور ان دونوں کے مفہوم میں کسی قسم کا ایسا اجمال نہیں ہے جسے بیان کرنا ضروری ہو کیونکہ۔ ف۔ ان الركوع الخ یعنی لغت میں رکوع یعنی جھک جانا اور سجود بمعنیٰ پست ہو جانا ہے۔ ف۔ پست ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ سر زمین سے لگ جائے، اسی لئے لغت صراح میں لکھا ہے سجود، سر بر زمین نہادن۔ الہداد۔ یعنی سر زمین پر رکھنا، اس طرح اس کے لغوی معنی بالکل واضح ہیں۔ م۔ اسی بناء پر صرف جھک جانے اور چہرے کا کچھ حصہ زمین پر قبلہ رو رکھ دینے سے اس

کے معنی متحقق ہو جائیں گے۔ف۔

فیتعلق الرکنیة بالادنی فیهما ......الخ

پس ان دونوں ارکان کے تھوڑے تھوڑے حصے کا پایا جانا ہی کافی ہوگا۔ف۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ حصے بھی نہ پائے جائیں تو رکوع و سجود کا ہونا ہی نہ پایا جائے، اس کے بعد رکوع یا سجود میں طمانینت کا ہونا تو وہ خود رکوع یا سجود نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کو تھوڑی دیر تک کرتے رہنے کا نام طمانینت ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ نفس رکوع و سجود اور شئی ہے اور ان میں طمانینت کا پایا جانا دوسری شئی ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ نفس فعل رکوع و سجود بغیر طمانینت کے پایا جا سکتا ہے، اور وہی فعل نماز میں فرض رکن ہے، اور طمانینت اس سے کچھ زائد عمل ہے، پس نص کے مطلق ہونے سے جس قدر ثابت ہے وہ صحیح ہو جائے اور حدیث سے جس طمانینت کا ثبوت ہوتا ہے اس پر وہ عمل موقوف نہ ہو، ورنہ یہ لازم آئے گا کہ اس حدیث سے نص سے ثابت شدہ عمل رکوع وغیرہ منسوخ ہو جائے حالانکہ یہ بات غلط ہے۔الفتح۔

البتہ امام ابو یوسفؒ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نماز اپنے لغوی معنی میں نہیں ہے، اس لئے شرعی مراد میں اجمال ہے، اور اس اجمال کا بیان حدیث سے اس طرح ہو رہا ہے کہ رکوع و سجود سے مراد اتنی دیر تک اس حالت پر رہنا کہ اس میں تین بار تسبیح کہہ سکے، اس طرح اس حدیث سے نص کا منسوخ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ صرف یہ لازم آتا ہے کہ یہ حدیث اس کے لئے بیان ہے جس سے نص کی وضاحت ہوتی ہے، اس شبہ کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث سے اس روایت کا تعارض لازم آتا ہے، پس اس مقصد کے لئے جو اصل ہے وہ لغت ہے اور اسی پر حکم کی بنیاد باقی رہی۔م۔

وکذا فی الانتقال اذ هو غیر مقصود......الخ

اور یہی حال انتقال کا ہے کیونکہ وہ خود مقصود نہیں ہے۔ف۔ یعنی رکوع سے سجدہ کے لئے اور ایک سجدہ سے دوسرے سجدہ کے لئے منتقل ہونا خود مقصود نہیں ہے۔ بلکہ یہ انتقال معنی تو سجدہ و رکوع کے معنی کے واسطہ سے ہے، پس معلوم ہوا کہ قومہ و جلسہ فرض نہیں ہیں۔

و فی اخر ما روی تسمیته ایاه صلوة حیث قال و ما نقصت من هذا شیئا فقد نقصت من صلاتك......الخ

اور خود وہ حدیث ابو یوسفؒ نے روایت کی ہے اس کے آخر میں اس عمل صلوۃ کو بھی صلوۃ ہی کہا ہے جس میں اعتدال و طمانینت نہیں ہے، کیونکہ اس کے آخر میں یہ جملہ ہے **و ما نقصت من هذا الخ**۔ف۔ یعنی رسول اللہ ﷺ نے آخر میں اس اعرابی کو یہ بھی کہا جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ کی ایک روایت ہم نے ذکر کی ہے، اور سنن کی اعرابی والی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اعرابی سے پہلے یہ فرمایا کہ واپس جاؤ اور نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی تو رفاعہ بن رافعؓ نے کہا کہ دوسرے صحابہ کے لئے یہ بات بہت پریشان کن رہی کہ جو شخص خفت کے ساتھ نماز پڑھے تو اس کی نماز بالکل ادا نہ ہو، مگر آخر میں جب یہ فرمایا کہ **فاذا انتقصت منه شیئا فقد انتقصت من صلوتك** کہ تم نے ان اعمال میں جتنی کمی کی اتنی ہی کمی نماز میں کرلی، تو رفاعہؓ نے کہا کہ اس فرمان سے صحابہ کو بہت اطمینان ہو گیا کہ جس نے نماز میں ان چیزوں کی کمی کی تو اس کی نماز میں سے اتنی کمی ہوئی اور کل نماز بے کار نہیں گئی، ترجمہ ختم ہوا۔

اس تحقیق کے بعد یہ بات متحقق ہو گئی کہ عینی اور ابن الہمامؒ کا امام ابو یوسفؒ کے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے طویل بحث کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، البتہ امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق اعتدال اور طمانینت کو رکن ثابت کرنا کسی حد تک درست ہو سکتا ہے لیکن امام ابو یوسفؒ کے حق میں مشکل ہوگا کیونکہ ان کے نزدیک بھی ان چیزوں کا ثبوت واجب کے درجہ میں

ہے جبکہ امام شافعیؒ بعض وجوب کو رکن قرار دیتے ہیں لیکن تو امام اعظمؒ کے اس اصول سے متفق ہیں کہ کسی چیز کو رکن ماننے کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے ایک تو یہ کہ اس کا ثبوت قطعی سے ہو دوسری یہ کہ دوسری کوئی دلیل اسکی معارض اس طرح کی نہ ہو وہ نفس فعل میں سے نہ ہو، جبکہ اس بحث میں ان دونوں چیزوں کا ثبوت دلیل قطعی سے بہت مشکل ہے، اور یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ اس مسئلہ میں ائمہ کرام سے کوئی صریح روایت ثابت نہیں ہے۔ م۔

ثم القومه والجلسة سنة عندهما......الخ

پھر رکوع کے بعد کھڑا ہونا یعنی قومہ کرنا اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنا یعنی جلسہ کرنا امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ف۔ یعنی ایک بار تسبیح کہنے کے اندازے سے۔م۔ یعنی تمام مشائخ میں متفق علیہ ہے۔ف۔ میں کہتا ہوں کہ محیط میں قومہ کے ترک ہو جانے سے سجدہ سہو کو واجب کہا ہے، اور اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف بھی بیان نہیں کیا ہے، جیسا کہ دوسری واجب چیزوں کے بیان میں گذرا۔ فافہم۔م

وكذا الطمانينة فى تخريج الجرجانیؒ وفى تخريج الكرخیؒ واجبة حتى تجب سجدتا السهو بتركها عنده.

ترجمہ:- اور جرجانیؒ کے تحقیق کے مطابق طمانینت کا بھی یہی حال ہے، لیکن کرخیؒ کی تحقیق میں واجب ہے یہانتک کہ ان کے مذہب کے مطابق اس طمانینت کے ترک سے بھی سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔

توضیح:- طمانینت کے بارے میں جرجانی اور کرخیؒ کی تحقیق

وكذا الطمانينة فى تخريج الجرجانیؒ وفى تخريج الكرخیؒ واجبة ......الخ

اور جرجانیؒ کی تحقیق میں طمانینت کا بھی یہی حال ہے۔ف۔ یعنی طمانینت کے مسئلہ میں مشائخ کی تحقیق میں اختلاف ہوا ہے، چنانچہ ابوعبداللہ الجرجانی (جو کہ ابوبکر الرزای کے شاگرد ہیں اور وہ کرخیؒ کے شاگرد ہیں) کی تحقیق میں یہ بھی سنت ہے کیونکہ طمانینت کا عمل تو رکن نماز رکوع یا سجدہ کے پورا کرنے کے ہے، لہذا وہ سنت ہوئی۔ مع۔ لیکن کرخیؒ کی تحقیق میں طمانینت واجب ہے، اسی بناء پر ان کے نزدیک اس کے ترک ہو جانے سے سہو کے دو سجدے لازم ہوتے ہیں۔

ف۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اولیٰ ہے کیونکہ حدیث میں جو یہ فرمان ہے انك لم تصل یعنی تم نے تو نماز ہی نہیں پڑھی، یہ اگرچہ طرفینؒ کے نزدیک مجازی معنی پر محمول ہے یعنی تم نے نقص سے خالی اچھی اور مکمل نماز نہیں پڑھی، لیکن اتنی ناقص پڑھی کہ گویا کچھ نہیں پڑھی، اور اس کا اعادہ واجب ہے اس لئے یہ ایسا مجاز ہوا جو حقیقت کے بالکل قریب ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ طمانینت پر ہیشگی کرنا اور ہمیشہ اسی طرح پڑھنا تو وجوب کی دلیل ہے۔

امام محمدؒ سے ایک بار سوال کیا گیا کہ جو شخص نماز میں طمانینت نہ کرے اس کی نماز کا کیا حکم ہوگا، تو فرمایا کہ مجھے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ اس کی نماز ہی جائز نہ ہو، اور امام سرخسیؒ اور ابواللیثؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے ترک ہونے سے نماز کا اعادہ لازم ہے، اور بعض مشائخ نے فرمایا کہ دوسری بار ادا کرنے سے ہی اس کی ادائیگی سے سبکدوشی ہوگی اس سے پہلے نہیں، اس کے بعد اس کے اعادہ کے واجب ہونے میں کوئی شبہ بھی باقی نہیں رہا، کیونکہ یہی حکم ہر ایسی نماز میں ہے جو کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہوئی ہو، ساتھ ہی فرض نماز دوبار ادا نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ دوسری بار ادا کی ہوئی نماز پہلی نماز کی کمی کو پورا کرنے والی ہو جائے گی، مگر بعض مشائخ نے جو یہ حکم دیا ہے کہ دوسری بار ایسی نماز کو ادا کرنا فرض ہے، تو اس کہنے کا مطلب یہ نکلا کہ پہلی بار کی ادائیگی سے فرض ساقط نہیں ہوا تھا بلکہ باقی رہ گیا تھا، اور یہ حکم اسی وقت دیا جاتا ہے جبکہ کوئی رکن چھوٹا ہو اور واجب نہ چھوٹا ہو، اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ابو یوسفؒ کے نزدیک قومہ و جلسہ و طمانینت سب فرض ہیں، اس دلیل کی وجہ سے کہ یہ تمام کام ہمیشہ کئے

جاتے تھی ان پر مواظبت تھی، جیسا کہ اس سے پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ ترجمہ ختم ہوا۔
یعنی آیت میں اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ کا حکم مجمل ہے، اب جبکہ رسول اللہ ﷺ نے قومہ اور جلسہ میں اعتدال اور رکوع و سجود میں طمانینت پر ہمیشگی فرمائی تو اس عمل سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ یہ بھی ان ارکان میں شامل ہیں جو مفروض ہیں، ایسا ہی کہا گیا ہے۔ بلکہ یہ بتایا جاچکا ہے کہ رکوع و سجود سے ان کے لغوی معنی مقصود نہیں ہیں بلکہ شرعی معنی مقصود ہیں، پس جب فرمان باری تعالیٰ میں لفظ اقیموا جو امر کا صیغہ ہے اس سے مفہوم شرعی کا قصد ہوا ہے تو یہی فرض ہوا، اور اس مفہوم شرعی میں معنی اعتدال بھی داخل ہیں۔ م۔ اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ طمانینت کے متعلق یہ بات معلوم ہوگئی کہ وہ قول اصح میں امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق واجب ہے، اس لئے قومہ و جلسہ بھی رسول اللہ ﷺ کی مواظبت اور مداومت کرنے کی وجہ سے واجب ہی ہونا چاہئے۔ الفتح۔ اور اس دلیل سے بھی کہ بخاریؒ نے ایک حدیث میں بیان کی ہے کہ حضرت حذیفہؓ نے ایک ایسے شخص کو دیکھا تھا جو اپنا رکوع و سجود پورا ادا نہیں کرتا تھا اور اس نے یہ بتایا تھا کہ ایک زمانہ سے اس طرح پڑھتا چلا آرہا ہے تو حضرت حذیفہؓ نے اس سے فرمایا کہ تم نے اب تک اللہ کے واسطے نماز نہیں پڑھی ہے، اور اگر تم اس حال میں مرجاتے تو صحیح طریقہ پر نہیں مرتے۔ ع۔

وعن انس ان النبی ﷺ قال اقیموا ا لرکوع والسجود فواللہ الی لاراکم من بعد ظھری اذا رکعتم وسجدتم، متفق علیہ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم رکوع اور سجود کو قائم کرو یعنی ٹھہر ٹھہر کر ادا کرو، کیونکہ اللہ کی قسم تم جب رکوع اور سجدہ کرتے ہو تو میں تم کو اپنی پیٹھ پیچھے سے دیکھتا ہوں، بخاری اور مسلمؒ دونوں نے اس کی روایت کی ہے، **وعنہ مرفوعا اعتدلوا فی السجود ولایبسطن احدکم ذراعیہ انبساط الکلب رواہ الخمسۃ۔** م۔
یعنی ان سے ہی یہ دوسری روایت بھی مرفوعاً منقول ہے کہ تم سجدہ میں اعتدال کرو، اور تم میں سے ایک بھی اپنے دونوں ہاتھوں کو کتوں کی طرح ہرگز نہ پھیلائے صحاح ستہ میں سے پانچ نے اس کی روایت کی ہے۔ م۔

اور اس دلیل سے بھی کہ حضرت ابو مسعود بدریؓ سے یہ حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **لاتجزی صلوۃ لایقیم الرجل فیھا ظھرہ فی الرکوع والسجود،** یعنی کسی کی ایسی نماز ادا نہیں ہوتی جس میں آدمی اپنی پیٹھ کو رکوع و سجود میں ٹھیک قائم نہ کرے، اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، دار قطنی اور بیہقی نے کی ہے، اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور اس میں امید کرتا ہوں کہ اس کا یہی حکم امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک بھی ہے۔ الفتح۔ یعنی مشائخ نے جو اپنی تحقیقات کے بعد فیصلہ کیا ہے اس کے برخلاف ہم یہ امید کرتے ہیں کہ طرفینؒ کے نزدیک وہی حکم ہے جو حدیث میں مذکور ہے۔ م۔

اور قاضی خان کا یہ قول بھی اسی پر دلالت کرتا ہے کہ اگر کوئی نمازی رکوع کرنے کے بعد فوراً وہیں سے سر اٹھائے بغیر سجدہ میں چلا جائے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق اس کی نماز جائز ہوگی البتہ سجدہ سہو لازم ہوگا حالانکہ حدیث میں تو صاف صاف یہ فیصلہ سنایا گیا ہے: **لایجزی صلوۃ...... الخ،** کہ نماز جائز نہ ہوگی، جواب یہ دیا جائے گا حدیث کا لفظ لایجزی فعل منفی ہے جو اجزاء سے مشتق ہے اور اس مصدر کے معنی کے بارے میں بیضاویؒ نے اصول میں کہا ہے کہ اجزاء ایسے ادا کرنے کو کہتے ہیں جو پورے طور پر مکمل تو نہ ہو مگر کافی ہو، اس سے مکمل ادائیگی میں کمی ثابت ہوتی ہے جس کی تلافی سجدہ سہو کی تلافی سے ہوجاتی ہے، اسی جواب سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ رکوع و سجود میں جو رکن نماز ہیں ان میں طمانینت فرض نہیں ہے، اور اس سے لغوی معنی مراد ہیں ورنہ حدیث میں لایجزی کی بجائے لایجوز ہوتا، یعنی جائز نہیں ہوگی، اور یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ امام شافعیؒ کے اصول کے مطابق بھی جائز ہی ہونا چاہئے اجزاء یعنی کافی کہنے کی تو کوئی بات ہی نہیں ہے، اس لئے اس اصل کے خلاف ان کا قول نہیں ہونا چاہئے، اسی طرح امام ابو یوسفؒ کے متعلق ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ان کے نزدیک فرض سے مراد یہ ہے کہ عملی طور سے ہونا ضروری ہے یعنی واجب قوی ہے، اس تفسیر کی بناء پر ہمارے ائمہ ثلاثہ میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا، اور یہ بات

اچھی طرح واضح ہو گئی کہ دلیل کی روشنی میں طمانینت، قومہ اور جلسہ تینوں میں سے ہر ایک عمل واجب ثابت ہے۔

ف۔ پوری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ آیت پاک اَقِیمُوا الصَّلٰوۃَ اور ارْکَعُوا وَاسْجُدُوْا میں اصل مطلوب رکوع اور سجود ہے اور ابن مسعودؓ کی حدیث سے یہ معلوم ہوا کہ رکن اپنے لغوی معنی میں ہے، اور لغت ہی استعمال میں اصل ہے، اور طمانینت واجب اور اعرابی کی حدیث میں یہی چیز مطلوب ہے، اس طرح یہ سب باتیں واجب ثابت ہوئیں، اسی اشکال کی بناء پر ہم نے اس فصل کی ابتداء میں فرائض ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان میں سے اکثر باتیں واجبات سے ہیں، اور یہ کہ دلیل کی روشنی میں ہمیں ان باتوں کو فرائض کہنے میں اشکال ہے، اس بحث میں اچھی طرح غور کرنے کی ضرورت ہے۔ م۔ اب یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مشائخ نے فرمایا ہے کہ نمازی جب سجدہ کرنے کا ارادہ کرے۔ ھ۔ تو سب سے پہلے اپنے گھٹنے رکھے اور اگر موزے پہنے ہو تو پھر پیشانی رکھے، اور ہاتھوں کو کانوں کے مقابل اور انگلیوں کو قبلہ رخ رکھے، اور ہتھیلیوں پر زور دے، اور ہاتھوں کو دونوں بغل سے جدا رکھے، اور کہنیوں کو زمین پر نہ بچھائے، اور پیٹ کو رانوں سے جدا رکھے، مگر عورت اپنے ہاتھوں جدا رکھے، اور پیٹ کو ران پر بچھا دے، الخلاصہ وغیرہا۔

ویعتمد بیدیه علی الارض، لان وائل بن حجرؓ وصف صلاة رسول اللهﷺ فسجد وادعم علی راحتیه ورفع عجیزته، ووضع وجهه بین کفیه ویدیه حذاء أذنیه، لماروی انه علیه السلام فعل کذلك.

ترجمہ: - اور سجدہ میں جانے کے وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین پر ٹیک لگائے، اس لئے کہ حضرت وائل بن حجرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی نماز کی کیفیت اپنے عمل سے اس طرح بیان کی کہ سجدہ میں گئے اس طرح سے کہ اپنی ہتھیلیوں پر زور دیا اور اپنے سرین کو اٹھایا، اور اپنے چہرہ کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں کانوں کے بالمقابل رکھا، کیونکہ روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی طرح کیا ہے۔

توضیح: - رکوع سے سجدہ میں جانے کی کیفیت

سجدہ میں زمین پر ہاتھ بچھانا اور ان کے درمیان چہرہ رکھنا

ویعتمد بیدیه علی الارض، لان وائل بن حجرؓ وصف صلاة رسول اللهﷺ فسجد......الخ

اور سجدہ کرتے وقت اپنے دونوں ہاتھوں سے زمین پر ٹیک لگائے۔ ف۔ مگر حق یہ ہے کہ پہلے گھٹنے رکھنا اولیٰ ہے البتہ جب عمر زیادہ ہو جائے یا موزے پہنے ہوئے ہو تب پہلے ہاتھوں سے ٹیک دے بعد میں گھٹنے رکھے، اور یہی صحیح مسلم کی حدیث میں ہے۔ م۔ لان وائل الخ کیونکہ وائل بن حجرؓ نے رسول اللہ ﷺ کی نماز کی نقل دکھاتے ہوئے سجدہ کیا تو دونوں ہتھیلیوں پر ٹیک لگایا اور سرین کو اونچا رکھا۔

ف۔ یہ حدیث وائلؓ سے نہیں ملی مگر ابو یعلی الموصلی نے براء بن عازبؓ سے روایت کی جس کے الفاظ اس طرح ہیں **حدثنا محمد بن الصباح حدثنا شریك عن ابی اسحق قال وصف البراء بن عازب السجود فسجد وادعم علی کفه ورفع عجیزته وقال هکذا کان رسول اللهﷺ یسجد،** یعنی ابو اسحٰق نے کہا کہ براء بن عازب نے سجدہ کی نقل کی اس طرح سے کہ سجدہ کیا اور ہتھیلی پر ہاتھ کو ٹیک دیا، اور سرین اونچی کی اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ اسی طرح سجدہ کرتے تھے، اس کی روایت ابی داؤد اور نسائی نے کی ہے، اور نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ اس کو بیہقی و ابن حبان نے بھی روایت کیا ہے، اور یہ حدیث حسن ہے۔ مع۔ ف۔

ووضع وجهه بین کفیه ویدیه حذاء أذنیه، لماروی انه علیه السلام فعل کذلك......الخ

اور اپنے چہرہ کو دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں اور دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کے بیچ میں رکھے۔ ف۔ یہی قول احمد کا

ہے۔ع۔لما روی الخ کیونکہ روایت سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو اپنے چہرہ کو اپنی دونوں ہتھیلیوں کے درمیان رکھا، اس کی روایت مسلم نے کی ہے، اور اسحٰق بن اس طرح روایت کی ہے کہ **اخبرنا الثوری عن عاصم بن کلیب عن ابیه عن وائل بن حجرؓ قال رمقت النبی ﷺ فلما سجد وضع یدیه حذاء اذنیه.** یعنی میں رسول اللہ کو دیکھتا رہا، یہانتک کہ جب آپ نے سجدہ کیا تو دونوں ہاتھوں کو دونوں کانوں کے مقابل میں رکھا۔اس کی روایت عبد الرزاق نے اپنے مصنفؒ میں کی ہے، اور طحاویؒ نے حفص بن غیاث عن الحجاج عن ابی اسحٰق روایت کی ہے کہ ابواسحٰقؒ نے کہا ہے کہ میں نے براء بن عازبؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں اپنی پیشانی کہاں رکھتے تھے، تو کہا کہ دونوں ہتھیلیوں کے درمیان۔فع۔اس قسم کی حدیثیں حجت ہیں، اور امام شافعیؒ کے نزدیک دونوں ہتھیلیوں کو......الخ کندھوں کو سامنے رکھے، جس کی دلیل ابوسعید ساعدیؓ کی حدیث ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے اور ایسی ہی روایت ابوداؤد اور ترمذی میں بھی ہے، لیکن بخاریؒ کی اسناد میں فلیح بن سلیمان جو راوی ہیں وہ اگر کبار علماء میں سے ہیں اور تمام صحاح ستہ والوں نے ان سے روایت کی ہے اس کے باوجود ذہبیؒ نے میزان میں ذکر کیا ہے کہ نسائی وابن معین وابو حاتم وابوداؤد ویحییٰ بن سعید القطان اور ساجیؒ انہیں ضعیف کہا ہے۔مف۔

اسی بناء پر ابن معین اور ابوحاتم اور نسائیؒ نے کہا ہے فلیح بن سلیمان قوی نہیں ہیں، اور یحییؒ سے مروی ہے کہ وہ ثقہ نہیں ہیں اور دوسری روایت میں کہا ہے کہ وہ ضعیف ہیں اور تیسری روایت میں کہا ہے کہ انہیں حجت میں پیش نہیں کیا جائے، ابن معینؒ نے کہا ہے کہ یہ تین شخص ایسے ہیں کہ ان کی حدیث قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے، ا۔تحویل بن مصرف۔نمبر ۲۔ایوب بن عتبیہ، نمبر۔فلیح بن سلیمان، ساجیؒ نے کہا ہے کہ فلیح کو وہم ہوتا ہے، اور ابن معینؒ نے ابوکامل سے نقل کیا ہے کہ ہم فلیح پر اتہام رکھتے تھے، ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ فلیح حجت میں لانے کے لائق نہیں ہیں، دار قطنیؒ نے کہا ہے کہ معتبر اماموں نے فلیح کے بارے میں اختلاف کیا ہے، لیکن فی الحقیقت ان میں کچھ بات نہیں ہے۔م۔

ابن الہمام نے کہا ہے کہ فلیح کے بارے میں اگرچہ یہ اقوال مذکورہ موجود ہیں مگر قول راجح یہی ہے کہ یہ قابل حجت ہیں، اسی بیان کی وجہ سے حضرت وائلؓ کی وہ حدیث جو صحیح مسلم میں ہے ترجیح دی گئی ہے، عینیؒ نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔

واضح ہو کہ بندہ مترجم کے لئے یہ بات مشکل معلوم ہوتی ہے کہ ایسے واقعات اور افعال میں سے کسی ایک پر ہی اکتفاء اور حصر کر لیا جائے کہ یہی فعل صحیح ہے کیونکہ ایسے مواقع میں اس بات کا احتمال باقی رہتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں طرح وہ عمل کیا ہو، یعنی کبھی اپنی ہتھیلیاں کندھوں کے مقابل اور کبھی کانوں کے برابر رکھی ہوں، اور آپ کے تمام ایسے افعال میں اسی طرح ہونا ممکن ہے ہاں اگر کوئی فعل اس طرح کا نقل کیا گیا ہو کہ اسی طرز پر آپ نے ہمیشہ عمل کیا ہو، اسی بناء پر ابن الہمامؒ نے یہ بات بہت اچھی کہی ہے کہ اس طرح کہنا چاہئے کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ مذکورہ دونوں طریقوں میں سے جس طریقہ پر عمل آسان ہو وہ کرلے تا کہ ساری مرویات میں اتفاق ہو جائے اور کوئی اختلاف باقی نہ رہے، اس طرح سے کہ آپ ﷺ کبھی اس طرح کرتے اور کبھی اس طرح کرتے البتہ اتنا فرق ہے کہ کانوں کے مقابل ہتھیلیوں کے رکھنے میں ہاتھوں کا اپنے پہلو سے جدا رکھنے پر آسانی سے عمل ہو جاتا ہے جو کہ خود ایک مسنون عمل ہے، بیان ختم ہوا، اور میں مترجم بھی یہی کہتا ہے کہ یہی فیصلہ معقول ہے۔

قال وسجد علی انفه وجبهته، لان النبی علیه السلام واظب علیه، فان اقتصر علی احدهما جاز عند ابی حنیفة، وقالا لایجوز الاقتصار علی الانف الا من عذر، وهو روایة عنه، لقوله علیه السلام: امرت ان اسجد علی سبعة اعظم، وعَدَّ منها الجبهة، ولابی حنیفة ان السجود یتحقق بوضع بعض الوجه وهو المأمور به، الا ان الخد والذقن خارج بالاجماع، والمذکور فیما روی الوجه فی المشهور.

ترجمہ:۔اور کہا کہ اپنے ناک اور اپنے پیشانی پر سجدہ کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہمیشگی کی ہے، اس لئے ان دونوں میں سے کسی ایک پر اکتفاء کرے گا تو بھی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہوگا، لیکن صاحبینؒ نے کہا ہے کہ بغیر عذر

کے صرف ناک پر اکتفاء کرنا صحیح نہ ہوگا اور یہی خود امام اعظمؒ کے نزدیک بھی ایک روایت ہے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی بناء پر کہ مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں اور ان سات میں سے ایک پیشانی کو بھی شمار کیا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ چہرہ کے کچھ حصہ کو زمین پر رکھنے سے ہی سجدہ ثابت ہو جاتا ہے، اور اس کا ہمیں حکم دیا گیا ہے البتہ اجماع کی وجہ سے رخسار اور ٹھوڑی چہرے سے خارج ہیں اور وہ روایت جو اوپر مذکورہ ہوئی اس کی مشہور روایت میں لفظ الوجہ یعنی چہرہ ہے۔

توضیح: -ناک اور پیشانی پر سجدہ، صرف ناک پر سجدہ کرنا، حدیث سے دلیل

قال وسجد علی انفه وجبهته......الخ

اپنی ناک اور پیشانی پر سجدہ کرے۔ف۔ ناک سے مراد وہ جگہ ہے جو سخت ہے اور سامنے کا حصہ جو حصہ ہوتا ہے مراد نہیں ہے۔ف۔ اور پیشانی کی حد یہ ہے کہ ایک کنپٹی سے دوسری کنپٹی تک اور بھنوؤں کے نیچے سے سر کے پیالہ تک۔د۔ اور اس بات پر اجماع ہے کہ ان تمام حصوں کا رکھنا واجب نہیں ہے۔ مفع۔ کہا گیا ہے کہ پیشانی کے اکثر حصہ کو رکھنا واجب ہے، اور دوسرا قول ہے کہ یہ فرض ہے جیسا کہ بعض پیشانی کو رکھنا بالاتفاق فرض ہے۔د۔

لان النبی علیه السلام واظب علیه......الخ

کیونکہ نبی کریم ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی ہے۔ف۔ یعنی سجدہ میں ناک اور پیشانی دونوں رکھتے تھے، جیسا کہ ابو حمید ساعدی کی حدیث میں ہے، پھر سجدہ کیا اور اس میں اپنی ناک اور پیشانی کو زمین پر رکھا، صحیح بخاری وابوداؤد اور نسائی، اسی کی مانند وائلؓ کی حدیث ہے، طبرانی اور ابو یعلی نے اس کی روایت کی ہے۔

فان اقتصر علی احدهما جاز عند ابی حنیفة......الخ

اگر سجدہ میں فقط ناک پر یا فقط پیشانی پر اکتفاء کیا، تو بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے۔

ف۔ لیکن اس میں قول پر **وقالا لایجوز الخ** اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ مجبوری کے علاوہ عام حالات میں صرف ناک پر اکتفاء کرنا جائز نہیں ہے۔ف۔ مثلاً پیشانی میں زخم ہو، اس مثال سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صاحبینؒ کے نزدیک بھی صرف پیشانی پر اکتفاء کرنا جائز ہے، اور نہایہ میں اس بات کی تصریح کر دی ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، لیکن تحفہ اور بدائع سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک مکروہ بھی نہیں ہے، اور المفید اور المزید کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے، برخلاف ناک پر اکتفاء کرنے کے کہ بلا عذر ناک پر اقتصار کرنا جائز ہی نہیں ہے، لیکن امام اعظمؒ کے نزدیک جائز مگر مکروہ ہے، اور درر میں ہے کہ امام صاحب نے صاحبینؒ کے قول کی طرف رجوع کر لیا ہے، یہی قول صحیح ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔

اور مصنفؒ نے فرمایا ہے **هو روایة عنه الخ** یہی امام صاحب سے ایک روایت ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ میں اس بات کا حکم دیا گیا ہوں کہ میں سات ہڈیوں پر سجدہ کروں، اور ان میں سے پیشانی کو بھی شمار کیا ہے۔ف۔ چنانچہ فرمایا ہے پیشانی پر، اور دونوں ہاتھوں پر اور دونوں گھٹنوں پر اور دونوں قدموں کے کناروں پر، یہ حدیث حضرت ابن عباسؓ سے صحاح کی مروی ہے۔فع۔ اس کی توجیہ اس طرح سے ہے کہ ان اعضاء میں پیشانی کا شمار ہے، لیکن ناک شمار نہیں ہے، اس لئے صرف ناک پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہوگا، سجدہ نام ہے زمین پر چہرہ رکھنے کا۔ اس چہرہ سے اس کا پورا حصہ رکھنا مراد ہے، اور اس کا پورے اجزاء بھی مراد نہیں ہے۔ بالاتفاق۔ اسی بناء پر گال وغیرہ اس سے خارج ہیں، لہٰذا چہرہ جو ایک کل ہے اس کے اس جز کو متعین کرنا ضروری ہے جس کے رکھنے سے سجدہ ادا ہو جائے چنانچہ اس مجمل کو اس حدیث سے واضح کر دیا گیا، اور نقص کا مفہوم ظاہر ہو گیا، اور ناک پر سجدہ کرنے کا یقیناً مداومت پائی گئی ہے اس لئے اس کا ترک کرنا مکروہ ہوگا، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے اس بیان کی ہوئی

حدیث میں جن ہڈیوں پر سجدہ کرنے کا حکم ہے ان میں دونوں ہاتھوں اور گھٹنوں کا بھی ذکر ہے، اگرچہ قرآن پاک پر ان کا ذکر نہیں ہے، اس میں مزید گفتگو عنقریب آئے گی۔م۔

ولابی حنیفة ان السجود یتحقق بوضع بعض الوجه المامور به......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ چہرہ کے بعض حصہ کو زمین پر رکھنے سے ہی سجدہ متحقق ہو جاتا ہے، اور قرآن پاک میں اسی بات کا حکم دیا گیا ہے۔ف۔الحاصل قرآن میں جو حکم ہے وہ مطلق ہے اور مجمل نہیں ہے الا ان الخد الخ البتہ چہرہ کے اجزاء میں سے کچھ مثلاً گال اور ٹھوڑی تو بالاتفاق اس حکم سے خارج ہیں۔ف۔ مطلب یہ ہے کہ آیت مطلق ہونے کی وجہ سے ان حصوں پر حکم لاحق ہوتا تھا لیکن اجماع امت سے یہ اجزاء اس حکم میں داخل نہیں ہیں، یعنی ساری امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آیت میں یہ اجزاء مراد نہیں ہیں۔

الحاصل چہرہ میں سے ٹھوڑی اور گال کے ماسوا باقی اجزاء پر سجدہ کرنا جائز ہے، اور جس حدیث میں جبہہ (پیشانی) کا ذکر ہے وہ مشہور ہے والمذکور فیما روی الخ کیونکہ مشہور روایت میں جو مذکور ہے وہ وجہ یعنی چہرہ ہے۔ف۔اس طرح یہ روایت بھی اس بات میں متفق ہوئی کہ گال اور ٹھوڑی کے ماسوا باقی تمام چہرہ سے، سجدہ جائز ہے، حضرت عباسؓ بن عبد المطلب کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب بندہ سجدہ کرتا ہے تو اس کے ساتھ سات اعضاء بدن سجدہ کرتے ہیں چہرہ، دونوں ہتھیلیاں دونوں گھٹنے اور دونوں قدم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان، حاکم، ابو یعلی اور طحاوی نے اس اس کی روایت کی ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ مصنفؒ کا یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ مشہور روایت میں لفظ وجہ یعنی چہرہ ہے، کیونکہ مشہور روایت میں لفظ جبہہ ہی ہے، اور صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ان سات ہڈیوں پر سجدہ کروں یعنی پیشانی، ناک دونوں ہاتھ دونوں گھٹنے اور دونوں قدم اس حدیث میں ناک پیشانی کے تابع ہے ورنہ تعداد بجائے سات کے آٹھ ہو جائے گی، اور صحاح ستہ کی اس مذکورہ روایت میں جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول اس میں جبہہ کے بیان کے وقت ناک کی طرف ہاتھ سے اشارہ مذکور ہے، اور حق بات یہ ہے کہ عباسؓ بن عبد المطلب کی حدیث میں لفظ چہرہ یا اراب کی مراد یہ معلوم ہو گئی کہ وہ چہرہ ہی ہے، کیونکہ اس میں کسی طرح بھی پورا چہرہ مراد نہیں ہے۔

ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ جب یہ بات واضح ہو گئی کہ الوجہ یعنی چہرہ سے مراد جبہہ کا بیان ہے تو وہ آیت جو مجمل ہے اس کا بیان بھی اسی سے ہو گیا، اور اسی وجہ سے کہ حق بات یہی ہے کہ آیت مجملہ تو مشائخ نے صاحبینؒ کے قول پر ہی فتویٰ دیا ہے، اسی لئے امام اعظمؒ کا اسی طرح رجوع کرنا بھی اسد بن عمرو کی روایت کے موافق صحیح ثابت کیا ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ جب یہ حدیث آیت کے لئے بیان ٹھہری تو لازم ہو گا کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں گھٹنوں پر بھی سجدہ کرنا فرض ہو کیونکہ یہ بات تو کسی طرح مناسب نہیں ہے کہ حدیث کے ایک جزو کو بیان رکھا جائے اور باقی اجزاء کو ترک کر دیا جائے، لیکن ہمارے ائمہ کرام سے اس کے خلاف تصریح پائی گئی ہے، جیسا کہ مصنفؒ نے آئندہ کہا ہے۔

ووضع الیدین والرکبتین سنة عندنا لتحقق السجود دونهما واما وضع القدمین فقد ذکر القدوری انه فریضة فی السجود.

ترجمہ:-اور ہمارے نزدیک دونوں ہتھیلیوں اور گھٹنوں کو رکھنا سنت ہے کیونکہ اس کے رکھے بغیر بھی سجدہ ادا ہو سکتا ہے، البتہ دونوں قدموں کو رکھنا تو اس کے متعلق صاحب قدوریؒ نے کہا ہے کہ یہ سجدہ میں فرض ہے۔

توضیح:- سجدہ میں قدموں کو رکھنا

ووضع الیدین والرکبتین سنة عندنا لتحقق السجود دونهما......الخ

اور ہاتھوں اور گھٹنوں کا رکھنا ہمارے نزدیک سنت ہے۔ف۔ ابن الہمامؒ نے کہاہے کہ اس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ امرت ان اسجد کے فرمان میں یعنی مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ میں اس طرح سجدہ کروں، الخ، حدیث میں حکم سے مراد یہ ہے کہ مجھے اس بات کا مطالبہ ہوا ہے، اور یہ خاص کر مطالبہ بطور واجب مراد نہیں ہے بلکہ بطور استحباب و سنت ہے، پھر ابن الہمامؒ نے اس مسئلہ کو شافعیہ کے مسلک کے مطابق قرار دیا ہے اور اپنے یہاں ایسی صورت میں وجوب مراد لیا ہے، البتہ اس وجوب سے سنت مراد لینا اس طرح ہے کہ ہاتھ اور گھٹنے رکھے بغیر بھی سجدہ ادا ہو سکتا ہے، لیکن ان کو رکھ کر سجدہ کرنے میں زیادہ طور سے ادا ہوتا ہے، لہٰذا اسی طرح سجدہ کرنا سنت ہوا، پھر خود ہی یہ احتمال بھی پیدا کیا اس بہتری کے ساتھ ہی ادا کرنا مطلوب ہو تو ایسی صورت میں وہ سنت باقی نہ رہے گا بلکہ واجب ہو گا، بہر صورت فرض نہ ہو گا (مختصراً)۔

اور مصنفؒ نے اس کی صورت ہونے پر خود اس طرح دلیل قائم کی ہے کہ **لتحقق السجود الخ** کیونکہ ان دونوں کے رکھے بغیر بھی سجدہ کرنا ممکن ہے۔ف۔ اور ان کے ساتھ اس میں بہتری پائی گئی اس لئے یہ سنت ہے، بندہ مترجم یہ کہتا ہے کہ صاحبینؒ کی دلیل کی متعلق بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کے فرمان کے مطابق چہرہ سے سجدہ کرنے حکم مجمل ہے اور اس کے بیان کے لئے یہ حدیث ہے **امرت ان اسجد** الخ سے جبہہ کا لفظ آیا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ جبہہ یعنی پیشانی پر تو سجدہ کرنا فرض ہوا اور ناک پر سجدہ کرنے آپ کی مداومت پائی گئی نیز یہ ناک تابع ہونے کی وجہ سے اس پر سجدہ کرنا واجب ہوا، پھر مجمل سجود میں چونکہ ہاتھ اور گھٹنے داخل نہ تھے لیکن ان کی تفسیر بھی نہ ہوئی بلکہ ان کا رکھنا صرف بطور سنت ہوا۔

لیکن اس بیان پر یہ اعتراض وارد ہو تا کہ انسان کی فطری تخلیق کے بر خلاف سجدہ کرنا ممکن ہو جائے تو اس کا اعتبار نہ ہو گا، اس بناء پر یہ بات لازم آتی ہے کہ حدیث آیت کی تفسیر قرار دی جائے اس طرح ہاتھ اور گھٹنا رکھنا بھی واجب ہو جائے، لیکن اسے فرض اس لئے نہیں کہا جائے گا کہ اس حدیث میں تھوڑا سا شک بھی باقی رہ جاتا یعنی اس میں قطعیت نہیں پائی جاتی ہے۔م۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ہاتھوں اور گھٹنوں کو بھی رکھنا کیوں واجب نہیں کہا جائے جبکہ حدث کے ظاہر سے اور رسول اللہ ﷺ کا ان کاموں پر مواظبت کرنے سے بھی وجوب سمجھا جاتا ہے، اور فقیہ ابواللیثؒ بھی اسی قول وجوب کو اختیار کیا ہے۔الفتح۔

اور واقعات میں ہے کہ اگر مصلی نے دونوں ہاتھ اور گھٹنے زمین پر نہیں رکھے تو سجدہ پورا ادا نہ ہوا، یہی قول فقیہ ابواللیث کا بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ ہمارے مشائخ ایسے سجدہ پر بھی جائز ہونے کا فتوی دیتے ہیں، یہاںتک کہ اگر اس شخص کے ہاتھوں اور گھٹنوں کے نیچے نجاست موجود ہو تو بھی جائز ہے، ذخیرہ میں ہے کہ فقیہ ابواللیثؒ نے اس روایت کو صحیح نہیں کہا ہے، اور عمدۃ الفتاوی میں ہے کہ گھٹنے یا ہاتھ کے نیچے اگر نجاست پڑی ہوئی ہو تو سجدہ صحیح نہ ہو گا۔ مع۔ احتیاط کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس پر فتویٰ ہو، پہلے بھی ہم یہ بات بیان کر چکے ہیں۔م۔

واما وضع القدمين فقد ذكر القدوری انه فريضة فی السجود......الخ

اور سجدہ کے وقت قدموں کو زمین پر رکھنے کے بارے میں قدوریؒ نے کہا ہے کہ ایسا کرنا فرض ہے۔ف۔ اگر کسی نے ایک پاؤں اٹھایا اور دوسرا زمین پر رہنے دیا تو سجدہ جائز مگر مکروہ ہو گا۔ف۔ اور اگر ایک پاؤں کے نیچے مقدار درہم سے زائد ہو تو جائز نہ ہو گا، عمدۃ الفتاویٰ، اور اگر دونوں پاؤں کی انگلیاں سجدہ میں اٹھالیں تو جائز نہیں ہے، کرخی اور جصاصؒ نے مختصرات میں ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ الذخیرہ۔ مع۔ اور اگر ایک انگلی بھی لگی ہو تو کافی ہے۔ف۔ گویا ہر قدم سے ایک ایک انگلی رکھنی کافی ہے، ورنہ مکروہ ہو گا، جیسا کہ پاؤں اٹھانے میں کراہت ہے۔ الحاصل سجدہ کرنا پیشانی پر فرض اور ناک اور ہاتھ اور گھٹنوں پر واجب اور قدموں پر فرض ہے۔م۔

فان سجد على كور عمامته او فاضل ثوبه جاز، لان النبی عليه السلام كان يسجد على كور عمامته، ويروی انه عليه السلام صلی فی ثوب واحد يتقی بفضوله حر الارض وبردها.

ترجمہ:-اگر کسی مصلی نے عمامہ کے پیچ پر یا اپنے زائد کپڑے سجدہ کیا تو جائز ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنے عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرتے تھے، اور بیان کیا جاتا ہے کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھتے تھے اور اس کے زائد حصہ سے زمین کی گرمی اور ٹھنڈک سے بچتے تھے۔

توضیح:-عمامہ کے پیچ یا فاضل کپڑے پر سجدہ کرنا، حدیث سے دلیل

فان سجد علی کور عمامته او فاضل ثوبه جاز......الخ

اگر نمازی نے عمامہ کے پیچ پر یا بڑے کپڑے پر سجدہ کیا تو جائز ہے۔ف۔یہی مذہب ایک جماعت ائمہ تابعینؒ اوزاعی ومالکؒ واسحٰقؒ کا ہے اور امام احمد کے مذہب میں بھی یہی اصح روایت ہے، اور تہذیب الشافعیہ میں ہے کہ عام علماء کا یہی قول ہے، مگر بالاتفاق اس میں ایک شرط یہ ہے کہ پیشانی رکھنے سے زمین کا حجم محسوس ہو ورنہ نہیں۔مع۔لان النبی ﷺ الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنے عمامہ کے پیچ پر سجدہ کیا کرتے تھے۔ف۔لیکن اس جگہ ایک قید ضروری ہوگی کہ عمامہ کا پیچ پیشانی پر ہو، اگرچہ پیشانی کے تھوڑے سے حصہ پر ہو، کیونکہ اگر وہ پیچ صرف سر پر ہوا اور اسی پر سجدہ ہو اور پیشانی کچھ نہیں لگتی ہو تو وہ سجدہ جائز نہ ہوگا۔ت۔اور فتح القدیر میں تجنیس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ مکروہ تنزیہی ہوگا، بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں عبداللہ بن محرر ضعیف ہے اور جابرؓ کی سند میں عمرو بن شمر ضعیف ہے، اور ابو حاتمؒ نے کہا ہے کہ انسؓ کی حدیث منکر ہے، مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ حضرت ابن عباسؓ اور ابن ابی اوفیؓ دونوں کی اسناد عمدہ اور جید ہیں، اور ان کی وجہ سے جو روایت ضعیف ہے وہ بھی قوی ہو جاتی ہے۔مع۔

ابن الہمامؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث اس طرح نقل کی ہے، کہ ابو نعیم نے حلیہ میں کہا ہے حدثنا ابو یعلی الحسین بن محمد الزبیری حدثنا ابوالحسن عبداللہ بن موسی الحافظ الصوفی البغدادی حدثنا لاحق حدثنا الحسن بن علی الدمشقی حدثنا محمد بن فیروز المصری حدثنا بقیه بن الولید حدثنا ابراهیم بن اوهم عن ابیه اوهم بن منصور العجلی عن سعید بن جبیر عن ابن عباسؓ ان النبی ﷺ کان یسجد علی کور عمامته، یعنی رسول اللہ ﷺ عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرتے تھے، اور طبرانی کی ابن ابی اوفی کی روایت میں ہے کہ میں نے آپ ﷺ کو دیکھا کہ آپ عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرتے تھے، ابن عدی نے کامل میں حضرت جابرؓ سے ایسی اسناد سے روایت کی ہے جس میں عمرو بن شمر عن جابر الجعفی ہے، اور یہ دونوں ضعیف ہیں۔

اور حافظ ابوالقاسم تمام بن محمد الرازی نے فوائد میں کہا ہے حدثنا محمد بن ابراهیم بن عبدالرحمن اخبرنا ابوبکر احمد بن عبدالرحمن بن ابی حصین الطر طوسی حدثنا کثیر بن عبید حدثنا سوید بن عبدالعزیز بن عمر عن نافع عن ابن عمرؓ ان النبی ﷺ کان، یسجد علی کور العمامة، اور مصنفؒ نے فاضل کپڑے پر سجدہ کی دلیل میں کہا ہے ویروی انه علیه السلام صلی فی ثوب واحد یتقی بفضوله حر الارض وبردها، اور یہ بھی روایت ہے کہ حضرت ﷺ نے ایک ایسے کپڑے میں نماز پڑھی کہ اس کے زائد جصے سے زمین کی گرمی اور ٹھنڈک سے خود کو بچاتے تھے۔ف۔یہ حدیث ابن ابی شعیب نے روایت کی ہے حدثنا شریك عن حسین بن عبدالله عن عكرمة عن ابن عباسؓ ان النبی ﷺ فی ثوب الخ، اور اس حدیث کو احمد وابو یعلی وطبرانی اور ابن عدیؒ نے روایت کیا ہے، لیکن ابن عدی نے حسین بن عبداللہ کا ضعف نقل کیا اور کہا ہے کہ میرے نزدیک اس کی حدیث لکھی جائے کیونکہ اس کی کوئی حدیث بھی منکر نہیں پائی گئی۔

میں کہتا ہوں کہ بیہقیؒ نے سنن میں حسن بن بصریؒ سے روایت کی ہے صحابہ کرامؓ اس طرح سجدہ کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ ان کے کپڑوں میں ہوتے تھے، اور ان میں سے کچھ اپنے عمامہ پر بھی سجدہ کرتے تھے، بخاریؒ نے تعلیقات ذکر کیا ہے کہ حسنؒ نے

کہاہے کہ قوم یعنی صحابہ کرامؓ اپنے عماموں اور ٹوپیوں پر سجدہ کرتے تھے اور اس طرح سے بھی کہ ان کے ہاتھ ان کی آستینوں میں ہوتے، اس جگہ یہ بات ظاہر ہے کہ صحابہ کرامؓ نے اس طرح جو کچھ نماز پڑھی وہ سب رسول اللہ علیہ السلام سے معلوم کر کے اور آپؐ کی اجازت سے پڑھی ہو گی اور یہ عمل ان کا خاص نہیں بلکہ عام تھا۔

صحاح ستہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ علیہ السلام کے ساتھ انتہائی گرمی کی حالت میں نماز پڑھتے اور جب ہم میں سے کوئی اپنے چہرہ کو زمین پر گرمی کی وجہ سے نہیں رکھ سکتا تھا تو اپنا کپڑا اس پر بچھا کر سجدہ کرتا اس تفصیل کی بناء پر وہ ضعیف حدیثیں بھی قوی ہو گئیں کیونکہ ان کے ضعیف ہونے کی معنی یہ نہیں تھے کہ وہ بے اصل اور باطل تھی بلکہ اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ راوی وغیرہ میں جو معتبر شرطیں ہوا کرتی ہیں ان کے نہ ہونے سے اس بات پر یقین نہ ہو سکا کہ واقعہ ایسا ہی تھا مثلاً رسول اللہ علیہ السلام نے عمامہ کے پیچ پہ سجدہ کیا اور روایت بھی کئی طریقوں سے پائی گئی اور صحاح ستہ میں حضرت انسؓ کی یہ روایت آئی اور حضرت حسنؒ سے صحابہ کرامؓ کے یہ افعال عمومی طریقے سے پائے گئے ان روایتوں کی بناء پر یہ گمان قوی ہو گیا کہ رسول اللہ علیہ السلام سے یہ روایت ثابت ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ اس سے پہلے گذر چکا ہے کہ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ اور اس بات پہ اجماع ہے کہ اگر زمین پہ پاک کپڑا بچھا ہوا ہو تو ایسے کپڑے پر سجدہ جائز ہے، پھر پہنے ہوئے کپڑے کے فاضل حصے پر نماز پڑھنے میں کوئی چیز جواز سے مانع نہیں ہے۔

واضح ہو کہ اعضائے سجود میں سے صرف پیشانی کے بارے میں یہ حکم ہے نہ کہ وہ زمین سے متصل ہو باقی میں نہیں، اس مسئلے پر سب کا اتفاق ہے کیونکہ نعلین میں نماز پڑھنا صحیحین میں ہے، اور ابن تیمیہ نے کہا ہے کہ اکثر اہل علم کے نزدیک پاؤں کی طرح ہاتھوں میں بھی زمین سے ملا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک پیشانی میں ضروری ہے، پہلی حدیث کی بناء پر الصق جبهتك وأنفك من الأرض یعنی زمین سے اپنی پیشانی اور ناک کو ملا لو تو اس کا جواب یہ ہے کہ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اپنی پیشانی کو زمین سے اونچی اس لئے نہ رکھو کہ اس میں مٹی نہ لگ جائے بلکہ اس کا خیال کئے بغیر زمین سے لگا دو جیسا کہ حضرت رباحؓ کی حدیث میں یہ قصہ ہے اسی میں حضور علیہ السلام نے فرمایا ترب جبينك یعنی اپنی پیشانی میں مٹی لگا لو اور دوسری دلیل میں حضرت خبابؓ کی حدیث ہے کہ ہم لوگوں نے ریت کے جلنے کی شکایت کی تو آپ علیہ السلام نے پہلے ہی وقت میں نماز پڑھنے کا حکم باقی رکھا اور اس سے تاخیر نہ کی حالانکہ آخر وقت میں ظہر کو ٹھنڈے وقت میں ادا کیا ہے اس کا تعلق پیشانی کو بغیر کسی حائل چیز کے زمین سے لگانے میں کچھ نہیں ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ ایک کپڑا تہہ کر کے بچھا لیا جاتا تو امام شافعی کے نزدیک ایسا کرنا جائز ہوتا۔ م۔

اور اگر آستین سے کسی نے کلام پاک کو چھوا تو جائز نہیں ہو گا جیسا کہ براہ راست ہاتھ سے چھونا جائز نہیں ہے اور اگر آستین کو نجاست پر بچھا کر سجدہ کیا تو بقول اصح یہ جائز نہیں ہے اگرچہ مرغینانیؒ نے اس کے جائز ہونے کو صحیح کہا ہے مگر اس کا اعتبار نہیں ہے، اور اگر زمین پر ہاتھ رکھ کر اس پر سجدہ کیا تو جواز کی تصحیح ہو گی، لیکن جائز نہ ہونا ہی ترجیح کے لائق ہے۔ تجنیس میں ہے کہ اگر چھوٹے پتھر پر سجدہ کیا اس طرح سے کہ پیشانی کا زیادہ حصہ زمین پر ہو تو جائز ہے ورنہ نہیں، اور گھٹنے کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پیشانی میں سے جتنی مقدار واجب ہے وہ اس پر نہیں لگے گی۔ مختصر الفتح۔

ويبدي ضبعيه لقوله عليه السلام: وابد ضبعيك، ويروى وابدّ من الإبداد، وهو المدّ، والأول من الإبداء وهو الإظهار، ويجافي بطنه عن فخذيه؛ أنه عليه السلام كان إذا سجد جافى حتى أن بهمة لو أرادت أن تمر بين يديه لمرت، وقيل: إذا كان في صف لا يجافي كيلا يؤذي جاره.

ترجمہ: اور اپنے دونوں بازو ظاہر کرے، رسول اللہ علیہ السلام کے اس فرمان کی وجہ سے کہ اپنے دونوں بازو کو ظاہر کرو۔ اور دوسری روایت یہ بھی ہے أبد ضبعيك یعنی یہ ابداد مصدر سے جس کے معنی کھینچ کر رکھنے کے ہیں، کہ اپنے بازو کو ظاہر کرو۔ اور

اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے دور رکھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو دور کر دیتے یہاں تک کہ اگر بکری کا بچہ اس کے درمیان سے گذرنا چاہے تو گذر جائے، اور یہ کہا گیا کہ جب جماعت کی صف میں ہو تو بازو کو دور نہ کرے تاکہ پڑوسی کو تکلیف نہ پہونچائے۔

توضیح:- سجدہ میں دونوں بازو کشادہ رکھے، حدیث سے استدلال، پیٹ کو رانوں سے دور رکھے

ویبذی ضبعیه لقوله علیه السلام: وابد ضبعیك......الخ

کہ اپنے دونوں بازو ظاہر کرے یعنی کشادہ کردے۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ ابد ضبعیك کہ اپنے دونوں بازو ظاہر کرو۔ ف۔ یہ حدیث نہیں ہے۔ لیکن عبدالرزاقؒ نے کہاہے أخبرنا سفیان الثوری عن آدم بن علی البکری قال: رآنی ابن عمر وأنا أصلی لا اتجافی عن الأرض بذراعی، فقال یا ابن أخی! لا تبسط بسط السبع وادعم[1] علی راحتیك، وابدء ضبعیك، فإنك إذا فعلت ذلك سجد کل عضو منك، یعنی آدم ابن علی البکری نے کہاہے کہ حضرت ابن عمرؓ مجھے اس حال میں دیکھا کہ میں اس طرح نماز پڑھتا تھا کہ زمین سے اپنے ہاتھوں کو کشادگی نہیں دیتا تھا تو فرمایا اے بھتیجے! درندوں کی طرح مت بچھاؤ۔ اور اپنی ہتھیلیوں پر ٹیک لگاؤ اور اپنے بازوؤں کو کشادہ کرلو کیونکہ جب تم نے اس طرح کرلیا تو تمہارا ہر عضو سجدہ کی حالت میں ہو گیا۔ اس حدیث کو ابن حبان وحاکم نے لا تبسط سے مرفوع کردیا، اور بجائے ابدء ضبعیك کے جاف عن ضبعیك ہے ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ فع۔

ویروی وابدّ من الإبداد، وهو المدّ، والأول من الإبداء وهو الإظهار......الخ

اور بعض مشائخ نے دوسری طرح بھی اس کی روایت کی ہے، یعنی پہلے روایت میں الإبداء سے ابدء ہے یعنی ظاہر کرو۔ اور اس دوسری روایت میں ابداد سے ابدّ بتشدید الدال ہے جس کے معنی المد کے ہیں یعنی اپنی بازو کھینچے ہوئے رکھو۔ ف۔ اس جگہ مراد حدیث کی روایت کرنی نہیں ہے، لہٰذا عینیؒ کا یہ اعتراض کہ یہ کسی حدیث میں نہیں ہے ختم ہو گیا۔ م۔

ویجافی بطنه عن فخذیه؛ لأنه علیه السلام کان إذا سجد جافی حتی......الخ

اور اپنے پیٹ کو اپنی رانوں سے جوف دے یعنی دور کردے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو اس کی جوف خلا اتنی پیدا کردیتے کہ اگر بکری کا بچہ آپ کے ہاتھوں کے بیچ سے گذرنا چاہتا تو گذر جاتا۔ ف۔ اس کی روایت مسلم نے کی ہے۔ بُہمہ چھوٹی بکری یا بھیڑی کو کہتے ہیں۔ اور حاکم وطبرانی کی روایت میں بُهَیمَۃٌ ہے۔ پہلے حرف کے پیش اور دوسرے کے زبر کے ساتھ بصیغہ تصغیر یعنی بھیڑ یا بکری کا بچہ اور کہا گیاہے کہ قول صحیح ہے۔ مفع۔

وقیل: إذا کان فی صف لا یجافی کیلا یؤذی جاره......الخ

اور کہا گیاہے کہ اگر نمازی صف کے اندر ہو تو ہاتھوں کو پھیلا کر یا جوف دے کر نہ رکھے تاکہ پڑوسی کو اس سے تنگی اور تکلیف نہ ہو۔ ف۔ اس میں استدلال بہتر طریقہ سے یوں ہے کہ براءؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے کہ تم جب سجدہ کرو تو دونوں ہتھیلیاں رکھو اور دونوں کہنیاں اونچی کرو۔ اس کی روایت مسلم اور ترمذی نے کی ہے۔ عبد اللہ ابن مالک یعنی ابن بحینہ نے کہاہے کہ جب نماز پڑھتے یعنی سجدہ کرتے تو دونوں ہاتھوں کے درمیان اتنا فصل کردیتے کہ دونوں بغلوں کی سپیدی ظاہر ہوتی۔ اس کی روایت بخاری ومسلم دونوں نے کی ہے۔ اور حضرت براء بن عازبؓ کی حدیث میں ہے إذا صلی جنح یعنی جب نماز پڑھتے (یا سجدہ کرتے) تو اپنے دونوں ہاتھوں کو پہلوؤں سے جدا کرکے مانند بازو کے کردیتے تھے۔ اس کی روایت ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے۔ اور حضرت ابوہریرۃؓ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب سجدہ کرے تو

(۱) فتح سے، ٹیک لگانا، مصباح اللغات۔ انوار الحق القاسمی

کتے کی طرح اپنی بازو نہیں نہ بچھائے۔ ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے۔
اور ہاتھوں کو بغل سے علیحدہ کر کے رکھنے کے بارے میں حضرت ابو حمید ساعدی کی سند سے ترمذی اور نسائی میں مذکور ہے۔ اور وائلؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب سجدہ کرتے تو ہاتھوں سے پہلے گھٹنے رکھتے تھے۔ اور جب اٹھتے تو گھٹنوں سے پہلے ہاتھ اٹھاتے، جیسا کہ چاروں سنن میں ہے۔ اور ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے ک جب اٹھتے تو گھٹنوں کے بل اٹھتے اور ہاتھوں کو رانوں پر ٹیک دیتے۔ اور حضرت ابن عمرؓ سے ابوداؤد میں ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی اٹھتے وقت زمین پر ہاتھوں کو ٹیکے۔ اور بخاری میں ایک صحابی کا حال بیان کیا ہے کہ وہ اپنے مرض کی وجہ سے سجدہ کرتے وقت گھٹنوں کے نیچے گدی رکھ لیتے تھے۔ اور ابن عمرؓ سے مرفوعاً ایک روایت ابوداؤد اور نسائی میں ہے کہ چہرہ کی طرح دونوں ہاتھ بھی سجدہ کرتے ہیں۔ اس لئے جب چہرہ رکھے تو انہیں بھی رکھے اور جب اٹھائے تو انہیں بھی اٹھائے۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ اس باب میں اتنی باتیں اور دلیلیں کافی ہیں۔ یہ بات جاننے کے لائق ہے کہ مذکورہ احادیث سے کچھ ثبوت ہو وہ مختلف حالات میں ہیں۔ ائمہ مجتہدین کو حالات کا علم ہوا ہے۔ لیکن اجتہادی علوم سے ہر ایک مجتہد نے بعض حالت اولیٰ قرار دیا ہے اور اسی کو اختیار کر لیا مثلاً پہلے گھٹنوں کو رکھنا پھر ہاتھوں کو رکھنا سجدہ کرتے وقت اولیٰ ہے حضرت ابن عمرؓ کی روایت کے مطابق کہ اونٹ کی طرح پہلے ہاتھ رکھنے سے منع کیا ہے۔ لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ یہ ممانعت طاقت والوں کے لئے اور تنزیہی طور پر ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں خود آپ کا ہاتھ پھر گھٹنے رکھنا ثابت ہے اس زمانہ میں جب کہ آپ کی عمر زیادہ ہو گئی تھی۔ لہٰذا مذہب مختار یہ ہوا کہ طاقتور شخص پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھے۔ لیکن کمزور شخص کے حق میں دونوں باتیں برابر ہیں بلکہ کمزوری کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کے فعل کے مطابق عمل کرنا ہی اولیٰ ہے۔ اتنی باتیں معلوم ہونے کے بعد یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ گذشتہ علماء نے ان معلومات کے بغیر ہی اپنے امام کے قول مختار کے علاوہ دوسری باتوں کو مکروہ، متروک اور ناجائز قرار دیا اور صرف ایک ہی حالت پر اکتفاء کر لیا جو اپنی جگہ غلطی ہے۔ م۔

ويوجه أصابع رجليه نحو القبلة، لقوله عليه السلام إذا سجد المؤمن سجد كل عضو منه، فليوجه من أعضائه القبلة ما استطاع، ويقول في سجوده سبحان ربي الأعلى ثلاثا، وذلك أدناه لقوله عليه السلام: وإذا سجد أحدكم فليقل في سجوده: سبحان ربي الأعلى ثلاثا وذلك أدناه، أى أدنى إكمال الجمع، ويستحب أن يزيد على الثلاث في الركوع والسجود بعد أن يختم بالوتر، أنه عليه السلام كان يختم بالوتر، وإن كان إماما لا يزيد على وجه يمل القوم حتى لا يؤدى إلى التنفير.

ترجمہ:- اور اپنے پیروں کی انگلیوں کو قبلوں کی طرف موڑدے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ مؤمن سجدہ کرتا ہے تو اس کا ہر عضو سجدہ کرتا ہے۔ اس لئے جہاں تک ممکن ہو اپنے اعضاء بدن کو قبلہ کی طرف رکھے۔ اور سجدہ کی حالت میں کہے سبحان ربی الأعلى تین بار اور یہ اس کی کم سے کم مقدار ہے۔ اور یہ بات مستحب ہے کہ رکوع اور سجود میں تین بار سے زیادہ کہے مگر طاق عدد پر ہی ختم کرے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ بھی طاق عدد پر ختم کرتے تھے، لیکن اگر نمازی امام ہو تو وہ اتنا زیادہ نہ کہے کہ مقتدیوں کو جبر محسوس ہو پھر وہ بھاگنے لگیں گے

توضیح:- انگلیوں کے سرے قبلہ رخ رہیں، حدیث سے دلیل سجدہ میں سبحان ربی الأعلى کہنا، دلیل

ويوجه أصابع رجليه نحو القبلة......الخ

اور اپنے پاؤں کی انگلیوں کو قبلہ کی طرف موڑدے۔ ف۔ جیسا کہ ابو حمید ساعدی اور ابن عمرؓ اور دوسروں کی سند بخاری میں منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہ فعل ثابت ہے۔ اس جگہ مصنفؒ یہ قول ذکر کیا ہے۔

لقوله عليه السلام إذا سجد المؤمن سجد كل عضو منه......الخ
یعنی رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ مؤمن جب سجدہ کرتا ہے تو اس کا ہر عضو سجدہ کرتا ہے اس لئے جہاں تک ممکن ہو اپنے اعضاء کو قبلہ کی طرف متوجہ رکھو۔ف۔یہ روایت غریب ہے۔واللہ تعالی أعلم۔فع۔

ويقول في سجوده سبحان ربى الأعلى ثلاثه وذلك أدناه......الخ
اور سجود کی حالت میں تین مرتبہ سبحان ربی الأعلى کہے اور یہ کمتر مقدار ہے۔ف۔علماء نے کہا ہے کہ اس سے کم کر دینا یا بالکل چھوڑ دینا بھی مکروہ ہے۔ف۔ لقوله عليه السلام الخ، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم میں سے کوئی جب سجدہ کرے تو کہے سبحان ربی الأعلى تین بار کہے اور یہ کمتر مقدار ہے۔ف۔لیکن اس جگہ اعتراض ہوا کہ حدیث مذکور میں تو کہیں بھی جمع اور کمال جمع ہونے کا کوئی ذکر نہیں ہے پھر بھی ایسی تفسیر کیوں کی گئی۔تو اس کا جواب اور مزید تحقیق رکوع کی بحث میں پہلے گذر چکا ہے اسی کا یہ ٹکڑا ہے لہذا اوپر ہی کی بحث یہاں بھی ہوگی۔واضح ہو کہ حدیث میں وذلك أدناه میں ہٗ کی ضمیر أو في السجود کی طرف لوٹ رہی ہے اور یہ ظاہر ہے مگر اس لئے نہیں پھیری گئی ہے کہ بالاتفاق تمام تسبیحات سنت ہیں۔دفیہ مافیہ۔م۔

ويستحب أن يزيد على الثلاث في الركوع والسجود بعد أن يختم بالوتر......الخ
اور مستحب یہ ہے کہ رکوع و سجود میں تین تین بار سے زائد تسبیحیں پڑھی جائیں مگر عدد طاق پر ختم کی جائیں۔ف۔یعنی اس طرح ختم کرنا بھی مستحب ہے۔اور اس زیادتی کے جائز ہونے میں تمام ائمہ متفق ہیں۔یہانتک کہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے زیادہ مشابہ بتائی گئی ہے جن کی زیادتی کا انداز دس تک لگایا گیا ہے۔اور طاق عدد پر ختم کرنے کی دلیل یہ حدیث ہے کہ لأنه عليه السلام كان يختم بالوتر کہ خود رسول اللہ ﷺ عدد طاق پر ہی ختم کرتے تھے۔

ف۔لیکن اس حدیث کا پتہ معلوم نہ ہو سکا۔فع۔البتہ عدد طاق کے مستحب ہونے میں وہ عام حدیث کافی ہے کہ اللہ تعالی طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔اس بات کا بھی لحاظ ہونا چاہئے کہ تسبیحات تو خود ہی عموماً طاق بار پڑھی جاتی ہیں اور یہ عام احادیث کے حکم میں داخل ہے برخلاف ایسی چیز کے جو اصل میں طاق کے حکم میں داخل نہیں ہے جیسے نفل نمازیں دو رکعتیں چار رکعتیں غور کا مقام ہے۔اور یہ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ جو رکوع میں دس تک کہتے تھے تو یہ دراصل گننے والے کا اپنا اندازہ ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ وہ آہستہ آہستہ خشوع و خضوع کے ساتھ پانچ بار ہی کہتے ہوں۔م۔

وإن كان إماما لا يزيد على وجه يمل القوم حتى لا يؤدى إلى التنفير......الخ
یعنی زیادتی کی کوئی حد نہ ہونا تنہا نماز پڑھنے والے کے لئے، کیونکہ امام اگر دیر تک پڑھتا رہے گا تو مقتدی حضرات اپنی مجبوریوں سے گھبرا کر جماعت سے بھاگنے لگیں گے بالآخر جماعت میں مختصر افراد رہ جائیں گے۔اور یہ فعل حرام ہوگا۔جو ایک مستحب پر عمل کرنے کے نتیجے میں ہوگا۔بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس زمانہ کے مسلمانوں پر اور ان کے احوال پر صد افسوس ہے کہ آپس میں تقلید و عدم تقلید کے مسائل سے مستحبات تلاش کر کے آپس میں نفرت حرام اور نفاق حرام اور اگلے بزرگوں کی غیبت اور آپس میں حرام غیبت کے علاوہ مختلف اقسام کے اتنے فساد بپا کرتے رہتے ہیں۔حالانکہ اگر کسی نے ان کے ارشاد و ہدایت کرنے کو مان لیا تو اس نے مستحب فعل کا ثواب پایا۔اور اگر ان کے ساتھ غیبت و باہمی عداوت و نفرت میں شرکت کی تو مختلف حرام کاموں کے کرنے پر عذاب پانے کا مستحق بھی ہوا۔اور یہ حرکتیں علم و فقاہت میں شامل نہیں ہیں بلکہ جہالت اور غباوت کا نتیجہ ہے۔ فالعیاذ باللہ۔

ثم تسبيحات الركوع والسجود سنة، لان النص تناولهما دون تسبيحاتهما، فلا يزاد على النص، والمرأة تنخفض في سجودها وتلزق بطنها بفخذيها، لان ذلك استرلها، قال ثم يرفع رأسه، ويكبر لما روينا، فاذا اطمأن

جالسا کبّر وسجد لقوله عليه السلام فى حديث الاعرابى: ثم ارفع رأسك حتى تستوى جالسا ولولم يستو جالسا وكبر و سجد اخرى اجزأه عند أبى حنيفةؒ و محمدؒ، وقد ذكرناه.

ترجمہ :- پھر رکوع اور سجود کی تسبیحات کہنا سنت ہے کیونکہ حدیث ان دونوں (رکوع و سجود) ہی کو شامل ہے، اور ان کی تسبیحات کو شامل نہیں ہے، اس لئے نص سے شامل شدہ مضمون پر زیادتی نہیں کی جائے گی، اور عورت پست ہو جائے گی اپنا سجدہ ادا کرتے وقت، اور اپنی پیٹ کو اپنی رانوں سے ملالے گی، کیونکہ ایسا کرنا اس کے حق میں زیادہ پردہ ہے، مصنفؒ نے کہا، پھر نمازی اپنا سر اٹھائے اور تکبیر کہے اس حدیث کی بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، پھر جب اطمینان کے ساتھ بیٹھ جائے تو تکبیر کہے اور سجدہ کرے رسول اللہ ﷺ کی اس فرمان کی بناء پر جو اعرابی کی حدیث میں گذر چکا ہے کہ تم اپنا سر اٹھاؤ یہانتک کہ سیدھے بیٹھ جاؤ، لیکن اگر سیدھا نہیں بیٹھا اور فوراً تکبیر کہدی اور دوسرا سجدہ کر لیا تو بھی امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جائز ہو گا اور یہ بات ہم نے پہلے بیان کر دی ہے۔

توضیح :- سجدہ سے اٹھ کر دوسرے سجدہ میں جانے کی صورت

ثم تسبيحات الركوع والسجود سنة، لان النص تناولهما دون تسبيحاتهما......الخ

رکوع اور سجود میں ان کی تسبیحات کہنا سنت ہیں۔ ف۔ اکثر علماء کے نزدیک۔ ع۔ لان النص الخ کیونکہ نص رکوع و سجود کو شامل ہے، ان کی تسبیحات کو نہیں۔ ف۔ اس لئے ان دونوں کی تسبیحات فرض نہیں ہوئیں، اس بناء پر امام اعظمؒ کے شاگرد ابو مطیع بلخیؒ کا یہ قول ضعیف ہو گیا کہ تین تین تسبیحات کہنا بھی فرض ہیں، کیونکہ نص میں تو صرف رکوع اور سجود کا حکم ہے جبکہ یہ تسبیحات ان سے زائد عمل ہیں۔

فلا يزاد على النص......الخ

لہذا نص پر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ ف۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے مذکورہ دلیل کی بناء پر ہم نے یہ فرض کر لیا کہ یہ تسبیحات فرض نہیں ہیں مگر اس سے یہ بات کس طرح ثابت ہوئی کہ یہ سنت ہیں کیونکہ یہ تو ممکن ہے کہ یہ واجب ہوں جس کی یہ دو دلیلیں ہو سکتی ہیں:

نمبر ا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان پر ہمیشگی فرمائی ہے اور یہ بات واجب ہونے کی دلیل ہے۔

نمبر ۲۔ آپ ﷺ نے اس کا حکم فرمایا ہے **اجعلوها** کہہ کر، یعنی **سبحان ربى العظيم** کے بارے میں فرمایا کہ اسے رکوع میں کرو (رکوع کی حالت میں ادا کرو) اور **سبحان ربى الاعلى** کی بارے فرمایا کہ اسے سجدہ میں رکھو (سجدہ کی حالت میں کہو) لہذا یہ امر کا صیغہ ہوا جس کا اثر وجوب کا ہے، ہاں اس وقت وجوب نہ ہو گا جبکہ خلاف کے لئے کوئی دوسری دلیل موجود ہو، اور اس جگہ وجوب کے خلاف کی دلیل یہ ہے کہ اعرابی کو تعلیم دیتے وقت اسے بیان نہیں کیا گیا ہے اس طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ مذکورہ حکم استحباب کے طور پر ہے، علماء نے کہا ہے تین بار سے کم کرنا بالکل چھوڑ دینا مکروہ ہے، اب اس جگہ اس کے مستحب ہونے کی تصریح کر دی تو اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو گئی کہ اس کراہت سے مراد تنزیہی ہے۔ الفتح۔

اس جگہ تحقیق یہ ہے کہ ذلک ادناہ یہ کمتر سجود ہے یعنی تین تسبیحات یہ سجود کی کمتر مقدار ہے، پھر یہاں احتمال نمبر ا۔ یہ تین تسبیحات ہی شرط ہیں اور یا نمبر ۲۔ تسبیحات کی مقدار کا ہونا ہی کافی ہے تو جب ہم نے اعرابی کی حدیث میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ اس میں صرف یہی بات مذکور ہے کہ تین تسبیحات کی مقدار اعتدال واجب ہے، اس سے ثابت ہوا کہ یہ تسبیحات خود سنت ہیں، اور حدیث السعدی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین مرتبہ **سبحان الله وبحمده** کہنے کی مقدار ٹھہرتے تھے جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کی ہے۔

والمرأة تنخفض في سجودها وتلزق بطنها بفخذيها......الخ
ترجمہ سے مطلب واضح ہے لان ذلك الخ کیونکہ ایسا کرنا اس کے حق میں زیادہ پردہ ہے۔ف۔ یعنی عورت کو ایسا حکم دینے کی مصلحت یہ ہے، یہانتک ایک سجدہ ہوا۔

قال ثم یرفع رأسه، ویکبر لما روینا......الخ
پھر سجدہ سے اپنا سر اٹھائے اور تکبیر کہے۔ف۔ یعنی سر اٹھاتے ہوئے کہے، لما رویناا س دلیل سے جو ہم نے حدیث بیان کردی ہے۔ف۔ یعنی جھکتے ہوئے تکبیر کہتا جائے لقوله علیه السلام الخ اس دلیل کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے حدیث اعرابی میں فرمایا ہے۔

لقوله علیه السلام في حدیث الاعرابی: ثم ارفع رأسك حتی تستوی جالسا......الخ
یعنی اعرابی کو اس طرح تعلیم دی کہ پھر سجدہ سے تم اپنا سر اٹھاؤ کہ سیدھے بیٹھ جاؤ، اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ قومہ کہلاتا ہے، اور قول صحیح کے مطابق یہ واجب ہے، لیکن مشائخ نے امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق اسے واجب نہیں جانا ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے فرمایا ہے ولولم یستو الخ یعنی اگر نمازی پورا نہیں بیٹھا بلکہ تکبیر کہہ کر دوسرا سجدہ بھی کر لیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک اتنا ہی اس کے لئے کافی ہو گیا، یہ بات ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔
ف۔ بلکہ اگر تکبیر بھی نہیں کہی تو بھی یہی حکم ہو گا یعنی کافی ہو گا کیونکہ یہ قومہ سنت ہے۔

وتکلموا فی مقدار الرفع، والاصح انه اذا کان الی السجود اقرب لایجوز، لانه یعد ساجدا وان کان الی الجلوس اقرب جاز، لانه یعد جالسا، فتحقق الثانیة، قال فاذا اطمأن ساجدا کبر، وقد ذکرناه، و استوی قائما علی صدور قدمیه، ولایقعد ولا یعتمد بیدیه علی الارض.
ترجمہ:- اور مشائخ نے اس بات میں کلام کیا ہے کہ کس قدر سر اٹھائے، تو اس میں قول اصح یہ ہے کہ اگر سر اٹھا کر سجود سے زیادہ قریب ہو تو یہ صحیح نہ ہو گا کیونکہ اسے سجدہ کرنے کی حالت ہی میں شمار کیا جاتا ہے، اور اگر وہ بیٹھنے کی زیادہ قریب ہو تو صحیح ہو گا کیونکہ اسے بیٹھنے والا شمار کیا جاتا ہے، لہٰذا دوسرا سجدہ ثابت ہو گیا، پھر جب سجدہ کی حالت میں اطمینان کر لے تو تکبیر کہے، اور یہ بات ہم نے پہلے بھی بتادی ہے، اور اپنے پنجوں کے بل سیدھا کھڑا ہو جائے، اور اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھ کر ٹیک نہ لگائے۔

توضیح:- دو سجدوں کے درمیان بیٹھنے کی مقدار

وتکلموا فی مقدار الرفع، والاصح انه اذا کان الی السجود اقرب لایجوز......الخ
اور مشائخ نے سر کے اٹھانے کی مقدار کے بارے میں کلام کیا۔ف۔ یعنی کوئی شخص سجدہ سے اٹھ کر پورا ٹھیک نہیں بیٹھے مگر پہلے سجدے سے دوسرے سجدے میں جاتے وقت امتیاز کے لئے کس قدر سر اٹھا کر دوسرا سجدہ کرے تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ والاصح انه الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ شرح الطحاوی میں کہا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سے ایک روایت بھی ہے۔ف۔ یہی قول اصح ہے۔المحیط۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ میرا اعتقاد یہ ہے کہ اگر قومہ یا جلسہ میں نمازی نے اپنی پیٹھ سیدھی نہیں کی تو وہ گنہگار ہے، جیسا کہ اس سے پہلے مدلل گذر چکا ہے۔ف۔ اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم سجود میں اعتدال کرو اور تم میں سے کوئی بھی اپنے بازو کتے کی طرح نہ بچھائے، پانچوں ائمہ حدیث نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت براء بن عازبؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا رکوع کرنا اور سجدہ کرنا اور دونوں سجدوں کے درمیان کا وقفہ اور جب رکوع سے سر اٹھاتے یہ سب تقریباً برابر ہوا کرتے تھے سوائے قیام اور قعدہ کے (ان میں بہت دیر ہوتی) بخاری اور مسلم دونوں نے اس کی روایت کی ہے، لہٰذا یہی واجب ہوا کہ اعتدال کے ساتھ بیٹھ کر ہی دوسرا سجدہ کرے۔

قال فاذا اطمأن ساجدا كبر، وقد ذكرناه......الخ

پھر جب سجدہ کی حالت میں اطمینان کرلے تو تکبیر کہے۔ف۔ پھر یہ کس طرح معلوم ہو کہ اس حالت میں اطمینان ہو گیا تو اس کے لئے تین تسبیح کی مقدار کا اندازہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہی مقدار سب سے کمتر ہے، پھر جبکہ سجود اور جلسہ تقریباً برابر تھے تو اس میں بہتر یہ ہے کہ جلسہ میں دو تسبیح تک انتظار کرلے، اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ایک تسبیح کی مقدار ضروری ہے، یہاںتک کہ ایک رکعت پوری ہو گئی، جس کا ماحصل یہ ہوا کہ نماز کے لئے پہلے تکبیر تحریمہ پھر ثنا پھر تعوذ، اس کے بعد رکعت پوری کرنے کے لئے پہلے تسمیہ پھر قراءت قرآن پھر تکبیر کے ساتھ رکوع اس میں تسبیحات رکوع پھر سمع اللہ کہتے ہوئے سر اٹھا کر قومہ اور ربنا لك الحمد، پھر تکبیر کہتے ہوئے سجدہ پھر اس میں اس کی تسبیحات پھر اٹھ کر جلسہ پھر دوسرا سجدہ، پھر تکبیر کہتا ہوا سر اٹھائے، دوسری رکعت میں کھڑے ہوتے وقت یہ صورتیں ہوتی ہیں کہ اٹھ کر کچھ دیر بیٹھ کر کھڑا ہو یا بغیر بیٹھے ہوئے سیدھا کھڑا ہوئے، پھر زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے یا زمین پر ہاتھ نہ ٹیکے، ان دونوں صورتوں میں ہمارے نزدیک تکبیر کہتے ہوئے اٹھے۔

و استوى قائما على صدور قدميه، ولايقعد ولا يعتمد بيديه على الارض......الخ

اپنے پنجوں کے بل سیدھا کھڑا ہو جائے۔ف۔ اس طرح سے کہ سجدہ سے سر اٹھا کر ہاتھوں کو گھٹنوں کے اوپر رکھے اور پنجوں کے بل سیدھا کھڑا ہو جائے، اور یہ بہتر صورت ہے اس شخص کے لئے جس میں جسمانی طاقت موجود ہو وہ نہ بیٹھے، جیسا کہ شوافعؒ کے نزدیک جلسہ استراحت ہے، اور اپنے ہاتھوں کے ساتھ زمین پر نہ ٹیکے۔ف۔ یہ صورت مستحب ہے اس وقت جبکہ عذر نہ ہو۔البحر۔ بلکہ ٹیک کے لئے رانوں پر ہاتھ رکھ لے۔المحیط۔

وقال الشافعي يجلس جلسة خفيفة ثم ينهض معتمد اعلى الارض لان النبي عليه السلام فعل ذلك ولنا حديث ابي هريرة ان النبي عليه السلام كان ينهض في الصلوة على صدور قدميه ومارواه محمول على حالة الكبر ولان هذه قعدة استراحة والصلوة ماوضعت لها.

ترجمہ:-اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ تھوڑی سی بیٹھک کر کے زمین پر ٹیک لگا کر اٹھے، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے، اور ہماری دلیل حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے، اور امام شافعیؒ نے جو روایت بیان کی ہے وہ بڑھاپے کے دنوں پر محمول ہے، اور اس جلسہ کا مختار نہ ہونا اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ استراحت اور آرام کا قعدہ ہے، جبکہ نماز استراحت کے لئے وضع نہیں کی گئی ہے۔

توضیح:- سجدہ سے قیام کی طرف جانے کی کیفیت، دلیل شافعیہ، دلیل حنفیہ

وقال الشافعي يجلس جلسة خفيفة ثم ينهض معتمد اعلى الارض......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ف۔ جس کو مالک بن الحویرثؓ نے روایت کیا ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کے علاوہ سنن اربعہ کے محدثین نے بھی روایت کیا ہے، امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اکثر علماء کے نزدیک یہ مستحب نہیں ہے۔ع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس وقت بیٹھنے کے جواز میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور خود رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اختلاف اس معاملہ میں ہے کہ دونوں صورتوں میں سے کون سی بہتر اور مختار ہے، تو اس میں تحقیق یہ ہے کہ جو شخص قوی وجوان ہو وہ سجدہ ثانیہ کر کے پہلی یا تیسری رکعت کے بعد ران پر ہاتھ رکھ کر ٹیک دے کر کھڑا ہو، اور یہ زمین پر ہاتھ نہ رکھے، جیسا کہ ابن عمرؓ سے مروی ہے، نهى ان يعتمد الرجل على يديه اذا نهض في الصلوة، یعنی حضرت ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا

ولنا حدیث ابی هریرة ان النبی علیه السلام کان ینهض فی الصلوة علی صدور قدمیه......الخ

اور ہماری دلیل حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز میں پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے۔ف۔ ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ ترمذیؒ نے اسے خالد بن ایاس عن صالح مولیٰ التوءمہ عن ابی ہریرہؓ روایت کیا ہے، لیکن خالد بن ایاس کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کی آخری زندگی میں ان کے حفظ میں خلل آگیا تھا، ترمذیؒ نے اس کی روایت کے بعد کہا ہے کہ اہل علم کا اسی پر عمل ہے، یعنی جلسہ خفیفہ نہ کرے، اس قول کی تائید بھی ہوئی ہے اس طرح سے کہ اصل میں یہ حدیث قوی ہے ایک تو یہ کہ اسی پر اہل علم کا عمل ہے، دوسرے یہ کہ ابن ابی شیبہؒ نے ابن مسعودؓ سے کی کہ یہ ابن مسعودؓ اپنے پنجوں کے بل اٹھتے اور کچھ بیٹھتے نہ تھے، اسی طرح حضرت علیؓ و عمرو ابن عمر و ابن الزبیرؓ سے روایت کی ہے، اور شعبیؒ سے روایت کی کہ حضرت عمر و علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ نماز میں اپنے پنجوں کے بل اٹھا کرتے تھے، اور ابو عیاش سے روایت کی کہ میں نے بہت سے صحابہ کرامؓ کو پایا کہ وہ جب پہلی رکعت یا تیسری رکعت کے دوسرے سجدے سے سر اٹھاتے تو کچھ دیر بھی نہ بیٹھتے اور ویسے ہی کھڑے ہو جاتے، عبدالرزاق نے اسی کی حضرات ابن مسعود ابن عباس و ابن عمرؓ سے روایت کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اکابر صحابہ کرامؓ سب اسی پر متفق ہیں، اور مالک بن الحویرثؓ کی بہ نسبت یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زیادہ حاضر باش تھے، لہٰذا ان ہی حضرات کی بات مقدم مانی جائے گی، اور اسی وجہ سے اہل علم کا اسی پر عمل بھی رہا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی ابھی بتادی گئی ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہاتھوں کو زمین پر ٹیک کر اٹھنے سے منع فرماتے تھے، جیسا کہ ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث میں یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب اٹھتے تو رانوں پر ہاتھ ٹیکتے تھے، اس بناء پر مذکورہ تمام روایتوں میں توفیق دینا لازم ہے۔ف۔

وماروا ہ محمول علی حالة الکبر ولان هذه قعدة استراحة والصلوة ما وضعت لها......الخ

اور امام شافعیؒ نے مالک بن الحویرثؓ کی حدیث میں جو روایت کی ہے، یعنی یہ کہ جلسہ خفیفہ کا ثابت ہونا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے بڑھاپے کی حالت پر محمول ہے۔ف۔ اس کی تائید میں یہ جملہ بھی ہے کہ سجدہ میں جاتے وقت پہلے گھٹنے پھر ہاتھ رکھنے کی بجائے پہلے ہاتھ پھر گھٹنے رکھنا آپ ﷺ کی آخری زندگی میں بدن میں تغیر آجانے کی صورت میں ثابت ہے۔م۔ اسی طرح یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے رکوع و سجود میں بڑھنے کی کوشش نہ کرو اور جلدی نہ کرو کیونکہ میرا بدن ڈھیلا ہو گیا ہے ایسی صورت میں میں تم سے کہاں بڑھ سکتا ہوں، میں جس حالت میں بھی ہوں گا تم مجھے پالو گے، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، صحابہ اور تابعینؒ کے علاوہ ابن المنذر نے فقہاء میں سے ابوالزناد و ثوری و مالک واحمد و اسحٰقؒ کا بھی یہی قول بیان کیا ہے، اور ابو اسحٰق مروزی و شافعیؒ نے کہا ہے کہ اگر نمازی کمزور ہو تو جلسہ استراحت کرلے اور اگر قوی ہو تو نہ بیٹھے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ قول مذکور کے بعد پھر کچھ اختلاف باقی نہ رہا، حمیدالدینؒ نے شمس الائمہ سرخسیؒ سے نقل کیا ہے کہ یہ اختلاف صرف افضلیت میں ہے جواز میں نہیں ہے، یہانتک کہ اگر جلسہ استراحت کرلیا تو ہمارے نزدیک جائز ہو گا اور اگر نہیں کیا تو امام شافعیؒ کے نزدیک بھی جائز ہو گا۔ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ ظہیریہ میں تو اس بات کی تصریح بھی کردی ہے۔ھ۔ اب یہ بات صاف ہو گئی کہ اس جلسہ استراحت کرنے کی وجہ سے جس کسی نے بھی سجدہ سہو کو لازم ہونے کو کہا ہے وہ بالکل ضعیف قول ہے، اور یہ سجدہ کیوں کر لازم آسکتا ہے حالانکہ بالاجماع رسول اللہ ﷺ سے یہ جلسہ ثابت ہے، اگرچہ اس کی یہ تاویل بھی کی جاتی ہے کہ یہ ضعیفی کی وجہ سے تھا، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ یہ جلسہ ضعیف آدمی کے لئے سنت کے طور پر جائز ہے اور قوی آدمی کے لئے استراحت کا جلسہ نہ ہونا ہی اولیٰ ہے۔م۔

ولان هذه قعدة استراحة والصلوة ماوضعت لها......الخ

اور جلسہ استراحت کا مختار نہ ہونا اس وجہ سے بھی ہے کہ یہ قعدہ استراحت اور آرام کا ہے جبکہ آرام کے لئے موضوع ہی

نہیں ہے۔ف۔ لیکن بدن میں تھکاوٹ کا آجانا بے اختیاری معاملہ ہے اسی لئے شریعت نے عام لوگوں کی رعایت کرتے ہوئے دو رکعت پر قعدہ استراحت کا حکم دیا ہے، البتہ اگر واقعۃ ضعف بدن ہو تو دوسری رکعت ادا کرنے کے لئے بھی تھوڑی سی دیر بیٹھ جائے تو جائز ہے، تاکہ اچانک اٹھنے کی تکلیف اٹھانی نہ پڑے، یہ بات ذہن نشین کر لینے کی ہے، اور ام قیس بنت محصنؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک زیادہ ہو گئی اور بدن پر گوشت بھاری ہو گیا تو اپنی جائے نماز پر ایک عمود[1] بنالیا کہ اس پر ٹیک لیتے تھے، اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے، اور یہ حکم نوافل میں محمول ہے مگر اس سے ضعیف جسمی کا ہونا ظاہر ہے، ایسا ہی صحاح ستہ اور ام سلمہ وغیرہما کی حدیث میں ہے، لہٰذا کسی شخص کا یہ کہنا کہ آپ کی عمر مبارک ایسی نہ تھی اس کا اعتبار نہ ہوگا، اچھی طرح سمجھ لو۔م۔ یہانتک ایک رکعت پوری ہونے کا بیان ہو گیا اور اب دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہونے کا بیان ہے۔

ويفعل في الركعة الثانية مثل ما فعل في الركعة الأولى؛ لأنه تكرار الأركان إلا أنه لا يستفتح ولا يتعوذ؛ لأنهما لم يشرعا إلا مرة واحدة، ولا يرفع يديه الا في التكبيرة الأولى خلافا للشافعيؒ في الركوع وفي الرفع منه لقوله عليه السلام: لا ترفع الأيدي إلا في سبع مواطن: تكبيرة الافتتاح وتكبيرة القنوت وتكبيرات العيدين وذكر الأربع في الحج، والذي يروى من الرفع محمول على الابتداء كذا نقل عن ابن الزبيرؓ.

ترجمہ:-اور دوسری رکعت میں بھی ویسا ہی کرے جیسا کہ پہلی رکعت میں کیا ہے، کیونکہ دوسری رکعت میں ارکان نماز کو ہی دوبارہ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اتنا فرق ہے کہ اس دوسری رکعت میں نہ استفتاح پڑھے اور نہ تعوذ کرے۔ کیونکہ یہ دونوں کام صرف ایک مرتبہ ہی کے لئے مشروع ہیں۔ اور اپنے دونوں ہاتھوں کو نہ اٹھائے مگر صرف پہلی تکبیر میں۔ لیکن امام شافعیؒ کا رکوع کی تکبیر میں اختلاف ہے اسی طرح اس سے اٹھتے وقت بھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ صرف سات مواقع میں ہاتھ اٹھائے جائیں جو یہ ہیں۔ ۱- تکبیر افتتاح ۲- تکبیر قنوت ۳- عیدین کی نمازوں کی تکبیریں اور باقی چار کو حج کے باب میں ذکر کیا ہے۔ اور جو حدیث کہ رفع الیدین میں روایت کی جاتی ہے وہ ابتدائے اسلام میں ہونے پر محمول ہے۔ حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ سے ایسا ہی منقول ہے۔

توضیح:-دوسری رکعت مکمل کرنیکی صورت، حدیث سے دلیل، رفع یدین کی بحث

ويفعل في الركعة الثانية مثل ما فعل في الركعة الأولى؛ لأنه تكرار الأركان إلا أنه لا يستفتح......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ إلا أنه الخ لیکن اتنا فرق ہے کہ دوسری رکعت میں استفتاح نہ پڑھے۔ف۔ یعنی سبحانك اللهم الخ۔ ولا يتعوذ اور تعوذ یعنی أعوذ بالله من الشيطان الرجيم نہ پڑھے۔

لأنهما لم يشرعا إلا مرة واحدة......الخ

کیونکہ یہ دونوں کام صرف ایک بار ہی مشروع ہوئے ہیں۔ف یعنی ان میں تکرار مستحب نہیں ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب دوسری رکعت کے لئے اٹھتے تو الحمد لله رب العالمين سے قرأت شروع کر دیتے اور سکوت نہ کرتے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ اس حدیث کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بسم الله الرحمن الرحيم بھی نہ پڑھتے تھے، اور ظاہر مذہب بھی یہی ہے مگر ترجیح دی گئی ہے کہ بسم اللہ کہنا چاہئے۔م۔ اس جگہ اور باقی رہ گیا جو پہلی رکعت سے ہی متعلق ہے۔ چنانچہ فرمایا ولا يرفع الخ اور کسی تکبیر میں ہاتھ نہ اٹھائے سوائے پہلی تکبیر تحریمہ میں۔

خلافا للشافعي في الركوع وفي الرفع منه ......الخ

اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے یعنی رکوع میں جانے اور رکوع سے سر اٹھانے میں کہ ف ان دونوں تکبیروں میں بھی

(۱) عمود، ٹیک لگانے کی چھڑی، لوہا، مصباح، قاسمی ۱۲۔

پہلی تکبیر کی طرح ہاتھ اٹھائے۔ان احادیث کی بناء پر جن کا عنقریب ذکر آئے گا۔اور اپنے مذہب کی دلیل مصنفؒ نے یہ بیان کی ہے۔

لقوله عليه السلام: لا ترفع الأيدي إلا في سبع مواطن: تكبيرة الافتتاح......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، **وذکر الحج الخ** مذکورہ تین کے بعد باقی چار کو حج کے بیان میں ذکر کیا ہے، ف تکبیرات العرفات اور تکبیر الجمر تین اور تکبیر الصفاوالمروۃ اور تکبیر الاستلام۔

والذي يروى من الرفع محمول على الابتداء كذا نقل عن ابن زبيرؓ......الخ

اور رفع الیدین کے بارے میں جو روایتیں بیان کی جاتی ہیں وہ محمول ہے ابتدائے اسلام کے زمانے پر جیسا کہ ابن الزبیرؓ سے منقول ہے۔ف۔ بندہ مترجم کہتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس مسئلہ کے سلسلہ میں بھی عوام میں ہنگامہ اور فساد برپا ہے۔اور سنت کے قائم کرنے کے بہانے سے اسلام کی بنیاد ہلائی جارہی ہے۔اس لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اللہ پاک کی توفیق سے اس مسئلہ کی خوب وضاحت کردی جائے تاکہ اصل اور حق بات ظاہر ہو جائے۔**ولا حول ولا قوة إلا بالله العزيز الحكيم۔**

سب سے پہلے اس بات کو متعین کر لینا ہے کہ آپس میں کس بات اور کس محل میں اختلاف ہے۔

واضح ہو کہ اصطلاح میں لفظ سنت کا استعمال ایسے کام پر ہوتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے برابر کیا ہو مگر کبھی ترک بھی کر دیا ہو۔اور کبھی ایسے کام کو بھی سنت کہہ دیا جاتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے کیا ہو حالانکہ اس کے متعلق یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اسے ہمیشہ کیا گیا ہے۔اس جگہ پہلی صورت میں گفتگو ہو رہی ہے۔یعنی رسول اللہ ﷺ کا مسنون طریقہ یہی تھا کہ تکبیر تحریمہ کے علاوہ باقی مواقع میں رسول اللہ ﷺ بغیر ہاتھ اٹھائے ہمیشہ نماز پڑھتے رہے یا رکوع میں جاتے اور اس سے سر اٹھاتے وقت ہمیشہ ہاتھ اٹھا کر نماز پڑھتے رہے۔

ائمہ حنفیہ کو اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ان مواقع میں رسول اللہ ﷺ سے ہاتھ کا اٹھانا ثابت ہے۔مگر اس بات کی تحقیق نہیں ہے کہ آپ کا وہ عمل صرف ابتداء اسلام میں تھا یا آخر تک آپ کا عمل یہی رہا ہے۔اور اس بات میں بھی کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ہاتھوں کو اٹھانا یا رفع الیدین کرنا فعل مسنون ہے۔فعل واجب نہیں ہے۔اور یہ بات بھی فقہاء کے درمیان مسلم ہے کہ نماز کے عمل میں بہت ہی احتیاط کی ضرورت ہے۔اسی لئے اس عمل کے وقت کوئی بھی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے جو نماز میں سے نہ ہو، ایسا کرنے سے نماز میں خرابی پیدا ہوتی ہے، پھر اگرچہ عمل رفع الیدین سے امام اعظمؒ وصاحبینؒ اور مشائخ فقہاء میں کسی کے نزدیک بھی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، اور یہی صحیح بھی ہے۔

مذکورہ تمہیدات کے بعد اس جگہ دو مجمل باتوں میں غور کرنا میرا فرض ہے، اول رفع یدین کا ثبوت، پھر مقامات رفع یعنی کن کن مواقع میں ہاتھ اٹھائے جاتے تھے، اور کس حد تک یا کس طرح، اس کے ثبوت کے سلسلہ میں ان کے موافق اور مخالف سندوں میں گفتگو، دوم ہاتھوں کو نہ اٹھانے اور ان کے سلسلہ کی سندوں میں کلام اور آخر میں صحابہ کرامؓ کے آثار اور ان کے اعمال کے بارے میں بھی گفتگو، پہلی بات یہ ہے کہ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب فرض نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو تکبیر کہتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے اور جب قراءت سے فارغ ہو کر رکوع کرنا چاہتے تو بھی ایسا ہی کرتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بھی ایسا ہی کرتے، اور جب کسی نماز کو بیٹھ کر پڑھتے تو اس میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، اور جب دونوں سجدوں سے سر اٹھاتے تو بھی یوں ہی ہاتھ اٹھاتے اور تکبیر کہتے تھے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، اسی طرح دونوں سجدوں کے درمیان بھی ہاتھ اٹھانے کی روایت موجود ہے، اور وہ مالک بن الحویرثؓ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا کہ وہ ہاتھ اٹھاتے اس وقت بھی تکبیر کہتے اور اس وقت بھی جبکہ رکوع سے سر اٹھاتے، یہاں تک کہ کان کی لو تک پہونچاتے، سوائے ترمذی کے پانچوں ائمہ محدثین نے اس کی روایت کی ہے، اور نسائی کی روایت میں ہے کہ ہاتھ اٹھاتے

جب سجدہ کرتے اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اسی طرح عبداللہ بن طاؤس کا فعل مع روایت کے ابوداؤد اور نسائی میں مذکور ہے، بلکہ سیوطی اور ابن حجر وغیرہ نے تو رسول اللہ ﷺ کا رفع یدین کرنا ہر جھکاؤ اور اٹھاؤ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ذکر کیا ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عمر وابو موسیٰ وابو سعید خدری وابوالدرداء وانس وابن عباس اور جابرؓ ہیں اور ابن طاؤس کے اثر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی کچھ خاص لوگوں کا اس پر عمل رہا ہے، کیونکہ نضر بن کثیر نے کہا ہے میں نے ابن طاؤس کے اس عمل پر اعتراض کیا کہ یہ عمل کہاں سے سیکھا اور کس طرح حاصل کیا تو میں نے وہیب بن خالد سے بیان کیا اور اظہار خیال کیا کہ میرے بغل میں رہتے ہوئے ابن طاؤس نے اس طرح رفع یدین کی حرکت کی ہے تو وہیب نے ابن طاؤس سے کہا کہ تم نے وہ حرکت کی ہے جو ہم نے کسی اور کو کرتے نہیں دیکھی، تو ابن طاؤس نے جواب دیا کہ میں نے اپنے والد طاؤس کو ایسا ہی کرتے دیکھا، اور میرے والد نے ابن عباسؓ کو ایسا ہی کرتے دیکھا، اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے، اس کی روایت ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے۔

اس واقعہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی خاص خاص حضرات ایسا کیا کرتے تھے، بلکہ دوسری روایت میمون المکیؒ کی شاہد ہے کہ عبداللہ بن الزبیرؓ نے ہمیں نماز پڑھائی تو میں نے دیکھا کہ آہستہ اشارہ کے ساتھ رفع یدین کرتے تھے جب وہ کھڑے ہوتے اور جب رکوع کرتے اور جب سجدہ کرتے اور جب قیام کو اٹھتے تو کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرتے، میمون المکیؒ نے کہا کہ پھر میں ابن عباسؓ کے پاس آیا اور ان سے یہ کیفیت بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تمہیں یہ بات پسند ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کو دیکھو تو عبداللہ بن الزبیرؓ کے پیچھے مقتدی بن کر نماز پڑھ لو، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اس روایت سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس وقت بھی عبداللہ بن الزبیرؓ نے دونوں سجدوں کے درمیان میں بلکہ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت رفع الیدین کیا تھا، مگر چونکہ صرف ایک ہی ابن الزبیرؓ کا ایسا عمل تھا اسی لئے میمون مکیؒ کو اعتراض سا ہوا، مگر ابن عباسؓ نے اس عمل کو درست قرار دیا کہ رسول اللہ ﷺ کا بھی ایسا عمل تھا۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ ہر حرکت جھکاؤ اور اٹھاؤ سے رفع یدین کم ہوتے ہوئے صرف تحریمہ، رکوع، قومہ اور دونوں سجدوں کے درمیان چار موقع میں رہا جیسا کہ حضرت علیؓ کی حدیث سے ثابت ہے، پھر شافعیہ وغیرہ کہتے ہیں کہ دونوں سجدوں کے درمیان کا بھی رفع یدین منسوخ ہو گیا حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کی بناء پر کہ رسول اللہ ﷺ جب نماز کو کھڑے ہوتے تو کندھوں کے سامنے تک دونوں ہاتھ اٹھاتے پھر تکبیر کہتے پھر جب رکوع کرنا چاہتے تو اسی کی طرح کرتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو بھی اسی طرح کرتے، اور جب سجدہ سے سر اٹھاتے تو ایسا نہیں کرتے، اور ایک روایت میں ہے کہ جب سجدہ کو جاتے تو ایسا نہیں کرتے، اس کی روایت بخاری، مسلم کے علاوہ چاروں ائمہ محدثین نے کی ہے، چونکہ حضرت علیؓ کی حدیث بھی صحیح تھی، اور یہ حدیث ابن عمرؓ بھی صحیح ہے تو یقینی طور سے سجدہ میں جانے اور سجدہ سے سر اٹھانے دونوں اور دوسرے سجدے کے دونوں بھی منسوخ ہیں؛ حالانکہ اس پر بھی ابن الزبیرؓ کا عمل رہا اور رسول اللہ ﷺ کے بعد ابن عباسؓ کی تائید و تقریر اور عمل بھی باقی رہا، بہت ممکن ہے کہ ان کے نزدیک ان اوقات کے نسخ رفع یدین کا ثبوت نہ ہوا ہو، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس باب میں مالک بن الحویرثؓ سے بھی روایت موجود ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مالک بن الحویرثؓ روایت صحیحین وابوداؤد وابن ماجہ اور نسائی میں بہت ہی اختصار کے ساتھ صرف تکبیر تحریمہ اور رکوع سے سر اٹھانے کی مذکور ہے اور ممکن ہے کہ اس میں رکوع تکبیر بھی شامل کر لی جائے، اور نسائی کی دوسری روایت میں مالک بن الحویرثؓ سے سجدہ میں جانے اور سجدہ سے سر اٹھانے کا رفع الیدین بھی موجود ہے، حضرت ابن عمرؓ کی مذکورہ روایت کے موافق ہی وہ روایتیں بھی ہیں جو منسوخ شدہ احادیث میں ہیں، ترمذی نے دوسرے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے نام

گنوائے ہیں جن سے اس مسئلہ کے بارے میں روایتیں موجود ہیں، ان میں سے وائل بن حجرؓ ہیں جن کی روایت مسلم میں ہے، اور حضرت علیؓ سے سنن اربعہ میں روایت موجود ہے، اور حضرت علیؓ کے سنن اربعہ کی روایت سے، اور سہل بن سعد وابن الزبیر و ابن عباس ومحمد بن سلمہ وابی اسید وابو قتادہ وابو ہریرہؓ سے ابوداؤد میں روایت ہے، اور انس وجابر وعمر لیثی سے ابن ماجہ میں روایت ہے اور حکم بن عمیر سے احمد میں روایت ہے اور ابو بکرؓ و براءؓ سے بیہقی میں روایت موجود ہے اور عمر وابو موسی سے دار قطنی کے سند سے اور عتبہ بن عامر اور معاذ بن جبل سے طبرانی کی سند سے، مقصد یہ ہے کہ ان صحابہ کرام سے رفع الیدین کے بارہ میں روایات ہیں مگر اس سے بحث نہیں کہ وہ اس طور سے ہوں جو منسوخ ہیں یا اس طرح سے کہ وہ ناسخ ہیں، اور یہ بات اس سے پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ابن عمر وابن عباسؓ سے ہر جھکنے اور اٹھنے کے موقع پر بھی رفع یدین کی روایت پائی گئی ہے، جو منسوخ ہو چکی ہے لہٰذا جن سندوں سے ایسی روایتیں ہوں گی وہ سب منسوخ ہوں گی، مثلاً ابو موسیٰ وخدری وابوالدرداء وانس اور جابرؓ ہیں، اور حضرت علیؓ کی جو دو سجدوں کے درمیان کی ہے وہ بھی منسوخ ہے، اور باقی حضرات کی احادیث کو تلاش کرنا بہت مشکل اور دقت طلب ہے۔

اب یہ بات کہ رفع یدین کی کیا کیفیت ہوتی تھی یا ہونی چاہئے تو اس میں بھی اختلاف ہے، چنانچہ مالک وابو داؤد کی روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ جب نماز شروع کرتے تو کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے، اور جب رکوع سے سر اٹھاتے تو اس سے بہت کم ہاتھ اٹھاتے، اور میں کہتا ہوں کہ کم ہو کر شاید سینہ تک ہوتے ہوں گے یا بطور اشارہ کے ہوں گے، جیسا کہ میمون مکی کے اثر میں ابن الزبیرؓ سے اشارہ کا لفظ آیا ہے، اور مالکؒ کی ایک روایت میں ہے کہ ابن عمرؓ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کرتے تھے، مگر اول تو یہ روایت پہلی روایت کے مخالف ہے، دوسرے یہ کہ ابن جریجؒ نے نافع سے پوچھا کہ کیا پہلی دفعہ کے ہاتھ اٹھانے میں زیادہ اونچا کرتے تھے، تو نافع نے کہا کہ نہیں بلکہ برابر ہی کرتے تھے، تو ابن جریج نے کہا ذرا ایک بار مجھے ویسا کر کے دکھادیں، تو نافع نے دونوں پستان تک یا اس سے بھی نیچے تک دکھلائے، یہ روایت کو امام مالکؒ کی سند سے صحیح ہے، لیکن اس کی کیفیت میں بہت زیادہ اضطراب ہے، ابوہریرہؓ وغیرہؒ کی روایتوں میں تو کانوں کی لو تک ہے، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہر جھکتے اور اٹھنے میں رفع یدین کا منسوخ ہونا مشکل ہے کیونکہ صحیحین اور باقی چاروں سنن میں ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ابو ہریرہؓ نے لوگوں کو نماز پڑھائی اس طرح سے کہ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر کہتے، تو ان سے کہا گیا کہ اے ابو ہریرہ! یہ کیسی تکبیر ہے تو کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی نماز ہے، میں کہتا ہوں کہ اس تکبیر سے وہی رفع یدین مراد ہے کیونکہ صرف تکبیر ہونے پر تو کوئی انکار یا اعتراض نہ تھا، اور اس خیال کی تائید نسائی کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ ایک مرتبہ ابو ہریرہؓ بنو زریق کی مسجد میں آئے اور کہنے لگے کہ تین باتیں ایسی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ انہیں کرتے مگر لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا ہے، نمبر ا۔ رسول اللہ ﷺ نماز میں رفع یدین کرتے۔

نمبر ۲۔ بہت معمولی سا سکوت کرتے، نمبر ۳۔ اور جب سجدہ کرتے تو تکبیر کہتے تھے، میں کہتا ہوں کہ سجدہ کی تکبیر معروف نہ تھی اور نہ اس کا انکار ہوا ہے، اس کے علاوہ خود ابن عمرؓ سے ہر جھکتے اور اٹھتے وقت میں رفع یدین کرنا مالکؒ کی روایت میں گذر چکا ہے، ابن الجوزیؒ نے اپنی تحقیق میں اس بات پر طعن کیا ہے کہ حنفیہ ابن الزبیر اور ابن عباسؓ سے رفع یدین کے منسوخ ہونے کی روایت کرتے ہیں، حالانکہ ان دونوں حضرات سے اس کے خلاف ایسی روایت موجود ہے، جو سند کے اعتبار سے قوی اور محفوظ ہے، چنانچہ ابن داؤد نے میمون مکی سے روایت کی ہے کہ میمونؒ نے ابن الزبیرؓ کو ایسی حالت میں دیکھا ہے کہ وہ لوگوں کو اس طرح نماز پڑھا رہے تھے کہ وہ جب بھی رکوع کرتے اور سجود کرتے تو اپنی دونوں ہتھیلیوں سے اشارہ کرتے، میمونؒ نے کہا کہ میں نے جا کر ابن عباسؓ کو اس بات کی اطلاع دی تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تمہیں رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنی ہو تو ابن الزبیر کی اقتداء کر کے دیکھ لو، ترجمہ ختم ہوا۔

لیکن یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ اس میں سجدہ کے وقت بھی رفع یدین کا بیان ہے، اور رکوع سے کھڑے ہوتے

وقت کا تذکرہ نہیں ہے، اور اس سے زیادہ کے بارے میں بھی سکوت ہے، مگر سجدہ نہ کرنے پر تو اتفاق کیا ہے، اور ابن عمرؓ کی حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ اس حالت میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، لہٰذا یا تو ابن عباسؓ کا یہ اثر صحیح نہیں ہے یا منسوخ ہے اور اس نسخ کی اطلاع ان دونوں حضرات کو اس وقت تک نہ ہوئی ہو، میں مترجم کہتا ہوں کہ ان باتوں سے بڑھ کر اشکال کی بات یہ ہے کہ ان تمام آثار میں یہ تصریح ہے کہ عام طور سے اس وقت صحابہ کرام اور تابعین کرام میں رفع یدین کا عمل ترک ہو چکا تھا۔

اس اشکال کے جواب میں کسی کو یہ نہیں کہنا چاہئے، ترک کا ثبوت آثار سے ہو رہا ہے جبکہ عمل کا ثبوت ہم نے احادیث سے کیا ہے، کیونکہ گفتگو احادیث کے ثابت کرنے کے سلسلہ میں نہیں ہے، بلکہ یہ بات متعین ہو چکی ہے اور بلاشبہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا کیا ہے، اور صرف اس بات کا سوال باقی رہ گیا ہے کہ آپ ﷺ کی آخری زندگی میں بھی اس رفع یدین پر عمل باقی رہ گیا تھا یا نہیں، تو ابن طاؤس کے اثر میں یہ عام انکار ہے کہ ہم نے کسی کو بھی ایسا کرتے ہوئے نہیں دیکھا، اور خود میمون مکیؒ نے بھی اس سے انکار کیا ہے، اور ان سب میں سب سے زیادہ حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ تصریح کہ لوگوں نے اسے ترک کر دیا ہے، جیسا کہ نسائی میں ہے۔

پس ان آثار سے یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ اس وقت عام طریقہ سے لوگوں نے رفع یدین کرنا چھوڑ دیا تھا، اور بڑے اور مشہور صحابہ کرامؓ خاص کر امامت کی حالت میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اب یہ بات تحقیق طلب یہ ہے کہ کیا حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ گمان کرنا صحیح ہے کہ لوگوں نے رفع یدین کرنے کو سستی کی بناء پر ترک کر دیا ہے تو میرے نزدیک یہ کسی طرح بھی وہم و گمان میں آنے کی نہیں ہے کہ سارے بڑے بڑے صحابہ کرام بھی محض سستی کی وجہ سے ایک سنت یعنی رفع یدین کو بغیر کسی معقول وجہ کے ترک کر دیں، نیز ابن عباسؓ سجدہ کے وقت بھی اس رفع یدین کو باقی رکھیں، حالانکہ یہ تو بالاتفاق متروک و منسوخ ہو چکا تھا۔ اس لئے یہ کہنا پڑتا ہے کہ یقیناً صحابہ کرامؓ نے اسے متروک و منسوخ ہو جانے کی بناء پر ہی ترک کیا تھا۔

اب میں رفع یدین کی کچھ حدیثوں میں گفتگو شروع کرتا ہوں، اور جن صحابہ کرامؓ سے رفع یدین کے ثبوت میں روائتیں پائی گئی ہیں انہی میں سے اس کے ترک کرنے کے بھی آثار بیان کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے رفع یدین کی حدیث کی اسناد میں اسماعیل بن عیاش عن صالح بن کیسان ہے جن میں صالح بن کیسان امام عقبہ مدنی ہیں، جبکہ اسمٰعیل بن عیاش کی روایت جو شامیوں کے علاوہ کسی اور سے ہو وہ ضعیف اور لائق حجت نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ النسائیؒ، ابن حبانؒ، اور ابن خزیمہؒ نے کہا ہے اور ابن حجرؒ نے بھی اپنی کتاب تقریب میں اس فیصلہ کو برقرار رکھا ہے، مذکورہ بناء پر ابو ہریرہؓ کی حدیث مذکور حجت کے لائق باقی نہیں رہی، ابو حمید الساعدی کی حدیث کئی اسناد سے مروی ہے لیکن ان میں سے بعض پورے طور سے رسول اللہ ﷺ تک نہیں پہونچائی گئی ہے، پھر محمد بن عمرو بن عطاء نے ابو حمید ساعدی اور ابو قتادہ سے نہیں سنا ہے کیونکہ ہشیم بن عدی نے کہا ہے کہ ابو قتادہ تو حضرت علیؓ کی جمعیت میں شہید ہوئے، اور حضرت علیؓ نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی، ابن عبد البر نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے، اور محمد بن عمرو بن عطاء کی وفات سنہ ۱۲۵ء کے بعد ہے، اس بناء پر ابن حزم نے اسے عبد الحمید کا وہم بتایا ہے، لیکن بیہقیؒ نے اس روایت کے متعلق کہا ہے کہ یا شاذ ہے، اور اہل تاریخ کا اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ وہ سنہ ۵۴ تک رہے، میں کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ نے بھی اسی قول کو اصح کہا ہے۔

لیکن عینیؒ نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے کہ شعبی اور ہثیم کے قول کے خلاف کسی دوسرے کے قول کو ترجیح نہیں ہو گی، اگرچہ وہ بخاری ہی ہوں، اور ابن حبان و طحاوی کی روایتوں میں سے محمد بن عمرو اور ابو حمیدؓ کے درمیان ایک نامعلوم و مجہول شخص کا واسطہ ثابت کیا ہے، اور ابو داؤد کا بھی یہی طریق بیان کیا ہے، اور یہ نتیجہ نکالا کہ یہ حدیث منقطع اور مضطرب ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ اس بحث کو زیادہ طویل کرنا بے فائدہ ہے، اور حق بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ہر جھکتے اور اٹھتے وقت رفع یدین ثابت تو ضرور ہے لیکن تصریح کے ساتھ یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ آپ ﷺ کی آخری زندگی تک آپ کا یہ معمول باقی رہا ہو، اور بیہقیؒ کی ابن عمرؓ سے وہ روایت جس کے آخر میں ہے کہ یہی نماز آپ کی باقی رہی یہانتک کہ آپ اللہ تعالیٰ سے جا ملے، تو یہ روایت اگرچہ

اسناد کے اعتبار سے صحیح ضرور ہے، لیکن اس میں جو حکم لگایا گیا ہے وہ نماز کے متعلق ہے، اس کے ہر جزو اور ہر ذکر کے لئے یہ حکم عام نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ ہر جزو کے آخر تک دائمی حکم کا تقاضا تو یہ تھا کہ ثناء اور تعوذ وغیرہ تمام اعمال واذکار کو واجب کہنا چاہئے تھا حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، نیز جن صحابہ کرام سے رفع یدین مروی ہے ان سے ہی ترک بھی مروی ہے، چنانچہ حضرت علیؓ سے عاصم بن کلیب نے اپنے والد کے واسطہ سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ صرف ابتداء کی تکبیر میں ہاتھ اٹھاتے پھر نہیں اٹھاتے تھے، ابو بکر بن ابی شیبہ اور طحاوی نے اس کو روایت کی ہے، عاصم بن کلیب چونکہ ثقہ راوی ہیں اس لئے طحاوی کا انہیں سند میں لانا مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، اس موقع پر اس بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس سنت یعنی رفع یدین کو حضرت علیؓ نے یوں ہی بلا وجہ چھوڑ دیا ہو، اور طحاویؒ نے ابن ابی داؤد کی حدیث سے روایت کی ہے **انبأنا احمد بن عبداللہ بن یونس حدثنا ابوبکر بن عیاش عن حصین عن مجاھد قال صلیت خلف ابن عمر فلم یکن یرفع یدیه الافی التکبیرۃ الاولی.**

یعنی مجاہدؒ نے کہا ہے کہ میں نے عبداللہ بن عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی ہے، اور انہوں نے تکبیر تحریمہ کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر ہاتھ نہیں اٹھائے، یہ اسناد صحیح ہے، اسی کی مانند ابن ابی شیبہ نے مجاہد سے انہوں نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے، طحاویؒ نے کہا ہے کہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ابن عمرؓ نے حدیث روایت کی اور خود ہی اس پر عمل نہ کیا اس سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک وہ روایت منسوخ ہو چکی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ نسخ کہے بغیر بھی دونوں روایتوں میں توفیق و تطبیق ممکن ہے اس طرح سے کہ رفع یدین کرنا سنت عزیمہ میں سے نہیں ہے اس لئے اس کا کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں کبھی کیا اور کبھی نہ کیا، اسی بات پر رفع یدین نہ کرنے کی روایتیں بھی دلالت کرتی ہیں، اور اسی بات پر میمون مکی وابن طاؤس کے آثار اور حضرت ابو ہریرہؓ کا یہ قول دلالت کرتا ہے کہ لوگوں نے اس پر عمل چھوڑ دیا ہے، البتہ میمون مکی کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سجدہ کی حالت میں بھی رفع یدین کرنا جائز ہے، اور ابن عمرؓ کی حدیث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اس حالت میں رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ عام روایتیں اسی طرح کی ہیں اس سے ایک مراد تو یہ ہو سکتی ہے کہ سجدہ کی حالت میں رفع یدین کا حکم منسوخ ہو گیا ہے تو ایسی صورت میں نسخ کہنے کی دلیل چاہئے، جبکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ صرف اس وقت رفع یدین نہیں کیا۔

خلاصہ یہ ہوگا کہ رفع یدین کے ثبوت کی ایک صورت تو یہ ہو کہ ہر جھکتے اور اٹھتے وقت رفع ہوتا تھا، پھر رسول اللہ ﷺ کے بعد بھی حضرت ابن الزبیرؓ کا اس پر عمل رہا اور ابن عباسؓ کی تصدیق بھی پائی گئی لیکن عموماً تمام حضرات کا اس سے انکار ہی رہا، دوسری صورت یہ ہے کہ صرف رکوع و قومہ اور دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کا حکم ثابت ہو اور اس پر بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد کچھ لوگوں کا عمل باقی رہا ہو چنانچہ ترمذیؒ نے لکھا ہے کہ بعض اہل علم صحابہ اور تابعین کا یہی قول ہے، لیکن عموماً اس پر عمل نہیں تھا، اور وہیب بن خالد اور میمون مکی وغیرہ کے آثار اور ابو ہریرہؓ کے قول سے عام انکار ظاہر ہے، اور خود رفع یدین کی روایت کرنے والے صحابہؓ سے اس کے خلاف عمل صحیح سندوں سے ثابت ہے، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ بہت سے اہل علم صحابہ کرام اور تابعینؒ کا عمل صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھانے پر ہے اس کے بعد نہیں۔

ابوداؤد وترمذیؒ نے وکیع کی روایت سے عن سفیان الثوری عن عاصم بن کلیب عن عبدالرحمٰن بن الاسود عن علقمہ روایت کی ہے کہ ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ کیا میں تمہیں لے کر رسول اللہ ﷺ کی نماز نہ پڑھوں، یہ کہہ کر انہوں نے اس طرح نماز پڑھائی کہ صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے پھر نہیں اٹھائے، اور ابوداؤد میں ابن مسعودؓ کی روایت سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ تو صرف پہلی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھایا کرتے تھے، پھر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، اس حدیث کو طحاوی وابن ابی شیبہ نے بھی روایت کیا ہے، ترمذیؒ نے ابن مسعودؓ کی حدیث کو حسن کہا ہے، اور نسائیؒ نے وکیعؒ کی روایت کی مانند ابن المبارک عن سفیان

روایت کی ہے، اور یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز رفع یدین کے بغیر ہی ہوتی تھی۔

البتہ اس حدیث کے ثبوت میں اس طرح کی بحث کی گئی ہے کہ نمبر ا۔ عاصم بن کلیب ضعیف راوی ہیں مگر یہ اعتراض بالکل بے اعتبار ہے، کیونکہ ابن معین نے ان کی توثیق کی ہے اور اچھا سمجھا ہے، اور مسلم نے بھی اپنی صحیح میں ان سے احادیث ذکر کی ہیں، ان باتوں کے باوجود ان پر الزام لگانا خوف کا مقام ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ الزام لگانا کہ عبدالرحمٰن نے علقمہ سے نہیں سنا ہے یہ بھی بالکل غلط اور مہمل بات ہے کیونکہ خطیب بغدادیؒ نے ان کے سماع کی تصریح کی ہے، اور ابراہیم نخعی اور عبدالرحمٰن دونوں ہم عمر تھے، اور بالاتفاق ابراہیم نے سنا ہے تو عبدالرحمٰن نے کیوں نہیں سنا، نہ سننے کی کیا وجہ ہوئی۔

تیسری بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اسناد تو ٹھیک ہے مگر وکیع یا ثوری نے بقول دارقطنی و بخاری وغیرہ اس حدیث میں اپنی طرف سے یہ جملہ بڑھا دیا کہ پھر ہاتھ نہ اٹھاتے تھے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صرف گمان بے دلیل ہے جو قابل تسلیم نہیں ہوتا ہے۔

اور یہ جو اعتراض کیا گیا ہے کہ اس جملہ کے بغیر ہی روایت پائی گئی ہے، تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ہاں وہ مختصر ہے اور یہ مطول ہے، اور اس بات پر اتفاق ہے کہ ثقہ راوی جو لفظ یا جملہ بھی بڑھاتا ہے وہ مقبول ہوتا ہے، تو اس بات کے باوجود اس پر اعتراض کرنے کی کیا وجہ ہوئی، اور حق بات یہ ہے کہ حدیث صحیح ہے، اور ابن حزم نے محلے میں اس کی تصحیح کی ہے، بلکہ اس کے صحیح ہونے کی قوی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ سے رفع یدین نہ کرنا صحیح و ثابت ہے، بلکہ دارقطنی و ابن عدیؒ نے **محمد بن جابر عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراهیم عن علقمه عن عبدالله قال صلیت مع رسول الله ﷺ و ابی بکر و عمرؓ فلم یرفعوا ایدیهم الاعند استفتاح الصلوة**، یعنی عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ وابوبکر و عمرؓ کے ساتھ نماز پڑھی مگر ان میں سے کسی نے بھی تکبیر تحریمہ کے موقع کے علاوہ اپنے ہاتھ نہیں اٹھائے، دارقطنیؒ نے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ ابراہیم کی روایت ابن مسعودؓ سے مرسل صحیح ہے۔

اور تحقیق یہ ہے کہ محمد بن جابرؒ ثقہ ہیں، ترمذیؒ نے ابن المبارکؒ سے روایت کی ہے کہ ابن مسعودؓ کی مذکورہ بالا حدیث ثابت نہیں ہوئی، عینیؒ اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ابن المبارک کو جس اسناد سے یہ روایت ملی تھی اس کا ثبوت نہ ہوا ہوگا، مگر اس سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ ترمذی کی تصحیح نہ ہو اور ابن حزم نے اس کی تصحیح کی ہو، اور حاکمؒ کہا ہے کہ عاصم بن کلیب صحیح کے راویوں میں سے نہیں ہیں مگر یہ بات غلط ہے کیونکہ صحیح مسلم کے باب الہدی کے راویوں میں ان کا نام موجود ہے، اور ابوبکر بن ابی شیبہ نے روایت کی عبداللہ بن المبارک عن الاعمش عن الشعبی کہ شعبیؒ صرف پہلی بار تکبیر تحریمہ میں ہاتھ اٹھاتے پھر باقی مواقع میں ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، اور عن شعبہ عن ابی اسحٰق روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے شاگردوں میں سے کوئی بھی تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، وکیعؒ نے کہا ہے کہ پھر دوبارہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور ابراہیم نخعیؒ سے روایت کی کہ ابراہیم کہا کرتے تھے کہ تم جب تکبیر تحریمہ کہو تو ہاتھ اٹھاؤ پھر باقی مواقع میں مت اٹھاؤ، اور دوسری روایت میں ابراہیم نے کہا کہ سوائے تکبیر تحریمہ کے اور کبھی رفع یدین نہ کرو، اور صرف تحریمہ کے وقت خیثمہ و قیس سے رفع یدین کرنے اور باقی نہ کرنے کی روایت کی ہے، اور عبدالملکؒ نے کہا ہے کہ میں نے شعبی و ابراہیم نخعی و ابواسحٰق کو دیکھا ہے کہ وہ سوائے تکبیر تحریمہ کے کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے، یہ سب باتیں ابوبکر بن ابی شیبہ نے بیان کی ہیں۔

اور عینیؒ نے کہا ہے کہ براءؓ بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب تکبیر افتتاح کہتے تو رفع یدین کرتے تھے، یعنی دونوں کانوں کی لو کے قریب اٹھاتے پھر دوبارہ نہیں اٹھاتے تھے۔ اس کی روایت ابوداؤد اور ابن ابی شیبہ نے کی ہے اور طحاوی نے تین سندوں سے اسے ذکر کیا ہے۔ ابوداؤد نے کہا ہے کہ یہ حدیث ہشیم اور خالد بن ادریس نے یزید بن ابی زیاد سے روایت کی اور اس میں "پھر دوبارہ نہیں اٹھاتے تھے" کا جملہ نہیں ہے۔ خطابیؒ نے کہا ہے کہ یہ جملہ فقط شریکؒ نے ذکر کیا ہے۔ یعنی اس جملہ کی

روایت کرنے والے صرف شریک ہیں۔ اور ابن عبد البر نے کہا ہے کہ اس کے راوی صرف شریک نہیں بلکہ صرف یزید ہیں۔
عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ دعوی صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عدی نے کامل میں کہا ہے کہ ہشیم، شریک اور ان کے علاوہ ایک جماعت نے یزید بن ابی زیاد سے روایت کی ہے۔ اور سبھوں نے کہا ہے کہ پھر دوبارہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ اس بیان سے ابو داؤد کا یہ دعوی غلط ہو گیا کہ ہشیم وغیرہ نے یہ جملہ نہیں کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ براء وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ لیکن شاید اس کا وہی جواب ہو جو ابن الہمامؒ نے ابن مسعودؓ کی حدیث میں ذکر کیا ہے کہ یہ ایک فرض گمان ہے۔ صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ بیان ہونی چاہئے، یہ وجہ کہ شاید یزید بن ابی زیاد کو ضعیف کہتا ہو، یا ان کا منفرد ہونا ہو۔ عینیؒ نے کہا ہے کہ شریک کے منفرد ہونے کا دعوی تو باطل ہو گیا کیونکہ دار قطنی ہیں۔ عینیؒ

نے کہا ہے کہ یہ دعوی صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن عدی نے کامل میں کہا ہے کہ ہشیم، شریک اور ان کے علاوہ ایک جماعت نے یزید بن ابی زیاد سے روایت کی ہے۔ اور سبھوں نے کہا ہے کہ پھر دوبارہ ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ اس بیان سے ابو داؤد کا یہ دعوی غلط ہو گیا کہ ہشیم وغیرہ نے یہ جملہ نہیں کہا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ براء وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ لیکن شاید اس کا وہی جواب ہو جو ابن الہمامؒ نے ابن مسعودؓ کی حدیث میں ذکر کیا ہے کہ یہ ایک فرضی گمان ہے۔ صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ بیان ہونی چاہئے، یہ وجہ کہ شاید یزید بن ابی زیاد کو ضعیف کہتا ہو، یا ان کا منفرد ہونا ہو۔ عینیؒ نے کہا ہے کہ شریک کے منفرد ہونے کا دعوی تو باطل ہو گیا کیونکہ دار قطنی نے
یزید بن ابی زیاد سے سوائے شریکؒ کے اسمٰعیل بن زکریا سے اور بیہقی نے اسرائیل بن یونس سے اور طبرانی نے اوسط میں حمزۃ الزیات سے اسی کے موافق روایت یا متابعت کی ہے۔

اب یزید بن ابی زیاد کے بارے میں گفتگو کرنی ہے

اس طرح سے کہ عینیؒ نے کہا ہے کہ اول تو یزید بن ابی زیاد کی متابعت موجود ہے کہ عیسی بن عبد الرحمٰن نے بھی روایت کی ہے جیسا کہ طحاویؒ نے روایت کی ہے، دوم یہ کہ خود یزید ثقہ ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کی حدیث جائز قبول ہے، اور یعقوبؒ نے کہا ہے کہ وہ مقبول عدل اور ثقہ ہیں، ابو داؤد نے کہا ہے کہ وہ ثقہ ہیں اور جو کوئی ان کے بارے میں کوئی بات نامناسب کہتا ہے تو مجھے پسند نہیں آتی ناگواری ہوتی ہے، ابن خزیمہؒ نے یزید بن ابی زیاد کی حدیث اپنی کتاب صحیح میں روایت کی ہے، ساجیؒ نے کہا ہے کہ وہ صدوق ہیں اور ابن حبان نے بھی یہی کہا ہے، اسی طرح مسلم نے اپنی صحیح میں ان حدیث کی روایت کی ہے، اور بخاریؒ نے ان سے استشہاد کیا ہے۔

بندہ مترجم کہتا ہے کہ ابن حجرؒ نے تقریب میں لکھا ہے کہ یزید بن زیاد بن ابی زیاد جنہیں یزید بن ابی زیاد کہا جاتا ہے بنو مخزوم کے مولیٰ مدنی اور ثقہ ہیں، اور یزید بن ابی زیاد جو ہاشمی کوفی ہیں ضعیف ہیں، اور اسی نام کے شامی بھی ہیں وہ متروک ہیں، اس موقع پر اس فرق کو خیال رکھنا ضروری ہے، اس جگہ اصل گفتگو دوسرے یزید یعنی ہاشمی کوفی میں ہے، لیکن تہذیب میں لکھا ہے کہ ابو داؤد نے فرمایا ہے کہ وہ ثقہ ہیں میں نہیں جانتا کہ کسی نے ان کی حدیث ترک کی ہو، اور ابو زرعہ و ابن عدی نے بھی ان کی حدیث لکھنے کے بارے میں کہا ہے، اس طرح ان کی حدیث کی جب دوسری حدیث ابن مسعودؓ سے تائید ہو گئی تو اب کسی طرح بھی حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے، خاص کر ایسی صورت میں جبکہ اسی کے متابعت بھی موجود ہو۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ حضرت براء و ابن مسعودؓ کی حدیثوں سے رسول اللہ ﷺ سے رفع یدین کا ترک ضرور ثابت ہے اور حضرت ابن مسعودؓ اور ان کے سینکڑوں شاگردوں سے بھی رفع یدین کا ترک ثابت ہے اسی طرح حضرت علیؓ اور ان کے بے شمار شاگردوں سے بھی رفع یدین کو چھوڑ دینا ثابت ہے اور ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ سے بھی ترک رفع ثابت بلکہ نسائی کی روایت کے

موافق بقول ابو ہریرہؓ سب لوگوں سے عموماً ترک رفع ثابت بلکہ انکار ہے اور وہیب بن خالد و میمون المکی سے بھی عموماً ترک رفع ثابت ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کے موافق حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ سے بھی ترک رفع ثابت ہے، پھر اس بات میں بھی کچھ شک نہیں ہے کہ حضرت علیؓ اور ابن مسعودؓ جیسے بڑے صحابہ کرامؓ ایسے نہ تھے کہ ایک ایسی سنت کو جس پر متواتر عمل ہو رہا ہو وہ خود اپنے سینکڑوں شاگردوں کے ساتھ بلاوجہ بالکل ترک کردیں۔

اب رفع یدین کا ثبوت

تو وہ بھی کئی صحابہ کرامؓ سے مروی ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ کسی روایت سے بھی یہ بات ثابت نہیں ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری فعل تھا، اور یہ بات پہلے بھی بیان کی جاچکی ہے کہ پہلے تو جھکتے اور اٹھتے وقت تکبیر کے ساتھ دونوں ہاتھ بھی اٹھائے جاتے تھے، بعد میں بقیہ کو چھوڑ کر تکبیر تحریمہ کے علاوہ رکوع میں جاتے وقت، اس سے اٹھتے وقت اور سجدے میں جانے کے وقت باقی رہا، پھر سجدہ جانے کے وقت بھی ہاتھ اٹھانا چھوڑ دیا گیا اور صرف رکوع میں جانے اور اس سے اٹھنے کا باقی رہ گیا، پھر اس بات میں اضطراب ہے کہ ہاتھ کس طرح اٹھائے جاتے تھے، اس لئے تحقیق کے ساتھ یہ کہا جائے گا کہ آخر میں جب رکوع و قومہ کا متروک ہونا حضرات براءؓ و ابن مسعودؓ سے ثابت ہو گیا تو کیا وجہ ہے کہ یہ بات نہیں کہی جائے، اس کے علاوہ خود رفع یدین کی حدیث روایت کرنے والے صحابہ کرامؓ سے خود ان کے شاگردوں سمیت اس کا ترک کرنا بھی ثابت ہو چکا ہے، لہٰذا واللہ اعلم بالصواب، حق بات یہی ہے کہ رفع یدین ترک ہو چکا تھا، البتہ یہ مسئلہ محل اجتہاد ہے اور اس میں اس قدر مباحث ہیں اس لئے جو کوئی رفع یدین کرے تو اس کی نماز صحیح ہو گی اور اس سے کسی قسم کا مباحثہ جائز نہ ہو گا، بلکہ یہ بھی کہنا درست نہ ہو گا اس کا ترک بطور منسوخ کے ہوا ہے، ساتھ یہ بات بھی ضروری ہے کہ اصطلاحی معنی میں رفع یدین سنت نہیں رہا، واضح ہو کہ اس مقام پر یہ کہنا کہ رفع یدین کی حدیثیں ترک رفع کی نسبت سے قوی ہیں اس لئے ترک رفع کا ثبوت نہیں ہے اور صرف رفع یدین کی ثابت ہیں، اور یہ کہنا کہ ہمیں حدیث صحابہ سے مطلب ہے آثار سے مطلب نہیں ہے بالکل ہی سرسری سی بات ہے، اور صحیح بھی نہیں ہے، صرف اوہام کی بناء پر احادیث ترک نہیں کی جاتی ہیں۔

اس جگہ ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ ابن مسعودؓ کی حدیث تو ابھی تک نفی پر قائم ہے، اور ابن عمرؓ کی حدیث سے ثبوت ہوتا ہے جبکہ یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ مثبت اور منفی میں تعارض کی صورت میں مثبت کو مقدم مانا جاتا ہے، جواب یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا رفع یدین کے دیکھنے سے انکار کا مطلب یہ نہ تھا کہ کبھی ایسا ہوا ہی نہیں اور کبھی دیکھا ہی نہیں ہے، اس کے برخلاف حضرت بلالؓ کی حدیث خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے کے سلسلہ کی کہ جس دن مکہ فتح ہوا اس دن رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز نہیں پڑھی، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ سے بروایت صحیح ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے، تو دونوں کو اس طرح جمع کر کے کہا جائے گا کہ ابن عمرؓ نے نماز پڑھتے ہوا دیکھ لیا تھا، جبکہ کسی وجہ سے حضرت بلالؓ نہیں دیکھ سکے تھے، اس کے برخلاف رفع یدین کا مسئلہ ہے کہ جب حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ تحریمہ کے سوا پھر ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔

اس جگہ یہ بات طے شدہ ہے کہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتی ہیں ان دونوں روایتوں میں تطبیق دینے کی صرف یہ صورت ہو سکتی ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ کے پرانے عمل کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں آخری دنوں کے عمل کا ذکر کیا گیا ہے، کیونکہ جس طرح ہر جھکنے اور اٹھنے کی حالت میں رفع یدین کا عمل متروک ہوا ہے پھر دو سجدوں کے درمیان کا متروک ہوا اسی طرح رکوع اور قومہ میں بھی ترک کر دیا گیا ہے، کیونکہ عام صحابہ کرام کا بالخصوص حضرت ابو بکر و عمرؓ و علیؓ و ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں سے اس کا ترک کرنا ثابت ہو چکا ہے، بلکہ ابن الزبیرؓ نے جو رفع یدین میں آہستہ

سے اشارہ کیا تو عام طور سے انکار کیا گیا اور ابو ہریرہؓ نے خود اسے متروک العمل ہونا فرمایا ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ علیہ کا آخری عمل ترک رفع یدین ہے، اور اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ اس کے برعکس کہنے سے کہ پہلے ترک رفع کا عمل تھا اور آخر میں رفع ہونے لگا دونوں روایتوں میں توفیق نہیں ہو سکتی ہے، اور یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ جن حضرات صحابہ کرامؓ سے رفع یدین کو ثابت کیا گیا ہے راوی نے ان کے اس وقت کے عمل کو بیان کیا ہے جبکہ رفع یدین پر عمل باقی تھا ترک نہ ہوا تھا، اور آثار سے یہ بات بھی محقق ہو گئی کہ بعض بعض صحابہ کرام کا رفع یدین پر عمل باقی بھی تھا، گویا ان کے نزدیک یہ فعل اگرچہ سنت کے اس معنی میں کہ اس پر عمل ہمیشہ ہوتا رہا ہو، نہیں تھا، مگر وہ لوگ بطور ادب یا مستحب اس پر عمل کرتے تھے، کیونکہ وہ اس ترک کو نسخ کے معنی میں نہیں لیتے تھے۔

اور میں مترجم کہتا ہوں یہ بھی احادیث میں توفیق دینے کی ایک صورت ہے، اگرچہ عام طریقہ سے رفع یدین کو چھوڑ دینے سے اسی بات کی تائید ہوتی ہے کہ جمہور صحابہ اور تابعین کی موافقت ہی زیادہ بہتر صورت ہے، یہاںتک کہ ابن عباسؓ نے رفع یدین کو صرف چند مواقع کے لئے شمار کیا ہے، چنانچہ امام بخاریؒ نے رفع یدین نامی اپنے رسالہ میں تعلیقاً ذکر کیا ہے کہ وکیعؒ نے ابن ابی لیلیٰ عن الحکم عن مقسم عن ابن عباس روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ صرف ان سات مواقع میں ہاتھ اٹھایا کرتے تھے: ا۔ نماز شروع کرتے وقت، نمبر ۲۔ استقبال کعبہ کے وقت، نمبر ۳۔ صفا و مروہ پر، نمبر ۴۔ عرفات میں، نمبر ۵۔ مزدلفہ میں جمع ہونے کے وقت، نمبر ۶۔ عیدین میں، نمبر ۷۔ اور دونوں جمروں میں، اس حدیث کو طبرانی نے بھی روایت کیا ہے، اور بزارؒ نے نافع عن ابن عمر عن النبی علیہ روایت کی ہے، پس یہ روایت خواہ مرفوع ثابت ہو یا موقوف ثابت ہو یقیناً اس بات کی دلیل ہے کہ صحابہ کرامؓ میں ہاتھوں کا اٹھانا محدود و معدود تھا، اور اس بات کی بھی دلیل ہے کہ نماز کی رفع یدین کو ذکر کر کے صرف تکبیر تحریمہ کو ذکر کیا اور رکوع و قومہ کے رفع یدین کو ذکر نہ کیا جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان مواقع میں ان کے درمیان متروک ہو چکا تھا، اور کسی ایک کو ذکر کر کے بقیہ کو ذکر نہ کرنے کے کیا معنی ہیں، پھر یہ معلوم ہونا چاہئے کہ امام مالکؒ سے رفع کی روایتیں پائی جانے کے باوجود صحیح روایت میں ان سے ترک رفع یدین ثابت ہے، اور یہی قول سفیان ثوریؒ کا ہے، اور صحابہ اور تابعینؒ میں سے ترمذیؒ کے ظاہری قول کے مطابق جمہور اسی قول پر ہیں، اور نظر تحقیق میں بھی یہی قول اقویٰ ہے، جیسا کہ میں تحقیق کے ساتھ مختصراً بیان کر دیا ہے۔ **وللہ الحمد**۔ موجودہ زمانہ میں اکثر حضرات حنفیہ کے اجتہاد کی تقلید کرتے ہیں اور کچھ لوگ اہل حدیث کے اجتہاد کے مقلد ہیں، مگر صد افسوس کے یہ سب ایک دوسرے سے عداوت رکھتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کو کافر اور فاسق بھی کہتے ہیں مگر یہ بات سخت تعجب کی ہے کیونکہ اصل ایمان واعتقاد ہے اور یہ باتیں تو اعمال کی فروع میں سے جو اضافہ ثواب کے واسطے ہوتی ہیں، جن میں کسی جانب بھی قطعی دلیل اور قطعیت نہیں ہوتی ہے، (کہ صرف اپنا ہی مسلک صحیح اور دوسروں کا بالکل غلط ہے) اعمال میں اختلاف تو صحابہ کرامؓ میں بھی موجود تھا، اس کے باوجود سب ایک دوسرے کے بھائی بھائی تھے، بلکہ اس بھی زیادہ ان کے دل متفق تھے، اور مومنوں کی شان بھی یہی ہے اور یہی ہونی چاہئے، اور اگر دونوں فریقوں میں ایمان ہے تو ان میں محبت وایمان جو ایمان کی پہچان ہے وہ بھی ہونی چاہئے جیسے ہمارے اسلاف میں رفع یدین کرنے والے اور نہ کرنے والے دونوں ایک ہی قلب پر متحد تھے، علمائے اہل سنت تو معتزلہ کو بھی کافر نہیں کہتے جو صحیح حدیثوں کا انکار کرتے ہیں اور قرآن کو مخلوق کہتے ہیں پھر تم کیوں اپنی نادانی سے اہل سنت کی تکفیر کو جائز سمجھتے ہو، اللہ ہمیں اور تمہیں سب کو اچھی سمجھ کی توفیق دے **وھو العزیز الحکیم**، یہاںتک نماز کی دو رکعتیں مکمل ہو گئیں۔

واذا رفع راسه من السجدة الثانية في الركعة افترش رجاله اليسرى فجلس عليها ونصب اليمنى نصبا ووجه اصابعه نحو القبلة هكذا وصفت عائشةؓ قعود رسول الله عليه في الصلوة ووضع يديه على فخذيه وبسط اصابعه وتشهد ويروى ذلك في حديث وائلؓ ولان فيه توجيه اصابع يديه الى القبلة.

ترجمہ:- اور جب نمازی دوسرے رکعت کے دوسرے سجدہ سے سر اٹھائے تو بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھ جائے اور دائیں پاؤں کو سیدھا کھڑا رکھے اور اپنی انگلیوں کو قبلہ کی جانب متوجہ کردے، کیونکہ ام المؤمنین عائشہؓ نے رسول اللہ ﷺ کا نماز میں اسی طرح بیٹھنا بیان فرمایا ہے، اور اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر رکھے اور اپنی ہاتھوں کی انگلیوں کو بچھادے، اور تشہد پڑھے، اور بیٹھنے کا یہ طریقہ حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث میں بیان کیا گیا ہے اور اس وجہ سے بھی کہ اس طرح رکھنے میں ہاتھوں کی انگلیوں کا قبلہ رخ متوجہ کرنا حاصل ہوتا ہے۔

توضیح:- قعدہ کی کیفیت، تشہد میں انگلی اٹھانا

واذا رفع راسه من السجدة الثانية في الركعة افترش رجله اليسرى فجلس عليها......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ صحیح مسلم میں حضرت ام المؤمنینؓ کی حدیث سے صرف بایاں پاؤں بچھانا اور دایاں پاؤں کھڑا کرنا تو ثابت ہے، لیکن قبلہ کی جانب انگلیوں کو متوجہ کرنا تو نسائی میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہا کہ نماز کی سنت میں سے ہے کہ دایاں پاؤں کھڑا کرے اور انگلیاں قبلہ کی طرف متوجہ کرے اور بائیں پاؤں پر بیٹھے۔ف۔ ترمذیؒ نے کہا ہے کہ بایاں پاؤں بچھا کر اس پر بیٹھنا اور دایاں کھڑا کرنا اسی پر اکثر اہل علم ہے۔ع۔

ووضع يديه على فخذيه وبسط اصابعه وتشهد......الخ

اور اپنے دونوں ہاتھوں کو دونوں رانوں پر یعنی داہنے کو داہنی ران پر اور بائیں کو بائیں ران پر تقسیم کرکے رکھے اور اپنے ہاتھوں کو انگلیوں بچھادے۔ف۔ یعنی جس حال پر ہوں اسی پر چھوڑدے، اور انہیں ایک دوسرے سے نہ ملائے۔ع۔ اور ہاتھوں سے گھٹنے نہ پکڑے یہی اصح قول ہے۔ الخلاصہ۔ھ۔ وتشهد الخ اور تشہد یعنی التحیات پڑھے۔ف۔ یعنی وجوبا قول اصح کے مطابق۔م۔

ويروى ذلك في حديث وائلؓ ولان فيه توجيه اصابع يديه الى القبلة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ جہانتک ہر عضو کو قبلہ رخ متوجہ کرنا ممکن ہو اولیٰ ہے۔م۔ لیکن یہ روایت غریب ہے اور ترمذی کے حدیث جو وائلؓ سے مروی ہے اس میں تو صرف اتنا ہے کہ جب تشہد میں بیٹھے تو بایاں پاؤں بچھا اور دایاں ہاتھ بائیں ران پر رکھا، اور دایاں پاؤں کھڑا کیا۔ف۔ اور وائلؓ کی حدیثوں میں انگلیوں کا ذکر نہیں بلکہ صحیح مسلم میں ابن عمرؓ سے ہے، لیکن اس میں انگلیوں کے پھیلانے کا نہیں بلکہ مٹھی باندھنے کا ذکر ہے۔ع۔ چنانچہ مذکور ہے کہ جب حضرت رسول اللہ ﷺ نماز میں بیٹھتے تو دائیں ہتھیلی کو دائیں ران پر رکھتے اور سب انگلیاں بند کرلیتے اور انگوٹھے سے متصل (تشہد کی) انگلی سے اشارہ کرتے اور بائیں ہتھیلی کو بائیں ران پر رکھتے۔

واضح ہو کہ ہتھیلی کو ران پر رکھنا انگلیوں کو قبض کرنے یعنی مٹھی باندھنے کے ساتھ ہونا ممکن نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے اس کی مراد یہی ہوسکتا ہے، واللہ اعلم، کہ پہلے انگلیوں کو کھلی رکھتے پھر اشارہ کے وقت مٹھی باندھ لیتے تھے، اور امام محمدؒ سے بھی اشارہ کی یہی کیفیت مروی ہے، کہ چھنگلیا اور اس کے پاس والی انگلی کو باندھ لو اور بیچ کی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر حلقہ کرلو اور کلمہ کی انگلی اٹھا کر اشارہ کرو، اور امام ابو یوسفؒ سے امالی میں یہی مذکور ہے، اور امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے بھی یہی نقل کیا ہے، اور حلوائیؒ نے کہا ہے کہ لا الہ پر انگلی کھڑی کرے اور الا اللہ کے وقت گرادے، تاکہ اٹھانا انکار کے لئے اور رکھنا اقرار کے لئے ہو، انگلیوں کے کناروں کو گھٹنوں کے کناروں کے اوپر رکھنا چاہئے، اس سے دور نہ ہوں۔

یہ تفصیل اس بناء پر ہے کہ اشارہ کرنے کو صحیح کہا گیا ہے، لیکن کئی مشائخ وہ بھی ہیں جنہوں نے اشارہ کرنے سے منع کیا ہے، لیکن ایسا کہنا نقل و عقل دونوں کے خلاف ہے، الفتح، ذخیرہ میں ہے کہ ظاہر الروایۃ یہی ہے، اور منیہ اور واقعات میں اسی پر فتویٰ

ہے۔ع۔ در مختار میں اسی کو عامہ فتاویٰ کی طرف نسبت کر کے کہا کہ معتمد وہ ہے جسے شارحین نے صحیح کہا بالخصوص متاخرین نے جیسا کہ شیخ ابن الہمام اور حلبی ہیں، اور ہندیہ میں ہے کہ مختار یہ ہے کہ اشارہ کرلے۔ الخلاصہ۔ اور اسی پر فتویٰ ہے، المضمرات عن الکبریٰ۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ سے اشارہ کرنے کے ثبوت میں بہت سی حدیثیں ہیں مثلاً ابن عمر و وائل بن حجر اور ابو حمید ساعدی ان کے علاوہ بھی بہت سی احادیث اور آثار ہیں، اس کی برخلاف اشارہ نہ کرنا مجھے کسی روایت سے معلوم نہ ہو سکا، اور عینیؒ اور ابن الہمامؒ نے تینوں اماموں سے اشارہ کرنے کی روایت ذکر کی ہے، اور خود امام محمدؒ کے مؤطا میں بھی موجود ہے، لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ اشارہ کرنا سنت ہے، اور ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ امام ابو حنیفہؒ سے بھی اس کے برخلاف یہ منقول ہو تا کہ اشارہ نہ کرے مگر رسول اللہ ﷺ سے اشارہ کرنے کا ثبوت مل جاتا تو اسی کو مقدم سمجھتے ہوئے اس پر عمل کرنا اور ابو حنیفہؒ کے قول کو چھوڑنا لازم ہوتا، علمائے متقدمین و متاخرین سب کا یہی طرز عمل رہا ہے، ان کے رسالہ میں سے مختصر ذکر کیا گیا ہے۔

پھر اشارہ کرنے کی کیفیت دو طرح کی منقول ہے، نمبر ا۔ ساری انگلیوں سے مٹھی باندھ کر صرف کلمہ کی انگلی سے خواہ انگوٹھے کو بھی داب کر یا چھوڑ کر جیسا کہ ابن عمر و ابن الزبیرؓ کی حدیث میں ہے، نمبر ۲۔ اس طرح جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ بیچ و انگوٹھے کو ملا کر حلقہ باندھ کر اور چھوٹی دونوں کو بند کر کے ہو، عینیؒ نے کہا ہے ہر طرح جائز ہے۔ انتہی۔ اور اس کے سوا وہ صورت جو در مختار میں نقل کی گئی ہے کہ سب انگلیاں کھلی رہیں اور کلمہ کی انگلی اٹھا کر اشارہ کیا جائے، تو شامیؒ نے جمہور کے طریقہ کے خلاف قرار دیا ہے، اگرچہ عوام میں یہی صورت رائج ہے، عینیؒ میں ہے کہ دونوں ہاتھوں کی دونوں انگلیوں سے اشارہ کرنا مکروہ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے احد احد، ایک ایک اور انگلی کو اٹھانے کے ساتھ سے حرکت بھی دینا مستحب ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ حدیث میں موجود ہے، اس بناء پر یہ جو کہا گیا ہے کہ انکار کے وقت انگلی کو اٹھائے اور اقرار کے وقت جھکادے صراحۃ حدیث میں موجود نہیں ہے۔م۔

وان کانت امرأة جلست علی التیها الیسری واخرجت رجلیها من الجانب الایمن، لانه أستر لها، و التشهد التحیات لله والصلوات والطیبات السلام علیك ایها النبی الی آخره، وهذا تشهد عبد الله بن مسعود فانه قال اخذ رسول الله ﷺ بیدی و علمنی التشهد کما کان یعلمنی سورة من القرآن، وقال قل التحیات لله الی اخره.

ترجمہ:-اور اگر نمازی عورت ہو تو وہ اپنے بائیں سرین پر بیٹھے گی اور اپنے دونوں پاؤں کو دائیں جانب سے نکالے گی، کیونکہ اس صورت میں عورت کے لئے زیادہ پردہ پوشی ہوتی ہے، اور جس تشہد کے پڑھنے کا اس قعدہ میں حکم ہے وہ ہے جو التحیات سے رسولہ تک (متن میں مذکور) ہے (اور ترجمہ توضیح کے ضمن میں آئے گا) اور یہ تشہد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا ہے، کیونکہ انہوں نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار میرا ہاتھ پکڑا، اور یہ تشہد مجھے سکھایا اسی طرح جس طرح وہ مجھے قرآن پاک سکھایا کرتے تھے، اور فرمایا تم کہو التحیات للہ آخر تک۔

توضیح:- قعدہ میں عورت کے بیٹھنے کا طریقہ، کلمات تشہد

وان کانت امرأة جلست علی التیها الیسری واخرجت رجلیها من الجانب الایمن......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ اور امام مالکؒ کے نزدیک مرد بھی دونوں قاعدوں میں عورتوں کی طرح تورک کرے گا اور امام شافعیؒ کے نزدیک اگرچہ صرف درمیانی قعدہ میں تورک کا قول منقول ہے لیکن شاید ایسے وقت میں کہ لوگوں کے پاس

کپڑوں کی کمی سے پردہ اور ستر پوشی کی ضرورت سے یہ حکم تھا، اسی لئے اکثر علماء سلف کا ہمارے مذہب کے مطابق اسی حدیث پر عمل ہے۔ م۔ ابن بطالؒ نے ذکر کیا ہے کہ ام الدرداءؓ مردوں کی طرح بیٹھتی تھیں، حالانکہ وہ فقیہ تھیں، اور حضرت صفیہؓ اور حضرت عمرؓ کی بیویاں زیادہ پردہ پوشی کے خیال سے چاروں زانوں ہو کر بیٹھتی تھی، اور باندی مردوں کی طرح ہاتھ اٹھائے گی، لیکن رکوع، سجود اور قعدہ میں آزاد عورت کی طرح کام کرے گی۔ مع۔ تشہد کے لئے کوئی لفظ متعین اور واجب نہیں ہے۔ المجمع۔ مگر جتنی التحیات منقول ہے اس سے زیادہ اپنی طرف سے نہ کرے، محیط السرخسی، کیونکہ نماز کی دعائیں اور اذکار محدود و متعین ہیں۔ ش۔

التشهد التحيات لله والصلوات والطيبات السلام عليك ايها النبی الی آخره......الخ

اور تشہد جس کے پڑھنے کا اس قعدہ میں حکم ہے یہ ہے التحیات سے ورسولہ تک۔ ف۔ قول اصح کے مطابق قعدہ اولیٰ میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ م۔ اس کا ترجمہ اور توضیح یہ ہے **التحيات لله** تمام کی تمام عبادتیں جو زبان سے کہنے کی ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے واسطے ہیں کوئی دوسرا ان کا مستحق نہیں ہے **والصلوات** اور وہ تمام عبادتیں جن کا تعلق بدن سے ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کے واسطے ہیں کوئی ان کے لائق نہیں ہے، **والطيبات** اور وہ تمام عبادتیں جن کا تعلق مال خرچ کرنے سے ہے اللہ تعالیٰ کے واسطے میں کوئی دوسرا ان کے سزاوار نہیں ہے **السلام عليك ايها النبی ورحمة الله وبركاته**، السلام تجھ پر اے نبی محمد ﷺ واللہ تعالیٰ کی رحمت واس کی برکتیں۔

ف۔ مروی ہے کہ جب معراج میں رسول اللہ ﷺ نے **التحيات لله والصلوات والطيبات** حضور الٰہی میں پیش کی تو جواب میں یہ تحفہ عطاء ہوا **السلام عليك ايها النبی ورحمة الله وبركاته** تو رسول اللہ ﷺ نے عرض کیا **السلام علينا وعلى عباد الله الصالحين**، یہ سلام ہم پر یعنی مع امت مرحومہ کے ہم سب پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نیک بندوں پر، روایت میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے کہا تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا **اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً عبده و رسوله**، میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی الٰہ نہیں ہے مگر اللہ اور گواہی دیتا ہوں کہ بیشک محمد اس کے بندہ اور رسول ہیں۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ عینیؒ نے مذکورہ باتیں زین الائمہ فرودی کے ثواب عبادات سے نقل کی ہیں مگر مجھے یہ بات یاد نہیں آتی ہے کہ میں نے معراج کے سلسلہ کی احادیث میں یہ باتیں پائی ہوں، حالانکہ بندہ مترجم نے اردو تفسیر میں امام حماد وغیرہ سے سبحان الذی کی تفسیر میں تقریباً بڑے تین اجزاء کا بالتفصیل مطالعہ کیا ہے، واللہ اعلم، بہر صورت روایت کچھ بھی ہو لیکن اب اس تشہد کے پڑھنے میں واجب ہے کہ تشہد کے الفاظ سے ان کے معانی پر اس طرح توجہ دی جائے کہ گویا وہ اللہ تعالیٰ کی التحیات پڑھتا ہے اور رسول اللہ ﷺ پر السلام علیک کہتا ہے اور اپنے اوپر اور تمام صالحین پر بھی یہ مخصوص السلام بھیجتا ہے، اور آخر میں کلمہ شہادت پر ختم کرے، اور ایسا نہیں کرنا چاہئے کہ ان الفاظ کو خبر کے طور پر ادا کرے، یہ بات مجتبیٰ وغیرہ میں مذکور ہے، اور تنویر میں تو اس کی تصریح ہے۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ رسول اللہ ﷺ بھی التحیات میں اسی طرح **السلام عليك ايها النبی الخ** ،اسی طرح **اشهد ان محمد عبده ورسوله**، بھی فرمایا کرتے، اور اس طرح نہیں فرماتے تھے کہ میں رسول اللہ ہوں، اسی بناء پر شیخ ابن حجرؒ اس کی تصریح کر دی ہے، البتہ صحیح بخاری کی حضرت سلمہ بن الاکوعؓ کی حدیث میں مذکور ہے کہ نماز کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں آپ ﷺ نے **اشهد ان لااله الا الله واشهد انی رسول الله** فرمایا ہے، جیسا کہ شامی وغیرہ میں ہے، اور واضح ہو کہ تمام نماز میں معانی کا خیال رکھنا واجب ہے، بالخصوص فرض قراءت قرآن میں سے الحمد کا، اس کے لئے کوئی عذر نہ ہوگا، ہاں اگر سیکھنے کی کوشش کے باوجود قدرت نہ ہو تو مجبوری ہے اس بحث میں قراءت کے مسئلہ میں انشاء اللہ مزید تفصیلی گفتگو کریں گے۔

الحاصل۔ تشہد کے الفاظ رسول اللہ ﷺ سے کئی طرح سے سند صحیح منقول ہوئے ہیں، ان تمام میں ہمارے نزدیک بہتر کلمات وہی

ہیں جو ذکر کئے گئے ہیں وہی پڑھے جائیں، امام ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اسی پر علماء صحابہ و تابعین میں سے اکثر کا عمل ہے۔م۔ جملہ محدثین کا بھی اسی پر عمل ہے۔ع۔

وهذا تشهد عبد الله بن مسعود فانه قال اخذ رسول الله ﷺ بيدى و علمنى التشهد......الخ

اور یہ عبداللہ بن مسعودؓ کا تشہد ہے۔ف۔ حدیث کی روایت میں یہ تشہد حضرت ابن مسعودؓ کی اسناد سے مذکور ہے، اسی لئے یہ ابن مسعودؓ کے نام سے مشہور ہوا ہے، حالانکہ اس پر تو اکثر صحابہ کرامؓ کا عمل تھا،م۔فانه قال الخ چنانچہ ابن مسعودؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑا، وعلمنى الخ اور آپ ﷺ نے مجھے تشہد کی تعلیم اسی طرح دی جس طرح مجھے قرآن پاک کی تعلیم دیتے تھے۔ف۔ یعنی بغیر کمی وبیشی کے ایک ایک حرف کی تصحیح کے ساتھ۔وقال قل الخ، اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہو۔ف۔ صحیح مسلم میں ہے کہ پھر فرمایا کہ تم میں سے کوئی جب نماز کے اندر قعدہ کرے تو وہ کہے۔فع۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ جب تم ہر رکعت پر بیٹھو تو کہو۔ف۔التحیات للہ الی اخرہ،التحیات للہ آخر تک۔ف۔ یعنی عبده ورسوله تک اسی طرح جس طرح ذکر کیا جاچکا ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد علمائے تابعین کہتے ہیں کہ ابن مسعودؓ ہم سے ہر حرف کی تصحیح کے بغیر ہم سے (راضی نہیں ہوتے اور) قبول نہیں کرتے تھے، اور اسی حدیث میں ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ یہانتک پہونچے **السلام علينا وعلى عبادالله الصالحين** تو فرمایا کہ اس کو کہتے ہی اللہ تعالی کے ہر نیک بندہ کو جو آسمان میں ہے یا زمین میں ہے سب کو سلام پہونچ گیا، اور تشہد کے ختم کے بعد فرمایا کہ پھر تم سے ہر شخص کوئی ایسی دعاء مانگے جو اسے پسند ہو پس اس سے دعا کرلے، جیسا کہ جامع ترمذی اور سنن نسائی میں ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ تشہد پڑھنے میں ان ہی الفاظ کو کہے البتہ دعاء میں اختیار ہے، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے درود کی دعا کرے اور اس سے کچھ زیادہ کر کے عذاب سے پناہ مانگے، اور جنت مانگے، اور اسی بات پر عام علماء وفقہاء کا اب بھی عمل ہے۔م۔

والأخذ بهذا اولى من الاخذ بتشهد ابن عباسؓ وهو قوله: التحيات المباركات الصلوات الطيبات لله سلام عليك ايها النبى ورحمة الله وبركاته سلام علينا الى اخره، لان فيه الامر واقله الاستحباب، والالف واللام وهما للاستغراق، و زيادة الواو، وهى لتجديد الكلام كما فى القسم وتاكيد التعليم.

ترجمہ:-اور اسی تشہد کو پڑھنا زیادہ بہتر ہے تشہد ابن عباسؓ پڑھنے کے مقابلہ میں، جس کے الفاظ یوں ہیں (جو متن میں مذکور ہے) اور اولی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے میں لفظ قل موجود ہے کہو جو امر کا صیغہ ہے جس کا مطلب کم سے کم استحباب ہوتا ہے، نمبر ۲۔ اور اس میں الف ولام کے حروف بھی ہیں جو استغراق کے لئے ہیں، نمبر ۳۔ اور واو بھی موجود ہے جو دوسرے میں نہیں ہے جو نئے کلام کے لئے آتا ہے جیسے قسم ہے، نمبر ۴۔ اور اس میں تشہد کی تعلیم موجود ہے۔

توضیح:-تشہد ابن مسعودؓ وتشہد ابن عباسؓ کا فرق

والأخذ بهذا اولى من الاخذ بتشهد ابن عباسؓ ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ اور اولی کہنے سے معلوم ہوا کہ تشہد ابن عباسؓ کو کہنا بھی جائز ہے، یہی قول صحیح ہے، اس میں بحر الرائق کی یہ بحث کہ پہلا تشہد ہی واجب ہے اس کو کوئی وزن نہیں ہے، کیونکہ کسی بھی تشہد کا پڑھنا واجب ہے، جیسا کہ دعاء قنوت کا پڑھنا تو واجب ہے مگر خاص کر اللهم انا نستعينك الخ کی کوئی خصوصیت نہیں ہے، امام اعظمؒ کے قول کے مطابق جیسا کہ شامیؒ نے صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے، تشہد کے الفاظ مختلف اور متعدد ہیں مثلاً تشہد حضرت عمرؓ وابو موسی اشعریؓ وجابر بن عبد اللہؓ وغیرہم، چنانچہ عینیؒ نے نو طریقوں سے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے، ان میں سے ایک یہ تشہد ابن

عباسؓ بھی ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں التحیات المبارکات الصلوات الطیبات للہ سلام علیك ایھا النبی و رحمة اللہ وبرکاته سلام علینا، اس کے بعد بھی عبده ورسوله تک۔

ف۔ اس تشہدؓ کو ترمذی و نسائی نے سلام کے لفظ سے روایت کیا ہے، اس میں ایک تو نمبر ا۔ التحیات کے بعد مبارکات صلوات طیبات سب ایک ہی صفت کے طور پر بغیر واو کے ہیں، نمبر ۲۔ سلام الف ولام کے بغیر ہے، اسی واسطے عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ تشہد صحیح مسلم میں نہیں ہے، کیونکہ صحیح مسلم میں دونوں جگہ السلام الف لام کے ساتھ ہے، ان ہی وجہوں سے مصنفؒ نے کہا ہے کہ ابن مسعودؓ کے تشہد کو اختیار کرنا اولیٰ ہے، لان فیه الخ کیونکہ اس کے پڑھنے کو صیغہ امر سے کہا گیا ہے۔ ف۔ یعنی قل تم کہو، یا فلیقل ہر شخص کہے، یا قولو تم سب کہو، جیسا کہ اوپر کی روایات میں گذرا کہ وہ امر کے صیغہ سے امر ہیں۔

واقله الاستحباب ......الخ

اور امر کے صیغہ میں کم سے کم استحباب کا مرتبہ ہوتا ہے۔

ف۔ یعنی عموماً صیغہ امر سے وجوب ثابت ہوتا ہے اور اگر وجوب نہ ہو تو یہاں کم از کم مستحب کا درجہ ضرور ثابت ہوگا، اور ابن عباسؓ کی روایت میں یہ حکم نہیں ہے، اس لئے جس حکم میں ہے اسی کو قبول کرنا زیادہ بہتر ہوگا، اور اب اس کے ترجیح کی دوسری وجہ یہ ہے۔

والالف واللام وهما للاستغراق، و زيادة الواو وهي لتجديد الكلام كما في القسم و......الخ

کہ اس پہلی روایت میں الف ولام ہے اور یہ دونوں استغراق (یعنی تمام افراد کو اپنے اندر داخل کر لینے) کے لئے ہیں۔ ف۔ معنی یہ ہیں کہ تمام سلام ہر وجہ سے، اور تشہد ابن سلام میں جو سلام ہے وہ نکرہ ہے اس میں ایک سلام بھی شامل ہو سکتا ہے۔ وزیادۃ الواو الخ اور تیسری وجہ یہ ہے کہ اس تشہد ابن مسعودؓ میں واو کی زیادتی ہے اور وہ نئے کلام کے لئے آتا ہے جیسے قسم میں۔

ف۔ التحیات للہ کے بعد جب والصلوات کہا گیا تو واو سے پھر نیا کلام شروع ہو گیا اس طرح کئی تحیات وصلوات اور طیبات ہوئیں اس کے برخلاف جب بلا واو ہو سب صفتیں ہو گئیں اور موصوف صفت مل کر ایک ہی رہ گیا جیسے کسی نے قسم میں کہا واللہ الرحمٰن الرحیم میں نماز پڑھوں گا تو یہ ایک ہی قسم ہوگی (یعنی ایسے اللہ کی قسم جو رحمٰن ورحیم ہے) اور اگر یوں کہا واللہ والرحمن والرحیم میں نماز پڑھوں گا تو یہ تین قسم ہوئیں (یعنی قسم ہے اللہ کی قسم ہے رحمٰن کی قسم ہے رحیم کی) اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر نماز نہیں پڑھی تو تین کفارے ادا کرنے واجب ہوں گے، اس سے معلوم ہوا کہ تشہد ابن مسعودؓ میں التحیات کی بہت زیادتی ہے۔ ع۔م۔

وهي لتجديد الكلام كما في القسم وتاكيد التعليم......الخ

اور چوتھی وجہ اس تشہد میں تعلیم کی تاکید موجود ہے۔ ف تعلیم کرنا تو ابن مسعودؓ وابن عباسؓ دونوں کو ہی ہے کیونکہ تشہد ابن عباسؓ میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو تشہد کی بھی اسی طرح تعلیم دیتے تھے جیسے قرآن کی صورت کی تعلیم کرتے تھے، اس طرح نفس تعلیم میں تو دونوں روایتیں برابر ہوئیں، مگر ابن مسعودؓ کے تشہد میں یہ طریقہ تاکید کے ساتھ ہے اس طرح سے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن مسعودؓ کا ہاتھ پکڑا چنانچہ صحیح مسلم کی روایت میں ہے کہ مجھے تشہد کی تعلیم اس صورت سے فرمائی کہ میری ہتھیلی آپ کی دونوں مبارک ہتھیلیوں کے درمیان تھی، اور معلوم ہونا چاہئے کہ ابن مسعودؓ نے تعلیم دیتے وقت بھی یہی صورت تبرکاً باقی رکھی تھی چنانچہ اپنی شاگرد علقمہؒ کو اسی طرح ہاتھ پکڑ کر سکھلایا، اور علقمہؒ نے بھی اپنے شاگرد ابراہیم نخعیؒ کو اور ابراہیم نخعیؒ نے بھی اپنے شاگرد حماد بن ابی سلیمان کو اور حمادؒ نے بھی اپنے شاگرد ابو حنیفہؒ کو اس طرح ہاتھ پکڑ کر تشہد کی تعلیم دی۔

الحاصل اس میں زیادہ تاکید ہے، عینیؒ نے تو تشہد ابن مسعودؓ کے دس سے زیادہ ترجیح کی وجہیں بیان کی ہیں، اور ابن الہمامؒ نے

کہاہے ترجیح کی مزید وجہوں میں سے ایک یہ بھی ہے صحاح ستہ کے تمام اماموں نے اس تشہد کی روایت میں لفظاً و معنیً اتفاق کیا ہے، اور یہ صورت بہت ہی کمیاب ہے، اور ابن عباسؓ کا تشہد امام مسلمؒ کے افراد میں شمار کیا گیا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ ابھی معلوم ہو چکاہے کہ صحیح مسلم میں السلام کالفظ موجود ہے۔ م۔

پھر اگرچہ بخاری کے علاوہ دوسروں نے تشہد ابن عباسؓ کی روایت کی ہو لیکن اعلیٰ درجہ کی حدیث تو وہ ہوتی ہے جس میں امام بخاریؒ و مسلمؒ دونوں ہی متفق ہوں اگرچہ الفاظ میں اتفاق نہ ہو مگر معنی میں اتفاق ہو، اس بناء پر اس روایت کا درجہ کتنا اعلیٰ ہو گیا کہ اس کے الفاظ میں بھی اتفاق نہ ہو بلکہ دوسرے ائمہ بھی متفق ہیں، اور علماء نے اجماع کیا ہے کہ اس باب میں یہ حدیث سب سے زیادہ صحیح ہے، بلکہ دوسرے ائمہ نے اس کی تصریح کر دی ہے، اور کہاہے کہ اسی پر اکثر صحابہ و تابعین کا عمل ہے، اور خطابیؒ اور ابن المنذرؒ کا بھی یہی قول ہے، اور اسی تشہد ابن مسعودؓ کے مثل معاویہؓ نے ممبر پر تعلیم دی ہے، یہ روایت طبرانی کی ہے، اور حضرت عائشہؓ نے اسی تشہد کو رسول اللہ ﷺ کا تشہد کہا ہے، جیسا کہ بیہقیؒ نے روایت کی ہے، اور نوویؒ نے روضہ میں کہاہے کہ اس کی اسناد جید ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اسی تشہد کو رسول اللہ ﷺ بھی پڑھا کرتے تھے، اور عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے تشہد اس طرح سکھلایا ہے جس طرح قرآن کی کوئی سورت سکھلاتے تھے، اور آپ ہم سے واو اور الف ولام کے کہنے پر اصرار کرتے نہ کہنے پر مواخذہ کرتے، تاکہ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ سے پوری موافقت رہے، اور عبدالرحمٰن بن یزید نے کہاہے کہ ہم لوگ تشہد کو ابن مسعودؓ سے اس طرح حفظ کرتے تھے جیسے قرآن کے حروف حفظ کرتے تھے، اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس تشہد کے الفاظ کے یاد کرنے کا اعلیٰ درجہ کا اہتمام تھا جس کی دوسری مثال نہیں پائی جاتی ہے۔ مع۔

ولا یزید علی ھذا فی القعدة الاولی لقول ابن مسعودؓ علمنی رسول اللہ ﷺ التشھد فی وسط الصلوة واخرھا فاذا کان وسط الصلوة نھض اذا فرغ من التشھد واذا کان اخر الصلوة دعا لنفسه بما شاء.

ترجمہ:- اور پہلے قعدہ میں اس سے زیادہ نہ بڑھائے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کے اس کہنے کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے درمیان نماز اور آخر نماز میں تشہد پڑھنا بتایا ہے، پھر جب نماز کے درمیان ہوتی تو تشہد سے فارغ ہوتے ہی اٹھ کھڑے ہوتے، اور جب آخر نماز ہوتی تو اپنے واسطے جو چاہتے دعا کرتے۔

توضیح:- قعدہ اولیٰ میں تشہد سے کچھ بھی زیادہ نہیں پڑھنا چاہئے

ولا یزید علی ھذا فی القعدة الاولی لقول ابن مسعودؓ علمنی رسول اللہ ﷺ التشھد......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف اور یہ حکم بالاتفاق فرض نمازوں کے لئے ہے، د، **لقول ابن مسعودؓ الخ** ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔

واذا کان اخر الصلوة دعا لنفسه بما شاء......الخ

ف۔ امام احمدؒ نے اپنی مسند میں ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ابن مسعودؓ کو تشہد سکھلایا تو ابن مسعودؓ اسے پڑھا کرتے جب درمیان نماز میں بیٹھتے، اور آخر نماز میں بائیں کولھے پر اس طرح **التحیات للہ** سے **عبدہ ورسولہ** تک، کہا کہ اگر درمیان نماز ہوتی اُٹھ کھڑے ہوتے جیسے ہی تشہد سے فراغت ہوتی، اور اگر آخر نماز ہوتی تو تشہد کے بعد دعاء کرتے جس کے ساتھ اللہ چاہتا یعنی وہی دعاء کرتے جس میں مرضی مولی ہوتی۔ پھر سلام پھیر دیتے۔ ابن الہمامؒ نے آخر نماز میں تشہد کے بعد دعائیں صحیحین وغیرہ میں بہت سی مشہور ہیں۔ ف۔ اور صحیح بخاری و صحیح مسلم میں ابوہریرہؓ سے مروی ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی اخیر تشہد سے فارغ ہو تو وہ اللہ سے چار چیزوں سے پناہ مانگے، ۱- عذاب جہنم، ۲- عذاب قبر، ۳- فتنہ

زندگی و موت، ۴- فتنہ مسیح الدجال کے شر سے۔ ع۔

الحاصل یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ پہلے قعدہ میں نمازی تشہد کے سوا کچھ نہ پڑھے۔ یہی مذہب امام احمدؒ اور اسحاقؒ کا ہے۔ لیکن امام شافعیؒ نے کہاہے کہ **اللهم صل علی محمد** بھی زیادہ کرے۔ اس روایت کی وجہ سے جو حضرت ام سلمہؓ سے مروی ہے کہ ہر دو رکعت پر تشہد اور رسولوں اور ان کے تابعین نیک بندوں پر سلام بھی ہے۔ عینیؒ نے اس کے جواب میں کہا ہے کہ یہ فرائض کے علاوہ نوافل پر محمول ہے۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس روایت میں درود کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں تو تشہد یعنی **التحیات للہ والصلوات والطیبات** تک ہے۔ اور رسولوں پر سلام وہ **السلام علیک أیها النبی** سے رسول اللہ پر سلام ہوا۔ اور **السلام علینا** سے رسولوں، نیک متبعین پر اور **علی عباد اللہ الصالحین** سے تمام رسولوں پر ہو گیا۔ یہانتک کہ فرشتوں کے رسولوں اور ان کے تابعدار فرشتوں پر بھی ہو گیا۔ اب کوئی بتائے اس روایت سے مستقل درود کا ثبوت کہاں سے ہوا۔ اور اس سے زیادہ نہ کہنا تو ابن مسعودؓ سے معلوم ہو چکا ہے۔

الحاصل دونوں روایتیں موافق ہیں ان میں کوئی تعارض نہیں۔ م۔ ہمارے یعنی احناف کے نزدیک تشہد سے کچھ پڑھنے کی صورت میں اگر عمداً بڑھایا ہو تو مکروہ ہو گا اور اعادہ نماز واجب ہو گا۔ اور اگر سہواً بڑھایا ہے تو سجدہ سہو واجب ہوں گے خواہ یہ زیادتی درود کی ہو یا کسی اور چیز کی ہو کیونکہ اس کے پڑھنے سے فرض یعنی قیام میں تاخیر ہوئی ہے۔ ت۔ و۔ تشہد کے بعد کتنا زیادہ ہونے سے سجدہ واجب ہو گا تو جواب میں اختلاف ہے۔ در مختار میں ہے کہ مذہب میں مفتی بہ قول کے مطابق فقط **اللهم صل علی محمد** کہنے سے۔ اور شامی نے لکھا ہے کہ حلبی نے کہا ہے کہ اکثر کے نزدیک **اللهم صل علی محمد وعلی آل محمد** کہنے سے سجدہ لازم ہو گا، ورنہ نہیں، اور یہی قول اصح ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک جب اتنی تاخیر ہو جس میں کسی رکن کو ادا کرنا ممکن ہو، اور یہ قول امام اعظمؒ کے مطابق ہے۔ صاحبینؒ کے نزدیک جب تک **حمید مجید** تک درود نہ پڑھے سجدہ سہو واجب نہ ہو گا۔ ش۔ اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ رکن کی ادائیگی کی مقدار تین تسبیح ہے یا ایک تسبیح۔ م۔

مسئلہ: مقتدی اگر تشہد پڑھ کر امام سے پہلے فارغ ہو جائے تو بالاتفاق وہ خاموش رہے۔

مسئلہ: مسبوق جس کی کوئی رکعت چھوٹ گئی ہو وہ آہستہ آہستہ پڑھے تاکہ امام کے سلام کے وقت فارغ ہو۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ پورا پڑھ کر خاموش ہو جائے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کلمہ شہادت بار بار پڑھتا رہے۔ د۔ تمام اقوال کو صحیح کہا گیا ہے۔ ش۔ اگر اس درمیانی قعدہ و تشہد کے بعد اٹھے تو جلالی میں ہے کہ سجدہ سے اٹھنے کی طرح پنجوں کے بل اٹھے۔ اور طحاویؒ نے کہا ہے کہ زمین پر ہاتھ ٹیکنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ الزاہدی۔ میں کہتا ہوں کہ اس صورت میں ہاتھ ٹیک کر اٹھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ الزاہدی۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس صورت میں ہاتھ ٹیک کر اٹھنے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔ اور حدیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ م۔

ویقرأ فی الرکعتین الأخریین بفاتحة الکتاب وحدها لحدیث أبی قتادةؓ أن النبی ﷺ قرأ فی الأخریین بفاتحة الکتاب، وهذا بیان الأفضل هو الصحیح؛ لأن القراءة فرض فی الرکعتین علی ما یأتیك من بعد إن شاء اللہ، وجلس فی الأخیرة کما جلس فی الأولی لما روینا من حدیث وائل وعائشةؓ ولأنها أشق علی البدن، فکان أولی من التورك الذی یمیل إلیه مالكؒ، والذی یروی أنه علیه السلام قعد متورکا ضعفه الطحاوی، أو یحمل علی حالة الکبر، ویتشهد وهو واجب عندنا.

ترجمہ:- اور نمازی آخری دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے، حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ نبی کریم ﷺ نے آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھی۔ یہ بیان افضلیت کا ہے۔ یہی قول صحیح ہے۔ کیونکہ قرأت قرآن صرف (پہلی) دو رکعتوں میں فرض ہے۔ جیسا کہ انشاءاللہ عنقریب ———— اس کی بحث آئے گی۔ اور آخری قعدہ میں بھی اسی طرح بیٹھے جیسا کہ پہلے قعدہ میں بیٹھا ہے۔ اس روایت کی وجہ سے جو ہم نے حضرت وائلؓ اور حضرت عائشہؓ سے بیان کی ہے۔ اور اس

وجہ سے بھی کہ اس طرح بیٹھنا بدن کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لہٰذا اس بیٹھک سے بہتر ہے جو تورک کہلاتا ہے اور اس کی طرف امام مالکؒ مائل ہوئے ہیں۔ اور وہ جو ایک روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تورک کی حالت میں بیٹھے تھے۔ اسے امام طحاویؒ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ یا اسے بڑھاپے کی عمر اور حالت پر محمول کیا جائے گا، اور تشہد پڑھے اور اس کا پڑھنا ہمارے نزدیک واجب ہے۔

توضیح:- اخیر کی دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ، قعدہ اخیرہ کی کیفیت، حدیث سے دلیل تورک یعنی کولھے پر بیٹھ کر دونوں پیر داہنی طرف نکالنا، حدیث سے دلیل

ويقرأ في الركعتين الأخريين بفاتحة الكتاب وحدها ......الخ

اور اخیر کی دونوں رکعتوں میں اور مغرب کی آخری ایک رکعت میں صرف فاتحہ الکتاب یعنی سورہ الحمد پڑھے، لحدیث ابی قتادہ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے اخیر کی دو رکعتوں میں فاتحہ پڑھی۔ ف۔ حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر و عصر کی پہلی دو رکعتوں میں فاتحہ اور اس کے ساتھ سورہ پڑھا کرتے تھے، اور پچھلی دو رکعتوں میں فاتحہ پڑھتے گاہے گاہے ہمیں بھی کوئی آیت سنادیتے، اور رکعت کو جتنی طویل کرتے دوسری کو اتنی طویل نہیں کرتے، اسی طرح صبح کی نماز میں بھی کرتے، یہ روایت سوائے ترمذی کے بقیہ ائمہ ستہ نے بیان کی ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ آخری دو رکعتوں میں صرف سورہ فاتحہ پڑھے۔

وهذا بيان الأفضل هو الصحيح......الخ

یہ افضلیت کا بیان ہے، اور یہی صحیح ہے۔ ف۔ اور یہی ذخیرہ میں ہے، اور اسی پر اعتماد ہے، قاضی خان، یہی قول اصح ہے، المحیط، یہی صحیح اور ظاہر الروایۃ ہے، اور خاموش رہنا مکروہ ہے، الخلاصہ۔ ھ۔ حسنؒ کی وہ روایت جو امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے اس سے احتراز ہے، وہ قول یہ ہے کہ آخری رکعتوں میں سورہ فاتحہ کی قراءت واجب ہے، اس بناء پر اس کے ترک سے سجدہ سہو لازم ہوگا۔ فع۔ لیکن عینیؒ نے اسی قول کو صحیح کہا ہے کہ اخیرین میں فاتحہ کی قراءۃ واجب ہے۔ د۔ اس کی مزید بحث ان شاء اللہ قراءت کی بحث میں آئے گی۔ م۔ اور مذہب کے موافق، اخری رکعتوں میں خاموش رہنا مکروہ نہیں ہے۔ د۔

لأن القراءة فرض في الركعتين على ما يأتيك من بعد إن شاء الله......الخ

کیونکہ دو ہی رکعتوں میں قراءت کرنا فرض ہے، اس کی دلیل بھی ان شاء اللہ ذکر کی جائے گی۔ ف۔ اس کے بعد رکوع و سجود پرانے طریقے کے مطابق کرے، اور آخری دونوں رکعتیں پوری کرے۔ م۔

وجلس في الأخيرة كما جلس في الأولى لما روينا من حديث وائل وعائشةؓ ......الخ

اور قعدہ اخیرہ میں بھی قعدہ اولی کے مطابق بیٹھے۔ ف۔ ان میں سارے کام پہلی دو رکعتوں کی طرح کرے، انہی میں سے بیٹھنے کی حالت بھی ہے۔ لما روينا الخ حضرت وائل بن حجر اور حضرت عائشہؓ ان حدیثوں کی وجہ سے جن کی روایت ہم نے پہلے ہی کردی ہے۔ ف۔ چنانچہ اس جلسہ کے کچھ حالات کا بیان تو وائلؓ کی حدیث میں تھا اور حالات یعنی بائیں پاؤں کو بچھانا اور دائیں کو کھڑا کرنا حضرت عائشہؓ کی حدیث میں گذرا ہے، لہٰذا قعدہ اخیرہ میں بھی اس طرح بیٹھے، گذشتہ حدیث کی بناء پر۔ مع۔

ولأنها أشق على البدن، فكان أولى من التورك الذي يميل إليه مالكؒ......الخ

اور اس کی عقلی اس دلیل کی وجہ سے کہ یہ بیٹھک بدن کے لئے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ ف۔ جبکہ یہ بات احادیث سے ثابت ہے کہ جس عبادات میں بدن کو زیادہ تکلیف ہوتی ہو وہ افضل ہوا کرتی ہے۔ ع۔ فکان الخ پس تشدت کی یہ کیفیت تورک کی نشست سے بہتر ہوگی۔ ف۔ اگرچہ تورک کی کیفیت بھی یعنی کولھے پر بیٹھ کر دونوں پاؤں دائیں طرف نکالنا، جیسا کہ عورتیں بیٹھا کرتی ہیں۔ الذی یمیل الخ یہ وہی تورک ہے جس کی طرف امام مالکؒ میلان کرتے ہیں۔ ف۔ بلکہ امامؒ کا یہی مذہب ہے کہ قعدہ میں

مرد بھی اسی طرح بیٹھے کیونکہ یہ بیٹھک حدیث سے بھی ثابت ہے، اور امام شافعیؒ پہلے قعدہ میں ہم لوگوں کے مانند بیٹھنے کو فرماتے ہیں لیکن دوسرے قعدہ میں امام مالکؒ کی طرح تورک کو پسند کرتے ہیں مگر ہمارے نزدیک مختار وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے، اس کی دو وجہیں ہیں، نمبر ا۔ عورتوں سے فرق ہو گا جو شریعت میں پسندیدہ عمل ہے، اور نمبر ۲۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث بہت ہی قوی ہے۔

والذی یروی أنه علیه السلام قعد متورکا ضعّفه الطحاوی...... الخ

اور وہ حدیث جو تورک کے سلسلہ میں روایت کی جاتی ہے۔ف۔ اس سند کے ساتھ عبدالحمید بن جعفر عن محمد بن عمرو بن عطاء عن ابی حمید الساعدیؓ، یعنی ابی حمیدؓ نے رسول اللہ علیہ السلام کی نماز کی کیفیت پوری بیان کی اور آخر میں یہ کہا انه علیه السلام قعد متورکا، یعنی رسول اللہ علیہ السلام تورک کی حالت میں بیٹھے، ف تو اس روایت کا حل یہ ہے کہ ضعفه الطحاوی کہ اسے طحاویؒ نے ضعیف کہا ہے، ف، کئی وجہ سے اول یہ کہ عبدالحمید بن جعفر ضعیف راوی ہے، اور عبدالحقؒ نے احکام میں فرمایا ہے کہ وہ مطعون ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یحیی القطان اور سفیان ثوریؒ نے انہیں ضعیف کہا ہے، لیکن ابن معین وغیرہ نے ان کو ثقہ کہا ہے، اور اس حدیث کو مسلم کے علاوہ بخاری اور باقی چاروں سنن والوں نے روایت کی ہے، دوسری وجہ طحاوی کا اسے ضعیف کہنا ہے، وجہ یہ ہے کہ محمد بن عمرو بن عطاء نے ابو حمید سے نہیں سنا ہے، اور محمد بن عمرو کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ مرجیہ تھا اور اکثر اسے وہم کی بیماری ہو جایا کرتی تھی، اور اسے نہ سننے کی وجہ سے ابن حزمؒ نے ابو داؤد کی شرح میں کہا ہے کہ شاید یہ عبدالحمید کا وہم ہے۔

لیکن بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس جگہ تاریخ کے علماء کا آپس میں اختلاف ہے، چنانچہ امام بخاریؒ اور ان کے علاوہ ایک جماعت کا سننا ثابت ہے، لیکن عینیؒ نے امام ہیثمؒ کے قول سے مقدم سمجھا ہے اور واقعۃً یہ بات قابل لحاظ بھی ہے، اور ابن حزمؒ نے بھی اسی پر یقین کیا ہے، تیسری وجہ یہ ہے کہ طحاویؒ نے دوسری اسناد سے محمد بن عمرو بن عطاء سے روایت کی ہے کہ ہم سے ایک بزرگ نے روایت کی ہے کہ ابو حمید ساعدیؓ صحابہ کرام کے ایک مجمع میں تھے جن کی تعداد دس تھی اس بعد آخر تک یہی حدیث بیان کی ہے اس بناء پر یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمد بن عمروؒ نے خود ابو حمیدؓ سے نہیں سنا ہے۔ مع۔ پھر امام طحاویؒ نے جو اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے اسے امام بیہقیؒ نے تسلیم نہیں کیا ہے، اور شیخ ابن حجر عسقلانیؒ بھی لکھتے ہیں کہ طحاوی کے قول پر توجہ نہیں دینی چاہئے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ایسا خیال کرنا بہت بہت دور کی بات ہے اسی بناء پر شیخ محقق تقی الدین بن دقیق العیدؒ نے امام طحاویؒ کے قول کو قوی قرار دیا ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، اور امام مسلمؒ نے اسے اپنی صحیح میں ذکر کیا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس روایت میں کلام ہے کہ اویحمل الخ یا یہ کہ اس تورک کی بیٹھک کو عمر کی زیاتی یا بدن کے کمزور ہونے پر محمول کیا جائے، ف۔ یعنی جب آپ کی عمر زیادہ ہو گئی تھی۔

ف۔ مصنفؒ نے انتہائی ادب کی بناء پر بوڑھا نہیں کہا ہے، شیخ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ ابو حمیدؓ کی حدیث میں اس عمر کی زیادتوں کے بارے میں کوئی تذکرہ نہیں ہے لہذا اسے ظاہر لفظ پر محمول کیا جائے گا، میں مترجم کہتا ہوں کہ دوسری احادیث میں ایسی بیٹھک کا ثبوت ہے جو عورتوں کی بیٹھک کے مخالف ہے، اور تورک میں ایک طرح کا ضعف ہے اس لئے ہم نے دونوں میں توفیق کی کوشش کرتے ہوئے اس بات کو ترجیح دی ہے کہ آپ علیہ السلام یوں تو ہمیشہ اس طرح بیٹھتے جو مردانہ بیٹھک کہلاتی ہے البتہ کبھی مجبوراً اور ضرورۃً دوسری طرح بھی بیٹھ جاتے تھے جس میں آسانی ہوتی، اور ام سلمہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام اپنی وفات سے پہلے تک آپ کی اکثر نماز بیٹھ کر ہوا کرتی تھی، اور آپ ایسے ہی اعمال کو پسند فرماتے تھے جس پر مداومت اور ہمیشگی ہوتی اگرچہ وہ عمل تھوڑا ہی ہو، جیسا کہ نسائی نے روایت کی ہے، یہ طریقہ بظاہر فرائض کے علاوہ نفل نمازوں کے لئے ہے، لیکن کمزوری کے زمانہ میں اٹھتے وقت استراحت کرنے کا اس سے ثبوت ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت حفصہؓ سے بھی ثابت ہے، یہ حکم ایسا ہی ہے جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ لوگوں کو جب نماز اور اس میں بیٹھنے کا طریقہ سکھاتے تو اسی طرح جیسا کہ ہمارا اس پر عمل ہے، لیکن اس

کے باوجود خود جب بیٹھتے تو چار زانو ہو کر بیٹھتے، اس لئے پوچھنے پر فرمایا ہے کہ میرے پیر مجھے نہیں اٹھاتے ہیں یعنی ان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ میں ان پر زور دے کر بیٹھ سکوں، یہ روایت صحیح بخاریؒ ومالک ونسائی میں ہے، اس۔

حاصل مسئلہ یہ ہوا کہ بایاں پاؤں بچھا کر اور دایاں پاؤں کھڑا کر کے بیٹھنا اولیٰ ہے، لیکن اگر قراءت طویل کرنے کی وجہ سے تھکاوٹ آگئی یا بڑھاپے کی وجہ سے اس طرح بیٹھنا برداشت نہ ہو تو اس وقت تورک کرنا بہتر ہے اور اگر بلا کسی عذر کے تورک کیا تو بھی جائز ہوگا، اس حدیث میں دوسری قسم کا بیان ہے، یعنی عذر کی حالت میں بیٹھک جو حکم کے اعتبار سے پہلی قسم کی بیٹھک کے مساوی ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔

ويتشهد وهو واجب عندنا......الخ

اور تشہد پڑھے، ف، یعنی دونوں قعدوں میں پڑھنا واجب ہے، الفتح۔ اور نفل کے ہر قعدہ میں بھی۔ م۔ اور یہی قول امام احمد کا ہے، اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ دونوں قعدوں میں سنت ہے۔ مع۔

اور اگر تشہد کا کچھ حصہ پڑھے اور باقی چھوڑ دے تو بھی ظاہر الروایۃ میں جائز ہے، اور کہا گیا ہے کہ جائز ہونا تو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ہے، اور ناجائز ہونا امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہے، یہ بات امام مرغینانیؒ نے کہی ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے۔

اب میں مترجم کہتا ہوں کہ جب تشہد پڑھنا واجب ہوا تو اس کا کچھ نہ پڑھنے سے یا چھوڑ دینے سے سجدہ سہو واجب ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ نماز باطل نہ ہوگی، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ واجب کو چھوڑ دینا جائز ہوگا۔ م۔ پھر تشہد کے ختم کر لینے کے بعد درود اور دعاء مسنون ہے، اور سلام کرنا واجب ہے، پھر درود کو دعاء سے پہلے پڑھنا بہتر ہے اسی لئے فرمایا ہے (آئندہ)۔

وصلى على النبى عليه السلام، وهو ليس بفريضة عندنا خلافا للشافعي فيهما، لقوله عليه السلام : اذا قلت هذا اوفعلت فقد تمت صلاتك ان شئت ان تقوم فقم و ان شئت ان تقعد فاقعد.

ترجمہ :- اور حضرت محمد رسول ﷺ پر درود بھیجے، اور یہ پڑھنا ہمارے نزدیک فرض نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے، فرض نہ ہونا رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے ہے کہ جب تم نے یہ کہہ دیا یا کر لیا تو تماری نماز مکمل ہو گئی، اب اگر تم کھڑے ہونا چاہو تو کھڑے ہو جاؤ، اور اگر تم چاہو کہ بیٹھے رہو تو بیٹھ جاؤ۔

توضیح: درود پڑھنا قعدہ اخیرہ میں، درود کے کلمات

وصلى على النبي عليه السلام......الخ

اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے۔ ف۔ یعنی سنت طریقہ سے۔ ع۔ عام علماء کا یہی قول ہے، درود کے صیغے اور الفاظ بہت مختلف ہیں، ان میں سے کچھ تبرکا بیان کئے جائیں گے، ان میں سے جو بہت زیادہ مشہور ہے وہ بھی بیان کیا جاتا ہے، اور کچھ زیادتیاں جو دوسری روایتوں میں پائی جاتی ہیں ان کے ذکر کرتے ہوئے قوس دے کر مترجم کا لفظ بڑھا دیا جائے گا، تبیین الحقائق میں عینیؒ کی طرح امام محمدؒ سے یہ درود منقول ہے:

اللهم صلى على محمد و على آل محمد كما صليت على ابراهيم و على آل ابراهيم (انك حميد مجيد اللهم) بارك على محمد و على آل محمد كما باركت على ابراهيم و على آل ابراهيم (فى العالمين) انك حميد مجيد.

یہ الفاظ صحیحین میں بھی ہیں، مگر اول میں انک حمید مجید بھی ہے لیکن آخر میں فی العالمین کا لفظ نہیں ہے، اگر کوئی اس کی بھی زیادتی کر لے تو جائز ہے، جیسا کہ در مختار میں ہے، بلکہ جو الفاظ ذکر کئے گئے ہیں ان میں سے ہر لفظ کو اپنی جگہ پر اسی طرح

رہنے دے، ویسے ہر طریقے سے جائز ہے، اور در مختار میں ہے کہ سیدنا محمد اور سیدنا ابراہیم کا لفظ بھی بڑھانا ادب ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا سید ہونا تو امر قطعی ہے لیکن فرائض کی ادائیگی میں زیادہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ روایات میں جتنے الفاظ ہوں ان ہی پر اقتصار کرنا چاہئے البتہ نوافل میں بڑھا سکتے ہیں، عینیؒ میں ہے کہ حضرت علیؓ سے مروی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے مندرجہ ذیل کلموں کو میرے ہاتھ میں گن کر دیا اور فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے بھی یہ مجھے گن کر دئے، اور انہوں نے کہا کہ میرے رب عزوجل کے پاس سے اسی طرح نازل کئے گئے ہیں:

اللهم صلی علی محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید، اللهم بارك علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید اللهم سلم علی محمد و علی آل محمد کما سلمت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم انك حمید مجید، اس کی اسناد میں نظر ہے۔

اور حضرت علی وابن مسعودؓ وابن عباسؓ وجابرؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ کہو **اللهم صلی علی محمد وعلی آل محمد و بارك علی محمد وعلی ال محمد وارحم محمد اوال محمد کما صلیت و بارکت و ترحمت علی ابراهیم وعلی آل ابراهیم فی العالمین انك حمید مجید،** اسناد میں نظر ہے، ان دونوں صیغوں میں سے پہلے میں سلام اور دوسرے میں ترحم زائد ہے، اور ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ **اللهم ارحم محمد،** یعنی یا اللہ محمد ﷺ پر رحم کر، اس طرح کہنے کو بعضوں نے مکروہ کہا ہے، اور بعض نے مکروہ بھی نہیں کہا ہے۔ الفتح۔

مبسوط سرخسی میں ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے کیونکہ ایسا کہنے میں اثر کی اتباع اور موافقت ہے، اور رحمت الٰہی سے کوئی بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا ہے۔ ع۔ صحیح یہی ہے کہ اس میں مطلقاً کراہت نہیں ہے۔ التبیین۔

حضرت کعب بن عجرہؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ کہو **اللهم صلی علی محمد و ال محمد کما صلیت علی ابراهیم و بارك علی محمد و ال محمد کما بارکت علی ابراهیم انك حمید مجید۔** یہ حدیث صحاح ستہ میں موجود ہے۔

حضرت ابوحمید الساعدیؓ سے مروی ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ ہم لوگ آپ پر کسی طرح درود بھیجیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہو **اللهم صلی علی محمد وازواجه وذریته کما صلیت علی ابراهیم و بارك علی محمد وازواجه ذریته کما بارکت علی ابراهیم انك حمید مجید،** یہ حدیث ابن ماجہ کے علاوہ باقی لوگوں نے روایت کی ہے، اور ابو مسعود انصاریؓ کی روایت بمعنی کعب بن عجزہ ہے، لیکن آخر میں فی العالمین زیادہ ہے، یعنی **کما بارکت علی ابراهیم فی العالمین انك حمید مجید،** یہ حدیث صحیح مسلم وابوداؤد اور ترمذی میں ہے، اس کے علاوہ اور دوسرے الفاظ بھی ہیں۔

احکام درود

آیت کریمہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ﴾ الایۃ میں امر کے صیغہ سے مخاطب کیا گیا ہے، جس کا نزول ماہ شعبان سنہ ۲ھ میں ہوا ہے، اس بناء پر تمام عمر میں کم از کم ایک بار درود بھیجنا فرض ہے۔ ت۔ اور اگر یہ ایک مرتبہ نماز کے اندر ادا کر لیا گیا تو بھی فرض بھی ادا ہو جانا چاہئے، جیسا کہ النہر میں اس سے بحث کی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ کا خود اپنے اوپر درود بھیجنا واجب نہ تھا، المجتبی۔ نماز میں التحیات پڑھنا ہمارے نزدیک واجب اور اس کے بعد درود بھیجنا ہمارے اور جمہور علماء کے نزدیک سنت ہے۔

وهو لیس بفریضة عندنا خلافا للشافعي فیهما......الخ

یعنی نماز میں درود بھیجنا ہمارے نزدیک فرض نہیں ہے مگر شافعیؒ نے دونوں میں اختلاف کیا ہے۔ ف۔ یعنی التحیات اور درو

دونوں کو فرض کہتے ہیں، ہمارے نزدیک چونکہ التحیات کا حکم نماز میں خبر واحد سے ثابت ہے، اور خبر واحد سے قطعی فرض کا ثبوت نہیں ہوتا البتہ واجب کا ثبوت ہو سکتا ہے اس لئے ہم بھی اس کے وجوب کے قائل ہیں، اور نماز میں درود پڑھنے کے سلسلہ میں چونکہ اس کے وجوب کی کوئی دلیل ہے نہیں بلکہ بظاہر اس کے واجب نہ ہونے پر دلالت ہے۔

لقوله عليه السلام : اذا قلت هذا او فعلت فقد تمت صلاتك ان شئت ان تقوم فقم......الخ

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے (التحیات عبدہ ورسولہ تک پڑھانے کے بعد فرمایا کہ) جب تم نے یہ کہایا کیا تو تمہاری نماز پوری ہو گئی، اگر تمہارا جی اٹھنے کو چاہے تو اٹھ جاؤ اور اگر بیٹھنے کو جی چاہے تو بیٹھ جاؤ۔

ف۔ اس جملہ کی اگر چہ پہلے بھی تحقیق گذر گئی ہے کہ ممکن ہے کہ یہ خود حضرت ابن مسعودؓ کا بھی ہو سکتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا یہ قول مرفوعاً بھی ہو سکتا ہے، ویسے پہلی صورت یعنی ابن مسعودؓ کا قول ہونے میں بھی مرفوع کے حکم ہی میں ہوگا، بہر صورت یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ التحیات کے بعد درود اور دعاء کچھ بھی واجب نہیں ہے، ورنہ کھڑے ہونے کی اجازت نہ ہوتی، اور حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیث جو ابو داؤد میں ہے کہ تشہد کے بعد حدث ہونے پر رسول اللہ ﷺ نے نماز کے پوری ہو جانے کا حکم دیا ہے۔

اگر یہ احتمال نکالا جائے کہ شاید التحیات کے واجب ہونے کے بعد درود واجب ہوا ہو اس دلیل سے کہ یہ روایت ہے، **لاصلوة لمن لم يصل علی** کہ جس نے مجھ پر درود نہیں بھیجی اس کی نماز نہیں ہوئی، اسی طرح سے دوسری روایتیں بھی ہیں ابن ماجہ میں ہے جابر جعفی وعبد المہیمن کی روایت سے، اور طبرانی میں ابن عباسؓ کی سند سے اور بیہقی میں مجہول روایت سے، تو ان کا جواب یہ ہے کہ یہ روایتیں حجت نہیں ہو سکتی ہیں کیونکہ یہ ضعیف ہیں اسی لئے قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ شافعیؒ کا یہ قول کہ نماز میں درود فرض ہے یہ شاذ ہے، ان سے پہلے کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہوا ہے، اور نہ اس میں ایسی کوئی حدیث ہے جس کی اتباع واجب ہو، اور اس کہنے پر پوری جماعت نے اعتراض کیا ہے اور برا کہا ہے، جن میں طبرانی وقشیری بھی ہیں، اور خود علمائے شافعیہ میں سے خطابی بھی مخالف ہیں۔

اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس مسئلہ میں مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے بھی یہ کہا ہو، اور وہ تشہدیں جو حضرات ابن مسعود وابن عباس وابو ہریرہ وابو سعید وابو موسیٰ وابن الزبیرؓ سے مروی ہیں ان میں سے کسی میں درود کے فرض ہونے کا ذکر نہیں ہوا ہے، اور **لا صلوة لمن لم يصل علی** کی حدیث کو سارے محدثین نے ضعیف کہا ہے، اور بالفرض اگر صحیح بھی ہو جائے تو اس کے معنی ہوں گے کہ بغیر درود کے نماز میں کمال نہیں آتا ہے، اور اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اس کے بغیر نماز فاسد ہو گی یا اس کے معنی یہ بھی لئے جا سکتے ہیں کہ جس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی درود نہیں پڑھا اس کی نماز نہیں ہوئی، الی آخرہ۔ مفع۔

شیخ ابن حجرؒ نے ترمذی وابن خزیمہ وابن حبان وغیرہم سے درود کے واجب ہونے کے سلسلہ کی احادیث میں بڑی بحثیں کی ہیں، میں مترجم کہتا ہوں کہ شاذ قول پر اس قدر زور دینا اور بحث کرنا غیر ضروری ہے، اس کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ کوئی شخص نماز کو درود کے بغیر نہ پڑھے، البتہ اس صورت میں کہ مثلاً نماز فجر میں یہ خوف ہو کہ آفتاب نکل آئے گا تو درود چھوڑ کر اسے نماز مختصر کر لینی چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

والصلوة على النبی عليه السلام خارج الصلوة واجبة اما مرة واحدة، كما قاله الكرخی، او كلما ذكر النبی عليه السلام، كما اختاره الطحاوی، فكفينا مؤنة الامر والفرض المروی فی التشهد هو التقدير.

ترجمہ:- اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں واجب ہے، یا تو صرف ایک بار واجب ہے جیسا کہ کرخیؒ نے کہا ہے، یا یہ کہ جب رسول اللہ ﷺ کا نام ذکر کیا جائے جیسا کہ طحاویؒ نے اختیار کیا ہے، اس طرح حکم بار عظیم ہم

سے کفایت کیا گیا، اور تشہد کے بارے میں جو فرض کا حکم ہے وہ تقدیر کے معنی میں ہے۔

توضیح:- نماز کے علاوہ دوسرے اوقات میں درود شریف پڑھنا، نہ پڑھنے پر وعید درود شریف پڑھنے کے مستحب اوقات، تشہد درود کے بعد دعاء، حدیث سے دلیل

والصلوة علی النبی علیه السلام خارج الصلوة واجبة اما مرة واحدة، کما قاله الکرخی......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، ف، اجماع ہے کہ تمام عمر میں ایک بار درود پڑھنا فرض ہے، اس سے زیادہ پڑھنے کے لئے اصل آیت صَلُّوْا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ہے اور وہ مکرر واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتی ہے، اور جب کبھی آپ کا مبارک نام لیا جائے ہر بار درود پڑھنے کے بارے میں دو قول ہیں، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے مامرة الخ یا تو ایک بار واجب ہے جیسا کہ کرخیؒ نے کہا ہے۔ف۔ یعنی نماز کے علاوہ کسی مجلس میں آپ کا نام کئی بار لیا جائے تو کرخیؒ کے نزدیک ایک بار تو آپ ﷺ پر درود پڑھ دینا واجب ہے، اور باقی مرتبوں میں مستحب ہے، عینیؒ نے لکھا ہے کہ اسی پر عام علماء کا فتویٰ ہے، جیسا کہ شرح المجمع اور تنویر میں ہے کہ یہی ظاہر مذہب ہے۔

او کلما ذکر النبی علیه السلام، کما اختاره الطحاوی......الخ

یا ہر بار واجب ہے جب بھی رسول اللہ ﷺ کا ذکر کیا جائے جیسا کہ طحاویؒ نے سند کیا ہے۔ف۔ تحفہ میں اسی کو اصح کہا ہے۔ن۔ مجتبیٰ زاہدی وحلبی وباقانی میں اسی کو صحیح کہا ہے۔اور بحر الرائق نے اسے ترجیح دی ہے، اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آیت پاک یعنی صَلُّوْا عَلَیْهِ الخ سے تو تمام عمر میں ایک بار کہنا فرض ثابت ہوتا ہے پھر ایک ہی مجلس میں مکرر ذکر کرنے سے ایک بار تو واجب اور باقی میں ان احادیث کی وجہ سے استحباب ہوتا ہے جن میں درود پڑھنے کی تاکید اور نہ پڑھنے پر بخیل ہونے کی بناء پر برائی و جفاکاری وذلت وبدبختی کا ذکر ہے اس لئے جب ان احادیث کی وجہ سے وجوب ثابت ہوا تو ہر بار کے ذکر پر وجوب ہی ہوگا یہ نہیں کہ مجلس میں صرف ایک بار تو واجب ہو اور باقی ذکر پر وجوب نہ ہو، کیونکہ خواری وذلت کی یہ وعید کہ **رغم انف رجل ذکرت عنده فلم یصل علی**، یعنی جس کے پاس میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ پڑھے تو وہ خوار ہے، اس لئے اگر ایک مرتبہ ذکر ہو تو درود پڑھے پھر دوبارہ ذکر ہو تو پھر پڑھے خواہ وہ خود پڑھے یا دوسرے کا سنے، کیونکہ وجوب کا سبب تو ذکر ہے اس لئے جب بھی یہ سبب مکرر ہوگا وجوب میں مکرر ہوگا۔

اس طرح بحر کے کلام کا خلاصہ یہ ہوا کہ پوری عمر میں ایک بار فرض اور ہر بار واجب بھی ذکر ہو تو قول صحیح کے مطابق واجب ہے، اور نہر میں ہے کہ التحیات کے اندر ذکر میں واجب نہیں ہے، اور شامی نے لکھا ہے کہ آخر تشہد کے بعد ایک بار پڑھنے کے علاوہ نماز میں دوسری بار درود مکروہ تحریمی ہے، اور تاجر یا دقائی اپنے اسباب کی شہرت کے لئے یا ایسے ہی کسی اور مقصد سے درود پڑھے تو حرام ہوگا، طحاویؒ نے بعض محققین سے نقل کیا ہے کہ درود پڑھنے والے کی نیت اگر خالص نہ ہو تو وہ ثواب سے محروم ہوگا، لیکن رسول اللہ ﷺ کے واسطے اللہ تعالیٰ اسے رد نہیں کرتا ہے، باجی کے حوالہ سے در میں ہے، درود کے وقت جھومنا اور گردن واعضاء بدن ہلا کر چلانا جہالت ہے، چونکہ یہ دعاء ہے اس لئے درمیانی آواز سے نہ چلا کر نہ آہستگی سے ہو، بندہ مترجم کہتا ہے کہ ایک صحابی کو آپ ﷺ نے تمام اوقات فراغت میں درود پڑھنے کا وظیفہ بتلایا ہے، جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں ہے، اور اس میں شک نہیں ہے کہ یہ وظیفہ بہت ہی افضل ہے، کیونکہ ذکر اور کلام الٰہی اور درود کے بعد بقیہ چیزوں کا مرتبہ ہے۔م۔ پھر جب کبھی موقع ملے اور پڑھنا مستحب ہے۔د۔

جن اوقات کی تصریح آئی ہے وہ یہ ہیں جمعہ کا دن، اس کی رات، صبح وشام کے وقت، مسجد میں داخل ہونے اور اس سے نکلنے کے وقت، رسول اللہ ﷺ کے مزار کی زیارت کے وقت، صفا مروہ پر، امام کو جمعہ وغیرہ کا خطبہ دیتے وقت، اذان کے بعد، دعاء

کے شروع، درمیان اور آخر میں، قنوت کے بعد اگرچہ قنوت وتر ہو، تلبیہ کے بعد، کسی مسلمان سے ملاقات کے بعد، کان بجتے وقت، کوئی چیز بھول جانے پر، وعظ کہنے اور حدیث پڑھنے کی ابتداء وانتہاء میں، فتویٰ لکھنے، تصنیف اور درس دینے اور درس لینے کے وقت، منگنی کرنے والے و نکاح پڑھنے و پڑھانے والے پر، سب جائز کاموں کے شروع میں، رسول اللہ علیہ کا نام لکھنے کے وقت درود پڑھنا مستحب ہے، اور سات مواقع میں مکروہ ہے، جماع، پیشاب اور پائخانہ کرنے کی حالت میں اور کاروباری چیزوں کے تشہیر کے لئے، پھسلتے وقت، تعجب کے موقع میں، ذبح کرتے وقت اور چھینکتے وقت مکروہ ہے۔ اشرعہ۔ اور یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ رسول اللہ علیہ کا جب ذکر کیا جائے تو سننے والے پر درود واجب ہے ہر بار۔

پھر یہ سوال کے ہر وہ شخص جو مجلس میں موجود ہو سب پر درود واجب ہے تو مقدمہ ابو اللیثؒ کی شرح میں ہے کہ یہ واجب علی الکفایہ ہے کہ اگر کسی نے نہ پڑھا تو سب گنہگار ہوں گے، اور مجتبیٰ میں کہا ہے کہ ہر ایک کے ذمہ قرضہ ہے یعنی اس کو قضاء کرے کیونکہ یہ بندہ کا حق ہے، اس کے برخلاف اگر اللہ تعالیٰ کے ذکر پر حمد ادا نہ کی تو اس کی قضاء لازم نہیں ہے، اس موقع پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر ایک مجلس میں بار بار ذکر الٰہی ہو تو ایک بار ذکر کافی ہے، اور اگر بالکل ترک کردے تو اس کی قضاء نہیں ہے ایسا کیوں، تو مجتبیٰ میں ثنا و درود میں فرق بیان کیا ہے، لیکن ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ فرق ظاہر نہیں ہوتا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ فرق یہ ہے کہ درود کے واسطے حکم ہے لیکن ثناء کے لئے حکم نہیں ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ بلکہ ثناء کے لئے بدرجہ اولیٰ حکم ہے، اور طحاویؒ نے کہا ہے کہ جس طرح بندہ کی حق کی قضاء ہوتی ہے ویسے ہی حق اللہ تعالیٰ کی بھی قضاء ہوتی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ ان دونوں میں فرق ظاہر نہیں ہے، اور یہ واضح ہو کہ **اللھم ارحم محمدا** کہنا اگرچہ نماز کے علاوہ دوسرے مقام میں کہنا بقول بعض جائز بھی ہو لیکن نماز کے درود میں صرف اس کو پڑھنا یا مشہور درود کے ساتھ ہو نوویؒ کے قول کے مطابق بدعت ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے۔ ط۔ لہٰذا احتیاط کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ درود جو مشہور ہے اور جس کی اسناد و صحیح ثابت ہوئی ہے اسی کو پڑھے اور اپنی رائے سے کچھ نہ پڑھے، اور احتیاطاً ضرور پڑھے، جیسا کہ اس کی تصریح گذر گئی ہے، اور امام شافعیؒ تو آیت کریمہ کے امر کا صیغہ صَلُّوا سے فرضیت کا استدلال کرتے ہی، جس کا جواب گذر چکا ہے کہ امر کے بعد اس پر ایک مرتبہ عمل کر لینے سے اس کی ادائیگی ہو جاتی ہے، اور ہم تمام عمر میں ایک بار کے فرض ہونے کو مان چکے ہیں۔

فکفینا مؤنۃ الامر والفرض المروی فی التشھد ھو التقدیر......الخ

پس حکم کا بار عظیم ہم سے کفایت کیا گیا۔ ف۔ بندہ مترجم کہتا ہے کہ گذشتہ تفصیل کا حاصل یہ ہوا کہ آیت کریمہ کے حکم سے ایک مرتبہ درود کہنے سے جو فرض لازم ہوتا ہے وہ ادا ہو گیا اگرچہ ساری عمر میں ایک ہی مرتبہ کہا گیا ہو، اور نماز کے اندر درود واجب نہیں ہے، اور نماز کے علاوہ جب کبھی ذکر ہو تو دوسری حدیثوں کی بناء پر درود پڑھنا واجب ہے، اور اگر بار بار ذکر ہو تو صحیح قول کے مطابق واجب علی الکفایہ ہے، لیکن اس مترجم کے نزدیک نماز کے باہر اور نماز کے اندر حکم میں فرق کرنا دلیل کی بناء پر مشکل ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔ خلاصہ یہ کہ درود کے فرض ہونے کی کوئی دلیل تو نہیں ہے، البتہ امام شافعیؒ کا یہ قول کہ تشہد فرض ہے اس دلیل کی وجہ سے کہ حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ تشہد فرض ہونے سے پہلے کہا کرتے تھے الخ، جیسا کہ سنن نسائی میں ہے، تو اس میں فرض ہونے کا ذکر ہے۔

اس کا جواب مصنفؒ نے اس طرح دیا ہے کہ والفرض الخ یعنی فرض جو تشہد کے بارے میں مروی ہے وہ تقدیر کے معنی ہے۔ ف تو حدیث مذکور کے معنی یہ ہوئے کہ تشہد کا حکم نافذ ہونے یا مقدر و مقرر ہونے سے پہلے ہم لوگ اس طرح کہا کرتے تھے **السلام علی اللہ والسلام علی جبرئیل و میکائیل** تو رسول اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم ایسا مت کہو کیونکہ السلام تو خود اللہ ہے، البتہ اس طرح کہو **التحیات للہ والصلوات والطیبات** الخ پورا تشہد ابن مسعودؓ کہا، شیخ ابن الہمام نے کہا ہے کہ یہ روایت صرف نسائیؒ کی ایک اسناد ہے، اور دوسری اسناد سے یہی حدیث اس طرح ہے کہ ہم لوگ جب رسول اللہ علیہ کی ساتھ نماز پڑھتے

تو کہتے السلام علی اللہ السلام الخ اور باقی صحاح میں بھی یہ حدیث مروی ہے اور کسی میں بھی لفظ فرض نہیں ہے، پھر اگر ہم فرض کے معنی تقدیر کے بھی نہ لیں تو بھی لفظ فرض سے جو مذکورہ روایت میں مستعمل ہوا ہے اصطلاحی فرض مراد نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ اصطلاحی تو وہ ہوتا ہے جو نص قطعی سے کسی احتمال کے بغیر ثابت ہو، اور اس جگہ حدیث مذکور تو خبر واحد ہے جو ظنی ہوتی ہے، اس طرح زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ اس خبر واحد صحیح سے وجوب ثابت ہو جبکہ ہم خود یہ بات کہتے ہیں کہ تشہد پڑھنا واجب ہے۔ م۔ اور جب رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھنے سے فارغ ہوتے تو اپنے لئے اور اپنے والدین اور تمام مومنین اور مومنات کے لئے استغفار کرے خلاصہ یہ ہے کہ دعاء میں صرف اپنی ذات کی تخصیص نہ کرے، اور یہ سنت ہے۔ التبیین۔

قال ودعا بما يشبه الفاظ القرآن والادعية المأثورة، لما روينا من حديث ابن مسعودؓ قال له النبي عليه السلام، ثم اختر من الدعا اطيبها و اعجبها اليك، ويبدأ بالصلاة على النبي عليه السلام ليكون اقرب الى الاجابة، ولا يدعو بما يشبه كلام الناس تحرزاً عن الفساد و لهذا يأتي بالمأثور المحفوظ.

ترجمہ:- اور دعاء کرے ایسے الفاظ سے جو قرآن کے الفاظ کے مشابہ ہوں، اور وہ دعاء ماثور و منقولہ دعاؤں میں سے ہو، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث کی وجہ سے جس کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ دعاؤں میں ایسی دعاء کا انتخاب کرو جو تمہارے نزدیک بہت عمدہ اور پسندیدہ ہوں، اور دعاؤں کو شروع کرے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے سے تاکہ مقبولیت کے زیادہ قریب ہو، اور ایسی دعاؤں میں سے نہ مانگے جو انسان کے کلام کے مشابہ ہو، فساد نماز سے بچنے کے خیال سے، اسی لئے ایسی دعائیں پڑھے جو منقولہ میں سے اسے یاد ہوں۔

توضیح:- منقولہ اور ماثورہ دعائیں، وہ دعائیں جو انسان کے کلام کے مشابہ ہوں

قال ودعا بما يشبه الفاظ القرآن والادعية المأثورة......الخ

کہا مصنفؒ نے اور دعاء کرے۔ ف۔ یعنی عربی زبان میں کیونکہ نماز کی حالت میں عربی کے ماسوا دوسری زبان میں دعاء کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ ش۔ پھر دعا کرے عربی میں ایسے الفاظ سے جو قرآن کے الفاظ اور دعاء ماثورہ کے مشابہ ہوں۔ ف۔ یعنی اگر قرآن کی آیت سے ہی ہو مثلاً ﴿رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً﴾ الایہ تو اس سے صرف دعاء کا قصد کرے یعنی تلاوت کا ارادہ نہ کرے، اس کے لئے معنی سمجھنا شرط ہے، یا ایسے الفاظ سے دعا مانگے جو قرآن پاک میں کسی نہ کسی جگہ موجود ہوں، مثلاً ﴿رَبَّنَا آتِنَا جَنَّةً وَّاَجِرْنَا مِنَ النَّارِ﴾، یا ایسے الفاظ سے جو دعاؤں میں روایت کئے گئے ہیں یا ان سے مشابہ ہیں۔

لما روينا من حديث ابن مسعودؓ قال له النبي عليه السلام، ثم اختر من الدعا اطيبها.....الخ

اس حدیث کی بناء پر جو ہم تک پہونچی ہے حضرت ابن مسعودؓ سے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں دعاؤں میں سے جو زیادہ پاکیزہ و پسندیدہ معلوم ہوں انہیں اختیار کرو۔

ف: یعنی حضرت ابن مسعودؓ کو تشہد سکھلانے میں تشہد کے بعد یوں فرمایا **ليختر احدكم من الدعاء اعجبه اليه فيدعو به** پھر آدمی دعاؤں میں سے ایسی دعاء کو پسند کرے جو خود اسے بہت زیادہ پسندیدہ ہو، یہ روایت صحیحین و ابوداؤد و نسائی میں موجود ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس سے تو ہر دعاء کی اجازت معلوم ہوتی ہے خواہ قرآن و حدیث کے الفاظ کے مشابہ ہو یا نہ ہو جیسا کہ امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ یہ جائز ہے کہ آدمی کہے **اللهم زوجني امرأة حسينة، وبستانا انيقاً**، یعنی اے اللہ کسی خوبصورت عورت سے میرا نکاح کرادے اور مجھے میوہ دار باغ دےدے۔

جواب یہ ہے کہ صحیح حدیث میں مروی ہے **ان صلوتنا هذه لايصلح فيها شيء من كلام الناس الخ** یعنی ہماری اس نماز میں ایسی کوئی بات مناسب نہیں ہے جو لوگوں کی باتوں میں سے ہو۔ الخ۔ اسی لئے امام احمدؒ نے کہا ہے کہ نماز میں صرف وہی

دعاء مانگنی جائز ہے جو احادیث یا آثار میں موجود ہوں یا قرآن کے موافق ہوں، اگر چہ قرآن میں نہ ہوں، یہی قول امام نخعی اور طاؤسؒ کا ہے اور بعض شافعیہ کا بھی یہی قول ہے، اسی طرح امام الحرمینؒ نے اپنے والد کا میلان ذکر کیا ہے، ابن سیرینؒ نے فرمایا ہے کہ فرض نمازوں میں اور آخرت کے سوا اور دنیا میں سے کوئی دعاء جائز نہیں ہے، اور ائمہ حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن کے الفاظ کے مشابہ اور دعائے ماثورہ میں سے ہو، پھر بہتر یہ ہے کہ تشہد کے فوراً بعد نہ ہو بلکہ درود کے بعد ہو اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

ویبدأ بالصلاة علي النبى عليه السلام ليكون اقرب الى الاجابة، ولا يدعو بما يشبه كلام الناس......الخ

کہ پہلے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے سے ابتداء کرلے پھر دعاء کرے تاکہ قبولیت سے زیادہ قریب ہو۔ **ولايدعو الخ** اور ایسے الفاظ سے دعاء نہ کرے جو لوگوں کے کلام کے مشابہ ہو، اپنی نماز کے فاسد ہو جانے سے بچنے کے لئے۔ ف۔ یعنی لوگوں کی باتوں سے مشابہ دعاء اس لئے نہ ہو کہ نماز فاسد ہونے سے محفوظ رہے، اسی لئے مصلی ایسی دعائیں پڑھے جو ماثور اور منقول ہوں۔

ف۔ دعاء ماثورہ سے مراد وہ دعا ہے جس کی روایت کی گئی یا حدیث و آثار میں منقول ہو ایسی دعائیں بہت ہیں ان میں سے وہ دعا بھی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ابو بکر صدیقؓ کو تعلیم فرمائی ہے یعنی: **اللهم انى ظلمت نفسى ظلماً كثيرا وانه لايغفر الذنوب الا انت فاغفرلى مغفرة من عندك وارحمنى انك انت الغفور الرحيم.** اور ابن مسعودؓ کی دعاء یہ ہے **اللهم انى اسألك من الخير كله مأعلمت منه ومالم اعلم واعوذبك من الشر كله ماعلمت منه ومالم اعلم،** یہ نہایہ میں مذکور ہے، یہ دونوں حدیثیں صحیح ہیں۔ م۔

اور مستحب ہے کہ یہ دعا کرے: **رب اجعلنى مقيم الصلوة ومن ذريتى ربنا و تقبل دعا، ربنا اغفرلى ولوالدى يوم يقوم الحساب،** یہ تاتار خانیہ میں ہے، یہ قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعاء میں سے ہے، پھر در مختار میں دعویٰ کیا ہے کہ فقہاء کے کلمات اس امر میں مضطرب اور مختلف ہیں کہ کیسی دعاء قرآن کے مشابہ ہوتی ہے، اور کیسی دعاء کلام الناس کے مشابہ ہوتی ہے، عینیؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید تو معجز ہے اس کے مشابہ کسی کلام کا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، تو اس کی مراد یہ ہوئی کہ جس کے الفاظ قرآن میں موجود ہوں، بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس صورت میں **اللهم زوجنى بامرأة حسينة** جائز ہونا چاہئے کیونکہ یہ سب الفاظ قرآن میں موجود ہیں، امام حلبیؒ نے مصنفؒ کے قول کو مختار کہا ہے۔

وما لا يستحيل سواله من العباد قوله اللهم زوجنى فلانة يشبه كلامهم وما يستحيل كقوله اللهم اغفرلى ليس من كلامهم وقوله اللهم ارزقنى من قبيل الاول لاستعمالها فيما بين العباد، يقال رزق الامير الجيش.

ترجمہ:- اور جس چیز کا مانگنا بندوں سے محال نہ ہو جیسے کسی کا یہ کہنا کہ اے اللہ فلاں عورت سے میری شادی کرادے، تو یہ کلام انسان کے کلام کے مشابہ ہے، اور جس چیز کا بندوں سے مانگنا محال ہو جیسے نمازی کا یہ کہنا کہ اے اللہ میری مغفرت کردے تو یہ انسانوں کے کلام سے نہیں ہوگا، اور لوگوں کا یہ کہنا اللہم ارزقنی اے اللہ مجھے رزق دے تو یہ پہلی قسم سے ہے کیونکہ ایسے جملے انسانوں کے درمیان مستعمل ہوتے رہتے ہیں، جیسا کہ یوں کہا جاتا ہے رزق الامیر الجیش امیر نے لشکر کو رزق دیا۔

توضیح:- نماز کے اندر یہ دعا مانگنی کہ اے اللہ فلاں عورت سے میری شادی کرادے کیسا ہے؟

وما لا يستحيل سواله من العباد قوله اللهم زوجنى فلانة يشبه كلامهم......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ اگر کسی نے کہا **اللهم اغفر لزيد** اے اللہ زید کی مغفرت فرما یا کہا **اللهم اغفر لعمى** اے اللہ میرے چچا کی مغفرت فرما یا اور کسی شخص کی مغفرت مانگے تو صحیح بات یہ ہے کہ یہ انسانوں کے کلام کے مشابہ نہیں ہے۔ م۔

وقولہ اللھم ارزقنی من قبیل الاول لاستعمالھا فیما بین العباد، یقال رزق الامیر الجیش......الخ
اور نمازی کا اس طرح کہنا کہ اے اللہ مجھے رزق دے پہلی قسم سے ہے۔ ف۔ یعنی انسانی کلام کی قسم سے ہے، اور یہی قول صحیح ہے۔ ف۔ یہ لفظ ہدایہ کے کچھ نسخوں میں ہے اور کچھ نسخوں میں نہیں ہے، اس کی دلیل یہ ہے **لاستعمالھا الخ** کیونکہ یہ کلام لوگوں میں آپس میں مستعمل ہے، جیسا کہ یوں کہا جاتا ہے **رزق الامیر الجیش** کہ امیر نے لشکر کو رزق بہم پہونچایا۔
ف۔ یعنی بادشاہ نے لشکر کو ان کا رزق یعنی تنخواہ دی، اور مصنفؒ نے اس واسطے صحیح کہا ہے کہ اس مسئلہ میں اختلاف ہے، بعضوں کے نزدیک نماز فاسد نہ ہوگی مصنفؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے، کیونکہ رزق دینے والا حقیقت میں اللہ ہی ہے، اور رزق دینے کی نسبت امیر کی طرف کرنی نسبت مجازی ہے۔ الفتح۔ درمختار میں بھی اسی قول کو قبول کیا ہے پھر یہ لکھا ہے کہ اگر اس دعاء کے ساتھ مال وغیرہ کی قید لگادے مثلاً یوں کہے کہ اللہ مجھے مال سے رزق دے یا اسی جیسی دعا کرے تو یقیناً نماز فاسد ہوگی، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جگہ نماز فاسد ہونے اور نہ ہونے کی بنیاد نسبت حقیقی اور مجازی ہونے نہ ہونے کی نہیں ہے بلکہ اس بات پر بنیاد ہے کہ ایسے جملہ کو بندوں سے کہہ سکتے ہیں یا نہیں، اور جب کہہ سکتے ہیں تو اگرچہ مجازاً ہو وہ کلام الناس سے ہو یعنی ایسا کلام جو لوگوں سے کیا جاسکتا ہے، کیونکہ یہ مشہور و معروف صورت ہے اور اس میں شک نہیں ہے کہ لوگوں سے یہ کلمہ کہا جاسکتا ہے تو یقیناً فساد ہوگا۔

اسی لئے خلاصہ میں ہے کہ اگر کوئی کہے **اللھم ارزقنی فلانۃ** اے اللہ فلاں عورت مجھے دیدے تو قول اصح یہ ہے کہ اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور کہا **اللھم ارزقنی الحج** اے اللہ مجھے حج اور روزی کر تو اصح یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی۔ الفتح۔ اس جگہ یہ بات ظاہر ہے کہ حقیقۃ روزی دینے کا تو اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرا کوئی بھی نہیں ہے، اور اس کے لئے ارادہ اسباب مہیا کرنا کس طرح ممکن ہوسکتا ہے، اور یہ بات بھی اللہ کی قدرت میں ہے کہ اس عورت مخصوصہ سے نکاح ہو جائے اگر مشیت الٰہی اس کے لئے نہ ہوگی تو اس سے نکاح نہ ہو سکے گا، اس کے باوجود اس کے کہنے سے نماز فاسد ہونے کا حکم دیا ہے، اسی طرح یہ جملہ بھی ہے الٰہی مجھے مال نصیب کر، کہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے روزی دینے سے متحقق ہوگا، اس کے باوجود اس کے فاسد ہونے کا یقین کیا ہے، اور یہ بات یقینی طور سے معلوم ہے کہ قدرت الٰہی میں **اللھم ارزقنی فلانۃ** اور **اللھم ارزقنی الحج**، دونوں جملے بالکل مساوی ہیں اور آپس میں ان میں کوئی فرق نہیں ہے پھر بھی پہلے جملہ فاسد کر دیتا ہے اور دوسرا جملہ فاسد نہیں کرتا۔
اس سے واضح طور سے یہ بات معلوم ہوئی کہ یہاں چار صورتیں ہوتی ہیں:
نمبر ۱۔ یہ کہ مانگی ہوئی دعاء قرآن یا حدیث میں موجود ہو تو وہ کسی اختلاف کے بغیر مطلقاً جائز ہے خواہ ایسی ہو کہ لوگوں سے وہ بولی جاتی ہو یا نہیں۔

نمبر ۲۔ ایسی دعاء ہو جسے بندوں سے مانگنا محال ہو جیسے **اللھم اغفرلی**۔
نمبر ۳۔ ایسی دعاء ہو کہ فی نفسہ بندوں سے مانگنا محال نہ ہو پھر بندوں سے مانگنے کی عادت نہ ہو، جیسے **اللھم ارزقنی الحج** تو ان صورتوں میں نماز فاسد نہ ہوگی۔

نمبر ۴۔ **اللھم ارزقنی مالا** الٰہی مجھے مال عطاء کر یہ جملہ نماز کو فاسد کر دے گا، اگرچہ یہ حقیقت ہے مال کا رزق دینے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس لئے کہ اگر کوئی انسان کسی کام کے لئے فاعل حقیقی خدا کے علاوہ کسی اور کو سمجھے تو یہ کہا جائیگا ہنوز اس کے ایمان میں خلل ہے، اور ہم کسی بھی مومن کے بارے میں ایسے ایمان کا گمان تک نہیں کر سکتے ہیں، اس تفصیل کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان اختلاف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یقینی طور سے اللہ تعالیٰ کو فاعل حقیقی جانتا ہو مگر ایسے محاورہ پر دعا کا جملہ بولا کہ شرعاً وہ محاورہ باہمی گفتگو میں جائز سمجھا گیا ہو اگرچہ اس نے مومن ہونے کی بناء پر اعتقاد کے لحاظ سے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف یقینی ہو تو ہمارے نزدیک اس کا کہنا جائز نہیں ہے، مگر امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، اسی بناء پر

خلاصہ میں ہے کہ اس جملہ سے کہ **اللھم اقض دیونی** اے اللہ میرے قرضے ادا کردے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اس بندہ مترجم کو اس موقع پر منجانب اللہ تحقیق القاء کی گئی ہے، **واللہ تعالی ھو العلیم الخبیر**۔

واضح ہو کہ صحیح احادیث سے اس بات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر چیز جو مانگنی ہو وہ خدا سے ہی مانگنی چاہئے خواہ وہ معمولی ہو یا قیمتی اور تھوڑی ہو یا زیادہ، پھر یہ بات ذہن نشین کرنے کی ہے کہ نماز تو اللہ تعالی سے بہت ہی قریب ہونے اور اس سے سرگوشی کرنے رحمت چاہنے کا مقام ہے اور مومن کی معراج ہے اور اولی نفس کے خیالات بالخصوص عام انسانوں کے اکثر اوقات ایسی چیزوں کی طرف مٹے ہوئے ہوتے ہیں جو ان کے پسندیدہ ہوں مگر اللہ کے نزدیک وہ ناپسندیدہ ہوں، اور ایسی چیز میں تمیز کرنا، اور پہچاننا بہت مشکل ہے اس لئے منع کر دیا اور یہ کہدیا کہ صرف ایسی ہی چیز کی دعا مانگے جس میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی موافقت پائی جائے تاکہ مانگنے والا اپنے رحمت کی درخواست میں ایسی کسی چیز کو داخل نہ کردے جس اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت ہو، اب جب نمازی نے اپنی نماز میں صحابہ کرامؓ کی اتباع ہی کو مدنظر رکھا تو اس سے ایک تو سنت کی اتباع کی شرافت و بزرگی حاصل ہوئی اور دوسرے بڑے فتنہ اور خطرہ سے وہ بچ گیا، اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو، واللہ تعالی اعلم۔

پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ذالولو جیہ میں ہے کہ فرض نمازوں میں اپنی دعاؤں کا خاص خیال اور احتیاط رکھنا چاہئے ایسا نہ ہو کہ زبان سے ایسی بات نکل جائے جس سے نماز فاسد ہوتی ہو، تاتار خانیہ، پھر جس دعاء کے نماز میں پڑھنے سے نماز فاسد ہوتی ہے اس سے اسی صورت میں نماز فاسد ہوگی جبکہ آخری قعدہ میں ابھی تشہد کی مقدار وہ نہ بیٹھا ہو یا یہ کہ ابھی تشہد نہ پڑھ سکا ہو اور اس سے پہلے ہی دعاء پڑھ لی، کیونکہ اگر مقدار تشہد بیٹھ جانے یا تشہد پڑھ لینے کے بعد وہ دعا مانگی ہو تو اس سے قبل چونکہ آخری قعدہ ہوتے ہی نماز کے فرائض مکمل ہو چکے ہیں اس لئے اس دعاء کے پڑھتے ہی وہ نماز سے فارغ بھی ہو جائے گا۔ التبیین۔

چند ضروری مسائل

نمبر ۱۔ کافر کے لئے دعا خیر کرنی حرام ہے، اس سے کفر لازم نہیں آتا ہے۔

نمبر ۲۔ تمام مومنوں کے لئے ان کے تمام گناہوں سے مغفرت کی دعا مانگنی جائز ہے، البحر۔

نمبر ۳۔ ساری زندگی کے لئے دعا عافیت مانگنی یا دونوں جہاں کی بہتری مانگنی یا دونوں جہاں کے شر کا دور ہونا، یا جو چیزیں عادۃً مانگنا کچھ بھی حرام نہیں ہے، کیونکہ ترمذیؒ وغیرہ کی حدیث میں ہے کہ دنیا و آخرت کی عافیت مانگنے سے بہتر کوئی دعا نہیں ہے، اور دونوں جہاں کی بہتری مانگنی بھی حدیث میں موجود ہے اور اللہ تعالیٰ عزوجل ارحم الراحمین تمام چیزوں پر قادر ہے اس لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے بندہ کو دونوں جہاں میں عافیت دیدے اور مرض وغیرہ سے نجات بھی دیدے، اور اگر بالفرض اس نے دنیا میں اس کی دعا قبول نہیں کی تو اس کے لئے آخرت میں ذخیرہ جمع پونجی بنادے۔

اور دونوں جہاں کی بھلائی اور خود اللہ تعالیٰ کا فضل مطلوب ہے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ کوئی مومن بھی یہ خیال نہیں کر سکتا ہے کہ اللہ کی طرف سے اور ازل میں جو فیصلہ اس کے بارے میں کیا جا چکا ہے اسے کسی طرح ختم کرادے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص بیمار ہو اور اس کی موت مقدر ہو چکی ہو پھر بھی اس کی بیماری میں اس کی شفاء کی دعا کرنی بغیر کسی خوف و خطرے کے جائز ہے، اور اس وقت اس سے ہرگز یہ بات مقصود نہیں ہوتی ہے کہ اللہ کا فیصلہ ازلی ختم ہو جائے البتہ ایسی چیزیں جن کا ہونا جو عقلاً یا عادۃً محالات میں سے ہو ان کی دعائیں مانگنا ایک حد تک بے ادبی ہے، ایسی بات نہیں ہے کہ واقعۃً وہ اللہ کی قدرت سے باہر ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ تو بڑی قوت اور قدرت کا مالک ہے، اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ ہمیشہ صرف ایک ہی دعا مانگتے رہنے سے دل سخت ہو جاتا ہے جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، لہٰذا فرض نمازوں میں تو خاص احتیاط کرنی چاہئے ان کے علاوہ دوسری نمازوں میں پورے ذوق و شوق اور خشوع و خضوع اور دل کی گہرائیوں سے اپنی مرغوب اور پسندیدہ دعائیں مانگے، اور دعاؤں کی شرائط و آداب کا خاص

خیال رکھے کہ یہ دعا خود بھی ایک عبادت بلکہ عبادت کا مغز ہے، یہ بحث ہم نے تفسیر میں خوب وضاحت کے ساتھ بیان کر دی ہے، واللہ تعالیٰ ھو اعلم بالصواب. م. اب دعاء کے بعد دونوں طرف سلام پھیرے اس کے بارے میں مصنف نے یہ فرمایا ہے۔

ثم یسلم عن یمینہ فیقول السلام علیکم ورحمۃ اللہ وعن یسارہ مثل ذلک لماروی ابن مسعودؓ ان النبی علیہ السلام کان یسلم عن یمینہ حتی یری بیاض خدہ الایمن وعن یسارہ حتی یری بیاض خدہ الایسر.

ترجمہ:- پھر داہنی طرف سلام پھیرے اور کہے السلام علیکم ورحمۃ اللہ اور بائیں طرف بھی اسی طرح سلام پھیرے اس لئے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ داہنی طرف سلام پھیرتے تھے یہانتک کہ آپ کے داہنی طرف کے رخسار مبارک کی سفیدی دیکھی جاتی تھی، اور بائیں طرف بھی یہانتک کہ آپ کے بائیں جانب رخسار کی سپیدی دیکھی جاتی تھی۔

توضیح:- دائیں بائیں سلام کہنا حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث سے دلیل، اگر پہلے بائیں جانب سلام کیا یا سامنے سلام کیا یا پیٹھ دی یا دونوں سلام ایک ہی طرف کر دئے، چند مسائل

ثم یسلم عن یمینہ فیقول السلام علیکم ورحمۃ اللہ وعن یسارہ مثل ذلک......الخ

پھر اپنے داہنے طرف سلام پھیرے۔ف۔ چہرہ گھمالے، یہانتک کہ اس کے داہنے رخسار کی رنگت لوگ دیکھ سکیں، یہی قول صحیح ہے۔القنیہ۔ فیقول الخ اور یوں کہے۔ف قول مختار کے مطابق الف لام کے ساتھ السلام علیکم ورحمۃ اللہ تم پر السلام ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت، ف۔ اس موقع پر وبرکاتہ زیادہ نہ کرے۔المحیط۔ لیکن حاوی قدسی میں کہا ہے کہ بڑھانا اچھا ہے، حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث کی بناء پر جو صحیح اسناد کے ساتھ ابوداؤد میں ہے جس سے امام نوویؒ کا قول رد ہو گیا کہ یہ بدعت ہے۔م۔اور بائیں طرف بھی اسی کی مانند سلام پھیرے۔ف۔ یہانتک کہ بائیں رخسار کی سپیدی نظر آجائے، اور پہلے کی طرح کہے، لیکن محیط میں ہے کہ پہلے سلام کی بہ نسبت آواز پست کرے، تبیین میں کہا ہے کہ یہی احسن ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ سنت ہے۔م۔

لماروی ابن مسعودؓ ان النبی علیہ السلام کان یسلم عن یمینہ حتی یری بیاض خدہ الایمن......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف یہی قول اکثر علماء صحابہؓ و تابعینؒ و مجتہدین کا ہے ان کے علاوہ امام شافعیؒ کا قول جدید بھی ہے، یہ حدیث سنن اربعہ میں ہے، اور یہی معنی صحیح مسلم میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے، بعض بزرگوں کے نزدیک ایک سلام سامنے کی طرف کسی قدر دائیں طرف جھکی ہوئی حالت میں بھی ہونا چاہئے، اس بارے میں کئی حدیثیں مروی ہیں مگر وہ ضعف سے خالی نہیں ہیں، البتہ ترمذی اور ابن ماجہ کی روایت جوام المومنین حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اور اسے حاکم نے شیخینؒ کی شرط کے مطابق صحیح کہا ہے تنقیح میں اس قول کو تسلیم نہیں کیا ہے، اور کہا ہے کہ اس راوی زہیر بن محمد ہے جو اگرچہ صحیحین کے راویوں میں سے ہے مگر اس کی روایات میں منکر احادیث ہے، اور طحاویؒ وابن عبدالبر نے بھی اسے صحیح نہیں کہا ہے، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ حاکم کا اسے صحیح کہنا قابل تسلیم نہیں ہے، اور رسول اللہ ﷺ سے ایک ہی سلام کے بارہ میں کوئی روایت ثابت نہیں ہے۔مع۔ اور بالفرض اگر اسے ہم درست بھی مان لیں تو بھی حضرت عائشہؓ کی حدیث سے ابن مسعودؓ کی حدیث زیادہ راجح ہے کیونکہ عورتیں پیچھے ہوتی تھیں اس لئے مردوں کو اگلی صف میں ہوتے تھے رسول اللہ ﷺ کے حالات سے زیادہ واقفیت رہتی تھی، بالخصوص جبکہ دوسرا سلام پہلے سلام کی بہ نسبت بہت پست ہوتا تھا۔

چند مسائل

اگر کسی نے نے بائیں طرف پہلے سلام کر دیا تو جبتک گفتگو نہ کی ہو دائیں طرف سلام کر دے، پھر بائیں سلام کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر سامنے کی طرف پہلے سلام کیا تو دوسرا سلام بائیں طرف کر دے، پھر بائیں سلام کو دوبارہ کہنے کی

ضرورت نہیں ہے، اور اگر سامنے کی طرف پہلے سلام کیا تو دوسرا سلام بائیں طرف کر دے۔ فع۔ اور اگر پیٹھ پھیر دی ہو تو پھر سلام نہ کرے قول اصح یہی ہے۔ القنیہ۔

اور اگر ایک ہی جانب دوبارہ سلام کر دے تو جائز ہوگا مگر سنت کی مخالفت ہوئی، اگر نمازی صرف السلام کہنے پایا تھا کہ کسی دوسرے نے اس کی اقتدا کی نیت کی تو یہ اقتدا صحیح نہیں ہے، اس سے یہ معلوم ہوا کہ نماز سے فارغ ہو جانے کے لئے پورے طور پر السلام علیکم کہنا ضروری نہیں ہے۔ مع۔ علیکم السلام کہنا مکروہ ہے۔ السراج۔ فقیہ ابو جعفر نے کہا ہے کہ قول مختار یہ ہے کہ مقتدی از خود سلام نہ پھیرے بلکہ انتظار کرے کہ جب امام دائیں طرف سلام پھیرے، تو مقتدی بھی دائیں طرف سلام پھیرے اور امام جب بائیں طرف سلام پھیرے تو مقتدی بھی بائیں طرف سلام پھیرے۔ قاضی خان۔

مقتدی اپنا التحیات مکمل کر لے تب سلام پھیرے، اور امام نے قہقہہ وغیرہ کے مانند عمداً کوئی مفسد صلوۃ کام کیا تو وہ نماز سے فارغ ہو گیا اب مقتدی بھی سلام نہ پھیرے، بلکہ مسبوق بھی نماز سے نکل گیا، اور اگر مقتدی نے امام سے پہلے اپنی نماز پوری کر کے کلام کر لیا تو اس کی نماز تو ہو گئی مگر مکروہ ہوئی، اور امام اپنی جگہ میں باقی رہ گیا ایسی بناء پر اگر اس سے کوئی مفسد صلوۃ پایا جائے تو امام ہی کی نماز فاسد ہوگی، اور اس نمازی پر جو فارغ ہو چکا ہے کوئی اثر مرتب نہ ہوگا۔ م۔ د۔ ش۔

ونوی بالتسليم الاولى من على يمينه من الرجال والنساء والحفظة كذلك فى الثانية، لان الاعمال بالنيات، ولاينوى النساء فى زماننا، ولامن لاشركة له فى صلاته، هو الصحيح، لان الخطاب حظ الحاضرين، ولابد للمقتدى من نية امامه، فان كان الامام من الجانب الايمن او الايسر نواه فيهم، وان كان بحذائه نواه فى الاولى عند ابى يوسف ترجيحا للجانب الايمن، و عند محمد وهو رواية عن ابى حنيفة نواه فيهما، لانه ذوحظ من الجانبين.

ترجمہ:- اور امام پہلے سلام سے نیت کرے ہر اس نمازی کی جو اس کے دائیں جانب ہو مردوں عورتوں اور فرشتوں میں سے، اسی طرح دوسرے سلام سے بھی، کیونکہ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے، اور آج کل ہمارے زمانہ میں عورتوں کی نیت نہ کرے، ایسے کسی شخص کی بھی نیت نہ کرے جو اس کی نماز میں شریک نہ ہو، یہی قول صحیح ہے، اس لئے کہ خطاب تو حاضرین کا حصہ ہے، اور مقتدی کے لئے ضروری ہے اپنے امام کی نیت کرنا تو امام اس کے دائیں جانب ہو یا بائیں جانب ہو جدھر بھی ہو اسی طرف کے سلام میں دوسرے لوگوں کے ساتھ امام کی بھی نیت کرے، اور اگر بالکل سامنے ہو تو امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق صرف پہلے سلام میں امام کی نیت کرے دائیں جانب کو ترجیح دیتے ہوئے اور امام محمدؒ کے نزدیک اور یہی امام ابو حنیفہؒ کی بھی روایت ہے کہ اس امام کی دونوں سلاموں میں نیت کرے گا، کیونکہ امام اس کے دونوں جانب سے حصہ دار ہے۔

توضیح:- امام داہنے طرف کے سلام میں اس طرف جتنے مرد، عورت اور فرشتے ہوں
سب کی نیت کرے، اسی طرح بائیں طرف کے سلام میں بھی نیت کرے
اس زمانہ میں عورتوں کا مسجد میں نماز کے لئے جانا، مقتدی کی نیت سلام کے وقت

ونوى بالتسليم الاولى من على يمينه من الرجال والنساء والحفظة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ اور چاہئے کہ حضرات شوافعؒ کی طرح اپنے سلام میں ان جنات کی بھی نیت کرے جو مومن ہوں۔ مغ۔

كذلك فى الثانية، لان الاعمال بالنيات......الخ

اسی طرح دوسرے سلام کرنے میں بھی۔ ف۔ یعنی بائیں طرف کے حاضرین کی نیت کرے مذکورین میں سے خواہ کوئی بھی ہو

کیونکہ اعمال کا مدار تو نیتوں پر ہے۔ف۔ جیسا کہ صحیح احادیث میں مروی ہے، اور وضوء کے مسئلہ میں اس حدیث سے نیت شرط قرار نہیں دی تا کہ کتاب اللہ پر زیادتی لازم نہ آئے۔ مع۔ اور اصل میں تو عورتوں کے لئے بھی مسجد میں حاضر ہونا ہے، مگر اس زمانہ میں فتنہ کے خوف سے ان عورتوں کو روکا گیا ہے جیسا کہ بنی اسرائیل کی عورتیں فتنہ کے خوف سے روکی گئی ہیں، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے:

ولاینوی النساء فی زماننا، ولامن لاشرکة له فی صلاته، هو الصحیح......الخ

کہ ہمارے زمانہ میں عورتوں کو سلام کرنے کی نیت نہ کرے۔ف۔ کیونکہ اب تو انہیں جماعت میں شرکت سے ہی منع کیا جاتا ہے۔ **ولا من لاشرکة الخ** اور ایسے شخص کو سلام کرنے کی نیت نہ کرے جس کو اس نماز کی نماز میں شرکت نہ ہو۔ف۔ اگرچہ وہ لوگ اس جگہ موجود ہوں۔ **هو الصحیح الخ** یہی قول صحیح ہے۔ف۔ بخلاف اس قول کے جو حاکم شہید نے اختیار کیا ہے کہ تمام مومن مردوں اور عورتوں کی نیت کرے، کہ یہ ضعیف قول ہے۔

لان الخطاب حظ الحاضرین......الخ

کیونکہ خطاب تو حاضرین کو ہی کیا جاتا ہے اور حاضرین ہی کا حصہ ہے۔ف۔ لہٰذا اس نیت میں ایسے افراد شامل ہوں گے جو وہاں موجود نہ ہوں گے، کیونکہ وہ تو حاضر باشوں کا حصہ ہے۔ف۔ اب تک سلام سے متعلق جو گفتگو ہوئی وہ اس سلام سے متعلق ہے جو نماز سے فارغ ہونے کے لئے کیا جاتا ہے، اور اب اس سلام سے متعلق گفتگو ہو رہی جو نماز کے اندر التحیات میں **السلام علینا وعلی عباد الله الصالحین** پڑھتے وقت کیا جاتا ہے، تو اس میں تمام مومنین و مومنات کی نیت کرنی چاہئے، جیسا کہ شمس الائمہؒ نے اس کی تصریح کی ہے، بلکہ شافعیہ کی تصریح کے مطابق جنات کی بھی نیت کرنی چاہئے۔ع۔ بلکہ تمام آسمان و زمین میں جو کوئی بھی بندہ صالح ہے سب کو یہ سلام پہونچ جائے گا، جیسا کہ حدیث میں ہے، اس جگہ گفتگو صرف لفظ علینا کی مراد لینے میں ہے کہ اس سے صرف حاضرین مراد لئے جائیں یا سارے مومنین و مومنات خواہ وہ انسانوں میں سے ہوں یا جنات میں سے، اس میں دوسرا قول صحیح ہے، حاضرین سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو نماز میں شریک ہوں، م، اور جس تفصیل کے ساتھ امام نیت کرے اسی تفصیل کے ساتھ مقتدی بھی نیت کرلے۔

ولابد للمقتدی من نیة امامه، فان کان الامام من الجانب الایمن او الایسر نواه فیهم ......الخ

مقتدی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے سلام میں امام کی نیت کرے، ف یعنی مقتدی کے لئے ضروری ہے کہ امام کو سلام کرنے کی نیت کرے۔ **فان کان الامام الخ** کہ اگر مقتدی سے امام دائیں جانب ہو، ف، تو دائیں طرف کے لوگوں کے ساتھ امام کی بھی نیت کرلے، اور اگر امام بائیں طرف ہو تو بائیں طرف کے لوگوں میں میں امام کی بھی نیت کرے۔

وان کان بحذائه نواه فی الاولی عند ابی یوسف ترجیحا لجانب الایمن......الخ

اور اگر امام مقتدی کے بالکل سامنے ہو۔ف۔ اس طرح سے کہ مقتدی ٹھیک امام کی پیٹھ کے پیچھے ہو، تو مقتدی امام کی اپنے پہلے سلام یعنی دائیں سلام میں نیت کرے کیونکہ دائیں جانب کو بائیں کے مقابلہ میں ترجیح حاصل ہے اور یہ امام ابو یوسفؒ کا قول ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک اور یہی قول امام ابو حنیفہؒ سے بھی مروی ہے، کہ مقتدی اپنے دونوں سلام میں نیت کرے کیونکہ امام اس مقتدی کے دونوں سلام میں برابر کا حقدار ہے، ف، یہی قول صحیح ہے، التاتارخانیہ، اسی طرح حضرت سمرہ بن جندبؓ کی یہ حدیث بھی دلیل ہے **امرنا النبی ﷺ ان نرد علی الامام وان نتحاب وان یسلم بعضنا علی بعض،** یعنی رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ امام کے سلام کا جواب دیں اور آپس کی محبت بڑھائیں ہم میں سے ایک دوسرے کو سلام کرے، اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے، اس روایت کے ظاہر سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ مقتدی پر سلام کا جواب دینا واجب ہے کیونکہ جواب دینا بہر صورت واجب ہی ہوتا ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔

والمنفرد ینوی الحفظة لاغیر، لانه لیس معه سواهم، والامام ینوی بالتسلیمتین هو الصحیح، ولاینوی فی الملائکة عددا محصورا، لان الاخبار فی عددهم قد اختلفت، فاشبه الایمان بالانبیاء علیهم السلام، ثم اصابة لفظة السلام واجبة عندنا ولیس بفرض خلافا للشافعی، هو یتمسك بقوله علیه السلام: تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم.

ترجمہ:-اور تنہا نماز پڑھنے والا شخص صرف اپنے محافظ فرشتوں کی نیت کرے گا، اس کے علاوہ کسی اور کی نہیں، کیونکہ ان فرشتوں کے علاوہ اس کے ساتھ دوسرا کوئی بھی نہیں ہے، اور امام اپنے دونوں سلاموں میں نیت کرے گا، اور یہی قول صحیح ہے، اور فرشتوں کی نیت کرتے وقت متعین افراد کی نیت نہیں کرے گا، کیونکہ احادیث میں ایسے فرشتوں کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، لہٰذا تعداد کے اعتبار سے یہ فرشتے انبیاء سابقین کی تعداد جیسے ہوئے کہ کتنے انبیاء پر ایمان لانا چاہئے، پھر خاص لفظ سلام استعمال کرنا ہمارے نزدیک واجب ہے اور فرض نہیں ہے، اور یہ قول امام شافعیؒ کے قول کے مخالف ہے وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان سے حجت پکڑتے ہیں کہ اس نماز کو حرام کرنے والی چیز تکبیر اور اسے حلال کرنے والی چیز سلام ہے۔

توضیح:-سلام کرتے وقت تنہا نماز پڑھنے والا کیا نیت کرے گا
سلام کے ساتھ نماز سے فارغ ہونا، شوافع کی دلیل

والمنفرد ینوی الحفظة لاغیر، لانه لیس معه سواهم.....الخ

ف۔ حفظ سے مراد وہ فرشتے ہیں جو انسان کی ذات اور اس کے اعمال کی حفاظت کے علاوہ اللہ کی مرضی کے مطابق کام کرتے رہتے ہی، ان کے بارے میں قرآن پاک میں ہے ﴿وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً﴾ یعنی اللہ تعالیٰ تم پر حفظ بھیجتا ہے، ان کے بارے میں کئی آیتیں اور حدیثیں موجود ہیں، حق بات یہ ہے کہ ان کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہے، اور منفرد اپنی نماز میں بوقت سلام صرف ان ہی کی نیت کرے۔

لانه لیس معه سواهم.....الخ

کیونکہ منفرد کے ساتھ ان حفظہ کے علاوہ دوسرا کوئی نہیں ہے۔ ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس دعویٰ میں تامل ہے کہ حفظہ کا انحصار صحیح نہیں ہے ان صحیح احادیث کی بناء پر کہ جو مومن جنگل میں اذان کے واقامت کے ساتھ نماز پڑھتا ہے اس کے مقتدی اتنے بے شمار فرشتے ہوتے ہیں کہ اس کی نظر ان کا احاطہ بھی نہیں کر سکتی ہے، جیسا کہ اذان کے باب میں گذر چکا ہے، اور یہی بات ہر مومن کی نماز کے بارے میں بھی بیان کی گئی ہے، لہٰذا مناسب بات تو یہی ہے کہ نمازی اپنے ساتھ کے تمام فرشتوں کی نیت کرے خواہ وہ حفظہ میں سے ہوں یا ان کے علاوہ کوئی اور ہوں۔ م۔

والامام ینوی بالتسلیمتین هو الصحیح.....الخ

اور امام نیت کرے دونوں سلاموں میں۔ ف۔ اپنے محافظ فرشتوں کی اور قوم کی بھی۔ ع۔ اسی طرح مقتدی بھی حفظہ کی نیت کرے۔ ف۔ بلکہ محافظین فرشتوں کے علاوہ ان تمام فرشتوں کی بھی جو اس وقت آگئے ہوں، جیسے رات کے فرشتے، دن کے فرشتے اور وہ فرشتے جو فجر کے وقت اور عصر کے وقت آمد و رفت کے وقت ایک دوسرے سے ملتے ہیں، اسی طرح ہوش و گوش والے اور تمیز دار بچے بھی اپنے سلام میں اپنے حفظہ کی نیت کریں گے، اور شامیؒ نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ نابالغوں کی نیکیاں بھی لکھی جاتی ہیں، اور ان ہی کو ان نیکیوں کا ثواب ملے گا، البتہ ان کے والدین وغیرہما کو ان کی تعلیم دینے کا ثواب ملے گا، الحاصل بہر صورت فرشتوں کی نیت کرنی چاہئے، یہی قول صحیح ہے۔

ولاینوی فی الملائکة عددا محصورا، لان الاخبار فی عددهم قد اختلفت.....الخ

اور فرشتوں کے بارے میں اپنے ذہن میں کوئی تعداد متعین نہ کرے۔ف۔ یہی قول صحیح ہے۔البدائع۔کیونکہ احادیث اور آثاران فرشتوں کے بارے میں مختلف ہیں۔ف۔اس لے یہ نیت کرنی چاہئے کہ فی الحقیقت وہ جتنے بھی ہوں ہم نے سب پر سلام کیا ہے اس کہنے سے سارے فرشتے اس میں داخل ہوگئے ان میں نہ کسی کی کمی ہوئی اور نہ زیادتی۔

فاشبه الایمان بالانبیاء علیهم السلام تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم......الخ

اس طرح یہ مسئلہ انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانے کے مشابہہ ہوگا۔ف۔اس لئے کہ انبیاء علیہم السلام کی تعداد مختلف بیان کی گئی ہے،اور کسی بھی نص قطعی اور یقینی طور پر ان کا کوئی شمار نہیں ہے،اسی لئے عقائد کی کتابوں میں اس طرح کی تصریح کی گئی ہیکہ ایمان اس طرح لائے کہ ہم سب انبیاء پر ایمان لائے،اور ہم کسی نبی کے بھی منکر نہیں ہیں۔

چند ضروری مسائل

حفظہ یعنی محافظین فرشتوں کے بارے میں درمختار میں بہت کچھ جو بیان کیا گیا ہے،ان میں سے اکثر بے اعتبار ہیں، اور صحیح بات وہی ہے جو ابھی مصنفؒ نے بیان فرمائی ہے،واللہ تعالی اعلم۔م۔

ثم اصابة لفظة السلام واجبة عندنا ولیس بفرض خلافا للشافعي......الخ

پھر ہمارے نزدیک لفظ السلام ادا کرنا واجب ہے۔ف۔یعنی لفظ السلام علیکم کو دوسرے لفظ سے بدلے بغیر کہنا نماز کی حرمت ختم کرنے کے لئے واجب ہے، محیط میں ہے کہ یہی اصح ہے،اور یہ کہنا فرض نہیں ہے۔ف۔یہانتک کہ اگر نمازی نے سلام سے پہلے مثلاً حدث کر دیا تو نماز کا اعادہ واجب ہوگا،اور نماز باطل نہ ہوگی۔م۔خلافا للشافعی الخ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ف۔اس اختلاف کے بارے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ خود امام شافعیؒ کے نزدیک بھی یہ حکم ثبوت کے اعتبار سے قطعی نہیں ہے، بلکہ واجب ہی ہے، لیکن وہ اسے رکن قرار دے کر اس کے ترک کرنے کو مفسد نماز کہتے ہیں۔

هو یتمسك بقوله علیه السلام : تحریمها التکبیر و تحلیلها التسلیم......الخ

امام شافعیؒ اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں کہ مفتاح **الصلوة الطهور وتحلیلها التکبیر و تحریمها التسلیم**،یعنی نماز کی تحلیل تسلیم ہے اس میں سلام کرنے کی تصریح ہے جیسے کے تحریمہ کے بارے میں تکبیر کی تصریح ہے لہٰذا تسلیم بھی مثل تکبیر کے فرض ہوگی،،اگر کوئی مصنفؒ پر یہ اعتراض کرے کہ اس حدیث مذکور سے تکبیر تحریمہ کے فرض ہونے پر تو استدلال کرلیا ہے مگر تسلیم کے فرض ہونے میں اس سے استدلال نہیں کیا ایسا کیوں ہے؟ تو بعض شارحین نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے، مگر اس مترجم کو یہ جواب بالکل ہی پسند نہیں ہے،اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ تکبیر تحریمہ کی فرضیت اس آیت پاک **وربك فکبر** سے ہے،اسی کی تفسیر میں یہ حدیث بیان کی گئی ہے، برخلاف سلام کے کہ اس کے فرض ہونے پر کوئی قطعی دلیل یا آیت نہیں ہے،اس وجہ سے صرف اسی حدیث سے فرضیت ثابت نہیں ہوسکتی ہے، بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ وجوب ہی ہوسکتا ہے اسی بناء پر تسلیم کے واجب ہونے کے ہم قائل ہوئے ہیں، حالانکہ اس وجوب کے مقابل اور مخالف بھی دلیل موجود ہے، جیسا کہ مصنفؒ نے کہا ہے (آئندہ)۔

ولنا مارویـنا من حدیث ابن مسعودؓ، والتخییر ینافی الفریضة والوجوب الا انا اثبتنا الوجوب بما رواه احتیاطا، و بمثله لایثبت الفریضة، والله اعلم.

ترجمہ:-اور ہماری دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے پہلے روایت کر دی ہے،اور کسی بات میں اختیار دینا اس کے فرض اور واجب ہونے دونوں کے خلاف ہوتا ہے، پھر بھی ہم نے اس کے واجب ہونے کا حکم دیا ہے احتیاطا اس حدیث پر عمل کرتے ہوئے جو امام شافعیؒ نے روایت کی ہے،اور اس جیسی روایت سے فرضیت ثابت نہیں ہوتی ہے،واللہ

اعلم۔

توضیح:۔ تحلیل و تسلیم کے بارے مین مترجم کی طرف سے وضاحت
چند ضروری مسائل، امام کے سلام کے بعد توقف، امام کے سلام سے پہلے اٹھنا
نمازی کا اپنے عمل سے نکلنا، نماز ظہر و عصر اور عشاء کے بعد دیر تک دعا مانگنا
سلام کے بعد امام کا منہ پھیرنا، نماز کے بعد اوراد و وظائف
فرض کے ادائیگی کے بعد امام کے لئے سنت پڑھنے کی جگہ، مقتدی کی جگہ

ولنا ماروینا من حدیث ابن مسعودؓ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ وہ روایت جو تشہد کے بارے میں وارد ہے جس کے آخر میں یہ جملہ ہے فاذا قلت هذا اوفعلت هذا فقد تمت صلوتك ان شئت ان تقوم فقم وان شئتم ان تقعد فاقعد، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو رہی ہے کہ تشہد ختم کرنے پر یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے بیٹھے یعنی دعا وغیرہ بھی پڑھ لے اور چاہے تو کھڑا ہو جائے والتخییر الخ اور اختیار دینا فرضیت و وجوب کے منافی ہے۔ف۔ یعنی اس کے بعد اب کوئی چیز واجب نہیں رہی، اگر کوئی واجب باقی رہتا تو اس طرح کا اختیار نہ ہوتا کہ چاہے اٹھ کھڑا ہو، اس سے بظاہر یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ تشہد کے بعد سلام کرنا بھی واجب نہیں ہے۔

الا انا اثبتنا الوجوب بما رواه احتیاطا......الخ

البتہ ہم نے احتیاط پر عمل کرتے ہوئے اس حدیث سے وجوب کو ثابت کیا جو امام شافعیؒ نے روایت کی ہے، ف، اسی تحلیلها التسلیم کی حدیث سے ہم نے احتیاطا سلام کے واجب ثابت کیا ہے، اس معنی میں کہ اگر کسی نے سلام چھوڑ دیا تو گنہگار ہوگا، اس کے برخلاف امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سلام ایک واجب اور رکن نماز ہے کہ اگر کوئی اسے ترک کر دیگا تو اس کی نماز فاسد ہوگی، ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ سلام کا ثبوت خبر واحد سے ہے، اور خبر واحد قطعی نہیں بلکہ ظنی ہوتی ہے۔

وبمثله لایثبت الفریضة......الخ

ایسی ظنی دلیل سے کوئی فرضیت ثابت نہیں ہوتی ہے، واللہ تعالی اعلم، ف، میں مترجم کہتا ہوں کہ جس طرح احتیاطا خبر واحد سے سلام کے وجوب کو ثابت کیا ہے اسی طرح احتیاطا ہی اسی نص سے درود کے وجوب کو بھی ثابت کرنا چاہئے، جس سے رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک ذکر ہونے پر ہر بار درود واجب کہتے ہیں، میں نے یہ پہلے بحث پہلے ذکر کر دی ہے۔م۔

چند ضروری مسائل

امام کے سلام پھیر دینے سے مقتدی کا تحریمہ باطل نہ ہوگا اسی بناء پر مقتدی اٹھ کر اپنی نماز پوری کرے گا، لیکن اگر امام نے نماز کے خلاف کوئی کام کیا مثلاً قہقہہ لگایا تو مقتدی کا بھی تحریمہ باطل ہو جائے گا، ایسا مقتدی جس کی کوئی رکعت چھوٹ گئی ہو وہ امام کے ساتھ قعدہ میں التحیات عبدہ ورسولہ تک پڑھے، اس مسئلہ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور زائد میں قدوری، کرخی اور خواہر زادہ کے نزدیک امام کی اتباع ضروری نہیں ہے، اس لئے بعضوں کے نزدیک قرآن کی دعائیں پڑھتا رہے، اور بعضوں کے نزدیک التحیات بار بار پڑھتا رہے اور بعضوں کے نزدیک درود پڑھنا چاہئے اور بعضوں کے نزدیک خاموش بیٹھے رہنا چاہئے، امام جب سلام پھیرے تو مسبوق جلدی نہ کرے بلکہ انتظار کر کے دیکھے کہ اس پر سجدہ سہو تو واجب نہیں ہے، اگر اس کا یقین ہو جائے کہ وہ امام نماز سے فارغ ہو جائے تب کھڑا ہو، اگر مسبوق امام کے سلام پھیرنے سے پہلے ہی کھڑا ہو گیا تو اس نے برا کیا پھر بھی اس کی نماز

جائز ہو جائے گی، امام شافعیؒ کے نزدیک مسبوق کو چاہئے کہ امام کے دونوں سلام کے بعد کھڑا ہو اس کے باوجود اگر اس کے ایک سلام کے بعد ہی کھڑا ہو جائے تو بھی جائز ہے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اپنے فعل سے نماز سے نکلنا مصلی پر فرض نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے۔ مع۔

عینیؒ نے بعض جوامع سے نقل کیا ہے کہ سلام پھیرتے وقت جن جن لوگوں یا چیزوں کی نیت کرنے کے لئے اس سے پہلے مسنون طریقہ بتایا گیا ہے لوگوں نے اس کی موافقت چھوڑ دی ہے، لہٰذا بہت ہی افسوس کی بات ہے، اور در مختار نے بھی اس کی اتباع کی ہے۔ م۔ حجت میں ہے کہ امام جب ظہر، مغرب و عشاء (جن کے بعد مسنون نماز ہے) کا سلام پھیر کر فارغ ہو تو وہ لانبی دعاؤں میں مشغول نہ ہو بلکہ سنت نماز شروع کر دے۔ التاتار خانیہ۔

صحیح حدیث میں بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس دعاء **اللهم انت السلام و منك السلام تبارك يا ذالجلال والاكرام** کے اندازہ کے مطابق بیٹھتے تھے، پھر نماز کے بعد جو دعائیں منقول ہیں وہ دوسری حدیثوں سے توفیق دیتے ہوئے سنتوں کے بعد کی مانی جائے گی، اور شامیؒ نے بھی اسی پر اعتماد کیا ہے، اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ مذکور دعاء سے زیادہ دیر تک پڑھنے میں مشغول ہونا مکروہ ہے، جیسا کہ خلاصہ میں ہے، اور شمس الائمہ حلوائیؒ نے کہا ہے کہ کچھ زیادہ بیٹھنے میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، اسی مسئلہ کو ابن الہمامؒ نے اختیار کیا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو جو سلام کے بعد سنتوں کے لئے کھڑا ہو گیا تھا روک کر کہا تھا سنت کو فرض نماز سے نہ ملاؤ کہ بنو اسرائیل اسی سے تباہ ہوئے، اور حضور ﷺ نے حضرت عمرؓ کی اچھائی بیان کی تھی جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سنت اور فرض کے درمیان فرق کرنا چاہئے، اور حق بات یہ ہے کہ فقہاء میں کچھ اختلاف نہیں ہے، کیونکہ جو لوگ منع کرتے ہیں وہ دیر تک وظیفہ پڑھنے سے منع کرتے ہیں جیسا کہ حجت میں گذرا، اور جو فرق کرنے کو جائز کہتے ہیں وہ اوسط درجہ بیٹھنے کو کہتے ہیں اور امید ہے کہ کراہت سے کراہت تنزیہی مراد ہو گی۔ م۔ اس کے بعد امام مقتدیوں کی طرف رخ کرے اور اگر متقدیوں کی جانب کوئی مسبوق ہو تو دائیں یا بائیں طرف پھر جائے، اور جاڑے وگرمی میں حکم میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ ہر موسم میں حکم برابر ہے۔ یہی صحیح ہے۔

الخلاصہ۔ پڑھنے کے اوراد و ظائف بہت ہیں، اور مستحب ہے کہ **استغفار تین بار، آية الكرسى ایک بار، سبحان الله ۳۳ بار، الحمدلله ۳۳ بار، الله اكبر ۳۳ بار، لااله الا الله وحده لا شريك له له الملك وله الحمد وهو على كل شىء قدير** ایک بار پڑھے کہ ان کی فضیلتیں بہت زیادہ ہیں، اور انشاء اللہ اپنے موقع پر مختصراً وہ بیان کی جائیں گے۔ م۔ د۔

جن فرضوں کے بعد سنتیں ہیں (ظہر، مغرب، عشاء) ان میں اپنے فرض کی جگہ سے دائیں یا بائیں یا پیچھے ہٹ کر یا گھر میں جا کر سنتیں پڑھے، اور مقتدی یا منفرد جہاں چاہے پڑھے، اور جن فرائض کے بعد سنتیں نہیں ہیں (فجر، عصر) ان میں فرض کی جگہ قبلہ رخ بیٹھا نہ رہے بلکہ اگر چاہے تو اٹھ کر چلا جائے، اور اگر چاہے تو آفتاب نکلنے تک محراب میں بیٹھا رہے اور ایسا کرنا افضل ہے، جیسا کہ الخلاصہ میں ہے، فجر سے آفتاب نکلنے تک ذکر میں رہنے کا ثواب شب بیداری (رات بھر عبادت) کرنے کے برابر ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔ م۔

فصل فی القراءة

قال ويجهر بالقراءة الفجر والركعتين الاولیين من المغرب والعشاء ان كان اماما ويخفى فى الاخريين هذا هو المتوارث.

ترجمہ:۔ یہ فصل نماز کے اندر قرآن پاک کی قراءت کے بیان میں ہے، مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ نمازی قرآن پاک کی قرأت

زور سے کرے گا فجر کے فرض میں اور مغرب اور عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں اس وقت جبکہ امام ہو اور ان کے بعد کی رکعتوں میں آہستہ کہے گا، اسی طرز پر عمل در آمد ہوتا چلا آیا ہے۔

توضیح:- فصل قراءت کی، قاری کی چوک، اعراب کے بدلنے سے معنی میں فساد آنا حروف کا بدل جانا، مترجم کی طرف سے وضاحت، ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ کہدینا کلمہ کے ٹکڑے کرنا، کلمہ اور حرف کو آگے پیچھے کرنا، ایک آیت کی جگہ دوسری آیت پڑھ لینا بے جگہ وقف اور وصل کرنا، غلطی کے بعد درست کرلینا، فجر کی دونوں رکعتوں میں قراءت اور مغرب وعشاء کی پہلی دو رکعتوں میں قراءت

فصل فی القراءة، قال ویجهر بالقراءة الفجر والرکعتین الاولیین......الخ

ف۔ ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ رکن قراءت کو دوسرے ارکان میں سے جدا کر کے ایک مستقل فصل میں قراءت کے احکام بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے بیان کیا ہے، اور نوازل میں ہے کہ کسی شخص نے نماز شروع کی اور سوگیا اور اس سوتے ہوئے حالت میں اس نے قراءت قرآن کرلی تو اس کی قراءت ادا ہوگئی کیونکہ شریعت نے ایسی حالت میں سونے کو بیداری کے برابر رکھا ہے، نمازی کی شان کی تعظیم حدیث سے ظاہر ہونے کی بناء پر، اسی بات سے نماز اور طلاق کے درمیان حکم میں فرق ظاہر ہوگیا، کہ اگر کوئی دیوانہ اور بچہ نماز پڑھ لے تو ان کی نماز مقبول ہوگی اور اگر ان میں سے کسی نے طلاق دی تو طلاق مقبول نہ ہوگی، اگر مصنفؒ نے تجنیس میں کہا ہے کہ مختار یہ ہے کہ سوتے ہوئے آدمی کی قراءت جائز نہیں ہوتی ہے، کیونکہ عبادات کی ادائیگی کے لئے اختیار شرط ہے، اور وہ پائی نہیں گئی۔ انتہی۔

لیکن سب سے بہتر وجہ وہی ہے جو فقیہ ابو اللیثؒ نے نوازل میں بیان کی ہے کہ سونے والے کی بھی قراءت درست ہے، اور اختیار ہونے کی جو شرط ہے اس کا ہر وقت پایا جانا ضروری نہیں ہے بلکہ ابتدائے نماز میں ہونا کافی ہے وہ پائی گئی، اسی بناء پر اگر کسی نمازی نے رکوع یا سجدہ کیا ایسی حالت میں کہ اسے اپنے عمل کا مطلق خیال نہیں ہے بلکہ ذہن سے بات نکلی ہوئی ہے پھر بھی ایسا رکوع اور سجدہ درست مانا جاتا ہے حالانکہ یہاں بھی اختیار نہیں پایا گیا۔

بندہ مترجم کا کہنا ہے کہ غفلت اور بیداری ایک دوسرے کے مقابل نہیں ہیں، کیونکہ ذہول وغفلت تو یاد کے مقابل ہے اور خواب بیداری کا مقابل ہے، ایسی صورت میں ایک کا دوسرے پر قیاس کرنا مشکل ہے، پھر فقیہ ابو اللیث نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے اس کا مضمون یہ ہے کہ کوئی نمازی سجدہ کی حالت میں سوگیا تو اللہ تعالی اس بندے کی وجہ سے فرشتوں پر اپنی خوشی اور فخر کا اظہار کرتا ہے، یہ حدیث اس بات پر بالکل دلالت نہیں کرتی ہے کہ اس کی قراءت اور نماز کے دوسرے سب کام ادا ہوگئے، بلکہ معنی تو صرف یہ ہوئے کہ اس انسان نے بشری رکاوٹوں کے باوجود قیام کیا اور عبادت کی، اس لئے بہتر بات وہی ہوئی جو مصنفؒ نے بیان کی ہے، اسی لئے ظہیریہ میں ہے کہ اگر سوتے ہوئے نمازی نے قراءت کی تو قول اصح یہ ہے کہ یہ درست نہیں ہوگی۔ ھ۔م۔ پھر ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ قراءت سے متعلق ایک خاص مسئلہ ہے جس کی بہت سی شاخیں ہیں، اور قراءت کرنے والے کو اکثر لغزش بھی ہوتی ہے، مگر اتنا زیادہ مسئلہ کے اہم ہونے کے باوجود مصنفؒ نے اسے بالکل ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے ہم اسے بیان کرتے ہیں، واضح ہو کہ قاری کی لغزش اور خطایا تو اعراب کی یا حروف کی یا کلمات کی یا آیات کی ہوتی ہے، حروف میں لغزش اس طرح سے ہوسکتی ہے کہ ایک حرف کو دوسرے حرف کے بجائے رکھنا، یا مقدم کرنا یا مؤخر کردینا یا بڑھانا یا گھٹانا ہے۔

اعراب کا بیان

اگر اعراب میں تغیر ہونے سے معنی نہ بگڑے تو نماز فاسد نہ ہوگی، کیونکہ ایسی غلطیوں سے بچنا بہت ہی مشکل ہے، اس لئے معذور

سمجھا جائے گا، اور اگر معنی بگڑ جائے ایسی صورت میں اگر اتنا زیادہ تغیر ہوا ہو کہ اس کے اعتقاد سے کفر لازم آتا ہو مثلاً البارئ المصور کو جو اصل میں اسم فاعل ہے اور واؤ کو زیر ہے، معنی تصویر بتانے والا، کوئی المصور اسم مفعول اور واؤ کو زبر کے ساتھ پڑھے اس کے معنی ہوں گے گڑھا ہوا، مورت بنایا ہوا، نعوذ باللہ من ذلك، یا مثلاً ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں، اس میں اگر لفظ اللہ کو رفع اور العلماء کو کسرہ کے ساتھ ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللهُ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءَ﴾ نمازی پڑھ لے تو اس کے معنی بالکل ہی بدل جائے گے اور یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے علماء سے ڈرتا ہے تو ایسے اعرابی تغیر سے متقدمین کے نزدیک فاسد ہوگی۔ لیکن متاخرین نے اختلاف کیا ہے، چنانچہ ابن مقاتل، محمد بن سلام، ابو بکر بن سعید بلخی، ابو جعفر ہندوانی، محمد بن الفضل اور شمس العلماء حلوائیؒ نے کہا ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی، مگر متقدمین کے قول میں احتیاط زیادہ ہے اس لئے کہ اگر پڑھنے والا بالفرض ایسا عمداً پڑھے گا تو اس پر کفر کا فتویٰ ہوگا، اس طرح یہ کفریہ کلام ہوا جو قرآن ہرگز نہ ہوا، کیونکہ اگر انسانی کلام جو کفریہ نہ ہو اسے بھی نماز کی حالت میں کہنے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، تو ایسا کلام جو کفریہ ہو اس سے تو بدرجہ اولی نماز فاسد ہوگی، اس بناء پر متقدمین کے کلام میں بہت زیادہ احتیاط پر عمل ہے، البتہ عوام کے لئے متاخرین کے کلام میں زیادہ آسانی ہے، کیونکہ عوام تو اعراب کے بدلنے اور اس کے تغیر سے ناواقف اور مجبور بھی ہوتے ہیں۔ قاضی خان۔ اور یہی اشبہ ہے۔ المحیط۔ اسی پر فتویٰ ہے۔ العتابیہ والظہیر یہ۔ اور یہ امام ابو یوسفؒ کے قول پر ظاہر ہے، جیسا کہ چند مسائل سے واضح ہوا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اسی طرح اگر کوئی شخص اتنی عربی جانتا ہو اعراب میں تغیر و تبدل کی وجہ سے کچھ سمجھتا ہو تو وہ معذور نہ ہوگا، لہٰذا اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ م۔ حرکتوں کے تغیر و تبدل کی بحث کے بعد تشدید و تخفیف کی بحث ہے کہ جس جگہ تشدید ہے وہاں اسے ظاہر نہ کرنا اور جس جگہ نہیں ہے وہاں تشدید کرنا، تو اگر کسی نے تشدید کو چھوڑ کر تخفیف کے ساتھ پڑھا تو عام مشائخ کے نزدیک مد اور تشدید کا چھوڑنا ایسا ہی ہے جیسے اعراب میں غلطی کرنا ہے، اس طرح اعراب، مد اور تشدید، تخفیف سب کا حکم یکساں ہوا، اس لئے اگر کسی نے رب العالمین کی باء کو بغیر تشدید کے رب العلمین پڑھا یا اِيَّاكَ نَعْبُدُ میں ایاکَ کی تشدید کو چھوڑ کر اِيَاكَ پڑھا تو بہت سے مشائخ نے کہا ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی کیونکہ معنی بالکل بدل جاتے ہیں اس لئے کہ ایا بغیر تشدید حرف یاء کے معنی آفتاب کے ہیں، اس طرح اس کے معنی ہوں کہ ہم تیرے آفتاب کی عبادت کرتے ہیں، مگر قول اصح یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہوگی، یہی قول مختار ہے۔ الخلاصہ۔

کیونکہ ایاک میں یا کی تشدید کے بعض لغتوں میں بغیر تشدید کے بھی منقول ہے اگرچہ اس کے کہنے والے تھوڑے ہی ہیں، بعض متاخرین نحویوں نے یہ بات نقل کی ہے، اس طرح ہمارے متقدمین اصحاب فقہاء کے قول کے مطابق بھی نماز فاسد نہ ہوگی، اور متاخرین فقہاء کے قول کے مطابق تو اس توجیہ کی بھی ضرورت نہیں ہے، اسی وجہ سے مد کا بھی مسئلہ ہے چنانچہ یہ مسئلہ پہلے گذر چکا ہے کہ اکبر کے ہمزہ کو مد دینے سے نماز فاسد ہو جائے گی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ تکبیر تحریمہ یعنی اللہ اکبر کی بحث میں گذرا ہے، اور خلاصہ میں ہے کہ اگر مد نہ کیا اور ایسا کرنے سے تغیر معنی ہو یا نہ ہو مختار یہ ہے کہ مفسد نماز نہیں ہے، اور خلاصہ میں ہے کہ ﴿مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ﴾ میں اگر ذال کو تشدید دی اور کذّب پڑھا تو بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے نماز فاسد نہ ہوگی، اور اسی پر فتویٰ ہے۔ العتابیہ۔

بے جگہ امالہ کرنے سے بھی نماز فاسد نہ ہوگی، جیسا کہ المحیط میں ہے، حرکت وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد اب حروف کا بیان ہوگا، اس کی بھی کئی صورتیں ہیں، ان میں بھی کئی صورتیں ہیں تو ایسا غلطی سے ہو گیا یا صحیح حرف کی ادائیگی سے مجبوری میں ہوا ہو، اگر غلطی سے ایک حرف کی جگہ دوسرا حرف نکل گیا ہو پھر دیکھنا ہو گا کہ ایسا ہونے سے معنی میں خاص فرق ہوا یا نہیں، پس اگر معنی میں بھی فرق نہ ہوا ہو اور اس جیسا لفظ قرآن پاک میں کہیں موجود بھی ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی جیسے کوئی اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ کی

جگہ ان المسلمون غلطی سے پڑھ لیا چونکہ المسلمین کی طرح المسلمون کا لفظ بھی قرآن پاک میں ہے تو کوئی فرق نہیں آیا لیکن وہ پورے قرآن میں کہیں نہ ہو جیسے کسی نے قَوّٰامِیْنَ بِالْقِسْطِ کی بجائے قیامین بالقسط پڑھ دیا، اسی طرح اگر توابین کی جگہ تیابین پڑھ دیا، اسی طرح الحی القیوم کی جگہ الحی القیام پڑھا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد نہ ہو گی، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فاسد ہو گی، اور اگر معنی بھی بدل گئے تو طرفینؒ کے نزدیک فاسد ہو گی، اور ابو یوسفؒ کے نزدیک اسی صورت میں فاسد ہو گی کہ اس جیسا لفظ قرآن میں نہ ہو، اس بناء پر اگر اصحاب الشعیر تین نقطوں کے ساتھ پڑھ لیا تو بالاتفاق نماز فاسد ہو جائے گی۔

الحاصل طرفین کے نزدیک نماز کے فاسد نہ ہونے میں معنی کے متغیر ہونے کا اعتبار ہو گا، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرآن میں پائے جانے کا اعتبار ہو گا، اس بناء پر ابو منصور عراقیؒ نے جو کہا ہے اس کا اعتبار نہ ہو گا کہ جن دو حرفوں میں تمیز مشکل ہو ان میں حرف بدل جانے سے نماز فاسد نہ ہو گی اور جہاں مشکل نہ ہو ان میں نماز فاسد ہو جائے گی، اسی طرح ابن مقاتلؒ نے جو کہا ہے اس کا بھی اعتبار نہ ہو گا کہ جن حرفوں میں مخرج قریب ہے ان میں ایک کی جگہ دوسرا حرف پڑھ لینے سے نماز فاسد نہ ہو گی اور جن میں مخرج قریب نہ ہو ان میں فاسد ہو جائے گی۔

حاصل یہ ہوا کہ بغیر مشقت کے دو حرفوں میں تمیز ہو سکتی ہو جیسے ط اور ص اس میں صالحات کی جگہ طالحات پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر تمیز کرنے میں مشقت ہو جیسے ظ، ض، دونوں نقطہ دار ہیں یا س، ص، دونوں بغیر نقطہ والے ہیں یا ت، اور ط میں بعضوں نے کہا ہے کہ ایک کی جگہ دوسرے کے پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، مگر اکثر مشائخ نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہو گی۔ الفتح۔ قاضی خان میں بھی یہی ہے، اور وجیز کردری میں لکھا ہے کہ اکثر مشائخ نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، اور شیخ ابو الحسن و ابو عاصمؒ نے کہا ہے کہ اگر ایسا کیا ہو تو فاسد ہو جائے گی، اور اگر زبان پر بے اختیار جاری ہو گیا یا وہ فرق کرنا نہیں جانتا ہو تو فاسد نہ ہو گی، یہی قول درمیانہ اور مقبول و مختار ہے۔ ھ۔ مگر ان مشائخ کی جزئیات ایک جگہ اکٹھی پائی نہیں جاتی ہیں۔

اور خلاصہ میں جو مسائل ہیں ان میں غور کرنے سے آپس میں تضاد اور اختلاف معلوم ہوتا ہے، اس لئے متقدمین کا قول اولیٰ ہو گا، اب اگر مجبوری کی وجہ سے حرف بدلا ہو مثلاً ح کسی سے ادا نہ ہو سکے اور وہ ہ سے ادا کرے جیسے الحمد کی جگہ الھمد کہدے، یا اعوذ نہ کہے کہ اور عین کی آواز کی جگہ ہمزہ کی آواز نکال کر أوْز کہا، یا الصمد کی جگہ السمد بجائے ص کے س سے کہا، تو اگر وہ شخص شب و روز آواز درست کرنے کی کوشش کے باوجود آواز درستگی پر قادر نہ ہو سکے تو نماز درست ہو جائے گی، لیکن کوشش چھوڑ دینے کی صورت میں فاسد ہو جائے گی، اس طرح اسے ہمیشہ کوشش میں لگے رہنا ہو گا، اور الثغ توتلے کا حکم جو بسم اللہ کو ث کی آواز سے پڑھتا تو لام کی جگہ با پڑھتا ہو یا ان جیسا کوئی حرف ہو کہ اس کی زبان سے نہ نکلتا ہو، ایسی صورت میں اگر کلام بدل جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر نماز کے علاوہ تلاوت کی ہو تو وہ مستحق ثواب نہ ہو گا، اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ ایسی کوئی آیت تلاش کرلے جن میں اس کے یہ مشکل الفاظ نہ آئے ہوں اور ان ہی آیات کو پڑھا کرے اور اگر یہ بھی اس کے لئے مشکل ہو یعنی ایسی کوئی آیتیں اسے نہ ملتی ہوں یا یاد نہ ہوتی ہوں تو وہ خاموش رہے، ایسے عاجز شخص پر قیاس کرنے سے یہ حکم نکلتا ہے کہ ایسا شخص جو اپنی بساط بھر کوشش کرتے رہنے کے باوجود کامیاب نہ ہو سکا تو بھی اس کی نماز فاسد نہ ہو گی اور ——— ہم بھی اسی قول کو قبول کرتے ہیں۔ الخلاصہ۔

اور اگر اس سے کلام نہیں بدلا پھر اگر ایسی آیتیں اسے مل جائیں جن میں یہ حروف نہ ہوں تو ان ہی آیات کو یاد کر کے پڑھا کرے، البتہ سورہ فاتحہ کو چھوڑنے یا بدلنے کی اجازت نہ ہو گی، ایسی حالت میں دوسرے کسی کو یہ جائز نہ ہو گا کہ اسے اپنا امام بنائے۔ فافا۔ کا بھی یہی حکم ہے، یعنی وہ شخص جس کی زبان سے ف کی آواز نکلتی رہتی ہو، اسی طرح اس تمتمو کا بھی یہی حال ہے یعنی وہ شخص جو حرف کو سینہ میں بہت گھما کر نکال سکتا ہو، اسی طرح تمتام کا بھی یہی حال ہو گا جو کسی بھی حرف کے نکالنے پر قادر نہ ہو،

اب اگر الثغ یعنی توتلے کو ایسی آیتیں مل جائیں اور ان کے پڑھنے پر وہ قادر ہو جن میں اس کے مشکل حروف نہ ہوں پھر بھی وہ شخص ایسی آیتوں کو چھوڑ کر ایسی آیتیں پڑھ لے جن میں اس کے مشکل حروف موجود ہوں تو اکثر مشائخ کے نزدیک اس کی نماز درست نہ ہوگی، اور اگر آسان آیتیں اسے نہ ملیں تو نماز درست ہو جائے گی۔ الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ جس شخص کی زبان میں سے کچھ حروف ادا نہ ہوتے ہوں تو اس کے لئے یہ بات بہت مشکل ہے کہ نماز کے علاوہ دوسرے اوقات کی تلاوت میں اسے بالکل ثواب نہ ملے اگرچہ اس پر تلاوت فرض نہ ہو، اور ہندیہ میں ہے کہ اگر کچھ حروف کسی کی زبان پر ادا نہ ہوتے ہوں ایسی صورت میں اس نے ایسی آیت نہیں پائی جس میں یہ حروف نہ ہوں تو اس کی نماز جائز ہوگی، مگر ایسے شخص کو کسی دوسرے کی امامت نہیں کرنی چاہئے، اور اگر ان مشکل حروف سے خالی آیتیں مل جائیں تو ان سے بالاتفاق نماز درست ہوگی، اور اگر یہ ایسی آیتوں کے میسر ہو جانے کے باوجود اس نے ایسی آیتیں پڑھیں جن میں وہ مشکل حروف موجود ہوں تو بعضوں نے کہا ہے کہ اس کی نماز جائز نہ ہوگی۔ قاضی خان۔ اور یہی قول صحیح ہے۔ المحیط۔

وہ توتلا شخص اور امی دونوں اس بات میں برابر ہیں کہ اپنے قرآن کو درست کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے اگر کوئی توتلا اپنے ہی جیسے دوسرے کسی کی امامت کرے تو اس کی امامت درست ہوگی، اور اگر کوئی صحیح قراءت کرنے والا امام اسے میسر آجائے تو اسے اپنی تنہا نماز جائز نہ ہوگی۔ ح۔ وابن الشحنہ۔ د۔ اس کی نماز بغیر قراءت کے جائز ہوگی یا نہیں تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔

اب یہاں سے حروف کی تقدیم و تاخیر کا بیان ہے

اگر حروف کی تقدیم و تاخیر سے معنی میں تغیر ہوتا ہو جیسے کوئی قسورہ کو قوسرہ پڑھ دے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور معنی کا تغیر نہ ہو تو امام محمدؒ کے نزدیک فاسد نہ ہوگی مگر امام ابو یوسفؒ کا اس میں اختلاف نہیں ہے۔

حروف کی زیادتی اور کمی کا بیان

ادغام کو توڑ دینا یعنی ملا کر نہ پڑھنا اس کا حکم ایسا ہے جیسا کہ حروف زیادہ کرنے کا ہے، اگر حروف کی زیادتی سے معنی میں فرق نہ آتا ہو جیسے نهی المنکر کی جگہ انهی عن المنکر الف کی زیادتی کے ساتھ، یا ارادوہ (بالتشدید) کو یا پانچ حرفی پڑھا تو عام مشائخ کے نزدیک فساد نہ ہوگا، اور اگر تغیر معنی ہو جائے تو جیسے زرابی کو زرابیب۔

وَالْقُرآنِ الْحَكِيمِ اِنَّكَ الخ پڑھتے ہوئے وانك، واو کی زیادتی کے ساتھ پڑھ دیا، اور اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى کو وَاِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى واو کے ساتھ پڑھا تو فاسد ہو جائے گی۔ الخلاصہ۔ یہی تفصیل حرف کے کم کردینے میں بھی ہوگی جیسے جاء تهم کو جاء ہم پڑھا، تو نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ معنی میں فرق نہ ہوا، اور وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى مَا خَلَقَ الذَّكَرَ پڑھا بغیر واو کے پڑھ کر معنی میں بھی فرق کر دیا اس لئے فاسد ہو جائے گی، اور اگر کم ہونے والا حرف کسی کلمہ کا ہو تو قاضی خان میں ہے کہ اگر وہ صرف اصلی میں سے ہو اور معنی بدل جائے تو امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، جیسے رزقنا کو بغیر راء کے زقنا یا بغیر زاء کے رقنا پڑھا ہو، اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق مشائخ نے کہا ہے کہ اس کے بعد جو کچھ پڑھا ہو اگر وہ قرآن میں موجود ہو تو فاسد نہ ہوگی، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر ایسے کلمہ سے جس کے اصلی حروف تین ہوں ایک حذف کر دیا جیسے عربی کو عری بغیر باء کے پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر چار حرفی لفظ سے آخر کے حرف کو گرا لیا جبکہ وہ اس کے حذف کے قاعدہ کو جیسے ترخیم کرنا کہتے ہیں جانتا ہو مثلاً نادوا یا مالك۔ میں کاف کے حذف کے ساتھ نادوا یا مال پڑھا تو فاسد نہ ہوگی۔ الفتح۔ اور اگر حرف کے حذف کردینے سے معنی میں تغیر آجاتا ہو جیسے بجائے لایومنون کے صرف یومنون پڑھا تو عام مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہوگی۔ المحیط۔ اور یہی قول صحیح ہے۔ العتابیہ۔ اور اگر لایظلمون أفرأیت میں ہمزہ کو حذف کر کے نون کو فا سے ملا کر لا یظلمون فرأیت پڑھا یا یحسبون انهم کی بجائے ہمزہ حذف کر کے یحسبون نهم پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ الذخیرہ۔

ایک کلمہ کی جگہ دوسرا کلمہ پڑھنا

اگر قرآن کے کلمہ کی جگہ جو کلمہ پڑھ دیا ہے اگر دونوں کے معنی قریب قریب ہوں اور جو پڑھا اس جیسا کلمہ قرآن میں موجود بھی ہو، جیسے حکیم کی جگہ علیم پڑھ دیا تو بالاتفاق فاسد نہ ہوگی۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جگہ یہ شرط بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اس سے معنی فاسد پیدا نہ ہوں۔ م۔ اور اگر اس جیسا کلمہ قران پاک میں نہ ہو جیسے اثیم کی جگہ فاجر اور اواہ کی جگہ ایاہ پڑھا تو بھی طرفین کے نزدیک فاسد نہ ہوگی، اور ابو یوسفؒ سے دو روایتیں ہیں۔ الفتح۔

اور خلاصہ میں یقین کے ساتھ کہا ہے کہ ابو یوسفؒ کے نزدیک فاسد ہو جائے گی جیسے توابین کی جگہ کوئی تیابین پڑھا اور اگر وہ کلمہ نہ قرآن میں ہو اور نہ دونوں کے معنی قریب قریب ہوں تو بلا اختلاف نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ اس شرط کے ساتھ کہ وہ کلمہ تسبیح و تحمید کا ذکر نہ ہو، اور اگر وہ لفظ قرآن میں تو ہو مگر دونوں کے معنی علیحدہ ہوں جیسے انا کنا فاعلین کی جگہ غافلین پڑھ دیا اس جیسا کوئی دوسرا لفظ پڑھا مگر ایسا کہ اگر اس کا اعتقاد بھی کرے یا اسی کو صحیح جان کر کہے تو اس سے کفر لازم ہوتا ہو، ایسی صورت میں عام مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، اور ابو یوسفؒ کا صحیح مذہب یہی ہے۔ الخلاصہ۔

اگر فرمان باری تعالیٰ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى میں قالوا نعم پڑھ دیا بھی فاسد ہو جائے گی، اگر آیت کے آخر میں تُمْنُوْنَ کی جگہ تَخْلُقُوْنَ پڑھا تو قول اظہر یہ ہے کہ فاسد ہو جائے گی، انت العزیز الکریم میں اگر العزیز الحکیم تو قول مختار یہ ہے کہ فاسد ہو جائے گی، قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ الْغُرُوْبِ میں عِنْدَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ عِنْدَ الْغُرُوْبِ پڑھنا بھی مفسد ہے، کل صغیر و کبیر مستطر کی جگہ اگر فی سفر یا والنازعات غرقا کی جگہ نزعاً پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر شفعاء کی بجائے شرکاء پڑھا تو بھی فاسد ہو جائے گی، مجمع النوازل میں ہے کہ اگر پیغمبر کے نسب میں دوسرے کلمہ سے پڑھا اور وہ کلمہ قرآن مجید میں موجود ہو جیسے موسیٰ بن لقمان تو امام محمدؒ کے قول کے مطابق فاسد نہ ہوگی، اور امام ابو یوسفؒ کی بھی یہی روایت ہے اور عامہ مشائخ اسی کے قائل ہیں، اور اگر وہ کلمہ قرآن میں نہ ہو جیسے مریم ابنۃ غیلان پڑھا تو بالاتفاق فاسد ہوگی، اور ایسا ہی ہے نبی کا نسب بیان جسے بیان کرنا ہی صحیح نہ ہو تو بھی فاسد ہوگی، جیسے عیسیٰ بن لقمان پڑھ دیا تو اس سے فاسد ہوگی کیونکہ عمداً ایسا پڑھنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ الفتح۔

کلمہ کے ٹکڑے کرنے کا بیان

اگر ایک کلمہ ادا کرتے ہوئے کچھ ادا کیا پھر سانس اکھڑ گئی پھر آخری حصہ ادا کر لیا، یا کچھ کلمہ پڑھا اور بھول گیا پھر باقی یاد آیا اور اتنا ہی پڑھا یا اسے یہ خیال آیا کہ میں پڑھ چکا ہوں، اس وجہ سے باقی نہیں پڑھا، اور اس جیسی دوسری صورتوں میں بعض مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اگر ایسے کلمہ کا ٹکڑا ہو کہ پورا کلمہ اگر کہتا تو نماز فاسد ہو جاتی تو اس کلمہ کے ٹکڑے کے کہنے سے بھی نماز فاسد ہوگی ورنہ نہیں۔ الذخیرہ والمحیط۔ ٹکڑے کا حکم کل کا ہے، یہی قول صحیح ہے، قاضی خان، اور بعضوں نے کہا ہے کہ اگر کلمہ کا ٹکڑا لغو اور بے معنی ہو یا معنی میں تغیر کر دے تو وہ مفسد ہے ورنہ نہیں، البتہ عام مشائخ کے نزدیک بہر حال مفسد نہیں ہے، کیونکہ ایسی غلطیوں سے بچنا انتہائی مشکل ہے، لہٰذا کھانسی کی مانند معاف ہے۔ المحیط والذخیرہ۔ اگر کلمہ کے کچھ حروف کو حذف کر دیا تو صحیح یہ ہے کہ اس سے فساد نہ ہوگا۔ المحیط۔ اگر قرآن کو لحن کر کے پڑھا تو اگر اس کلمہ میں تغیر آگیا ہو تو اس سے فساد ہوگا، اور اگر وہ الحان صرف مدولین میں ہو تو اس سے فساد نہ ہوگا، ہاں اگر اس سے فاحش ہو جائے تو فساد ہوگا، سوائے نماز کے، الحان عامہ مشائخ کے نزدیک مکروہ ہے۔ الخلاصہ۔ اور یہی قول صحیح ہے، الوجیز لکردری۔ اور ان کے سننا بھی مکروہ ہے۔ الخلاصہ۔

کلمہ زیادتی بغیر عوض

اگر قراءت میں کوئی کلمہ زیادہ کر دیا تو اس سے معنی میں فرق آجانے کی صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی، خواہ قرآن

مجید میں یہ کلمہ کہیں ہو یا نہ ہو، جیسے والذین آمنوا باللہ کی بجائے والذین آمنوا و کفروا باللہ، اور اگر زیادتی سے معنی میں فرق نہ آئے اور وہ کلمہ قرآن میں کہیں موجود بھی ہو مثلاً انہ کان بعبادہ خبیراً بصیراً، کی جگہ انہ کان بعبادہ خبیراً بصیراً علیما تو بالاتفاق نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر قرآن میں وہ کلمہ نہ ہو جیسے فاکھۃ و نخل و رمان کی بجائے فاکھۃ و نخل و تفاح و رمان کہا تو عامہ مشائخ کے نزدیک مفسد نہیں ہے۔ المحیط۔

ایک حرف یا ایک کلمہ کو مکرر کرنا

اگر تشدید والے حرف کو علیحدہ علیحدہ کر کے پڑھا مثلاً من یرتد جو دال کی تشدید کے ساتھ ہے اگر اسے من یر د تدد پڑھ کر دال ظاہر کر دی تو فساد نہ ہوگا، اور اگر الحمد للہ کو اللہ تین لام کے ساتھ پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

اگر کلمہ کو مکرر کر دیا

اور اس سے معنی متغیر نہ ہوتے بلکہ مثلاً تاکیدی ہو جائے تو اس سے فساد نہ ہوگا اور اگر متغیر ہو جائے، مثلاً رب العلمین میں رب کو مکرر رب رب العالمین کہہ دیا یا مثلاً مالک ما لک یوم الدین کہدیا تو صحیح یہ ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی۔ الظہیر یہ۔

کلمہ اور حروف کا مقدم اور مؤخر ہونا

ایسی صورت میں اگر معنی میں فرق نہ آئے تو فاسد نہ ہوگی مثلاً لَھُمْ فِیھَا زَفِیْرٌ وَّ شَھِیْقٌ کی بجائے شھیق و زفیر کہا۔ الخلاصہ۔ اور اگر فرق آجائے جیسے اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ میں نعیم کی جگہ جحیم اور جحیم کی جگہ نعیم پڑھا تو اکثر مشائخ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، اور یہی قول صحیح ہے۔ الظہیر یہ۔ یہی حال دو کلمہ کو دو کلموں پر مقدم کرنے کا ہے مثلاً فلاتخافوھم و خافون کی جگہ فلاتخافون و خافوھم کر دیا تو معنی بدل جانے کی وجہ سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر یوم تَبْیَضُّ وُجُوْہٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْہٌ کی جگہ یوم تسود وجوہ و تبیض وجوہ کر دیا تو تغیر نہ ہونے کی وجہ سے فاسد نہ ہوگی، اگر کلمہ کے حرف کو دوسرے حرف پر مقدم کیا مثلاً کعصف کو کعفص کر دیا کہ معنی بدل گئے تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر غثاء احوی میں اوحی کر دیا تو تغیر نہ ہونے کی وجہ سے فساد لازم نہیں آئے گا، اور یہی مختار ہے۔ الخلاصہ۔

ایک آیت کی جگہ دوسری آیت

میں مترجم کہتا ہوں کہ قرآن کے علاوہ کوئی جملہ آیت نہیں ہے، اگر کوئی شخص نے ایسا جملہ کہا جو پورا کلام ہے مگر قرآن کا حصہ نہیں ہے تو اظہر یہ ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی، مگر میں نے کہیں یہ حکم نہیں دیکھا ہے۔ واللہ اعلم۔ م۔

اگر ایک آیت سے بڑھ جانے کے بعد وقف کیا پھر دوسرے مقام کی آیت پوری کی، یا تھوڑی پڑھی تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی مثلاً والعصر ان الانسان پڑھ کر وقف کیا پھر ان الابرار لفی نعیم پڑھا، یا ان الذین آمنوا وعملوا الصلحت پر وقف کی پھر اولئک ھم الکافرون پڑھا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر وقف نہیں کیا اور معنی بھی نہیں بدلے مثلاً ان الذین آمنوا واعملوا الصالحات پڑھ کر ملا دیا فلھم جزاء الحسنی پڑھ دیا جبکہ کانت لھم جنت الفردوس پڑھنا چاہئے تھا، تو بھی فاسد نہ ہوگی، اور اگر معنی بدل گئے جیسے ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اولئک ھم الکافرون پڑھا تو عامہ علماء کے نزدیک فاسد ہو جائے گی اور یہی صحیح ہے۔ الخلاصہ۔

اگر پوری ایک آیت پڑھ کر بھی دوسری آیت پڑھی تو اظہر یہ ہے کہ فاسد نہ ہوگی، کیونکہ ہر آیت مفید ہے البتہ بعض ان صورتوں میں جبکہ عطف کیا جائے جس سے معنی بدل جائیں، مثلاً ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات کانت لھم جنات الفردوس نزلا پڑھ کر کہا واولئک لھم اللعنۃ ولھم سوء الدار، ایسی صورت میں متقدمین کے اصول کے مطابق معنی کا

اعتبار رہو گا، جیسا کہ فتح القدیر کے حوالہ سے ذکر کیا جاچکا ہے، پس اس موقع میں فاسد ہونا ہی ظاہر ہے۔
واضح ہو کہ وقف اور وصل کے اعتبار سے فرق کرنا بہت ہی مشکل کام ہے اور مجھے اس میں تردد ہے، میرے نزدیک زیادہ احتیاط کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جس صورت میں وصل کرنے سے معنی میں فساد آتا ہو وہاں وقف سے بھی احتیاطاً فساد کا ہی اعتبار کیا جائے۔ البتہ آخر میں ایک غور طلب مسئلہ بھی ذکر کیا جارہا ہے، انتظار کرنا چاہئے۔ م۔

بے موقع وقف اور وصل کرنا

اگر بے موقع وقف کیا یا ابتداء کی تو اگر معنی میں بہت زیادہ فرق نہ ہوا ہو مثلاً یوں کہا ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات اور وقف کر دیا اس کے بعد اولئك هم خیر البریه سے ابتداء کی تو بالاتفاق نماز فاسد نہ ہو گی۔ المحیط۔ اسی طرح بے موقع وصل کرنے میں جیسے اصحاب النار پر وقف نہ کیا بلکہ اس کے فوراً بعد پڑھ دیا الذین یحملون العرش تو اس سے فاسد نہ ہو گی مگر برا ہے۔ الخلاصہ۔

اگر معنی میں بہت زیادہ فرق ہو جائے مثلاً شهد الله انه لااله کہہ کر وقف کر دیا الا هو کہا تو اس میں اختلاف ہے، مگر عام علماء کے نزدیک فساد نہ ہو گا، اور اسی پر فتوی ہے کہ وقف اور وصل کی کسی صورت میں بھی فساد نہ ہو گا۔ المحیط۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وقف اور وصل کے اثر کا اعتبار نہیں ہے۔ م۔ قاضی ابو بکرؒ نے فرمایا ہے کہ قراءت ختم کرنے کے بعد جب رکوع کرنا چاہے اگر وہ قراءت اللہ تعالیٰ کی کسی ثناء وصفت پر ختم ہوئی ہو تو تکبیر کہتے وقت اللہ اکبر سے ملانا اولیٰ ہے، اور اگر ثناء پر ختم نہ ہو مثلاً یہ پڑھا ان شانئك هو الابتر تو اسے اللہ اکبر سے نہیں ملانا چاہئے یعنی ابتر کی راء کو لفظ اللہ سے علیحدہ کرنا چاہئے۔ التاتارخانیہ۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ ادب کا حکم اسی طرح کا ہے جیسا کہ تلاوت قرآن کے وقت ۲۵ پارہ الیه یرد علم الساعة الخ میں کہا گیا ہے کہ اسے اعوذ بالله من الشطین الرجیم سے نہیں ملانا چاہئے، کیونکہ اس کی الیہ کی ضمیر میں اس بات کا شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ شیطٰن کی طرف لوٹ رہی ہے۔ م۔

ایسی قراءۃ جو اس مصنف اجماعی میں نہ ہو

معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور خلافت میں تمام صحابہ کرام کے اجماع سے موجودہ قرآن جو متواتر ہے تمام مروجہ قراءتوں کے ساتھ جمع کیا گیا ہے اب ایسی قراءۃ جو اس میں سے نہ ہو وہ قرآن نہیں ہے کیونکہ قرآن تو ایسی قراءۃ کا نام ہے جو متواتر قطعی اور مروجہ میں سے ہو، اور یہ صفت شاذ قراءۃ کی نہیں ہے لہذا یہ قراءت قرآن کی صفت نہ ہوئی۔ م۔
اگر مصلی نے ایسے آیتوں کی قراءت کی جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ وغیرہ کی طرف منسوب ہوتی ہوں تو ان کا اعتبار نہ ہو گا، اور قراءت کے نہ ہونے کے برابر ہوں گی، اس لئے اس کی قراءت سے نماز ادا نہ ہو گی البتہ اس سے وہ نماز فاسد نہ ہو گی اس طرح سے کہ ان کے علاوہ اگر اور بھی متواتر آیتوں میں سے بقدر ضرورت تلاوت کر لی تو نماز صحیح مانی جائے گی، یہی قول صحیح ہے۔ المحیط۔

غلط پڑھنے کے بعد اس کی اصلاح کر لینا

فوائد ذخیرہ میں ہے کہ اگر اس طرح قراءت کی جو بڑی غلطی سمجھی جاتی ہے مگر فوراً اس کی اصلاح کر لی تو انہوں نے کہا ہے کہ میرے نزدیک اس کی نماز جائز ہو گی، اور اعراب کی غلطی کا بھی یہی حکم ہے، اگر اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ مؤنث کا صیغہ استعمال کیا تو بعضوں نے کہا ہے کہ اس سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور کچھ دوسرے مشائخ نے اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ المحیط والذخیرہ۔

ایک بہت مفید قاعدہ

امام ابوالقاسم الصفارؒ سے منقول ہے کہ جب کئی وجہوں سے جائز مگر ایک وجہ سے فاسد ہو سکتی ہو احتیاطا اس کے فاسد ہونے کا ہی حکم دیا جائے، البتہ قراءت کے سلسلہ میں کہ اس میں عام لوگ مبتلا اور گرفتار ہوتے رہتے ہیں۔ الظہیر یہ۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ بندہ نے وقف اور وصل کی بحث میں فساد کا حکم دینے میں احتیاط سے کام لیا ہے، اس وجہ سے کہ ان میں صراحۃ فساد کا حکم ہو رہا تھا لیکن جائز ہونے کا حکم بہت ہی کم اور مجروح تھا، مگر ابھی مذکورہ قاعدہ اس صورت میں ہے کہ جبکہ جواز کا حکم بھی صراحۃ پایا جا رہا ہو، اور یہ فیصلہ اس بندہ کا اپنا اختیار کردہ ہے، مگر مشائخ کے اقوال تو بروقت ذکر کر دئے گئے ہیں، لہٰذا اس تفصیل کو ذہن نشین رکھنا چاہئے، اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہاں اختصار کے ساتھ قراءت کے مسئلہ کا بیان کیا گیا، اور یہ بحث اصل قراءت سے متعلق تھی اسی لئے اسے پہلے ذکر کیا گیا، تاکہ بلکل صحیح طریقہ کے ساتھ نمازی اپنی نماز میں قراءت کر سکے جیسا کہ مصنفؒ نے ذکر کیا ہے۔

قال ویجهر بالقراء ۃ فی الفجر والرکعتین الاولیین من المغرب والعشاء ان کان اماما......الخ

اور نمازی قراءت جہر کرے۔ ف۔ واجب جان کر کرے، فجر کی نماز میں۔ ف۔ یعنی اس کی دو رکعتوں میں، اور مغرب و عشاء کی پہلی دونوں رکعتوں میں ان کان اماما الخ جہر کرنے کا مذکورہ حکم اس وقت ہے جبکہ نمازی امام ہو، ویخفی الخ اور پچھلی رکعتوں میں۔ ف۔ یعنی باقی نمازوں میں کہ مغرب میں ایک اور عشاء میں دو رکعتیں ہیں۔

هذا هو المتوارث......الخ

اسی طریقہ پر عمل در آمد ہے، متوارث ہے۔ ف۔ یعنی ہم نے اپنے اسلاف کرام سے نماز پڑھنے کا یہی طریقہ پایا ہے، اور ان لوگوں نے اپنے اسلاف سے اسی طرح تابعین اور تابعینؒ نے صحابہ کرامؓ سے اسی طرح پایا ہے، اور صحابہ کرامؓ نے بھی یقیناً اسی طرح رسول اللہ ﷺ سے پایا ہے۔ الفتح۔ اور قاعدہ ہے کہ جو بات اس طرح عام متوارث طریقہ سے ثابت ہوتی ہے اس کو مزید ثابت کرنے کے لئے کسی نص کے مطلق ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ اس طرح متواتر ثبوت انتہائی قوی ہے، اور یہی راز ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس بات میں بھی کہ قرآن پاک میں نماز کی ترکیب رکعتوں کی تعداد وغیرہ کو تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا ہے۔ م۔

اور عینیؒ نے دار قطنیؒ کی روایت سے قتادہ عن انسؓ کی حدیث جو حضرت جبریل علیہ السلام کی امامت کے بیان میں ذکر کی گئی ہے اس میں قراءت کو جہر اور اخفاء کے ساتھ کرنے کا اسی طرح بیان کیا گیا ہے، اور ابوداؤدؒ نے اس بیان کی دو روایتیں حسنؒ اور زہریؒ سے ذکر کی ہیں، اور عبدالحقؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مرسل بھی احسن واصح ہے، پھر میں مترجم یہ بھی کہتا ہوں کہ ان روایتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جیسے جہر کرنا واجب ہے ویسے ہی جہر کرنے میں اصل مغرب و عشاء کی پہلی دو رکعتیں ہیں، ایسی بات نہیں ہے کہ پہلی دونوں یا آخری دونوں میں سے کسی میں بھی پڑھ لینے کا اختیار ہو، جیسا کہ بعض مشائخ نے کہا ہے، اگرچہ اس جگہ تین اقوال ہیں اور ان میں طویل بحث ہے، جیسا کہ شامیؒ نے ذکر کیا ہے۔ م۔

وان کان منفرداً فهو مخیر ان شاء جهر واسمع نفسه، لانه امام فی حق نفسه، وان شاء خافت، لانه لیس خلفه من یسمعه، والافضل هو الجهر، لیکون الاداء علی هیأة الجماعة، ویخفیها الامام فی الظهر والعصر، وان کان بعرفة لقوله علیه السلام: صلوٰة النهار عجماء، ای لیست فیها قراء ۃ مسموعة، وفی عرفة خلاف لمالك، والحجة علیه مارویناه.

ترجمہ:۔ اور اگر نمازی تنہا ہو تو اسے اختیار ہے کہ اگر چاہے تو جہر کرے یعنی اپنے آپ کو سنائے، کیونکہ وہ اپنی ذات کے

معاملہ میں امام ہے، اور اگر چاہے تو آہستہ کہے کیونکہ اس کے پیچھے کوئی ایسا نہیں ہے جسے وہ سنائے، پھر بھی اس کے لئے جہر کرنا ہی افضل ہے تاکہ اس کی ادائیگی جماعت کی حالت پر ہو، لیکن امام ظہر اور عصر کی نمازوں میں آہستہ قراءت کرے گا اگر چہ مقام عرفہ میں ہو، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ دن کی نماز عجماء یعنی گونگی ہے، یعنی دن کی نماز میں ایسی قراءت نہیں ہے جو سنی جائے، اور مقام عرفہ کے بارے میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے، ان کے خلاف ہماری دلیل وہی ہے جو ہم نے پہلے روایت کر دی ہے۔

توضیح:- تنہا نماز پڑھنے والا، ظہر اور عصر میں آہستہ پڑھنا، حدیث سے دلیل، عرفہ میں قراءت

وان کان منفرداً فھو مخیر ان شاء جھر واسمع نفسہ، لانہ امام فی حق نفسہ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے مخیر ف یعنی جہر یا اخفاء کرنا اس پر کچھ بھی واجب نہیں ہے، لانہ امام الخ کیونکہ وہ اپنی ذات کے حق میں امام ہے۔ف۔اس سے معلوم ہوا کہ جہر کرنا اسی قدر ضروری ہے کہ وہ سنا سکے، اس میں کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنادے تو اسے جہر کرنا کہا جائے گا، اسی لئے جماعت کی نماز پڑھانے والے امام کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ضرورت سے زیادہ آواز بلند نہ کرے بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اپنے نفس کو تکلیف اور پریشانی میں نہ ڈالے، جیسا کہ فتح القدیر وغیرہ میں ہے۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ اگر امام کو جماعت کی دور تک کی صفوں کو سنانے کی ضرورت ہو لیکن زور سے قراءت کرنے کی وجہ سے اسے تکلیف ہوتی ہو تو اسے زور لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، جس سے اسے حضوری قلب میں پریشانی ہو جائے، بلکہ اسی انداز سے جہر کرے جس سے اسے تکلیف نہ ہوتی ہے، اس سلسلہ میں انشاء اللہ مزید گفتگو بعد میں ہوگی، اور حاصل یہ ہوا کہ منفرد کو اختیار ہے کہ وہ آہستہ پڑھے یا جہر کرے مگر اسی قدر جہر کرے کہ اپنے کو سنادے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے، تاج الشریعہ نے کہا ہے کہ یہ تفسیر منفرد کے جہر کرنے کی ہے، فخر الاسلامؒ نے کہا ہے کہ پوری طاقت سے جہر نہ کرے۔ع۔

وان کان منفرداً فھو مخیر ان شاء جھر واسمع نفسہ......الخ

اور اگر چاہے تو اخفاء کرے کیونکہ اس کے ساتھ ایسا کوئی نہیں ہے جسے وہ سنا سکے۔ف۔یوں تو اللہ عزوجل تو ہر آہستہ اور زور کی آواز کو سمجھتا ہے۔والافضل الخ اور ان دونوں اختیاری باتوں میں سے افضل جہر ہی کرنا ہے تاکہ منفرد شخص کا بھی جماعت کی طرح ادا کرنے کی صورت پائی جائے۔ف۔جو جہر سے ضروری ہوتی ہے، مذکورہ اختیار منفرد کے لئے جس طرح جہری نماز میں ہے، اسی طرح بعضوں نے سری نماز میں بھی منفرد کو مختار سمجھا ہے، اور عصامؒ نے اس کی دلیل یہ دی ہے کہ منفرد اگر ظہر وعصر نماز میں جہر کرے تو اس پر بھی سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا ہے، مگر ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ منفرد کو آہستگی کے ساتھ قراءت کرنا لازم ہے۔الفتح۔ تبیین میں کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ھ۔یہ تفصیل اس صورت میں ہے جبکہ وہ اپنی نماز وقت کے اندر ادا کر رہا ہو، لیکن اگر وقت کے بعد قضاء کرنا چاہتا ہو تو اس کی تفصیل عنقریب آئے گی۔م۔

ویخفیھا الامام فی الظھر والعصر..............الخ

اور امام ظہر وعصر کی نماز میں قراءت آہستگی کے ساتھ کرے۔ف۔اور جب جماعت ہونے کی صورت میں بھی جس میں جہر کیا جاتا ہے امام آہستگی کے ساتھ قراءت کرتا ہے تو منفرد بدرجہ اولی ان دونوں نماز میں اخفاء کرے گا، اس سے پہلے اس مسئلہ کو صحیح ثابت کیا جا چکا ہے، اور جس طرح جہر یہ نمازوں میں توارث پایا گیا ہے اسی طرح سریہ نمازوں میں بھی توارث ہے، اس کی دلیل حضرت خباب بن الارتؓ کی حدیث ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ ظہر اور عصر میں قراءت کرتے تھے فرمایا ہاں کرتے تھے، ان سے پھر پوچھا گیا کہ آپ لوگوں کو یہ کیسے معلوم ہوتا تھا، جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کی ڈاڑھی مبارک ہلتے رہنے سے، یہ روایت بخاری کی ہے، اور حضرات ابو سعید خدریؓ کی حدیث جو صحیح مسلم میں ہے کہ ظہر وعصر کی پہلی دو رکعتوں میں

قراءۃ کاالم سجدہ کے برابر ہوتی تھی، اور آخر دونوں رکعتوں میں اس کی نصف قراءۃ ہوتی تھی، اور دوسری روایت میں ہے کہ پہلی دونوں رکعتوں کی ہر ایک رکعت میں تقریباً ۳۰ آیتیں ہوتیں توان روایتوں سے یہ بات معلوم ہوئی کہ قراءۃ سراً ہوتی تھی، کیونکہ اگر جہراً ہوتی تو اس طرح تخمینہ لگانے کی ضرورت نہ ہوتی بلکہ ٹھیک آیتیں بتادی جاتیں۔

الحاصل ان مذکورہ احادیث کے علاوہ امامت جبرئیل علیہ السلام کی حدیث جو حضرت انسؓ سے مروی ہے، اور نماز ظہر و عصر کے پڑھنے کا طریقہ بطریقہ تواتر اور توارث ہم تک پہونچا ہے ان سب میں قراءت کے اخفاء کا ثبوت ہے جس کی وجہ سے اس کا اخفاء کرنا ہی ہم پر لازم اور واجب ہوتا ہے۔

، وان کان بعرفة لقوله علیه السلام: صلوٰة النهار عجماء......الخ

اگرچہ عرفہ کے مقام میں ہو۔ف۔ یعنی حج کے مقام عرفہ میں جہاں ظہر اور عصر کی نمازیں بیک وقت ادا کی جاتی ہیں، چونکہ اس مسئلہ میں امام مالکؒ کا اختلاف موجود ہے اس لئے اس کو صراحۃً ذکر کردیا ہے۔لقوله علیه السلام الخ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ صلوۃ النہار عجماء، یعنی دن کی نماز گونگی ہے۔اعجم مذکر اور عجماء مونث ہے بمعنی گونگی

ای لیست فیها قراء ة مسموعة......الخ

یعنی دن کی نماز میں ایسی قراءت نہیں ہوتی جو سنی جائے۔ف۔ گویا اس مذکورہ تعمیم سے اس بات پر استدلال ہے کہ عرفہ کا میدان ہو یا کہیں بھی ہو ان نمازوں کی قراءت جہری نہ ہوگی، لیکن نوویؒ نے کہ روضہ میں کہا ہے کہ یہ حدیث نہیں ہے۔عف۔ اور علمائے نقل (محدثین) نے اس کی حدیث نہ ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ع۔ عبد الرزاقؒ نے اسے مجاہد ابو عبیدہ تابعین کا قول نقل کیا ہے۔فع۔ان اقوال کے باوجود اس میں سے جمعہ اور عیدین کی نمازیں مستثنیٰ ہیں، اس لئے اولی یہی ہے کہ امام مالکؒ کے قول کی بناء پر ان حضرات سے نص کا مطالبہ کیا جائے، اور اگر حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ سے جہر کا ثبوت ہو تو وہ دلیل ہوگی ورنہ نہیں۔م۔

وفی عرفة خلاف لمالك، والحجة علیه ماروینا ه......الخ

اور مقام عرفہ میں امام مالکؒ کا اختلاف ہے۔ف۔ کہ وہ جمعہ پر قیاس کرتے ہوئے جہر کرنے کی قائل ہیں۔ **والحجة الخ** اور امام مالکؒ کے خلاف ہماری وہ دلیل ہے جو ہم نے روایت کی ہے۔ف۔ مگر وہ مرفوع حدیث نہیں ہے، لہٰذا کسی دوسری نقلی دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ یہاں صرف قیاس کرنا کافی نہیں ہے۔ف۔ یہ ساری بحثیں فرائض کی ادائیگی میں جہر و اخفاء کرنے سے متعلق تھیں۔

ویجهر فی الجمعة والعیدین لورود النقل المستفیض بالجهر وفی التطوع بالنهار یخافت، وفی اللیل یتخیر اعتبارا بالفرض فی حق المنفرد، وهذا لانه مکمل له فیکون تبعا له، ومن فاتته العشاء فصلاها بعد طلوع الشمس، ان ام فیها جهر کما فعل رسول الله ﷺ حین قضی الفجر غداة لیلة التعریس بجماعة .

ترجمہ :-اور جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں جہر کرے گا، اس نقل کے پائے جانے کی وجہ سے جو جہر ہونے کے ساتھ عام شائع ہے، اور دن کی نفل نماز میں اخفاء کرے گا، اور رات کی نفل میں اختیار ہے، منفرد کے حق میں فرض نماز پر قیاس کرتے ہوئے، یہ اس لئے کہ نفل نماز فرض کو مکمل کرنے والی ہوتی ہے، لہٰذا نفل فرض کے تابع ہوگی، اور وہ شخص جس کی عشاء کی نماز چھوٹ گئی اور اسے آفتاب نکلنے کے بعد ادا کرنا چاہتا ہے تو چاہئے کہ اگر امامت کرتا ہو تو اس میں جہر کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ التعریس کی صبح میں جماعت کے ساتھ فجر کی قضاء کی ہے۔

توضیح :- جمعہ اور عیدین کی قراءت، نفل نماز میں قراءت، فائتہ عشاء کو دن میں ادا کرنا

ویجهر فی الجمعة والعیدین لورود النقل المستفیض بالجهر......الخ

اور امام جمعہ و عیدین میں جہر کرے۔ف۔ جہر کرنا واجب ہے لورود النقل الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے،ف۔ یعنی بطریق شہرت منقول ہے، کہ جمعہ اور عیدین میں قراءت جہراً ادا کی جاتی ہے، للہٰذا یہ بھی ایک حد تک توارث کی دلیل ہے، روایتوں میں سے ایک روایت حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین اور جمعہ میں سبح اسم ربك الاعلی اورھل اتلك حدیث الغاشیه پڑھتے تھے بخاری کے علاوہ ائمہ خمسہ نے اس کی روایت کی ہے،اور حضرت ابوواقد اللیثیؓ کی حدیث میں عیدین کی قراءت کے بارے میں ہے کہ ق والقرآن المجید،اور اقتربت الساعه الخ ہے، جیسا کہ مسلمؒ نے روایت کی ہے، پس متوارث دلیلوں سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ ان سورتوں کی قراءت بالجہر کرتے تھے،اور بیہقیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ عیدین کی نماز میں جہر کرنا سنت ہے،اور عیدین میں جبانہ جانا سنت سے ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جبانہ سے مراد محلّہ سے نکل کر عیدگاہ میں جاکر پڑھنا سنت ہے، یہ لفظ سنت کا ہے مگر اس پر ہمیشگی اور اجماع پائے جانے کی وجہ سے قراءت بالجہر واجب ہوئی۔ف۔جماعت کے ساتھ تراویح اور رمضان کے وتر با جماعت میں بھی قراءت میں جہر کرنا ہے۔ت۔اگرچہ تراویح نہ پڑھی ہو (پھر بھی وتر کا حکم یہی ہے) مجمع الانہار،اور کہا گیا ہے کہ قول اصح یہ ہے کہ ان میں بھی جہر واجب ہے۔ق۔ش۔ط۔اور جس ذکر کو نماز میں ادا کرنا واجب ہو اسے بھی جہراً کہنا چاہئے جیسے تکبیر افتتاح اور ایسا ذکر جو فرض نہیں ہے تو اگر وہ کسی علامت کے طور پر ہو تو اسے بھی امام جہراً کہے، جیسے ہر اٹھتے اور جھکتے وقت کی تکبیریں، لیکن مقتدی اور منفرد جہر نہ کرے،اور ایسی تکبیریں جو کسی نماز کے ساتھ مخصوص ہو جیسے عید کی تکبیریں، تو ان میں بھی جہر کرے،اور قنوت کو بھی جہر اًادا کرنا عراق کے مشائخ کا قول ہے، لیکن صاحب الہدایہؒ نے اس کو اخفاء کرنا مختار کہا ہے،ان کے علاوہ دوسرے اذکار کو جہر نہ کرنا چاہئے، جیسے تشہد، آمین اور تسبیحات وغیرہ۔البحر الرائق۔

وفی التطوع بالنهار یخافت......الخ

اور دن کی نفل میں اخفاء کرے۔ف۔ یعنی اخفاء کرنا واجب ہے۔الزاہدی۔ مگر رات کی نفل میں اختیار ہے۔ف۔ کہ جہر کرے یا اخفاء کرے اعتبارا الخ منفرد کے حق میں فرض پر قیاس کرتے ہوئے۔ف۔ یعنی جیسا کہ فرض نماز میں منفرد کا حکم ہے کہ دن کے فرائض میں اخفاء کرنا واجب ہے مگر جہری نماز میں اسے اختیار ہے،اسی طرح رات کی تنہا نفل پڑھنے والے کا اس پر قیاس ہے،اس لئے جہر کرنا افضل ہے۔

وهذا لانه مکمل له فیکون تبعا له......الخ

یعنی نفل کا تنہا فرض پڑھنے والے ہی پر قیاس کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفل نمازیں فرض نمازوں کی کمی کو پورا کرنے والی ہوتی ہیں،اسی لئے نفل فرض کے تابع ہو گی،ف،اور رات کے وقت تنہا فرض پڑھنے والے کو بھی اختیار ہے اس طرح تنہائی میں نفل پڑھنے میں بھی اختیار ہے۔م۔اور اگر نفل نماز جماعت سے پڑھی جائے تو امام اس میں بھی جہر کرے۔الزیلعی۔اور اب قضاء کا بیان ہے۔

ومن فاتته العشاء فصلاها بعد طلوع الشمس، ان ام فیها جهر......الخ

اور جس شخص کی عشاء کی (یا فجر یا مغرب کی) نماز فوت ہو گئی پھر آفتاب نکلنے کے بعد اسے قضاء کرنا چاہئے،اور اگر امامت کر رہا ہو تو اس میں جہر کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے لیلۃ التعریس کی فجر کی نماز قضاء کرتے ہوئے جماعت سے جہر قراءت کی تھی،ف، تعریس کے معنی ہیں مسافر کا آخر رات میں چلنے سے اتر کر آرام کرنا،اس سے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کا جو مختصر ا یہ ہے،ایک مرتبہ جہاد کے سفر سے واپسی میں صحابہ کرامؓ کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ پورے لشکر کے ساتھ ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، اور بلالؓ نے ساری رات جاگتے رہنے کی از خود ذمہ داری لی مگر وہ بھی سو گئے جاگ نہ سکے،وہ اس وقت جاگے جب ان پر دھوپ

پڑی، تو رسول اللہ ﷺ نے وہاں سے کوچ کرنے کا حکم فرمایا، اور آگے بڑھ کر جب آفتاب ایک نیزہ بلند ہو گیا تو وہاں اتر کر وضوء کیا اور موذن کو اذان کا حکم دیا پھر دو رکعتیں پڑھی یعنی فجر کی سنت ادا کی، پھر معمول کے مطابق اقامت کے بعد جماعت سے نماز پڑھائی، جیسا کہ اسے مسلم اور احمدؒ نے ابو قتادہؓ و مالکؒ عن زید بن اسلم مرسلاً روایت کی ہے، اور محمدؒ نے آثار میں عن ابی حنیفہ عن حماد عن ابراہیم پر مرسلا روایت کی ہے، اور امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے، کہ جہری نماز کی قضا اگر جماعت کے ساتھ ہو تو امام جہر کرے، قاضی خان میں ہے کہ اگر امام نے بھولے سے اخفاء کر لیا تو اس پر سجدہ سہو واجب ہے۔ ھ۔ یہ تفصیل تو امام کے ساتھ قضاء کرنے کے بارے میں ہے، کیونکہ اگر تنہا قضاء کرے تو اس میں اختلاف ہے، جیسا کہ ہندیہ میں ہے کہ اگر جہری قضاء نماز کو کوئی تنہا پڑھے تو اصح قول یہ ہے کہ اسے جہر کرنا ہی افضل ہے۔ المحیط۔ الکافی۔ الذخیرہ و قاضی خان۔ شمس الائمہ، فخر الاسلام، اور متاخرین فقہاء کا مختار مسلک یہی ہے، قاضی خان نے کہا ہے کہ جہر کے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ قضاء میں ادا کے موافق ہو جائے، اور منفرد کو جب وقتیہ ادا کرنے میں اختیار ہے تو اسے قضاء میں بھی اختیار ہے، لیکن جہر کرنا ہی افضل ہے، مگر ہمارے مصنفؒ نے اس قول کو تسلیم نہیں کیا اور اس لئے فرمایا۔

وان كان وحده خافت حتما ولايتخير هو الصحيح، لان الجهر يختص إما بالجماعة حتما أو بالوقت في حق المنفرد على وجه التخيير ولم يوجد احدهما.

ترجمہ:- اور اگر نمازی قضاء نماز تنہا پڑھتا ہو تو وہ لازمی طور سے آہستہ قراءت کرے گا، اور اسے اختیار نہیں دیا جائے گا، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ جہر کرنا مخصوص ہے ان دو صورتوں میں نمبر ۱۔ جماعت کے ساتھ ہو تو اس وقت جہر کرنا لازم ہے، نمبر ۲۔ یا وقتیہ نماز میں تنہا پڑھنے والا ہو تو وہ مختار بنایا جاتا ہے اور یہاں دونوں میں سے ایک صورت بھی نہیں پائی گئی۔

توضیح:- اگر نمازی قضاء نماز تنہا پڑھتا ہو تو وہ اخفاء ہی کرے گا

وان كان وحده خافت حتما ولايتخير هو الصحيح......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے **هو الصحيح** الخ یہی قول صحیح ہے۔ ف۔ تاج الشریعہؒ نے وقایہ میں اسی قول کو متن قرار دیا ہے، اور تنویر میں اسی قول کی اتباع کی ہے۔

لان الجهر يختص إما بالجماعة حتما أو بالوقت في حق المنفرد......الخ

اس کا مطلب بھی ترجمہ سے واضح ہے۔ ف۔ حاصل مسئلہ یہ ہوا کہ قراءت میں جہر یا اخفاء کرنا صرف شریعت کے فیصلہ پر موقوف ہے، جبکہ ہم نے حکم شرعی میں جہر کرنے کی دو صورتیں پائی ہیں ایک تو جہر واجب ہے جبکہ جہری نماز جماعت سے پڑھی جائے، خواہ ادا ہو یا قضاء، یہ پوری بحث دلیل کے ساتھ پہلے گذر چکی ہے، دوسرا جہر جس میں اختیار بھی ہے کہ آہستہ پڑھے یا جہر کرے، یہ اس صورت میں ہے جبکہ تنہا پڑھنے والا جہری نماز وقت کے اندر پڑھتا ہو تو اسے اختیار ہے کہ جہر کرے، اور ایسا کرنا اخفاء کرنے سے افضل بھی ہے۔

ولم يوجد احدهما......الخ

اور ان دونوں صورتوں میں سے ایک بھی یہاں نہیں پائی گئی۔ ف۔ اس وقت جبکہ جہری کو وقت کے بعد منفرد قضاء کرتا ہو، اور یہ بات جو مشہور ہے کہ نماز میں اصل جہر اً ہی پڑھنا ہے، مگر مشرکین چونکہ دن میں ہنگامے اور شور کیا کرتے اس لئے دن کے وقت جہر کرنے سے منع کر دیا گیا ہے جس کی دلیل یہ فرمان باری تعالی ہے ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا﴾ کہ تم اپنی نماز نہ تو زور کے ساتھ ادا کرو اور نہ ہی آہستگی کے ساتھ بلکہ دونوں کے درمیان کی راہ تلاش کرو، اور اس کی درمیانی راہ یہ ہوئی کہ دن میں اخفاء ہو اور رات میں جہر باقی رہا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تفسیر گویا بالرائے ہے، مگر صحیح تو یہ ہے کہ ابن عباسؓ سے یہ منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں چھپے رہتے تھے اور جب بھی آپ قراۃ قرآن کے وقت آواز بلند کرتے تو مشرکین آپ کی آواز سن کر قرآن کو اور اس کے نازل کرنے والے کو اور اس کے لانے والے کو برا بھلا کہتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ﴾ الخ، یعنی اپنی قراءت میں جہر نہ کیجئے کہ مشرکین اسے سنیں وَلَا تُخَافِتْ بِهَا اور اس کو اخفاء بھی نہ کیجئے، یعنی اتنا اخفاء نہ کیجئے کہ اپنے اصحاب کو بھی نہ سنا سکیں، ﴿وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيلًا﴾ یعنی جہر و اخفاء کے درمیان کی راہ اختیار کیجئے، یہی روایت صحیحین، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے، یا صحیح کی روایت جو حضرت ام المومنین عائشہؓ سے دعا کے بارے میں ہے اور امامت جبرئیل کی حدیث سے جہر اور اخفاء کا ثبوت ہوتا ہے۔

اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز میں پڑھتے، پھر آپ نے جو ہمیں سنایا وہ تم کو سنایا، اور جو ہم سے مخفی کیا وہ ہم نے بھی تم سے مخفی کیا، اس کی روایت ابو داؤد اور نسائی نے کی ہے، اور ایک صحیح روایت میں ہے کہ نماز کی ہیئت خشوع و خضوع اور تمسکن کی ہے، جیسا کہ ترمذی میں فضل بن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے، اور بیاضیؓ نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کے حالات معلوم کرنے نکلے جبکہ وہ نماز پڑھتے تھے اور ان کی قراءت بلند آواز سے ہو رہی تھی تو آپ نے فرمایا کہ تم تو اپنے رب سے مناجات کر رہے ہو ذرا یہ دیکھنا چاہئے کہ کس چیز سے مناجات کرتے ہو، اتنی بلند آوازی کے ساتھ قراءت میں مقابلہ نہ کرو۔ مالکؒ نے اس کی روایت کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی اصل سکون کے ساتھ مناجات کرنی ہے، کیا تم نہیں دیکھتے کہ فاتحہ دعا ہے اور اس میں اصل اخفاء کرنا ہی ہے، اور یہ فرمان ﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلٰوتِكَ﴾ کا عمل تورات گئے نمازوں میں جاری ہے، الحاصل حق بات یہ ظاہر ہوئی کہ نماز میں اصل اخفاء ہے اور فرائض میں جہر کرنا مطلقاً ہے یعنی ادا ہو یا قضاء اگر جماعت کے ساتھ ہو، یا تنہائی میں بھی جہر ہے بشرطیکہ وقت کے اندر ہو، مگر منفرد جبکہ قضاء پڑھ رہا ہو اس کے بارے میں جہر کرنے کی کوئی روایت نہیں ہے لہٰذا اخفاء پر عمل کرنا ہی واجب رہا، اسی بناء پر مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ قول صحیح یہ ہے کہ ایسے منفرد کو لازمی طور پر اخفاء کرنا ہے، مگر بندہ مترجم کو یہ بات نہیں معلوم ہو سکی کہ کس روایت کی بناء پر منفرد کو جہر کرنے کا اختیار ہے، یہ تو صرف قیاس سے ہے، اور جب ہمارے سلف کی قضاء پڑھنے کی روایات میں جہر کا ذکر نہیں ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اخفاء ہی ہوگا، اور چونکہ جہر اور اخفاء کا حکم منجانب شرع ہوتا ہے اس لئے اس میں قیاس کرنے کی گنجائش نہ ہوگی، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۔م۔

اگر کوئی شخص نماز تنہاء پڑھ رہا تھا جب اس کی سورہ فاتحہ پوری ہو چکی یا تھوڑی پڑھ چکا تھا کہ دوسرے شخص نے آکر اس کی اقتداء کر لی تو اسے چاہئے کہ وہ اس سورہ فاتحہ کو از سر نو زور سے پڑھے، البحر عن الخلاصہ عن الاصل۔

ومن قرأ فی العشاء فی الاولیین السورة، ولم یقرأ بفاتحة الکتاب لم یعد فی الاخریین، وان قرأ الفاتحة ولم یزد علیها، قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة وجهر، و هذا عند ابی حنیفة و محمد، و قال ابو یوسفؒ: لایقضی واحدة منهما لان الواجب اذا فات عن وقته لایقضی الابدلیل، ولهما وهو الفرق بین الوجهین ان قراۃ الفاتحة شرعت علی وجه یترتب علیها السورة، فلو قضاها فی الاخریین، تترتب الفاتحة علی السورة، وهذا خلاف الموضوع.

ترجمہ:- اگر کسی نے عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں سورت تو پڑھی مگر سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو وہ آخری دونوں رکعتوں میں اس فاتحہ کا اعادہ نہ کرے، اور اگر صرف سورہ فاتحہ پڑھی یعنی اس کے ساتھ دوسری کوئی سورہ نہیں ملائی تو وہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ سورہ بھی پڑھے اور جہر بھی کرے، یہ قول امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی قضاء نہ کرے، کیونکہ واجب جب اپنے وقت سے جاتا رہا تو اس کی قضاء نہیں ہاں اگر کسی

صورت میں کوئی دلیل موجود ہو، اور ان دونوں ائمہ یعنی طرفین کی دلیل اور یہی فرق بھی دونوں صورتوں میں کہ سورہ فاتحہ کا پڑھنااس طرح شروع اور ثابت ہوا ہے کہ اس پر سورہ کی ترتیب قائم کی جائے، اب اگر فاتحہ کو پچھلی رکعتوں میں قضاء کرے گا تو فاتحہ کی ترتیب سورہ کے بعد ہو جائے گی، اور یہ بات اصل موضوع کے خلاف ہے۔

توضیح:۔عشاء کی پہلی دو رکعتوں میں کوئی فاتحہ پڑھنا بھول گیا یا پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھ لی مگر سورہ نہیں ملائی

ومن قرأ فی العشاء فی الاولیین السورة، ولم یقرأ بفاتحة الکتاب لم یعد فی الاخریین......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، عشاء کی نماز ہو یا مغرب کی یا کوئی اور ہی ہو، سورہ نہیں ملائی اس میں بعض فقہاء نے کہا ہے کہ بھول کر یا اگرچہ عمداً ہی چھوڑ گیا ہو۔لم یعد الخ تو آخری دو رکعتوں میں فاتحہ کا اعادہ نہ کرے۔ف۔یعنی فاتحہ کی قضاء نہ کرے۔ الذخیرہ۔ع۔میں مترجم کہتا ہوں کہ قصداً سورہ فاتحہ کو چھوڑنا اسی قول میں جائز ہو گا جس میں نماز کی دو رکعتوں میں قراءت کرنا فرض کیا گیا ہے خواہ وہ پہلی رکعتیں ہوں یا آخری دو رکعتیں ہوں، اس بناء پر پہلی دو رکعتوں میں ترک فاتحہ سے سجدہ سہو لازم نہ ہو گا، اس میں دوسرا قول یہ بھی ہے کہ پہلی دو رکعتوں میں ہی قراءت کرنا لازم ہے لیکن اگر کوئی نہ کر سکے تو آخری دو رکعتوں میں اس کی قضاء کر لے، اس بناء پر قصداً چھوڑنا گناہ کا کام ہو گا اور سجدہ سہو بھی لازم ہو گا، یہی قول اصح ہے۔م۔اور اگر رکوع سے پہلے سورہ فاتحہ کا چھوٹ جانا نماز کو یاد آئے تو وہ سورہ فاتحہ پڑھ کر دوبارہ سورہ پڑھ لے۔د۔بطور وجوب۔ط۔اور اگر رکوع میں یاد آئے تو بھی کھڑے ہو کر اسی ترتیب سے پڑھ کر دوبارہ رکوع کرے۔ش۔

وان قرأ الفاتحة ولم یزد علیها، قرأ فی الاخریین الفاتحة والسورة وجهر......الخ

اگر سورہ فاتحہ پڑھ لی مگر اس پر کچھ زیادتی نہیں کی۔ف۔یعنی سورہ یا چند آیتوں کا اضافہ نہ کیا اگرچہ قصداً چھوڑی ہو۔د۔میں مترجم کہتا ہوں کہ قصداً کے سلسلہ میں وہی حکم ہو گا جو ابھی گذر گیا ہے۔م۔قرأ فی الاخر.یین الخ تو پچھلی دونوں رکعتوں میں فاتحہ و سورت پڑھ لے۔ف۔فاتحہ تو معمول کے مطابق پڑھے مگر سورہ بطور قضاء کے، میں مترجم کہتا ہوں کہ موجودہ صورت میں فاتحہ سنت کے طور پر نہیں ہو گی، بلکہ بطور وجوب ہو گی، کیونکہ سورت تو فاتحہ کی ترتیب واجب ہے، لہٰذا اچھی طرح سمجھ کر رکھ لو۔م۔

وجهر......الخ

اور جہر کرے، یہ جہر کرنا ایک روایت کے مطابق وجوبا اور دوسری روایت میں استحبابا ہے، جس کی تفصیل عنقریب آئے گی۔م۔اور اگر رکوع کی حالت میں یہ بات یاد آئی کہ اس سے پہلے سورت نہیں پڑھی ہے تو اسے چاہئے کہ کھڑے ہو کر اسے رکوع کی حالت میں یہ بات یاد آئی کہ اس سے پہلے سورت نہیں پڑھی ہے تو اسے چاہئے کہ کھڑے ہو کر اسے پڑھ لے اور دوبارہ رکوع کرے۔د۔کیونکہ ترتیب فرض ہے چنانچہ اگر رکوع کا اعادہ نہ کرے تو نماز ہی فاسد ہو جائے گی۔ش۔

و هذا عند ابی حنیفة و محمد، و قال ابویوسفؒ: لایقضی واحدة منهما......الخ

اور یہ جو متن میں مذکور ہوا وہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔ وقال ابو یوسفؒ اور ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ دونوں میں سے کسی کی قضا نہ کرے۔ف۔نہ فاتحہ کو اور نہ سورت کو، جس کی دلیل یہ ہے۔

لان الواجب اذا فات عن وقته لایقضی الابدلیل......الخ

کیونکہ واجب (مثلاً سورہ اور فاتحہ) جب اپنے وقت سے مؤخر ہو جائے تو اس کی قضاء نہیں کی جاتی ہے، مگر دلیل کے ساتھ۔ف۔اور موجودہ صورت میں قضاء کرنے کی ایسی کوئی دلیل نہیں پائی جا رہی ہے، کیونکہ دلیل کی شرط یہ ہے کہ اس کا مثل

موجود ہو تاکہ اس کے اصل ٹھکانے سے اٹھاکر اس پر رکھا جاسکے جہاں قضاء کرنی ہے، جبکہ آخری دو رکعتوں میں سورت پڑھنا ثابت نہیں ہے اس لئے اس میں کس طرح پہلی رکعتوں سے اٹھاکر آخری رکعتوں میں لائی جاسکے، چنانچہ یہ دیکھتے ہو کہ ایام تشریق کی نمازیں جو قضاء ہو چکی ہوں دوسرے اوقات میں بغیر تکبیر تشریق کے ہوتی ہیں اگرچہ بر وقت پڑھنے یہ تکبیر واجب ہوتی ہے۔ مع۔ اس کا جواب نہیں دیا گیا ہے، بلکہ مصنفؒ نے امام ابو حنیفہؒ کا قیاس بیان فرمایا۔

ولهما وهو الفرق بين الوجهين ان قراۃ الفاتحة شرعت على وجه يترتب عليها السورة.....الخ

اور ان دونوں یعنی امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کی دلیل، اور یہی دلیل دونوں صورتوں میں فرق بھی ہے یہ ہے کہ فاتحہ کا پڑھنا اس طرح پر شروع ہوا ہے کہ اس کے بعد سورہ بھی پڑھی جاسکے۔ ف۔ یعنی فاتحہ ایسے طور پر نماز میں پڑھی جائے جس کے بعد سورہ بھی پڑھی جاسکے۔ ف۔ اور پہلی صورت میں پہلی دو رکعتوں میں بغیر سورہ فاتحہ کے صرف سورت پڑھی تھی۔

فلو قضاها فى الاخريين، نترتب الفاتحة على السورة، وهذا خلاف الموضوع.....الخ

اگر فاتحہ کو آخری دو رکعتوں میں پڑھے۔ ف۔ تو حالت یہ ہو جائے گی کہ پہلے سورہ پڑھ لی اور بعد میں سورہ فاتحہ پڑھی ہے اس لئے سورت پر فاتحہ کی ترتیب پائی جائے گی وھذا جبکہ یہ بات شروع طریقہ کے خلاف ہو گی۔ ف۔ کیونکہ شروع طریقہ تو یہ ہے کہ پہلے فاتحہ اور بعد میں سورہ ملائی جائے، اس لئے پہلی صورت میں فاتحہ کے قضاء کرنے کا حکم نہیں کیا گیا ہے، البتہ دوسری صورت میں شروع طریقہ کے خلاف ہونا لازم نہیں آتا ہے، جیسا کہ کہا ہے (آئندہ)۔

بخلاف ما اذا ترك السورة، لانه امكن قضاؤها على الوجه المشروع، ثم ذكرههنا مايدل على الوجوب، وفى الاصل بلفظة الاستحباب لانها ان كانت مؤخرة فغير موصولة بالفاتحة، فلم يمكن مراعاة موضوعها من كل وجه.

ترجمہ:- بخلاف اس صورت کے جب سورہ چھوڑ دی ہو کیونکہ اسے اپنے مشروع طریقہ سے قضاء کر لینا ممکن ہے، پھر مصنفؒ نے اس جگہ ایسے طریقہ سے ذکر کیا ہے کہ وجوب پر دلالت کرتا ہے، لیکن اصل میں استحباب کے لفظ سے ذکر کیا ہے، کیونکہ اگر سورہ مؤخر ہو جائے تو وہ فاتحہ سے ملنے والی نہ ہو گی اور ایسی صورت میں پورے طور پر اس کے موضوع کی رعایت کرنا ممکن نہ ہو گا۔

توضیح:- اگر کوئی پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھ لے مگر سورہ ملانا چھوڑ دے

بخلاف ما اذا ترك السورة، لانه امكن قضاؤها على الوجه المشروع.....الخ

بخلاف اس دوسری صورت کہ پہلی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ پڑھ لی مگر سورہ نہیں ملائی ہو، کیونکہ سورہ کا قضاء کر لینا ممکن ہے۔ ف۔ اس طرح سے ممکن ہے کہ آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے بعد سورہ کی قضاء کر لے، اسی طرح سے جو مشروع ہے۔ ف۔ کیونکہ مشروع طریقہ تو یہی ہے کہ فاتحہ پہلے اور سورہ بعد میں ملائی جائے، اور یہ صورت یہاں بآسانی ممکن ہے۔ م۔ اس مذکورہ دلیل سے امام ابو یوسفؒ کا جواب بن نہیں پڑا کیونکہ یہ تو اس سے نکلا کہ سورہ اپنے موقع پر نہیں پڑھی گئی، اور امام ابو یوسفؒ کے اس قول کا جواب نہ ہوا کہ واجب کو جب اپنے موقع پر ادا نہ کیا جائے تو اس کی قضاء کے لئے مستقل دلیل پائے بغیر اس واجب کی قضاء نہیں کی جاتی ہے۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں چار قول ہیں، نمبر ا۔ تو وہ ہے جو ابھی متن میں ذکر کیا گیا ہے، اور یہی ظاہر الروایۃ بھی ہے، نمبر ۲۔ اس کے برعکس حکم یعنی فاتحہ کو قضاء کیا جائے اور سورہ قضاء نہ کی جائے، یہ قول شیخ عیسیٰ بن ابانؒ کا ہے، نمبر ۳۔ ابو یوسفؒ کا قول کہ دونوں سورتوں میں سے کسی کی قضاء نہ کی جائے، نمبر ۴۔ حسنؒ کے واسطہ سے ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ فاتحہ و سورہ دونوں کی قضاء

کی جائے، اب کس طرح قضاء کی جائے، تو جواب میں مشائخ نے کہا ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں سورہ مقدم کی جائے اور بعضوں نے کہا ہے کہ فاتحہ مقدم کی جائے، یہی قول صحت کے بہت قریب ہے، اور مشروع طریقہ کے مناسب بھی ہے۔ مفع۔
اب یہ بات رہی کہ ان سورتوں کی قضاء واجب ہے یا مستحب، تو مصنفؒ نے فرمایا ہے **ثم ذکر ھھنا الخ** پھر ظاہر الروایۃ میں اس مقام پر ذکر کیا ہے۔ف۔ یعنی امام محمدؒ نے جامع صغیر میں ذکر کیا ہے۔ع۔ یا مصنفؒ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے **مایدل علی الوجوب الخ** وہ لفظ جو وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ف۔
اس طرح کہا کہ **قرأ فی الاخر بین الخ** یہ لفظ اگرچہ خبر کے طور پر مستعمل ہو رہا ہے، مگر حکم کے درجہ میں ہے، جیسا کہ اس موقع پر اصول میں ذکر کیا گیا ہے۔ مفع۔ اور مصنفؒ نے بھی اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔م۔ در مختار نے اسی قول کو اصح ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ش۔ حالانکہ یہ قول ضعیف ہے۔م۔

وفی الاصل بلفظة الاستحباب ......الخ

اور امام محمدؒ نے اصل یعنی مبسوط میں لفظ استحباب سے ذکر کیا ہے۔ف۔ **بقوله الی ان یقضی السورة فی الاخریین** یعنی میرے نزدیک مستحب یہ ہے کہ سورہ کو آخری دونوں رکعتوں میں قضاء کرلے۔ع۔ اور یہ بات مخفی نہیں ہوگی کہ وجوب تو صراحۃ نہیں ہے بلکہ سمجھا گیا ہے، اور مستحب ہونا تو بالکل صریح ہے، لہذا روایت میں اسی قول پر اعتماد کرنا چاہئے۔ الفتح۔ یعنی ظاہر الروایۃ کا خلاصہ یہی ہوا کہ قضاء کرنا مستحب ہے۔

لانها ان كانت مؤخرة فغير موصولة بالفاتحة، فلم يمكن مراعاة موضوعها من كل وجه.....الخ

یعنی آخری دونوں رکعتوں میں جبکہ سورہ کی قضاء فاتحہ واجبہ سے متصل نہ رہی بچھڑ گئی تو وہ اپنی سورہ فاتحہ سے متصل نہ رہی۔ف۔ کیونکہ اس کی سورہ فاتحہ تو پہلی دونوں رکعتوں میں ہے۔ع۔ **فلم یمکن الخ** تو جس طرح اس کی ترتیب مقرر کی گئی تھی یا موضوع تھی یعنی یہ کہ اپنی فاتحہ کے فوراً بعد میں ہو اس کی پوری پوری رعایت ممکن نہ ہو سکی۔ف۔ لہذا سورہ کو قضاء کرنا صرف مستحب باقی رہ گیا، اور اگر آخری رکعتوں میں سورہ کو فاتحہ سے مقدم کردیں تو بھی کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ آخری رکعتوں میں ایسی حالت ہو جائے کہ اس کی سورہ کو فاتحہ اپنی جگہ پر باقی نہ رہ کر سورہ سے پیچھے پڑ جائے اور خلاف مشروع یعنی اصل مقررہ طریقہ کے خلاف بھی ہو جائے اس کے باوجود یہ قضاء شدہ سورہ اپنی سورہ فاتحہ کے ساتھ مکمل طور پر نہ ملی کیونکہ اس کی سورہ فاتحہ تو پہلی دونوں رکعتوں میں ہے، ان ہی خرابیوں کی وجہ سے مصنفؒ نے یہ وجہ ذکر کی ہی نہیں کی ہے۔م۔
اب ایک بات اور رہی کہ سورہ کو قضاء کرنے کی صورت میں جہرا تھی اور آخری دونوں رکعتوں کی فاتحہ اخفاء سے ہے اس لئے یہ بیان کیا۔

ويجهر بهما هو الصحيح؛ لان الجمع بين الجهر والمخافتة في ركعة واحدة شنيع، و تغير النفل، وهو الفاتحة اولى، ثم المخافتة ان يسمع نفسه، والجهر ان يسمع غيره، وهذا عند الفقيه ابى جعفر الهندوانیؒ، لان مجرد حركة اللسان لايسمى قراءة بدون الصوت وقال الكرخی ادنى الجهر ان يسمع نفسه وادنى المخافتة تصحيح الحروف لان القراءة فعل اللسان دون الصماخ وفی لفظ الكتاب اشارة الى هذا.

ترجمہ:- اور ان دونوں یعنی سورہ فاتحہ اور سورہ میں جہر کرے، یہی صحیح قول ہے، کیونکہ سورہ کو جہر کرکے اور فاتحہ کو اخفاء کرکے ایک رکعت میں جمع کرنا برا طریقہ ہے، اور نفل یعنی آخری دونوں رکعتوں میں سورہ فاتحہ کو بدلنا زیادہ بہتر ہے، پھر مخافت یعنی اخفاء کی حد یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے، اور جہر کی حد یہ ہے کہ دوسرے کو سنائے، یہ تعریف فقیہ ابو جعفر ہندوانیؒ کے نزدیک ہے، کیونکہ فقط زبان کی حرکت کرنے کو قراءت نام نہیں دیا جاتا ہے، اور امام کرخیؒ نے فرمایا ہے کہ جہر کی ادنی مقدار یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے، اور اخفاء کی ادنی مقدار یہ ہے کہ حروف کو صحیح طریقہ سے ادا کرے کیونکہ قراءۃ تو زبان کا کام ہے کان کا کام

نہیں ہے، اور لفظ کتاب میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔

توضیح: سر اور جہر کی تعریف

ویجهر بهما هو الصحیح، لان الجمع بین الجهر والمخافتة فی رکعة واحدة شنیع......الخ

سورہ اور فاتحہ دونوں میں جہر کرے کہ یہی قول صحیح ہے۔ **لان الجمع الخ** کیونکہ ایک ہی رکعت میں سورہ اور ... میں سے ایک کو جہر کرنا اور دوسری کو اخفاء کرنا اچھا نہیں ہے، یہ امر شنیع ہے۔ف۔ اب اگر دونوں کو اخفاء کرے تو سورہ جو واجب تھی اس کی صفت بدلنا پڑے گی، اس کے بر خلاف نفل کو بدلنا یعنی سورہ فاتحہ جو آخری دونوں رکعتوں میں پڑھی جاتی ہے ایسا کرنا نفل اور بہتر ہے۔ف۔ یعنی آخری دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ نفل ہے اس لئے اس کی اخفاء کی صفت کو جہر سے بدلنا بہتر ہے، اس لئے یہی قول صحیح ثابت ہوا۔م۔ اور شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط اور جامع قاضی خان میں بھی یہی قول ہے۔ع۔ اور امام ابو حنیفہؒ کی ایک روایت میں یہ ہے کہ سورہ کو جہراً پڑھے، اور فاتحہ کو اخفاء کر کے اپنے حال پر رہنے دے، اس کے باوجود جہر کرے اور اخفاء کا جمع کرنا لازم نہیں آئے گا کیونکہ سورہ اپنی فاتحہ سے جو پہلی دو رکعتوں میں تھی ملی ہوئی ہے، اور تمرتاشیؒ نے اسی قول کو صحیح کہا ہے، اور خواہر زادہؒ نے اسی جواب کو ظاہر جواب قرار دیا ہے۔مف۔ اور فخر الاسلامؒ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ع۔

اور میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ جب اصح قول کے مطابق یہی بات طے پائی کہ سورہ کی قضا مستحب ہے، اور اصح یہ ہے کہ پچھلی رکعتوں میں فاتحہ واجب ہے، اس لئے قول اصح یہ ہوا کہ آخری رکعتوں کی سورہ فاتحہ اور سورہ دونوں میں اخفاء کرے، کیونکہ فاتحہ جو کہ واجب ہے اسے نفل اور مستحب کے لئے بدلنا نہیں چاہئے، اچھی طرح سمجھ لو۔م۔

ثم المخافتة ان یسمع نفسه، والجهر ان یسمع غیره......الخ

پھر اخفاء کی حد یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنا سکے۔ف۔ یہ اخفاء کا کم سے کم درجہ ہوا، ایسی صورت میں اگر کوئی کان لگا کر سن لے تو یہ مجبہ ہے۔ الخلاصہ۔ یعنی یہ قراءت نہیں ہے بلکہ اس طرح بات کہنی ہے جو کہ سمجھ میں نہ آئے۔م۔ **والجهر الخ** اور جہر کی حد یہ ہے کہ دوسرے کو سنائے۔ف۔ اور ایک یا دو فرد نہیں بلکہ تمام حاضرین سن لیں تو وہ جہر ہے۔ الخلاصہ۔ یہی قول صحیح ہے۔ الوقایہ۔ اسی قول کو شمس الائمہ حلوائیؒ نے اصح کہا ہے، اور عامہ مشائخ نے پسند کیا ہے، اور اسی پر اعتماد ہے۔ المحیط۔ع۔ اور یہی مختار ہے، السراجیہ اور یہی قول فقیہ ابو جعفر ہندوانیؒ کے نزدیک ہے، الحاصل فقیہ ابو جعفرؒ کے اس قول کو سبھوں نے پسند کیا اور قبول کیا ہے۔

لان مجرد حرکة اللسان لایسمی قراءة بدون الصوت......الخ

کیونکہ صرف زبان کی حرکت کو قراءت کرنا نہیں کہا جاتا ہے جب تک کہ آواز نہ ہو۔ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کی وجہ فتح القدیر میں مذکور ہے، اور خود بھی ظاہر ہے، کہ آواز کے ساتھ حروف کا نکلنا ضروری ہے پھر بھی ایسا بیان آتا ہے کہ آواز کے نکلنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ لازم آیا ہے کہ پڑھنے والا خود اور اس کے قریب کا انسان سنے، کیونکہ اگر واقعۃ سننے کی شرط لازم ہو تو اس صورت میں جبکہ نمازی کے قریب شور و غل ہو یا خود مصلی بہرا شخص ہو یا ہوا بہت تیز چل رہی ہو یا ان جیسی کوئی دوسری مجبوری ہو جن کی بناء پر نہ سننے کی بناء پر قراءت کا فاسد ہونا لازم آئے گا، اسی لئے ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ قراءت ہونے کے لئے زبان کی حرکت مع آواز سے یہ لازم نہیں آتا کہ کان کا سننا بھی قراءت کی تعریف میں داخل ہو بلکہ صرف اس قدر لازم کہ وہ آواز اس انداز کی ہو جو سنی جا سکے، اور بہت ممکن ہے کہ فقیہ ابو جعفرؒ کی مراد بھی اتنی ہی ہو، اس وجہ سے کہ آواز بھی ہو رہی ہو اور اس کے سننے سے کوئی چیز مانع بھی نہ ہو ظاہر یہی ہے کہ وہ ضرور سنی جائے گی۔ الفتح۔

وقال الکرخی ادنی الجهر ان یسمع نفسه وادنی المخافتة تصحیح الحروف......الخ

اور امام کرخیؒ نے فرمایا ہے کہ جہر کا کم سے کم مرتبہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو سنائے، اور اخفاء کا کم از کم مرتبہ یہ ہے کہ حروف صحیح ہو کر نکلیں۔ ف۔ اور اخفاء کا زیادہ مرتبہ یہ ہے کہ خود سنے اور اس سے زیادہ یہ ہے کہ بہت قریب کا انسان سنے، اس تعریف کی بناء پر جہر اور اخفاء میں کوئی فرق اور اختلاف باقی نہ رہا، اب جبکہ حروف صحیح ہو گئے تو یہ صرف زبان کا اشارہ نہیں ہے بلکہ حروف تو اپنے اپنے مخرج کی آواز کی کیفیت ہے، اور حروف وہ نہیں ہے جو سمجھا گیا ہے کہ بغیر آواز کے زبان حرکت کیونکہ اس طرح تو حروف کی ادائیگی اور خروج ہی نہ ہوگا، اور جب حروف کی ادائیگی ہوئی تو ضرور وہ اس لائق ہوگا کہ سنا جائے، مگر حرف کا کان تک پہونچنے کے لئے یہ بات ضروری ہے کہ آواز اتنی زور سے نکلے کہ کان تک پہونچ سکے اور یہ بھی ضروری ہے کہ سننے سے وہاں کوئی چیز مانع بھی نہ ہو، مثلاً خود کان میں بہرا پن کی بیماری نہ ہو، نیز اس جگہ دوسری کوئی آواز اس سے زیادہ زور کے ساتھ نہ ہو، اور اس کے علاوہ دوسرے بھی بہت سے مانع ہو سکتے ہیں، اس طرح قراءت کے پائے جانے کے لئے اس کے سننے کی بھی شرط کوئی حیثیت نہیں ہے۔

لان القراءۃ فعل اللسان دون الصماخ......الخ

کیونکہ قراءت تو زبان کا فعل ہے اور کان کا فعل نہیں ہے۔ ف۔ یہی قول ابو بکر الاعمش فقیہ اور مالکؒ کا ہے، اور مشائخ نے کہا ہے کہ کرخیؒ کا قول قیاس کے زیادہ مطابق اور زیادہ صحیح ہے۔ ع۔ اور امام محمدؒ کا قول بھی اسی کی مانند ہے، جیسا کہ عینیؒ نے ذکر کیا ہے۔

وفی لفظ الکتاب اشارۃ الی ھذا......الخ

اور لفظ کتاب میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے، اسی بناء پر منفرد کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وقت کے اندر چاہے تو جہر کرے اور خود کو سنائے اس سے معلوم ہوا کہ خود سننے سے بھی جہر پایا جاتا ہے، عینیؒ نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ نے اصل میں یہ فرمایا ہے ان شاء قرأ فی نفسه وان شاء جهر واسمع نفسه، یعنی منفرد چاہے تو اپنے نفس میں پڑھے اور چاہے تو جہر کرے اور خود کو سنائے، پس اس عبارت میں اس بات کی تصریح پائی گئی کہ خود کو سنانا بھی جہر ہے، اور اس کے مقابل میں اپنے نفس میں پڑھنا اخفاء ہے، اور قول امام کرخیؒ کا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ عرف میں سنے بغیر قراءت نہیں کہلاتی ہے، تو جواب یہ ہوگا کہ مسئلہ قراءت امر شرعی ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ مناجات ہوتی ہے، اس لئے اس میں لوگوں کے عرف کا کوئی اعتبار نہیں ہے، لیکن حلوائی وابو جعفرؒ نے کہا ہے کہ قراءت میں سننا ضروری۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کی جیسی تحقیق کی ضرورت ہے میری نظر سے وہ نہیں گذری ہے، اور اس کی مکمل تحقیق کے لئے ایک مستقل رسالہ کی ضرورت ہے، اس تحقیق کا ماحصل (واللہ اعلم) یہ ہے کہ اخفاء اور جہر کے علحدہ علحدہ دو مرتبے ہیں، مگر ان دونوں کے درمیان ایک درمیانی حالت بھی ہے، اب اگر ظہر کی نماز میں کسی نے قراءت میں اس طرح تصحیح حروف کی کہ ان حروف کو خود نہیں سنا تو امام کرخیؒ کے فرمان کے مطابق وہ جائز ہوگی مگر ہندوانی کے نزدیک فاسد ہوگی، جیسا کہ عینیؒ میں ہے، اور اگر خود بھی وہ الفاظ سن لئے تو بالاتفاق جائز ہوگی، البتہ ہندوانیؒ کے نزدیک یہ اخفاء کا کمتر درجہ ہے، اور کرخیؒ کے نزدیک یہ جہر کا کمتر درجہ ہے، لیکن یہ بہت مشہور مسئلہ ہے کہ اخفاء کے موقع پر جہر کرنے سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہے اس بناء پر موجودہ مسئلہ میں امام کرخیؒ کے نزدیک سجدہ سہو لازم ہونا چاہئے حالانکہ اس کے بارے میں کسی نے بھی نہیں لکھا ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ جہر کا کمتر درجہ ہے اور اخفاء بھی ہے جبکہ تصحیح حروف ہو جانے کی صورت میں نماز جائز بھی ہوتی ہے، اور اگر اس نے اس طرح قراءت کی کہ دوسروں نے بھی سن لی تو یہ بالاتفاق جہر ہے، اور حضرت خباب بن الارتؓ نے خود رسول اللہ ﷺ کے ظہر میں قراءت کے اخفاء کرنے کی روایت کی ہے، جیسا کہ صحیح بخاری کے حوالہ سے اوپر حدیث گذر چکی ہے، اور خود خبابؓ سے ظہر وعصر میں جہراً قراءت کرنا مصنف ابن شیبہ میں مروی ہے، پس اس بات کا گمان میں آنا بھی ممکن نہیں ہے انہوں نے اپنی روایت کے خلاف خود

ہی عمل کیا ہو بلکہ صحیح بات اس میں یہی ممکن ہے کہ انہوں نے اس طرح قراءت کی کہ سننے والے کو بالجہر قراءت کرنے کا شبہ ہو گیا ہو، ساتھ ہی اس روایت میں سہو بھی نہیں پایا گیا جس سے اس بات پر دلیل ہوتی ہے کہ یہ بھی اخفاء کا ایک درجہ ہے جسے لوگوں نے جہر کہدیا ہو، اس سے یہ معلوم ہوا کہ کرخیؒ کے قول کے مطابق غیر کو سنانا اس وقت جہر مانا جائے گا جبکہ آواز اس انداز کی ہو کہ بآسانی سمجھ میں آجائے، اور ہندوانیؒ کے قول کے مطابق صرف ایک دو آدمی نہیں بلکہ حاضرین سب سن سکیں، جیسا کہ خلاصہ میں ہے۔

اور قہستانی نے اس تعریف پر یہ اعتراض کیا ہے کہ اگر جمعہ یا عیدین میں تمام مقتدی نہ سن سکیں تو اس قاعدہ کے مطابق ان کی نماز فاسد ہو جانی چاہئے، اس کا جواب شامیؒ نے یہ دیا ہے کہ صرف پہلی صف والوں کا سن لینا کافی ہے، مگر یہ جواب بھی اس لئے درست نہیں ہے کہ کبھی صف اول بھی بہت بڑی اور دائیں بائیں بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے اس میں سننا ممکن نہیں ہے، اور اگر امام کی آواز خود بھی پست اور آہستہ ہو تو زیادہ افراد نہیں سنتے ہیں، اور حلبیؒ نے جواب دیا ہے کہ جو لوگ سننے کے موقع میں ہوں ان کا سننا کافی ہے، مگر یہ جواب بھی درست نہیں ہے کیونکہ ایسا سننا تو اخفاء کی حالت میں بھی ہو سکتا ہے جبکہ کوئی امام کے ساتھ ہو، لہٰذا یہ بات کوئی قاعدہ کی صورت میں نہ ہوئی، اس کے علاوہ اس جگہ جتنے بہرے ہوں گے وہ بھی نہیں سنیں گے، اسی طرح اگر اس جگہ شور غل ہو رہا ہو تو کانوں والا انسان بھی سننے سے معذور ہو گا، اور حق جواب یہ ہے کہ خلاصہ کے کلام کی مراد یہ ہے کہ وہ آواز اتنی بلند ہو کہ اس کے سننے سے معذور ہو گا۔

اور حق جواب یہ ہے کہ خلاصہ کے کلام کی مراد یہ ہے کہ وہ آواز اتنی بلند ہو کہ اس کے سننے میں افراد کی خصوصیت اس طرح کی نہ ہو کہ اسے فلاں فلاں سن لیتے ہیں بلکہ ایسی ہو کہ جو بھی سننے کی حیثیت میں ہو وہ سن سکے، اور غالباً حلبیؒ کی مراد بھی یہی ہو، اس جگہ یہ اعتراض نہیں ہو سکتا ہے کہ قراءت اخفاء ہونے کے باوجود سنی جا سکتی ہے اس بناء پر کہ امام اور مقتدی کی جماعت کی شرط ہے، لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اگر امام کے پیچھے مستقل صف ہو اور صف اول کے مقتدی جو سننے کی حیثیت میں ہوں اور ان میں سے کچھ سن لیں تو اسے جہر بھی کہنا چاہئے اور جہر کی تعریف اس پر صادق آجائے گی، اس بناء پر شمس الائمہ حلوانیؒ کا یہ قول ضعیف ہے کہ اخفاء یہ ہے کہ خود پڑھنے والا اور اس کے قریب کے مقتدی سن لیں۔ ع۔

ہاں اگر اس قریب کے لفظ سے مراد بالکل متصل شخص ہو، پھر یہ بھی واضح ہو جانا چاہئے کہ جہر کی آواز سے سب کو قراءت سنانا بھی مقصود ہو، کیونکہ اگر پوری آیت نہیں بلکہ اس کا کچھ حصہ سنائیں تو اس سے وہ قراءت کی نہیں ہو گی، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ بھی کبھی اخفاء کی صورت میں بھی آیتوں کے بعض ٹکڑے سنا دیتے تھے جس سے بعض صحابہ کرامؓ کو یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ کس سورہ کی کون سی آیت ہے، مگر صف اول کے پورے افراد نہیں سن پاتے تھے، لیکن ابن ابی شیبہؒ نے جو سعید بن جبیرؒ کی ظہر کی قراءت سے متعلق یہ روایت کی ہے کہ صف اول یہ قراءت سن لیتی تھی تو اس میں اولاً محمد بن نزاحم راوی ضعیف اور متروک ہے پھر اس روایت کو اسی مفہوم پر محمول کیا جائے گا (بعض افراد کچھ سن لیا کرتے تھے) لہٰذا اگر جہر اس انداز کا ہو کہ صف اول سن لے یعنی صف اول کے مقتدی اس وقت جبکہ کوئی مانع نہ ہو سن سکتے ہوں تو بالاتفاق اس پر جہر کی تعریف صادق آجائے گی، لہٰذا اخفاء کے موقع پر اس حد تک جہر ہونے سے سجدہ سہو لازم آجائے گا۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اخفاء کے موقع پر ایسا جہر جس میں سہو واجب ہو اس میں امام کرخیؒ اور فقیہ ابو جعفر سب کا اتفاق ہے، اور اگر قاری خود اپنی قراءت سنے تو وہ اخفاء ہے اور ایسا ہونے سے بالاتفاق سجدہ سہو لازم نہ ہو گا، تو اب ان فقہاء کے درمیان صرف اس صورت میں جبکہ خود بھی قاری نے اپنی قراءت نہیں سنی اس بات میں اختلاف ہو گا کہ اس پر قراءت کی تعریف صادق آئی یا نہیں تو امام کرخیؒ کے نزدیک یہ بھی قراءت ہو گی اور نماز درست ہو گئی، مگر اس کے برخلاف فقیہ ابو جعفر کے نزدیک یہ قراءت نہ ہوئی لہٰذا نماز باطل ہوئی، اور متاخرین فقہاء نے اسی پر فتویٰ بھی دیا ہے اور یہ بھی کہا ہے قیاس کا زیادہ تقاضا اور قول اصح امام کرخیؒ

کا قول ہے، اس تفصیل کو ذہن نشین کر لو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وعلى هذا الاصل كل ما يتعلق بالنطق كالطلاق والعتاق والاستثناء و غير ذلك.

ترجمہ:۔ اسی اصل کے مطابق ہر وہ حکم ہوگا جس کا تعلق بولنے سے ہو مثلاً طلاق، عتاق اور استثناء وغیرہ۔

توضیح:۔ ہر ایسے امر کا حکم جس کا تعلق نطق سے ہو

وعلى هذا الاصل كل ما يتعلق بالنطق كالطلاق والعتاق......الخ

اور اسی اصل پر۔ف۔ یعنی جہر اور اخفاء کی تعریف کے اختلاف مذکور کے مطابق ہی ایسے تمام مسائل میں بھی حکم مختلف ہوگا، کل ما یتعلق الخ ہر وہ مسئلہ جس کا تعلق گویائی اور نطق سے ہو مثلاً طلاق۔ف۔ مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا تجھے طلاق ہے، مگر اس طرح سے کہا کہ یہ حروف صحیح طریقہ سے ادا تو ہوے البتہ خود نہیں سن سکا تو امام کرخیؒ کے نزدیک بیوی مطلقہ ہو گئی لیکن فقیہ ابو جعفرؒ کے نزدیک اسے طلاق نہ ہوگی بلکہ وہ بدستور اس کی بیوی رہے گی العتاق اور غلام آزاد کرنا۔ف۔ مثلاً کسی نے اپنے غلام یا باندی سے کہا کہ تم آزاد ہو مگر اس انداز سے کہا کہ یہ حروف صحیح طور پر ادا ہو گئے البتہ انہیں خود نہیں سن سکا تو اس کا حکم بھی اسی اختلاف مذکور کے مطابق ہوگا۔

كالطلاق والعتاق والاستثناء و غير ذلك......الخ

اور استثناء کرنا۔ف۔ یعنی انشاء اللہ کہنا، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ طلاق یا عتاق کے ساتھ انشاء اللہ کا جملہ استعمال کر لینے سے اس کا اثر ختم ہو جاتا ہے، چنانچہ اگر کسی نے اپنی زوجہ سے کہا کہ تجھے طلاق ہے انشاء اللہ یا غلام یا باندی سے کہا تو آزاد ہے انشاء اللہ تو نہ طلاق ہوگی اور نہ آزادی ہوگی، البتہ ان دونوں جملوں میں صرف جملہ انشاء اللہ کو اس طرح اخفاء کے ساتھ کہا کہ خود بھی نہیں سنا پھر بھی امام کرخیؒ کے نزدیک یہ استثناء لغو ہوگا اور کہنے کا اثر مرتب ہو جائے گا عینیؒ نے کہا ہے کہ شرط کرنے کا بھی یہی حکم ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ شرط کرنے کا مطلب یہ ہے کہ طلاق یا عتاق کا جملہ استعمال کیا اور ساتھ ہی اس کے لئے کوئی شرط بھی لگادی مگر اس میں اس طرح اخفاء کیا کہ خود بھی نہیں سنا مثلاً زور سے کہا تجھے طلاق اور اخفاء کے ساتھ کہا اگر یہ روٹی کھالی، تو فقیہ ابو جعفرؒ کے نزدیک یہ شرط بیکار ہوگی، اور بولنا صحیح نہ ہوگا، جبکہ خود بھی شرط نہ سنی ہو، ایسی صورت میں عورت نے روٹی کھائی ہو یا نہ کھائی ہو اسے طلاق واقع ہو جائے گی، اور امام کرخیؒ کے نزدیک چونکہ جملہ صحیح طریقہ سے ادا ہو گیا لہٰذا شرط صحیح ہوگی، اور روٹی کھالینے کی صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، واضح ہو کہ مذکورہ صورت میں اگر اس عورت نے اگرچہ شرط کے مطابق روٹی نہیں کھائی پھر بھی قاضی کے پاس جا کر یہ دعویٰ کیا کہ میرے شوہر نے مجھے طلاق دیدی ہے جسے ان گواہوں نے سنا یا خود مرد نے اقرار کیا تو مرد کا یہ دعوی درست نہ ہوگا کہ میں نے تو اس کے ساتھ شرط بھی لگائی تھی اور وہ مطلقہ ہو جائے گی، اگرچہ عند اللہ وہ عورت اس مرد کے لئے حلال بھی ہو، اسے ذہن نشین کر لو۔م۔

و غير ذلك......الخ

اور ان کے علاوہ دوسرے مسائل کے بارے میں بھی یہی اختلافی حکم ہوگا۔ف۔ دوسرے ایسے مسائل جن کا تعلق نطق سے ہے ان میں سے چند یہ ہیں جیسے اپنی بیوی سے ایلاء کرنا کہ واللہ میں تجھ سے ہمبستری نہ کروں گا اس طرح کہا کہ حروف کی تصحیح تو کی مگر اتنا آہستہ کہا کہ خود بھی نہیں سنا تو امام کرخیؒ کے نزدیک یہ ایلاء صحیح ہے اور اگر رجعت کرلے تو کفارہ دینا ہوگا، لیکن فقیہ ابو جعفرؒ کے نزدیک اس کہنے کا اعتبار نہ ہوگا، اور مثلاً قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں گوشت نہ کھاؤں گا مگر اس طرح قسم کھائی کہ خود بھی نہ سنی تو اختلاف ہے، یا خود تو جملہ سن لیا ساتھ ہی یہ شرط لگادی کہ اگر ذبیحہ نہ ہو مگر یہ شرط نہیں سنی تو کرخیؒ کے نزدیک اس ذبیحہ کو کھا سکتا ہے، اور ہندوانیؒ کے نزدیک جھوٹا ہو جائے گا، اور مثلاً تکبیر تحریمہ جس سے نماز شروع ہوتی ہے، اور حج کے لئے

احرام باندھنا، اور ذبح کے وقت بسم اللہ کہنا، یعنی یہ باتیں اس طرح کہیں کہ جملے صحیح طریقہ سے ادا ہو گئے مگر خود نہ سنے تو ہندوانیؒ کے نزدیک نماز اور احرام شروع نہیں ہوئے، اور وہ ذبیحہ حرام اور مردار ہے، اور امام کرخیؒ کے نزدیک ساری چیزیں صحیح ہیں، اور مثلاً آیت سجدہ کی تلاوت ہے، اسی طرح دوسرے اور بھی بہت سے مسائل ہیں، مثلاً نماز کے دوران کلام کیا اس طرح پر کہ حروف صحیح ادا ہوئے مگر اس طرح کے خود بھی نہیں سنے تو کرخیؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی لیکن ہندوانیؒ کے نزدیک نماز درست رہے گی، اب ایسے معاملات جن میں ایجاب و قبول کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً کسی چیز کی فروخت کے موقع پر مالکؒ نے کہا یہ چیز میں نے تمہارے ہاتھ بیچ دی مگر اس انداز سے کہا کہ الفاظ صحیح طور سے ادا ہوئے البتہ خود نہیں سنے تو امام کرخیؒ کے نزدیک اس کی طرف سے پیشکش ہو گئی یا ایجاب ہو گیا مگر فقیہ ابو جعفرؒ کے نزدیک نہیں ہوا، اسی طرح نکاح وغیرہ میں بھی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خریدار نے کچھ نہ سنا ہو پھر بھی اگر یہ کہدے کہ میں نے یہ چیز تم سے خرید لی ہے تو دیانت کے طور پر یہ بیع لازم ہو گئی امام کرخیؒ کے نزدیک، اور اگر خود سن لیا ہو تو ہندوانیؒ کے نزدیک بھی وہ بیع لازم ہو جائے گی، عینیؒ نے لکھا ہے کہ بیع کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ قول صحیح یہ ہے کہ اس طرح کہنا شرط ہے کہ مشتری سن سکے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس قول کے مطابق کاروبار کے علاوہ ایسے جتنے بھی معاملات ہیں جن میں ایجاب و قبول کی ضرورت ہوتی ہے یہی شرط ہو گی، تصریح۔ د۔ ش کے مطابق، پھر ان مسائل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ کچھ مسائل میں امام کرخیؒ کے قول میں احتیاط ہے مثلاً طلاق و ایلاء اور قسم میں اور کچھ دوسرے مسائل میں فقیہ ابو جعفرؒ کے قول میں احتیاط ہے مثلاً نماز اور ذبیحہ وغیرہ۔ م۔ اب قراءت کی مقدار میں ہو گی۔

وادنی مایجزیء من القراء ة فی الصلوة آیة عند ابی حنیفة، وقالا ثلاث آیات قصار، او آیة طویلة، لانه لایسمی قارئا بدونه، فاشبه قراء ة مادون الآیة، وله قوله تعالی ﴿فَاقْرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ من غیر فصل الا ان مادون الآیة خارج، والآیة لیست فی معناه.

ترجمہ:- اور نماز کے اندر کم از کم جتنی مقدار کافی ہوتی ہے اس کی مقدار امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک آیت ہے، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ وہ تین چھوٹی آیتیں ہیں، یا ایک بڑی آیت ہے، کیونکہ اس سے بھی کم پڑھنے والے کو قاری نہیں کہا جاتا ہے، پس اس مقدار سے کم پڑھنا ایک آیت سے پڑھنے کے مشابہ ہو گیا، اور امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿فَاقْرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ کہ قرآن سے جتنا بھی پڑھنا تمہارے لئے آسان ہو اتنا ہی پڑھو، مگر ایک آیت سے بھی کم تو بالاجماع قراءت سے خارج ہے، اور پوری آیت اس سے کم کے معنی میں نہیں ہے۔

توضیح:- نماز میں قراءت کی کتنی مقدار فرض ہے

وادنی مایجزیء من القراء ة فی الصلوة آیة عند ابی حنیفة......الخ

ف. یعنی نماز میں قراءت قرآن ایک فرض رکن ہے اس طرح پر کہ یہ نہ ہو تو نماز باطل ہو جاتی ہے، اب یہ سوال ہے کہ اس کی کم سے کم کتنی مقدار فرض ہے کہ اگر وہ بھی نہ پائی جائے تو نماز باطل ہو جائے گی، اس میں ائمہ کا اس طرح اختلاف ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک آیت ہے۔ م۔ امام ابو حنیفہؒ سے اس مسئلہ میں تین روایتیں ہیں، نمبر ا۔ ایک آیت سے فرض ادا ہو جائے گا، اگرچہ وہ بہت چھوٹی آیت ہو۔ المحیط۔ اور یہی اصح ہے۔ الخلاصہ۔ ھ۔ نمبر ۲۔ جتنی مقدار کو قراءت قرآن کہہ سکتے ہیں، قدوریؒ نے اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ ع۔ پھر اگر وہ آیت صرف ایک آیت جیسے مُدْهَامَّتَانِ، یا جیسے ق۔ ن۔ ص۔ کہ بعض قراء کے نزدیک ان میں سے ہر ایک ایک آیت ہے، تو امام صاحبؒ کے قول کے مطابق مشائخ کا اس میں اختلاف ہے، اور قول اصح یہ ہے کہ امام صاحبؒ کے نزدیک اس سے فرض ادا نہ ہو گا۔ شرح المجمع لابن ملک۔ الظہیریہ۔ السراج اور الفتح

القدیر۔ کیونکہ یہ تو صرف شمار کے لئے ہے اور قراءت نہیں ہے۔ ع۔ حلوائی۔

اور اگر ایک بڑی آیت ہو جیسے آیۃ الکرسی اور آیۃ المداینہ (یعنی سورہ بقرہ کی وہ آیت جس میں قرض کے لین دین کا بیان ہے) اور اگر نمازی نے اس میں سے تھوڑی ایک رکعت میں اور بقیہ دوسری رکعت میں پڑھی تو عامہ مشائخ کے نزدیک جائز ہے۔ المحیط۔ اور یہی اصح ہے۔ الکافی۔ المنیہ۔ نمبر ۳۔ اور تیسری روایت امام صاحبؒ سے کتاب الاصل میں مذکور ہے اور وہ صاحبینؒ کے قول کے مثل ہے۔ ع۔ وقالا ثلث آیات الخ اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ نماز کے جائز ہونے کے لئے کم از کم مقدار تین چھوٹی آیتیں یا ایک بڑی آیت ہے۔ ف۔ اور امام صاحبؒ سے بھی ظاہر الروایۃ یہی ہے، مگر کتاب میں پہلی ہی روایت مذکور ہے۔ م۔

لانہ لایسمی قارئا بدونہ، فاشبہ قراءۃ مادون الآیۃ...... الخ

یعنی صاحبینؒ کے قول کی فرضیت کی دلیل یہ ہے کہ اس مقدار سے کم پڑھنے والے کو قاری نہیں کہا جائے گا۔ فاشبہ الخ پس تین سے کم پڑھنے والا بھی ایک بھی ایک آیت سے کم پڑھنے والے کے مشابہ ہو گیا۔ ف۔ حالانکہ ایک آیت سے کم بالاتفاق اسی وجہ سے کافی نہیں ہے کہ اسے قاری نہیں کہا جاتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ نے قراءت کرنے کا حکم دیا ہے۔ م۔

ولہ قولہ تعالی ﴿فَاقْرَؤُا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ من غیر فصل الا ان مادون الآیۃ خارج...... الخ

اور امام صاحبؒ کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے کہ اتنی مقدار پڑھو جو قرآن میں سے تمہارے لئے آسان ہو۔ ف۔ تو اس آیت میں آسان مقدار کا حکم دیا ہے۔ من غیر فصل، بغیر کسی تفصیل کے۔ ف۔ کہ وہ مقدار آیت ہو یا زیادہ، اور کلمہ "ما" قلیل و کثیر کی ہر مقدار کو شامل ہے الا ان الخ لیکن آیت سے بھی کم ہو تو یہ خارج ہے۔ ف۔ یعنی بالاتفاق خارج ہے، اور آیت سے کم تو لوگوں کی زیادہ پر تو یوں بھی لوگوں کی زبان پر آتا رہتا ہے۔ مع۔

والآیۃ لیست فی معناہ...... الخ

اور پوری آیت اس سے کم کے معنی میں نہیں ہے۔ ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ مُدْهَآمَّتَانِ ق اور ص وغیرہ بھی تو لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں لہٰذا ان کے علاوہ جو آیتیں ہیں وہ ان کے معنی میں نہیں ہیں۔ م۔ پھر امام ابو حنیفہؒ سے یہ رجوع صحیح طور سے پایا گیا ہے کہ ایک آیت کی قراءت سے نماز جائز ہو جاتی ہے۔ ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ ظاہر الروایۃ سے تو یہی بات سمجھی جاتی ہے ایسی صورت میں متن والوں نے یہ قول نقل ہی کیوں کیا ہے۔ م۔

ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ قراءت کی چار صورتیں ہیں، نمبر ا۔ فرض۔ نمبر ۲۔ واجب، نمبر ۳۔ سنت، نمبر ۴۔ مکروہ، اور فرض کی مقدار میں امام ابو حنیفہؒ سے تین روایتیں ہیں ان میں سے ایک تو صاحبینؒ کے قول کی طرح ہے، میں کہتا ہوں کہ ظاہر الروایۃ یہی ہے، جیسا کہ عینیؒ نے ذکر کیا ہے۔ م۔ اور واجب قراءت یعنی جس کے نہ ہونے سے نماز کا اعادہ واجب ہو گا اور اعادہ نہ ہونے سے گناہ لازم لائے، وہ پوری سورہ فاتحہ اور چھوٹی تین آیتیں یا ایک بڑی آیت ہے جو آخری دو رکعتوں اور مغرب کی تیسری رکعت کے ماسوا ہیں، اور مسنون قراءت حالت سفر و حضر میں جس کی تفصیل خود اسی کتاب میں عنقریب آئے گی، اور مکروہ یہ ہے کہ جتنی قراءت واجب ہے اس میں سے کچھ چھوڑ دی جائے، شرح الطحاوی میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے ساتھ ایک یا دو آیت پڑھ کر ختم کرنا مکروہ ہے، مجتبیٰ میں ہے کہ اس طرح ایک بڑی آیت بھی سورہ فاتحہ کے ساتھ پڑھ لی جائے تو عامہ مشائخ کے نزدیک نماز جائز ہو گی۔ الفتح۔

عینیؒ نے لکھا ہے کہ فتاویٰ مرغینانی یعنی ظہیریہ میں ہے کہ اگر کسی نے سورہ فاتحہ کے بغیر صرف آیۃ الکرسی یا آیۃ المداینہ پڑھی تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق صحیح یہ ہے کہ نماز جائز نہ ہو گی، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ قول گویا اصل کی روایت کے مطابق ہے، یا اس بناء پر ہے کہ امام صاحبؒ نے ایک آیت کے قول سے رجوع کر لیا ہے، یا اس معنی کے اعتبار سے ہے کہ واجب کی

مقدار ادانہ ہوئی۔م۔یہ قول بعض مشائخ کا ہے، مگر عامہ مشائخ کے نزدیک جائز ہے پھر اگر اس ایک بڑی کو تھوڑی تھوڑی مقدار کر کے دو رکعتوں میں ختم کیا تو بعض مشائخ نے کہا ہے کہ نماز صحیح نہ ہوگی کیونکہ ایک میں مکمل ایک آیت نہیں پڑھی گئی، اور بعض فقہاء نے کہا ہے کہ وہ بھی چھوٹی تین آیت سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے جائز ہوگی۔ مع۔ لیکن بہر صورت کراہت تحریمی باقی رہے گی، جب تک کہ مقدار واجب قراءت نہ کرلی جائے۔الفتح۔

اور اگر آدھی آیت یا ایک کلمہ کو اتنی بار دھرایا کہ وہ ایک آیت کے برابر ہوگئی تو بھی جائز نہ ہوگی۔ فع۔ فتاویٰ نسفی میں ہے کہ چھوٹی تین آیتوں اور بڑی ایک آیت کا پڑھنا بالاجماع جائز ہے، اور امام اعظمؒ کا ایک آیت سے رجوع کرنا صحیح ہے۔ع۔ درمختار میں لکھاہے کہ اگر بڑی ایک آیت کو دو رکعتوں میں کسی نے پڑھا تو قول اصح یہ ہے کہ امام صاحب اور صاحبینؒ سب کے نزدیک نماز صحیح ہوگی، کیونکہ اس کی آدھی آیت بھی چھوٹی تین آیتوں سے زیادہ ہے۔الحلبی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مذکورہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ سورۂ فاتحہ پوری پڑھی ہو اور اس کے علاوہ بڑی آیت سے بھی نصف پڑھی ہو، کیونکہ پوری طویل آیت پڑھ لینے میں بھی اختلاف ہے جیسا کہ گذر چکا ہے۔م۔ نوادر میں امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ اگر کوئی شخص صرف الحمدللہ رب العلمین پڑھ سکتا ہے تو وہ اسی کو ہر رکعت میں ایک بار پڑھتا رہے، اور اسے مکرر نہ پڑھے، ایسے شخص کی نماز جائز ہوگی، اور یہی قول امام ابو حنیفہؒ کا بھی ہے، اور مبسوط بکرؒ میں ہے کہ سنت ادا ہونے میں بڑی ایک آیت تین آیتوں کے برابر ہوتی ہے۔ع۔

ایک اشکال اور اس کا حل

جبکہ قراءت کی مذکورہ قسمیں اصل میں موجود ہیں یعنی فرض، واجب اور مسنون کی مقدار تو پھر اس قول کے کیا معنی ہیں کہ پوری سورہ بقرہ پڑھ لینے سے بھی فرض ہی کی ادائیگی ہوگی، اسی طرح رکوع و سجود میں جتنی بھی دیر کی جائے وہ کل فرض ہی ادا ہوگا، ایسی صورت فرض اور سنت کی ادائیگی کیونکر ہوگی، اکثر علماء کے کہنے کے مطابق جواب اصح یہ ہے کہ فرمان باری تعالی ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ ...... الخ﴾ کا تقاضا یہ ہے کہ ایک آیت پڑھ لینے سے اس حکم کی تعمیل ہوگی، اس طرح ایک آیت پڑھی یا اس سے زائد پڑھیں بہر صورت فرض ادا ہوا، اور سنت کے معنی ہوں گے اس فرمان کی وہ حد جو رسول اللہ ﷺ نے مقرر کردی ہے یعنی چالیس سے سو آیتوں تک۔الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جواب سے اشکال دور نہ ہوا کیونکہ امام کو مثلاً تین آیتوں کے بعد سہو ہوگیا اور غلطی بھی ایسی ہوئی جو مفسد صلوۃ ہو تو اس حیثیت سے کہ فرض قراءت مقدار کے بعد ہوئی ہے نماز صحیح ہونی چاہئے، تو اگر پوری قراءت ہی فرض مان لی جائے تو ایسی صورت میں یہ مفسد نماز فرض کے درمیان پایا گیا ہے اس لئے نماز فاسد ہوجانی چاہئے، اس اشکال سے بچنے کے لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید تحقیقی جواب یہ ہو کہ فرمان باری تعالیٰ ﴿فَاقْرَءُوْا مَا تَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ﴾ سے مطلقاً قراءت مراد ہے اسی بناء پر ایک آیت پڑھنے سے بھی فرض ادا ہوا اور زیادہ پڑھنے سے بھی فرض ادا ہوا، البتہ زیادہ پڑھنے کی صورت میں اگر تین آیتیں پڑھی ہیں تو واجب بھی ادا ہوگیا اور اگر مثلاً فجر میں چالیس سے سو آیتیں پڑھیں تو سنت بھی ادا ہوگئی، اس طرح تین صورتوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل ہونے فرض کے حکم پر عمل ہوگیا، اس کے بعد مسنون قراءت پڑھنے سے سنت کی ادائیگی کے ساتھ فرض اور واجب کی بھی ادائیگی ہوگی، اور جب واجب قراءت کی تو اس سے فرض اور واجب کی ادائیگی ہوگئی البتہ سنت باقی رہ گئی، اور اگر صرف مقدار فرض قراءت کی تو واجب اور سنت باقی رہ گئی صرف فرض کی ادائیگی ہوئی، اچھی طرح سمجھ لو، واللہ تعالیٰ اعلم۔م۔

اور مکروہ قراءتوں میں سے چند صورتیں یہ ہیں امام کے پیچھے قراءت کرلی، یا کھڑے ہونے کی قدرت ہونے کے باوجود کچھ

بیٹھ کر پڑھنا، یا کسی نماز کے لئے کوئی خاص سورہ اس طرح متعین کرلینا کہ اس کے ماسوا دوسری کوئی قراءت نہ کی جائے۔ الفتح۔ اور یہ آیت پاک ﴿فَاقْرَؤُا مَا تَيَسَّرَ﴾ الآیۃ جب مطلق مان لی گئی تو اس امام اعظمؒ کے نزدیک اس کا فرد کامل ایک آیت ہوگی اور صاحبینؒ کے نزدیک تین آیتیں ہوں گی، اور اسی قول میں احتیاط کا پہلو بہت زیادہ ہے، اس طرح بہر صورت فرض کی ادائیگی سے سبکدوشی ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ صرف قٓ یا صٓ یا نٓ وغیرہ پڑھ لینے سے امام اعظمؒ کے نزدیک نماز جائز نہ ہوگی، اور قہستانی کی متابعت میں در مختار میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی حاکم ان کلمات کے پڑھنے پر بھی جواز کا حکم دیدے تو جائز مان لی جائے گی، اس طرح یہ صورت بنتی ہے کہ کسی شخص نے اپنے غلام سے کہا کہ اگر آج میں نے اس نفل میں قراءت کی تو تم آزاد ہو، اس کے بعد اس نے صرف قٓ یا نٓ جیسے کلمات میں سے کچھ پڑھا اور سورہ فاتحہ نہیں پڑھی پھر وہ کسی ایسے قاضی کے پاس جاکر مدعا ظاہر کیا جس کے اجتہاد میں یہ ہو کہ اتنی قراءت سے بھی نماز جائز ہے اور اس نے غلام کو آزاد ہونے کا حکم لگا دیا تو اس کا یہ حکم لگانا جائز مان لیا جائے گا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جگہ غلطی کی گنجائش ہے، اور حق بات یہ ہے کہ اس اجتہادی مسئلہ میں قاضی کا حکم صحیح ہے کیونکہ وہ مجتہد ہے، اس لئے ہر شخص پر آزادی کا حکم ماننا لازم ہے لیکن دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ اس شخص کا فتویٰ ہو یا اس نے اپنے اجتہاد سے یہ جانا ہو کہ اتنی قراءت سے نماز جائز نہیں ہوتی ہے تو اس پر اس نفل کی قضاء کرنی لازم ہوگی لیکن قاضی کا حکم بھی اس پر لازم ہوگا، اس پر وہ غلام آزاد ہو جائے گا اور اس کے مالک کو غلام کے بارے میں کچھ اعتراض کرنا درست نہ ہوگا، یہی تحقیق صحیح ہے۔ فافہم۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

نماز میں جتنی قراءت کرنی فرض ہے اتنی یاد کرنا بھی ہر شخص کے لئے فرض عین ہے۔ ت۔ میں مترجم کہتا ہوں یہ حکم تو عمل کے لئے ہے اور عمل میں چونکہ فرض و واجب دونوں برابر ہیں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ جتنی قراءت کرنی واجب ہے ہر شخص کے ذمہ اتنی یاد کر لینی لازم ہے، البتہ جب تک ایک ہی آیت ہو اس سے زیادہ یاد نہ ہو اسی ایک سے اس کی نماز جائز ہو جائے گی اور وہ گنہگار بھی نہ ہوگا، بشرطیکہ سورہ فاتحہ اور اس کے علاوہ کم از کم تین آیتیں یاد کرتا رہتا ہو۔ م۔ اور پورے کلام مجید کو یاد رکھنا فرض کفایہ ہے۔ ت۔ یہانتک کہ اگر علاقہ کے لوگوں میں سے کسی نے بھی حفظ نہیں کیا تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر کسی نے بھی حفظ کر لیا تو بقیہ کسی سے بھی مطالبہ باقی نہ رہے گا۔ م۔ البتہ باقی لوگوں کے لئے حفظ کرنا نفل عمل سے بھی افضل ایک سنت ہے۔ د۔ بلکہ بہت زیادہ پسندیدہ سنت مؤکدہ ہے۔ م۔ فرض کے علاوہ باقی حصہ کو یاد کرنا نفل سے افضل ہے، اور باقی قرآن سیکھنے سے فقہ سیکھنا افضل ہے، اور تمام فقہ سے چارہ نہیں ہے۔ الفتح۔

قرآن پاک یاد کر کے بھول جانا بہت بری بات ہے، مگر حرام ہونے کا حکم اس وقت ہوگا جبکہ دیکھ کر بھی نہ پڑھ سکے۔ ھ۔ وغیرہ، جن لوگوں کو قرآن حفظ کرنا سنت ہے مقدار فرض کے علاوہ ان کے لئے اس کے حفظ کرنے کے مقابلہ میں فقہ سیکھنا افضل ہے۔ د۔ فقہ کی کتابوں میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے، اس مسئلہ میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ہر شخص کو فقہ کے مسائل سیکھنے کی جتنی ضرورت ہے اس پر اتنا سیکھنا فرض ہے خواہ وہ شخص مرد ہو یا عورت ہو، لیکن نماز، روزہ، حج اور زکوۃ کے مسائل میں سے زکوۃ کے مسائل سیکھنے اسی وقت لازم ہوں گے جبکہ مال کا مالک ہو چکا ہو، اسی طرح حج کے مسائل کا جاننا اس وقت لازم ہوگا جبکہ مال کا مالک ہو چکا ہو، اس طرح مال کے پائے جانے سے پہلے صرف اتنا ہی جاننا لازم ہوگا کہ اسلام کا رکن زکوۃ اور حج بھی ہے دوسرے ارکان کی طرح، مال آجانے کے بعد مقدار نصاب زکوۃ مقدار اور ادائیگی کی شرائط وغیرہ اور ان کے مسائل جاننے ہوں گے، اور اپنے متعلقہ ضروری مسائل سے زائد سیکھنا فرض کفایہ ہے، یہانتک کہ اگر علاقہ کے سب لوگ سیکھنا چھوڑ دیں تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر کسی نے بھی سیکھ لئے تو باقی لوگوں کے ذمہ سے بھی ذمہ داری اور ان سے مطالبہ ختم ہو جائے گا، اور وہی فقیہ سب کی

ضرورتیں پوری کرے گا۔
پھر زمانہ گذرنے کے ساتھ ساتھ ایسے مسائل بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں جو پہلے نہیں تھے اور ان سے شریعت کے مسائل بھی متعلق ہوتے رہتے ہیں اس لئے اس بات کی بھی ضرورت ہوگی کہ ان کے حل کرنے کے لئے اجتہاد کی قوت بھی حاصل کی جائے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ اجتہاد بھی فرض کفایہ ہے اس لئے اگر علاقہ کے سارے مسلمان اس کمال کے حاصل کرنے سے منہ موڑ دیں تو سب گنہگار ہوں گے، پس اس جگہ یہ بات معلوم ہوگئی کہ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علامہ نسفی پر اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے ان کا یہ قول قابل تعجب ہے، اس طرح سے کہ انہوں نے علم غیب کا دعویٰ کیا ہے جیسا کہ مولانا بحر العلوم نے ارکان اربعہ میں لکھا ہے۔
دوسرے یہ کہ ان لوگوں نے پچھلوں کے ذمہ سے فرض کفایہ کو ساقط کر دیا ہے اور اب اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا اس کے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو یہ کہہ کر سب کو گنہگار کر دیا ہے، تیسرے یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بندہ کو اجتہاد کی ایک گونہ صلاحیت بھی دی ہے اور وہ اپنی اس صلاحیت سے کام لینے لگا تو عوام اس کے مخالف ہو گئے یہ کہتے ہوئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد اب اجتہاد کرنے والا مدعی کاذب ہے، اور اس کی وجہ سے فتنہ و فساد برپا ہو گئے، جبکہ اس کا باعث صرف صرف غلط دعویٰ اور بدترین قول ہے، اور مجھے سخت تعجب ہے کیونکہ اسلام کی جڑ کاٹنے کے لئے خود ہی شیطان کے ہاتھ میں دھار اور ہتھیار دیدئے گئے ہیں، کیونکہ ایسے قول کے مفاسد بے شمار ہیں، اس لئے انا للہ وانا الیہ راجعون، ایسے مواقع میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے اور وہی خدا سید ھی راہ کی ہدایت دینے والا ہے۔ م۔
اگر کسی جگہ کے تمام لوگوں نے قرآن حفظ کرنا چھوڑ دیا ہو تو اس جگہ فقہ حاصل کرنے سے کہیں بہتر حفظ کرنا ہے۔ ش۔ م۔
پوری سورہ فاتحہ کے علاوہ کوئی ایک سورہ یا چھوٹی تین آیتیں حفظ کرنا واجب ہے ہر مسلمان مرد اور عورت پر۔ ت۔ م۔ ھ۔ (اور اب آئندہ قراءۃ مسنونہ کا بیان ہوگا)۔

وفی السفر یقرأ فاتحة الکتاب وای سورة شاء، لما روی ان النبی علیه السلام قرأ فی صلوة الفجر فی سفره بالمعوذتین، ولان للسفر اثرا فی اسقاط شطر الصلوة، فلأن یؤثر فی تخفیف القراء ة اولی، وهذا اذا کان علی عجلة من السیر، وان کان فی امنة وقرر یقرأ فی الفجر نحو سورة البروج وانشقت، لانه یمکنه مراعاة السنة مع التخفیف.

ترجمہ:- اور نمازی حالت سفر میں سورہ فاتحہ کے ساتھ جون سی سورہ چاہئے پڑھے، اس لئے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حالت سفر میں نماز فجر پڑھتے ہوئے قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھی ہیں، اور اس لئے بھی کہ سفر کا ایک اثر ہے آدھی نماز کے ساقط کر دینے میں اس لئے یہ بات زیادہ بہتر ہے کہ قراءت کی کمی میں بھی اس کا اثر موجود ہو، یہ حکم اس حالت میں ہے کہ چلنے میں جلدی ہو، اور اگر امن اور اطمینان حالت میں ہے تو وہ فجر کی نماز میں سورہ بروج اور انشاق جیسی سورتیں پڑھے، کیونکہ اس کے پڑھنے میں تخفیف کے ساتھ سنت کی رعایت بھی ممکن ہو جائے گی۔

توضیح:- قراءت مسنونہ، سفر کی حالت میں تخفیف قراءت

وفی السفر یقرأ فاتحة الکتاب وای سورة شاء......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ اگرچہ سورہ چھوٹی ہی ہو تو اس سے بھی سنت ادا ہو جائے گی لما روی الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ یعنی فاتحہ سے زائد پہلی رکعت میں سورہ فلق اور دوسری میں سورہ ناس پڑھی، یہ حدیث ابوداؤد و نسائی نے عقبہ بن عامرؓ سے روایت کی ہے، اور اس میں یہ بھی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز کے لئے ٹھہرے تو لوگوں کو ان ہی

دونوں سورتوں سے نماز پڑھائی، اس کی سند میں ایک راوی قاسم ہیں جو معاویہ کے راوی ہیں اور امام یحیی بن معین وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے اگر چہ کچھ دوسرے لوگوں نے اس میں کلام بھی کیا ہے، اور اس حدیث کو ابن حبان نے اپنی کتاب صحیح میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کی ہے۔ مفع۔ اور حق بات یہ ہے کہ حدیث حسن ہے۔ ف۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث قراءت میں تخفیف کرنے پر دلالت کرتی ہے۔

ولان للسفر اثرا فی اسقاط شطر الصلوة، فلأن یؤثر فی تخفیف القراء ة اولی......الخ

اور دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ جبکہ سفر آدھی نماز ختم کر دیتا ہے (یعنی چار رکعت والی کو دو رکعت میں قصر کر دیتا ہے) تو بدرجہ اولیٰ قراءت میں تخفیف کر دے گا۔ ف۔ اگر چہ ابتداء اسلام میں نماز میں دو ہی رکعتیں فرض ہوئی تھیں مگر بعد میں حضر یعنی اقامت کی حالت میں بڑھادی گئیں البتہ سفر میں وہی دو رکعتیں باقی رکھی گئیں جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے صحیح مسلم میں ہے، اس لئے فرض میں زیادتی مسلم رہی، لیکن سفر کی احتمالی تکلیف نے اس میں تخفیف رکھی اس طرح پر کہ اس میں زیادتی نہیں کی گئی، لہٰذا بدرجہ اولی سفر قراءت کی تخفیف کو لازم کرے گا۔

وهذا اذا كان على عجلة من السير، وان كان فی امنة وقرار یقرأ فی الفجر نحو......الخ

اور تخفیف قراءت کا یہ حکم اس صورت میں ہو گا جبکہ مسافر کو جانے کی جلدی ہو رہی ہو۔ ف۔ یعنی سفر میں جارہا ہو اور اتر کر نماز پڑھ لی وان كان الخ اور اگر حالت امن وحالت قرار میں۔ ف۔ یعنی کسی منزل پر ٹھہر گیا ہو کہ یہاں ٹھہر کر اطمینان سے سفر میں روانہ ہو گا تو یقرأ الخ تو فجر میں سورہ بروج اور سورہ انشقت جیسی سورتیں پڑھے گا۔ ف۔ یعنی وَ السَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ الخ اور اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ.

لانه يمكنه مراعاة السنة مع التخفيف......الخ

کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن ہو گا کہ تخفیف قراءت کے ساتھ سنت کو بھی بجالائے۔ ف۔ اور بحر الرائق میں یقین کے ساتھ کہا ہے کہ جامع صغیر میں کہا ہے کہ سفر کی رفتار کی حالت میں اور امن واقرار کی دونوں حالت میں قراءت کی تخفیف ہونی چاہئے کیونکہ مذکورہ حدیث کا حکم مطلق ہے اور اسی قول کو ترجیح حاصل ہے، لیکن نہر الفائق میں اس دلیل کو رد کر دیا ہے، اور مصنفؒ کی تفصیل ترجیح دی ہے۔ د۔ اسی قول پر تمام شارحین متفق ہیں، اور امیر الحاج نے بھی منیہ کی شرح میں اسی پر اتفاق کیا ہے۔ م۔

ويقرأ فی الحضر فی الفجر فی الركعتين باربعين اية اوخمسين اية سوى فاتحة الكتاب ويروى من اربعين الى ستين ومن ستين الى مائة وبكل ذلك ورد الاثر ووجه التوفيق انه يقرأ بالراغبين مائة وبالكسالى اربعين وبالاوساط مابين خمسين الى ستين وقيل ينظر الى طول الليالى وقصرها والى كثرة الاشغال و قلتها.

ترجمہ:- اور اقامت کی حالت کی فجر کی دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ چالیس یا پچاس آیتیں پڑھے، اور یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ چالیس سے ساٹھ اور ساٹھ سے سو آیتوں تک پڑھے، ان میں سے ہر ایک قول کی دلیل میں اثر موجود ہے، ان سب میں توفیق دینے کی صورت یہ ہے کہ مقتدیوں میں جو لوگ قراءت سننے کے زیادہ راغب ہوں ان میں سو آیتیں اور جو لوگ سست ہوں ان میں چالیس آیتیں اور جو لوگ درمیانی قسم کے ہوں ان میں پچاس آیتوں سے ساٹھ آیتوں تک پڑھے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ رات کے بڑے ہونے اور چھوٹے ہونے کو دیکھ کر اسی طرح نمازیوں کی مشغولیتوں کے زیادہ اور کم ہونے کا خیال رکھ کر قراءت کرے۔

توضیح:- اقامت کی حالت میں فجر کی نماز میں مسنون قراءت کی مقدار و فرائض و تراویح اور تہجد میں پڑھنے کا طریقہ، فرض کی ایک رکعت میں فاتحہ کے علاوہ دو سورتیں جمع کرنا

ويقرأ فی الحضر فی الفجر فی الركعتين باربعين اية اوخمسين اية......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔اور جب دونوں رکعتوں کی مقدار بتائی گئی تو اس حساب سے ہر رکعت میں بیس یا پچیس آیتیں ہوئیں جیسا کہ عینی میں ہے، ویروی الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ چنانچہ حضرت جابر بن سمرةؓ کی روایت میں سورہ قٓ اور اس جیسی سورت کی روایت کی گئی ہے، جیسا کہ مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور ابوہریرةؓ کی روایت میں ساٹھ سے سو تک کے درمیان کی روایت ہے، اور حضرت ابن حبان اور ابن عمرؓ سے سورہ صافات اور حضرت جابر بن سمرةؓ سے سورہ واقعہ جیسی سورت کا بیان ہے۔ز۔ف۔ع۔اور عمرو بن حریث کی حدیث میں اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ ہے، مسلم وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، اور عبداللہ بن السائب کی روایت میں سورہ المومنون ہے، جیسا کہ ترمذی میں ہے، اور بخاری میں بھی یہ تعلیق کے طور ہے، اور حضرت ابوبکرؓ نے سورہ بقرہ دونوں رکعتوں میں پڑھی ہے۔المالک۔اور حضرت عثمانؓ سورہ یوسف پڑھا کرتے تھے۔المالک۔ اور حضرت عمرؓ نے سورہ یوسف اور سورہ حج پڑھی ہے۔المالک۔ یعنی اس وقت جب بالکل ابتدائے وقت میں جماعت کھڑی کی گئی، جیسا کہ روایت میں اس کی تصریح بھی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے ہوئے کہا ہے کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں الم تنزیل السجدہ اور ھَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّھْرِ پڑھتے، اور جمعہ کی نماز میں سورہ جمعہ اور سورہ منافقون پڑھتے بخاری کے علاوہ باقی ائمہ خمسہ نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت معاذ بن عبداللہ الجہنیؓ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی ہر رکعت میں اِذَا زُلْزِلَتْ پڑھی ہے۔ابوداؤد۔ خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ روایتوں اور آثار میں بہت زیادہ اختلاف ہے اس لئے ائمہ مذہب کی روایتیں بھی مختلف ہیں۔

ووجه التوفيق انه انه يقرأ بالراغبين مائة وبالكسالى اربعين ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ یعنی مذکورہ مقدار مجموعۃ دونوں رکعتوں میں ہوں۔ وقیل الخ اور کہا گیا ہے کہ راتوں کی درازی و کمی کو دیکھے۔ف۔اس لئے ہمارے یہاں جاڑے کی راتوں میں زیادہ اور باقی راتوں میں کم پڑھے۔

والى كثرة الاشغال و قلتها......الخ

اور امام اپنے مقتدیوں کی مصروفیتوں کی زیادتی و کمی کا خیال کر کے قراءت کرے۔ف۔ جیسے وقت کی گنجائش اور ابتدائے وقت اور آخری وقت کا خیال کرے، یعنی غلس یا اندھیرے میں نماز شروع کرے تو زیادہ پڑھے، اور اسفار یا آخری وقت میں پڑھے تو قراءت میں کمی کرلے، اور بندہ مترجم نے اوپر توفیق دے دی ہے کہ غلس واسفار میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اس طرح سے کہ صبح صادق کے بعد جو وقت ہوتا ہے اس کے حصہ میں غلس بھی ہے اور اسفار بھی ہے، لیکن ابتدائی حصوں میں غلس زیادہ ہوتا ہے اور اسفار کم ہوتا ہے، نیز رات کے غلس یا اندھیرے کے مقابلہ صبح صادق کے وقت اسفار زیادہ ہوتا ہے، اسی طرز اور خیال پر احادیث و آثار میں توفیق دینا افضل و اولی ہے، اور ایک بہت بڑی بات جو خیال رکھنے کی ہے کہ سورج نکلنے تک کے وقت کو نماز اور ذکر و تسبیح میں مشغول رکھنے کے لئے امام اپنے حسن تدبیر سے مقتدیوں کے واسطے تدبیر کرے بالخصوص اس زمانہ میں۔م۔اگر حالت اقامت میں بھی کچھ جلد بازی یا پریشانی کی کیفیت ہو تو مثلاً وقت تنگ ہو یا جان یا مال کا خوف ہو تو اسی انداز سے پڑھے کہ وقت کے اندر نماز ہو جائے یا خطرہ میں مبتلا نہ ہونا پڑے۔الزاہدی۔ واضح ہو کہ سورہ فاتحہ ہر حالت میں ایک طرح سے واجب ہے، لیکن وقت کی انتہائی کمی کی صورت میں اگر پوری سورہ فاتحہ پڑھنے سے وقت ختم ہونے کا اندیشہ ہو تو صرف فرض مقدار پڑھنے پر ہی کفایت کرلے، جیسا کہ اس کی تصریح موجود ہے۔م۔

قال وفى الظهر مثل ذلك لاستوائها فى سعة الوقت، و قال فى الاصل او دونه، لانه وقت الاشتغال، فينقص عنه تحرزا عن الملال، والعصر والعشاء سواء يقرأ فيهما بالاوساط المفصل وفى المغرب دون ذلك فيها بقصار المفصل، والاصل فيه كتاب عمر الى ابى موسى الاشعرى ان اقرأ فى الفجر والظهر بطوال المفصل، وفى العصر والعشاء باوساط المفصل، وفى المغرب بقصار المفصل، ولان مبنى المغرب على العجلة، والتخفيف اليق بها، والعصر والعشاء يستحب فيهما التأخير،

وقد يقعان بالتطويل في وقت غير مستحب، فيوقت فيهما بالاوساط.

ترجمہ:- ظہر میں بھی اسی (فجر) کی طرح قراءت کرے کیونکہ یہ دونوں اوقات نماز کی گنجائش کے اعتبار سے برابر برابر ہیں، اور کہا ہے اصل میں کہ اس ظہر میں اس فجر سے کچھ کم پڑھے، کیونکہ یہ ظہر کا وقت کاموں میں مشغول رہنے کا وقت ہے اس لئے پہلے کے مقابلہ میں کچھ کم کرے ملال اور گرانباری سے بچنے کے خیال سے، اور عصر اور عشاء کا حکم برابر ہے، ان دونوں وقتوں میں اوساط مفصل سے پڑھے، اور مغرب اس سے بھی کم ہے اس لئے اس میں قصار مفصل سے پڑھے، اس سلسلہ میں اصل حضرت عمرؓ کا فرمان ہے جو حضرت موسیٰ اشعریؓ کو انہوں نے لکھا تھا کہ تم فجر اور ظہر میں طوال مفصل سے پڑھو، اور عصر اور عشاء میں اوساط مفصل سے اور مغرب میں قصار مفصل سے پڑھو، اور اس لئے بھی کہ مغرب کی بنیاد جلدی پر ہے، اور کبھی ان دونوں وقتوں میں طول دینے سے غیر مستحب وقت بھی آجاتا ہے اس لئے ان دونوں وقتوں کے لئے اوساط کو ہی مقرر کیا گیا ہے۔

توضیح:- ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کے اوقات میں قراءت مسنون

قال وفي الظهر مثل ذلك لاستوائها في سعة الوقت......الخ

اور ظہر کی نماز میں اسی جیسی قراءت کرے۔ف۔ یعنی جو قراءت فجر کی نماز میں ذکر کی گئی ہے۔ **لاستوائهما الخ** کیونکہ دونوں نمازیں وقت کی گنجائش کے اعتبار سے برابر ہیں۔

و قال في الاصل او دونه، لانه وقت الاشتغال، فينقص عنه تحرزا عن الملال......الخ

اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے اصل یعنی کتاب مبسوط میں **او دونه** یا فجر سے کم پڑھے۔ف۔ یعنی کمی بھی جائز ہے، کیونکہ ظہر کا وقت کاموں میں مشغول ہونے کا ہے۔ **فينقص الخ** تو فجر کے مقابلہ میں کمی کر دے مقتدین کی گرانباری سے بچنے کے لئے۔ف۔ کیونکہ عادت الٰہی میں دلوں پر ملالت اور گرانباری کا آنا بہت برا ہوتا ہے، اس لئے فقیہ امام کا فرض یہ ہے کہ مستحب قراءت میں زیادتی کرنے کے لئے کسی مسلمان کو گرانباری نہ بنائے، میں مترجم کہتا ہوں کہ حضرت جابر بن سمرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر میں وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى پڑھا کرتے تھے، اور عصر میں بھی اس جیسی سورت، لیکن فجر میں اس سے طویل سورہ پڑھتے، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، اور براءؓ کی حدیث سے لقمان اور ذاریات کا پڑھنا معلوم ہوتا ہے، نسائی۔م۔

والعصر والعشاء سواء يقرأ فيهما بقصار المفصل......الخ

اور عصر اور عشاء برابر ہیں۔ف۔ مسنون قراءت کی مقدار کے بارے میں، یعنی دونوں میں اوساط مفصل سے قراءت کرے۔ف۔ واضح ہو کہ قرآن کریم کی آخری حصہ کی کئی سورتیں مفصلات کہلاتی ہیں ان میں طوال، اوساط اور قصار مفصل تین قسموں میں منقسم ہوتی ہیں، اور طوال کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے اس میں دو اقوال ہیں، نمبر ۱۔ یہ کہ سورہ حجرات سے ابتداء ہوتی ہے، نمبر ۲۔ یہ کہ سورہ قٓ سے سورہ بروج تک ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ سورہ عبس تک ہے، اور اوساط مفصل سورہ إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ سے سورہ وَالضُّحٰی تک ہے اور اس کے بعد کی سورتیں قصار مفصل ہیں، قاضی خان وغیرہ۔ع۔ف۔ اور یہ تینوں نام ہمارے اسلاف میں بھی مشہور تھے، اور حضرت بریدہؓ کی مرفوع حدیث میں عشاء کی قراءت میں والشمس ضحها اور اس جیسی سورتوں کا بیان ہے، النسائی اور الترمذی، اور سفر کی ایک رکعت میں والتین والزیتون پڑھتے تھے، یہ روایت حضرت براءؓ سے صحاح ستہ میں موجود ہے، اور حضرت جابر بن سمرہؓ سے ایک حدیث مرفوعاً ہے کہ ظہر و عصر میں سورۃ بروج و طارق کی قراءت کی ہے، النسائی، ابوداؤد اور الترمذی، اور ظہر ہی کی مانند فجر اور عصر بھی ہیں کہ ان میں وقت کی بہت گنجائش ہے، البتہ ضرورتیں زائد ہونے کی وجہ سے ان میں مشغولیت رہتی ہے۔ مع۔

وفي المغرب بقصار المفصل......الخ

اور مغرب میں اس سے کم یعنی مغرب کی نماز میں قصار مفصل پڑھے۔ف۔ حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مغرب میں قُلْ یَا اَیُّھَا الْکَافِرُوْنَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھا کرتے تھے، ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے، اور ابن مسعودؓ نے بھی سورہ اخلاص پڑھی ہے، ابو داؤد، اور حضرت ابو بکرؓ نے قصار مفصل سے ہر رکعت میں سورہ پڑھی ہ، موطا مالک۔

والاصل فیه کتاب عمر الی ابی موسی الاشعری ان اقرأ فی الفجر والظهر بطوال المفصل......الخ

اور اس بارے میں اصل خلیفہ امیر المومنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا فرمان ہے جو انہوں نے اپنے عامل ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا تھا۔ف۔ یہ روایت عبد الرزاقؒ اور ابن شاہینؒ نے مختصر أبیان کی ہے، اور ترمذیؒ نے اس کا حوالہ دیا ہے، ان اقرأ الخ یہ لکھا تھا کہ فجر میں پڑھا کرو۔ ع۔(۱) ع۔ عبد الرزاق۔ ن۔ ابن شاہین۔ م۔ صرف مصنفؒ کی روایت ہے۔ ن۔

والظهر بطوال المفصل......الخ

اور ظہر میں م۔ طوال مفصل کو۔ ف۔ اور ظہر میں اوسط مفصل کو۔ ن اور عصر میں۔ اور عشاء میں۔ ع۔ ن۔ اوسط مفصل کو و فی المغرب اور مغرب میں قصار مفصل کو ع۔ ن۔ ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ صاحب ہدایہؒ نے ظہر میں طوال مفصل کی ـــــــ روایت کی ہے اور ابن شاہینؒ کی روایت میں اوساط مفصل ہے، لیکن عبد الرزاق اور ابن شاہینؒ کی روایت میں نماز عصر کا بالکل ذکر نہیں ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ میں نے ظہر میں طوال مفصل کی روایت نہیں دیکھی ہے بلکہ ترمذیؒ نے اس فرمان کا حوالہ دیا تو ظہر میں اوساط مفصل ذکر کیا ہے، البتہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ ظہر کی ہر رکعت میں تقریباً تیس آیتیں پڑھتے تھے، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، اس بناء پر یہ روایت طوال مفصل کے مطابق ہو گئی۔ مف۔

بہر صورت مغرب میں قصار مفصل پر سب متفق پائے گئے، البتہ کچھ روایتوں میں اس کے خلاف بھی پایا گیا ہے، مثلاً نسائی کی روایت جو حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ہے کہ سورہ اعراف پڑھی گئی ہے، اور بخاری کی روایت میں حضرت زید بن ثابتؓ سے ہے، اور سورہ والمرسلات جو حضرت ام الفضل کی حدیث میں ہے اور صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، اور سورہ طور جو حضرت جبیر بن مطعمؓ کی حدیث میں ہے ترمذی کے علاوہ باقی ائمہ خمسہ کی کتابوں میں ہے، اور نسائی میں حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں سورہ حٰم الدخان ہے، ان روایتوں کے سلسلہ میں عینیؒ نے جواب دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ مومنوں کی خواہش کا اندازہ کر کے کبھی طویل قراتیں کر لیتے تھے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ روایتیں بہت واضح دلیلیں ہیں اس بات کی کہ مغرب کا وقت شفق ابیض یا سپید لکیر کے ختم ہونے تک باقی رہتا ہے، جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے اور شفق احمر یا سرخ لکیر کے ختم ہونے باقی نہیں رہتا ہے جس پر بعض لوگوں نے فتویٰ دیا ہیں، اس بحث کو اچھی طرح یاد رکھو۔ م۔

ولان مبنی المغرب علی العجلة، والتخفیف الیق بها......الخ

اور مغرب میں قصار مفصل اس لئے بھی ہے کہ مغرب کی نماز کی بنیاد جلدی پر ہے اور جلدی کے مناسب مختصر اور تھوڑے پڑھنے پر ہے، اس لئے قصار مفصل ہی پڑھنی چاہئے، میں مترجم کہتا ہوں کہ جلدی تو نماز شروع کرنے میں ہے۔ م۔ یتیمہ میں ہے کہ اگر عصر کی نماز مکروہ وقت میں ادا کرنی ہو تو صحیح یہی ہے کہ پوری مسنون قراءت کی جائے، التاتار خانیہ، اور بدائع میں ہے کہ قراءت میں کوئی حد مقرر نہیں ہے، بلکہ وقت اور مقتدیوں اور امام کے مختلف حالات کے مطابق ہونی چاہئے۔ د۔ مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کے قول کی اتباع اس قول سے بہتر ہے۔ م۔

والعصر والعشاء یستحب فیهما التاخیر......الخ

اور عصر و عشاء سے ہر ایک میں تاخیر مستحب ہے۔ ف۔ اس لئے ان کی قراءت میں طوال دینا بہتر نہ ہوگا، اور طول دینے سے کبھی یہ دونوں نمازیں غیر مستحب وقت میں بھی داخل ہو سکتی ہیں۔ ف۔ عصر میں آفتاب میں زردی آجانے سے اور عشاء میں نیند کے غلبہ کی وجہ سے غیر مستحب وقت آجائے گا جو خلاف اولیٰ ہوگا۔

وقد یقعان بالتطویل فی وقت غیر مستحب، فیوقت فیهما بالاوساط......الخ

اس بناء پر ان دونوں وقتوں میں اوساط مفصل کی حد مقرر کی جائے گی۔ف۔ جیسا کہ گذشتہ آثار میں مقرر کی گئی ہے۔م۔وتر کی نماز میں فاتحہ کے بعد جو پڑھنا چاہے صحیح ہے۔المحیط۔ مگر تبرک کے طور پر کبھی کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور قُلْ يَا اَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھ لینا چاہئے، التہذیب۔ تمام نمازوں میں مستحب قراءت سے زیادہ امام نہ پڑھے اور قوم کو پریشانی میں نہ ڈالے، بلکہ ان کے لئے قراءت میں تخفیف کرے جبکہ مستحب ادا ہو جائے۔المضمرات عن الطحاوی۔
اور حضرت جابر بن سمرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ کی نماز ہلکی ہلکی معلوم ہوتی تھی، جیسا کہ مسلم نے روایت کی ہے، اور دلیل یہ ہے کہ فرائض میں قراءت اس طرح ہونی چاہئے کہ ایک ایک حرف ٹھہر ٹھہر کر، اور تراویح میں درمیانی درجہ پر اور رات کی نماز تہجد میں اتنی تیزی کے ساتھ پڑھنی جائز ہے جبکہ قراءت صاف سمجھ میں آتی ہو۔د۔اور دوسری نفل نمازوں کا بھی غالباً یہی حکم ہے۔ش۔ فرض نمازوں کی ایک رکعت میں سورہ فاتحہ کے علاوہ دو سورتیں بھی پڑھنی جائز ہے، اس حدیث کی وجہ سے جو صحیحین میں ہے، مگر یہ ایسی کوئی سنت نہیں ہے جسے رسول اللہ علیہ نے جو کیا ہو یا فرمایا ہو، لیکن خود رسول اللہ علیہ نے نوافل میں کئی کئی سورتیں تلاوت کی ہیں، جیسا کہ بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے.........اس کے بعد عینیؒ میں دیکھا ہے کہ ہمارے ایک رکعت میں دو سورتیں جمع کرنا مکروہ نہیں ہے۔م۔

ويطيل الركعة الاولى من الفجر على الثانية اعانة للناس على ادراك الجماعات، قال وركعتا الظهر سواء، وهذا عند ابى حنيفة وابى يوسفؒ و قال محمدؒ احب الى ان يطيل الركعة الاولى على الثانية فى الصلوة كلها، لما روى ان النبى عليه السلام كان يطيل الركعة الاولى على غيرها فى الصلوة كلها، ولهما ان الركعتين استويا فى استحقاق القراءة فيستويان فى المقدار بخلاف الفجر لانه وقت نوم وغفلة، والحديث محمول على الإطالة من حيث الثناء والتعوذ والتسمية، ولامعتبر بالزيادة والنقصان بما دون ثلاث ايات لعدم امكان الاحتراز عنه من غير حرج.

ترجمہ:-اور فجر کی پہلی رکعت کو دوسری رکعت کے مقابلہ میں طویل کرے لوگوں کو جماعت پالینے میں مدد دینے کی غرض سے، اور ظہر کی دونوں رکعتیں برابر ہیں، اور یہ حکم امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، لیکن یہ روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ علیہ تو تمام نمازوں میں پہلی رکعت کو دوسری رکعتوں کے بالمقابل طویل کیا کرتے تھے، اور شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ قراءت کے استحقاق میں تو دونوں رکعتیں ہی برابر ہوا کرتی ہیں اس بناء پر مقدار میں بھی دونوں برابر رہیں گی، بخلاف فجر کے اس کی پہلی رکعت اس لئے طویل کی جاتی ہے کہ وہ وقت نیند اور غفلت کا ہوتا ہے، اور مذکور حدیث میں پہلی رکعت کے طویل ہونے کے مفہوم کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ صرف اس میں ثناء اور تعوذ اور تسمیہ بھی ہوتی ہے، اور تین آیتوں سے کم اور زیادہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا ہے، کیونکہ بلا تکلیف اٹھائے دونوں رکعتوں کو بالکل برابر رکھنا ممکن نہیں ہے۔

توضیح:-فجر کی پہلی رکعت کو دوسری کے بالمقابل طویل کرنا، تین آیتوں سے کم اور زیادہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے

ويطيل الركعة الاولى من الفجر على الثانية اعانة للناس على ادراك الجماعات......الخ
مطلب واضح ہے۔ف۔ پہلی رکعت کو دوسری کے مقابلہ میں طول دینا خواہ آیات کی زیادہ کی وجہ سے ہو (اگر وہ چھوٹی ہوں) یا کلمات کی زیادتی سے ہوں (اگر وہ بڑی ہوں) التبیین، اور یہ حکم بالاجماع ہے۔

اعانة للناس على ادراك الجماعات......الخ
اس فائدہ کے خیال سے کہ مقتدی کو پہلی رکعت پانے کے ساتھ پوری جماعت پالینے کا موقع مل جائے گا۔ف۔ یہ بات حضرت ابو قتادہؓ کی مرفوع حدیث میں موجود ہے اور ابوداؤد میں اس کی تصریح ہے۔م۔

قال ور کعتا الظهر سواء، وهذا عند ابی حنیفة وابی یوسف ......الخ

اور ظہر کی دونوں رکعتیں ہی برابر ہیں۔ف۔ یعنی جن میں قراءت فرض ہے۔ وهذا الخ یعنی ظہر کی دونوں رکعتوں کے برابر ہونے کا حکم امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے۔ف۔ اور اکثر شافعیہ کا بھی یہی قول ہے، اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ اس ظہر میں بھی پہلی رکعت کو دوسری پر طول دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مع۔

و قال محمدؒ احب الی ان یطیل الرکعة الاولی علی الثانیة فی الصلوة کلها......الخ

اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ پہلی رکعت کو دوسری پر طول دینا ہی مجھے پسند ہے، یعنی مستحب ہے، کہ تمام نمازوں میں پہلی رکعت کو دوسری کے مقابلہ میں طویل کیا جائے۔ف۔ خواہ وہ ظہر ہو یا کوئی اور ہو، جیسا کہ فجر کی سنت ہے۔

لما روی ان النبی علیه السلام کان یطیل الرکعة الاولی علی غیرها فی الصلوة کلها......الخ

کیونکہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ پہلی رکعت کو دوسری رکعتوں کے مقابلہ میں تمام نمازوں میں طویل کرتے تھے۔ف۔ چنانچہ ابو قتادہؓ کی مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی پہلی رکعتوں میں سورہ فاتحہ سورہ سمیت پڑھتے اور آخری دونوں میں صرف فاتحہ پڑھتے، اور پہلی رکعت کو جتنی طویل کرتے اتنی اور کسی کو طویل نہیں کرتے، ایسا ہی عصر اور صبح میں بھی کرتے تھے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ، اس سے ہم لوگ اس نتیجہ پر پہونچے کہ پہلی رکعت کو طول دینے سے رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہی تھا کہ لوگ پہلی رکعت بھی پالیں۔ ابوداؤد۔ اور عینیؒ نے بھی ذکر کیا ہے، اور عشاء میں بھی اسی طرح کرتے تھے۔ ابوداؤد۔ اسی قول کو نوویؒ نے اختیار کیا ہے۔ع۔ خلاصہ میں اسی قول کو مستحب کہا ہے۔ف۔ اور اسی پر فتویٰ ہے۔ الزاہدی و معراج الدرایہ۔ اور فتاویٰ الحجہ میں ہے کہ اسی قول کو فتویٰ کے واسطے قبول کیا گیا ہے۔ التاتارخانیہ۔ ھ۔

ولهما ان الرکعتین استویا فی استحقاق القراءة فیستویان فی المقدار......الخ

اور شیخینؒ کی دلیل۔ف۔ بلکہ تمام شافعیہ کی بھی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں ہے کہ ظہر کی پہلی ہر رکعت میں قراءت تقریباً تیس آیتوں کی اور پچھلی ہر رکعت میں ۱۵ آیتوں کی اور عصر کی ہر پہلی رکعت میں پندرہ آیتوں کی اور پچھلی ہر رکعت میں اس کی نصف ہے، جیسا کہ مسلم اور احمدؒ نے اس کی روایت کی ہے، پس ایسی حدیث کا مفہوم یہ نکلا کہ ظہر اور عصر دونوں کی پہلی دونوں رکعتیں برابر ہوتی تھی، لیکن اس میں نہ اشکال ہوتا ہے کہ دوسری ایک حدیث میں ہے کہ ظہر کی قراءت اوساط مفصل سے ہے اور بھی ایک روایت میں ہے کہ اس میں صرف سورہ فاتحہ کی قراءت ہے، اور وہ تو بالاتفاق صرف سات آیتیں ہیں پندرہ نہیں ہیں، بہت ممکن ہے کہ آخری دونوں میں فاتحہ کے علاوہ کچھ اور بھی پڑھتے ہوں، بہر حال اس حدیث میں اشکال رہ جاتا ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے ایک اور دلیل شیخینؒ کی اس طرح دی ہے ان الرکعتین الخ .... قراءت کے استحقاق میں دونوں رکعتیں برابر ہیں لہٰذا دونوں کی مقدار بھی برابر ہوگی۔

بخلاف الفجر لانه وقت نوم وغفلة......الخ

برخلاف فجر کے۔ف۔ کہ اگرچہ دونوں قراءت کے بارے میں بالکل برابر کی مستحق ہیں لیکن ایک خاص مجبوری اور عارضی حالت کی وجہ سے دونوں حکموں میں فرق ہو گیا ہے یعنی عام نمازیوں کی بے اختیاری ہے۔ لانه وقت نوم الخ کہ صبح کا وقت نیند اور غفلت کا ہے۔ف۔ اس لئے یہ اعتراض نہیں ہو سکتا ہے کہ مجبوریاں ظہر وغیرہ میں دوسرے کاموں میں مشغول رہنے کی بھی تو ہو سکتی ہیں اس لئے کہ یہ اختیاری مجبوریاں ہیں، البتہ اس وقت اکثر قیلولہ اور تھوڑی دیر آرام کرنا ہو سکتا ہے، دوسرے یہ کہ نص کے مقابلہ میں ایسا قیاس رد کر دینے کے قابل ہے، مگر خود حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث میں یہ مذکور تاویل موجود ہو۔

والحدیث محمول علی الاطالة من حیث الثناء والتعوذ والتسمیة......الخ

حضرت ابو قتادہؓ کی حدیث محمول ہے اس زیادتی پر جو صرف دلیل رکعت میں ثناء اور تعوذ اور تسمیہ کے پڑھنے سے ہوتی

ہے۔ف۔ یعنی پہلی رکعت کو طویل کرنا اس طرح سے ہے کہ اس میں سبحانك اللهم الخ اور اعوذ بالله الخ اور بسم الله الخ پڑھتے ہیں جو دوسری رکعتوں میں نہیں پڑھتے ہیں، اسی لئے پہلی رکعت دوسری رکعتوں سے طویل ہوتی ہے جبکہ دونوں رکعتوں کی قراءت برابر ہوتی ہے، لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ تاویل ظہر وعصر میں کی جاسکتی ہے کیونکہ پڑھنے والے کی قراءت مخفی ہوتی ہے، مگر فجر وعشاء کی نماز میں تو زور سے ادا کی جاتی ہیں اور ان میں گذشتہ تاویل کرنے میں تامل ہوتا ہے، بلکہ فجر کی نماز میں تو بالاتفاق قراءت طویل ہوتی ہے، اسی بناء پر فتح القدیر میں کہا ہے کہ یہ تاویل ناقابل فہم ہے، اور اسی وجہ سے خلاصہ میں کہا ہے کہ امام محمدؒ ہی کا قول احب یعنی پسندیدہ ہے، پھر شیخینؒ کا قول اس صورت میں ہے جبکہ آیتوں کے درمیان چھوٹی اور بڑی ہونے کا فرق ہو تو اس صورت میں کلمات اور حروف کے اعتبار سے برابر کا اعتبار ہوگا، ایسا ہی مرغینانی نے کہا ہے۔ التبیین۔ لیکن حق بات یہی ہے کہ مقدار کا اعتبار آیتوں سے ہوتا ہے (حروف وغیرہ سے نہیں ہوتا ہے) اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

ولامعتبر بالزيادة والنقصان بما دون ثلاث ايات......الخ

مقدار کے بارے میں تین آیتوں سے کمی وزیادتی کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ف۔ البتہ پوری تین آیتیں زیادہ پڑھنے سے ایک زیادہ اور دوسری کم سمجھی جائے گی، اور صرف ایک آیت یا دو آیتیں زیادہ پڑھنے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

لعدم امكان الاحتراز عنه من غير حرج......الخ

کیونکہ اتنی قراءت کی زیادتی یا کمی سے بچنا ممکن نہیں بہت مشکل ہوتا ہے۔ف۔ جبکہ شریعت نے مشکل میں گرفتار ہونے سے درگذر کیا ہے، لہذا اتنی کمی وبیشی کے اعتبار کو بھی ختم کردیا گیا ہے، اور خود رسول اللہ ﷺ سے بھی صحیح روایت سے ثابت ہے کہ مغرب کی نماز میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھی ہے حالانکہ ان میں ایک سورہ میں ایک آیت دوسری کے مقابلہ میں زیادہ ہے، اور عینی میں ہے کہ فرض نمازوں میں تین آیتوں کی زیادتی مکروہ ہے اور نوافل وسنن میں مکروہ نہیں ہے۔ جامع المحبوبی۔ ع۔ لیکن یہ حکم ان سورتوں سے مستثنیٰ ہے جن کو سنت کے طور پر پڑھنا ثابت ہے، کیونکہ ان میں تین آیتوں کی زیادتی بھی مکروہ نہیں ہے۔ البحر۔ اس جگہ کراہت سے تنزیہی مراد ہے۔ البحر۔ یعنی یہ اختلاف اولویت اور صرف بہتری کا ہے، کیونکہ اگر کوئی پہلی رکعت میں سورہ بقرہ اور دوسری میں صرف کوئی تین آیتیں ہی پڑھ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے بالکل جائز ہے۔ الظہیر یہ۔

پھر یہ اختلاف جیسا صرف فرائض کے درمیان اور سنت کا ہے ایسا ہی جمعہ اور عیدین کے درمیان بھی ہے۔ البدائع۔ پھر یہ احتیاط صرف امام کے حق میں ہے کیونکہ تنہا پڑھنے والے کو اختیار ہے جس طرح چاہے پڑھے۔ جامع التمر تاشی۔ اور امام ابو حنیفہؒ سے مجرد حسن بن زیاد میں منقول ہے کہ ہم نے ابتک قراءت کے بارے میں ابھی جو حکم بیان کیا ہے اس میں تنہا پڑھنے والا بھی امام کی طرح ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ تنہا پڑھنے والے کے لئے جہر کرنا لازم نہیں ہے، قنیہ میں ہے کہ مسنون قراءت میں امام اور منفرد دونوں برابر ہیں مگر عموماً لوگ اس سے غافل ہیں۔ مع۔ حلبیؒ نے بھی یہی کہا ہے۔ د۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ سنت تو رسول اللہ ﷺ کے عمل کا نام ہے، اس لئے آپ کا عمل صرف فرض کی ادائیگی میں کس طرح ہو سکتا تھا جو منفرد کے حق میں بھی مسنون قراءت کا حکم وہی ہو جو امام کی قراءت مسنونہ کا ہے کہ اس کے نہ کرنے سے اس کی برائی لازم آئے اور اگر کسی عذر کی بناء پر جماعت ترک ہوگئی ہو تو اپنی قرائت کے مطابق قراءت کرے، ورنہ مستحب ہے کہ قراءت مسنونہ پڑھے، اس بناء پر میرے نزدیک جامع التمر تاشی کا قول صحیح ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ اور مجرد حسن بن زیاد کا قول اس روایت کو شامل نہیں ہے، اور یہی قول اعتماد کرنے کے لائق بھی ہے۔ ظم۔

اور فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص پہلی رکعت میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ لے تو دوسری رکعت میں بھی یہی پڑھے۔ ع۔ اس بناء پر مسبوق کو بھی اسی طرح پڑھنا چاہئے۔ م۔ اسی طرح دونوں رکعتوں میں فاتحہ کے ساتھ کسی ایک سورہ کو بھی

پڑھ لینادرست ہے، جیسا کہ مالک بن الحویرثؓ کی مرفوع حدیث میں اِذَا زُلْزِلَتِ سورہ کے بارے میں ہے، جیسا کہ ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، ایک صحابی امامت کرتے ہوئے ہر رکعت میں فاتحہ وغیرہ پڑھ لینے کے بعد صرف قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ ہی پڑھا کرتے تھے، اس بناء پر رسول اللہ ﷺ کے پاس اس مسئلہ کو پیش کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے اس کی وجہ دریافت کرو، دریافت کرنے پر انہوں نے جواب دیا کہ یہ سورہ رب رحمن کی صفت ہے اس لئے مجھے اس سے بہت محبت ہے، اور یہی وجہ ہے کہ میں ہر ایک رکعت میں اسی کو پڑھتا ہوں، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جاؤ اسے بھی یہ خبر پہونچادو کہ خدائے رحمن بھی تجھ سے محبت رکھتا ہے، بخاری و مسلم اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، تو اس طرح رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس عمل کو باقی رکھا اور اس کی مخالفت نہیں کی اس سے ایسا کرنا جائز ثابت ہوا، سورہ فاتحہ کے بعد ایک رکعت میں دو سورتوں کو جمع کرنا ہمارے نزدیک مکروہ نہیں ہے، طحاویؒ نے کہا ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کا بھی اسی پر عمل ثابت ہے۔ مع۔

مگر میرے نزدیک فرض نمازوں میں ایسا کرنا کوئی سنت مؤکدہ نہیں ہے، اور مکروہ بھی نہیں ہے بلکہ صرف جائز ہے، اور یہ مسئلہ اس سے پہلے بھی بیان کیا جا چکا ہے۔ م۔

حدیقۃ العلماء میں لکھا ہے کہ چار حضرات ایسے بھی گذرے ہیں جنہوں نے ایک ہی رکعت میں پورا قرآن پاک ختم کیا ہے، اور وہ یہ ہیں، نمبر۱۔ حضرت امیر المومنین عثمانؓ، نمبر۲۔ حضرت تمیم داریؓ، نمبر۳۔ حضرت سعید بن جبیرؒ اور امام ابو حنیفہؒ۔ ع۔ ان چاروں میں پہلے دو صحابی اور آخری دو تابعی ہیں۔ رحمہم اللہ۔ م۔

ولیس فی شیء من الصلوۃ قراءۃ سورۃ بعینھا لایجوز غیرھا لا طلاق ماتلونا، ویکرہ ان یوقت بشیء من القرآن لشیء من الصلوات لما فیہ من ھجر الباقی وایھام التفضیل.

ترجمہ:- اور کسی بھی نماز میں کوئی بھی سورہ اس طرح کی لازم نہیں ہوئی ہے کہ اس کے علاوہ کسی دوسری سورہ کو پڑھنا جائز نہ ہو، اس آیت کے مطلق ہونے کی وجہ سے جسے ہم نے پہلے ہی تلاوت کی ہے، اور یہ بات مکروہ ہے کہ نمازی کسی نماز کے لئے قرآن کے کسی حصہ کو لازم کردے، کیونکہ ایسا کرنے کی وجہ سے قرآن کے باقی حصہ کو چھوڑنا لازم آئے گا، اور دوسرے حصہ پر برتری دینی لازم آئے گی۔

توضیح:- نمازوں میں سورتوں کا مقرر کرلینا یا کسی وقت کے لئے کسی سورہ کو، چند ضروری مسائل

ولیس فی شیء من الصلوۃ قراءۃ سورۃ بعینھا لایجوز غیرھا لا طلاق ماتلونا......الخ

اور نمازوں میں کسی معین سورہ کو پڑھنے کا حکم نہیں ہے۔ ف۔ یعنی کسی نماز میں قراءت ادا ہونے کے لئے کسی معین سورہ کو پڑھنا فرض نہیں ہے، اس طور پر کہ سورہ کے علاوہ دوسری کوئی سورہ جائز ہی نہ ہو۔ ف۔ بلکہ قرآن میں سے مطلقاً کسی سورہ کو بھی پڑھ لینا فرض ہے، اور سورہ فاتحہ کا متعین ہونا فرض کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور واجب ہے، اسی بناء پر اگر کوئی سورہ فاتحہ کی جگہ دوسری کوئی سورہ پڑھ دی تو بھی فرض ادا ہو جائیگا۔

لا طلاق ماتلونا ......الخ

اس آیت کے مطلق ہونے کی وجہ سے جو اوپر تحریر کردی گئی ہے۔ ف۔ یعنی ﴿فَاقْرَؤُا مَاتَیَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ﴾ الخ کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سے جو بھی پڑھنا تمہارے آسان ہو پڑھ دو چنانچہ سورہ فاتحہ کے ترک ہو جانے سے نماز باطل نہ ہوگی، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا ہے، اس دلیل کے پیش نظر کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ہے **لاصلوۃ الابفاتحۃ الکتاب** یعنی سورہ فاتحہ کے ساتھ ہی نماز ہوگی اس کے بغیر نہ ہوگی۔ بخاری وغیرہ۔ کیونکہ اس حدیث سے یہی بات سمجھی جاتی ہے کہ جس عمل کا نام نماز ہے اس کی صورت اسی سورہ فاتحہ سے پائی جائے گی، اور اس سے مکمل ہوگی، اسی بناء پر ہمارے اگلے اور پچھلے

تمام علماء کرام میں اس پر عمل جاری ہے، اسی لئے اگر یہ سورہ نماز میں نہیں پائی جائے تو جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خداج اور غیر تام ہے یعنی ناقص ہے مکمل نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ ان علماء کرام کے نزدیک بھی فرض نہ تھی ورنہ اس فرض کے ترک ہو جانے سے صرف ناقص ہی نہ ہوتی بلکہ باطل ہو جاتی، اور یہ بات بالکل واضح ہے۔م۔

ویکرہ ان یوقت بشیء من القرآن لشیء من الصلوات لما فیہ من ھجر الباقی وایھام التفضیل......الخ

اور یہ بات مکروہ ہے کہ نمازی کسی بھی نماز میں قرآن پاک کے کسی ٹکڑے اور حصے کو لازم کرے۔ف۔ یعنی کسی نماز کے لئے کسی سورہ یا آیت کو خاص کر لینا مکروہ ہے، امام طحاویؒ اور اسبیجابیؒ نے کہا ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ کوئی اسی مقرر کردہ سورہ کو پڑھنا اپنے لئے ایسا واجب سمجھے کہ اس کے بغیر کچھ اور پڑھنا جائز ہی نہیں ہے، یا یہ بھی سمجھے کہ اس کے سوا کچھ اور پڑھنا مکروہ ہے۔ التبیین۔ف۔ بس حاصل یہ ہوا کہ نماز میں سورہ فاتحہ واجب ہے، اور اس کے علاوہ بھی قرآن میں سے کچھ اور پڑھنا چاہئے، مگر کسی سورہ یا چند آیتوں کو اس طرح حاصل کر لینا کہ اس کے علاوہ کچھ اور پڑھنے کو مکروہ سمجھا جائے یا اسی سورہ کو پڑھنا واجب کہا جائے، تو اس طرح خاص کرنا مکروہ ہوگا۔م۔ اور اگر اس طرح نہ سمجھے بلکہ کوئی سورہ صرف آسان جاننے یا اس خیال سے کہ اسے رسول اللہ ﷺ نے پڑھا ہے اور فقط تبرکاً اسے مقرر کر لیا تو کراہت نہ ہوگی، مگر اس میں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ کبھی کبھی اس کے خلاف بھی کر لیا جائے تاکہ جاہل عوام یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ اسی سورہ کی قراءت ضروری ہے اور کسی دوسری سورہ کی قراءت جائز نہیں ہے۔ التبیین۔

اسی بناء پر شافعیہ نے جمعہ کے دن فجر کی نماز میں سورہ سجدہ پڑھنے کو محض اس خیال سے لازم کیا ہے کہ اس کا پڑھنا سنت ہے تو عوام کے دل میں یہ عقیدہ قائم ہو گیا ہے کہ اس وقت میں یہی سورہ پڑھنی ضروری ہے، اتنی کہ اس کے علاوہ کچھ اور جائز ہی نہیں ہے۔ مع۔ پس حق بات یہ ہے کہ کسی نماز کے لئے کسی سورہ کو ہمیشہ کے لئے مقرر کر لینا مکروہ ہے، خواہ اسے لازمی سمجھے یا نہ سمجھے۔ف۔

لما فیہ من ھجر الباقی وایھام التفضیل......الخ

کیونکہ کسی سورہ کو مقرر کر لینے سے باقی قرآن کو چھوڑنا لازم آتا ہے۔ف۔ مگر یہ شبہہ تو اسی صورت میں لازم آئے گا جبکہ دوسری نمازوں میں اس سورہ کے علاوہ کچھ بھی نہ پڑھے۔ف۔ مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ اگرچہ دوسری نمازوں میں اسی طرح مخصوص نہ کرے جب بھی کم از کم اتنا تو ضرور خیال ہوگا اس نماز میں اسی سورہ کی قراءت ضروری ہے، پس باقی قرآن کو چھوڑنا لازم آئے گا، اس وہم کے علاوہ یہ بھی لازم آتا ہے۔

وایھام التفضیل......الخ

برتری اور افضلیت ثابت کرنے کا وہم لازم آتا ہے۔ف۔ اس لئے سنت کی برکت کے خیال سے پڑھتا رہے لیکن کبھی کبھی مختلف اوقات میں کچھ دوسری قراءت بھی کر لیا کرے، تاکہ عوام کو مذکورہ شبہ نہ ہونے پائے جیسا کہ فتح القدیر اور التبیین میں اس کی تصریح کر دی ہے، اور ایسا نہ کرے حدیث میں جن قراءتوں کا ثبوت موجود ہے انہیں گاہے گاہے اور دوسری قراءتوں کو اکثر و بیشتر پڑھتا رہے جیسا کہ در مختار میں سمجھا ہے، اور حدیث میں کچھ قراءتوں کا پہلے ذکر کیا چکا ہے، سوائے تہجد اور عیدین کی نمازوں کے کہ ان کا بیان عنقریب آئے گا۔م۔ اور امام شافعیؒ کے نزدیک بھی مذکور خرابی کی وجہ سے کراہت لازم آتی ہے اس بناء پر ان میں کوئی اختلاف ثابت نہ ہوا، بلکہ مسنون اور متبرک ہونے کے خیال سے خاص طور سے ان سورتوں کو پڑھتا رہے جن کا صحاح کتابوں میں بیان موجود ہے۔ بالاجماع۔

اور اگر کوئی ان مسنون قراءتوں کو ہی اس خیال سے پڑھتا رہے کہ ان کے علاوہ کسی اور کی قراءت جائز نہیں ہے تو بالاتفاق مکروہ ہے، اور اگر کبھی ایسا خیال ہونے لگے کہ ان قراءتوں کو سن کر عوام اس گمان میں پڑ جائیں گے، کہ ان کا ہی پڑھنا واجب ہے تو

اس وقت بھی یہی واجب ہے کہ کبھی کبھی دوسری سورتیں پڑھ لیا کرے، اب میں مترجم کہتا ہوں کہ امام کو یہ چاہئے کہ موقع بہ موقع اپنے مقتدیوں کو یہ سمجھاتا رہے کہ ان سورتوں کا پڑھنا واجب نہیں بلکہ مسنون ہے اور ان کے علاوہ دوسری سورتیں بھی جائز ہیں تو ان کا وہم جاتا رہے گا اور غلط خیال جگہ نہ پکڑے گا، اوقات مخصوصہ میں مسنون سورتیں پڑھتے رہنے سے قرآن کے باقی ماندہ حصے کی قراءت چھوٹ جاتی ہے اس لئے بہتر ہو گا کہ گاہے گاہے خیال کر کے اِدھر اُدھر کی سورتیں بھی پڑھ لینی چاہئے، ویسے بھی کسی حدیث میں اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ فلاں فلاں سورتیں ہمیشہ پڑھتے اور ان کے علاوہ کبھی کوئی دوسری سورہ نہیں پڑھتے تھے، فافہم۔م۔

چند ضروری مسائل

ختم قرآن کے بعد دو رکعت پڑھتے وقت پہلی رکعت میں سورہ فلق اور سورہ ناس پڑھ کر رکوع کر کے دوسری رکعت میں الحمد کے بعد الم سے چند آیتیں پڑھ کر رکوع کرنا چاہئے۔ الخلاصہ۔ فتاوی الحجہ میں ہے کہ قرآن مجید کی قراءت ساتوں قراءتوں اور ان کی روایتوں سے جائز ہے مگر میرے خیال میں بہتر بات یہ ہے کہ امالہ وغیرہ سے متعلق جو نادر اور عجیب قراءتیں منقول ہیں یا ساتوں قراءتوں میں سے جو بعض روایتیں غریب ہیں وہ عوام کی موجودگی میں نہیں پڑھنی چاہئے۔ التاتارخانیہ مع التوضیح۔م۔ فرض نمازوں کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کے ساتھ پوری سورہ پڑھنی چاہئے لیکن مجبوری کی صورت میں دونوں رکعتوں میں ہی پوری سورہ ختم کر لینی چاہئے۔ الخلاصہ۔ سورہ کے تھوڑے تھوڑے حصہ کو ہر رکعت میں پڑھنا مکروہ نہیں ہے، یہی صحیح ہے۔ الظہیریہ۔ پہلی رکعت میں سورہ بقرہ کے آخر ۱ من الرسول سے آخر تک پڑھ کر دوسری رکعت میں قُل هوالله کی سورہ پڑھنا مکروہ نہیں ہے۔ التاتارخانیہ۔ اگر کسی رکوع کے آخر حصہ میں آیتیں زیادہ ہوں تو کم آیتوں والی سورہ سے افضل ہے اور اگر رکوع کے آخر حصہ میں آیتیں کم ہوں تو ان کے مقابلہ میں کم آیتوں کی چھوٹی سورہ ہی افضل ہو گی۔ الذخیرہ۔

ایک بڑی آیت کے مقابلہ میں تین چھوٹی آیتیں افضل ہیں، یہی قول صحیح ہے۔ التاتارخانیہ۔ ایک رکعت میں ایک سورہ پڑھنے کے بعد بیچ کی ایک سورہ چھوڑ کر اس کے بعد کی سورہ پڑھنے کی صورت میں اختلاف ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک مطلقاً مکروہ نہیں ہے۔ المحیط۔ اور بعض کے نزدیک مکروہ ہے، مگر قول مختار یہ ہے کہ مسلسل ہی سورہ پڑھی جائے درمیان میں کچھ نہیں چھوڑنی چاہئے۔ الذخیرہ۔ اور اگر اوپر کی سورہ اسی رکعت میں یا دوسری رکعت میں کوئی پڑھے، اسی طرح آیت چھوڑ کر اوپر کی آیت کوئی پڑھے تو مکروہ ہے۔ المحیط۔ جمہور فقہاء کا یہی قول ہے۔ع۔ یہ احکام فرض نمازوں کے ہیں مسنون نمازوں کے نہیں ہیں۔ المحیط۔ اگر رکوع کے واسطے تکبیر کہنے کے بعد کچھ اور بھی قراءت کرنے کا خیال ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے جب تک کہ رکوع نہ کیا ہو۔ الخلاصہ۔ اب اس صورت کا بیان آتا ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کچھ قراءت کرے یا نہ کرے۔

ولايقرأ المؤتم خلف الامام خلافا للشافعیؒ فی الفاتحة، له ان القراءة ركن من الاركان، فيشترك كان فيه، ولنا قوله عليه السلام: من كان له امام فقراءة الامام له قراءة وعليه اجماع الصحابةؓ، وهو ركن مشترك بينهما لكن حظ المقتدى الانصات والاستماع، قال عليه السلام. واذا قرأ فانصتوا، ويستحسن على سبيل الاحتياط، فيما يروى عن محمد ويكره عندهما لما فيه من الوعيد.

ترجمہ:- اور مقتدی امام کے پیچھے کچھ بھی قراءت نہ کرے، لیکن امام شافعیؒ کا فاتحہ کے بارے میں اختلاف ہے، اس مسئلہ میں ان شوافع کی دلیل ہے کہ نماز میں دوسرے ارکان کی طرح قراءۃ بھی ایک رکن ہے اس لئے اس کے پڑھنے میں امام اور مقتدی دونوں برابر ہوں گے، اور ہماری دلیل میں رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے من كان له الخ وہ شخص جس کا کوئی امام ہو تو اس کے امام کی قراءت ہی اس کی قراءت ہے، اور اسی بات پر صحابہ کا اجماع بھی ہے، اور اس سورہ کی قراءت اگرچہ ان دونوں میں مشترک

ہے لیکن مقتدی کا حصہ صرف خاموش رہنا اور کان لگانا ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ہے کہ وہ (امام) جب قراءت کرے تو خاموش رہو، اور وہ روایت جو امام محمدؒ سے منقول ہے اس کے مطابق اس سورہ پڑھ لینا ہی احتیاطاً بہتر ہے، لیکن ان شیخینؒ کے نزدیک اس کا پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ اس پڑھنے میں وعید وارد ہوئی ہے۔

توضیح:-امام کے پیچھے مقتدی کا پڑھنا، امام شافعیؒ اور امام ابو حنیفہؒ کی اپنی دلیلیں

ولا یقرأ المؤتم خلف الامام خلافا للشافعیؒ فی الفاتحۃ.....الخ

مقتدی امام کے پیچھے قراءت نہ کرے۔ف۔نہ فاتحہ پڑھے اور نہ سورہ ملائے، یعنی قرآن مجید کے کسی حصہ کی قراءت نہ کرے۔م۔خواہ وہ نماز جہری ہو یا سری ہو۔عنایہ۔بڑے صحابہ کرام میں سے ایک بڑی جماعت کا یہی قول ہے، جیسا کہ عنقریب اس کی تفصیل آئے گی۔م۔اسی طرح تابعین میں سے ان کے سردار سعید بن المسیب عروہ بن الزبیر وسعید بن جبیر وزہری وشعبی ونخعی اور اسود وغیر ہمؒ کا اور ثوری وابن ابی لیلیٰ حسن بن یحییٰ واوزاعی ومالک واحمد وابن المبارکؒ کا ہے، مگر امام اوزاعی وامام مالک اور امام ابن المبارکؒ جہریہ نماز میں منع کرتے ہیں، اور جواہر مالکیہ میں ہے کہ عبد اللہ بن وہب واشہب اور ابن حبیب وغیر ہم مثلاً ائمہ احناف مطلقاً (جہریہ ہو یا سریہ سب میں) منع کرتے ہیں۔مع وابن کثیر۔

خلافا للشافعیؒ فی الفاتحۃ، لہ ان القراءۃ رکن من الارکان، فیشترکان فیہ.....الخ

سورہ فاتحہ کے بارے میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ف۔ان کے نزدیک مقتدی بھی سورہ فاتحہ پڑھا کرے، مگر ان کے قول قدیم میں امام مالکؒ کے قول کے مطابق یہ تھا کہ فقط سری نماز میں فاتحہ پڑھے اور جہری میں نہ پڑھے، مگر قول جدید میں ہے کہ نماز جہری ہو یا سری ہو بہر صورت میں قراءت کرلے، اور رافعیؒ نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ سری میں بھی قراءت فاتحہ واجب نہیں ہے، یہی قول لیث وابو ثور اور ثوریؒ کا ہے مع **لہ ان القراءۃ الخ** اور امام شافعیؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ نماز کے ارکان میں سے قراءت بھی ایک رکن ہے اس لئے اس کی ادائیگی میں امام اور مقتدی دونوں ہی برابر کے ذمہ دار ہوں گے۔ف۔ مثلاً نماز میں قیام۔قعود۔رکوع اور سجود کی ادائیگی میں تو سب برابر کے ذمہ دار ہیں۔

اور امام شافعیؒ کے قول کی پہلی نقلی دلیل یہ ہے کہ حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی یہ حدیث مرفوع ہے کہ **لاصلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب**، دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور اس کی اسناد صحیح ہے، اور ابن القطان نے اس کی تصحیح کی ہے، البیضاوی فی الاصول میں ہے اجزاء بمعنی کافی ادا ہونا، اس بناء پر اس روایت کے معنی ہوئے کسی شخص کی ایسی نماز کافی ادا نہ ہوئی جس نے فاتحہ نہ پڑھی ہو، حضرت ابو سعید خدریؓ سے مرفوعا روایت ہے **امرنا ان نقرأ بفاتحۃ الکتاب و ماتیسر** ہمیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ ہم فاتحہ اور اس کے ساتھ جو آسان ہو وہ بھی پڑھیں۔ابوداؤد۔ابن سید الناسؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح اور اس کی روایت کرنے والے ثقہ ہیں، میں کہتا ہوں کہ اس سے معلوم ہوا کہ فاتحہ اور اس کے ساتھ زائد سورہ بھی واجب ہے۔

اور حضرت ام المومنین عائشہؓ اور ابو ہریرہؓ سے مرفوعا روایت ہے کہ **من صلی صلوٰۃ لایقرأ فیھا بام القران فھی خداج غیر تام**۔ یعنی جس نے کوئی ایسی نماز پڑھی جس میں ام القرآن (فاتحہ) نہ پڑھی تو وہ نماز ناقص ہے، پوری نہیں ہے، صحیح مسلم اور ابن ماجہ وغیر ہم نے اس روایت کی ہے، اس حکم میں مقتدی بھی شامل ہے، میں کہتا ہوں کہ اس بات کی تصریح بھی ہے کہ وہ نماز ناقص ہے تام نہیں ہے، اور بعضوں نے اپنی رائے سے یہ بھی کہدیا ہے کہ جو ناقص ہو وہ نماز ہی نہیں ہوتی ہے لہذا باطل ہوئی، مگر ان کا یہ کہنا سراسر جہالت کی بات ہے، کیونکہ جس اعرابی نے اعتدال وغیرہ کے بغیر ہی نماز پڑھی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے آخر میں اس کی اصلاح فرمائی، اسی واقعہ کے اخیر میں نسائی وغیرہ کی روایت میں اس بات کی بھی تصریح ہے کہ صحابہ کرام کو ان کے اس

واقعہ سے بہت خوشی ہوئی تھی کیونکہ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کاموں یعنی اعتدال وغیرہ میں کمی کی تو اس کی نماز میں کمی تو آئی مگر مطلقاً باطل نہیں ہوئی، جیسا کہ میں نے بھی اس بحث کو فرائض وغیرہ کے بیان میں بالتفصیل بیان کر دیا ہے، امام شافعیؒ کے اپنے ملک کے استدلال کی صورت یہ ہے کہ ان مذکورہ احادیث میں ہر شخص پر فاتحہ کی قراءت واجب کی گئی ہے اس سے بحث نہیں کہ نمازی بحیثیت امام ہو یا مقتدی یا منفرد ہو کہ سب پر واجب ہے۔

ان کی دوسری دلیل خاص ہے، وہ بھی عبادہ بن الصامت سے مروی ہے کہ **صلی بنا رسول اللہ ﷺ الصبح فثقلت علیہ القراء ۃ فلما انصرف قال انی اراکم تقرؤن وراء امامکم قال قلنا یا رسول اللہ ای واللہ قال لاتفعلوا الا بام القران فانہ لاصلوۃ لمن لم یقرأ بھا**. یعنی رسول اللہ ﷺ ہمیں صبح کی نماز پڑھائی مگر قراءت میں کچھ دشواری محسوس فرمائی تو سلام پھیرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اپنے امام کے پیچھے قراءت کرتے ہو، تو ہم سب نے اقرار کرتے ہوئے کہا جی ہاں یارسول ہم تو قراءت کرتے ہیں، یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ ایسا مت کرو صرف فاتحہ پڑھ لیا کرو کہ جو فاتحہ نہیں پڑھتا ہے اس کی نماز ہی نہیں ہوتی ہے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، اس جیسی ابوداؤد و نسائی اور دار قطنی وغیرہم نے بھی دوسری روایت بیان کی ہے۔

اس حدیث کی اسناد میں محمد بن اسحٰق ایک راوی ہیں، جس کے بارے میں امام مالکؒ نے کہا ہے کہ وہ کذاب ہیں، اور امام احمدؒ ابوحاتم و نسائی و یحیی بن معین نے انہیں ضعیف کہا ہے، اور ہشام بن عروہ و سلیمان التیمی و یحیی القطان اور وہب بن خالد نے ان کو کذاب کہا ہے، جبکہ کذاب کا عیب لگانا بہت سخت قسم کی جرح لگانی ہے، پھر بھی ترمذیؒ نے بخاریؒ سے اس ثقہ ہونے کی روایت کی ہے، اور ذہبیؒ نے میزان میں امام مالکؒ نے اس کے پاس ہدیہ بھی بھیجا ہے (جو محترم اور ثقہ ہونے کی علامت ہے) اور ابن الہمامؒ نے فتح القدیر میں مختلف اقوال نقل کر لینے کے بعد اسی قول کو ترجیح دی ہے کہ وہ ثقہ ہیں، بہر صورت اس راوی کے بارے میں مختلف اقوال منقول ہیں اس بناء پر یہ حدیث حسن کے درجہ میں ہوئی، جو حجت ہوتی ہے۔

پس حاصل کلام یہ نکلا کہ جہری نماز میں مقتدی کو اپنے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھ لینا چاہئے، یہاں تک امام شافعیؒ کی دلیل تھی اگرچہ اس میں مجھے کچھ گفتگو کرنی ہے جو عنقریب کی جائے گی، اور اگر امام نماز پڑھا رہا ہو اور اس نے قراءت کرنے کے بعد رکوع کر لیا اور اس رکوع میں آکر کوئی مقتدی شریک ہوا تو یہی حکم ہوگا کہ اسے یہ رکعت پوری مل گئی، یہی قول جمہور ائمہ کا ہے اور خود امام شافعیؒ کا بھی ہے، اس طرح امام شافعیؒ نے عذر کی بناء پر مخصوص کرتے ہوئے خلاف ظاہر حکم دیا ہے، اگرچہ ہمارے زمانہ میں بعض لوگوں کو ہمہ دانی کا خبط سوار ہوا ہے حالانکہ وہ جہل مرکب کے مرض میں گرفتار میں دعویٰ کرتے ہوئے اپنی کتاب میں امام شافعیؒ کے وجوب فاتحہ کے مسلک کے سلسلہ میں جو یہ دلائل گذرے انہیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ رکوع میں شریک ہو جانے پر پوری رکعت کے مل جانے کا جو قول جمہور ائمہ کا ہے یہ ضعیف قول ہے، اس کے جواب میں میں مترجم کہتا ہوں کہ صحیح مسلم میں ایک مرفوع حدیث موجود ہے کہ جس نے امام کے ساتھ رکوع پالیا اس نے پوری رکعت پالی، اس حدیث کے پیش نظر جمہور کا استدلال قطعی طور سے بالکل صحیح ہے، اور اس مدعی باطل کی جہالت صاف ظاہر ہے۔م۔

ولنا قولہ علیہ السلام: من کان لہ امام فقراء ۃ الامام لہ قراء ۃ......الخ

اور ہماری دلیل۔ف۔ اس بارے میں کہ امام کے پیچھے مقتدی خاموش رہے گا کچھ نہیں پڑھے گا، رسول اللہ ﷺ کا یہ قول ہے **من کان لہ امام فقراء ۃ الامام لہ قراء ۃ** یعنی جس نمازی کا کوئی امام بھی ہو تو اس امام کی قراءت ہی خود اس کی قراءت ہے۔ف۔ یعنی حسی اور ظاہری قراءت نہیں ہے بلکہ حکمی ہے، یعنی شریعت نے یہ فیصلہ سنایا ہے کہ امام کی قرائت کر لینے کی بناء پر جس نے اس کی امامت میں نماز پڑھی ہے تو اس امام کی قراءت میں خود اس کی قراءت ہو گی، اب جبکہ مقتدی کی قراءت کا فرض امام نے ادا کر دیا تو اب وہ دوبارہ نہیں پڑھے گا، کیونکہ کسی بھی صورت میں بھی دوبار قراءت کرنا شرعاً ثابت نہیں ہے، اس طرح

مقتدی کی بھی قراءت ادا ہو گئی۔م۔

وعلیه اجماع الصحابةؓ......الخ

اور اسی قول پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔ف۔یعنی تمام صحابہ کرامؓ سے یہی بات ثابت ہوئی، تو گویا یہی ثبوت اجماع ہے، اگرچہ بعض صحابہ کرامؓ سے اس کے خلاف بھی ثابت ہے مثلاً عبادہ بن الصامتؓ وغیرہ، پس جب ایسی دلیل اور نص موجود ہو (کہ مقتدی کے لئے امام ہی کی قراءت کافی ہو) تو امام شافعیؒ کا طرف سے دوسرے ارکان کا قیاس کرتے ہوئے مقتدی پر قراءت فاتحہ بھی واجب کہنا درست نہ ہوگا۔

وهو ركن مشترك بينهما لكن حظ المقتدى الانصات والاستماع......الخ

اور یہ قراءت ایک رکن ہے جو امام مقتدی کے درمیان مشترک ہے۔ف۔لیکن اس کی ادائیگی کے طریقہ میں تقسیم عمل ہے کہ امام کا کام زبان سے ادا کرنا ہے لکن حظ المقتدی الخ اور مقتدی کا حصہ خاموش رہنا اور کان لگا کر سننا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، واذا قرء فانصتوا کہ جب امام قراءت کرے تو تم خاموش رہو۔ف۔یعنی خاموشی کے ساتھ سنو، اور یہ حدیث آمین کے مسئلہ میں گذر چکی ہے۔

ويستحسن على سبيل الاحتياط......الخ

اگرچہ امام محمدؒ سے روایت کردہ قول کے مطابق احتیاطاً قراءت فاتحہ کا بھی حکم اچھا ہے۔ف۔یعنی امام محمدؒ سے مروی ہے کہ بہتر یہ ہے کہ مقتدی بھی احتیاط کے طور پر سورہ فاتحہ پڑھ لیا کرے تاکہ فقہاء کے اختلاف سے بچ جائے، مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ خود امام محمدؒ کی موطا کی روایت اور آثار میں اس قول کے خلاف موجود ہے، لہٰذا مذکورہ روایت کا اعتبار ختم ہو گیا ہے۔

ويكره عندهما لما فيه من الوعيد......الخ

یعنی شیخین کے نزدیک مقتدی کا پڑھنا مکروہ ہے۔ف۔یعنی مکروہ تحریمی ہے۔لما فیه الخ کیونکہ مقتدی کے پڑھنے میں وعید آئی ہے۔ف۔چنانچہ امام محمدؒ نے مؤطا وغیرہ میں بہت سے آثار ذکر کئے، اور مزید بیان آتا ہے، اس بناء پر جب ایک طرف اس بات کا جائز ہونا ثابت ہوا کہ مقتدی بھی فاتحہ پڑھ سکتا ہے اور دوسری طرف اس کے پڑھنے پر سخت وعید بھی ثابت ہوئی اور ایسی صورت میں یہ بات بالاتفاق مسلم ہے کہ وعید کے خوف سے نہ کرنا ہی ضروری ہے پس اس کا پڑھنا مکروہ تحریمی ثابت ہوا۔

چونکہ اس مسئلہ میں اس زمانہ میں انتہائی فساد آمیز اختلاف برپا ہے اس لئے اس کی خوب تحقیق و توضیح کی ضرورت ہے، اس طور پر کہ آیت پاک ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ ترجمہ یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو اس امید کے ساتھ کہ تم پر رحم کیا جائے، یہ حکم ہر شخص کے لئے عام ہے کیونکہ مشرکین مکہ نے اس کے سننے سے پرہیز کیا اور اپنے لوگوں کو یہ کہا ﴿لَا تَسْمَعُوا لِهَٰذَا الْقُرْآنِ وَالْغَوْا فِيهِ﴾ الایہ یعنی اس قرآن کی طرف کان نہ لگاؤ اور اس کے پڑھنے کے وقت سب مل کر شور و غوغا کرو۔الخ۔ تاکہ لوگ نہ سن سکیں، کیونکہ قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کی سچی اور صاف دلیلوں کو سن کر لوگ مسلمان ہو جاتے تھے اس بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کو نصیحت کی کہ اس کلام حق کو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو، اور یہ حکم بالکل عام کر دیا جس کی وجہ سے لازمی طور پر مومنوں کو بھی بدرجہ اولی فرمانبرداری کرنی پڑی، بلکہ حقیقی طور پر اس پر عمل کرنے والے اہل اسلام ہی ہوئے، کیونکہ کفار تو ایمان ہی نہیں لائے، پھر ایمان والوں کے لئے تو ہر حالت میں اس پر عمل کرنا واجب ہوا، اور نماز کی حالات میں تو خصوصیت کے ساتھ اس کی تاکید بڑھ گئی، اور اس پر عمل کرنا واجب ہو گیا۔

شیخ اجل امام وقت عماد الدین ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے، جس کا ترجمہ یہ ہے اللہ تعالیٰ نے تلاوت قرآن کے وقت سننے اور خاموش رہنے کا قرآن کی تعظیم و احترام کے واسطے حکم دیا ہے، لیکن یہ حکم بہت زیادہ تاکید کے ساتھ فرض نماز کی ادائیگی

کے وقت ہے جبکہ امام جہراً قراءت کر رہا ہو، اسی بناء پر امام مسلمؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **انما جعل الامام لیوتم به فاذا کبر فکبروا واذا قرء فانصتوا الخ** یعنی امام تو اسی واسطے مقرر کیا گیا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب وہ قراءت کرے تو تم خاموشی کے ساتھ سنو۔ الخ۔ اسی قسم کے روایت اہل السنن نے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے کی ہے، امام مسلمؒ نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ عماد۔

یعنی امام اپنے مقتدیوں کی طرف سے ان سبھوں کا ذمہ دار ہے کہ سارے مقتدیوں نے جمع ہو کر دربار خداوندی میں حمد و ثنا اور مناجات پیش کرنے کے لئے اسے منتخب کیا ہے، اس بات کی تائید حضرت ابوہریرہؓ کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ **الامام ضامن والموذن مؤتمن اللهم ارشد الائمة واغفر للمؤذنین**، یعنی امام ضامن ہے اور موذن امانت دار ہے، الٰہی تو اماموں کو ہدایت دے اور موذنوں کو بخش دے، یہ روایت ابوداؤدؒ اور ترمذیؒ کی ہے۔

لوگوں نے موذن کو اس بات کے لئے امانت دار مقرر کیا ہے کہ وہ سارے لوگوں کی نمازوں کو ٹھیک اوقات میں ادا کرنے اور ان کو روزوں کے رکھنے اور کھولنے کے لئے صحیح وقت کی اطلاع دے لہٰذا اسے ان مقاصد میں اور امانتوں میں خیانت نہیں کرنی چاہئے، اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی کہ اگر ان سے کچھ لغزش ہو جائے تو الٰہی انہیں تو بخش دے، اور امام تو مقتدیوں کا ذمہ دار ہے، کیونکہ اپنے سارے مقتدیوں کی جانب سے بارگاہ الٰہی میں مناجات پیش کرتا ہے، انہیں باتوں کا نام قرأت ہے، مقتدی اس قراءت کو سنتے جاتے اور دل میں اسی حمد و ثنا اور اسی طرح اس کے سوال کی تصدیق کرتے جاتے ہیں، مثلاً امام نے پڑھا **الحمد لله رب العالمین**، تو مقتدی بھی دل میں اسکی تصدیق کرتے جاتے ہیں، کہ بلاشبہ ساری تعریفیں اور خوبیاں تو ہمارے رب ہی کے لئے ہیں، جو **رب العلمین** ہے، اور باری تعالیٰ کے دربار میں اس بات کا اقرار کرتے جاتے ہیں کہ ہمارا امام جس طرح عرض کر رہا ہے ہم سب بھی اس کے پیچھے اس کا اقرار کر رہے ہیں، اسی مفہوم کو حدیث میں بھی اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس کی نماز سے اس کے لئے اتنا ہی حصہ ہے جتنا اس نے سمجھ کر کہا اور کیا ہے، اسی بناء پر اگر امام صرف منہ سے کہتا جاتا ہو مگر دل سے غافل ہو تو وہ ہدایت پر نہیں ہے، حالانکہ وہ منہ سے اِهۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِيۡمَ کہتا ہو، یعنی الٰہی میں **صراط المستقیم** کی ہدایت دے، پھر اس کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی بادشاہ کے دربار میں کوئی درخواست پیش کرتا ہو اور صرف زبان سے کہتا جاتا ہو کہ تو بادشاہ ہے مگر منہ اور آنکھوں سے اس مکان اور شاہی دربار کی جھاڑ فانوس اور اور بادشاہ کے نوکروں وغیرہ کی طرف دیکھتا رہتا ہو، اسی بناء حدیث میں ہے کہ اللہ کی رحمت نمازی بندے کی طرف متوجہ ہوتی ہے، کہ جب وہ کسی اور خیال میں جاتا ہے تو وہ رحمت اس سے منہ موڑ لیتی ہے، پھر جب وہ اپنی زبان اور دھیان کو اللہ کی طرف متوجہ کرتا ہے اس کی طرف رحمت بھی متوجہ ہو جاتی ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ امام اپنے مقتدیوں کا ضامن ہوتا ہے، اس لئے ان مقتدیوں پر یہ لازم آتا ہے کہ امام جو کچھ عرض کرتا جائے وہ سب اسے غور سے خاموشی کے ساتھ سنتے جائیں، اور اس کی تائید و موافقت کرتے جائیں، یہی مراد ہے اس حدیث **انما جعل الامام لیؤتم به** کے، واضح ہو کہ ابوداؤد و حاکم اور دار قطنی نے کہا ہے کہ مذکورہ حدیث میں **اذا قرء فانصتوا** کو سلیمان التیمیؒ نے زیادہ بیان کیا ہے، اور یہ محفوظ نہیں ہے، پھر امام نوویؒ نے بھی کہا ہے کہ ان حفاظ حدیث کا اسے ضعیف کہہ دینا مقدم اور اہم ہوگا۔

مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ ان کا کہنا سمجھ سے بعید بات ہے اور اصول کے بھی ہے، کیونکہ اگر دوسرے راویوں نے یہ جملہ ذکر نہیں کیا ہے تو اس سے کچھ لازم نہیں آتا ہے بالخصوص ایسی صورت میں کہ سلیمان التیمی نے اس کی روایت کی ہو کیونکہ وہ خود بھی ثقہ ہیں اور صحیح وغیرہ کی بہت سی حدیثوں کے راوی بھی ہیں تو ایسے ثقہ راوی کی زیادتی قابل قبول ہوتی ہے، بالخصوص اس صورت میں کہ ان کی تائید میں ان جیسی روایت کرنے والے ابوسعید محمد بن سعد انصاری بھی ہیں، جیسا کہ نسائی میں سند صحیح سے موجود

ہے، بلکہ عمر بن عامر اور سعید بن ابی عروبہ نے اس کے مثل قتادہؒ سے روایت کی ہے، جیسا کہ بزاء وابن عدی اور ابن خزیمہ نے اسے ذکر کیا ہے، ساتھ ہی ابن خزیمہ نے اس کی تصحیح بھی کی ہے اور خود امام ایک بڑے پایہ اور بڑی شان کے امام اور حافظ حدیث میں ہے، ان حالات میں یہ ثقہ راوی جو جملے زیادہ بیان کرتے ہیں انہیں ضعیف اور امام مسلم وغیرہ کی تصحیح و تائید سے انکار کرنا قابل تعجب ہے، اور امام مسلمؒ نے اپنی صحیح کی مقدمہ میں خود امام بخاریؒ کے نہ ماننے پر جرح میں یہ حدیث پیش کی ہے، اور صرف امام بخاریؒ کے قول کے بغیر کسی دلیل کے تقلید کرنا تو انتہائی تعجب خیز بات ہے، الحاصل یہ حدیث صحیح ہے جسے شیخ حافظ ابن کثیرؒ نے آیت کریمہ کے موافق ہونے میں پیش کیا ہے۔ م۔

پھر شیخ عمادؒ نے لکھا ہے کہ ابراہیم بن مسلم الہجری نے بواسطہ ابو عیاض حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ ابوہریرہؓ نے کہا ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کیا کرتے تھے جب یہ آیت قری القرآن کی نازل ہوئی تو ان کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا، ابن جریر نے کہا ہے کہ **حدثنا عن ابی بکر بن عیاش عن عاصم عن المسیب بن رافع عن ابن مسعودؓ** انہوں نے فرمایا ہے کہ ہم لوگ نماز میں سلام کیا کرتے تھے اس لئے یہ آیت نازل ہوئی، اور ابن جریر نے کہا ہے **حدثنا ابو کریب حدثنا المحاربی عن داؤد بن ابی ھمد عن بشیر بن جابر قال صلی ابن مسعودؓ فسمع اناسا یقرؤن مع الامام، فلما انصرف قال أمَا آنَ لکم ان تفھموا، اما آن لکم ان تعقلوا ﴿وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ کما امر کم الله،** یعنی ابن مسعودؓ نے نماز پڑھائی تو یہ سن لیا کہ کچھ لوگ امام کے ساتھ بھی پڑھتے ہیں، جب سلام پھیرا تو فرمایا کہ کیا اب بھی تمہارے لئے وقت نہیں آیا ہے کہ تم سمجھو، کیا اب بھی تمہارے لئے وقت نہیں آیا ہے کہ عقل سے کام لو، کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ، اور خاموش رہو جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو حکم دیا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد صحیح ہے۔

اور ابن جریر نے کہا ہے **حدثنی ابو السائب حدثنا حفص عن اشعث عن الزھری،** زہری نے کہا ہے کہ یہ ایک نوجوان انصاری کے حق میں نازل ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ ہر بار جب وہ کچھ پڑھتے وہ انصاری بھی پڑھتا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا﴾ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد صحیح ہے اور اگرچہ یہ مرسل ہے مگر حکم میں مرفوع کے ہے، اور بیہقیؒ نے مجاہدؒ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت ایک جوان انصاری کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ م۔

شیخ عمادؒ نے لکھا ہے کہ کہ علی بن ابی طلحہ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ یہ آیت اِذَا قُرِئَ (القرآن) فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا الخ فرض نمازوں کے بارے میں ہے، اور عبداللہ بن مغفل سے بھی یہی روایت ہے، **وقال ابن جریر حدثنا حمید بن مسعدة حدثنا بشر بن المفصل حدثنا الجریری عن طلحة بن عبیدالله بن کریر قال الخ** یعنی طلحہ بن عبیداللہ نے کہا کہ میں نے عبید بن عمیر اور عطاء بن ابی رباح کو دیکھا کہ دونوں باتیں کرتے تھے اور واعظ وعظ کہتا تھا تو میں نے کہا کہ آپ دونوں وعظ نہیں سنتے اور اپنے اوپر گناہ لازم کرتے ہیں جو اس آیت پاک **واذا قری القران الایہ** میں بطور وعید کہا گیا ہے، یہ سن کر ان دونوں نے میری طرف دیکھا پھر اپنی گفتگو میں مشغول ہوگئے، پھر میں نے اپنی بات ان سے دوہرائی تو انہوں نے بھی دوسری بار مجھے دیکھا پھر اپنی باتوں میں مشغول ہوگئے، میں نے تیسری بار اپنا اعتراض دہرایا تو انہوں نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا کا تعلق صرف نماز سے ہے۔ عماد۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد صحیح اور جید ہے، اور طلحہ بن عبیدہ بن کریز ثقہ ہیں اس جگہ لفظ کریز قتیل کے وزن پر ہے اس کے علاوہ جہاں کہیں یہ نام مستعمل ہوتا ہے وہاں حسین کاف کے ضمہ کے ساتھ (یعنی مصغر) ہے۔ م۔ اور سفیان الثوریؒ نے ابوہاشم اسمٰعیل بن کثیر کے واسطہ سے مجاہدؒ سے یہی روایت کی ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے، اسی طرح اور بھی بہت لوگوں نے مجاہدؒ سے روایت کی ہے، اور سعید بن جبیر و ضحاک وابراہیم نخعی و قتادہ و شعبی و سدی و عبدالرحمٰن بن اسلم ان تمام

حضرات نے فرمایاہے کہ اس آیت سے مراد نماز کے اندر تلاوت ہے۔ عماد۔

اور بیہقیؒ نے امام احمدؒ سے روایت کی ہے کہ علماء نے اس بات پر اجماع کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں ہے، اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں کہا کہاہے **حدثنا ابو اسامه عن سفیان عن ابی المقدام هشام بن زیاد عن معاویة بن قرة قال سالت بعض اشیاخنامن اصحاب رسول الله ﷺ، احسبه قال عبدالله بن مغفل الخ** یعنی معاویہ بن قرۃ نے کہاہے کہ میں نے اپنے شیوخ میں سے کسی شیخ صحابی سے اور مجھے گمان ہے کہ عبداللہ بن مغفلؓ کا نام لیاتھا، پوچھاکہ جو کوئی بھی قرآن سنے کیا اس پر کان لگاکر سنناواجب ہے، تو فرمایاکہ یہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوْا الخ امام کے پیچھے قراءت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ الفتح۔

میں مترجم کہتاہوں کہ اس اسناد میں سوائے ہشام بن زیاد کے سب ثقہ ہیں، کیونکہ ہشام کو توامام احمد وابوزرعہ وغیرہ نے ضعیف کہاہے، لیکن صحیح سندوں سے جوبات ثابت ہوئی اس میں ان کا بھی صادق ہونا معلوم ہو گیالہٰذا وہ ضعف بھی جاتارہا، پھر شیخ عمادؒ نے مجاہد وعطاء وحسن بصری وسعید بن جبیرؒ سے آیت میں نماز اور جمعہ کے خطبہ کے سننے اور اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے، اور عبدالرزاقؒ کی روایت میں ہے کہ مجاہدؒ نے اس بات کو مکروہ بتایاہے کہ مقتدی امام کے پیچھے رحمت یاعذاب کی تلاوت کے وقت کچھ کہے کیونکہ اس موقع میں بھی صرف خاموش رہناچاہئے، امام احمدؒ نے کہ ہے **حدثنا ابن سعید مولی بنی هاشم حدثنا عباد بن میسرة عن الحسن عن ابی هریرةؓ ان رسول الله ﷺ قال من استمع الی اية من کتاب الله کتب حسنة مضاعفة ومن تلاها کانت له نورا یوم القیامة،** یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایاہے کہ جس شخص نے کان لگاکر قرآن کی کسی آیت کو سنا تواس کے مضاعفۃً نیکی لکھی جائے گی (یعنی کئی گونہ جو بڑھتی رہے) اور جس نے خود آیت تلاوت کی تووہ اس کے لئے قیامت کے دن نور ہوگی، یہ حدیث صرف امام احمدؒ کی سند سے ہے۔ عماد۔

امام محقق الحافظ الحجۃ ابن کثیرؒ نے ایسا کوئی قول نقل نہیں کیاہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نہیں ہے، پس اس متعصب لوگوں پر تعجب ہوتاہے کہ اپنی خواہش کی اتباع میں بزرگان دین پر اعتراض کرنے کے واسطے تفسیر کبیر وغیرہ سے اس آیت کے بارے میں مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، اور حق بات سے منہ موڑ کر گمراہی میں پڑتے ہیں، اس مسئلہ میں حق واضح یہی ہے جس کا ابھی ذکر ہوچکاہے کہ آیت مذکورہ کا تعلق نماز اور خطبہ سے ہی ہے، شیخ عمادؒ نے کہاہے کہ امام ابن جریرؒ کا قول مختار یہی ہے کہ اس آیت کا تعلق نماز اور خطبہ سے ہے، جن کے واسطے خاموش رہنے کا بھی حکم وارد ہواہے۔

میں مترجم کہتاہوں کہ حکم وارد ہونے سے مراد جمعہ کے خطبہ کو سننے میں بالکل خاموش رہنے کا حکم ہے جو صحاح کی حدیثوں میں پایاجاتاہے، اور نماز قراءت میں خاموش رہنے کی حدیث جواوپر ذکر کی گئی ہے وہ یہ **واذا قرأ فانصتوا** ہے، اس طرح مذکورہ آیت سے یہ حکم ثابت ہواکہ جب نماز میں قراءت قرآن ہورہی ہو توامام کے پیچھے نماز پڑھنے والے لوگو! تم کان لگاکر سنو اور خاموش رہو، اس طرح یہ بات ظاہر ہوگئی کہ **لاصلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** وہ حدیث جس سے امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیاہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کسی کی نماز درست نہیں ہوگی اور ہر شخص کو اس کا پڑھنا لازم ہے در حقیقت یہ مقتدی کے لئے عام نہیں ہے، کیونکہ اگر ہر مقتدی کے لئے لازم ہو تواس وقت اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اے مقتدیو! تم سورہ فاتحہ پڑھو اور خاموش مت رہو اور نہ سنو، جبکہ یہ مطلب اس آیت کے مقصد کے بالکل برعکس ہے، اس کے جواب میں شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ ہم تو مقتدی پر صرف فاتحہ کی قراءت کو واجب کہتے ہیں اس بناء پر آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ سورہ فاتحہ کے علاوہ جب قرآن کی قراءت کی جائے تو سنو اور خاموش رہو۔

احناف کی طرف سے اس کاجواب یہ دیاجاتاہے کہ تم حدیث کے معنی میں ہی اس طرح تاویل کروکہ اس حدیث **لا صلوة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب** سے صرف ایسے لوگوں کے لئے پڑھنالازم ہے جو بغیر خاموشی کے سنیں، کیونکہ جن پر سننااور

خاموش رہنا واجب ہے وہ کس طرح پڑھ سکتے ہیں، اس سے یہ معلوم ہوا کہ حدیث کا مخاطب صرف امام اور منفرد ہے اور مقتدی نہیں ہے کہ ان پر تو قراءت سننا اور خاموش رہنا واجب ہے، پس یہ بات معلوم ہو گئی کہ جس حدیث کو اے شوافعؒ تم نے عام سمجھا تھا کہ امام منفرد اور مقتدی سبھوں کو یہ حکم عام ہے حالانکہ وہ ظاہر قرآن کی بناء پر عام نہیں ہے، اسی بناء پر حدیث میں ایسی کوئی قید نہیں لگائی ہے کہ اس قرآن کا تو عام ہونا ہی ظاہر ہے، علاوہ ازیں اگر یہی بات ہو کہ صرف لفظوں میں قید نہ لگائی جانے کی وجہ سے حکم عام ہو گیا ہے تو دوسری حدیث میں صراحۃً مذکور ہے امرنا ان نقرأ بفاتحة الكتاب وما تيسر، اور یہ بھی صحیح ہے، اس میں بھی امام کی کوئی قید نہیں ہے لہٰذا یہ بھی عام ہو گی، البتہ اس میں فاتحہ کے ساتھ سورہ یا ماتیسر کی قید ہے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ مقتدی پر صرف فاتحہ کا پڑھنا لازم نہیں ہے بلکہ ماتیسر یا سورہ کا پڑھنا بھی لازم ہے۔

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے جو متفق علیہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی مقتدی نے براہ راست رکوع میں شرکت اقتداء کی یہ پوری رکعت اسے مل گئی، حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس نے اس رکعت میں فاتحہ نہیں پڑھی اور نہ سنی، تو جس طرح اس صورت میں یہ کہا جاتا ہے کہ امام کی اتباع کر لینے کی وجہ سے اس کے لئے بھی وہی قراءت کافی ہو گئی اور مان لی گئی ہے جو امام نے کی ہے، اسی طرح امام کے پیچھے ابتداء سے شریک ہونے والے نے حسا اور لفظاً اگرچہ قراءت نہیں کی ہے مگر اس کے لئے بھی وہی قراءت مان لی گئی ہے جو امام نے کی ہے، اور اس کی دلیل میں یہ حدیث بھی ہے من كان له امام فقراءة الامام له قراءة، اس صورت میں امام کی جو قراءت ہوئی وہی مقتدی کی بھی قراءت مان لی گئی ہے، اسی لئے یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ مقتدی نے قراءت نہیں کی ہے، تو حدیث سے خلاف نہ ہوا، بلکہ حدیث کے معنی یہ واضح ہو گئے کہ فاتحہ پڑھنا تو ہر کسی کو ضروری ہے البتہ وہ خود اپنی زبان سے پڑھ لے یا اس کا امام اس کی طرف سے پڑھ لے، کیونکہ فاتحہ تو دعا و ثناء ہی کا نام ہے، اس لئے امام نے سب کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کر دی ہے اور سب کی طرف سے دعا کر دی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ، کہہ کر، کہ اے خدا! ہم سبھوں کی راہ راست کی ہدایت دے، آخر تک، کیونکہ اس دعاء کو جمع کے صیغہ کے ساتھ ادا کیا ہے اور "اہدنا" کہا ہے اور اہدنی بصیغہ مفرد نہیں کہا ہے کہ صرف مجھے ہدایت دے اس طرح یہ دعاء اور یہ قراءت سب کی طرف سے ادا ہو گئی۔

شوافعؒ کی طرف سے جواب یہ ہے کہ ہم لوگ حدیث کی تاویل اس طرح اس لئے نہیں کرتے کہ ہمارے پیش حضرت عبادہ بن الصامتؓ کی وہ حدیث ہے جو پہلے گذر چکی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے صبح کے بعد تصریحاً فرمایا ہے کہ نماز میں تم لوگ بھی سورہ فاتحہ پڑھا کرو، اس طرح مقتدیوں کو قراءت فاتحہ کرنے کا حکم ہے۔

ہماری طرف سے اس کے کئی طرح سے جواب دئے گئے ہیں اول یہ کہ اذا قرئ القران کی آیت پاک بلاشبہ قطعی طور پر متواتر ہے اس وجہ سے اس کے ظاہری معنی کو ایسی منفرد روایت سے بدل دینا جائز نہیں ہے، جس کے صحیح ہونے کے بارے میں بھی کلام ہو، کیونکہ اس حدیث کا مدار محمد بن اسحٰق راوی پر ہے، اور ان کے سلسلہ میں گفتگو بھی گذر چکی ہے، کہ ان پر کذاب اور ضعیف وغیرہ کا الزام ہے، اور زیادہ سے زیادہ اس حدیث کو حسن کا درجہ دیا جا سکتا ہے، اس طرح اس کا مقابلہ قطعی اور متواتر آیت سے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہو سکتا ہے، کہ اس سے نصف آیت کو منسوخ کرنا پڑے، پس اس روایت کے معنی میں غور کرنا ہو گا، کیونکہ یقینی طریقہ سے اس کے معنی ایسے نہیں ہو سکتے کہ وہ آیت کو منسوخ کر دیں، اس جگہ صرف سورہ فاتحہ کی تلاوت کی اجازت دینے کو تخصیص کہنا صرف لفظ بدلنا کہلائے گا، اصل مقصد میں کوئی فرق نہیں آئے، اور اہل علم کے نزدیک یہ بات واضح ہے کہ قرآن پاک کو سننے اور خاموش رہنے میں جو مصلحت ہے وہ شرف سورہ فاتحہ کے لئے ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی دوسری آیتوں اور سورتوں کے لئے بھی عام ہے، اس میں پورا قرآن یکساں ہے، بلکہ فاتحہ کی اہمیت کچھ دوسری آیتوں کی بہ نسبت زیادہ ہے کیونکہ اسے سبع مثانی اور قرآن عظیم کے خصوصی القاب سے نوازا گیا ہے، اس طرح ہمارے نزدیک حاصل مطلب یہ ہوا کہ قرآن کو اہمیت کے ساتھ سنو اور خاموش رہو، برخلاف آپ لوگوں کے اے شوافع! کہ قرآن العظیم یعنی فاتحہ کو نہ سنو اور

نہ اس کے لئے خاموشی اختیار کرو، اس روایت کے معنی ہم عنقریب بیان کریں گے، دوسری وجہ یہ ہے کہ اس روایت کے الفاظ مختلف ہیں کہ ایک روایت میں ہے کہ **لاتفعلوا الامام القران فانه لاصلوة لمن لم یقرأ بها**، یعنی ایسا مت کرو مگر سورہ فاتحہ کے ساتھ کیونکہ اس کا مرتبہ یہ ہے کہ جس نے اسے نہیں پڑھا اس کی نماز ہی نہیں ہوئی، اس روایت میں تو مطلقاً قراءت کی ممانعت سے ام القران کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اس کا مستثنیٰ ہونا تو بالکل ظاہر ہو رہا ہے مگر یہ بات صاف طور سے معلوم نہیں ہو رہی ہے کہ یہ کس طرح اور کس وقت پڑھی جائے، جیسا کہ یہ کہا جائے کہ بادشاہ اپنی رعایا کو ان کی شرارتوں پر سزا دیتا ہے سوائے مجاہدین کے، اس جملہ میں مجاہدین کو سزا دینے کا انکار نہیں ہے بلکہ اس سے خاموشی ہے، اس میں یہ تفصیل ہو سکتی ہے کہ اگر مجاہدین حالت جہاد میں خطا کرتے ہیں تو ان سے درگذر کر جاتا ہے، لیکن اگر وطن میں وہ خطا کرتے ہیں تو ان کو بھی سزا دیتا ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اس مثال سے یہ قاعدہ معلوم ہوا کہ استثناء میں جس کو مستثنیٰ کیا جائے مثال مذکور کی طرح اس میں سکوت ہوتا ہے، اور دوسری صریح دلیل سے حکم معلوم کیا جاتا ہے، اور ایسی دلیل قرآن پاک میں بہت ہے، یہی صحیح اور محقق ہے، مگر شافعیہ کہتے ہیں کہ جو حکم اولاً تھا اس کے خلاف یہاں حکم لگانا چاہئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فاتحہ پڑھو، اور اب میں یہ کہتا ہوں کہ اسے میں نے مان لیا، مگر دوسری روایت میں ہے **فلا تقرؤا بشئی من القرآن اذا جهرت به الا بأم القران**، یعنی جب میں قرآن کو جہراً پڑھو تو تم لوگ کچھ نہ پڑھو مگر سورہ فاتحہ کو، ابوداؤد، نسائی اور دار قطنی نے یہ روایت ذکر کی ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، میں کہتا ہوں کہ اوپر کے مخالف یہ حکم نکلا کہ مگر سورہ فاتحہ کو جہراً پڑھو، تیسری روایت میں **لا یقرأن احد منکم شیئا من القرآن اذا جهرت بالقراء ة الا بأم القران**، کہ جب میں قرآن کو جہراً پڑھوں تو تم میں سے کوئی بھی ہرگز کچھ بھی قرآن سے نہ پڑھے سوائے ام القرآن کے اس کی روایت دار قطنی نے کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں، ان کے علاوہ بخاریؒ، احمدؒ، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے بھی اس کی روایت کی ہے، اس روایت کا مطلب یہ نکلا کہ تم بھی ام القران کو جہراً پڑھو، اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ کسی بھی حکم کی تصریح نہیں پائی گئی، کیونکہ سب سے ممانعت پائی جا رہی ہے البتہ ایک اس سے استثناء ہے، جو جواز پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ اس چوتھی روایت میں ہے، کہ **لعلکم تقرؤن والامام یقرأ قالوا انا لنفعل، قال لا إلا ان یقرأ احدکم بفاتحة الکتاب**، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ شاید تم اس حالت میں قراءت کرتے ہو کہ امام بھی قراءت کر رہا ہوتا ہے، لوگوں نے کہا جی ہاں ہم تو ایسا کرتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہ کرو البتہ تم میں سے کوئی فاتحہ پڑھ لے، اس کی روایت احمدؒ نے کی ہے، اور ابن حجر وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن کے درجہ میں ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس روایت سے بھی یہ بات معلوم ہوئی کہ فاتحہ کے علاوہ کچھ اور پڑھنا جائز نہیں ہے البتہ سورہ فاتحہ کے پڑھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کوئی پڑھنا چاہئے تو پڑھ سکتا ہے، جیسا کہ اس پانچویں روایت میں ہے **فان کان لابد فالفاتحة**، یعنی کچھ نہ پڑھو اور اگر کچھ پڑھنے کو ہی جی چاہتا ہو تو صرف فاتحہ پڑھ لو، اور چھٹی روایت میں ہے کہ **أتقرؤن فی صلوتکم خلف الامام والامام یقرأ فلا تفعلوا ولیقرأ احدکم بفاتحة الکتاب فی نفسه**، یعنی کیا تم امام کے پیچھے اپنی نماز میں قراءت قرآن کرتے ہو حالانکہ امام بھی پڑھتا ہے، تم ایسا ہرگز نہ کرو، تم صرف اپنے دل میں فاتحہ کتاب پڑھ لیا کرو۔

ابن حبان و طبرانی اور بیہقی وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، اس روایت سے امام کے پیچھے پڑھنے کی ممانعت اور اپنے دل میں خاموشی کے ساتھ پڑھنے کا حکم ثابت ہوتا ہے، ان مختلف روایتوں کے ذکر کے بعد میں یہ کہتا ہوں کہ اس روایت کے الفاظ میں اتنا زیادہ اختلاف اور اضطراب ہے کہ بعض الفاظ جہر کرنے کی اجازت دیتے ہیں تو بعض الفاظ اخفاء کو واجب قرار دیتے ہیں، اور بعض الفاظ سے صراحۃً جواز ثابت ہوتا ہے کہ تم کو پڑھ لینا جائز ہے، پھر بعض میں اس طرح بھی ہے کہ نہ کرو تو اچھا ہے، اور بعض میں قول حق یہ ہے کہ وہاں سکوت کرنا چاہئے، پھر جب جواز وجوب اور جہر و اخفاء میں تردد ہو رہا ہو وہاں تو صرف تکلف ہی ہوگا

اطمینان نہیں ہو سکتا ہے۔

علاوہ ازیں یہ معنی کیوں کر ہو سکتے ہیں ایسی روایت سے کسی قطعی آیت کے نصف حصہ کو منسوخ کر دیا جائے، اور چھٹی روایت جس میں صراحۃً پڑھنے کا حکم موجود ہے وہ ابن حبان کی روایت ہے کہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرو، اس کے بارے میں کہتا ہوں کہ اس روایت کے ثبوت کو فرض کر لینے کے بعد پھر اس سے صرف جواز کا مرتبہ ثابت ہوتا ہے، اور وہ بھی زور سے نہیں بلکہ دل ہی دل میں ثابت ہوتا ہے اس میں بھی یہ شرط ہوتی ہے کہ اس مقابلہ میں کوئی دوسری روایت نہ ہو، ان باتوں کی بناء پر یہ لازم آتا ہے کہ فی نفسہ یا دل ہی دل میں پڑھنے کے معنی میں ایسی تاویل سے کام لیا جائے جو کہ آیت کے معنی کے موافق ہو، اور یہ صورت نہ ہو کہ نصف آیت کو منسوخ کرتے ہوئے اسے مضطرب روایت کے موافق کر دیا جائے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ لفظ "فی نفسہ" کی تاویل کرنے کی یہ دو صورتیں ہو سکتی ہیں:

نمبر ا۔ یہ کہ سورہ فاتحہ کے معنی میں غور کیا جائے اس طرح پر کہ اس میں ثناء و دعاء ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ثناء کہنا اور دعا کرنا اس طرح ممکن ہے کہ اسے صرف دل سے کہہ لیا جائے اور زبان سے بالکل نہ کہا جائے، جیسا کہ اس آیت پاک میں ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا ہے ﴿فَاَسَرَّهَا یُوْسُفُ فِیْ نَفْسِهٖ وَلَمْ یُبْدِهَا لَهُمْ ۚ قَالَ اَنْتُمْ شَرٌّ مَّكَانًا ۚ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَصِفُوْنَ﴾ یعنی یوسف نے اپنے نفس میں اس کلمہ کو چھپا کر رکھا اور انہیں ظاہر نہیں کیا، اور کہا تم قدر و منزلت کے اعتبار سے بدتر مکان میں ہو، اللہ تعالیٰ نے خوب جانتا ہے جو تم تہمت لگاتے ہو، اس آیت میں صاف ظاہر ہے کہ صرف دل ہی دل میں کہا ہے کہ اور زبان سے کوئی حرف ظاہر نہیں کیا، پس جس طرح (معنی میں) دل کی بات کو "فی نفسہ" پر اطلاق کیا گیا ہے اس قراءت کے مسئلہ میں بھی اسی طرح ہو، بالخصوص اس صورت میں کہ امام تو سب کی طرف سے ثناء کرتا ہی ہے ان مقتدیوں کا یہ سمجھ لینا درست ہو سکتا ہے کہ ہم بھی یہی کہتے ہیں، اور ایسا کرنا ہی امام کے ساتھ موافقت کرنی ہے، بالخصوص اس صورت میں جبکہ امام کی موافقت ہی مقصود ہو، اور یہ بات بھی اس جگہ مخفی نہیں ہے مذکورہ حدیث کے مقابل مفہوم کی حدیث بھی موجود ہے جو یہ ہے قراءۃ الامام له قراءۃ کہ مقتدی کے امام کی قرأت مقتدی کے لئے بھی قرأت ہے، شیخ الاسلام عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث متعدد (افرادیا) طرق سے مروی ہے مثلاً جابر بن عبداللہ وابن عمر وابو سعید خدری وابو ہریرہ وابن عباس اور انس بن مالکؓ۔ ع۔

شیخ ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ فقط جابر بن عبداللہؓ سے بھی مختلف سندوں کے ساتھ مرفوع روایت موجود ہے، لیکن دار قطنی و بیہقی اور ابن عدیؒ کہا ہے کہ اس حدیث کا حضرت جابرؓ سے مرفوع ہونا ضعیف ہے، کیونکہ سفیان و شریک و ابو خالد الدالانی وغیرہ نے اس کو موسیٰ بن ابی عائشہ عن عبداللہ بن شداد عن النبی ﷺ یعنی جابر کے بغیر ہی روایت کیا ہے، اور اقرار کیا ہے کہ عبداللہ بن شدادؓ سے مرسل روایت صحیح ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ نے بھی دعویٰ کیا ہے مختلف طریقوں سے مرفوعاً مروی ہے مگر سب ضعیف ہیں۔ م۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ صحیح اسناد کے ساتھ بھی مرفوعاً روایت ثابت ہے، اور میں کہتا ہوں کہ شیخ امام حافظ ابن کثیرؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث کو امام احمدؒ نے اپنی سند میں جابرؓ سے روایت کی ہے اور موطا امام مالکؒ میں جابرؓ سے موقوفاً بھی روایت ہے اور یہی اصح ہے۔ ترجمہ ختم ہوا۔

اور محمد بن الحسنؒ نے اپنی کتاب موطا میں کہا ہے اخبرنا ابو حنیفه حدثنا ابوالحسن موسیٰ بن ابی عائشةؓ عن عبدالله بن شداد عن جابرؓ عن النبی ﷺ قال من صلی خلف الامام فان قراءة الامام له قراءة اور احمد بن منیع نے اپنی سند میں کہا اخبر نا اسحق الازرق حدثنا سفیان و شریك عن موسی بن ابی عائشه عن عبدالله بن شداد عن جابرؓ قال قال رسول الله ﷺ من کان له امام فقراءة الامام له قراءة اور بھی کہا حدثنا جریر عن موسیٰ بن ابی عائشة عن عبدالله بن شداد عن النبی ﷺ الحدیث. اس روایت میں جابر کا ذکر نہیں کیا ہے، اور عبدالحمید نے روایت کی حدثنا

ابو نعیم حدثنا الحسن بن صالح عن ابی الزبیر عن جابرؓ عن النبی ﷺ الحدیث، دیکھنے کی بات یہ ہے کہ احمد بن منیع جو ترمذی وغیرہ کے شیوخ میں ہیں ثقہ حافظ من العاشرہ۔ت۔ کی پہلی اسناد جابرؓ جو بخاری اور مسلم صحیح کی شرط پر ہے، اور اس میں سفیان وشریک نے مرفوع روایت کی ہے، اس طرح دار قطنی وغیرہ کا کہنا کہ ان لوگوں نے اسے مرفوعاً ذکر نہیں کیا غلط ثابت ہوگیا، اور عبد الحمید کی روایت جابرؓ سے مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، اور اس میں ابو الزبیرؒ نے مرفوع روایت کی ہے، پس مرفوع نہ کرنے کا دعویٰ جیسا کہ دار قطنی وغیرہ نے ذکر کیا ہے باطل ثابت ہوا، پس سفیان شریک اور ابو الزبیر جیسے ائمہ نے صحیح سندوں سے اسے مرفوع ذکر کیا ہے، بالفرض اگر کوئی ایک ہی ثقہ راوی کسی روایت کو مرفوعاً ذکر کرتا ہے تو اسے قبول کرنا واجب ہوتا ہے اب جبکہ ثقہ راویوں کی ایک جماعت نے مرفوعاً ذکر کیا ہو تو اسے قبول کیوں نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کی قبولیت کا کتنا بلند مقام ہوگا، پھر اگر ان حضرات نے مرسلاً روایت کیا ہو جب بھی تو کوئی حرج نہیں ہوتا ہے بلکہ قابل قبول ہوتا ہے کیونکہ ثقہ راوی کبھی حدیث کو مرفوعاً روایت کرتا ہے تو کبھی مرسلاً بھی روایت کرتا ہے۔ الفتح۔

یہ بات تو اصول حدیث میں صراحت کے ساتھ مذکور ہے اور صحاح حدیث میں موجود ہے جیسے صحابہ کرام کے حالات میں ہے کہ وہ کبھی رسول اللہ ﷺ کا ذکر کرکے روایت کرتے ہیں اور کبھی رسول اللہ ﷺ کا نام ذکر کئے بغیر ہی صرف حکم کرتے ہیں، اس بات کی بھی تصریح اصول حدیث میں موجود ہے مثلاً حضرت جابرؓ نے کبھی تو رسول اللہ ﷺ کی طرف نسبت کی جیسا کہ سند امام احمد اور مسند احمد بن منیع وغیرہ میں ہے، اور کبھی صرف اپنی جانب سے بات کہدی یا حکم بیان کردیا، چنانچہ موطا امام مالک میں ہے، اور جب سندیں صحیح ہیں تو معلوم ہوگیا کہ یہ حدیث موقوف بھی اصل میں مرفوع ہی ہے، اور شیخ ابن کثیرؒ نے بھی اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ اصح ہے، یعنی مسند احمد کی بھی روایت بھی صحیح ہے، کیونکہ امام احمدؒ نے ثلاثی روایت ثقہ راویوں کی سندوں سے بیان کی ہے، جن میں کسی بحث کی کوئی گنجائش نہیں، اس طرح اسناد صحیح ہوئی، اور اس کا انکار کردینا دین کے خلاف اور نا قابل قبول ہے۔م۔

ابن عدیؒ نے اس بات کو امام ابو حنیفہؒ کے واقعہ میں ایک قصہ کے ساتھ بیان کیا ہے جیسے حاکم نے اس طرح ذکر کیا ہے

حدثنا محمد بن بکر بن خمد أن الصیرفی ثنا عبد الصمد بن الفضل البلخی ثنا المکی بن إبراهیم عن أبی حنیفة عن موسی بن أبی عائشةؓ عن عبدالله بن شداد بن الهاد عن جابر بن عبد الله أن للنبی ﷺ صلی ورجل خلفه یقرأ، فجعل رجل من أصحاب النبی ﷺ ینهاه عن القراء ة فی الصلوة، فلما انصرف أقبل علیه الرجل، فقال: أتنهانی عن القراء ة خلف رسول الله ﷺ، فتنازعا حتی ذکرذلك النبی ﷺ، فقال علیه السلام: من صلی خلف الإمام فإن قرأة الإمام له قرأة، اور دوسری روایت میں اس طرح ہے **إن رجلا قرأ خلف رسول الله ﷺ فی الظهر أو العصر، فأولی إلیه رجل، فنهاه، فلما انصرف قال: أتنهانی، الحدیث.**

خلاصہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے والے کو دوسرے شخص نے منع کیا تو جب آپ ﷺ نے سلام پھیرا تو اس نے کہا: کیا تم مجھے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے قرأت کرنے سے منع کرتے ہو۔ اس بناء پر دونوں میں بات بڑھ گئی یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بھی یہ بات پہونچائی گئی تو آپ نے فرمایا کہ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام ہی کی قراءت اس کی قراءت ہے، اس پوری روایت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ اصل حدیث یہ ہے، مگر جابرؓ نے کبھی اس میں سے صرف ضروری حصہ بغیر قصہ بیان کئے روایت کردیا ہے، اور کبھی حرفاً حرفاً قصہ ہی بیان کیا ہے، اور اس واقعہ کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے امام کے پیچھے قراءت کرنے سے ممانعت کردی گئی ہے، خواہ وہ نماز سری ہو یا جہری ہو، خاص کر وہ روایت جو ابو حنیفہؒ کے واسطہ سے ہے کہ منع کرنے کا یہ قصہ ظہر یا عصر کی نماز میں پیش آیا تھا اس طرح یہ روایت اس روایت کے صراحۃً معارض ہوئی جو عبادۃ بن الصامتؓ کی روایت سے نماز فجر کے بارے میں گذر چکی ہے، ان میں سے وہ حدیث جو جابرؓ سے مروی ہے اس روایت کی

بہ نسبت زیادہ قوی اور اصح ہے جو عبادہؓ سے مروی ہے۔ الفتح۔

اور میں مترجم کہتا ہوں کہ جب یہ حدیث ثابت ہو گئی تو حضرت جابرؓ کے ماسوا جن صحابہ کرامؓ سے یہ مروی ہے مثلاً ابن عمرو ابن عباس وابو سعید خدری وابوہریرہ اور انسؓ، یہ روایتیں سند کے اعتبار سے ضعیف ضرور ہیں مگر حضرت جابر کی روایت کے صحیح ہونے کی وجہ سے دوسری بھی قوی ہو گئیں پھر مختلف سند ہونے کی وجہ سے ان کا ضعف بھی ختم ہو کر حسن کے درجہ تک پہونچ گئیں ہیں، بالخصوص اس صورت میں کہ یہ حدیث جابرؓ سے صحیح سندوں سے مروی ہے، اور چوں کہ جابرؓ نے کہا ہے کہ جس نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس کی نماز ہی نہیں ہوئی البتہ اگر وہ امام کے پیچھے ہو، یہ روایت اگرچہ مرفوع ہے اس کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ امام کے پیچھے مطلقاً قراءت منع ہے خواہ قراءت فاتحہ کی ہو یا اس کے علاوہ کچھ بھی ہو، اور ابوہریرہؓ نے جب **لا صلوۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب** کی حدیث روایت کی تو ان سے کہا گیا کہ اے ابوہریرہ ہم تو اکثر اوقات امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں تو ابوہریرہؓ نے فرمایا اے فارسی اسے اپنے دل ہی دل میں پڑھ لو۔

اب میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سوال وجواب سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ اس وقت بھی عام طور پر یہ بات معلوم تھی کہ امام کے پیچھے قراءت نہیں ہونی چاہئے اسی بناء پر یہ سوال کرنا پڑا، نیز ابوہریرہؓ نے اس کا انکار بھی نہیں کیا کہ امام کے پیچھے ہو کر قراءت مانع نہیں ہے بلکہ کہا ہے کہ تم اسے اپنے دل میں پڑھ لو، اور میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ اس کے معنی یہ کیے گئے کہ آہستہ سے پڑھ لو حالانکہ ابوہریرہؓ حدیث اس طرح کی روایت نہیں کی کہ جو کوئی جہرا فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی ہے۔

الحاصل فی نفسہٖ قراءت کے معنی وہ ہوئے جو میں مترجم پہلے ذکر کر چکا ہے، اس طرح آیت کریمہ یہ حدیث دونوں سے متفق اور قراءت کرنے سے مانع ہیں، اور صرف حضرت عبادہؓ کی حدیث سے قراءت فی نفسہ کا جائز ہونا معلوم ہوتا ہے، اور قراءت حسی کا صراحۃ جواز نہیں نکلتا ہے، اور جبکہ حضرت جابرؓ کی حدیث ثابت اور صحیح ہے اس بناء پر اگر حضرت عبادہؓ کی حدیث سے قراءت حسی ثابت ہو جائے تو مقتدی کے لئے دو قراءتیں جمع ہو جائیں گی جس کا ثبوت نہیں ہے، لہٰذا کچھ لوگوں کا کہنا ساقط ہو گیا کہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں جو ممانعت ہے اس سے مراد فاتحہ کے ماسوا قرائت ہے۔

البتہ ایک بات یہ باقی رہی کہ کچھ نالائق جاہل امام ابو حنیفہؒ کو ضعیف کہتے ہیں اور اس کی نسبت خطیب اور دار قطنی کی طرف کرتے ہیں، اس بناء پر میں مترجم نے اپنے شیخ محقق سے پوچھا کہ امام ابو حنیفہؒ کی تضعیف نہیں ہوئی، تو وہ فرمانے لگے کہ میاں مجھے تو یہ ایسی بات بھی پسند نہیں ہے، اس پر میں نے خطیب کا حوالہ دیا تو وہ سخت ناراض ہو گئے اور فرمایا کہ خطیب تو امام ابو حنیفہؒ کے سامنے (لونڈے) بچے ہیں ان کا یہ منہ نہیں ہے، اور میاں مجھے تو ایسی باتیں بالکل ہی پسند نہیں ہیں، پھر میں نے دیکھا کہ اسی قسم کی باتیں عینیؒ نے پہلے ہی بیان فرمادی ہیں، اور ذہبیؒ نے میزان میں کئی اقوال ذکر کئے ہیں، اور جرح وتعدیل کے امام یحییٰ بن معینؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی تائید میں فرمایا ہے کہ وہ تو ثقہ ہیں، میں نے کسی کو بھی ابو حنیفہؒ کے متعلق ضعیف کہتے ہوئے نہیں سنا ہے، شعبہ بن الحجاجؒ تو امام ابو حنیفہؒ کو خط لکھ کر حدیث روایت کرنے کی تاکید کرتے ہیں، ایک بار انہوں نے کہا کہ ابو حنیفہؒ ثقہ اور اہل الصدق میں سے ہیں، ان پر کبھی کذب کی تہمت بھی نہیں لگائی گئی ہے، وہ دین الٰہی میں مامون اور حدیث کے معاملہ میں بڑے صادق تھے، عینیؒ نے بہت اختصار سے کام لیا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ وقت مثلاً ائمہ ثلاثہ وعبد اللہ بن المبارک وسفیان بن عیینہ واعمش وثوری وعبد الرزاق وحماد بن زید ووکیع وغیر ہم نے ابو حنیفہؒ کی بہت زیادہ تعریفیں بیان کی ہیں، مذکورہ بالا بیانات سے ہمیں دار قطنی کا ابو حنیفہؒ کے بارے میں متعصب ہونا ثابت اور واضح ہو گیا، انہیں اس بات کا کس طرح حق مل گیا کہ وہ امام ابو حنیفہؒ کو ضعیف قرار دیں، جبکہ وہ خود ہی ضعیف کہلانے کے لائق ہیں۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ امام ابو حنیفہؒ کے استاد کا بیان ہے کہ ابو حنیفہؒ ثقہ ثبت اور بڑے امام ہیں، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، تقریب ابن حجر کے صحیح نسخہ میں ہے کہ امام صاحب مشہور فقیہ ہیں، اور امام صاحب کے اوپر کے راوی ابو الحسن موسی بن ابی

عائشہ الکوفی کے متعلق تقریب میں لکھا ہے کہ یہ ثقہ اور عابد ہیں، ان کے روایتیں صحیحین میں بھی موجود ہیں۔ع۔ اور اوپر کے راوی عبداللہ بن شداد بن الہاد رسول اللہ علیہ السلام کے زمانہ میں پیدا ہوئے، اور عجلی نے انہیں بڑے تابعین اور ثقات میں سے شمار کیا ہے، جن کا شمار فقہاء میں سے تھا اور کوفہ میں شہید ہوئے، آخر میں حضرت جابرؓ ہیں یہ تو مشہور و معروف صحابی ہیں، سبحان اللہ۔ ان کا نام ہی تبرک کے طور پر لیا جاتا ہے۔

الحاصل وہ سند جو امام ابو حنیفہؒ سے مذکور ہے اس کے تمام راوی کتنے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں، ان سے جب روایت من کان له امام فقراء ۃ الامام له قراء ۃ پائی گئی تو اس سے سورہ فاتحہ اور دوسری سورہ سب کی ممانعت ہو گئی، شیخ ابن حجرؒ وغیرہ پر سخت تعجب ہے کہ اس کو فاتحہ کے ماسوا سورہ پر محمول کیا ہے، کیونکہ جب امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہو گئی تو یہ صورت اختیاری نہیں ہے بلکہ اضطراری اور لازمی ہوئی اس میں کسی بھی فعل کو خاص نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جتنی قراءت بھی امام نے کی وہ سب مقتدی کی ہو گئی، لہٰذا عبادہؓ کی حدیث جو نماز فجر کے بارے میں ہے اس پر مقدم ہو گی۔م۔

ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ اول اس وجہ سے کہ جب دو حدیثوں کے درمیان آپس میں تعارض ہو تو جو حدیث مانع ہوتی ہے تو وہ مطلقاً مقدم ہوتی ہے اور اسی کو ترجیح ہوتی ہے، دوم اس وجہ سے کہ تعارض کا اعتبار سند کی قوت پر ہوتا ہے، اور جابرؓ کی حدیث سند کے اعتبار سے اصح اور محمد بن اسحٰق کی حدیث زیادہ سے زیادہ حسن کے درجہ کی ہے، مزید براں حضرت جابرؓ کی حدیث کئی سندوں سے اور جابرؓ کی طرح دوسرے صحابہ کرامؓ سے بھی ثابت ہیں جس کی تفصیل گذر چکی ہے، اس بناء پر یہ اعلیٰ درجہ کی صحیح ہوئی، سوم صحابہ کرام کا مذہب اور عمل بھی جابرؓ کی اسی حدیث کے موافق ہے، چنانچہ مصنفؒ نے تو یہاں تک کہدیا کہ اس پر صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے۔

موطا امام مالکؒ میں ایک روایت ہے مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کہ جب تم کسی امام کے پیچھے نماز پڑھو تو امام کی قراءت ہی کافی ہے، اور جب تنہا پڑھو تو قراءت کرو، اور ابن عمرؓ امام کے پیچھے قراءت نہیں کرتے تھے، دار قطنی نے ابن عمرؓ سے یہ مرفوع روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ رفع کا دعویٰ ایک وہم ہے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ جب ابن عمرؓ سے یہ بات ثابت ہو گئی تو یہ عمل ہی رسول اللہ علیہ السلام سے سماع ہوا، ایسی صورت میں مرفوع کہنا بھی صحیح ہے، اگرچہ اسناد میں کلام ہو، ابن عدیؒ نے کامل میں ابو سعید خدریؓ سے ایک حدیث من کان له امام الخ روایت کی اور کہا کہ اس کی اسناد میں اسمٰعیل راوی ضعیف ہیں، اور اس کی متابعت و موافقت کسی دوسرے راوی نے نہیں کی ہے۔

لیکن میں اس کے جواب میں کہتا ہوں یہ دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ نضر بن عبداللہ راوی نے اس کے مثل روایت کی ہے جیسا کہ معجم اوسط طبرانی میں موجود ہے، امام طحاویؒ نے شرح الآثار میں کہا ہے حدثنا یونس بن عبدالعلی حدثنا عبدالله بن وهب اخبرنی حیوۃ بن شریح عن بکر بن عمرو عبیدالله بن مقسم انه سأل عبدالله بن عمرو زید بن ثابت و جابر بن عبدالله الخ یعنی عبداللہ بن مقسم نے عبداللہ بن عمر اور زید بن ثابت اور جابر بن عبداللہؓ سے امام کے پیچھے قراءت کرنے کے متعلق دریافت کیا تو سبھوں نے فرمایا کہ امام کے پیچھے کسی نماز میں نہ پڑھو، میں مترجم کہتا ہوں کہ اسناد جید صحیح ہے، اور محمد بن الحسنؒ نے موطا میں سفیان بن عیینہ عن منصور عن ابی وائل روایت کی کہ یہی مسئلہ عبداللہ بن مسعودؓ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ خاموش رہو یعنی کچھ نہ پڑھو، کیونکہ نماز میں شغل ہے اور امام کی قرائت ہی تمہارے لئے کافی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد بھی جید صحیح ہے، اور موطا میں داؤد بن قیس الفراء المدنی سے روایت کی کہ مجھے سعد بن ابی وقاصؓ کے کسی صاحبزادے نے خبر دی ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے فرمایا ہے کہ میرا یہ دل چاہتا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قراءت کرتا ہو اس کے منہ میں انگارہ ہو، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد بھی صحیح ہے، کیونکہ داؤد بن قیس ثقہ اور فاضل ہیں،

اور سعدؓ کے سارے فرزند ثقہ ہیں، تو اس روایت میں جو صاحبزادے بھی ہوں وہ ثقہ ہوں گے، اس اثر کو عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں روایت کیا ہے البتہ اتنا سا فرق ہے کہ عبدالرزاقؒ کی روایت میں بجائے لفظ انگارے کے لفظ پتھر ہے یعنی اس کے منہ میں پتھر ہے، اس میں توفیق کے لئے یہ بات ممکن ہے کہ سعدؓ نے دونوں باتیں کہی ہوں اور جو جہنم کا پتھر ہے وہ انگارہ ہی ہے، اور موطا میں داؤد بن قیس عن ابن عجلان عن عمرؓ روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ کاش امام کے پیچھے پڑھنے والے کے منہ میں پتھر ہو۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابن عجلان وہی محمد بن عجلان ہے جو ثقہ ہیں تو اسناد صحیح ہے، اور اس اثر کو عبدالرزاقؒ نے بھی عمرؓ سے روایت کیا ہے، اور طحاویؒ نے حماد بن سلمہ عن ابی حمزہ روایت کی ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ اگر میرے آگے امام موجود ہو تو کیا میں اس حال میں قراءت کروں، تو فرمایا کہ نہیں، میں کہتا ہوں اس روایت کی اسناد بھی جید ہے، اور اس میں ابو حمزہ نقطہ کے ساتھ حرف جیم ہے اور تابعین اور ثقہ ہیں، ابن ابی شیبہؒ نے مصنفؒ میں حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ امام کے پیچھے مت پڑھو وہ جہر کرتا ہو یا اخفاء، اور سنن نسائی میں اسناد جید سے کثیر بن مرہ حضرمی سے روایت ہے کہ ابوالدرداءؓ سے میں نے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا ہر نماز میں قراءت ہے فرمایا کہ ہاں تو ایک انصاری شخص نے کہا یہ تو واجب ہو گئی، اس پر میری طرف توجہ فرمائی، اس وقت میں سب سے قریب تھا پس کہا کہ میں یہی جانتا ہوں کہ امام نے جب کسی قوم کی امامت کی تو مقتدیوں کی طرف سے بھی کفایت کر دی، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ابوالدرداءؓ نے یہ کلام رسول اللہ ﷺ سے سنے بغیر اپنی طرف سے بنا کر نہیں کہا ہے۔ الفتح۔

اور حضرت جابرؓ نے حدیث **لاصلوۃ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب** کے یہ معنی بیان کر دئے ہیں کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ امام کے پیچھے نہ ہو، چنانچہ موطا اور ترمذی میں سند صحیح کے ساتھ یہ بات موجود ہے، پھر اس بندہ مترجم کے نزدیک دلائل میں غور کرنے کے اعتبار سے حق بات یہی ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے کچھ بھی قراءت نہ کرے، لیکن اس پر لازم ہے کہ امام سورہ فاتحہ میں سے جو آیت ثناء پڑھے مقتدی اسے کان لگا کر خاموشی کے ساتھ سنے اور دل سے اس کی تصدیق کرے گویا خود بھی اسی کی طرح ادا کیا ہے، اور امام جو آیت سوال کی پڑھے تو مقتدی خود بھی دل سے اس کے مانگنے میں موافقت کرے، گویا خود بھی اس کی طرح ادا کیا اور مانگا ہے، کیونکہ وہ حدیث جس میں **قسمت الصلوۃ بینی و بین عبدی نصفین** پوری حدیث جو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے جہر کرنے اور اخفاء کرنے کے بیان میں مفصل گذر چکی ہے اس بات پر صراحۃ دلیل ہے کہ سورہ فاتحہ حمد و ثناء ہے اور دعا ہے، اور دل سے حمد و ثناء اور دل سے دعا کرنی شرط ہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ قلب غافل کی دعاء قبول نہیں کرتا ہے، جیسا کہ صحیح احادیث میں ہے، اور اس حدیث **لیس العبد من صلابۃ الاما عقل منھا**، یعنی بندہ کے لئے اس کی نماز میں سے حصہ نہیں ہے مگر اتنا سا جس میں کچھ کر گیا ہو، یہ دلیل ہے اس بات کی کہ غافل نہ ہو اور ہر ثناء و دعا پر بیدار و ہوشیار ہو، اور امام نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں اپنی اور مقتدیوں کی طرف سے جو کچھ عرض کی ہے اس میں شریک ہو، اور اسی مفہوم کے پیش نظر بندہ مترجم نے اپنے واسطے احادیث میں تطبیق دینے کو اعلیٰ مقدار اور مطلب قرار دیا ہے، **واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب**.

فاتحہ خلف الامام کے سلسلہ میں سارے دلائل اور مباحث بیان کرنے کے بعد یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے علم میں

قراءت خلف الامام کے سلسلہ میں سارے دلائل اور مباحث بیان کرنے کے بعد یہ کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اپنے علم میں قراءت خلف الامام ہی کو حق سمجھے تو دوسرے کسی شخص کو اس سے ناراض ہونے یا دشمنی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، لیکن افسوس تو ان لوگوں پر ہے جو خود تو جاہل مرکب ہیں پھر بھی اپنے خیال اور دعوی میں وجوب قراءت یا عدم قراءت خلف الامام کو نص محکم اور قرآنی حکم سمجھ کر دوسروں پر طعن و ملامت کرتے ہیں، اسی لئے بندہ مترجم نے اس مسئلہ کو بہت زیادہ پھیلا کر اور مبسوط کر کے بیان کیا ہے تاکہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ فاتحہ خلف الامام کا واجب ہونا در کنار، اس کا ثابت ہونا ہی بہت ضعیف ہے، لیکن

اگر کسی کو معرفت الٰہی سے محرومی اور انصاف نظر میں کمی ہو تو اس کا کیا علاج ہے، سچی ہدایت اور اس کی توفیق تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کے قبضہ واختیار میں ہے، ہم اسی سے ہدایت اور راہ یابی کی التجا کرتے ہیں، اور اسی سے عاجزانہ درخواست ہے کہ احمقوں کو ہم پر غالب نہ کرے، جو ایک ڈھیلے کے پیچھے ہی گھر بنا کر رہنا پسند کرتے ہیں اور اسی میں مصلحت سمجھتے ہیں، اور اسلام کو خوار و بے اعتبار اور بدنام اور مخالفوں کی نظروں میں اپنے کو ناکارہ اور بد اخلاق ظاہر کرتے ہیں، اللھم اغفر وارحم وانت ارحم الراحمین، پھر کہتا ہوں کہ حق بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام محمدؒ اور امام ابو حنیفہؒ کے بالکل موافق ہیں، یعنی ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امام کے پیچھے قراءت مکروہ ہے، چنانچہ آثار میں منع قراءت کی روایتیں بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ محمدؒ فرماتے ہیں کہ امام کے پیچھے قراءت بالکل نہیں کرنی چاہئے نہ سری نمازوں میں اور نہ جہری نمازوں میں اور صحابہ کرام کے عام آثار بھی اسی کے مطابق ہیں، اور امام ابو حنیفہؒ کا قول بھی یہی ہے۔ انتہی۔

اس طرح ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس بات میں کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ امام کے پیچھے کچھ نہیں پڑھنا چاہئے، کیونکہ احتیاط کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس بات میں دلیل قوی ہو اسی کی اتباع کرتے ہوئے عمل کیا جائے، اور یہاں قوی دلائل کا تقاضا یہی ہے کہ کچھ نہ پڑھا جائے، پڑھنے کا مطلب ہوگا ضعیف اقوال پر عمل کرنا، اب پھر میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی مذکورہ باتیں حق ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

چند ضروری مسائل

ہمارے بعض فقہاء کے کلام میں ہے کہ اگر کسی جگہ سے زور سے قرآن کی تلاوت کی آواز آتی ہو تو اس کا سننا مطلقاً واجب ہے، خلاصہ میں ہے کہ ایک شخص فقہی مسائل لکھ رہا ہو اور اس کے بغل میں کوئی زور سے تلاوت کرنے لگا ہو جبکہ وہ لکھنے والا نہ سننے پر مجبور ہو تو زور سے پڑھنے والا خود ہی گنہگار ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص رات کے وقت چھت پر زور سے تلاوت کر رہا ہو اور لوگ آس پاس سو رہے ہوں تو پڑھنے والا ہی گنہگار ہوگا، اس بات کی تصریح ہے کہ مطلقاً سننا واجب ہے کیونکہ اذا قری القرآن کی آیت کے الفاظ میں عموم ہے، اور سبب نزول پر خاص کر کے انحصار کرنا درست نہیں ہے۔ الفتح۔

اس مسئلہ کی بناء پر چند افراد اکٹھے ہو کر جو اپنی اپنی تلاوت کرتے ہیں، اور کوئی بھی دوسرے کی قراءت نہیں سنتا ہے تو ایسا کرنا منع ہے، اگر کسی نے اسے جائز کہا ہے تو وہ قول ضعیف ہے، اور بیاضیؓ کی وہ حدیث جو منفرد کی نماز کی حالت جہر و سراً میں ادا کرنے سے متعلق پہلے اپنی جگہ پر گذر گئی ہے، اسی بات پر دلالت کرتی ہے کہ تم میں سے ایک شخص بھی دوسرے شخص کی جہریہ تلاوت کے مقابلہ میں جہر نہ کرے۔ م۔ نماز کے علاوہ دوسری حالت میں تلاوت کرنے والے چاہئے کہ وہ اچھے کپڑے پہن کر عمامہ باندھ کر قبلہ رخ ہو کر بیٹھے، اسی طرح ایک عالم کو بھی علم کے واسطے میں بیٹھنا چاہئے، ویسے کروٹ پر لیٹے ہوئے بھی قراءت کرنا منع نہیں ہے، مگر پاؤں سمیٹ لینا چاہئے، اگر کوئی شخص چلتے ہوئے تلاوت کرے، یا کپڑے بننے والا جولاہہ یا کوئی مرد یا عورت سوت کاتتے ہوئے تلاوت کریں اور قلب حاضر ہو تو تلاوت مکروہ نہیں ہوگی، گرمیوں میں دن کے پہلے حصہ میں اور جاڑوں میں رات کے پہلے حصہ میں قرآن ختم کرنا چاہئے، پانچ ہزار بارہ سورہ اخلاص ختم کرنے کے مقابلہ میں ایک دن میں پورا قرآن ختم کرنا افضل ہے، نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں تین بار قل ہو اللہ پڑھنے کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے، چنانچہ عراق کے مشائخ کے نزدیک مستحب ہے، لیکن فرض نماز کے اندر ایک بار سے زیادہ نہیں پڑھنا چاہئے، پائخانہ میں جاکر پڑھنا مکروہ ہے، اور قول مختار میں یہ بھی مکروہ ہے حمام میں جہراً پڑھنا جبکہ وہاں کوئی ننگا ہو، اور ننگے نہاتے وقت بھی اور جس جگہ کسی کی بیوی ننگی ہو، عورت کو عورت سے بہ نسبت اندھے مرد کے قرآن پڑھنا افضل ہے۔ الفتح۔ آخری اور خلاصہ بحث یہ ہوا کہ امام کے پیچھے مقتدی کو کچھ نہیں پڑھنا چاہئے۔

ویستمع وینصت وان قرأ الامام آیة الترغیب والترھیب، لان الاستماع والانصات فرض بالنص، والقراءۃ و سوال الجنة والتعوذ من النار کل ذٰلك مخل به، وکذلك فی الخطبة، وکذلك ان صلی علی النبی علیه السلام لفریضة الاستماع الا ان یقرأ الخطیب قوله تعالیٰ ﴿یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ﴾ الایة، فیصلی السامع فی نفسه، واختلفوا فی النائی عن المنبر، والاحوط ھو السکوت اقامة لفرض الانصات، واللہ اعلم بالصواب.

ترجمہ:- اور کان لگائے اور خاموش رہے، اگرچہ امام ترغیب یا ترہیب کی آیت پڑھے، کیونکہ کان لگانے اور خاموش رہنے کی فرضیت قرآن سے ثابت ہے، جبکہ تلاوت قرآن ہو یا جنت کا سوال ہو یا جہنم کی آگ سے تعوذ ہو یہ ساری چیزیں اس مقصد میں خلل انداز ہوتی ہیں، اسی طرح سے خطبہ کے دوران بھی، خاموشی کے ساتھ سننا چاہئے، اسی طرح اگر نبی کریم ﷺ پر درود پڑھ رہا ہو تو وہاں بھی خاموشی کے ساتھ سننا چاہئے، خطبہ کا سننا فرض ہونے کی وجہ سے، مگر اس وقت جبکہ خطیب اس فرمان باری تعالیٰ کو پڑھ رہا ہو یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا الخ اے ایمان والو ان نبی پر درود بھیجو الایۃ، تو اس وقت اس کا سننے والا اپنے دل میں درود پڑھ لے، اور فقہاء نے اس شخص کے حکم کے بارے میں اختلاف کیا ہے جو منبر سے دوری پر ہو، تو اس میں بھی خاموش رہنے کی فرضیت کو قائم رکھنے کی غرض سے واللہ اعلم بالصواب.

توضیح:- مقتدی کا کان لگا کر سننا و خاموش رہنا، خطبہ کے وقت چپ رہنا
جب خطیب یہ آیت یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا صَلُّوْا الخ پڑھے، جو شخص منبر سے دور ہو
چند ضروری مسائل، نفل نماز پڑھتے وقت رحمت کی ہر آیت پر سوال، اور عذاب کی آیت پر پناہ مانگنا

ویستمع وینصت وان قرأ الامام آیة الترغیب والترھیب.....الخ

امام نماز کی حالت میں اگرچہ ترغیب یا ترہیب کی آیتیں پڑھتا ہو پھر بھی مقتدی خاموشی کے ساتھ اس کی طرف کان لگائے رکھیں۔ف۔ یعنی جنت کی نعمتوں اور اس کے انعامات کے متعلق آیات پڑھے تو اس وقت جنت کا سوال نہ کرے اسی طرح جہنم اور اس کے عذاب کا تذکرہ کرے جب بھی خاموش رہے اور اس سے پناہ نہ چاہے، کیونکہ نص قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ کان لگا کر سننا اور خاموش رہنا فرض ہے۔ف۔ ساتھ ہی اس آیت کے آخر میں اللہ کی طرف سے لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ کہہ کر رحمت دینے کا وعدہ بھی کیا گیا ہے، پس فرماں برداری پر رحمت پانا یقینی ہوا۔

والقراءۃ و سوال الجنة والتعوذ من النار کل ذٰلك مخل به.....الخ

امام کے پیچھے تلاوت کرنا، جنت کا مطالبہ کرنا اور جہنم سے پناہ مانگنا خواہ مقبول ہو یا نہ ہو یہ سب باتیں خشوع اور کان لگا کر سننے میں خلل انداز ہوتی ہیں، اسی طرح خود امام بھی سوائے قراءت و تلاوت کرنے کے کسی دعا وغیرہ میں مشغول نہ ہو، اسی طرح امامت خواہ فرض نماز کی ہو یا نفل نماز کی ہو، مگر تنہا پڑھنے والا بھی فرض نماز میں اس طرح کرے، البتہ نفل میں اسے اس بات کی اجازت ہے کہ جنت کا سوال اور جہنم سے پناہ مانگے، اس بات کی دلیل حضرت حذیفہؓ کی روایت کردہ اس حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رات کے وقت نماز پڑھی، اس میں آپ نے جب بھی کسی ایسی آیت کی تلاوت کی جس میں جنت کا تذکرہ ہوتا اس پر آپ ٹھہر کر اللہ سے جنت کا مطالبہ کیا، اور کسی جہنم کا تذکرہ ہوتا اس پر ٹھہر کر جہنم سے پناہ مانگی ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ امام کو بھی نفل نمازوں میں اس قسم کی دعائیں کرنی جائز ہے، حالانکہ فقہاء نے صراحۃً اس کی ممانعت کی ہے، لیکن اس کی وجہ یہ بیان کی ہے اس طرح دعائیں مانگنے سے مقتدیوں پر گراں گذرے گا اور نماز طویل ہو جائے گی، اس بناء پر اگر مقتدیوں پر گراں نہ گذرے اور وہ اس سے خوش ہوں تو امام ایسا کر سکتا ہے۔ الفتح۔

و کذلك فی الخطبة......الخ

اسی طرح خطبہ میں بھی۔ف۔کہ خطیب پڑھے اور سننے والے خاموشی سے سنیں، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم نے جب جمعہ کے دن خطبہ کے دوران اپنے ساتھی سے کہا کہ خاموش رہو تو تم نے لغو کیا، جیسا کہ بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے، اس سے ثابت ہوا کہ خاموش رہنا واجب ہے، اور عام علماء کا یہی قول ہے۔

و کذلك ان صلی علی النبی علیه السلام لفریضة الاستماع......الخ

اسی طرح اگر خطیب نبی کریم ﷺ پر درود بھیجیں۔**لفریضة الاجتماع الخ** کیونکہ خطبہ سننا فرض ہے۔ف۔بلکہ خاموش رہنا بھی فرض ہے، شرعاً زندگی میں صرف ایک بار درود بھیجنا فرض ہے، اور بقیہ زندگی میں درود بھیجنا صرف نفل ہے ایسی صورت میں خطبہ سننا جو فرض ہے اسے ترک کر کے نفلاً پڑھنا درست نہ ہوگا، امام طحاویؒ کے نزدیک جب کبھی کوئی رسول اللہ ﷺ کا نام سنے اس پر درود بھیجنا واجب ہے، اسی بناء پر اس جگہ طحاویؒ امام ابو یوسفؒ کا مذہب اختیار کیا ہے کہ خطبہ کے درمیان نام مبارک سننے سے اپنے دل میں درود پڑھنا چاہئے۔مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے مراد دل میں پڑھنا ہے، اور آہستہ پڑھنا مراد نہیں ہے، کیونکہ تمام علماء کے نزدیک بالاتفاق خاموش رہنا اس وقت واجب ہے، جبکہ آہستہ پڑھنے سے بھی خاموشی نہیں ہوتی ہے......اسی بناء پر یہ قول اس تاویل کی تائید کرتا ہے جو بندہ مترجم نے امام کے پیچھے دل ہی دل میں فاتحہ پڑھنے میں تاویل کی ہے، کہ دل سے حمد و ثنا اور سوال مراد ہے، زبان سے کہنا مراد نہیں ہے، اچھی طرح یاد رکھو، ابن ابی شیبہؒ نے حضرات علی و ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ وہ دونوں خطبہ کے وقت درود پڑھنے کو مکروہ کہتے تھے، اور زہریؒ سے روایت کی ہے کہ حجرہ سے امام کا نکلنا نماز کو ختم کر دیتا ہے، اور اس کا خطبہ شروع کر دینا گفتگو کو ختم کر دیتا ہے، امام ابو حنیفہؒ کا یہی قول ہے، امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک خطبہ میں کلام کرنا ممنوع اور خاموش رہنا واجب ہے۔مع۔الحاصل اس حالت خطبہ میں کوئی درود نہ بھیجے۔

الا ان یقرأ الخطیب قوله تعالیٰ ﴿یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْهِ﴾ الایة......الخ

مگر یہ کہ خطیب یہ آیت پاک یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْ الخ پڑھے، یعنی اے ایمان والو! نبی محمد ﷺ پر درود بھیجو، اور کامل سلام بھیجو، تو اس آیت کا سننے والا اپنے دل میں درود پڑھے۔ف۔

خلاصہ یہ ہوا کہ درود بھیجنا ممنوع ہے مگر جبکہ مذکورہ آیت پڑھے، ساتھ ہی اس اجازت کا مطلب نہیں ہے کہ اس وقت جس طرح جی چاہے درود بھیجے، درود بھیجتے وقت لوگوں کو چاہئے کہ وہ اپنے دل میں بھیجیں، اس جگہ بعض شارحین نے یہ لکھ دیا ہے کہ آہستہ سے درود بھیجے، اس لئے میں مترجم کہتا ہوں کہ آہستہ سے پڑھنے سے بھی اس حکم خاموشی کے بالکل برعکس ہو جاتا ہے، اور سکوت کی فرضیت کو مٹا دیتا ہے، جبکہ اس آیت کی وجہ سے اس وقت سن کر درود بھیجنا فرض تو نہیں ہو جاتا ہے بلکہ نفل ہی رہتا ہے ایسی صورت میں فرض خاموشی کے ساتھ اس کا پڑھنا اگرچہ آہستہ ہی کسی طرح جائز ہوگا، لہٰذا یہی صحیح بات ہوگی کہ اپنے دل میں پڑھے، کیونکہ درود دعا ہے، اسی لئے عینیؒ میں کہا ہے کہ اس طرح بھی (دل میں پڑھنا) کان لگانے اور چپ رہنے کے مخالف ہوگا، تو جواب یہ ہوگا کہ جب صرف دل میں پڑھا مگر زبان سے خاموش رہا اور کانوں سے سنتا رہا تو مخالفت نہیں کی بلکہ صَلُّوْا عَلَیْهِ الخ حکم کی بھی فرمانبرداری کر لی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مذکورہ قول اس بات پر صراحۃً دلیل ہے کہ اس جگہ دل سے پڑھنا ہی مراد ہے، اور یہ بھی واضح ہو کہ یہ حدیث **لاتفعلوا الا ان یقرأ احدکم بام القرآن فی نفسه** اسی طرح سے واقع ہے، اسی بناء پر بندہ مترجم نے اس سے پہلے بھی تاویل کی ہے کہ سورہ فاتحہ کو دل میں پڑھ لے، یہ تاویل اگرچہ ایسی ہے کہ کسی دوسرے سے یہ سننے اور دیکھنے میں نہیں آئی ہے پھر بھی درست ہے، اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس مترجم کو یہ تاویل اس طرح الہام فرمائی گئی ہے جس سے تمام نصوص میں موافقت بھی ہو جائے بڑی الجھن سے نجات بھی حاصل ہو جائے، اس لئے اچھی طرح خیال رکھو۔م۔

واختلفوا فی النائی عن المنبر......الخ

اور اس شخص کے بارے میں یہ اختلاف ہے کہ منبر سے دور ہو۔ف۔ متقدمین سے اس مسئلہ میں کوئی روایت نہیں ہے، لیکن متاخرین نے آپس میں اختلاف کیا ہے کہ وہ شخص جو منبر سے اس قدر دور ہو کہ وہ خطبہ کی آواز نہیں سکتا ہو تو کیا اس پر بھی سکوت واجب ہے۔فع۔ محمد بن سلمہؒ نے کہا ہے کہ خاموش رہنے میں ہی زیادہ احتیاط ہے، اسی قول کو صاحب ہدایہؒ نے اپنایا ہے۔ع۔

والاحوط ھو السکوت اقامۃ لفرض الانصات، واللہ اعلم بالصواب.

اور خاموش رہنا ہی زیادہ محتاط طریقہ ہے اقامۃ الخ اس خاموشی کو بجالانے کے لئے جو کہ فرض ہے۔ واللہ اعلم۔۔ف یعنی سننا اور خاموش رہنا دو فرض تھے تو دوری کی وجہ سے اگرچہ سننا ممکن نہیں ہے مگر دوسرا فرض جو خاموش رہنا ہے اس پر عمل کرنا ممکن ہے، لہٰذا اسی کو قائم رکھے، ابن کثیرؒ نے مجاہدؒ سے یہی قول بیان کیا ہے، جیسا کہ گذر گیا م۔ خود امام بھی خطبہ کی حالت میں گفتگو نہ کرے کیونکہ رونق جاتی رہتی ہے، خطبہ کے دوران سلام کرنا منع ہے اس لئے اس کا جواب دینا بھی واجب نہیں ہے، یہی حکم مدرس، قاری اور وظیفہ خوان کا ہے، اسی طرح مانگنے والے فقیر کے سلام کے جواب بھی واجب نہیں ہے۔ فع۔ واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے تہجد کی نماز میں حضرت بلالؓ کو ایک سورہ کو پڑھتے ہوئے چھوڑ کر دوسری سورہ پڑھنے سے منع کیا ہے، اس لئے ابن الہمامؒ نے دوسری نفل نماز میں اس طرح پڑھنے کو مکروہ فرمایا ہے۔

چند ضروری مسائل

نفل نمازوں میں ہر آیت رحمت پر سوال کرنا اور ہر آیت عذاب پر پناہ مانگنا حضرت حذیفہؓ کی حدیث سے ثابت ہے، اور بوقت تلاوت خاص خاص آیتوں کے جواب اسی طرح منقول ہیں، مثلاً الیس ذلك بقادر علی ان یحیی الموتی، کے جواب میں یہ کہنا بلی، وانا علی علی ذلك الشاھدین، اسی طرح منقول ہیں، الیس اللہ باحکم الحاکمین کے جوب میں بھی بلی، و انا علی ذلك من الشاھدین، اسی طرح قل ارأیتم ان اصبح ماؤکم غورا فمن یاتیکم بماء معین، کہ جواب میں اللہ رب العلمین، اسی طرح فبای حدیث بعدہ یومنون، کے جواب میں آمنت باللہ لاالہ الا ھو کہنا۔ع۔ اور فبای آلاء ربکما تکذبان کے جواب میں یہ کہنا لا شیء من نعمك ربنا تکذب. م. اور سجدہ کی حالت میں دعا کرنا مستحب ہے کیونکہ حدیث میں اسے مقبول ہونے کے لائق بتایا گیا ہے۔ع۔

کچھ مفید باتیں، حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت کردہ حدیث میں ہے کہ جس نے حکم شرعی کے مطابق وضوء کیا اس طرح حکم کے مطابق ہی نماز پڑھی اس کے پچھلے گناہ جتنے بھی ہوں گے سب بخش دیئے جائیں گے، نسائی۔ حضرت عبداللہ بن شقیق تابعی سے مروی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرامؓ نماز کے علاوہ عمل کو چھوڑنے کو کفر نہیں جانتے تھے۔ ترمذی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کھڑے ہوئے ہونے کی حالت میں ایک قدم پر زور دینا افضل اور سنت قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ نسائی میں ہے، حضرت عمار بن یاسرؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آدمی نماز سے سلام پھیرتا ہے، مگر نتیجہ کے طور پر کسی کے حصہ میں ثواب کا دسواں حصہ، کسی کے حصہ میں نواں اسی طرح آٹھواں، ساتواں، چھٹا، پانچواں، یا چوتھائی یا تہائی یا آدھا حصہ ملتا ہے (اس کے اخلاص کے مطابق اس لئے بہت ہی احتیاط اور خشوع و خضوع کے ساتھ نماز پڑھنی چاہئے تاکہ زیادہ سے زیادہ حصہ ثواب کا انسان مستحق ہو سکے) ابوداؤد اب امامت کا بیان اور اس کی تفصیلی بحث آتی ہے۔

باب الامامة

امامت کا باب

الجماعة سنة مؤكدة لقوله عليه السلام : الجماعة من سنن الهدى لايتخلف عنها الا منافق.

ترجمہ: جماعت سنت مؤکدہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ بہت سی سنن ہدی میں سے ایک جماعت بھی ہے، منافق کے علاوہ دوسرا کوئی بھی اس سے پیچھے نہیں رہتا۔

توضیح:- امامت کا بیان

امام و مقتدی کی نماز کے متعلق کی شرطیں، جماعت کے بارے میں علماء کے اقوال، جماعت کن لوگوں سے ساقط ہوتی ہے، جماعت کا مسنون ہونا، حدیث سے دلیل، جمعہ اور عیدین کی جماعت، تراویح کی، رمضان میں وتر کی جماعت، جماعت کی تعداد، جمعہ میں جماعت کی تعداد، مسجد میں دوسری جماعت اذان و اقامت کے ساتھ، مسجد محلّہ اور جامع مسجد، محلّہ میں دو مسجدیں، فقہ کی مشغولیت میں ترک جماعت، مترجم کی طرف سے وضاحت۔

باب الامامة. امام اور مقتدی کے درمیان دس شرطوں کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے، نمبر ا۔ اقتداء کی نیت اور عورت کی امامت کی نیت کرنا، نمبر ۲۔ دونوں کا ایک جگہ میں ہونا، نمبر ۳۔ دونوں کی نمازوں کا ایک ہونا، نمبر ۴۔ مقتدی کا یہ عقیدہ ہونا کہ امام کی نماز صحیح ہو رہی ہے، نمبر ۵۔ عورت کا مرد کے محاذی (متصل نہ ہونا) نمبر ۶۔ مقتدی کی ایڑی کا امام سے آگے نہ ہونا، نمبر ۷۔ مقتدی کو یہ معلوم ہوتے رہنا کہ امام ایک رکن سے دوسرے رکن میں جارہا ہے، نمبر ۸۔ امام کے مسافر یا مقیم نہ پہچاننے کی وجہ سے نماز کا خراب نہ ہونا، نمبر ۹۔ نماز کے ارکان میں امام کے ساتھ شریک ہونا، نمبر ۱۰۔ امام کا مقتدی کے لئے امامت کے لائق ہونا۔ م۔

یہ ابوہریرہؓ سے مرفوعا ثابت ہے، آدمی کی نماز جو جماعت کے ساتھ ادا کی گئی ہو وہ اس نماز سے جو اس کے اپنے گھر میں ہو یا بازار میں پچیس گونہ افضل ہوتی ہے، نسائی کے علاوہ بقیہ صحاح خمسہ میں ہے، لیکن حضرت ابن عمرؓ کی روایت میں ہے کہ ستائیس گونہ افضل ہوتی ہے، بخاری و مسلم، عثمانؓ سے مرفوعا مروی ہے، جس نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھ لی اس نے گویا آدھی رات تہجد پڑھتے ہوئے گذاری، اور جس نے صبح کی نماز بھی جماعت کے ساتھ ادا کی تو گویا اس نے پوری رات تہجد کی نماز پڑھی، مسلم، مالک، ابوداؤد، ترمذی، جس مسجد میں جماعت ادا کی جاتی ہو اس میں دور سے جا کر پڑھنے والے کو یا اندھیری رات میں جانے والے کو، اور وہاں انتظار کرنے والے کو زیادہ ثواب ملتا ہے، جیسا کہ حضرت ابو موسیٰ و ابی ابن کعبؓ سے صحیحین میں مروی ہے، جماعت کے حکم کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، جن کا تذکرہ طویل ہے، مختصراً یہ ہیں:

قول نمبر ا۔ جماعت فرض عین ہے یعنی ہر شخص پر فرض ہے اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے، مگر نماز کے صحیح ہونے کے لئے جماعت کا ہونا شرط نہیں ہے قول نمبر ۲۔ فرض کفایہ ہے یعنی اگر کچھ افراد بھی جماعت سے نماز پڑھ لیں تو باقی تمام لوگوں سے فرض ادا نہ کرنے کا گناہ معاف ہو جاتا ہے، چنانچہ امام شافعیؒ اور جمہور صحابہ کا یہی قول ہے، قول نمبر ۳۔ یہ ہے کہ واجب ہے، اور عام مشائخ حنفیہ کا بھی یہی قول ہے۔ الغایہ۔ اس جماعت کا ثبوت چونکہ سنت رسول سے ہوا ہے اسی بناء پر اس واجب کو سنت بھی کہا جاتا ہے۔ المفید۔

اور جماعت واجب ہوتی ہے ایسے عاقلوں، بالغوں اور آزاد لوگوں پر جو بغیر کسی حرج کے جماعت میں شرکت کر سکتے ہیں۔ البدائع۔ اور تحفہ میں ہے کہ اسی شخص پر جماعت میں شرکت واجب ہے جو بغیر کسی حرج کے شرکت کر سکتا ہو، عذر کی وجہ سے یہ ساقط ہو جاتی ہے، اسی بناء پر بیمار، اندھے اور اپاہج پر شرکت واجب نہیں ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر چہ اندھے کو لے

جانے والا اور اپاہج کو لاد کر لے جانے والا ملے پھر بھی اس پر شرکت جماعت واجب نہ ہو گی، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک ان صورتوں میں شرکت واجب ہو گی، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ نہ جمعہ میں شرکت واجب ہے، نہ کسی دوسری جماعت میں بیمار پر، گٹھیا والے پر اور اپاہج و لنجے و اندھے پر اسی طرح دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کٹے ہوئے شخص پر، اور جیسے فالج کا مرض لگ گیا ہو، اور عاجز اور بوڑھے پر بھی، اور جب بھی بارش و کیچڑ کی زیادتی ہو تو بھی قول صحیح کے مطابق شرکت جماعت واجب نہیں ہے، اسی طرح جب بہت زیادہ سردی ہو یا تاریکی ہو تو بھی شرکت جماعت ساقط ہو جاتی ہے، اگر بادشاہ کے پاس پکڑے جانے کے خوف سے چھپا ہوا ہو تو بھی شرکت واجب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کسی شخص کو ایک مسجد میں جماعت نہ ملے تو ہمارے ائمہ کے نزدیک بالاتفاق اس پر دوسری جماعت میں شرکت کے لئے جانا واجب نہیں ہے، شمس الائمہؒ نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں اگر محلہ کی مسجد میں داخل ہو گیا ہو تو وہیں تنہا پڑھ لے، ورنہ اولیٰ یہ ہے کہ دوسری مسجد میں شرکت کی کوشش کرے۔ فع۔ التبیین جماعت اس وقت ساقط ہوتی ہے جبکہ رات کے وقت میں تیز ہوا چل رہی ہو، مگر دن میں ساقط نہیں ہوتی ہے، اسی طرح شرکت ساقط ہوتی ہے جبکہ پاخانہ یا پیشاب کی ضرورت ہو یا نکلنے میں قرض خواہ کے گرفتار ہو جانے کا خوف ہو، یا سفر کی حالت میں قافلہ کے چھوٹ جانے کا خوف ہو، یا کسی بیمار کا محافظ اور تیماردار ہو یا اپنے مال کے برباد ہونے کا خوف ہو، یا عشاء کا کھانا تیار ہو اور اسے کھانے کے لئے دل کا شوق بڑھا ہوا ہو، اور اسی وقت اقامت کہی گئی ہو، یا عشاء کے علاوہ کسی دوسرے وقت میں یہی صورت پیش آئی ہو، اور دل بھی اس کا مشتاق اور اس کی طرف راغب ہو۔ السراج۔ قول نمبر ۴۔ وہ ہے جو کہ مصنف ہدایہؒ نے اختیار کیا ہے، الجماعۃ سنۃ الخ، جماعت سنت مؤکدہ ہے۔ف۔ یعنی مردوں کے لئے یہ سنت قوت میں واجب کے ہے جس کے چھوڑنے کی وجہ سے بے ادبی اور برائی ہے۔ ن۔ فع۔

لقوله عليه السلام : الجماعة من سنن الهدى لايتخلف عنها الا منافق.

رسول اللہ ﷺ کی اس فرمان کی وجہ سے کہ جماعت سنن ہدیٰ میں سے ایک ہے، منافق ہی اس سے پیچھے رہتا ہے۔ف۔ یعنی جس کی خصلت منافقوں کی جیسی ہو۔ع۔ یہ حدیث مرفوعاً ثابت نہیں ہے، بلکہ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ جس شخص کو یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہو کہ کل کے دن اللہ تعالیٰ سے اسلام کی حالت میں ملے تو اسے چاہئے کہ نمازوں کا پورا خیال رکھے جب ان کے لئے اذان دی جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے پیغمبر ﷺ کے لئے سنن ہدیٰ مقرر فرمائی ہیں، آخر حدیث تک، اسی میں یہ جملہ بھی ہے کہ میں نے اپنے طور پر یہ دیکھا ہے کہ ایسا منافق جس کا نفاق بالکل ظاہر ہو تا وہی نماز پڑھنے سے بچھڑ تا تھا، اور (نمازی) آدمیوں کو تو اس طرح بھی مسجد میں لایا جاتا تھا کہ دو آدمیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھے ہوتا تھا اور اسے لاکر صف میں کھڑا کر دیا جاتا تھا، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، الحاصل مذکورہ بیان ابن مسعودؓ کا اثر ہے، اسی بناء پر جماعت کو فرض کہنے والوں نے معارضہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کو جس میں جماعت سے نماز نہ پڑھنے والوں کے گھروں کو جلانے کو دھمکی ہے، بلاعذر گھر میں پڑھنے والوں اور جماعت سے پیچھے رہ جانے والوں کا ارادہ کیا ہے۔

لیکن بیہقیؒ نے کہا ہے کہ عام روایتوں کی تلاش اور مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث میں جماعت سے مراد صرف جمعہ کی نماز مراد ہے، جیسا کہ ایک دوسری روایت جو عبد اللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے اس کے الفاظ ہیں **يتخلفون عن الجمعه**، جو جمعہ کی مراد پر صریح ہے، مگر امام نوویؒ نے کہا ہے کہ یہ مستقل دو حدیثیں ہیں، ایک جمعہ کے بارے میں دوسری پنجوقتی جماعتوں کے بارے میں ہے، بن الہمامؒ نے کہا ہے کہ بہر حال یہ خبر واحد ہے اور ہمارے نزدیک خبر واحد سے کسی فرض کا ثبوت نہیں ہوتا ہے، البتہ واجب کا ثبوت ہوتا ہے، اس طرح عامہ مشائخ کی دلیل یہی روایت ہوئی، اور مصنفؒ نے عبد اللہ بن مسعودؓ کے اثر سے جو سنن الہدیٰ کا ذکر کیا ہے اس سے سنت اصطلاحی مراد ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ انہوں نے نمازوں کو بھی سنن الہدیٰ کہا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ سنن الہدیٰ مطلقاً نماز کو نہیں کہا گیا ہے بلکہ جماعت کی نمازوں کو کہا گیا ہے، اس طرح جماعت کے

وصف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، نہایہ اور عینیؒ نے جماعت کے سنت مؤکدہ ہونے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تنہا نماز پڑھنے پر جماعت کی نماز کو ۲۵، یا ۲۷ درجہ زیادہ فضیلت دی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا نماز بھی درست ہوتی ہے، اور فاسد نہیں ہوتی ہے، اور ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے حضرت ابی بن کعبؓ کی مرفوعاً روایت کی ہے کہ بالکل تنہا نماز پڑھنے والے کے مقابلے میں ایک اور ساتھی کے ساتھ نماز افضل ہے، اور ایک شخص کے ساتھ ہونے کے مقابلہ میں دو شخص کے ساتھ اور جس قدر نمازی زیادہ شریک ہوتے جائینگے وہ نماز اللہ کے نزدیک زیادہ محبوب ہوتی جائیگی، اس سے معلوم ہوا کہ تنہا شخص کی نماز بھی جائز ہے البتہ جماعت چونکہ شعار اسلام میں سے ہے اس لئے سنت مؤکدہ ہے۔

ابن الہمامؒ نے اس دلیل کو رد کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ چونکہ جماعت نماز کے افعال میں سے نہیں ہے اس لئے بغیر جماعت بھی نماز صحیح ہو جائے گی، البتہ ترک واجب کا گناہ ہوگا لیکن فی الجملہ صحیح ہونے کو ایک بہت ہی مدلل اور اہم مضمون کے طور پر طویل گفتگو کے ساتھ بیان کیا ہے، اور اس کلام سے ظاہری طور یہی سمجھا بھی جاتا ہے کہ شیخ ابن الہمامؒ کا ذاتی میلان اس مسئلہ میں وجوب کی طرف ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان "**الجفاء کل الجفاء والکفر والنفاق من سمع منادی اللہ الی الصلوۃ فلا یجیبہ**" اسی پر محمول کیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے یعنی جفاکاری پوری جفاء اور کفر و نفاق اس شخص کا ہے جو اللہ تعالیٰ کے منادی کو سنے کہ وہ نماز کی طرف بلاتا ہے پھر بھی جواب نہ دے (نماز کو نہ جائے) احمد و طبرانی نے اس کی روایت کی ہے، اور طبرانی کی ایک اور روایت میں ہے کہ مومن کے واسطے بدبخت ہونے اور خسارہ میں پڑ جانے کے لئے اتنی بات بہت کافی ہے کہ موذن کی یہ آواز سنے کہ وہ نماز کے لئے پکارتا ہے پھر بھی اس کا جواب نہ دے (نماز میں شریک نہ ہو)۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے پہلے یہ مسئلہ گذر چکا ہے کہ اس جیسی حدیث میں جواب دینے کا مطلب بلانے کے بعد وہاں جانا ہوتا ہے، اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے (کہ کلمات اذان کو دہرانا اور دعاء کرنا مراد ہے) ابن ماجہ نے مرفوعاً ایک روایت بیان کی ہے کہ جس نے اذان سنی پھر بھی نماز کے لئے نہیں آیا تو اس کی نماز درست نہیں ہوئی البتہ اگر مجبوری ہو تو دوسری بات ہے، اور حاکم نے بھی اس کی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ روایت بخاری اور مسلم دونوں کی شرط کے مطابق ہے۔

اور اس مسئلہ میں عینیؒ کا میلان سنت مؤکدہ کو ترجیح دینے کی طرف ہے، کیونکہ اس کے وجوب کے دلائل میں کافی گفتگو اور بحث ہے، ویسے اس کے وجوب اور سنت دونوں اقوال میں غور کرنے سے دونوں باتیں سمجھ میں آتی ہیں دونوں کے دلائل قوی ہے، لیکن حق یہ ہے کہ واجب کہنے والوں کے دلائل اظہر ہیں اور سنت کہنے والوں کی روایتیں قوی ہیں، چنانچہ یہی مذکورہ روایت تمام متون میں اور خلاصہ و محیط اور سرخسیؒ کی محیط میں بھی ہے، البتہ بحر الرائق میں کہا ہے کہ اہل مذہب کے نزدیک وجوب ہی کا قول راجح ہے، زاہدیؒ نے کہا ہے کہ جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں جماعت شرط ہے، اور تراویح میں جماعت سنت کفایہ ہے، اور رمضان میں وتر کی جماعت مستحب ہے۔ د۔

جماعت کے لئے امام کے علاوہ ایک کا ہونا بھی کافی ہے، السراجیہ۔ ف۔ وہ دوسرا اگرچہ چھوٹا ہو البتہ تمیز کرنے کی عمر آچکی ہو۔ السراجیہ۔ یا وہ شخص جن ہو، اسی طرح وہ جگہ مسجد ہو یا کوئی دوسری جگہ ہو۔ د۔ لیکن جمعہ کی جماعت کے لئے امام کے ساتھ تین آدمی کا ہونا یا چار آدمیوں کا ہونا ضروری ہے۔ قدوری۔ محلّہ کی مسجد میں ایک فرض نماز کے لئے اذان و اقامت کے ساتھ جماعت کے بعد دوسری جماعت کرنی مکروہ ہے، لیکن راستہ کی مسجد میں یا ایسی مسجد میں جس میں موذن اور امام مقرر نہ ہو دوسری جماعت مکروہ نہیں ہے، اور بالاتفاق اذان و اقامت کے بغیر جماعت مکروہ نہیں ہے۔ شرح المجمع۔

حلوائیؒ نے کہا ہے کہ اگر امام کے علاوہ تین آدمی تک ہوں تو مسجد کے گوشہ میں بھی بالاتفاق مسجد محلّہ افضل ہے یا مسجد افضل ہے اس میں دو اقوال ہیں، اگر محلّہ میں دو مسجدیں ہوئی ہیں تو پرانی میں جانا چاہئے، اور اگر دونوں ایک زمانہ کی بنی ہوئی ہوں تو زیادہ قریب میں جائے، اور اگر آدمی فقہ سیکھنا ہو تو اس کے درس کے استاد کی مجلس یا مجلس عامہ بالاتفاق افضل ہے۔ ف۔ اگر کوئی

شخص دن اور رات فقہ کے حصوں میں مشغول رہنے کی وجہ سے جماعت میں شریک نہ ہوتا ہو تو نجم الائمہؒ نے کہا ہے کہ اس کی محنت ضائع اور لوگ اس کے معاملہ میں خاموش رہنے پر عند اللہ معذور نہیں سمجھے جائینگے (ان سے بھی مواخذ ہوگا)۔ ع۔ کہا گیا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ شخص سستی اور کسلمندی کا عادی ہو کر ہمیشہ جماعت ترک کرنے لگا ہو۔ م۔ اور نجم الائمہؒ نے یہ بھی کہا ہے لغت کی تکرار میں ترک جماعت میں معذور نہ ہوگا، لیکن فقہ کی تکرار اور اس کی کتابوں کے مطالعہ میں معذور سمجھا جائے۔ ع۔ یعنی اس وقت جبکہ کبھی کبھی جماعت ترک ہو جانے کی صورت میں۔ م۔

اگر کسی کو صرف فقہ میں ہی مشغولیت اور دلچسپی کے ساتھ مصروفیات ہو اس کے علاوہ کسی اور فن سے نہ ہو تو ترک جماعت میں وہ معذور ہوگا، ایسا ہی عینیؒ نے کہا ہے، اور باقانیؒ اسی پر اعتماد کیا ہے۔ د۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ تحقیق یہ ہے کہ جماعت واجب یا قریب واجب ہے، اور ضرورت کے مطابق فقہ حاصل کرنا فرض ہے، اور اس سے زائد سیکھنا نہ فرض عین ہے اور نہ واجب ہے، البتہ اس صورت میں واجب اور فرض ہو جائے گا جبکہ دوسروں نے اس کے سیکھنے سے منہ موڑ لیا ہو اور ایک ہی شخص اس کے لئے مناسب ہو تو واجب یا فرض ہو جائے گا، اس سے پہلے مدلل بیان کر چکے ہیں کہ اجتہاد کی صلاحیت حاصل کرنے تک فقہ سیکھنا فرض کفایہ ہے، اس کے علاوہ تمام علوم دینیہ کا حکم برابر ہے، بظاہر یہ مسئلہ اس کا نتیجہ ہے کہ جماعت سے پڑھنا سنت ہے۔ سمجھ لو۔

اگر رات کے وقت مسجد میں جاتے ہوئے کسی کو ڈر لگتا ہو تو شرف الائمہؒ کے قول کے مطابق وہ شرکت جماعت میں معذور سمجھا جائے گا۔ ع۔

واولی الناس بالامامة اعلمهم بالسنة، وعن ابی یوسف اقرؤهم، لانه لابد منها، والحاجة الی العلم اذا نابت نائبة، و نحن نقول القراء ة مفتقر الیها لرکن واحد والعلم لسائر الارکان، فان تساووا فاقرؤهم لقوله: علیه السلام یؤم القوم اقرأ هم لکتاب الله، فان کانوا سواء فاعلمهم بالسنة، واقرؤهم کان اعلمهم لانهم کانوا یتلقونه بأحکامه، فقدم بالحدیث ولا کذلك فی زماننا فقدمنا الاعلم.

ترجمہ:- اور تمام لوگوں (موجودہ نمازیوں) میں امامت کے لئے زیادہ مستحق وہ شخص ہے جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہو، اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ وہ شخص زیادہ مستحق ہے جو ان میں سب سے اقرأ ہو، کیونکہ نماز کے لئے قرأۃ کے بغیر چارہ نہیں ہے، اور زیادتی علم کی ضرورت ہو اس وقت ہوتی ہے جبکہ نماز میں کوئی حادثہ پیش آجائے، اور ہم لوگ یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک رکن کی ادائیگی کے لئے قراءۃ کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن علم کی ضرورت ارکان کے لئے ہوتی ہے، اگر وہ تمام بالکل برابر ہو جائیں تو اسے ترجیح دی جائے گی جو ان میں زیادہ اقرأ ہو کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ قوم کی امامت وہی شخص کرے گا جو انئیں کتاب اللہ کا زیادہ قاری ہو، اور اگر وہ لوگ اس میں بھی برابر ہوں تو پھر ترجیح ہوگی اس شخص کو جو ان میں سنت کا زیادہ عالم ہو، ویسے بھی ان لوگوں میں اقرأ شخص ہی سنت کا بھی زیادہ عالم ہوتا تھا کیونکہ وہ صحابہ کرام قرآن کو جتنا سیکھتے تھے ان کے احکام کے ساتھ سیکھتے تھے، اسی لئے حدیث میں بہتر قاری کو مقدم کیا گیا ہے، لیکن یہ بات اب ہمارے زمانہ میں نہیں ہے، اسی لئے ہم نے اعلم کو مقدم کیا ہے۔

توضیح:- امامت کے لئے اولیٰ کون ہے، اگر ایک ہی قسم کے چند اشخاص ہوں، حدیث سے دلیل

واولی الناس بالامامة اعلمهم بالسنة......الخ

جو شخص جماعت میں شریک لوگوں میں سے سنت کا زیادہ عالم ہو وہی امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ ف۔ جمہور علماء کا یہی قول ہے، اور سنت سے مراد فقہ اور شرعی احکام ہیں۔ ع۔ یعنی فقط نماز کے احکام کا زیادہ عالم ہو۔ المضمرات۔ یہی قول ظاہر ہے۔ البحر۔

بشرطیکہ اچھی طرح قرأت قرآن بھی کر سکتا ہو اتنی مقدار میں جس سے نماز جائز ہو یعنی فرض قرأت کی مقدار۔ع۔ اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مقدار واجب ہے۔ د۔ اور یہی قول صحیح ہے، کیونکہ اولی اور افضل کہنے کے لئے واجب کا ترک نہیں کیا جاسکتا ہے۔ م۔ بلکہ مقدار مسنون مراد ہے۔ التبیین۔ بشرطیکہ اس کے اعتقاد کے بارے میں الزام موجود نہ ہو۔ النہایہ۔

اگر کسی مسجد کا امام معمولی ہو اور کسی کو اس کے اعتقاد کے بارے میں اعتراض ہو اس لئے وہ شخص اس امام کے پیچھے نہ پڑھ کر تنہا پڑھتا ہو تو اسے معذور سمجھا جائے گا، بخلاف ایسے امام کے جس کے اعمال فاجروں جیسے ہوں۔ م۔ یہاں اولی امام سے مراد ایسا شخص ہے جو ظاہری فحش کاموں سے بچنے کی کوشش کرتا ہو، اور بظاہر پرہیزگار ہو، اگرچہ کوئی دوسرا شخص تقویٰ میں اس سے بڑھا ہوا موجود ہو۔ المحیط۔ اگر وہ شخص نماز کے مسائل کے بارے میں تو دوسروں سے بڑھا ہوا ہو لیکن دوسرے علوم نہ جانتا ہو تو بھی وہی شخص اولیٰ ہوگا۔ الخلاصہ۔

وعن ابی یوسف اقرؤھم، لانه لابد منھا، والحاجة الی العلم اذا نابت نائبة......الخ

اور ابو یوسفؒ کا قول ہے ان میں اولی وہ ہے جو اقرأ ہو۔ ف۔ یعنی بہتر قرأت کرنے والا ہو، جبکہ نماز کے ضروری مسائل کا اسے علم بھی ہو **لان القراۃ الخ** کیونکہ قرأت سے چارہ نہیں ہے۔ ف۔ کیونکہ یہ تو نماز کا مستقل رکن ہے، **والحاجة الخ** اور زیادہ علم کی ضرورت تو کسی خاص واقعہ کے پیش آنے کی صورت مین ہوتی ہے، تو البتہ اس وقت زیادہ علم کی ضرورت ہوگی، عینیؒ نے لکھا ہے کہ دوسرے ائمہ کا بھی یہی قول ہے۔

ونحن نقول القراءة مفتقر الیھا لرکن واحد والعلم لسائر الارکان......الخ

اور ہم لوگ طرفین یعنی امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کی طرف سے کہتے ہیں کہ قرأت کی ضرورت تو اس لئے ہے کہ وہ ایک رکن ہے۔ ف۔ یعنی قرأت، **والعلم لسائر الارکان الخ** اور علم کی ضرورت تمام ارکان کے لئے ہوتی ہے۔ ف۔ اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اگر کسی کو نماز میں ضرورت کے مطابق ارکان نماز کا علم ہو، البتہ اگر کوئی اہم مسئلہ پیش آجائے تو اس کے جواب کا علم نہ ہو (تو پھر کون شخص افضل ہوگا) جواب یہ ہوگا کہ قرأت اور علم دونوں میں افضل ہونے کی صلاحیت ہے اور دونوں چیزیں افضل بننے کی صفتیں ہیں، لہٰذا قرأت کے افضل کی صفت کا تعلق صرف ایک ہی رکن سے ہے اور اس سے زیادہ نہیں ہے لیکن علم کی افضلیت کا تعلق تو نماز کے دوسرے ارکان سے بھی ہے، اس بناء پر جس میں یہ فضیلت موجود ہو وہ قاری سے افضل ہی ہوگا اس لئے اسے اولیٰ بالامامۃ بھی کہا جائے گا۔ م۔

فان تساووا فاقرؤھم لقوله: علیه السلام یؤم القوم اقرأ ھم لکتاب الله......الخ

یعنی اگر حاضرین علم میں برابر ہوں تو ان میں وہی بہتر ہوگا جو بہتر قاری ہوگا۔ **لقوله الخ** رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے کہ **یؤم القوم اقرء ھم لکتاب الله** یعنی قوم کی امامت وہی شخص کرے گا جو کتاب الٰہی کا بہتر قاری ہوگا **فان کانو ا الخ** پھر اگر اس اعتبار سے بھی سب برابر ہوں تو ان میں امامت کے لئے بہتر وہی ہوگا جو سنت کو زیادہ جاننے والا ہوگا۔ ف۔

فان کانوا فی السنة سواء فاقدمھم ھجرۃ، فان کانوا فی الھجرۃ سواء فاقدمھم اسلاما، ولایؤم الرجل الرجل فی سلطانه، ولا یقعد فی بینه علی تکرمنه الاباذنه.

ترجمہ: پھر اگر سنتوں کے جاننے میں سب مساوی ہوں تو جو ہجرت کرنے یعنی مکہ سے مدینہ کی طرف جانے میں مقدم ہو، اگر ہجرت کرنے میں بھی برابر ہوں تو جو اسلام لانے میں مقدم ہو (وہ اولیٰ ہوگا) اور کوئی شخص دوسرے شخص کے مقام سلطنت میں امامت نہ کرے، اسی طرح اس کے تخت پر بھی نہ بیٹھے، البتہ اس کی اجازت (یا پیشکش) سے بیٹھ سکتا ہے، بخاری کے علاوہ تمام صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، اور ابن حبان کی روایت میں اسلام لانے کے لفظ کی جگہ ''سن'' کا لفظ ہے یعنی جو سن یا عمر میں زیادہ ہے۔ ع۔

اس حدیث میں اقرأ کو اعلم پر مقدم کیا گیا ہے جیسا کہ امام ابویوسفؒ اور دوسرے اماموں کا بھی قول ہے، تو امام محمدؒ نے آثار میں اس کا وہ جواب دیا ہے جو مصنفؒ ابھی بیان کرتے ہیں اقراهم کان اعلمهم الخ یعنی صحابہ کرام میں جو اقرأ تھے وہ اعلم بھی تھے کیونکہ وہ لوگ جتنا قرآن سیکھتے تھے اتنا ہی اس کے احکام بھی سیکھ لیتے تھے۔ف۔ اس طرح وہ لوگ احکام کے جاننے میں برابر تھے، البتہ قرأت میں بہتر ادائیگی کے اعتبار سے کچھ فرق ہوتا تھا اس لئے حدیث میں قاری کو بہتر اور اولیٰ کہا گیا ہے، لیکن ہمارے زمانے میں یہ بات نہیں ہے۔ف۔ بلکہ بہت سے قاری تو وہ ہوتے ہیں جو صرف بہتر طریقہ سے ادائیگی کرسکتے ہیں مگر مطلب اور مسائل کے اعتبار سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔

فقدمنا الاعلم......الخ

اس بناء پر ہم نے اعلم کو فوقیت دی اور انہیں اولیٰ کہا ہے۔ف۔ پس اگر سب لوگ علم قرآن میں برابر ہوں تو ان میں سے جو بہتر قاری ہوگا وہی مقدم مانا جائے گا، اس وقت اس حدیث فان کانوا سواء فاعلمهم بالسنة کے معنی یہ ہوں گے کہ اگر جماعت میں شرکت کرنے والے تمام قراءت اور علم دونوں میں برابر ہوں تو ان میں جو شخص بھی سنت کا زیادہ عالم ہوگا وہی اولیٰ ہوگا، اس بناء پر سنت سے مراد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ کی معرفت ہوگی، کیونکہ علم قرآن میں تو سب برابر ہیں، اور حاکم کی صحیح الاسناد روایت میں بجائے فاعلمهم بالسنة کے فافقهم فقها کا جملہ ہے، یعنی فقہ میں سب سے زیادہ ہو، اور ابن الہمامؒ کو یہاں تردد ہوا ہے اس بناء پر کہ اس میں تو صراحت کے ساتھ قاری کو فقیہ پر ترجیح ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ شیخ ابن الہمامؒ کی نظر لفظ فقہ سے اس کے مشہور اصطلاحی معنی کی طرف گئی ہے، اس لئے انہیں یہ تشویش پیدا ہوئی ہے، تحقیق تو یہ ہے کہ عام طریقہ سے نصوص کی عبارتوں میں علم سے فقہ مراد ہوتی ہے، کیا تم کو اس بات سے بھی تنبیہ نہیں ہوتا ہے جو حدیث میں موجود ہے، کہ ہزار عابدوں سے ایک فقیہ شیطان کے لئے زیادہ سخت اور پریشان کن ہوتا ہے جیسا کہ ترمذی میں ہے، حالانکہ علم کے بغیر تو ہونا ناممکن ہے، اس لئے اس میں فقیہ کو عالم پر ترجیح دی ہے۔

الحاصل فقیہ تو وہی ہوتا ہے جو اسرار علم پر واقف ہو، چنانچہ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے اما آن لكم تفقهوا الخ یعنی امام کے پیچھے قرأت کرنے والوں کو فرمایا ہے کہ تم کو تمہارے فقہ کا وقت نہیں آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اعلمهم بالسنة سے مراد وہ حکمت ربانی ہے جو رسول اللہ ﷺ نے بتلائی ہے، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾ یعنی رسول اللہ ﷺ کو کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، پس کتاب قرآن اور حکمت ہی سنت ہے اسی کو فقہ کہو، کہ وہ تو عین حکمت ربانی ہے، اس تفصیل کی بناء پر ابن الہمامؒ نے اس جگہ جو طویل گفتگو فرمائی ہے وہ ساقط ہوگئی، اس کے علاوہ ایک عمدہ دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مرض وفات میں فرمایا تھا مروا ابابکر فلیصل اس کے اے لوگوں تم ابوبکر کو یہ پیغام پہونچا دو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھا دیں، حالانکہ ان سے بہتر قاری قرآن اس وقت موجود تھے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے اقرأ کم ابی یعنی ابی ابن کعب تم سب سے بہتر قاری ہیں، پس ابوبکر کو امامت کے لئے منتخب کرنے کی وجہ یہی ہوئی کہ وہ زیادہ فقیہ تھے حضرت ابوسعیدؓ کے اس قول کی وجہ سے کہ فكان ابوبكر اعلمنا یعنی رسول اللہ ﷺ کی وفات کے اشارہ کو ہم میں سے سوائے ابوبکر کے کسی دوسرے نے نہیں سمجھا، اور ابوبکرؓ کے رونے پر لوگوں کو حیرت ہوئی تو ابوسعیدؓ اقرار فرماتے ہیں کہ ابوبکرؓ ہم سب میں زیادہ عالم تھے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ دلیل بہت ہی قوی اور عمدہ ہے، اس میں یہ فقہ مضمر ہے کہ ابوبکر کا کمال حکمت ربانی کے علم کی وجہ سے تھا، اس جگہ جزئی مسائل کی زیادتی مراد نہیں ہے، اور یہی بات اظہر من الشمس ہے، اس سے زیادہ مزید گفتگو کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔م۔

فان تساووا فاورعهم، لقوله عليه السلام من صلى خلف عالم تقى فكانما صلى خلف بنى، فان تساووا

فاسنهم لقوله عليه السلام لابنى ابى مليكة: وليؤ مكما اكبر كما سنا، ولان فى تقديمه تكثير الجماعة.

ترجمہ:۔اگر وہ علم اور قرأت میں بھی برابر ہوں تو ان میں جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہوگا وہی مستحق امامت ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے پرہیز گار عالم کے پیچھے نماز پڑھی گویا اس نے ایک نبی کے پیچھے نماز پڑھی، اور اگر وہ پرہیز گاری کے اعتبار سے برابر ہوں تو ان میں زیادہ عمر والے زیادہ مستحق ہوں گے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ابوملیکہ کے دو بیٹوں کو فرمایا کہ تم میں جو بڑا ہو وہی امامت کیا کرے، اور اس لئے بھی کہ اس کو آگے بڑھانے سے جماعت کے افراد میں زیادتی ہوگی۔

توضیح:۔مسافر، مقیم، گھر میں مہمان وصاحب خانہ، مالک مکان، وکرایہ دار ومہمان امام محلّہ اور اس سے بہتر آدمی، امی وگونگے، محلّہ میں ایک ہی آدمی امامت کے قابل ہو، جس شخص کی امامت سے قوم کو نفرت اور کراہت ہو، مکروہ اور ناجائز اماموں کا بیان

فان تساووا فاورعهم......الخ

اگر جماعت میں شرکت کرنے والے تمام علم وقرأت میں مساوی ہوں تو ان میں جو اورع ہوگا وہی اولی ہوگا۔ف۔اورع سے ایسا شخص مراد ہے جسے ایسا کام جس میں شرعاً شبہہ ہو اگرچہ اس کا کرنا جائز ہو تو اس سے بھی پرہیز کرے لہٰذا جس کام کا کرنا عموماً مباح ہو اس سے بھی وہ پرہیز کرے، اور تقویٰ سے مراد ہے حرام چیزوں کے علاوہ مکروہ تحریمی جیسی چیزوں سے بھی بچنا۔

لقوله عليه السلام من صلى خلف عالم تقى فكانما صلى خلف بنى......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جس نے متقی عالم کے پیچھے نماز پڑھی گویا اس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی۔ف۔یہ حدیث نہیں ہے۔ع۔یعنی کسی نے نہیں پائی ہے، چنانچہ سخاویؒ کو نہیں ملی، اور ملا علی قاریؒ نے کہا ہے کہ یہ موضوع ہے، میں کہتا ہوں کہ اسے حدیث نہیں کہنا چاہئے، اگرچہ اس کے معنی پائے جاتے ہیں، کیونکہ عالم جو اورع ہو وہ کامل ہوتا ہے اور عالم وارث انبیاء ہوتے ہیں اس طرح گویا پیغمبر کے پیچھے نماز پڑھی، اور ابن الہمام اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ حاکم نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر تمہیں یہ بات اچھی معلوم ہوتی ہو کہ تمہاری نماز مقبول ہو تو تم میں سے جو بھی بہتر ہو اسے اپنا امام بناؤ، یہ روایت بھی اگرچہ ضعیف ہے لیکن بیہقیؒ وغیرہ کی روایتوں سے اس کی تائید ہوتی ہے، تو یہ اگرچہ ضعیف ہو مگر فضائل اعمال میں اس پر عمل ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے کہ صحیح حدیث میں اس کے بعد ہجرت کے مقدم ہونے کو اولیٰ کہا گیا ہے (لہٰذا اب بھی یہی حکم ہونا چاہئے) جواب یہ ہے کہ اب بالاتفاق فتح مکہ کے بعد سے مذکورہ ہجرت کا حکم ختم ہو گیا ہے، البتہ اب اگر کوئی مسلمان دارالکفر میں ہو تو وہ دارالاسلام میں ہجرت کر سکتا ہو یعنی وہ ہجرت جو اس حدیث میں ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ مہاجر کون ہے تو آپ نے فرمایا کہ جس نے اس کو چھوڑ دیا ہو جسے اللہ نے مکروہ رکھا ہو، یعنی گناہوں اور خطاؤں کو چھوڑنے والا مہاجر ہے، جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ میں موجود ہے، اسی لئے ہمارے علماء کرام نے اس حدیث ہجرت کے پیش نظر یہ فرمایا ہے کہ اس ہجرت میں سب سے مقدم وہی ہوگا جس میں ورع کا مادہ زیادہ ہو۔م۔

فان تساووا فاسنهم......الخ

اگر مذکورہ باتوں میں سب برابر ہوں تو وہ اولیٰ ہوگا جو ان میں عمر میں بڑا ہو۔ف۔کیونکہ قوم کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے

درمیان میں نمائندگی کرنے والا تو امام ہی ہوتا ہے، جیسا کہ طبرانی، دار قطنی اور بیہقی کی روایتوں میں ہے، اور جو عمر میں بڑا ہوتا ہے اسی کو درباروں میں مناجات اور مطلب پیش کرنے کے لئے بڑھانا سنت ہے صحیح روایتوں میں موجود ہے، اور سورہ فاتحہ بلکہ مقصود نماز ثناء باری تعالی، اظہار عاجزی اور دعاء والحاح ہے۔م۔

لقوله عليه السلام لابنى ابى مليكة: وليؤ مكما اكبر كما سنا......الخ

رسول اللہ علیہ السلام کے اس فرمان کی وجہ سے جس میں آپ نے ملیکہ کے دونوں بیٹوں کو مخاطب فرمایا ہے کہ۔ف۔ ملیکہ کے بیٹوں کو نہیں بلکہ مالک بن الحارث کے ساتھی کو مخاطب فرمایا ہے جیسا کہ کتاب الزکوۃ میں کہا ہے، جس کی روایت صحاح ستہ نے کی ہے کہ دونوں اذان دیں اور اقامت کہیں، لیکن تم میں جو بڑا ہو وہی امامت کرے۔

ولان فى تقديمه تكثير الجماعة......الخ

اور اس لئے بھی کہ بڑے، بزرگوں کو بڑھانے میں جماعت میں زیادتی ہوتی ہے۔ف۔ پہلے گذر چکا ہے کہ جماعت کی زیادتی اللہ کے نزدیک محبوب ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے، نیز دوسری حدیث میں بھی یہ ہے کہ جس نے ہمارے بڑے، بزرگوں کی عزت افزائی نہیں کی وہ ہم میں سے نہیں ہے، بس امام بنانے سے اس کی عزت افزائی ہی تو ہوتی ہے، بے ادبی نہیں ہوتی، پھر اگر عمر میں بھی سب برابر ہوں تو جوان میں اخلاق میں بہتر ہو وہ امامت کے لئے اولی ہوگا، کیونکہ حدیث میں ہے کہ خیارکم احسنکم اخلاقا یعنی تم میں جو لوگ اخلاق میں بہتر ہوں وہ تم میں اچھے ہیں، خلق سے مراد باقی طریقے اور باتیں ہیں، اور لوگوں کی شیطانی تکلفات مراد نہیں ہیں۔

یہ اچھی طرح یاد رکھو، پھر اگر سب برابر ہو تو ان میں جو سب میں بہتر ہو گا وہ مقدم ہوگا، اور اگر حسب کے اعتبار سے بھی سب برابر ہوں تو ان میں جو حسب میں بہتر ہو گا وہ مقدم ہوگا، اور اگر اس حسب کے اعتبار سے بھی سب برابر ہوں تو ان میں خوبصورت ہو گا وہ اولی ہوگا، اس موقع پر کافی نے اس کی تفسیر میں کہا ہے کہ جس کا چہرہ تہجد کی نماز کی زیادتی کی وجہ سے روشن ہو، مگر اس تفسیر کی کوئی حقیقت اور روشن اصلیت نہیں ہے، بلکہ اس کے ظاہری معنی مراد ہیں، پھر اگر خوبصورتی میں بھی سب برابر ہوں تو نسب کے اعتبار سے جو اشرف ہو گا وہ مقدم ہوگا، اور اگر سب اس میں بھی برابر ہوں تو قوم کو اختیار ہے کہ وہ جسے پسند کرلیں، یا قرعہ اندازی میں جس کا نام نکل آئے، اور کہا گیا ہے کہ مسافر امام کے مقابلہ میں مقیم اولیٰ ہوگا۔

خلاصہ میں ہے کہ قرأت کے وقت جسے کھانسی زیادہ آتی ہو اس سے بہتر وہ شخص ہوگا جسے کھانسی نہ آتی ہو، معمولی کھانسی آنے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، البتہ اگر زیادہ کھانسنے والا شخص لوگوں میں ایسا ہو کہ اسے محترم اور متبرک سمجھتے ہوں وہی افضل اور اولیٰ ہوگا، الفتح۔ اگر گھر میں صاحب خانہ کے ساتھ مہمان بھی موجود ہو تو صاحب خانہ امامت کے لئے زیادہ مستحق ہوگا البتہ اس صورت میں جبکہ ان میں بادشاہ یا حاکم اعلی یا قاضی ہو تو ان کو آگے بڑھادینا صاحب خانہ کے لئے اولی ہوگا لیکن اگر خود ہی امامت کرلے یہ بھی جائز ہوگا، اگر مالک مکان و کرایہ دار دباہر کے مہمان اکٹھے ہوں تو ان میں کرایہ پر لینے والا امامت کا مستحق ہوگا، التاتارخانیہ، جیسے عاریت پر لینے والا اولی ہوتا ہے۔ السراج۔ اگر امام محلہ سے بہتر آدمی جماعت میں موجود ہو تو بھی امام محلہ اولی ہوگا۔ القنیہ۔

گونگوں کے درمیان امی کی امامت بالاتفاق جائز ہے، کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور اس کے برعکس ہونے کی صورت میں کسی جگہ لکھا ہے کہ ہمارے علماء کے نزدیک جائز نہیں ہے، مگر خواہر زادہؒ نے لکھا ہے کہ خلاف اولی ہے، التاتارخانیہ، محلہ میں اگر ایک ہی شخص امامت کے لائق ہو اور وہ امامت نہ کرے تو گنہگار ہوگا۔ القنیہ۔ اگر کوئی شخص قوم کی مرضی کے خلاف زبردستی امامت کرتا ہو تو اگر واقعۃً اس میں کوئی خرابی ہو یا مخالفت کرنے والے اس سے اچھے ہوں تو ایسے شخص کا امام بننا مکروہ تحریمی ہے، اور اگر وہ مستحق امامت ہو تو قوم کا اس کی مخالفت کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ت۔د۔ آئندہ مکروہ اور ناجائز امامت کا بیان آتا ہے۔

ویکرہ تقدیم العبد، لانہ لایتفرغ للتعلم، والاعرابی لان الغالب فیھم الجھل، والفاسق لانہ لایھتم لامر دینہ، والاعمی لانہ لا یتوقی النجاسۃ، وولد الزناء لانہ لیس لہ اب یشفقہ فیغلب علیہ الجھل، ولان فی تقدیم ھؤلاء تنفیر الجماعۃ، فیکرہ، وان تقدموا جاز، لقولہ علیہ السلام: صلوا خلف کل بر وفاجر.

ترجمہ:- اور مکروہ ہے غلام کو امامت کے لئے آگے بڑھانا، کیونکہ علم کے لئے وہ فارغ نہیں ہوتا ہے، اور دیہاتی اعرابی کو بھی آگے بڑھانا کیونکہ ان میں اکثر جہالت ہوتی ہے، اور فاسق کو بھی کیونکہ وہ اپنے دینی معاملات میں اہتمام نہیں کرتا ہے، اور اندھے کو بھی کیونکہ وہ نجاست سے نہیں بچتا ہے، اور حرامی شخص کو بھی کیونکہ عموماً ایسے لوگوں میں بھی جہالت غالباً ہوتی ہے کیونکہ والد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شفقت نہیں پاتا ہے جس کی وجہ سے اچھی تعلیم اور اچھی صحبت پا سکے، اور اس وجہ سے بھی کہ عوام ایسے لوگوں کی امامت سے نفرت کرتے ہیں جس کی وجہ سے جماعت میں کمی آجاتی ہے، اسی لئے ان لوگوں کی امامت مکروہ ہوتی ہے، اور اگر ان میں سے کوئی امامت کرے تو صحیح ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر نیک اور صابر کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرو۔

توضیح:- غلام، دیہاتی، فاسق، اندھے اور حرامی کی امامت مکروہ ہے حدیث سے دلیل، اہل قبلہ کو کافر کہنا، اعتقاد میں خرابی، رافضی، جہمی، قدری مشبہ اور خطابیہ کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم، مترجم کی طرف سے وضاحت، حنفی کا شافعی کے پیچھے اور شافعی کا حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم

ویکرہ تقدیم العبد، لانہ لایتفرغ للتعلم......الخ

غلام کو امام بننے کے لئے آگے بڑھانا مکروہ ہے۔ف۔ اگرچہ وہ اس وقت آزاد کیا جا چکا ہو۔ الخلاصہ۔ق۔ کیونکہ وہ حصول علم کے لئے فرصت نہیں پاتا ہے۔ف۔ تاکہ نماز کے احکام و مسائل جان سکے، مگر یہ کراہت تنزیہی ہے، اور اگر وہ خود آگے بڑھ گیا ہو تو جائز ہے، کیونکہ اصل جائز ہونا ہے، جیسا کہ خلاصہ میں ہے۔

والاعرابی لان الغالب فیھم الجھل......الخ

اور اعرابی دیہاتیوں کو آگے بڑھانا بھی کیونکہ ان میں اکثر جہالت پائی جاتی ہے۔ف۔ اعراب سے بڑھ کر تیر کمان، ترکوں کی ایک قوم کرد، اور بے پڑھے گنوار ہوتے ہیں۔م۔د۔ جیسے جاٹ اور دوسری بہت سی قومیں ہیں، لیکن خلاصہ میں غلام، اعرابی، فاسق، اندھے اور ولد الزنا کی امامت کو جائز لکھا ہے۔ھ۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ یہ لوگ بھی ضروری مسائل و قرأت جانتے ہوں، کیونکہ امی کے پیچھے قاری کی نماز جائز نہیں ہوتی ہے، البتہ اس صورت میں جائز ہو گی جبکہ اعرابی اپنے ہی جیسے اعرابی کی امامت کرتا ہو۔م۔

والفاسق لانہ لایھتم لامر دینہ......الخ

اور فاسق کو بھی امامت کے لئے آگے بڑھانا مکروہ ہے، کیونکہ فاسق اپنے دینی امور میں کوئی اہتمام نہیں کرتا ہے۔ف۔ یہاں تک کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ اس کے پیچھے جائز نہیں ہے، والاعمی الخ اور اندھے کو بھی امام بنانا مکروہ ہے کیونکہ وہ ناپاکیوں سے احتیاط نہیں کر سکتا ہے۔ف۔ اپنے اندھے ہونے کی وجہ سے، چونکہ اسے نجاست کے لگنے کا احتمال ہوتا ہے اس لئے کراہت تنزیہی ہوتی ہے، اور اگر نجاست معلوم اور یقینی ہو تو مقتدی کی نماز صحیح نہ ہو گی، اس وقت جبکہ ایک درہم سے زیادہ نجاست لگی ہوئی ہو۔م۔ اعشیٰ (جس کو　　رتوندھی ہو وہ) اندھے جیسا ہے۔ النہر۔ لیکن اگر اندھا تمام لوگوں میں زیادہ عالم ہو تو وہی امامت کا زیادہ مستحق ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عبد اللہ بن ام مکتوم اور عتبان بن مالکؓ کو جو اندھے تھے انہیں رسول اللہ ﷺ نے جہاد کے لئے باہر جاتے وقت مدینے میں اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا، اور یہی حکم غلام کی امامت کا بھی ہے۔ البدائع۔ مل۔م۔

وولد الزناء لانه ليس له اب يشفقه فيغلب عليه الجهل......الخ

اس حرامی شخص یعنی ولد الزنا کو بھی امامت کے لئے آگے بڑھانے کا حکم ہے، کیونکہ اس کا باپ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی شفقت پدری سے محروم ہوگا جس کی وجہ سے تعلیم وتربیت سے وہ محروم ہوگا۔ف۔ امام شافعیؒ کا یہی قول ہے اور امام مالک کی یہ ایک روایت ہے، لیکن ان سے ایک دوسری روایت میں ہے کہ مکروہ بھی نہیں ہے، اور امام احمد اور امام منذرؒ کا یہی قول ہے۔ع۔ لیکن اگر ان میں جہالت نہ ہو جب بھی ان کی امامت کراہت سے خالی نہیں ہے۔

ولان تقديم هؤلاء تنفير الجماعة، فيكره......الخ

کیونکہ ان پانچوں قسموں میں سے کسی کو بھی امام بنانے سے جماعت میں شریک ہونے والوں کو نفرت دلانا ہے۔ف۔ لہذا ان کو امام بنانے میں کراہت ہوگی، پھر یہ کراہت بھی اسی صورت میں ہوگی جبکہ ان سے بہتر دوسرا کوئی امامت کے لائق مجمع میں موجود ہو، ورنہ کوئی کراہت بھی نہ ہوگی۔ بحث البحر۔

وان تقدموا جاز، لقوله عليه السلام: صلوا خلف كل بر وفاجر......الخ

اور اگر یہ آگے بڑھ بھی جائیں تو جائز ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے **صلوا خلف كل بر و فاجر** کہ ہر نیکوکار اور بدکار کے پیچھے نماز پڑھ لو۔ف۔ یہ حدیث دار قطنی نے روایت کی ہے، اور راویوں کو ثقہ کہا ہے، لیکن منقطع ہے، اس لئے مذکورہ کراہت تنزیہی ہوگی، جیسا کہ مجتبیٰ میں اصل سے نقل کیا ہے، اور حضرت ابن عمر و انس وغیرہ صحابہ کرام نے حجاج ثقفی کے پیچھے نماز پڑھی ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ نے ولید بن عقبہ کے پیچھے نماز پڑھی جس نے ایک دن نشہ کی حالت میں نماز پڑھائی ہے، اور محیط میں ہے کہ فاسق ومبتدع کے پیچھے بھی جماعت کا ثواب ملتا ہے۔ع۔ لیکن متقی کے پیچھے پڑھنے سے جو ثواب ملتا ہے وہ ثواب ان کے پیچھے پڑھنے سے نہ ملے گا۔ الخلاصہ۔

اسلام کے اعتقادی مسائل میں جو فرقہ گمراہی میں مبتلاء ہے اگر ان کی گمراہی کفر کی حد تک نہ پہونچی ہو تو ایسے بدعتیوں کے پیچھے بھی کراہت کے ساتھ نماز جائز ہے، ورنہ بالکل جائز نہیں ہے۔ الخلاصہ والتبیین۔ اور یہی قول صحیح ہے۔ البدائع۔ واضح ہو کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ سے اہل قبلہ کو کافر نہ کہنا مروی ہے، اہل قبلہ سے مراد وہ شخص ہے جس کی صفت وہ ہو جو حدیث میں آیا ہے کہ جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کا استقبال کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا، اور شمنیؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس دین حق کی تعلیم دی ہے اس کے خلاف صرف عارضی شبہ پیدا کر کے کوئی بات پیدا کر لینا خواہ اعتقاد سے متعلق ہو یا عمل سے متعلق ہو یا حال سے ہو اسے دین اور صراط مستقیم ٹھہرالینا بدعت ہے، اور میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر اس شخص کا اعتقاد درست ہو لیکن عملی خیر کی قسم میں سے ایسا کوئی عمل اس نے نکالا ہو جو بدعت ہو تو اس شخص کے پیچھے نماز کے جائز ہونے میں سلسلہ میں میں نے اختلاف نہیں دیکھا ہے، البتہ کچھ غیر مقلدین اس زمانہ میں ایسے ہیں جو علم وفقہ سے جاہل ہونے کے باوجود کافر قرار دیتے ہیں، اور اگر کسی کے اعتقاد میں خرابی ہو پھر وہ اگر ضروریات دین کا انکار کرتا ہو تو وہ شخص کافر ہوگا، اور اگر اس مسئلہ میں تھوڑا کسی قسم کا اشکال ہو لیکن توحید کے بارے میں خلل نہ ہو تو اس کو کافر کہنا جائز نہ ہوگا۔

پھر بہت سے ایسے بدعتی ہیں جن کے پیچھے نماز جائز نہ ہونا مروی ہے، اسے کچھ تفصیل سے ابھی ذکر کر دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا ہوں اس لئے ذکر کرتا ہوں وہ یہ ہے، ہندیہ میں ہے کہ رافضی، جہمی، قدری، مشبہ اور جو قرآن کے مخلوق ہونے کے قائل ہوں ان کے پیچھے نماز جائز ہے۔ الخلاصہ۔ خطابیہ کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے۔ الفتح۔ یہاں رافضی سے وہ فرقہ مراد ہے جن نے ابو بکر صدیقؓ کی صحبت کا انکار کیا ہو، اور خطابیہ وہ عقیدے کے اعتبار سے انتہا درجہ کے رافضی ہیں جو اپنوں کے لئے جھوٹ بولنے کو بھی جائز سمجھتے ہوں، اس لئے ان کی گواہی قابل قبول نہیں ہوتی ہے، قدری وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو ہر کام پر قادر کہتے ہوں، مشبہہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں وغیرہ رکھنے میں مخلوق کے مشابہہ کہتے ہیں۔م۔

ایسے بدعتی کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے جو شفاعت یا دیدار الٰہی یا عذاب قبر یا کراماً کاتبین کا منکر ہو کیونکہ یہ کافر ہے کیونکہ یہ ساری باتیں شارع علیہ السلام سے بطریق توارث ثابت ہیں، اگر کوئی یہ کہے کہ رب العزت عزوجل بروز قیامت اپنی بڑائی اور بزرگی کی وجہ سے دکھائی نہیں دے گا تو وہ بدعتی ہے، مگر میرے نزدیک دلیل کے اعتبار سے یہ مشکل ہے، اگر کوئی کہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں بندوں جیسے ہیں تو وہ کافر اور ملعون ہے، اور اگر کوئی کہے کہ اسے جسم ہے مگر کسی دوسرے جسم کی طرح نہیں ہے تو وہ بدعتی ہے کیونکہ جسم ثابت کرنے سے کچھ وہم پیدا ہوتا تو استثناء کر کے اس وہم کو دور کر دیا ہے کہ کسی اور جسم کے مانند نہیں ہے، اس طرح اس میں صرف ایک وہم باقی رہا جو عذاب کا سبب ہے، اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اس طرح کہنے سے بھی وہ کافر ہو جائے گا، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اچھا ہے اور ایسے بدعتی کو بدرجہ اولیٰ کافر کہنا چاہئے، روافض میں سے جس کسی نے حضرت علیؓ کو دوسرے تینوں خلفاء پر فضیلت دی تو وہ بدعتی ہوگا، اور اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ یا حضرت عمرؓ کی خلافت کا انکار کیا تو وہ کافر ہے۔ فتح القدیر میں ایسا ہی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ شیخ نے لکھا ہے کہ ابو بکر صدیقؓ یا عمر فاروقؓ کی خلافت کا جس نے انکار کیا وہ کافر ہے، اور شیخ الاسلام عینیؒ نے ذکر کیا ہے کہ عادل رافضی جسے کافر کہا جاتا ہے ایسا شخص ہے حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت کا منکر ہو، یہی قول اصحاب شافعیؒ کا بھی ہے، لیکن قفال اور ان کے متبعین نے کہا ہے کہ ان لوگوں کو کافر نہیں کہنا چاہئے، اور امام شافعیؒ کا ظاہر مذہب یہی ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر حضرت ابو بکر صدیقؓ کی خلافت میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ شیخ ابن الہمامؒ نے لکھا ہے، لیکن اصل قول یہ ہے کہ جو شخص حضرت ابو بکرؓ کو صحابی یا رسول اللہ ﷺ کی صحبت پانے کا منکر ہو وہ کافر ہے کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ﴾ الایۃ، میں یقینی اور قطعی طور صحبت کا ثبوت ہے اس لئے اس کے انکار سے کفر لازم آئے گا، میں مترجم کہتا ہوں کہ صحبت صدیق کی طرح خلافت صدیق پر بھی اجماع قطعی ہے لہٰذا دونوں میں فرق کرنا مشکل ہے، اس کے علاوہ آیات اور صفات الٰہی بھی قطعیات میں ہیں حالانکہ ان میں تاویل کرنے کو معتبر مانا گیا ہے تو یہاں بھی روافض میں انکار کرنے والے تاویل کرتے ہیں پس، ممکن ہے کہ کفار اور تکفیر کے دونوں میں فرق ہو، مزید بحث بعد میں آئے گی۔ م۔

معراج کا منکر اگر آیت ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْۤ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا﴾ کا منکر ہو تو وہ کافر ہے یعنی مسجد الحرام سے اقصیٰ تک سفر قطعی اور قرآن سے ثابت ہے، اور اس میں سے اوپر معراج کا انکار کرنے والا بدعتی ہے۔ الخلاصہ۔ میں کہتا ہوں کہ اوپر معراج کا بیان بھی مشہور اخبار میں موجود ہے اگرچہ ان کی تفصیل آحادیث میں ہے، جیسا کہ ہم نے ان کو اپنی تفسیر میں بیان کر دیا ہے اور یہی بات ایک سے زیادہ مفسرین نے بیان کی ہے، لہٰذا اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔ امام محمد بن الحسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ اور ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے کہ خواہشوں کے بندوں یعنی بداعتقادیوں کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، اور ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ متکلمین کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، اگرچہ تکلم حق کرتا ہو۔ فع۔

متکلمین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اسلامی عقائد کو عقلی دلائل کے موافق کرتے ہوں، یا عقلی قیاس کرنے والوں کے مقابلہ میں ثابت کرتے ہوں، اس بناء پر جو کوئی دلائل سے حق کی حفاظت کرتا ہو وہ متکلم نہیں سمجھا جائے گا، جیسا کہ بہت سے بزرگان دین نے نفسانی خواہشات کے متبعین کے اقوال کا جواب دیا ہے، مزید یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ امام ابو حنیفہؒ کی امام شافعیؒ سے اہل قبلہ کو کافر نہ کہنے کی بھی روایت موجود ہے، اسی طرح کافر کہنے کی بھی روایت موجود ہے، اس لئے اختلاف کو دور کرنے کے لئے ابن الہمامؒ نے اس طرح توفیق دی ہے کہ ایسے جس معنی کا اعتقاد کیا وہ اعتقاد خود کفر ہے، اس لئے اس کا قائل کفر کا قائل ہوا، مگر اسے اس لئے کافر نہیں کہا ہے کہ اس نے اپنے طور پر سمجھنے کی پوری کوشش کی اور آخر میں اسے یہی بات حق معلوم ہوئی ہے، اس کے بعد شیخ نے یہ بھی کہا ہے کہ ان حضرات نے اس کے پیچھے پڑھی ہوئی نماز کو باطل قرار دیا ہے، پس اس کہہ لینے کی وجہ سے دو متضاد مفہوم میں توفیق دینے کی کوشش درست ثابت نہیں ہوئی ہے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ شاید ان کی مراد یہ ہو کہ اگرچہ نماز

صحیح ہو جاتی ہے مگر ایسے شخص کے پیچھے پڑھنا صحیح بھی نہیں ہے۔ فتح القدیر کے مفہوم کا یہ خلاصہ ہوا۔
اور بحر الرائق میں ابن نجیمؒ نے یہ عہد کیا ہے کہ جن مسائل میں تکفیر کی گئی ہے میں ان میں سے کسی پر بھی فتویٰ نہیں دوں گا، میں مترجم کہتا ہوں کہ میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ واللہ اعلم بالصواب کہ رسول اللہ ﷺ نے کفر کے غلبہ کو ختم کرنے کے لئے جہاد کیا، اور کافروں کے سامنے یہ اعلان کیا کہ اگر وہ اسلام کی اطاعت کر لیں تو ان کی جان و مال کی حفاظت کی جائے گی، اس کے بعد ان میں کچھ لوگ منافق ہو گئے تھے جو ظاہر میں تو مسلمان تھے مگر اندرونی طور پر وہ کافر اور منافق تھے مگر انہیں عام مومنین پہچانتے تھے اس کے باوجود ان سے نہ تو جہاد کیا گیا اور نہ ہی ان سے جزیہ لیا گیا، مسلمانوں کا مقصد ان سے ایک حد تک حاصل ہو رہا تھا کہ ان کے شر و فساد سے امن تھا، اور چونکہ انہیں ظاہری اسلام سے خارج نہیں کیا گیا تھا اس لئے ان کی طرف سے اختلاف اور پھوٹ کا ضرر اور فتنہ وغیرہ کا اثر ظاہر نہیں ہوتا تھا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس شخص کو کافر نہیں کہا جائے گا جس کے بارے میں حدیث میں ہے کہ جس نے ہماری نماز پڑھی اور ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا اور ہمارا ذبیحہ کھایا تو وہ مسلم ہے اس کے لئے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے، اسی فرمان کی اتباع میں امام ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ نے کسی اہل قبلہ کے اسلام سے خارج کرنے کا فتویٰ نہیں دیا ہے، لیکن اس سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ وہ حقیقت میں بھی مومن ہے، اس کے علاوہ اس حدیث سے فقہاء کی مراد یہ ہے کہ وہ تمام امور جو اس دین کے ظاہری طور پر ضروری ہیں ان میں سے کسی امر کا بھی وہ مخالف نہ ہو، اس بناء پر اگر کسی فرقہ نے ایسے کسی امر میں اختلاف کیا جس کا اس دین میں ہونا ضروری ہے تو اس کی تکفیر کا حکم ہوگا اور کافر کہا جائے گا، اور کچھ امور ایسے بھی ہیں جن کی ضروری ہونے یا نہ ہونے میں ائمہ کا اختلاف ہے تو مجموعی طور پر جب تک ضروریات دین پر قائم ہے اس کی تکفیر نہیں ہوگی، لیکن اس کے اسلام کا حکم ظاہری طور پر ہوگا، اور کچھ امور ایسے ہیں کہ ان کا دین توحید میں سے ہونا یا نہ ہونا ضروری ہے اگرچہ ظاہری طور سے دین کی ضروریات میں سے نہ ہو تو ان کے انکار پر کفر کا حکم نافذ ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ امور کفریہ ہیں اور ان کا قائل کفر کا قائل ہے اگرچہ گذشتہ نص کی وجہ سے ظاہر ضروری نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تکفیر نہ کی جاتی ہو، یہ تفصیلی بحث اس مقصود کے پیش نظر ہے جو گذر چکی ہے۔
اب اسلام کا دوسرا مقصود رضائے الٰہی اور حقیقی معارف اور آخرت میں بڑے درجات کا حاصل ہونا ہے تو ان کے حاصل ہونے کے لئے صحیح اور سچے اعتقادات کے ساتھ طاعات کا ہونا ضروری ہے، جن میں اعلیٰ درجہ کی عبادت نماز ہے، اور اس سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ امام مقتدیوں کی طرف سے باری تعالیٰ کے دربار میں سربراہ اور اس کی قرات مقتدی کی قراءت ہے بلکہ امام ان لوگوں کی نماز کا ضامن ہے، اس لئے وہی شخص امام ہوگا جو سنت اور صراط مستقیم پر قائم ہو، اگر ایسا مکمل شخص نہ ملے تو اس سے قریب تر ہو اور کم ہو کر آخر حد یہ ہو کہ اس میں صرف عملی طور سے فسق و فجور ہو جو ایک قسم کا کفران بھی ہے، مگر یہ حد تو نہ ہو کہ اس کے اعتقاد میں باطنی طور سے بھی کفر ہو، اس لئے جس شخص کے اعتقاد میں کفر ہو اس کو امام بنا کر اپنی طرف سے بارگاہ الٰہی میں لانا جائز نہیں ہے حالانکہ فاجر کے پیچھے نماز جائز ہے؛ اور وہ روحانی توجہ جو صراط مستقیم اور سبل حادہ (دشوار گذار راستہ) میں فارق ہے وہ حق توحید ہے، پس معتقد توحید کا رخ قطعی طور سے صراط مستقیم ہے، اور اعمال تو نازل طے کرنے کے لئے توشہ و زاد راہ ہے، اور مخالف توحید کی توجہ روحی یقیناً اس کے برخلاف ہے اگرچہ اس کے لئے زاد راہ بظاہر نماز و روزہ بکثرت ہو، اور الحمد للہ کہنے کا حق اسی کو ہوگا جو معتقد توحید ہوگا، اور موحد کے لئے الحمد للہ کہنے کا حق برحق ہے، اور جو باطل عقیدہ کا قائل ہو جیسے کسی ایسے نصرانی کی توحید جس کا یہ عقیدہ ہو کہ عیسیٰ کا بھی باپ ہے اور اس کی نسبت اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف کرتا ہو وہ اس کی جناب میں عظمت کے لائق نہیں ہے ایسے شخص کا عقیدہ بالکل باطل ہے، اس جگہ آیات و احادیث سے استنباط کئے ہوئے بہت سے دقائق علوم اور حقائق معارف ہیں لیکن اس کے لئے کافی غور و فکر اور تذکرہ و تدبر کی ضرورت ہے۔
اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ائمہ کرامؒ کی دونوں روایتیں حق اور صحیح ہیں، اور بندہ مترجم کو بھی اللہ کی جانب سے

اس کی سمجھ عطا کی گئی ہے، اگر اس نے کوئی غلطی کر لی ہو، ویسے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ **فوق کل ذی علم علیم و ان اللہ تعالی ھو اعلم بالصواب**، ہر جاننے والے سے دوسرا زیادہ جاننے والا ہے، اور صحیح بات کا خدا ہی عالم ہے، حنفی شخص کا شافعی المذہب کے پیچھے نماز پڑھنے کے بارے میں فتح القدیر میں ہے کہ کچھ ان شرطوں کے ساتھ جائز ہیں جنہیں ہم باب الوتر میں لکھیں گے، عینیؒ نے ان میں سے کچھ ذکر کی ہیں جن کا ماحصل یہ ہے کہ جن باتوں میں اختلاف ہے مثلاً پیشاب و پائخانہ کے راستوں کے علاوہ کسی اور جگہ سے اگر خون نکلا تو ہمارے نزدیک وضوء ٹوٹ گیا اور اس پر وضو یا تیمم کر کے دوبارہ پاک ہونا ضروری ہے، لیکن شوافعؒ کے اجتہاد میں وضوء نہیں ٹوٹا، ایسی صورت میں اگر وہ وضوء کر لیتا ہو اور منی کو دھو ڈالتا ہو۔

الحاصل اختلافی مسائل میں اگر وہ رعایت نہ رکھتا ہو تو قول اصح کے مطابق اسی کی اقتداء جائز نہ ہو گی، اور اگر رعایت کرتا ہو تو جائز ہو گی، لیکن کفایہ و نہایہ میں تمرتاشیؒ سے نقل کیا ہے کہ رعایت کرنے کی صورت میں بھی مکروہ ہے، اور بحر الرائق میں کہا ہے کہ اگر اختلافی مواقع میں رعایت رکھنے کا یقین ہو تو اس کی اقتداء مکروہ بھی نہ ہو گی اور اگر شک ہو تو مکروہ ہے، اور اگر رعایت نہ رکھنا ہی یقینی ہو تو اقتداء صحیح نہ ہو گی، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس مسئلہ کی مزید تفصیل باب الوتر میں آئے گی، اور شوافعؒ نے بھی احناف کے پیچھے نماز پڑھنے کی ایسی ہی شرطیں لگائی ہیں، ملا علی قاری حنفیؒ نے فرمایا ہے کہ جس طرح شافعیہ ہمارے ساتھ برتاؤ کریں گے ہم بھی ان کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کریں گے، میں مترجم انتہائی افسوس و حیرت کے ساتھ یہ اقوال دیکھتا ہوں اور باری تعالی جل شانہ کے دربار میں درخواست کرتا ہوں کہ اے ارحم الراحمین مجھے بخش دے اور ہدایت فرما کر دل کجی اور زیغ سے محفوظ فرمائے اور ایمان پر خاتمہ بخیر فرمائے۔

اب اس مسئلہ کے متعلق میں مزید گفتگو کرتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ حق صریح تو یہ ہے کہ دونوں جماعتوں کی دلیل ایک ہی ہے یعنی وہی قرآن واحد اور وہی حدیث رسول ہے، اب اگر اختلاف ان میں ہے تو وہ صرف اجتہادی مواد میں ہے، جبکہ ظنی چیزوں پر عمل قطعی نہیں بلکہ واجب ہوتا ہے اور نتیجہ میں وہ صرف ثواب ملتا ہے، ساتھ ہی یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ ہر اجتہاد میں غلط اور صحیح ہونے کا باقی رہتا ہے، تو اگر کسی حنفی یا شافعی نے صحیح اجتہاد کئے بغیر کوئی فتوی دیا تو وہ باطل ہے اور اگر صحیح طور سے اجتہاد کر کے نماز ادا کی تو سب کی نماز صحیح ہو گی، اس لئے مطلقاً ہر ایک کا دوسرے کے پیچھے اقتداء کرنا بغیر کسی شرط کے صحیح ہو گا، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اختلافات تو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ کرام میں بھی تھے، پھر بھی ایک دوسرے کی اقتداء کرتے تھے، اور ان میں سے کسی نے بھی اس قسم کی شرطیں نہیں لگائی تھی، اسی طرح دونوں مجتہدوں کے طریقہ اجتہاد پر دونوں طرف اولیاء اللہ بھی ہوا کرتے تھے چنانچہ ان میں شیخ امام قطب جو سید عبد القادر جیلانی کے نام سے مشہور ہیں وہ حنبلی تھے، تو کیا ہمارے حنفی علماء ان حضرات قطب گیلانیؒ کی اقداء کو مکروہ جانتے تھے، اور اب بھی مکروہ جانیں گے، تو جبکہ ان بزرگ ہستی کی دوسرے مسلک کے امام کی اقتداء میں درست ہو سکتی ہے تو اس بیچارے مقتدی کی بھی نماز دوسرے مسلک کے امام کے پیچھے درست نہ ہو گی، اس لئے جو شخص اس اقتداء کا مخالف ہو وہ سلف صالحین کا مخالف ہو گا، کیا ایسے لوگ مومنوں کی جماعت میں پھوٹ ڈالنے سے نہیں ڈرتے کہ ایسا کرنا حرام ہے۔ **فاتقوا اللہ لعلکم تفلحون** کہ تم اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پالو، انشاء اللہ اس مسئلہ میں عنقریب اور بھی آئندہ بحث ہو گی۔ م۔

خصی اور بغیر ختنہ والے شخص اور مابون یعنی جسے لواطت کرانے کی عادت ہو ایسے لوگوں کو امام بنانا مکروہ ہے۔ ع۔ امرد کو بھی امام بنانا مکروہ ہے البتہ اس صورت میں صحیح ہے جبکہ وہ عالم اور افضل ہو۔ ش۔ اور سفیہ یعنی بے وقوف اور مفلوج اور جس کے بدن کے زیادہ حصے پر مرض یعنی سفیدی کی بیماری ہو اور شراب خور، سود خور، چغل خور، ریاکار، اور بننے والے، بناوٹ کرنے والے یعنی وہ شخص جو مثلاً وضوء وغیرہ میں بتکلف بناوٹ کرے، اور اجرت یا تنخواہ پر امامت کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھنی مکروہ ہے۔ حق د۔ اسی طرح جس شخص سے دینی معاملات میں خصومت اس کو بھی امام نہیں بنانا چاہئے، البتہ وہ خود مقتدی بن جائے تو

جائز ہے، ظہیریہ میں ہے کہ سیدھے لوگوں کے لئے کبڑا امام ہونا مکروہ ہے اور یہی قول اصح ہے۔ مع۔ اور شیخین کے نزدیک جائز ہے۔ الکفایہ۔ اور اگر امام کا قدم اس طرح ٹیڑھا ہو کہ اس کے کسی حصہ پر کھڑا ہو تو اس کا امام ہونا جائز ہے البتہ کوئی دوسرا شخص اس سے بہتر ہو تو اسی کی امامت بہتر ہو گی۔ التبیین۔

ولا يطول الامام بهم الصلوة لقوله عليه السلام من ام قوما فليصل بهم صلوة اضعفهم، فان فيهم المريض والكبير و ذا الحاجة، ويكره للنساء ان يصلين وحدهن الجماعة، لانها لاتخلوا عن ارتكاب محرم، وهو قيام الامام وسط الصف فيكره كالعراة، وان فعلن قامت الامام وسطهن لان عائشه فعلت كذلك، وحمل فعلها الجماعة على ابتداء الاسلام، ولان فى التقديم زيادة الكشف.

ترجمہ:-اور امام اپنے مقتدیوں کے ساتھ اپنی نماز کو زیادہ دراز نہ کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص لوگوں کی امامت کرے تو اسے چاہئے کہ ان میں سے کمزوروں کے انداز سے نماز پڑھائے کیونکہ ان میں بیمار، بوڑھے اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں، اور عورتوں کے لئے یہ بات مکروہ ہے کہ صرف وہی جماعت کریں، کیونکہ عورتوں کی جماعت ارتکاب حرام سے خالی نہیں ہوتی، اور اس کراہت کی وجہ یہ ہے کہ ان کے امام کا ان کے صف کے بیچ میں کھڑا ہونا تو یہ جماعت کریں تو ان کی امام عورت ان کے بیچ میں کھڑی ہو، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے اسی طرح کیا ہے، اور ان کی جماعت کے عمل کو ابتدائے اسلام پر محمول کیا جائے گا، اور اس لئے کہ آگے بڑھنے میں کشف عورت زیادہ ہوتی ہے۔

توضیح:-امام کا نماز میں طول دینا، عورتوں کی جماعت

ولا يطول الامام بهم الصلوة لقوله عليه السلام من ام قوما فليصل بهم صلوة اضعفهم......الخ

امام مقتدیوں کے ساتھ نماز کو طول نہ دے۔ ف۔ اس طرح سے کہ قرأت کو مقدار مسنون سے زیادہ نہ پڑھے، یا کسی وقت اور کسی جگہ مختصر کرنے کی ضرورت ہو پھر بھی مختصر نہ کرے۔ الجوہر۔ د۔ ف۔ اس وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے من ام قوما الخ کہ جو شخص کسی قوم کا امام بنے تو ان نمازیوں میں جو سب سے کمزور ہوں ان کا لحاظ کر کے نماز پڑھائے۔ ف۔ اور صحیح کی روایت میں ہے کہ جو لوگوں کو نماز پڑھائے وہ تخفیف کرے۔

فان فيهم المريض والكبير و ذا الحاجة......الخ

کیونکہ ان میں بیمار و بوڑھے اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔ ف۔ اور جب تنہا پڑھے تو جس قدر چاہے طول دے، امام کا نماز کو طول دینا مطلقاً مکروہ تحریمی ہے، یعنی خواہ اس سے قوم راضی ہو یا نہ ہو، کیونکہ تخفیف کا حکم مطلقاً ہے۔ النہر۔ مقدار مسنون میں تطویل نہیں ہے، جیسا کہ المحیط میں ہے، مگر کسی ضرورت کے موقع پر، کیونکہ نماز فجر میں قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ کر نماز ختم کر دی ہے، مف۔ حاصل یہ ہوا کہ امام پر لازم ہے کہ اپنے مقتدیوں کی رعایت کرے، اور اس مسئلہ میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مع۔

ويكره للنساء ان يصلين وحدهن الجماعة، لانها لاتخلوا عن ارتكاب محرم......الخ

اور مکروہ ہے یعنی مکروہ تحریمی ہے۔ ف۔ د۔ صرف عورتوں کو بغیر مرد کی موجودگی کے نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی مکروہ ہے۔ ف۔ خواہ فرض نماز ہو یا نفل و تراویح ہو، لانها الخ یعنی عورتوں کی ایسی جماعت مکروہ تحریمی کے ارتکاب سے خالی نہیں ہے، یعنی یہ کہ عورتوں کی امام جو خود بھی عورت ہو وہ جماعت کی صورت ان کی صف میں بیچ میں کھڑی ہو گی اور آگے نہیں بڑھے گی، حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہی تھا کہ آپ صف سے آگے ہو کر کھڑے ہوتے تھے، پس اس عمل سے امام کا آگے کھڑا ہونا واجب ثابت ہوا، اور عورتوں کی امام اس عمل کے برخلاف درمیان صف کھڑی ہو گی جیسا کہ ابتدائے اسلام میں کھڑے

ہونے کا حکم تھا، تاکہ شرمگاہ پر دوسروں کی نظر نہ پڑے، الحاصل صرف عورتوں کی جماعت مکروہ ہوگی جیسا کہ ننگے مردوں کی جماعت مکروہ ہوتی ہے، اس لئے وہ تنہا تنہا نماز ادا کریں، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، لیکن نماز جنازہ میں مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ت۔ بلکہ عورتیں بھی جنازہ کی نماز جماعت سے پڑھیں، کیونکہ اس کی نماز بار بار پڑھنا شرعاً ثابت نہیں ہے، اور صرف ایک شخص کی ادائیگی سے فرض ادا ہو جائے گا، اور اگر نماز جنازہ میں مردوں کی امامت کوئی عورت کرے تو بھی فرض ادا ہو جائے گا، اور دوبارہ نماز پڑھانے کی ضرورت نہیں ہوگی، لیکن اگر مرد امام ہو اور اس کے پیچھے مرد و عورت مقتدی ہوں اسی صورت میں کسی عذر کی وجہ سے امام نے کسی عورت کو اپنا قائم مقام بنا دیا تو سب کی نماز فاسد ہو جائے گی۔د۔

وان فعلن قامت الامام وسطهن لان عائشه فعلت كذلك.....الخ

اور اگر عورتوں نے مکروہ تحریمی ہونے کے باوجود جماعت کرنی چاہی تو ان کی عورت امام ان کے بیچ میں کھڑی ہوگی، کیونکہ ام المؤمنین عائشہؓ نے اسی طرح کیا ہے۔ف۔ اس دلیل پر یہ اعراض ہوتا ہے کہ پھر اس جماعت کو مکروہ کیونکہ کہا گیا ہے تو اس کا جواب اس عبارت سے دیا گیا ہے۔

وحمل فعلها الجماعة على ابتداء الاسلام.....الخ

کہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے عمل جماعت کو ابتدائے اسلام پر محمول کیا گیا ہے۔ف۔ یعنی بعد میں فسخ کر دیا گیا ہے، ولان الخ اور اس وجہ سے بھی کہ امام کا صف کے بیچ میں کھڑی ہونے کی بجائے آگے بڑھ کر کھڑی ہونے میں زیادہ ستر کھلنے کا بہت احتمال ہے۔ف۔ جبکہ حتی الامکان اسے کم کرنا واجب ہے، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام اگر آگے بڑھ کر کھڑی ہو تو یہ فعل مکروہ تحریمی ہے۔م۔ف۔ پھر بھی اگر امام آگے بڑھ کر کھڑی ہو جائے تو نماز فاسد نہ ہوگی۔الجوہرہ۔

اس مسئلہ کی وضاحت اس طرح سے ہوتی ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک عورتوں کی جماعت مستحب ہے، اور ہمارے نزدیک مصنفؒ نے ہدایہ میں مکروہ تحریمی کہا ہے، اور انزاریؒ نے شرح غایۃ البیان میں اسے بدعت کہا ہے، لیکن شیخ الاسلام عینیؒ اور محقق ابن الہمامؒ نے اسے رد کر دیا ہے۔

مختصر یہ ہے کہ حضرت ام ورقہ بنت عبداللہ بنت الحارث بن عمیر الانصاریہؓ کی حدیث جو ابوداؤد میں مروی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ عورت قرآن پاک پڑھی ہوئی تھی ان کی درخواست پر رسول اللہ ﷺ نے ان کے گھر کے لئے ایک موذن مقرر کر دیا اور انہیں حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کریں، اور حاکم کی روایت میں ہے نماز فرائض کے بیان میں عبدالرحمٰن راوی نے کہا ہے کہ میں نے ان کے موذن کو دیکھا ہے جو بہت بوڑھے آدمی تھے، اور ان عورت کو شہادت کی خوشخبری بھی آپ نے دیدی تھی اسی وجہ سے وہ شہیدہ کہلاتی تھی۔ چنانچہ وہ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں اپنے مدبر غلام و باندی کے ہاتھوں ظلماً شہید ہو گئی تھی، دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور اس روایت کی اسناد میں ولید بن جمیع عن عبدالرحمٰن بن خلاد ہے، بعضوں نے کہا ہے کہ ابن حبان نے ولید کے بارے میں کلام کیا ہے، مگر یہ کلام مردود ہے، کیونکہ امام مسلمؒ نے اس سے حدیث روایت کی ہے اور یہی کافی ہے، اور ابن معین و عجلی نے اسے ثقہ کہا ہے، اور احمد و ابوزرعہ نے کہا ہے کہ اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، اور ابو حاتم نے کہا ہے کہ یہ صالح الحدیث ہے، اور خود ابن حبانؒ نے دونوں کو ثقہ لکھا ہے۔

عبدالرزاق و شافعی اور ابن ابی شیبہؒ نے روایت کی ہے کہ ام المومنین ام سلمہؓ نے عورتوں کی امامت کی ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر اور یہی بات عبدالرزاق نے ابن عباسؓ سے اور ابن عدیؒ نے اسماء بنت ابی بکرؓ سے روایت کی ہے، اور صحیح میں حضرت ام المومنین عائشہؓ کے لئے ایک موذن لڑکے کا ہونا مذکور ہے، حاکم نے روایت کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرض نمازوں میں عورتوں کی امامت کی ہے ان کے بیچ میں کھڑے ہو کر، لیث بن ابی سلیم ثقہ راوی ہیں، امام مسلمؒ نے ان کے حوالہ سے روایت کی ہے، اور یہاں بھی ابن ابی شیبہ کی روایت میں ابن ابی لیلیٰ کی متابعت موجود ہے، ابن حزم نے محلی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ

نے عورتوں کو بلند آواز سے مغرب کی نماز پڑھائی ہے، اسی طرح ام سلمہؓ نے عصر کی نماز پڑھائی، امام محمدؒ نے آثار میں سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عائشہؓ رمضان میں عورتوں کی صف کے بیچ میں کھڑی ہو کر انہیں پڑھاتی تھیں، عینیؒ نے کہا ہے کہ امام کے بیچ میں کھڑا ہونا مردوں کے حق میں مکروہ ہے، عورتوں کے لئے مکروہ نہیں ہے، حالانکہ یہ آثار موجود ہیں، اور یہ جو کہا گیا ہے کہ یہ فعل ابتدائے اسلام کا تھا، عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ تو احادیث و تواریخ سیرت سے ناواقفیت کی بناء پر ہے۔

سروجیؒ نے کہا ہے کہ ابتداء اسلام کہنا سمجھ سے بعید ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نبوت کے بعد ۱۳ برس تک مکہ میں رہے، جیسا کہ بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے، پھر مدینہ آکر حضرت عائشہؓ سے ان کی چھ سال کی عمر میں ان سے نکاح کیا پھر جب وہ ۹ برس کی ہوئیں تو ان سے ہمبستری ہوئی اور آپ کی زندگی میں کل نو برس رہیں، اسی طرح ان کا امام بننا تو ان کے بالغ ہونے کے بعد ہوا اس لئے یہ واقعہ امامت ابتدائے اسلام کا فعل کس طرح ہوا، کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ منسوخ ہے، اور ابن الہمامؒ وغیرہ نے اس خیال کو بھی رد کر دیا ہے کیونکہ حاکم و محمد کی روایت اور ام ورقہؓ و ابوداؤد وغیرہ کی حدیثیں سب نسخ کی نفی کرتی ہیں اور یہ بھی کہا ہے کہ صحیح طور پر کوئی ناسخ بھی متعین نہیں ہے، اور اگر ہم یہ بات بھی مان لیں کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ عورت کی نماز گھر کے اندرونی حصہ میں زیادہ پسندیدہ ہوتی ہے، اگر ہم اسے ناسخ مان بھی لیں تو بھی اس سے صرف جماعت کا مسنون ہونا نسخ ہوا مگر اس سے مکروہ تحریمی کا تو ثبوت نہیں ہوا، بلکہ زیادہ سے زیادہ مکروہ تنزیہی و خلاف اولی ہونا معلوم ہوا، پھر ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ہمارے لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ ہم اپنا ہی مذہب بنالیں یعنی عورتوں کی جماعت مکروہ تنزیہی ہے، کیونکہ ہمارا مقصود تو حق کا اتباع ہے خواہ کہیں بھی ہو، فتح القدیر کا بیان ختم ہوا۔

اور شارح اکملؒ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر عورتوں کی جماعت ثابت ہوتی تو اس کا ترک کرنا مکروہ ہوتا عینیؒ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ ہر ثابت شدہ یا مشروع شیء کا ترک کرنا مکروہ نہیں ہوتا ہے، پھر یہ تو مسنون نہیں بلکہ مستحب تھا لہٰذا اس کا ترک مکروہ نہیں ہوگا، اور میں مترجم کہتا ہوں کہ خود اس جماعت کے ترک کا بھی تو ثبوت نہیں ہے، بلکہ حضرت ام ورقہؓ کی ظاہری حدیث سے تو اس عمل کے باقی رہنے کا ثبوت ہوتا ہے نہ کہ اس کے ترک کا۔

پھر میں یہ کہتا ہوں کہ مذہب میں قول صحیح بھی یہی ہے کہ عورتوں کی جماعت بلا کراہت جائز ہے اگرچہ خلاف اولیٰ ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ امام محمدؒ نے آثار میں حضرت عائشہؓ کے اس اثر کے بعد کہ "رمضان میں وہ عورتوں کی امامت کرتی تھیں" یہ لکھا ہے کہ **قال محمد یعجبنا ان قوم المرأۃ الخ** یعنی میں محمد کہتا ہوں کہ ہمیں یہ بات اچھی نہیں لگتی ہے کہ عورت امام بنے، یہ مقولہ اس بات پر صراحۃ دلالت کرتا ہے کہ انہوں نے ایسی امامت کو خلاف اولی قرار دیا ہے پھر یہ کہا ہے کہ یہی قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے، اور خلاصہ میں کہا ہے کہ **صلوتھن فرادیٰ افضل**، یعنی عورتوں کا تنہا تنہا نماز پڑھنا افضل ہے، اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جماعت مکروہ نہیں ہے بلکہ خلاف افضل ہے، پس جبکہ اپنے مذہب کی روایت درایت کے موافق بھی ہے تو اسی پر اعتماد کرنا چاہئے، پس مذہب میں حکم صحیح یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت بلا کراہت جائز ہے، پھر ان میں جو عورت امام بنے وہ صف کے بیچ میں کھڑی ہو، اور اولیٰ یہ ہے کہ عورتیں تنہا پڑھیں، اور امام شافعیؒ کے نزدیک عورتوں کی جماعت بہتر ہے۔

بندہ مترجم یہ کہتا ہے کہ صحابہؓ کے زمانہ میں بھی ایک ایک گھر میں کئی کئی عورتیں ہوا کرتی تھیں اس کے باوجود روایت میں ہے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ نے رمضان کے مہینہ میں جماعت کی ہے، اس سے باقی دنوں میں تنہا تنہا پڑھنے کو ہی اولیٰ و افضل مانا جائے اور ترک اولیٰ پر محمول نہ کیا جائے، اور بہت ممکن ہے کہ رمضان میں بھی جو حضرت صدیقہ عائشہؓ نے عورتوں کو لے کر جماعت سے نماز پڑھائی وہ عورتوں کو تراویح پڑھنے پر آمادہ کرنے کے لئے کیا ہے، **واللہ تعالی اعلم**.

عورتوں کو مردوں کی جماعت میں شریک ہونا اگرچہ جماعت جمعہ و عیدین کی ہو اور وعظ کی مجلس میں مطلقاً مکروہ تحریمی ہے

اوزاسی پر فتویٰ ہے۔ف۔الکافی وغیرہ۔ھ۔اور ابن الہمامؒ نے بوڑھی پھوس عورتوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کیا ہے۔د۔ایک کمرہ میں عورتوں کے واسطے مرد کا امام ہونا جبکہ دوسرا مرد نہ ہو اور نہ مرد کی ذی رحم محرم عورتیں مانند بہن وغیرہ کے ہو اور نہ مرد کی بیوی یا باندی ہو تو مکروہ تحریمی ہے،اور اگر عورتوں کے ساتھ مذکورہ عورتوں میں سے کوئی ہو یا مسجد میں امامت کرے تو مکروہ نہیں ہے۔ البحر۔لیکن فتاویٰ ھندیہ میں ہے مرد کی امامت عورت کے لئے جائز ہے جبکہ وہ امامت کی نیت کرے اور خلوت میں نہ ہو،اور اگر امام خلوت میں ہو،پس امام اگر اب ان سب عورتوں یا ان میں سے کسی کا محرم ہو تو امامت جائز ہے لیکن مکروہ ہے۔النہایہ عن شرح الطحاوی۔اور عورت کا مقتدی ہونا مرد کے ساتھ نماز جمعہ صحیح ہے،اگرچہ امام نیت نہ کرے،اور عیدین کے لئے بھی یہی قول اصح ہے۔الخلاصہ۔

ومن صلی مع واحد أقامه عن يمينه لحديث ابن عباسؓ فانه عليه السلام صلى به واقامه عن يمينه، ولايتاخر عن الامام، وعن محمد انه يضع اصابعه عند عقب الامام، والاول هو الظاهر، وان صلى خلفه اوفي يساره جاز، وهو مسيء لانه خالف السنة، وان ام اثنين تقدم عليهما، وعن ابي يوسف يتوسطهما، ونقل ذلك عن عبدالله بن مسعودؓ، ولنا انه عليه السلام تقدم على انس واليتيم حين صلى بهما، فهذا للافضلية، والاثر دليل الاباحة.

ترجمہ:-اور جو شخص صرف ایک شخص کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو وہ اس شخص کو اپنے داہنی طرف کھڑا کر لے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی اس حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں نماز پڑھائی اور انہیں اپنے داہنی جانب کھڑا کیا،اور وہ شخص امام سے پیچھے نہ رہے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک وہ شخص اپنی انگلیوں کو ایڑی کے قریب رکھے گا، پہلا یہی قول ظاہر ہے، لیکن اگر وہ شخص امام کے پیچھے یا امام داہنی طرف کھڑا ہو جائے تو بھی جائز ہوگا، مگر یہ برائی اختیار کرنے والا ہوگا کیونکہ اس نے سنت کی مخالفت کی ہے،اور اگر دو آدمیوں کی امامت کرے تو خود ان دونوں سے آگے کھڑا ہو جائے،اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ان دونوں کے بیچ میں کھڑا ہوگا،اور یہ قول ابن مسعودؓ سے منقول ہے،اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ آگے بڑھ گئے تھے حضرت انسؓ اور ان کے علاوہ ایک یتیم لڑکے کو پیچھے کر کے جبکہ ان دونوں کو آپ نے نماز پڑھائی تھی، لہٰذا یہ دلیل افضلیت کی ہوئی اور دوسرا اثر مباح ہونے کی دلیل ہوئی۔

توضیح:-ایک مرد کے ساتھ دوسرے مرد کی نماز، حدیث سے دلیل دو مردوں کا امام، حدیث سے دلیل

ومن صلى مع واحد أقامه عن يمينه لحديث ابن عباسؓ فانه عليه السلام صلى به ......الخ

جو شخص ایک مرد کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو وہ اسے اپنے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا کرے۔ف۔یعنی اپنے برابر۔ع۔اگرچہ سمجھ دار لڑکا ہی ہو، یہی قول مختار ہے۔المحیط۔اور امام شافعیؒ کے نزدیک اسے کچھ پیچھے رکھنا مستحب ہے۔ع۔یہ خلاف ظاہر ہے۔ لحديث بن عباسؓ الخ مذکورہ قول مختار کی دلیل حضرت ابن عباسؓ کی یہ حدیث ہے۔ف۔کہ میں اپنی خالہ ام المومنین میمونہؓ کے یہاں رات کے وقت سویا، تو رسول اللہ ﷺ اٹھے تاکہ رات کی نماز پڑھیں، پس مشکیزہ سے آپ نے وضوء کیا اور کھڑے ہوگئے تو میں نے اٹھ کر اسی طرح وضوء کیا اور آپ کے بائیں کھڑا ہو گیا، تو آپ نے میرا سر پکڑ کر پیچھے سے گھما کر دائیں طرف کھڑا کر دیا، تمام صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے۔عف۔اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ابن عباسؓ کے ساتھ نماز پڑھی۔

فانه عليه السلام صلى به واقامه عن يمينه......الخ

اور ان کو اپنی طرف کھڑا کر دیا۔ف۔ابن عباسؓ اس وقت اچھے برے میں تمیز کرنے والے لڑکے ہو گئے تھے،اور اس لفظ دائیں سے، برابر کا کھڑا ہونا ظاہر ہوتا ہے۔م۔ولا يتاخر الخ اور یہ مقتدی اپنے امام سے کچھ پیچھے نہیں رہے گا۔ف۔یہ ظاہر الروایۃ ہے۔المحیط۔اس جگہ ایڑی کی برابری کا اعتبار ہے پنجوں کے برابری کا اعتبار نہیں ہے، جیسا کہ گذر گیا ہے۔م۔اور اگر

مقتدی کے قدم کا زیادہ حصہ آگے بڑھ گیا تو اس کی نماز فاسد ہو گئی۔ د۔ شاید اسی وجہ سے احتیاطاً پیچھے رکھنا بہتر ہے۔

وعن محمد انه يضع اصابعه عند عقب الامام......الخ

اور امام محمدؒ سے مروی ہے کہ مقتدی اپنی انگلیوں کو امام کی ایڑی کے برابر رکھے۔ف۔ جیسا کہ عوام میں اسی پر عام طور سے عمل جاری ہے۔ ع۔ والاول الخ قول اول ہی ظاہر ہے۔ف۔ یعنی ظاہر الروایۃ ہے۔ م۔ وان خلفه الخ اور اگر اس مقتدی نے امام کے پیچھے بائیں نماز پڑھی تو جائز ہے۔ف۔ یعنی نماز فاسد نہ ہو گی وهو مسئى الخ اور وہ برا کرنے والا ہوا کیونکہ اس نے سنت کے خلاف کیا ہے۔ف۔ بعض مشائخ نے صراحۃً مکروہ کہا ہے اور یہی صحیح بھی ہے۔ البدائع۔ اور اگر ایک عورت ہو تو وہ یقیناً پیچھے کھڑی ہو گی۔ د۔ اور اگر ایک مرد اور ایک عورت ہو تو مرد کو دائیں طرف اور عورت کو پیچھے کھڑا کرے۔ المحیط۔

وان ام اثنين تقدم عليهما، وعن ابى يوسف يتوسطهما، ونقل ذلك عن عبدالله......الخ

اور اگر دو مردوں کا امام ہو تو دونوں کو پیچھے رکھ کر خود آگے بڑھ جائے۔ف۔ اگرچہ ان دونوں میں سے ایک لڑکا نابالغ ہو۔ المحیط۔ یہ حضرت عمرؓ سے آثار میں مروی ہے، وعن ابی یوسف الخ اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ امام دونوں کے بیچ میں ہو جائے، ونقل الخ اور یہ ابو مسعودؓ سے منقول ہے۔ف۔ کہ ابن مسعودؓ نے خود ایسا کیا تھا، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، ولنا الخ اور ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت انسؓ اور ایک یتیم کے آگے کھڑے ہوئے تھے۔ف۔ یعنی انس بن مالکؓ اور یتیم یعنی ضمیرہ بن سعد الحمیریؓ پر۔ف۔ ن۔ اور ان دونوں کے پیچھے انسؓ کی والدہ ام سلیم جن کا نام ملیکہ تھا، کھڑی تھیں۔ حين صلى الخ جبکہ دونوں کے ساتھ نماز پڑھی تھی۔

ف۔ یہ نماز اس وقت پڑھی گئی تھی جبکہ ام سلیمؓ نے دعوت کی اور اپنے گھر بلایا تھا، جیسا کہ سنن ابن ماجہ کے علاوہ بقیہ صحاح میں موجود ہے، تو یہ طریقہ افضلیت کے لئے ہے۔ف۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ عمل تھا۔

والاثر دليل الاباحة......الخ

اور اثر یعنی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے جو مروی ہے وہ مباح ہونے کی دلیل ہے۔ف۔ اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ ابن مسعودؓ نے تنگ جگہ میں نماز پڑھی ہو، اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اس روایت سے تو نفل نماز کو جماعت کے ساتھ پڑھنا معلوم ہوا، تو میں جواب دوں گا کہ ہاں اذان واقامت کے بغیر نفل نماز کی جماعت کے ساتھ جائز ہے، لیکن اس روایت سے یہ بات ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سب کو بلا کر نفل نماز جماعت کی ہے، جیسا کہ صحیح روایت میں ہے کہ تم لوگ کھڑے ہو کر پڑھو۔ م۔ اور اگر مقتدی دو سے زائد ہوں تو امام کے بیچ میں کھڑا ہونا مکروہ تحریمی ہے۔

ف۔ اور اگر ایک عورت اور دو مرد ہوں تو مردوں سے پیچھے عورت کھڑی کی جائے۔ المحیط جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے۔ م۔ امام نے نماز شروع کی اس طرح سے کہ داہنی جانب صرف ایک مرد مقتدی تھا پھر دوسرا شخص آیا اور اس نے مقتدی کو اپنی طرف کھینچ کر دونوں امام کے پیچھے ہو گئے تو شیخ ابو بکر خان نے کہا ہے کہ اس سے نماز فاسد نہ ہو گی۔ المحیط۔ اور یہی صحیح ہے۔ التاتارخانیہ عن العتابیہ۔ اور اگر امام اس صورت میں خود بڑھ گیا اور اتنا بڑھا کہ اپنی سجدہ گاہ سے آگے بڑھ گیا تاکہ دونوں مقتدی برابر ہو جائیں تو بھی کوئی خرابی نہ ہو گی۔ المحیط۔ اگر امام یہ کہے کہ تم اپنے کندھے ملاؤ اور خالی جگہ نہ چھوڑو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البحر۔ امام کو چاہئے کہ وہ ادھر ادھر کھڑا نہ ہو بلکہ محراب میں رہے۔ مائل۔ المجتبیٰ۔ امام کے قریب اہل علم وفضل کھڑے ہوں، شرح الطحاوی۔ پھر امام کے دائیں۔ المحیط۔

صفوں میں افضل پہلی صف ہے پھر دوسری اسی طرح آخر تک، اگر سامنے کی صف میں جگہ موجود ہو تو پچھلی صف کو چیرتا ہوا آگے بڑھے۔ القنیہ۔ امام کے برابر صرف ایک شخص ہو اور اس کے پیچھے پوری صف ہو تو بالاجماع ایسا کرنا مکروہ ہے، شرح الارشاد۔ عف۔ قول اصح یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک یہ بات مکروہ ہے کہ امام دو ستونوں کے درمیان

کھڑا ہو، یا ایک گوشہ میں یا مسجد کے ایک کنارے میں ہو کہ ایسا کرنا اسلاف کے عمل کے خلاف ہے۔ الہدایہ۔ فع۔ صف کے پیچھے تنہا کھڑا ہونا جائز ہے مگر مکروہ ہے، جس کی دلیل بخاری کی حدیث ہے جو حضرت ابو بکرؓ سے مروی ہے، اور امام احمدؒ کے نزدیک فاسد ہوگی، کیونکہ ابوداؤد، الترمذی اور ابن حبان کی حدیثوں میں اس کے اعادہ کا حکم دیا گیا ہے۔ مفع۔

ولایجوز للرجال ان یقتدوا بامرأة اوصبی، اما المرأة فلقوله علیه السلام: اخروھن من حدیث اخرھن الله، فلا یجوز تقدیمھا.

اور مردوں کے لئے کسی عورت یا بچوں کی اقتداء کرنی جائز نہیں ہے، لیکن عورت تو اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ انہیں پیچھے رکھو جیسا کہ اللہ نے پیچھے رکھا ہے۔

توضیح:- عورت اور لڑکے کی اقتداء مردوں کو، حدیث سے دلیل

ولایجوز للرجال ان یقتدوا بامرأة اوصبی...... فلا یجوز تقدیمھا......الخ

تو عورت کو آگے بڑھانا جائز نہ ہوگا۔ ف۔ اور خنثی کا بھی یہی حکم ہے۔ د۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جگہ تین بحثیں ہیں، نمبر ۱۔ حدیث کو ثابت کرنا،۲ اس کے معنی کو متعین کرنا،۳ اس حدیث سے فرضیت کا ثبوت اس طرح پر کہ اس کے خلاف کرنا جائز نہ ہو، اور ہر ایک میں اشکال ہے، چنانچہ تمام شارحین اس پر متفق ہیں کہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، بلکہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے جو عبدالرزاق نے اور طبرانی نے روایت کی ہے، اگرچہ یہ کہنا ممکن ہے کہ یہ قول حکماً مرفوع ہو، نمبر ۲۔ اس کے اندر لفظ "حیث" کے معنی میں غور کرنا یعنی لفظ حیث مکان کے معنی میں ہے، اور چونکہ سوائے نماز کے کسی اور جگہ عورتوں کو مؤخر کرنا مشروع نہیں ہے، اس لئے معلوم ہو کہ نماز میں عورتوں کی جگہ آخر میں ہے، اس جگہ لفظ حیث سے یہ بتلایا گیا ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو والی اور سلطان ہونے اور گواہی و میراث کے مسائل میں مؤخر کیا ہے یعنی مرتبہ کم کردیا ہے اسی طرح تم نماز میں بھی انہیں مؤخر رکھو، اس وقت میں موافقت مستحب ہوئی، نمبر ۳۔ اور پہلے معنی کے تسلیم کرلینے کی صورت میں یہ تو خبر واحد ہے، جو حدیث سے مرفوع بھی نہیں ہے، اس لئے اس سے فرضیت کس طرح ثابت ہوگی، انزاریؒ نے کہا ہے کہ خبر مشہور ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنف ہدایہؒ نے بھی یہی کہا ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوا کہ جب خبر کے مرفوع ہونے کا ہی ثبوت نہیں ہے تو مشہور ہونے کا ثبوت کہاں سے ہوا، مجتبیٰ میں کہا ہے کہ اس مسئلہ میں مجتہدین کے اجماع کو دلیل میں پیش کیا جائے گا، لیکن ابن جریرؒ وغیرہ نے عورت کی امامت کو تراویح میں جائز رکھا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ میرے نزدیک استدلال کی صورت میں اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاخِرِيْنَ﴾، اور یہ معنی خاص ہیں جو علم الٰہی میں مقدم و موخر کے لئے معلوم ہیں، اور صحاح حدیث میں صحیح سندوں سے حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ نماز میں بہت خوبصورت عورت بھی شامل ہوا کرتی تھی اس لئے کچھ مرد حضرات اپنے تقوی کی بناء پر بالکل بیٹھتے تاکہ خوبصورت عورت پر نظر نہ پڑے، اور کچھ لوگ اسے دیکھنے کی غرض سے پیچھے صف میں رہا کرتے، اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کا تعلق نماز سے ہے کسے مقدم ہونا چاہئے اور کسے مؤخر ہونا چاہئے یہ بات علم الٰہی میں ہے جس کا بیان حدیث سے ہوا چنانچہ صحیحین کی حدیث میں اقیموا صفوفکم کا بیان ہے، یعنی اپنے موقع اور شان کے مطابق اپنی صفیں ٹھیک کرو۔

اس کی مزید وضاحت دوسری صحیح حدیث میں ہے کہ پہلے مردوں کی صف ہو پھر لڑکوں کی پھر عورتوں کی، اس میں رسول اللہ ﷺ نے صف کی ترتیب اور نمازیوں کی تقدیم و تاخیر کو واضح فرمایا، تو یہ بیان اس آیت کے علم کا ہوا، اور عنقریب ہم ان احادیث کی توضیح کریں گے، اور فن اصول فقہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ کسی مجمل آیت کا جب بیان ہو جائے تو اس کے حکم کی

نسبت اسی آیت کی طرف ہوگی، جیسے وضوء کرتے ہوئے سر کے مسح کرنے کی تفصیل میں چوتھائی سر پر مسح کرنے کا حکم حدیث سے ثابت ہوا ہے مگر فرض عملی قرار پایا ہے، اسی طرح یہاں ہر ایک کا مقام اور محل جو حدیث میں بیان کیا گیا وہ حکم آیت پاک ہی کی طرف منسوب ہوگا، اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ علم الٰہی میں پہلے مردوں کی صف پھر عورتوں کی صف ٹھہری، تو یہی فرض ہوا، اور ابن مسعودؓ کا قول اسی بات کا حوالہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں عورتوں کو مؤخر رکھا ہے یعنی حکم الٰہی کی بناء پر تم اس کی فرمانبرداری کرو، اور ان کو مؤخر رکھو، اب اگر اپنی جگہ سے اسے بدلا یعنی مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم کیا تو نماز فاسد ہو جائے گی، یہ استدلال عمدہ اور لطیف ہے اس لئے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہوں، اور اسے شکر کے ساتھ قبول کرنا اور یاد رکھنا چاہئے۔

اس طرح آخری بات یہ ٹھہری کہ فلایجوز تقدیمها لهٰذا عورت کو مقدم کرنا جائز نہ ہوگا۔ف۔یہی حکم خنثیٰ کا بھی ہے، کہ اس کی امامت مردوں اور اپنے مثل خنثیٰ کے بھی جائز نہیں ہے۔الخلاصہ۔جس خنثیٰ کے عورت یا مرد ہونے کی پہچان مشکل ہو تو اس کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ عورتوں کی امامت کرے، بشرطیکہ وہ آگے ہو، اور اگر صف کے بیچ میں ہو تو عورتوں کی نماز فاسد ہوگی۔محیط للسرخسی۔ھ۔

واما الصبی فلانه متنفل، فلا یجوز اقتداء المفترض به، وفی التراویح و السنن المطلقة جوّزه مشائخ بلخ، ولم یجوزه مشائخنا، و منهم من حقق الخلاف فی النفل المطلق بین ابی یوسفؒ و بین محمد، والمختار انه لایجوز فی الصلوٰة کلها، لان نفل الصبی دون نفل البالغ حیث لا یلزمه القضاء بالافساد بالاجماع، ولایبنی القوی علی الضعیف، بخلاف المظنون، لانه مجتهد فیه، فاعتبر العارض عدما، بخلاف اقتداء الصبی بالصبی، لان الصلوة متحدة.

ترجمہ:-اور لڑکے کو آگے بڑھانا اس لئے جائز نہیں ہے کہ وہ تو نفل پڑھنے والا ہے، اس لئے فرض پڑھنے والے کو اسکے پیچھے پڑھنا جائز نہ ہوگا، اور نفل اور مطلق سنتوں کے بارے میں بلخ کے علماء نے امامت کو جائز قرار دیا ہے، لیکن ہمارے مشائخ نے اسے جائز نہیں کہا ہے، اور بعض فقہاء نے نفل مطلق کے بارے میں امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان اختلاف ثابت کیا ہے، لیکن مذہب مختار یہ ہے کہ کسی بھی نماز میں جائز نہیں ہے، کیونکہ نابالغ کی نفل نماز بالغ کی نفل نماز سے کمتر ہوتی ہے اسی بناء پر بالاتفاق نابالغ پر نفل کو فاسد کر دینے سے قضاء لازم نہیں آتی ہے، اور ضعیف پر قوی کی بناء نہیں کی جاتی ہے، بخلاف ایسی مظنون نماز کے کیونکہ اس میں اجتہاد کیا جاتا ہے، اس لئے اس عارضی یعنی ظن کو معدوم سمجھا جائے گا، بخلاف نابالغ کی اقتداء نابالغ پیچھے کرنے کی صورت میں، کیونکہ دونوں کی نماز متحد اور ایک ہی ہے۔

توضیح:-مردوں کو نابالغ کی اقتداء کا حکم، حدیث سے دلیل، نابالغ کی امامت نابالغ کے لئے

واما الصبی فلانه متنفل، فلا یجوز اقتداء المفترض به......الخ

نابالغ کی امامت بالغین کے لئے اس وجہ سے جائز نہیں ہے کہ نابالغ کی نماز اگرچہ فرض ہی ہو وہ نفل کے حکم میں ہے اس لئے وہ نفل ادا کرنے والا ہوتا ہے۔ف۔کیونکہ نابالغ ہونے کی وجہ سے اس پر نماز فرض ہی نہ ہوئی، لہٰذا اس کا پڑھنا نفل ہے، اور مرد بالغ بلکہ عورت بالغہ کی بھی نماز فرض ہوتی ہے۔م۔فلا یجوز الخ اس لئے اس نابالغ کی اقتداء ایسے شخص کے لئے جائز نہ ہوگی جو فرض ادا کرتا ہو۔ف۔اس لئے بالغ مرد و عورت کی فرض نماز بالغ کے پیچھے صحیح نہ ہوگی بلکہ بالغوں کی نفل نمازیں بھی شروع کرتے ہی واجب ہو جاتی ہیں، اس لئے نفل نمازوں میں بھی اقتداء درست نہ ہوگی، اس کی مزید تفصیل آئندہ آئے گی۔م۔البتہ اگر نابالغ اپنے ہی جیسے نابالغوں کی امامت کرے تو جائز ہے۔الخلاصہ۔ھ۔پھر فرض نماز کے بارے میں ہمارے مذہب کے مطابق امام اوزاعیؒ، ثوریؒ، مالکؒ، احمدؒ اور اسحٰقؒ کا ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک نابالغ کی امامت فرض نماز میں صحیح ہے، البتہ جمعہ کے بارے

میں دو روایتیں ہیں، ان کی دلیل عمر بن ابی سلمہ کی حدیث ہے کہ میں نے چھ یا سات برس کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں امامت کی ہے، جیسا کہ بخاری میں ہے، خطابیؒ نے کہا ہے کہ حسنؒ اس حدیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں، اور ایک بار اس کے بارے میں کچھ اس طرح فرمایا ہے کہ اس کو چھوڑو یہ کچھ کھلتی چیز نہیں ہے۔

اور ابوداؤدؒ نے کہا ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ میں نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے، شاید عمر بن ابی سلمہ کے اس عمل کی خبر رسول اللہ ﷺ کو نہ پہونچی ہو، اور کہا ہے کہ بڑے صحابہ کرام نے تو اس کی مخالفت کی ہے، بہت تعجب کی بات ہے کہ شوافع نے اکابر صحابہ یہانتک کہ ابو بکر صدیق و عمر فاروقؓ کے افعال کو دلیل میں نہیں لائے، اور دلیل میں پیش کیا ایک چھ سات برس کے لڑکے کے عمل اور قول کو جبکہ یہ بات معلوم ہو گئی فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے لڑکے کی اقتداء نہیں کر سکتا ہے تو کیا نفل پڑھنے والا بچے کی اقتداء کر سکتا ہے یا نہیں اس سلسلہ میں یہ فرمایا ہے وفی التراویح کہ تراویح اور سنن مطلقہ میں بلخ کے علماء و مشائخ نے جائز رکھا ہے۔

ف۔ سنن مطلقہ سے مراد وہ سنتیں ہیں جو فرائض کے ساتھ روزانہ کے لئے مقرر شدہ ہیں، اور ایک روایت میں عیدین کی نماز بھی سنت ہے، اور وتر بھی صاحبین کے قول کے مطابق، اسی طرح سورج گرہن، چاند گرہن اور استسقار کی نمازیں بھی صاحبین کے قول کے مطابق۔ ف۔ اور ظاہر یہ ہے کہ سنن مطلقہ قید نہیں ہے، بلکہ اس میں تمام نوافل بھی داخل ہیں اگرچہ وہ کسی وقت کے ساتھ موقت اور مقید نہ ہوں ان تمام کو بلخ کے مشائخ جائز مانتے ہیں۔ ل۔

ان کا یہ کہنا صلوۃ مظنونہ پر قیاس کرنے کی وجہ سے ہے، اور اس صلوۃ مظنونہ سے مراد وہ نماز ہے جس کا نمازی نے اپنے ذمہ میں ہونے کا گمان کیا ہے، اسی گمان کی بناء پر اس کو پڑھنا بھی شروع کر دیا پھر تھوڑی دیر بعد اس نماز میں کچھ فساد آگیا جس سے وہ ٹوٹ گئی اور اب اسے یہ یقین آیا کہ وہ نماز اس پر واجب نہ تھی، تو کیا اس کے شروع کرنے سے وہ ذمہ میں لازم ہو گئی اور اس کا قضاء کرنا واجب ہے یا نہیں، تو حکم یہ ہے کہ اس کی قضاء واجب نہیں ہے، مگر امام زفرؒ کے نزدیک واجب ہے، پھر اگر بالغ آدمی مظنونہ نماز پر نفل کی بناء کرے یعنی اسے نفل کی حیثیت سے پڑھنا شروع کر دے تو جائز ہے، بلخ کے مشائخ نے کہا ہے کہ نفل نماز تو شروع کر دینے سے ذمہ میں لازم آجاتی ہے، لیکن مظنونہ نماز ذمہ میں لازم نہیں آتی، تو جس طرح مظنونہ پر نفل کی بناء کرنا جائز ہے اسی طرح نابالغ کی نماز پر بناء کرنا ہے، یعنی نابالغ کی اقتداء کر کے ادا کرنا جائز ہے۔ ملخص الفتح۔

ولم یجوزہ مشائخنا، و منھم من حقق الخلاف فی النفل المطلق بین ابی یوسفؒ ......الخ

لیکن ہمارے مشائخ بخارا و ماوراء النہر نے اسے جائز نہیں کہا ہے و منھم من الخ اور ہمارے مشائخ میں سے ابو یوسفؒ و محمدؒ کے درمیان نفل مطلق کی صورت میں اختلاف بیان کیا ہے۔ ف۔ یعنی غیر موقت نفل نماز میں نابالغ کی اقتداء کرنے کی صورتیں ان مسائل سے لگائی ہیں جن سے یہ معلوم ہوا کہ ابو یوسفؒ اور محمدؒ آپس میں اس مسئلہ میں اجتہادی بناء پر مختلف ہیں، یہانتک کہ امام محمدؒ کے نزدیک یہ جائز ثابت ہوا اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ناجائز ثابت ہوا۔

والمختار انه لایجوز فی الصلواۃ کلھا......الخ

لیکن فتوی کے واسطے مختار مسلک ابو یوسفؒ کا قول ہے کہ نابالغ کی اقتداء جائز نہیں ہے۔ ف۔ نوافل مطلقہ ہیں بلکہ بخارا کے جمہور مشائخ کے قول کے مطابق اقتداء جائز نہیں ہے، تمام نمازوں میں۔ ف۔ خواہ نفل مطلق ہو یا موقت ہو اگرچہ نماز جنازہ ہو۔ م۔ یہی قول اصح ہے۔ المحیط۔ یہی ظاہر الروایہ ہے۔ البحر۔

لان نفل الصبی دون نفل البالغ حیث لا یلزمه القضاء بالافساد بالاجماع......الخ

یونکہ نابالغ کی نفل نماز بالغ کی نفل نماز سے کمتر ہوتی ہے۔ ف۔ یعنی اگر نابالغ نفل نماز پڑھ رہا ہو تو بالغ نفل پڑھنے والے کی اس کے پیچھے اقتداء جائز نہیں ہے کیونکہ نابالغ کی نفل بھی بالغ کی نفل کے برابر نہیں ہوتی ہے بلکہ کمتر ہوتی ہے، کیونکہ تمام

لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی نابالغ اگر اپنی نفل نماز کو فاسد کردے تو اس کے غیر مکلف ہونے کی وجہ سے اس پر نماز فرض ہی نہیں ہے، برخلاف بالغ کے کہ اگر وہ اپنی نفل نماز فاسد کردے تو اس کے ذمہ اس کی قضاء واجب ہے، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بالغ کی نفل سے بھی نابالغ کی نماز کمتر ہے، پھر بالغ اپنی نفل کو مقتدی بن کر نابالغ کی ذمہ داری میں کس طرح دے سکتا ہے، جبکہ لایبنی الخ قوی کی بناء ضعیف پر نہیں کی جاتی ہے۔ف۔ لیکن جو ذمہ میں لازم آتی ہو اس کی بناء کرنی مظنونہ غیر واجب الذمہ نماز پر تو جائز ہے، پس نابالغ کی نماز اس کی جیسی نہیں ہوئی لہٰذا اس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے کیونکہ نابالغ کی نماز بہر صورت ضعیف ہے۔

بخلاف المظنون، لانه مجتهد فيه، فاعتبر العارض عدما......الخ

برخلاف مظنون نماز کے کہ نماز مظنون کے اندر وہ بات جس میں اجتہاد کو دخل نہیں ہے۔ف۔ یہانتک کہ امام زفرؒ کے نزدیک اس کے فاسد ہونے کے بعد اس کی قضاء واجب ہے، لہٰذا بالغ کی نفل قوی ہوئی نابالغ ہونے تک باقی رہنا لازمی بات ہے، اس لئے بالغ کی نماز اس نابالغ کی نماز کے مثل نہیں ہوگی، برخلاف مظنون نماز کے کہ اس میں وہم و گمان کا پیدا ہو جانا ایک عارضی صفت ہے، اس لئے مظنون نماز پڑھنے والے امام کے پیچھے جب نفل پڑھنے والے نے اقتداء کی تو دونوں ایک جیسی ہو سکتی ہے، بالخصوص امام زفرؒ کے اجتہاد کی بناء پر فاعتبر الخ اس لئے اس عارض یعنی ظن کو معدوم اور کالعدم سمجھ لیا گیا۔

ف۔ یعنی مقتدی کے حق میں (جو امام کے حق میں نہیں) کیونکہ مقتدی نے اس امام کی اقتداء یہ جان کر کی ہے کہ یہ نماز اس پر واجب الذمہ ہے، اور امام کو پہلے سے اس کا ظن نہ تھا، اب ہو گیا ہے، لہٰذا اس کی امامت بدستور باقی اور وبحال رہی، اور مقتدی کے بارے میں معدوم سمجھ لیا گیا ہے بالخصوص امام زفرؒ کی اجتہاد کی وجہ سے، یعنی امام کو ظن ہو یا نہ ہو اس نماز کو فاسد کر دینے سے بہر صورت اس کی قضاء لازم آئے گی، اس سے معلوم ہوا کہ مظنون نماز پڑھنے والے کے پیچھے نفل پڑھنے والے مقتدی کی اقتداء کرنا صحیح ہوتا ہے کیونکہ دونوں کی نمازیں ایک ہی قسم کی ہیں، کیونکہ دونوں صورتوں میں مقتدی کے ذمہ قضاء لازم آتی ہے، اور بالغ نفل پڑھنے والے کا نابالغ کی اقتداء صحیح نہیں ہو سکتی ہے، کیونکہ بہر صورت نابالغ کی نماز نفل ہی ہوگی، کسی صورت سے بھی وہ واجب نہیں ہو سکتی ہے، لہٰذا دونوں میں کسی طرح موافقت اور اتحاد نہیں ہے۔م۔

بخلاف اقتداء الصبي بالصبي، لان الصلوة متحدة......الخ

اس کے برخلاف اگر نابالغ اپنے جیسے نابالغ کی اقتداء کرے تو وہ صحیح ہے، کیونکہ دونوں کی نمازیں یکساں اور متحد ہیں۔ف۔ اس لئے کہ جیسے اس امام کے لئے نفل ہے اس طرح سے مقتدی کے لئے بھی نفل ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر کوئی نابالغ نفل کی نیت سے نماز پڑھتا ہو اور اسی جیسا دوسرا نابالغ اس کے پیچھے وقتی فرض میں اقتداء کرلے تو نماز درست ہوگی کیونکہ وقتی فرض بھی تو اس کے لئے نفل ہی کے حکم میں ہے۔م۔ اب آئندہ صفوں کی ترتیب کا بیان شروع ہوگا۔

و يصف الرجال ثم النساء لقوله عليه السلام ليلينی منكم اولوا الاحلام والنهی ولان المحاذاة مفسدة فيؤخرن.

پہلے جو مرد حاضر ہیں وہ صف باندھیں پھر لڑکے پھر عورتیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے تم میں سے میرے قریب وہ لوگ رہیں جو احلام و نہی والے ہوں اور اس لئے کہ عورتوں کی محاذاۃ مردوں کی نماز کو فاسد کر دیتی ہے لہٰذا وہ پیچھے رکھی جائیگی۔

توضیح:۔ صف بندی کی کیفیت جبکہ نمازیوں میں مرد لڑکے

اور عورتیں بھی موجود ہوں، حدیث سے دلیل

و یصف الرجال ثم النساء ......الخ

اور مرد صف باندھیں۔ف۔ یعنی امام کے پیچھے مردوں کی صف باندھیں جائے، پھر لڑکے جو بلوغ کے بعد مرد ہی ہوں گے، اور اگر وہ مشتبہ ہوں مثلاً خنثیٰ ہیجڑے ہوں، یعنی جن میں مرد اور عورت دونوں کی علامت موجود ہو، تو وہ لڑکوں کی صف کے بعد صف باندھیں مگر عورتوں سے پہلے۔ م۔ پھر عورتیں صف باندھیں۔

لقوله علیه السلام لیلینی منکم اولوا الاحلام والنهی......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ مجھ سے قریب رہیں تم میں کے صاحبان احلام و نہی۔ف۔ احلام حلم کی جمع ہے جس میں بغیر نقطہ کی حاء ہے (حاء حطی) اور لام جزم ہے، وہ چیز جو سونے والا دیکھتا ہے، اسی معنی میں ہے وہ لفظ احلام جو مصر کے اس بادشاہ نے جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ میں تھا جبکہ یوسف علیہ السلام مصر کے جیل خانہ میں مقید تھے، اس نے نیند کی حالت میں دیکھ کر لوگوں سے اس کی تعبیر پوچھی تو انہوں نے احلام کہہ کر کوئی جواب نہیں دیا، جیسا کہ قرآن پاک میں ہے وَمَا نَحْنُ بِتَاوِیْلِ الْاَحْلَامِ بِعَالِمِیْنَ، لیکن اب اس کا زیادہ استعمال ایسے خواب پر ہونے لگا ہے جو بالغ ہونے پر دلالت کرتا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ یہاں بھی صاحبان احلام یعنی بالغ مرد مراد ہوں، اور نہی جمع ہے نھیہ کی (ن ھ ی ہ) نون کے ضمہ اور یا کے فتحہ کے ساتھ بمعنی عقل جس کے معنی ہوئے صاحبان نہی یعنی عقل والے، خلاصہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے قریب بالغوں اور عاقلوں کے رہنے کا حکم دیا ہے۔ع۔م۔

ابن مسعودؓ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے لیلینی منکم او لوالاحلام والنهی ثم الذین یلونهم یعنی تم میں سے میرے قریب صاحبان حلم و عقل رہیں، پھر وہ لوگ جو ان لوگوں سے ملتے ہوئے ہوں، مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے۔ع۔ مردوں میں سے فقہ و علم والے زیادہ عاقل ہوتے ہیں وہ بالکل مقابل میں ہوں گے، پھر ان سے کم درجہ بدرجہ پھر ان کے بعد نابالغین جو مذکر ہوں، پھر عورتیں جو عقل میں کم ہیں، پس صف بندی میں یہی ترتیب ہونی چاہئے، اس سے بظاہر یہ بات سمجھی جاتی ہے کہ ایک ہی صف میں سب کھڑے ہو مگر اس بتائی ہوئی ترتیب کے ساتھ، اور اس سے یہ بات نہیں سمجھی گئی کہ پہلی صف میں مرد دوسری میں بچے تیسری میں عورتیں ہوں، اسی بناء پر زیلعیؒ نے کہا ہے کہ اس روایت سے صرف مردوں کے آگے ہونے کا حکم نکلتا ہے، اس لئے عینیؒ نے فرمایا ہے کہ ابو مالکؒ کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کی صف بناتے تو مردوں کو لڑکوں کے آگے صف میں اور لڑکیوں کو ان کے پیچھے صف میں اور عورتوں کو ان لڑکوں کے پیچھے صف میں رکھتے، اسے حارث نے اپنی سند میں بیان کیا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ آیت پاک ﴿لَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِیْنَ مِنْکُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِیْنَ﴾ الایۃ سے میں نے ہر ایک کے لئے ایک متعین مقام کا فرض ہونا پہلے بیان کر دیا ہے اور احادیث سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اسی پر ابتدا سے اب تک عمل جاری ہے، وہی بیان کافی ہے۔ واللہ تعالیٰ ہو اعلم۔م۔

ولان المحاذاة مفسدة فیؤخرن......الخ

اور چونکہ عورت کا مردوں کے متصل (محاذاۃ) ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے اس لئے بھی عورتوں کی صف بالکل آخر میں ہونی چاہئے۔ف۔ ابن الہمامؒ نے ساری بحثوں کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نماز فاسد ہونے کی وجہ سے شہوت کا ہونا نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ نمازیوں کے لئے کھڑے ہونے کی جو متعین اور مفروض ہو چکی تھی اس کی خلاف ورزی ہوئی ہے اس لئے نماز فاسد ہوگی، اب مصنفؒ محاذاۃ کے مسئلہ کو ایک مستقل عنوان اور بحث کے ساتھ بیان کر رہے ہیں جو یہ ہے۔

وان حاذته امرأة وهما مشتركان في صلوة واحدة، فسدت صلاته ان نوى الامام امامتها، والقياس ان لا تفسد، وهو قول الشافعي رحمة الله عليه، اعتبارا بصلاتها حيث لاتفسد، وجه الاستحسان مارويناه، وانه من المشاهير، وهو المخاطب به دونها، فيكون هو التارك لفرض المقام، فتفسد صلاته دون صلاتها، كالمأموم اذا تقدم على الامام.

ترجمہ:-اور اگر محاذی ہو گئی کوئی عورت کسی مرد (نمازی) کے اور وہ دونوں ہی ایک نماز میں مشترک ہوں تو اس مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی اگر امام نے اس عورت کی امامت کی نیت کی ہو، لیکن قیاس تو یہ ہے کہ اس مرد کی نماز فاسد نہ ہو چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی قول ہے، اس عورت کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ اس محاذاۃ سے عورت کی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، مگر استحسان کی وجہ سے وہ حدیث ہے جس کی روایت ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، اور یہ حدیث مشہور احادیث میں سے ہے، اس حدیث میں مخاطب مرد ہی ہے، عورت مخاطب نہیں ہے، لہٰذا یہی مرد اس پر عمل کرنے والا پایا گیا کہ اس نے اس لازمی مقام کو چھوڑ دیا، لہٰذا اس مرد ہی کی نماز فاسد ہو گی نہ اس عورت کی، جیسا کہ کوئی مقتدی اپنے امام سے آگے کھڑا ہو گیا ہو۔

توضیح:-نماز میں کوئی عورت مرد کے محاذی ہو گئی اور امامت کے وقت مرد نے اس عورت کی امامت کی نیت بھی کی تھی

وان حاذته امرأة وهما مشتركان في صلوة واحدة......الخ

اور اگر مرد سے کوئی عورت محاذی ہو گئی۔ف۔اس طرح سے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک نے اپنے اس صف اور مقام کو چھوڑ دیا جو اس پر لازم تھا۔م۔ **وهما الخ** جبکہ دونوں ایک ہی نماز پڑھنے میں مشترک ہوں۔ف۔یعنی ایک ہی نماز کے اندر تحریمہ اور اداء میں مشترک ہوں خواہ وہ حقیقتاً ہو یا حکماً۔

فسدت صلاته ان نوى الامام امامتها......الخ

تو مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی، بشرطیکہ امام نے اس عورت کی امامت کی نیت کی ہو۔ف۔کیونکہ امامت کی نیت کرنے کی وجہ سے ہی وہ مقتدیہ بن سکی ہے، اور مرد کا جو مقام متعین تھا وہ باقی نہ رہا، اس لئے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اس مسئلہ کی مزید وضاحت اور اس کی شرطیں انشاء اللہ ہم آئندہ بیان کرینگے، یہ مسئلہ خلاف قیاس ہے، استحسان کی بناء پر ہے۔م۔

والقياس ان لا تفسد، وهو قول الشافعي رحمة الله عليه......الخ

جبکہ قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ عورت کی طرح مرد کی بھی نماز فاسد نہ ہو، جیسا کہ امام شافعیؒ کا یہی قیاس ہے، **اعتبارا الخ** عورت کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ اس عورت کی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے۔ف۔بالاتفاق عورت کی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، اس لئے مرد کی بھی نماز فاسد نہیں ہونی چاہئے۔

وجه الاستحسان مارويناه، وانه من المشاهير، وهو المخاطب به دونها......الخ

اس استحسان کی دلیل وہ حدیث ہے جو پہلے بیان کر چکے ہیں۔ف۔یعنی **اخروهن من حيث اخروهن الله**، تو اس حدیث سے حکم فرض ہو جانا چاہئے تھا کیونکہ یہ حدیث مشہور اور احادیث میں سے ہے، جن کی دلالت قطعی ہوتی ہے، اب مرد ہی کی نماز کیوں فاسد ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے **هو المخاطب به الخ** کہ مرد ہی اس حکم کا مخاطب ہے، عورت نہیں ہے۔ف۔یہی مردوں کو چونکہ حکم ہے کہ تم عورتوں کو مؤخر کرو، **فيكون الخ** لہٰذا مرد ہی اس ذمہ داری کی ادائیگی کا تارک ہوا۔

فتفسد صلاته دون صلاتها، كالمأموم اذا تقدم على الامام......الخ

لہٰذا مرد ہی کی نماز فاسد ہو گی اور عورت کی فاسد نہ ہو گی **كالمأموم** جیسا کہ مرد مقتدی۔ف۔جس کا اصل مقام امام کے

پیچھے رہنے کا، اور وہ امام سے آگے ہو جائے۔ف۔ اور اپنا فرض مقام چھوڑ دے تو اس کی نماز فاسد ہو جاتی ہے، اسی طرح جب عورت کے ساتھ اپنا فرض مقام چھوڑ دے گا تو بھی اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور حکم مذکور اس صورت میں ہے جبکہ اس کو فرض مقام اور فرض نماز میں شرکت درست پائی جائے جو امام کی نیت کرنے پر موقوف ہے۔

وان لم ینو امامتها لم تضره، ولاتجوز صلاتها، لان الاشتراك دونها لایثبت عندنا خلافا لزفرؒ، ألاتری انه یلزمه الترتیب فی المقام، فیتوقف علی التزامه كالاقتداء، وانما یشترط نیة الامامة اذا ایتمت محاذیة، وان لم یكن بجنبها رجل ففیه روایتان، والفرق علی احدهما ان الفساد فی الاول لازم، وفی الثانی محتمل.

ترجمہ:-اور اگر امام نے عورت کی امامت کی نیت نہ کی ہو تو پھر عورت کی محاذاۃ سے مرد کو کوئی نقصان نہ ہوگا، اور عورت کی نماز بھی صحیح نہ ہوگی، کیونکہ امامت کی نیت کے بغیر نماز میں اس عورت کی شرکت ہمارے نزدیک ثابت نہ ہوگی، بخلاف امام زفرؒ کے قول کے، کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ امام پر ہر ایک کے کھڑے ہونے کی جگہ کے لئے ترتیب دینا لازم ہے، تو یہ بات اس پر موقوف ہوگی کہ امام اس کے لزوم کو قبول کرلے، مانند اقتداء کرلینے کے، اور امام کی امامت کی نیت اسی صورت پر موقوف ہوگی جبکہ عورت کے بغل میں کھڑی ہو کر اقتداء کرے، اور اگر عورت کے بغل میں کوئی مرد نہ ہو تو ایسی صورت میں دو روایتیں ہیں، اور ان دونوں روایتوں میں فرق یہ ہوگا کہ پہلی روایت میں یقیناً نماز فاسد ہوگی اور دوسری صورت میں صرف احتمال ہوگا۔

توضیح:-اگر امام نے محاذیہ عورت کی امامت کی نیت نہ کی ہو تو اس کا حکم

وان لم ینو امامتها لم تضره، ولاتجوز صلاتها......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے خلافا الخ اس مسئلہ میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے۔ف۔ کیونکہ ان کے نزدیک عورت کی اقتداء کا صحیح ہونا امام کی نیت ہونے پر موقوف نہیں ہے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ موقوف الاتری الخ کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ امام پر یہ بھی لازم ہے کہ صف کی ترتیب میں ہر ایک کے کھڑے ہونے کی جگہ کو متعین کرے۔ف۔ گذشتہ روایت کی بناء پر جس میں عورتوں کو پیچھے کرنا ضروری بتلایا گیا ہے، لیکن یہ بات اسی وقت ہوگی جبکہ امام عورت کا اقبال ہونا بھی قبول کرلے فیتوقف الخ تو یہ بات اس پر موقوف ہوگی کہ امام اس ذمہ داری کو عورتوں کے بھی امام بننے کو قبول کرلے۔ف۔ اور اس کا قبول کرنا صرف نیت کرلینے سے ہوتا ہے۔

كالاقتداء، ......الخ

جیسے اقتداء کرنے کا حال ہے۔ف۔ جیسے کہ مقتدی کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ اس امام کو اپنا امام تسلیم کرے یعنی اس کی اقتداء کی نیت کرلے، کیونکہ وہ مقتدی اسی صورت میں اپنی نماز کو امام کی ضمانت میں دیگا، تاکہ امام کی کسی حرکت سے اگر نماز میں کچھ کمی یا خرابی لازم آجائے تو مقتدی کی رضامندی اور قبولیت کی وجہ سے اس مقتدی پر بھی اس کا اثر آجائے، اسی طرح امام کی نیت بھی ہے تاکہ عورتوں سے اگر کوئی نقصان ہو تو امام کا قبول کیا ہوا اس پر لازم آجائے، یہاںتک کہ کسی عورت کو یہ آزادی نہ رہی کہ جس مرد کی نماز کو بگاڑنا چاہئے تو اس کے بغل میں کھڑی ہو کر اس کی نماز بگاڑ دے، بلکہ اگر امام نے عورت کے امام بننے کی نیت کرلی اس کے بعد بڑھ کر اس کے برابر کھڑی ہوگئی تو اس کی نماز فاسد ہوگی۔م۔

وانما یشترط نیة الامامة اذا ایتمت محاذیة......الخ

امامت کی نیت کرنا امام کے لئے اس وقت شرط ہوگی جب عورت امام کے برابر ہو کر مقتدی بنی ہو۔ف۔ تو امام کی نماز اسی صورت میں باطل ہوگی جبکہ امام نے نیت بھی نہ کی ہو، اور اگر امام کے پیچھے کھڑی ہوئی تو اس کی یہ دو صورتیں ہوں گی، نمبر ا۔ کسی مقتدی مرد کے برابر آکر کھڑی ہوئی، نمبر ۲۔ اس طرح برابر نہ کھڑی ہوئی ہو، تو اگر مرد کے برابر کھڑی ہوئی تو صحیح یہی ہے کہ

امام کی نیت کے بغیر وہ عورت مقتدیہ نہ بنے گی۔ع۔

وان لم یکن یجنبھا رجل ففیہ روایتان، والفرق علی احدھما ان الفساد فی الاول لازم......الخ

اور اگر عورت کے بغل میں یعنی محاذی کوئی مرد نہ ہو تو اس میں دو روایتیں ہیں۔ف۔ کیونکہ فی الحال تو عورت محاذی نہیں ہے لہذا اس کی ذات سے کوئی فساد نہیں ہوگا۔ مگر اس بات کا احتمال باقی رہتا ہے کہ وہ آگے بڑھ کر محاذیہ ہو جائے، پس احتمالی صورت کا موجودہ صورت پر اعتبار کر کے نیت شرط ہوگی اور اعتبار کرنے میں نیت شرط نہ ہوگی، اگر یہ وہم پیدا ہو کہ شرط ہونے کی روایت پر اس صورت اور پہلی صورت میں کیا فرق ہوگا تو اس کا جواب دیا والفرق الخ کہ پہلی اور دوسری صورت میں یہ فرق ہوگا کہ دوسری صورت کی بنا پر اس روایت میں کہ جس میں بھی نیت شرط ہے یہ ہے کہ پہلی صورت میں نماز کا ———— فاسد ہونا لازم ہے، اور دوسری صورت میں فاسد ہونے کا صرف احتمال ہے۔ف۔ تو احتمالی صورت کو واقعی اور موجودہ صورت پر قیاس کر کے نیت شرط ہے، یہانتک کہ اگر وہ اعتبار نہ کریں تو نیت شرط نہ ہوگی، جیساکہ دوسری روایت میں ہے، بیان کردہ مطلب تو وہ ہے جسے بندہ مترجم نے سمجھا ہے، لیکن عینیؒ نے پہلی صورت اور دوسری روایت شرط نہ ہونے کی صورت میں فرق قائم کیا ہے، لیکن میرے نزدیک میرے بیان کردہ مطلب میں کوئی التباس باقی نہیں رہتا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں۔م۔

من شرائط المحاذاۃ ان تکون الصلوۃ مشترکۃ وان تکون مطلقۃ وان تکون المراۃ من اھل الشھوۃ وان لایکون بینھما حائل لانھا عرفت مفسدۃ بالنص بخلاف القیاس فیراعی جمیع ماورد بہ النص.

ترجمہ:- محاذات ہونے کے لئے شرطوں میں سے چند یہ ہیں نمبر۱ دونوں کی نماز مشترک ہو، نمبر۲۔ نماز مطلق ہو نمبر۳ عورت شہوت کے لائق ہو، نمبر۴۔ اور دونوں کے درمیان کوئی حائل نہ ہو، کیونکہ محاذاۃ جو نماز کے لئے مفسد ہے یہ بات نص سے جانی گئی ہے مگر خلاف قیاس ہے، اس لئے ان تمام باتوں کی رعایت کرنی ہوگی جو نص میں بتائی گئی ہیں۔

توضیح:- عورت محاذیہ کی امامت کی نیت کی شرطیں
اگر خنثیٰ مشکل ہو، عورتوں کا جماعت میں حاضر ہونا

من شرائط المحاذاۃ ان تکون الصلوۃ مشترکۃ......الخ

اور محاذات جو مفسد نماز ہو اس کی چند شرطیں یہ ہیں، نمبر۱۔ دونوں کی نماز ایک ہی ہو، نمبر۲۔ اور یہ ہے کہ نماز مطلقہ ہو۔ف۔ پورے ارکان والی ہو، جنازہ کی نماز نہ ہو، کیونکہ اس میں پورے ارکان نہیں ہوتے، نمبر۳۔ عورت اہل شہوت سے ہو، نمبر۴۔ عورت اور مرد کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو۔ف۔ ان تمام شرطوں کے پائے جانے کے بعد ہی نماز فاسد ہوگی۔

لانھا عرفت مفسدۃ بالنص بخلاف القیاس فیراعی جمیع ماورد بہ النص......الخ

کیونکہ محاذاۃ جو نماز کے لئے مفسد ہے ایسے نص سے جانی گئی ہے جو خلاف قیاس ہے۔ف۔ اس لئے نص میں جو صورت مذکور ہے اسی صورت میں مفسد سمجھی جائے گی، لہذا ان تمام شرطون کی رعایت رکھی جائے گی جو نص میں موجود ہیں۔ف۔ کیونکہ اس میں قیاس کو بالکل دخل نہیں ہے، واضح ہو کہ محاذاۃ کے مفسد ہونے کیلئے دس شرطیں ہیں۔

نمبر۱۔ محاذاۃ مرد اور عورت کے درمیان ہو، اس لئے اگر مرد کی بجائے لڑکا ہو یا بجائے عورت کے لڑکی ہو یا مرد کے محاذی خوبصورت لڑکا ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی، قول اصح کے مطابق۔ف۔ اور اگر خنثیٰ مشکل ہو تو بھی فاسد نہ ہوگی، التاتارخانیہ۔

نمبر۲۔ محاذاۃ میں عورت مشتہاۃ ہو (شہوت کے لائق ہو) اس لئے کہا گیا ہے کہ نو برس کی لڑکی بھی شہوت کے لائق ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ وہ بلوغ کی عمر کو پہونچ گئی ہو، تو وہ مطلقاً مشتہاۃ ہے ورنہ وہ اس لائق ہو کہ اس سے جماع کیا جاسکے۔زع۔ عمر کا اعتبار نہیں ہے، قول اصح کے مطابق المستبین۔ اگرچہ فی الحال بڑھاپے کی وجہ سے قابل شہوت نہ رہے، بلکہ قابل نفرت ہوگئی

ہو۔ الکفایہ۔ ع۔ خواہ یہ عورت لونڈی ہو یا آزاد شدہ خواہ زوجہ ہو یا اجنبیہ ہو یا ماں بہن وغیرہ محرم ہو۔ ع۔ ف۔ ک۔

نمبر ۳۔ عورت عقل والی ہو۔ ع۔ ایسی ہو کہ اس کی نماز صحیح ہو، اس لئے مجنونہ اگر محاذاۃ کرے تو فاسد نہ ہوگی۔ الکافی۔ عینیؒ نے کہا ہے کہ اسی طرح معتوہ (مدہوش اور پاگل) کا اعتبار نہ ہوگا لیکن مترجم کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے۔ م۔

نمبر ۴۔ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل مثلاً پیلر، ستون وغیرہ نہ ہو۔ ع۔ الکافی۔ اور اس کی موٹائی ایک انگلی کے انداز سے ہو۔ التبیین۔ اور اس کی اونچائی مقدمۃ الرحل یا مقدمۃ الرحل (کجاوہ کی کاٹھی کی سامنے یا پیچھے کی لکڑی) کے برابر ہو۔ المحیط۔ یا اتنی جگہ خالی ہو کہ اس میں ایک مرد کھڑا ہو جائے۔ التحریر۔ التبیین۔ یا ان دونوں میں سے ایک چبوترہ اور دوسرا نیچے ہو، اور دوکان ایک آدمی کے برابر اونچی ہو۔ المحیط۔ المفید۔ ع۔

نمبر ۵۔ محاذاۃ ہونے میں پنڈلی اور ٹخنہ کا اعتبار ہے، یعنی دونوں کے حصے برابر ہوں تو مفسد صلوۃ ہے اور یہی قول صحیح ہے۔ التبیین۔ کہا گیا کہ یہی قول اصح ہے۔ ع۔ اکثر قدم کا محاذاۃ مفسد ہے۔ مختصر المحیط۔ ابواللیثؒ نے کہا ہے کہ یہی اصح ہے۔ ع۔

نمبر ۶۔ اصل نماز رکوع و سجود والی ہو، اگرچہ اسے اشارہ سے ادا کرتے ہوں، یہی مطلقہ نماز ہے، اس بناء پر جنازہ کی نماز میں محاذی ہونا نماز کو فاسد نہیں کرتا ہے۔

نمبر ۷۔ یہ محاذات ایک کامل رکن میں پایا گیا ہو، اور مختصر المحیط سے استنباط کیا ہے کہ ابویوسفؒ کے نزدیک مقدار رکن کافی ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک ادا ہونا شرط ہے، چنانچہ اگر ایک عورت نے تکبیر تحریمہ مردوں کی ایک صف میں باندھا پھر بڑھ کر دوسری صف میں رکوع کیا پھر بڑھ کر تیسری صف میں سجدہ کیا تو اس نے ہر صف میں سے اپنے دائیں و بائیں اور پیچھے بھی صف ہو تو اس کے ایک ایک مرد کی نماز فاسد کر دی، جیسا کہ المحیط میں ہے، ایک عورت اپنی صف کو چھوڑ کو مرد کی صف میں جاکر صرف تین مردوں کی نماز فاسد کرتی ہے دائیں والے بائیں والے کی اور اگر پیچھے کوئی ہو تو اس کی اور اس سے زیادہ کی فاسد نہیں کرتی ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے، التاتارخانیہ۔ اور اگر دو عورتیں ہوں تو ایک دایاں اور ایک بایاں اور دو پیچھے والیوں کی اگر ہوگی فاسد کریںگی اور اگر تین ہوں تو دایاں و بایاں ایک اور پچھلے تین تین آخر صف تک، اور یہی جواب الظاہر ہے۔ التبیین۔

نمبر ۸۔ امام نے عورت کی امام ہونے کی نیت کی ہو، یا عورتوں کی امامت کی نیت کی ہو، اور اگر اس طرح نیت کی کہ سوائے ایسی عورت کے جو میرے یا دوسرے مرد کے محاذی ہو تو تمام عورتوں کی امامت کی نیت کرتا ہوں تو اس صورت میں محاذات کا پایا جانا مفسد نہیں ہے، شمس الائمہؒ نے کہا ہے کہ اگر ہم نیت کی شرط نہ لگائیں تو ہر عورت جب چاہے مرد کی نماز فاسد کر دے، اور اس کا نقصان مخفی نہیں ہے، اگرچہ کتاب المبسوط میں مطلقاً بیان کیا گیا ہے کہ جمعہ اور عیدین میں عورت کی اقتداء مرد کے ساتھ جائز ہے، لیکن اکثر مشائخ کے نزدیک یہ اس صورت پر محمول ہے جبکہ امام نے عورتوں کی نیت کر لی ہو، اور بعض مشائخ نے وقتیہ فرائض اور جمعہ و عیدین میں فرق کیا ہے، اور مختصر المحیط میں ہے کہ عورتوں کی نیت کا اعتبار نماز شروع کرتے وقت ہے، اس کے بعد کی نیت کا اعتبار نہیں ہے، اور عورتوں کا نیت کرتے وقت موجود ہونا شرط نہیں ہے۔

نمبر ۹۔ دونوں کا مشترک ہونا، اس لئے اگر ایک مرد و عورت نے تیسری رکعت میں امام کی اقتداء کی، پھر ان کو حدث ہوا اس لئے وضوء کرنے گئے، پھر واپس آکر نماز پڑھنے لگے، اور عورت اس کے محاذی کھڑی ہو گئی و، پس اگر عورت اس مرد کی محاذی ہوئی ایسی رکعت میں جو ان دونوں کے لئے تو پہلی اور دوسری ہے مگر امام کے حق میں تیسری اور چوتھی ہے تو مرد کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر یہ دونوں اپنی ان دونوں رکعتوں یعنی تیسری اور چوتھی کو پڑھنے کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی رکعتوں کو جو امام کے لئے پہلی اور دوسری میں مگر ان کے لئے تیسری اور چوتھی ہیں اس میں عورت مرد کے محاذی ہو کر کھڑی ہو گئی اور پڑھنے لگی تو مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ ان دونوں رکعتوں میں اشتراک نہیں پایا گیا، الذخیرہ خلاصہ یہ ہے کہ یہ دونوں جو رکعت اپنے واسطے

ادا کریں (یعنی جس میں امام نہ ہو نہ حقیقۃ اور نہ حکما) اس میں فساد نہ ہوگا، اور جس رکعت میں حکماً امام کے پیچھے ہوں تو اس میں محاذات ہونے سے نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ التبیین میں ہے۔

نمبر ۱۰۔ جیسے ایک جگہ کا ہونا شرط ہے کہ دونوں زمین پر ہوں یا دونوں چبوترہ پر ہوں اسی طرح ان دونوں کی جہت کا بھی ایک ہونا شرط ہے، اس صورت میں جہت مختلف ہو جاتی ہے جبکہ خانہ کعبہ کے اندر لوگ نماز پڑھتے ہوں (وہاں جس کا منہ جس طرف ہو صحیح ہوگا) اسی اندھیری رات میں جب کسی طرح قبلہ کا تعین نہ ہو سکے تو قلب سے تحری کرنا ہوگا (اس وقت بھی جس کا منہ جدھر ہو نماز صحیح ہوتی ہے، اس لئے لوگوں کی جہت مختلف ہو سکتی ہے) التبیین۔ اگر امام نے نماز شروع کرتے وقت عورتوں کی امامت کی نیت کی، اور اس وقت امام کے لئے ایک دو قدم آگے بڑھنا ممکن نہ ہو یا کسی وجہ سے کراہت محسوس کی اور عورت کو اشارہ سے پیچھے جانے کا حکم دیا تو عورت پر پیچھے جانا واجب ہوگا، اگر پیچھے نہ جائے تو اس عورت کی نماز فاسد ہو جائے گی مرد کی نہ ہوگی، جیسا کہ الذخیرہ اور المحیط میں ہے۔

ف۔ اس مسئلہ کا ماحصل یہ ہوا کہ مرد کی نماز عورت سے محاذاۃ کی صورت میں ان شرطوں کے ساتھ فاسد ہوگی جبکہ وہ عورت (۱) قابل شہوت ہو چکی ہے (۲) اور امام نے اس کی امامت کی نیت کی ہو (۳) مرد کے ساتھ ہو (۴) نماز مطلقہ ہو (۵) نماز کے ایک مکمل رکن میں ہو اور دونوں (۶) تحریمہ اور (۷) اداء میں مشترک ہوں، اور دونوں کی (۸) جگہ ایک اور رُخ ایک ہو، دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو یا جگہ خالی نہ ہو، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

ویکره لهن حضور الجماعات، یعنی الشّوابّ منهن لما فیه من خوف الفتنة ولابأس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء وهذا عند ابی حنیفة و قالا یخرجن فی الصلوٰة کلها لانه لا فتنة لقلة الرغبة، فلا یکره کما فی العید، وله ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنة غیر ان الفساق انتشارهم فی الظهر والعصر والجمعة، اما فی الفجر والعشاء هم نائمون، وفی المغرب بالطعام مشغولون، والجبانة متسعة فیمکنها الاعتزال عن الرجال، فلا یکره.

ترجمہ:- اور عورتوں کو جماعتوں میں حاضر ہونا مکروہ ہے، یعنی ان میں سے جو جوان ہوں، کیونکہ ان سے فتنوں کے بڑھنے کا خطرہ ہوتا ہے، اور بڑھیاؤں کو فجر، مغرب اور عشاء کی نمازوں کے لئے نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے، یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ وہ تمام نمازوں کے لئے نکل سکتی ہیں کیونکہ ان کی طرف رغبت کم ہونے کی وجہ سے کوئی فتنہ نہیں ہے، لہٰذا نکلنا مکروہ نہ ہوگا، جیسا کہ بالاتفاق عید کی نماز کے لئے نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ شہوت کی زیادتی آمادہ کرتی ہے، اس لئے فتنہ واقع ہو سکتا ہے، البتہ فساق ظہر، عصر اور جمعہ کی نمازوں میں چلتے پھرتے رہتے ہیں مگر فجر اور عشاء میں وہ سوتے رہتے ہیں، اور مغرب میں وہ کھانے میں مشغول رہتے ہیں، اور جنگل وسیع ہوتا ہے اس لئے ان بڑھیاؤں کو مردوں سے ایک طرف کو ہو جانا ممکن ہوتا ہے، لہٰذا مکروہ نہ ہوگا۔

توضیح:- عورتوں کے لئے جماعت میں حاضر ہونے کا حکم

ویکره لهن حضور الجماعات، یعنی الشّوابّ منهن لما فیه من خوف الفتنة......الخ

عورتوں کو جماعت میں حاضر ہونا مکروہ ہے، عورتوں سے مراد جوان عورتیں ہیں۔ ف۔ یعنی وہ عورتیں جن سے جماع کی رغبت ہو، کیونکہ ان کی حاضری میں فتنہ کا خوف ہے۔ ف۔ اسی لئے حضرت عمرؓ نے منع فرمادیا ہے اور جب عورتوں نے حضرت ام المومنین صدیقہؓ سے شکایت کی تو انہوں نے بھی فرمایا کہ اگر رسول اللہ ﷺ اس وقت کے نماز کی حالت دیکھتے تو جیسے بنو اسرائیل کی عورتیں روک دی گئی تھی تم کو بھی روک دیا جاتا۔ م۔

ولاباس للعجوز ان تخرج فی الفجر والمغرب والعشاء وھذا عند ابی حنیفۃ......الخ
فجر، مغرب اور عشاء تین اوقات میں نکلنے میں بوڑھیوں کے لئے کوئی حرج نہیں ہے، مگر یہ حکم ابو حنیفہؒ کے مسلک میں ہے۔ف۔ کہ تین ہی وقتوں کے لئے وہ نکلیں، وقالا الخ اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ بڑھیائیں تمام نمازوں میں نکل سکتی ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں فتنہ کا خوف نہیں ہے، ان کی طرف رغبت کم ہونے کی وجہ سے، اس لئے ان کا نکلنا مکروہ نہ ہوگا، جیسا کہ بالاتفاق عیدین کی نماز کے لئے نکلنے میں جواز کا حکم ہے حالانکہ وہ وقت بہت روشن ہوتا ہے۔

ولہ ان فرط الشبق حامل فتقع الفتنۃ غیر ان الفساق انتشارھم الظھر والعصر والجمعۃ......الخ
اور ان ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ شہوت کی زیادتی ہی جماع کا سبب بن جاتی ہے، اس لئے فتنہ واقع ہو سکتا ہے۔ف۔ مگر جبکہ فاسق لوگ ہوں غیر ان الفساق الخ البتہ بات اتنی ہے کہ فساق ظہر، عصر اور جمعہ کے اوقات میں چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ف۔ اس لئے ان وقتوں میں بوڑھی عورتیں نہ نکلیں، اما فی الفجر الخ لیکن فجر اور عشاء کے وقت وہ سوتے رہتے ہیں اور مغرب کے وقت وہ کھاتے پینے میں مشغول رہتے ہیں۔ف۔ اس لئے ان تین اوقات میں فاسقوں سے خطرہ نہیں ہوتا اور بوڑھیاں نماز کو نکلیں، لیکن عید کی نماز کو اس پر قیاس کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

والجبانۃ متسعۃ فیمکنھا الاعتزال عن الرجال، فلا یکرہ......الخ
یعنی جنگل وسیع ہوتا ہے اس لئے وسیع میدان میں بوڑھی عورتوں کو مردوں سے کنارے ہو جانا اور بچ کر چلنا ممکن ہے، اس لئے عید گاہ میں ان کا جانا مکروہ نہیں ہے۔ف۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مسجدوں میں جانے سے اللہ کے باندیوں کو منع مت کرو اور اسی جیسی دوسری حدیث ابن عمر وغیرہؓ سے مروی ہے، یہ حکم انتہائی حکم کے قبیل سے ہے، کیونکہ فجور کی زیادتی ہو گئی ہے چنانچہ صحیح روایت میں ہے رسول اللہ نے فرمایا کہ ایسی عورت جس نے فجور کیا ہو یعنی برائی کی ہو وہ ہمارے ساتھ عشاء نماز میں حاضر نہ ہو، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، اور عورتوں کو خوشبو لگانے اور بناؤ سنگار کرنے کی برائی کو تو خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کی ایک جماعت نے بیان فرمایا ہے، چنانچہ بندہ مترجم نے تفسیر کے پارہ ۱۸ میں اظہار زینت کے بیان میں ان حدیثوں کو جمع کر دیا ہے۔

اور صحیح روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ سے مروی ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان چیزوں کو دیکھ لیتے جن کو آپ کے بعد عورتوں نے اپنایا ہے تو ان کو مسجد جانے سے روک دیتے جیسے بنی اسرائیل کی عورتیں روک دی گئیں ام المومنین ام سلمہؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے عورتوں کی بہتر مسجد ان کی کوٹھریوں کے گوشے میں ہے، اس کی روایت احمد نے کی ہے، متاخرین مشائخ کا فتویٰ ہے کہ بوڑھی عورتوں کو بھی ہر وقت مسجد میں جانے سے منع کیا جائے کیونکہ کھلا ہوا فساد ظاہر ہے۔ الکافی۔ اور یہی مختار ہے۔ التبیین۔ اور اسی پر اعتماد ہے کہ ایسی بوڑھی جس میں کچھ بھی جان (جوانی) ہو اسے منع کیا جائے، البتہ بوڑھی کھوسٹ جو ہو گئی ہو وہ مستثنیٰ ہے۔ الفتح۔ اور جو دلیل مصنفؒ نے دی ہے اس کا رواج امام ابو حنیفہؒ کے زمانہ میں ہوگا، اب نہ پنجوقتی نماز میں فرق ہے اور نہ عید گاہ میں۔ م۔ اور جب نماز کے لئے نکلنے کی ممانعت ثابت ہوئی تو وعظ اور علم کی مجلسوں کے لئے نکلنے میں بدرجہ اولیٰ ممانعت ہوگی۔ مع۔

قال ولایصلی الطاھر خلف من ھو فی معنی المستحاضۃ ولا الطاھرۃ المستحاضۃ، لان الصحیح اقوی حالا من المعذور، والشئی لایتضمن ماھو فوقہ، والامام ضامن بمعنی تضمن صلوتہ صلوۃ المقتدی، ولایصلی القاری خلف الامی، ولا المکتسی خلف العاری لقوۃ حالھما۔

ترجمہ:- اور نہ نماز پڑھے پاک آدمی ایسے شخص کے پیچھے جو مستحاضہ کے معنی میں ہے، اور نہ نماز پڑھے پاک عورت مستحاضہ کے پیچھے، اس لئے کہ تندرست شخص اولیٰ ہے معذور شخص سے، اور کوئی چیز اپنے سے بہتر اور اعلیٰ کی ضامن نہیں ہوتی ہے،

حالانکہ امام ضامن ہوتا ہے اس اعتبار سے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کی متضمن ہوتی ہے، اور قاری امی کے پیچھے نماز نہ پڑھے، اور نہ کپڑا پہننے والا انسان ننگے کے پیچھے، کیونکہ قاری اور مکتسی کا حال ان کے مقابل سے اقوی ہے۔

توضیح:-پاک آدمی کی نماز معذور کے پیچھے اور قاری کی نماز امی کے پیچھے اور کپڑے والے کی نماز ننگے آدمی کے پیچھے پڑھنے کا حکم

قال ولایصلی الطاهر خلف من هو فی معنی المستحاضة......الخ

ایسا شخص جو پاک ہے ایسے شخص کے پیچھے جو مستحاضہ کے حکم میں ہے۔ف۔

جیسے وہ شخص جس کو پیشاب کے جاری ہونے کا مرض ہو، یا ہمیشہ ناک سے خون جاری رہتا (نکسیر) ہو، اور بہتا ہوا زخم ہو یا دست جاری ہونے کی بیماری ہو، یا ہوا نکلتی رہتی ہو، اس سے مراد یہ ہے کہ ایک نماز کا پورا وقت اس قسم کے عارضہ کے بغیر نہ پایا جاتا ہو، پس ایسے لوگوں کا وضوء اگرچہ اللہ تعالی کے نزدیک اس کے فضل کی بناء پر پاک ہے لیکن حقیقی طور پر نہیں ہے بلکہ حکمی ہے، کیونکہ ظاہری طور سے اور حساً پاک نہ ہونے کی وجہ سے وہ پاک نہیں کہا جاسکتا ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ پاک مرد معذور مرد کے پیچھے نہ پڑھے

ولا الطاهرة خلف المستحاضة......الخ

اور نہ پاک عورت مستحاضہ عورت کے پیچھے نماز پڑھے۔ف۔ یہ حکم اس وقت ہوگا جبکہ وضوء کے وقت یا اس کے بعد عذر پایا گیا ہو، ورنہ اس کی طہارت کامل ہے۔الزاہدی۔ اور یہ بات پہلے بھی گذر چکی ہے، معذور کی اقتداء اسی جیسے عذر والے شخص کے لئے جائز ہے، اور اگر عذر مختلف ہو تو جائز نہیں ہے۔التبیین۔ اور اگر امام میں دو عذر ہوں مثلاً ہوا نکلتے رہنا اور زخم سے خون کا جاری رہنا، تو اس کے پیچھے ایک عذر والے شخص مثلاً ہوا نکلنے والے شخص کی نماز جائز نہ ہوگی۔الجوہرہ۔ کیونکہ مقتدی امام کے مقابلہ میں تندرست ہے۔م۔

لان الصحیح اقوی حالا من المعذور......الخ

کیونکہ تندرست کا حال معذور کی نسبت سے اقوی ہے۔ف۔ تو اقتداء کرنے سے ایسا ہوا کہ تندرست اور صحیح شخص نے اپنی نماز معذور امام کی ضمانت میں دے دی، والشئی الخ اور یہ بات معلوم ہے کہ کوئی چیز بھی اپنے سے اعلی اور افضل کی ضامن نہیں ہوتی ہے۔

والامام ضامن بمعنی تضمن صلوته صلوة المقتدی......الخ

حالانکہ امام اپنے مقتدی کی نماز کا ضامن ہوتا ہے۔ف۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ امام اپنے مقتدی کی نماز کا ذمہ دار یعنی مکلف ہے بلکہ تضمن صلوته صلوة المقتدی اس معنی کے اعتبار سے ہے کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کی متضمن ہے۔ف۔ اس لئے امام کی نماز مقتدی کی نماز سے کمزور ہو کر اس کو متضمن نہیں ہو سکتی ہے، لیکن میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ مذکورہ بیان اس بات کا تقاضا نہیں کرتا ہے کہ نماز ناجائز بمعنی باطل ہے بلکہ معنی کراہت ہے، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ اس تعلیل کا مطلب یہ ہے کہ عذر کا اعتبار معذور کے حق میں ہے اسی معذور تک ہی حکم رہے گا، جیسا کہ فتح القدیر میں لکھا ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ معذور کے حق میں نماز کا صحیح ہونا مقتدی کی رائے پر بھی ہے اس لئے جب نماز صحیح ہوئی تو امام کی صحیح نماز شامل ــــ ہوگی مقتدی کی صحیح نماز کو، اسی لئے یہ مسئلہ ہے کہ اگر کسی مقتدی کو امام کی ایسی کوئی بات معلوم ہوئی جو خود امام کے خیال میں اس کی نماز کے لئے مفسد ہے جیسے کسی عورت چھونا، ذکر کو ہاتھ لگانا وغیرہ، مگر خود امام کو اس کی خبر نہیں ہے تو مقتدی کی نماز اکثر مشائخ کے قول کے مطابق جائز ہوگی، کیونکہ مقتدی کی رائے اور مسلک کے مطابق امام کی نماز جائز ہے، اور اس کے حق میں اسی کی رائے کا اعتبار ہوگا، تو یہ لازم آیا کہ یہی کہا جائے کہ اس کی نماز جائز ہوگی، اور یہی قول اصح ہے، جیسا کہ

المستبین میں ہے۔ ھ۔

اور امام شافعیؒ کے نزدیک اصح قول کے مطابق معذور شخص کے پیچھے تندرست کی نماز جائز ہے، اور امام زفرؒ کا قول بھی یہی ہے کیونکہ اس نے امام کے حکم کی فرمانبرداری کی ہے، جیسا کہ عینی میں ہے،، لیکن مکروہ ہونا اظہر ہے، واللہ تعالیٰ أعلم

ولایصلی القاری الخ...... اور قاری امی کے پیچھے نہ پڑھے۔ف۔ بقیہ ائمہ کا یہی مذہب ہے۔ مع۔ جس شخص کو ایک آیت بھی یاد ہو وہ ایسے شخص کے پیچھے نہ پڑھے جسے ایک آیت بھی یاد نہ ہو، اسی کو امی کہتے ہیں اور اگر امی کسی گونگے کی اقتداء نہ کرے، کیونکہ امی تحریمہ پر تو قادر ہے۔ المحیط۔ الذخیرہ۔ اور ان سب کا برعکس ہونا جائز ہے۔ ع۔ د۔

ولا المکتسی الخ اور لباس والا ننگے کے پیچھے نماز نہ پڑھے۔ف۔ یعنی جس کا ستر واجب چھپا ہوا ہو وہ ننگے ستر والے کے پیچھے نہ پڑھے۔ **لقوله الخ** کیونکہ قاری اور ستر ڈھانپنے والا، امی اور ننگے سے بہتر اور قوی ہے۔

ویجوز ان یؤم المتیمم المتوضین وهذا عند ابی حنیفة وابی یوسف، وقال محمد لایجوز، لانه طهارة ضروریة والطهارة بالماء اصلیة، ولهما انه طهارة مطلقة، ولهذا لایتقدر بقدر الحاجة، ویؤم الماسح الغاسلین، لان الخف مانع سرایة الحدث الی القدم، وماحل بالخف یزیله المسح، بخلاف المستحاضة، لان الحدث لم یعتبر زواله شرعا مع قیامه حقیقة.

اور یہ جائز ہے کہ تیمّم کرنے والا امامت کرے وضوء کرنے والوں کی، یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے مذہب کے مطابق ہے، لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، کیونکہ تیمّم ضرورت اور مجبوری کی طہارت ہے، جبکہ پانی کی طہارت اصلی ہے، اور ان دونوں یعنی شیخین کے نزدیک تیمّم بھی اصلی طہارت اور مطلقاً طہارت ہے، اس لئے اس تیمّم کو قدر ضرورت تک مقدر نہیں کیا جاتا ہے، اور موزے پر مسح کرنے والا پیر دھونے والے کی امامت کر سکتا ہے، کیونکہ موزہ قدم تک حدث کو اثر کرنے سے منع کرنے والا ہوتا ہے، اور موزے پر جو کچھ لگ جاتا ہے اسے مسح دور کر دیتا ہے، بخلاف مستحاضہ کے یعنی جس کے پیچھے معذور ہونے کی وجہ سے اقتداء جائز نہیں ہے، اس لئے کہ حدث ایسی چیز ہے کہ اس کا زوال شرعاً معتبر نہیں ہوا ہے، حالانکہ وہ حقیقۃ قائم اور موجود ہے۔

توضیح:- تیمّم کرنے والے کے پیچھے وضوء کرنے والے کی نماز اسی طرح موزوں پر مسح کرنے والے کی پیر دھونے والوں کے پیچھے نماز کا حکم

ویجوز ان یؤم المتیمم المتوضین وهذا عند ابی حنیفة وابی یوسف......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے **وهذا عند ابی حنیفة الخ** یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا مذہب ہے۔ف۔ جمہور علماء فقیہ سلف و خلف نیز ائمہ ثلثہ کا قول بھی یہی ہے۔ مع۔ **لانه طهارة الخ** امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جائز نہیں ہے کیونکہ تیمّم تو طہارت ضروریہ ہے۔ف۔ یعنی جب پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو اس وقت کے لئے تیمّم کی اجازت ہے، مگر پانی سے طہارت حاصل کرنا تو اصلی ہے۔

ولهما انه طهارة مطلقة، ولهذا لایتقدر بقدر الحاجة......الخ

اور شیخین کی دلیل یہ ہے کہ تیمّم طہارت مطلقہ ہے۔ف۔ یعنی جب اس کی ضرورت ہو اس وقت مطلقہ اور مستحاضہ کی طہارت کی طرح وقت کے ساتھ مقید نہیں ہے، اسی لئے تیمّم ضرورت کے وقت تک کے لئے نہیں ہے۔ف۔ بلکہ شراب طہور ہے اگرچہ دس سال تک ہو، اور عمرو بن العاصؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عمروؓ کو ایک لشکر کا سردار مقرر کر کے روانہ کیا، جب لوگ سفر سے واپس آئے تو آپ نے ان سے سردار عمروؓ کا حال پوچھا، تو لوگوں نے کہا کہ ویسے تو وہ نیک سیرت ہیں مگر

ایک دن انہوں نے ہمیں جنابت کی حالت میں نماز پڑھائی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے خود عمروؓ سے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ سردی کی رات تھی اور مجھے احتلام ہو گیا تھا اس سے مجھے سخت خطرہ محسوس ہوا کہ اگر میں غسل کروں گا تو مارا جاؤں گا، اس لئے میں نے فرمان الٰہی ﴿لَاتُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ﴾ پر عمل کرتے ہوئے تیمم کر کے ان کو نماز پڑھائی، یہ سن کر آپ نے تبسم فرمایا اور کہا ہے کہ یالك من فقیه عمرو بن العاص، اور لوگوں کو دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا اس کی روایت ابو داؤد اور بخاری نے تعلیقاً کی ہے اصل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ جو کہ شیخین کہلاتے ہیں ان کے نزدیک تیمم پانی کا خلیفہ ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک وضو کا خلیفہ ہے، اس کہنے سے شاید امام محمدؒ کی مراد یہ ہو کہ پانی چونکہ افضل ہے اس کے برخلاف نہیں کرنا چاہئے، واللہ تعالی اعلم۔ مع۔ اگر اُمّی یا اخرس (گونگے) نے قاری کے پیچھے نماز نہ پڑھ کر خود تنہا پڑھ لی تو قول صحیح کے مطابق اس کی نماز جائز ہو گی۔ المجمع۔ ت۔

اور اصح یہ ہے کہ فاسد ہو گی، اگر قاری مسجد کے بالکل قریب ہو یا اس کے دروازہ پر ہو ایسی حالت میں اگر اُمّی مسجد کے اندر نماز پڑھ لے تو بالاتفاق جائز ہو گی، اگر قاری کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور امی اس کے علاوہ دوسری نماز بلا انتظار پڑھ لے تو بالاتفاق اس کی نماز جائز ہو گی۔ ن۔ اگر کوئی سواری پر سوار ہو کر نماز پڑھ رہا ہو اور پیدل شخص اس کی اقتداء کر کے نماز پڑھ لے تو نماز جائز نہ ہو گی، ایسا تندرست جس نے اپنے کپڑے کی ناپاکی نہیں دھوئی وہ اگر ایسے شخص کی اقتداء کر لے جسے کبھی بھی وضوء باقی نہ رہتا ہو تو نماز صحیح نہ ہو گی، جوامع الفقہ۔ ت۔ اگر قاری نے امی کی اقتداء کر کے نماز شروع کر دی تو اس کی نماز اور اقتدا بھی صحیح نہیں ہو گی اس لئے اگر اسے قہقہہ اور زوردار ہنسی آجائے تو اس کا وضوء نہیں ٹوٹے گا۔ ف۔

اور اگر نفل نماز ہو تو اس کی قضاء لازم نہ آئے گی، یہی قول صحیح ہے، امام محمدؒ نے الاصل میں اس کی تصریح کی ہے۔ المحیط۔ ھ۔ مذکورہ مسائل میں بنیادی بات یہ قاعدہ نکلا کہ اگر امام کا حال مقتدی کے برابر یا اس سے بہتر ہو تو سب کی نماز صحیح ہو گی، اور اگر مقتدی سے گھٹی ہوئی حالت ہو تو امام کی نماز صحیح ہو گی

مگر مقتدی کی فاسد ہو گی۔ المحیط۔ اس قاعدہ سے دو صورتیں مستثنیٰ ہیں کہ امام امی اور مقتدی قاری ہو، یا امام گونگا اور مقتدی امی ہو تو امام کی بھی نماز صحیح نہیں ہے۔ قاضی خان۔ خواہ گونگے کو اپنے پیچھے امی ہونا اور امی کو قاری ہونا معلوم ہو یا نہ ہو، ظاہر الروایہ یہی ہے۔ النہایہ۔ مذکورہ حکم اس وقت ہو گا جب امی نے یا گونگے نے جماعت سے نماز پڑھنے کی نیت کی ہو، اور اگر امی اور گونگا تنہا نماز پڑھیں، تو نماز جائز ہو گی، قول صحیح کے مطابق، جیسا کہ مجمع میں ہے، یا فاسد ہے، قول اصح کے مطابق، جیسا کہ النہایہ میں ہے، مزید گفتگو بعد میں ہو گی۔ م۔

ویؤم الماسح الغاسلین، لان الخف مانع سرایة الحدث الی القدم......الخ

اور مسح کرنے والا دھونے والے کی امامت کر سکتا ہے۔ ف۔ یعنی موزوں پر مسح کرنے والا پاؤں دھونے والوں کی امامت کر سکتا ہے۔ م۔ بلا خلاف۔ ع۔ لان الخف الخ کیونکہ موزے حدث کو قدم تک سرایت کرنے سے روکتے ہیں۔ ف۔ اس طرح حدث سے پیروں کی پاکی ختم نہیں ہوتی ہے۔ م۔ اور جو کچھ موزے کے اوپر اثر کیا ہے اسے مسح دور کر دیتا ہے۔ ف۔ اس لئے موزہ والے کی طہارت دھونے والے کی طرح باقی ہے۔ م۔

بخلاف المستحاضة، لان الحدث یعتبر زواله شرعا مع قیامه حقیقة......الخ

برخلاف مستحاضہ کے یعنی ایسے شخص کے پیچھے جس کے کسی بھی عذر کی وجہ سے اس کی اقتداء جائز نہ ہو، اس لئے کہ حدث ایسی چیز ہے کہ شرعاً اس کے زوال کا اعتبار نہ ہوا اگر وہ حقیقت قائم نہ ہو، ف، کیونکہ معذور کا تو حقیقتاً اپنی جگہ موجود رہتا ہے، تو شریعت نے اس کے حدث کے رہنے کے باوجود اسے معذور سمجھا ہے، ایسی بات نہیں ہے کہ اس کے حدث کو معدوم اور ختم ہو جانے والا سمجھا ہو، جو لوگ معذور کے پیچھے پاک کی اقتداء کو جائز سمجھتے ہیں شاید کہ وہ یہ کہتے ہوں گے کہ اگرچہ حدث حقیقتاً

ختم نہیں ہوا ہے مگر حکماً تو وہ پاک ہے اس لئے اس کی امامت جائز ہے واللہ تعالی اعلم۔ م۔ فصد کی پٹی پر اور جبیرہ پر مسح کرنے والا موزہ پر مسح کرنے والے کی طرح ہے۔ الخلاصہ والمحیط۔ ھ ع۔

ویصلی القائم خلف القاعد و قال محمد لایجوز وهو القیاس لقوة حال القائم ونحن ترکناه بالنص وهو ما روی ان النبی علیه السلام صلی اخر صلاته قاعدا والقوم خلفه قیام و یصلی المؤمی خلف مثله لاستوائهما فی الحال الا ان یؤمی المؤتم قاعد او الامام مضطجعاً لان القعود معتبر فیثبت به القوة.

ترجمہ :- اور کھڑا ہو کر پڑھنے والا بیٹھ کر پڑھنے والے کے پیچھے پڑھ سکتا ہے، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جائز نہیں ہے، اور قیاس کا تقاضا بھی یہی ہے، کیونکہ کھڑا ہونے والے بیٹھنے والے کے مقابلہ میں بہتر اور قوی حالت میں ہے، اور ہم نے اس قیاس کو نص موجود ہونیکی وجہ سے ترک کر دیا ہے، اور وہ یہ ہے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی آخری نماز بیٹھ کر ادا فرمائی جبکہ پیچھے سب لوگ کھڑے ہوئے تھے، اور اشارہ کرنے والا اپنے جیسے کے پیچھے پڑھ سکتا ہے، کیونکہ دونوں ایک ہی حال کے ہیں، مگر یہ کہ بیٹھ کر اشارہ کرتا ہو اور امام لیٹے ہوئے اشارہ کرتا ہو (تو یہ جائز نہ ہوگا) کیونکہ قعود معتبر رکن ہے تو اس کی وجہ سے مقتدی کو قوت حاصل ہوتی ہے۔

توضیح :- کھڑے ہو کر پڑھنے والے کی نماز بیٹھ کر پڑھنے والے کے پیچھے حدیث سے دلیل، اشارہ کرنے والے کی نماز اسی جیسے کے پیچھے پڑھنے کا حکم

ویصلی القائم خلف القاعد و قال محمد لایجوز وهو القیاس لقوة حال القائم......الخ

کھڑا ہونے والا بیٹھنے والے کے پیچھے پڑھ سکتا ہے۔ ف۔ یعنی ایسے بیٹھ کر پڑھنے والے کے پیچھے جو رکوع و سجدہ کر سکتا ہو کیونکہ اشارہ کرنے والے کے پیچھے جائز نہیں ہے۔ فع۔ وقال محمد الخ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ قاعد کے پیچھے قائم کی اقتداء جائز نہیں ہے، اور قیاس بھی یہی ہے کیونکہ قائم کا حال قاعد سے قوی ہے۔ ف۔ بلکہ حدیث میں ہے کہ وَاِذَا صَلّیٰ جَالِساً فَصَلُّوْا جُلُوْساً، یعنی جب امام بیٹھ کر پڑھے تو تم بھی بیٹھ کر پڑھو۔ م۔

ونحن ترکناه بالنص وهو ما روی ان النبی علیه السلام صلی اخر صلاته قاعدا......الخ

اور ہم نے قیاس کو نص کے مقابلہ میں ترک کر دیا ہے وهو الخ اور وہ نص یہ ہے جو مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی آخری نماز بیٹھ کر پڑھی۔ ف۔ یعنی سب سے آخر ظہر کی نماز اتوار کے دن پڑھی والقوم الخ اور قوم آپ کے پیچھے کھڑی تھی۔ ف۔ اس طرح سے کہ حضرت ابو بکرؓ جو پہلے سے نماز پڑھا رہے تھے رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے گئے اور باقی لوگوں نے ابو بکرؓ کی اقتداء کی، پھر دوشنبہ کی صبح کی نماز آپ نے ابو بکرؓ کے پیچھے پڑھی ہے جیسا کہ بیہقی نے تصریح کے ساتھ بیان کیا ہے، اور دونوں حدیثیں صحیحین میں موجود ہیں، بخاریؒ نے اپنی اسناد شیخ حمیدیؒ سے نقل کی کہ حدیث اذا صلی جالسا فصلوا جلوسا منسوخ ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا آخری فعل وہی تھا جو ابھی ذکر کیا گیا ہے۔ م۔ مشائخ نے اس بات کی تصریح فرمائی ہے کہ اگر بیمار کسی رکن پر کھڑے ہونے پر قادر ہو اگر تکبیر تحریمہ کے کہنے تک وہ کھڑا ہو سکتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ اتنا کھڑا ہو کر ادا کرلے، اور نص مذکور سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر ہی وہ تکبیر کہی ہو، اس لئے دلیل کے اعتبار سے یہی قوی ہے کہ ایسے امام کے پیچھے کھڑے ہو کر پڑھنا جائز ہے جس نے کھڑے ہو کر تحریمہ باندھ کر قعود کیا ہو، اور امام احمدؒ کا مذہب یہی ہے۔ مختصر۔ الفتح سے، اس طرح دونوں روایتوں میں توفیق کی بہتر صورت یہ ہو گی کہ حدیث اذا صلی جالساً الخ اس وقت ہے جبکہ امام نے بیٹھ کر تحریمہ باندھا ہو تو لوگ بھی بیٹھ جائیں، اس صورت میں منسوخ نہیں ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔ واللہ اعلم۔ م۔

پھر یہ جو بیان کیا گیا ہے کہ لوگ نماز میں حضرت ابو بکرؓ کی اقتداء کرتے تھے، اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ علیہ السلام کے بغل میں تھے اس لئے یہ رسول اللہ علیہ السلام کی آواز لوگوں کو مکبر کی حیثیت سے سناتے تھے، درایہ میں لکھا ہے کہ اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ عیدین اور جمعہ کی نماز میں جو لوگ مکبر بن کر لوگوں کو سناتے ہیں وہ جائز ہے، یعنی صحیح طریقہ سے ضرورت کے مطابق سنانا، ورنہ ہمارے زمانہ میں لوگ گلے پھاڑ کر ضرورت سے زیادہ آواز سے اور اللہ اور اکبر دونوں کے ہمزہ کو خوب کھینچ کر کہتے ہیں تو یہ بات بعید نہیں ہے کہ ضرورت سے زیادہ آواز نکالنا اور چلانا ہوا جس سے نماز فاسد ہو جائے۔ فتح القدیر سے مختصر، پھر اسی بات کی بھی تصریح موجود ہے کہ حضرت ابو بکرؓ رسول کے برابر تھے اور باقی صفیں پیچھے تھیں، تو شاید اسے عذر پر محمول کیا گیا ہو، کیونکہ ابو بکرؓ نماز پڑھا رہے تھے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے تشریف لا کر امامت فرمائی ورنہ مشائخ نے اسی طرح پڑھانے کو بالاتفاق مکروہ کہا ہے، اس سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ اگر امام نماز پڑھا رہا ہو اور اس سے اعلی شخص آکر پہلے امام کا امام بن جائے بشرطیکہ رکعت پوری نہ ہوئی ہو تو نماز صحیح ہو گی مگر میں مترجم نے یہ جزئیہ کسی کتاب میں نہیں دیکھا ہے۔م۔

و يصلي المؤمي خلف مثله لاستوائهما في الحال الا ان يؤمي......الخ

اور اشارہ کرنے والا اپنے جیسے اشارہ کرنے والے کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے۔ف۔ اگرچہ امام بیٹھ کر اشارہ کرتا ہو اور مقتدی کھڑے ہو کر اشارہ کرتا ہو، کیونکہ اس طرح کھڑا ہونا رکن نہ رہا بلکہ اسے چھوڑ کر بیٹھ جانا ہے اولیٰ ہے۔ التمر تاشی۔ عف۔ لہٰذا جائز ہے۔ لاستوائهما الخ کیونکہ حالت میں امام و مقتدی دونوں برابر ہیں۔ف۔ جبکہ حالت ہی برابری کا اعتبار ہے، جیسا کہ المحیط میں ہے الا ان یومی الخ مگر یہ کہ مقتدی بیٹھ کر اشارہ کر سکتا ہو، اور امام لیٹے لیٹے۔ف۔ تو اقتداء جائز نہیں ہے۔ المحیط۔ یہی مذہب مختار ہے۔ التبیین اور تمر تاشیؒ کا قول مختار نہیں ہے، کیونکہ یہ تو تینوں اماموں کے قول کے مطابق علی الاصح جائز ہے۔ مع۔ لان العقود الخ کیونکہ یہ قعود رکن معتبر ہے جس کی وجہ سے مقتدی کو قوت ثابت ہو گی، اور اسکا حال اقوی ہو گا لہٰذا ایسے مقتدی کے لئے ایسے امام کی اقتداء جائز نہ ہو گی۔م۔

ولايصلي الذى يركع ويسجد خلف المؤمي، لان حال المقتدى اقوى، وفيه خلاف زفرؒ، ولايصلي المفترض خلف المتنفل، لان الاقتداء بناء ووصف الفريضة معدوم فى حق الامام، فلايتحقق البناء على المعدوم، قال ولامن يصلي فرضا خلف من يصلي فرضا آخر، لان الاقتداء شركة وموافقة فلابد من الاتحاد.

ترجمہ:- اور وہ شخص جو رکوع اور سجدہ کر سکتا ہو اشارہ کرنے والے پیچھے نماز نہ پڑھے، اس لئے کہ مقتدی کا حال اس کے امام سے بہتر ہے، اس مسئلہ میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے، اور فرض پڑھنے والا بھی نفل پڑھنے والے کے پیچھے نہ پڑھے، اس لئے کہ اقتداء کرنا بناء ڈالنا ہے جبکہ امام کے حق میں فرضیت کا وصف معدوم ہے، اس لئے معدوم شئی پر بناء کرنا متحقق نہ ہو گا، اور وہ شخص بھی نہیں اقتداء کر سکتا ہے جو کوئی فرض نماز پڑھتا ہو ایسے شخص کی جو دوسرا فرض پڑھ رہا ہو، کیونکہ اقتداء کے معنی میں شرکت اور موافقت دونوں ہی چاہیے، اس لئے اتحاد ضروری ہوا۔

توضیح:- رکوع و سجود کرنے والے کی نماز اشارہ کرنے والے کے پیچھے
اور فرض نماز پڑھنے والے کی نفل نماز پڑھنے والے کے پیچھے پڑھنے کا حکم

ولايصلي الذى يركع ويسجد خلف المؤمي، لان حال المقتدى اقوى......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، لان حال المقتدى اس لئے کہ مقتدی کا حال اقوی ہے۔ف۔ امام کے مقابلہ میں وفیہ خلاف الخ اور اس مسئلہ میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے۔ف۔ کہ ان کے نزدیک جائز ہے، جیسے امام شافعیؒ کا قول ہے۔ع۔ اگر امام بیٹھ کر رکوع و سجدہ کرتا ہو اور اس کے پیچھے کچھ لوگ کھڑے ہو کر اشارہ سے رکوع اور سجدہ کرتے ہوں تو بھی جائز ہے، اور اگر امام بھی

اشارہ سے رکوع و سجدہ کرتا ہو تو بھی جائز ہے، اگر امام کھڑا ہو کر رکوع و سجود سے نماز پڑھتا ہو اور پیچھے کچھ لوگ بھی اسی طرح پڑھتے ہوں، اور کچھ لوگ بیٹھ کر رکوع و سجدہ کرتے ہوں، اور کچھ اشاہ سے رکوع و سجدہ کرتے ہوں، اور کچھ لیٹے ہوئے اشارہ سے ادا کرتے ہوں تو سب کی نماز جائز ہے۔ الذخیرہ۔ ع۔

ولایصلی المفترض خلف المتنفل......الخ

فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کے پیچھے نہ پڑھے۔ ف۔ یہی امام مالکؒ کی بھی روایت ہے، اور امام احمدؒ کی روایت بھی یہی ہے ان کے مذہب میں اکثر اصحاب کا یہی مختار مسلک ہے، اور یہی قول سعید بن المسیب، نخعی، زہری، حسن، ابو قلابہ و یحیٰی بن سعید الانصاری اور مجاہد کا قول ہے اور ایک روایت میں طاؤس کا بھی قول ہے۔ م۔

لان الاقتداء بناء و وصف الفريضة معدوم فی حق الامام، فلایتحقق البناء علی المعدوم......الخ

کیونکہ اقتداء کرنا بناڈالنا ہے۔ ف۔ یعنی یہ ایک وجودی چیز ہے یعنی شئی معدوم نہیں ہے، اس لئے فرض میں اقتداء کرنے کے معنی یہ ہوئے کہ مقتدی اپنے فرض کو امام کے فرض میں اقتداء کے طور پر بنیاد بنائے **و وصف الفريضة الخ** حالانکہ امام کے حق میں فرضیت کی صفت نہیں پائی جارہی ہے۔ ف۔ کیونکہ وہ نفل پڑھ رہا ہے، اس لئے اقتداء کے وصف کو کس موجود چیز سے ملائے گا، **فلایتحقق الخ** اس لئے معدم پر بناء کرنا ثابت نہ ہوگا۔ ف۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ فرض پڑھنے والا کسی غیر فرض پڑھنے والے یعنی نفل پڑھنے والے کے پیچھے اقتداء نہ کرے۔

ولامن یصلی فرضا خلف من یصلی فرضا آخر، لان الاقتداء شرکة و موافقة فلابد من الاتحاد......الخ

ایک فرض پڑھنے والا کسی ایسے شخص کی اقتداء نہ کرے جو اس کے علاوہ دوسرا فرض پڑھ رہا ہو۔ ف۔ کیونکہ مقتدی میں اگرچہ امام کے فرض کا وصف پایا جارہا ہے مگر دونوں میں موافقت نہیں ہے کہ مثلاً مقتدی عصر کا فرض پڑھتا ہے اور امام ظہر کا فرض پڑھ رہا ہے، **لان الاقتداء الخ** کیونکہ اقتداء میں شرکت اور موافقت دونوں پائی جاتی ہیں۔ ف۔ کہ صرف شرکت نماز کے افعال میں نہیں ہے **فلا بد الخ** اس لئے اتحاد کا ہونا بھی ضروری ہوا۔ ف۔ یعنی فرض نماز میں متحد ہونا تاکہ تحریمہ میں شرکت اور افعال میں موافقت پائی جائے، اور امام مقتدی کی طرف سے ضامن بنے اس طرح سے کہ مقتدی کی نماز اسی وقت صحیح ہو جبکہ امام کی بھی نماز صحیح ہو۔ م۔

حاصل یہ ہوا کہ دونوں کی نمازوں کا متحد ہونا شرط ہے اس لئے اقتداء صحیح ہوگی ورنہ نہیں پس ظہر کی نماز پڑھنے والے کی اقتداء عصر کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے یا آج کی ظہر کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے کل ظہر کی نماز پڑھنے والے کی اقتداء یا جمعہ پڑھنے والے کے پیچھے ظہر پڑھنے والے کی قضایا ان سب کا برعکس جائز نہ ہوگی۔ محیط السرخسی۔ ع۔ اور یہی امام مالکؒ اور احمدؒ کا قول ہے۔ ف۔ نذر کی نماز پڑھنے والے کی اقتداء دوسرے نذر کی نماز پڑھنے والے کے پیچھے جائز نہیں ہے مگر اس صورت میں جائز ہے جبکہ دونوں کی نذر بالکل متحد ہو رہی ہو۔ محیط اسرخسی، اور اگر دو مردوں میں سے ہر ایک نے دو رکعت نفل پڑھنے کی قسم کھائی تو ہر ایک کی اقتداء دوسرے کے پیچھے جائز ہے۔ المحیط السرخسی۔ کیونکہ اس جگہ ان کا مقصد قسم پورا ہونا ہے، اس وجہ سے وہ نماز نفل ہی کی حیثیت سے رہ گئی ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک قسم کھانے والے کی اقتداء دوسرا قسم کھانے والا کرسکتا ہے۔ ف۔ اسی بناء پر اگر کوئی قسم کھانے والا نذر مان کر پوری کرنے والے کی اقتداء کرے تو نماز جائز ہوگی اور اس کا برعکس ہونے سے جائز نہ ہوگی۔ محیط السرخسی۔

اور طواف کے بعد جو دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں اس میں اس نماز کا سبب طواف ہوا اور ہر ایک کا طواف دوسرے کے طواف سے علیحدہ ہوتا ہے اس لئے طواف کی نماز میں ایک دوسرے کی اقتداء کرے تو نماز جائز نہ ہوگی۔ ف۔ اگر نفل پڑھنے میں دو آدمی شریک ہوئے، اور امام کے فساد کی وجہ سے دونوں کی نماز فاسد ہوگئی اب اگر اس کی قضاء کرتے وقت ان میں سے ایک دوسرے کی

اقتداء کرے تو نماز جائز ہو گی، اور اگر دونوں اپنی نماز نفل تنہا پڑھ رہے تھے پھر ایک نے اپنی نماز فاسد کر دی اس کے بعد اس کی قضاء کی نیت سے پڑھتے وقت ایک دوسرے کی اقتداء کرے تو نماز جائز نہ ہو گی۔ محیط السرخسی۔ اور یہ لوگ کسی نذر ادا کرنے والے کے پیچھے بھی نہیں پڑھ سکتے ہیں، اگر دو مردوں نے ظہر کی نماز پڑھنی چاہی اور ایک نے دوسرے کی امامت کی مگر دونوں نے ہی امامت کی نیت کی، اقتداء کی نیت کسی نے نہیں کی تو دونوں کی نماز جائز ہو گی اور اس وقت یہ سمجھا جائے گا کہ ہر ایک نے تنہا نماز ادا کی ہے، اور اگر ہر ایک نے دوسرے کی اقتداء کی نیت کی تو نماز فاسد ہو گی۔ف۔ محیط السرخسی۔

اگر ظہر کے بعد کی سنتیں پڑھنے والے نے ایسے شخص کی اقتداء کی جو ظہر سے پہلے کی سنت پڑھتا ہو تو یہ اقتداء جائز ہو گی۔ الخلاصہ۔ اگر عشاء کے بعد کی سنت پڑھنے والا ایسے شخص کی اقتداء کرے جو تراویح پڑھ رہا ہو تو یہ اقتداء جائز ہو گی۔ فع۔ اور ایسے دو شخص جو وتر کی نماز جماعت سے پڑھ رہے ہوں مگر ایک ابو حنیفہؒ کے خیال کا تابع ہو اور دوسرا صاحبین کا تابع ہو، یعنی ایک واجب اور دوسرا سنت مانتا ہو، پھر بھی نماز صحیح ہو گی۔ ع۔ ھ۔ باب الوتر میں مزید تفصیل آئے گی۔ م۔ الحاصل اتحاد شرط ہے، اسی لئے فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے یا ایک فرض پڑھنے والے کی اقتداء دوسرے فرض پڑھنے والے کے پیچھے جائز نہ ہو گی۔ م۔

وعند الشافعي يصح في جميع ذلك، لان الاقتداء عنده اداءٌ علي سبيل الموافقة، وعند نا معنى التضمن مراعي.

ترجمہ:-اور امام شافعیؒ کے نزدیک مذکورہ تمام صورتوں میں اقتداء صحیح ہو گی، کیونکہ ان کے نزدیک موافقت کی صورت میں اداء صحیح ہوتی ہے، اور ہمارے نزدیک تضمن کے معنی کی رعایت بھی ضروری ہے۔

توضیح:-امام شافعیؒ کا مسلک اور ان کی دلیل نیز امام ابو حنیفہؒ کی دلیل

وعند الشافعي يصح في جميع ذلك، لان الاقتداء عنده اداء علي سبيل الموافقة......الخ

اور امام شافعیؒ کے نزدیک ان تمام صورتوں میں اقتداء درست ہے۔ف۔ یعنی اس صورت میں جبکہ مقتدی رکوع و سجود کرتا ہو اور امام اشارہ کرتا ہو اور دونوں میں مقتدی فرض ادا کرنے والے ہوں لان الاقتداء الخ کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک ایک کا دوسرے کے موافق ادا کرنا۔ف۔ یعنی صرف اعمال میں موافقت ہو، گویا ان کے نزدیک ہر شخص اپنی نماز تنہا ادا کرتا ہے اور جماعت میں صرف اتنی شرکت ہے کہ وہ جو بھی عمل کرتے ہیں ان کی ادائیگی میں ایک ساتھ ہوتے ہیں۔

وعند نا معنى التضمن مراعي......الخ

اور ہمارے نزدیک اس میں تضمن کے معنی کا بھی لحاظ ہے۔ف۔ یعنی ہمارے نزدیک اعمال کی موافقت کے ساتھ اتنی بات کا اور بھی لحاظ ہوتا ہے کہ مقتدی کی نماز امام کی نماز کے ضمن میں ہے، اسی بناء پر امام کی نماز فاسد ہونے سے مقتدی کی نماز بھی فاسد ہو گی

اور امام کی نماز عمدہ ہونے کی وجہ سے اس کی بھی نماز عمدہ ہو جائے گی، جو اگر تنہا پڑھتا تو بالکل ناقص اور بھدی ہوتی، امام کے ضامن ہونے کی دلیل حضرت ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤتَمَن الخ ابوداؤد و ترمذی نے اسی کی روایت کی ہے، اور بھی ایک صحیح حدیث ہے جس کا بیان آئندہ ہو گا، بالاجماع اس مذکورہ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پوری قوم کی نمازوں کا کفیل و ذمہ دار وجوب اور اداء ہر چیز میں امام ہے، کیونکہ خود ہر شخص پر نماز فرض ہے تو یہ ضمانت نماز کے صحیح اور فاسد ہونے کے بارے میں ہوئی۔

پھر امام شافعیؒ کا اس مسئلہ میں یہ استدلال کہ فرض پڑھنے والے کی نماز نفل پڑھنے والے کے پیچھے وہ حدیث ہے جس میں معاذؓ

عشاء کی نماز میں سورہ بقرہ کی طویل قرأت کرتے اور کسی نمازی نے شکایت کی تو رسول اللہ ﷺ نے معاذؓ کو ملامت کی کہ کیا فتنہ برپا کرنا چاہتے ہو اور اوسط سورتیں مفصلات میں متعین کر دیں، صحیحین میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ معاذؓ عشاء کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھ کر اپنی قوم میں واپس جاکر ان کو بھی نماز پڑھاتے تھے، اس میں مسلم کے الفاظ ہیں، اور بخاری میں اس طرح ہے کہ واپس جاکر ان کو فرض نماز پڑھاتے، استدلال کی وجہ یہ ہے کہ یہ پہلے فرض پڑھ کر آئے پھر امامت کرتے تو ظاہر کہ اس وقت نفل ہی کی نیت کرتے ہوں گے، جبکہ قوم فرض ہی پڑھتی تھی، اس طرح متنفل کے پیچھے مفترض کی نماز ثابت ہوگئی، لیکن معلوم ہونا چاہئے کہ یہ نص خلاف قیاس ہے اس لئے اسے اسی موقع کے لئے منحصر کر دینا چاہئے۔

اسی طرح دوسری روایت ایک اعرابی کی بھی ہے جس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی اس پر صدقہ کردے تو ایک صحابی نے اس کو نماز پڑھادی تو یہ عین فرض نماز میں ہے، اس سے اس بات کا ثبوت نہیں ہوتا ہے کہ اگر کوئی تراویح پڑھتا ہو یا کوئی شخص چار رکعت نفل پڑھتا ہو تو اس کے پیچھے ایک شخص عشاء کی فرض نماز ادا کرلے، کیونکہ اداء نماز کی جماعت بغیر نیت اور نماز واحد کے ثابت نہیں ہوئی ہے۔

اس استدلال میں ہمارے علماء نے اس طرح بحث کی ہے کہ حدیث اس لئے بیان نہیں کی گئی ہے کہ نفل کے پیچھے فرض نماز کی اقتداء صحیح ہے بلکہ اس کے بیان کرنے کا مقصد تو یہ ہے کہ یہ بتادیا جائے کہ امام کو مقتدیوں کی رعایت کئے بغیر طویل قرأت ممنوع ہے، جیسے معاذؓ کرتے اور اسی لئے انہیں منع کیا گیا، پھر ہمارے علماء نے کہا کہ حضرت معاذ کا ایسا کرنا کیا رسول اللہ ﷺ کے علم میں تھا بھی یا نہیں، پھر اگر رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرنا معلوم تھا تو کیا آپ نے مقرر فرمایا تھا یا نہیں پھر مقرر کرنا کیا قوم کی لاعلمی کی وجہ سے تھا یا علم کے ساتھ تھا، پھر اگر حدیث اسی مقصد کے لئے ہوتی تو وہ خلاف قیاس ہوتی وہاں پر قیاس ترک کر دیا جاتا جیسا کہ اماً بیٹھا ہو اور مقتدی کے کھڑے ہونے کی صورت میں کہا گیا ہے، چونکہ حدیث کا مقصود یہ نہیں ہے بلکہ حدیث سے اشارۃً سمجھا گیا ہے، اور وہ بھی اس طرح کہ جب رسول اللہ ﷺ کو حضرت معاذؓ کے طول قرأت کا علم ہوا تو آپ نے ان کو مختصراً قرأت کا حکم دیا، اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے انہیں دونوں جگہ نماز پڑھانے سے منع فرمایا، اب اس میں گفتگو اس طرح ہوتی ہے کہ منع کرنا اگرچہ اس روایت میں مذکور نہیں ہے مگر بہت ممکن ہے کہ آپ نے انہیں اس بات سے بھی منع فرمادیا ہو، کیونکہ دوسری روایت سے ثابت ہے کہ معاذؓ کی شکایت جس نمازی نے کی تھی ان کا نام سلیمؓ ہے، ان سے ہی روایت ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے پاس جاکر عرض کیا کہ ہم لوگوں کے سوجانے کے بعد معاذؓ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہم دن بھر کام کر کے تھکے ہوئے رات میں سوجاتے ہیں، اور اس وقت وہ آکر اذان دیتے ہیں تو ہم اٹھ کر نماز کو جاتے ہیں پھر وہ طویل نماز ہمیں پڑھاتے ہیں، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ ان کو فرمایا کہ تم فتنہ برپا کرنے والے نہ بنو، یا تو میرے ساتھ نماز پڑھو یا اپنی قوم کو مختصر نماز پڑھاؤ، اس کی روایت احمدؒ نے کی ہے۔

شیخ الاسلام عینیؒ اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ ان کا اس طرح پڑھنے کا علم رسول اللہ ﷺ کو نہیں تھا، اسی لئے آپ نے دو باتوں میں سے ایک کے کرنے کی اجازت دی کہ وہ یا تو آپ کے ساتھ پڑھیں پھر قوم کے ساتھ نہ پڑھیں، یا قوم کی امامت کریں تو میرے ساتھ نہ پڑھیں، پس حقیقت اور مقصد کلام تو اس بات سے منع کرنا ہے کہ معاذؓ جب آپ کے ساتھ پڑھیں تو قوم کی امامت نہ کریں، میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ قوم کی شکایت ظاہراً یہ تھی کہ اول تو معاذؓ آپ کے ساتھ نماز پڑھ کر اتنی دیر سے جاتے ہیں کہ ہم لوگ دن کے تھکے ماندے سو جاتے ہیں اور اس پر یہ زیادتی کہ ہمارے جمع ہونے کے بعد طویل قرأت کرتے ہیں، اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے معاذؓ کو جو کچھ فرمایا اس کے معنی میں یہ دو احتمال نکلتے ہیں کہ (ا) میرے ساتھ نماز پڑھو اور قوم کی امامت چھوڑ دو، اور اگر نہیں چھوڑتے اور امامت بھی کرتے ہو تو تخفیف کرو، لیکن یہ معنی ایک قسم کے مجازی معنی ہوئے، اس کے علاوہ اس معنی کی وجہ سے قوم کی ایک شکایت دور نہ ہوئی یعنی حضرت معاذ کا عشاء پڑھ کر

دیر سے جانا (۲) دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ یا تو تم میرے ساتھ نماز پڑھو اور امامت چھوڑ دو، یا امامت کرتے ہو تو تخفیف کرو، اور یہی حقیقی معنی ہیں، اور اس جامع کلام میں دونوں باتیں آگئیں یعنی یہ کہ میرے ساتھ پڑھو تو امامت چھوڑ دو، دوسرے یہ کہ امامت کرو تو بھی تخفیف کے ساتھ کرو، اس صورت میں قوم کی دونوں شکایتیں دور ہو گئیں۔

اس میں اگر یہ احتمال نکالا جائے کہ اس میں احتمال تو اس بات کا بھی ہے کہ امامت چھوڑنے کا حکم اس وجہ سے ہو کہ عشاء بڑھ کر جانے تک تھکی ہوئی قوم انتظار نہیں کر سکتی ہے، ورنہ اگر متصل کے پیچھے مفترض کی نماز صحیح نہ ہوتی تو صاف طریقہ سے منع کر دینا چاہئے تھا، اور جب منع نہیں کیا تو اس سے جائز ہونا ثابت ہو گیا، اس کا جواب یہ ہے کہ منع کرنے کی دو صورتیں ہیں (۱) بات اپنے پیش نظر رکھ کر صاف طریقہ سے کی جائے مثلاً چونکہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی نماز نہیں ہوتی ہے اس لئے تمہاری قوم کی نماز تمہارے پیچھے نہ ہو گی کہ تمہاری نماز نفل اور ان کی نماز فرض ہو گی اس لئے تم امامت نہ کرو، ظاہر ہے کہ اس طرح کہنے سے کلام کافی طویل ہو جاتا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ آپ کو جوامع الکلم عنایت ہو گئے تھے یعنی چند الفاظ میں بڑا سے بڑا مطلب ادا کر دینا، پس آپ نے مختصر سے الفاظ میں منع بھی فرما دیا، معاذؓ کے متعلق مقاصد اور قوم کے مطالب انہیں چند الفاظ میں ادا بھی کر دیا، کیونکہ جب آپ نے یہ فرمایا کہ یا میرے ساتھ پڑھو، یعنی پھر قوم کی امامت نہ کرو، تو اس سے دونوں مطلب نکل آئے کہ اس کام سے منع بھی کر دیا اور معاذؓ کو اجازت بھی دیدی کہ چاہیں تو آپ کے ساتھ ہی نماز پڑھتے رہیں۔

حق یہ ہے کہ منع تو موجود ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں منع کی علت کیا تھی، کیا یہ علت تھی نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنا جائز نہیں ہے یا یہ علت نہ تھی تو بظاہر یہی بات ہے کہ یہ علت نہ تھی، جبتک کہ کسی دوسری سے مفترض کا متنفل کی اقتداء ثابت نہ ہو جائے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ اگر ناجائز ہوتا تو خود ہی قوم کو پڑھی ہوئی تمام نمازوں کے اعادہ کا حکم فرما دیتے، جواب یہ ہے کہ اس نص و اس سوال سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے، کیونکہ اس کے واسطے تو اس کا بیان ہی نہ ہوا تھا، بلکہ اس کی اصل غرض لانبی قرأت سے منع کرنا ہے، اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ نفس روایت سے امام شافعیؒ کا استدلال نہیں ہے بلکہ اس روایت میں معاذؓ کو منع کرنا ذکر نہیں کیا گیا ہے اس لئے اس سے جواز کا حکم ثابت ہوا، پس جب ہم نے دوسری روایت سے منع کرنا ثابت کر دیا تو استدلال جاتا رہا، اور علماء نے اس کا دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ شاید معاذؓ کے پیچھے نفل کی نیت سے نماز پڑھتے ہوں کیونکہ نیت کا حال تو دوسرے کو معلوم نہیں ہو سکتا ہے، اس احتمال کو اس طرح ختم کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پیچھے فرض نماز پڑھنے کی فضیلت کو چھوڑ کر وہ نفل نماز کیوں پڑھتے، پھر فرض نماز کو قوم کے ساتھ کیوں ادا کرتے کہ اس طرح بڑی فضیلت کو چھوڑ کر چھوٹی فضیلت حاصل کرنا ان سے بعید ہے۔

شیخ تقی الدین شافعیؒ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ ایسا سوچنا وہمی بات ہے کیونکہ اپنی قوم کے ساتھ فرض کی ادائیگی بھی تو رسول اللہ ﷺ کے حکم اور آپ کی فرمانبرداری کی وجہ سے تھی اور یہ بھی ایک بڑی فضیلت ہے، اور اگر وہم مذکور کا خیال ہو تو لازم آتا ہے مدینہ منورہ اور اس کے آس پاس کی تمام مسجدوں کے ائمہ پر بھی یہی اعتراض کیا جائے کہ انہوں نے حضور کی اقتداء چھوڑ کر علیحدہ فرائض ادا کئے ہیں، کہا گیا ہے کہ امام شافعیؒ نے اس حدیث کی روایت میں کہا ہے کہ ھی لہ تطوع و لھم فریضۃ، یعنی معاذؓ جو قوم کو نماز پڑھاتے ہیں وہ معاذؓ کے لئے تو نفل ہوتی ہے مگر قوم کے لئے فرض ادا ہوتی ہے، اس سے یہ بات صراحۃ معلوم ہوئی کہ معاذ کی فرض نماز وہی ہوتی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھتے تھے، شیخ تقی الدینؒ وغیرہ نے اس کا رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ یہ جملہ حدیث کا نہیں ہے بلکہ کسی راوی نے بڑھایا ہے، اور چونکہ تمام راویوں نے ذکر نہیں کیا ہے صرف شافعیؒ (اپنی) روایت میں ذکر کرتے ہیں اس سے یہ گمان ہوتا ہے کہ اس جملہ کو امام شافعیؒ نے اپنے اجتہاد سے بڑھایا ہو۔

عینیؒ نے لکھا ہے کہ ابن قدامہ حنبلی اور ابن تیمیہ حرانی حنبلی نے کہا ہے کہ امام احمدؒ نے اس جملہ کو ضعیف کہا ہے، ایک اور وہ حدیث جابرؓ جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوہ ذات الرقاع میں لشکر کے ایک حصہ کو نماز خوف کی دو رکعتیں پڑھائیں، پھر دوسرے حصہ کو بھی دو رکعتیں ہوئیں، اور صلوۃ المسافر کی ہمارے نزدیک دو ہی رکعتیں ہوتی ہیں اس طرح رسول اللہ ﷺ نے پہلے گروہ کو فرض کے طور پر نماز پڑھائی جبکہ دوسری جماعت کی نفل کی حیثیت سے پڑھائی ہے، اگرچہ امام شافعیؒ کے نزدیک کل فرض ہیں۔

طحاویؒ نے جواب دیا ہے کہ یہ اس وقت کی بات ہے جب ایک فرض کو دوبار بھی پڑھنا جائز تھا، پھر اس دعویٰ کو اسناد کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ لوگ ابتدائے اسلام میں ایک فرض کو دوبار پڑھ لیتے تھے یہانتک کہ اس کی ممانعت کر دی گئی، اور ایسا ہی مہلب نے بھی ذکر کیا ہے، پھر یہ حکم حضرت ابن عمرؓ کی اس حدیث سے منسوخ ہو گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس بات سے منع کر دیا ہے کہ کسی بھی فرض کو دن میں دوبار پڑھا جائے، شیخ تقی الدین بن دقیق العیدؒ نے اعتراض کیا کہ یہ تو احتمال پر نسخ ہے۔

اس کا جواب اس طرح دیا گیا ہے کہ طحاویؒ نے ایک حد تک اجتہاد کر کے ترجیح دے کر نسخ پر محمول کیا ہے، اور یہ صحیح بلکہ واجب ہے کیونکہ دو صحیح نص متعارض میں جہانتک ممکن ہو سکے کسی ایک کو ترجیح دینی چاہئے، اور وہ یہاں اسے نسخ پر محمول کرنے سے ہی ممکن ہے، اور جب ہم یوں کہیں کہ ایک نص سے اباحت اور دوسری سے حرمت ہی کو ترجیح ہوتی ہے، تو اس کے بھی یہی معنی ہوئے کہ مباح منسوخ ہے، اور صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے ایک زمانہ کے بعد لوگوں کو نماز خوف ایک ایک رکعت کر کے پڑھائی اور درمیان میں ہر وہ گروہ کو نماز کے مخالف کام کرنے پڑتے تھے، اب اگر نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی نماز صحیح ہوتی تو آپ ہر گروہ کو پوری پوری نماز پڑھا دیتے اور اس طرح رکعات کی تقسیم نہ فرماتے جس سے مقتدیوں کو درمیان نماز کے مخالف کام کرنے کی ہرگز نوبت نہ آتی۔

ویصلی المتنفل خلف المفترض، لان الحاجة فی حقه الی اصل الصلوة، وهو موجود فی حق الإمام، فیتحقق البناء، ومن اقتدی بامام ثم علم ان امامه محدث اعاد، لقوله علیه السلام من ام قوما ثم ظهر انه کان محدثا اوجنبا اعاد صلاته، واعاد وا، وفیه خلاف الشافعی بناء علی ما تقدم، ونحن نعتبر معنی التضمن، وذلك فی الجواز والفساد.

ترجمہ:- اور نفل پڑھنے والا فرض پڑھنے والے کے پیچھے نماز پڑھ سکتا ہے، کیونکہ نفل پڑھنے والے کو اصل نماز کی ضرورت ہے اور یہ بات امام کے حق میں موجود ہے اس لئے اس کے پیچھے اقتداء درست ہو گی، اور جس کسی نے کسی امام کے پیچھے پوری نماز پڑھ لی اور بعد نماز اسے معلوم ہوا کہ اس کا امام محدث تھا (اسے وضو یا غسل کی حاجت تھی) تو اسے چاہئے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے کسی کی امامت کی اور بعد میں اسے معلوم ہوا کہ وہ محدث یا جنبی تھا اسے چاہئے کہ اپنی نماز دوبارہ پڑھ لے اسی طرح مقتدیوں کو بھی دوبارہ پڑھ لینی چاہئے، لیکن اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، اس بناء پر جو گذر گیا ہے، اور ہم لوگ تضمن کے معنی کا اعتبار کرتے ہیں، اور یہ تضمن جائز ہونے اور فاسد ہونے دونوں صورتوں میں ہوتا ہے۔

توضیح:- فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل نماز پڑھنے کا حکم
محدث امام کی اقتداء کر لینے کے بعد کیا حکم ہے، حدیث سے دلیل

ویصلی المتنفل خلف المفترض، لان الحاجة فی حقه الی اصل الصلوة.....الخ

متنفل نمازی مفترض نمازی کی اقتداء کر سکتا ہے۔ف۔ اگرچہ فرض پڑھنے والا آخری دونوں رکعتوں میں قرأت نہ کرے،

التاتارخانیہ، لیکن قول اصح یہ ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں فاتحہ واجب ہے جیسا کہ صاحب درمختار نے عینیؒ سے مسئلہ استنباط کیا ہے، اس لئے اگر فرض پڑھنے والے نے قرأت نہیں کی تو اس نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔ م۔ اور اگر نفل نماز شروع کرنے والے نے اس امام کی اقتداء کو توڑ کر پھر اسی فرض میں فرض پڑھنے والے کی اقتداء اس نیت سے کی کہ اس کی نیت توڑنے سے نفل نماز لازم آگئی ہے وہ ادا ہو جائے تو ایسی قضاء ہمارے نزدیک جائز ہے۔ الکافی۔ ھ۔

لان الحاجة فی حقه الی اصل الصلوة، وهو موجود فی حق الامام، فیتحقق البناء......الخ

کیونکہ متنفل کو اصل نماز کی ضرورت ہے، اور نفس نماز امام کے حق میں خواہ فرض کی نیت سے پڑھتا ہو یا فرض کی نیت سے پورے طور پائی جا رہی ہے، لہٰذا متنفل کے لئے اس امام کی اقتداء درست ہو گی، ومن اقتداء الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ یہ حکم اس وقت تھا جبکہ نماز ختم ہونے کے بعد امام کی حالت کا علم ہوا، اور اگر اقتداء کی نیت سے پہلے ہی امام کا حال معلوم ہو چکا ہو تو بالاجماع ایسے امام کی اقتداء جائز نہ ہو گی۔ ن۔ اور اقتداء کے بعد امام کا محدث ہونا معلوم ہوا تو مقتدی کی نیت اور اس کا اقتداء ہی درست نہ ہونے کی وجہ سے از سر نو نماز پڑھنی ہو گی اور اسے اعادہ کہنا حقیقۃً نہیں ہے بلکہ صرف ظاہراً اعادہ کہا گیا ہے۔ ط۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقتدی کی نماز تو امام کے زیر سایہ یا اس کے ضمن میں ادا ہوتی ہے تو جب امام ہی کی نماز نہ ہوئی تو مقتدی کی بھی از خود باطل ہو گئی، برخلاف امام شافعیؒ کے مذہب کے کہ امام و مقتدی میں سے ہر ایک کی نماز مستقل اور علیحدہ ہے اس لئے ان کے نزدیک مقتدی کی نماز صحیح ہو گی، اور ہم احناف یہ کہتے ہیں کہ دونوں کی نماز باطل ہو گی۔

لقوله علیه السلام من ام قوما ثم ظهر انه کان محدثا او جنبا اعاد صلاته......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ وفیه خلاف الشافعی الخ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے جو بیان کیا جا چکا ہے۔ ف۔ کہ امام شافعیؒ کے نزدیک اقتداء کا مطلب ہے دوسرے کے جاری کام کے موافق اپنے کام کو کر دینا، اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر کی نماز پر اپنی نماز کی بناء کرنا۔

ونحن نعتبر معنی التضمن، وذلك فی الجواز والفساد......الخ

اور ہم تضمن کے معنی کا اعتبار کرتے ہیں۔ ف۔ کہ اقتداء کا مطلب ہے غیر کی نماز پر اپنی نماز کو مبنی کرنا وذاك فی الجواز الخ اور یہ بات یعنی تضمن تو بہر صورت پائی جاتی ہے خواہ جائز ہونے کی صورت ہو یا باطل ہونے کی۔ ف۔ اگر حدیث مذکورہ من ام قوما الخ درجہ صحت یا اس کے قریب بھی پہونچ جائے تو اس سے استدلال کافی ہے، ورنہ تضمن کے معنی کا ثبوت ہو تو کافی ہے، اس لئے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ حدیث مذکور صحیح نہیں ہے بلکہ غریب ہے۔ ف۔ ع۔ ز۔ لیکن امام محمدؒ نے الآثار میں ابراہیم بن یزید المکی کی اسناد سے خود حضرت علیؓ کی حالت جنابت میں امامت کا واقعہ بیان کیا، جیسا کہ عینی اور فتح القدیر میں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سند میں ابراہیم بن یزید مذکور متروک الحدیث ہے (یعنی ایسا شخص ہے جس کی روایت محدثین کے نزدیک قابل قبول نہیں ہوتی ہے) لہٰذا یہ اسناد صحیح نہیں ہوئی۔ م۔

اس موقع میں مصنفؒ کے مناسب تھا کہ اس حدیث کو حجت میں پیش کرتے جسے ابوداؤد اور ترمذی نے حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اَلْاِمَامُ ضَامِنٌ وَالْمُؤَذِّنُ مُؤْتَمَنٌ اَللّٰهُمَّ اَرْشِدِ الْاَئِمَّةَ وَاغْفِرْ لِلْمُؤَذِّنِیْنَ، یعنی امام مقتدیوں کی نماز کا ضامن ہے، اور موذن ان کا امانت دار ہے، الٰہی اماموں کو ہدایت کی توفیق عطا فرما، اور موذنوں کو بخش دے، اس حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ امام ضامن ہے، اس کے معنی یہی ہیں کہ قوم کی نمازیں ادا کرنے کا ذمہ دار ہے کوئی ایسا شخص ہے جو قوم کے ماسوا ہے (یعنی امام) کیونکہ نماز تو خود ہر شخص پر واجب ہے، اس سے معلوم ہوا کہ امام قوم کی نمازوں کے صحیح اور فاسد ہونے کا ذمہ دار ہے، اسی لئے بالاجماع نمازی جب محدث یا جنبی ہوتا ہے تو اس کی نماز باطل ہوتی ہے، اس لئے جب آدمی جنبی ہو گا تو جن کی نمازوں کا وہ ضامن تھا ان کی نمازیں بھی خود اس کی نماز کے ساتھ فاسد ہو گی، یہی مطلوب ہے، کسی نے

اعتراض کیا ہے کہ اس حدیث کی اسناد میں اضطراب ہے، جواب یہ ہے کہ امام احمدؒ نے یہ روایت عبدالعزیز بن محمد عن سہیل بن ابی صالح عن ابیہ ابی ہریرۃ مرفوعاً روایت کی ہے، اور یہ اسناد صحیح ہے، تنقیح میں کہا ہے کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں تقریباً چودہ حدیثیں اسی اسناد سے روایت کی ہیں۔

پھر اعتراض ہوا کہ ابوداؤد کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز فجر میں داخل ہوئے پھر لوگوں کو اشارہ فرمایا کہ اپنی جگہوں پر کھڑے رہو، تھوڑی دیر بعد آپ اس حال میں تشریف لائے کہ آپ کے سر سے پانی ٹپکتا تھا، آکر آپ نے انہیں نماز پڑھائی، اور جب فارغ ہوئے تو فرمایا: کہ میں بھی بشر ہوں اور میں اس وقت حالت جنابت میں تھا، اس کی اسناد صحیح ہے، پس اگر اس حالت میں تکبیر تحریمہ منعقد نہ ہوتی تو کھڑے رہنا کا کیوں حکم دیتے۔

جواب یہ ہے کہ اول تو اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ وہ تکبیر باقی رہی تھی، کیونکہ اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ واپس آکر تکبیر کہی، دوم ابن سیرین کی روایت میں ہے کہ ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنی جگہ بیٹھ جاؤ، اور صحیح مسلم میں ہے کہ آکر اپنے مصلی پر کھڑے ہوئے اور تکبیر سے پہلے آپ کو بات یاد آگئی۔ آخر تک۔ جب یہ حال ہے کہ صرف تکبیر کہنے سے استدلال ہو اور وہ بھی ثابت نہ ہو سکی تو وہ کیوں کر حجت بن سکتی ہے، لہٰذا یہ دعویٰ بالکل صحیح ثابت ہوا کہ اعادہ واجب ہے۔ م۔ امام پر واجب ہے کہ قوم کو اس وقت کی نماز کے سلسلہ میں جنبی یا محدث ہونے سے مطلع کردے جہاں تک ممکن ہو خواہ زبانی یا خط سے کسی شخص کے ذریعہ سے، یہی قول اصح ہے، بشرطیکہ مقتدی محدود اور متعین ہوں، ورنہ امام پر لازم نہیں ہے۔ البحر بحوالہ معراج الدرایہ۔

اسی طرح اگر کوئی رکن یا شرط چھوٹ گئی ہو یا فوت ہو گئی ہو تو بھی خبر کرنا واجب ہے۔ د۔ تو بری الذمہ ہو جائے گا، اور مقتدیوں کے خیال میں اگر وہ عادل یا سچا جانا جاتا ہو تب اعادہ واجب ہوگا ورنہ مستحب ہوگا۔ م۔ د۔ اگر کسی امام نے زمانہ تک نماز پڑھائی اور آخر میں وہ کہتا ہے کہ میں نے بغیر وضوء یا ناپاکی کی حالت میں یا نجاست کے ساتھ نماز پڑھائی تو مقتدیوں پر اس کا اعادہ واجب نہیں ہے کیونکہ وہ بلاشبہ فاسق ہوا اور ایسے شخص کا قول مقبول نہیں ہوتا، جیسا کہ اس نے یہ کہا ہو کہ میں تو مجوسی تھا تو بھی اس کا اعادہ نہ ہوگا کیونکہ اس صورت میں تو کفر کی تصریح ہے، اور اس کا حکم مرتد کا ہے، اس لئے اس پر اسلام پر باقی رہنے کے لئے جبر کیا جائے گا، اور سخت ترین سزا دی جائے گی۔ المجتبیٰ۔ ع۔ اگر مجوسی یا فاسق غیر ذمہ دار لاپرواہ نہ ہو اور اس بات کا احتمال ہو کہ اس نے احتیاط اور پرہیزگاری کے طور پر کہا ہو تو لوگ اپنی نمازیں دہرالیں، اسی طرح اگر یوں کہا ہو کہ میرے کپڑے میں نجاست تھی۔ الخلاصہ۔ ھ۔ یعنی مجھے معلوم نہ تھا، عمداً ایسا نہیں کیا ہے۔ م۔ اور یہی حکم ہے اگر ظاہر ہو جائے کہ امام کافر یا مجنون یا عورت یا خنثیٰ یا امی تھا، یا بغیر تحریمہ یا حالت حدث میں یا جنابت میں پڑھائی۔ التبیین۔ واضح ہو کہ ایسا مجنون جس کا جنون مستقل ہو، اس کی اقتداء اور مست نشہ کی اقتداء صحیح نہیں ہے، اور اگر ایسا ہو کہ اس میں کبھی کبھی افاقہ بھی ہوتا رہتا ہو تو اس کے افاقہ کے زمانہ میں اس کی اقتداء صحیح ہے۔ قاضی خان۔ خواہ افاقہ کا وقت مقرر ہو یا نہ ہو، یہی روایتیں ظاہرہ ہیں، اور فقیہ ابواللیث نے ان ہی روایات کو اختیار کیا ہے۔ التاتارخانیہ۔

واذا صلى امي بقوم يقرؤن و قوم اميين فصلا تهم فاسدة عند ابى حنيفة، وقالا صلوة الامام ومن لم يقرأ تامة، لانه معذور ام قوما معذورين، فصار كما اذا ام العارى عراة ولابسين، وله ان الامام ترك فرض القراء ة مع القدرة عليها فتفسد صلوته، وهذا لانه لو اقتدى بالقارى تكون قراء ته له، بخلاف تلك المسألة وامثالها، لان الموجود فى حق الامام لايكون موجودا فى حق المقتدى.

ترجمہ:-اور جبکہ نماز پڑھائی امی نے ایسے لوگوں کو کچھ ان میں قرأت کر سکتے ہوں اور کچھ ان میں قرأت نہیں کر سکتے ہوں، یعنی امی ہوں تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان تمام نمازیوں کی نماز فاسد ہوگی، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام کی اور ان لوگوں کی جو امی ہوں نماز پوری ہو جائے گی، کیونکہ امام خود بھی امی ہے اور اس نے امیوں کی اقتداء کی ہے لہٰذا یہ سب معذور سمجھے جائیں گے، تو

ایسا ہو جائے گا کہ ننگے امام نے ننگوں اور کپڑے پہننے والوں ہر قسم کے لوگوں کو نماز پڑھائی ہو، اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ امام قدرت ہونے کے باوجود فرض قراۃ کو چھوڑ دیا ہے لہٰذا اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور یہ بات اس لئے ہے کہ اگر وہ قاری کی اقتداء کر لیتا تو اس امام کی قرأت اس کی قرأت ہو جاتی، بخلاف اس خاص مسئلہ اور اس جیسے دوسرے مسئلوں کے کہ ان مسائل میں جو بات امام کے لئے حاصل ہے وہ مقتدی کے لئے حاصل نہ ہو جائے گی۔

توضیح:-امی نے قاریوں اور امیوں کی امامت کی تو کیا حکم ہوگا

واذا صلی امی بقوم یقرؤن و قوم امیین فصلا تھم فاسدة عند ابی حنیفة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے **لانه معذور قوما الخ** صاحبین کے مسلک کی دلیل یہ ہے کہ معذور امی نے اپنے جیسے معذوروں کی امامت کی ہے۔ف۔ اور یہ صورت بالاتفاق صحیح ہے **فصار الخ** پس ایسا ہو گیا جیسے ننگے نے ننگوں اور ستر ڈھکے ہوئے ہر قسم کی امامت کی ہو۔ف۔ کہ اس صورت میں بالاتفاق ننگے امام اور ننگے مقتدیوں کی نماز جائز ہے، اور ستر ڈھکے ہوئے لوگوں کی نماز فاسد ہے۔ الخلاصہ۔ ح۔ اسی طرح یہاں بھی امی امام امی مقتدیوں کی نماز جائز اور قاریوں کی نماز فاسد ہونی چاہئے، میں مترجم کہتا ہوں کہ دونوں مسئلوں میں فرق ہے، کیونکہ اگر امام ایسے شخص کو مقرر کیا جائے جو ستر ڈھانپے ہوئے ہو تو اس کی وجہ سے ننگے مقتدیوں کو بھی ڈھکا ہوا نہیں سمجھا جائے گا، اس کے برخلاف اگر قاری کو امام بنایا جائے تو اس کی قرأت اس کے تمام مقتدیوں کی طرف سے خواہ وہ بھی قرأت کر سکتے ہوں یا وہ امی ہی ہوں سے قرأت فرض کر لی جائے گی، اور وہی قرأت سب کے لئے ہو جائے گی، اسی لئے مصنفؒ نے امام اعظمؒ کی دلیل لکھی ہے کہ **وله ان الامام الخ** اور امام اعظمؒ کی دلیل ہے کہ اس مسئلہ میں امام یعنی امی نے فرض قرأت کو ترک کیا ہے، حالانکہ اسے (بالواسطہ) قرأت پر قدرت حاصل تھی تو اس امام کی نماز فاسد ہو گئی۔ف۔ اور اس کی وجہ سے تمام مقتدیوں کی بھی نماز فاسد ہوئی۔

وھذا لانه لو اقتدی بالقاری تکون قراء ته له......الخ

اور اس سوال کا جواب کہ امام کو کس طرح قدرت حاصل تھی جو اس نے ترک کی ہے یہ ہے کہ **لانه لو اقتدای الخ** اس لئے کہ اگر یہ امی امام کسی قاری کو امام بنا کر خود اس کی اقتداء کر لیتا تو اس امام قاری کی قرأت اس کے لئے بھی مان لی جاتی۔ف۔ اور ایسا کرنا یعنی قاری کو امام بنا دینا اس کے اختیار میں تھا تو گویا اس نے اپنے اختیار سے فرض قرأت چھوڑی ہے، ورنہ قاری کی قرأت اس امی کی قرأت ہو جاتی۔

بخلاف تلك المسألة وامثالها، لان الموجود فی حق الامام لایکون موجودا فی حق المقتدی......الخ

بخلاف اس مسئلہ۔ف یعنی ننگے اور ستر ڈھکے ہونے کے **وامثالها الخ** اور اس جیسے دوسرے مسائل کے۔ف جیسے ایک زخمی نے دوسرے چند زخمیوں اور چند تندرستوں کی امامت کی یا اشارہ کرنے والے نے چند اشارہ کرنے والوں اور کچھ قدرت رکھنے والوں کی امامت کی کہ ان تمام مسائل میں امام کی قوت اس کے مقتدیوں میں نہیں آتی ہے، **لان الموجود الخ** کیونکہ ان مسائل میں جو بات امام کو حاصل ہے وہ مقتدیوں کو حاصل نہ ہوگی۔ف اس طرح سے کہ ستر ڈھکے یا تندرست کو امام بنا دینے سے مقتدی کے بارے میں شریعت نے یہ حکم نہیں دیا ہے کہ مقتدیوں کا بھی ستر ڈھک گیا، یا رکوع و سجدہ ادا ہو گیا، پس اس فرق کی بناء پر ایک کا دوسرے پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، پھر اگر یہ کہا جائے کہ جب قاری کی وجہ سے امی کو قرأت کی قدرت ہوتی ہے، تو لازم آتا ہے کہ امی کی نماز کبھی بھی درست نہ ہو، جبتک کہ وہ کسی قاری کے پیچھے نہ پڑھ، حالانکہ تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ:۔ (باقی آئندہ)

ولو کان یصلی الامی وحده والقاری وحده جاز هو الصحیح، لانه لم یظهر منهما رغبة فی الجماعة، فان قرأ الامام فی الاولیین ثم قدم فی الاخریین امیا فسدت صلاتهم، وقال زفرؒ لا تفسد لتأدی فرض القراءة.

ترجمہ:-اور اگر ایک ہی جگہ امی بھی تنہا نماز پڑھتا ہو اور قاری بھی تنہا نماز پڑھ رہا ہو تو ان میں سے ہر ایک کی نماز صحیح ہو گی اور یہی صحیح قول ہے، کیونکہ ان میں سے کسی کی بھی جماعت کی رغبت ظاہر نہیں ہوئی، اور اگر امام نے اپنی پہلی دو رکعتوں میں قرأت کی لیکن آخری دو رکعتوں میں اس نے کسی امی کو اپنا قائم مقام بنادیا تو سب کی نماز فاسد ہو گئی، لیکن امام زفرؒ نے فرمایا ہے کہ کسی کی بھی نماز فاسد نہیں ہوئی کیونکہ فرض قرأت ادا ہو چکی ہے۔

توضیح:- قاری نے تنہا نماز پڑھی اور امی نے بھی ایک جگہ تنہا نماز پڑھی تو کیا حکم ہو گا اگر امام نے پہلی دو رکعتوں میں قرأت کی پھر امی کو اپنا قائم مقام بنادیا تو کیا حکم ہو گا تشہد کی حالت میں امی کو آگے بڑھایا

ولو كان يصلي الامي وحده والقارى وحده جاز هو الصحيح......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔اس جگہ یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر امی قاری کی اقتداء کرلیتا تو اس کی نماز بھی قرأت کے ساتھ ادا ہو سکتی تھی اور اب تنہا پڑھنے کی وجہ سے اس کی نماز بلا قرأت کیوں جائز ہو گی، جواب یہ ہے کہ اس صورت کی کوئی روایت ابو حنیفہؒ سے مروی نہیں ہے، جیسا کہ شرح الطحاوی میں مذکور ہے۔ف۔ پھر بعض مشائخ نے اس صورت میں بھی امی کو قرأت پر قادر سمجھ کر کہا ہے کہ امی کی تنہا نماز موجودہ صورت میں فاسد ہے، اور کچھ دوسرے مشائخ نے کہا ہے کہ امی کو قدرت اسی وقت میسر ہوئی ہے جب وہ جماعت پالے، اور اس پر یہ واجب نہیں ہے کہ قاری جہاں بھی وہ اسے تلاش کر کے جماعت سے پڑھے، پس جب جماعت نہیں ہوئی تو امی کو قدرت نہیں پائی گئی اس لئے اس کی نماز صحیح ہو گئی۔

لانه لم يظهر منهما رغبة فى الجماعة......الخ

کیونکہ امی و قاری دونوں میں سے ایک نے بھی جماعت کی رغبت نہیں کی، مصنفؒ نے اسی کی تائید کی اور اسی کو صحیح کہا ہے، لیکن اگر قاری نے نماز شروع کر دی اس کے بعد امی آیا اور اس کی اقتداء نہ کر کے تنہا ہی نماز پڑھ لی تو قول اصح یہ ہے کہ اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہو گی۔النہایہ۔ پھر اس جگہ فتح القدیر اور النہایہ کے کلام میں اضطراب ہے، اور بندہ مترجم کے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ جن مشائخ کے نزدیک جماعت سے پڑھنا واجب ہے، ان کے نزدیک اس امی پر جماعت سے پڑھنا لازم ہو گا، اور اس صورت میں اسے قرأت پر قدرت حاصل تھی، اور اس نے قصداً اسے چھوڑ دیا لہذا اس کی تنہا نماز درست نہ ہو گی، لیکن جن مشائخ کے نزدیک جماعت سے پڑھنا واجب نہیں مثلاً مصنفؒ تو اسے قدرت اسی وقت مانی جائے گی جب جماعت اسے مل گئی ہو، اسی لئے رغبت نہ ہونے کی مصنفؒ نے توجیہ کی ہے پس اس کی تنہا نماز صحیح ہو جائے گی، اسے اچھی طرح سے سمجھ لیں، میں مترجم نے یہ کلام کہیں نہیں پایا ہے، **فالله تعالى اعلم بالصواب**۔م۔

اگر کسی نے اس نیت کے ساتھ احرام باندھا کہ کسی کی امامت نہیں کروں گا مگر دوسرا کوئی آکر اس کی نماز میں شامل ہو گیا تو اس کی نماز صحیح ہو جائے گی۔ف۔اگر کسی امی کے ساتھ آس پاس کوئی قاری ہو تو اس امی پر اس قاری کی طلب یا اس کا انتظار واجب نہیں ہے کیونکہ اس امی کو دوسرے کسی پر بھی حکومت حاصل نہیں ہے تاکہ طلب لازم ہو، اور قدرت اسی وقت مانی جائے گی جبکہ قاری موجود اور اس کے مطابق ہو۔الکافی۔اس جگہ مطاوع سے مراد غالباً جماعت کا طالب ہونا ہے **والله اعلم**.م.

فان قرأ الامام فى الاولیين ثم قدم فى الاخريين اميا فسدت صلاتهم......الخ

اگر امام نے پہلی دونوں رکعتوں میں قرأت کی اور آخری دونوں رکعتوں کے لئے کسی امی کو اپنا خلیفہ بنادیا۔ف۔خواہ دونوں رکعتوں کے لئے یا ایک رکعت کے لئے، مثلاً مغرب کی نماز میں پہلی رکعتوں کے پڑھ لینے کے بعد تیسری رکعت کے لئے اسے خلیفہ بنادیا، اور مذہب کی معروف روایت یہ ہے کہ آخر رکعتوں میں قرأت لازم نہیں ہے تو بھی یہی حکم ہے یعنی فسدت

صلوتھم الخ سب مقتدیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی، جس طرح کسی بچے کو یا کسی عورت کو خلیفہ بنا دینے سے فاسد ہو جاتی ہے۔ ن۔ وقال زفرؒ الخ اور زفر نے فرمایا ہے کہ فاسد نہ ہوگی کیونکہ فرض قرأت ادا ہو گیا ہے۔ ف۔ اور آخری رکعتوں میں تو قرأت فرض نہیں ہے بلکہ مستحب ہے لہٰذا اس میں قاری اور امی سب برابر ہوں گے۔

ولنا ان کل رکعة صلوة فلا تخلو عن القرء ة اما تحقیقا او تقدیرا ولا تقدیر فی حق الامی لا نعدام الاھلیة وکذا علی ھذا لو قدمه فی التشھد واللہ تعالی اعلم بالصواب.

ترجمہ:- اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ہر رکعت حقیقۃً نماز ہے، لہٰذا کوئی رکعت بھی قرأت سے خالی نہیں ہوگی، قرأت خواہ حقیقۃً ہو یا حکماً ہو، اور امی کے حق میں قرأت حکماً نہیں ہوتی ہے کیونکہ اس میں تو قرأت کی اہلیت ہی نہیں ہے، اسی طرح یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جبکہ قاری نے تشہد کی حالت میں امی کو خلیفہ بنادیا ہو، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

توضیح:- مقیم کا مسافر کے ساتھ مقتدی ہونا، مقیم نے عصر کی دو رکعتیں پڑھیں اور آفتاب غروب ہو گیا، پھر مسافر نے آکر اقتداء کی، اقتداء مسبوق کی مسبوق کو، لاحق کی لاحق کے ساتھ اور اتری ہوئی سواری کے ساتھ، تتلے کی اقتداء تتلے کے ساتھ، امام کے کپڑوں کے نیچے چھپی ہوئی تصویریں ہوں یا انگوٹھی یا درم پر تصویریں ہو، اصلی امام گمان کر کے اقتداء کی اور وہ خلیفہ نکلا، چار مقامات میں امام کی متابعت نہیں کی جاتی ہے، نو چیزیں ایسی ہیں کہ اگر امام انہیں نہ کرے تو مقتدی کرے

ولنا ان کل رکعة صلوة فلا تخلو عن القرء ة اما تحقیقا او تقدیرا......الخ

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ہر رکعۃ حقیقتاً نماز ہے اس لئے قرأت سے خالی نہ ہوگی، خواہ قرأت حقیقۃً ہو یا تقدیراً ہو۔ ف۔ چنانچہ پہلی دو رکعتوں میں حقیقۃً ہے اور آخری دونوں رکعتوں میں تقدیراً ہے اس حدیث کی وجہ سے کہ اولین کی قرأت اخیرین کی قرأت ہے، پس جبکہ آخری دونوں رکعتوں میں تقدیراً واجب ہے تو امی خلیفہ کے حق میں بھی لازماً یہ تقدیر قرأت مقدر کرنی ہوگی ولا تقدیر الخ حالانکہ امی کے بارے میں قرأت کا مقدر کرنا بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے اندر تو صلاحیت ہی نہیں ہے۔ ف۔ کسی چیز کا مقدر کرنا وہیں معتبر ہوتا ہے جہاں ممکن بھی ہو، اور امام کی قرأت جو امی مقتدی کی بھی قرأت مانی جاتی ہے وہ تقدیراً نہیں اس پر ولایت اور امارت کی وجہ سے ہے، جیسا کہ کافی میں ہے، اور اگر ہم آخری رکعتوں میں بھی قرأت کو فرض مان کر کہیں جب تو اختلاف پورا واضح ہوگا، وکذا علی ھذا الخ اور اسی طرح اسی سبب سے اگر امام نے تشہد کی حالت میں کسی امی کو اپنا قائم مقام بنادیا ہو۔ ف۔ مثلاً امام کے سجدہ سے سر اٹھاتے ہی اسے حدث ہو گیا تو اس نے کسی امی کو اپنا خلیفہ بنا دیا ایسی صورت میں نماز فاسد ہو جائے گی، بخلاف امام زفرؒ کے، اور اگر امام کو مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد حدث ہوا اور اس نے امی کو اپنا خلیفہ بنادیا تو بالاجماع اس کی نماز پوری ہو گئی، فخر الاسلامؒ نے بھی یہی کہا ہے، اور یہی قول صحیح ہے۔ ع۔

چند ضروری مسائل

کسی مقیم کا نماز کے وقت کے اندر یا وقت کے ختم ہونے کے بعد کسی مسافر کا مقدی بننا صحیح ہے، لیکن مسافر کا مقیم کی اقتداء کرنا صرف وقت کے اندر صحیح ہے۔

نمبر ۲۔ کسی مقیم نے عصر کی دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں کہ آفتاب غروب ہو گیا اس کے بعد مسافر نے اسی عصر کے وقت میں اقتداء کی تو اقتداء صحیح نہیں ہوگی۔ الخلاصہ۔

نمبر ۳۔ امام تمر تاشیؒ نے ذکر کیا ہے کہ امی پر واجب ہے کہ دن رات کوشش کر کے اتنا قرآن سیکھ لے جس سے نماز جائز

ہوتی ہے، اور اگر کوتاہی کی تو وہ عند اللہ معذور نہ ہوگا۔ النہایہ۔ ائمہ ثلثہ کا بھی یہی قول ہے۔ ع۔

نمبر۴۔ مقدار فرض سیکھ لینے کے بعد اتنا اور بھی سیکھ لینے کی کوشش کرے جو مقدار واجب ہے ورنہ گنہگار ہوگا۔

نمبر۵۔ اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے مسبوق کے ساتھ مسبوق کا، نمبر۶۔ اور نہیں صحیح ہے لاحق کے ساتھ لاحق کا۔

نمبر۷۔ اور نہ اترے ہوئے کا سوار کے ساتھ۔ الخلاصہ۔

نمبر۸۔ اور نہ الثغ کے پیچھے جو بعض حروف نہیں نکال سکتا ہو (تتلا) البتہ اگر ایک الثغ (تتلا) اپنے ہی جیسے الثغ کی اقتداء کرے تو درست ہوگی، بشرطیکہ اس جماعت میں کوئی بھی ان حروف کا ادا کرنے والا نہ ہو، اگر کوئی موجود ہو تو الثغ کی امامت سے الثغ سمیت سب کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

نمبر۹۔ اور جو شخص کہ وقف کی جگہ وقف نہ کرتا ہو اور بے جگہ وقف کرتا ہو، یا پڑھتے وقت بہت کھانستا ہو، یا وہ حرف ت کو یا حرف ف کو کئی بار نکالتا ہو تو اسے امامت نہیں کرنی چاہئے۔

نمبر۱۰۔ اور اگر کوئی شخص مشقت کے ساتھ صحیح حرف نکالے تو اس کی امامت مکروہ نہیں ہے۔ المحیط۔

نمبر۱۱۔ اگر امام کے کپڑوں کے نیچے چھپی تصویریں ہوں یا انگوٹھی یا درہم پر چھوٹی تصویر ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ قاضی خان۔

نمبر۱۲۔ اگر کسی نے اپنے امام کی اقتداء کے وقت یہ گمان کیا کہ اصلی امام ہے اس نماز میں کسی کا قائم مقام نہیں ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ دوسرے کا قائم مقام ہے تو اس سے نماز درست ہوگی اور کوئی حرج نہ ہوگا۔

نمبر۱۳۔ اور اگر کسی کی اقتداء اس خیال سے کی کہ یہ دوسرے کا قائم مقام ہے مگر بعد کو اسے یہ معلوم ہوا کہ یہی اصل امام ہے تو یہ نماز صحیح نہ ہوگی۔

نمبر۱۴۔ اور اگر اقتداء کی نیت کرتے وقت اسے یہ خیال تھا کہ امام فلاں شخص ہے مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ کوئی دوسرا شخص ہے تو اقتداء صحیح ہے اور اگر زید کا یقین کرتے ہوئے اقتداء کی اور وہ دوسرا شخص ثابت ہوا تو یہ اقتداء صحیح نہیں ہے، جیسا کہ صغریٰ میں ہے۔

نمبر۱۵۔ چار مواقع میں امام کی موافقت نہیں کرنی چاہئے، نمبر۱۔ جبکہ امام دو سجدوں کے بعد تیسرا زائد سجدہ کر رہا ہو، نمبر۲۔ عیدین کی تکبیرات میں اگر امام چھ سے زیادہ تکبیریں کہے تو جتنی تکبیریں حدیث اور اقوال صحابہ میں پائی گئی ہیں ان میں متابعت کرلے اور اگر امام چھ سے زیادہ تکبیریں کہے تو ان میں متابعت نہ کرے، نمبر۳۔ اگر نماز جنازہ میں امام چار سے زیادہ تکبیریں کہے تو ان میں متابعت نہ کرے؛ نمبر۴۔ اگر چوتھی رکعت کے لئے سجدہ کرنے سے پہلے بیٹھ جائے تو امام کے ساتھ سلام پھیرے، اور اگر پانچویں کا سجدہ بھی کر لیا تو مقتدی سلام پھیرے، اور اگر امام چوتھی رکعت کے بعد مقدار تشہد بیٹھنے سے پہلے کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ پانچویں کا سجدہ بھی کر لیا مگر مقتدی نے تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیا تو بھی سب کی نماز فاسد ہو گئی۔

نمبر۱۶۔ نو چیزیں وہ ہیں کہ اگر امام نہ کرے تب بھی مقتدی انہیں ادا کرلے:

نمبر۱۔ تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھوں کو اٹھانا، نمبر۲۔ رکوع کے لئے تکبیر کہنا، نمبر۳۔ رکوع میں تسبیح کہنا، نمبر۴۔ سجدہ میں تسبیح کہنا، نمبر۵۔ امام تسبیح یعنی سمع اللہ لمن حمدہ کہے یا نہ کہے مقتدی کو تحمید یعنی ربنا لک الحمد کہنا، نمبر۶۔ سجدہ میں جاتے ہوئے تکبیر کہنا، نمبر۷۔ التحیات پڑھنا، نمبر۸۔ سلام کہنا، نمبر۹۔ عید الاضحیٰ کے دنوں میں تکبیر تشریق کہنا۔ الخلاصہ و خزانۃ المفتین۔ مع۔

نمبر۱۷۔ امی یعنی جسے قرأت نہیں آتی کیا وہ نماز میں قرأت کے اندازے سے صرف کھڑا ہی رہے، تو امام ظہیر الدین نے کہا ہے کہ نہیں، نمبر۱۸۔ اور لاحق (جو ابتداء میں امام کے ساتھ مگر بعد میں کم از کم ایک رکعت اس کی چھوٹ گئی ہو) جو بعد میں اپنی چھوٹی ہوئی نماز ادا کرتا ہو مگر قرأت کے بغیر تو اس کا حکم بھی شافی میں پہلے حکم کی طرح مذکور ہے۔ الفتح۔

لاحق، مسبوق، مدرک، ان کی تفصیل، لاحق اور مسبوق کے احکام، امام اور قوم میں رکعات کی تعداد میں اختلاف، امام نے نماز دہرائی، اور انہیں مقتدیوں نے اس کی اقتداء کی، قوم میں ایک شخص کو تین اور ایک شخص کو چار رکعتوں کے ہونے کا یقین ہے، اور باقی افراد اور خود امام کو تردد ہے، امام کو تین رکعتوں کا یقین ہے، اور ایک مقتدی کو پوری نماز ہو جانے کا یقین ہے، ایک کو نقصان ہونے کا یقین اور امام اور باقیوں کو شک ہے، امام پڑھا کر چلا گیا پھر کسی نے ظہر کا اور کسی نے عصر کے وقت کا دعویٰ کیا، مترجم کی طرف سے وضاحت، ان چیزوں کا بیان جن سے اقتداء صحیح نہیں ہوتی ہے

نمبر۱۹- واضح ہو کہ مقتدی کی تین قسمیں ہیں (۱) مدرک (۲) لاحق (۳) مسبوق، نمبرا۔ مدرک اس مقتدی کو کہتے ہیں جس نے شروع سے آخر تک امام کو نماز میں پایا ہو، نمبر۲۔ لاحق اس مقتدی کو کہتے ہیں جس نے شروع سے امام کی اقتداء کی مگر اس کی کل رکعتیں یا بعض رکعتیں عذر کی بناء پر امام کے ساتھ پڑھنے سے چھوٹ گئی ہوں، پھر یہ عذر خواہ خود لاحق سے ہوا ہے جیسے حدث یا غفلت یا نیند وغیرہ یا شریعت کی طرف سے عائد ہو مثلاً خوف کے وقت کی نماز میں امام تمام قوم کو دو حصوں میں تقسیم کر کے پہلے ایک حصہ کو ایک رکعت پڑھادے اور وہ جماعت بقیہ نماز چھوڑ کر دشمن کے مقابلہ میں چلی جائے اور دوسرا حصہ میدان سے امام کے پیچھے آکر دوسری ایک رکعت پڑھ لے، (تفصیل نماز خوف کے بیان میں آئے گی) تو اس صورت میں پہلا گروہ لاحق اور دوسرا گروہ مسبوق مانا جائے گا، یا جیسے چار رکعتوں والی نماز میں مقیم نے مسافر کے پیچھے شرکت کی تو آخری دو رکعتوں میں مقیم لاحق ہو گا، اور خواہ یہ عذر امام کی طرف سے پیدا ہو کہ امام رکوع و سجدہ میں مقتدی پر سبقت کر جائے اس لئے یہ شخص چھوٹی ہوئی رکعت کو بغیر قرأت کے پڑھے گا، اب لاحق اور مسبوق کے احکام یہ ہیں، تو لاحق کا حکم یہ ہے کہ پہلے وہ ان رکعتوں کو بغیر قرأت کے ادا کرے گا جو اس سے چھوٹ گئی ہوں، اور قیام کی حالت میں کچھ نہیں پڑھے گا بلکہ اتنی دیر بالکل خاموش رہے گا جتنی دیر میں امام پڑھ لیتا ہو، اس میں کچھ کمی یا زیادتی نقصان نہیں ہے، شرح الطحاوی، اور اگر اس عرصہ میں کوئی ایسی چیز بھول گیا ہو جس سے سجدہ سہو لازم ہوتا ہو پھر بھی اس پر سجدہ سہو لازم نہیں ہو گا۔ ت۔ اور اگر وہ شخص مسافر ہو مگر نماز کی حالت میں اس نے اقامت کی نیت کر لی تو اس کا وہ فرض دو رکعت سے چار رکعت نہیں ہو گا، لیکن یہ اس صورت میں کہ امام فارغ ہو چکا ہو، اور اگر اس وقت تک امام نماز سے فارغ نہ ہوا ہو تو بالاتفاق چار رکعتیں پڑھے گا۔ المصفی۔

ان چاروں باتوں میں مسبوق لاحق کے برعکس ہو گا، پھر لاحق فوت شدہ کو پڑھ کر امام کی متابعت کرے بشرطیکہ وہ ابھی تک نماز میں مشغول ہو، ورنہ تمام رکعتیں بلا قرأت کے پڑھ لے جس طرح امام کے پیچھے پڑھتا ہے۔ ت۔ الوجیز۔ امام نے سجدہ سہو ادا کیا تو لاحق اپنی چھوٹی ہوئی نماز پوری کرنے سے پہلے اس کی اتباع نہیں کرے گا، مسبوق کے برخلاف۔ الخلاصہ۔ اگر لاحق نے پہلے امام کی متابعت کر لی پھر سلام کے بعد باقی نماز پڑھی تو ہمارے نزدیک نماز جائز ہو گی۔ شرح الطحاوی۔ مسبوق ایسے مقتدی کو کہتے ہیں جس نے امام کی اقتداء اس وقت کی جب اس نے ایک رکعت یا تمام رکعتیں پڑھ چکا ہو، (یا وہ شخص جس کی امام کے ساتھ کم از کم ایک رکعت چھوٹی ہو) اگر ظہر کی ایک رکعت کے بعد شریک ہو کر حدث ہو جانے سے لاحق بھی ہو گیا تو طہارت حاصل کر کے پہلے لاحق کی طرح پڑھ لے پھر ایک رکعت مسبوق کی طرح پڑھے، مسبوق کا حکم یہ ہے کہ جتنی رکعتیں اس کی پہلے چھوٹ گئی ہوں انہیں امام کے سلام کے بعد ادا کرے، اور اس ادا میں وہ منفرد کے حکم میں ہے سوائے ان چار مسائل کے۔

پہلا مسئلہ:- وہ کسی دوسرے کی اقتداء نہیں کر سکتا ہے، اور نہ خود اس کی کوئی دوسرا شخص اقتداء کر سکتا ہے، چنانچہ اگر ایک مسبوق نے دوسرے مسبوق کی اقتداء کی نیت کی تو مقتدی کی نیت فاسد ہو گی۔ البحر۔ اور اگر اقتداء کی نیت کئے بغیر اس کے ساتھ

ساتھ پڑھتا رہا تو نماز صحیح ہو گی۔ الخلاصہ۔ اگر امام نے سہو کے خیال سے سجدہ سہو کیا پھر اسے خیال آیا کہ وہ سہو نہیں تھا، لیکن مسبوق نے اس کی اتباع کی تھی تو مشہور ترین روایت کے مطابق اس کی نماز فاسد ہو گی، اور ابو اللیثؒ نے کہا ہے کہ ہمارے زمانہ میں فاسد نہیں ہے۔ الظہیر یہ۔ اور اگر سہو ہونے کا اسے علم نہ ہوا ہو تو بالاتفاق نماز فاسد نہ ہو گی۔ قاضیخان۔ اسی قول مختار کو قبول کہا گیا ہے۔ الغیاثیہ۔ اور اگر امام چوتھی رکعت پر بیٹھ کر پانچویں کے لئے کھڑا ہوا اور مسبوق بھی اس کی اتباع میں کھڑا ہوا تو اس کی نماز فاسد ہو گی ورنہ نہیں، اور اگر پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کر لیا تو سب کی نماز فاسد ہو گئی۔ قاضی خان۔

دوسرا مسئلہ:- اگر مسبوق نے نئے سرے سے پڑھنے کے لئے تکبیر کہی تو پہلے کی پڑھی ہوئی نماز ختم ہو جائے گی، بخلاف تنہا پڑھنے والے شخص کے۔

تیسرا مسئلہ:- اگر امام پر سجدہ سہو لازم ہو تو لوٹ کر مسبوق بھی اس کے ساتھ سجدہ سہو کرے بشرطیکہ اپنی رکعت کا سجدہ نہ کر لیا ہو، اور اگر اپنی نماز پڑھتا ہی رہا اور امام کے ساتھ نہیں کیا تو اس پر لازم ہے کہ اپنی نماز کے آخر میں سجدہ کرے بخلاف منفرد کے کہ اس پر غیر کے سجدہ سے سجدہ لازم نہیں ہوتا ہے۔

چوتھا مسئلہ:- مسبوق پر تکبیر تشریق واجب ہے، اور منفرد پر ابو حنیفہؒ کے نزدیک نہیں ہے۔ الفتح۔ البحر۔ پھر مسبوق کے بہت سے احکام ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں، (۱) اگر امام کو جہر نماز میں پائے تو ثناء سبحانك اللهم نہ پڑھے، الخلاصہ یہی صحیح ہے۔ التجنیس۔ یہی اصح ہے، الوجیز، للکردری، خواہ امام سے وہ قریب ہو یا بعید ہو یا بہرہ ہی ہو۔ الخلاصہ۔ پھر جب باقی نماز ادا کرنے کو کھڑا ہو تب ثناو تعوذ پڑھے، قرأت کے واسطے۔ قاضی خان۔ الظہیر یہ۔ اور اگر امام کو سری نماز میں پائے تو سبحانك اللهم الخ پڑھے۔ الخلاصہ۔ اگر امام رکوع یا سجدہ میں ہو اور اس کی اپنی رائے میں ہو کہ ثناء پڑھ کر امام سے مل جاؤں گا تو کھڑے کھڑے پڑھ لے ورنہ امام کی متابعت کرلے، اگر امام قعدہ میں ہو تو ثناء نہ پڑھے، بلکہ تکبیر تحریمہ کہہ کر جھکتے ہوئے تکبیر کہہ کر بیٹھ جائے۔ البحر۔ ان مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مسبوق پہلے امام کے ساتھ پڑھے پھر چھوٹی ہوئی رکعتیں تنہا ادا کرے۔ محیط السرخسی۔ اور اگر پہلے اپنی چھوٹی ہوئی رکعتیں پڑھنے لگا یعنی امام کی متابعت نہیں کی، تو ایک قول میں اس کی نماز فاسد ہو گئی، یہی اصح ہے۔ الظہیر یہ۔ اور یہی اظہر ہے۔ البحر۔

دوسرا قول بعض متاخرین کا ہے کہ جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ المضمرات۔ ان میں سے یہ بھی ہے کہ قعدہ میں امام کی مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد سلام سے پہلے مسبوق کھڑا نہ ہو کیونکہ ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہے۔ الفتح۔ سوائے چند صورتوں کے اول یہ کہ مسبوق موزوں پر مسح کرنے والا ہو اور اس کی مدت ختم ہونے کا خوف ہو یا ایسا معذور ہو کہ اسے وقت کے نکل جانے یا جمعہ میں وقت عصر یا عید میں ظہر کے وقت ہو جانے یا فجر میں آفتاب نکل جانے یا اس کو حدث ہو جانے کا خوف ہو تو اس کو بلا کراہت یہ بات جائز ہے کہ امام کے فارغ ہونے کا انتظار نہ کرے، اسی طرح اگر خوف ہو کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد لوگ میرے سامنے سے گذرنے لگیں گے تو بھی چھوٹی ہوئی رکعت ادا کرنے کو کھڑا ہو جائے۔ الوجیز للکردری۔

اور اگر تشہد کی مقدار بیٹھنے سے پہلے کھڑا ہو گیا تو جائز نہیں ہے، اور اگر مسبوق امام کے سلام سے پہلے فارغ ہوا اور سلام میں امام کی متابعت کی تو اسی بات فتوی ہے کہ اس کی نماز فاسد نہ ہو گی۔ الخلاصہ۔ ف۔ ان میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اخیر تشہد اشهد ان لا اله الا الله، دوبارہ پڑھے۔ الغیاثیہ۔ اور صحیح یہ ہے کہ التحیات اس قدر آہستہ پڑھے کہ امام کے سلام کے وقت اس سے فارغ ہو۔ قاضی خان۔ الخلاصہ۔ الوجیز۔ الفتح۔

اور اس مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اپنی تنہا نماز میں سہو کرنے سے اس پر سجدہ سہو لازم آتا ہے، یہی مختار مذہب ہے، جیسا کہ الظہیر یہ اور الجواہر میں ہے، اور اگر یہ گمان کیا کہ مجھ پر امام کے ساتھ سلام کرنا واجب ہے اور سلام کیا تو نماز فاسد ہو گئی۔ الظہیر یہ۔ اور ان میں ایک یہ ہے کہ مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی نماز اس طرح ادا کرتا ہے کہ قرأت قرآن کے موقع میں اس کی حیثیت

تنہا پڑھنے والے کی ہوتی ہے، اور تشہد پڑھنے کے موقع میں اس کی حیثیت آخری نماز ادا کرنے والے کی ہوتی ہے، اسی بناء پر اگر کسی نے مغرب کی ایک رکعت جماعت سے پائی تو وہ کھڑا ہو کر ایک رکعت کے بعد قعدہ ادا کر کے پھر دوسری رکعت کے بعد بھی قعدہ کرے اس طرح اس کے تین قعدے ہو جائینگے اور ان دونوں میں سے ہر ایک میں فاتحہ اور سورہ پڑھے، اگر وہ شخص کسی رکعت میں قرأت چھوڑ دے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ الخلاصہ۔

یعنی مسبوق جو تنہا نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے وہ اس کی نماز کا پہلا حصہ ہے قرأت کے بارے میں حتی کہ (گذشتہ مثال میں) مغرب کی ایک رکعت جو اس نے امام کے ساتھ پائی وہ دراصل مسبوق کی نماز کی تیسری رکعت ہے، لہٰذا وہ کھڑے ہو کر چھوٹی ہوئی دونوں رکعتیں فاتحہ اور سورہ ملا کر پڑھے گا، اور یہ پڑھنا اس پر واجب ہے حتی کہ اگر کسی رکعت میں بالکل قرأت نہ کرے تو اس کی نماز فاسد اور اگر مقدار واجب نہ پڑھے تو نماز کا اعادہ واجب ہوگا، یہ بات قرأت کے اعتبار سے ہوئی اور قعدہ کے اعتبار سے مسبوق اخیر نماز ادا کرتا ہے یہاں تک کہ مغرب کی جو رکعت امام کے ساتھ پائی وہ پہلی شمار ہوئی، پھر مسبوق ایک رکعت بھری یعنی قرأت فاتحہ وغیرہ کے ساتھ پڑھ کر دو رکعت کے بعد قعدہ کرے پھر تیسری رکعت بھری پڑھ کر قعدہ اخیرہ کرے، پھر قرأت کے بارے میں یہ تیسری نہیں بلکہ دوسری رکعت ہے، اس لئے کہ مغرب کی تیسری رکعت میں مذہب کے موافق قرأت فرض نہیں ہے بلکہ افضل ہے۔ جبکہ یہاں قرأت فرض رکھی گئی ہے۔ م۔

اور اگر ظہر یا عصر یا عشاء یعنی رباعی میں سے ایک رکعت پائی تو مسبوق کھڑا ہو کر ایک رکعت فاتحہ اور سورہ سمیت پڑھ کر قعدہ کرے، پھر ایک رکعت فاتحہ اور سورہ پڑھے پڑھے چوتھی رکعت میں اس کو اختیار ہے اگرچہ قرأت کرنا افضل ہے۔ الخلاصہ۔ اور اگر امام نے چار رکعتوں کی پہلی دو رکعتوں میں قرأت چھوڑ دی، وہ اس کو دوسرے دوگانہ یعنی تیسری اور چوتھی رکعت میں قضاء کر رہا تھا، اور مسبوق نے اسی دوسرے دوگانہ یعنی تیسری یا چوتھی رکعت میں پا کر اسکی اقتداء کرلی، تو جب وہ تنہا ہو کر باقی نماز کو پڑھے گا تو اس میں قرأت کرے گا، یہانتک کہ اگر اسے چھوڑ دے گا تو اس کی نماز فاسد ہو گی، الوجیز للکردری، میں مترجم کہتا ہوں کہ فاسد ہونے کا حکم مشکل ہے، کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مسبوق نے اپنی پہلی دو رکعتیں (پہلی اور دوسری رکعت) میں قرأت نہیں کی لیکن آخری دو رکعتیں جو اس نے امام کے ساتھ پائی ہیں، ان میں چونکہ امام نے قرأت کرلی ہے اس لئے امام کی قرأت خود مقتدی کی قرأت بھی ہو گئی ہے، البتہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آخری دو رکعتیں تو قرأت کی ادائیگی کا محل نہیں ہیں، مگر یہ تو انتہائی غور طلب بات ہے۔ م۔

اور ان مسائل میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی مسبوق اپنے امام کی اتباع سجدہ سہو ادا کرتے وقت کرے اور سلام و تکبیر تشریق اور تلبیہ حج میں نہ کرے، پھر سلام و تلبیہ میں متابعت کرلے تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر تکبیر کہتے وقت یہ جان کر اتباع کی کہ میں مسبوق ہوں تو نماز فاسد نہ ہو گی، شمس الائمہ سرخسیؒ کا اسی طرف میلان ہے۔ الظہیریہ۔ اور ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اگر امام کو یہ بات یاد آگئی کہ میں نے بوقت قرأت آیت سجدہ تلاوت کر کے سجدہ ادا نہیں کیا ہے اس لئے اس سجدہ کو ادا کرنے لگا تو اگر مسبوق نے اپنی رکعت ادا کرتے وقت اس وقت تک رکعت کا سجدہ ادا نہ کیا ہو تو اسے چاہئے کہ اس رکعت کو چھوڑ کر امام کی متابعت کرلے اور امام کے ساتھ سجدہ سہو بھی ادا کرلے، اس کے بعد اپنی چھوٹی ہوئی نماز ادا کرنے کو کھڑا ہو جائے، کیونکہ ایسا نہ کرنے سے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر اپنی رکعت کا سجدہ ادا کرنے کے بعد امام کی اتباع کرے گا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اس صورت میں یہی ایک روایت ہے، اور اگر امام کی متابعت نہیں کرے گا تو بھی کتاب الاصل کی روایت کے مطابق فاسد ہو جائے گی۔ الفتح۔ البدائع۔ شرح الطحاوی۔ المضمرات۔ شرح المبسوط للسرخسی۔ الخلاصہ۔ السراج۔

اور سجدہ صلاتیہ میں بھی یہی حکم ہے، اس سلسلہ میں قاعدہ یہ ہوا کہ تنہائی میں پڑھنے کے موقع پر اگر امام کی اتباع کرے یا امام کی اتباع کرنے کے موقع پر تنہا پڑھ لے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ بحر الرائق میں ہے، واضح ہو کہ اگر امام و قوم میں

تعداد کے بارے میں اختلاف ہو جائے تو اسی فریق کی بات مانی جائے جس کے موافق امام کی رائے ہو، اگرچہ امام کے ساتھ صرف ایک ہی شخص ہو۔ الخلاصہ۔ اگر امام نے اپنی نماز دہرائی اور ان ہی لوگوں نے اس کی اقتداء کی جو پہلے سے شریک تھے تو یہ اقتداء صحیح ہے۔ المحیط۔ اور اگر نمازیوں میں سے ایک شخص کو تین رکعتوں کا اور ایک کو چار رکعتوں کے ہونے کا یقین ہے اور ان کے ماسوا سارے نمازی امام کے ساتھ تردد کی حالت میں ہوں تو ان تردد کرنے والوں پر کچھ بھی لازم نہیں ہے۔ الخلاصہ۔ اور امام پر اس کا اعادہ مستحب بھی نہیں ہے، مگر جس کسی کو کمی کا یقین ہو اس پر اعادہ کرنا واجب ہے، اور اگر امام کو تین رکعتوں کے ہونے کا یقین ہو اور ایک مقتدی کو پوری چار ہو جانے کا یقین ہو تو امام پر قوم سمیت اعادہ واجب سوائے اس شخص کے جس کو چار ہو جانے کا یقین ہو، کہ اس پر اعادہ واجب نہیں ہے۔ المحیط۔

اگر ایک نمازی کو رکعت کی کمی کا یقین ہو اور امام سمیت بقیہ نمازیوں کو شک ہو پس اگر وقت باقی ہو تو اس کا اعادہ مستحب ہے، ورنہ کچھ بھی واجب نہیں ہے، اور اگر دو عادل آدمی یقین کے ساتھ رکعت کی کمی کی خبر دیں تو اعادہ واجب ہے۔ الخلاصہ۔ اگر امام نماز پڑھا کر چلا گیا اس کے بعد کچھ نمازیوں نے ظہر ہونے کا اور کچھ نے عصر کی نماز ہونے کا دعوی کیا، پس وہ وقت جس نماز کا ہو اسی وقت کا اعتبار کیا جائے گا، اور اگر وقت کے بارے میں لوگوں میں شبہ ہو تو دونوں کا اپنا اپنا خیال درست مانا جائے گا، جیسا کہ ظہیریہ میں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس بات میں کوئی شبہہ نہیں ہے کہ پڑھی گئی تو ایک ہی ہے اسی کے بارے میں دو رائیں ہوئیں وہ بھی بغیر کسی شک و شبہ بلکہ یقین کے ساتھ، اس لئے ہر ایک کے یقین کی بناء پر دونوں کی نمازوں کو جائز کہا گیا ہے، اور اس کا اثر اس طرح سے ظاہر ہوگا کہ مثلاً دو شخصوں میں سے ایک نے اس نماز کے بارے میں قسم کھا کر کہا کہ یہ ظہر کی نماز تھی اور دوسرے نے اس طرح قسم کھا کر کہا کہ وہ عصر کی نماز تھی، اور دونوں کے درمیان یہ اختلاف وقت گذر جانے کے بعد یعنی مغرب کے وقت ظاہر ہوا تو مشتبہ وقت کی صورت میں دونوں کی قسم کے سچ ہونے کا حکم ہوگا، البتہ دین داری کا تقاضا تو یہ ہے کہ دونوں ہی اعادہ کریں، اچھی طرح مسئلہ سمجھ لیں، واللہ تعالی اعلم بالصواب.

وہ کون سی باتیں ہیں جن سے اقتداء صحیح نہیں ہوتی ہے

اگر امام اور مقتدی کے درمیان اتنا راستہ ہو جس میں گاڑی وغیرہ (یعنی سواری اور بڑا سامان) گذر جانے کی جگہ ہو تو اس میں اقتداء کرنا صحیح نہیں ہوگا، ورنہ صحیح ہوگا۔ الخلاصہ۔ قاضی خان۔ بشرطیکہ راستہ پر ملی ہوئی صفیں بچھی ہوئی نہ ہو؛ اگر ملی ہوئی ہوں تو اقتداء صحیح ہے، اگر راستہ پر صرف ایک مرد کھڑا ہوا ہو تو اس سے اتصال نہیں سمجھا جائے گا، اور اگر راہ میں تین شخص کھڑے ہوئے ہوں تو بالاتفاق وہ صف ملی ہوئی مانی جائے گی، اور اگر دو افراد ہوں تو ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق متصل ہے، اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق متصل نہیں ہے۔ المحیط۔ اور اگر امام بھی راستہ پر ہو اور پیچھے میں قوم بھی راستہ ہی پر طول میں ملی ہوئی صفیں ہوں، پس اگر امام اور صف کے درمیان گاڑی گذرنے کے انداز سے راستہ نہ ہو تو ان کی نماز جائز ہوگی اور صف اول اور صف دوم اور سوم وغیرہ میں بھی اسی فاصلہ اور نسبت کا اعتبار ہوگا۔ قاضی خان۔

میدانوں میں اتنا فاصلہ معتبر ہوگا جس میں دو صفیں لگائی جاسکیں، لیکن عید گاہ میں کچھ زیادہ فاصلہ ہونا بھی نقصان دہ نہیں ہے، اگرچہ اس میں دو صفیں یا ان سے بھی زیادہ صفیں سما سکیں، لیکن جنازہ کے مصلی کی فاصلہ کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے، نوازل میں اس کا حکم مسجد کے حکم کے جیسا بتلایا ہے۔ الخلاصہ۔ اگر امام اور مقتدی کے درمیان بڑا دریا حائل ہو تو اقتداء کے لئے مانع ہے، بڑا دریا سے وہ جگہ مراد ہے جہاں سے کشتی اور پل اور تدبیر وغیرہ کے بغیر گذرنا سخت مشکل ہو۔ شرح الطحاوی۔ جس دریا میں کشتیاں اور ناؤیں چلتی ہوں، اگر وہ اتنا چھوٹا ہو کہ اس میں ناؤ کشتی وغیرہ نہ چلے تو اقتداء کے لئے یہ مانع نہیں ہے، اور یہی مختار ہے۔ الخلاصہ۔ اور یہی صحیح حکم ہے۔ جواہر الاخلاطی۔ اسی طرح اگر جامع مسجد میں ہو تو ایسا ہی حکم ہوگا۔ قاضی خان۔ اور اگر

بڑے دریا پر پل ہو اور اس کے ایک طرف امام ہو اور دوسری طرف صف ہو اس طرح سے کہ درمیانی جگہ میں بھی ملی ہوئی صفیں ہوں تو اقتداء صحیح ہے، ان میں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اگر صف میں کسی جگہ صرف تین آدمی ہوں تو وہ درست ہوگی اور اگر صرف ایک آدمی ہو تو بالاجماع درست نہ ہوگی، اور اگر کسی صف میں دو آدمی ہوں تو اس میں وہی اختلاف ہے جو راستہ کے بارے میں پہلے گذر چکا ہے۔ اگر امام اور مقتدی کے درمیان حوض یا تالاب ہو پس اگر فاصلہ اس انداز کا ہو کہ ایک طرف نجاست گرنے سے دوسری طرف نجس ہو جائے تو مانع ہے ورنہ نہیں۔ المحیط۔

اگر امام کے پیچھے پوری صف عورتوں کی ہو اور اس کے پیچھے مردوں کی صفیں ہوں تو استحسانا تمام صفوں کی نماز فاسد ہوگی۔ المحیط۔ اگر تین عورتیں ہوں تو ظاہر الروایہ کے مطابق مردوں کی پہلی صف آخر تک ہر صف کے تین تین آدمیوں کی نمازیں فاسد ہوگی۔ قاضی خان۔ امام اور مقتدی کے درمیان اگر بڑی دیوار حائل ہو ایسی کہ امام تک پہونچنے سے وہ حائل ثابت ہوتی ہو تو اقتداء صحیح نہیں ہے، اگرچہ امام کا حال نمازیوں پر مشتبہ ہو یا نہ ہو۔ الذخیرہ۔ اور اگر امام تک پہونچنا اس دیوار کی موجودگی کے باوجود ممکن ہو مثلاً دیوار نیچی ہو یا درمیان میں بڑا سا سوراخ ہو یا درمیان میں آمد و رفت کا راستہ ہو تو اقتداء صحیح ہے، اور سوراخ اتنے چھوٹے ہوں کہ ان سے آنا جانا نہ ہو سکے لیکن امام کے دیکھنے اور اس کی آواز سننے میں کچھ اشتباہ نہ ہو تو اقتداء جائز ہے اور یہی صحیح ہے، اور اگر چھوٹی دیوار ایسی ہو جس سے امام تک پہونچنا تو دشوار ہو مگر اس سے امام کا حال مخفی نہ رہتا ہو تو بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اقتداء جائز ہے، اور یہی صحیح ہے۔ المحیط۔

اور اگر دیوار میں دروازہ بند ہو تو اس میں مختلف اقوال ہیں، جیسا کہ محیط السرخسی میں ہے، مسجد اگرچہ بڑی ہو تو اس میں کوئی فاصل چیز اقتداء سے مانع نہ ہوگی۔ الوجیز۔ یہانتک کہ امام محراب میں اور مقتدی مسجد کے بالکل آخری کنارے پر ہو تو بھی اقتداء صحیح ہے، شرح الطحاوی۔ اگر مسجد سے متصل کوئی اپنے گھر کی چھت پر کھڑا ہوا تو اقتدا جائز نہیں ہے، اگرچہ امام کا حال اسے پورا معلوم ہو تا رہا ہو۔ قاضی خان۔ الخلاصہ۔ اور یہی قول ہے۔ محیط السرخسی۔ اور اگر اس دیوار پر ہو جو مسجد اور اس کے گھر کے درمیان ہے اور امام کا حال اس پر مشتبہ نہیں ہے تو اقتداء جائز ہے، اگر کوئی مسجد سے باہر ایک ایسے چبوترہ پر کھڑا ہوا جو مسجد سے متصل ہو تو اقتداء جائز ہے بشرطیکہ وہاں تک صفیں ملی ہوئی ہوں، الخلاصہ۔ اگر کوئی ایسی مسجد کی چھت پر ہو جس کا دروازہ مسجد میں ہو اور امام مسجد میں ہو تو اگر امام کا حال بالکل واضح ہو اور اسے کوئی اشتباہ نہ ہوتا ہو تو اقتداء جائز ہے ورنہ نہیں۔ قاضی خان۔ اور اگر چھت کا دروازہ مسجد میں نہ ہو، لیکن امام کا حال جاننے میں بھی اشتباہ نہیں ہوتا ہو تو بھی اقتداء جائز ہے، اسی طرح اگر ایسی حالت کے ساتھ اذان گاہ سے امام مسجد کا اقتداء کیا تو جائز ہے۔ الخلاصہ۔ آئندہ نماز میں حدث ہونے کا بیان ہوگا۔

باب الحدث فی الصلاۃ

ومن سبقه الحدث فی الصلوة انصرف، فان کان اماما استخلف و توضأ و بنی، والقیاس ان یستقبل، وهو قول الشافعی، لان الحدیث ینافیها، والمشیء والانحراف یفسدانها، فاشبه الحدث العمد، ولنا قوله علیه السلام: من قاء او رعف او امذی فی صلاته، فلینصرف ولیتوضأ ولیبن علی صلاته مالم یتکلم، و قال علیه السلام: اذا صلی احدکم فقاء او رعف فلیضع یده علی فمه، ولیقدم من لم یسبق بشیء، والبلوی فیما یسبق دون ما یتعمده، فلا یلحق به، والاستیناف افضل تحرزا عن شبهة الخلاف، و قیل المنفرد یستقبل والامام والمقتدی یبنی صیانة لفضیلة الجماعة.

ترجمہ:- جس شخص کو نماز میں حدث سبقت کر جائے، وہ فوراً نماز سے نکل آئے، اور اگر وہ امام ہو تو کسی کو اپنا قائم مقام بنادے، اور خود جا کر وضوء کرے، اور پڑھی ہوئی نماز پر بناء کرے، (اس کے بعد سے پڑھے) ویسے قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ از سر

نو پڑھے، چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی قول ہے، کیونکہ حدث اس نماز کے مخالف ہے، چلنا پھرنا اور قبلہ سے نہ پھیرنا وغیرہ تو نماز کو فاسد بھی کردیتے ہیں، اس بناء پر یہ تو حدث اختیاری کے مشابہ ہوا، اور ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ جس کسی کو نماز کی حالت میں قئی ہو یا نکسیر پھوٹ جائے یا مذی نکل جائے، تو وہ فوراً پھر جائے اور وضوء کرے اور پڑھے ہونے پر بناء کرے جبکہ کوئی بات نہ کرے اور بھی رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے کسی نے نماز پڑھی اور اسے قئی آگئی یا نکسیر پھوٹ گئی تو وہ اپنے ہاتھ کو منہ پر رکھے ہوئے کسی ایسے شخص کو اپنی جگہ پر بڑھادے جسے ایسا کچھ نہ ہوا ہو، اور ابتلاء تو اس حدث میں ہے جو بے اختیار نکل آئے، نہ اس صورت میں جس میں قصداً حدث کرے، اس لئے اس عامد کے حکم کو غیر عامد سے نہیں ملایا جائے گا، بہتر صورت استئناف (از سر نو پڑھنا) افضل ہے، اختلافی شبہ سے بچنے کے لئے اور کہا گیا ہے کہ تنہا پڑھنے والا نئے سرے سے پڑھے، اور امام اور مقتدی بناء کریں، جماعت کی فضیلت کو بچانے کے خیال سے۔

توضیح:- نماز میں حدث واقع ہونے کا بیان، مقتدی کو حدث امام کو حدث

ومن سبقه الحدث في الصلوة انصرف، فان كان اماما استخلف و توضأ و بنى......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، و بنی اور بناء کرے۔ف۔ یعنی جتنی نماز ہو چکی ہے اس کے بعد سے پڑھے، یعنی ایسا اگر کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کہ ایسا کرنا ضروری نہیں ہے، اس جگہ لفظ ''من'' کا فائدہ یہ ہوا کہ یہ حکم عورت اور مرد دونوں کے لئے ہے، کیونکہ ''من'' میں دونوں داخل ہوتے ہیں، اسی طرح نمازی جو بھی ہو خواہ تنہا پڑھنے والا ہو یا جماعت سے پھر امام ہو یا مقتدی سب کو شامل ہے، سبقه الحدث الخ اس میں دو اشارے ہیں (۱) یہ کہ حدث از خود بلا اختیار سبقت کر جائے، (۲) الحدث یعنی وہ حدث جس سے وضوء واجب ہو جائے، اسی لئے پہلے ہی کہدیا ہے توضأ یعنی وضوء کرے، انصرف اس لفظ کو دوسرے الفاظ مثلاً استخلف وغیرہ سے پہلے لکھنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حدث واقع ہوتے ہی اتنی کسی تاخیر کے بغیر کہ اس میں کوئی رکن ادا ہو سکے فوراً پھر جائے، اس جگہ لفظ بنی کو مطلق رکھا گیا ہے یعنی کہیں بھی بناء کرلے یعنی جہاں وضوء کیا وہیں یا راستہ میں یا پرائی جگہ پر آکر، مگر یہ اطلاق صرف امام کے واسطے ہے، کیونکہ مقتدی کا حکم بعد میں آرہا ہے، گذشتہ ہر ایک قید اور اشارہ کے ساتھ کئی مسائل نکلتے ہیں جن کی وضاحت سامنے آتی ہے، چنانچہ نماز میں بناء کرنے کے لئے تیرہ شرطیں ہیں۔م۔

والقياس ان يستقبل، وهو قول الشافعي، لان الحد ث ينافيها......الخ

حالانکہ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ بالکل ابتداء سے پڑھے، چنانچہ امام شافعیؒ کا یہی قول بھی ہے بلان الحدث الخ اس دلیل کی وجہ یہ ہے کہ حدث جو ہوا ہے وہ تو نماز کے بالکل منافی ہے، اس کے علاوہ اور بھی کی موانع پائے جاتے ہیں مثلاً وضوء کے لئے کچھ دور تک ننگے پیر چل کر جانا ۔ ،اور چلتے وقت قبلہ سے رخ کا بدل جانا تو یہ دونوں ہی عمل نماز کو فاسد کر دیا کرتے ہیں، تو وہ حدث جو ابتک بے اختیاری سمجھا جاتا تھا اب حدث عمد کے مشابہ سمجھ میں آرہا ہے۔ف۔ اور حدث عمد یعنی جان بوجھ کر حدث کرنے میں بالاتفاق بناء جائز نہیں ہے، یہانتک امام شافعیؒ کی دلیل بیان کی گئی ہے، اور اب اس کا جواب احنافؒ کی طرف سے یہ دیا جارہا ہے کہ قیاس کا تقاضا تو یہی تھا لیکن نص کی موجودگی کی وجہ سے ہم نے اس قیاس کو چھوڑ دیا ہے جو یہ ہے۔

ولنا قوله عليه السلام: من قاء او رعف او امذى في صلاته، فلينصرف وليتوضأ وليبن......الخ

ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے من قاء الخ یعنی جس کی نماز میں قئی ہوئی یا نکسیر پھوٹی یا مذی نکل آئی تو وہ پھر جائے اور وضوء کرے اور بناء کرے اپنی نماز پر، جب تک کلام نہ کیا ہو۔ف۔ یہ حدیث نواقض وضوء کے بحث میں گذر چکی ہے، اور دار قطنی نے مرسل کو صحیح مانا ہے لہٰذا یہ حدیث بلاشبہ کلام صحیح ہے، اور مرسل ہمارے اور جمہور کے نزدیک بھی حجت ہوتی ہے، اور ابن ماجہ نے اسمٰعیل بن عیاش عن ابن جریج سے متصل روایت کی ہے، اسمٰعیل کی روایت ابن جریج وغیرہ اہل الشام سے

صحیح ثابت ہے، چنانچہ تقریب میں بھی اقرار کیا ہے، لہٰذا یہ روایت حسن مرفوع متصل ہے۔م۔

وقال علیه السلام: اذا صلی احدکم فقاء او رعف فلیضع یدہ علی فمه.....الخ

زیلعی اور عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ الفاظ غریب ہیں، لیکن ابوداؤد اور ابن ماجہ نے ام المؤمنین عائشہؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ **اذا صلی احدکم فلیاخذہ بانفه ثم لینصرف**، یعنی جب تم میں کوئی نماز پڑھے اور حدث ہو جائے تو اسے چاہئے کہ وہ اپنی ناک پکڑے پھر لوٹ جائے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دو کام کرے ایک تو یہ کہ وہ اپنی ناک پکڑے دوسرے یہ کہ پھر جائے لیکن ناک پر ہاتھ رکھے ہوئے پھر جائے، اور دار قطنیؒ نے حضرت علیؓ کا قول روایت کیا ہے کہ جب کوئی اپنے قوم کی امامت کرے پھر اپنے پیٹ میں قراقر یعنی پیٹ کی حرکت سے ہوا نکلنے والی معلوم کرے یا اسے نکسیر چھوٹ جائے، یا قئی ہونے کی کیفیت محسوس کرے تو وہ اپنی ناک پر کپڑا رکھ لے اور قوم میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے بڑھادے،، طبرانیؒ نے ابن عمرؓ کی حدیث رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ جو اپنے پیٹ میں قرار پائے وہ پھر کر وضوء کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسمٰعیل بن عیاش کی حدیث متصل ہے، ورنہ مرسل حدیث بلا خلاف صحیح اور حجت ہے، اور حضرت علیؓ کے قول کے مانند جو دار قطنی نے روایت کیا ہے ابن ابی شیبہ نے حضرت ابو بکر الصدیق و علی بن ابی طالب و سلمان فارسی و عبد اللہ بن عمر اور عبد اللہ بن مسعود سے روایت کیا ہے، اور دوسروں نے اسی جیسی حضرت عمر و عثمان و ابن عباس و انسؓ سے روایت کی ہے یہانتک کہ بعضوں نے کہا ہے کہ اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اور نوویؒ نے پوری کوشش کر کے صرف مسعودؓ بن مخرمہؓ کا اختلاف نکالا ہے اگر بات صحیح ہو، اور ابن ابی شیبہ وغیرہ نے ائمہ تابعین میں سے علقمہ و طاؤس و سالم و سعید بن جبیر و شعبی و ابراہیم نخعی و عطاو مکحول و سعید بن المسیب اور حسن بصریؒ سے روایت کی ہے، اور ہمارے مذہب کی طرح امام اوزاعی و ثوری و ابن ابی لیلی و سلیمان بن یسار و ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن کے بھی اقوال ہیں، پس اس قول مذکورہ پر تو صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اور اکثر بیشتر تابعین اور فقہاء کرامؒ کا بھی یہی قول ہے، شافعیہؒ نے اعتراض یہ کیا ہے کہ حضرت علی بن طلقؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ اگر تم میں کسی کو نماز کی حالت میں خروج ریح ہو تو وہ پھر سے وضوء کر کے نماز دوبارہ پڑھے، اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی اور ابن حبانؒ کی ہے، اس میں اعادہ کا حکم ہے۔

جواب یہ ہے کہ اس میں تو وضوء کے بعد نماز کے اعادہ کا ذکر ہے، اور اس بات کا بیان نہیں ہے کہ جب دوبارہ نماز پڑھے تو اس صورت میں از سر نو پڑھے یا پڑھی ہوئی نماز کے بعد سے پڑھ کر پورا کرے، اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم یہ فرض بھی کرلیں کہ اس کے معنی یہی ہوں کہ از سر نو پڑھے تو بناء سے اس میں ممانعت تو نہیں ہے جو دوسری حدیث اور صحابہ کرامؓ کے اجماع سے ابھی ثابت ہوا ہے، پھر ہم بھی تو یہی کہتے ہیں کہ از سر نو پڑھ لینا ہی افضل ہے، اس کے علاوہ ابن القطان نے کہا ہے کہ یہ حدیث علی بن طلق کی صحت کو نہیں پہونچی ہے، کیونکہ اس میں مسلم بن مسلم الحنفی ابو عبد الملک مجہول شخص ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ ابن عباسؓ نے بھی مرفوعاً روایت کی ہے کہ نماز میں نکسیر پھوٹ جانے کی صورت میں استقبال صلوۃ یعنی از سر نو پڑھنا چاہئے، اس کی روایت طبرانی، ابن عدی اور دار قطنی نے کی ہے، جواب یہ ہے کہ اس روایت کی اسناد میں سلیمان بن ارقم راوی کو بخاری، احمد ابوداؤد اور نسائی وغیرہ نے متروک کہا ہے، پھر تھوڑی دیر کے لئے اس بات کو مان لینے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ از سر نو پڑھ لینا افضل ہے اور بناء کرنا جائز ہے۔

اس بات پر پھر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ مؤطا و سنن ابی داؤد میں وہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تکبیر تحریمہ کے بعد یہ یاد آیا تھا کہ آپ جنبی ہیں اور غسل کرنا ضروری ہے، یاد آتے ہی آپ نے لوگوں کو ٹھہرنے کا اشارہ فرمایا، پھر جلد ہی غسل فرما کر تشریف لائے اور امامت کی، اس میں کسی کو خلیفہ نہیں بنایا، جواب یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ سے صحیح کی ایک روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ نماز اس وقت تک شروع نہیں کی تھی، پھر نہانے کے بعد واپس آکر تکبیر کہی، اور خود ابوداؤد کی ایک روایت میں

ہے کہ ہم منتظر تھے کہ آپ پھر گئے، اور اگر یہ بھی فرض کیا جائے کہ نماز بھی شروع کر دی تھی تو طہارت ابتداء سے ہی نہ ہونے کی وجہ سے نماز شروع کرنے کا کوئی اعتبار بھی نہیں ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی فضیلت اور برکت کا کیا کہنا، اسی وجہ سے لوگ آپ کے انتظار میں رہے کہ فوراً ہی تو تشریف لائیں گے، اسی لئے ایک دن ظہر کے وقت چونکہ واپسی میں کافی تاخیر کا احتمال تھا تو آپ نے ازخود پڑھنے کی انہیں اجازت دیدی تھی، جیسا کہ صحیح میں ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ اگر نماز کی حالت میں کسی کو ازخود حدث ہو جائے تو خلاف قیاس دلیل منصوص اور اجماع صحابہؓ کی وجہ سے بناء کرنا جائز ہے اور اس میں قیاس کو اب کوئی دخل نہیں ہے، متروک ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ کوئی قصداً حدث کر دے تو اسے بھی بے اختیار حدث کے حکم میں داخل کر لینا چاہئے، ایسا کیوں نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ البلوی فیما لیسبق الخ ابتلاء تو ایسی حدث میں ہے جو بے اختیار نکل جائے، اختیار و عمد کی صورت میں نہیں ہے، لہٰذا عمد اور اختیار کو غیر عمد اور غیر اختیار کے ساتھ نہیں ملایا جا سکتا ہے۔ ف۔ اس کے علاوہ یہ حکم تو خلاف قیاس ہے اس لئے جن چیزوں سے حدث ہوتا ہے انہیں تک بے اختیاری کی صورت میں بھی رہے گا اور اس حرکت تک متعدی نہ ہوگا جو عمداً کی گئی ہو۔ م۔

والاستیناف افضل تحرزا عن شبهة الخلاف......الخ

اور از سر نو پڑھنا افضل ہے تاکہ شبہ کے اختلاف سے احتراز ہو جائے۔ ف۔ کیونکہ خبر واحد سے اجماع قوی ہوتا ہے، عینیؒ نے اعتراض کیا ہے کہ بناء کرنے پر (یعنی صرف بقیہ نماز پڑھ لینے پر) تو صحابہ کرامؓ کا اجماع ہے اور خلاف قیاس باتوں میں صحابہ کرامؓ کا قول نص کے جیسا ہوتا ہے، اور حدیث میں امر اس کی تائید کرنے والی ہے اختصار کے ساتھ بیان ختم ہوا، میں مترجم کہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کا اس کے جواز پر اجماع ہے کیونکہ اس کا مقصد نرمی ہے، اور حضرت علی بن طلقؓ کی حدیث استیناف (از سر نو) کرنے پر محمول ہے، اسی لئے یہ دلیل نص ہونے کی وجہ سے افضل ہوا اس بات کا لحاظ رکھے بغیر کہ اس میں اختلاف ہے یا نہیں، اس کے علاوہ چونکہ بناء کرنے کے لئے بہت سی شرطیں متعین کی گئی ہیں، ان سب کی رعایت کرنے میں اس بات کا احتمال ہمیشہ باقی رہ جاتا ہے کہ کسی بھی شرط کے پائے جانے میں کوتاہی باقی رہ گئی ہو، اچھی طرح سمجھ لیں۔ م۔

پھر واضح ہونا چاہئے کہ بناء کے جائز ہونے کی بہت سی شرطیں ہیں، اور مسئلہ اب اس جگہ ختم ہوتا ہے یہ بتا کر کہ بناء کے جائز ہونے میں مرد و عورت سب برابر ہیں ان میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ المحیط۔ جس رکن میں حدث واقع ہو اس کا شمار نہیں ہوگا، اس لئے اس رکن کو بھی دوبارہ ادا کرتے وقت بجالانا واجب ہے۔ الہدایہ۔ الکافی۔ اور استیناف افضل ہے۔ الہدایہ۔ المتون اور یہ حکم امام، مقتدی اور منفرد سب کے واسطے برابر ہے۔

والمنفرد ان شاء اتم في منزله، وان شاء عادالي مكانه، والمقتدى يعود الى مكانه الا ان يكون امامه قد فرغ، او لايكون بينهما حائل.

ترجمہ:- اور تنہا پڑھنے والا اگر چاہے تو اسی جگہ نماز پڑھ لے جہاں اس نے وضوء کیا ہے، اور اگر چاہے تو وہاں سے اسی جگہ پر لوٹ آئے جہاں اس نے پہلے نماز پڑھی تھی اور مقتدی اپنی جگہ پر لوٹ کر آجائے مگر یہ کہ اس کا امام فارغ ہو چکا ہو، یا اس امام اور مقتدی کے درمیان کوئی حائل نہ ہو۔

توضیح:- تنہا نماز پڑھنے والے محدث کا حکم

والمنفرد ان شاء اتم في منزله، وان شاء عادالي مكانه......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ ایسے شخص کو لوٹنے میں چلنے سے حرکت جتنی بھی ہو کوئی نقصان نہیں پہونچاتی ہے، یہی

قول صحیح ہے: ف۔ بلکہ لوٹ کر پرانی جگہ پر آنا ہی افضل ہے۔ الکافی۔ والمقتدی الخ لازمی طریقہ سے اپنی جگہ پر واپس آجائے ۔ف۔ یعنی اس پر بھی لوٹ کر آنا ضروری ہے۔ الفتح۔ اگرچہ وہ امام جس نے خلیفہ بنادیا ہو محدث ہو۔ الصدر۔

الا ان یکون امامه قد فرغ، او لایکون بینهما حائل......الخ

البتہ یہ شخص دو صورتوں میں مستثنیٰ رکھا جائے گا، جو یہ ہیں (۱) اس کا امام فارغ ہو چکا ہو تو ایسی صورت میں اس کا لوٹنا ضروری نہیں ہے، لیکن اس لئے جائز ہے کہ پوری نماز ایک ہی جگہ میں ادا ہو جائے، منفرد کی نماز کی طرح (۲) اور یا امام اور اس کے مقتدی کے درمیان کوئی حائل نہ ہو۔ ف۔ یعنی دوسری صورت یہ ہے کہ مقتدی نے جہاں وضو کیا ہو وہاں سے امام کے ساتھ اقتداء کرنے میں ایسی کوئی چیز درمیان میں حائل نہ ہو جو اقتداء کے لئے مانع ہو جیسے چوڑا راستہ اور بڑا دریا، اور بغیر کھڑکیوں وغیرہ کے اونچی دیوار، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، تو جب وضوء کی جگہ سے ہی اقتداء کرنا صحیح ہو اتو وہیں سے بناء کرنا بھی جائز ہو الہذا صف میں آکر پڑھنا لازمی نہ ہوا۔

بناء صحیح ہونے کی چند شرطیں یہ ہیں

(۱) جو حدث ہو اوہ ایسا ہو کہ جس سے وضوء لازم آتا ہو

(۲) ایسا نہ ہو کہ وہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہو (۳) سماوی ہو یعنی اس حدث یا اس کے سبب میں بندہ کا کوئی اختیار نہ ہو۔ فتح البحر۔ اگر شاذ و نادر الوقوع ہو جیسے لونڈی (انگلی کے پوروں وغیرہ) سے پانی جاری ہونا، کہ اس میں از سر نو (استیناف) کرنا ہوگا، اور بندہ سے مراد یہ ہے کہ اس میں مخلوق کا کوئی اختیار نہ ہو، پس مذکورہ شرطوں کی بناء یہ مسائل نکلتے ہیں۔ م۔ چنانچہ اگر حدث از خود نہ ہوا بلکہ مصلی نے قصداً ہوا باہر کی ہو (گوز کر دیا) یا نکسیر پھوڑ دی ہو یا پائخانہ یا پیشاب نکال دیا تو اس کی نماز باطل ہو گئی اور آئندہ اس پر بناء کرنا جائز نہیں ہے، اور اگر عمداً حدث نہیں کیا بلکہ از خود حدث ہو گیا اور وہ حدث ایسا ہو جس سے غسل لازم ہوتا ہو جیسے کسی عورت کو دیکھ کر انزال ہو گیا تو بھی یہ نماز باطل ہو گئی اور اس پر بناء بھی جائز نہیں ہوگا، اور اگر ایسا حدث ہوا جس سے وضوء لازم آیا ہو تو دیکھا جائے گا کہ اگر کسی آدمی کے کرنے سے ہے تو بھی بناء درست نہ ہوگا، البتہ امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے جیسا کہ الخلاصہ میں ہے۔

اگر کسی مصلی کو کسی نے غلہ، گولی، پتھر یا تیر مار کر زخمی کر دیا یا مصلی کے زخم کو دبادیا جس سے خون وغیرہ نکل پڑا تو امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کے نزدیک بناء نہیں کر سکتا ہے، شرح الطحاوی، اگر کسی نے منہ بھر قئی کی پس اگر بغیر ارادہ ہو تو وضوء کر کے بناء کر لے جبتک کلام نہ کیا ہو، اور اگر بالقصد قئی کی ہو تو بناء نہ کرے۔ المحیط۔ اور اب مصلی کے علاوہ کسی دوسرے سے حدث کا سبب پائے جانے کا بیان ہے، اس کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کسی نے مصلی کے

اوپر چھت سے کوئی ڈھیلا پتھر وغیرہ گرا کر مصلی کا خون نکال دیا، پس اگر اوپر کے آدمی کی رفتار وغیرہ کے سبب سے یہ ہوا تو بناء کرنا جائز نہیں ہے لیکن اس میں امام ابو یوسفؒ کا اختلاف ہے، اور اگر کسی آدمی کے چلنے یا کسی حرکت کرنے سے وہ پتھر نہ گرا ہو تو اس صورت میں بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اختلاف ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کے نزدیک بناء جائز نہ ہوگا، اور یہی قول صحیح بھی ہے، اور اگر کسی درخت کا پھل کچھ اس طرح گرا کہ اس سے نیچے کا نمازی زخمی ہو گیا، تو بھی یہی حکم ہے، اور اگر نمازی کے پاؤں میں یا سجدہ کرتے ہوئے پیشانی میں بلا قصد کانٹا لگا اور خون بھی بہا تو بناء جائز نہ ہوگا، اور اگر زنبور، بھڑ نے اس طرح کاٹا کہ اس سے خون نکل آیا تو بھی بناء جائز نہیں ہے، اگر نمازی کے چھینکنے یا کھنکھارنے کے زور پڑنے سے ہوا نکل گئی تو بھی بناء جائز نہیں ہے، اور یہی صحیح ہے۔ الظہیر یہ۔ اگر گدی جو کہ تر تھی اگر اس کے ارادہ کے بغیر از خود گری ہو تو بالاتفاق وہ بنا کر سکتی ہے، اور اگر اس کی حرکت دینے سے گری ہو تو طرفین کے نزدیک بناء نہیں کر سکتا ہے۔ التبیین۔ اگر مصلی کے زخم اور دنبل سے خون بہا تو دھو کر وضوء کر کے بناء کر لے، اور اگر اسے نچوڑ دیا ہو یا گھٹنے پر تھا اور رکوع یا سجدہ کرتے وقت اس

پر دباؤ پڑنے سے خون بہنے لگا تو وہ حدث عمد کے برابر ہو گا اسی وجہ سے اس پر بناء نہیں کر سکتا ہے۔ المحیط۔

اگر مصلی نماز پڑھتے ہوئے نشہ وغیرہ کے بغیر بیہوش ہوا یا دیوانہ ہوا یا قہقہہ مارا تو وضو کر کے استیناف کرے یعنی از سر نو پڑھے اور بناء نہیں کرے، اسی طرح اگر نماز میں سو گیا جس سے احتلام ہو گیا استحسانا بناء نہیں ہے، اگر مصلی کے کپڑے پر ایک درم سے زیادہ پیشاب کی چھینٹیں اڑ کر پڑ گئیں، اور اس نے نماز سے علیحدہ ہو کر دھو دیا تو ظاہر الروایت میں بناء کرنے کا حکم نہیں ہے۔ شرح الطحاوی۔

بناء کرنے کی دوسری شرط یہ ہے کہ حدث ہوتے ہی نماز سے پھر جائے، اس لئے اگر حدث ہونے کے بعد کوئی رکن ادا کر لیا، یا اتنی دیر ٹھہرا رہا کہ اس میں کوئی رکن ادا ہو سکے تو نماز فاسد ہو گئی، اگر وضوء کے لئے جاتے ہوئے کچھ پڑھا یا آتے ہوئے کچھ پڑھا تو صحیح یہ ہے کہ جانے اور آنے دونوں طرح پڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، یہی صحیح ہے۔ ع۔ البتہ اگر سبحان اللہ یا لا الہ الا اللہ پڑھنے سے اصح قول کے مطابق اس پر بناء کے جائز ہونے کا قول باقی رہتا ہے۔ التبیین۔ اگر رکوع میں امام کو حدث ہوا اور اس نے رکن ادا کرنے کے ارادہ سے سمع اللہ لمن حمدہ کہا یا سجدہ کی حالت میں ہو اور سر اٹھاتے وقت اسی ارادہ سے اللہ اکبر کہا تو سب کی نماز فاسد ہو گی، المنتقی نے اس پر تصریح کی ہے۔ ع۔ اور اگر رکن کی ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو اس میں دو روایتیں ہیں الکافی۔ یعنی ایک قول میں فساد اور دوسرے میں عدم فساد کا، اور وجیز کردری میں قول اول یعنی فساد پر حکم لگایا ہے۔ م۔

تیسری شرط یہ ہے کہ حدث ہو جانے کے بعد قصداً کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے نماز فاسد ہوتی ہے، سوائے ان کاموں کے جن کے کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یا ایسے ضروری کام کے لوازمات سے ہو یا اس کا آخری حصہ کے طور پر ہوا کرتا ہو، اسی بناء پر اگر کسی نے حدث کے بعد کسی طرح کا کوئی کلام کر دیا، یا قصداً قہقہہ مار کر ہنس دیا یا کچھ کھایا یا پیا یا اسی طرح کا اور کوئی کام کیا تو اس کی بناء جائز نہ ہو گا۔ البدائع۔ اگر وضوء کے لئے کنوئیں سے پانی بھرنے کی ضرورت پڑی تو جائز ہو گا۔ البدائع۔ اسی طرح رسی لانے کی ضرورت ہوئی ہو جب بھی، لیکن مضمرات میں کہا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ کنویں سے پانی بھرنے سے بناء کرنا باطل ہو جائے گا، اور خلاصہ میں کہا ہے کہ یہی مختار ہے۔ م۔ اور اگر شرم گاہ کھول کر استنجاء کیا تو بناء جائز نہیں ہے۔ البدائع۔ یہی ظاہر المذہب ہے۔ التبیین۔ ابو علی نسفیؒ نے کہا ہے کہ اگر شرم گاہ کھولنے کی ضرورت پڑ جائے تو بناء جائز ہے، النہایہ، یہی اشبہ ہے مگر بقیاس عورت۔ م۔

اگر عورت نے وضوء کرنے کے لئے اپنے بازو کھول دئے تو بناء ناجائز ہو گی، یہی صحیح ہے، اور معلوم ہونا چاہئے کہ وضوء کرتے وقت اس کے تمام فرائض کے ساتھ اس کی سنتوں کو بھی بجالائے، یہی قول اصح ہے۔ التبیین۔ مگر بعضوں نے کہا ہے کہ ضرورت کے مطابق صرف فرائض بجالائے۔ م۔ البتہ اگر تین کی بجائے چار بار کسی عضو کو دھو لیا تو بناء باطل ہو جائے گی۔ التاتارخانیہ۔ اگر کوئی شخص نزدیک کے پانی کو چھوڑ کر وضوء کرنے کے لئے دور چلا گیا تو اگر ایسا غلطی سے ہو گیا ہو یا دونوں جگہوں کی مقدار میں تھوڑا سا فرق ہو تو بناء جائز ہے، لیکن اگر زیادہ فاصلہ ہو تو بناء جائز نہیں ہے۔ الخلاصہ۔ مثلاً حوض میں وضوء کی مقررہ جگہ کو بلا عذر چھوڑ کر کوئی دوسری طرف چلا گیا اور اگر کسی خاص مجبوری مثلاً جگہ کی تنگی وغیرہ ہو تو بناء جائز ہے۔ الوجیز۔

اگر وضوء کر کے آیا اور ابھی تک نماز کے لئے کھڑا نہیں ہوا تھا کہ اسے یہ بات یاد آ گئی کہ اس نے مسح نہیں کیا ہے، پھر جا کر مسح کیا تو بناء کر سکتا ہے، لیکن اگر نماز کے لئے کھڑا ہو جانے کے بعد یاد آیا کہ مسح نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں بناء باطل ہو گی۔ الخلاصہ۔ اور اگر بھول کر کپڑا اٹھانے چلا گیا تو بھی بناء باطل ہو جائے گی۔ التاتارخانیہ۔ اگر کسی برتن میں پانی مسجد میں رکھا ہوا ہو اس سے وضوء کر کے ایک ہاتھ سے اس برتن کو لے جا کر جائے نماز تک چلا گیا تو بناء جائز ہے۔ المحیط۔ اگر پانی سے بھرے برتن کو دونوں ہاتھوں سے اٹھایا تو اب بناء باطل ہو گی۔ الجوہرہ۔

اگر مصلی کے کپڑے کو نجاست لگ گئی، اگر اسی وقت اسے اتار دینا ممکن ہو اس طرح سے کہ وہیں پر اس کے پاس دوسرا کپڑا

موجود تھا تو نماز صحیح رہے گی، اور اگر فوراً اتارنا ممکن ہو سکا اس لئے اسی نجس کپڑے کے ساتھ ایک رکن نماز ادا کر لیا تو بالاجماع اس کی نماز فاسد ہو گئی، اور اگر رکن ادا تو نہیں کیا لیکن اتنی دیر کر دی کہ اس وقت میں رکن ادا کر سکتا تھا تو فاسد نہیں ہوئی، اگرچہ بہت دیر ہو گئی ہو، اور اگر دوسرا کپڑا پایا لیکن فوراً نہیں اتارا اور نہ کوئی رکن ادا کیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو گئی۔ المحیط۔

اور چوتھی شرط یہ ہے کہ نماز میں جو حدث ظاہر ہوا تھا اس کے بعد اس سے پہلے کا دوسرا حدث ظاہر نہ ہو گیا ہو۔ البحر۔ مثلاً موزوں پر مسح کئے ہوئے تھا کہ نماز کی حالت میں کوئی حدث اتفاقاً ہو گیا اس لئے وہ وضوء کرنے گیا، اور وہاں اتنی دیر ہو گئی کہ اس میں موزوں پر مسح کرنے کی مدت ختم ہو گئی، تو وہ اب از سر نو نماز پڑھے، یہی صحیح ہے، اور مثلاً تیمم کرنے والے کو نماز میں حدث کے بعد پانی استعمال کرنے پر قدرت ہو گئی اور جیسے مستحاضہ نے جس وقت کا وضوء کیا تھا حدث کے بعد وہ وقت گذر گیا۔ محیط السرخسی۔ اور مثلاً بہتے ہوئے زخم والے کا وقت ختم ہو گیا تو بناء باطل ہو گئی۔ التاتارخانیہ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر معذور کا وقت ختم ہو گیا۔ م۔ زخم کی پٹی (جبیرہ) پر مسح کرنے والے کا حدث کے بعد زخم اچھا ہو گیا، تو بناء جائز نہیں ہے۔ التاتارخانیہ۔

اور پانچویں شرط یہ ہے کہ حدث مذکور کے بعد اس کو اپنی قضاء نماز یاد نہ آئے جبکہ وہ صاحب ترتیب ہو۔ البحر۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ موجودہ صورت میں کسی عذر سے وہ ترتیب ساقط بھی نہ ہوئی ہو مثلاً وقت اتنا تنگ ہو گیا ہو جس سے ترتیب سے پڑھنے کا حکم ساقط ہو گیا ہو ایسی صورت میں یاد آنے سے بھی کوئی نقصان نہ ہو گا، اس لئے بناء کرنا جائز ہو جائے گا۔ م۔

چھٹی شرط یہ ہے کہ امام کسی ایسے شخص کو اپنا خلیفہ نہ بنائے جس کی امامت اس جگہ درست نہ ہو، مثلاً عورت کہ ایسی صورت میں بناء صحیح نہیں۔ البحر۔ بلکہ سب کی نماز فاسد ہو گی اس وقت جبکہ کسی عورت یا نابالغ یا حدث والے کسی شخص کو امام خلیفہ بھی بنادے۔ م۔ اگر کسی نے حدث کے بعد گھر کا دروازہ کھول کر وضوء کیا پھر نکل کر نماز کے لئے جانے لگا تو اگر گھر میں چوروں کے داخل ہو جانے کا خوف ہو تو دروازہ بند کر لے ورنہ بند نہ کرے۔ التاتارخانیہ۔ اگر نمازی کو حدث ہو جانے سے اس کے کپڑے کو نجاست لگی ہو تو وہ اسے دھو کر بناء کر سکتا ہے، اور اگر کہیں باہر سے آکر اسے نجاست لگی ہو، یا حدث سے بھی اور باہر سے بھی آکر نجاست لگی ہو تو بناء کرنا صحیح نہ ہو گا اگرچہ یہ دونوں ناپاکیاں ایک ہی جگہ آکر لگی ہوں۔ التبیین۔

ف ساری بحث کا خلاصہ یہ ہوا کہ ابتک تیرہ شرطیں گن کر کے بتائی جا سکی ہیں جو مختصراً یہ ہیں (۱) حدث سماوی ہو (بے اختیاری ہو) (۲) مصلی کے بدن سے باہر ہو (۳) اس سے غسل لازم نہ آتا ہو (۴) اس کا وقوع بہت ہی کم ہو (۵) حدث کی حالت میں نماز کا کوئی رکن ادا نہ کرے (۶) آنے جانے میں رکن ادا نہ کرے (۷) کوئی ایسا کام درمیان میں کرے جو نماز کے مخالف ہو (۸) ایسا غیر ضروری کام ہو کہ جس کے نہ کرنے کی گنجائش ہو نہ کرے (۹) بغیر عذر مثلاً بھیڑ وغیرہ کے انتظار نہ کرے بلکہ فوراً ہی اس جگہ سے نکل جائے (۱۰) حدث سابق ظاہر نہ ہو (۱۱) ترتیب والے شخص کو قضاء نماز یاد نہ ہو (۱۲) مقتدی اپنی جگہ کے علاوہ دوسری جگہ نماز ادا نہ کرے۔ سوائے مذکورہ صورتوں کے (۱۳) کسی ایسے شخص کو اپنا خلیفہ نہ بنائے جو اس وقت امامت کے لائق نہ ہو۔ فعم۔ یہ سارے احکام اس وقت ہوں گے جبکہ نماز میں حدث ہو جانے کے بعد وہاں سے نکلا ہو، کیونکہ اگر حدث ابھی تک نہیں ہوا صرف خیال یا خطرہ ہوا اور نماز سے پھر گیا اور اس کے بعد حدث ہوا تو ظاہر الروایۃ کے مطابق بناء جائز نہیں ہے۔ ف۔ فرائض میں جس طرح بناء کرنا جائز ہے، اسی طرح جنازہ کی نماز میں بھی جائز ہے البتہ خلیفہ بنانے میں اختلاف ہے، بحر الرائق سے اختصار کے ساتھ۔ المحیط۔ ع۔

ہر ایسی صورت میں جس میں نماز میں خلیفہ بنانا جائز ہے اس میں امام کو بناء کرنا جائز ہے، اور جس صورت میں بناء کرنا جائز نہیں ہے وہاں خلیفہ بنانا بھی جائز نہیں ہے اور جو شخص ابتداء امام کے بجائے امام ہو سکتا تھا وہ حدث بناء میں خلیفہ ہو سکتا ہے، اور جو شخص ابتداء میں موجودہ امام کا امام نہ ہو سکتا ہو وہ خلیفہ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ المحیط۔ الحاصل امام کا اعتبار ہوتا ہے قوم کا نہیں، اسی بناء پر اگر امام قاری اور

مقتدی سب امی ہوں تو جماعت کا امام ان میں کا ایک امی ہو سکتا ہے مگر امام کا خلیفہ نہیں ہو سکتا ہے، اگر خلیفہ بنادیا جائے تو سب کی نماز فاسد ہو جائے گی۔م۔

خلیفہ بنانے کا طریقہ

یہ ہے کہ کبڑا بنا ہوا، اپنے ہاتھ سے ناک دابے ہوئے پیچھے ہٹے تاکہ لوگوں کو یہ وہم ہو جائے کہ اس کی نکسیر پھوٹ گئی ہے، یہی سنت ہے۔ف۔ اور اپنے متصل سب سے پہلی صف سے اپنا خلیفہ آگے بڑھادے، بغیر کوئی بات کئے ہوئے، صرف اشارہ سے۔ التبیین۔ اپنے خلیفہ کا کپڑا پکڑ کر محراب کی طرف کھینچے۔ الخلاصہ۔ فع۔ خلیفہ بنانا امام محدث پر واجب نہیں ہے، مگر خلیفہ بنانے کا پہلا حق اسی کو ہے۔م۔ اور ایسا امام محدث کہ وہ صحراء میں یعنی میدان میں جماعت بڑھا رہا ہو اسے اس بات کا اختیار ہے کہ جبتک وہ صفوں سے نہ نکل گیا ہو اس وقت تک کسی کو اپنا خلیفہ بنا سکتا ہے، اور جب مسجد میں ہو تو جبتک مسجد سے نہ نکل گیا ہو۔ التبیین۔ فع۔ مسجد سے نکل جانے کے بعد نہیں بنا سکتا ہے خواہ صفیں باہر تک ملی ہوں یا ملی نہ ہوں، یہ قول شیخینؒ کا ہے اور یہی صحیح ہے۔ مع۔ اور مسجد سے باہر کے آدمی کو خلیفہ بنانا صحیح نہیں ہے، اور شیخینؒ کے قول کے مطابق تو قوم کی نماز ہی فاسد ہو جائے گی، ساتھ ہی امام کی بھی، اصح روایت پر فاسد ہوئی۔ قاضی خان۔ تحفہ۔ع۔ مسبوق کو خلیفہ نہیں بنانا چاہئے، اور خود مسبوق کو بھی چاہئے کہ قبول نہ کرے اور اگر قبول کر لیا تو جائز ہوگا الظہیریہ لیکن امام جہاں تک پہنچا ہے اسکے بعد سے نماز پوری کرے اور جب سلام پھیرنے کا وقت ہو تو کسی کو آگے بڑھا کر خود پیچھے آجائے اور مسبوق اپنی

اور اگر سلام پر پہونچ کر بجائے سلام کے قہقہہ مار دیا یا قصداً حدث کر دیا یا مسجد سے نکل گیا یعنی ایسا کوئی بھی کام کر دیا جو منافی صلوۃ ہے تو اسی کی نماز فاسد ہو گی لیکن قوم کی نماز پوری ہو گی، اور امام سابق اگر اس عرصہ میں فارغ ہو گیا ہو، اس طرح سے کہ اس کی درمیانی کچھ نماز جو چھوٹ گئی تھی اسے طہارت یعنی وضوء کر لینے کے اسے پوری کر کے جماعت کے ختم سے ذرا پہلے آ گیا ہو تو اس کی بھی نماز پوری ہو گئی، اور اگر وہ فارغ نہ ہوا ہو تو قول اصح یہ ہے کہ اس کی نماز بھی فاسد ہو گئی۔ الہدایہ۔ اگر خلیفہ کو امام کا حال معلوم ہو تو اسے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ التاتارخانیہ۔

اور اگر امام کا حال معلوم نہ ہو اور اشارہ سے اسے بتلادے اس طرح سے کہ اگر ایک رکعت باقی ہو تو ایک انگلی اور اگر دو رکعتیں ہوں تو دو انگلیوں سے اشارہ کرے، اور سجدہ تلاوت کے باقی رہنے کو زبان اور پیشانی پر انگلی رکھے اور سجدہ سہو باقی رہنے کو دل پر ہاتھ رکھے۔ الظہیریہ، اور سجدہ نماز کو بتلانے کے لئے اگر ایک باقی ہو تو پیشانی پر ایک انگلی، ورنہ دو انگلیاں رکھے، جوامع الفقہ۔ع۔ اور اگر رکوع باقی ہو تو اس کے بتلانے کے لئے گھٹنے پر ہاتھ رکھے، اور اگر قرأت باقی ہو تو ہاتھ منہ پر رکھ کر اشارہ کرے۔ البحر۔ اگر بات کرتے ہوئے خلیفہ بنایا تو سب کی نماز فاسد ہو گی خواہ جان کر ہو یا بھول کر یا نادانی سے۔ع۔

اگر کوئی چار رکعتوں والی نماز پڑھ رہا ہو، اور کسی دوسرے نے آکر اس کی اقتداء کر لی، اس کے بعد امام کو حدث ہو گیا، اور اس نے اسی مقتدی کو اپنا خلیفہ بنادیا، حالانکہ اسے یہ نہیں معلوم ہے کہ اب تک کتنی رکعت امام نے پڑھی تھی، تو یہ خلیفہ چار ہی رکعت پڑھے، اور احتیاطاً ہر رکعت کے بعد قعدہ کرتا جائے۔ قاضی خان۔ اور اگر کسی لاحق کو خلیفہ بنایا تو وہ قوم کو اشارہ کر دے تاکہ اس پر جو نماز باقی رہ گئی ہو اسے پوری کرلے پھر قوم کو نماز پڑھادے اور اگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ امام کی نماز ——— پوری کر دی، یہانتک کہ سلام پھیرنے کے قریب ہو گیا، پھر اس نے کسی ایسے مدرک کو اپنا خلیفہ بنادیا جس نے سلام پھیر دیا، تو ہمارے نزدیک جائز ہے۔ المضمرات۔ یعنی سلام کے بعد لاحق اپنی نماز پوری کرلے۔م۔

امام محدث امام باقی رہتا ہے یہانتک کہ وہ مسجد سے باہر ہو جائے یا کسی کو اپنا خلیفہ بنادے جو اس جگہ اس نیت سے کھڑا ہو جائے کہ لوگوں کی امامت کرے گا، یا خود قوم کسی کو اپنا خلیفہ بنالے، چنانچہ اگر ان دونوں باتوں سے کوئی بات نہ ہوئی، یہانتک کہ محدث امام نے مسجد ہی کے ایک کونہ میں وضوء کر لیا اور لوگ اس کے انتظار میں کھڑے رہ گئے پھر امام نے آکر لوگوں کے ساتھ نماز مکمل کی تو ادا ہو گئی۔ المحیط۔ اور اگر امام کے نکلنے سے پہلے کوئی شخص از خود آگے بڑھ جائے تو جائز ہو گا۔ قاضی خان۔

اور اگر دو شخص آگے بڑھ گئے تو کہا گیا ہے کہ جس کے ماننے والے زیادہ ہوں گے وہ صحیح اور دوسرا فاسد ہوگا، اور اگر دونوں کے مقتدی برابر ہوں تو دونوں جماعت فاسد ہوگی۔ التبیین۔ اور قول اصح یہ ہے کہ دونوں فریق کی نماز فاسد ہوگی۔ المبسوط۔ ع۔

اگر امام کا صرف ایک ہی مقتدی ہو تو امام کی اور اس کی نیت کے بغیر وہ از خود خلیفہ متعین ہو جائے گا۔ التبیین۔ اور میں مترجم کہتا ہوں کہ از خود متعین ہونے کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ وہ شخص خلافت کے لائق ہو۔ م۔ اگر امام کو حدث ہو گیا اور اس کے مسجد سے باہر جانے سے پہلے کسی نے اس کی اقتداء کرلی تو صحیح ہوگا، اگرچہ پہلے امام محدث نے منہ پھیر لیا ہو۔ ع۔ اگر کسی کو خلیفہ مقرر کر لینے کے بعد امام محدث کی اقتداء کسی نے کی تو یہ باطل ہوگی۔ م۔ خلیفہ کی نماز صحیح ہونے کی شرط یہ ہے کہ امام محدث کے مسجد سے جانے سے پہلے خلیفہ امام کے محراب میں داخل ہو چکا ہو۔ عف وغیرہ۔ مسافروں نے مسافر کی اقتداء کی تو امام کو حدث ہو گیا، اس کے بعد اس نے مقیم مقتدی کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا، اس صورت میں مسافر امام محدث پر مقیم امام کی اتباع میں چار رکعت لازم نہیں ہوگی، اور اگر مسافر کو خلیفہ مقرر کیا اور اس نے اقامت کی نیت کرلی تو قوم پر چار رکعت کا امام لازم نہیں۔ محیط السرخسی۔ یہ سارے احکام اس صورت میں ہیں جبکہ امام کو واقع میں حدث ہو گیا ہو، اور اگر صرف گمان ہوا ہو تو اس کے احکام ابھی بیان کئے جائینگے۔

ومن ظن انه احدث، فخرج من المسجد، ثم علم انه لم يحدث، استقبل الصلوة، وان لم يكن خرج من المسجد، يصلي مابقي، والقياس فيهما الاستقبال، وهو رواية عن محمد، لوجود الانصراف من غير عذر، وجه الاستحسان انه انصرف على قصد الاصلاح، الاترى انه لو تحقق ما توهمه، بنى على صلاته، فالحق قصد الاصلاح بحقيقته مالم يختلف المكان بالخروج، وان كان استخلف فسدت، لانه عمل كثير من غير عذر، وهذا بخلاف ما اذا ظن انه افتتح على غير وضوء، فانصرف ثم علم انه على وضوء، حيث تفسد، وان لم يخرج، لان الانصراف على سبيل الرفض، الاترى انه لوتحقق ماتوهمه، يستقبله، فهذا هو الحرف.

ترجمہ:- اور جس نمازی کو یہ گمان ہو گیا ہو کہ اسے حدث ہو گیا ہے، اور اسی خیال سے وہ مسجد سے نکل گیا بعد میں اسے یہ یقین آ گیا کہ اسے حدث نہیں ہوا ہے تو وہ از سر نو نماز پڑھے (استقبال کرے) اور اگر ابھی تک وہ مسجد سے نہیں نکلا ہو تو صرف باقی نماز پڑھے، اور قیاس کا تقاضا دونوں صورتوں میں یہ ہے کہ از سر نو پڑھے، اور امام محمدؒ سے یہی روایت ہے، کیونکہ اس نے بلا عذر قبلہ سے اپنا منہ پھیر لیا ہے، اور استحسان کی وجہ یہ ہے کہ نمازی بلا وجہ نہیں بلکہ اپنی نماز کی اصلاح کے خیال سے پھرا تھا، کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ جس بات کا اسے وہم ہوا ہے اگر واقع میں یہی ثابت ہو جاتی تو وہ اپنی نماز بناء کرتا، اس لئے اصلاح کے ارادے کو بھی حقیقی اصلاح کے ساتھ ملا دیا گیا ہے، جبتک کہ نکل جانے سے جگہ نہ بدلی ہو، اور اگر اس نے کسی دوسرے کو اپنا خلیفہ بنا دیا تو اس کی نماز فاسد ہو گئی، کیونکہ ایسا کرنا بغیر عذر کے عمل کثیر ہے، یہ حکم اس صورت کے خلاف ہے کہ امام نے یہ گمان کیا ہو کہ اس نے بغیر وضوء کے نماز شروع کی ہے اس لئے اس نے اپنا رخ قبلہ سے پھیر لیا، اس کے بعد اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ وضوء کی حالت میں ہے تو اس صورت میں اس کی نماز فاسد ہو جائے گی اگرچہ وہ مسجد سے باہر نہ ہوا ہو، کیونکہ اس کا رخ بدل دینا نماز کے چھوڑنے کے طور پر ہے، کیا تم یہ نہیں دیکھتے ہو کہ جس بات کا اسے وہم ہوا تھا اگر وہ متحقق ہو جاتی ہو اس صورت میں از سر نو ہی پڑھی ہوتی، تو یہی بات دونوں صورتوں میں اصل ہے۔

توضیح:- غازی نمازی کا دشمن کے آجانے کے شبہ سے رخ پھیرنا، حدث کے شبہ سے امام کا مسجد سے نکلنا، نماز میں بے وضوء نماز شروع کرنے کا شبہ

ومن ظن انه احدث، فخرج من المسجد، ثم علم انه لم يحدث، استقبل الصلوة.....الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے ثم علم الخ پھر اسے معلوم ہوا کہ اسے حدث نہیں ہوا تھا۔ف۔ مثلاً گمان ہوا کہ پیشاب کا قطرہ ٹپک گیا ہے اس لئے مسجد سے نکل گیا، پھر معلوم ہوا کہ نہیں ٹپکا تھا استقبل الخ تو وہ نئے سرے سے نماز پڑھے۔ف۔ خواہ مقرر کیا ہو یا نہیں وان لم یکن الخ اور اگر وہ مسجد سے باہر نہ ہوا ہو۔ف۔ کیونکہ اسے حدث نہ ہونا ظاہر ہو گیا ہے۔

وان لم یکن خرج من المسجد، یصلی مابقی......الخ

تو وہ باقی نماز پڑھ لے، استحسان کے طور پر، والقیاس الخ اور دونوں صورتوں میں قیاس کا تقاضا یہی ہے کہ نئے سرے سے نماز پڑھے، امام محمدؒ کا یہی قول مروی ہے کیونکہ نماز میں بغیر عذر حقیقی کے قبلہ کی طرف سے منہ پھیرنا پایا گیا ہے۔ف۔ اگرچہ چلتے ہوئے قبلہ کی طرف منہ کئے ہوئے ہو یا پیٹھ کئے ہوئے ہو، یہی ظاہر الروایۃ ہے۔ع۔ برخلاف اس صورت کے جبکہ حقیقت میں حدث ہو کر عذر پایا گیا ہو، تو اس صورت میں نص کی وجہ سے خلاف قیاس قبلہ سے اس کا منہ پھیرنا مفسد نہیں ہوا۔

وجہ الاستحسان انہ انصرف علی قصد الاصلاح، الاتری انہ لو تحقق ما توھمہ......الخ

استحسان کی وجہ یہ ہے کہ اس نمازی نے اصلاح کے ارادہ سے اپنا رخ بدلا تھا۔ف۔ الاتری الخ جیسا کہ اس نمازی نے خیال کیا تھا اگر وہ درست ہو جاتا یعنی حقیقت میں حدث ہو تا تو کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اپنی نماز پر بناء کرتا اور پڑھی ہوئی نماز بے کار نہ جاتی فالحق الخ اس لئے اصلاح کے ارادہ کو بھی اصلاح کا حکم دیدیا گیا۔ف۔ مگر یہ بات مسجد سے باہر نکل جانے کے بعد نہیں ہو گی بلکہ مالم یختلف الخ جب تک کہ مسجد سے نکل جانے کی وجہ سے جگہ نہ بدلے۔ف۔ کیونکہ جگہ بدلنا تحریمہ کو باطل کر دیتا ہے، اور جبتک جگہ ایک رہتی ہے تحریمہ باقی رہتا ہے، اسی طرح غازی و مجاہد نے اگر یہ خیال کیا کہ دشمن دوسرے رخ سے آرہا ہے اس لئے اس نے اپنا رخ بھی بدل دیا حالانکہ یہ خیال غلط تھا تو اس کی نماز باطل نہ ہو گی جبتک کہ وہ اپنی جگہ سے نہ نکل جائے۔ جامع التمرتاشی۔ع۔

وان کان استخلف فسدت، لانہ عمل کثیر من غیر عذر......الخ

اور اگر اس وہم کرنے والے غازی نے کسی کو اپنا خلیفہ بنادیا تو اس کی نماز فاسد ہو گئی۔ف۔ اگرچہ اپنی جگہ سے آگے نہ بڑھا ہو۔ف۔ لانہ عمل الخ کیونکہ یہ عمل کثیر ہے جبکہ کوئی عذر بھی نہیں ہے۔ف۔ کہا گیا ہے کہ خلیفہ بنانے سے نماز کے فاسد ہو جانے کا حکم صاحبین کے قول کے مطابق ہے، متفرقات ابو جعفر میں لکھا ہے کہ اگر خلیفہ نے رکوع تک نماز پڑھ لی تب امام کی نماز فاسد ہو گی اس سے پہلے فاسد نہ ہو گی، اور ابن سماعہ نے امام محمدؒ سے روایت کی ہے کہ خلیفہ اگر امام کی جگہ پر کھڑا ہو گیا تو بھی نماز فاسد ہو جائے گی، اگرچہ اس نے کوئی رکن ادا نہ کیا ہو، اگر قوم نے خود خلیفہ بنالیا ہو تو امام کے ماسوا ان تمام مقتدیوں ہی نماز فاسد ہو گی۔الفتح۔

وھذا بخلاف اذا ظن انہ افتتح علی غیر وضوء، فانصرف ثم علم انہ علی وضوء......الخ

اور امام کا نماز سے پھر جانا نماز کی اصلاح کے خیال سے اس کا حکم اس صورت کے مخالف ہے جبکہ اس نے یہ گمان کیا ہو کہ بغیر وضوء کے نماز شروع کی تھی۔ف۔ یا موزہ پہن کر اس پر مسح کئے ہوئے تھا اور اسے گمان ہوا کہ مدت مسح ختم ہو گئی ہے۔ یا تیمم کئے ہوئے تھا اور دور سے چمکدار زمین دیکھ کر اسے خیال ہوا کہ یہ پانی ہے یا ظہر کی نماز پڑھنے کی حالت میں اسے خیال کہ فجر کی نماز باقی ہے، اور وہ صاحب ترتیب ہے اس لئے ترتیب نماز کے ترک واجب کا خیال آگیا، یا کپڑے پر سرخی دیکھ کر یہ گمان ہوا کہ خون ہے۔التبیین۔

فانصرف ثم علم انہ علی وضوء، حیث تفسد......الخ

ان خیالات کی بناء پر اس نے اپنا رخ قبلہ سے پھیر لیا ثم علم الخ پھر اس نے جان لیا کہ تمام خیالات غلط تھے اور وہ بہر صورت باوضوء ہے حیث الخ کہ ان تمام صورتوں میں نماز فاسد ہو گی، اگرچہ وہ مسجد سے باہر نہ گیا ہو لان الانصرف الخ کیونکہ

اس طرح پھرنا نماز کو ختم کر دینے کے ارادہ سے تھا۔ف۔ یعنی نماز کو چھوڑنے کے طور پر پھرا ہے، اصلاح کے لئے نہیں پھرا ہے الاتری الخ کیا تم نہیں دیکھتے کہ جس خیال سے اس نے رخ پھیرا ہے اگر وہ خیال درست ہو جاتا، تو یقیناً اسے از سر نو نماز پڑھنی ہوتی۔ف۔ وہ تو اسی خیال سے پھرا تھا، برخلاف پہلی صورت کے اس میں نماز کو ترک کرنا نہیں ہے بلکہ پختہ کرنا اور بناء کرنا ہے۔

الاترى انه لو تحقق ماتوهمه، يستقبله، فهذا هو الحرف.....الخ

پس یہی بات دونوں صورتوں میں اصل ہے۔ف۔ جس سے دونوں کا فرق ظاہر ہے، حاصل یہ ہوا کہ جو گمان ایسا ہے کہ اس نے ترک ورفض اور چھوڑ دینے کے طور کیا ہو تو وہ مفسد نماز ہوگا، اور جس گمان نے ایسا نہیں کیا تو دیکھا جائے گا کہ اس کے بعد نمازی مسجد سے باہر گیا ہے یا نہیں، اگر باہر چلا گیا ہو تو اس کا تحریمہ ٹوٹ گیا، اور نہیں گیا ہو تو وہ بناء کر سکتا ہے یعنی پہلی پڑھی ہوئی نماز کے بعد سے پڑھ کر نماز مکمل کرے۔م۔ پھر مرد نمازی کے لئے اس کا گھر، کمرہ، عیدگاہ، جنازہ کی نماز کا میدان سب مسجد کے حکم میں ہے، لیکن عورت اگر اپنی نماز کی جگہ سے (جو اس کے کمرہ کے ایک کونہ میں ہوتی ہے) باہر ہوگی تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔التبیین۔

ومكان الصفوف في الصحراء له حكم المسجد، ولو تقدم قدامه فالحد السترة، وان لم تكن فمقدار الصفوف خلفه، وان كان منفردا فموضع سجوده من كل جانب، وان جنّ او نام فاحتلم او اغمى عليه، استقبل لانه يندر وجود هذه العوارض، فلم يكن في معنى ما رود به النص، وكذلك اذا قهقه، لانه بمنزلة الكلام، وهو قاطع.

ترجمہ:-اور صحراء میں صفوں کی جگہ کا وہی حکم ہے جو مسجد کا حکم ہے، اور وہ آگے کی طرف بڑھا ہو تو اس کی حد سترہ ہے، اور آگے سترہ نہ ہو تو پیچھے کی صفوں کی مقدار ہے، اور اگر گمان کرنے والا نمازی اکیلا، تنہا ہو تو اس کی حد اس کے سجدہ کی جگہ ہے ہر طرف سے، اور اگر نمازی دیوانہ ہو گیا یا سونے کی وجہ سے اسے احتلام ہو گیا، یا اس پر بیہوشی طاری ہو گئی تو یہ الگ نماز پڑھتے وقت بالکل ابتداء سے پڑھیں گے کیونکہ ان بیماریوں کا وجود کبھی کبھی ہوتا ہے، لہٰذا یہ بیماریاں اپنی بیماریوں جیسی نہ ہوئیں جن کا بیان حدیث میں آیا ہے، اسی طرح اگر نمازی نے قہقہہ مار دیا، کیونکہ قہقہہ کلام کے حکم میں ہے، اور وہ نماز کو قطع کرنے والا ہے۔

توضیح:-جنگل میں مسجد کا حکم، امام حدث کی حالت میں آگے کی طرف بڑھا منفرد کو اگر گمان ہوا تو اس کی حد، جنون یا احتلام یا بیہوشی کی حالت میں حدث ہوا، یا قہقہہ کے ساتھ ہنسا

ومكان الصفوف في الصحراء له حكم المسجد، ولو تقدم قدامه فالحد السترة.....الخ

اور جنگل میں صفوں کی جگہ جہاں تک ہے وہاں تک مسجد کا حکم ہے ولو تقدم الخ اب اگر نمازی آگے کی طرف سے نکلنے کے لئے بڑھا۔ف۔ اور آگے سترہ موجود ہو تو اس کی حد سترہ تک ہی ہے۔ف۔ لہٰذا اگر سترہ سے بھی آگے بڑھ گیا تو نماز فاسد ہو گئی۔وان لم تکن الخ اور آگے سترہ نہ ہو تو اس کے پیچھے جتنی صفیں ہوں گی ان کے ہی مقدار سے آگے حد ہو گی۔ف۔ یہاں تک کہ اگر پانچ گز تک صفیں ہوں گی تو آگے کی حد بھی پانچ ہی گز ہے، اس لئے اس سے زیادہ آگے بڑھنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، اور اسی قول کو تبیین الحقائق میں یقین کے ساتھ کہا ہے، اور عینی میں بھی یہی مذکور ہے، لیکن ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ جب سترہ نہ ہو تو سب سے بہتر بات یہ ہے کہ اس کے سجدہ کی جگہ کو حد مقرر دیا جائے، کیونکہ امام اپنے بارے میں منفرد کے حکم میں ہے، اور منفرد کا یہی حکم ہے، میں کہتا ہوں کہ بحر الرائق اور در مختار میں ابن الہمامؒ کی اتباع کرتے ہوئے اسی کو اختیار کیا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ پیچھے کی حد میں بھی یہی دلیل قائم ہوتی ہے کہ امام اپنے معاملہ میں منفرد ہے؛ اور میرے نزدیک حق بات یہ ہے کہ منفرد کی اداء قاصر ہے جیسا کہ صراحت کے ساتھ اس بات کو اصول کی کتابوں میں بیان کیا گیا ہے، لہٰذا اس پر جماعت کا

قیاس کرنا درست نہیں ہے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

وان کان منفردا فموضع سجوده من کل جانب......الخ

اور اگر وضوء کے ٹوٹ جانے کا گمان کرنے والا ایک منفرد ہو، **فموضع سجوده الخ** کہ اس کی حد ہر طرف سے اس کے سجدہ کا مقام ہے۔ف۔ یہانتک کہ منفرد کے لئے دائیں، بائیں اور پیچھے اس کی مقدار حد ہے، ایسا ہی المحیط۔ھ۔ پس اگر ہم امام کو منفرد پر قیاس کریں تو پیچھے بھی صفوں تک حد نہیں ہونی چاہئے، بعینہ اسی دلیل سے کہ امام اپنے معاملات میں منفرد کے حکم میں ہے، حالانکہ بالاتفاق پیچھے کی حد آخری صف تک ہونے کی امام اعظمؒ سے نص بیان کر دی ہے، لہذا معتمد قول وہی ہوا جو مصنف ہدایہؒ نے بیان کر دیا ہے۔م۔

وان جنّ او نام فاحتلم او اغمی علیه، استقبل لانه یندر وجود هذه العوارض......الخ

اور اگر نمازی مجنون ہو گیا۔ف۔ وہ خواہ امام ہو یا مقتدی ہو یا منفرد ہو سب کا ایک ہی حکم ہوگا، یا سونے سے اسے احتلام ہو جائے، یا اس پر بیہوشی طاری ہو گئی، **استقبل** تو نماز کو نئے سرے سے پڑھے۔ف۔ بشرطیکہ تشہد کی مقدار نہ بیٹھا ہو۔ف۔ اغماء ایک مرض ہے جو دماغ میں سرد گاڑھے بلغم کے بھرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ع۔ یعنی روح دماغی کے راستے بند کر کے اس کے حس و حرکت کو بند کر دیتا ہے، یہ قول حکیموں کا ہے۔م۔ اور متکلمین کے نزدیک اغماء ایک سہو ہے جو انسان پر اس طرح چھا جاتا ہے کہ اس حالت میں تمام اعضاء بدن میں کمزوری اور سستی آجاتی ہے، اور جنون اس کے خلاف ہے کیونکہ جنون کی وجہ سے عقل میں خرابی اور بربادی آجاتی ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ انبیا کرام پر بیہوشی آسکتی ہے لیکن جنون نہیں آسکتا ہے۔ع۔ الحاصل اگر نماز میں وضوء ٹوٹ جانے کا حکم دیوانگی، بے ہوش یا خواب میں احتلام ہو جانے کی وجہ سے ہو تو اس میں بناء کرنا جائز نہ ہوگا بلکہ از سر نو پوری نماز پڑھنی ہوگی۔م۔ **لانه یندر الخ** کیونکہ ایسی بیماریاں بہت ہی کم شاذ و نادر ہوتی ہیں، اس وجہ سے عموم بلوی نہیں ہوتا ہے۔م۔

فلم یکن فی معنی ما رود به النص، و کذلك اذا قهقه، لانه بمنزلة الکلام، وهو قاطع......الخ

اس بناء پر یہ عارضے ان عارضوں کے معنی میں نہ آسکے جو نص میں بیان کئے گئے ہیں۔ف۔ یعنی ہوا کا خارج ہونا، قئی، نکسیر اور مذی کا نکلنا کیونکہ یہ چیزیں اکثر و بیشتر پائی جاتی ہیں نادر و نایاب نہیں ہیں، اس لئے قلیل الوجود حدث ہونے کی صورت میں بناء کرنے کا حکم نہیں ہوگا۔م۔ **و کذلك الخ** اسی طرح اگر نمازی نے قہقہہ مار دیا۔ف۔ تو بناء نہیں ہوگا، کیونکہ نص میں جو عارضے بتائے گئے ہیں وہ بے اختیاری طور پر پائے جاتے ہیں، بخلاف قہقہہ کے کیونکہ قہقہہ تو کلام کرنے کے برابر ہے، اور یہ کلام تو نماز کو توڑ دیتا ہے۔ف۔ اسی طرح قہقہہ بھی نماز کو ختم کرنے والا ہوگا، اسی لئے اس نماز کی بناء نہیں ہو سکتی جو کلام کرنے یا قہقہہ مارنے کی وجہ سے ٹوٹ گئی ہو، یہ احکام اس صورت میں ہوں گے جبکہ یہ باتیں تشہد کی مقدار بیٹھنے سے پہلے پائی گئی ہوں، کیونکہ اگر تشہد کی مقدار بیٹھنے کے بعد ہوئیں تو اس کی نماز پوری ہو جائے گی۔ع۔

وان حصر الامام عن القراء ة، فقدم غیره اجزأهم عند ابی حنیفةؒ، وقالا لایجزیهم، لانه یندر وجوده، فاشبه الجنابة، وله الاستخلاف بعلة العجز، وهو هنا الزم، والعجز عن القراء ة غیر نادر، فلا یلحق بالجنابة، ولو قرأ مقدار ما تجوز به الصلوة، لایجوز بالاجماع، لعدم الحاجة الی الاستخلاف، وان سبقه الحدث بعد التشهد توضأ وسلم، لان التسلیم واجب، فلابد من التوضی لیأتی به، وان تعمد الحدث فی هذه الحالة او تکلم او عمل عملا ینافی الصلوة، تمت صلوته، لانه تعذر البناء لوجود القاطع، لکن لا اعادة علیه، لانه لم یبق علیه شیء من الارکان.

ترجمہ:- اگر امام قرأت کرتے ہوئے رک جائے اور کسی دوسرے کو اپنی جگہ پر بڑھا دے تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تمام

لوگوں کی نماز درست رہے گی، لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ کسی کی نماز درست نہ رہے گی، کیونکہ ایسی مجبوری بہت ہی کم ہوتی ہے، تو یہ جنابت کے مشابہہ ہو گیا، اور امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ اس وقت دوسرے کو خلیفہ بنانا عاجز ہو جانے کی وجہ سے ہے، اور یہ عاجزی یہاں اچھی طرح پائی جا رہی ہے، اور قرأت سے عاجز ہو جانا کوئی نادر واقعہ نہیں ہے اس لئے اسے جنابت کے ساتھ حکم میں نہیں ملایا جا سکتا ہے، اور اگر اس نے اتنی قراءت کر لی تھی جس سے نماز جائز ہو جاتی ہے تو بالاجماع خلیفہ بنانا جائز نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں خلیفہ مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اور اگر تشہد کے بعد حدث ہو گیا ہو تو وضوء کر کے صرف سلام کہہ لے، کیونکہ سلام کہنا اس وقت واجب ہے اس لئے وضوء کرنا اس کے ادا کرنے کے لئے ضروری ہو گا، اور اگر اسی وقت اپنے ارادہ سے حدث کر لے یا گفتگو کر لے یا کوئی بھی ایسا کام کر لے جو نماز کے مخالف ہو تو اس نماز پوری ہو گئی، کیونکہ اس نے بناء کرنے کو ناممکن بنا دیا ہے مخالف نماز پائے جانے کی وجہ سے، لیکن اب اس پر اس نماز کو دوبارہ ادا کرنے کی ضرورت نہ ہو گی، کیونکہ اب اس پر کوئی رکن ادا کرنا باقی نہیں رہا۔

توضیح:-امام قراءت کرنے سے عاجز ہو گیا، ایسی صورت میں اس نے دوسرے کو آگے بڑھا دیا، تشہد کے بعد حدث کیا، یا منافی نماز کوئی عمل کیا

وان حصر الامام عن القراء ة، فقدم غیره اجزأهم عند ابی حنیفةؒ، وقالا لایجزیهم......الخ

اگر امام قرأت سے عاجز ہو جائے اور چاہنے کے باوجود نہ پڑھ سکے۔ف۔ یہانتک کہ ایک آیت بھی نہ پڑھ سکے، کسی دہشت یا شرمندگی یا کسی اور وجہ سے حالانکہ وہ اس سورہ یا آیت کا حافظ ہے اور پڑھ سکتا ہے، اس مجبوری میں اس نے کسی دوسرے کو اپنا قائم مقام بنا دیا، تو امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک جماعت کے لئے کافی ہے۔ف۔ اور امام احمدؒ کا یہی معمول بھی ہے۔ مع۔ **وقالا الخ** اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ ان کو یہ کافی نہیں ہے۔ف۔ یہ مشہور قول ابو یوسفؒ کا ہے، برخلاف المفید کے کہ جس میں ابو یوسفؒ کا قول ابوحنیفہؒ کے قول کے ساتھ ذکر کیا ہے مع۔

لانه یندر وجوده، فاشبه الجنابة......الخ

کیونکہ ایسا واقعہ نادر الوجود ہے لہذا جنبی ہونے کے مشابہہ ہو گا، پھر صاحبینؒ کے نزدیک جب موجودہ صورت میں کسی کو خلیفہ نہیں بنا سکتا ہے تو امی کی طرح بغیر قرأت ہی کی نماز مکمل کر دے بشرطیکہ مقتدیوں میں کوئی بھی قاری نہ ہو سب امی ہی ہو۔ن۔

ف۔ غایۃ البیان میں کہا ہے کہ یہ کہنا بھول ہے، کیونکہ صاحبینؒ کا مذہب یہی ہے کہ وہ از سر نو نماز پڑھے، جیسا کہ فخر الاسلامؒ نے شرح الجامع الصغیر میں تصریح کر دی ہے۔ مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنفؒ نے بھی تو اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے یہ کہہ کر کہ جنابت کے مشابہہ ہے جبکہ جنابت میں از سر نو پڑھنے کا ہی حکم ہے۔م۔

وله الاستخلاف بعلة العجز، وهو هنا الزم، والعجز عن القراء ة غیر نادر، فلا......الخ

امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ خلیفہ تو اصل کے عاجز ہونے کی صورت میں ہی بنایا جاتا ہے، **وهو ههنا الخ** اور یہ بات اس جگہ اچھی طرح لازم آرہی ہے **والعجز الخ** اور قرأت سے عاجز ہو جانا پڑھتے پڑھتے رک جانا نادر نہیں ہے۔ف۔ کیونکہ اکثر اوقات رعب اور شرم وغیرہ کی وجہ سے پڑھنا موقوف ہو جاتا ہے، **فلا یلحق الخ** لہذا اسے جنابت کے حکم میں شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ف۔ البتہ یہ بات اور ہو گی کہ وہ بالکل ہی بھول کر امی ہو چکا ہو، ایسی صورت میں بالاجماع خلیفہ نہیں کیا جا سکتا ہے، شیخ الاسلام ابوالیسرؒ نے اس مسئلہ کی تصریح کر دی ہے۔ مع۔

ولو قرأ مقدار ما تجوز به الصلوة، لایجوز بالاجماع، لعدم الحاجة الی الاستخلاف......الخ

اور اگر امام نے اتنی قرأت کرلی ہو جو نماز کے لئے کافی ہو جاتی ہے۔ف۔ جس کی مقدار ایک آیت ہے، جیسا کہ اس کی تصریح امام رازیؒ وغیرہ نے کی ہے۔ مل۔ لایجوز الخ تو بالاجماع خلیفہ بنانے کی ضرورت نہ ہوگی۔ف۔ بالفرض اگر اس صورت میں کسی کو اپنا خلیفہ بنالیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ المحیط۔ کیونکہ یہ عمل کثیر ہے۔د۔ پھر کتنی قرأت جائز اور کافی ہوتی ہے، اس کی تفسیر میں ایک آیت کہنا جیسا کہ ابھی مذکور ہوا غور طلب ہے، کیونکہ پوری فاتحہ اور اس کے ساتھ تین آیتوں کا ہونا قول اصح کے مطابق واجب ہے، جس کے نہ کرنے سے ایسی کمی لازم آتی ہے کہ اس نماز کو دوبارہ پڑھنا واجب ہو جاتا ہے، اور ایک ہی آیت پر اکتفاء کرنا گناہ کا کام ہے، اس بناء پر شاید یہ کہا جاسکے کہ عذر کی مجبوری سے ایک آیت کافی ہے، غور کرلیں۔ م۔

وان سبقه الحدث بعد التشهد توضأ وسلم، لان التسليم واجب، فلابد من التوضي......الخ.

اور اگر نمازی کو تشہد کے بعد حدث ہو گیا ہو تو وضوء کر کے صرف سلام کہدے۔ف۔ یہ کہنے سے اگرچہ فرض ادا ہو گیا لیکن واجب باقی رہا، **لان التسليم الخ** اس لئے کے سلام کہنا واجب ہے اس لئے وضوء کرنا بھی ضروری ہوا تاکہ سلام کہہ سکے۔ف۔ کیونکہ طہارت کے بغیر نماز پوری سے فراغت نہیں ہو سکے گی **وان تعمد الخ** اور اگر تشہد کے بعد اس نے قصداً حدث کر دیا یا قصداً گفتگو کی یا قصداً ایسا کوئی بھی کام کیا جو نماز کے منافی ہو تو اسکی نماز پوری ہو گئی۔ ف۔ اس کی نماز ختم ہو گئی اگرچہ سلام کرنا واجب تھا ترک ہو گیا ہے۔ لیکن اب پہلے کی طرح وضو کر کے صرف سلام نہیں کر سکتا ہے۔ کیونکہ نماز کو ایک بار ختم کر کے اس پر بناء کرنا مشکل ہے۔

لكن لا اعادة عليه، لانه لم يبق عليه شيء من الاركان......الخ

لیکن اسے اب دوبارہ نماز پڑھنی لازم بھی نہیں ہوگی، کیونکہ اب اس پر کوئی رکن باقی نہیں رہا ہے۔ف۔ اور نماز سے جو یہ فارغ ہوا ہے وہ اپنے ارادہ سے ہوا ہے، اگرچہ لفظ سلام سے فارغ ہونا واجب تھا، لیکن اس کی وجہ اس کے پہلے کے ارکان میں کوئی خرابی نہیں ہوتی ہے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث میں تشہد ختم کر کے فرمایا کہ تمہارا کھڑے ہونے کو اگر جی چاہے تو کھڑے ہو جاؤ، اس کا ظاہر اسی مفہوم کا تقاضا کرتا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں۔

فان راى المتيمم الماء فى صلاته بطلت، وقد مر من قبل، فان رآه بعد ما قعد قدر التشهد، اوكان ماسحا فانقضت مدة مسحه، اوخلع خفيه بعمل يسير، اوكان اميا فتعلم سورة، اوعريانا فوجد ثوبا، او مؤميا فقدر على الركوع والسجود، او تذكر فائتة عليه قبل هذه، او احدث الامام القارىء فاستخلف اميا، او طلعت الشمس فى الفجر، او دخل وقت العصر وهو فى الجمعة، اوكان ماسحا على الجبيرة فسقطت عن برء، اوكان صاحب عذر فانقطع عذره كالمستحاضة ومن بمعناها، بطلت الصلوة فى قول ابى حنيفةؒ، وقالا: تمت صلوته.

ترجمہ:۔ اگر تیمم کر کے نماز پڑھنے والے نے نماز کی حالت میں پانی کو دیکھ لیا (قادر ہو گیا) تو اس کی نماز باطل ہو گئی، اور یہ مسئلہ پہلے بھی گذر چکا ہے، اگر اس متیمم نے مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد پانی کو دیکھا، یا موزہ پر مسح کرنے والا تھا اور اس کی مدت مسح ختم ہو گئی ہو، یا اپنے موزوں کو معمولی سی حرکت سے اتار دیا ہو، یا اس نے اپنے ذمہ اس سے پہلے کی باقی فرض نماز کو یاد کر لیا ہو، یا قاری امام نے حدث کیا پھر کسی امی کو اپنا خلیفہ بنادیا ہو، یا فجر کی نماز پڑھتے ہوئے سورج نکل آیا ہو، یا جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے عصر کا وقت آگیا ہو، یا زخم وغیرہ کی پٹی پر مسح کرنے والا ہو اور وہ پٹی زخم کے اچھے ہونے کے بعد گر گئی ہو، یا وہ کسی وجہ سے صاحب عذر تھا لیکن اس کا عذر ختم ہو گیا ہو جیسا کہ استحاضہ والی عورت یا اس جیسی کسی عذر والا ہو تو ان تمام صورتوں میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی نماز باطل ہو گئی لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی نماز پوری ہو گئی ہے۔

توضیح:۔ تشہد کے بعد منافی نماز کے پائے جانے کی چند صورتیں جن میں امام صاحبؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک نماز کے جائز ہونے یا فاسد ہونے میں اختلاف ہے، اور ان کی تفصیل

فان راى المتيمم الماء فى صلاته بطلت، وقد مر من قبل......الخ

اگر متیمم نے اپنی نماز میں پانی دیکھا۔ف۔ یعنی تشہد سے پہلے اس حال میں کہ اسے اب پانی کے استعمال پر قدرت ہے، اور پانی پاک اور بقدر ضرورت ہے اور اس کے ملنے کا گمان غالب ہے۔ بطلت الخ تو اس کی نماز بالاجماع باطل ہو گئی، اور یہ مسئلہ پہلے بھی گذر چکا ہے۔ف۔ یعنی تیمم کے بیان میں گذر چکا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ متیمم نے اپنی نماز کی حالت میں پانی ایسی صورت اور حالت میں دیکھا کہ اس کا تیمم ٹوٹ گیا، تو یہ حدث ایسا نہیں ہے کہ اس پر اپنی نماز کی بناء کرے کیونکہ اس کی نماز باطل ہو گئی ہے، نہایہ میں کہا گیا ہے کہ اس کے باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ متیمم جو پانی کا خلیفہ ہے اس سے اس کا مقصود یعنی نماز مکمل ہونے سے پہلے ہی اصل یعنی پانی پر قدرت حاصل ہو گئی ہے، اور حدث سابق ظاہر ہونے سے نماز بناء کے قابل نہ رہی، بخلاف اس صورت کے کہ متیمم کو حدث ہوا جب وہاں سے نکلا تو اسے پانی مل گیا تو اسے چاہئے کہ اب وضوء کر کے بقیہ نماز پوری کرے، کیونکہ اس صورت میں اس نے حدث کے بعد پانی پایا ہے، اس لئے کہ اس پانی کی وجہ سے اس کا وضوء نہیں ٹوٹا ہے بلکہ پہلے ہی حدث ہوا ہے، لیکن پہلی صورت میں پانی سے ہی حدث سابق ظاہر ہے، میں کہتا ہوں کہ صحیح بات یہ ہے کہ دونوں مسئلوں کے درمیان نماز باطل ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، جس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔م۔

شرح الکنز میں ہے کہ اگر کسی تیمم کرنے والے امام کے پیچھے وضوء کرنے والا مقتدی ہو اور اس نے پانی دیکھ کر یہ اعتقاد کیا کہ میرے امام کو پانی پر قدرت حاصل ہے، اس بناء پر اس کی نماز صحیح نہ ہو گی، اور اس اعتقاد کی وجہ سے اقتداء اور نماز سب باطل ہوئی، لیکن اگر امام کو پانی ہونے کا علم نہ ہو سکا تو اس کی نماز درست رہے گی، فتح القدیر میں ایسا ہی ہے، اگر تیمم کرنے والے مسافر نے نماز میں کسی شخص کے پاس کافی پانی دیکھ کر گمان یا شک کیا کہ مانگنے سے بھی وہ پانی نہیں دے گا، اس کے باوجود اس نے نماز توڑ کر اشارہ سے اس سے پانی مانگا اب اگر اس نے پانی نہیں دیا تو اس کا تیمم حسب سابق باقی رہے گا، جیسا کہ صدر الشریعہ نے اس کی تصریح کی ہے، اس صورت میں نماز کے باطل ہونے کی وجہ حدث سابق نہیں ہے بلکہ ترک نماز کی نیت سے نماز سے باہر آنا ہے، اسی بناء پر اگر وہ انکار نہ کرتا بلکہ پانی دے دیتا تو بھی اسے از سر نو نماز پڑھنی ہوتی۔

اب اسکی مثال ایسی ہو گئی کہ تیمم کرنے والے نے سراب (چمکدار بالو) کو پانی سمجھ کر اپنا رخ پھیر لیا تو اس صورت میں بالکل ابتداء سے نماز لازم ہو جاتی ہے جیسا کہ قوله من ظن انه احدث الخ کی شرح میں گذر گیا ہے اس بناء پر اگر نماز کی حالت میں کسی کے پاس پانی دیکھ کر وضوء کے لئے پانی مانگنا چاہا مگر ملنے کا یقین نہ ہونے کی وجہ سے نہیں مانگا، پھر نماز پوری کر لینے کے بعد مانگا اور اس نے نہ دیا تو نماز پوری ہو گئی جیسا کہ صدر الشریعہ نے زیادات سے نقل کیا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ مصنفؒ نے جس مسئلہ کو ذکر کیا ہے وہ دو قیدوں سے مشروط ہے (۱) تیمم کرنے والے نے پانی اس صورت سے دیکھا کہ اس کے استعمال پر اسے قدرت حاصل ہو گئی ہے (۲) اس نے نماز کے رخ سے اپنا منہ پھیر لیا ہے، ان قیدوں پر قرینہ یہ ہے کہ مسئلہ کو بناء جائز نہ ہونے کے تحت بیان کیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ حکم منہ پھیرنے پر ہے، مکمل کرنے پر موقوف نہیں ہے، اس مسئلہ کو اچھی طرح یاد کر لیں کیونکہ صرف میرے دل و دماغ پر اس کا انشراح ہوا ہے کسی دوسری جگہ اس بحث کے ملنے کی امید نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔م۔

فان رآه بعد ما قعد قدر التشهد، او كان ماسحا فانقضت مدة مسحه......الخ

اور تیمم کرنے والے نے مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد پانی پایا۔ف۔ تو نماز کے باطل ہونے میں امام صاحب اور صاحبینؒ کا اختلاف ہے، اس جگہ مسلسل بارہ مسائل کئے گئے ہیں کہ ان سبھوں میں تشہد ختم کر لینے کے یا اتنی دیر بیٹھنے کے بعد سے متعلق ہے ہیں۔

(۱) یہی ہے کہ متیمم نے مقدار تشہد بیٹھنے کے پانی دیکھا اور اس کے استعمال پر قادر بھی ہوا۔

(۲) او كان ماسحا الخ یا وہ موزوں پر مسح کرنے والا تھا اور اس کے مسح کی مدت گذر گئی۔ف۔ مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد اور اس کے پاس پاؤں دھونے کی مقدار میں پانی بھی موجود ہے تو امام صاحب کے نزدیک اس کی نماز باطل اور صاحبین کے نزدیک

پوری ہو جائے گی۔
اور شرح الکنز (یعنی زیلعیؒ کی تبیین الحقائق) میں ہے کہ اگر پانی نہیں پایا تو امام اعظمؒ کے قول کی بناء پر بعض نے کہا ہے کہ نماز باطل نہ ہو گی، مگر بعضوں نے کہا ہے کہ باطل ہو جائے گی، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اگر حدث ہوا اور وضوء کرنے کو گیا، اور وضوء کرتے ہوئے مسح کی مدت ختم ہو گئی تو اس کی نماز باطل نہ ہو گی بلکہ وضوء کر کے پاؤں دھولے اور نماز پر بناء کرے یعنی صرف بقیہ نماز پوری کرلے، کیونکہ اسکو صرف پاؤں دھونا ایسے حدث سے لازم آیا ہو جو فی الحال اس کے پاؤں میں اثر کر گیا ہے تو ایسا سمجھا جائے گا گویا اس کو ایک حدث ہو گیا، لیکن صحیح قول یہ ہے کہ وہ بناء نہیں کر سکتا ہے بلکہ اسے از سر نو نماز پڑھنی ہو گی، کیونکہ مدت کا ختم ہونا کوئی خود مستقل حدث نہیں ہے بلکہ اس سے وہ حدث ظاہر ہو گا جو شروع نماز سے پہلے منسوب ہو، اس لئے گویا اس نے بغیر طہارت نماز شروع کی ہے، اس کی مثال اس تیمم کرنے والے کی سی ہو گئی جو حدث ہو جانے پر وضوء کرنے کے لئے گیا اور اسے وہاں پانی مل گیا تو اب وہ پڑھی ہوئی نماز پر بناء نہیں کر سکتا ہے بلکہ گذشتہ دلیل کی بناء پر از سر نو پڑھے گا، اور جیسا کہ استحاضہ والی عورت کو نماز میں حدث ہوا اور وضوء کر کے آنے سے پہلے اس نماز کا وقت نکل گیا تو وہ بناء نہیں کر سکتی ہے۔ف۔

او خلع خفیه بعمل یسیر، او کان امیا فتعلم سورة......الخ

(۳) تیسرا مسئلہ او خلع خفیه الخ یعنی مقدار تشہد بیٹھنے کے بعد خفیف عمل سے اپنے موزوں کو اتار دیا۔ف۔ کوئی بھی ایک موزہ نکالا، دونوں کو نکالنا کی قید ضروری نہیں ہے، خفیف عمل سے نکالنے کی صورت یہ ہو گی کہ اس کے موزے بہت ہی ڈھیلے ڈھالے تھے جو پاؤں کو ذرا حرکت دینے سے اتر گئے، اور دونوں ہاتھ لگانے کی ضرورت نہ پڑی، پھر پورے پاؤں کے نکالنے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی بلکہ قدم کا اکثر حصہ نکل جانا ہی اس مقصد کے لئے کافی ہے یعنی ان پاؤں کو دھونا لازم آگیا حالانکہ ابھی تک نماز سے فارغ نہیں ہوا ہے، اسی صورت میں امام اعظمؒ کے نزدیک نماز باطل اور صاحبینؒ کے نزدیک نماز مکمل ہو گئی ہے، اس جگہ عمل خفیف کی قید لگانے کا فائدہ یہ ہو گا کہ اگر عمل کثیر سے یا دونوں ہاتھ لگا کر اتارا تو خود بخود وہ نماز سے خارج ہو جائے گا، اور چونکہ مقدار تشہد وہ بیٹھ چکا ہے لہٰذا بالاجماع نماز پوری ہو جائے گی۔م ع۔ف۔ وغیرہ۔

او کان امیا فتعلم سورة......الخ

(۴) چوتھا مسئلہ و اکان امیا یا نمازی امی تھا۔ف۔ جو تنہا نماز پڑھ رہا تھا۔الینابیع۔ یا اپنے ہی جیسے امیوں کی امامت کر رہا تھا۔ التبیین۔ اسی حالت میں کوئی سورہ یاد ہو گئی۔ف۔ تشہد کے بعد ایسا ہونے سے امام اعظمؒ کے نزدیک نماز باطل ہو جائے گی لیکن صاحبینؒ کے نزدیک باطل نہ ہو گی اس جگہ سورہ سے مراد صرف اتنی مقدار یاد ہونا کافی ہو گا جس سے قرأت جائز ہو جاتی ہو جو کہ امام صاحب کے نزدیک صرف ایک آیت ہے۔م۔ اور یاد ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی پڑھنے والے انسان کی آواز کان میں گئی اور از خود بلا اختیار وہ آیت یاد ہو گئی یا وہ آیت حافظہ سے نکل گئی تھی اور اس موقع پر اچانک یاد آگئی، اس صورت میں امام صاحب کے نزدیک باطل اور صاحبین کے نزدیک مکمل ہو جائے گی، اور اگر بالارادہ نماز ہی کی حالت میں اس نے مقدار تشہد بیٹھنے بعد آہستہ یاد کرلی تو چونکہ یہ عمل نماز کے منافی اور عمل کثیر ہے اس لئے بالاتفاق نماز مکمل ہو جائے گی۔ التبیین۔ع۔ اور اگر ایسا نمازی کسی قاری کے پیچھے پڑھ رہا ہو جب بھی عامہ مشائخ کے نزدیک فاسد ہو جائے گی، لیکن بعض کے نزدیک فاسد نہ ہو گی، امام ابواللیثؒ نے اسی قول کو قبول کیا ہے۔الینابیع۔ع۔التبیین۔ اور یہی قول صحیح ہے۔الظہیریہ۔ھ۔

او عریانا فوجد ثوبا، او مؤمیا فقدر علی الرکوع والسجود......الخ

پانچویں مسئلہ او عریانا الخ یا کوئی نمازی ننگا نماز پڑھ رہا تھا کہ اسی حالت میں اسے کپڑا مل گیا۔ف ایسا کپڑا پایا جس سے نماز صحیح ہو سکتی ہو، یعنی اس میں اتنی ناپاکی بھی نہ ہو جس سے نماز صحیح نہ ہو، یا اس میں اگر ناپاکی لگی ہوئی بھی ہو مگر اس کے پاک کرنے کے لئے پانی وغیرہ موجود ہو، اور اگر پانی نہ ہو تو اس کپڑے کا چوتھائی یا اس سے زیادہ حصہ پاک ہو۔ التبیین۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ

مذکورہ قیود اور فوائد صرف کپڑوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں بلکہ ہر ایسی چیز کے لئے بھی جو بدن کے ڈھانکنے میں کام آسکتی ہو، اسی بناء پر جو نماز کی شرطوں کے بیان میں گذر چکا ہے، الحاصل اس مسئلہ میں بھی امام صاحب اور صاحبینؒ کے درمیان نماز کے باطل ہونے اور مکمل ہو جانے کے سلسلہ میں وہی اختلاف ہے جو دوسرے مسائل میں بیان کیا گیا ہے۔م۔ چھٹا مسئلہ او مومیا یا نمازی اپنی نماز میں رکوع و سجود کو اشاروں سے ادا کر رہا ہو، لیکن مقدار تشہد کے بعد وہ رکوع و سجود پر اچانک قادر ہو گیا۔ف۔ تو اس مسئلہ میں بھی دوسرے مسئلوں کی طرح اختلاف ائمہ ہوگا۔

او تذکر فائتة علیه قبل هذه......الخ

ساتواں مسئلہ او تذکر فائتة الخ یا مقدار تشہد تک پڑھ لینے کے بعد نماز کو وہ قضاء نماز یاد آگئی جسے اس نے ابتک ادا نہیں کیا اور وہ ذمہ میں باقی ہے۔ف۔ مثلاً ظہر کی نماز پڑھتے ہوئے قعدہ اخیرہ کے بعد اسے یہ بات یاد آگئی کہ آج کی فجر کی نماز قضاء ہو گئی تھی اور ابتک اسے ادا نہیں کر سکا ہے، جبکہ یہ نمازی صاحب ترتیب ہے ساتھ ہی قضاء نماز چھ نمازوں سے کم ہے اور وقت میں بھی اتنی گنجائش ہے کہ قضا نماز ادا کر لینے کے بعد پھر سے وقتیہ نماز بھی پڑھ لے، اس لحاظ سے اس پر یہ لازم تھا کہ پہلے فجر یا قضاء نماز ادا کر لینے کے بعد ظہر کی نماز پڑھتا، تو اس مسئلہ میں گذشتہ مسئلوں کی طرح ائمہ کرام کا اختلاف ہے۔م۔ ان تمام شرطوں کے بعد بھی اگر فائتہ نماز یاد آئی تو فقط اسی کی نماز فاسد ہوگی۔التبیین۔

او احدث الامام القاریء فاستخلف امیا......الخ

آٹھواں مسئلہ او احدث الامام الخ یا مقدار تشہد کے بعد قاری امام کو حدث ہو گیا اس وجہ سے اس نے دوسرے کو اپنا خلیفہ بنادیا جو امی ثابت ہوا۔ف۔ تو اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے، اور متون کی کتابوں میں بھی یہی بیان کیا گیا ہے، لیکن علامہ شیخ الاسلامؒ نے اس قول کو اختیار کیا ہے کہ بالاجماع نماز فاسد نہ ہوگی، اور کافی میں بھی لکھا ہے کہ یہی صحیح قول ہے، اور فساد نہ ہونا کشف الغوامض، مبسوط میں مذکور ہے۔ مع۔ د۔ م۔

او طلعت الشمس فی الفجر......الخ

نواں مسئلہ او طلعت الشمس الخ یا فجر کی نماز پڑھتے ہوئے آفتاب نکل آیا۔ف۔ یعنی مقدار تشہد کے بعد تو اس میں بھی حسب سابق ائمہ کا اختلاف ہے، اس بناء پر کہ تحریمہ سے وہ خارج نہیں ہوا ہے۔ع۔ اس طرح جبکہ عیدین کی نمازوں میں آفتاب ڈھل گیا ہو، یا قضاء، نماز پڑھتے ہوئے ممنوعہ تین اوقات میں سے کوئی وقت آگیا ہو۔د۔

او دخل وقت العصر وهو فی الجمعة......الخ

دسواں مسئلہ او دخل وقت العصر الخ یا جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے عصر کا ابتدائی وقت داخل ہو چکا ہو۔ف۔ مقدار تشہد کے بعد ایسا ہوا ہو تو دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی ائمہ کا اختلاف ہوگا، ینابیع میں کہا ہے کہ یہ مسئلہ اسی وقت صحیح ہوگا جبکہ صاحبینؒ کے قول کے مطابق ظہر کا آخری وقت کا سایہ ایک مثل کے برابر ہو۔ع۔ میں کہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ امام اعظمؒ نے ایک دو مثل سایہ ہونے کے قول سے ایک مثل سایہ کی طرف رجوع کر لیا ہے۔م۔ موجودہ مسئلہ میں جمعہ کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے، کیونکہ ظہر میں بھی یہی حکم ہے، اگرچہ بعض لوگوں کا قول یہ بھی ہے کہ جمعہ کی قید احترازی ہی ہے یعنی حکم مذکور صرف جمعہ کے لئے ہے، اور ظہر کے لئے نہیں ہے، کہ ظہر کا حکم جمعہ کے حکم کے مخالف ہے۔ع۔ وغیرہ۔ اور یہی اظہر قول ہے۔م۔

او کان ماسحا علی الجبیرة فسقطت عن برء......الخ

گیارہواں مسئلہ او کان ماسحا الخ یا ایسا نمازی جو زخم کی پٹی پر مسح کر کے نماز پڑھ رہا تھا کہ مقدار تشہد کے بعد زخم بھر کر از خود وہ پٹی گر گئی۔ف۔ کیونکہ اگر وہ زخم کچا رہتے ہوئے پٹی گر جائے تو اس کی طہارت زائل نہ ہوگی، باقی رہ جائے گی۔

او كان صاحب عذر فانقطع عذره كالمستحاضة ومن بمعناها......الخ

بارہواں مسئلہ او مان صاحب عذر الخ یاایسا معذور نمازی جس کا عذر وضوء کے ساتھ ہی ظاہر ہوا اور جاری رہا یہانتک کہ مقدار تشہد کے بعد اس کا عذر ختم ہو گیا۔ف۔ یعنی اگر اس کا عذر بالکل ختم ہو گیا تو حسب سابق اس میں بھی ائمہ کرام کا اختلاف ہو گا، لیکن اس کے عذر کے ختم ہونے کا صحیح حال تو دوسری نماز کے وقت کے ختم ہونے کے بعد ہی معلوم ہو گا۔ کالمستحاضہ الخ جیسے استحاضہ والی عورت یا ایسا کوئی بھی شخص خواہ وہ عورت ہو یا مرد جس کی بیماری ایسی ہو کہ جو استحاضہ کے حکم میں ہو۔ف۔ مثلاً جس کا پیشاب ہر وقت گرتا رہتا ہو، یا پیٹ سے کچھ ناپاک مادہ نکلتا رہتا ہو، یا ایسا زخم جس سے پیپ یا خون ہر وقت رستا رہتا ہو، یا اس کی ہوا ہمیشہ نکلتی رہتی ہو، یا ہمیشہ ناک سے خون نکلتا ہو، ان تمام صورتوں میں اگر کسی کی ظہر کی نماز میں مقدار تشہد کے بعد وہ بیماری جو اسے ہمیشہ لگی رہتی تھی اچانک رک گئی ہو، تو اس کی نماز ختم ہونے کے بعد عصر کے وقت میں پورے وقت اس کی بات کا خیال رکھنا ہو گا کہ اس کے اندر عذر مذکور پھر سے پایا گیا یا نہیں اگر ایک مرتبہ بھی پورے وقت میں پالیا گیا ہو تو ظہر کے وقت میں اس عذر کے ختم ہونے کا کوئی اعتبار نہ ہو گا اور اسے عذر مسلسل سمجھا جائے گا لہٰذا اس کے ظہر کی نماز صحیح مانی جائے گی، اور اگر پورے وقت عصر میں وہ عذر نہیں پایا گیا تو وہ نماز ظہر جس کے آخر میں قدر تشہد کے بعد عذر ختم ہو گیا تھا اس کے صحیح اور باطل ہونے میں احناف کا وہی اختلاف رہے گا جو دوسرے مسائل میں تھا یعنی بطلت صلوته نماز باطل ہو گئی یعنی اس کی فرضیت اب باقی نہ رہی۔

ف۔ مذکورہ مسائل کے علاوہ اس جگہ اور بھی کئی مسائل ان کے جیسے ہی ذکر کئے جا رہے ہیں:

(۱) کوئی شخص پانی کی مجبوری سے ایسا کپڑا پہن کر نماز پڑھ رہا جس پر اتنی ناپاکی لگی ہوئی تھی جو عموماً معاف نہیں سمجھی جاتی بلکہ اسے دھونا ضروری ہوتا ہے، لیکن مقدار تشہد کے بعد وہ ناپاکی دور کرنے کے لائق پانی یا ایسی چیز پر وہ قادر ہو گیا جس سے اس ناپاکی کو دور کر سکے۔

(۲) کوئی شخص فجر کی نماز قضاء کر رہا تھا کہ مقدار تشہد قعدہ کے بعد زوال کا وقت ممنوع آگیا، اسی طرح صرف فجر ہی نماز نہیں بلکہ کسی بھی نماز کو قضاء کرتے ہوئے مکروہ اور ممنوع وقت آگیا، مثلاً عصر کے وقت میں کوئی ظہر کی قضاء نماز پڑھ رہا تھا کہ قعدہ کے بعد آفتاب غروب ہو گیا۔

(۳) ایک باندی کھلے سر نماز پڑھ رہی تھی کہ قعدہ کے بعد فوراً اس کے مالک نے اسے آزاد کر دیا تو اگر باندی نے اس وقت اپنا سر نہیں چھپایا اور ننگے سر نماز پڑھتی رہی تو امام اعظمؒ کے نزدیک ان تمام صورتوں میں نماز فاسد ہو جائے گی لیکن صاحبینؒ کے نزدیک نماز پوری ہو جائے گی، جیسا کہ امام اسبیجابیؒ نے ذکر کیا ہے۔ع۔ التبیین۔

ان مسائل میں مقدار تشہد کے بعد یا سجدہ سہو میں اس قسم کی کوئی بات پیدا ہو جائے اور نمازی تنہا ہو تو صرف اس کی اور اگر امام ہو تو اس کے ساتھ مقتدیوں کی نماز بھی باطل ہو جائے گی، اور نمازی نے سجدہ سہو ذمہ میں رہتے ہوئے سلام پھیر دیا اور کوئی عارض پیدا ہو گیا تو اگر سہو کا سجدہ اس نے ادا کر لیا تو نماز باطل ہو جائے گی ورنہ نہیں، اور اگر امام سے پہلے ہی مقتدیوں نے سلام پھیر دئے اس کے بعد امام کو کوئی عارض پیش آیا تو صرف امام ہی کی نماز فاسد ہو گی اور مقتدیوں کی نماز فاسد نہ ہو گی، جیسا کہ مقتدیوں نے امام کے سجدہ سہو کے ساتھ سجدہ ادا نہیں کیا، اور امام کو کوئی عارض پیش آگیا تو صرف امام ہی کی نماز باطل ہو گی۔ التبیین۔

اور اگر نمازی کو سلام کے بعد یاد آیا کہ اس پر سجدہ تلاوت ادا کرنا یا تشہد پڑھنا باقی رہ گیا ہے، تو اس کی بابت ذخیرہ میں لکھا کہ کتاب میں مذکور نہیں ہے، لیکن قاعدہ سے انہیں مسائل میں سے ہونا چاہئے، اور اگر سلام پھیر دینے کے فوراً بعد ہی اسے یہ بات یاد آگئی کہ نماز کا ایک سجدہ (سجدہ صلاتیہ) باقی رہ گیا ہے، پھر نماز قضاء کرتے وقت سجدہ کے اندر سورہ یاد آگئی تو بالاتفاق اس کی نماز

فاسد ہو گی کیونکہ اس پر نماز کا ایک رکن باقی ہی تھا کہ اسے سورہ یاد آ گئی۔ع۔ الحاصل متن کے حکم کے مطابق ان مذکورہ مسائل میں نماز باطل ہو جانے کی وجہ سے اب بناء کرنا صحیح نہ ہو گا۔

بطلت الصلوة فی قول ابی حنیفة، وقالا: تمت صلوته......الخ

امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق۔ف۔ یعنی فرض نماز نہیں رہی وقالا تمت الخ اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ نمازی کی نماز پوری ہو گئی۔ف۔ کیونکہ مذکورہ سارے عوارض قعدہ اخیرہ کے بعد واقع ہوئے ہیں، اور فتح القدیر میں ہے کہ صاحبینؒ کے قول کو ترجیح ہے، اور شرنبلالیہ میں اس قول کو اظہر کہا ہے۔ اور میں مترجم کہتا ہوں کہ متن کی کتابوں میں مسائل کے مذکورہ ہونے کا مطلب ان روایتوں کو صحیح قرار دیتا ہے، یعنی مذکورہ مسائل میں امام اعظمؒ کی روایتوں میں یہی صحیح ہے کہ نماز فاسد ہو گئی ہے، اس بناء پر فتح القدیرؒ نے جو ترجیح کہا ہے اس کا مطلب یہ ہو گا کہ دلیل کے اعتبار سے صاحبینؒ کے قول کو ترجیح ہے، لیکن اس بندہ مترجم کو تو اس بات میں ابتک تردد ہے کہ دلیل کے اعتبار سے ترجیح کس طرح دی جائے گی، کیونکہ امام اعظمؒ کی دلیل ان مسائل میں ابھی تک واضح اور محقق نہیں ہو سکتی ہے یعنی یہ بات ظاہر نہ ہو سکی کہ امام صاحب کی دلیل کیا ہے اسی بناء پر مصنفؒ نے لکھا ہے۔

وقیل: الاصل فیه ان الخروج عن الصلوة بصنع المصلی فرض عند ابی حنیفة، و لیس بفرض عندهما، فاعتراض هذه العوارض عنده فی هذه الحاجة کاعتراضها فی خلال الصلوة، وعندهما کاعتراضها بعد التسلیم، لهما ما روینا من حدیث ابن مسعودؓ، وله انه لایمکنه أداء صلوة اخری الا بالخروج من هذه، وما لایتوصل الی الفرض الا به یکون فرضا، و معنی قوله تمت قاربت التمام، والاستخلاف لیس بمفسد حتی یجوز فی حق القاری، وانما الفساد ضرورة حکم شرعی ،وهو عدم صلاحیة الامامة.

ترجمہ:- اور کہا گیا ہے کہ مذکورہ مسائل میں اصل یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نمازی کا اپنے اختیار سے نماز سے فارغ ہونا فرض ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک فرض نہیں ہے، لہٰذا مقدار تشہد کے بعد بھی نماز کی حالت میں مذکورہ عوارض کا پیش آنے کا وہی حکم ہو گا جو اس سے پہلے نماز کے درمیان میں پیش آنے کا ہوتا ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک ایسا بے اعتبار ہو گا جیسا کہ سلام پھیر دینے کے بعد ہوتا ہے، کیونکہ صاحبینؒ کی دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وہ روایت ہے جو اس سے پہلے ہی ہم بیان کر چکے ہیں، اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ مقدار تشہد کے بعد بھی نمازی کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ موجودہ نماز کے ختم ہوئے بغیر کوئی دوسری فرض پڑھ سکے، اور ہر وہ چیز جس کے بغیر کوئی فرض ادا نہیں کیا جا سکتا ہو وہ چیز بھی فرض ہو جاتی ہے، اور حدیث میں جو لفظ تمت ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تم اب نماز ختم ہونے کے قریب پہونچ چکے ہو، اور اس وقت کسی کو خلیفہ بنانا نماز کے لئے مفسد نہیں ہوتا ہے، اسی لئے تو قاری کے لئے بوقت ضرورت دوسرے کو خلیفہ بنا دینا جائز ہوتا ہے، اور نماز کے فاسد ہونے کا حکم تو صرف اس وجہ سے ہوتا ہے کہ شریعت کا حکم ایسا ہی ہے یا شریعت کے حکم کا یہی تقاضا ہے کیونکہ اس وقت امام کے اندر صلاحیت کا نہ ہونا ہے۔

توضیح:- مذکورہ متعدد مسائل میں ائمہ کے اختلاف کی صورت میں امام اعظمؒ کی قیاسی دلیل

وقیل: الاصل فیه ان الخروج عن الصلوة بصنع المصلی فرض عند ابی حنیفة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے فاعتراض هذه العوارض الخ لہٰذا امام اعظمؒ کے نزدیک مذکورہ مسائل میں سے ہر ہر مسئلہ میں مقدار تشہد کے بعد بھی جو عارضے آتے رہے ان کا وہی حکم ہو گا جو ان عوارض کے مقدار تشہد سے پہلے نماز کے درمیان کسی بھی وقت پیش آنے سے ہوتا ہے۔ف۔ یعنی مقدار تشہد بیٹھ جانے کے باوجود نمازی ابھی تک اپنی نماز سے فارغ نہیں ہوتا ہے، اس

وجہ سے اس حالت میں جتنے بھی عارضے ہوتے رہے سب کے متعلق یہی کہا جائے گا کہ نماز کے درمیان پیش آئے بالآخر فاسد ہوگئی وعندھما لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مقدار تشہد کے بعد عوارض کا پیش آنا ایسا ہے جیسے سلام پھیرنے اور نماز سے بالکل فارغ ہونے کے بعد عوارض کا ہونا ہے۔ف۔ لہذا مقدار تشہد کے بعد کے عوارض نماز کے لئے مفسد نہیں ہوتے ہیں، یہ اصل مذکور ابو سعید بروعی نے بیان کی ہے، اور عامہ مشائخ بھی اسی کے قائل ہیں۔ع۔

لھما ما روینا من حدیث ابن مسعودؓ......الخ

یعنی صاحبینؒ کی دلیل حضرت ابن مسعودؓ کی وہ حدیث ہے جو ہم نے پہلے روایت کردی ہے۔ف۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان **اذا قلت ھذا او فعلت ھذا فقد تمت صلاتک**، کہ جب تم نے یہ کہا یہ کیا تو تمہاری نماز پوری ہوگئی، اس کے بعد یہ فرمایا **او فعلت ان تقوم فقم** کہ اگر اٹھنے کو تمہارا جی چاہے تو کھڑے ہو جاؤ، آخر حدیث تک، جیسا کہ تشہد وغیرہ کی بحث میں بالتفصیل ذکر کی جاچکی ہے، اس روایت سے اس طرح استدلال کیا جاتا ہے کہ مذکورہ مسائل میں قعدہ اخیرہ کے بعد ان عارضوں کا ذکر ہے اور جبکہ نماز قعدہ اخیرہ پر ہی تمام ہو جاتی ہے تو اس کے تمام ہو جانے کے بعد اس نماز کو باطل نہیں کہا جا سکتا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ **تحریمھا التکبیر و تحلیلھا التسلیم** بھی حدیث ہے، اس سے پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ تکبیر تحریمہ نماز کے اندر کا حصہ نہیں ہے، اسی طرح تحلیل تسلیم بھی نماز میں داخل نہیں ہے، اس لئے **فقد تمت صلوتک** کی مراد یہ ہوگی کہ نماز کی تحریم و تحلیل کے درمیان جتنے کام ہیں وہ سب پورے ہو چکے ہیں، جس کی دلیل خود یہ جملہ **تحریمھا التکبیر** ہے کہ اس کے لفظ تحریمہا میں تحریم مضاف اور ہا مضاف الیہ جو الصلوۃ کی طرف عائد ہے، ترکیب اضافی میں اصل یہ ہے کہ مضاف اپنے مضاف الیہ سے بالکل علیحدہ اور غیر ہے، اس بناء پر نماز سے تحریم اور تحلیل دونوں خارج رہی، جس کا حاصل یہ ہوا کہ مقدار تشہد بیٹھ جانے کے بعد نماز تو پوری ہوگئی اگرچہ ابھی تک اس سے تحلیل یعنی نماز سے ایسی علیحدہ نہیں ہوئی جس کے بعد ساری چیزیں چلنا پھرنا، باتیں کرنا وغیرہ حلال ہو جائیں، فافہم۔

وله انه لایمکنه اداء صلوۃ اخری الا بالخروج من ھذہ......الخ

اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ مصلی کو اس نماز کے بعد دوسری نماز پڑھنا اس وقت تک ممکن نہیں ہوتا ہے یہاں تک کہ یہ نمازی اپنی نماز سے مکمل فارغ اور نماز کے احرام سے خارج ہو جائے۔ف۔ جیسا کہ حج کے احرام سے نکل جانے سے دوسرے منع شدہ کاموں کا کرنا حلال ہو جاتا ہے، پھر دوسرے فرض کا تعلق ہے۔م۔

وما لایتوصل الی الفرض الا به یکون فرضا......الخ

اور جو چیز ایسی ہو کہ اس کے بغیر دوسرے فرض تک نہ پہونچا جائے وہ بھی فرض ہوتی ہے۔ف۔ الحاصل موجودہ نماز سے نکلنا فرض ہوا، اس کی مثال اس طرح دی جا سکتی ہے کہ زید پر اپنی بیوی اور بچوں کا نفقہ فرض جسے وہ بغیر کمائے ادا نہیں کر سکتا ہے اس لئے اس پر کمانا، اور حاصل کرنا فرض ہوگا تجارت۔ سے ہو یا ملازمت سے یا جہاد سے جس طرح بھی جائز طریقہ سے ممکن ہو، اور جیسے نماز میں قیام، رکوع اور سجود سب فرض ہیں مگر جب تک کہ رکوع سے فارغ ہو کر کھڑا نہ ہو جائے سجدہ ادا نہیں کر سکتا ہے اس لئے نماز میں ایک رکوع سے دوسرے رکوع کی طرف منتقل ہونا بھی فرض ہے، تو منتقل ہونے کا عمل اگرچہ فی نفسہ فرض نہیں ہے مگر فرضیت کی وجہ سے ارکان میں سے ایک رکن ہوگا، عینیؒ نے کہا ہے کہ یہ نکتہ شیخ ابو المنصور الماتریدیؒ سے منقول ہے۔

اگر کوئی یہ وہم کرے کہ اگر ایک مرد اور ایک عورت قعدہ اخیرہ میں مقدار تشہد کے بعد محاذی ہو جائیں تو بالاتفاق ان کی نماز مکمل ہو جاتی ہے، حالانکہ مرد نمازی کی طرف سے نماز سے فارغ ہونے کا کوئی عمل نہیں پایا گیا ہے، جواب یہ ہوگا کہ محاذات کا عمل صرف ایک شخص سے نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ تو دونوں طرف سے ہوتی ہے، اور عورت کی طرف سے بلاشبہ ابتدائی عمل پایا گیا ہے، پھر جب وہ مرد کے دائیں یا بائیں طرف سے اس کی محاذی ہوئی اور اس طرح مرد بھی اس کی محاذی ہو گیا تو وہ عمل فراغ پایا گیا،

نیز حدیث میں جو لفظ تمت آیا ہے اس کے معنی قاربت التمام کے ہیں یعنی تمام ہونے کے قریب ہو گئی۔ف۔ جیسے کہ حج میں وقوف عرفہ کے متعلق فرمایا گیا ہے من وقف بعرفة فقد تم حجه کہ جس نے عرفہ کا وقوف کر لیا تو اس کا حج تمام ہو گیا حالانکہ بالاتفاق عرفہ کے بعد بھی صبح کے طواف زیارت کا فرض باقی رہتا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ ـــــــ قعدہ میں مقدار تشہد ہو جانے کے بعد بھی ایک فرض باقی رہ جاتا ہے، اور وہ فرض تحلیل ہے (اپنے کسی بھی عمل سے قصداً نماز کی کیفیت سے فارغ ہو جانا ہے) اور اس تحلیل میں لفظ سلام سے فارغ ہونا واجب ہے اور اسی تحلیل کو ابو سعید بروعیؒ نے دوسرے لفظ سے یعنی خروج بصنع المصلی کہا ہے، عینیؒ نے لکھا ہے کہ اکثر مشائخ تو ابو سعید بروعیؒ کے ہم خیال ہیں یعنی نمازی پر ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ اپنے عمل وفعل سے اپنی نماز سے فارغ ہو، لیکن مصنفؒ کے نزدیک امام کرخیؒ کا یہ قول مختار ہے کہ خروج بفعل المصلی ہمارے ائمہ سے کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں ہے، اور مذکورہ تمام صورتوں میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز کے باطل ہونے کی وجہ سے صرف یہی ایک بات ہے کہ یہ چیزیں نماز کو متغیر کر دیتی ہیں۔ع۔ امام کرخیؒ نے کہا ہے کہ تینوں ائمہ کا اس مسئلہ میں کچھ بھی اختلاف نہیں ہے کہ نمازی کا اپنے عمل سے نماز سے فارغ ہونا فرض بالکل نہیں ہے، اور نہ وہ قول امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے، بلکہ شیخ بروعی نے از خود اسے بیان کیا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے ان مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کا اختلاف پایا، حالانکہ ان کا اس طرح قاعدہ کا استخراج غلط ہے، کیونکہ اگر خروج بصنعہ فرض ہی ہوتا تو ایسے فعل کے ساتھ اس خروج کو مخصوص کرنا چاہیے تھا جو عبادت ہو یا قربت ہوتا ہے۔

اب یہ سوال ہے کہ آخر مذکورہ مسائل میں امام اعظمؒ کے نزدیک نماز کیونکہ باطل ہو جاتی ہے، جواب یہ ہے کہ اس پر سلام کرنا واجب تھا اور وہ نماز کا آخری عمل بھی ہے اس سے قبل وہ چیزیں صادر ہوئیں اس طرح درمیان نماز میں واقع ہو گئیں اس لئے نماز باطل ہو گئی، یہی وجہ ہے کہ اگر دو رکعت کے قعدہ اخیرہ کے بعد مسافر اقامت کی نیت کر لے تو اس کا فرض بدل جاتا ہے یعنی قصر کی سہولت ختم ہو کر پوری پڑھنی ہوتی ہے۔ الفتح۔

حاصل یہ ہوا کہ ابو سعید بروعیؒ اور دوسرے عام مشائخ کے نزدیک امام ابو حنیفہؒ کے قول میں خروج بصنعہ فرض ہے اور امام کرخیؒ اور ان کے علاوہ کچھ اور علماء کے نزدیک فرض ہے، اسی قول کو مصنفؒ نے اختیار کیا ہے، شرح الکنز زیلعی اور عینی، اور اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔

مختصر بحث یہ ہوئی کہ امام اعظمؒ کے نزدیک نماز کے فاسد ہو ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ افعال سب کے سب نماز کے دوران واقع ہوئے اور ایسی حالت میں نماز فاسد ہو جاتی ہے اس لئے نماز باطل ہوئی ہے، اگر یہ سوال کیا جائے کہ مذکورہ مسائل میں سے اس مسئلہ میں کہ قاری امام نے مقدار تشہد کے بعد کسی امی کو اپنا خلیفہ بنایا ہو اور یہ عمل چونکہ عمل کثیر ہے اس لئے امام کی نماز ناقص ادا ہو جانی چاہئے، اور باطل نہیں ہونی چاہئے، اس کا جواب خود مصنفؒ نے اس طرح دیا ہے۔

والاستخلاف ليس بمفسد حتى يجوز في حق القاري، وانما الفساد ضرورة حكم شرعي......الخ

اور خلیفہ بنانا ایسا فعل نہیں ہے جو نماز کو فاسد کر دے، اسی بناء پر قاری کے بارے میں نماز کے جائز ہونے کا حکم ہوتا ہے۔

ف۔ اس جواب پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس کے باوجود اس مسئلہ میں نماز باطل ہونے کا حکم کیوں دیا گیا ہے۔ د۔ جواب یہ ہے کہ نماز کے فاسد ہونے کا حکم تو ایک شرعی تقاضے کے مطابق ہے۔ ف کیونکہ اگر خلیفہ بنانے سے ہی نماز کے فاسد ہونے کا حکم ہوتا تو امی کی بجائے قاری کو کو خلیفہ بنانا مفسد نہ ہوا تو امی کو بھی خلیفہ بنانا مفسد نہیں ہونا چاہئے اس سے معلوم ہوا کہ فساد کا حکم کسی دوسری وجہ سے دیا جاتا ہے، اسی کو ضرورت حکم شرعی کہا گیا ہے۔

وهو عدم صلاحية الامامة......الخ

اور امر شرعی یہ ہے کہ امی امام میں اس وقت امامت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ف۔ تو گویا نماز کے بعض حصہ میں حکم شرعی کے مطابق امام قاری رہا، اور آخری حصہ میں امام مخالف شرع ہوا جو مفسد ہے، اسی لئے مجبوراً نماز کے فاسد ہونے کا حکم

ہو گا، جبکہ درمیان نماز غیر صالح امام ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک گویا ختم نماز کے بعد غیر صالح امام آیا ہے۔ مع۔ پھر اس مسئلہ میں امام تمر تاشی وہندوانی اور کاشانیؒ نے کہا ہے کہ قاری اگر امی کو خلیفہ بنائے تو بالاتفاق نماز جائز ہو گی کیونکہ بلا ضرورت خلیفہ مقرر کرنا عملی کثیر ہوتا ہے، جیسا کہ عینی میں ہے، اور یہ بحث پہلے بھی گذر چکی ہے۔

میں مترجم نے اس سے پہلے یہ بتلا دیا ہے کہ مذکورہ تمام مسائل میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تمام فرائض کی فرضیت باطل ہو گئی ہے، اس کے بعد اب سوال ہوتا ہے کہ وہ نمازیں کیا نفل ہو جائیں گی یا مطلقاً باطل ہو جائیں گی، تو جواب یہ ہے کہ صرف تین مسائل کے علاوہ وہ تمام باطل ہو جائیں گی اور ان تین میں نفل ہو جائیں گی وہ یہ ہیں:

(۱) پہلے کی کوئی قضاء نماز کا باقی رہنا نماز کی حالت میں یاد آگیا ہو (۲) فجر کی نماز پڑھتے ہوئے آفتاب نکل آیا ہو (۳) جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے عصر کا وقت داخل ہو گیا ہو۔ الجوہرہ۔ ت۔ (۴) جبکہ اشارہ سے نماز پڑھنے والا انسان رکوع و سجود پر قادر ہو گیا ہو۔ الحاوی۔ اور ظاہر یہ ہے کہ عید کی نماز پڑھتے ہوئے اگر زوال کا وقت آگیا ہو، اسی طرح قضاء نماز پڑھتے ہوئے اگر اوقات مکروہ میں سے کوئی بھی وقت داخل ہو گیا ہو تو بظاہر ان نمازوں کو بھی نفل سے بدل جانا چاہئے، مگر میں نے یہ جزئیہ کہیں نہیں دیکھا ہے۔ الدر۔ مگر یہ مسئلہ ظاہر ہے کسی جگہ دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ع۔

ومن اقتدى بالامام بعد ما صلى ركعة فاحدث الامام، فقدمه اجزاه لوجود المشاركة فى التحريمة، والاولى للامام ان يقدم مدركا، لانه اقدر على اتمام صلاته، وينبغى لهٰذا المسبوق ان لا يتقدم لعجزه عن التسليم، فلو تقدم يبتدىء من حيث انتهى اليه الامام بقيامه مقامه، واذا انتهى الى السلام يقدم مدركا يسلم بهم، فلو انه حين اتم صلوة الامام قهقه او احدث متعمدا، او تكلم او خرج من المسجد، فسدت صلوته وصلوة القوم تامة، لان المفسد فى حقه وجد فى خلال الصلوة، و فى حقهم بعد تمام اركانها، والامام الاول ان كان فرغ لاتفسد صلاته، وان لم يفرغ تفسد، وهو الاصح، فان لم يحدث الامام الاول، وقعد قدر التشهد، ثم قهقه او احدث متعمدا، فسدت صلوة الذى لم يدرك اول صلاته عند ابى حنيفةؒ، وقالا لاتفسد.

ترجمہ:- اور اگر کسی نے امام کی اس وقت اقتداء کی جبکہ اس نے ایک رکعت پڑھ لی ہے، اور اس وقت امام کو حدث ہو گیا اس لئے امام نے اسی مقتدی کو آگے بڑھا دیا یعنی اپنا خلیفہ بنا دیا تو اس کے لئے جائز ہو جائے گا، کیونکہ تحریمہ میں ان دونوں کی شرکت پائی گئی ہے، لیکن امام کے لئے یہ زیادہ مناسب تھا کہ کسی مدرک کو خلیفہ بناتا، کیونکہ وہ مبسوق کی بہ نسبت امام کی بقیہ نماز کو مکمل کرنے پر زیادہ قادر ہوتا ہے، اور خود اس مسبوق کے لئے بھی یہی مناسب ہے کہ خود آگے نہ بڑھے کیونکہ یہ آخر میں سلام پھیرنے سے عاجز ہو گا، اور اگر یہ مسبوق آگے بڑھ گیا تو اس جگہ سے نماز شروع کرے جہاں تک امام کی نماز ہو چکی ہے؛ کیونکہ اس کے قائم مقام ہے، اور جب سلام پھیرنے کے قریب پہونچ جائے تو کسی مدرک کو آگے بڑھا دے اور وہ تمام لوگوں کے ساتھ سلام پھیر دے، اور اگر مسبوق اس وقت جبکہ امام کی بقیہ نماز پوری کر چکا ہے زور سے ہنس پڑھے یا قصداً حدث کر دے یا کسی سے بات کرلے یا مسجد سے نکل آئے تو خود اس کی فاسد ہو جائے گی لیکن ساری قوم کی نماز پوری ہو جائے گی، کیونکہ جو چیزیں اس کی نماز کے لئے مفسد ہو رہی ہیں وہ اس کی نماز کے درمیان پائی گئی ہیں وہ بقیہ نمازیوں کی نماز کے ارکان کے پورے ہونے کے بعد پائی جارہی ہیں، اور اگر پہلا امام بھی اس وقت مقتدیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہو چکا ہو تو اس کی نماز فاسد نہ ہو گی، اور اگر اب تک فارغ نہ ہوا ہو تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور یہی قول اصح ہے، اور اگر پہلے امام کو حدث نہیں ہوا اور مقدار تشہد بیٹھ کر زور سے ہنس پڑا یا قصداً حدث کر لیا تو ایسا مقتدی جو شروع نماز میں امام کے ساتھ شریک نہ ہوا ہو تو اس کی نماز امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق فاسد ہو جائے گی، لیکن صاحبینؒ نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہو گی۔

توضیح:-امام کو حدث ہو جانے پر اس نے مسبوق کو اپنا خلیفہ بنایا، مسبوق خلیفہ نے اگر زور سے ہنس دیا یا قصداً حدث کیا، امام کا قصداً ہنسنا یا حدث کرنا مقدار تشہد کے بعد، اور مسبوق کی نماز

ومن اقتدی بالامام بعد ما صلی رکعة فاحدث الامام، فقدمه اجزاه لوجود......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، فقدمه الخ پھر امام نے اسی مسبوق کو اپنا خلیفہ بنادیا تو صحیح ہو گیا۔ف۔ مسبوق کو خلیفہ بنانا اسی صورت میں صحیح ہوگا جبکہ وہ امامت کی صلاحیت رکھتا ہو اگرچہ کچھ رکعت چھوٹنے سے وہ مسبوق ہو گیا ہے لوجود المشارکة الخ کیونکہ دونوں اماموں کے درمیان تحریمہ میں شرکت پائی جاتی ہے۔ف۔ جبکہ خلیفہ ہونے کے لئے یہی ضروری ہے کہ امام اور اس کے خلیفہ کے درمیان تحریمہ میں مشارکت پائی جائے خواہ کسی قسم کی ہو یعنی کامل ہو کہ تحریمہ اور اداء دونوں میں شرکت ہو یا ناقص ہو کہ فقط تحریمہ میں شرکت ہو، جیسا کہ مسبوق میں صرف تحریمہ میں شرکت ہو رہی ہے والاولی الخ امام کے لئے بہتر تو یہی تھا کہ کسی ایسے شخص کو خلیفہ بنائے جو ابتداء سے اس کے ساتھ شریک ہو لانه اقدر الخ کیونکہ مدرک کو امام کی نماز بالکل آخر تک پڑھانے کی پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ف۔ برخلاف مسبوق کے۔

وینبغی لهٰذا المسبوق ان لا یتقدم لعجزه عن التسلیم......الخ

اور مسبوق کے لئے مناسب یہی تھا کہ خلافت قبول کرنے کے لئے آگے نہ بڑھے، اور قبول نہ کرے، کیونکہ آخر وقت میں سلام پھیرنے سے عاجز ہوگا۔ف۔ اس لئے کہ اگر آگے بڑھ ہی گیا تو سلام کے وقت کسی مدرک کو آگے بڑھادے گا تاکہ وہ ان تمام نمازیوں کے ساتھ سلام پھیر دے جو ابتداء سے شریک ہوں، اور مدرک کو خلیفہ بنا کر اپنی چھوٹی ہوئی نماز پوری کرے گا، لیکن اسے ایسا کرنا خلاف اولیٰ ہو کر بھی قبول کرنا جائز ہے، جیسا کہ خود امام اول کے لئے یہ جائز ہوا کہ اس مسبوق کو اپنا خلیفہ بنادے، اسی طرح اگر امام کسی لاحق کو یا خود مسافر ہونے کی صورت میں کسی مقیم کو امام بنادے تو جائز مگر خلاف اولیٰ ہوگا۔ف۔ع۔

فلو تقدم یبتدیء من حیث انتهی الیه الامام بقیامه مقامه......الخ

اگر مسبوق امام بنائے جانے کی صورت میں اسے قبول کرتے ہوئے آگے بڑھ جائے تو امام جہانتک نماز پڑھا چکا ہے اس کے بعد سے ابتداء کرے لقیام مقامه کیونکہ یہ مسبوق امام کا قائم مقام ہے۔ف۔ اور اس عذر میں مسبوق کے حق میں خلاف ترتیب ہونا مضر نہیں ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک ترتیب شرط نہیں ہے، اسی وجہ سے مسبوق امام کے سلام کے بعد چھوٹی ہوئی رکعتیں ادا کرتا ہے، جیسا کہ بالتصریح امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے۔مع۔ البتہ اگر مسبوق کو امام کے متعلق یہ علم نہ ہو کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں اور نماز کے درمیان کوئی خاص بات ہوئی ہے یا نہیں اور امام نے خود بھی نہیں بتلایا ہو تو ایسی صورت میں اسے چاہئے کہ احتیاطاً ہر رکعت پر قعدہ کرتا جائے، اور اگر یہ مسبوق دو رکعتوں کے بعد نماز میں شریک ہوا ہو تو اس پر دو قعدے لازم ہوں گے، اور اگر امام نے کسی طرح اسے یہ بتلایا ہو کہ میں نے پہلی دو رکعتوں میں قرأت نہیں کی ہے تو مسبوق کو چاہئے کہ آخری دو رکعتوں میں قرأت کرے، پھر اس پر اپنی بقیہ دو رکعتوں میں بھی قرأت فرض ہے، جیسا کہ اس سے پہلے وجیز وغیرہ کے حوالہ سے گذر چکا ہے۔م۔

واذا انتهی الی السلام یقدم مدرکا یسلم بهم......الخ

جب یہ مسبوق نماز پوری کر کے سلام تک پہونچے تو کسی مدرک کو آگے بڑھادے تاکہ وہ قوم کے ساتھ سلام پھیر دے۔ف۔ لیکن مسبوق خود سلام نہیں پھیر سکتا ہے کیونکہ ابھی تک اس کے ذمہ اس کے چھوٹی ہوئی نماز باقی ہے، فلو انه الخ...... پھر اگر خلیفہ مسبوق نے اپنے امام کی نماز پوری کر لینے کے بعد قہقہہ مار دیا یا قصداً حدث کر دیا یا باتیں کر لیں یا مسجد سے نکل گیا تو صرف اس کی اپنی نماز فاسد ہو جائے گی۔ف۔ ساتھ ہی اس شخص کی بھی نماز فاسد ہو جائے گی جو اس مسبوق کے حکم میں

ہو۔ت۔ جیسے کہ اور بھی دوسرا کوئی مقتدی مسبوق ہو یا امام اول نے جو محدث ہو چکا ہے ابھی تک اپنی نماز پوری نہ کی ہو۔م۔

فسدت صلوته وصلوة القوم تامة، لان المفسد فی حقه وجد فی خلال الصلوة......الخ

اور مقتدیوں کی نماز پوری ہو گئی۔ف۔ یعنی وہ تمام مقتدی جو جماعت میں شروع سے آخر تک شریک رہے ہوں، یا اگر درمیان میں کچھ چھوٹ گئی ہو تو سلام کے وقت تک اپنی نماز پوری کرلی ہو۔م۔ بر خلاف ان مقتدیوں کے جن کا حال مسبوق کے جیسا ہو **لان المفسد الخ** کیونکہ نماز کو فاسد کرنے والی وہ تمام باتیں جو بیان کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک اس مسبوق کے حق میں اس نماز کے بیچ میں ختم سے پہلے ہی پائی گئی ہیں۔ف۔ لہٰذا اس کی نماز فاسد ہو گئی۔

و فی حقهم بعد تمام ارکانها، والامام الاول ان کان فرغ لاتفسد صلاته......الخ

اور مدرک مقتدیوں کے حق میں نماز کے ارکان کے پورے ہو جانے کے بعد پائی گئی ہیں۔ف۔ اس لئے ان کی نماز پوری ہو گئیں، اور وہ پہلا امام جس نے حدث ہو جانے کی وجہ سے دوسرے کو اپنا خلیفہ بنایا تھا تو اس کا حکم یہ ہے **الامام الاول الخ** اس سے پہلے امام کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں (۱) اگر وہ چھوٹی ہوئی مقدار کو خلیفہ کے پیچھے پوری کر کے فارغ ہو گیا ہو تو اس کی بھی نماز فاسد نہ ہو گی۔ف۔ کیونکہ وہ بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنی پوری نماز اب تک پڑھ چکا ہے، اگر چہ درمیان میں اس کا کچھ حصہ پہلے چھوٹ گیا تھا (۲) دوسری صورت **ان لم یفرغ** اگر وہ ابھی تک اپنی چھوٹی ہوئی نماز کو پڑھ کر فارغ نہ ہوا ہو تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔ف۔ مسبوق کی طرح فاسد ہو گی، **وهو الاصح الخ** یہی قول اصح ہے۔ف۔ یہانتک کہ وہ صورت بیان کی گئی ہے جو خود پہلے امام سے پائی گئی ہو۔

فان لم یحدث الامام الاول، وقعد قدر التشهد، ثم قهقه......الخ

اور اگر پہلے امام کو حدث نہیں ہوا۔ف۔ بلکہ اس نے تمام رکعتیں پڑھادیں اور مقدار تشہد قعدہ اخیرہ میں بیٹھ گیا **ثم قهقهه الخ** پھر قہقہہ مار کر ہنسا یا قصداً حدث کر دیا۔ف۔ مگر نہ تو کسی سے بات کی اور نہ مسجد سے باہر گیا، تو ایسے تمام لوگوں کی نماز فاسد ہو جائے گی جو امام کے ساتھ شروع نماز سے شریک نہ ہو۔ف۔ کیونکہ جو شخص جماعت میں شروع سے شریک ہوا ہو یعنی مدرک ہو تو اس کی نماز بھی امام کی نماز کی طرح فاسد نہ ہو گی اور **الذی لم یدرك** کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مدرک کے علاوہ جتنے بھی نماز میں شریک ہیں اور وہ مسبوق ہوں گے یا لاحق ہوں گے ان کی نماز فاسد ہو جائے گی، حاصل یہ ہوا کہ مسبوق کی نماز تو بالاتفاق فاسد ہو گی، اسی طرح لاحق کے بارے بھی قول صحیح یہی ہے کہ فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ السرج میں ہے، اور یہی اصح قول ہے، جیسا کہ مصنفؒ نے اشارہ کیا ہے، اگر چہ ظہیریہ میں فاسد نہ ہونے کو ہی صحیح کہا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر لاحق نے امام کے قہقہہ سے پہلے ہی اپنی چھوٹی ہوئی نماز پوری کرلی ہو تو بلا خلاف فاسد نہیں ہونی چاہئے۔م۔

فسدت صلوة الذی لم یدرك اول صلاته عند ابی حنیفةؒ، وقالا لاتفسد......الخ

یہ حکم امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے صاحبینؒ نے کہا ہے کہ فاسد نہ ہو گی۔ف۔ اور اگر مسبوق عجلت کے ساتھ کھڑے ہو کر امام کے قہقہہ مارنے سے پہلے چھوٹی ہوئی رکعت رکوع وسجدہ وغیرہ کے فارغ ہو گیا اس کے بعد امام نے قہقہہ مارا تو اس کی نماز بھی فاسد نہ ہو گی، کیونکہ اس کے تنہا پڑھ لینے سے منفرد ہونے کی تاکید ہو گئی، جیسا کہ ظہیریہ وغیرہ میں ہے۔م۔ف۔ یہ اختلاف صرف قہقہہ اور عمداً حدث کرنے کے بارے میں ہے۔

وان تکلم اوخرج من المسجد لم تفسد فی قولهم جمیعا، لهما ان صلوة المقتدی بناء علی صلوة الامام جوازا و فسادا ولم تفسد صلوة الامام، فکذا صلوته وصار کالسلام والکلام وله ان القهقهة مفسدة للجزء الذی یلاقیه من صلوة الامام، فیفسد مثله من صلوة المقتدی غیران الامام لا یحتاج الی البناء، و المسبوق محتاج الیه والبناء علی الفاسد فاسد، بخلاف السلام، لانه مُنْهٍ والکلام فی معناه و ینتقص وضوء الامام لوجود القهقهة فی

حرمة الصلوة.

ترجمہ:-اور اگر امام نے بات کرلی یا وہ مسجد سے باہر نکل گیا تو ان تینوں ائمہ کے نزدیک بالاتفاق فاسد نہ ہوگی، صاحبینؒ کی دلیل ان دونوں صورتوں میں یہ ہوگی کہ مقتدی کی نماز کی بناء امام کی نماز پر ہوگی نماز کے جائز ہونے کی صورت میں بھی اور فاسد ہونے کی صورت میں بھی، اور اس صورت میں امام کی نماز فاسد نہیں ہوتی ہے اس لئے مقتدی کی بھی فاسد نہ ہوگی اور قہقہہ اور قصداً حدث کرنے کا حکم سلام اور کلام کرنے کا ہوگا، اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ قہقہہ اس جزو نماز کو فاسد کرتا ہے جو امام کی نماز سے ملا ہوتا ہے لہذا ویسا ہی جزو مقتدی کی نماز کا بھی فاسد ہوگا، البتہ اب امام کی نماز بناء کرنے کی محتاج نہیں رہی لیکن مسبوق اب بھی محتاج ہوتا ہے، اور فاسد جزو پر بناء کرنا فاسد ہوتا ہے، بخلاف سلام کرنے کے کیونکہ سلام تو نماز کو منہی یعنی تمام کرنے والا ہے، اسے فاسد کرنے والا نہیں ہے، اور کلام بھی سلام ہی کے معنی میں ہے وینتقض الخ اور بالاتفاق قہقہہ سے امام کا وضوء اسی لئے ٹوٹ جاتا ہے کہ قہقہہ حرمت نماز میں پایا گیا ہے۔

توضیح:-امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کی دلیل

وان تکلم اوخرج من المسجد لم تفسد فی قولهم جمیعا......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ بالاتفاق نماز فاسد نہ ہوگی اب اختلاف ائمہ صرف قہقہہ اور عمداً حدث کرنے میں رہ گیا ہے لهما الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ یعنی بالاتفاق یہ بات طے شدہ ہے کہ مقتدی کی نماز کی بنیاد امام کی نماز پر ہے کہ اگر امام کی نماز درست ہوگی تو مقتدی کی بھی درست ہوگی اور اگر امام کی نماز فاسد ہوگی تو مقتدی کی بھی فاسد ہوگی جیسا کہ اس حدیث میں ہے الامام ضامن، اس کی پوری بحث پہلے گذر بھی چکی ہے۔

ولم تفسد صلوة الامام، فکذا صلوته وصار کالسلام والکلام......الخ

یعنی بالاتفاق جب کسی بھی صورت میں امام کی نماز فاسد نہیں ہوئی تو اس طرح مقتدی کی نماز بھی فاسد نہیں ہوگی۔ف۔ یہانتک کہ قہقہہ اور حدث میں بھی وصار کالسلام الخ اور قہقہہ اور حدث جو قصداً کیا گیا ہو ان میں سے ہر ایک کا حکم سلام اور کرنے کا ہو جائے گا۔ف۔ یعنی جس میں بالاتفاق مقتدی کی نماز بھی فاسد نہیں ہوتی ہے، یہ بات مخفی نہیں ہونی چاہئے، البتہ اتنی بات ضروری ہے کہ امام کی نماز کے ارکان وغیرہ سب کے سب مکمل ہو چکے ہیں لیکن مسبوق کی نماز نامکمل رہی ہے۔

وله ان القهقهه مفسدة للجزء الذی یلاقیه من صلوة الامام، فیفسد مثله من صلاة المقتدی.... الخ

اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ قہقہہ نماز کے اسی حصہ اور جزو کو فاسد کرتا ہے جہاں پر امام نے قہقہہ مارا ہوا اور اس میں مقتدی بھی شریک ہو۔ف۔ یعنی امام کی نماز میں جس جزو سے قہقہہ متصل ہوا اسی جزو کو قہقہہ فاسد کرتا ہے فیفسد الخ تو اسی جزو سے مقتدی کی نماز بھی فاسد ہوگی۔ف۔ کیونکہ مقتدی کی نماز کی بنیاد امام کی نماز پر ہوا کرتی ہے، مشہور قاعدہ کے مطابق، اب جبکہ نماز کا ایک جزو بھی فاسد ہو گیا تو آئندہ کے تمام اجزاء کی بنیاد اسی فاسد حصہ پر نہیں رکھ سکتے، غیر ان الخ اب فرق یہ رہ جاتا ہے کہ امام کو مزید بناء کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ہے۔ف۔ کیونکہ اس کے سارے ارکان پورے ہو چکے ہیں، اور وقت بھی بالکل آخر ہے، اسی طرح اس کے تمام مقتدیوں کی بھی نماز پوری ہو چکی ہے جو شروع سے اس کے ساتھ ہیں۔

و المسبوق محتاج الیه والبناء علی الفاسد فاسد......الخ

لیکن مسبوق ابھی تک بناء کرنے کا محتاج ہے۔ف۔ کیونکہ ابتداء کی کچھ نماز اس کے ذمہ باقی ہے، اسی طرح اس لاحق کی بھی نماز کا کچھ باقی ہے جس نے ابھی تک اپنی چھوٹی ہوئی نماز ادا نہ کی ہو وہ بھی بناء کا محتاج ہے، اس سے پہلے یہ بات بتادی گئی ہے کہ جس جزو پر اپنی بقیہ نماز کو پورا کرنا ہے وہ جز امام کے قہقہہ کی وجہ سے فاسد ہو چکا اور فاسد جزو پر بناء کرنا بھی فاسد ہوتا ہے۔ف۔

الحاصل بناء ممکن نہ ہونے کی وجہ سے نماز ناتمام اور فاسد ہو گئی، اگر اس موقع پر یہ سوال کیا جائے کہ قہقہہ سے فاسد ہونے کی صورت میں جو دلیل دی گئی ہے وہی دلیل تو کلام کرنے کی صورت میں بھی دی جاسکتی ہے پھر بھی اس میں بناء کرنے کو جائز کیوں کہا گیا ہے اس کا جواب مصنفؒ نے خود دیا ہے کہ بخلاف السلام الخ برخلاف سلام کے کیونکہ سلام تو نماز کو آخر تک پہونچانے دینے والا ہوتا ہے، کہ اسی سے نماز ختم کی جاتی ہے، اسی طرح کلام بھی سلام ہی کے حکم میں ہے۔ف۔ اس بناء پر کلام بھی نماز کو تمام کرنے والا ہے اور فاسد کرنے والا نہیں ہے۔ف۔ تو جس طرح مسبوق امام کے سلام کے بعد بناء کر سکتا ہے اسی طرح اس کے کلام کر لینے کے بعد بھی بناء کر سکتا ہے، بخلاف اس کے جبکہ امام نے قہقہہ مار دیا ہو تو مدرک حضرات بغیر سلام کے ہی اٹھ جائیں، (کہ ان کی نماز ختم ہو گئی) الفتح۔

و ینتقض وضوء الامام لوجود القهقهة فی حرمة الصلوة......الخ

قہقہہ سے امام کا وضوء بالاتفاق ٹوٹ جائے گا۔ع۔ کیونکہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے ہی درمیان نماز کے قہقہہ پایا گیا ہے۔ف۔ نماز کے احرام سے فارغ ہونے سے پہلے ہی قہقہہ پایا گیا ہے، اور ہم نے نص میں قہقہہ کو ناقض وضوء اور ناقض نماز پایا ہے۔م۔

ومن احدث فی رکوعه او سجوده توضأ وبنی ولایعتد بالتی احدث فیها، لان اتمام الرکن بالانتقال ومع الحدث لایتحقق، فلابد من الاعادة، ولوکان اماما فقدم غیره دام المقدم علی الرکوع، لانه یمکنه الاتمام بالاستدامة، ولو تذکر وهو راکع اوساجد ان علیه سجدة، فانحط من رکوعه لها، او رفع رأسه من سجوده، فسجدها یعید الرکوع والسجود، وهذا بیان الاولی لتقع الافعال مرتبة بالقدر الممکن، وان لم یعد اجزأه، لان الترتیب فی افعال الصلوة لیس بشرط، ولان الانتقال مع الطهارة شرط، وقد وجد، وعن ابی یوسفؒ انه یلزمه اعادة الرکوع، لان القومة فرض عنده.

ترجمہ:-اور جس شخص کو اس کے رکوع یا سجدہ میں حدث ہو گیا تو وہ وضوء کر کے اپنی نماز پر بناء کرے، اور جس رکن میں حدث ہو جائے وہ شمار نہ کیا جائے، کیونکہ رکن کا مکمل ہونا اس رکن کے بعد دوسرے رکن کی طرف منتقل ہو جانے سے ہوتا ہے، اور یہ بات حدث ہو جانے سے متحقق نہیں ہوتی ہے، اس لئے ایسے رکن کو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، اور اگر نمازی امام ہو اور اس نے دوسرے کو اسی حالت میں آگے بڑھایا تو اسے رکوع کی حالت ہی میں قائم سمجھا جائے گا، کیونکہ اس کے لئے رکوع کو اسی حالت میں گھوم کر آخر تک باقی رکھنا ممکن ہوتا ہے، اور اگر رکوع یا سجدہ کی حالت میں اسے یاد آیا کہ اس پر سجدہ (خواہ نماز کا ہو یا تلاوت کا) باقی ہے اور فوراً اپنے رکوع سے اس سجدہ کیلئے جھک گیا یا اپنے سجدہ سے اس کے لئے اپنا سر اٹھالیا، اور اس سجدہ کو ادا کر لیا تو اس رکوع اور سجود کو دوبارہ ادا کر لے، یہ بیان اولی اور بہتر طور پر کرنے کے لئے ہے، تاکہ حتی الامکان سارے افعال ترتیب کے ساتھ ادا ہو جائیں، اور اگر رکوع اور سجدہ کو دوبارہ ادا نہیں کیا تو بھی کافی ہو گا، کیونکہ نماز کے افعال ادا کرنے میں ترتیب شرط نہیں ہے، کیونکہ طہارت کی حالت میں منتقل ہو جانا ہی شرط ہے جو پائی گئی ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ رکوع کا اعادہ کرنا ضروری ہے کیونکہ ان کے نزدیک قومہ کرنا فرض ہے۔

توضیح:-رکوع اور سجدہ میں حدث ہونا، رکوع کی حالت میں دوسرے کو خلیفہ مقرر کرنے کا حکم

ومن احدث فی رکوعه او سجوده توضأ وبنی ولایعتد بالتی احدث فیها......الخ

جس شخص کو حدث ہوا۔ف۔ خواہ وہ منفرد ہو یا امام ہو یا مقتدی ہو فی رکوعه الخ وہ حدث خواہ رکوع کی حالت میں ہوا ہو یا سجدہ کی حالت میں تو وہ وضوء کرے اور بناء کرے ولایعتد الخ لیکن جس رکن میں حدث ہوا ہو اسے شمار نہ کرے۔ف۔ کیونکہ وہ

رکن طہارت کے ساتھ پورا نہیں ہوا ہے۔

ان اتمام الرکن بالانتقال و مع الحدث لایتحقق، فلابد من الاعادۃ......الخ

کیونکہ ایک رکن سے دوسرے رکوع میں منتقل ہو جانے کے بعد ہی پہلا رکن تمام سمجھا جاتا ہے۔ف۔اور ایسا انتقال فرض ہے۔ع۔ **ومع الحدث الخ** اور حدث کی حالت میں رہتے ہوئے دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونے سے ایسے صحیح نہیں مانا جاتا ہے۔ف۔یہاںتک کہ اگر رکوع کی حالت میں حدث ہو جائے اور اس کے منتقل ہونے کا ارادہ کرے تو وہ نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ ابھی گذر گیا ہے، اور پھر نمازی دوسرے رکن کی طرف اسی حالت میں منتقل ہو گیا تو پہلا رکن ابھی تک مکمل نہیں ہو سکا ہے، اس لئے اس رکن کو دوبارہ ادا کرنا ضروری ہو گیا۔ف۔چنانچہ اگر رکوع کی حالت میں حدث ہو گیا تھا تو وضوء کر کے آنے کے بعد رکوع کو دوبارہ ادا کرے۔

ولو کان اماما فقدم غیرہ دام المقدم علی الرکوع......الخ

اگر محدث امام ہو اور اسے رکوع کی حالت میں حدث ہو گیا تو اس نے جھکے جھکے دوسرے کو اپنا خلیفہ بنا دیا، ف، تو اس خلیفہ کو از سر نو رکوع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ **دام المقدم الخ** خلیفہ رکوع کی حالت میں جھکا ہوا رہ جائے، اور اپنا رکوع مکمل کر کے اٹھ جائے، کیونکہ خلیفہ کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے رکوع کی حالت میں ہی برقرار رہ جائے اور کھڑا نہ ہو۔ف۔کیونکہ جس فعل پر دوام کیا جائے اس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس نے از سر نو شروع کر دیا ہے، دراصل اس مسئلہ کی بنیاد ایک قسم کے مسئلہ پر ہے کہ اگر کسی کے بدن پر ایک کپڑا موجود ہے اسی کے بارے میں قسم کھا کر کہتا ہے کہ میں یہ کپڑا نہیں پہنوں گا، اور وہ اسی حالت میں اپنا کپڑا پہنے ہوئے رہ گیا تو اگرچہ اس نے قسم کھانے کے بعد اسے از سر نو نہیں پہنا ہے پھر بھی یہی کہا جائے گا کہ اس نے پہن لیا ہے اس طرح وہ جھوٹا ہو کر حانث ہو جائے گا، اور اسی طرح کسی نے کسی سواری پر سوار رہتے ہوئے یہ قسم کھائی کہ میں اس پر سوار نہ ہوں گا تو اگر وہ اس پر سے نیچے نہ اترے اور اوپر ہی رہ جائے تو اسے حانث کہا جائے گا۔مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ دوام اور ہمیشگی کا یہاں مطلب یہ ہے کہ جتنی دیر میں اس کپڑے کو اتارنا ممکن ہو وہ اسے نہ اتارے بلکہ اس کے بعد پہنے ہوئے رہ جائے، یا جتنی دیر میں سواری سے اترنا ممکن ہو اس سے زیادہ اسی پر سوار رہ جائے اور نہ اترے تو اسی کو استدامت اور ہمیشہ برقرار رہنا کہا جائے گا، جیسا کہ باب الایمان میں یہ بالتصریح بیان کیا گیا ہے۔م۔ **ولو تذکر الخ** ترجمہ سے مطلب واضح ہے **فانحط من رکوعہ الخ**۔ف۔یعنی سجدہ کی قضاء کرنے کے لئے رکوع سے جھک گیا **اور رفع الخ**، ف یعنی جبکہ سجدہ کی حالت میں اسے سجدہ قضاء یاد آیا خواہ سجدہ تلاوت ہو یا نماز کا باقی ہو اور اس نے سجدہ قضاء کو ادا کرنے کے لئے موجودہ سجدہ سے اپنا سر اٹھا کر سجدہ کیا تو **یعید الرکوع الخ** تو وہ اپنے رکوع اور سجدہ کو دوبارہ ادا کرے۔ف۔یعنی جس رکوع میں یا سجدہ میں یاد کر کے قضاء سجدہ کو کیا ہے اس رکوع اور سجدہ کو استحباباً ادا کرے۔

وھذا لبیان الاولی لتقع الافعال مرتبۃ بالقدر الممکن، وان لم یعد اجزأہ......الخ

اس طرح دوبارہ سجدہ ادا کرنے کا حکم اولیٰ طریقہ کا بیان ہے تاکہ جہاں تک ممکن ہو ترتیب کے ساتھ افعال ادا ہوں۔ف۔ یعنی موجودہ رکوع سے پہلے کے باقی سجدہ کو پہلے ادا کرنا ممکن ہے اس لئے ایسا ہی کرنا اولیٰ ہوگا، جس کی صورت یہ ہے کہ رکوع یا سجدہ قضاء کو ادا کرنے کے بعد جس رکوع یا سجدہ میں یاد آیا ہے اسے دوبارہ ادا کر لے اور پہلے کے رکوع یا سجدہ کو شمار میں نہ لائے، اگرچہ حقیقت میں وہ پہلے ہی ادا ہو چکا ہے۔م۔

وان لم یعد اجزأہ، لان الترتیب فی افعال الصلوۃ لیس بشرط......الخ

اسی بناء پر اگر رکوع یا سجدہ کو دوبارہ ادا نہ کیا تو بھی کافی ہو گا **لان الترتیب الخ**، کیونکہ نماز کے افعال میں ترتیب کو قائم رکھنا شرط نہیں ہے۔ف۔اگر ترتیب شرط ہوتی تو اعادہ یقیناً واجب ہوتا، پھر جس رکوع یا سجود میں باقی رہنا یاد آیا ہے وہ بھی اسی وقت پورا

ہو جاتا ہے جب سجدہ قضاء ادا کرنے کے لئے جھکنے لگا ہے لان الانتقال الخ کیونکہ اس میں صرف طہارت کی حالت میں دوسرے رکن کی طرف منتقل ہونا ہی شرط ہے، اور یہ شرط بھی پائی گئی ہے۔

وعن ابی یوسفؒ انه یلزمه اعادة الرکوع، لان القومة فرض عنده......الخ

لیکن امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ رکوع کا اعادہ کرنا لازم ہے۔ لان القومة الخ کیونکہ قومہ کرنا یعنی رکوع سے سیدھا کھڑا ہونا امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فرض عملی ہے۔ ف۔ حالانکہ مسئلہ میں یہ فرض کیا گیا ہے کہ رکوع میں یاد آتے ہی اسی طرح سجدہ میں چلا گیا یعنی سجدہ قضاء کرنے کے لئے کھڑا نہیں ہوا ہے، اسی لئے اگر رکوع سے سیدھا کھڑا ہونے کے بعد قضاء کا سجدہ کیا ہو تو بالاتفاق اعادہ واجب نہ ہوگا، جیسا کہ سجدہ کے مذکورہ صورت میں اعادہ کرنا بالاتفاق واجب نہیں ہے۔ مترجم۔

ومن ام رجلا واحدا فاحدث، وخرج من المسجد، فالمأموم امام نوى اولم ینو، لما فیه من صیانة الصلوة، و تعین الاول لقطع المزاحمة ولا مزاحمة، ویتم الاول صلاته مقتدیا بالثانی، کما اذا استخلفه حقیقة، ولو لم یکن خلفه الا صبی او امرأة، قیل تفسد صلاته لاستخلاف من لایصلح للامامة، وقیل لاتفسد، لانه لم یوجد الاستخلاف قصدا، وهو لایصلح للامامة، واللہ اعلم.

ترجمہ:۔ جس شخص نے فقط ایک مرد کی امامت کی اور اس امام کو حدث ہو گیا اس بناء پر وہ مسجد سے باہر نکل آیا تو دوسرا شخص جو مقتدی ہے از خود امام بن جائے گا، پہلے امام نے اس کی امامت کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو، کیونکہ ایسا کرنے سے نماز کی حفاظت ہو گی، اور وہ شخص اس لئے از خود امام بن جائے گا کہ اس کا کوئی مقابل نہیں ہے، اور پہلا امام وضوء کر لینے کے بعد دوسرے امام یعنی اپنے خلیفہ کی اقتداء کر کے اپنی بقیہ نماز مکمل کرے گا، اسی طرح جیسا کہ حقیقۃً اپنے اختیار سے اسے اپنا خلیفہ بنایا ہوتا، اور اگر اس کے پیچھے سوائے لڑکے یا عورت کے دوسرا کوئی اہل یعنی مرد نہ ہو تو کہا گیا ہے کہ اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ فی الحال اس کا خلیفہ از خود وہ لڑکا ہو گا یا عورت ہو گی اور ان میں سے کوئی بھی امامت کے لائق نہیں ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس کی نماز فاسد نہیں ہو گی کیونکہ اس نے کسی ایسے شخص کو اپنے پیچھے نہیں پایا ہے جسے یہ بالقصد اپنا خلیفہ بنا سکتا، اور جو موجود ہے وہ امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے، واللہ اعلم۔

توضیح:۔ امام محدث کے پیچھے بچہ یا عورت کے سوا دوسرا کوئی شخص نہ ہو، امام محدث کے پیچھے ایک کے ساتھ جماعت، امام نے کسی کو اور قوم نے دوسرے کو آگے بڑھا دیا ہو، بغیر نیت کے خلیفہ بننا نمازی کی نکسیر

ومن ام رجلا واحدا فاحدث، وخرج من المسجد، فالمأموم امام نوى اولم ینو......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ دوسرا شخص اسی وقت امام بنے گا جبکہ اس کے اندر امام بننے کی صلاحیت بھی موجود ہو۔ م۔ اس کے معنی میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس مقتدی نے خود بھی امام بننے کی نیت کی ہو یا نہ کی ہو۔ ع

لما فیه الخ کیونکہ ایسا ہونے میں نماز کی حفاظت ہوتی ہے اور فاسد ہونے سے بچ جاتی ہے۔ ف۔ ح نے اس جگہ لفظ صلوۃ کو مطلق رکھا ہے اس لئے اس شخص کی نماز مراد لی جائے گی جس کی نماز خلیفہ معین نہ ہونے کی بناء پر فاسد ہو جاتی ہے، خواہ وہ مقتدی ہو یا پہلا امام ہو، کیونکہ ایک روایت میں ہے کہ اگر امام خلیفہ مقرر کئے بغیر مسجد سے نکل جائے تو اس امام کی نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن دوسری روایت میں ہے کہ فاسد نہ ہو گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں بہر حال مقتدی ہی کی نماز مراد ہے، مگر دوسری روایت کے مطابق امام محدث کی نماز مراد ہے۔ مف۔ مگر نہایہ میں امام کی نماز مراد لی گئی ہے اور بعد کی عبارت سے بھی یہی اظہر ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں۔ م۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس جگہ پر تو یہ بات لازم تھی کہ کسی کو اپنا خلیفہ معین کر دے تو اس کا جواب مصنفؒ نے یہ دیا ہے کہ امام اول پر کسی کو اپنا

خلیفہ متعین کرنا اس لئے لازم ہوتا ہے تاکہ مقتدیوں میں کوئی اختلاف باقی نہ رہے اور یہ بات اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ اس کے مقتدیوں میں ایک سے زائد افراد اس کی اہلیت رکھتے ہیں مگر موجودہ صورت میں صرف ایک ہی شخص ہے جس کا کوئی مزاحم نہیں ہے۔

ویتم الاول صلاته مقتديا بالثاني، كما اذا استخلفه حقيقة......الخ

اور پہلا امام وضوء کر لینے کے بعد اپنی بقیہ نماز دوسرے امام یعنی اپنے پرانے مقتدی کے پیچھے ادا کر لے۔ف۔ یعنی اگرچہ امام نے اسے اپنا خلیفہ اپنے اختیار سے مقرر نہیں کیا ہے پھر بھی حکماً اسے خلیفہ مان کر اس کی اقتداء کر لے، کما اذا الخ ٹھیک اسی طرح جس طرح حقیقت میں اسے اپنا خلیفہ متعین کر دیتا، پھر اس کے پیچھے اپنی نماز تمام کرتا۔

ولو لم يكن خلفه الا صبى او امرأة، قيل تفسد صلاته لاستخلاف من لا يصلح للامامة......الخ

اور اگر امام محدث کے پیچھے نابالغ اور عورت کے ماسوا دوسرا کوئی بھی امامت کے لائق نہ ہو تو کہا گیا ہے کہ امام کی نماز فاسد ہو جائے گی، لاستخلاف الخ اس وجہ سے کہ اس نے حکماً ایسے شخص کو اپنا خلیفہ بنایا ہے جس میں امامت کی صلاحیت نہیں ہے۔ف۔ کیونکہ صرف بچہ اور عورت ہی اس کے پیچھے موجود ہیں، اس لئے حکماً وہی از خود خلیفہ مقرر ہو گئے۔العنایہ۔ اس جگہ پھر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ان کا خلیفہ بن جانا تو صرف نماز کی حفاظت کی غرض سے ہے، مگر یہاں تو برعکس فساد لازم آتا ہے۔م۔

وقيل لاتفسد، لانه لم يوجد الاستخلاف قصدا، وهو لايصلح للامامة، والله اعلم.

اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ امام محدث کی نماز فاسد نہ ہو گی،ف، کیونکہ اس جگہ خلیفہ ہو جانے کی صورت میں نماز فاسد ہو گی جبکہ یہاں خلافت کسی طور سے بھی نہیں پائی جا رہی ہے نہ حقیقۃً اور نہ حکماً لانه لم يوجد الخ کیونکہ امام نے حقیقۃً کسی کو خلیفہ نہیں بنایا ہے۔ف۔ لہٰذا خلافت حقیقۃً نہیں پائی گئی، وهو لايصلح الخ اور جو مقتدی تھے یعنی نابالغ بچہ اور عورت تو ان میں سے کوئی بھی امامت کے لائق نہیں ہے، اس لئے حکماً بھی خلافت نہیں پائی گئی۔

الحاصل کسی صورت سے بھی امام کی نماز فاسد نہ ہوئی، اور اگر واقعۃً کسی کو بھی خلیفہ بنا دے تو بالاتفاق سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور تیسرا قول یہ ہے کہ مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ان کا کوئی بھی امام باقی نہیں رہا ہے، اور امام کی نماز فاسد نہ ہو گی، اور یہی صحیح قول ہے۔العنایہ۔ علامہ فخر الاسلام اور التمر تاشیؒ نے اسی قول کو اصح کہا ہے، امام اگر اپنے حالت سفر کی قضاء نماز کو پڑھ رہا تھا کہ مقیم نے اسی نماز کو قضاء کرتے ہوئے اس کی اقتداء کر لی بعد میں اس امام کو حدث ہو گیا، تو وہ مقتدی امام نہیں بن سکتا ہے، امام کے پیچھے اگر کئی افراد مقتدی ہوں تو جبتک ان میں سے کسی ایک کو امام آگے نہ بڑھا دے یا خود کوئی بڑھ جائے اور لوگ بلا چوں وچرا اس کی اقتداء کر لیں تو وہ امام متعین ہو گا ورنہ نہیں۔

اگر امام نے کسی ایک کو اپنا خلیفہ متعین کیا مگر قوم نے کسی دوسرے کو یا خود نمازیوں میں سے ایک جماعت نے ایک کو اور دوسری جماعت نے دوسرے کو تو سب کی نماز فاسد ہو جائے گی، اگر امام کسی کو اپنا خلیفہ متعین کرنے سے پہلے مسجد سے باہر ہو گیا یعنی مسجد کی جو حد مقرر ہے تو قوم کی نماز فاسد ہو جائے گی مگر امام کی نماز اپنی جگہ پر صحیح رہے گی، حسنؒ نے کہا ہے کہ ساری روایتیں اس بات پر متفق ہیں کہ بغیر نیت کئے ہوئے خلیفہ امام نہیں ہو سکتا ہے، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مسبوق امام کے سلام کے بعد جو نماز ادا کرتا ہے وہ اس کی نماز کا پہلا حصہ شمار کیا جاتا ہے اور امام کے ساتھ جو نماز پائی ہے وہ نماز کا آخر حصہ ہوتا ہے، امام مالکؒ و ثوریؒ اور احمدؒ کا یہی مذہب ہے، اور ابن المنذرؒ نے اس قول کو ابن عمرؓ و مجاہد اور ابن سیرینؒ سے نقل کیا ہے، اور امام احمدؒ، ابن عباسؓ سے اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے، امام نوویؒ نے مذہب امام شافعی اس کے برعکس بیان کیا ہے، اور حضرت عمر و علی اور ابو الدرداءؓ سے بھی یہی روایت ذکر کی گئی ہے، لیکن المنذرؒ نے کہا ہے کہ ان صحابہ کرام سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے، واللہ اعلم، اگر کسی نمازی کی نکسیر پھوٹ گئی تو اس کے بند ہونے تک نماز نہ پڑھے، انتظار کرے، پھر وضوء کر کے

بقیہ نماز پوری کرلے۔ د۔

باب ما یفسد الصلوۃ وما یکرہ فیھا

ومن تکلم فی صلوتہ عامدا اوساھیا بطلت صلوتہ خلافا للشافعیؒ فی الخطاء والنسیان و مفزعہ الحدیث المعروف.

ترجمہ:۔ جس شخص نے اپنی نماز میں قصداً یا بھول کر بات کرلی تو اس کی نماز فاسد ہوگئی، لیکن غلطی سے اور بھول کر بات کرنے میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، اور امام شافعی کی مستدل مشہور حدیث ہے۔

توضیح:۔ مفسدات اور مکروہات نماز کا بیان، کلام مفسد اور غیر مفسد کی تفصیل، امام شافعیؒ کی دلیل

باب مایفسد الصلاۃ وما یکرہ فیھا...... الخ

اس باب میں ان چیزوں کا بیان ہے جو نماز کو فاسد کرتی ہیں اور جو نماز میں مکروہ ہیں یعنی ایسے افعال جن کا کرنا بندہ کے اختیار میں ہیں اور غیر اختیاری حدث نہیں ہیں ان میں سے جو چیزیں نماز کو فاسد کرتی ہیں، اور فاسد نہ کرنے والی چیزوں میں سے اس جگہ ان چیزوں کا بیان ہے جن کا کرنا یا نماز میں ہونا مکروہ ہے۔ مع۔

ومن تکلم فی صلوتہ عامدا اوساھیا بطلت صلوتہ.....الخ

جس شخص نے اپنی نماز کی حالت میں کلام کیا، کلام خواہ ارادہ سے ہو یا بھول سے ہو بہر صورت اس کی نماز باطل ہوگئی۔ ف۔ وہ چیزیں جو نماز کو فاسد کرتی ہیں وہ خواہ قولی ہوں یا فعلی ہوں ان کی دو قسمیں ہیں، مفسد قولی میں سے ایک کلام کرنا ہے اس سے مراد وہ آواز ہے جس میں حروف پائے جاتے ہوں اور اس سے کوئی مطلب بھی سمجھ میں آتا ہو، یہ بات کبھی صرف ایک حروف میں بھی پائی جاتی ہے جیسے ق جو عربی میں امر حاضر کا صیغہ ہے اس کے معنی ہیں، بچاؤ، اسی بناء پر اگر کسی نے اپنی سواری کے جانور کو نماز کی حالت میں "ہر" کہدیا یا کتے یا بلی کو لے لے کہہ کر بلایا، یا انہیں بھگایا، الحاصل ان جیسی آوازوں سے جس میں حروف ہجا موجود ہوں تو وہ نماز فاسد کردینگی اور اگر ایسا ہو کہ صرف آواز پائی جائے اور اس میں کوئی حرف ظاہر نہ ہو تو وہ آواز مفسد نہ ہوگی، جیسا کہ الذخیرہ میں موجود ہے۔ ھ۔ مگر نماز مکروہ ہوگی۔ ط۔

اگر ایک حرف ظاہر تو ہو مگر اسی کے کوئی معنی نہ ہوں تو وہ کلام نہیں کہلائے گا۔ ش۔ پھر اگر ایک حرف ہو یا دو یا اس سے زیادہ حرف ہو اور ان سے مطلب بھی سمجھا جاتا ہو یہ اس وقت کلام کے حکم میں ہوں گے جبکہ وہ سنے جاتے ہوں اگرچہ خود ہی سن سکتا ہو تو بھی وہ کلام ہوجائے گا اور اسی سے نماز فاسد بھی ہوجائے گی۔ المحیط۔ اور اگر حروف صحیح طور سے ادا تو ہوگئے مگر خود بھی نہیں سنے تو وہ مفسد نہیں ہیں، یہ حکم اس بناء پر ہے کہ صرف تصحیح حروف سے کلام نہیں کہلاتا ہے جس کی بحث جہر اور مخافت کے بیان میں گذر چکی ہے، لیکن کرخیؒ کے قول کے مطابق یہ ضروری ہے کہ تصحیح حروف ہوجانے کی صورت میں اسے کلام مان لیا جائے، اور چونکہ اس قول میں بھی وزن ہے اس لئے میرے نزدیک فتویٰ دیتے وقت کافی غور کرلینا چاہئے۔ م۔

پھر جب کلام مان لیا گیا تو خواہ اسے دوسروں نے سنا ہو یا کہنے والے نے خود سنا ہو ایک فتویٰ کے مطابق تو وہ مفسد ہے خواہ ارادۃً ہو یا بھول سے ہو سوائے ان صورتوں میں کہ سلام کردیا ہو، یا بھول سے کلام ہو یا یہ بات نہیں جانتا ہو کہ نماز میں بولنا منع ہے یا کسی نے اسے زبردستی مجبور کیا ہو، اور اگر کوئی نماز میں اس طرح سویا کہ وضوء نہیں ٹوٹا مگر اسی حالت میں بول دیا تو بھی قول مختار یہی ہے کہ نماز فاسد ہوجائے گی۔ المحیط۔ الخلاصہ۔ ھ۔ ع۔ د۔ اور کلام خواہ تھوڑا ہو یا زیادہ، خواہ نماز کی اصلاح کے لئے ہو، مثلاً مقتدی نے امام سے کہدیا کہ چار ہوگئیں، اس وقت جبکہ وہ پانچویں کے لئے اٹھنا چاہتا ہو، یا اس لئے نہ ہو بہر صورت کلام مفسد ہوگا، جبکہ یہ لوگوں کے کلام سے ہو۔ المحیط۔ ھ۔ اور جب نماز باطل ہی مان لی گئی تو اسے ابتداء سے پڑھنا ہوگا مگر یہ اس صورت میں کہ

قعدہ اخیرہ میں مقدار تشہد بیٹھنے سے پہلے بولا ہو۔ قاضی خان۔

اس مسئلہ میں ائمہ فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، امام نوویؒ نے شرح المذہب میں کہا ہے کہ اگر اصلاح نماز کے خیال کے علاوہ عمداً کلام کیا ہو تو بالاجماع اس کی نماز فاسد ہو گی، ابن المنذرؒ وغیرہ نے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، اور اگر اصلاح نماز کے خیال سے بولا ہو مثلاً امام جبکہ پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہونے لگا تو مقتدی نے کہدیا کہ چار پڑھ لی گئی ہیں، یا اس جیسا کچھ اور کہا ہو، تو بھی مفسد ہو گا، اور یہی جمہور فقہاء کا مذہب ہے، اور اگر زبردستی کرنے پر مجبور اً بولا ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک اصح یہ ہے کہ نماز فاسد ہو گی، یا اگر بھول یا بدخیال سے بول اٹھا تو مفسد نہیں ہے ہاں اگر کلام طویل ہو، طویل ہونا کو عرف سے جانا جاتا ہے، امام مالکؒ کے نزدیک کلام اگر اصلاح نماز کے لئے ہو تو وہ مفسد نہیں ہوتا ہے جیسے کہ بے اختیار زبان سے کچھ نکل جائے، اور اگر بھول کر کلام ہو یا جہالت کی وجہ سے تو ان کا حکم قصداً کلام کرنے کا ہو گا، اور امام احمدؒ کے مذہب میں اصلاح نماز کے سلسلہ کے کلام میں تین روایتیں ہیں (۱) یہ کہ مفسد ہے اور اسی روایت کو خلالؒ نے پسند کیا ہے، جیسا کہ المغنی لابن قدامہ میں ہے، اور نخعی تابعیؒ کے نزدیک بھول کر بولنا بھی مفسد ہے، یہی قول قتادہ بن دعامۃ تابعی اور حماد بن سلیمان کا ہے، اور امام احمدؒ سے ایک قول مثل قول شافعیؒ کے ہے، اور ایک روایت مثل ابو حنیفہؒ کے ہے۔ مع۔ مصنفؒ نے صرف امام شافعیؒ کا اختلاف ذکر کیا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ خلافا للشافعیؒ یعنی بھول چوک کے ساتھ کلام کر لینے میں امام شافعیؒ نے اختلاف کیا ہے۔ ف۔ بشرطیکہ وہ کلام طویل نہ ہو، کیونکہ عرف واصطلاح میں طویل کلام بھول چوک نہیں ہوتا ہے۔ ع۔

ومفزعه الخ اور امام شافعیؒ کی مجبوری کی دلیل مشہور حدیث ہے۔ ف۔ یہ کہہ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مشہور حدیث کی وجہ سے مجبور ہو کر امام شافعیؒ نے خطاو نسیان کے کلام کو مستثنیٰ کیا ہے، ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ان اللہ وضع عن امتی الخطاء والنسیان وما استکرھوا علیہ یعنی اللہ تعالیٰ نے میری امت سے خطاو نسیان کو دور کر دیا ہے، اور اس چیز کو بھی جس پر ان کو بزور مجبور کر دیا جائے، اس کی روایت کی ہے ابن ماجہ وابن حبان والحاکم اور ابن عدی نے جعفر بن جبیر بن فرقد کے توسط سے، اسی کے مانند دوسرے صحابی سے روایت کر کے کہا ہے کہ اسی راوی جعفر بن جبیر کی منکرات سے ہے، ابن ماجہ نے ابوذرؓ کی حدیث سے اور طبرانی نے حضرت ثوبانؓ کی حدیث سے اور ابوالدرداءؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے، اور ابو نعیم نے حلیہ میں ابن عمرؓ کی حدیث مرفوعاً روایت کی اور کہا کہ غریب ہے ابن حبان اور حاکمؒ نے اس کی تصحیح کی ہے، اور عقیلی نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

اور ابن ابی حاتم نے کتاب العلل میں اپنے والد امام ابو حاتم سے پوچھا تو فرمایا کہ گویا یہ روایتیں موضوع ہیں، اور یہ حدیث اور اس کی سندیں صحیح نہیں ہیں، پھر صحیح فرضاً مان لینے کی صورت میں اس کے معنی میں بحث کرنا چاہئے، تو معلوم ہونا چاہئے کہ حدیث کے ظاہری معنی مراد نہیں ہیں یعنی یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری امت سے بھول چوک اور اکراہ زبردستی کرنے کو دور کر دیا ہے کہ نہ کوئی بھولے گا نہ کوئی چوکے گا اور نہ کسی پر زبردستی ہو گی، کیونکہ یہ تو صراحۃً ظاہر کے خلاف ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ نماز میں بھول گئے تھے، تو معلوم ہوا کہ اس لفظ سے حقیقت مراد نہیں ہے، تو اب اس کا حکم مراد ہو گا یعنی ان تینوں چیزوں کا حکم اٹھا دیا گیا ہے، پھر حکم میں دو صورتیں ہیں ایک دنیوی دوسرے اخروی، اس پر ہم یہ کہتے ہیں کہ دنیاوی حکم بھی اٹھانا مراد نہیں ہے، کیونکہ اگر کسی نے دوسرے کو خطاءً قتل کر دیا تو قرآنی نص کے مطابق اس پر دیت اور کفارہ واجب ہوتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کا گناہ اٹھا دیا گیا ہے، تو اب اگر کسی نے نماز میں بھول چوک سے کلام کر لیا تو اس پر گناہ نہ ہو گا، لیکن دنیا کے اعتبار سے اس کی نماز فاسد ہو گئی، جیسا کہ بھولے سے نماز کا کوئی رکن چھوڑ دے تو بالاجماع نماز فاسد ہو گی اور گناہ نہ ہو گا، جیسا کہ کوئی گولی کا نشانہ سیکھتا تھا، اور نشانہ چوک کر کسی کو گولی لگ گئی تو گناہ نہ ہو گا مگر دیت اور کفارہ دونوں واجب ہوں گے۔ مع۔

ولنا قوله علیه السلام ان صلاتنا هذه لایصلح فیها شیء من کلام الناس، وانما هی التسبیح والتهلیل و

قراء ۃ القران ومارواہ محمول علی رفع الاثم بخلاف السلام ساھیا، لانہ من الاذکار فیعتبر ذکرا فی حالۃ النسیان، وکلاما فی حالۃ التعمد لما فیہ من کاف الخطاب:

ترجمہ:- اور ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ ہماری یہ نماز لوگوں کے کلام جیسی کسی چیز کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے، یہ تو تسبیح و تہلیل اور قرأت قرآن کا نام ہے، اور جو روایت امام شافعیؒ نے بیان کی ہے وہ تو گناہ کے دور ہو جانے پر محمول ہے، بخلاف بھول کر سلام کرنے کے کہ یہ بھی تو اذکار میں سے ہے اس لئے نسیان کی حالت میں نکل جانے کی صورت میں اسے ذکر کا اعتبار کیا جائے گا، اور قصداً کہنے کی صورت میں کلام پر محمول کیا جائے گا اس وجہ سے کہ اس میں کاف خطاب کا متصل ہے۔

توضیح:- حنفیہ کی دلیل، بھول کر یا ارادہ کے ساتھ سلام کرنے کا حکم

ولنا قولہ علیہ السلام ان صلاتنا ھذہ لایصلح فیھا شیء من کلام الناس......الخ

نماز میں بھول کر سلام کرنے کے سلسلہ میں احناف ائمہ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ ہماری یہ نماز لوگوں کے کلام جیسی چیز کی صلاحیت بالکل نہیں رکھتی ہے یہ تو فقط تسبیح اور تہلیل اور قراءۃ قرآن کا مجموعہ ہے۔ف۔امام مسلمؒ نے اپنی کتاب صحیح میں یہ باب قائم کیا ہے کہ ابتداء اسلام میں نماز کی حالت میں سلام کرنا جائز تھا بعد میں منسوخ ہو گیا، اور اس باب کے ماتحت حضرت معاویہ بن الحکم السلمیؓ کی یہ طویل حدیث روایت کی ہے اسی میں وہ جملہ بھی ہے جو مصنفؒ نے ذکر کیا ہے، طبرانی کی روایت میں "یصلح"، کی جگہ طویل "لایحل" مذکور ہے، یعنی ہماری اس نماز میں لوگوں کا کچھ کلام بھی حلال نہیں ہے۔مع۔اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں انسانوں کا کلام تھوڑا ہو یا زیادہ کچھ بھی حلال نہیں ہے اس وجہ سے نماز کا احرام ٹوٹ جاتا ہے۔م۔

حضرت زید بن ارقمؓ کی حدیث میں ہے کہ آدمی نماز کی حالت میں اپنے برابر والے کے ساتھ باتیں کر لیتا تھا اور بعد میں جب یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾ اسی آیت سے ہم لوگوں کی خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا اور ہم کلام کرنے سے روک دئے گئے، اس کی روایت بخاری، مسلم دونوں نے کی ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث بھی اس بات میں تصریح ہے کہ لوگ پہلے باتیں کیا کرتے تھے پھر جب ہم لوگ حبشہ سے واپس آئے تو ممانعت ہو گئی، جیسا کہ صحیح میں ہے، اور ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ یہ حکم نیا ہے کہ تم لوگ نماز میں باتیں نہ کرو، اسی روایت کو ابن حبانؒ نے بھی بیان کیا ہے۔مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حضرت زید بن ارقمؓ کی حدیث سے معلوم ہوا کہ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نماز کے اندر کلام کرنے کی ممانعت کی گئی ہے، کیونکہ بالاتفاق آیت ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾ بالاجماع مدینہ میں نازل ہوئی ہے، اور ابن مسعودؓ کی حدیث میں تو اس بات کی تصریح ہے کہ حبشہ سے واپسی مدینہ منورہ میں ہوئی ہے، اس روایت سے خطابیؒ کا یہ خیال غلط ثابت ہوا کہ مکہ ہی میں کلام کرنا حرام ہو چکا تھا، کیونکہ ان کا وہ خیال ان صریح احادیث کے مخالف ہے، بلکہ مدینہ منورہ میں بھی کچھ دن تک جائز تھا، یہانتک کہ ﴿قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ﴾ کا نزول ہوا، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حبشہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے سے پہلے ہو چکا ہے، اسی لئے ائمہ حنفیہؒ نے کہا ہے کہ حضرت ذوالیدینؓ کی حدیث کا واقعہ کلام کے حرام ہونے سے پہلے کا ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو دو ہی رکعتوں پر سلام پھیر دیا تو ذوالیدین نے کھڑے ہو کر کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ کیا نماز کم کر دی گئی ہے یا آپ بھول گئے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیا ذوالیدین نے سچ کہا ہے تو لوگوں نے جواب دیا جی ہاں انہوں نے سچ کہا ہے، اس کے بعد آپ نے دو رکعتیں اور بھی پڑھ لیں اور سجدہ سہو ادا کر لیا یہ حدیث بخاری اور مسلم کی صحیحین میں مذکور ہے۔

الحاصل یہ اس واقعہ اس وقت کا ہے جبکہ کلام کرنا ممنوع تھا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ذوالیدینؓ نے قصداً کلام کیا اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے نہ تو ان کو نماز کے لوٹانے کا حکم دیا اور نہ کسی دوسرے کو، اس جگہ یہ کہنا کہ ان کا یہ کلام چونکہ نماز کی اصلاح کے

لئے تھا اس لئے لوٹانے کا حکم نہیں دیا ہے، تو یہ بہت کمزور سی دلیل ہے کیونکہ اگر نماز کی اصلاح کے لئے باتیں کرنی جائز ہوئیں تو مردوں کو ایسے موقعہ پر سبحان اللہ کہنے اور عورتوں کو ہاتھ پر ہاتھ مارنے (تصفیق) کا کیوں حکم دیا جاتا، بلکہ یہ بھی دلیل ہے کہ اس وقت کلام کرنا منسوخ نہیں ہوا تھا کیونکہ ذوالیدین نے تسبیح نہیں کہی جبکہ حدیث میں آیا ہے کہ تصفیق عورتوں کے لئے ہے اور تسبیح مردوں کے لئے ہے، یعنی جب امام مثلاً چار رکعتوں کے بعد پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہونے لگے یا ایک ہی رکعت کے بعد بیٹھنے لگے یا دو ہی رکعتوں پر سلام پھیرنے لگے تو چاہئے کہ مردوں میں سے کوئی سبحان اللہ با آواز بلند کہدے یا عورتوں میں سے کوئی تصفیق کرے یعنی دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے تا کہ امام کو تنبیہ ہو جائے، کیونکہ قرأت میں تو بالاتفاق لقمہ دینا چاہئے، اب جبکہ ذوالیدین نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ اس وقت کلام کرنا ممنوع نہ تھا، اور اس کی ممانعت کے بعد ہی تسبیح کہنے یا تصفیق کرنے کا حکم دیا گیا، اس جگہ لوگوں کو ایک وہم اور ہوتا ہے وہ یہ کہ روایت حضرت ابوہریرہؓ سے ہے اور وہ تو ہجرت کے ساتویں برس فتح خیبر کے وقت ہوا ہے، اور حدیث کے الفاظ ہیں صلی بنا رسول اللہ ﷺ یعنی آپ نے ہمیں نماز پڑھائی، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں کلام کے منسوخ ہونے کا حکم بہت زمانہ بعد کا واقعہ ہے۔

اس وہم کا جواب یہ ہے کہ زبان کے محاورہ میں عموماً ایسے معاملہ کو جو اپنے ہم جنسوں کے ساتھ پیش آتا ہے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا جاتا ہے، تو اگر حضرت ابوہریرہؓ نے وہی الفاظ کہے ہوں جو بیان کئے گئے ہیں یعنی راوی کو وہم نہ ہوا ہو کہ انہوں نے کچھ اور کہا ہو مگر راوی نے کچھ اور سمجھ لیا ہو ایسی صورت میں ابوہریرہؓ کے کہنے کی یہ مراد سمجھی جائے گی کہ ہم یعنی اصحاب رسول اللہ ﷺ، جیسا کہ نزال بن سبرہؒ میں ہے کہ قال لنا رسول اللہ ﷺ وانا وایاکم کماندعی بنی عبدمناف الخ اسی روایت میں نزال بن سبرہ اگرچہ تابعی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کو دیکھا بھی نہیں ہے بھی کہہ رہے ہیں کہ ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا پس اس سے یہ مراد لی جائے گی کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ میری قوم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، اور جیسا کہ طاؤس میں تابعیؒ کا یہ کہنا کہ قدم علینا معاذ بن جبلؓ فلم یاخذ من الخضروات شیئا، یعنی معاذ بن جبلؓ ہم پر سردار ہو کر آئے تو ساگ سبزیوں وغیرہ سے کچھ بھی زکوۃ نہیں لی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ملک پر سردار بن کر آئے، کیونکہ یہ طاؤس تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے جبکہ معاذؓ کو رسول اللہ ﷺ نے یمن پر حاکم بنا کر بھیجا تھا، روایت میں مذکور ذوالیدین کا اصل نام خرباق اور ان کی کنیت ابوالعمراء تھی اور محققین کے نزدیک یہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد بھی زندہ تھے رضی اللہ عنہم وعنا، اور دوسرے ایک شخص کے ان سے بھی اسی قسم کی روایت پائی جاتی ہے وہ ذوالشمالین میں انہوں نے البتہ جنگ بدر میں شہادت پائی ہے، ان کا اصل نام عمیر بن عمرو الخزاعی ہے اور حدیث نماز میں گفتگو کرنے والے یہ نہیں بلکہ پہلے (یعنی خرباق) ہیں مع۔ م۔

ومارواه محمول علی رفع الاثم بخلاف السلام ساهیا......الخ

اور امام شافعیؒ نے جو روایت کی ہے وہ گناہ دور ہونے پر محمول ہے۔ ف۔ یعنی بھول وچوک اور جبر واکراہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے گناہ معاف کر دیا ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس روایت سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ پچھلی امتوں پر ان صورتوں میں بھی گناہ ہوتا ہوگا، اور بظاہر یہ حکم یہودیوں کے لئے تھا، بشرطیکہ حدیث اس امت کی خصوصیات میں سے ہو، اور اگر صرف اظہار واقعہ ہے تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھول وچوک ہونے کی صورت میں گرفت نہیں کرتا ہے، اور یہ جواب اسی صورت میں ہوگا جبکہ روایت ان وضع عن امتی الخ صحیح بھی ہو، ورنہ ثبوت ہی نہیں ہے، پھر اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ یہ روایت دوسری روایت کے مقابل ومعارض ہے تو بھی کہتے ہیں کہ ہماری حدیث اس دوسری حدیث کی نسبت سے اصح اور عالی ہے اور وہ صریح مانع ہے، اور یہ روایت اس سے کمتر اور صریح نہیں ہے۔

اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ تمہاری حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کلام کرنا مطلقاً ناجائز ہے، لیکن اس کے لئے یہ بات تو ضروری نہیں ہوتی ہے کہ اس سے نماز بالکل فاسد ہو جائے، جیسا کہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سورہ نہ ملانا جائز تو ہے مگر نماز کے لئے

مفسد بھی نہیں ہے، جواب یہ ہے کہ دو احکام حرام ہونا اور حلال ہونا کسی معاملہ میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں، اور جب کلام کو حلال قرار نہیں دیا گیا تو لامحالہ یہ حرام کو باطل کرنے والا ہوا، شیخ ابن الہمامؒ نے اس کی تحقیق کی ہے۔م۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی بھی ایسا کلام جو ذکر نہ ہو کسی طرح کا بھی ہو وہ مفسد نماز ہے۔

بخلاف السلام ساهيا، لانه من الاذكار فيعتبر ذكرا فى حالة النسيان......الخ

بخلاف اس صورت جبکہ بھول کر سلام پھیر دے۔ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ سلام ہر صورت میں کلام کے مثل نہیں ہے لانہ الخ کیونکہ یہ سلام تو نماز کے اذکار سے ہے۔ف۔ یہانتک کہ سلام التحیات میں تو پڑھا جاتا ہے مگر بے موقع نہیں پڑھ سکتے معلوم ہوا کہ اس کی دو حالتیں ہیں۔

فيعتبر ذكرا فى حالة النسيان، وكلاما فى حالة التعمد لما فيه من كاف الخطاب......الخ

(۱) سلام کو ذکر اس صورت میں کہا جائے گا جبکہ وہ حالت نسیان میں ہو (۲) اور کلام اس وقت مانا جائے گا جبکہ قصداً کیا گیا ہو، کیونکہ اس کے لفظ "علیک" میں کاف خطاب کا ہے۔

ف۔ حاصل یہ ہوا کہ السلام علیکم خطاب ہے اس لئے یہ لوگوں کے کلام سے ثابت ہوا، مگر وہ ذکر نماز بھی خطاب کے ساتھ ہے، پس ہم نے دونوں صفتوں کو دو حالتوں میں اعتبار کیا ہے، اس طور پر کہ جب نمازی نے بھول کر سلام پھیرا تو بلا ارادہ ایک کلمہ زبان سے نکالا جو ذکر نماز ہے اور اس سے کسی کو سلام کرنے کا ارادہ بھی نہیں کیا ہے، لہٰذا یہ جملہ اس کا کلام نہیں ہے، اس لئے مفسد بھی نہیں ہے، اور جب بالا ارادہ سلام کیا تو جن سے خطاب کیا ان سے کلام پایا گیا، لہٰذا یہ مفسد ہوا۔م۔ اگر یہ کہا جائے کہ تھوڑا سا کلام بھی معاف ہوتا ہے کیونکہ یہ قول بھی ہے تو دوسرے فعل قلیل کی طرح اسے مفسد نہیں ہونا چاہئے، جواب یہ ہے کہ آدمی کی ہر طبعی حرکت ہی ایک فعل ہے اور قلیل سے بچنا ممکن نہیں ہوتا ہے برخلاف کلام کرنے کے یہ کچھ بھی طبعی نہیں ہے، جیسا کہ شیخ رازی کے اسرار میں ہے۔مع۔ اگر نماز کو اپنے اختیاری سلام سے ختم نہیں کیا بلکہ کسی شخص کو بھول کر سلام کر دیا یا جواب دیا تو نماز بہر صورت فاسد ہوگی خواہ حرف خطاب علیک یا علیکم کہے یا نہ کہے۔ن۔د۔ اگر مسبوق نے امام کے ساتھ بھول کر سلام پھیرا تو نماز فاسد نہ ہوگی، لیکن اگر اپنی باقی نماز یاد ہوتے ہوئے سلام پھیرا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ شرح الطحاوی۔ اور اگر اس خیال کے ساتھ سلام کیا کہ مجھے تو امام کے ساتھ سلام کرنا چاہئے تو یہ ارادتی سلام اور بھی زیادہ مفسد ہے کہ اس کی بنیاد انکار پر ہے۔ الخلاصہ۔

اگر مقیم نے دو ہی رکعت پر عشاء کو تراویح یا ظہر کو جمعہ یا اپنے مسافر خیال کر کے پھیر دیا تو نماز فاسد ہوگئی، اس لئے از سر نو وہ پڑھے، اور اگر چوتھی رکعت گمان کر کے دوسری رکعت پر ہی سلام پھیر دیا تو (کلام کرنے سے پہلے یا پیٹھ کو قبلہ رخ کرنے یا کوئی اور مفسد نماز ادا کرنے سے پہلے) نماز پوری کر کے سجدہ سہو کر لے۔ قاضی خان۔ قاعدہ یہ ہے کہ سلام کا سہو اگر اصل نماز میں ہو تو وہ مفسد نماز ہے، اور اگر وصف نماز میں ہو تو مفسد نہیں ہے۔ المحیط۔ اگر کسی کو بھولے سے سلام کرتے ہوئے "السلام" کہا اور اتنا کہتے ہی اسے خیال آگیا اس لئے "علیک" نہیں کہا پھر بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ المحیط۔ اگر سلام کے ارادے سے مصافحہ کیا تو مفسد نماز ہے، اگر ہاتھ کے اشارے سے سلام کا جواب دیا، یا کسی کے مانگنے پر سر یا ہاتھ سے ہاں یا نہیں کا اشارہ کیا تو نماز فاسد نہ ہوگی، التبیین۔ لیکن مکروہ ہوگی، شرح الامیر للمنیہ، اب کلام سے متعلق کچھ مزید مسائل بیان کئے جائیں گے۔

فان اَنَّ فيها او تَاَوَّهَ او بكى فارتفع بكاؤه، فان كان من ذكر الجنة او النار لم يقطعها، لانه يدل على زيادة الخشوع، وان كان من وجع او مصيبة قطعها، لان فيه اظهار الجزع والتأسف، فكان من كلام الناس، وعن ابى يوسفؒ ان قوله اه لم يفسد فى الحالين واوه يفسد.

ترجمہ:- اگر نماز میں درد کا اظہار کیا، یا اوہ کیا یا رویا اور آواز بلند ہوگئی، اگر یہ باتیں جنت یا دوزخ کو یاد کرنے کی وجہ سے ہو تو

نماز باطل نہ ہوگی، کیونکہ یہ باتیں خشوع کی زیادتی پر دلالت کرتی ہیں، اور اگر کسی درد یا مصیبت کی وجہ سے کیا ہو تو یہ باتیں نماز کو باطل کردیں گی کیونکہ ان سے گھبراہٹ اور افسوس کا اظہار ہوتا ہے، لہٰذا انسان کے کلام سے یہ چیزیں شمار کی جائینگی اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ نمازی کا آہ کہنا دو میں سے کسی حال میں بھی نماز کو فاسد نہیں کرے گا، لیکن لفظ اوہ فاسد کردے گا۔

توضیح:- نماز میں رونے، آہ، اوہ کہنے کا حکم

فان انّ فیھا او تاوّہ او بکی فارتفع بکاؤہ، فان کان من ذکر الجنۃ او النار لم یقطعھا......الخ

اور اگر نماز میں ایں کیا یا اوہ کہا یا رویا اور آواز بلند ہوگئی۔ف۔ یعنی غم کے ساتھ صرف آنسو ہی جاری نہیں ہوئے بلکہ اس سے بھی زیادہ ہوا یعنی اس طرح رویا کہ اس سے حروف بھی پیدا ہوگئے، جیسا کہ فتح القدیر میں مذکور ہے، اسی طرح کہا اور حروف صاف ادا ہوگئے تو یہی کافی ہوگا، امام کرخیؒ کے قول کے مطابق یا قول مختار کے مطابق سننا بھی ضروری ہے، لیکن یہ صورت یہاں ممکن نہ ہوگی، کیونکہ اس نے قصداً حروف کی ادائیگی کا ارادہ نہیں کیا ہے، ورنہ اس دوسری صورت میں بلا اختلاف نماز فاسد ہوگی، بلکہ رونے کی وجہ سے حروف پیدا ہوگئے ہیں، اس کا علم اسی صورت سے ہوگا کہ اپنی آواز کو وہ خود سنے یا دوسرے لوگ سن سکیں۔م۔ انین کے معنی ہیں اہ کہنا "الف" کو زبر اور "ہ" کو جزم کے ساتھ۔ع۔ اور تاتارخانیہ میں ذکر کیا ہے کہ اواہ کہے، لیکن عینیؒ کا قول ہی صحیح ہے اور یہی معنی دوسری کتابوں میں بھی ہے۔م۔

تاوّہ بروزن تفعّع کے معنی ہیں اوہ کہنا ویسا اس میں کئی لغتیں ہیں (۱) اوہ الف کو فتحہ واو کو جزم اور ہاء کو کسرہ (۲) الف کو مد اور ہاء کو جزم کے ساتھ یعنی واو کو الف کر کے الف میں ملا کر الف کو مد کردیا (۳) اوہ الف کو فتحہ واؤ کو تشدید ہاء کو جزم۔ع۔ خلاصہ یہ ہوا کہ نمازی نے اپنی نماز میں انین کیا یا تاوہ کا کوئی لفظ کہا یا اس طرح رویا کہ اس سے حروف پیدا ہوگئے، تو اس میں دو صورتیں ہوں گی (۱) یہ کہ **فان کان الخ** کہ اگر مذکورہ کوئی صورت بھی جنت یا دوزخ کے یاد آنے کی وجہ سے ہوئی ہو تو نماز کے لئے مفسد نہ ہوگی، **لانہ یدل الخ** کیونکہ یہ کیفیت خشوع و خضوع کی زیادتی پر دلیل ہے۔ف۔ اس صورت میں رغبت یا خوف کی زیادتی ظاہر ہے، اور اگر صراحتہ یوں کہے، **اللھم ادخلنی الجنۃ**، الٰہی مجھے جنت میں داخل فرما، **اللھم اجرنی من النار**، اللہ مجھے دوزخ سے بچا، تو نماز قطع نہ ہوگی، ایسی صورت میں کنایۃً کہتے میں تو بدرجہ اولیٰ قطع نہیں ہوگی۔ف۔ یہی قول امام مالکؒ و احمدؒ کا ہے۔ع۔

لان فیہ الخ کیونکہ اس میں غم و افسوس کا اظہار ہے **فکان الخ** پس یہ انسانوں کے کلام سے ہوگیا۔ف۔ جو مفسد نماز ہوتا ہے، گویا اس نے صراحۃً اس طرح کہا ہے کہ میری مدد کرو کہ مجھ پر مصیبت ہے۔ع۔ اور یہ **اللھم نجنی من الکرب العظیم** کہ اسے اللہ مجھے بڑی مصیبت سے نجات دے، جیسی دعا نہیں ہے، کیونکہ بغیر دعاء کئے بھی درد مصیبت سے چلانا اور رونا معروف طریقہ ہے تو گویا اس نے یوں کہا ہائے مجھ پر بڑی مصیبت آن پڑی ہے۔ یا۔ وائے مجھے بڑی تکلیف ہوگئی ہے، اس لئے یہ بلا شبہ مفسد ہوگی، اس کلام کے ظاہر سے یہی وہم ہوتا ہے کہ درد اختیاری ہو یا بے اختیاری بہر صورت مفسد نماز ہے، لیکن محیط السرخسیؒ میں کہا ہے کہ اگر بیماری کے درد میں بے اختیاری طور سے آواز نکل جائے تو اگر جمائی وغیرہ جیسی صورت میں ہو تو مفسد نہیں ہے، کیونکہ اس سے بچنا طاقت سے باہر ہے، عینیؒ نے اسے امام محمدؒ کا قول بتلایا ہے، لیکن اظہر یہ ہے کہ اس میں اتفاق ہے کوئی اختلاف نہیں ہے، واللہ اعلم۔م۔

امام شافعیؒ کے نزدیک کسی صورت میں مفسد نہیں ہے۔ع۔ بظاہر مراد یہ ہے کہ بے اختیاری کی صورت ہو یا جس میں حروف پیدا نہ ہوں جس سے دلیل حالت کا اظہار ہو، کیونکہ یہی وجہ بیان ہوئی پس اس طرح عام قول کے مطابق اس مسئلہ میں اتفاق ہوگا۔ محیط السرخسی، اچھی طرح سمجھ لو۔م۔ **وعن ابی یوسفؒ الخ** اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اہ کہنا۔ف۔ الف کو فتحہ اور ہ کو جزم کے ساتھ **لم یفسد الخ** کسی صورت میں مفسد نہیں ہے، خواہ جنت و دوزخ کی یاد کی وجہ سے ہو، یا درد و مصیبت کی

وجہ سے ہو، اور اوہ سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ف۔اس سے بظاہر یہ مراد ہے کہ تکلیف کی حالت میں مفسد ہے، لہٰذا اختلاف صرف اہ،مد کے بغیر میں ہے۔م۔

وقيل الاصل عنده ان الكلمة اذا اشتملت على حرفين، وهما زائدتان او احدهما لاتفسد، وان كانتا اصليتين تفسد، وحروف الزوائد جمعوها في قولهم "اليوم تنساه" وهذا لا يقوى، لان كلام الناس في متفاهم العرف يتبع وجود حروف الهجاء، وافهام المعنى، و يتحقق ذلك في حروف كلها زوائد.

ترجمہ:-اور کہا گیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مذکورہ مسئلہ میں اصل یہ ہے کہ کوئی کلمہ ایسا ہو کہ وہ دو حرفوں سے مرکب ہو اور وہ دونوں یا ان میں سے ایک حرف زائد ہو تو اس کی ادائیگی سے نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر دونوں حرف اصلی ہوں تو نماز فاسد ہو جائے گی زائد حروف وہی ہیں جنہیں لوگوں نے اس جملہ میں اکٹھا کر لیا ہے الیوم تنساہ، مگر یہ اصل قوی نہیں ہے کیونکہ لوگوں کا کلام ہونا عرف کے باہمی سمجھوتہ میں ہے جو ان دو باتوں کے پائے جانے پر موقوف ہے (۱) اس میں حروف ہجا پائے جار ہے ہوں (۲) اس میں معنی سمجھائے جا رہے ہوں اور یہ بات ان حروف میں پائی جاتی ہے جو زائد ہوں۔

توضیح:-حروف زوائد،اور نماز میں ان کے ساتھ کلام کرنا

وقيل الاصل عنده ان الكلمة اذا اشتملت على حرفين، وهما زائدتان او احدهما لاتفسد......الخ

اور کہا گیا ہے امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ بات اصل مانی گئی ہے کہ کوئی کلمہ جو دو حرفوں پر مشتمل ہوں اور وہ دونوں ہی یا ان میں سے کوئی ایک حروف زائد ہوں تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ف۔کیونکہ کلام عرب میں کم سے کم تین حروف اصلی ہوتے ہیں، اور اگر دونوں حروف ہی اصلی ہوں تو وہ دونوں نماز کو فاسد کر دینگے۔ف۔بظاہر اس وجہ سے کہ دو حروف اکثر ہونے کی وجہ سے تین حروف کے قائم مقام ہو جائیں گے، کیونکہ اکثر کل کے قائم مقام ہوتا ہے۔م۔ان زائد حروف کو اہل لغت نے اس جملہ میں جمع کر دیا ہے الیوم تنساہ، (آج کے دن تم اسے بھلا دو گے، الف، لام، ی، و، ہ، ت، ن، س، ا، ہ، ف، اس مجموعہ کو دوسری طرح اور تیسری بھی کہا جا سکتا ہے، مثلاً السمان ہویت خلاصہ یہ ہے مجموعہ کو جس طرح بھی ادا کیا جائے مگر یہ حروف جمع ہونے چاہئے، یہ تو ایک لطیفہ سا ہے، کہ ان کے مجموعہ کو معنے دار جملہ بنا دیا گیا ہے۔

یہ واضح ہو کہ ان حروف کو زوائد کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الحاق اور تضعیف دو موقعوں کے علاوہ جہاں کہیں کسی کلمہ میں حروف اصلیہ پر کوئی زیادتی کی جاتی ہے تو کلام عرب میں تلاش کرنے سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ صرف ان ہی حروف سے زیادتی کی جاتی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ حروف جہاں کہیں پائے جائیں وہ زائد ہی ہونگے، نحویوں نے اس کی تصریح کر دی ہے۔د۔ع۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ اہ کے دونوں حروف چونکہ ان ہی زوائد میں سے ہیں اس لئے یہ نماز کے لئے مفسد نہیں ہوں گے، برخلاف آہ کہنے کے کہ اس میں تین حروف جمع ہو گئے ہیں، اور تین حرفی کلمہ تو مفسد ہوا ہی کرتا ہے جیسا کہ دو حرفی جو کہ اصلی ہوں مفسد ہوتے ہیں، لیکن یہ بات بھی ذہن نشین کرنے کی ہے کہ اجماع اور اتفاق جس اصل پر ہے وہ یہ کہ جو بات لوگوں کے کلام سے ہو جائے اور ان کی گفتگو میں آجاتی ہو وہ مفسد ہوتی ہے، اس بناء پر خاص کر امام ابو یوسفؒ کا بیان کردہ یہ اصل نامناسب ہے، کیونکہ اس قاعدہ سے اجماعی قاعدہ توڑنا پڑتا ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے فرمایا ہے وھذا الخ یعنی یہ کہ اصل قوی نہیں ہوتی ہے۔ف۔یعنی یہ اصل قوی نہیں ہے، اس جملہ کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ بتائی ہوئی وجہوں کے مطابق اسکے معنی قوی نہیں ہیں، اور دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ روایت یا استنباط قوی نہیں ہے۔

لان كلام الناس في متفاهم العرف يتبع وجود حروف الهجاء، وافهام المعنى......الخ

کیونکہ انسانی کلام ہونا۔ف۔یہی چیز یعنی انسانی کلام نص صریح سے مفسد قرار پایا ہے اور یہ انسانی کلام عرف عام میں دو باتوں کے پائے جانے کے تابع ہوتا ہے، (۱) اس میں حروف ہجا پایا جائے۔ف۔یہاں تک کہ اگر مصلی کی آواز میں کوئی حروف ہی نہ ہو تو بالاتفاق کچھ نہیں ہے (۲) معنی سمجھانے کا وجود۔ف۔یعنی جو حرف نکلے اس سے آپس میں کچھ مطلب سمجھ میں آجائے، یہانتک کہ اگر کچھ مفہوم نہ نکلے یا مفہوم ہو مگر باہمی نہ ہو یعنی کسی دوسرے سے اس کو تعلق نہ ہو، مثلاً نمازی نے خود اپنے آپ کو خطاب کیا ہو، باری تعالی کے دربار میں حمد و ثنا یا دعا ہو تو مفسد نماز نہیں ہے، اب جبکہ یہ قاعدہ طے پا گیا کہ منہ سے نکلی ہوئی آواز سے حروف ہجا نکلیں اور ان سے مطلب کا اظہار ہو تو وہ کلام ہے، اس لئے حروف زوائد اور حروف اصلیہ کو اصل ماننا پہلی اصل کو نقصان کرنا لازم آئے گا۔

و يتحقق ذلك فی حروف كلها زوائد......الخ

کیونکہ اصل اول یعنی کلام ہونا ایسے حروف میں محقق ہو جاتا ہے جو سب کے سب زائد ہوں۔ف۔حالانکہ وہ یقیناً انسانی کلام ہوتا ہے لہذا یہ دوسرا اصل باطل ٹھہرا، اس لئے آہ کا مسئلہ اس بناء پر باطل ہے، اس تقریر اور تفصیل سے شارحین نہایہ غایۃ اور درایہ وغیرہ کا اعتراض باطل ہو گیا، ساتھ فتح القدیر کے جواب کی بھی ضرورت نہ رہی۔م۔اگر اپنے گناہوں کی زیادتی کو یاد کر کے تاوہ کیا تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی، اگر روتے ہوئے بغیر آواز کے آنسو بہیں تو بھی فاسد نہ ہوگی، التاتارخانیہ، اگر اخ اخ یعنی نقطہ والے خاء کے ساتھ کہا تو بالاجماع فاسد ہوگی، لیکن آواز اگر سنائی نہیں دی تو فاسد نہ ہوگی البتہ مکروہ ہوگی، کیونکہ یہ کوئی کلام نہیں ہے۔محیط السرخسی۔میں کہتا ہوں کہ یہ قول مختار کے مطابق ہے، کیونکہ جب مصلی نے اس کو ادا کرنے کے واسطے حروف درست کر کے ادا کئے تو امام کرخیؒ کے قول کے مطابق فاسد ہو جائے گی، اور میں مترجم نے جہر و اخفاء کے بیان میں بحث کر کے بتایا ہے کہ کرخیؒ کے قول کی بھی اہمیت ہے، لہذا احتیاط ضروری ہے یہانتک کہ بندہ مترجم کے نزدیک اس نے قصداً منہ سے اسے نکالنا چاہا تو فاسد نہ ہونے پر فتویٰ نہ دیا جائے، اس میں کچھ غور کر لیں۔م۔

نمازی نے سجدہ گاہ کی مٹی کو پھونکا اور اس کے حرف سننے میں نہ آئے تو بالاتفاق نماز فاسد نہ ہوگی۔الذخیرہ۔ع۔جیسے سانس باہر لینا، لیکن عمداً ایسا کرنا مکروہ ہے، اور اگر اسے اس طرح سنا گیا کہ اس میں حروف ہجاء بھی پیدا ہو گئے تو وہ مفسد نماز اور مثل کلام ہے۔الخلاصہ۔یہی قول امام احمدؒ کا ہے، لیکن امام شافعیؒ کے دو قول ہیں، اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ جس نے نماز کی حالت میں نفخ کیا (یعنی پھونکا) تو اس نے کلام کیا، اس کی روایت سعید بن منصور ستہ نے کی ہے، اسی جیسی روایت سعیدؒ بن جبر نے روایت کی ہے، اور محیط میں ہے کہ اگر مصلی نے اف کہا تو امام ابو حنیفہؒ و امام محمدؒ کے نزدیک مفسد ہوگی، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اف اگر تشدید کے ساتھ نہ کہا ہو تو مفسد نہیں ہے، اور تشدید کے ساتھ مفسد ہے، مشائخ کے نزدیک ایسا ہی ہونا چاہئے۔مع۔

وان تنحنح بغير عذر بان لم يكن مدفوعا اليه، وحصل به الحروف، ينبغی ان يفسد عندهما، وان كان بعذر فهو عفو كالعطاس والجشاء اذا حصل به حروف، ومن عطس فقال له آخر: يرحمك الله وهو فی الصلوة، فسدت صلوته، لانه يجری فی مخاطبات الناس، فكان من كلامهم، بخلاف ما اذا قال العاطس او السامع الحمدلله علی ما قالوا، لانه لم يتعارف جوابا.

ترجمہ:-اور اگر بغیر مجبوری کے کھانسا، اس طور پر کہ اس کھانسنے پر مجبور نہ ہو اور اس سے حروف بھی حاصل ہو گئے تو مناسب یہ ہے کہ طرفینؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے، اور اگر یہ کھانسی مجبوری کے ساتھ ہو تو اس کا حکم چھینکنے اور ڈکار لینے کا ہے جبکہ حرف پیدا ہو جائیں، اگر کسی کو چھینک آئی اور دوسرے کسی ایسے شخص نے جو نماز کی حالت میں ہے اس کے جواب میں کہا یرحمک اللہ تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یہ جملہ لوگوں کے خطاب میں مستعمل ہوتا ہے، لہذا انسان کے کلام میں سے

ہو گیا بخلاف اس صورت کے کہ چھینکنے والے نے یا سننے والے نے الحمد اللہ کہا ہو، مشائخ کے کہنے کے مطابق، کیونکہ یہ الحمد اللہ جواب میں متعارف نہیں ہے۔

توضیح:۔ نماز میں تنحنح کرنا، تنحنح کی تعریف، نماز میں چھینکنا، ڈکار لینا، چھینک کا جواب نماز میں

وان تنحنح بغير عذر بان لم يكن مدفوعا اليه، وحصل به الحروف......الخ

اور اگر نمازی نے تنحنح کیا (کھانسا)۔ف۔ تو یہ شرطوں کے ساتھ نماز کو فاسد کر دے گا (ا) یہ کہ بغیر عذر ہو، اس طور سے کہ وہ مدفوع الیہ نہ ہو۔ف۔ یعنی اضطرار اور لاچاری کے طور پر نہ ہو، جس میں انسان بے اختیار ہو جاتا ہو، بلکہ اختیاری طور پر ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ اختیاری کھانسی کرنے کے ساتھ حروف پیدا ہوئے ہوں۔ف۔ یعنی دو حروف یا اس سے بھی زیادہ پائے گئے ہوں، تو ینبغی ان یفسد الخ لائق ہے کہ طرفین یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے۔ف۔ تنحنح کے معنی ہیں اح اح کہنا بے نقطہ کے حاء کے ساتھ۔ع۔ اور اگر اس طرح کھانسنے میں حروف ظاہر نہ ہوں یعنی گلا صاف کرنے کے لئے صرف کھنکھار ہو اور اس میں کوئی حرف نہ نکلا ہو تو بالاتفاق فاسد نہیں ہو گی البتہ مکروہ ہو گی۔البحر۔ یہ احکام اس وقت ہوں گے جبکہ کوئی عذر یا غرض صحیح نہ ہو۔

وان كان بعذر فهو عفو كالعطاس والجشاء اذا حصل به حروف......الخ

اور اگر کھانسی عذر کی وجہ سے ہو۔ف۔ خواہ طبعی عذر ہو کہ بے اختیار طبیعت کھانسنا چاہتی ہو، یا عذر غرض صحیح ہو مثلاً آواز کو درست یا صاف کرنا فھو عفو الخ تو یہ معاف ہے۔ف۔ اگرچہ حروف پیدا ہو گئے ہوں۔ع۔ جیسے چھینک یا ڈکار جبکہ ان میں سے کسی سے بھی حروف پیدا ہو گئے ہوں تو بھی معاف ہے۔ف۔ کیونکہ یہ عذر طبعی ہے۔م۔

آواز صاف کرنے کے لئے کھانسا اگرچہ بھی اس سے حروف پیدا ہو جائیں تو اس سے کوئی نقصان نہ ہو گا، اور یہی صحیح قول ہے، اسی طرح اگر امام نے غلطی کی اور مقتدی نے کھانس دیا تا کہ امام ہوشیار ہو جائے تو اس طرح بھی نماز فاسد نہ ہو گی، اور غایۃ البیان میں ہے کہ اگر نماز میں کسی نے اس لئے کھانسا تا کہ لوگوں کو اور آنے والے کو اس کے نماز کے اندر رہنے کا علم ہو جائے تو اس سے نماز فاسد نہ ہو گی۔التبیین۔فع۔

ومن عطس فقال له آخر: يرحمك الله وهو في الصلوة، فسدت صلوته، لانه يجرى في......الخ

اور کسی کو چھینک آئی اس کے جواب میں نمازی نے کہا یرحمک اللہ تو اس کی نماز فاسد ہو گئی۔ف۔ یہی حکم دونوں محیط میں قول مختار ہے۔ھ۔ لانہ یجری الخ کیونکہ لوگوں کے مخاطبات اور عام گفتگو کے درمیان ایسی گفتگو ہوتی رہتی ہے لہذا وہ جملہ بھی عام لوگوں کے کلام کا حصہ ثابت ہوا۔ف۔ یعنی یرحمک اللہ کے جملہ میں خطاب کا کاف موجود ہے، اور لوگوں کے بول چال میں جاری بھی ہے، اس لئے یہ انسانی کلام تو ہوا، اگرچہ حدیث میں یہ حکم ہے کہ اگر کوئی مسلمان بھائی چھینکنے کے بعد الحمد للہ کہے تو سننے والے مسلمانوں پر اس کا حق ہے کہ اس کے واسطے یرحمک اللہ کہیں۔م۔ اگر نمازی چھینک کر اسی حالت میں خود بھی یرحمک اللہ کہے تو نماز کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔الخلاصہ۔ھ۔ مگر اس میں تامل معلوم ہوتا ہے کہ کیونکہ یہ بھی تو کلام الناس سے ہو گیا، اس لئے مصنفؒ کا کلام مقام غور ہے۔م۔

بخلاف ما اذا قال العاطس او السامع الحمدلله على ما قالوا ، لانه لم يتعارف جوابا......الخ

اس کے برخلاف چھینکنے والے نمازی نے یا سننے والے نمازی نے خود الحمد للہ کہا۔ف۔ تو اس سے نماز فاسد نہ ہو گی، مشائخ کے کہنے کے مطابق، کیونکہ جواب میں الحمد للہ کہنا متعارف نہیں ہے۔ف۔ ابو حنیفہؒ سے محیط میں ایک روایت ہے کہ مصلی نے چھینک کر الحمد للہ کہا، پس اگر صرف دل سے نہیں بلکہ زبان سے بھی کہا ہو تو نماز فاسد ہو گئی، العنایۃ فع۔ اگر مصلی نے الحمد للہ

کہتے ہوئے چھینکنے والے کے جواب کا ارادہ کرلیا یا استفہام کا ارادہ کیا تو صحیح قول یہی ہے کہ نماز فاسد ہوگئی۔ التمر تاشی۔ ھ۔ اگر نمازی نے خود چھینکنے میں الحمدللہ کہا تو نماز فاسد نہ ہوگی مگر فی نفسہ یعنی اس کو اپنے دل میں کہہ لینا چاہئے، یعنی بغیر زبان کے ہلائے ہوئے، ویسے بہتر یہی ہے کہ سکوت اختیار کرے۔ الخلاصہ۔ پھر صحیح یہ ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد کہہ لے، اور اگر مقتدی ہو تو پوشیدہ یا علانیہ کسی طرح سے بھی بالاتفاق نہ کہے۔ التمر تاشی۔ اگر نمازی کو چھینک ہونے پر کسی نے باہر سے یرحمک اللہ کہدیا، یہ سن کر نمازی نے آمین کہی تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ المحیط۔ المنیہ۔ اگر دو نمازیوں میں سے ایک نے چھینک لی اور باہر سے تیسرے شخص نے اسے یرحمک اللہ کہدیا تو چھینکنے والے شخص کی نماز فاسد ہوگئی۔ الظہیریہ۔ القاضی خان۔ اور اگر نمازی کو یرحمک اللہ کہا اور دوسرے نمازی نے آمین کہی تو اس آمین کہنے والے کی نماز کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔ السراج۔ اگر نمازی کو خوش خبری سنائی گئی تو اس نے الحمدللہ کہہ کر جواب دیا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی اور اگر جواب کا ارادہ نہ کیا ہو یہ ظاہر کیا ہو کہ میں نماز کی حالت میں ہوں تو بالاجماع نماز فاسد نہ ہوگی۔ محیط السرخسی۔

وان استفتح ففتح عليه في صلاته تفسد، ومعناه ان يفتح المصلي على غير امامه، لانه تعليم و تعلم، فكان من كلام الناس، ثم شرط التكرار في الاصل، لانه ليس من اعمال الصلوة، فيعفى القليل منه، و لم يشترط في الجامع الصغير، لان الكلام بنفسه قاطع وان قل.

ترجمہ:- اگر تلاوت کرنے والے نے کسی نمازی سے لقمہ چاہا تو اس نے نماز ہی کی حالت میں اسے لقمہ دیا تو اس کی نماز فاسد ہوگئی، اس جملہ کا یہ مطلب ہے کہ نمازی نے اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے کو لقمہ دیا ہو، وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی سکھلانے اور سیکھنے کا عمل ہے، اس طرح لوگوں کے کلام میں سے ہوگیا، پھر امام محمد نے اپنی کتاب الاصل یعنی مبسوط میں تکرار کی شرط لگائی ہے، کیونکہ یہ نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے، لہٰذا ایسا تھوڑا سا عمل معاف سمجھا جائے گا، لیکن جامع صغیر میں اس کی شرط نہیں لگائی ہے، کیونکہ کلام از خود مفسد ہوتا ہے اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔

توضیح:- نماز میں لقمہ غیر کو، مترجم کی طرف سے توضیح، امام کو لقمہ

وان استفتح ففتح عليه في صلاته تفسد......الخ

اگر قرآن شریف کی تلاوت کرنے والا کہیں پر اٹک گیا اور نمازی سے لقمہ چاہا تو اس نے نماز ہی کی حالت میں لقمہ دے دیا، تو اس کی نماز فاسد ہوگئی۔ ف۔ کہ نمازی نے اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے کو لقمہ دیا۔ ف۔ کیونکہ اس میں امام کو لقمہ دینا نہیں پایا گیا کیونکہ جائز صورت یہی ہے اس لئے غیر کو لقمہ دینے سے ہی نماز فاسد ہو جائے گی۔

ومعناه ان يفتح المصلي على غير امامه، لانه تعليم و تعلم......الخ

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ نمازی نے اپنے امام کے علاوہ کسی دوسرے کو لقمہ دیا ہو، ف۔ کیونکہ اس میں امام کو لقمہ دینا نہیں پایا گیا کیونکہ جائز صورت یہی ہے اس لئے غیر کو لقمہ دینے سے ہی نماز فاسد ہو جائے گی لانہ تعلیم الخ کیونکہ یہ سکھلانا اور سیکھنا ہے۔ ف۔ گویا نمازی نے سکھلایا اور لقمہ چاہنے والے نے سیکھا، اس لئے یہ انسانی کلام میں سے شمار ہوگا۔ ف۔ اور ممکن ہے کہ یہ عمل کثیر میں سے شمار ہو جائے، تو بھی مفسد ہوگا، اور شاید کہ اسی وجہ سے ایک مرتبہ کو عمل قلیل اور مکرر کرنے کو عمل کثیر قرار دیا ہے، اسی لئے مصنفؒ نے کہا ثم شرط الخ امام محمدؒ نے اصل یعنی مبسوط میں اس فعل کا مکرر ہونا شرط کیا ہے، یعنی جب مکرر واقع ہو تو مفسد ہے، کیونکہ یہ فعل نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے، اس لئے اس میں تھوڑا عمل معاف ہوگا۔ ف۔ اور ایک بار ایسا کرنا قلیل عمل ہے۔

و لم يشترط في الجامع الصغير، لان الكلام بنفسه قاطع وان قل......الخ

لیکن الجامع الصغیر میں تکرار کی شرط نہیں لگائی ہے، کیونکہ کلام تو خود ہی مفسد ہوتا ہے، اگرچہ تھوڑا ہی ہو۔ف۔ یہی اصل قول ہے، القاضی خان، یہی صحیح ہے، الفتح، میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنفؒ نے خود کسی قول کو بھی ترجیح نہیں دی ہے، لیکن اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مبسوط کی روایت میں فعل کثیر ہونے کی بناء پر عمل کو مفسد قرار دیا ہے، اور یہ عمل مکرر ہونے کے بعد کثیر ہوگا، اور جامع صغیر میں جو علت بیان کی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ فعل نہیں بلکہ قول ہے اور کلام، اور کلام تو قلیل ہونے کی صورت میں بھی مفسد ہوتا ہے، میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ لقمہ دینے والے اور لقمہ لینے والے نے صرف قرآن پڑھا ہے اور یہ کسی حالت میں بھی کلام الناس نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ بلا شبہ کلام الٰہی ہے، اس کے باوجود اس کی یہ توجیہ کرنی کہ تعلیم و تعلم کی وجہ سے انسانی کلام ہو گیا ہے، عقل سے بہت بعید ہے، البتہ یہ توجیہ کی جاسکتی ہے کہ جب سیکھنا اور سکھانا ہی مقصود ہو گیا تو وہ قرآن کی تلاوت نہ رہا بلکہ نماز میں ایک ایسا عمل پایا گیا جو نماز کے افعال میں سے نہیں ہے، اس لئے اس کے مفسد ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ فعل کثیر ہو یعنی بار بار ہوا ہو، لیکن جامع صغیر میں یہ شرط نہیں لگائی گئی ہے، اس بناء پر اسی اصل پر محمول کرنا چاہئے، پس قاضی خان نے اگرچہ جامع صغیر کی روایت کو اصح کہا ہے لیکن وہ محل تامل ہے، جیسا کہ ابھی تم نے سمجھ لیا ہے، اور اب اچھی طرح سمجھ لو۔م۔

اگر لقمہ دینے والے نے تعلیم کا ارادہ نہیں کیا بلکہ تلاوت کا ارادہ ہی باقی رکھا تو وہ مفسد نہیں ہے، جیسا کہ محیط السرخسی میں ہے۔ھ۔ اگر لقمہ کی آیت مکمل ہونے سے پہلے ہی لقمہ لینے والے کو وہ یاد آجائے اور تلاوت شروع بھی کر دے تو اس کی نماز بھی فاسد نہ ہوگی، کیونکہ لقمہ مکمل ہونے کے بعد یاد آنے سے بھی لقمہ ہی کی طرف منسوب ہوگا، قریب البلوغ کا لقمہ بھی بالغ کے لقمہ کے حکم میں ہے، البحو۔ بحوالہ قنیہ۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تعلیم و تعلم کی غرض سے لقمہ دینا اگرچہ کلام انسان نہیں ہے بلکہ قرآن ہی ہے، لیکن یہ فعل مفسد ہے، اس لئے فعل کثیر ہو کر مفسد ہوگا اور فعل کثیر ہونے کے لئے مکرر ہونا شرط ہے، اور اگر اسے کلام مان لیا جائے تو تھوڑا سا کلام بھی مفسد ہوگا، لیکن اس صورت میں قرآن کو کلام الناس قرار دینا بہت ہی تکلیف ہے۔م۔ اگر نماز کے باہر سے کسی نے مصلی کو لقمہ دیا اور اس نے اسے قبول کر لیا تو مصلی کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ المنیہ۔ اگر کوئی کسی بالغ کو نماز سکھاتا ہو تو سیکھنے والے کو چاہئے کہ وہ فرض نمازوں کو امام کے ساتھ بغیر قرأت کے یا تنہا ہی پڑھ لے، اس سے فارغ ہونے کے بعد کوئی اسے کھڑا کر کے نماز سکھلا دے، کیونکہ فرائض کو اس طرح سیکھتے ہوئے پڑھنے سے وہ فاسد ہو جائے گی۔م۔

وان فتح على امامه لم يكن كلاما استحسانا، لانه مضطر الى اصلاح صلاته، فكان هذا من اعمال صلاته معنى، وينوى الفتح امامه دون القراء ة هو الصحيح لانه مرخص فيه و قراء ته ممنوع عنها.

ترجمہ:- اور اگر مقتدی نے اپنے ہی امام کو لقمہ دیا تو استحساناً یہ کلام نہیں مانا جائے گا، کیونکہ مقتدی اپنی نماز کی اصلاح کے لئے اس بات پر مجبور ہے، لہٰذا یہ عمل معنی نماز کے اعمال میں سے ہو جائے گا، اور اس وقت لقمہ دینے والا صرف اپنے امام کو لقمہ دینے کی نیت کرے، قراءت کی نیت نہ کرے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ اسی بات کی اسے رخصت دی گئی ہے جبکہ اس قراءت سے نماز میں منع کیا گیا ہے۔

توضیح:- اپنے امام کو لقمہ دینا، لقمہ کی نیت

وان فتح على امامه لم يكن كلاما استحسانا، لانه مضطر الى اصلاح صلاته......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے استحسانا الخ یعنی لقمہ کے اس عمل کو استحساناً کلام نہیں مانا جائے گا۔ف۔ ورنہ قیاس کا تو تقاضا یہ ہے کہ عمل بھی کلام ہو جائے، مگر قیاس کو ترک کر دیا گیا۔م۔ لانه مضطر الخ ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ اور

نماز کا کوئی عمل بھی نماز کو فاسد نہیں کرتا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے اسی حالت میں آپؐ کو قرأت میں اشتباہ پیدا ہو گیا، پھر جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت ابی بن کعب کو مخاطب کر کے آپ نے فرمایا کیا آپ ہمارے ساتھ نماز میں تھے، انہوں نے عرض کیا جی ہاں میں موجود تھا، اس پر آپ نے فرمایا کہ آپ نے مجھے لقمہ کیوں نہیں دیا، اس کی روایت ابوداؤد اور ابن حبان نے کی ہے، اور حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اپنے اماموں کو لقمہ دیا کرتے تھے، حاکم نے اس کی روایت کی ہے، حضرت علیؓ نے فرمایا ہے کہ امام جب لقمہ چاہے تو تم اسے کھلادو، حسن اور ابن سیرین عطاءؒ سے جائز ہونا مذکور ہے، اور نافعؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے ہمیں نماز پڑھائی تو تردود میں پڑ گئے اس لئے میں نے لقمہ دیا تو انہوں نے اسے قبول کر لیا، جیسا کہ مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ مع۔

صحیح میں ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز میں کوئی آیت بھول گئے تو فراغت کے بعد فرمایا کہ تم نے مجھے لقمہ کیوں نہیں دیا، عینیؒ وغیرہ نے لکھا ہے کہ قیاس تو یہ تھا کہ لقمہ نماز کے لئے مفسد ہو کیونکہ لقمہ دینا گویا یہ قول ہے کہ آپ جب یہاں تک پہونچ چکے ہیں تو اس کے بعد اب یہ آیت ہے، پس جبکہ یہ قول مفسد نماز ہے تو لقمہ بھی جو اسی معنی میں ہے اسے بھی مفسد ہونا چاہئے، لیکن حضرت ابن عمرؓ کی حدیث کی موجودگی کی وجہ سے ہم نے لقمہ کو جائز کہتے ہوئے قیاس کو چھوڑ دیا، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ مشکل مسئلہ ہے کیونکہ نماز تمام اذکار کی دو دو جہتیں ہیں، اسی لئے قرآن کریم عین کلام الٰہی ہے، اور لقمہ دینا ایک فعل ہے کہ قرآن کو اس طرح پڑھو، اس لئے اولیٰ یہی ہے کہ یہی فعل کثیر ہے جامع صغیر کی روایت کے مطابق لیکن مبسوط کی روایت کے مطابق قلیل ہے، اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔

الحاصل نصوص کثیرہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مقتدی کے لئے یہ بات جائز ہے کہ اپنے امام کو لقمہ دے بلکہ اس بات کا اسے حکم بھی دیا گیا ہے وینوی الخ البتہ مقتدی اپنے امام کو اپنا لقمہ دیتے وقت صرف یہ نیت کرے کہ اپنے امام کی رکاوٹ دور کرنی ہے، قراءت قرآن کی نیت نہ کرے، ف۔ اگرچہ آیت پڑھ کر ہی اصلاح ہو، الصحیح الخ یہی قول صحیح ہے۔ ف۔ اور اسی کو کافی میں اختیار کیا ہے لأنہ الخ کیونکہ لقمہ دینا ایک ایسا فعل ہے جس کی اجازت دی گئی ہے، اور مقتدی کے لئے تلاوت قرآن ایک ایسا فعل ہے جسے منع کیا گیا ہے۔

ف۔ اس کے برعکس اگر ہم یہ کہتے کہ مقتدی قراءت کی نیت کرے تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ نص قطعی کے ذریعہ مقتدی کو قراءت سے منع کیا گیا ہے، اور ایک خبر واحد سے تم اسے جائز قرار دیتے ہو، اس طرح تو اس کی معارض نہ ہوگی، اسی وجہ سے ہم نے لقمہ دینے کی اجازت کا ثبوت حاصل کر لیا، اور اسی وجہ سے اس کی صحیح ہونے کو کہا گیا ہے کہ یہی صحیح ہے، اور چونکہ ایک ضرورت یعنی اپنے امام کی قراءت کی رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے خلاف قیاس اسے جائز قرار دیا گیا ہے اس لئے ضرورت تک ہی اس کی اجازت رہے گی یعنی ہر کس وناکس کو لقمہ دینا جائز نہیں سمجھا جائے گا، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا۔

ولو كان الامام انتقل الى آية اخرى، تفسد صلوة الفاتح، وتفسد صلوة الامام لو اخذ بقوله لوجود التلقين والتلقن من غير ضرورة، و ينبغى للمقتدى ان لايعجل بالفتح، وللامام ان لايلجئهم اليه، بل يركع اذا جاء اوانه، او ينتقل الى اية اخرى.

ترجمہ:- اور اگر امام دوسری آیت کی طرف منتقل ہو چکا ہو تو لقمہ دینے والے کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر امام نے اس کا لقمہ قبول کر لیا ہو تو اس امام کی بھی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ موجودہ صورت مقتدی کی طرف سے تلقین (سکھانا) اور امام کی طرف سے تلقین سیکھنا پایا گیا اور وہ بھی بلا ضرورت، اور مقتدی کے لئے یہ بات مناسب ہے کہ لقمہ دینے میں جلد بازی نہ کرے، اسی طرح امام کو چاہئے، کہ بلا ضرورت اپنے مقتدی کو لقمہ دینے پر مجبور نہ کرے، بلکہ رکوع کر لے، یا دوسرے آیت کی طرف منتقل ہو جائے (اور پڑھنے لگے)۔

توضیح:-لقمہ دینے میں جلد بازی نہ کرنا، بلکہ توقف سے کام لینا

ولو كان الامام انتقل الى آية اخرى، تفسد صلوة الفاتح......الخ

اگر امام دوسری آیت کی طرف منتقل ہو چکا تھا۔ف۔یعنی جس جگہ پر وہ اٹکا تھااس سے آگے نہ بڑھ سکنے کی وجہ سے دوسری جگہ سے پڑھنا شروع کر دیا،اس کے بعد مقتدی نے پہلی ہی آیت کی اصلاح کے لقمہ دے دیا تو لقمہ دینے والے کی نماز فاسد ہو جائے گی،اور اگر امام نے بھی اس کا لقمہ قبول کر لیا تو امام کی بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ف۔اور امام کی نماز فاسد ہونے کی وجہ سے سارے نمازیوں کی نماز فاسد ہو جائے گی"اس کا لقمہ قبول کر لیا" اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ لقمہ اس وقت بمنزلہ قول کے ہو گیا ہے،اس لئے نماز فاسد ہو گی۔

لوجود التلقين والتلقن من غير ضرورة......الخ

کیونکہ مقتدی کا لقمہ دینا اور امام کا لقمہ لینا یہاں بلاضرورت ہے۔ف۔اس لئے استحسان نہ رہا بلکہ قیاس کے مطابق وہ مفسد ہوا ہے، قابل لحاظ ہے یہ بات کہ دلیل مذکور اسی کی تائید کرتی ہے، کیونکہ اتنی قرات کر لینے کے بعد کہ جس سے نماز جائز ہو جائے یا دوسری آیت کی طرف منتقل ہونے کے بعد لقمہ دینے کی کوئی ضرورت باقی نہیں تھی، البتہ اگر بیان کی ہوئی دلیل چھوڑ دی جائے اور یہ کہا جائے کہ قول کی وجہ سے نماز فاسد نہ ہو بلکہ فعل کی وجہ سے فاسد ہو، اور چونکہ یہ فعل صرف ایک بار پایا گیا ہے جو قلیل ہونے کی وجہ سے مفسد نہ ہو، اور لقمہ دینے کے ثبوت کی حدیث سے بھی مطلقاً جواز سمجھا جاتا ہے، اسی لئے محیط میں کہا ہے کہ عامہ مشائخ کے نزدیک لقمہ دینے والے مقتدی اور لینے والے امام کی بھی نماز کسی حال میں فاسد نہ ہو گی، جیسا کہ عینی اور فتح القدیر میں ہے، اور کافی میں ہے کہ صحیح یہ ہے کہ لقمہ دینے والے کی نماز کسی حالت میں فاسد نہیں ہو گی اسی طرح اگر امام نے لقمہ لے لیا تو بھی صحیح قول کے مطابق اس کی نماز فاسد نہ ہو گی۔ھ۔اور قاضی خان و جامع تمرتاشی میں بھی اسی قول کو صحیح کہا ہے، جیسا کہ عینی میں ہے، اور غور کرنے والے کے لئے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مؤید ہے کیونکہ اصل مسئلہ میں مبسوط کی تعلیل قوی ہے، اور وہ قوی نہیں ہے جو جامع صغیر میں بیان کی گئی ہے، اچھی طرح سمجھ لیں۔م۔

و ينبغي للمقتدى ان لايعجل بالفتح، وللامام ان لايلجئهم اليه......الخ

اور مقتدی کو چاہئے کہ لقمہ دینے میں جلد بازی نہ کرے یعنی فوراً لقمہ نہ دے۔کیونکہ ممکن ہے کہ امام کو خود اسی وقت یاد آجائے، اس طرح بے ضرورت امام کے پیچھے قرآت تلاوت کرنے والا ہو جائے۔محیط السرخسی۔وللامام الخ اسی طرح امام کو بھی چاہئے کہ مقتدیوں کو لقمہ دینے پر مجبور نہ کرے۔ف۔اس طرح سے کہ بار بار اسی بھولی ہوئی آیت کو دہرانے لگے، یا خاموش کھڑا رہ جائے۔نفع۔کیونکہ اس طرح وہ امام ان کو پیچھے پڑھنے پر مجبور کرے گا، حالانکہ ایسا کرنا مکروہ ہے۔الکافی۔

بل يركع اذا جاء اوانه، او ينتقل الى اية اخرى......الخ

بلکہ جب اس کا وقت آگیا ہو رکوع کر دے۔ف۔یعنی اس قدر پڑھ چکا ہو جس سے نماز جائز ہو جاتی ہے۔الکافی۔اور وہ مقدار بقول امام اعظم ایک آیت اور بقول صاحبین اور مفتی بہ تین آیتیں ہیں، اور بعض روایتوں میں مستحب قراءت کا اعتبار ہے۔الکافی۔العینی۔لیکن قول اصح واللہ اعلم مقدار واجب ہے، اور وہ پوری سورہ فاتحہ اور اس کے علاوہ تین آیتیں ہیں کیونکہ لقمہ میں کوئی کراہت تحریمی نہیں ہے، بخلاف ترک واجب کے کہ وہ مکروہ تحریمی ہے، چونکہ اس موقع کی روایتیں مختلف ہیں اسی لئے مصنفؒ نے تفصیل سے کام نہیں لیا بلکہ "جب وقت آگیا ہو" کہہ کر اجمال سے کام لیا، اور اگر اتنی مقدار بھی نہیں ہو سکی اور امام کو اشتباہ ہو گیا تو اس کے متعلق لکھا ہے کہ او ینتقل الخ یا امام دوسری آیت کی طرف منتقل ہو جائے۔

ف۔یعنی جس آیت پر اشتباہ ہوا ہو اسے چھوڑ کر دوسری آیت سے شروع کر دے، یہانتک کہ قرآن میں سے اس کے بعد

کسی جگہ سے بھی پڑھ دے، بہر حال اپنے مقتدیوں کو لقمہ دینے پر مجبور نہ کرے، کافی میں اسی قول کو پسند کیا ہے،، کیونکہ لقمہ دینے میں بظاہر سیکھنے اور سکھانے کی ہی صورت ہو جاتی ہے، اس لئے اس میں کراہت ہے، یعنی کراہت تنزیہی ہے۔ المحیط۔ قاضی خان۔ التمر تاشی۔ ع۔ اگر امام نے جماعت کے علاوہ کسی اور شخص کا لقمہ قبول کر لیا تو سب کی نماز فاسد ہو گئی، اگر مقتدی نے باہر کے کسی آدمی سے سن کر امام کو لقمہ دیا تو بھی سب کی نماز فاسد ہونی چاہئے، بشرطیکہ امام نے بھی اسے قبول کر لیا ہو، البحر عن القنیہ۔

فلو اجاب فی الصلوة رجلا بلا اله الا الله فهذا كلام مفسد عند ابی حنيفة و محمد و قال ابويوسفؒ لايكون مفسد او هذا الخلاف فيما اذا اراد به جوابه له انه ثناء بصيغته فلا يتغير بعزيمته ولهما انه اخرج الكلام مخرج الجواب وهو يحتملة فيجعل جوابا كالتشميت والاسترجاع على الخلاف فی الصحيح.

ترجمہ:-اگر کسی نمازی نے اپنی نماز میں کسی شخص کو لا الہ الا اللہ کہہ کر جواب دیا تو یہ کلام نماز کو فاسد کر دے گا، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک، لیکن امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ یہ مفسد نہیں ہو گا یہ اختلاف اس صورت میں ہو گا جبکہ اس نے دوسرے کو جواب دینے کا ارادہ کیا ہو، امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ کلمہ اپنی وضع کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کے لئے ہے، اس لئے نمازی کے صرف ارادہ کی وجہ سے نہیں بدلے گا، اور طرفینؒ کی دلیل یہ ہے کہ نمازی نے اس کلمہ کو جواب کے موقع میں استعمال کیا ہے ساتھ ہی یہ کلمہ جواب کا احتمال بھی رکھتا ہے، اس لئے اسے جواب ہی کا حکم دیا جائے گا، جیسے کہ چھینک کا جواب ہوتا ہے، اور انا للہ وانا الیہ راجعون کے کہنے میں بھی صحیح قول کے مطابق یہی اختلاف ہے۔

توضیح:-نماز میں لا الہ الا اللہ و سبحان اللہ واللہ اکبر وغیرہ کہنا، دلائل حنفیہ وشافعیہ، توضیح مترجم، نمازی نے دوسرے کا حکم مانا، قرآن مجید کے نظم کلام بقصد اشعار، نماز میں شعر، یا خطبہ نماز میں فکر

فلو اجاب فی الصلوة رجلا بلا اله الا الله فهذا كلام مفسد عند ابی حنيفة و محمد......الخ

اگر نمازی نے دوسرے کے سوال کے جواب میں لا الہ الا اللہ کہا۔ف۔یا کسی کو کوئی اچھی خبر سنائی گئی اور اس نے نماز میں کہا سبحان اللہ یا اللہ اکبر، پس اگر اس کلام سے جواب کا ارادہ نہیں کیا بلکہ حمد کا ارادہ کیا یا اپنی نماز میں ہونے کا اظہار کیا تو بالاتفاق اس سے نماز فاسد نہیں ہو گی، اور اگر اس نے جواب کا ارادہ کیا تو یہ کلام امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک نماز کو فاسد کر دے گا۔ف۔ایسا ہی الخلاصہ میں ہے۔ھ۔

وقال ابويوسفؒ لايكون مفسد او هذا الخلاف فيما اذا اراد به جوابه......الخ

اور امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے۔ف۔اور امام شافعیؒ نے بھی۔ع۔ھ۔کہ اس سے نماز فاسد نہ ہو گی، **وهذا الخلاف الخ** اور یہ اختلاف اسی صورت میں ہے کہ اس کلام سے نمازی نے کہنے والے کے جواب کا ارادہ کیا ہو، **له انه الخ** امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ یہ صیغہ یعنی لا الہ الا اللہ اور اس کے جیسے دوسرے جملے اپنے صیغے اپنی وضع میں خدا کی تعریف کے لئے ہے، اس بناء پر مصلی نے جو کچھ دوسری باتوں کی اس میں نیت کر لی ہے اس نیت سے وہ متغیر نہ ہو گا۔ف۔یعنی یہ کلمہ اور اس جیسے دوسرے کلمہ سب اصل وضع کے معنی میں رہیں گے اور نمازی نے اگر ان سے جواب کا ارادہ کر لیا تو اس ارادہ کی وجہ سے ثناء کے معنی سے نہیں بدلے گا اور نماز میں اللہ کی تعریف کر لینے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے۔م۔ع۔

ولهما انه اخرج الكلام مخرج الجواب وهو يحتملة فيجعل جوابا كالتشميت والاسترجاع......الخ

اور طرفین یعنی امام اعظمؒ و امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ نمازی نے لا الہ الا اللہ وغیرہ کلمات کو جواب کے طور پر استعمال کیا ہے، **وهو يحتملة الخ** اور یہ جملہ اس کا احتمال بھی رکھتا ہے، لہذا اسے جواب ہی مان لیا جائے گا۔ف۔یہاں تک کہ اگر اس جملہ میں جواب بننے کی صلاحیت نہ ہوتی اور کوئی دوسرا سوال و جواب اس پر صادق آسکتا ہے تب نماز کو فاسد نہ کرتا، جیسا کہ بعض حواشی

میں ہے، اس جملہ کی توضیح یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ ثناء یعنی اللہ کی تعریف کا کلمہ ہے، اور اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیا کوئی معبود ہے یا اللہ کے ماسوا کوئی اور معبود ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا لا الہ الا اللہ، تو جب یہ ایک کلمہ دو معنوں ثناء اور توحید میں مشترک ہوا تو اس موقع پر کسی قرینہ سے ہی ایک معنی کرنا واجب ہوا، اس بناء پر ہم نے اس کے قلبی ارادہ کو قابل ترجیح سمجھ کر کلمہ کو جواب ہونے کا فیصلہ کیا، لہذا یہ کلام صرف جواب بنا اور نماز میں سوال وجواب نماز کے لئے مفسد ہی ہوتا ہے۔ مع۔

کالتشمیت والاسترجاع علی الخلاف فی الصحیح......الخ

جیسے چھینک کا جواب۔ف۔ یعنی یرحمک اللہ، چونکہ جواب ہے اس لئے یہ انسانی کلام میں داخل ہو گیا، اگرچہ یہ اصل میں ذکر الٰہی ہے۔ع۔ تو جس طرح چھینک کا جواب نماز کو فاسد کرتا ہے، اسی طرح جواب لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ اور اللہ اکبر بھی فاسد کر دیتے ہیں۔م۔ والاسترجاع الخ اور استرجاع بھی صحیح روایت کے مطابق اسی اختلاف کے مطابق ہے۔ف۔ مصیبت کی خبر کا جواب اس آیت یعنی انا للہ و انا الیہ راجعون سے یعنی امام ابو یوسفؒ کے نزدیک مفسد ہے۔عنایہ۔ صدر شہیدؒ نے کہا ہے کہ یہی ظاہر ہے۔الخلاصہ۔ اگر یہ کہا جائے کہ ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابن مسعودؓ نے داخلہ کی اجازت چاہی اس وقت جبکہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے تو اس وقت آپ ﷺ نے یہ تلاوت فرمائی ادخلوھا بسلام آمنین، شمس الائمہ سرخسیؒ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ شاید پہلے سے تلاوت کرتے ہوئے اس آیت پر پہونچے، تو آپ نے یہ آیت زور سے تلاوت فرمادی ہو تاکہ آپ کا نماز کی حالت میں ہونا معلوم ہو جائے، یا آپ نے نماز کا اظہار کرنے کو پڑھی ہو۔ مع۔

اس مترجم کے نزدیک جب حدیث ہو تو جواب کی ضرورت ہے ورنہ نہیں۔م۔ اگر یحییٰ نامی طالب علم کو کتاب دینا مقصود ہو اور اسی ارادہ سے نماز میں یہ پڑھ دیا یٰیَحْیٰی خُذِ الْکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ تو نماز فاسد ہو جائے گی، جیسے یوسف نام کو یہ فرمان الٰہی پڑھ دیا یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ ھٰذَا تو ان صورتوں میں نماز فاسد ہو جائے گی، اگر کسی قسم کی دعا پر مصلی نے آمین کہی تو بھی نماز فاسد ہو جائے گی۔ مع۔ اگر بچھو نے کاٹا یا کوئی چھت سے گرا تو مصلی نے کہا بسم اللہ تو نماز فاسد نہ ہوگی اور اسی پر فتویٰ ہے، البحر عن النصاب، اسی طرح اگر کوئی ہولناک بات پر تسبیح یا تہلیل یا انا للہ کہا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ع۔

اگر نمازی نے چاند دیکھ کر کہا ربی و ربک اللہ، تو طرفین کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، اگر قرآن میں کسی آیت وغیرہ کو آپنے آپ کو بخار وغیرہ سے پناہ لینے کے لئے پڑھا تو بالاجماع نماز فاسد ہوگی۔الظہیریہ۔ بیمار نے نماز میں ہر جھکتے اور اٹھتے وقت تکلیف کی وجہ سے کہا بسم اللہ، تو نماز فاسد نہیں ہوگی، اور اسی پر فتویٰ ہے۔المضمرات۔ شرح جامع صغیر صدر الشہید کی کتاب میں ہے کہ اگر انا للہ وانا الیہ راجعون سے جواب کا ارادہ کیا ہو تو بالاتفاق نماز فاسد ہو جائے گی، اگر اللھم صلی علی محمد یا اللہ اکبر کہنے سے جواب کا ارادہ نہیں کیا تو بالاجماع نماز فاسد نہ ہوگی، اگر نماز میں رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا اگر اس سے جواب مقصود نہ ہو تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر جواب کا ارادہ ہو مثلاً کسی نے رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک لیا تب نمازی نے اس کے جواب میں درود پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اگر کسی نے یہ آیت ﴿مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ﴾ الآیۃ پڑھی، اور نمازی نے نماز میں درود پڑھی تو فاسد نہ ہوگی، اگر قرآن سے کسی نے شیطان کا ذکر پڑھا اور مصلی نے نماز میں شیطان پر لعنت بھیجی یعنی قرآن میں جس طرح پر مذکور ہے، تو نماز فاسد ہوگی اور اسی پر فتویٰ ہے الخلاصہ۔ اگر ایک شخص نے اللہ تعالیٰ کا نام لیا اور نمازی نے جواب میں عزوجل کہدیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔د۔ الحاصل کوئی بھی ایسا قول جو اگرچہ قرآن کی آیت ہو جب اس سے جواب مقصود ہوگا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ت۔ ان جیسے تمام مسائل میں امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کا قول صحیح ہے۔العینی۔

اگر نمازی نے نماز کی حالت میں کسی دوسرے کا حکم مانا جیسا کہ اس سے کہا گیا کہ آگے کی طرف بڑھو اور وہ بڑھ گیا، یا صف کی خالی جگہ میں کوئی آیا اور نمازی نے اسے جگہ دیدی، تو نماز فاسد ہو جائے گی، اس لئے اسے یہ چاہئے کہ تھوڑا ٹھہر کر اپنے ارادہ سے

آگے بڑھے۔ جامع الرموز عن القنیہ۔ د۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے پہلے امامت کی بحث میں گذرا ہے کہ صف کے پیچھے کھڑا ہونا مکروہ ہے اس لئے چاہئے کہ کسی شخص کو کھینچ کر اس جگہ لے آئے یا امام خود آگے بڑھ جائے جبکہ دوسرا مقتدی آجائے تو سب اپنے اختیار پر ہے، اور جگہ دینا اصلاح نماز کے لئے ہے، پس اصل بات یہ ہے کہ نماز کی اصلاح کے لئے جو کام ثابت شدہ ہیں ان میں در حقیقت شارع علیہ السلام کی فرماں برداری ہوتی ہے، یہانتک کہ صف کی خالی جگہ کو بھرنا، اور صف والوں کے لئے اپنے بازوؤں کو نرم اور متواضع رکھنا کسی طرح مفسد نماز نہیں ہے، ان کے علاوہ البتہ نماز کی حالت میں کسی کی فرماں برداری جائز نہیں ہے، اسے سمجھ کر یاد کر لو۔ م۔
اگر کسی آیت کریمہ کو بقصد شعر پڑھا تو نماز فاسد ہو گی۔ محیط السرخسی۔ اگر نماز کے دوران کوئی شعر یا خطبہ بنایا مگر زبان سے ادا نہیں کیا تو نماز فاسد نہ ہو گی پھر بھی اسنے برا کیا۔ المنیہ۔ اگر خاص فکر کرنے سے کوئی حدیث یاد آئی یا کوئی مسئلہ یاد کیا یا شعر یاد کیا تو نماز مکروہ ہو گی مگر نماز فاسد نہ ہو گی۔ السراج۔ مذہب حنبلیہ کی مشہور کتاب شیخ ابراہیم مطلوبہ مصر میں ہے کہ ہمارے مشائخ میں سے حضرت غوث اعظم السید عبد القادر جیلانیؒ نے کہا ہے کہ نماز کا ایک خاص رکن استحضار کلی اور خشوع قلبی بھی ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ صحیح احادیث سے بھی یہی ثابت ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔
خلاصہ بحث یہ ہوا کہ قرآن کے الفاظ یا ثناء ہیں جب ان میں خطاب کا حرف ہو تو اس سے بالاتفاق نماز فاسد ہو گی، اور جب حرف خطاب نہ ہو اور اس سے جواب کا قصد کیا ہو تو امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ کے نزدیک مفسد نماز ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرآن ہونے یا ثناء ہونے سے جواب کا قصد بھی اسے متغیر نہ کرے گا اس لئے نماز کے لئے مفسد نہ ہو گا، یہی اختلاف انا للہ وانا الیہ راجعون میں بھی ہے۔

وان اراد به اعلامه انه فی الصلوة لم تفسد بالاجماع لقوله علیه السلام اذا نابت احدکم نائبة فی الصلوة فلیسبح.

ترجمہ:- اور اگر ثناء وغیرہ سے دوسروں کو یہ بتلانے کا ارادہ کیا ہو کہ وہ نماز میں ہے تو بالاتفاق نماز فاسد نہ ہو گی کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب نماز کی حالت میں کسی کے سامنے کوئی خاص واقعہ پیش آجائے تو تسبیح کر لے۔

توضیح:- اگر ثنا یا قرآن پڑھنا نماز پڑھنے کی اطلاع دینے کے لئے ہو، حدیث سے دلیل، قعدہ اولیٰ کے بغیر تیسری رکعت، مصلی کے سامنے عورت کا آنا اور اس کو روکنا، نماز کی حالت میں اذان کا جواب دینا، نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا، ہاں، یا نعم وغیرہ کی عادت نماز میں، فارسی میں دعا و تسبیح، نماز میں احرام کی حالت اور لبیک کہنا، نماز میں اذان، لاحول ولا قوة الا باللہ، آخر نماز میں تشہد بھولنا، اور سلام پھیر کر پڑھنا، پھر قبل تمام سلام، فاتحہ اور سورہ کو بھولنا، اور رکوع میں یاد آنا، قراءت کے لئے اٹھنے کے بعد سجدہ کرنا، مرض کی تکلیف میں بسم اللہ کہنا، امام کے علاوہ دوسرے کی دعا پر آمین کہنا

وان اراد به اعلامه انه فی الصلوة لم تفسد بالاجماع......الخ

یعنی کلمہ ثناء یا قرآن پڑھنے سے اگر غیر کو یہ بتلانے کا ارادہ کیا ہو کہ میں نماز میں ہوں۔ ف۔ یعنی غیر کے جواب کا ارادہ نہیں کیا ہو، تو بالاتفاق نماز فاسد نہیں ہو گی، **لقوله علیه السلام الخ** اس حدیث کی وجہ سے کہ جب نماز میں تم میں سے کسی کو کوئی واقعہ پیش آئے تو چاہئے کہ تسبیح پڑھ دے۔ ف۔ یہ حدیث صحاح ستہ میں ہے، اور حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ مردوں کے لئے تسبیح اور عورتوں کے لئے تصفیق ہے، اسی لئے شیخ ابن العربی مالکیؒ نے امام مالکؒ کے اس قول کو کہ ہر مرد و عورت دونوں کو

تسبیح پڑھنا چاہئے رد کر دیا ہے، کہ اصح واعلیٰ حدیث کے یہ مخالف ہے، خطابیؒ نے کہا ہے کہ تحقیق یہ ہے کہ عورت اپنے دائیں ہاتھ کو ہتھیلی کی طرف سے بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے، محیط میں ہے کہ اگر نمازی سے کسی نے آنے کی اجازت چاہی پس اس نے تسبیح پڑھ دی تاکہ اسے اس بات کی خبر ہو جائے کہ وہ نماز میں ہے تو نماز میں کچھ بھی خرابی نہیں آئے گی، واقعات میں ہے کہ تکبیر کا حکم یہی ہے، لیکن تسبیح پڑھنا مستحب ہے۔ ع۔ فی البحر۔

اگر امام قعدہ کئے بغیر تیسری رکعت کے لئے اتنا کھڑا ہو جائے کہ قیام سے زیادہ اقرب ہو تو مقتدی کو تسبیح نہیں کہنی چاہئے کیونکہ بے فائدہ ہو گا۔ البدائع۔ سامنے سے عورت نے گذرنا چاہا تو نمازی نے سبحان اللہ کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو نماز فاسد نہیں ہوئی، لیکن تسبیح اور اشارہ دونوں نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ایک ہی کافی ہے۔ المحیط۔ جواب دینے کے ارادہ سے یا بغیر کسی نیت کے موذن کا جواب دیا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر یہ ارادہ کیا کہ جواب نہیں ہے تو فاسد نہ ہو گی۔ محیط السرخسی۔ اگر نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کا نام سن کر درود پڑھا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر نماز میں رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھا تو فاسد نہ ہو گی۔

اگر نمازی کی زبان میں ہاں، درست ہے، بجا ہے، یا اس جیسا اور کوئی لفظ کہا یا عربی میں نعم یا فارسی میں آری جاری ہوا اگر اس کی عادت ہو تو نماز فاسد ہو گی ورنہ عربی میں نعم کہنے سے فاسد نہ ہو گی۔ محیط السرخسی اور یہی حکم فارسی کے آری کا ہے۔ قاضی خان۔ اور یہی حکم اردو کا بھی ہے۔ م۔ اگر فارسی میں دعا و تسبیح کہی تو عتابیؒ نے جامع الفقہ میں ذکر کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ سے فاسد ہونا مروی ہے، آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا جتنی مرتبہ بھی نماز میں آتا جائے اور ہر مرتبہ نمازی لبیک یا سیدی یعنی اے مالک! میں حاضر ہوں کہتا جائے تو ایک قول میں نماز فاسد ہو جائے گی اور ایک قول میں فاسد نہ ہو گی۔ مع۔ صحیح یہ ہے کہ فاسد تو نہیں ہو گی مگر نہ کہنا ہی بہتر ہے۔ القاضی خان۔ اگر حاجی نے احرام کی حالت میں حج کا لبیک نماز میں کہا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ الخلاصہ۔

اگر ایام تشریق میں تکبیر تشریق نماز میں کہی تو نماز فاسد نہ ہو گی۔ القاضی خان۔ اگر نماز میں اذان کی نیت سے اذان دی تو فاسد ہو جائے گی۔ المحیط۔ اگر نماز میں دعا کی تو اگر وہ کلام الناس سے ہو جائے تو نماز فاسد ہو گی ورنہ نہیں، اس کی تحقیق پہلے گذر چکی ہے۔ م۔ اگر امام نے آیت ترغیب یا ترہیب پڑھی تو مقتدی نے کہا صدق اللہ و بلغت رسلہ، یعنی اللہ تعالیٰ کا کلام سچا ہے، اور اس کے رسولوں نے حکم پہونچا دیا تو یہ مفسد نہیں ہے، مگر اس نے کہہ کر برا کیا۔ القاضی خان۔ الظہیر یہ۔ اگر شیطان کے وسوسہ دلانے پر مصلی نے کہا **لاحول و لا قوۃ الا باللہ العلی العظیم**

تو اگر آخرت کے معاملہ میں ہو تو مفسد نہیں ہے اور اگر دنیاوی معاملہ میں ہو تو مفسد ہے۔ التمر تاشی۔ اگر آخر میں تشہد بھول کر سلام پھیر دیا پھر فوراً ہی یاد آگیا اور تشہد پڑھنے لگا، پھر پورا کرنے سے پہلے سلام پھیر دیا، تو امام ابو یوسفؒ کے فرمان کے مطابق نماز فاسد ہو گئی کیونکہ تشہد پڑھنا شروع کر دینے کی وجہ سے قعدہ اخیرہ ختم ہو گیا تھا پھر تھوڑا پڑھ کر سلام پھیر دیا تو قعدہ اخیر جو فرض تھا اس کے نامکمل رہ جانے کی وجہ سے نماز فاسد ہو گئی، اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوئی، کیونکہ پورا قعدہ نہیں لیا بلکہ جتنا تشہد پڑھا، اور تشہد کے پڑھنے کی جگہ قعدہ ہے، اور قعدہ کے ختم ہو جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اسی قول پر فتویٰ ہے، اسی طرح اگر بھولے سے سورہ فاتحہ اور سورہ ملانا چھوٹ گیا اور رکوع میں چلا گیا، پھر رکوع میں یاد آگیا اس لئے قراءت کے لئے کھڑا ہو گیا پھر شرمندہ ہو کر سجدہ میں چلا گیا، تو اس مسئلہ کی کوئی روایت موجود نہیں ہے، البتہ جو اختلاف پہلے بیان کیا گیا ہے وہی یہاں بھی ہونا چاہئے، جیسا کہ قاضی خان میں ہے، بیمار کو اٹھنے بیٹھنے جھکنے میں تکلیف ہونے کی وجہ سے وہ بسم اللہ کہتا ہے، تو جواب میں اختلاف ہے، اور واقعات میں ہے کہ نماز فاسد نہ ہو گی۔ الظہیر یہ۔ ع۔ اور اسی پر فتویٰ ہے۔ المضمرات۔ ھ۔

اگر بچھو کے کاٹنے پر نمازی نے بسم اللہ کہی تو حکم میں اختلاف ہے مگر فتویٰ یہ ہے کہ نماز فاسد نہیں ہوئی، جیسا کہ النصاب

میں ہے۔ البحر۔ اگر نمازی نے اپنے امام کے علاوہ کسی اور سے ولا الضالین سن کر آمین کہی تو متاخرین کے نزدیک نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن ابو حنیفہؒ سے اس کے خلاف مروی ہے، جیسا کہ الذخیرہ میں ہے، اگر نماز کے باہر کسی کی دعا پر نمازی نے آمین کہی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ ع۔

ومن صلى ركعة من الظهر ثم افتتح العصراوالتطوع فقد نقض الظهر لانه صح شروعه في غيره فيخرج عنه.

ترجمہ:۔ جس نے مثلاً ظہر کی ایک رکعت پڑھ کر عصر کی نماز یا نفل نماز شروع کر دی تو اس کی ظہر کی نماز باطل ہو گئی، کیونکہ دوسری کی ابتداء صحیح ہو گئی ہے، لہٰذا ظہر کی نماز سے وہ نکل آئے گا۔

توضیح:۔ ظہر کی ایک رکعت پڑھ لینے کے بعد عصر کی نماز یا نفل نماز شروع کرنے کا حکم، تنہا مصلی، اور دخول جماعت کے واسطے تکبیر، گھر سے تنہا فرض پڑھ کر جماعت کی اس فرض میں شرکت کرنے کا حکم

ومن صلى ركعة من الظهر ثم افتتح العصراوالتطوع......الخ

اگر کسی نے ایک رکعت پڑھی۔ ف۔ کسی نماز کی مثلاً ظہر کے فرض کی پھر عصر کی فرض نماز شروع کر دی۔ ف۔ ایسی صورت میں کہ وہ یا تو صاحب ترتیب نہیں ہے یا ساقط ہے، یا نفل نماز کی۔ ف۔ دوسری نماز شروع کرنے کی صورت یہ ہو گی کہ تکبیر اور نیت دونوں کہیں خواہ اٹھائے یا نہ اٹھائے، اس طرح اس کا شروع کرنا صحیح ہو گیا۔

فقد نقض الظهر لانه صح شروعه في غيره فيخرج عنه......الخ

تو اس نے ظہر کی نماز توڑ ڈالی، کیونکہ اس کا ظہر کے غیر کو خواہ عصر کی نماز یا نفل نماز کو شروع کرنا صحیح ہو گیا فیخرج عنہ تو وہ ظہر کی نماز سے نکل آئے گا۔ ف۔

میں مترجم نے جتنی قیدیں بڑھائی ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے کہ ظہر کی فرض نماز پڑھنے والا عصر کی نماز شروع کرنے والا اسی وقت صحیح مانا جائے گا جبکہ اس شخص پر ترتیب سے پڑھنا لازم نہ رہا ہو، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے ذمہ چھ نمازوں یا ان سے زیادہ باقی رہ گئی ہوں یا وقت بہت تنگ رہ گیا ہو یا ان نمازوں کو بھول چکا ہو، یا کوئی اور وجہ ہو، ورنہ جس شخص پر ترتیب لازم ہو وہ ظہر سے منتقل ہو کر عصر کی نیت سے عصر میں داخل نہیں ہو سکتا ہے، بلکہ وہ جو کچھ بھی پڑھے گا نفل ہو جائے گا، کیونکہ اس کی نماز ظہر سے پہلے عصر کی نماز ادا نہیں ہو سکتی ہے۔ ع۔ پھر صرف تکبیر کہہ لینے سے عصر کی نماز میں داخل نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے لئے صحیح نیت کا پایا جانا بھی ضروری ہے جو یہاں نہیں ہو سکتی ہے۔ الکافی۔

اور جامع تمر تاشی وغیرہ میں ہے کہ اسی طرح جس نے نفل شروع کرنے کے بعد اس سے فرض وغیرہ کی نیت کر لی یا ظہر سے جمعہ کو یا برعکس جمعہ سے ظہر کو بدلا ہو۔ ع۔ اور یہی بات تبیین الزیلعی میں بھی ہے۔ م۔

پھر منتقل ہونا اگرچہ کسی شکل ہو وہ ثابت ہو جائے گا، چنانچہ اگر ظہر کی نماز تنہا شروع کی اس کے بعد جماعت کھڑی ہو گئی تو امام کی اقتداء کی نیت سے تکبیر کہی تو وہ اپنی نماز ظہر سے نکل کر امام کے ساتھ شروع کر دینے سے ظہر کی جماعت میں داخل ہو جائے گا، علیٰ ہذا القیاس اگر مقتدی تھا اور اس نے تنہا ہو جانے کی نیت سے تکبیر کہی یا تنہا پڑھتا تھا اور امام ہونے کی نیت سے تکبیر کہی تو وہ اپنی پہلی نماز سے نکل جائے گا، یہ سارے احکام ہمارے نزدیک ہیں، الحاصل جو کچھ پڑھ چکا ہے وہ حساب میں نہیں آئے گا، لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک اگر تنہا پڑھنے والے (منفرد) نے امام کی اقتداء کی نیت کی تو اس کی نیت صحیح ہو گی اور وہ مقتدی بن جائے گا، اور جو پڑھ چکا ہے وہ بھی حساب میں آئے گا، اور پہلا تحریمہ کافی ہو گا۔ مع۔ یہ اس قاعدہ کی بناء پر ہو گا کہ امام کی نماز مقتدی کی نماز کی متضمن نہیں ہوتی ہے بلکہ ان میں کا ہر فرد علیحدہ علیحدہ ہے صرف رکوع و سجود وغیرہ ایک ساتھ ادا کرتے

ہیں، لیکن امام احمدؒ کے نزدیک یہ قاعدہ مشہور نہیں ہے، اس بناء پر ان کی طرف اس روایت کی نسبت قابل غور ہے۔ واللہ اعلم.
خلاصہ یہ ہوا کہ ہمارے نزدیک اول تو تحریمہ کافی نہیں ہے اور جو کچھ اس وقت تک پڑھا ہے وہ حساب میں نہیں آئے گا، اور منفرد اس تحریمہ سے نکل آئے گا۔ م۔ اور اگر تنہا نماز پڑھتا ہو پھر اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص نے اقتداء کر لی اس بناء پر اس نے دوبارہ تکبیر کہی تو وہ اپنے پہلے تحریمہ پر باقی رہے گا، البتہ اگر اقتداء کے لئے آنے والی عورت ہو۔ ع۔ ایسا ہی النہایہ میں بھی ہے، اگر ظہر کے لئے تحریمہ باندھا پھر تکبیر کہہ کر ظہر میں امام کی اقتداء کی نیت کی تو پہلی نیت باطل ہو گئی اور اقتداء کرنا صحیح ہو گیا اگر کسی نے گھر میں ظہر کی نماز پڑھ لی پھر مسجد جا کر ظہر کی جماعت میں شریک ہو گیا تو پہلی نماز جو ادا کر لی گئی تھی باطل نہ ہو گی۔ الکافی۔

اور ہمارے نزدیک مشہور یہ ہے کہ پہلی پڑھی ہوئی فرض باقی رہی اور بعد میں جماعت کے ساتھ ادا کی ہوئی نفل ہوئی ساتھ ہی جماعت کا ثواب بھی ملے گا، اور سنن میں ہے کہ بعض صحابہ سے کسی نے پوچھا کہ ان دونوں میں سے کسے فرض کی حیثیت سے باقی رکھا جائے تو انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مرضی پر موقوف ہے کہ جسے چاہے فرض قرار دے تحقیق یہ ہے کہ جو نماز پورے شرائط وارکان کے علاوہ خشوع وخضوع کے ساتھ ادا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسی کو قبول فرمائے گا اور اسی کو تعمیل حکم قرار دے گا، لیکن بندہ کی ذمہ داری میں پہلے فرض کا درجہ ہے بعد میں نفل کا ہے، اور اسی پر احکام بھی مبنی ہوں گے، اسی لئے ارشاد ہے کہ ایک دن میں ایک فرض کو دوبارہ مت پڑھو، اسی لئے دوبارہ فرض نہیں پڑھا بلکہ نفل پڑھی ہے، اور اگر قسم کھائی ہو کہ آج کے ظہر کی فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کروں گا تو اس صورت میں قسم جھوٹی ہو کر کفارہ لازم آئے گا، اچھی طرح یاد رکھو۔ م۔

ولو افتتح الظهر بعد ما صلى منها ركعة فهي هي و يجتزئ بتلك الركعة لانه نوى الشروع في عين ماهو فيه فلغت نيته و بقي المنوى على حاله.

ترجمہ:- اگر کسی نے ظہر کی ایک رکعت نماز پڑھ لینے پھر اسی کو شروع کر دیا تو یہ بعد کی نماز وہی پہلی نماز رہے گی، اور شمار کر لے اس رکعت کو جسے پڑھ چکا ہے، کیونکہ اس رکعت کو جس کو پڑھ چکا ہے پھر شروع کرنے کی نیت کی ہے اس لئے اس کی نیت لغو ہو گئی، اور اس کی نیت لغو ہو جائے گی، اور جس کی نیت کی ہے وہ اپنی حالت پر باقی رہے گی۔

توضیح:- ایک نماز شروع کر کے ایک رکعت پڑھ لینے کے بعد اسی نماز کو پھر سے شروع کرنا، چار رکعتی نماز مکمل کرنے پر سلام پھیرنا پھر سہو کا ہونا، اور دوبارہ نماز، مترجم کی توضیح، مغرب کے قعدہ اول پر خیال تکمیل، سلام اور تکبیر، مغرب کی دو رکعتوں پر سلام، پھر سے شروع کرنا، مغرب کی نماز میں ایک رکعت کے بعد شبہ، تکبیر تحریمہ، پھر سے نماز شروع کرنا

ولو افتتح الظهر بعد ما صلى منها ركعة ......الخ
اگر ظہر کی نماز شروع کی۔: ۔ دوبارہ نیت وتکبیر کے ساتھ، ظہر کی ایک رکعت پڑھ لینے کے بعد۔ ف۔ یعنی ایک مرتبہ ظہر کی نماز شروع کر کے ایک رکعت پڑھ لینے کے بعد، دوبارہ اسی ظہر کی نیت سے تکبیر تحریمہ کہے مگر زبان سے نیت کے الفاظ کہے بغیر۔ م۔ فهي الخ تو یہ دوسری نماز بھی پہلی ہی نماز ہے۔ ف۔ یعنی پہلی نماز سے باہر نہ ہو گا۔

و يجتزئ بتلك الركعة لانه نوى الشروع في عين ماهو فيه......الخ
اور جتنی رکعت نماز کی پڑھ چکا ہے اسے بھی شمار کرے اور اپنے حساب میں رکھے۔ ف۔ یہانتک کہ اس رکعت کے بعد اور تین رکعتیں ہو جانے پر نماز ختم کرنے کے لئے قعدہ اخیرہ کرے گا اور فرض کی نیت سے پڑھے گا، اور اگر اس نے پہلی رکعت کو

اپنے حساب میں نہ رکھ کر پھر سے چار رکعتیں پوری کرنے کے بعد قعدہ کرے گا تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی، اور اگر مغرب کی نماز ہو تو صرف اور دو رکعتوں کے بعد، اور فجر کی ہو تو اور صرف ایک رکعت کے بعد قعدہ اخیرہ ہو گا۔

الحاصل پڑھی ہوئی پہلی رکعت کو حساب میں رکھتے ہوئے جب بھی قعدہ اخیرہ ہو وہاں قعدہ کرے ورنہ نماز باطل ہو گی۔ جیسا کہ عینی اور فتح القدیر وغیرہ میں ہے۔ الحاصل بحث یہ ہوئی کہ جو نماز شروع کی گئی ہے اگر اس سے بعد میں پھر اسی نماز میں منتقل ہونا چاہیں تو منتقل ہونا صحیح نہ ہو گا۔ م۔

لانه نوى الشروع في عين ماهو فيه فلغت نيته و بقي المنوى على حاله......الخ

کیونکہ اس نے ایسے فرض کے شروع کرنے کی نیت کی ہے کہ بعینہ وہی ہے جسے وہ پڑھ رہا ہے۔ **فلغت نیته الخ** اس بناء پر اس کی نیت لغو ہو گئی اور جس کی نیت کی ہے وہ اپنی جگہ پر ہے۔ ف۔ پھر یہ باتیں اس وقت ہوں گی جبکہ اس نے اپنے طور پر دل ہی دل میں دوبارہ نیت کی ہو، کیونکہ اگر اس نے نیت کو زبان سے ظاہر کیا مثلاً ظہر کی ایک رکعت پڑھ کر کہا **نویت ان اصلی ظهر الیوم الخ** یعنی میں آج کے ظہر کی فرض نماز پڑھنے کی نیت کرتا ہوں یا اسی جیسا کچھ اور جملہ کہے تو اس سے پہلے تک جو کچھ پڑھ چکا ہے وہ کالعدم ہو جائے گی، اور شمار نہ ہو گی، جیسا کہ الخلاصہ اور الکافی میں ہے، اس مسئلہ میں اصل یہ ہے کہ جب نیت کا تعلق ایسی چیز سے ہو کہ وہ موجود نہیں ہے تو نیت صحیح ہے، اور اگر موجود شئی کے ساتھ نیت کا تعلق ہو تو وہ صحیح نہیں ہے، بس اسی قاعدہ کی بناء پر کئی مسائل نکلتے ہیں۔ ع۔

اگر ظہر کی چار رکعت پڑھ کر سلام کے بعد یاد کیا کہ بھولے سے ایک سجدہ چھوٹ گیا ہے پس اس نے کھڑے ہو کر دوبارہ شروع سے ظہر کی چار رکعت پڑھ کر سلام پھیرا تو ظہر کا فرض ادا نہ ہو گا، کیونکہ ظہر پڑھنے کے لئے دوبارہ کی ہوئی نیت لغو قرار دی گئی ہے، ایسی صورت میں جب اس نے کھڑے ہو کر ایک رکعت اور ملائی تو وہ نفل ہو کر ادا ہوئی اور پہلے کی پڑھی رکعتیں فرض کی حیثیت سے ادا ہوئی تھیں اس وجہ سے اب فرض اور نفل و سنتیں جمع ہو گئیں اس سے پہلے کہ وہ فرض نماز پڑھ کر فارغ ہوتا، الخلاصہ۔ اور البحر۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ عوام اکثر ایسے سوال کرتے رہے ہیں کہ ان میں پہلے مسئلہ کو مکمل نہیں کرتے بلکہ پھر نئے طریقہ سے شروع کر دیتے ہیں، انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے، مذکورہ مسئلہ میں اہمیت اس لئے زیادہ ہو گئی کہ ایک سجدہ جو چھوٹ گیا تھا وہ بھی فرض تھا کیونکہ ہر رکعت میں دونوں سجدے فرض ہوتے ہیں، اچھی طرح سمجھ کر یاد رکھنا چاہئے۔

اگر کسی نے مغرب کی دو رکعت پڑھنے کے بعد قعدہ کر کے اس خیال سے کہ نماز پوری ہو چکی ہے یعنی تینوں رکعتیں ادا ہو چکی ہیں سلام پھیر دیا، پھر کھڑے ہو کر اس نیت سے تکبیر کہی کہ ابھی مغرب کی سنت پڑھنی ہے، یہاں تک کہ وہ سجدہ میں چلا گیا اور خواہ سجدہ ادا کیا ہو یا نہ کیا ہو اس کے فرض نماز فاسد ہو گئی کیونکہ اس نے فرض سے فراغت سے پہلے نفل شروع کر دیا ہے، اگر دو رکعت کے بعد سلام پھیرنے کے بعد اسے یاد آیا کہ نماز ابھی پوری نہیں ہوئی ہے مگر لاعلمی اور نادانی کی وجہ سے اس نے یہ گمان کیا کہ اسکی نماز برباد ہو گئی اس لئے کھڑے ہو کر اس نے دوبارہ مغرب کی نماز کیلئے تکبیر تحریمہ کہہ کر از سر نو تین رکعتیں پڑھ لیں تو اسکی نماز جائز ہو جائیگی۔ اور اگر دو رکعتیں پڑھ کر اسے گمان ہوا کہ اس نے تکبیر تحریمہ نہیں کہی، اس لئے اس نے پھر سے نماز شروع کر کے تین رکعتیں پڑھیں تو نماز جائز نہ ہو گی، کتاب رزین میں ہے کہ یہ حکم اس وقت ہو گا جبکہ اس نے نماز شروع کرنے کے بعد ایک رکعت پڑھ کر قعدہ کے مقدار نہ بیٹھا ہو، کیونکہ اس سے یہ لازم آئے گا کہ قعدہ اخیرہ چھوڑ کر فرض نماز پوری کئے بغیر نفل نماز شروع کر دی ہے۔ الخلاصہ۔ ھ۔

قرآن شریف دیکھ کر پڑھنا

اس کی متعدد صورتیں ہیں (۱) اس طرح سے کہ پڑھنے والے کو کچھ یاد نہیں ہے اس لئے دیکھ کر قراءت کی (۲) یا حفظ ہونے

کے باوجود دیکھ کر پڑھا (۳) قرآن مجید کو ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہے (۴) یا رحل پر رکھا ہوا ہے پھر جن علماء نے اسے جائز کہا ہے ان کی دلیل حضرت ذکوانؓ کی امامت کی روایت ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے مسئلہ کو امام کے مسلک کے مطابق وضع کر کے کہا ہے (آئندہ بیان آتا ہے)۔

وإذا قرأ الامام من المصحف فسدت صلاته عند ابی حنیفة وقالا هی تامة، لانه عبادة انضافت الی عبادة الا انه یکره، لانه یشبه بصنع اهل الکتاب، ولابی حنیفة ان حمل المصحف والنظر فیه وتقلیب الاوراق عمل کثیر، ولانه تلقن من المصحف، فصار کما اذا تلقن من غیره ــــــ وعلی هذا لا فرق بین المحمول والموضوع وعلی الاول یفترقان.

ترجمہ:- جبکہ امام نے قرآن مجید سے قراءت کی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، لیکن صاحبینؒ نے کہا ہے کہ نماز پوری اور درست ہو گی کیونکہ یہ خود عبادت ہے پھر دوسری عبادت سے ملی ہے، مگر ایسا کرنا مکروہ ہے، کیونکہ اہل کتاب کے عمل کے مشابہ ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید کو اٹھانا اور اس میں دیکھنا اور ورقوں کو الٹنا عمل کثیر ہے، اور یہ وجہ بھی ہے کہ اس طرح نماز کے اندر قرآن کریم سے سیکھنا لازم آتا ہے تو یہ ایسا عمل ہو گا جیسا کہ کسی دوسرے سے سیکھنے سے ہوتا ہے، اور اس دوسری دلیل کی بناء پر قرآن مجید کو ہاتھ میں لئے ہونے کی صورت اور رکھے ہوئے ہونے میں کوئی فرق نہ ہو گا، لیکن پہلی صورت میں فرق ہو جائے گا۔

توضیح:- قرآن مجید میں دیکھ کر قراءت کرنا

وإذا قرأ الامام من المصحف فسدت صلاته عند ابی حنیفة وقالا هی تامة......الخ

اگر امام نے نماز میں قراءت کی۔ف۔ اسی طرح منفرد نے بھی قراءت کی قرآن شریف دیکھ کر فسدت الخ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس کی نماز فاسد ہو گئی۔ف۔ اس لئے تمام مقتدیوں کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔

شیخ الاسلام عینیؒ نے لکھا ہے کہ اس عبارت میں لفظ امام قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے، کیونکہ منفرد کا بھی یہی حکم ہے، اور امام محمدؒ نے اصل میں اور شیخ ابن حازم ظاہریؒ نے محلی میں کہا ہے کہ یہی قول سعید بن المسیب اور حسن بصری اور شعبی و سلمیؒ کا ہے

میں مترجم کہتا ہوں کہ علمائے ظاہر کا بھی یہی مذہب ہے۔ع۔ پھر جامع صغیر اور مختصر قدوری میں تفصیل نہیں ہے کہ تھوڑا اور زیادہ پڑھنے کا حکم مختلف ہے، مگر بعض مشائخ نے کہا ہے کہ اگر پوری آیت یا زیادہ قرآن کریم سے دیکھ کر پڑھے تو امام اعظمؒ کے نزدیک نماز فاسد ہو گی اور اگر تھوڑی مقدار ہو تو فاسد نہ ہو گی، اور بعضوں نے کہا ہے کہ اگر فاتحہ کی مقدار ہو تو نماز فاسد ہو گی ورنہ نہیں، التبیین۔ع۔

اور ظاہر یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک قلیل ہو یا کثیر مفسد ہونے اور صاحبینؒ کے نزدیک مفسد نہ ہونے میں برابر ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے اس عبارت کو مطلق رکھا ہے۔العنایہ۔ و قالا الخ اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ دیکھ کر پڑھنے والے کی بھی نماز پوری ہے، کیونکہ یہ ایک عبادت ہے جو دوسری عبادت سے مل گئی ہے۔ف۔ اور یہی قول امام شافعیؒ و احمدؒ کا بھی ہے، بلکہ بلا کراہت جائز ہے، اس کے علاوہ ایک جماعت کا بھی قول ہے، اور اتفاقاً گاہے گاہے اس کے اوراق کو بھی نماز میں لوٹے تو بھی فساد نہیں ہے، جیسا کہ امام نوویؒ نے ذکر کیا ہے۔ع۔

دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ قراءت کرنی ایک مستقل عبادت ہے، اور قرآن کریم میں ڈالنا بھی ایک مستقل عبادت ہے، اور نماز میں ان دونوں عبادتوں کو اکٹھا کر لیا ہے، اس لئے نماز فاسد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ان کی دلیل اسی روایت میں ہے کہ حضرت عائشہؓ کے آزاد کردہ غلام جن کا نام ذکوانؓ تھا وہ رمضان کے مہینہ میں حضرت ام المؤمنین عائشہؓ کی امامت کرتے اور قرآن

شریف دیکھ کر تلاوت کرتے۔ عف۔
لیکن اس روایت کی صحت پر دلیل کی ضرورت ہے، دوسرے یہ کہ محراب میں لکھی ہوئی آیت پر نظر کرنا بالاتفاق مفسد نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں نظر کرنا مفسد نہیں رہا، البتہ اسے اٹھانا ہاتھ میں رکھنا قابل غور ہے، تو آنحضرت ﷺ نے حضرت امامہ بنت ابی العاصؓ کو کندھے پر اٹھایا تھا پھر جب سجدہ کرتے تو انہیں اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو چڑھا لیتے تھے پس جب یہ عمل کثیر نہیں ہوا تو قرآن اٹھانا بھی عمل کثیر نہ ہوا، الحاصل ایسی کوئی چیز مفسد نہیں ہوتی، اور عبادت کا عمل تو جائز ہی ہے۔

الا انه يكره، لانه يشبه بصنع اهل الكتاب......الخ

مگر اتنی بات ضرور ہے کہ یہ عمل مکروہ ہے۔ ف۔ کچھ ذاتی کراہت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ یہ صورت اہل کتاب کے طریقہ کے مشابہ ہے۔ ف۔ کیونکہ اہل کتاب کے اندر حافظ اور ذاتی دلچسپی نہیں ہے کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کو زبان کر سکیں اس لئے اپنے وظائف اور اذکار کو اسی طرح ہاتھوں میں لے کر پڑھتے ہیں اور ہمیں یہودیوں کی مشابہت سے صحیح احادیث کے ذریعہ ممانعت کی گئی ہے، اس لئے جس صورت میں شریعت بغیر مشابہت کے ہو اس میں مشابہت مکروہ ہوئی، اس وجہ سے امام شافعیؒ کا یہ فرمانا کہ دیکھ کر پڑھنا صحیح ہے اس دلیل سے ضعیف ہو گیا، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز نہ ہونے کیلئے جو استدلال کیا گیا ہے خود وہ بھی ضعیف ہے، اس کی دو دلیلیں بیان کی گئی ہیں۔

ان حمل المصحف والنظر فيه وتقليب الاوراق عمل كثير......الخ

یہ (۱) **ان حمل المصحف الخ** کہ قرآن پاک کو اٹھائے رہنا اور اس میں نظر کرنا، اس کے ورقوں کو الٹنا یہ سب مل کر عمل کثیر ہوتا ہے۔ ف۔ پھر بلاضرورت بھی ہے، لیکن اس علت پر یہ لازم آتا ہے کہ اگر قرآن کریم کو ہاتھ میں اٹھائے نہ رہے بلکہ رحل پر یا کسی اور مناسب اونچی جگہ پر رکھ کر پڑھتا جائے، یا محراب پر لکھا ہوا اسے دیکھ کر پڑھتا رہے تو نماز فاسد نہیں ہونی چاہئے۔ الکافی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ امامہ بنت ابی العاص کا کا قصہ جو اوپر بیان کیا گیا ہے صاف اور صحیح طریقہ سے اس تعلیل کو رد کرتا ہے۔ م۔ (۲) دلیل یہ ہے **لانه تلقن الخ** کہ مصحف کو دیکھ کر پڑھنا اس سے سیکھ لینا ہے، اس لئے تو ایسا ہو گیا جیسے کسی دوسرے آدمی سے نماز میں سیکھتا جائے۔ ف۔ اور ایسا کرنا بالاتفاق مفسد نماز ہے، لہذا مصحف سے استفادہ بھی مفسد ہونا چاہئے، کیونکہ سیکھنا نماز کے اعمال سے نہیں ہے۔

وعلى هذا لا فرق بين الدحدول والموضوع وعلى الاول يفترقان ......الخ

اس تعلیل کی بناء پر رحل پر رکھے ہوئے قرآن سے سیکھنے اور ہاتھ میں اٹھائے ہوئے سے پڑھنے میں کچھ فرق نہیں ہے۔ ف۔ کیونکہ دوسرے سے سیکھنا تو دونوں صورتوں میں لازم آتا ہے جبکہ یہی بات فساد کی وجہ ہے **وعلى الاول الخ** اور پہلی علت کے مطابق رکھے ہوئے قرآن پاک اور اٹھائے ہوئے میں فرق رہ جاتا ہے۔ ف۔ کیونکہ اس میں فساد کی بنیادی وجہ عمل کثیر کا پایا جانا ہے جیسا کہ گذرا! مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ تعلیل اول کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ اول تو یہ ہے کہ اس کے اندر کے عمل کو کثیر کہنا ہی قابل تامل اور محل نظر ہے، اور امامہؓ کے قصہ کے مخالف ہے۔

دوم یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے اصل کے مطابق عمل کثیر عمل قلیل کے درمیان فرق کرنا، اور کسی عمل کو کثیر کہنا خود مصلی کی رائے پر موقوف ہے لہذا حقیقی اور اصل تعلیل دوم ہے کہ دیکھ کر پڑھنے سے نماز کے اندر سیکھنا لازم آتا ہے، اور یہ عمل مفسد ہے اس سے بحث نہیں کہ قرآن پاک کو ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ہو یا وہ کسی چیز پر رکھا ہوا ہو یا محراب پر لکھا ہوا ہو، اسی لئے کافی میں لکھا ہوا ہے کہ ہر حال میں مفسد ہے، اور یہی صحیح بھی ہے۔ ھ۔

اگر قرآن حفظ ہو یعنی نماز میں پڑھنے کے لئے آیتیں اور سورتیں یاد ہوں اگر وہ کہیں پر لکھی ہوئی ہوں انہیں صرف دیکھ کر یعنی کتاب اور کاغذ کو ہاتھ میں لئے بغیر نماز میں پڑھتا ہو تو مشائخ نے کہا ہے کہ نماز بالاتفاق فاسد نہ ہوگی، کیونکہ اس صورت میں نہ سیکھنا پایا گیا اور نہ اٹھانا پایا گیا ہے۔ التبیین۔

اگر نماز کی حالت میں کسی لکھی ہوئی عبارت کو سمجھا تو یہ سمجھنا دو قسم کا ہوگا، ایک تو یہ کہ وہ لکھا ہوا قرآن ہو اور اسے سمجھا تو اس کے جائز ہونے میں کسی کا کوئی اختلاف نہ ہوگا جیسا کہ ابھی اوپر میں ذکر کیا گیا ہے۔

ولو نظر الى مكتوب وفهمه فالصحيح انه لا تفسد صلاته بالاجماع، بخلاف ما اذا حلف لا يقرأ كتاب فلان حيث يحنث بالفهم عندمحمدؒ، لان المقصود هنالك الفهم اما فساد الصلاة فبالعمل الكثير ولم يوجد، وان مرّت امرأة من بين يدى المصلى لم يقطع الصلاة لقوله عليه السلام لا يقطع الصلاة مرور شيء.

ترجمہ:- اور اگر نماز کی حالت میں کچھ لکھا ہوا دیکھا، اور اسے زبان سے پڑھے بغیر سمجھ بھی لیا تو قول صحیح یہ ہے کہ اس سے بالاجماع نماز فاسد نہ ہوگی، بخلاف اس صورت کے جبکہ کسی نے یہ قسم کھائی ہو کہ فلاں کی تحریر کو نہیں پڑھے گا، کہ اس کے صرف سمجھ لینے سے بھی امام محمدؒ کے نزدیک حانث ہو جائے گا، کیونکہ اس تحریر کے پڑھنے سے اصل مراد سمجھنا ہے، زبان کی حرکت ضروری نہیں ہوتی ہے، اور نماز کا فاسد ہونا تو عمل کثیر سے ہوتا ہے اور وہ نہیں پایا گیا ہے، اور اگر کوئی عورت کسی نمازی کے سامنے سے گذری تو اس سے نماز فاسد نہیں ہوگی کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ نماز کو سامنے سے گذرنے والی کوئی چیز بھی توڑ نہیں سکتی ہے۔

توضیح:- نماز میں دوسری کتاب پر نظر اور اس کا مطلب
مصلی کے سامنے سے عورت کا گذرنا، حدیث سے دلیل، مترجم کی توضیح

ولو نظر الى مكتوب وفهمه فالصحيح انه لا تفسد صلاته بالاجماع......الخ

اور اگر کسی تحریر پر نظر ڈالی۔ف۔ جو قرآن کے ماسوا ہو، مثلاً کتاب فقہ وغیرہ ہو، اور اسے سمجھ بھی لیا۔ف۔ حالانکہ نماز کی حالت میں یہ فعل ہوا ہے لیکن زبان سے کوئی حرکت نہیں کی۔ع۔ تو قول صحیح یہ ہے کہ بالاجماع اس سمجھنے والے کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ف۔ خواہ وہ تحریر خود بخود سمجھ میں آجائے یا سمجھنے کے ارادہ کرنے سے سمجھے ان دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، یہی قول صحیح ہے۔ التبیین۔

الحاصل سمجھ میں آجانے کی وجہ سے صاحبینؒ کا آپس میں اختلاف ہے اور وہ یہ ہے ماذا حلف الخ اس کی صورت یہ ہے کہ کسی نے قسم کھائی کہ میں فلاں شخص کی تحریر نہیں پڑھوں گا۔ف۔ مثلاً کوئی شخص کو عادت تھی کہ وہ دوسروں کا خط پڑھ لیا کرتا تھا، اس دن اس نے قسم کھالی کہ اب فلاں شخص کا خط نہیں پڑھوں گا، اس کے بعد اس کے خط کو زبان سے تو نہیں پڑھا مگر آنکھوں سے دیکھ کر سمجھ لیا تو اس کے حکم میں اختلاف ہے۔

بخلاف ما اذا حلف لا يقرا كتاب فلان حيث يحنث بالفهم عند محمد ......الخ

چنانچہ امام محمدؒ کے نزدیک اس کے سمجھ لینے پر بھی وہ حانث ہوگا۔ف۔ کیونکہ قسم کا مدار عرف پر ہے، اس لئے یہاں حانث ہو جائے گا، کیونکہ اس جگہ خط نہ پڑھنے کا مقصود سمجھنے سے ہے۔ف۔ یعنی فلاں کی تحریر سے اس کا راز معلوم نہیں کروں گا، اور جب نظر ڈالنے سے بھی راز معلوم کر لیا تو وہ حانث ہو گیا، اور نماز کے مسئلہ میں فساد اس لئے نہیں ہوا کہ فساد الصلوۃ الخ کہ اس نماز میں فساد عمل کثیر پائے جانے کی وجہ سے ہوتا ہے، اور وہ نہیں پایا گیا۔ف۔ کیونکہ مفہوم سمجھ لینا تو عمل خفیف ہے بلکہ یہ تو عمل ظاہری بھی نہیں ہے، بلکہ فساد نماز تو کلام پر ہوا ہے اور یہ کلام نہ ہوا، اور سمجھنے کو بولنے کا حکم نہیں دیا جاتا ہے، چنانچہ اگر کسی

کی بیوی کی پیشانی پر یہ جملہ لکھا ہوا ہو کہ تجھے طلاق ہے، اور شوہر اسے دیکھ کر سمجھ کر خاموش رہا تو طلاق نہ ہو گی اور اگر اسے پڑھ لے بول دے تو طلاق پڑ جائے گی۔ل۔ اگر کسی نے توریت یا زبور یا انجیل سے پڑھا تو بہر حال نماز فاسد ہو گی۔ القاضی خان۔

وان مرّت امرأة من بين يدى المصلى لم يقطع الصلاة......الخ

اگر کسی نمازی کے سامنے کوئی عورت گذری تو وہ نماز کو فاسد نہیں کرے گی۔ف۔ یعنی مصلی کے سامنے یا بالکل سترہ نہ ہو یا ہو مگر اس کے نمازی کے درمیان سے کوئی عورت گذری تو عورت جیسی بھی ہو یعنی حائضہ ہو یا نہ ہو مطلقاً کوئی عورت گذرے نماز میں فساد نہ ہوگا، اور کتا و گدھا بھی نماز خراب نہیں کرتا ہے، عامہ فقہاء جمہور علماء سلف و خلف اور ان کے متبعین کا یہی قول ہے، البتہ کچھ علماء کا اس میں اختلاف بھی ہے چنانچہ حضرت انس، مکحول، ابوالاحوص و حسن اور عکرمہؒ سے مروی ہے کہ کتا اور گدھا نمازی کے سامنے سے گذر جائے تو نماز کو توڑ دیتا ہے، اور فقہاء میں سے امام احمدؒ سے مشہور روایت ہے کہ بالکل سیاہ، کالے کتے کا گذرنا بھی نماز کو توڑ دیتا ہے، کتوں کی آنکھیں جیسی بھی ہوں کہ آنکھوں کے غیر الگ سیاہ ہونے کا اعتبار نہیں ہے، ایک روایت میں عورت اور گدھے کے گذرنے کا بھی بیان ہے، کہ نماز کے لئے قاطع ہے، خواہ نماز فرض ہو یا نفل ہو۔ مع۔ مصنفؒ نے اس حدیث سے استدلال کیا ہے۔

لقوله عليه السلام لا يقطع الصلاة مرور شيء......الخ

یعنی کسی چیز کا نمازی کے سامنے سے گذرنا نماز کو نہیں توڑتا ہے۔ف۔ امام نوویؒ نے صحیح مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ف۔۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حدیث حضرت ابوخدریؓ و عبداللہ بن عمرؓ و ابوامامہؓ و انسؓ اور جابرؓ سے ابوداؤد، طبرانی اور دار قطنی نے مختلف روایتیں بیان کی ہیں، ان کی اسنادوں میں کلام ہے، لیکن حضرت انسؓ کی حدیث میں جو دار قطنی کے روایت کی ہے اس کی متعلق ابن الجوزیؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد میں صخر بن عبداللہ ایک راوی ہیں جن کے بارے میں ابن عدیؒ نے کہا ہے کہ یہ ثقہ لوگوں سے جھوٹی روایتیں بیان کرتے ہیں، اور ان کی مساوی روایتیں بنائی ہوئی ہوتی ہیں، اور منکرات ہیں، اور ابن حبانؒ نے کہا ہے کہ ان سے روایت کرنا حلال نہیں ہے، صاحب التنقیح نے اسے رد کر دیا ہے کہ یہ وہم ہے کیونکہ ان کی اسناد میں جو صخر بن عبداللہ راوی ہیں وہ صخر بن عبداللہ بن حرملہ ہیں جنہوں نے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز سے روایت کی ہے، تو اس میں ابن عدی یا ابن حبان کسی نے کلام نہیں کیا ہے، بلکہ ابن حبان نے ان کو ثقات میں لکھا ہے، اور نسائی نے کہا ہے کہ وہ صالح ہیں، اور جن کو ابن عدی و ابن حبان نے ضعیف کہا ہے وہ تو صخر بن عبداللہ الکوفی ہیں جن کو حاجی کہا کرتے تھے اور صخر بن عبداللہ یعنی ابن حرملہ سے پیچھے پیدا ہوئے، اور انہوں نے مالک بن انس ولیث بن سعد وغیرہ سے روایتیں بیان کی ہیں۔

حاصل یہ ہوا کہ اسناد میں صخر بن عبداللہ عن عمر بن عبدالعزیز عن انس بن مالک ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو نماز پڑھاتے تھے، ان کے سامنے سے ایک گدھا گذرا تو عیاش بن ابی ربیعہ نے کہا سبحان اللہ، جب رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیرا تو فرمایا کہ تسبیح پڑھنے والا کون تھا، تو عیاش بن ابی ربیعہؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! میں تھا کیونکہ میں نے سنا تھا کہ گدھا نماز کو توڑ ڈالتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا لایقطع الصلوۃ شئی، نماز کوئی چیز قطع نہیں کرتی ہے۔

الحاصل اس اسناد سے ظاہر ہے کہ صخر بن عبداللہ بن حرملہ راوی ہیں جو ثقہ ہیں اور ان کا زمانہ عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ ہے، اور صخر بن عبداللہ کوفی جو حاجی سے مشہور تھے نہیں ہیں، جن کا زمانہ بعد کا ہے، یہانتک کہ انہوں نے امام مالکؒ وغیرہ سے روایت کی ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ظاہر ہوتا ہے کہ حدیث مذکور حسن کے درجہ سے نیچے کی نہیں ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے استدلال کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی چیز نماز کو قطع نہیں کرتی ہے تو عورت اور کتا اور گدھا بھی قاطع نہ ہوگا، جبکہ سامنے سے گذر جائے، لیکن اس میں اعتراض دو وجہوں سے ہوتا ہے، پہلی وجہ وہی ہے جو ابن الہمامؒ

نے بیان کی ہے کہ یہ حدیث اس حدیث کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے جس میں ان چیزوں سے نماز قطع کرنے کی روایت ہے۔
میں کہتا ہوں کہ حضرت ابوذرؓ کی وہ حدیث جس میں یہ بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مرد کی نماز کو عورت، گدھا اور کتا قطع کر دیتے ہیں جبکہ اس کے سامنے کجاوہ کے پچھلے حصہ کے برابر کوئی چیز نہ ہو، اور آخر میں ہے کہ سیاہ کتا شیطان ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوع حدیث ہے کہ نماز کو عورت، کتا اور گدھا قطع کرتے ہیں، اس کی روایت بھی مسلمؒ ہی نے کی ہے، اور ابن عباسؓ کی حدیث ہے کہ نماز کو حائضہ عورت اور کتا قطع کرتے ہیں، اس کی روایت ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے جیسا کہ عینی میں ہے۔
الحاصل نماز کو قطع کرنے والے عورت کتا اور گدھا ہیں، اور اس کا ثبوت مسلم کی صحیح حدیث سے ہے، اور ان سے قطع نہ ہونا ایسی روایت سے ثابت ہے جس کے ثبوت ہی میں تامل ہے، اس لئے ان دونوں کے درمیان تعارض نہیں ہو سکتا ہے، تعارض کے لئے دونوں کے درمیان مساوات اور برابری شرط ہے، اس کے علاوہ نماز کو قطع کرنے والی حدیث اپنے مفہوم میں بالکل واضح غیر مشتبہ ہے، اور قطع نہ کرنے والی اپنے مفہوم میں ناطق نہیں ہے بلکہ قطع کا مفہوم ہے، دوسری وجہ اس کی دلیل کو تسلیم کر لینے کی صورت میں ہم کہتے ہیں کہ لا یقطع الصلوۃ مرور شئی، عام ہے تو اس سے یہ تین چیزیں خاص کر لی گئی ہیں، جو ابوذر اور ابوہریرہؓ کی حدیثوں میں بالکل واضح ہو کر ثابت ہوئی ہیں، جن کا ماحصل یہ ہو گا نماز کے سامنے سے کسی چیز کے گذرنے سے بھی نماز قطع نہیں سوائے ان تین چیزوں کے، اس طرح دونوں حدیثوں پر عمل ہو جائے گا، البتہ تحقیقی جواب یہ ہے کہ صحیح مسلم کی دوسری حدیث جو ابوذرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث سے بھی زیادہ صحیح اور زیادہ قوی ہے وہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کی یہ ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے ہوتے اور میں آپ کے سامنے چوڑائی میں لیٹی ہوتی جیسے کہ جنازہ رکھا جاتا ہے، اس کی روایت بخاری اور مسلم دونوں نے کی ہے، صحیحین کی ایک اور روایت میں ہے کہ میرے پاؤں آپ کے سجدہ گاہ پر ہوتے، جب آپ سجدہ کرتے تو میرے پیر کو دبا کر اشارہ فرماتے تو میں اپنے پاؤں کھینچ لیتی، پھر آپ کھڑے ہوتے تو میں اپنے پاؤں پھیلا دیتی، اس زمانہ میں گھروں میں چراغ نہ تھے، ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت ام المومنینؓ نے اکثر اوقات اپنے حائضہ ہونے کی حالت میں بھی ایسی طرح بیان فرمایا ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ یہ حدیث صحیحین وغیرہما میں بہت سے سندوں سے مروی ہے، اس طرح یہ زیادہ اصح اور اقویٰ ثابت ہے، اور اس سے بالکل صاف صاف یہ معلوم ہوا ہے کہ عورت قاطع نماز نہیں ہے برخلاف حضرت ابوذر اور ابوہریرہؓ کی حدیث کہ وہاں قاطع کے معنی میں تاویل بھی ہو سکتی ہے، کہ قاطع نماز سے قاطع خشوع نماز ہے یعنی ان چیزوں کی وجہ سے نماز میں خشوع ختم ہو جاتا ہے، چنانچہ عورت کے بارے میں یہ بات ظاہر میں مفہوم ہوتی ہے کہ جب عورت نمازی کے سامنے سے گذرتی ہے تو اس کا دل منتشر ہو جاتا ہے، اور اس میں بھید شیطان کا ہے۔ واللہ اعلم۔
صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جب عورت چلتی ہے تو شیاطین اس کی بناؤ سنگار اور تزئین کرتے چلتے ہیں، کچھ اور تفصیل کے ساتھ جو اصل حدیث میں متعدد روایات سے ثابت ہے، اس میں غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جماعت کے سامنے عورت یا منفرد کے سامنے اجنبیہ عورت گذرنے میں منفرد کے سامنے اس کی منکوحہ زوجہ کے گذرنے میں کتنا فرق ہے، پھر گدھے کے واسطے بھی شیطان کا ثبوت ہے، اسی طرح کالے بھجنگ کتے کے بارے میں خود اسی حدیث میں مذکور ہے کہ وہ شیطان ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ فی الحقیقت خود وہی شیطان ہے بلکہ اس سے مراد شیطان ظہور ہے، اور ممکن ہے کہ اس سے موذی اور مکروہ صورت مراد ہو، جیسا کہ عورت میں جبکہ بنی سجی ہو ظہور شہوت ہے، مذکورہ بیان سمجھ لینے کے بعد عاقل شخص کے لئے یہ جاننا بھی آسان ہے کہ نماز کی سیدھی راہ صراط مستقیم پر درحقیقت شیطان کے لئے گذرنا محال ہے البتہ اس کا فریب اور جال مصلی کے خشوع خضوع کی رہزنی اور ڈکیتی کر سکتا ہے جو وسوسہ وغیرہ کی شکل میں ہو، ان اسباب رہزنی میں ان چیزوں کا گذر بھی بشرطیکہ

نمازی کے سامنے سے سترہ کے اندر ہو، سترہ نہ ہو تو قبلہ کی طرف ہو۔
عینیؒ نے لکھا ہے کہ شیخ نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ جمہور علماء نے حضرات ابوذرؓ اور ابو ہریرہؓ کی حدیثوں میں قاطع نماز کو قاطع خشوع پر محمول کیا ہے، یعنی ان چیزوں کے گذرنے سے نماز کے اندر کا خشوع ختم ہو جاتا ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تو صرف عورت کے بارے میں ثابت ہوا، تو جواب دیا گیا ہے کہ نہیں بلکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ حجۃ الوداع میں منیٰ کے مقام میں آپ جماعت سے نماز پڑھ رہے تھے اور ابن عباسؓ نے صفوں کے سامنے سے اپنا گدھا چھوڑ دیا، اور کچھ پرواہ نہیں کی، ابن الجوزیؒ نے کہا ہے کہ چونکہ عورت اور گدھے کے بارے میں یہ ثبوت ہے اسی لئے امام احمدؒ نے ان دونوں کے قاطع ہونے کے بارے میں تردد کیا ہے، البتہ سیاہ کتے بارے میں قاطع صلوۃ ہونے کا قطعی حکم لگایا ہے، کیونکہ اس میں دوسرے کسی احتمال اور خلاف کا ثبوت نہیں ہے۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ قطع کرنے والے کی حیثیت سے تین چیزوں کا ذکر ہوا ہے پھر ان میں سے دو یعنی عورت اور گدھے کے بارے میں قطع صلوٰۃ کے معنی قاطع خشوع کا ثبوت ہوا تو سیاہ کتے کے بارے میں اسی قطع کے معنی صلوٰۃ کیوں کر ہوں گے، کیونکہ ایک ہی لفظ سے دو مخالف مطلب مراد ایک ہی جملہ میں جائز نہیں ہے، جیسا کہ اصول کے بیان میں ہم نے اس کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے، پس جب اس حدیث میں قطع کے معنی نماز کے خشوع کا قطع لیا گیا تو یہی معنی عورت، گدھا اور کتا سب کے بارے میں ایک ہی مراد ہوگی اور کوئی بھی تحریمہ نماز کے لئے قاطع نہ ہوگا۔
خلاصہ بحث یہ ہوا کہ ساری حدیثیں اور آثار اس بات پر متفق ہیں کہ ایسا نمازی جس کے سامنے سترہ نہ ہو اس کے سامنے سے عورت و گدھا اور کتا کے گذرنے سے نماز کا خشوع قطع ہوتا ہے لیکن نماز کا تحریمہ کسی بھی چیز کے گذرنے سے نہیں ٹوٹتا ہے۔

الا ان المار آثم لقوله عليه السلام: لوعلم المارّ بين يدى المصلى ماذا عليه من الوزر لوقف أربعين، وإنما يأثم اذا مر فى موضع سجوده على ما قيل، ولا يكون بينهما حائل ويحاذى اعضاء المار اعضائه لو كان يصلى على الدكان.

ترجمہ:- البتہ گذرنے والا خود گنہگار ہوگا کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا شخص اس گناہ کو جان لے جو گذرنے کی وجہ سے اسے ہوگا تو وہ چالیس تک کھڑا رہ جائے گا، اور وہ اسی صورت میں گنہگار ہوگا جبکہ اس کی سجدہ گاہ کے اندر سے گذرا ہو، جیسا کہ کہا گیا ہے، اور نمازی اور گذرنے والے کے درمیان کچھ حائل نہ ہو، اور اگر نمازی کسی اونچی جگہ پر ہو تو گذرنے والے کے اعضاء بدن اس کے اعضاء کے مقابل ہوئے ہوں۔

توضیح:- نمازی کے آگے گذرنا، حدیث سے دلیل
گذرنے کی حد، چبوترہ پر نماز، اور آگے سے گذرنے والا

الا ان المار آثم لقوله عليه السلام: لوعلم المارّ بين يدى المصلى ماذا عليه من الوزر......الخ
لیکن گذرنے والا گنہگار ہوگا۔ف۔ یعنی عورت وغیرہ کسی چیز کے بھی گذرنے سے نماز ٹوٹتی نہیں تو اس کا یہ مطلب نہ ہوگا کہ گذرنے والے کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہے آمد و رفت کرے بلکہ گذرنے والے کو یہ جائز نہ ہوگا کہ نمازی کے سامنے سے گذرے جبکہ سترہ نہ ہو، اور اگر سترہ ہو تو جہانتک ہے اس کے اندر سے گذرے ورنہ حرام کا مرتکب ہوگا خواہ وہ عورت ہو یا مرد کیونکہ اگرچہ مرد کے گذرنے سے خشوع ختم نہ ہوگا پھر بھی نمازی کے آگے آنے سے وہ عاصی اور گنہگار ہوگا۔

لقوله عليه السلام: لو علم المار بين يدى المصلى ماذا عليه من الوزر لوقف أربعين...... الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا جانتا کہ اس کی وجہ سے اسے کتنا گناہ ہوگا تو وہ چالیس تک کھڑا رہ جاتا۔ف۔ یعنی وہاں سے نہ گذرتا اور مسلسل چالیس اس پر کھڑا رہنا بھی آسان معلوم ہوتا، اس حدیث کے راوی ابوالنصر نے اخیر میں عذر پیش کیا ہے مجھے یہ بات یاد نہیں رہی کہ چالیس کے بعد کیا فرمایا، دن مہینے یا سال، یہ حدیث صحیحین میں ہے، اور بزارؒ کی روایت میں چالیس خریف کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم. لیکن ابن الہمامؒ نے اس بات کی تائید کی ہے۔م۔

وإنما يأثم اذا مر في موضع سجوده على ما قيل......الخ

گذرنے والا اسی صورت میں گنہگار ہوگا جبکہ یہ بات یقینی طور سے معلوم ہو جائے کہ یہ گذرنے والا سجدہ گاہ سے اسی طرح سے گذرے گا جو بیان کیا گیا ہے۔ف۔ یعنی اس جگہ سے جس کے اندر سے گذرنا حرام ہے، اور اس کی حد ہے نمازی کے قدم سے اس کے سجدہ کی جگہ تک یہی اصح قول ہے۔ التبیین۔ اسی قول کو شمس الائمہ سرخسی اور شیخ الاسلام نے پسند کیا ہے، اور اسی پر قاضی خان کو بھی اعتماد ہے۔ع۔ یہی قول کافی۔ خزانہ اور ظہیریہ میں بھی ہے۔م۔

لیکن ہمارے مشائخ نے اس کی حد یہ بتائی ہے کہ جب مصلی اپنی نظر سجدہ کی جگہ پر رکھ کر پڑھ رہا ہو اس وقت گذرنے والے پر اس کی نظر نہ پڑ رہی ہو۔ الخلاصہ۔ یعنی اس کی حد سجدہ کی جگہ سے بھی اتنی آگے ہے کہ وہاں تک سجدہ کی حالت میں نظر رکھنے پر بھی نظر آتا ہو، اور جہاں سے نظر آتا ہو وہاں گذرنا مکروہ نہیں ہے۔م۔ یہی قول فخر الاسلام کا ہے۔ع۔ اور یہی صحیح ہے۔ الخلاصہ۔ اور یہی اصح ہے۔ البدائع۔ اور یہی اشبہ بالصواب ہے۔ النہایہ۔ غالباً مصنفؒ نے بھی اسی طرف لفظ قیل سے اشارہ کیا ہے، اور عنقریب واضح ہوگا۔م۔

ولا يكون بينهما حائل ويحاذى اعضاء المار اعضائه لو كان يصلى على الدكان......الخ

اور دوسری بات یہ ہے کہ دونوں کے درمیان کوئی چیز حائل نہ ہو، جیسے ستون یا دیوار یا سترہ یا آدمی کی پیٹھ وغیرہ۔ع۔م۔ یہانتک کہ اگر چھوٹی مسجد میں بھی کوئی چیز ہو تو بھی گذرنا مکروہ نہ ہوگا۔ الکافی۔ ویحاذی الخ اور اگر نمازی چبوترہ پر نماز پڑھتا ہو تو گذرنے والے کے اعضا نمازی کے اعضاء بدن کے مقابل ہوتے ہوں۔ف۔ یعنی نمازی بلندی پر ہو لیکن قدم آدم نہ ہو، اسی لئے اگر اتنی بلندی پر ہو کہ گذرنے والے کے اعضاء بدن نمازی کے اعضاء کے برابر ہوں تو سامنے سے گذرنے والا گنہگار ہوگا، چبوترہ اور چھوٹی مسجد میں سجدہ گاہ کا اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ چھوٹی مسجد ایک ہی جگہ کے حکم میں ہے، اور اگر بڑی مسجد یا میدان ہو تو اس میں سجدہ گاہ اور نظر آنے کی جگہ تک دونوں قول بیان کئے گئے ہیں، اور جب نمازی نے اونچائی پر نماز پڑھی تو جو شخص چبوترہ کے نیچے سے گذرے گا وہ بلاشبہ اس کی سجدہ گاہ پر حقیقت میں نہیں گذرے گا اس لئے پہلی روایت کے مطابق اسے گنہگار نہیں ہونا چاہئے اور دوسری روایت کے مطابق اگر ایسی جگہ سے گذرا کہ نمازی کے سجدہ کی جگہ پر نظر رکھنے کی حالت میں اس پر نظر پڑتی ہے تو دیکھا جائے گا کہ اگر گذرنے والے کے کچھ اعضاء نمازی کے کچھ اعضاء کے مقابل ہوتے ہیں تو وہ گنہگار ہوگا، ورنہ نہیں۔ مختصر من الصدر۔ اس سے معلوم ہوا کہ چبوترہ اگر اتنا اونچا ہو کہ گذرنے والے کا کوئی عضو نمازی کے مقابل نہ ہو تو کچھ گناہ نہ ہوگا۔ العینی۔ التمر تاشی اور نہایہ۔ چھوٹی مسجد ایسی مسجد ہے جو چالیس ذراع سے کم ہو، اور یہی مذہب مختار ہے۔ع۔

وينبغي لمن يصلي في الصحراء أن يتخذ أمامه سترة لقوله عليه السلام : اذا صلى احدكم في الصحراء فليجعل بين يديه سترة ومقدارها ذراع فصاعدا لقوله عليه السلام: أيعجز أحدكم إذا صلى في الصحراء أن يكون أمامه مثل مؤخرة الرحل، وقيل ينبغي أن يكون في غلظ الاصبع لأن ما دونه لا يبدو للناظرين من بعيد، فلا يحصل المقصود.

ترجمہ:۔اور جو شخص میدان میں نماز پڑھ رہا ہو، اس کے لئے مناسب ہے کہ اپنے سامنے کوئی سترہ بنالے، رسول اللہ ﷺ

کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جب تم میں سے کوئی میدان میں نماز پڑھائے، تو اسے چاہئے کہ اپنے سامنے سترہ بنالے، ایسا سترہ جس کی مقدار ایک ذراع یا اس سے زیادہ ہو، رسول اللہ علیہ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم میں سے کوئی میدان میں نماز پڑھ رہا ہو کیا وہ اس سے بھی عاجز ہو گا کہ اس کے سامنے کجاوہ کے پچھلے حصہ کے مثل ہو، اور کہا گیا ہے کہ وہ سترہ موٹاپا میں انگلی کی موٹائی کے برابر ہو، کیونکہ اس سے کم ہونے سے دور سے دیکھنے والے کو نظر نہیں آئے گا لہٰذا جو اصل مقصود ہے وہ حاصل نہ ہوگا۔

توضیح۔ سترہ، حدیث سے دلیل۔ مترجم کی توضیح

وينبغي لمن يصلي في الصحراء أن يتخذ أمامه سترة لقوله عليه السلام : اذا صلى احدكم......الخ

اور جو شخص میدان میں نماز پڑھتا ہو اس کے لئے مناسب ہے کہ اپنے آگے سترہ بنالے۔ف۔ مناسب کے معنی یہ ہے کہ مندوب ہے۔ البدائع۔ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ مستحب ہے۔ع۔ لقوله عليه السلام الخ کیونکہ حدیث یہ ہے کہ جب کوئی تم میں سے میدان میں نماز پڑھے تو اپنے سامنے سترہ بنالے۔ف۔ یہ الفاظ تو غریب ہیں۔ لیکن یہ حکم حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں اس طرح ہے کہ رسول اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھے تو سترہ کی جانب پڑھے اور کسی کو اپنے سامنے گذرنے نہ دے پھر بھی اگر وہ نہ مانے تو اس سے قتال کرے کیونکہ اس کے ساتھ شیطان ہے، ابن حاکم اور حاکم نے اس کی روایت کی ہے، اور اسی جیسی حدیث حضرت ابو سعید خدریؓ سے مرفوعا مروی ہے، ابوداؤد نسائی اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حدیث کے حکم کو استحباب پر محمول کیا، لیکن جب بغیر سترہ کے عام گذرگاہ پر کوئی نماز پڑھے گا تو یقیناً وہ گنہگار ہوگا کیونکہ یہ خود اس کا ذمہ دار ہوگا اور اس کی سند بھی یقیناً یہی حدیث ہوگی۔ لہٰذا تحقیقی بات یہ ہوگی کہ حدیث کے حکم کی وجہ سے سترہ کھڑا کرنا واجب ہوگا، لیکن جس جگہ لوگوں کے گذرنے کا صرف احتمال ہو وہاں سترہ مستحب ہوگا اس قاعدہ کی وجہ سے کہ **رفع الحكم يرفع العلة**، یعنی علت کے ختم ہو جانے سے حکم بھی ختم ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مصنفؒ کی بعد میں آنے والی عبارت **لا باس بترك السترة الخ** سے اسی کی تائید ہوتی ہے، اور واجب تو ہونا ہی چاہئے کیونکہ ایسی جگہوں میں گذرنے کو حرام یا مکروہ تحریمی قرار دیا گیا ہے۔م۔ **ومقدار ها الخ** اور سترہ کی مقدار کم از کم ایک ذراع اور اس سے زیادہ جتنی بھی ہو، **لقوله عليه السلام** رسول اللہ علیہ کی اس فرمان کی وجہ سے کہ اگر تم میں سے کوئی میدان میں نماز پڑھ رہا ہو کیا وہ اس بات سے عاجز ہو جائے گا کہ اس کے سامنے کجاوہ کے پچھلے حصہ کے برابر ہو۔ف۔ موخرہ سے مراد وہ لکڑی ہے جو کجاوہ کے پیچھے بیٹھنے والے کے سر کے برابر ہوتی ہے، یہ الفاظ غریب ہیں، بلکہ رسول اللہ علیہ سے روایت ہے کہ جب تم نے اپنے سامنے مؤخرۃ الرحل کے مثل کر لیا تو پھر تمہارے سامنے کسی کے گذرنے سے بھی کوئی نقصان نہ ہوگا، مسلم نے حضرت طلحہؓ سے اس کی مرفوعا روایت کی ہے، اسی جیسی ابوذرؓ سے بھی ہے، اور صحیح مسلم میں حضرت ام المومنین عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ سے نمازی کے سترہ کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے مثل موخرۃ الرحل فرمایا، جیسا کہ عینی میں ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس حدیث میں مثل موخرۃ الرحل سے مراد اتنی اونچی چیز ہے جو بیٹھنے والے کے سر کے برابر ہو، یہ ایک ذراع سے زیادہ ہوگی، مبسوط میں حضرت ابن مسعودؓ کا قول ذکر کیا ہے کہ تیر کا سترہ ہونا کافی ہے، ذخیرہ میں کہا ہے کہ تیر کی لانبائی ایک ذراع اور موٹائی انگلی کے برابر ہوتی ہے، اسی لئے مصنفؒ نے کہا **وقيل وينبغي الخ** اور کہا گیا ہے کہ موٹائی میں ایک انگلی کے برابر ہونا چاہئے، کیونکہ اس سے کم موٹائی تو دور سے دیکھنے والوں کو نظر نہیں آئے گی، اور مقصود حاصل نہ ہوگا:ف۔ شیخ الاسلامؒ نے شرح مبسوط میں اس حدیث عنزہ سے یہ استدلال کیا ہے جس کا بیان عنقریب آئے گا عنزۃ کی لانبائی ایک ذراع

اور موٹائی ایک انگلی کے برابر ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ عنزہ عصاء (ہاتھ کا ڈنڈا) ہوتا ہے جس کے نیچے کی طرف نوک دار پھل برچھی لگی رہتی ہے، اور قرینہ سے یہ بات بعید ہے کہ وہ ایک ذراع کے برابر ہو اگرچہ موٹائی میں ایک انگلی کے برابر ہونے کا احتمال ہے، اس لئے مؤخرۃ الرحل کا اندازہ بہتر ہے، اور ایک آدمی کے بیٹھے ہونے کے برابر اونچائی ہے، لیکن بخاریؒ نے تاریخ میں حضرت ابن عمرؓ سے مرفوع روایت کی ہے کہ آدمی نماز میں سترہ ضرور قائم کرے اگرچہ تیر کے ساتھ ہو، یہ ذراع کے قول کے لئے مفید ہے۔ واللہ اعلم۔م۔

اگر آدمی قبلہ رو بیٹھا ہوا سے سترہ کر لینا جائز ہے، اور کھڑا ہو تو اس میں اختلاف ہے، اگر سواری کے پایہ ہی کو سترہ بنالیا جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، شیخ الاسلامؒ نے کہا ہے کہ اگر اپنی قبا یا ترکش کو سامنے رکھ کر سترہ بنالیا جو ایک ذراع کے برابر اونچا ہو تو بلا اختلاف جائز ہے، اور اگر ایک ذراع سے کم ہو تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، غریب الروایہ ابو جعفرؒ میں ہے کہ بڑا دریا مثل راستہ کے سترہ نہیں ہے جیسے بڑا حوض، مختصر البحر المحیط میں ایسا ہی ہے، اونچی ٹوپی، گاؤ تکیہ اور بستر کا سترہ جائز ہے، اور قنیہ میں پاک جانور کا سترہ جائز ہے بخلاف خچر و گدھے کے، مرد کی پیٹھ کا سترہ جائز اور منہ کا سترہ منع ہے، لیکن پہلو کو سترہ بنانے میں تردد ہے، اور عورت، پاگل کو سترہ بنانا ممنوع ہے، اور سوئے ہوئے مرد کے ساتھ سترہ بنانے میں اختلاف ہے۔ مع۔

ويقرب من الستره لقوله عليه السلام: من صلى الى سترة فليدن منها، ويجعل السترة على حاجبه الايمن او على الايسر، به ورد الاثر، ولا بأس بترك السترة اذا امن المرور، ولم يواجه الطريق، وسترة الامام سترة للقوم، لانه عليه السلام صلى ببطحاء مكة الى عنزة، ولم يكن للقوم سترة، ويعتبر الغرز دون الالقاء والخط، لان المقصود لايحصل به.

ترجمہ:-اور سترہ سے قریب ہو جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جو سترہ کی طرف نماز پڑھے وہ اس کے قریب ہو جائے، اور سترہ کو اپنے دائیں اور بائیں کسی ایک کے سامنے کرے، اسی کے ساتھ اثر وارد ہوا ہے، اور اس صورت میں سترہ چھوڑ دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے جبکہ لوگوں کے گذرنے سے اطمینان رہے، اور اس کے سامنے بھی نہ ہو، اور امام کا سترہ مقتدی کا بھی سترہ ہو جاتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بطحاء مکہ میں عنزہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہے، اور اس وقت قوم کے لئے کوئی سترہ نہ تھا، اور سترہ کے گڑے ہونے کا اعتبار ہوگا اس کے ڈالنے کا اعتبار نہ ہوگا یا کسی لکیر کھینچنے کا اعتبار نہ ہوگا کیونکہ ان چیزوں سے مقصود حاصل نہیں ہوتا ہے۔

توضیح:-سترہ سے قریب اور سامنے ہونا، امام کا سترہ ہی مقتدی کے لئے سترہ ہوتا ہے، سترہ کو گاڑنا

ويقرب من الستره لقوله عليه السلام: من صلى الى سترة فليدن منها......الخ

اور سترہ کے نزدیک رہے، کیونکہ حدیث میں ہے کہ جو کوئی سترہ کی طرف نماز پڑھے تو اس سے قریب رہے۔ف۔ تاکہ شیطان اس کے اور سترہ کے درمیان سے نہ گذرے یہ روایت بزار نے جبیر بن مطعمؓ سے مرفوعا بیان کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ روایت بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق ہے، اور طبرانی نے بھی اس کی روایت کی ہے، اور اسی جیسی سہل بن ابی خثمہ کی حدیث بھی ہے، جسے ابوداؤد، نسائی، ابن حبان اور حاکم نے بیان کیا ہے، اور حدیث ابو سعیدؓ سے منقول ہے، جس کی روایت ابن حبان نے کی ہے، اور سہل بن سعدؓ کی بھی ہے جسے طبرانی نے بیان کیا ہے، اور بریرہؓ کی بھی حدیث ہے جس کی روایت بزار نے کی ہے۔ مع۔

ويجعل السترة على حاجبه الايمن او على الايسر، به ورد الاثر......الخ

اور سترہ کو اپنے دائیں یا بائیں بھوں کے مقابل رکھے۔ف۔ یعنی دونوں آنکھوں کے درمیان نہ رکھے۔ع۔اسی کیساتھ اثر وارد

ہوا ہے۔ف۔ اثر یعنی حدیث ہے، جیسا کہ اسے ابوداؤد، احمد، طبرانی اور ابن عدی نے حضرت مقداد بن الاسودؓ سے بیان کیا ہے، لیکن اس کی اسناد میں کلام ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے، اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ایسے موقع پر ہمارے لئے ایسی اسناد بھی کافی ہے، ولاباس الخ اور ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ اس جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سترہ رکھنے کی علت گذرنے والے کا یقینی طور سے گذرنا ہی نہیں ہے بلکہ درمیانی درجہ کا ہو کہ گذرنے کا احتمال رکھتا ہو، اسی لئے جہاں غالب گمان یہ ہو کہ اس جگہ کوئی نہیں گذرے گا وہاں سترہ چھوڑ دینے میں بھی کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، اور اس سے اس بات کا بھی فائدہ ہوتا ہے کہ اطمینان کی صورت میں سترہ رکھنا مستحب ہے، تبیین الحقائق میں کہا ہے کہ دائیں بھوں کے مقابل سترہ رکھنا افضل ہے، اور عینیؒ نے بھی یہی ذکر کیا ہے، لیکن ابن السکنؒ کی روایت میں صرف دائیں بائیں بھوں کے مقابل رکھنے کا ذکر ہے، لہٰذا افضلیت کے دعویٰ میں تامل ہے۔م۔

وسترة الامام سترة للقوم، لانه عليه السلام صلى ببطحاء مكة الى عنزة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ اس حدیث کی روایت بخاری اور مسلم نے ابوجحیفہ سے کی ہے، پھر فرض نماز سے فارغ ہو کر جب لوگ اپنی نمازوں میں نوافل اور سنن میں مشغول ہوں گے تو ظاہر ہے کہ اس وقت امام کا سترہ لوگوں کے لئے کافی نہ ہوگا، لیکن میں نے جزئیہ کہیں دیکھا نہیں ہے۔م۔

ويعتبر الغرز دون الالقاء والخط، لان المقصود لايحصل به......الخ

سترہ رکھتے وقت اس کے گاڑ دینے کا اعتبار ہوتا ہے اس کے ڈال دینے یا لکیر کھینچ دینے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ف۔ یعنی امام ہو یا تنہا ہو سترہ اس طرح بنائے کہ اسے کھڑا گاڑ دے، اور زمین پر ڈال نہ دے کہ کھڑا ہونے کا ہی اعتبار ہوتا ہے ڈال دینے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، اور اگر کوئی سترہ بنا کر گاڑ دینے کے لائق نہ ہو تو سامنے صرف لکیر کھینچ دینے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، لان المقصود الخ کیونکہ اس سے مقصود حاصل نہ ہوگا۔ف۔ سترہ کو زمین میں توڑ الدینے یا ایک لکیر کھینچ دینے کا اعتبار نہیں ہوتا ہے، کیونکہ سترہ کا مقصود تو یہ ہے کہ گذرنے والا اسے دیکھ کر باہر سے گذرے اندر نہ آئے۔

اس جگہ دو مسئلے ذکر کئے گئے ہیں (۱) یہ لکڑی کا ڈال دینا کافی نہیں ہے۔ الکافی نے اسی کو اختیار کیا ہے، اور اسی قول کو قاضی خان وغیرہ نے صحیح کہا ہے۔ البحر۔ اور یہی اصح ہے۔ الخلاصہ۔ اور یہی قول مختار ہے۔ الواقعات والقنیہ، شیخ الاسلامؒ نے مبسوط میں سترہ کو طول میں یعنی مغرب کی طرف لانبائی میں ڈالدینے کا اعتبار کیا ہے۔ع۔ التبیین۔ خط کھینچنے کے مسئلہ میں امام اعظمؒ سے دو روایتیں مروی ہیں، لیکن عامہ مشائخ کے نزدیک خط کا کوئی اعتبار نہیں ہے، مرغینانیؒ نے کہا ہے کہ یہی صحیح ہے، واقعات میں بھی یہی ہے، مصنفؒ نے بھی اسی قول کو قبول کیا ہے۔ھ۔ع۔

اور ایک جماعت کے نزدیک لکیر خواہ لانبائی میں ہو یا محراب کی شکل کا ہو معتبر ہے، جیسا کہ ابوداؤدؒ نے دوسرے علماء سے نقل کیا ہے، ابوہریرہؓ سے مروی حدیث کی وجہ سے جسے ابوداؤد، ابن ماجہ اور ابن ابی شیبہؒ نے بیان کیا ہے، اور ہم نے بھی ينبغى لمن يصلى کے ماتحت اسے ذکر کر دیا ہے، اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہی سنت اتباع کے لئے زیادہ لائق بتایا ہے، لیکن عینیؒ نے عبدالحقؒ سے اسے ضعیف اور ابن حزم سے اسی کے متعلق ثابت نہ ہونے کا قول بھی ذکر کیا ہے، اور شاید ابن الہمامؒ نے اس دعویٰ کو تسلیم ہی نہیں کیا ہے، اور کہا ہے کہ سترہ کا اصل مقصود تو منتشر خیالات کو روکنا ہوتا ہے، باوجودیکہ خط بھی نظر آرہا ہو، میں مترجم کہتا ہوں کہ جیسا کہ شیخ الاسلام خواہر زادہؒ نے کہا ہے کہ وہ سترہ جو پڑا ہوا ہو وہ بھی نظر آہی جاتا ہے، اس لئے اگر کسی کا جی چاہے تو اس قول کو قبول کر سکتا ہے۔م۔

ويدرأ المار اذا لم يكن بين يديه سترة، او مر بينه و بين السترة، لقوله عليه السلام: فادروا ما استطعتم، ويدرأ بالاشارة كما فعل رسول الله ﷺ بولدى ام سلمةؓ، اويدفع بالتسبيح لما روينا من قبل، ويكره الجمع

بينهما لان باحدهما كفاية.

ترجمہ :-اور جب مصلی کے سامنے سترہ نہ ہو تو سامنے سے گذرنے والے کو دفع کرے یا یہ کہ گذرنے والا اس نمازی اور اس کے درمیان سے گذر رہا ہو، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جہاں تک ہو سکے تم اس کو دفع کرو، اور دفع کرے اشارہ سے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین ام سلمہؓ کے دونوں فرزندوں کو دفع کیا تھا، یا تسبیح کر کے دفع کرے، اس حدیث کی بناء پر جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اور دونوں طریقوں کو جمع نہ کرے کیونکہ ان میں سے ایک بھی ضرورت پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔

توضیح:-نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کو منع کرنا، حدیث سے دلیل بقیہ مفسدات نماز، تعریف عمل کثیر، مختلف ضروری مسائل

ويدرأ المار اذا لم يكن بين يديه سترة، او مر بينه و بين السترة، لقوله عليه السلام: فادروا ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، مااستطعتم جہاں تک تم سے ہو سکے۔ف۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ جب تم میں سے کوئی نماز پڑھ رہا ہو اور اس کے سامنے سے کوئی گذر رہا ہو تو اس سے جہاں تک ممکن ہو کسی کو بھی سامنے سے جانے نہ دے، پھر بھی اگر وہ انکار کرے یعنی نہ مانے تو اس سے قتال کرے کہ وہ تو شیطان ہے، اس کی روایت بخاری اور مسلم دونوں نے کی ہے، اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایسا ہی مرفوعا روایت ہے، مسلم نے اس کی روایت بخاری اور مسلم دونوں نے کی ہے، اسی بناء پر بعض مشائخ نے کہا ہے کہ ایسے شخص سے قتال کرنا جائز ہے، اور اگر واقعۃً اسے قتل کر دیا جائے تو امام شافعیؒ کے نزدیک اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا۔ مع۔ اور ہمارے علماءؒ کے نزدیک اگرچہ گناہ نہ ہو پھر بھی دنیاوی احکام جاری ہوں گے، اسے کس طرح روکا جائے؟...... تو فرمایا یدرأ الخ اپنے اشارہ سے دفع کرے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین ام سلمہؓ کے دونوں بیٹوں کو منع کیا تھا۔ف۔ جب کہ ام سلمہؓ کے کمرہ میں نماز پڑھی تھی جیسا کہ ابن ماجہ نے اپنی سنن میں روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ اس کے راوی محمد بن قیس وہی ہیں جنہیں عمر بن عبد العزیزؒ نے قاضی بنایا تھا، ان سے امام مسلمؒ نے روایت بیان کی ہے۔ف۔ع۔ پھر سر یا آنکھ یا ہاتھ وغیرہ کے اشارے سے ہو۔ الکافی۔ھ۔

اويدفع بالتسبيح لما روينا من قبل، ويكره الجمع بينهما لان باحدهما كفاية......الخ

یا تسبیح کہہ کر اسے دفع کرے۔ف۔ یوں کہے سبحان اللہ تاکہ وہ ہوشیار ہو جائے اور نمازی کے سامنے نہ آئے، اس حدیث کی بناء پر جو ہم نے پہلے ہی روایت کر دی ہے۔ف۔ کہ جب نماز میں کوئی واقعہ پیش آئے تو تسبیح پڑھے، جیسا کہ صحاح میں ہے؛ لیکن یہ حکم مردوں کے لئے، اور عورتیں اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کی پشت پر مارے، **ويكره الجمع** الخ اشارہ اور تسبیح دونوں کاموں کو ایک ساتھ جمع نہ کرے، کہ ایسا کرنا مکروہ ہے اس لئے کہ اس سے بھی تو ضرورت پوری ہو جاتی ہے، یعنی صرف اشارہ کر دے یا تسبیح پڑھ دے، خلاصہ یہ ہے کہ نماز سے زائد از ضرورت کام جس قدر تھوڑے عمل سے پورا ہو جائے اسی پر بس کرے۔

چند ضروری مسائل

یہاں سے اب کچھ دوسرے مفسدات نماز کا بیان شروع کیا جا رہا ہے:

(۱) اول تو یہ ہے کہ عمل کثیر مفسد نماز ہوتا ہے، اور عمل قلیل مفسد نہیں ہوتا ہے، محیط سرخسی، مصنفؒ نے اسی چیز کو ضمناً ذکر کیا ہے۔م۔

(۲) عمل کثیر ایسا عمل ہے جسے دور سے دیکھنے والا یہ یقین کر لے کہ یہ شخص نمازی نہیں ہے، تو یہ عمل مفسد نماز ہوگا، اور اگر اسے یقین نہ آئے یعنی شک ہو تو مفسد نہیں ہے، یہی اصح قول ہے۔ التبیین۔ یہی احسن ہے۔ محیط السرخسی۔ اسی کو عامہ مشائخ

نے پسند کیا ہے، القاضی خان۔ الخلاصہ۔

(۳) اگر کوئی شخص تلوار پہنے یا بدن سے اتارے یا اٹھانے کی کوئی چیز ایک ہاتھ سے اٹھائے، یا بچہ یا کپڑے کو کندھے پر اٹھایا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ القاضی خان۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ پھر قرآن پاک کو اٹھا کر پڑھنے اور ورق الٹنے میں نماز فاسد ہونے کی علت اسے اٹھانا نہیں ہو سکتا ہے بلکہ فساد کی علت سیکھنا اور حاصل کرنا ہے، جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

(۴) کھانا اور پینا دونوں ہی مفسد نماز ہے، خواہ بالقصد ہو یا بھول کر۔ القاضی خان۔ نصاب میں ہے کہ نماز سے پہلے کسی نے کھایا پیا پھر نماز شروع کی اور اس کے منہ میں کھانے یا پینے کا کچھ بچا ہوا یا اٹکا ہوا رہ گیا تھا جسے وہ نگل گیا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اسی پر فتویٰ ہے۔ المضمرات۔ اگرچہ شیرینی ہو۔ الخلاصہ۔

(۵) دانتوں کے درمیان کا کھانا کوئی نمازی نگل گیا تو نماز فاسد نہ ہوگی اگرچہ چنا کے برابر ہو۔ البدائع۔ اور بقائیؒ نے کہا ہے کہ یہی اصح ہے۔ البرجندی۔

(۶) دانتوں کا خون نگلنا مفسد نہیں ہے جبتک کہ منہ بھر نہ ہو۔ قاضی خان۔ الخلاصہ۔ المحیط۔

(۷) اگر نماز میں ایک تل لے کر منہ میں ڈال کر نگل گیا تو مفسد نہیں ہوگا، یہی اصح ہے۔

(۸) اور اگر شکر منہ میں ڈالے اور منہ بغیر چلائے اس کی مٹھاس پیٹ میں جائے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ الخلاصہ۔ یہی مختار ہے۔ الظہیریہ۔

(۹) چراغ کی بتی اٹھانا مفسد نہیں ہے، چراغ میں فتیلہ یا بتی ڈالنا مفسد نہیں ہے۔ السراج۔ القاضی خان (۱۰) اگر منہ بھر کر قئی ہوئی تو طہارت جاتی رہی۔ مگر نماز فاسد نہیں ہوئی، اور اگر منہ بھر نہ ہو تو طہارت بھی باقی رہی اور نماز بھی باقی رہی۔

(۱۱) اگر منہ بھر قئی کو تھوک سکتا تھا مگر نگل گیا، تو نماز فاسد ہوگی، اور اگر منہ بھر نہ ہو تو بھی بقول محمدؒ مفسد ہے اور یہی احوط ہے۔ قاضی خان۔

(۱۲) اگر قصداً قئی کی پس اگر منہ بھر ہو تو مفسد ہوگی ورنہ نہیں۔ المحیط۔

(۱۳) اگر نماز کی حالت میں کوئی شخص چلا پس اگر قبلہ رخ رہا تو مفسد نہیں ہے بشرطیکہ لگاتار نہ ہو اور مسجد سے باہر نہ ہوا ہو اور اگر میدان میں ہو تو جب تک صفوں سے نہ نکلے۔ المنیہ۔

(۱۴) اگر نماز کی حالت میں دو صفوں کی مقدار چلا، اگر ایک ساتھ چلا ہو تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر صف تک چل کر ٹھہر گیا، پھر چل کر صف سے نکلا تو نماز فاسد نہ ہوگی۔ القاضی خان۔ درمیان میں ٹھہرنا ایک رکن کے اندازے سے ہو۔ د۔ امام محمد بن الحسنؒ نے سیر کبیر میں ارزق بن قیس سے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ابو بردہؓ کو دیکھا کہ وہ اپنے گھوڑے کی قباد پکڑے ہوئے نماز پڑھتے تھے یہاں تک کہ دو رکعتیں پڑھ لیں، پھر وہ قباد ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور گھوڑا قبلہ رخ چلتا رہا، پس ابو بردہؓ نے آگے بڑھ کر اس کی قباد پکڑ لی، اور الٹے پاؤں پھر کر باقی دونوں رکعتیں پڑھ لیں، امام محمدؒ نے کہا کہ ہم اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، بشرطیکہ قبلہ کی طرف پیٹھ نہ پھیرے، اس روایت میں تھوڑا اور زیادہ چلنے کی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قبلہ رخ چلنا کچھ مفسد نماز نہیں ہے، اس اثر کو بخاریؒ نے آدم عن شعبہ عن ارزق بن قیس روایت کیا ہے، اس اثر کی بناء پر بہت سے مشائخ نے اس کی تاویل مختلف طور سے کی ہے، کہ ایک دو قدم چلا ہو، یا ایک صف یا درمیان میں ٹھہر ٹھہر کر ہو، اور مرغینانیؒ نے کہا ہے کہ مختار مذہب یہ ہے کہ جب زیادہ ہو تو مفسد ہے۔

(۱۵) اور رکن الاسلام سعدیؒ نے اپنی اسناد سے نقل کیا ہے کہ اگر غازی یا حاجی یا مسافر مطیع و فرماں بردار ہو تو اس کا قبلہ رخ چلنا اگرچہ زیادہ مفسد نہیں ہوگا۔ مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ فیصلہ بہت عمدہ ہے کہ اس طرح کہ تمام آثار میں موافقت باقی رہ گئی، اور اس کے ماسوا میں اختلاف باقی رہتا ہے۔ سمجھ لیں۔

اب یہاں سے کچھ مسائل عمل کثیر کے بیان ہوں گے۔م۔

(۱۶)اور دونوں ہاتھوں کے اٹھانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے۔الخلاصہ۔اسی کو تنویر وغیرہ میں بھی ذکر کیا ہے، لیکن مرغینانیؒ نے اور کچھ دوسروں نے اتنے عمل کو مکروہ قرار دیا ہے، اب حق بات تو یہ ہے کہ اجتہادی مسائل میں مطلقا کراہت نہیں ہوتی ہے، یہی حق ہے۔م۔

(۱۷)سواری کے جانور کو ایک پانوں کی ایڑ سے چلانا مفسد نہیں ہے۔الخلاصہ المحیط۔اور یہی اوجہ ہے۔البحر۔

(۱۸)اور اگر بار بار اور زیادہ ہو، اور کہا گیا ہے کہ دونوں پاؤں سے حرکت دینا مطلقاً(کم ہو یا زیادہ) مفسد ہے۔الخلاصہ۔

(۱۹)اگر قدرت واختیار ہونے کے باوجود کوئی نمازی قبلہ سے اپنا سینہ پھیر دے تو نماز فاسد ہو جائے گی۔

(۲۰)اور صرف چہرہ پھیرا ہو تو فاسد نہ ہوگی بشرطیکہ فوراً سیدھا کرلے۔الذخیرہ۔اور اگر کسی عذر کی وجہ سے ہو مثلاً حدث کا گمان ہو گیا ہو تو اس کا جواب گذر چکا ہے۔م۔

(۲۱)اگر کوئی شخص بغیر عذر امام سے آگے بڑھ گیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔القاضی خان۔

(۲۲)جنگل میں جائے نماز میں کھڑے ہونے کی جگہ سے اگر کوئی اتنا پیچھے ہٹا کہ جتنی جگہ میں سجدہ کیا جا سکتا ہے تو اس سے نماز فاسد نہ ہوگی اس طرح اس کے دائیں و بائیں بھی اتنی ہی جگہ معتبر ہے، اور اتنی جگہ کو مسجد کا حکم ہوگا، جیسے قبلہ کی جانب میں ہے، اس کے بعد باہر نکلنے سے نماز فاسد ہو جائے گی، ورنہ نہیں۔

(۲۳)اور اگر اپنے چاروں طرف لکیر کھینچ دی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔المحیط۔

(۲۴)اگر امام مغرب کی نماز میں بھول کر کھڑا ہو گیا اور مقتدی نے جان بوجھ کر اس کی اتباع کی تو مقتدی کی نماز فاسد ہوگی۔

(۲۵)اور اگر امام نے چوتھی رکعت کا سجدہ کرلیا تو اس کی نماز بھی فاسد ہوگی۔م۔

(۲۶)عورت کے نماز پڑھتے ہوئے اس کے لڑکے نے اس کا دودھ چوسا پس اگر دودھ نکلا تو نماز فاسد ہوگی ورنہ نہیں۔محیط السرخسی۔

(۲۷)اور اگر تین بار چوسا تو بھی فاسد ہوگی اگرچہ دودھ نہ نکلا ہو۔ قاضی خان۔الخلاصہ۔

(۲۸)عورت نماز پڑھ رہی تھی کہ اس کے شوہر نے اس کی رانوں کے درمیان فرج کے مقام کے علاوہ جگہ میں آلہ تناسل داخل کر دیا تو اس کی نماز فاسد ہو گئی، اگرچہ عورت کی تری نہ نکلی ہو۔

(۲۹)اور اگر یوں ہی عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا یا شہوت یا بغیر شہوت کے بوسہ لیا تو عورت کی نماز فاسد ہے۔

(۳۰)اور اگر مرد نماز پڑھ رہا تھا اور عورت نے اس کا بوسہ لے لیا پس اگر مرد کو اس سے شہوت نہیں ہوئی تو نماز فاسد نہ ہوگی۔

(۳۱)اگر مطلقہ رجعیہ کی فرج کو شہوت کے ساتھ دیکھا تو طلاق سے رجوع ثابت ہو جائے گی، اور نماز فاسد نہیں ہوگی، یہی مذہب مختار ہے۔الخلاصہ۔

(۳۲)اگر اپنی نماز میں ایک رکوع یا ایک سجدہ زیادہ کیا تو ظاہر الروایۃ میں نماز فاسد نہ ہوگی۔

(۳۳)اسی طرح جب دو سجدے یا زیادہ بڑھا دئے تو بھی نماز فاسد نہ ہوگی۔

(۳۴)اور اگر نماز پوری ہونے سے پہلے ایک رکعت پوری پڑھائی تو نماز فاسد ہوگی۔المحیط۔

(۳۵)تکبیرات زوائد میں ہاتھ اٹھانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، یہی مذہب ہے۔

(۳۶)نماز کو فاسد کرنے والی چیزوں میں سے نجس شئی پر سجدہ کرنا بھی ہے اگرچہ فوراً ہی کسی پاک چیز پر اس کا اعادہ بھی کرلیا

جائے، قول اصح کے مطابق ہے۔

(۳۷) ایک رکن کا اندازہ تین بار تسبیح ادا کرنا ہے، یا اتنے کرنے کے اندازے سے ٹھہرنا شرم گاہ کھلے ہوئے ہونے کی حالت میں یا اتنی نجاست کے ساتھ جو نماز کے لئے مانع ہے، اور نماز پڑھی ایسے سلے ہوئے کپڑے پر جس کا استر ناپاک ہو۔ ت۔

(۳۸) کیا مفسد ہونے کے لئے اختیار شرط ہے، تو خبازیہ میں کہا ہے کہ ہاں اور حلبیؒ نے کہا ہے کہ نہیں۔ د۔ اور یہی اصح ہے۔ م۔ مفسدات میں سے یہ چیزیں بھی ہیں۔

(۳۹) دل سے مرتد ہو جانا، مر جانا، دیوانہ ہونا، بے ہوش ہونا، ہر وہ چیز جس سے غسل کرنا لازم آتا ہو۔

(۴۰) کسی رکن کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کی قضاء نہ کی گئی ہو۔

(۴۱) بلا عذر کسی شرط کو چھوڑنا۔

(۴۲) مقتدی کا امام سے پہلے رکوع کرنا اور سر اٹھانا، جبکہ دوسری مرتبہ امام کے ساتھ ادا نہ کیا ہو۔

(۴۳) مسبوق کا منفرد ہو جانے کے بعد یعنی رکعت کا سجدہ کرنے کے بعد امام کے سجدہ سہو میں متابعت کر کے شریک ہونا، سلام کے بعد نماز کا سجدہ یا تلاوت کا سجدہ یاد کر کے اس کو قضاء کر کے پھر قعدہ چھوڑ دینا۔

(۴۴) خواب کی حالت میں جس رکن کو ادا کیا ہو جاگنے کے بعد اسے دوبارہ نہ کرنا۔

(۴۵) ایسے مسبوق کی نماز کے درمیان جو مقیم نہ ہو امام کا قہقہہ وغیرہ ایسا کوئی کام کر لینا جو مفسد نماز اور وضوء ہو، ان کے علاوہ مفسدات میں سے قراءت میں کچھ مفسد صلوۃ کرنا جن کا بیان مفصلاً گذر چکا ہے۔

فصل: ويكره للمصلي ان يعبث بثوبه اوبجسده، لقوله عليه السلام: ان الله تعالى كره لكم ثلاثا وذكر منها العبث في الصلوة، ولان العبث خارج الصلوة حرام، فما ظنك في الصلوة، ولايقلب الحصا، لانه نوع عبث الا ان لايمكنه من السجود، فيسويه مرة لقوله عليه السلام: مرة يا اباذر والا فذر، ولان فيه اصلاح صلاته.

ترجمہ:- نمازی کے لئے یہ بات مکروہ ہے کہ اپنے کپڑے یا اپنے بدن سے کام کرے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تین چیزوں کو ناپسند کیا ہے، اور ان میں سے نماز میں غیر مفید کام کو بھی ذکر کیا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ جب نماز کے باہر کھیلنا حرام ہے تو تمہارا نماز کے اندر بے فائدہ کام کرنے کے متعلق کیا گمان ہو سکتا ہے، اور کنکریوں کو الٹ پلٹ نہ کرے کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا بے فائدہ کام ہے، البتہ اگر کسی وقت سجدہ کرنا کسی زمین پر ممکن نہ ہو تو ایک مرتبہ اسے برابر کر لے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا ہے، اے ابوذر! صرف ایک مرتبہ کر لو، ورنہ اسے بھی چھوڑ دو، اور اس لئے کہ اس میں نمازی کی نماز کی اصلاح ہے۔

توضیح:- فصل، نماز کی مکروہات کا بیان، کپڑے یا جسم کے ساتھ کھیلنا حدیث سے دلیل، کنکریاں لوٹنا، انگلیاں چٹخانا، حدیث سے دلیل

فصل: یہ فصل مکروہات نماز کے بیان میں ہے۔ ف۔ اس کے ماتحت عمل کثیر کے کچھ مسائل ذکر کئے جائینگے، کیونکہ اس کی تعریف میں بہت زیادہ اختلاف اور اضطراب واقع ہے۔ م۔

ويكره للمصلي ان يعبث بثوبه اوبجسده، لقوله عليه السلام: ان الله تعالى كره لكم ثلاثا ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ ممنوعہ تین چیزیں یہ ہیں **العبث في صلوة والرفث في الصوم والضحك في المقابر**، نماز میں بیہودہ حرکت کرنا، روزہ کی حالت میں رفث (عورتوں سے دل لگی کی باتیں) کرنا، اور قبروں میں ہنسنا، قضاعی نے اس کی روایت اپنی سند میں اس طرح کی ہے، (۱) عبد اللہ بن المبارک سے انہوں نے (۲) اسمٰعیل بن عیاش سے انہوں نے (۳)

عبداللہ بن دینار سے انہوں نے (۴) یحییٰ بن کثیر سے مرسل روایت کی ہے، ذہبیؒ نے میزان میں کہا ہے کہ یہ روایت اسمٰعیل بن عیاش کی منکرات میں سے ہے، ابن طاہر نے کہا ہے کہ یہ حدیث مقطوع ہے، اس الزام کا جواب یہ ہے کہ (۱) عبداللہ بن المبارک تو وہ ہیں جو تمام بڑے ائمہ محدثین کے نزدیک ثابت اور معتبر ہیں، اور (۲) اسمٰعیل بن عیاش کی وہ روایتیں جو اہل شام سے ہوں وہ صحیح ہیں ان کے بارے میں ابن معین نے کہا ہے کہ یہ ثقہ ہیں، اور (۳) عبداللہ بن دینار کو ابو علی النیشا بوری الحافظ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک ثقہ ہیں (۴) یحییٰ بن کثیر ثقہ ہیں جنہوں نے انسؓ کو دیکھا مگر کچھ سنا نہیں ہے لہٰذا یہ تابعی ہوئے، اور تابعی کی مرسل روایت حجت ہوتی ہے۔ مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یحییٰ نے ضرور کسی تابعی سے سن کر روایت کی ہے، لہٰذا بلا شبہ مقطوع ہے۔ م۔ "رفث" جماع یا ہر وہ چیز جس کی خواہش عورت سے کی جائے۔ ع۔

وذکر منھا العبث فی الصلوۃ......الخ

اس حدیث میں ان تین چیزوں میں سے ایک چیز نماز میں عبث کرنا بھی ذکر فرمایا ہے اس طرح عبث بھی مکروہ ٹھہرا **ولان العبث الخ** اور اس وجہ سے بھی کہ جب عبث نماز کے باہر حرام ہے تو بدرجہ اولیٰ نماز میں ممنوع ہوگا۔ ف۔ لہٰذا نماز میں بدرجہ اولیٰ حرام ہوا، لیکن عینیؒ وغیرہ نے کہا ہے کہ نص میں تو نماز کے اندر عبث مکروہ ہے اس لئے نماز کے باہر تیرا کیا گمان ہے یعنی مکروہ بھی نہیں ہے بلکہ خلاف اولیٰ ہوگا، اور نماز کے باہر عبث کے حرام ہونے پر تو کوئی دلیل نہیں ہے، تاج الشریعہ نے کہا ہے کہ عبث ہر وہ فعل ہے جس میں غرض صحیح نہ ہو۔ مع۔ پس اگر اس میں کوئی غرض صحیح ہو جیسے پیشانی سے پسینہ یا گرد و غبار جھاڑنا تو یہ عبث نہیں ہوگا۔ الفتح۔

ولایقلب الحصا، لانہ نوع عبث الا ان لایمکنہ من السجود، فیسویہ مرۃ......الخ

اور کنکریوں کو الٹ پلٹ نہ کرے، کیونکہ یہ بھی ایک فعل عبث ہے، البتہ اگر کسی وقت اس کے بغیر سجدہ کرنا ممکن نہ ہو، تکلیف دہ ہو جائے۔ ف۔ کنکریوں پر سجدہ کرنے میں مشقت محسوس ہو **فیسویہ مرۃ الخ** تو صرف ایک مرتبہ برابر کردے۔ ف۔ یہی ظاہر الروایۃ ہے، اور غیر ظاہر الروایۃ میں دو مرتبہ کی بھی اجازت ہے۔ المنیہ۔ اور ایک مرتبہ بھی نہ کرے تو بہت بہتر ہے۔ الخلاصہ۔

لقولہ علیہ السلام: مرۃ یا اباذر والا فذر، ولان فیہ اصلاح صلاتہ......الخ

اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے اے ابوذر! ایک بار، ورنہ وہ بھی چھوڑ دو۔ ف۔ ان الفاظ سے حدیث نہیں پائی گئی ہے، اور مبسوط وغیرہ میں لفظ ذر کی مناسبت سے یہ عبارت بنائی ہوئی ہے، ابوذرؓ سے مشہور ہے وہ یہ کہ جبکہ انہوں نے کنکریوں کو سمیٹنے کے بارے میں سوال کیا تھا تو حضور ﷺ نے فرمایا **واحدۃ اودع**، یعنی ایک بار کرو ورنہ اسے بھی چھوڑ دو، اس کی روایت احمد، عبدالرزاق، ابن شیبہ اور اصحاب السنن نے کی ہے، اسی کے مثل حذیفہؓ سے ہے جس کی روایت احمد اور ابن ابی شیبہ نے کی ہے، اور معیقیبؓ سے مرفوعا ہے کہ جب تم نماز کی حالت میں ہو تو کنکریوں کو ہاتھ نہ لگاؤ، اور اگر انتہائی ضروری ہو تو صرف ایک بار کرو، اس کی روایت صحاح ستہ یعنی بخاری، مسلم اور سنن کی چاروں کتابوں نے کی ہے۔ مع۔ **ولان فیہ الخ** اور اس لئے بھی کہ اس میں نمازی کی نماز کی اصلاح ہے۔ ف۔ جبکہ سجدہ کرنا ممکن نہیں پس ایک بار جائز ہے۔

ولایفرقع اصابعہ لقولہ علیہ السلام لاتفرقع اصابعک وانت تصلی، ولایتخصر، وھو وضع الید علی الخاصرۃ، لانہ علیہ السلام نھی عن الاختصار فی الصلوۃ، ولان فیہ ترک الوضع المسنون، ولا یلتفت لقولہ علیہ السلام لو علم المصلی من یناجی ما التفت، ولو نظر بموخر عینیہ یمنۃ و یسرۃ من غیر ان یلوی عنقہ لا یکرہ، لانہ علیہ السلام کان یلاحظ اصحابہ فی صلاتہ بموق عینیہ.

ترجمہ: - اور اپنی انگلیوں کو نہ چٹخائے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم نماز پڑھتے ہوئے اپنی انگلیوں کو نہ

چٹخائے، اور کولھے پر ہاتھ نہ رکھے، تخصر کے معنی ہیں ہاتھ کو کولھے پر رکھنا کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز کی حالت میں اختصار سے منع فرمایا ہے، اور اس لئے بھی کہ ایسا کرنے میں مسنون طریقہ اور ہیأت کو چھوڑنا پڑتا ہے، اور ادھر ادھر نہ دیکھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اگر نمازی یہ جان لے کہ کس ذات سے سرگوشی کر رہا ہے تو وہ ادھر ادھر نہ دیکھے اگر کسی وقت آنکھوں کے کناروں سے گردن موڑے بغیر دائیں بائیں دیکھ لے تو ایسا کرنا مکروہ نہیں ہوگا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کو اپنی آنکھوں کے کونوں سے اپنی نماز میں دیکھ لیا کرتے تھے۔

توضیح:- نماز میں انگلیاں چٹخانا، حدیث سے دلیل، کوکھ پر ہاتھ رکھنا، حدیث سے دلیل گردن موڑ کر دیکھنا، حدیث سے دلیل، آنکھوں کے کونوں سے دائیں بائیں دیکھنا، حدیث سے دلیل

ولایفرقع اصابعه لقوله علیه السلام لاتفرقع اصابعك وانت تصلی......الخ

اپنی انگلیاں نماز میں نہ چٹخائے۔ ف۔ اسی طرح ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں نہ ڈالے (تشبیک نہ کرے) قاضی خان۔ اس مسئلہ میں ائمہ اربعہ وغیرہم کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ع۔ لقوله علیه السلام الخ حضرت علیؓ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم انگلیاں نماز کی حالت میں مت چٹخاؤ ف۔ یہ روایت ابن ماجہ احمد اور دار قطنی نے حضرت انسؓ سے بیان کی ہے اور دونوں سندیں مطول ہیں۔ مفع۔ بعضوں کے نزدیک نماز کے علاوہ دوسرے حالات میں بھی مکروہ ہے۔ شیخ الاسلام۔ اس کی کراہت کی وجہ یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی قوم کا یہ عمل تھا۔ تاج الشریعہ۔ مع۔ اس بناء پر چونکہ یہ دینی معاملہ نہیں ہے لہٰذا مشابہت کی وجہ سے کراہت تنزیہی ہوگی۔ م۔

ولایتخصر، وهو وضع الید علی الحاصرة، لانه علیه السلام نهی عن الاختصار فی الصلوة......الخ

اور تخصر نہ کرے۔ ف۔ خواہ مرد ہو یا عورت ہو نماز میں ہو یا اس کے باہر ہو بالاتفاق مکروہ ہے۔ ع۔ اس کے معنی ہیں حاضرہ یعنی کوکھ پر ہاتھ رکھنا۔ ف۔ ابن سیرین کی یہی تفسیر ابن ابی شیبہ نے روایت کی ہے۔ ع۔ حدیث میں یہی مراد ہونا اصح ہے۔ ف۔ لانه علیه السلام الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں اختصار یعنی تخصر کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ف۔ اس حدیث کو ابن ماجہ کے علاوہ ائمہ خمسہ نے ابن سیرین عن ابی ہریرۃؓ روایت کیا ہے۔ مع۔

ولان فیه ترك الوضع المسنون، ولا یلتفت لقوله علیه السلام لو علم المصلی من یناجی ما التفت......الخ

اور اس لئے بھی مکروہ ہے کہ ایسا کرنے سے سنت طریقہ چھوڑنا لازم آتا ہے۔ ف۔ لیکن اس سے صرف کراہت تنزیہی ثابت ہوگی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ نماز کی حالت میں تحریمی اور باہر تنزیہی ہے۔ واللہ اعلم۔ ولایلتفت الخ اور نماز میں التفات نہ کرے۔ ف۔ گردن گھما کر۔ المبسوط۔ کہ ایسا کرنا تمام اہل علم کے نزدیک بالاتفاق مکروہ ہے۔ ع۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ اگر نمازی یہ جانتا کہ کس کے ساتھ سرگوشی کر رہا ہے تو التفات نہ کرتا۔ ف۔ یہ الفاظ حدیث میں نہیں آئے ہیں، لیکن طبرانیؒ نے اوسط میں ابوہریرۃؓ سے مرفوعا روایت کی ہے کہ تم نماز میں ادھر ادھر منہ کرنے سے بچو، کیونکہ تم میں کا کوئی بھی نماز میں اپنے رب سے مناجات کرتا ہے، حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز میں التفات کرنے کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ وہ تو اختلاس ہے کہ شیطان اس بندہ کو نماز میں اچک لیتا ہے، اس کی روایت کی ہے بخاری، ابوداؤد، نسائی اور احمدؒ نے، حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ نماز میں التفات کرنا ہلاکت ہے، کرنا ہو تو نفل میں کرو، فرض میں نہیں، اس کی روایت ترمذیؒ نے کی ہے، اور اسے حسن کے ساتھ صحیح بھی کہا ہے۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ پر نماز کی حالت میں برابر توجہ رکھتا ہے جبتک کہ وہ التفات نہ کرے، پھر جب وہ بندہ التفات کرتا ہے تو اللہ بھی اس سے اپنا چہرہ پھیر لیتا ہے، احمد، نسائی اور ابوداؤدؒ نے اس

کی روایت کی ہے۔ع۔

ولو نظر بمؤخر عينيه يمنة و يسرة من غير ان يلوى عنقه لا يكره، لانه عليه السلام......الخ

اگر نمازی نے اپنی آنکھوں کے گوشہ سے دائیں بائیں نظر کی اپنی گردن پھیرے بغیر تو مکروہ نہ ہوگا لانہ علیہ السلام الخ کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ اپنی نماز میں آنکھوں کے کناروں سے اپنے صحابہ کو دیکھا کرتے تھے۔ف۔ چنانچہ ابن ماجہ، ابن حبان، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ثابت ہے۔ مع۔اور آسمان کی طرف نظر اٹھانا مکروہ ہے۔التبیین۔

ولايقعي ولايفترش ذراعيه لقول ابى ذرؓ: نهاني خليلي عن ثلاث ان انقر نقر الديك، وان اقعى اقعاء الكلب، وان افترش افتراش الثعلب، والاقعاء ان يضع اليتيه على الارض و ينصب ركبتيه نصبا، هو الصحيح، ولا يرد السلام بلسانه، لانه كلام ولابيده، لانه سلام معنى حتى لو صافح بنية التسليم تفسد صلوته.

ترجمہ:-اور اقعاء (کتے کی طرح نہ بیٹھے) نہ کرے، اور اپنے ہاتھوں کو نہ بچھائے، حضرت ابوذرؓ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ میرے خلیل نے مجھے تین باتوں سے منع فرمایا ہے کہ میں مرغ کی طرح چونچ مارو، اور (۲) میں کتے کی طرح اقعاء کروں اور یہ کہ (۳) لومڑی کی طرح اپنے ہاتھ بچھاؤں، اقعاء کے معنی ہیں کہ اپنے دونوں سرینوں کو زمین پر رکھے اور دونوں گھٹنوں کو کھڑا کرے، یہی قول صحیح ہے، اور زبان سے کسی کے سلام کا جواب نہ دے، کیونکہ اس طرح یہ کلام ہو جاتا ہے، اور اپنے ہاتھ سے بھی نہیں کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا سلام ہے، یہانتک کہ اگر سلام کی نیت سے کسی سے مصافحہ کر لیا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

توضیح:-اقعاء کرنا یعنی کتے کی بیٹھک، ہاتھ بچھانا، اقعاء کی تعریف، زبان سے سلام کا جواب دینا، قسم کھائی کہ فلاں سے کلام نہ کروں گا اس کے بعد سلام کیا، ہاتھ سے سلام کا جواب دینا، مصافحہ کرنا، مترجم کی طرف سے وضاحت

ولايقعي ولايفترش ذراعيه لقول ابى ذرؓ: نهاني خليلي عن ثلاث ان انقر نقر الديك......الخ

اقعاء نہ کرے۔ف۔ کیونکہ یہ جمہور سلف و خلف کے نزدیک مکروہ ہے۔ع۔اور اپنے بازوؤں کو بھی نہ بچھائے۔ف۔ یعنی سجدہ کی حالت میں اس طرح ہاتھ نہ بچھائے جس طرح لومڑی بچھاتی ہے، حضرت ابوذرؓ کی حدیث کی وجہ سے۔ف۔ حضرت ابوہرہؓ کی حدیث کی وجہ سے، کہ مجھے میرے خلیل نے تین باتوں سے منع کیا ہے، وان انقر الخ (۱) کہ میں مرغ کی طرح چونچ ماروں۔ف۔ یعنی سجدہ کرتے وقت اتنی جلدی اور اتنا آسان کروں کہ دیکھنے میں ایسا معلوم ہو کہ مرغ زمین سے دانہ چننے کے لئے جلدی جلدی چونچ مار رہا ہو۔

وان اقعى اقعاء الكلب، وان افترش افتراش الثعلب......الخ

(۲) اور یہ کہ کتے کی طرح اقعاء کروں۔ف۔ التحیات اور دونوں سجدوں کے درمیان بیٹھنے **وان افترش الخ** اور (۳) یہ کہ لومڑی کی طرح ہاتھ بچھاؤں۔ف۔ یہ روایت احمد اور بیہقی نے بیان کی ہے، اس کی اسناد میں کلام ہے یہانتک کہ نوویؒ نے کہا ہے کہ اقعاء کے بیان میں حضرت عائشہؓ کی حدیث کے ماسوا کوئی بھی حدیث صحیح نہیں ہے، اور وہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عقبۃ الشیطان سے منع فرماتے اور درندے کی طرح ہاتھ بچھانے سے، جیسا کہ مسلم نے روایت کی ہے، عقبۃ الشیطان۔ یہی اقعاء ہے **والاقعاء الخ** اور اقعاء کی صورت یہ ہے کہ نمازی اپنی دونوں سرینوں (چوتڑوں) کو زمین پر رکھ کر دونوں گھٹنے گھڑے کر دے، حدیث کی مراد میں یہی معنی ہونا صحیح قول ہے۔ف۔ فقہاء کی صحیح مراد یہی ہے اور اصح بھی ہے۔المبسوط۔ نوویؒ نے کہا ہے کہ یہی اصح ہے۔اور اقعاء کی دو صورتوں میں سے یہی صورت ممنوع ہے، اور دوسری صورت وہ ہے جو کہ طاؤسؒ نے ابن عباسؓ سے بیان کی ہے کہ دونوں قدموں پر اقعاء سنت انبیاء ہے، جیسا کہ مسلم نے روایت کی ہے۔ مفع۔ دونوں ایڑیوں یا پنجوں پر بیٹھنا یا گھٹنے سینوں

سے ملانا، یہ سب بھی مکروہ ہے۔ الزاہدی۔

ولا یرد السلام بلسانه، لانه کلام......الخ

اپنی زبان سے سلام کا جواب نہ دے، کیونکہ یہ کلام ہے۔ ف۔ اسی لئے اگر کسی نے قسم کھائی کہ فلاں سے کلام نہ کروں گا، پھر اس کو سلام کیا تو حانث ہو جائے گا یعنی قسم ٹوٹ جائے گی، اور سلام کا جواب دیا تو نماز باطل ہو جائے گی، یہی قول امام مالکؒ وشافعیؒ و احمدؒ وابو ثورؒ واسحٰقؒ اور اکثر علماء کرام کا ہے، پھر اس سلام کا جواب کب اور کس طرح دینا چاہئے یا جواب دینا ضروری نہ ہوگا؟ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دل میں جواب دیدے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نہ دل میں جواب دے اور نہ بعد میں، اور امام محمدؒ کے نزدیک سلام پھیرنے کے بعد جواب دے، اور خطابیؒ وطحاویؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابن مسعودؓ کو سلام کے بعد جواب دیا ہے، اور مصلی اور قاری اور واعظ اور قاضی کو سلام کرنا مکروہ ہے۔ د۔

ولا بیده، لانه سلام معنی حتی لو صافح بنیة التسلیم تفسد صلوته......الخ

اور اپنے ہاتھ سے سلام کا جواب نہ دے۔ ف۔ کیونکہ یہ بھی سلام کے معنی میں ہے، یہانتک کہ اگر سلام کی نیت سے مصافحہ کیا تو نماز فاسد ہوگی۔ ف۔ اسی بناء پر اگر اشارہ سے جواب دیا تو فاسد ہونا چاہئے، یہ بات البقالی اور الحسام نے کہی ہے۔ ع۔ زیلعیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے پاس ایک عمدہ حدیث ہے جو ابو داؤد نے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے نماز میں ایسا اشارہ کیا جو سمجھا جاسکے یا جان لیا جائے تو اس نے اپنی نماز باطل کر دی، ابن الجوزیؒ نے فرمایا ہے کہ اس کی اسناد میں محمد بن اسحاق اور ابو غطفان ضعیف ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ محمد بن اسحٰق قول اصح کے مطابق ثقہ ہیں اور ابو غطفان کی ابن معین اور نسائی نے توثیق کی ہے، اور امام مسلمؒ نے اس کی روایت ذکر کی ہے۔ ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس حدیث میں نماز کے باطل اور قطع ہونے سے اس کے خشوع وخضوع کا قطع ہونا مراد ہو تو کراہت تنزیہی ہوگی اور اگر واقعۃً نماز ہی کا قطع ہونا مراد ہو تو اس کے خلاف یہ پیش کی جائے گی جو حضرت صہیبؓ سے مروی ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے گذرا اس وقت آپ نماز میں تھے تو میں نے آپ کو سلام کیا اس پر آپ نے مجھے اشارہ سے جواب دیا، راوی نے کہا مجھے یاد آتا ہے کہ انگلی کے اشارہ سے جواب دیا، اس کی روایت ابو داؤد ونسائی، اور ترمذی نے کی ہے اور ساتھ ہی اس کی تصحیح بھی کی ہے، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضرت بلالؓ سے سوال کیا کہ جب آپ لوگ رسول اللہ ﷺ کو ان کی حالت نماز میں سلام کرتے تو آپ کس طرح جواب دیتے تو انہوں نے جواب دیا کہ ہاتھ سے اشارہ کرتے، اس کی تصحیح ترمذی، ابن خزیمہ اور ابن حبان نے کی ہے، عینیؒ اس موقع میں احتمالات پیدا کئے ہیں کہ شاید جواب کا اشارہ نہ ہو بلکہ منع کا اشارہ ہو، اور شاید کلام کے منسوخ ہونے سے پہلے کا یہ واقعہ ہو۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ہم اشارہ سے جواب کے محروم ہونے کے قائل نہ ہوں، اسی بناء پر خلاصہ میں ہے کہ اگر کسی نے مصلی کو سلام کیا تو اس نے سر یا ہاتھ سے جواب کا اشارہ کیا، یا اسے کوئی خبر دی گئی تو اس نے ہاں یا نہیں کے لئے سر سے اشارہ کیا یا اس سے پوچھا گیا کہ کتنی رکعتیں نماز پڑھی گئی ہیں تو اس نے انگلیوں سے دو یا تین وغیرہ کا اشارہ کیا تو کسی صورت میں بھی نماز فاسد نہ ہوگی غایۃ البیان میں نقل کیا ہے کہ اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی کسی نمازی سے کلام کرے اور وہ سر کے اشارہ سے جواب دے۔ ف۔ ذخیرہ میں ہے کہ نمازی کے لئے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اس کو سر کے اشارہ سے جواب دے، نمازی سے کہا گیا کہ تم آگے بڑھو اور وہ آگے بڑھ گیا، یا کوئی شخص صف کی خالی جگہ میں داخل ہوا تو نمازی نے اس کے لئے جگہ خالی کر دی تو اس نمازی کی نماز فاسد ہو گئی کیونکہ اس نے نماز میں غیر اللہ کی فرماں برداری کی ہے، اس لئے اسے چاہئے کہ ذرا ٹھہر کر اپنی رائے سے آگے بڑھے۔ ع۔

یہ معلوم ہونا چاہئے کہ حدیث وقرآن میں جو اہل صف کے لئے بازو نرم کرنے کا حکم ہے تو اس سے مراد غیر کی فرماں

برداری نہیں ہے، غرض یہ کہ اصلاح نماز کے لئے تو حکم موجود ہے کیا نہیں دیکھتے کہ امام کی فرماں برداری واجب ہے، بنابریں میرے نزدیک یہ جزئیہ صحیح نہیں ہے یا اس کی یہ تاویل ہے کہ کوئی رئیس یا مالدار آیا اور صرف اس کی فرماں برداری کے واسطے مصلی آگے بڑھایا ادھر ادھر ہو گیا تو اس کی نماز فاسد ہونے میں کوئی شک نہیں ہوگا اور یقیناً فاسد ہوگی۔ م۔

ولایتربع الا من عذر، لان فیه ترك سنة القعود، ولایعقص شعره، وهو ان یجمع شعره علی هامته ویشده بخیط، او بصمغ لیتلبد، فقد روی انه علیه السلام نهی ان یصلی الرجل وهو معقوص، ولایکف ثوبه، لانه نوع تجبر ولایسدل ثوبه، لانه علیه السلام نهی عن السدل، وهو ان یجعل ثوبه علی رأسه وکتفیه ثم یرسل اطرافه من جوانبه.

ترجمہ:۔ بغیر عذر چارزانوں ہو کر نہ بیٹھے کیونکہ اس طرح سے بیٹھنے سے سنت کو ترک کرنا لازم آتا ہے، اور اپنے سر کے بالوں کا جوڑانہ باندھے، اس طرح پر کہ بالوں کو جوڑ کر جمع کر کے ڈورے سے باندھ دے یا گوند سے جوڑا بنالے، تاکہ بلند ہو جائیں، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ آدمی اس طرح نماز پڑھے کہ وہ معقوص ہو، اور اپنے کپڑے کو نہ سمیٹے کیونکہ اس میں ایک قسم کا تکبر ہے، اور اپنے کپڑے کو بے طریقہ سے استعمال نہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سدل سے منع فرمایا ہے جس کی صورت یہ ہو کہ کپڑے کو اپنے سر اور مونڈھو پر ڈال کر اس کے کناروں کو اپنے چاروں طرف چھوڑ دے۔

توضیح:۔ نماز میں چارزانوں ہو کر بیٹھنا، دلیل، بالوں کا جوڑا کرنا، حدیث سے دلیل، کپڑا چننا، کپڑا جھٹکنا، پیشانی کا گرد وغبار صاف کرنا، پسینہ پونچھنا، بے قاعدہ کپڑا لٹکانا، ننگے سر نماز پڑھنا، قمیض ہوتے ہوئے صرف پائجامہ پہننا، برنس پہن کر، کہنیوں تک آستین چڑھا کر، ایک ہی کپڑے میں، مترجم کی توضیح، سر کا بیچ کھلا ہوا ہو کناروں میں عمامہ ہو، خراب کپڑوں میں، کمر باندھ کر، نمازی عورت اور مرد کا مستحب لباس، جمائی آنا

ولایتربع الا من عذر، لان فیه ترك سنة القعود......الخ

اور چارزانوں ہو کر نہ بیٹھے مگر مجبوری کی صورت میں کیونکہ ایسا کرنے میں بیٹھک کی سنت کو ترک کرنا ہوتا ہے۔ ف۔ اور بعضوں کا کہنا ہے کہ یہ بیٹھک متکبروں کی ہوتی ہے اس لئے مکروہ ہے، یہانتک کہ خلاصہ میں نماز کے علاوہ بھی اس بیٹھک کو مکروہ کہا ہے، ابن الہمامؒ نے اس کی اتباع کی ہے، اور حق یہ ہے کہ جو مصنفؒ نے کہا ہے کہ سنت کے خلاف ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن عبداللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ نماز میں چارزانوں بیٹھتے تو میں بھی اسی طرح بیٹھا، میں اس وقت کم عمر تھا تو مجھے اس طرح بیٹھنے سے منع فرمایا، اور کہا کہ بیٹھنے میں سنت طریقہ یہ ہے کہ بایاں پاؤں بچھاؤ اور دایاں کھڑا کرو، تو میں نے عرض کیا کہ آپ خود تو چارزانوں ہی بیٹھتے ہیں، جواب دیا کہ میرے پاؤں مجھے نہیں اٹھاتے (کہ کمزور ہو گئے ہیں) مالک اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے۔ م۔

ولایعقص شعره، وهو ان یجمع شعره علی هامته ویشده بخیط......الخ

اور بالوں کو معقوص نہ کرے، اور عقص یہ ہے کہ بالوں کو سر پر جوڑا بنا کر ڈورے سے باندھ دے، یا گوند سے جوڑا کر دے، تاکہ وہ بلند ہو جائیں، **فقد روی الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ میں نے اس طرح نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے کہ معقوص ہو۔ ف۔ یہ حدیث ابورافعؓ سے عبدالرزاق، ابن ماجہ، ابوداؤد اور ترمذیؒ نے روایت کی ہے، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے، اور ام سلمہؓ کی حدیث طبرانی اور اسحٰق بن راہویہ نے روایت کی ہے، اور یہی معنی امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں ابن عباسؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے۔ مع۔ اور ائمہ ستہ نے ابن عباسؓ کی روایت کی ہے کہ **امرت ان اسجد علی سبعة وان لا**

اکف شعرا ولا ثوبا، یعنی مجھے حکم کیا گیا ہے کہ سات اعضاء پر سجدہ کروں، اور نہ بالوں کو اکٹھے کروں اور نہ کپڑے کو۔ف۔اس میں بھید یہ ہے کہ کھلے ہوئے بال بھی سجدہ کرنے میں اکٹھے ہو جائینگے جو لپیٹ دئے جانے کی صورت میں نہ ہوگا۔ع۔یہ حکم مردوں کے لئے مخصوص ہے۔

ولا یکف ثوبہ، لانہ نوع تجبر......الخ

اور کپڑے کو نہ سمیٹے۔ف۔اس طرح سے کہ سجدہ میں جاتے وقت آگے یا پیچھے سے اکٹھے۔معراج الدرایہ۔یہ حدیث ابن عباسؓ کی ہے جو ابھی گذر گئی ہے لانہ نوع الخ کیونکہ اس میں ایک قسم کا تکبر ہے۔ف۔کپڑے سمٹ جانے کی صورت میں انہیں جھٹک دینا مناسب ہے تاکہ رکوع کرتے ہوئے اس کے بدن سے لپٹے ہوئے نہ رہ جائیں اور اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ پیشانی سے تنکے وغیرہ جھاڑ دے خواہ فارغ ہونے کے بعد ہو یا اس سے پہلے اس صورت میں کہ ان سے کچھ تکلیف ہو رہی ہو، کیونکہ تکلیف نہ ہونے کی صورت میں درمیان نماز پونچھنا مکروہ ہے، اور نماز کے بعد مکروہ نہیں ہے۔القاضی خان۔اور انہیں چھوڑ دینا ہی زیادہ اچھا ہے۔محیط السرخسی۔اور پیشانی کے پسینہ کو پونچھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔القاضی خان۔خلاصہ یہ ہوا کہ جو کام مفید ہو اس کے کر لینے میں نماز کے لئے حرج نہیں ہے، لیکن جو غیر مفید ہو وہ مکروہ ہے۔الخلاصہ۔

ولا یسدل ثوبہ، لانہ علیہ السلام نھی عن السدل......الخ

اور کپڑے کو بے طریقہ لٹکا کر نہ چھوڑے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے سدل کرنے سے منع فرمایا ہے۔ف۔جیسا کہ ابن ماجہ اور ابوداؤدؒ اور ترمذی، ابن حبان، حاکم اور طبرانی نے اوسط میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کی ہے، اس کی اسناد حسن ہے، جیسا کہ عینیؒ نے اس کی تحقیق کی ہے۔

وھو ان یجعل ثوبہ علی رأسہ و کتفیہ ثم یرسل اطرافہ من جوانبہ.

سدل کی صورت یہ ہے کہ اپنا کپڑا سر اور کندھوں پر ڈال کر اس کے کنارے اپنے چاروں طرف لٹکتا ہوا چھوڑ دے۔ف۔سدل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قبا (شیروانی وغیرہ) کو آستینوں میں ہاتھ ڈالے بغیر یونہی کندھوں پر ڈال دے۔ت۔خواہ نیچے قمیص ہو یا نہ ہو۔ن۔اگر کوئی فرجی کی آستینوں میں ہاتھ ڈالے بغیر استعمال کرے تو قول مختار یہ ہے کہ یہ مکروہ نہیں ہے۔المضمرات۔قنیہ میں کہا ہے کہ صحیح ہے کہ نماز کے باہر سدل کرنا مکروہ نہیں ہے۔البحر۔عمامہ ہوتے ہوئے ننگے سر نماز پڑھنی اگرچہ صرف سستی اور کسلمندی کی وجہ سے ہو مکروہ ہے، اور اگر عاجزی اور خشوع کی وجہ سے ہو تو کوئی حرج نہیں ہے بلکہ بہت بہتر ہے۔الذخیرہ۔اسی بناء پر حضرت جابرؓ کا عمدہ لباس مشجب (کھونٹی یا آلنا) پر موجود رہتے ہوئے انہوں نے ننگے سر نماز پڑھی تھی، جیسا کہ بخاری میں ہے۔م۔

اگر قمیص کے ہوتے ہوئے صرف پائجامے میں نماز پڑھے تو نماز مکروہ ہوگی۔الخلاصہ۔میں مترجم کہتا ہوں کہ عمامہ میں بیان کی ہوئی تفصیل یہاں بھی ہے۔م۔برنس نماز میں مکروہ ہے لیکن جنگ کی حالت میں مکروہ نہیں ہے۔التاتارخانیہ۔کہنیوں تک آستین چڑھائے ہوئے نماز پڑھنا مکروہ ہے۔القاضی۔صماء مکروہ ہے یعنی صرف ایک کپڑے کو سر سے پیر تک اس طرح لپیٹنا کہ دونوں طرف سے ہاتھ نہ اٹھا سکے۔التبیین۔ف۔قاضی خان میں کہا ہے کہ صماء یہ ہے کہ دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھے پر دونوں کنارے ڈال دے جائیں، میں مترجم کہتا ہوں کہ حدیث میں لبس صماء ممنوع ہے، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے، صماء بظاہر ایسے طور ہوگا کہ رکوع اور سجدے کرتے ہوئے بیٹھنے کی حالت میں ستر نظر آئے، اور کہا ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جبکہ ازار نہ ہو۔م۔ع۔

اعتجار مکروہ ہے یعنی صرف سر کے کنارے عمامہ باندھا جائے اور بیچ کا سر کھلا رہے۔التبیین۔ایسا کرنا تو نماز کے علاوہ بھی مکروہ ہے ولوالجیہ۔البحر۔بالکل عام کپڑوں میں جو ہر وقت مستعمل ہوتے ہوں ان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔المعراج۔اس صورت

میں جبکہ دوسرے اچھے کپڑے موجود ہوں۔ م۔ کمر باندھ کر پڑھنا مکروہ ہے، لیکن خلاصۃ میں نہیں ہے، استعمالی کپڑوں میں مرد کے لئے مستحب ہے ازار، قمیض، اور عمامہ، لیکن عورت کے لئے ازار، قمیض، اوڑھنی اور تقعہ مستحب ہے۔ ع۔

حدیث میں ہے کہ جب کوئی تم میں سے جمائی لے تو اپنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھ لے کیونکہ شیطان ہو جاتا ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ ع۔ اور بھی حدیث میں ہے کہ جمائی شیطان کے اثر سے ہوتی ہے، اس لئے جہاںتک ہو سکے اس کو آنے سے روکو۔ م۔ اور حضرت عائشہؓ سے صحیح مسلم میں ہے کہ جب کھانا تیار ہو تو اس وقت نماز نہیں ہے، اسی طرح پیشاب و پائخانہ کی ضرورت محسوس ہونے کی صورت میں نماز نہیں ہے، عامہ علماء کے نزدیک ان احادیث کا مطلب یہ ہے کہ بھوک کی زیادتی کی وجہ سے کھانے کی خواہش زیادہ ہونے کی صورت میں یا پائخانہ اور پیشاب کے بعد وضوء کرنے سے وقت نکل جانے کا خطرہ ہو تو اسی وضوء سے نماز ادا کر لے کیونکہ ایسی نماز بھی اس کے قضاء کر دینے سے بہتر ہے، اگر نماز میں ٹوپی سر سے گر پڑے تو آسانی سے اٹھا کر سر پر رکھ لے مگر جب عمل کثیر کی ضرورت ہو تو چھوڑ دے۔ م۔ مگر مقام غور طلب ہے۔ م۔

ولا یاکل ولایشرب، لانه لیس من اعمال الصلوة، فان اکل اوشرب عامدا اوناسیا فسدت صلاته، لانه عمل کثیر، وحالة الصلوة مذکرة.

ترجمہ:- اور نہ کھائے اور نہ پیئے کیونکہ یہ نماز کے اعمال سے نہیں ہیں، اس لئے اگر کھا لیا یا پی لیا جان کر ہو یا بھول کر تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ یہ کام عمل کثیر ہے جبکہ نماز کی حالت یاد دلانے والی ہوتی ہیں۔

توضیح:- نماز میں کھانا پینا، عمل کثیر کی توضیح میں تفصیل اقوال

ولا یاکل ولایشرب، لانه لیس من اعمال الصلوة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ نماز میں کھانے پینے سے نماز فاسد ہونے کے سلسلہ کے کچھ مسائل گذر چکے ہیں **لانه عمل کثیر الخ** کیونکہ نماز میں کھانا پینا عمل کثیر ہے۔ ف۔ اور اس میں بھول جانے کا احتمال نہیں ہوتا ہے، کیونکہ نماز تو بیداری اور جاگنے میں ہوتی ہے اور اس کی خاص ہیأت اور حالت نماز میں ہونے کی یاد دلانے والی ہوتی ہے۔ ف۔ معلوم ہونا چاہئے کہ فعل کثیر تو نماز کو فاسد کر دیتی ہے، البتہ فعل کثیر کی تعریف اور تفسیر میں مختلف اقوال ہیں، اور ہر قول پر بہت سے مسائل نکلتے ہیں جن سے فساد کا حکم دیا جاتا ہے اور کچھ ایسے افعال بھی ہیں جو ایک میں مفسد ہیں اور دوسرے قول میں مفسد نہیں ہیں اس طرح زبردست اختلاف ہو گیا ہے، اس لئے اس مقام پر ان کی مختصراً کچھ تفصیل بیان کی جاتی ہے، معلوم ہونا چاہئے عمل قلیل و کثیر کے درمیان فرق کرنے کے پانچ اقوال ہیں:

(۱) جو کام عادۃ عموماً دو ہاتھوں سے ہوا کرتا ہے وہ کثیر اور مفسد ہے، اگرچہ نمازی نے اسے ایک ہی ہاتھ سے کر لیا ہو، اس کی مثال میں ذخیرہ میں جزئیے بیان کئے گئے ہیں کہ اگر قمیض پہنی یا پائجامہ باندھا تو نماز فاسد ہو جائے گی اور اگر اتارا تو فاسد نہ ہو گی، اگر داڑھی میں کنگھی کی یا موزے پہنے یا گھوڑے پر زین کسا، یا اسے اتارا یا اسے لگام لگائی، یا شیشی میں سے ہاتھ پر تیل ڈال کر سر میں لگایا، تو نماز فاسد ہو جائے گی، اجناس میں ہے کہ اگر اونٹ کی نکیل لگائی یا اتاری یا تھامے رہا یا موزے اتارے جبکہ ڈھیلے ہوں یا جوتے اتارے یا قمیض و قباء میں گھنڈیاں لگائیں یا ٹوپی پہنی یا اتاری یا دروازہ کھولا یا بند کیا یا تالا لگایا یا کھٹکایا یا چراغ میں بتی ڈالی تو نماز فاسد نہ ہو گی کیونکہ یہ سب عمل قلیل میں شمار ہیں، امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر کمان لے کر اس سے تیر پھینکا تو نماز فاسد ہو گی۔

مرغینانیؒ نے کہا ہے کہ اگر کمان ہاتھ میں اور تیر تانت پر چڑھا ہوا ہو اور اس کو پھینکا تو فاسد نہ ہو گی، اسی قول کو شیخ محمد بن الفضل نے قبول کیا ہے، کثیر کی دوسری تعریف تین بار ہونے کے ہیں، اس دلیل سے کہ حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے

کہ نمازی نے اگر کسی چیز سے دوبار پنکھا جھلا تو اس کی نماز فاسد نہ ہوگی اور اگر زیادہ جھلا تو فاسد ہو جائے گی، اسی طرح صدر شہید حسام الدینؒ نے کہا ہے کہ اگر کوئی نمازی بدن میں سے کسی جگہ تین بار متواتر کھجلایا تو نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر دوبار سے زیادہ کھجلایا مگر متواتر نہیں تو فاسد نہ ہوگی، جوں مارنے کا بھی یہی حکم ہے، یہی حکم متواتر تین پتھر پھینکنے اور تین بال نوچنے کا بھی ہے، کہ متواتر ہونے سے نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ جوامع الفقہ میں ہے۔

کثیر کی (۳) تیسری تعریف یہ ہے کہ قلیل وکثیر ہونا خود نمازی کی رائے پر ہے کہ اس نے خود اگر کثیر سمجھا تو نماز فاسد ہو جائے گی، ورنہ نہیں، شمس العلماء حلوائیؒ نے کہا ہے کہ یہ قول امام ابو حنیفہؒ کے قاعدے سے زیادہ موافق ہے کیونکہ وہ تو ایسے تمام معاملات کو اصل معاملہ والے کی رائے پر چھوڑ دیتے ہیں، اسی قول کو بناء پر وہ تمام مسائل بیان کئے گئے ہیں جو کہ ذخیرہ میں مذکور ہیں کہ اگر تین بار پنکھا جھلا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر تین بال تین مرتبوں میں اکھاڑے تو فاسد ہو جائے گی، اور اگر کسی آدمی کو ہاتھ یا کوڑے سے مارا تو نماز فاسد ہوگی، اور اگر پرندے کو پتھر پھینک کر مارا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور مبسوط میں ہے کہ اگر جانور کو ایک دو دفعہ مارا تو نماز فاسد نہ ہوگی، اور اگر تین بار مارا تو فاسد ہو جائے گی، اور اگر ایک پاؤں سے ایڑ لگائی مگر ہمیشہ نہیں تو فاسد نہ ہوگی، اور اگر دونوں پاؤں سے ایڑ لگائی تو فاسد ہو جائے گی۔ ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ سب احکام اس وقت ہوں گے جبکہ نمازی انہیں عمل کثیر خیال کرے ورنہ کچھ نہیں۔

(۴) تعریف یہ ہے کہ فعل کثیر وہ ہے کہ اس کے کرنے والے کا مقصود یہ ہو کہ اس کام کے لئے تنہا مجلس کرے (تنہائی چاہئے) اور ذخیرہ میں کہا ہے کہ اس قول پر ان مسائل سے استدلال کیا ہے کہ ایک عورت نماز میں تھی اسی حالت میں اس کے شوہر نے شہوت سے اس کا بوسہ لیا یا ہاتھ لگایا تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اسی طرح اگر بچہ نے اس نمازی عورت (ماں) کا سینہ چوسا اور اس سے دودھ نکل آیا تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ معلی نے امام ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے عورت سے مباشرت قلیلہ مفسد نہیں ہے، لیکن مباشرت کثیرہ مفسد ہے، ابن سماعہؒ نے امام ابو یوسفؒ سے روایت کی ہے کہ نمازی عورت کا بوسہ لینے سے بہر صورت اس کی نماز فاسد ہو جائے گی خواہ شہوت ہو یا بغیر شہوت کے ہو، اسی طرح ابو یوسفؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ نمازی مرد کو اس کی عورت نے شہوت کے ساتھ ہاتھ لگایا لیکن مرد نے اس سے لذت حاصل نہ کی یا عورت نے اس سے بوسہ لیا اور مرد نے نہیں تو مرد کی نماز فاسد نہ ہوگی۔

(۵) تعریف یہ ہے کہ دور سے دیکھنے والے کو یہ شک نہ ہو کہ یہ نماز کے سوا دوسرے کام میں ہے تو ایسا عمل کثیر ہے اور اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور اگر دیکھنے والے کو نمازی ہونے کا شک ہو تو مفسد نہیں ہے، مرغینانیؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اصح ہے، اور اگر عورت نے اپنے بچہ کو اٹھا کر دودھ پلایا یا کپڑا اتار اٹھایا اسے سیا تو یہ اعمال سارے اقوال کے مطابق عمل کثیر ہیں، اور اگر عمامہ اٹھا کر زمین سے سر پر یا سر سے زمین پر رکھا یا تین کلمات لکھے تو نماز فاسد نہ ہوگی، مگر جب زیادہ لکھنا ہو تو جو تین کلمات سے بڑھ جائے، اگر ہوا پر لکھا جو نظر نہیں آتا ہے جتنا بھی زیادہ ہو مفسد نہیں ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ پانچویں تعریف اصح ہے اور تنویر میں اسی پر اعتماد اور اکتفاء کیا ہے، کیونکہ اس کو سبھوں نے صحیح مانا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز نام ہے چند افعال واقوال کا لہذا نماز خود افعال ہونے پر عذر کی صورت میں افعال زیادہ ہو جایا کرتے ہیں جیسے اتفاقی حادثات کی صورت میں پڑھی ہوئی نماز پر بناء کرنے کے لئے آمد ورفت کرنا پڑتا ہے جیسا کہ اس کے مسائل بیان کئے جا چکے ہیں، تو اب افعال کی کمی وبیشی کرنے والی بات یہی ہوئی کہ نماز سے نکلنا، یا بلا ضرورت ایسے افعال جن کے کرنے سے یہ معلوم ہو کہ اب نماز کے علاوہ دوسرے کام میں مشغول ہونے کا ثبوت ہو وہ مفسد ہوں گے ورنہ نہیں، چنانچہ احادیث صحیحہ سے یہ بات بھی معلوم ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے منبر پر قرأت کی اور رکوع کیا اور نیچے اتر کر سجدہ کیا، یہ اتار چڑھاؤ کے افعال بھی نماز ہی کے کام میں شمار ہوئے، یا تہجد پڑھتے وقت کمرے کا دروازہ بند تھا اس موقع پر حضرت ام المومنین عائشہؓ کے آجانے پر نماز ہی کی حالت

میں دروازہ کھول دیا، اس سے بھی نماز فاسد نہ ہوئی اس لئے یہ باتیں مفسد نہیں ہوئیں، کیونکہ دیکھنے والا جب یہ دیکھتا ہے کہ نماز مسلسل ہو رہی ہے اور بعد کے افعال پہلے سے ملے ہوئے ہیں یا پہلے پر بناء ہو رہی ہے تو اسے کسی صورت سے بھی اس بات کا شبہہ نہ ہوگا کہ یہ نماز میں نہیں ہے، اس باریکی کو اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔ اب اس کے بعد مصنفؒ اس سلسلہ کے کچھ مسائل جامع صغیر سے ذکر کرنے والے ہیں۔

ولابأس بان يكون مقام الامام فى المسجد وسجوده فى الطاق، ويكره ان يقوم فى الطاق، لانه يشبه صنيع اهل الكتاب من حيث تخصيص الامام بالمكان، بخلاف ما اذا كان سجوده فى الطاق، ويكره ان يكون الامام وحده على الدكان لما قلنا، وكذا على القلب فى ظاهر الرواية، لانه ازدراء بالامام.

ترجمہ:-اور اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ امام خود مسجد میں کھڑا ہو اور محراب میں سجدہ کرے، البتہ یہ بات مکروہ ہے کہ تنہا امام محراب میں کھڑا ہو اور اسی میں سجدہ بھی کرے، کیونکہ یہ اہل کتاب کے عمل کے مشابہہ عمل ہے، اس طرح یہ کہ وہ امام کی جگہ مخصوص کر دیتے ہیں، بخلاف اس صورت کے کہ اس کا صرف سجدہ طاق میں ہو، اور یہ بات بھی مکروہ ہے کہ تنہا امام کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہو اسی مشابہت یہود کی بناء پر جو پہلے ہم بیان کر چکے ہیں، اسی طرح اس کا برعکس کرنا بھی ظاہر الروایۃ میں مکروہ ہے، کیونکہ اس طرح امام کو ہیچ سمجھنا حقیر جاننا لازم آتا ہے۔

توضیح:-امام مسجد میں اور سجدہ محراب میں، محراب میں تنہا امام کا کھڑا ہونا

امام تنہا بلند جگہ پر، تمام مقتدی تو اونچی جگہ پر ہوں اور امام نیچے ہو

ولابأس بان يكون مقام الامام فى المسجد وسجوده فى الطاق......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ مقام امام سے مراد اس کے قدم ہیں، اور طاق سے مراد محراب ہے، کیونکہ کھڑے ہونے میں قدم ہی کا اعتبار ہوتا ہے، اور جب اس کے قدم مسجد میں ہوں تو مقتدیوں کے برابر ہو گیا، اگرچہ سجدہ اس کا محراب کے اندر ہوتا ہے، اسی قاعدہ کی بناء پر اگر کوئی جنگلی جانور اس طرح کھڑا ہو کہ اس کے قدم حرم کی زمین پر ہوں لیکن اس کا سر حرم سے باہر ہو تو اس کے قتل کرنے سے محرم پر جرمانہ لازم ہوگا، اور اگر قسم کھائی کہ فلاں گھر میں داخل نہ ہوگا تو قدموں کے علاوہ دوسرے اعضاء اس میں داخل کرنے سے جھوٹا نہ ہوگا۔ ع۔

ويكره ان يقوم فى الطاق، لانه يشبه صنيع اهل الكتاب من حيث تخصيص الامام بالمكان......الخ

اور یہ بات بھی مکروہ ہے کہ امام تنہا طاق میں کھڑا ہو۔ ف۔ یعنی امام کے بقیہ اعضاء کے ساتھ اس کے قدم بھی محراب کے اندر موجود رہیں **لانه يشبه الخ** کیونکہ محراب میں کھڑے ہونے سے اہل کتاب کے طریقہ کی مشابہت لازم آتی ہے، کیونکہ وہ بھی اپنے امام کے لئے جگہ مخصوص کر دیتے ہیں، برخلاف اس کے کہ امام صرف سجدہ محراب میں کرتا ہو۔ ف۔ اور اس کے پاؤں محراب سے باہر ہوں تو مشابہت نہ ہوگی، اس میں کراہت کی اصل وجہ مشابہت ہے اسی بناء پر اعتجار مکروہ ہے، (اعتجار کے معنی ہیں عمامہ کو سر کے چاروں طرف اس طرح لپیٹنا کہ بیچ کا سر کھلا رہ جائے) اسی طرح منہ بند کرنا بھی مکروہ ہے، کیونکہ اس طرح اہل کتاب سے مشابہت ہوتی ہے، اسی طرح نماز میں دائیں بائیں جھکنا یعنی جھومنا بھی مکروہ ہے، اسی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ اس سے منع فرماتے تھے یہ کہتے ہوئے کہ نماز میں سکون کرو اور یہود کی طرح سے مت جھومو، اس کی روایت صحیح ہے۔

الحاصل اگر امام تنہا طاق میں (محراب) میں ہو تو مطلقاً مکروہ ہے، مشابہت یہود کی وجہ سے، اور بعضوں نے اس کی کراہت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ دور سے مقتدیوں کو امام کا حال معلوم نہ رہے گا، اسی بناء پر اگر محراب کچھ اس طرح بنا ہوا ہو کہ امام کا حال لوگوں سے مخفی نہ ہوتا ہو تو اس کا محراب میں بھی کھڑا ہونا مکروہ نہ ہوگا، امام طحاویؒ اسی کے قائل ہیں، اور سرخسیؒ نے بھی کہا ہے

کہ یہی اصح ہے، سوالوالجی نے فتاوی میں کہا ہے کہ اگر مقتدیوں کے لئے مسجد میں جگہ ہو رہی ہو، تو ایسی صورت میں امام کا تنہا محراب میں کھڑا ہونا مکروہ نہ ہوگا۔ ع۔ عذر کے اسباب میں سے تعلیم کا ارادہ کرنا بھی ہے۔ البحر۔ د۔ اور یہ قول امام شافعیؒ کا ہے، حدیث المنبر کی وجہ سے جیسا کہ عینیؒ نے ذکر کیا ہے۔ م۔

ویکرہ ان یکون الامام وحدہ علی الدکان لما قلنا......الخ

اور یہ بات بھی مکروہ ہے کہ تنہا امام کسی اونچی جگہ پر کھڑا ہو یہودیوں کی مشابہت کے خیال سے۔ ف۔ اور اگر امام کے ساتھ کچھ مقتدیوں بھی ہو جائیں تو مکروہ نہ ہوگا، یہی اصح قول ہے۔ محیط السرخسی۔ مکان سے مراد وہ اونچی جگہ ہے جس پر لوگ بیٹھیں، اس جگہ مصنفؒ نے اونچائی کی مقدار بیان نہیں کی ہے، اونچائی کی تحدید میں یہ کئی اقوال ہیں (۱) درمیانی قد کے آدمی کے برابر ہو اس سے کم مکروہ نہیں ہے۔ المحیط۔ الطحاوی۔ (۲) اتنی اونچی ہو کہ دوسروں سے خاص ممتاز نظر آتی ہو (۳) سترہ پر قیاس کرتے ہوئے ایک ذراع کے انداز سے ہو، قاضی خان نے کہا ہے کہ اسی پر اعتماد ہے۔ ع۔ یہی قول مختار ہے، لیکن دوسرا قول اوجہ ہے، اس لئے کہ تحقیر کا شبہ صرف ایک ذراع ہونے پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ اس انداز پر ہے کہ جس سے ممتاز ہو سکے۔ الفتح۔

لیکن ابن الہمامؒ نے اصل مسئلہ میں کلام کیا ہے کہ امام کا ممتاز ہونا کسی خاص مقام میں شرعاً بھی مطلوب و مقصود ہوتا ہے، چنانچہ اس پر لازم ہے کہ تنہا آگے بڑھے اور محراب تو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے بنتی ہے، اس طرح کچھ باتوں میں اگر موافقت ہو ہی جائے تو کوئی نئی بات نہ ہوگی، اس بناء پر محراب میں امام کا تنہا کھڑا ہونا مکروہ نہیں ہونا چاہئے، اور میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ امام کو اونچی جگہ پر کھڑا کرنا بلا ضرورت ہے، اس کام میں بلا ضرورت اہل کتاب سے مشابہت پائی جاتی ہے، اور صحابہ کے آثار اور روایتوں سے بھی ہمارے خیال کی تائید پائی جاتی ہے، چنانچہ ابوداؤدؒ نے مدائن کے واقعہ میں ابو سعید و حذیفہ اور عمار بن یاسرؓ کا اتفاق نقل کیا ہے، اس پر اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ صحیحین میں حضرت سہل بن سعدؓ سے تو رسول اللہ ﷺ کا منبر پر نماز پڑھنا بھی ثابت ہے، جواب یہ ہوگا کہ اس وقت منبر پر نماز پڑھنا تعلیم کی غرض سے تھا، جبکہ جگہ کی تنگی اور تعلیم وغیرہ کی ضرورت پر کھڑے ہونے کو مستثنیٰ کیا جا چکا ہے۔ م۔

وکذا علی القلب فی ظاہر الروایۃ، لانہ ازدراء بالامام......الخ

اسی طرح اس کے برعکس بھی ظاہر الروایۃ میں مکروہ ہے۔ ف۔ برعکس یعنی نمازی تو سب اونچی جگہ پر ہو لیکن امام بغیر عذر کے نیچے کھڑا ہو، اور مصنفؒ نے اس وجہ کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے لانہ ازدراء الخ یعنی اہل کتاب سے مشابہت کوئی وجہ نہیں ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس طرح امام کی تحقیر پائی جاتی ہے۔ ف۔ حالانکہ یہ بتایا گیا ہے کہ ہم امام کی تعظیم کیا کریں، اسی لئے ظاہر الروایۃ پر اعتماد کیا ہے۔ م۔ اور یہی قول اصح ہے۔ د۔ یہ کراہت عذر نہ ہونے کی صورت میں ہے ورنہ مکروہ بھی نہیں ہے، جیسا کہ جمعہ کی نماز میں کچھ لوگ اونچی جگہ پر بھی کھڑے ہو جاتے ہیں، یہ بات شیخ الاسلامؒ نے بیان کی ہے۔ ع۔

ولا بأس ان یصلی الی ظہر رجل قاعد یتحدث، لان ابن عمرؓ ربما کان یستتر بنافع فی بعض اسفارہ، ولا بأس بان یصلی وبین یدیہ مصحف معلق، اوسیف معلق، لانہما لا یعبدان، وباعتبارہ تثبت الکراہۃ، ولا باس بان یصلی علی بساط فیہ تصاویر، لان فیہ استہانۃ بالصور، ولایسجد علی التصاویر، لانہ یشبہ عبادۃ الصورۃ، واطلق الکراہیۃ فی الاصل، لان المصلی معظم.

ترجمہ:۔ اور اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی ایسے بیٹھے ہوئے آدمی کے پیچھے نماز پڑھے جو بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ اکثر اوقات اپنے سفر کے دوران اپنے غلام نافع کو سترہ بنا لیتے تھے، اور اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی اس طرح نماز پڑھے کہ اس کے سامنے کوئی قرآن یا تلوار لٹکی ہو، کیونکہ ان دونوں کی عبادت نہیں کی جاتی ہے، اور عبادت کا اعتبار کر کے ہی کراہت ثابت کی جاتی ہے، اور اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ ایسے فرش جائے نماز پر نماز پڑھی جائے جس میں

تصویریں ہوں کیونکہ اس طرح تصویروں کی تحقیر ہوتی ہے، اور تصویروں پر سجدہ نہ کئے جائیں، کیونکہ اس سے صورت کی عبادت کی مشابہت ہوتی ہے، اور کتاب الاصل میں کراہت کو مطلق رکھا گیا ہے کیونکہ جائے نماز قابل تعظیم ہے۔

توضیح:-بات کرنے والے آدمی کے پیچھے نماز، حدیث سے دلیل سامنے قرآن لٹکا ہوا ہو یا تلوار لٹکی ہوئی ہو، تصویر والے بچھونے پر، تصویر پر سجدہ

ولا باس ان یصلی إلی ظهر رجل قاعد یتحدث......الخ

ایسے مرد کے پیچھے جو بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہو نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ف۔ لیکن اگر ان کی آوازیں اتنی بلند ہوں کہ اس کے پیچھے نماز پڑھنے سے نمازی کو قرأت میں خلل کا اندیشہ ہو تو مکروہ ہے۔الخلاصہ۔اور سوئے ہوئے کی طرف بھی پڑھنے میں مکروہ نہیں ہے، اگرچہ قاضی خاں نے کراہت کا حکم لگایا ہے، اور ممکن ہے کہ ایسا کرنا مذاق اڑانے کے خوف سے ہو جیسا کہ معلوم ہوگا۔م۔اور باقی ائمہ کا بھی یہی قول ہے۔ع۔

لان ابن عمرؓ ربما کان یستتر بنافع فی بعض اسفاره......الخ

اس لئے کہ حضرت ابن عمرؓ بسا اوقات اپنے غلام نافعؒ کو حالت سفر میں سترہ بنا لیتے۔ف۔ جبکہ سفر میں نماز کے وقت کوئی درخت وغیرہ نہ پاتے تو نافعؒ کو فرماتے کہ اپنی پیٹھ پھیر کر بیٹھ جاؤ، ابن شیبہ نے اس کی روایت کی ہے، اگر یہ اشکال پیش کیا جائے کہ سنن کی کتابوں میں سعد بن منصور نے حدیث کی روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے باتیں کرنے والوں اور وسوسے ڈالنے والوں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، جواب یہ ہے کہ اس وقت منع فرمایا ہو جبکہ ان کی آواز بلند ہو رہی ہے، یا سونے والے کی ہوا خارج ہو کر مذاق اڑانے کا خطرہ ہو، جیسا کہ محیط برہانی میں کہا ہے۔ع۔ بلکہ بظاہر منع تنزیہی ہے، اور خطابیؒ نے کہا ہے کہ ممانعت کی ابن ماجہ اور ابوداؤد وغیرہ کی کوئی حدیث بھی درجہ صحت کو نہیں پہونچی ہے، جبکہ یہ روایت صحیح ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایسی حالت میں نماز پڑھتے کہ حضرت عائشہؓ چوڑائی میں لیٹی رہتی تھیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ حدیث کے آخر میں ہے کہ پھر جب رسول اللہ ﷺ وتر پڑھنا چاہتے تو مجھے جگا دیتے تو میں آپ کے ساتھ وتر پڑھتی، یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہؓ پہلے سوتی تھیں۔

ولاباس بان یصلی وبین یدیه مصحف معلق، اوسیف معلق، لانهما لا یعبدان......الخ

اگر آدمی نماز پڑھ رہا ہو اور اس کے سامنے قرآن مجید لٹکتا ہو یا تلوار لٹک رہی ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ف۔اور جمہور کا بھی یہی قول ہے، لانهما الخ کیونکہ قرآن پاک اور تلوار کی عبادت نہیں کی جاتی ہے، اور عبادت ہی کا اعتبار کر کے مکروہ کہا جاتا تھا۔

ولاباس بان یصلی علی بساط فیه تصاویر، لان فیه استهانة بالصور......الخ

اور ایسے بچھونے یا جائے نماز پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں تصویریں بنی ہوئی ہوں۔لانه فیه الخ کیونکہ اس پر پڑھنے میں تصویروں روندنا یا ذلیل کرنا ہوتا ہے۔ف۔ جبکہ ہمیں یہ حکم ہے کہ جو جاہل کسی جاندار کی تصویر بنا کر اپنی جہالت اور حماقت ظاہر کرتے ہیں، ہم ان تصویروں کو ذلیل سمجھیں، اور ان کی اہانت کریں، کیونکہ عبرت کے واسطے تو مخلوق الٰہی کی کمی نہیں ہے، اور خدائی نقل اتارنا بڑی جہالت کی بات ہے، اس جگہ تصویر سے مراد یہ ہے کہ بے روح درخت وغیرہ کی تصویر نہ ہو بلکہ کسی جاندار کی ہو، جیسا کہ بخاری کی حدیث سے ظاہر ہوتا ہے جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے۔م۔

ولایسجد علی التصاویر، لانه یشبه عبادة الصورة......الخ

اور تصویر پر سجدہ نہ کرے کیونکہ ایسا کرنے سے مورت اور تصویر پوجنے سے مشابہت ہوتی ہے۔ف۔ خلاصہ یہ ہوا کہ

تصویر والے بستر پر نماز پڑھنی جائز ہے لیکن اس تصویر پر سجدہ کرنا جائز نہیں ہے، یہ تفصیل جامع صغیر میں مذکور ہے۔

واطلق الكراهية في الاصل، لان المصلى معظم......الخ

الاصل کتاب میں بغیر کسی تفصیل کے تصویر والے فرش پر نماز کو مکروہ لکھا ہے، کیونکہ نماز گاہ یا جائے نماز قابل احترام و لائق تعظیم چیز ہے۔ف۔اس لئے ایسے کپڑے کو جو تصویر کی وجہ سے خوار و ذلیل ہو چکا ہے اسے مصلی نہیں بنانا چاہئے، لیکن تاج الشریعہ نے کہا ہے کہ جامع صغیر کی تفصیل ہی اصح ہے، جیسا کہ عینی میں ہے۔

ويكره ان يكون فوق رأسه في السقف اوبين يديه او بحذائه تصاوير او صورة معلقة لحديث جبرئيل انا لاندخل بيتا فيه كلب او صورة ولو كانت الصورة صغيرة بحيث لاتبدو للناظر لا يكره لان الصغار جدا لاتعبد واذا كان التمثال مقطوع الرأس اى ممحو الرأس فليس بتمثال لانه لاتعبد بدون الرأس و صار كما اذا صلى الى شمع او سراج على ما قالوا.

ترجمہ:-اور یہ بات مکروہ ہے کہ نمازی کے سر کے اوپر چھت میں یا سامنے یا دائیں بائیں تصویریں ہوں یا کوئی صورت لٹکی ہوئی ہو، اس حدیث جبرئیل کی وجہ کہ ہم فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا یا کوئی تصویر ہو، اور اگر تصویر اتنی چھوٹی ہو جو دیکھنے والے کو نظر نہ آتی ہو تو وہ مکروہ نہ ہوگی، کیونکہ چھوٹی تصویروں کی عبادت نہیں کی جاتی ہے، اور جب تصویر سر کٹی ہوئی ہو یعنی بغیر سر کے ہو تو وہ تصویر شمار نہ ہوگی، کیونکہ بغیر سر والی تصویر کی بھی عبادت نہیں کی جاتی ہے، اور اس وقت اس تصویر کا حکم ایسا ہوگا گویا کسی موم بتی یا چراغ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی ہو، جیسا کہ فقہاء کرام نے کہا ہے۔

توضیح:- تصویر والے بستر پر، تصویر پر سجدہ کرنا، سر کے اوپر چھت میں لٹکی ہوئی تصویر، سامنے، داہیں بائیں تصویر رہتے ہوئے نماز پڑھنی، حدیث سے دلیل، بہت چھوٹی تصویر، سر کٹی تصویر، سر مٹی ہوئی تصویر، موم بتی اور چراغ کے پیچھے، پڑے ہوئے تکیہ پر یا بچھونے پر تصویر ہوتے ہوئے نماز کا حکم

ويكره ان يكون فوق رأسه في السقف اوبين يديه او بحذائه تصاوير او صورة معلقة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ وہ تصویر ایسی ہو کہ بے تکلف دیکھنے والے کو نظر آتی ہو۔ القاضی خان۔ لحدیث جبرئیل الخ حدیث یہ ہے کہ ہم ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر ہو۔ف۔اس کی روایت بخاری نے حضرت ابن عمرؓ سے اور مسلم نے حضرت میمونہ اور عائشہؓ سے کی ہے، اور بخاری نے اتنی اور زیادتی کی ہے کہ اس سے مراد جاندار کی تصویر ہے، اور حضرت علیؓ کی روایت میں لفظ جنب کی زیادتی ہے یعنی جس گھر میں کتا ہو یا جاندار کی تصویر ہو یا جنبی آدمی ہو، اس کی روایت ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور احمدؒ نے کی ہے، اور ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ پھر جبریل علیہ السلام نے کہا کہ تصویر کے بارے میں آپ یہ حکم دیں کہ اس کا سر کاٹ دیا جائے، تو وہ درخت کے حکم میں ہو جائے گا، اور تصویر والے بچھونے کے بارے میں حکم دیجئے کہ اسے پھاڑ کر دو بستر میں ڈال دئے جائیں تا کہ وہ ادھر سے ادھر اٹھا کر ڈالے اور اٹھائے اور بچھائے جائیں، اور کتے کے بچہ کے بارے میں حکم دیجئے کہ اسے نکال دیا جائے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ (اللہ ہی بھید کو زیادہ جاننے والا ہے) کہ ان فرشتوں کو یہ مذکورہ چیزیں بہت زیادہ ناپسندیدہ ہیں، اس لئے ان فرشتوں پر رحم کھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ انہیں عام حالت میں ایسی جگہوں میں نہیں بھیجتا ہے، البتہ اگر غیظ و غضب کی جگہ بھیجنا مقدر ہو تو انہیں بھیج دیتا ہے، پس تصویر میں غضب کی وجہ اللہ عزوجل کی مخلوق سے مشابہہ بنانا ہے، اور بتوں کو تو براہ راست معبود بنالیا جاتا ہے، حالانکہ وہ محض باطل تصویر اور بے معنی ہے، اور کتے میں وجہ غضب یہ ہے کہ اس سے شیطان جدا نہیں ہوتا ہے، یہاںتک کہ سیاہ کتے کو تو مجسم شیطان ہی کہدیا جاتا ہے، اور جنبی اپنی ناپاکی کی وجہ سے فرشتوں کے لئے اذیت کا سبب

ہوتا ہے، بشرطیکہ اس پر نجاست لگی ہوئی ہو، یعنی مثلاً جب عذر کی وجہ سے نہیں نہایااور تیمم کر لیا تو طہارت ہو گئی، پس یہ چیزیں کسی فرشتے کے لئے مانع نہیں ہیں، بلکہ اس باشندہ پر رحم کھاتے مہربانی کرتے ہوئے وہاں نہیں جاتے ہیں، اسی لئے علماء نے کہا ہے کہ جس کمرہ میں یہ چیزیں ہوں وہاں فرشتے نہیں آتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ رحمت کے ساتھ نہیں آتے ہیں، اس فیصلہ کے بعد ایسے کمرہ میں یا ایسی جگہ میں نماز یقیناً مکروہ ہو گی جو رحمت کے فرشتہ سے خالی ہو، ایسا ہی بزرگوں نے کہا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ مومن کے ساتھ فرشتے لگے رہتے ہیں اس لئے مومن کے لئے ایسی جگہ نماز مکروہ ہو گی۔ م۔

ولو كانت الصورة صغيرة بحيث لاتبدو للناظر لا يكره لان الصغار جدا لاتعبد......الخ

اگر تصویر اتنی چھوٹی ہو کہ دیکھنے والے کو نظر نہ آتی ہو۔ف۔ مگر تکلف اور کوشش کے ساتھ۔ القاضی خان۔ تو وہ مکروہ نہ ہو گی، کیونکہ بہت چھوٹی تصویریں نہیں پوجی جاتی ہیں۔ف۔ اس لئے وہ بت کے حکم میں نہ ہو گی۔ف۔

میں مترجم یہ سوال کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں کیا فرشتے واقعۃً داخل نہیں ہوتے ہیں، تو جواب یہ ہے کہ فی الواقع میں نے کہیں اس کی تصریح نہیں پائی ہے اظہر یہ ہے کہ وہ داخل نہیں ہوں گے، اس لئے کراہت کی وجہ صرف ایک معنی میں رہنی چاہئے۔ سمجھ لیں۔ م۔

واذا كان التمثال مقطوع الرأس اى ممحو الرأس فليس بتمثال لانه لاتعبد بدون الرأس......الخ

اور جبکہ مجسمہ سر کٹا ہوا ہو۔ف۔ اس جگہ بعضوں نے یہ سمجھا ہے کہ سر دھڑ سے جدا ہو، مگر یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اصل مراد یہ ہے کہ سر کو مٹا دیا گیا ہو، کیونکہ جو مورتی بغیر سر کے رہ گئی ہو تو وہ مورتی ہی نہیں ہے۔ف۔ یا ایسا عضو مٹایا گیا ہو کہ جس کے بغیر زندگی باقی نہ رہتی ہو۔د۔ کیونکہ کوئی مورتی بغیر سر کے نہیں پوجی جاتی ہے۔ف۔ لہٰذا اس میں کراہت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی، وصار کما الخ اور ایسا ہو گیا جیسے کسی نے موم بتی یا چراغ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو مشائخ کے قول کے مطابق وہ مکروہ نہیں ہوئی۔ف۔ اور یہی قول اصح ہے، خزانۃ الفتاویٰ۔ یہ مختار ہے۔ المحیط و قاضی خان۔

اس کے برخلاف آگ سے بھری ہوئی تنور یا انگیٹھی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی تو مکروہ ہو گی۔ محیط سرخسی۔ کیونکہ مجوس کے فعل کے مشابہ ہے۔ع۔ بعض کے نزدیک یہ کراہت اس وقت ہو گی جب کہ اس کا منہ کھلا ہوا ہو ورنہ کراہت نہ ہو گی، اور بعض فقہاء کے نزدیک مطلقاً مکروہ ہے۔ الذخیرہ۔ بخاریؒ نے آفتاب کے گہن کی حدیث بیان کی جس میں رسول اللہ ﷺ نے نماز کے بعد فرمایا کہ میں نے آج کا سا منظر نہیں دیکھا کہ مجھے اس دیوار کے پیچھے آگ دکھائی گئی، آخر حدیث تک۔ پھر استدلال کیا کہ آگ وغیرہ کسی کے سامنے ہونے میں کوئی کراہت نہیں ہے، لیکن کئی وجہوں سے یہ استدلال صحیح نہیں ہے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ کلام اس آگ میں ہے جو پوجی جاتی ہے، اور مجوسی پر تو جہالت طاری ہے، اور جہنم کی آگ تو محسوس نہیں ہوتی ہے، اور جس کو محسوس ہوئی وہ اسی کے ساتھ مخصوص ہے، اور جاہلوں کو اس سے کوئی نقصان نہیں ہے۔ اچھی طرح سمجھ لیں۔

ولوكانت الصورة على وسادة ملقاة او على بساط مفروش لا يكره لانها تداس و توطأ بخلاف ما اذا كانت الوسادة منصوبة او كانت على الستر لانه تعظيم لها واشدها كراهة ان تكون أمام المصلى ثم من فوق راسه ثم على يمينه ثم على شماله ثم خلفه ولو لبس ثوبا فيه تصاوير يكره لانه يشبه حامل الصنم والصلوة جائزة فى جميع ذلك لاستجماع شرائطها و تعاد على وجه غير مكروه وهو الحكم فى كل صلوة اديت مع الكراهة ولا يكره تمثال غير ذى الروح لانه لايعبد.

ترجمہ:۔ اگر تصویر کسی پڑے ہوئے تکیہ یا بچھے ہوئے بستر پر ہو تو مکروہ نہیں ہے، کیونکہ تکیہ اور بچھونا پیروں تلے روندے اور بچھائے جاتے ہیں، بخلاف اس کے کہ تکیہ کھڑا ہو یا تصویر پردہ پر ہو تو مکروہ ہے کیونکہ یہ تصویر کی تعظیم ہے، پھر سب سے بڑھ

کر کراہت اس میں ہے کہ تصویر نمازی کے سامنے ہو پھر اس سے کم اس میں ہے کہ نمازی کے سر کے اوپر ہو پھر اس سے کم اس میں ہے کہ اس دائیں جانب ہو پھر اس سے کم جبکہ اس کے بائیں جانب ہو اور اس سے کم جبکہ نمازی کے پیچھے کی طرف ہو، اور اگر ایسا کپڑا پہنا کہ اس میں تصویریں بنی ہوئی ہوں تو وہ مکروہ ہوگی، کیونکہ یہ بت اٹھانے والے کے مشابہ ہوگا، ویسے ان تمام صورتوں میں نماز جائز ہوگی کیونکہ نماز جائز ہونے کی تمام شرائط جمع کرنے والا ہے، اور ایسی تمام نمازیں دوبارہ پڑھی جائیں جن میں کراہت نہ پائی گئی ہو، اور یہی حکم باقی نمازوں میں ہے کہ کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہوں اور غیر روح والی (بے جان) تصویر مکروہ نہیں ہے، کیونکہ ایسی تصویریں نہیں پوجی جاتی ہیں۔

توضیح:- نمازی کے سامنے پڑے ہوئے تکیہ یا بستر پر تصویر، کس حالت کی تصویر کتنی بری ہے اس کے درجے، تصویر والا کپڑا پہن کر نماز، ایسی نماز کا حکم جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو، درخت اور پھول وغیرہ کی تصویر کے ساتھ نماز، جزوی مسائل، مکانات میں تصویر، تصویر والے کپڑے کو بیچنا، امام کے بدن پر تصویر، تصویر بنانے پر اجرت، رنگ دار تصویر کا گھر گرانے والے کا حکم، قبر کی طرف نماز

ولو کانت الصورة علی وسادة ملقاة او علی بساط مفروش لا یکره لانها تداس......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے **لانه تعظیم لها** کیونکہ یہ تصویر کی تعظیم ہے۔ف۔ یعنی اس کے ساتھ کوئی بے تعظیمی یا بدتمیزی نہیں ہورہی ہے۔م۔ **واشدها کراهة الخ** ترجمہ سے مطلب واضح ہے کہ سب سے زیادہ کراہت اس صورت میں ہوتی ہے جبکہ تصویر نمازی کے سامنے ہو اور سب سے کم کراہت اس صورت میں ہے جبکہ تصویر پیچھے ہو۔ف۔ اور قول اصل کے مطابق پیچھے ہونے میں بھی کراہت ہے۔م۔ **و لو لبس الخ** اور اگر ایسا کپڑا پہنا جس میں تصویریں ہوں تو نماز مکروہ ہوگی، کیونکہ وہ شخص بت اٹھانے والے کے مشابہ ہوگا، **والصلوة جائزة الخ** اور نماز تو تمام مکروہ صورتوں میں جائز ہوگی، کیونکہ اس صورت میں بھی نماز کی تمام شرطیں موجود ہیں۔ف۔ لیکن ان شرطوں کے ساتھ ہی کراہت کی خارجی صورتیں بھی ان کے ساتھ پائی گئی۔

وتعاد علی وجه غیر مکروه وهو الحکم فی کل صلوة ادیت مع الکراهة......الخ

پھر اس طرح نماز ادا کی جائے گی کہ اس میں کراہت نہیں پائی گئی ہو۔ف۔ یعنی انتہائی احتیاط کے ساتھ نماز غیر مکروہ ہے۔ف۔ یعنی جس طرح انتہائی احتیاط کے ساتھ ترک واجب کی صورت میں ادا کیجاتی ہے۔ف۔ یعنی اس طرح ادا کی جائے کہ کسی قسم کی کراہت نہ ہونے پائے، **وهو الحکم الخ** اور یہی حکم ہر ایسی نماز میں ہے جو کراہت کے ساتھ ادا کی گئی ہو۔ف۔ کہ وہ اس طرح دوبارہ ادا کی جائے کہ اس میں کراہت کسی طرح کی نہیں پائی جائے، مذکورہ عبارت سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ پہلے مسئلہ میں کراہت تحریمی تھی، کیونکہ اگر تنزیہی کراہت ہوتی تو اسے دوبارہ ادا کرنا لازم نہ ہوتا۔م۔ **ولا یکره الخ** اور بے جان بے روح کی چیزوں کا نقشہ بنا ہوا ہونا مکروہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی پوجا نہیں کی جاتی ہے۔ف۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک روایت ہے کہ انہوں نے تصویر بنانے والے کو اس کام سے منع فرمایا تو اس نے اسے اپنے حصول رزق کے لئے عذر کا اظہار کیا، تو ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تمہیں یہی پیشہ اختیار کرنا ہی ہے تو بے جان چیزوں درخت وغیرہ کا نقش بنایا کرو۔

چند ضروری مسائل

گھروں میں تصویریں بنانا اور ایسے گھروں میں جانا اور بیٹھنا سب کام مکروہ ہے، تصویر والے کپڑے کو بیچنا مکروہ نہیں ہے، لیکن اقضیہ میں ہے کہ جو شخص تصویر کا کپڑا بیچتا ہو یا بنتا ہو اس کی گواہی قابل قبول نہیں ہے، جس کے بدن پر تصویر بنی ہوئی ہو اس کی

امامت مکروہ نہیں ہے کیونکہ وہ کپڑوں کے نیچے چھپی ہوتی ہیں، امام محمدؒ سے نوادر ہشام میں روایت کی ہے کہ ایک شخص نے ایک مزدور کو رنگ دیتے ہوئے کہا کہ آدمیوں کی تصویر بنادو، اگر وہ بنادے تو اس کی اجرت کا وہ مستحق نہ ہوگا کیونکہ یہ گناہ کا کام ہے۔
تفاریق میں ہے کہ اگر کسی نے رنگوں سے تصویریں بنی ہوئی دیوار کو گرادیا تو وہ شخص صرف گھر اور رنگ کی قیمت کا ذمہ دار ہوگا، تصویر کی قیمت کا ذمہ دار نہ ہوگا۔ ع۔ قبر کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنی مکروہ ہے، لیکن اگر نمازی اور قبر کے درمیان اتنا فاصلہ ہو کہ اگر نمازی کے سامنے سے گذرنا چاہے تو منع نہ ہو تو یہاں بھی مکروہ نہ ہوگا۔ الحاوی تاتارخانیہ۔

ولا بأس بقتل الحية والعقرب فى الصلوة لقوله عليه السلام اقتلوا الا سودين ولو كنتم فى الصلوة ولان فيه ازالة الشغل فاشبه درء المار ويستوى جميع انواع الحيات هو الصحيح لا طلاق ماروينا.

ترجمہ :-اور نماز کی حالت میں سانپ اور بچھو کے مار ڈالنے میں کوئی حرج نہیں ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ دونوں کالوں (بچھو اور سانپ) کو مار ڈالا کرو اگر چہ تم نماز کی حالت میں ہو، اور اس لئے بھی کہ ایسا کرنے سے ان کی طرف دلی خیال لگے رہنے کو دور کرنا ہے، تو یہ سامنے سے گذرنے والے کو دفع کرنے کے مشابہ ہو گیا، اس حکم میں ہر قسم کا سانپ داخل ہوگا اس میں مطلق حکم ہونے کی وجہ سے۔

توضیح :- نماز میں ہر قسم کے سانپ اور بچھو کے مار ڈالنے کا حکم
حدیث سے دلیل، گھر کے سانپوں کو مارنا

ولا بأس بقتل الحية والعقرب فى الصلوة لقوله عليه السلام اقتلوا الاسودين ولو كنتم فى الصلوة......الخ
نماز کی حالت میں بھی ہر قسم کے سانپ اور بچھو کے مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ف۔ اظہر یہ ہے کہ خواہ ایک ہی چوٹ میں مرے یا زیادہ سے اور اس سے کوئی خوف ہو یا نہ ہو مطلقاً اجازت ہے۔ المبسوط۔ اور امام شافعیؒ واحمدؒ کا بھی یہی قول ہے، **لقوله الخ** اس حدیث کی وجہ سے کہ دونوں کالوں کو قتل کرلو یعنی سانپ اور بچھو کو اگر چہ تم نماز کی حالت میں رہو۔ ف۔ اس کی روایت حاکم نے حضرت ابن عباسؓ سے کی ہے، اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث ہے **اقتلوا الاسودين فى الصلوة الحية و العقرب** کہ دونوں کالوں کو مار ڈالو نماز کی حالت میں بھی یعنی سانپ اور بچھو کو، اس کی روایت کی ہے ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، **ولان فيه الخ** اور ان کے مارنے کو اس وجہ سے بھی جائز کہا ہے کہ ان کو چھوڑ دینے سے ان سے نقصان کا ڈر لگا رہے گا اور مار ڈالنے سے وہ ڈر ختم ہو جائے گا، اس لئے یہ گذرنے والے انسان کے مشابہ ہو گیا۔

ويستوى جميع انواع الحيات هو الصحيح لا طلاق ماروينا......الخ
اس حکم میں تمام قسم کے سانپ داخل ہو گئے۔ ف۔ خواہ وہ سفید ہو یا گیسودار ہو یا کالا ناگ ہو، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ جو حدیث ہم نے روایت کی ہے وہ مطلق ہونے کی وجہ سے ہر قسم کو شامل ہے۔ ف۔ اسودین سے مراد سیاہ سانپ نہیں ہیں بلکہ عرف عرب میں سانپ کو کہتے ہیں خواہ وہ کسی رنگ کا ہو۔ م۔ اورؒ فقیہ ابو جعفر ہندوانیؒ نے کہا ہے کہ بعضے سانپ گھروں میں سپید اور گیسودار رہتے اور سیدھے چلتے ہیں وہ جنات ہوتے ہیں ان کو قتل کرنا جائز نہیں ہے، جبکہ ان کو پہلے یہ نہ کہدیا جائے کہ تم چلے جاؤ ورنہ ہم تمہیں مار ڈالیں گے، لیکن فقیہ ابو جعفر الطحاویؒ نے اس قول کو رد کرتے ہوئے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنوں سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کبھی بھی امت کے سامنے سانپ کی شکل میں ظاہر نہ ہوں اور نہ ان کے گھروں میں گھسیں تو اب جبکہ انہوں نے بدعہدی کی تو انہیں قتل کرنا مباح ہو گیا، قاضی خان نے کہا ہے کہ اولیٰ یہی ہے کہ ان کو پہلے مطلع کر دیا جائے۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ جب وہ نماز کی حالت میں سامنے آیا تو وہ شیطان ثابت ہوا، اس وقت اسے کس طرح مطلع کیا جائے گا،

اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ ابن عباسؓ سے صحیح روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے طلب کے ڈر سے سانپوں کو چھوڑ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے، کیونکہ جب سے اس نے ہم سے لڑائی مول لی ہے کبھی مصالحت نہیں کی ہے، اس جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب سانپ نے شیطان کی بات مانتے ہوئے آدم علیہ السلام کو نقصان پہونچایا ہے۔

ویکرہ عد الای والتسبیحات بالید فی الصلوۃ وکذلک عدالسور لان ذلک لیس من اعمال الصلوۃ وعن ابی یوسف ومحمد اللہ لاباس بذلک فی الفرائض والنوافل جمیعا مراعاۃ لسنۃ القراء ۃ والعمل بماجاء ت بہ السنۃ قلنا یمکنہ ان یعد ذلک قبل الشروع فیستغنی عن العد بعدہ واللہ اعلم.

ترجمہ:- اور مکروہ ہے نماز میں ہاتھ سے آیتوں اور تسبیحوں کو گننا، اسی طرح سے سورتوں کو شمار کرنا بھی، کیونکہ یہ چیزیں نماز کے اعمال میں سے نہیں ہیں، لیکن امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ سے منقول ہے کہ فرائض اور نوافل کسی میں بھی ان چیزوں کو شمار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، سنت قراءت کی رعایت کرتے ہوئے، اور سنت کے حکم پر عمل کرتے ہوئے، اور ہم اس کا جواب دیتے ہیں کہ نمازی کے لئے یہ ممکن ہے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے ان چیزوں کو گن لیا کرے اس لئے بعد میں گننے کی اسے کوئی ضرورت نہ ہوگی، واللہ اعلم۔

توضیح:- نماز میں آیتوں اور تسبیحوں کو ہاتھ سے شمار کرنا، ہاتھ میں تسبیح رکھنا، انگڑائی لینا، پیشاب وپاخانہ روکنا، پنکھا جھلنا

ویکرہ عد الای والتسبیحات بالید فی الصلوۃ......الخ

نماز کی حالت میں آیتوں اور تسبیحات کو ہاتھ سے شمار کرنا مکروہ ہے۔ف۔ اور غیر نماز میں قول صحیح کے مطابق نہیں ہے، ہاتھ ہی کی طرح تسبیح کا بھی حکم ہے، لیکن انگلیوں کے پوروں کو دبا کر گننے سے یا دل ہی دل میں شمار کرنے میں مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ محیط میں ہے۔الخلاصہ۔ زبان سے گننا تو مفسد نماز ہے۔المحیط۔

وکذلک عدالسور لان ذلک لیس من اعمال الصلوۃ......الخ

یہی حکم سورتوں کے شمار کرنے کا بھی ہے، وجہ یہ ہے کہ آیات یا تسبیحات یا سورتوں کو شمار کرنا نماز کے اعمال میں ضروری نہیں ہے، اور ظاہر الروایۃ بھی یہی ہے، لیکن غیر ظاہر الروایۃ میں صاحبینؒ کا اختلاف مروی ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے کہا ہے وعن ابی یوسف الخ اسی بناء پر امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ سے روایت ہے۔ف۔ یعنی غیر ظاہر الروایۃ میں کہ لاباس الخ فرائض و نوافل کسی میں ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے مراعاۃ الخ سنت قراءت کی نگہداشت کے خیال سے۔ف۔ جوہر نماز میں مثلاً فجر میں چالیس سے ساٹھ آیتوں تک شمار کا خیال رکھنا ہے، اس کے علاوہ اس بات پر عمل کرنا بھی جو سنت میں آئی ہے۔ف۔ جیسے صلوۃ التسبیح کہ اس کے ہر رکوع اور سجود وغیرہ میں دس دس بار سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ پڑھنے کا حکم آیا۔

قلنا یمکنہ ان یعد ذلک قبل الشروع فیستغنی عن العد بعدہ واللہ اعلم......الخ

ہم جواب دیتے ہیں نمازی کے لئے ممکن ہے کہ ان چیزوں کو نماز شروع کرنے سے پہلے ہی شمار کرلے اس لئے وہ بعد میں شمار کرنے سے مستغنی ہو جائے۔ واللہ اعلم۔ف۔ لیکن یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ قرآن مجید میں تو یہ ممکن ہے کہ ایک رکوع سے دوسرے رکوع تک یا مثلاً ۲۵ آیات تک شمار کرکے نماز میں اسی آیت تک پڑھ لے، لیکن یہ بات صلوۃ التسبیح میں ممکن نہیں ہے، لہٰذا صحیح جواب دو طرح سے دئے جائیں گے، جواب (۱) دل ہی دل میں گن کر یا انگلیوں کو دبا کر اندازہ کرلے، لیکن ایضاح میں تو ایسا کرنے کو بھی دل کا شغل قرار دیا ہے (۲) جواب یہ ہے کہ بیان کیا ہوا ائمہ کا اختلاف صرف نمازوں کے اندر ہے کیونکہ بالاتفاق نوافل میں شمار کرنے کو جائز کہا گیا ہے، جیسا کہ مرغینانی اور محبوبی نے ذکر کیا ہے، جیسا کہ عینی میں ہے، اس بناء پر فرض

نمازوں کے لئے پہلے ہی شمار کر کے ذہن میں محفوظ رکھ لے، اور نوافل وصلوۃ التسبیح وغیرہ میں گننا جائز بتایا گیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔ شمار دانہ جسے آجکل عموماً تسبیح یا سبحہ کہتے ہیں قول اصح کے مطابق جائز ہے، جیسا کہ السیوطیؒ نے اس کی تحقیق کی ہے، البحر نے اسے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اور علامہ فاضل لکھنوی نے النزہہ میں وضاحت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مکروہات نماز کے سلسلہ کے چند ضروری مسائل

مکروہات نماز میں سے یہ بھی ہیں، انگڑائی لینا، ہوا خارج نہ ہونے دینا یعنی روک کر رکھنا، پیشاب وپاخانہ روک کر رکھنا، پنکھا جھلنا بغیر زیادتی کئے ہوئے۔ التبیین۔ کھانسنا، کھنکھارنا قصداً بغیر کسی صحیح ضرورت کے، الزاہدی وغیرہ، تھوکنا، رکوع و سجود اور رکوع سے اٹھنے، دونوں سجدوں کے درمیان اطمینان سے بیٹھنے کو چھوڑنا، شرح المنیہ للامیر علی، ہدایہ۔

طمانیت واجب ہے، یہی قول صحیح ہے، جیسا کہ فتح القدیر نے اس کی تحقیق کی ہے، صف والے کھڑے ہوئے ہوں ان میں سے ایک کا بیٹھے رہنا، یا بیٹھے ہوئے ہوں اور ایک کا کھڑا ہونا۔ المحیط۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ کراہت تنزیہی تو ہو سکتی ہے لیکن تحریمی نہیں ہو سکتی ہے۔ م۔ اگلی صف میں گنجائش کے باوجود پیچھے تنہا کھڑا ہونا، اور اگر گنجائش نہ ہو تو حسنؒ کی روایت کے مطابق مکروہ نہیں ہے۔ د۔

ویسے اولیٰ یہ ہے کہ اگلی صف میں سے ایک کو کھینچ کر اپنے ساتھ کر لے۔ المحیط۔ فرض نمازوں میں ایک سورہ کو دوبارہ پڑھنا، لیکن نفل میں مکروہ نہیں ہے۔ قاضی خان۔ آیات کو اپنے اختیار کے ساتھ فرض نمازوں میں بار بار پڑھنا مکروہ ہے، اور بھول کر یا مجبوری کی صورت میں مکروہ نہیں ہے، جیسے نفل میں مطلقاً مکروہ نہیں ہے۔ المحیط۔ جمعہ کی نماز میں اور آہستہ سے پڑھی جانے والی نمازوں میں سجدہ کی سورت پڑھنا مکروہ ہے۔ الخلاصہ۔ سجدہ میں جاتے وقت گھٹنے سے پہلے ہاتھ رکھنا، اٹھتے وقت بغیر عذر پہلے گھٹنے اٹھانا مکروہ ہے۔ المنیہ۔

کمزوری اور بڑھاپا عذر ہے اسی بناء پر حدیث میں دونوں باتیں ثابت ہیں، اور حق بات یہ ہے کہ طاقت ور جوان کے حق میں مکروہ تنزیہی اور ضعیف کے حق میں مسنون ہے۔ م۔ مقتدی کا امام سے پہلے رکوع اور سجدہ میں پہونچ جانا، اور امام سے پہلے سر اٹھانا۔ محیط السرخسی۔

میں کہتا ہوں کہ حدیث میں اس کے لئے وعید آنے کی وجہ سے یہ مکروہ تحریمی ہے۔ م۔ بسم اللہ اور آمین کو بلند آواز سے کہنا۔ الزاہدی۔ میں کہتا ہوں کہ آمین کو جہراً کہنا جائز ہے اور یہی صحیح قول ہے۔ م۔ قراءت کو رکوع میں پہونچ جانے کے بعد مکمل کرنا، پورے طور پر رکوع میں پہونچ جانے کے بعد تکبیر کہنا یا جو ذکر ہو، بلا ضرورت یا مجبوری کے فرض نمازوں میں لکڑی وغیرہ پر ٹیک لگا کر کھڑا ہونا، لیکن نفل نمازوں میں مکروہ نہیں ہے، قول اصح کے مطابق۔ الزاہدی۔ قصداً بچے کو اٹھائے ہوئے پڑھنا، ورنہ مکروہ نہیں ہے۔ محیط السرخسی۔

عمامہ کو زمین سے اٹھا کر سر پر رکھنا، یا اس کے برعکس کرنا، السراج، عمامہ کے پیچ پر سجدہ کرنا۔ الذخیرہ۔ اپنے چہرہ کو مٹی لگنے سے بچانے کے لئے آستین پر سجدہ کرنا۔ البحر۔ اور عمامہ کو مٹی سے بچانے کے لئے یا پیشانی کو گرمی سے بچانے کے لئے آستین پر سجدہ کرنا مکروہ نہیں ہے۔ الظہیریہ۔ سجدہ کی حالت میں پاؤں ڈھکنا، الخلاصہ، حصول جنت یا دوزخ سے بچنے کے لئے فرض نمازوں میں دعا کرنا، مگر منفرد کو نفل نمازوں میں جائز ہے۔ المنیہ۔ ایک قدم پر کھڑا ہو کر آرام کر لینا۔ الظہیریہ۔ مگر عینیؒ نے شروط الصلوۃ میں اسے سنت لکھا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی صحیح ہے، جیسا کہ نسائی نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے۔ م۔ خوشبو سونگھنا۔ الذخیرہ۔ سجدہ کی حالت میں انگلیوں کو قبلہ سے پھیر دینا۔ قاضی خان۔ کعبہ کی چھت پر نماز پڑھنا، مسجد میں اپنی جگہ خاص کر لینا۔ تاتارخانیہ۔ کسی

آدمی کے منہ کی طرف نماز پڑھنا۔ ف۔ کسی کے آنے کی آہٹ پہچان کر رکوع میں دیر تک رہنا تاکہ وہ بھی شریک ہو جائے۔ مختار الفتاوی۔ منہ میں درہم یا دینار رکھنا یا ہاتھ میں مال لئے رہنا۔ قاضی خان۔ غلیظ نجاست سامنے پڑی ہونا۔ محیط السرخسی۔ بغیر عذر کے ٹھہرتے ہوئے کئی قدم چلنا، مگر عذر کے ساتھ مکروہ نہیں ہے۔ المحیط۔ بغیر عذر کے رکوع میں گھٹنے پر اور سجدہ میں زمین پر ہاتھ نہ رکھنا۔ قاضی خان۔ یہ مکروہ تحریمی ہے، اور قول اصح کے مطابق اس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ م۔ امام کے پیچھے قراءت کرنا مکروہ ہے۔ الہدایہ۔

سر ڈالنا یا اوپر کھینچنا، مرد کو رانوں میں پیٹ ملانا، امام کی موجودگی کے بغیر صف کھڑی کرنا خلاف سنت ہے۔ خزانۃ الفقہ۔ امام کا اتنی جلدی کرنا کہ مقتدی سنت پوری نہ کر سکیں۔ المنیہ۔ الحجہ۔ مکھیاں یا مچھر بھگانا، مگر مجبوری میں تھوڑی دیر بھگانا، تاتارخانیہ۔ کوئی بھی عمل قلیل ہو بغیر عذر مکروہ ہے۔ البحر۔

تیر و کمان لٹکائے ہوئے نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، ہاں اگر اس طرح لٹکایا ہو کہ اس سے نماز میں کسی طرح کا خلل ہو۔ السراج۔ یہی حکم پستول، ناشتہ دان، مال کی تھیلی، اور تلوار لٹکا کر پڑھنے کا بھی ہے، البتہ بندوق کا حکم یہ نہیں ہے۔ م۔ دوسرے کی غصب کی ہوئی زمین میں نماز تو جائز ہو گی، البتہ اس میں جس قدر حق اللہ کا ہے اس کی ادائیگی میں ثواب ہو گا اور جتنا حق بندہ کا ہے اس میں عذاب ہو گا۔ مختار الفتاوی۔ جو نماز کراہت تحریمی کے ساتھ ادا ہو اس کو دوبارہ پڑھنا واجب ہو گا، کیونکہ مکروہ تحریمی کا حکم کسی واجب چھوڑ دینے کے حکم میں ہوتا ہے، اور جو نماز کراہت تنزیہی کے ساتھ ادا ہو اسے دوبارہ پڑھنا مستحب ہے۔ الفتح۔

جزئیات

اگر کسی وقت والدین میں سے کوئی بھی مدد لینا چاہے یا فریاد کرتے ہوئے اسے آواز دیں تو نماز کی نیت توڑ دینی جائز ہے، اور اگر صرف پکاریں تو نہیں، کیونکہ ضرورت کی اہمیت کے مطابق قطع کا حکم ہو گا، السراج۔ ف۔ وغیرہ۔ یہ حکم فرض نمازوں میں تو بالاتفاق ہے، البتہ نوافل کے بارے میں کہا گیا کہ والد کے پکارنے پر نماز کو ختم کر دے، لیکن ہمارے اصول کی بناء پر اس میں تامل ہے، البتہ کہے ہوئے کے مطابق ہی فتویٰ دینا چاہئے، پھر میں نے در مختار میں بھی یہی فتویٰ دیکھا۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

اسی طرح نماز ان صورتوں میں بھی توڑی جا سکتی ہے جبکہ کوئی اجنبی چھت سے گرتا ہو یا آگ میں جلتا ہو یا ڈوبتا ہو یا اندھے کو کنویں میں گرتا ہوا نظر آئے اور وہ مدد کے لئے پکار بھی رہا ہو۔ السراج۔ ف۔ مناسب ہے کہ یہ حکم اس وقت ہو جبکہ یہ نمازی اس شخص کی فریادرسی کر سکتا ہو۔ م۔ اسی طرح اس وقت بھی نماز توڑ سکتا ہے جبکہ ایک درہم کی قیمت کی چیز چور لے بھاگے، یا عورت کی ہانڈی ابل جائے، یا مسافر کی سواری بدک جائے، یا چرواہے کو بھیڑئے کا خوف ہو۔ السراج۔ اور کافر نے آکر کہا کہ مجھے اسلام سکھادو تو اس وقت فوراً فرض نماز بھی توڑ ڈالے۔ الخلاصہ۔ طلوع فجر کے بعد اچھی بات کے علاوہ کوئی بات نہ کرے۔ محیط السرخسی۔ خصومت اور لڑائی کی نیت سے نماز نہ پڑھی جائے۔ الخلاصہ۔

فصل ویکره استقبال القبلة بالفرج في الخلاء لانه عليه السلام نهى عن ذلك والاستدبار يكره في رواية لما فيه من ترك التعظيم ولا يكره في رواية لان المستدبر فرجه غير موازى للقبلة وما ينحط منه ينحط الى الارض بخلاف المستقبل لان فرجه موازلها وما ينحط منه ينحط اليها.

فصل، قبلہ وطہارت و مساجد کے متعلق بعض احکام کا بیان

ترجمہ: مکروہ ہے خلاء میں مرد و عورت کے لئے شرم گاہ سے قبلہ کی طرف متوجہ ہونا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، اور ایک روایت میں اس کی طرف پیٹھ کرنا بھی کیونکہ اس میں بھی ترک تعظیم قبلہ ہے، لیکن دوسری روایت میں

پیٹھ کر کے بیٹھنا مکروہ نہیں ہے، کیونکہ پیٹھ کر کے بیٹھنے والا اپنی شرمگاہ کو قبلہ کے سامنے کرنے والا نہیں ہوتا ہے، اور شرمگاہ سے نکلنے والی چیز زمین کی طرف جاتی ہے، بخلاف اس قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھنے والے کے کیونکہ بیٹھنے والے کی شرمگاہ اس قبلہ کے سامنے ہوتی ہے اور شرمگاہ سے نکلنے والی چیز بھی قبلہ کے رخ ہی جاتی ہے۔

توضیح:۔ قبلہ وطہارت ومساجد کے متعلق احکام، شرمگاہ کے ساتھ خلاء میں قبلہ کا سامنا کرنا، قبلہ کی طرف سے پیٹھ پھیر کر بیٹھنے کی حدیث سے دلیل، قبلہ رو پیشاب وپائخانہ کرنا، یاد کر کے تعظیم کے لئے پھرنا، چھوٹے بچے کو قبلہ رو پیشاب وپائخانہ کرانا، خواب میں پاؤں کرنا، چاند وسورج کے سامنے شرمگاہ کرنا، ہوا کی طرف شرمگاہ کرنا

یکرہ استقبال القبلة بالفرج فی الخلاء لانه علیه السلام نهی عن ذلك......الخ

مرد اور عورت کا میدان میں شرمگاہ سے قبلہ کا سامنا کرنا مکروہ ہے۔ف۔ یعنی پیشاب وپائخانہ کرتے ہوئے قبلہ کی طرف شرمگاہ کو ننگا کر کے اپنی پیٹ کی گندگی باہر کرنا مکروہ تحریمی ہے، خواہ میدان میں ہو یا آڑ میں ہو یا نہ ہو، خواہ عمارت پائخانہ اور آبادی ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا ہے، والاستدبار یکرہ الخ استنجاء کرتے ہوئے قبلہ کی طرف پیٹھ کرنا بھی امام ابو حنیفہؒ کی ایک روایت میں مکروہ ہے، کیونکہ اس میں بھی تعظیم قبلہ کا ترک کرنا لازم آتا ہے۔ف۔ یہی روایت اصح ہے۔ع۔ د

ولا یکرہ فی روایة لان المستدبر فرجه غیر موازی للقبلة......الخ

اور دوسری روایت میں استدبار (قبلہ کی طرف پیٹھ کرنا) مکروہ نہیں ہے کیونکہ وہ اس حال میں ہوتا ہے کہ اس کی نیچے کی طرف کی شرمگاہ قبلہ کے سامنے نہیں ہوتی ہے، اور اس سے نکلنے والی ناپاک بھی نیچے زمین کی طرف جاتی ہے۔ف۔ یا پیشاب کی دھار دوسری طرف جاتی ہے بہر صورت قبلہ رخ نہیں ہے۔

بخلاف المستقبل لان فرجه موازلها وما ینحط منه ینحط الیها......الخ

بخلاف قبلہ کی طرف منہ کرنے والے کے کیونکہ اس کی شرمگاہ قبلہ کے سامنے ہوتی ہے، اور اس سے نکلنے والا پیشاب بھی قبلہ رخ ہی جاتا ہے۔ف۔ اس لئے اس کی طرف منہ کر کے استنجاء کرنا (استقبال) مکروہ ہوگا۔

واضح ہو کہ اس مسئلہ میں علماء کے درمیان اختلاف ہے، اول یہ کہ قبلہ کی طرف منہ کرنا اور پیٹھ کرنا دونوں مکروہ ہیں، خواہ میدان میں ہو یا آبادی میں اور مکان میں آڑ اور پردہ ہونے کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اس کی دلیل رسول اللہ ﷺ کی ممانعت ہے، چنانچہ ابو ایوب انصاریؓ جو بدری صحابی ہیں اور حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں انتقال فرمایا ہے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اذا اتیتم الغائط فلا تستقبلو الغائط ولا تستدبروها ولکن شرقوا او غربوا، یعنی جب تم پیشاب پائخانہ کو جاؤ تو قبلہ کی طرف منہ کر کے اور پیٹھ کر کے نہ بیٹھو لیکن مشرق یا مغرب کی طرف منہ کریں، اور پاکستان ہندوستان اور اس علاقہ کے دوسرے ملک والے اتر، شمال اور دکھن، جنوب کی طرف منہ کر کے بیٹھیں، حضرت ابو ایوبؓ سے روایت ہے کہ جب ہم لوگ ملک شام میں داخل ہوئے تو ہم نے وہاں نصرانیوں کے پائخانے قبلہ رخ بنے ہوئے پائے اس لئے ہم ان میں قبلہ رخ سے دوسری طرف مڑ کر بیٹھتے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے تھے، اس کی روایت نسائی وغیرہ نے کی ہے، یعنی دوسری طرف مڑ جانے کے باوجود ڈرتے کہ اس طرح بھی پھرنا جائز نہ ہو اس لئے استغفار کر لیتے۔م۔ یہ روایت جس طرح صحاح ستہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ سے مذکور ہے، اسی طرح حضرت سلمان فارسیؓ سے بھی بخاری کے علاوہ بقیہ ائمہ سے بھی منقول ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ سے مسلم، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے معقل بن ابی معقلؓ سے ابوداؤد وابن ماجہ نے، اور ایک انصاری صحابیؓ سے مؤطا میں مالکؒ نے روایت کیں، لہٰذا حدیث نہایت اعلیٰ درجہ کی صحیح ہوئی، اور اس کا مفہوم بالکل عام ہے کہ جنگل و آبادی میں آڑ

ہونے اور نہ ہونے کسی حال میں بھی استقبال یا استدبار نہ کرو، بالخصوص اس حدیث کی بناء پر کہ رسول اللہ علیہ کے بعد حضرت ابو ایوب انصاریؓ نے ملک شام میں اسی فرمان پر عمل کیا، یہی قول مجاہد، ابراہیم نخعی اور ابوحنیفہ کا ہے، پھر اس حدیث کے مخالف و معارض بھی روایتیں موجود ہیں، چنانچہ مروان اصفر نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ نے اپنا اونٹ سامنے بٹھا کر قبلہ کی طرف پیشاب کیا تو میں نے کہا کہ کیا اس کی ممانعت نہیں کی گئی ہے، فرمایا کہ ممانعت تو اسی صورت میں ہے کہ کھلا میدان ہو یا کچھ بھی آڑ (حائل) نہ ہو، اور جس جگہ آدمی اور قبلہ کے درمیان آڑ موجود ہو وہاں قبلہ رو ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس کی روایت ابوداؤد، ابن خزیمہ اور حاکم نے کی ہے، اسی قول کو شعبی و شافعیؒ نے اختیار کیا ہے، یعنی آڑ ہو تو استقبال و استدبار کسی حال میں بھی ہو، جائز ہے۔

اور ابن عمرؓ نے روایت کی ہے کہ میں ایک روز اپنی بہن حفصہؓ کے کوٹھے پر چڑھا تو میری نظر رسول اللہ علیہ پر پڑ گئی کہ آپ قبلہ رخ بیٹھ کر شام کی طرف منہ کئے ہوئے قضائے حاجت فرما رہے تھے، اس کی روایت بخاری اور مسلم نے کی ہے، اور جابر بن عبد اللہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ نے قضائے حاجت کے وقت قبلہ رو ہونے سے منع فرمایا تھا، پھر آپ کی وفات سے پہلے میں نے آپ کو دیکھا کہ آپ قبلہ رخ ہو کر قضائے حاجت فرما رہے تھے اس کی روایت ابوداؤد، الترمذی، ابن حبان، حاکم اور دار قطنی نے کی ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ان دونوں روایتوں (حضرت ابن عمر و جابرؓ) میں اس بات کا احتمال ہے کہ رسول اللہ علیہ کا عمل اس وقت خواہ استقبال کا ہو یا استدبار کا کسی ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے ہو، مثلاً جگہ نہ ہو اور کوئی بھی وجہ ہو، اسی سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ مروان اصفر کی ابن عمرؓ سے روایت ممکن ہے کہ ان کا اجتہاد ہو اس بناء پر کہ انہوں نے جبکہ رسول اللہ علیہ کو بیت المقدس کی طرف منہ کئے ہوئے دیکھا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کی ممانعت عمارتوں میں آڑ اور پردہ پائے جانے کی وجہ سے نہیں ہے، اور امام احمدؒ سے یہ مشہور ہے کہ استقبال تو ہر جگہ اور ہر حال میں منع ہے لیکن عمارت میں استدبار جائز ہے، بظاہر اس حدیث ابن عمرؓ کی وجہ سے ہو جو صحیحین کی ہے، اس میں ابن عمرؓ نے اپنے اجتہاد سے استنباط کیا ہو پھر استقبال کیا ہو تو یہ حدیث فعلی ہو گی اور ماقبل میں ممانعت کی حدیث قولی ہو گی پس تعارض کے وقت قول کو ترجیح ہو گی، اور فعلی اس کے معارض نہ ہو گی، لیکن یہاں ایک حدیث اور بھی ہے جو عراک عن عائشہؓ ہے کہ رسول اللہ علیہ کے سامنے کسی قوم کا تذکرہ اس طرح کیا گیا کہ وہ اپنی شرم گاہوں سے قبلہ کا سامنا کرنے کو مکروہ سمجھتی ہے یہ سن کر رسول اللہ علیہ نے فرمایا کیا ایسی ہی بات ہے؟ تو میری کھڈی (استنجاء کی جگہ) کو قبلہ رو کر دو، اس کی روایت ابن ماجہ، اور دار قطنی نے کی ہے، اور اس کی اسناد بھی صحیح ہے۔

اب میں مترجم کہتا ہوں کہ یہاں دو صورتیں نکلتی ہیں (۱) صورت یہ کہ ممانعت کی حدیث اپنے معنی میں بالکل واضح ہو اور ہر جگہ کے واسطے خاص ممانعت ہو تو اس صورت میں لامحالہ حضرت عائشہؓ کی حدیث ناسخ ٹھہرائی جائے، اور ہمیں یہ بات پہلے معلوم ہو چکی ہے کہ ممانعت والی حدیث اسناد کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی صحیح ہے اس لئے یہ ناسخ کسی طرح ممانعت کی حدیث کا معارضہ اور مقابلہ نہیں کر سکتی ہے، بنابریں ناسخ نہ ہو سکی، الحاصل ممانعت کا حکم عام باقی رہ گیا، اور غالباً وجہ بھی یہی ہے۔

(۲) صورت یہ ہے کہ پہلی حدیث مجمل ہو یا اس کو عام اور حضرت عائشہؓ کی حدیث کو مخصص قرار دینا اصل مانا جائے جیسا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک ہے اور یہ ان کے اصول میں سے ہے جو اپنے موقع پر ذکر کیا گیا ہے، اس طریقہ سے حضرت عائشہؓ کی حدیث بیان ہو گی کہ ممانعت کا حکم کھلے میدان کے لئے ہے، یا یہ کہ بنی ہوئی عمارتیں اس سے خاص قرار دی جائیں اس احتمال کی وجہ یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں پاخانے یا استنجاء خانے مدینہ کے گھروں میں نہیں بنائے جاتے تھے، قضائے حاجت کے لئے تمام افراد خانہ کو میدانوں میں یا جنگلوں میں جانا پڑتا تھا، یہاں تک کہ جس زمانہ میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ کو ناپاک منافقوں نے بہتان لگایا تھا اس وقت تک یہی طریقہ تھا جیسا کہ افک کی حدیث میں اس تصریح موجود ہے، اس بناء پر ممانعت کا حکم اس وقت بالکل عام تھا،

پھر گھروں میں استنجاء خانے بنائے جانے لگے جس کا بیان حضرات ابن عمرؓ و جابرؓ کی حدیث فعلی میں اور حضرت عائشہؓ کی حدیث قولی میں ہے۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ زیادہ احتیاط اسی بات میں ہے کہ ممانعت کے حکم کو مقدم رکھا جائے، نیز عینیؒ نے لکھا ہے کہ قول صحیح یہ ہے کہ جس ممانعت کا ذکر ہوا ہے وہ فرشتوں اور دوسروں کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ قبلہ کے احترام کی وجہ سے ہوا ہے جیسا کہ تہذیب الاثار طبرانی کی حدیث سراقہ بن مالک سے مرفوعا ثابت ہے، اور ایک حدیث جو بزارؒ نے روایت کی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو کوئی پیشاب کرنے کے لئے قبلہ رخ بیٹھ گیا پھر خیال آجانے کے بعد قبلہ کی تعظیم کے خیال سے دوسری رخ پر پڑ گیا تو اس جگہ سے اٹھنے بھی نہیں پائے گا اس کی مغفرت کردی جائے گی، اور فتح القدیر میں ہے کہ اس کی روایت طبرانی نے کی ہے عمرو بن جمیع عن عبداللہ بن الحسن عن جدہ، بالغ انسان (مرد ہو یا عورت) کے لئے یہ مکروہ ہے کہ چھوٹے بچے کو گود میں لے کر اسے قبلہ رخ پیشاب یا پائخانہ کرائے، اور یہ مکروہ ہے کہ خواب کے وقت اور دوسرے حالات میں قبلہ رخ اپنے پاؤں پھیلائے، اسی طرح قرآن پاک یا فقہ کی کتابوں کی طرف پاؤں پھیلانا بھی مکروہ ہے، مگر جبکہ یہ کتابیں پیر کے کافی اوپر جانب ہوں، میں مترجم کہتا ہوں کہ شرعی اور دینی ساری کتابیں یہانتک کہ حدیث و تفسیر کی ساری کتابیں بدرجہ اولی اسی حکم میں ہیں۔ م۔ت۔ چاند و سورج کی طرف بھی شرمگاہ کرنا مکروہ ہے، اور ہوا کے رخ پر بھی نجاست کے ڈر سے مکروہ ہے۔ ع۔م۔

ویکره المجامعة فوق المسجد والبول والتخلي، لان سطح المسجد له حكم المسجد، حتى يصح الاقتداء منه بمن تحته، ولايبطل الاعتكاف بالصعود اليه، ولايحل للجنب الوقوف عليه، ولاباس بالبول فوق بيت فيه مسجد، و المراد ما اعد للصلوة في البيت، لانه لم يأخذ حكم المسجد وان ندبنا اليه.

ترجمہ:- مکروہ ہے مسجد کی چھت پر مجامعت کرنا اور پیشاب کرنا اور پائخانہ کرنا کیونکہ مسجد کی چھت کا بھی حکم مسجد ہی کا ہے، یہانتک کہ اس کی نچلی منزل کے امام کی اقتداء کرنا اوپر کی منزل کے نمازیوں کے لئے صحیح ہے، اسی طرح نیچے کی منزل میں اعتکاف کرنے والوں کا اعتکاف اس کی چھت پر جانے سے باطل نہیں ہوتا ہے، اسی طرح جنبی کے لئے چھت پر چڑھنا حلال نہیں ہوتا ہے، اور کوئی حرج نہیں ہے ایسے گھر کے اوپر پیشاب کرنے میں جس میں مسجد بنائی گئی ہو، اس میں مسجد سے مراد اصطلاحی مسجد نہیں ہے بلکہ وہ جگہ نماز کے لے متعین کرلی گئی ہو، کیونکہ اس جگہ نے مسجد کا حکم حاصل نہیں کیا ہے، اگرچہ ہمیں ایسے مصلے بنالینے کی رغبت دلائی گئی ہے۔

توضیح:- مسجد کی چھت پر جماع کرنا، پیشاب اور پائخانہ کرنا، اعتکاف کی حالت میں مسجد پر چڑھنا، جنبی اور مسجد کی چھت، گھر میں نماز کی جگہ اور اس کی چھت پر پیشاب، چوڑے راستوں کی مسجدیں، عید کی نماز کی جگہ اور جنازہ کی نماز کی جگہ میں حائض اور جنبی کا داخل ہونا، فنائے مسجد کا حکم

ویکره المجامعة فوق المسجد والبول والتخلي......الخ

مطلب واضح ہے۔ف۔ یہ کراہت تحریمی ہے۔ف۔ لان المسجد الخ کیونکہ مسجد کی چھت بھی مسجد کے حکم میں ہوتی ہے۔ف۔ چھت سے آسمان تک ایک حکم ہے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہوا ہے۔ف۔ع۔ یہانتک کہ مسجد کی چھت کے اوپر سے اس امام کی اقتداء جائز ہے جو مسجد کے نیچے حصہ میں ہے۔ف۔ بشرطیکہ امام کا حال ان لوگوں سے چھپا ہوا نہ ہو۔ع۔ اور چھت پر چڑھنے سے اعتکاف باطل بھی نہیں ہوتا ہے۔

ولایحل للجنب الوقوف علیه......الخ

اور جنبی کو مسجد کی چھت پر چڑھنا، کھڑے ہونا جائز نہیں ہے۔ف۔ مثلاً مکان سے ملی ہوئی چھت سے مسجد کی چھت پر

آجائے اگر وہ جنبی ہو تو جائز نہیں ہوگا ورنہ جائز ہوگا۔م۔ بغیر عذر مسجد کو گذر گاہ یا راستہ بنانا مکروہ ہے، اور اگر کوئی اس کی عادت بنالے تو وہ فاسق کہلائے گا۔ القنیہ۔ جبکہ مسجد میں نجاست لے جانا جائز نہیں ہے اس لئے اس میں ناپاک تیل جلانا بھی جائز نہیں ہے، اسی طرح ناپاک چیز سے مسجد کو لیپنا بھی صحیح نہیں ہے، اسی طرح پیشاب یا فصد کا خون بھی لے جانا اگرچہ پیالہ میں ہو جائز نہیں ہے۔ت۔ ایسی مسجدیں جو پانی کی نالیوں اور حوضوں کے پاس بنادیتے ہیں تو قول اصح یہ ہے کہ وہ مسجد کی طرح محترم نہیں ہوتی ہیں، یہانتک کہ میت کو وہاں لے جانا جائز ہوتا ہے۔ع۔

و لاباس بالبول فوق بیت فیه مسجد، و المراد ما اعد للصلوة فی البیت......الخ

ایسے گھر کی چھت پر پیشاب کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے جس میں مسجد بنی ہوئی ہو۔ف۔ نماز کے لئے جگہ ہے، اس مسجد سے مراد وہ جگہ ہے جو گھر میں نماز پڑھنے کے لئے متعین کردی گئی ہو۔ف۔ لہٰذا وہ حقیقی مسجد نہیں ہوئی لانه لم یا خذ الخ کیونکہ اسے مسجد کا درجہ اور حکم مسجد حاصل نہیں ہے، اگرچہ ہمیں ایسی مسجد بنانے کی ترغیب دی گئی ہے۔ف۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں مسجدیں بنانے اور انہیں پاک وصاف رکھنے کا حکم فرمایا ہے، اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے، اس لئے مستحب ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کو خاموش مقبرہ نہ بنائے، بلکہ اس میں نفلیں پڑھنے اور ذکر واذکار کے لئے ایک نماز گاہ بنادے، یہ جگہ اسی کی ملکیت میں رہے گی، جب اسے مسجد کا حکم نہیں دیا گیا تو یہ جائز ہوگا کہ اس جگہ کے اوپر چھت پر پیشاب وغیرہ کرسکے۔ع۔ بلکہ خود اس جگہ میں بھی کرنا جائز ہے۔د۔ اور اس جگہ کے بدلے دوسری جگہ نماز کے لئے متعین کرلے۔م۔ جو جگہ نماز عید وجنازہ کے لئے مقرر کی ہوئی ہو اس کے بارے میں مشائخ کا اختلاف ہے، صدر الشہیدؒ نے فرمایا ہے کہ قول مختار میں فتوی یہ ہے کہ اگرچہ اس کی صفیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ ہوں پھر بھی اقتداء صحیح ہونے کے لئے اسے مسجد کا حکم ہوگا، تاکہ لوگوں سے حرج دور ہوکر آسانی حاصل ہو، اس کے علاوہ دوسرے احکام میں وہ مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔ع۔ یہی اصح ہے۔ التبیین۔ف۔ اسی پر فتوی دینا چاہئے۔ النہایہ۔

اور جو مسجدیں چوڑے اور عام راستوں پر ہیں ان کو مسجد کا حکم حاصل ہے لیکن ان میں اعتکاف اس لئے جائز نہیں ہوتا کہ ان کا نہ کوئی امام مقرر ہوتا ہے اور نہ کوئی موذن۔ع۔ عید گاہ اور جنازہ کی نماز کے لئے متعین جگہ میں جنبی اور حائض کا جانا جائز ہے۔د۔ فنائے مسجد کو مسجد ہی کا حکم حاصل ہوتا ہے، یہانتک کہ فنائے مسجد میں کھڑے ہوکر مسجد کے امام کی اقتداء بھی جائز ہوگی، اگرچہ ان کی صفیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی نہ ہو، اور نہ مسجد بھری ہو، اسی مسئلہ کی طرف باب الجمعہ میں امام محمدؒ نے اشارہ کیا ہے کہ طاقات (مسجد کے دروازہ کے باہر چھجوں) میں اقتداء جائز ہے اگرچہ صفیں ملی ہوئی نہ ہوں، اور روپے پیسے کے لین دین کی جگہ سے اقتداء صحیح نہیں ہے، مگر اس وقت صحیح ہے جبکہ صفیں وہاں تک پہونچ جائیں، اسی طرح وہ دوکانیں جو مسجد کے دروازہ پر ہوتی ہیں ان سے بھی اقتداء صحیح نہیں ہے، کیونکہ وہ فنائے مسجد میں سے ملی ہوئی مسجدیں ہیں۔ القاضی خان۔

ویکره ان یغلق باب المسجد، لانه یشبه المنع من الصلوة، و قیل لاباس به اذا خیف علی متاع المسجد فی غیر اوان الصلوة، ولاباس بان ینقش المسجد بالجص والساج وماء الذهب، وقوله لاباس یشیر الی انه لایؤجر علیه، لکنه لا یأثم به، و قیل هو قربة، وهذا اذا فعل من مال نفسه.

ترجمہ:- اور مکروہ ہے مسجد کے دروازہ کو بند کرنا کیونکہ ایسا کرنے سے نماز سے روکنے سے مشابہت پیدا ہوتی ہے، اور کہا گیا کہ اگر مسجد کے سامان کے چوری ہوجانے کا خطرہ ہو تو اوقات نماز کے علاوہ اسے بند کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اور اس بات میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ مسجد کو چونہ اور سوگوان کی قیمتی لکڑی اور سونے کے پانی سے مزین کیا جائے، اس میں لاباس کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسا کرنے سے گنہگار تو نہیں ہوگا مگر ثواب بھی نہیں دیا جائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ بھی ایک نیکی اور ذریعہ قربت ہے، یہ اس صورت میں جبکہ کرنے والے نے اپنے مال سے خرچ کیا ہو۔

توضیح:۔ مسجد کے دروازہ کو بند کرنے کا حکم، مسجد میں نقش و نگار اور تزیین کرنا مترجم کی طرف سے توضیح، قرآن شریف پر سونا چڑھانے اور منقش کرنا

ویکرہ ان یغلق باب المسجد، لانہ یشبہ المنع من الصلوۃ......الخ

مطلب واضح ہے نماز سے روکنے کے مشابہہ ہے۔ف۔ جبکہ نماز سے روکنا حرام ہے۔ع۔ وقیل الخ مطلب واضح ہے۔ف۔ اس لئے اوقات نماز کے علاوہ بند کردے، اور یہی صحیح قول ہے، التبیین۔ فع۔ اور اس کا انتظام محلہ والوں کے ذمہ ہوگا۔ع۔ ولاباس الخ اور مسجد میں نقش و نگار بنانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ف۔ محراب اور قبلہ کی دیوار کے علاوہ۔ف۔ الجص گچ الساج سال کی لکڑی، یعنی ساکھو۔ ماء الذھب سونے کا پانی۔ف۔ یعنی ان چیزوں سے مسجد کی چھت وغیرہ میں نقش کرنا، سوائے قبلہ کی طرف کی دیوار کے کوئی حرج نہیں ہے۔

ولاباس بان ینقش المسجد بالجص والساج وماء الذھب......الخ

مصنفؒ کے اس کہنے میں کہ مضائقہ یا حرج نہیں ہے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نقش کرنے والے کو اس پر ثواب نہ ملے گا، لیکن اس سے گنہگار بھی نہ ہوگا۔ف۔ شمس الائمہؒ نے یہ بھی کہا ہے، اخبار واحادیث میں موجود ہے کہ مسجدوں کی آرائش و زیب و زینت کرنا قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، حضرت علیؓ نے اسی آرائش کی وجہ سے ایک مسجد کو بیعہ (گرجا گھر) کہا ہے، ولید بن عبدالملک نے مدینہ میں مسجد نبوی کی تزئین کے لئے مال بھیجا تو عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسے محتاجوں میں تقسیم کردیا، محمد بن الحسنؒ نے ظاہراً اس نظر سے کہ مسجد بیت المقدس میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بہت روشن سرخ یاقوت اور دوسری بہت سی چیزیں آرائش کی ہیں، اسی طرح خانہ کعبہ میں بھی اندر سے سنہرا کام کیا ہو آراستہ اور باہر سے دیباج کے قیمتی پردوں سے سجا ہوا ہے اس بناء پر مسجد کی تزئین اور رہائش میں تعظیم ہے۔

پھر کہا گیا ہے کہ باریک کام اور نقش و نگار اور انتشار خیال میں ڈالنے والی چیزیں مکروہ ہیں، اور کہا گیا ہے محراب اور قبلہ کی دیوار میں نقش و نگار مکروہ ہے۔ع۔ اور کراہت اس بناء پر محمول ہے کہ نقش و نگار میں باریکی دوسری سجاوٹ ہو، بالخصوص محراب کی دیوار میں یا آراستگی ترک نماز کے ساتھ ہو یا اس میں بیٹھ کر دنیا کی باتیں ہو: الفتح۔ بندہ مترجم کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسجد یاد الٰہی، عبادت میں خلوص، آخرت کی طرف رغبت اور دنیا کی حقارت کی جگہ ہے، اس لئے وہ ہر بات جو عبادت میں فرحت اور انہماک بڑھانے والی اور نمازی کو اس کی عبادت میں راحت دینے والی ہوں ان کے انتظام میں کوئی حرج نہیں ہے، مثلاً سخت سردی سے بچاؤ اور ان کے علاوہ ہر وہ کام جو نقش و نگار اور دنیاوی آرائش کی طرف مائل کرنے والے ہوں وہ بلاشبہ مکروہ یا اس سے قریب ہیں یہانتک کہ عام لوگ بھی مسجد کی دیکھا دیکھی زینت کا شوق حاصل کریں، انہی وجوہ سے ہمارے اسلاف کا انکار پایا جاتا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم بحقیقۃ الحال۔م۔ یہی بات قرآن پاک پر سونے کا پانی چڑھانے میں ہے، ابن الہمامؒ نے مذکورہ مسائل پر قیاس کرتے ہوئے کہا ہے کہ کوئی حرج نہیں ہے۔

و قیل ھو قربۃ، وھذا اذا فعل من مال نفسہ......الخ

کہا گیا ہے کہ مسجد میں نقش و نگار بنانا عبادت ہے۔ف۔ کیونکہ اس میں تعظیم مسجد ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ یہ تقرب و عبادت ہے تو اس کے مقابلہ میں فقیر کو دینا زیادہ بہتر ہے۔ف۔ ھذا اذا فعل الخ اس نقش و نگار میں حرج نہ ہونے یا مستحب ہونے کا حکم اس وقت ہے جبکہ کوئی شخص اپنے ذاتی مال سے خرچ کر رہا ہو۔ف۔ یعنی اپنا حلال مال لگائے، اور مسجد کے اس مال سے نہ ہو جو اسکے بنانے والے نے اس کے خرچ کے لئے وقف کر دیا ہے۔

اما المتولی یفعل من مال الوقف مایرجع الی احکام البناء دون مایرجع الی النقش حتی لو فعل یضمن واللہ

اعلم بالصواب.

ترجمہ :-اور مسجد کا متولی وقف کے مال سے صرف وہی کام کرے گا جن سے مسجد کی مضبوطی اور پائیداری ہوتی ہو، اور اسے نقش و نگار میں خرچ نہیں کرے گا یہانتک کہ اگر اس نے ایسے کام کر لئے تو ان کے اخراجات کا وہ خود ذمہ دار ہو گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

توضیح :- متولی اور وقف کا مال، افضلیت مساجد بالترتیب۔ مسجد میں سوال کرنا گم شدہ جانور کا پتہ ڈھونڈھنا، اشعار، آواز بلند کرنا، وضوء کرنا، درخت لگانا کنواں کھودنا، کھانا، پینا سونا وغیرہ کئی ضروری متفرق مسائل

اما المتولی یفعل من مال الوقف مایرجع الی احکام البناء دون مایرجع الی النقش......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ یعنی متولی کو اپنے مال سے تاوان دینا پڑے گا۔م۔ شیخ ابو بکر رازیؒ سے مروی ہے کہ ہمارے زمانہ میں ظالموں کے خوف سے بچا ہوا مال عمارت کی مضبوطی کے بعد اگر زینت وغیرہ میں خرچ کر دے تو جائز ہے۔ع۔ الکافی۔ھ۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ضمان دینا نہ ہوگا، اگرچہ اس سے بہتر دوسرا کوئی بھی کام ہو۔م۔ تمام مسجدوں میں افضل مسجد الحرام جو مکہ میں ہے، اس کے بعد نبوی جو مدینہ میں ہے، پھر بیت المقدس پھر مسجد قباء ہے، پھر وہ جو سب سے زیادہ پرانی ہو، پھر جو سب سے بڑی ہو، پھر جو زیادہ قریب ہو، پھر استاد کی وہ مسجد جس میں فقہ و حدیث اور شریعت سے متعلق چیزوں کا سبق ہوتا ہو، یہ بالاتفاق ہے، مسجد میں کچھ مانگنا حرام اور دینا مطلقاً مکروہ ہے، اور مکروہ باتوں میں سے ہے، گم شدہ جانور کا اعلان، نصیحت کے اشعار کے ماسوا اشعار پڑھنا، آواز بلند کرنا، مقرر کردہ جگہ کے علاوہ کسی اور جگہ وضوء کرنا، درخت لگانا، کنواں کھودنا، کھانا، سونا معتکف اور مسافر کے علاوہ دوسروں کے لئے، پیاز وغیرہ بدبودار چیز کھا کر مسجد جانا، جائز باتیں کرنا، کسی کو اس کی جگہ سے ہٹانا جائز نہیں ہے مگر جب کہ جگہ تنگ ہو تو جائز ہے، اگرچہ وہ تعلیم دے رہا ہو، یا قرآن کی تلاوت کر رہا ہو، محلہ والوں کے لئے یہ جائز ہے کہ دو مسجدوں کو ملا کر ایک بنا دیں، مسجد کو پاک کرنے کے لئے ابابیل اور کبوتر کے گھونسلوں کو نکال کر پھینک دینا جائز ہے۔د۔ اگر ان میں سے بچے ہوں تو ان کو ذبح کئے بغیر زندہ ہی پھینک دینا جائز نہیں ہونا چاہئے، اگرچہ اسے بھی جائز کہا گیا ہے۔م۔ن۔

مسجد کی دیوار اور محراب پر لکھنا اچھا نہیں ہے، جس جائے نماز میں اللہ کے نام لکھے ہوں اسے بچھانا اور استعمال کرنا، یا جو اسے استعمال کرے اس کے ہاتھ بیچنا مکروہ ہے، چاہیے کہ اسے کسی اونچی جگہ پر رکھ دے اسی طرح دعاؤں کے پرچے لکھ کر دروازوں پر چپکانا مکروہ ہے۔ الکفایہ۔ مسجد میں کلی اور وضوء کرنا مکروہ ہے، البتہ اگر اس کے لئے کوئی جگہ متعین کر لی گئی ہو تو وہاں وضوء کر سکتے ہیں پھر وہاں نماز نہیں پڑھنی چاہئے، البتہ برتن میں وضوء کر سکتا ہے۔ قاضی خان۔ دیوار، چٹائی اور زمین پر اور سامنے نہیں تھوکنا چاہئے، اور اگر تھوک دیا تو اسے اٹھانا اور دبا دینا واجب ہے، اور یہی حکم ناک کے پانی اور رینٹ کا بھی ہے، ہونے سے اسے کپڑے پر لے لینا چاہئے، مسجد کی دیوار اور ستون میں پاؤں پوچھنا مکروہ ہے، چٹائی سے پوچھنے میں حرج نہیں ہے، جیسے رکھی ہوئی لکڑی سے یا مٹی کے ڈھیر سے، اور اگر مٹی پھیلی ہوئی ہو تو قول مختار میں مکروہ ہے۔ محیط السرخسی۔

پرانے کنویں مثل زم زم کو چھوڑ کر نیا کنواں کھودنا مکروہ ہے۔ قاضی خان۔ چٹائی وغیرہ رکھنے کے لئے جگہ بنا لینے میں کوئی حرج نہیں ہے بغیر عذر مسجد کو راستہ بنانا مکروہ ہے، اور عذر کے ساتھ جائز ہے، ایسی صورت میں ہر روز اس میں ایک بار نماز پڑھ لینی چاہئے، ہر آنے اور جانے میں پڑھنا ضروری نہیں ہے، اگر مسجد کی حفاظت کی نیت سے اس میں بیٹھنے والا درزی سینے کا کام

کرنے لگے تو مکروہ نہیں ہے لیکن اجرت کی نیت سے سینا مکروہ ہے اس میں بیٹھ کر کاتب اگر اجرت پر لکھتا ہو تو مکروہ ہے ورنہ نہیں، اگر استاد دھوپ وغیرہ کی وجہ سے مسجد میں بیٹھے تو مکروہ نہیں ہے، اور اقرار العیون میں اسے درزی اور کاتب کے حکم میں لکھا ہے۔ الخلاصہ۔

اگر مسجد ایک احاطہ میں ہو اگر اس احاطہ کے دروازہ کو بند کردینے کے بعد احاطہ کے اندر والوں کی جماعت ہو تو وہ احاطہ مسجد کے حکم میں ہے بشرطیکہ وہ لوگ عام طور پر لوگوں کو منع کرتے ہوں، اور اگر اسے بند کرنے کے بعد جماعت نہ رہے تو وہ مسجد نہیں ہے اگرچہ احاطہ والے کسی کو منع نہ کرتے ہوں۔ قاضی خان۔ مسجد کا چراغ گھر میں یا گھر کا چراغ مسجد میں نہیں لانا چاہئے۔ الخلاصہ۔ تہائی رات سے زیادہ مسجد کے چراغ کو جلتا ہوا نہ چھوڑا جائے، البتہ اگر وقف کرنے والے نے اس کی شرط کردی ہو یا اس علاقہ میں اس کا رواج ہو، کسی شخص نے محض بوجہ اللہ مسجد بنا کر اسے للہ وقف کردیا تو آئندہ اس کی ہر قسم کی نگہداشت اور انتظامات مثلاً اس کی مرمت تعمیر، چٹائی اور فرش بچھانے اور قندیل لٹکانے، اذان واقامت اور امامت وغیرہ کا وہی زیادہ حقدار ہے، اور اگر وہ اس لائق نہ ہو تو اسی کی رائے کے مطابق دوسرا انتظام کرے۔ قاضی خان۔ نماز کے بغیر بھی مسجد میں بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن اگر اس کی وجہ سے مسجد کا کچھ نقصان ہو وہ ذمہ دار ہوگا۔ الخلاصہ۔

باب صلوة الوتر

الوتر واجب عند ابی حنیفة، وقالا سنة لظهور آثار السنن فيه حيث لا يكفر جاحده، ولا يؤذن له، ولابی حنیفة قوله عليه السلام: أن الله تعالى زادكم صلاة ألا وهي الوتر فصلوها ما بين العشاء الى طلوع الفجر امر وهو للوجوب، ولهذا وجب القضاء بالإجماع، وإنما لا يكفر جاحده لان وجوبه ثبت بالسنة وهو المعنى بما روى عنه انه سنة، وهو يؤدى فى وقت العشاء، فاكتفى بأذانه وإقامته.

ترجمہ:- نماز وتر کا باب، نماز وتر واجب ہے امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ سنت ہے، اس میں سنت کی علامتیں پائی جانے کی وجہ سے اس طور پر کہ اس کے انکار کرنے والے کو کافر نہیں کہا جاتا ہے، اور اس لئے اذان نہیں دی جاتی ہے، امام ابو حنیفہؒ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ایک نماز زیادہ کی ہے، خبردار ہو کہ وہ وتر کی نماز ہے، اس لئے تم اسے عشاء سے طلوع فجر کے درمیان، اور یہ ایک امر ہے جو وجوب کے لئے ہوتا ہے، اسی لئے بالاجماع اس کی قضاء واجب ہوتی ہے، اس کے منکر کو اس لئے کافر نہیں کہا جاتا ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہے، اور یہی معنی ہیں اس روایت کے جو آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ یہ سنت ہے، اور یہ عشاء کے وقت میں ادا کی جاتی ہے اس لئے اسی کی اذان اور اقامت پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

توضیح:- وتر کی نماز کا بیان، حنیفہ کی دلیل، وتر کی نماز کا وقت

باب صلوة الوتر: الوتر واجب عند ابی حنیفة، وقالا سنة لظهور آثار السنن فيه.....الخ

وتر کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ سے تین روایتیں منقول ہیں، (۱) قول وتر فرض ہے، اور یہی قول امام زفر اور مالکیہ میں سے سجنونؒ واصبغؒ وابو بکر بن العربیؒ کا ہے، اور ابن بطالؒ نے اسے حضرت ابن مسعود وحذیفہؓ اور ابراہیم نخعیؒ سے نقل کیا ہے کہ اہل القران پر فرض ہے، اور شیخ علم الدین سخاویؒ نے اسی کو پسند کیا ہے، اور شرح المجمع میں ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک عمل کے اعتبار سے وتر فرض ہے اور اعتقاد کے اعتبار سے واجب ہے، (۲) قول وہ ہے جو مصنفؒ نے یہاں پر فرمایا ہے کہ الوتر واجب عندابی حنیفةؒ وتر امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب ہے۔ ف۔ ابو حنیفہؒ کا ظاہر مذہب یہی ہے۔ الدرایہ۔ یہی صحیح ہے۔ ع۔ یہی اصح ہے۔ القاضی خان، (۳) قول یہ ہے کہ وتر سنت مؤکدہ ہے، یہی قول اکثر علماء کا ہے وقالا الخ اور صاحبینؒ یعنی امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ وتر سنت یعنی مؤکدہ ہے لظهور الخ کیونکہ وتر میں سنت کی علامت ظاہر ہے، چنانچہ وتر کا منکر کافر

نہیں ہوتا ہے اور وتر کے لئے اذان بھی نہیں کہی جاتی ہے۔ف۔

اور مخدجیؒ سے روایت ہے کہ شام کے ایک شخص نے کہا ہے جن کا نام ابو محمد ہے کہ وتر واجب ہے، تو میں لوٹ کر عبادہ بن الصامتؓ کے پاس آیا اور عرض کیا کہ ابو محمد فرماتے ہیں کہ وتر واجب ہے، عبادہؓ نے فرمایا کہ انہوں نے جھوٹ کہا، میں نے رسول اللہ علیہ السلام سے سنا ہے کہ پانچ نمازیں ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر فرض کیا ہے۔ آخر تک۔ اس کی روایت ابوداؤد اور نسائیؒ نے کی ہے "جھوٹ کہا" کا مطلب ہے کہ انہوں نے اپنے اجتہاد میں خطاء کی ہے۔ع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ نفی فرضیت کی دلیل ہے، اور فرض ہونے کا قول انصاف کی نظر میں اتنا کمزور ہے کہ اس مسئلہ میں اور گفتگو کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے، مگر اس سے واجب کی نفی نہیں ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں تو یہ فرض نہیں ہے بلکہ واجب ہے جیسے عیدین کی نماز اور اسی بناء پر اس کا منکر کافر نہیں ہوتا ہے، اور نہ مثل عید کے اذان ہے، لیکن اس میں باعتبار معنی کے غور کرنے کے بعد وجوب ہی کے معنی معلوم ہوتے ہیں، یعنی اسے وجوب کہنا اس بناء پر ہے کہ دلیل کے ثبوت یا دلالت میں ایک نوع تصور ہوتا ہے ورنہ اصل میں یہ فرض ہے، پھر عبادت کی قسموں میں سے نمازوں کی فرضیت حقیقتاً پچاس ہے اگرچہ کم کر کے پانچ کی تعداد میں رکھی گئی ہیں، اس اعتبار سے کہ ہر ایک دس گنا کے برابر ہے اس طرح شکل میں پانچ برابر پچاس کے ہو گئیں، جیسا کہ معراج کی حدیث میں اس بات کی تصریح ہے، اور آخر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا **یبدل القول لدی** کہ میرے یہاں بات بدلی نہیں جاتی اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ اس نماز کے مسئلہ میں جتنی فرض نمازیں ہیں بس یہی ہیں، عملی وجوب کسی خاص بات کا خیال رکھتے ہوئے احتیاطاً ہے، پھر وہ باتیں آئندہ سامنے آئینگی۔م۔

ولابی حنیفة قوله علیه السلام: أن الله تعالی زادکم صلاة ألا وهی الوتر فصلوها......الخ

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک نماز زیادہ کر دی ہے اور سن لو کہ وہ وتر کی نماز ہے اس لئے اسے عشاء اور طلوع فجر کے درمیان پڑھو، اور یہ حدیث بصیغہ امر ہے یعنی فصلوا امر وجوب کے لئے ہوتا ہے۔ف۔ لہٰذا نماز وتر واجب ہوئی، **ولهذا الخ** اسی بناء پر وتر کی قضاء بالاجماع واجب ہے۔ف۔ یعنی بالاجماع ثابت ہے، اگرچہ صاحبینؒ کے نزدیک وجوباً نہیں ہے، بلکہ سنت کی قضاء واجب نہیں ہے اس طرح سنت سے فرق ہو گیا اور نتیجہ کے طور پر نماز وتر واجب ہوئی، **وانما لایکفرا الخ** اس کے منکر کے اوپر کفر کا حکم اس لئے نہیں لگایا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت سنت سے ہوتا ہے۔ف۔ اور وہ حدیث متواتر یا مشہور نہیں ہے اور دلالت قطعی بھی نہیں ہے اس لئے یہ فرض نہیں ہوئی اور اسی وجہ سے اس کے منکر کو کافر نہیں کہا جائے گا۔

وهو المعنی بما روی عنه انه سنة......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ سے جو روایت ہے کہ وتر سنت ہے اس کا مطلب یہی ہوا۔ف۔ وتر کے واجب ہونے کا ثبوت سنت کی دلیل سے ہے **وهو یودی الخ** اور چونکہ وتر کی نماز عشاء کے وقت میں ادا کی جاتی ہے اس لئے عشاء کی اذان و اقامت پر اکتفاء کیا گیا۔ف۔ اسی لئے وتر کے واسطے مستقلاً اذان و اقامت نہیں ہے، اس کے علاوہ عید کی نماز کے مانند وتر واجب کے لئے بھی اذان کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

شیخ ابن الہمامؒ کے قول کے مطابق مختصر طور پر اس مسئلہ کی تحقیق اس طور پر ہے کہ حدیث مذکور کئی صحابہ کرامؓ نے روایت کی ہے جو یہ ہیں عمرو بن العاصؓ وعقبہ بن عامرؓ وابن عباسؓ وابن عمرؓ وابو سعید الخدریؓ اور عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ اور خارجہ بن حذافہؓ وابو بسرہ غفاری، اور تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے یہ ساری روایتیں ضعیف ہیں، سوائے حدیث خارجہؓ کے جو یہ ہے **خرج علینا رسول الله ﷺ فقال ان الله امدکم بصلوة هی خیرلکم من حمر النعم فجعلنا لکم فیما بین العشاء الاخرة الی طلوع الفجر**، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہاری امداد کی ایک نماز سے جو تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہے، اس لئے

میں نے اسے عشاء اور طلوع فجر کے درمیان کردیا، اس کی روایت، احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ، حاکم، طبرانی اور دار قطنی نے کی ہے، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے، اور حاکمؒ نے اس کی تصحیح کی ہے، لیکن کامل ابن عدی میں عبداللہ بن ابی مرہ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام بخاریؒ نے فرمایا ہے کہ ان راویوں میں سے ایک کا دوسرے سے سننا معلوم نہیں ہوسکا ہے۔

جواب یہ ہے کہ صراحۃً بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا ہے، صرف ایک وقت میں پایا جانا اور ملاقات کا امکان کافی ہے، جیسا کہ امام مسلمؒ نے مقدمہ صحیح مسلم میں اس مسئلہ کو تحقیق کے ساتھ بیان کیا ہے، ابن الجوزیؒ نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی اسناد میں محمد بن اسحٰق ضعیف اور دار قطنی نے عبداللہ بن راشد کو ضعیف کہا ہے، جواب یہ ہے کہ محمد بن اسحٰق تو محققین کے نزدیک ثقہ ہیں ان محققین میں سے بخاریؒ ہیں جنہوں نے اس کی توثیق کی ہے، اور یہی کافی ہے، اس کے علاوہ محمد بن اسحٰق کی متابعت لیث بن سعد عن زید بن ابی حبیب موجود ہے، اور عبداللہ بن راشد جن کو دار قطنی نے ضعیف کہا ہے وہی عبداللہ بن راشد ہیں جو حضرت عثمانؓ کے آزاد کردہ غلام ہیں جنہوں نے ابوسعید خدریؓ سے حدیث کی روایت کی ہے، اور یہاں جو عبداللہ بن راشد راوی ہیں وہ عبداللہ بن راشد الزوفی ابوالضحاک البصری ہیں جنہوں نے خارجہؓ سے روایت کی ہے انہیں دار قطنی نے ضعیف نہیں کہا ہے بلکہ ابن حبان نے تو انہیں ثقات میں سے لکھا ہے، صاحب التنقیح نے ایسا ہی کہا ہے۔ م۔ فع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ نے تقریب التہذیب میں عبداللہ بن راشد الزوفی ابوالضحاک البصری کو غیر معلوم مستور الحال لکھا ہے لیکن جبکہ ابن حبان نے ان کو ثقات میں سے لکھا ہے تو اب یہ ایسے نہ رہے جن کو یہ کہا جاسکے کہ حال کا کسی کو پتہ نہیں ہے، اور نہ اب ان پر کسی قسم کا اعتراض باقی رہا۔ واللہ اعلم۔ م۔ اور نسائی کی روایت میں عبداللہ بن راشد الزوفی کی تو لیث بن سعد کے ساتھ تائید اور متابعت کی تصریح موجود ہے، لہٰذا یہ حدیث درجہ صحت کو پہونچ کر صحیح ہوگئی اور اگر یہ بات بھی نہ ہوتی تو بھی مختلف سندوں اور متعدد طرق سے پائے جانے کی وجہ سے حسن کے درجہ سے کم نہ ہوتی۔ ف۔

اب یہ سوال ہے کہ یہ حدیث تو ثابت ہوگئی مگر اب یہ جاننا ہے کہ اس سے وجوب کس طرح ثابت ہوا، تو جواب یہ ہے کہ استدلال کا ایک طریقہ یہ ہے کہ لفظ زاد کم یعنی زیادہ کیا اس روایت میں نہیں ہے بلکہ امدکم ہے اور امداد کچھ زیادتی پر نص نہیں ہے جیسا کہ اس آیت پاک **امدکم باموال و بنین او یمدکم** اور اس جیسے الفاظ صرف نعمت کو بتلاتے ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نماز کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تم کو ایسی نعمت دی ہے جو سرخ اونٹوں سے بہتر ہے اور تحریص اور ترغیب استحباب کے لئے ہے جیسا کہ فجر کی سنت کے بارے میں حدیث ہے **ان اللہ زادکم صلوۃ الی صلوتکم ھی خیرلکم من حمر النعم الاؤھی رکعتان قبل صلوۃ الفجر**، یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے تمہاری نماز پر ایک اور نماز زیادہ کی ہے اور وہ تمہارے لئے سرخ اونٹوں سے بڑھ کر ہے، اور یہ جان لو کہ وہ نماز فجر سے پہلے دو رکعتیں ہیں، حاکمؒ اور بیہقی نے اس کی روایت کی ہے، شیخ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔

اسی اعتراض کی وجہ سے اس طریقہ کے مشہور ہونے کے باوجود مصنفؒ نے اس طریقہ کو چھوڑ کر یہ دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے اور اس طرح استدلال کیا ہے کہ حدیث میں لفظ **فصلوھا** امر صیغہ سے کہا گیا ہے اور امر وجوب کے لئے ہوتا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ صحیح روایت میں یہ لفظ نہیں ہے، اور جس روایت میں ہے وہ ضعیف ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر صحیح روایت میں ہوتا تو بھی اس کے یہ معنی ظاہر نہیں ہیں کہ تم اسے خواہ مخواہ پڑھو یعنی ضرور پڑھو بلکہ اس کی مراد تو یہ ہے کہ تمہارے لئے اس کے پڑھنے کا وقت طلوع فجر تک ہے، اور حق بات یہ ہے کہ یہ معنی ظاہر ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اولیٰ یہ ہے کہ ابوداؤد کی حدیث بریدہؓ سے جو مروی ہے اس سے استدلال کیا جاوے کہ **الوتر حق فمن لم یوتر فلیس منی** یعنی وتر حق ہے جو اسے نہ پڑھے وہ مجھ سے نہیں ہے، حاکمؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور اسے صحیح بھی کہا ہے، اور کہا ہے کہ اس کے راوی ابوالمقیب ثقہ ہیں

اور ابن معینؒ نے بھی انہیں ثقہ کہا ہے، مگر بخاری وغیرہ نے اس میں کلام کیا ہے۔ الحاصل یہ حدیث حسن کے درجہ میں ہے، اور بزارؒ نے ابن مسعودؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے کہ **الوتر واجب علی کل مسلم** یعنی وتر ہر مسلمان پر واجب ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ امر کبھی استحباب کیلئے مستعمل ہوتا ہے اور لفظ حق اور واجب دونوں کے معنی ثابت کے ہیں جیسے قیام اللیل اور غسل جمعہ دونوں میں ایسی ہی تاکید فرمائی گئی ہے، اس لئے یہی معنی لینا چاہئے تاکہ وہ اعتراض اور مقابلہ ختم ہو جائے جو ابن عمرؓ کی حدیث میں کہ **انه علیه السلام کان یوتر علی البعیر**، یعنی رسول اللہ ﷺ اونٹ پر وتر پڑھا کرتے تھے، اس کی روایت بخاری اور مسلم نے کی ہے، تو اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہ تو ایک واقعہ کا بیان ہے جس میں یہ احتمال ہے کہ شاید کسی عذر کی وجہ سے ایسا کیا ہو، چنانچہ اب بھی اگر کیچڑ اور پانی ہو تو سواری پر فرض بھی جائز ہے یہ جواب "فع" میں ہے لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس جگہ ان مسائل کا بیان ہے جو اکثر اوقات پیش آتے ہیں، اتفاقی واقعات اور مسائل کا نہیں ہے جیسا کہ خود ابن الہمامؒ نے وضوء کی احادیث میں بیان کیا ہے، اور تمام روایتوں میں یہ اصح ہے، پس طحاویؒ نے وتر کی روایت کو کمزور بتایا ہے وہ معارض نہ ہوگا۔

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ معاذ بن جبلؓ کو اپنی وفات سے صرف چند دن پہلے ملک یمن بھیجا اور چند نصیحتیں فرمائیں ہیں ان، میں سے یہ بھی ہے انہیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں۔ الخ

اس وقت اگر وتر پڑھنا فرض یا واجب ہوتا تو اسے بھی ان نمازوں کے ساتھ ہی ذکر فرما دیتے کیونکہ اس کی تاخیر کو جائز نہیں فرماتے۔

تیسرا اعتراض، ابن حبانؒ نے ایک مرفوع روایت بیان کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رمضان کے مہینہ میں لوگوں کو تراویح کی نماز پڑھائی، چنانچہ آٹھ رکعتیں پڑھائیں اور وتر کی نماز پڑھائی، پھر دوسرے دن بھی لوگ اس کے لئے منتظر رہے مگر آپ نہیں نکلے اس لئے لوگوں نے بعد میں نہ نکلنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ مجھے اس بات کا خوف ہوا کہ تم پر وتر لازم کر دی جائے؛ ابن الہمامؒ نے کہا کہ صاحبینؒ کی طرف یہ عمدہ معارضہ ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس معارضہ کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ لکھا ہونے سے فرض کا حکم ہو جاتا ہے جبکہ وتر تو واجب ہے فرض نہیں ہے، مگر یہ جواب کچھ بھی وزن نہیں ہے کیونکہ فرض اور واجب میں فرق تو صرف اعتقاد کا ہے جبکہ عمل میں دونوں برابر مانے گئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ وتر لازم واجب نہ تھا، اس کا جواب دیا گیا ہے کہ شاید پہلے یہ وتر واجب نہ ہو اور بعد میں واجب کیا گیا ہو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تو صرف احتمال ہے، مزید تعجب کی بات یہ ہے کہ صلوۃ اللیل جس پر وتر کا اطلاق ہوا ہے شاید اس کی تیرہ یا گیارہ رکعتیں ہی پہلے وتر کی پڑھی جاتی ہوں کیونکہ اس کی تعداد پہلے متعین نہ تھی پھر یہی رکعتیں آہستہ آہستہ کم ہوتے ہوئے تین ہی رکعت باقی رہ گئی ہو، لیکن حق بات یہ ہے کہ اس قسم کے شبہے پیدا کرتے رہنا مناسب نہیں ہے، ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ وجوب کو لغوی معنی میں ہونے کی دلیل ترمذی کی حدیث ہے کہ ہر مسلمان پر وتر حق واجب ہے پس جو چاہے پانچ سے وتر کر لے، اور جو چاہے تین سے وتر کر لے اور جو چاہے کہ ایک رکعت سے وتر پڑھے وہ ایک ہی پڑھے اس کے علاوہ اس کی روایت ابن حبان اور حبان نے بھی کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق واجب سے شرعی وجوب مراد نہیں ہے، ورنہ پانچ بھی واجب ہوں اور ایک بھی واجب ہو، حالانکہ بالاجماع ایسا نہیں ہے، اس لئے اس کی مراد لائق، ضروری اور موکد ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کا جواب اسطرح دیا جاتا ہے کہ ابتداء میں رکعتوں کی تعداد متعین نہیں ہوئی تھی لیکن آخر میں تین رکعتیں متعین ہو چکی ہیں، لیکن اس سے پہلے یہ کہہ چکا ہوں کہ اس جواب میں کوئی پائداری نہیں ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

عینیؒ نے لکھا ہے کہ مختلف دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت علیؓ کی یہ مرفوع حدیث ہے کہ اے اہل القرآن وتر پڑھو کہ اللہ تعالیٰ خود وتر ہے، اور وتر کو دوست رکھتا ہے، اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے، اور ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، لیکن خطابیؒ نے کہا ہے کہ اس میں اہل القرآن کو خاص کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وتر

واجب نہیں ہے ورنہ عام حالات میں واجب ہونا چاہئے تھا کیونکہ اہل القرآن عام محاورے میں عوام کو شامل نہیں ہوتا ہے، عینیؒ نے اس جواب کو تسلیم نہیں کیا ہے، دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی ایک مرفوع حدیث یہ ہے کہ صبح ہونے سے پہلے پہلے وتر پڑھ لو، اس کی روایت مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے کی ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے تو صرف وقت کا بیان ہوا ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ ان دلائل میں سے ایک یہ حدیث بھی ہے کہ جو شخص وتر پڑھے بغیر سو گیا یا بھول گیا تو اسے جب یاد آئے پڑھ لے، اس کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے، میں کہتا ہوں کہ اسی قسم کا حکم رات کے معمول کے وظیفہ کے بارے میں بھی کہ جب ناغہ ہو جائے تو دوپہر تک قضاء کرنے کا حکم ہے، اس سے بھی وجوب کی دلیل نہیں نکلی، اسے بھی سمجھ لو، اور ابو جعفر الطحاویؒ نے ذکر کیا ہے کہ وتر کے واجب ہونے پر صحابہ کرام کا اجماع ہے۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ مکمل ہو تو یہی دلیل کافی ہو گئی۔ واللہ اعلم۔

میرے نزدیک اس سلسلہ کی تمام حدیثوں کو اکھٹا کرنے اور ان میں گہری نظر ڈالنے کے بعد یہ بات تحقیقی پیدا ہوتی ہے کہ رات کی نماز کو وتر یعنی طاق اور بے جوڑ بنانے میں ایک خاص فضیلت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس لئے جس کسی کو اپنے اوپر آخری شب میں بیدار ہونے کا یقین نہ ہو وہ رات کے پہلے حصہ ہی میں عشاء کے بعد پڑھ لے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ پڑھ لیا کرتے تھے۔ مگر آخر میں وتر پڑھنے میں زیادہ فضیلت ہے اور اقویٰ فعل ہے حضرت عمرؓ کا معمول تھا، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فعل کو حذر اور احتیاط پر محمول کیا اور حضرت عمرؓ کے فعل کو قوت پر محمول کیا، جیسا کہ امام مالکؒ اور ابوداؤد نے حضرت ابو قتادہؓ سے روایت کی ہے، اور حضرت ابو ہریرہؓ کو رسول اللہ ﷺ نے رات کے پہلے ہی حصہ میں وتر پڑھنے کی وصیت فرمادی ہے، اور صحیح روایت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ **لا وتران فی لیلة** ایک رات میں دوبار وتر کی نماز نہیں ہے، اور بخاری کی حدیث میں ہے کہ جب تم پہلے حصہ میں وتر ادا کر لو تو آخری حصہ میں نہ پڑھو۔

اور سنن اربعہ میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ دن اور رات کی نمازیں دو دو رکعتیں ہیں جو وتر سے طاق ہو جاتی تھی اور اس طاق کر لینے میں بڑی خاص فضیلت ہے، پس جن حدیثوں میں ام المومنین عائشہؓ سے تیرہ، گیارہ اور سات کو وتر کرنا مروی ہے ان کا مطلب یہی ہے کہ رات کی نمازیں وتر ملانے کے بعد اتنی رکعتیں ہو جایا کرتی تھی جیسا کہ ترمذیؒ نے اسحٰق بن ابراہیم یعنی ابن راہویہ سے نقل کیا ہے، اسی طرح وہ حدیث جو کچھ پہلے بیان کی گئی ہے کہ جو پانچ کے ساتھ ایتار کرنا چاہتا ہے وہ کر لے اور جو تین کے ساتھ بیجوڑ کرنا چاہے کر لے اور جو ایک کے ساتھ طاق کرنا چاہے وہ کر لے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وتر بنانا ہی مقصود ہے، اور ایتار کا کام ایک سلام کرنے کے یعنی آخر میں ایک بار ہی سلام پھیرنے سے ہوتا ہے، یہانتک کہ پانچ رکعتوں بلکہ ایک رکعت سے بھی ثابت ہے، اور وہ جو تیرہ و گیارہ وغیرہ کو وتر بنانے کا ذکر ہوا ہے وہ ایک سلام سے کسی نے بھی ذکر نہیں کیا ہے، اس تفسیر کی بناء پر ساری حدیثیں بغیر کسی نسخ اور تغیر کے باقی اور اثر کو ثابت کرنے والی رہیں، بر خلاف شیخ ابن الہمامؒ کے پہلے تو گیارہ وغیرہ رکعتوں پر وتر کا حکم مظطرب رہا، اور کوئی تعداد متعین نہ تھی، مگر آخر میں ساری روایت منسوخ ہو کر تین ہی کی تعداد متعین رہ گئی، یہ معلوم ہونا چاہئے کہ دو عیبوں ایک اضطراب اور دوم نسخ کو کسی حکم پر بلا دلیل لگانا کس طرح جائز ہو گا جبکہ اوپر کی دلیل میں لگائے گئے ہیں۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ ایتار یعنی رات کے وقت نماز کو طاق کر لینے کا حکم کیسا تھا یعنی واجب ہو کر یا سنت ہو کر تو یہ پہلا مسئلہ ہے، اور حق تو یہ ہے واللہ اعلم کہ آثار و علامات جو کسی مجتہد کو نتیجہ تک پہونچنے کے لئے ضروری ہیں دونوں اقوال کے لئے موجود ہیں، جس کا اقرار خود ابن الہمامؒ نے بھی کیا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ سے تو فقط ایک اور یہی روایت ہے کہ وتر واجب ہے، اور اس کی کوئی مقررہ تعداد قابل اعتماد نہیں ہے، لہٰذا اس بات کی کوئی ضرورت نہیں ہے کہ قول کے بارے میں یہ تکلف کیا جائے کہ پہلے اس مسئلہ میں اضطراب تھا پھر سب منسوخ ہو کر تین رکعتیں باقی رہ گئیں، اور مصنفؒ نے بھی اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے،

چنانچہ مصنفؒ نے شروع میں صرف یہی لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وتر واجب ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک سنت ہے یعنی رات کی نماز کو طاق کر لینے کا حکم جو حدیث میں اوتروا وصلوا وغیرہ ہے وجوب کے لئے ہے، خواہ اسے کسی بھی عدد سے طاق کر لیا جائے، اس بناء پر امام ابو حنیفہؒ کا قول کسی حدیث کے بھی خلاف نہیں ہے،
یعنی ایتار اور طاق کرنا پانچ رکعت سے ہو یا تین رکعت سے یا کسی اور عدد سے، البتہ امام اعظم کے نزدیک قول مختار میں تین رکعتیں ہیں کیونکہ زیادہ تر احادیث اور آثار میں تین رکعتوں کا ہی تذکرہ ہے، اور مغرب کی نماز کے مطابق بھی یہی عدد ہے، اور ایک رکعت یا پانچ رکعتوں کی کوئی نظیر نہیں ہے، اسی لئے مصنفؒ نے تعداد بیان کر کے اور مستقلاً اس طرح کہا ہے۔

قال الوتر ثلاث رکعات لایفصل بینھن بسلام لما روت عائشةؓ انه علیه السلام کان یوتر بثلاث وحکی الحسنؒ اجماع المسلمین علی الثلاث.

ترجمہ:- وتر کی نماز کی تین رکعتیں، ان کے درمیان سلام پھیر کر فصل نہ کرے اس بناء پر کہ حضرت عائشہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعتوں کے ساتھ وتر کی نماز پڑھتے تھے اور حضرت حسنؒ نے تین رکعتوں پر تمام لوگوں کا اجماع بیان کیا ہے۔

توضیح:- وتر کی رکعتوں کی تعداد، حدیث سے دلیل، حنفیہ کی دلیل

قال الوتر ثلاث رکعات لایفصل بینھن بسلام......الخ

وتر نماز کی تین رکعتیں ہیں، ان میں سلام سے جدائی نہ کرے یعنی تین رکعتیں پڑھ کر آخر میں سلام پھیرے۔ف۔ یعنی ایتار واجب ہے، اس کام کے لئے تین رکعتیں ہونی چاہئے کہ ان کے درمیان کوئی فصل نہیں ہے، کیونکہ ایک رکعت کی دوسری کوئی نظیر نہیں ہے، جیسے کہ پانچ کی بھی دوسری کوئی نظیر ہے، اور ظنی روایتوں کو قطعی روایتوں سے جتنی موافقت ہو جائے وہ بہتر اور اقوی ہے۔

لما روت عائشةؓ انه علیه السلام کان یوتر بثلاث......الخ

کیونکہ ام المومنین صدیقہؓ نے روایت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعتوں کے ساتھ وتر فرمایا کرتے تھے۔ف۔ یعنی بغیر فصل کئے ہوئے مسلسل تین رکعتوں سے جیسا کہ نسائیؒ نے حضرت ام المومنین سے روایت کی ہے کہ دو رکعتوں پر رسول اللہ ﷺ سلام نہیں پھیرتے تھے، مصنفؒ کی بیان کی ہوئی حدیث حاکمؒ نے روایت کی ہے، اتنی اور بھی زیادتی کے ساتھ کہ صرف تینوں رکعتوں کے آخر میں سلام پھیرتے تھے اور دوسری رکعت میں نہیں پھیرتے تھے، ام المومنینؓ کی حدیث یہ ہے کہ پہلی رکعت میں فاتحہ کے علاوہ سورہ اعلیٰ **سبح اسم ربك الاعلی** اور دوسری میں فاتحہ کے علاوہ **قل یا ایھا الکفرون** اور تیسری رکعت میں فاتحہ کے ساتھ ﴿**قل ھو اللہ احد**﴾ اور ﴿**قل اعوذ برب الفلق**﴾ اور ﴿**قل اعوذ برب الناس**﴾ پڑھتے تھے، اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، اور حاکم نے کی ہے، اور اسے صحیح بھی کہا ہے، اور ابن حبان اور ان کے مانند طحاویؒ نے ابن عباس وسعید بن عبد الرحمٰن سے اور ترمذی وابن ماجہ ونسائی وطحاویؒ نے علی سے روایت کی ہے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اخری رکعت میں تین سورتوں کو ملا کر کہا گیا ہے، اس بناء پر واجب نمازوں کی ہر رکعت میں کئی سورتیں پڑھنا مکروہ نہیں ہونی چاہئے، جیسا کہ محیط وغیرہ میں کہا ہے، کیونکہ اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔ اور طحاویؒ نے وتر کی تین رکعتوں کی روایت میں صحابہ کرام اور تابعین عظام کی ایک جماعت کا نام لیا ہے، جیسا کہ ان تمام کے نام عینیؒ میں مذکور ہیں۔

وحکی الحسنؒ اجماع المسلمین علی الثلاث......الخ

اور حسن بصری نے تین رکعتوں پر مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے۔ف۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ نے کہا ہے **حدثنا حفص حدثنا عمرو عن الحسن قال اجمع المسلمون علی ان الوتر ثلاث لایسلم الا فی آخرھن.** یعنی حسن بصریؒ نے کہا ہے کہ صحابہؓ نے اجماع کیا ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں ان کے درمیان سلام نہ پھیرے بلکہ آخر میں سلام پھیرے، اور ابوداؤد نے عبداللہ بن قیس سے روایت کی ہے کہ میں نے ام المومنین عائشہؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کتنی رکعتوں سے وتر فرمایا کرتے تھے، فرمانے لگیں کہ چار اور تین کے ساتھ اور چھ اور تین کے ساتھ اور آٹھ اور تین کے ساتھ، اور سات سے کم وتر نہیں کرتے اور تیرہ سے زیادہ وتر نہیں کرتے تھے، اس حدیث میں وتر کی تین رکعتوں کی تصریح کر دی ہے، عینیؒ نے لکھا ہے کہ اکثر علماء نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور ابن بطالؒ نے مدینہ کے فقہاء سبعہ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ مع۔ بلکہ طحاویؒ نے اسے عبدالرحمٰن بن ابی زیاد سے انہوں نے اپنے والد سے فقہاء سبعہ اور دوسرے صلحاء سے روایت کی ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ صحابہ اور تابعین کی ایک جماعت کا قول ہے۔ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ شیخ الاسلام عینیؒ اور محقق ابن الہمامؒ نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ تین ہی رکعت پر انحصار ہے، اور کمی وزیادتی پہلے زمانہ میں ہوتی تھی جبکہ آخری بات طے نہیں پائی تھی، لیکن اس کی کوئی دلیل نہیں پائی گئی ہے، اور حسن بصریؒ کے قول کی اسناد ضعیف ہے، اس کے علاوہ اس سے تین رکعتوں کے اختیار کرنے کا ثبوت ہے، جبکہ وتر کی تین رکعتیں ہونے کے متعلق کوئی کلام نہیں ہے۔

وھذا احد اقوال الشافعیؒ وفی قول یوتر بتسلیمتین وھو قول مالکؒ والحجة علیھما مارویناہ.

ترجمہ:-اور یہ قول امام شافعیؒ کے کئی اقوال میں سے ایک ہے، اور ایک قول میں ہے کہ دو سلاموں سے وتر پڑھے، اور یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے، اور ان دونوں کے خلاف ہماری دلیل وہ ہے جو ہم نے روایت کی ہے۔

توضیح:-وتر کے بارے میں امام شافعی کے اقوال، امام مالک کا قول، ان کے دلائل

وھذا احد اقوال الشافعیؒ......الخ

امام شافعیؒ کے اقوال میں سے ایک قول وہی ہے جو ابھی گذرا ہے۔ف۔ کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں، اور روضہ میں ہے کہ امام شافعیؒ کی ایتار کی سنت ایک سے طاق ۳-۵-۷-۹-اور گیارہ تک حاصل ہو جاتی ہے۔ مع۔

وفی قول یوتر بتسلیمتین وھو قول مالکؒ......الخ

اور امام شافعیؒ کے ایک اور قول میں ہے کہ دو سلام سے تین رکعت وتر پڑھے۔ف۔ یعنی دو رکعت پر سلام پھیر کر ایک رکعت کے بعد سلام پھیرے **وھو قول مالك الخ** امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔ف۔ جواہر مالکیہ میں ہے کہ وتر ایک اور دو سنت ہے، اور حاوی حنبلیہ میں ہے کہ وتر سنت ہے، اور بقول ابی بکر واجب ہے جو کم سے کم ایک رکعت ہوتی ہے، اور کامل ہونے میں کم از کم تین رکعت اور زیادہ سے زیادہ گیارہ رکعت تک ہے۔ مع۔

والحجة علیھما مارویناہ......الخ

اور ان دونوں کے مقابلہ میں ہماری دلیل وہ حدیث عائشہؓ ہے جو ہم نے پہلے روایت کر دی ہے۔ف۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دو رکعتوں پر سلام پھیرتے اور ایک رکعت سے وتر کر لیتے تھے، اور ام سلمہؓ کی حدیث میں وتر پانچ رکعتوں کے ساتھ بھی آیا ہے، اور اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ سے پانچ و تین اور ایک رکعت کے ساتھ بھی وتر بنانے کی اجازت گذر گئی ہے، جواب یہ ہے کہ کئی روایتوں سے یہ بات ہمیں معلوم ہوئی ہے کہ وتر کے بارے میں رکعتوں کی تعداد متعین ہونے سے پہلے یہ بات تھی کیونکہ جس نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین نہیں ہو سکی بلکہ اس میں اختیار ہو تو ان کی رکعتوں کا اعتبار نہ ہوگا، اب جبکہ آخر میں تعداد تین رکعتوں کے ہونے کی متعین ہو چکی تو بقیہ تمام تعداد منسوخ

مانی جائے گی۔ مفع۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے رات کی نماز کی بابت سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ دو دو رکعتیں ہیں اور آخر میں جب صبح صادق نکل آنے کا احتمال ہونے لگے اس وقت ایک رکعت اور پڑھ کر نماز ختم کر دو جس سے نماز وتر ہو جائے گی، اس کا جواب عینیؒ اور ابن الہمامؒ نے یہ دیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب صبح کا خوف ہو تو اس وقت دو کے ساتھ ہی ایک اور ملا لو تا کہ وہ وتر بن جائے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر اس روایت کو بھی تعداد کے تعین سے پہلے کے حکم پر محمول کیا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا، کیونکہ یہ تاویل دو طرح سے درست نہیں رہتی ہے، اول یہ کہ ابن عمرؓ سے صحیح مسلم میں مرفوعاً روایت موجود ہے کہ **الوتر رکعة آخر اللیل** کہ وتر رات کے آخر میں ایک رکعت ہے، اس کے علاوہ اس کی روایت بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ نے بھی کی ہے، بخاری میں ایک اور روایت اس طرح بھی ہے کہ رات کی نماز دو رکعت ہے پھر جب تم اسے ختم کر کے فارغ ہو جانا چاہو تو ایک رکعت اور بھی پڑھ لو کہ وہ تمہاری پڑھی ہوئی تمام رکعتوں کو وتر بنا دیگی۔

یہ روایت اس مطلب کے بیان میں صریح ہے کہ ایک رکعت فرد اور بے جوڑ ہے، اور خود ابن عمرؓ کا اسی پر عمل بھی تھا، چنانچہ نافعؒ نے روایت کی ہے کہ میں ابن عمرؓ کے ساتھ مکہ میں تھا اور آسمان برابر چھایا ہوا تھا جس سے مجھے صبح صادق ہونے کا خطرہ محسوس ہوا تو ایک رکعت پڑھ کر اپنی نماز کو وتر بنالیا پھر جب بادل چھٹ جانے پر معلوم ہوا کہ ابھی تو رات باقی ہے تو ایک رکعت اور بھی پڑھ کر پہلی رکعت کو دو رکعت نفل میں دیا اس کے بعد اور بھی دو رکعتیں پڑھیں، آخر میں جب پھر صبح ہونے کا احتمال ہوا تو ایک اور رکعت پڑھ کر وتر بنالی، اس کی روایت مالکؒ نے کی ہے۔

نوویؒ نے کہا ہے کہ مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ وتر میں ایک رکعت جائز ہے، اس میں سوائے ابو حنیفہؒ اور سفیان ثوریؒ کے کسی کا اختلاف نہیں ہے، اور یہ بات بھی معلوم ہونی چاہئے کہ امام مالکؒ بھی ایک رکعت پڑھنے کو جائز کہتے ہیں مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس ایک رکعت سے پہلے بھی رات کی نفل نماز کچھ پڑھی گئی ہو ورنہ صرف ایک رکعت کو جائز نہیں کہتے ہیں، اور ابن عبد البرؒ نے تمہید میں ایک حدیث ابو سعیدؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بتیر سے منع کیا ہے یعنی آدمی صرف ایک رکعت پڑھ کر ہی ایتار کرے، اسی مفہوم میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابن مسعودؓ سے بتر سے ممانعت کی روایت مذکور ہے۔

اب میں مترجم یہ کہتا ہو کہ وتر کی ایک رکعت کے جائز ہونے کے سلسلہ میں دو باتوں کا بیان آیا ہے: (۱) یہ کہ وہ آخر رات میں ہو (۲) یہ کہ وہ جواز قولی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا اس پر عمل شاذ و نادر ہے، اور جو لوگ اس کے ماننے والے یا کہنے والے ہیں وہ اسے سنت کہتے ہیں، اور وتر کے تین رکعت ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا اپنی اس سنت پر عمل بھی رہا ہے، اس طرح یہ سنت عمل بھی ہے اور سنت قولی بھی ہے، یہی زیادہ تر مشہور ہے اور اصح ہے اسی پر جمہور صحابہؓ و تابعین کا عمل بھی ہے، اور جتنے فقہاء ایک رکعت کے جواز کے قائل ہیں وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ حد جواز میں یہ کم سے کم درجہ ہے اور وہ بھی تین رکعت کو درجہ کمال میں داخل کرتے اب جبکہ امام صاحب نے دلائل کی بناء پر احتیاط کرتے ہوئے اسے واجب قرار دیا تو تین رکعتوں کو مدار اور اصل مان لینے میں زیادہ احتیاط ہے جس کے وجوہ ذکر کئے جا چکے ہیں، اور تین رکعت ہونے کی نظیر مغرب کی نماز ہے ایسے موقع پر احتیاط واجب ہوتی ہے اس لئے تین رکعت سے کم پر امام صاحب کے قول کے مطابق احتیاط نہیں ہوگی، اسی قول پر اہل علم و صلاح کا عمل کرنا لازم ہے، پھر بھی اگر کوئی شخص ایک ہی رکعت وتر نماز کا قائل رہے تو اس سے کسی کو جھگڑا بھی نہیں کرنا چاہئے، سوائے اس کے کہ اس کے پیچھے نماز وتر نہ پڑھنا ہی بہتر ہوگا، واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

ویقنت فی الثالثة قبل الرکوع، وقال الشافعی بعده لما روی انه علیه السلام قنت فی آخر الوقت، وهو بعد الرکوع، ولنا ماروی انه علیه السلام قنت قبل الرکوع، ومازاد علی نصف الشیء آخره.

ترجمہ:- تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھے، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ رکوع کے بعد پڑھے، کیونکہ روایت

کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قنوت پڑھی ہے آخر وقت میں کہ وہ تو رکوع کے بعد ہوتا ہے، اور ہماری دلیل وہ روایت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی ہے، اور جو چیز نصف کے بعد ہوتی ہے وہ اس کا آخر کہلاتی ہے۔

توضیح:- دعائے قنوت کی رکعت و مقام، شافعیہ کی دلیل، حنفیہ کی دلیل

ویقنت فی الثالثۃ قبل الرکوع......الخ

اور تیسری رکعت میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھے۔ف۔اس جگہ دو باتیں ہوئیں (۱) وتر میں ہمیشہ قنوت پڑھے (۲) تیسری رکعت کے رکوع سے پہلے پڑھے، اور ان دونوں باتوں میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، **وقال الشافعیؒ الخ** اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ تیسری رکعت میں رکوع کے بعد قنوت پڑھے، کیونکہ مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخر وتر میں قنوت پڑھی ہے۔ف۔ اس کی روایت دار قطنی نے کی ہے، **وھو الخ** اور رکوع کے بعد ہی وتر کا آخر ہوگا۔ف۔ لہذا رکوع کے بعد ہی پڑھنا چاہئے، شرح ارشاد میں ہے کہ شافعیؒ سے اس کے بارے میں کوئی تصریح نہیں ہے، لیکن ان کے شاگردوں میں اختلاف ہے کہ کچھ رکوع کے قبل اور کچھ رکوع کے بعد کے قائل ہیں، اور ان کے مذہب میں قول صحیح ہے، اور امام محمدؒ سے بھی یہی منقول ہے۔مع۔ بلکہ دونوں باتیں ہی جائز ہیں۔مع۔

میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ ہماری گفتگو اس قنوت کے پڑھنے میں ہے جو وتر میں پڑھی جاتی ہے، کیونکہ ایک قنوت وہ دعا بھی ہے جو کبھی کبھی عام مسلمانوں پر کسی سختی یا حادثہ پیش آنے کی وجہ سے پڑھی جاتی ہے، اس دعا کو نماز میں امام پڑھتا جاتا ہے اور سب مقتدی پیچھے سے آمین کہتے جاتے ہیں، جیسا کہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے متواتر ایک ماہ ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور صبح کی ہر نماز میں آخر رکوع میں **سمع اللہ لمن حمدہ** کہنے کے بعد قبیلہ رعل، ذکوان اور مختلف کئی قبیلوں پر لعنت اور بدعاء کی ہے اور مقتدیوں نے آمین کہی ہے، اس کی روایت ابو داؤد نے کی ہے، جیسا کہ حضرت انسؓ صبح کی نماز کے بعد آخر رکوع کے بعد مختلف قوموں پر دعائے قنوت پڑھی ہے، یہ صحیح مسلم میں ہے، اور بخاری میں مغرب اور فجر کے متعلق موجود ہے، اور ابو داؤد اور نسائی میں ایک مہینہ کے بعد اس کے چھوڑ دینے کی تصریح ہے، اور ابن عمرؓ سے فجر میں پڑھنے کا ثبوت ہے نیز اس آیت پاک ﴿لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ﴾ پوری آیت بخاری، ترمذی، اور نسائی میں موجود ہے، تو ان روایتوں سے وتر کی قنوت کے لئے کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی ہے زیادہ سے زیادہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس طرح یہ قنوت رکوع کے بعد پڑھی گئی ہے اسی طرح قنوت وتر بھی رکوع کے بعد ہی پڑھنی چاہئے، کیونکہ دونوں ہی قنوت ہیں۔

جواب یہ ہے کہ اس جگہ قیاس کو کوئی دخل نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ اس کے خلاف نص موجود ہے، **ولنا ماروی الخ** اور ہماری دلیل وہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رکوع کے قبل قنوت پڑھی ہے۔ف۔ چنانچہ حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ تین رکعتوں سے وتر کرتے، پہلی میں **سبح اسم ربك الاعلی**، دوسری میں **قل یا ایھا الکفرون** اور تیسری رکعت میں **قل ھو اللہ احد** پڑھتے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے، اس کی روایت نسائی نے کی ہے اور ابن ماجہ نے مختصراً کی ہے، اور حدیث کو ابن مسعودؓ سے ابن ابی شیبہ اور دار قطنی اور خطیب نے اور ابن عباسؓ کی حدیث کو ان سے خطیب، ابو نعیم اور حدیث ابن عمر و ابن مسعودؓ سے طبرانی نے روایتیں بیان کی ہیں۔مع۔ اور آخر کی نماز کی روایت جس سے امام شافعیؒ نے استدلال کیا ہے کہ رکوع کے بعد آخر ہوگی، اس کا جواب مصنفؒ نے اس طرح دیا ہے کہ **وما زاد الخ** اور کوئی بھی چیز جب اس کے آدھے کے بعد ہو تو اسے آخر ہی کہدیا جاتا ہے۔ف۔ تو جب ایک رکعت کے بعد جب دوسری رکعت آئی تو نماز آخر ہوگئی خواہ رکوع کے قبل ہی ہو، اور واضح ہو کہ انسؓ کی حدیث رعل و ذکوان پر لعنت کی حدیث میں قرأت کے بعد اور رکوع سے پہلے قنوت کا ہونا اصح روایت

ہے، چنانچہ صحیحین، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں تصریح کے ساتھ ہے، اگرچہ دوسری روایت میں رکوع کے بعد بھی مذکور ہے، مگر وہ قنوت حادثہ اور نازلہ ہے، اور قنوت الوتر میں رکوع کے قبل ہے، چنانچہ صحیح بخاری میں عاصم الاحول سے روایت ہے کہ میں نے انسؓ سے وتر نماز میں قنوت کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ ہاں، تو میں نے پھر سوال کیا کہ رکوع کے قبل یا رکوع کے بعد ہے فرمایا کہ رکوع کے قبل ہے، میں نے پھر کہا کہ فلاں شخص نے مجھے خبر دی ہے کہ رکوع کے بعد ہے تب انسؓ نے فرمایا کہ اس نے جھوٹی خبر دی ہے، کیونکہ رکوع کے بعد تو صرف ایک مہینہ رسول اللہ ﷺ نے قنوت پڑھی تھی۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس روایت سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ابن عمرؓ وغیرہ جتنے بھی صحابہ نے رکوع کے بعد کی روایت کی ہے ان کی مراد ظاہر ہو گئی کہ یہ صورت صرف ایک ماہ تک قنوت حادثہ یا نازلہ میں واقع ہوئی ہے، لیکن ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ رکوع کے بعد قنوت پڑھنے کی نص صریح حدیث حسن بن علیؓ حاکم کی روایت سے ہے کہ اس دعاء کو اپنی نماز وتر میں کہتا ہوں اس وقت جبکہ اپنا سر اٹھاتا ہوں، اور سجدہ کے سوا کچھ کام باقی نہیں رہتا ہے، آخر تک، جیسا کہ یہ روایت بھی سامنے آئے گی۔

پھر شیخ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا، لیکن اس بندہ مترجم کے نزدیک اس کا ظاہر جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا خود حضرت حسن بن علیؓ کا فعل تھا، اور خود رسول اللہ ﷺ نے اس کا کچھ بھی حکم نہیں فرمایا تھا، اور اوپر کے بیان سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ قنوت پڑھنے کا ایک موقع رکوع کے بعد بھی تھا، شاید کہ وہاں سے مطلب نکال لیا ہو۔ اچھی طرح سمجھ لو۔ م۔

ابن الہمامؒ نے حدیث ابی بن کعب و عبداللہ بن مسعودؓ و ابن عباس و ابن عمر و انس بن مالکؓ میں سے ہر ایک نے قنوت قبل الرکوع ذکر کرکے کہا کہ اس کی تحقیق کرنے والی بات یہ ہے کہ صحابہ کل یا اکثر کا عمل بھی یہی تھا چنانچہ ابن ابی شیبہ نے کہا حدثنا یزید بن ہارون عن ہشام الدستوائی عن حماد عن ابراہیم عن علقمة ان ابن مسعود و اصحاب النبی ﷺ کانوا یقنتون فی الوتر قبل الرکوع، یعنی ابن مسعودؓ اور رسول اللہ ﷺ کے دوسرے صحابہ کرام رکوع کرنے سے پہلے قنوت پڑھتے تھے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کی اسناد صحیح ہے، اور جب کہ یہ بات قابل ترجیح ہو گئی تو رکوع کے بعد قنوت پڑھنے کا کوئی محل باقی نہ رہا، اسی لئے امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ اگر کوئی بھول کر قنوت پڑھے بغیر رکوع میں پہونچ گیا اور وہاں یاد آگیا تو اب قنوت نہیں پڑھے گا اور نہ لوٹ کر کھڑا ہو گا۔ ف۔ یہی صحیح ہے۔ التاتارخانیہ۔ ھ۔ و قاضی خان۔

اور اگر لوٹ کر کھڑا ہو گیا اور دعاء قنوت پڑھی اور رکوع دوبارہ نہ کیا تو قول صحیح یہ ہے کہ نماز فاسد نہ ہو گی۔ قاضی خان۔ ف۔ اور اس پر سجدہ سہو واجب ہو گا خواہ قنوت پڑھے یا نہ پڑھے۔ الخلاصہ۔ اس مسئلہ سے یہ بات صاف ظاہر ہوئی کہ رکوع کے بعد قیام کر کے قنوت پڑھنا بے محل ہے۔ لیکن اگر وتر میں ایسے امام کی اقتداء کی جو رکوع کے بعد ہی وتر پڑھتا ہے تو بالاتفاق اس کی متابعت کر لینی چاہئے۔ الفتح۔ و قاضی خان۔ اور اگر رکوع میں یہ یاد آیا کہ وہ کچھ ضروری اور واجب قرأت چھوڑ کر رکوع میں آگیا ہے تو بالاتفاق لوٹ کر کھڑا ہو جائے۔ المضمرات۔ ف۔ یہانتک کہ اگر سورہ چھوڑ گیا تو بھی فوراً رکوع چھوڑ کر کھڑا ہو کر سورہ پڑھے پھر قنوت کرے پھر رکوع کرے اور سجدہ سہو ادا کر لے، اور اگر دوبارہ اس نے رکوع نہیں کیا تو جائز ہو گا۔ السراج۔ اگر امام کو رکوع میں یاد آیا کہ اس نے قنوت نہیں پڑھی تو واپس کھڑا نہیں ہونا چاہئے، اور اگر اس کے باوجود کھڑا ہو گیا اور مقتدیوں نے پہلے رکوع میں اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اور اب اس رکوع میں ساتھ دیا یا اس کے برعکس پہلے رکوع میں ساتھ دیا اور دوسرے میں ساتھ نہ دیا تو کسی کی نماز فاسد نہ ہو گی۔ الخلاصہ۔

قنوت کے موقع میں درود نہ پڑھے، ہمارے مشائخ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ الظہیریہ۔ ھ۔ اور آئندہ معلوم ہو گا کہ ایک روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ درود پڑھ لے، بلکہ قنوت کے مقبول ہونے کے لئے درود بہت بہتر ہے۔ م۔ اگر امام نے مقتدی کی دعائے قنوت سے فارغ ہونے سے پہلے رکوع کر دیا تو مقتدی امام کی متابعت کرتے ہوئے رکوع میں چلا جائے، اور اگر امام نے بغیر قنوت پڑھے رکوع کر دیا تو اگر مقتدی کو رکوع کے چھوٹ جانے کا خوف ہو تو رکوع کر دے، اور اگر خوف نہ ہو تو قنوت پڑھ کر

رکوع کردے۔ الخلاصہ۔ اگر کسی کو شک ہو جائے کہ کون سی رکعت پڑھ رہا ہے تو موجودہ رکعت میں قنوت پڑھ کر قعدہ کرے، پھر دو رکعتیں پڑھے، اور احتیاطاً ہر رکعت میں قعدہ اور قنوت پڑھے، یہی قول اصح ہے۔ محیط السرخسی۔

اگر مسبوق نے امام کے ساتھ قنوت پڑھ لی تو آئندہ نہ پڑھے، ہمارے تمام ائمہ کا اسی پر اتفاق ہے۔ المضمرات۔ قنوت پڑھنا قول صحیح کے مطابق واجب ہے۔ الجوہرہ۔

ویقنت فی الثالثة قبل الرکوع و قال الشافعی بعده لما روی انه علیه السلام قنت فی اخر الوقت وهو بعد الرکوع ولنا ماروی انه علیه السلام قنت قبل الرکوع ومازاد علی نصف الشیء اخره.

اور دعائے قنوت پورا سال پڑھے، امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے کہ صرف ماہ رمضان کے آخری نصف میں پڑھے ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن بن علیؓ کو فرمایا جبکہ انہیں قنوت کی تعلیم دی کہ تم اسے اپنی وتر نماز میں شامل کرلو، بغیر کسی فصل کئے ہوئے۔

توضیح:۔ قنوت صرف رمضان میں پڑھی جائے یا پورے سال

امام ابوحنیفہؒ اور شافعیؒ کا اختلاف اور ان کے دلائل حدیث سے

ویقنت فی الثالثة قبل الرکوع وقال الشافعی بعده لما روی انه علیه السلام قنت فی اخر......الخ

اور نمازی پورے سال وتر میں قنوت پڑھے خلافاً الخ برخلاف امام شافعیؒ کے کہ ان کے نزدیک ماہ رمضان کے آخری نصف کے علاوہ کبھی نہ پڑھے۔ ف۔ کہ امام شافعیؒ کے مذہب میں صحیح قول یہ ہے کہ صرف رمضان کے نصف اخیر میں پڑھنا مستحب ہے، اور بغیر کسی کراہت کے پورے سال پڑھنا جائز ہے۔ ع۔ اور ہمارے اور جمہور کے نزدیک پورے سال پڑھنا ہے لقوله علیه الخ اس دلیل کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے حسن بن علیؓ کو جب دعائے قنوت سکھلائی ہے یہ فرمایا کہ اجعل هذا فی وترك اس دعاء کو تم اپنی وتر نماز میں شامل کرلو، من غیر فصل، یہ جملہ تفصیل کے بغیر فرمایا۔ ف۔ یعنی رمضان کے نصف اخیر کی قید نہیں لگائی، اس سے معلوم ہوا کہ قنوت وتر میں ہمیشہ ہے۔

واضح ہو کہ یہاں کئی باتیں تفصیل کے لائق ہیں (۱) حدیث کا بیان (۲) اجعل هذا الخ کا اس میں حکم ہونا (۳) قنوت کے واجب ہونے کی دلیل، واضح ہو کہ یہ حدیث امام احمدؒ ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ ابن حبان، حاکم اور بیہقیؒ نے روایت کی ہے، اور حاکم وغیرہ کی روایتوں میں کچھ جملوں اور الفاظ کی زیادتی ہے اس لئے ان زیادتیوں کو قوسین میں کر کے اس کے اخراج کرنے والے کے نام لکھدوں گا، حسن بن علیؓ نے کہا ہے کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے کچھ کلمات سکھلائے جن کو میں اپنی وتر کی نماز میں کہتا ہوں (جبکہ اپنا سر رکوع سے اٹھاتا ہوں اور سجدہ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا ہے الحکم۔ ف۔) اور ایک روایت میں ہے قنوت وتر میں کہتا ہوں:

اللهم اهدنی فیمن هدیت، وعافنی فیمن عافیت، و تولنی فیمن تولیت، وبارك لی فیما اعطیت، وقنی شرما قضیت، انك تقضی ولا یقضی علیك انه لا یذل من والیت، ولا یعز من عادیت، (البیهقی) تبارکت ربنا وتعالیت (وصلی الله علی النبی علیه السلام (النسائی) اور ایک روایت میں **(تعالیت عما یقول الظالمون علوا کبیرا لا اله الا انت، استغفرك واتوب الیك، ربنا اغفرلنا ولا خواننا الذین سبقونا بالایمان، ولا تجعل فی قلوبنا غِلاً للذین آمنوا، ربنا انك رؤف رحیم، اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عنا، واغفرلنا وارحمنا وانت خیر الراحمین، واعوذ بعفوك من عقابك، وبرضاك عن سخطك، ولا احصی ثناء علیك، انت کما اثنیت علی نفسك)** ع نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح یا حسن ہے۔ ف۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ہمارے مشائخ نے جو **اللهم اهدنا فیمن هدیت وعافنا**

فیمن عافیت الخ یعنی جمع کے صیغہ سے بیان کیا ہے تو وہ منقول کے خلاف ہے اور مشائخ نے اسے تلفیق (خلط ملط) کر لیا ہے اس حکم سے کہ امام اپنی ذات کو مخصوص نہ کرے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تو صرف جماعت کے ساتھ ہونے والی وتر کی نماز میں ہوا، اور تنہا پڑھنے والے کو چاہئے کہ اھدنی دعافنی وغیرہ جیسا کہ بصیغہ واحد منقول ہے پڑھے، خلاصہ یہ ہوا کہ حدیث تو صحیح ہے لیکن اس میں حضرت حسنؓ نے کہا ہے کہ میں ان کو اپنی نماز وتر میں کہتا ہوں، یہ خود حضرت حسنؓ نے کیا اور رسول اللہ ﷺ کا حکم سمجھا نہیں جاتا ہے۔م۔

اور امام مصنفؒ کا استدلال اجعل هذا فی وترك، اس حدیث میں بالکل موجود نہیں ہے۔ع۔ اور مجھے بھی یہ جملہ کہیں نہیں ملا۔ف۔ زیلعیؒ۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ شاید مصنفؒ کی مراد یہ ہے کہ حسنؓ کا یہ فرمانا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے یہ کلمات سکھلائے ان کو میں وتر میں کہتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھے وتر میں پڑھنے کو سکھلائے، چنانچہ میں یہ کہتا ہوں، اس وجہ سے کہ اس دعاء کو وتر میں پڑھنا اپنی رائے اور خواہش سے نہیں ہوگا تو لامحالہ رسول اللہ ﷺ کا حکم ہی ہوگا۔

لیکن اس پر وہ اعتراض وارد ہوتا ہے جو عینیؒ نے لکھا ہے کہ اس توجیہ کی بناء پر زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو سکتا ہے کہ اس دعاء کو وتر میں پڑھنا مستحب ہے، پھر پورے سال پڑھنے کا بھی ثبوت نہیں ملتا ہے، اور شافعیہ ایسی دلیل کو تسلیم نہیں کریں گے، ہاں ابن الجوزیؒ نے تحقیق میں ہماری دلیل جو حضرت علیؓ کی حدیث سے پیش کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی وتر کے آخر میں پڑھا کرتے تھے، اللهم انی اعوذ برضاك من سخطك و بمعافاتك من عقوبتك، واعوذبك منك لا احصی ثناء علیك، انت كما اثنیت علی نفسك، یہ حدیث سنن اربعہ میں ہے، اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اس سے استدلال کی صورت یہ ہے کہ اس میں لفظ کان یقول واقع ہے جو استمرار اور مداومت پر دلالت کرتا ہے یعنی پڑھا کرتے تھے، اور جو مخالف ہو وہ اپنی دلیل پیش کرے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ استدلال اس بات پر موقوف ہے کہ یہ دعاء وتر میں پڑھا کرتے تھے، اللهم انی اعوذ بك الخ اور اس تقدیر سے حجت نہیں ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے، البتہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث اور ابی بن کعب کی روایات میں یقیناً لفظ استمرار ہے لہٰذا یہی کافی ہے، لیکن یہ بحث باقی ہے کہ قنوت واجب ہے، بہت ممکن ہے کہ اس پر مواظبت ادا کرتے رہنے کی وجہ سے ہی وجوب کا حکم دیا گیا ہو، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ مواظبت ثابت ہونے کے باوجود وجوب حکم اسی وقت ثابت ہوگا جبکہ یہ بھی ثابت ہو کہ ایسی مواظبت تھی کہ ایک بار بھی اسے نہیں چھوڑا، کیونکہ ان دو قسموں (گاہے گاہے چھوڑ دینے اور بالکل نہ چھوڑنے) پر مواظبت کا اطلاق ہوتا ہے، اور اگر حضرت حسنؓ کے کلمات کے متعلق کسی ناغہ کے بغیر ہمیشہ ہی کرتے رہنا ثابت بھی ہو جائے تو بعینہٖ یہی دعا واجب ہوگی حالانکہ ہمارے مشائخ کے نزدیک وہ دعاء مقرر ہے جو ابوداؤد نے مراسیل میں خالد بن ابی عمرانؒ سے مرسل روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ برابر قوم مضر پر لعنت اور بددعا کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ آخر میں حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور آپ کو اشارہ سے خاموش ہو جانے کے لئے کہا اس کے بعد انہوں نے کہا اے محمد ﷺ! اللہ تعالیٰ نے آپ کو لعنت کرنے والا نہیں بھیجا، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کو فقط رحمۃ العالمین بنایا ہے، پھر یہ آیت لے کر آئے لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ پوری آیت پھر یہ دعاء قنوت سکھلائی اللهم انا نستعینك و نستغفرك ونؤمن بك ونخضع لك و نخلع ونترك من یفجرك اللهم ایاك نعبد ولك نصلی و نسجد والیك نسعی و نحفد نرجو رحمتك ونخشی عذابك ان عذابك الجد بالكفار ملحق.

میں مترجم کہتا ہوں کہ سنن کبیر میں حضرت عمرؓ پر موقوف کرتے ہوئے مذکور ہے شروع میں بسم الله الرحمن الرحیم اور درمیان میں بسم الله الرحمن الرحیم اللهم ایاك نعبد آخر تک ذکر کیا، اور مصنفؒ ابن ابی شیبہ میں ابن مسعودؓ سے اسی طرح موقوف روایت ہے، اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ عامہ علماء کے نزدیک یہ قرآن تو نہیں ہے، پھر بھی احتیاطاً اسے جنبی اور حائض

نہ پڑھیں، اور لکھاہے کہ ملحق حاء کے کسرہ کے ساتھ زیادہ بہتر ہے حاء کے فتحہ کے مقابلہ میں، اور بحر الرائق میں لکھاہے کہ اسی قول کو امام اسبیجابیؒ نے صحیح کہاہے، اور جوہری نے حاء کے فتحہ کو بہتر بتلایاہے، میں کہتاہوں کہ ملا علی قاریؒ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے، واللہ اعلم۔

اور محیط میں ہے کہ قنوت میں کوئی دعاء معین نہیں ہے، ویسے اولیٰ یہی ہے کہ **اللهم انا نستعينك** آخر تک پڑھے، اور اس کے بعد **اللهم اهدنا فيمن هديت** آخر تک پڑھے، اور جو کوئی قنوت نہ جانتا ہو وہ **ربنا آتنا في الدنيا حسنة وفي الاخرة حسنته وقنا عذاب النار** پڑھے، سراجیہ میں کہاہے کہ فقیہ ابواللیث کے نزدیک مختار یہ ہے کہ **اللهم اغفرلنا** تین بار مکرر پڑھے۔ھ۔ بہر حال مطلق قنوت واجب ہے اور دعاء مذکور **اللهم انا. الخ. اللهم اهدنا فيمن هديت الخ** مستحب ہے، عینیؒ نے لکھاہے کہ دعائے قنوت میں کئی طریقے منقول ہیں، ان میں سے ایک وہ ہے جو حضرت عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت عمرؓ رکوع کے بعد کہا کرتے تھے، **اللهم اغفرلنا وللمومنين والمومنات والمسلمين والمسلمات والف بين قلوبهم واصلح ذات بينهم وانصرهم على عدوك اللهم العن الكفرة منن اهل الكتاب، الذين يصدون عم سبيلك و يكذبون رسولك و يقاتلون اوليائك اللهم خالف بين كلمتهم وانزل اقدامهم وانزل بهم باسك الذى لاترده عن القوم المجرمين، بسم الله الرحمن الرحيم اللهم انا نستعينك الخ** میں مترجم کہتاہوں کہ اس روایت میں تو یہ تصریح ہے کہ رکوع کے بعد پڑھتے تھے، اور جواب یہ ہے کہ اس قنوت میں حضرت عمرؓ نے مومنوں کے واسطے دعا اور کافروں کے واسطے لعنت کی ہے، اور آں حضرت ﷺ سے بھی ولید بن الولید اور کمزور مومنوں کے لئے نجات کی دعاء اور قبیلہ مضر پر لعنت کی جو اسی طرح رکوع کے بعد مروی ہے۔م۔

اور مشائخ کی ایک جماعت نے کہاہے کہ دعائے قنوت میں کوئی دعاء خاص نہ کرے، کیونکہ وہی زبان پر جاری ہو جائیگی، تو سچی رغبت کا مقصود حاصل نہ ہوگا، اور کچھ دوسرے لوگوں نے کہاہے کہ یہ حکم **اللهم انا نستعينك** کے زائد دعاء میں ہے، کیونکہ اس دعاء پر تو صحابہ کرامؓ کا اتفاق ہے، اور اگر اس دعاء کو مقرر نہ کرے تو ایسا نہ ہو کہ اس کی زبان پر ایسی دعاء جاری ہو جائے جو کہ انسانی کلام کے مشابہ ہے، جس سے نماز فاسد ہو جائے گی۔ف۔ پھر اگر یہ کہا جائے کہ تم نے پوری سال میں وتر کے اندر دعائے قنوت کا دعویٰ کیاہے حالانکہ ابوداؤد نے حسن بصریؒ سے روایت کی ہے کہ عمرؓ نے لوگوں کو تراویح کے لئے ابی بن کعبؓ کی اقتدا میں جمع کر دیا، اس لئے ابیؓ لوگوں کو بیس راتیں پڑھاتے تھے۔

ولايقنت بهم الا في النصف الثاني، یعنی ان کے ساتھ صرف دوسرے نصف میں قنوت پڑھتے تھے، پھر جب اخیر عشرہ رہا تو جماعت کے لئے نہ آئے اور اپنے گھر میں نماز پڑھی، ابن عدی نے کامل میں انسؓ سے مرفوع روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ آخری نصف رمضان میں قنوت پڑھتے تھے، جواب یہ ہے کہ ابن عدی کی روایت ضعیف ہے، جیساکہ نوویؒ نے اقرار کیا ہے، اور ابوداؤد کی روایت اگرچہ منقطع ہے کیونکہ حسنؒ نے حضرت عمرؓ کو نہیں پایاہے، لیکن ہمارے نزدیک حجت ہے، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ **لايقنت بهم القنوت اى الوتر** یعنی ان کو وتر نہیں پڑھاتے، تو اس سے صرف یہ معلوم ہوا کہ ابیؓ نے وتر کو پہلے نصف رمضان میں جماعت سے نہیں پڑھایا، اور عینی و فتح القدیر نے قنوت کے معنی دیر تک کھڑے رہنے کے لئے ہیں، جیساکہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ افضل نماز طول قنوت ہے، یعنی دیر تک کھڑا رہناہے، اب یہ معنی ہو جائینگے پہلے آدھے میں دیر تک کھڑے نہیں رہتے۔

واضح ہو کہ قنوت وتر تو آہستگی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، اور قنوت نازلہ جو کسی سخت پریشانی کے عالم میں عام مسلمانوں کے واسطے دعا اور کافروں کے واسطے بددعا وغیرہ ہوتی ہے وہ زور اور بلند آواز سے تاکہ مقتدی سب سن کر جواب میں آمین کہتے رہیں، اور اسی معنی میں حضرت انسؓ کی حدیث میں مذکور ہے **لايقنت الا اذا دعا لقوم او دعا عليهم** یعنی حضرت انسؓ نے

فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ قنوت صرف اسی وقت پڑھتے جب کسی قوم کے لئے دعا کرتے یا کسی بدکار قوم پر بددعا کرتے تھے، خطیب نے اس کی روایت کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے، یہ بات صاحب التنقیح نے کی ہے، جس کے معنی یہ نکلے کہ بآواز بلند قنوت نہیں پڑھتے تھے اور یہ قنوت الوتر نہیں ہے، اچھی طرح یاد کرلیں۔

خلاصہ بحث یہ نکلا کہ پورے سال میں قنوت پڑھی جائے اور نصف اخیر رمضان کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ م۔ اور قول مختار یہ ہے کہ امام اور قوم دونوں ہی اسے آہستگی کے ساتھ پڑھیں۔ النہایہ۔ اور قنوت نازلہ میں مضبوط دلائل اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ امام بآواز بلند دعا کرے اور مقتدین سب کے سب آمین کہیں۔ م۔ اور تنہا پڑھنے والے کے حق میں بھی یہی قول مختار ہے کہ قنوت کو آہستہ پڑھے، شرح المجمع لابن مالک۔ اور جب وتر کی نماز قضاء کی جائے تو قنوت بھی اسی طرح قضاء کرے۔ المحیط۔ وتر کی قضاء واجب ہے، خواہ اسے عمداً چھوڑا ہو یا بھول کر اور خطاء سے اگرچہ کافی وقت گذر جائیں، اور وتر کی نماز بغیر نیت کے ادا نہ ہوگی۔ الکفایہ۔ اور وتر کو کھڑے ہو کر پڑھنے کی صلاحیت ہو تو بیٹھ کر نہیں پڑھنی چاہئے، کہ جائز نہ ہوگی، اور بغیر عذر کے سوار ہو کر نہ پڑھے۔ محیط السرخسی۔ کہا گیا ہے کہ یہ قول متفق علیہ ہے، جیسا کہ ع ف وغیرہ سے ظاہر ہے۔ م۔

ویقرأ فی کل رکعة من الوتر فاتحة الکتاب وسورة، لقوله تعالی ﴿فاقرؤا ما تیسر من القرآن﴾ وان اراد ان یقنت کبر لان الحالة قد اختلف ورفع یدیه وقنت لقوله علیه السلام لاترفع الایدی الا فی سبع مواطن وذکر منها القنوت ولایقنت فی صلوة غیرها خلافا للشافعی فی الفجر لما روی ابن مسعود انه علیه السلام قنت فی صلوة الفجر شهرا ثم ترکه.

ترجمہ:- اور وتر کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ اور کوئی سورہ پڑھے اس فرمان باری تعالی کی بناء پر کہ تم کو قرآن سے جو بھی آسان معلوم ہو اسے پڑھو، اور جب قنوت پڑھنے کا ارادہ کرے تو پہلے تکبیر کہے کیونکہ پہلی حالت مختلف ہو چکی ہے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھائے اور قنوت پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ سات مواقع کے علاوہ دوسرے موقع میں ہاتھ نہ اٹھائے جائیں، اور ان میں سے ایک قنوت کو بھی ذکر کیا، اور اس کے علاوہ دوسری کسی نماز میں قنوت نہ پڑھے، فجر میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے اس حدیث کی وجہ سے جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آپ نے ایک مہینہ تک فجر کی نماز میں قنوت پڑھ کر چھوڑ دی ہے۔

توضیح:- وتر کی ہر رکعت کی قرأت، دعائے قنوت کے واسطے تکبیر و رفع یدین، حدیث سے دلیل

ویقرأ فی کل رکعة من الوتر فاتحة الکتاب وسورة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، لقوله علیه السلام الخ اس آیت کی دلالت کی وجہ سے کہ جو قرآن سے آسان ہو پڑھو۔ ف۔ یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کیونکہ صاحبین وشافعیؒ کے نزدیک تو وتر سنت ہے اور سنت کی ہر رکعت میں قرأت ہے، اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وہ اگرچہ واجب ہے لیکن شبہ کی وجہ سے احتیاطاً ہر رکعت میں قرأت کرنی چاہئے، اور کوئی سورہ متعین نہیں ہے، اسبیجابیؒ نے کہا ہے کہ اگر سنت کے طور پر تبرک کے لئے کوئی سورہ اعلی و کافرون و اخلاص پڑھے اور حتمی لازم نہ سمجھے تو مکروہ نہیں ہے۔ مع۔

وان اراد ان یقنت کبر لان الحالة قد اختلف ورفع یدیه وقنت......الخ

اور اگر قنوت پڑھنا چاہے۔ ف۔ یعنی وتر کی تیسری رکعت کی قرأت ختم ہونے لگے تو تکبیر کہے۔ ف۔ کہا گیا ہے کہ یہ تکبیر واجب ہے لان الخ کیونکہ حالت بدل گئی ہے۔ ف۔ اور یہی قول امام احمدؒ کا بھی ہے، جبکہ رکوع سے قبل قنوت پڑھی جائے، ابونصر الاقطعؒ نے کہا ہے کہ حضرات علیؓ و ابن عمرؓ و براء بن عازبؓ سے یہی مروی ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ قنوت واجب ہے اس لئے اس کا حکم

بھی علیحدہ ہے، برخلاف ثناء کے یعنی سبحانك اللهم الخ کے کہ وہ تو تکبیر تحریمہ کو مکمل کرنے والی ہے اس لئے اس کے بعد قرأت شروع ہونے پر تکبیر کی ضرورت نہیں ہے، اور اس لئے کہ قنوت کے لئے ہاتھ اٹھانا تکبیر کے بغیر نہیں ہے۔ مع۔ ورفع يديه الخ، اور دونوں ہاتھ اٹھائے۔ف۔ سنت کے طور پر اور قنوت پڑھے۔ف۔ وجوب کے طور پر۔ م۔ اور شافعیؒ کے نزدیک دو طریقے ہیں ایک میں ہاتھ اٹھائے اور دوسرے میں نہیں اور اظہر قول یہی ہے، اور یہی قول امام مالکؒ و اوزاعیؒ اور لیثؒ کا ہے۔ مع۔

لقوله عليه السلام لاترفع الايدى الا فى سبع مواطن وذكر منها القنوت......الخ

کیونکہ حدیث میں ہے کہ صرف سات جگہوں میں ہاتھ اٹھائے جائیں، ان سات میں سے ایک قنوت کو بھی ذکر کیا ہے۔ف۔ یہ حدیث نماز کی صفوں کے بیان میں گذر چکی ہے، اور ہم نے وہاں ذکر کر دیا ہے کہ حدیث میں قنوت کا ذکر نہیں ہے، جیسا کہ بخاریؒ کی جزء القراءۃ اور طبرانی وغیرہ میں ہے، بلکہ خود مصنفؒ کی روایت میں ہے، اور اسی بناء پر یہاں استدلال کیا ہے۔ مع۔ اور اب چونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک نماز فجر میں قنوت پڑھی جاتی ہے اس لئے کھل کر اس کی نفی کر رہے ہیں۔

ولايقنت فى صلوة غيرها خلافا للشافعي فى الفجر......الخ

اور سوائے نماز وتر کے کسی اور نماز میں قنوت نہیں پڑھی جائے۔ف۔ وتر میں پڑھی جانے والی قنوت وتر کے ماسوا کسی اور نماز میں نہیں پڑھی جائے، خلافا الخ فجر کی نماز میں امام شافعیؒ کے مسلک کے خلاف ہے۔ف۔ یعنی امام شافعیؒ کے نزدیک فجر میں قنوت ہے اور ہمارے نزدیک وہ قنوت نازلہ تھی جو ایک ماہ پڑھ کر بند کر دی گئی ہے لما روى الخ کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر میں ایک مہینہ تک قنوت نازلہ پڑھ کر بند کر دی ہے۔ف۔ کہ نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد پڑھی ہے، اس کے روایت بزار، طبرانی اور ابن ابی شیبہ سبھوں نے شریک قاضیؒ سے انہوں نے ابی حمزہ میمون القصاب عن ابراہیم عن علقمہ عن ابن مسعودؓ روایت کی ہے، اور طحاویؒ نے شریک القاضی کی بجائے ابو معشر عن ابی حمزہ الخ روایت کی ہے، اور اس میں تصریح ہے کہ یہ عصیہ اور زکوان پر بددعا تھی، اس کے بعد آپ کو منجانب اللہ اس سے منع کیا گیا تو پھر آپ نے پڑھنا چھوڑ دیا، اسی طرح ابن عمرؓ اور عبد الرحمٰن بن ابی بکرؓ نے بھی منسوخ ہو جانے کی روایت کی ہے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حق بات یہ ہے کہ یہ قنوت نازلہ تھی اور وہ مغرب بلکہ ظہر و عصر و عشاء میں بھی پڑھی جاتی تھی، جیسا کہ پہلے بھی مسلم، بخاری اور نسائی کے حوالہ سے گذر چکا ہے، اور ہم اس کے منسوخ ہو جانے کے قائل نہیں ہیں، بلکہ صرف متعینہ کافر گروہ پر لعنت کرنے سے منع کیا گیا ہے، لیکن اگر اب بھی عام مسلمانوں پر خدانخواستہ مصیبت نازل ہو جائے تو اسی قنوت نازلہ کو پڑھنا جائز ہوگا، اس مسئلہ کی تحقیقی تفصیل جس میں شافعی کے دلائل نقل کر کے ان کے جوابات اور اپنے قول حق کو محقق تشریح کے ساتھ ثابت کیا گیا ہے جسے شارح محقق ابن الہمام اور عینی وغیرہ سے نقل کیا گیا ہے کہ حازمیؒ نے کتاب الناسخ والمنسوخ میں کہا ہے کہ نماز فجر میں پڑھنا چاروں خلفائے راشدین و عمار بن یاسر و ابی بن کعب و ابو موسی اشعری و ابن عباس و ابوہریرہ و براء بن عازب و انس و سہل بن سعد و معاویہ و عائشہؓ سے ثابت ہے، اور اسی کی طرف اکثر صحابہ و تابعین کا رجحان ہے۔ ع۔

لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تو قنوت وتر نہ تھی بلکہ قنوت نازلہ تھی، جیسا کہ تحقیق کے ساتھ اس کا بیان گذر چکا ہے۔ م۔ اور صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ میں نماز میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ زیادہ مشابہ ہوں، اس کے بعد ابوہریرہؓ صبح کی آخری رکعت میں سمع الله حمده کہنے کے بعد قنوت پڑھتے اور عام مسلمانوں کے لئے دعاء فرماتے اور کافروں پر لعنت فرماتے تھے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تو قنوت نازلہ ہے، چنانچہ عینیؒ نے نقل کیا ہے کہ ابوہریرہؓ نماز ظہر و نماز عشاء و نماز صبح کی اخیر رکعت میں قنوت پڑھتے تھے، اس میں مومنوں کے لئے دعاء اور کافروں پر لعنت کرتے تھے، اس کی روایت بخاری و مسلم و ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے۔ م۔ عبد الرزاقؒ نے کہا ہے کہ اخبرنا ابوجعفر الرازى عن الربيع بن انس عن انس بن مالكؓ

انسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر میں قنوت پڑھا کرتے تھے یہانتک کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔
اسحٰق بن راہویہ نے اسی اسناد سے روایت کی ہے کہ ایک شخص نے انس بن مالکؓ سے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض قبائل عرب پر ایک مہینہ تک بددعا کی پھر چھوڑدیا، تو انسؓ نے (ایک مسکراہٹ کا اظہار کیا) اور کہا کہ رسول اللہ ﷺ فجر میں قنوت پڑھتے یہانتک کہ دنیا سے تشریف لے گئے، اس میں ابو جعفر الرازی ہیں جن کے بارے میں امام احمدؒ و یحییٰ و علی بن المدینی وابوزرعہ اور ابن حبان نے کلام کیا ہے، لیکن تنقیح میں کہا ہے کہ دوسروں نے ان کو ثقہ بھی کہا ہے، حاصل یہ نکلا یہ حدیث حسن کا درجہ پانے کے بعد حضرت انسؓ سے صحیحین وغیرہ میں قنوت فجر ایک مہینہ پڑھنا مروی ہے، اور ابو داؤد اور نسائی میں اس بات کی تصریح بھی ہے کہ ایک ماہ پڑھ کر اس کا پڑھنا بند کردیا گیا ہے، اور قیس الربیع نے عاصم بن سلیمان سے روایت کی ہے کہ ہم نے انس بن مالکؓ سے کہا کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں ہمیشہ قنوت پڑھا کرتے تھے تو فرمایا کہ جھوٹے ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تو صرف ایک ماہ تک عرب کے چند قبیلوں کے مشرکین پر بددعا کی تھی، یہ حدیث دوسرے سے صراحۃً مخالف ہے۔
اب اگر یہ کہا جائے کہ قیس بن الربیع میں ابن معین اور نسائی اور دار قطنی وغیرہ نے تو کلام کیا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شعبہؒ نے توثیق کی ہے اور ابن معین کے بارے میں کہا ہے کہ ان کو قیس بن الربیع کے بارے میں کلام کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہے، ذہبیؒ نے کہا ہے کہ شعبہؒ کی ہی بات درست ہے، تقریب میں انہیں صدوق لکھا ہے، اس لحاظ سے ابو جعفر رازیؒ سے مرتبہ میں کم نہیں بلکہ زیادہ ہوئے، جیسا کہ فتح القدیر میں کہا ہے، اس سے لازمی طور پر انسؓ کی مراد یہ ہوئی کہ فجر میں متواتر ایک ماہ تک قنوت کی قرأت ہوئی اس کے بعد بند کردی گئی، لیکن قنوت النازلہ برابر باقی رہی، اور منسوخ نہیں ہوئی، یہانتک کہ رسول اللہ ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے، اس کی تائید میں وہ حدیث ہے جو خطیبؒ نے انسؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ قنوت نہیں پڑھتے مگر جب کہ کسی قوم کے لئے دعا کرتے یا کسی قوم پر بددعا کرتے تھے، تنقیح میں کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے اور اس کی تائید میں وہ حدیث ہے جو مصنفؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کے حوالہ سے ذکر کی ہے جسے بزار و طبرانی وابن ابی شیبہ اور طحاویؒ نے روایت کی ہے جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے۔
اور اگر یہ وہم ہو کہ اس کی سند میں ابو حمزہ القصاب کے بارے میں امام احمد و ابن معین، وفلاس اور ابو حاتم نے اس وجہ سے کلام کیا ہے کہ ان کو بہت وہم ہوا کرتا تھا، اس کا جواب یہ ہے کہ ابو جعفر الرازی میں تو اس سے زیادہ جرح ہے، یہانتک کہ ابن حبانؒ نے کہا ہے کہ یہ مشہور لوگوں کے حوالہ سے منکر باتیں بناتے تھے، اور ابو حمزہ القصاب ان کے مقابلہ میں زیادہ قوی ہیں، اور اس بات کی تصریح موجود ہے کہ ابن ماجہ نے حضرت ام المومنین ام سلمہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر میں قنوت سے ممانعت کردی ہے، طبرانیؒ نے کہا ہے کہ حدثنا عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز حدثنا شیبان بن فروخ حدثنا غالب بن فرقد الطحان قال کنت عند انس بن مالك شهرين فلم یقنت فی صلوۃ الغداۃ، یعنی غالب نے کہا ہے کہ میں دو مہینہ تک انس بن مالکؓ کے پاس رہا مگر انسؓ نے فجر کی نماز میں کبھی قنوت نہیں پڑھی یہ روایت اس بیان میں صریح ہے کہ خود انسؓ فجر میں قنوت نہیں پڑھتے تھے۔
ف۔ بیہقیؒ نے ابن عمرؓ کے متعلق روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ نے صبح کی نماز پڑھی تو میں نے سوال کیا کہ آپ قنوت نہیں پڑھتے تو فرمایا کہ مجھے تو کسی صحابی کے متعلق یاد نہیں آتا کہ وہ بھی پڑھتے ہوں، ذہبیؒ نے کہا ہے کہ ابن عمرؓ سے یہ روایت صحیح ہے اور بیہقیؒ نے جو یہ بات کہی کہ ابن عمرؓ کو یاد نہیں رہا تو ذہبیؒ نے اسے یہ کہتے ہوئے رد کردیا کہ یہ بات بالکل محال ہے ہر روز صبح کے وقت پڑھی چیز کے بارے میں یہ کہیں کہ میں اسے بھول گیا اور اب قنوت پڑھنے سے متعلق بات تو ابو ہریرہؓ کا تو بیان یہ تھا کہ قنوت مومنوں کے لئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا کا ہونا یقیناً رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، نہ یہ کہ فعل قنوت مستمر

اور مستقل تھا، ابن الہمامؒ نے ایسا ہی کہا ہے۔
اور مترجمؒ کے نزدیک اس کی تاویل یہ ہے کہ ابوہریرہؓ نے جو قنوت پڑھی وہ شاید کہ وہی موقع ہو جس میں مسلمانوں پر کوئی بڑی مصیبت نازل ہوئی ہو، اور شاید کہ وہ مسلیمہ کذاب سے جنگ کا زمانہ ہو جس میں حضرت ابو بکرؓ سے قنوت کا ثبوت ہوا یا شام میں نصاریٰ سے جنگ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ سے قنوت پڑھنا پہلے ثابت کیا جاچکا ہے، اور روایت میں اس کی تصریح ہے کہ قنوت میں مومنوں کے لئے دعا اور کافروں کے لئے بددعا ہوتی تھی، بلکہ ابن حبان نے ابراہیم بن سعید عن الزہری عن سعید وابی سلمۃ عن ابی ہریرۃؓ روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز صبح میں قنوت نہیں پڑھتے تھے مگر اس وقت جبکہ کسی قوم کے لئے دعاء اور کسی قوم کے لئے بددعا کرتے، یہ اسناد صحیح ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ابوہریرہؓ نے بھی کسی مصیبت کے زمانہ میں ہی ایسا کیا تھا، اور یہ مراد نہیں ہے کہ ہر روز صبح میں قنوت پڑھنے کا وظیفہ مقرر تھا۔
اور سب سے واضح دلیل ابو مالکؒ سعد بن طارق اشجعی کی حدیث ہے کہ انہوں نے اپنے والد طارقؓ سے روایت کی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھی لیکن میں نے آپ کو قنوت پڑھتے نہیں دیکھا، اور حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پیچھے نماز پڑھی انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی اسی طرح حضرت عمرؓ کے پیچھے نماز پڑھی اور انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی اور حضرت عثمانؓ کے پیچھے بھی نماز پڑھی اور انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی، اسی طرح حضرت علیؓ کے پیچھے بھی نماز پڑھی اور انہوں نے بھی قنوت نہیں پڑھی، پھر کہا کہ اے میرے بیٹے اس طرح قنوت پڑھنا بدعت ہے، اس کی روایت نسائی، ابن ماجہ، اور ترمذی نے کی اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور ابن ماجہ کی روایت میں اس طرح ہے کہ میں نے اپنے والد سے کہا کہ اے اباجان! آپ نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور عثمان غنیؓ اور علیؓ کے پیچھے تقریباً پانچ برس کوفہ میں نماز پڑھی ہے تو کیا یہ حضرات فجر کی نماز میں دعاء قنوت پڑھا کرتے تھے، تو ان کے والد نے جواب دیا اے بیٹے! یہ تو بدعت ہے، ترمذی نے بغیر قنوت نماز پڑھنے پر اکثر صحابہ کرام کا عمل بیان کیا ہے، ابن ابی بشیر نے بھی ابو بکر و عمر و عثمانؓ سے روایت کی ہے کہ یہ حضرات فجر میں قنوت نہیں پڑھنے تھے ایک مرتبہ حضرت علی نے قنوت پڑھی تو لوگوں نے یعنی صحابہؓ و تابعینؒ نے انکار کیا، تو آپ نے فرمایا کہ میں نے دشمن پر فتح پانے کے لئے پڑھی ہے، ابن ابی شیبہ نے ابن عباسؓ وابن مسعود وابن عمرؓ وابن الزبیریؓ سے قنوت فجر نہ پڑھنے کی روایت کی ہے، اور امام نے آثار میں ابو حنیفہؒ عن حماد عن ابراہیم عن الاسودؒ روایت کی کہ اسود بن یزید نے کہا ہے کہ میں دو ماہ تک حضرت عمرؓ کے ساتھ سفر و حضر میں رہا مگر میں نے کبھی بھی فجر میں قنوت پڑھتے ہوئے آپ کو نہیں دیکھا، یہ اسناد بلاشک و شبہ صحیح ہے۔
ف۔ رہی بات یہ جو کہی گئی ہے کہ کسی کو یاد رہی اور کوئی بھول گیا، تو بلاشبہ بقول ذہبیؒ یہ محال سی بات ہے کہ کوئی شخص خود ایک مخلوق عظیم جماعت کے ساتھ صبح کی نماز میں ایک کام کرے اور دوسری صبح کو اسے بھول جائے یہاں تک کہ دوسروں کو دیکھ کر بھی وہ بات یاد نہ آئے بلکہ اس کے نہ کرنے پر دوسرے اسے ٹوکیں اور اس کے ادا کرنے کو کہیں تو وہ انکار کر بیٹھے، بلکہ ایسے عمل کو متواترات میں سے ہونا چاہئے، لہٰذا ایسا کہنا بالکل مہمل بات ٹھہری، ہاں قنوت نازلہ میں یہ بات ہو سکتی ہے کیونکہ وہ متواتر نہیں پڑھی جاتی تھی، بلکہ کسی وقت اور عموم بلوئی کے وقت گاہے گاہے پڑھی جاتی تھی، اور یہی قنوت نازلہ حضرات خلفاء راشدین وغیرہم سے ثابت ہے، اور یہی معنی حضرات انسؓ وابوہریرہؓ میں ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس سے ہمارے لئے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ قنوت نازلہ برابر ثابت رہی اور وہ منسوخ نہیں ہوئی لیکن ابو حمزہ القصاب اور حدیث ابو حنیفہؒ سے یہ بات ثابت ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ممانعت کے بعد پھر کبھی قنوت نازلہ نہیں پڑھی، اس طرح یہ مسئلہ اجتہادی ہو گیا۔
ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ ان سب میں موافقت کی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ممانعت سے پہلے کفار مشرکین پر عموماً اور کسی گروہ یا افراد پر نام بہ نام لعنت فرماتے تھے اس لئے اس لعنت سے ممانعت کر دی گئی، یہ کہتے ہوئے کہ آپ

تو رحمۃ للعالمین ہیں، چنانچہ اس کے بعد آپ نے کبھی لعنت نہیں کی، اور چونکہ حدیث انس وابو ہریرہؓ میں اس بات کی دلیل ہے کہ آپ قنوت پڑھتے تھے تو اس کی مراد یہ ہوگی کہ بغیر لعنت کے پڑھتے تھے اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہنگامی اور عموم بلوی کی صورت میں ہر نماز میں یا جہریہ نماز میں قنوت پڑھتے اور اس طرح کہ وہ لعنت سے خالی ہوتی، اور اس میں راز یہ ہو سکتا ہے کہ لعن کے معنی ہیں ایمان اور رحمت سے مکمل طور پر دور رہنا، اور بالاجماع کسی شخص کے واسطے بھی مرتے وقت کفر کی حالت پر مرنے کی بد دعا کرنی اگر خود کفر کی حرکت نہ ہو تو کم از کم حرام قبیح ضرور ہے۔م۔

فان قنت الامام فی الصلوۃ الفجر یسکت من خلفه عند ابی حنیفه و محمد و قال ابویوسف یتبعة لانه تبع لامامه والقنوت فی الفجر مجتهد فیه ولهما انه منسوخ ولامتابعة فیه ثم قیل یقف قائما لیتابعه فیما تجب بمتابعته وقیل یقعد تحقیقا للمخالفة لان الساکت شریك الداعی، والاول اظهر، ودلت المسألة علی جواز الاقتداء بالشفعویة، وعلی المتابعة فی قراءة قنوت فی الوتر.

ترجمہ:- اگر امام فجر کی نماز میں دعاء قنوت پڑھنے لگے تو اس کے پیچھے تمام افراد امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کے نزدیک خاموش رہیں، لیکن امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ امام کی اتباع کرلے کیونکہ مقتدی نے تو اس امام کی اقتدا کر رکھی ہے، جبکہ فجر میں قنوت کا پڑھنا بھی اجتہادی مسئلہ ہے، اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ قنوت کا پڑھنا تو اب منسوخ ہو چکا ہے، اور منسوخ شدہ چیز میں متابعت نہیں ہوتی ہے، پھر کہا گیا ہے کہ مقتدی کھڑا رہے گا تاکہ جہاں کہیں اس کی متابعت ضروری ہے وہاں متابعت کرے، اور کہا گیا ہے کہ بیٹھ جائے مخالفت کو محقق کرنے کے لئے، کیونکہ خاموش رہنے والا بھی شریک داعی ہی ہوتا ہے، لیکن پہلا قول اظہر ہے، اس مسئلہ نے شافعی امام کی اقتداء کے جائز ہونے پر دلالت کی ہے، اور اس بات پر بھی دلالت کی ہے کہ مقتدی وتر میں قنوت پڑھنے میں امام کی اتباع کرے۔

توضیح:- نماز فجر میں قنوت پڑھنے والے امام کی اتباع کا حکم
قنوت آہستہ پڑھنا، شافعی مذہب کی اقتداء کرنی فجر نماز میں

فان قنت الامام فی الصلوۃ الفجر یسکت من خلفه عند ابی حنیفه ومحمد......الخ

پھر اگر امام نماز فجر میں قنوت پڑھے۔ف۔ تو بالاتفاق اس کی اقتداء جائز ہے ویسکت الخ تو طرفین کے نزدیک مقتدی اس کے پیچھے خاموش رہے کچھ نہ پڑھے۔ف۔ یعنی امام کی اتباع کرے، وقال الخ اور امام ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ امام کی اتباع کرے۔ف۔ یعنی قنوت پڑھے جیسا کہ اگر امام عید کی نماز میں عید کی تین تکبیروں سے زیادہ تکبیر کہے تو اس وقت مقتدی بھی اس کی اتباع میں زائد تکبیریں کہتا ہے۔ف۔ اور اصل حکم میں مقتدی پر تو امام کی اتباع کرنی لازم ہے، تو اس وقت بھی اتباع کرے۔م۔ لانه الخ کیونکہ مقتدی تو یقینی طور پر امام کا تابع ہوتا ہے۔ع۔ تو اس مقتدی پر امام کی اتباع کا حکم اصلی اور یقینی ہے۔

والقنوت فی الفجر مجتهد فیه......الخ

اور فجر میں قنوت پڑھنا ایک اجتہادی معاملہ ہے۔ف۔ یعنی فجر میں قنوت پڑھنے کا معاملہ ایسا ہے کہ اس کے پڑھنے اور نہ پڑھنے دونوں طرف ایسی حدیثیں اور دلیلیں موجود ہیں کہ کچھ مجتہدوں نے اسے پڑھنے کو سنت قرار دیا اور کچھ لوگوں نے اجتہاد کے بعد اسے منسوخ مانا لہٰذا دونوں جانب حکم ظنی ہے کسی جانب بھی قطعی دلیل نہیں ہے، اور چونکہ مقتدی کے لئے اس کے امام کی متابعت کرنی اصلی اور قطعی حکم ہے اس لئے ظنی حکم کی وجہ سے قطعی حکم کو نہیں چھوڑنا چاہئے لہٰذا اس مسئلہ میں امام کی متابعت کرلے۔م۔ع۔

ولهما انه منسوخ ولامتابعة فیه ثم قیل یقف قائما لیتابعه فیما تجب بمتابعة......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ قنوت کا حکم منسوخ ہے، اور منسوخ میں ممانعت نہیں ہے۔ف۔یاد رہے کہ ابو یوسفؒ کہہ سکتے ہیں کہ ہم بھی تو اسے منسوخ کہتے ہیں لیکن منسوخ ہونا بھی تو بالاتفاق اجتہاد ظنی ہے اس لئے ظنی حکم کی وجہ سے قطعی متابعت کے حکم کو کیوں ترک کیا جائے، بندہ مترجم کے نزدیک اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ذکر میں بھی متابعت قطعی نہیں ہوتی ہے تو دونوں طرف برابر اور نسخ کا گمان مرجح ہوا، لیکن یہ بات تو مسلم ہے کہ قنوت قعدہ اول و تکبیر عید و سجدہ تلاوت اور سجدہ سہو میں امام کی اتباع کرنی چاہئے، اور اگر امام عید کی تکبیر میں تین بار سے زیادہ کہے تو اس کی اتباع اس حد تک کر لینی چاہئے جتنی میں موجود ہے، پھر اگر وہ اس سے بھی زیادہ تکبیر کہے تو اس کی اتباع نہیں کرنی چاہئے جیسے جنازہ کی تکبیریں اور کسی رکن کے زیادہ کرنے یا پانچویں کے کھڑے ہونے میں امام کی اتباع نہیں کرنی چاہئے۔

اور آٹھ باتیں وہ ہیں جو بہر صورت کرنی چاہئے، (۱) تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھانا (۲) ثناء پڑھنا (۳) ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونے کے لئے تکبیر کہنا (۴) سمع اللہ لمن حمدہ (۵) رکوع و سجدہ کی تسبیح (۶) تشہد پڑھنا (۷) سلام کرنا (۸) تکبیر تشریق کہنی یہاںتک کہ اگر امام نہ کہے تو بھی مقتدی بجالائے۔ع۔ھ۔م۔د۔ پھر امام صاحب کے کہنے کے مطابق جب مقتدی اتباع نہ کرے تو کیا کرے۔

وقيل يقعد تحقيقا للمخالفة لان الساكت شريك الداعي......الخ

ایک قول یہ ہے کہ مقتدی خاموش کھڑا رہے تاکہ جن چیزوں میں متابعت واجب ہے ان میں متابعت کرنے لگے۔ف۔یعنی قیام میں امام کھڑا ہو کر قنوت پڑھتا ہے اس لئے قنوت میں متابعت نہ کر کے صرف کھڑا رہے کیونکہ کھڑے رہنے میں تو متابعت کرنی ممکن ہے لہٰذا یہی کرے۔م۔**وقيل يقعد** اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ کھڑا نہ رہے بلکہ بیٹھ جائے **تحقیقاً** مخالفت کو محقق اور واضح کرنے کے لئے کیونکہ خاموش رہنے والا موافقت کرنے والا سمجھا جاتا ہے اور دعاء کرنے والے کا شریک ہوتا ہے۔

والاول اظهر، ودلت المسألة على جواز الاقتداء بالشفعوية......الخ

اور قول اول یعنی خاموش کھڑا رہے تو یہی اظہر ہے۔ف۔ قاضی خان نے کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے، اسی بناء پر اگر امام نماز جنازہ میں چار تکبیروں سے زائد کہدے تو صحیح قول یہ ہے کہ اس موقع پر مقتدی خاموش کھڑا رہے۔مع۔اس قول کو اظہر اس لئے کہا گیا ہے کہ نماز میں امام کی مخالفت پیدا کرنا اگرچہ کسی رکن اور شرط میں نہ ہو دو وجہ سے خراب ہے اول تو یہ ہے کہ اختلاف کرنا اقتداء کی شان کے خلاف ہے، کیونکہ حدیث میں ہے **انما جعل الامام ليؤتم به** یعنی امام تو اسی لئے ہوتا ہے کہ اس کی اتباع کی جائے الخ، بر خلاف اس کے مخالفت کرے بلکہ مخالفت کو واضح طور پر ثابت کرنے کے لئے بیٹھ جائے اور اجتماعی حالت کو درہم برہم کردے دوم یہ ہے کہ یہ فعل اگرچہ کثیر ہونے سے بھی مفسد نماز نہیں ہے مگر قلیل بھی مکروہ ہے، اسی لئے قاضی خان نے اس دوسرے قول کو غلط قرار دیا ہے، اور کہا ہے کہ قول اولی ہی صحیح ہے۔م۔

ودلت المسألة على جواز الاقتداء بالشفعوية......الخ

اور اس مسئلہ نے اس بات پر دلالت کی ہے کہ شافعی المذہب امام کے پیچھے کھڑا ہونا جائز ہے۔ف۔ایسے ہی مالکی و حنبلی کے پیچھے بھی۔ف۔کیونکہ خود ہی تو ایسے امام کو آگے بڑھایا ہے جو فجر کی نماز میں قنوت پڑھتا ہے۔م۔**وعلى المتابعة الخ** اور اس بات پر بھی دلالت کی ہے کہ وتر میں قنوت پڑھنے میں امام کی اتباع کرے۔ف۔یعنی قنوت ایسی دعاء ہے کہ اس میں مقتدی کو امام کے پیچھے پڑھنا چاہئے، اس پر دلالت کرنے کی وجہ یہ ہے کہ فجر کی قنوت میں مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ قنوت پڑھنا منسوخ ہے، اس لئے وتر میں یعنی ہر ایسی جگہ میں جہاں قنوت مسنون بلکہ واجب ہے وہاں بھی مقتدی خاموش نہ رہے گا، بلکہ پڑھے گا، یہاںتک کہ امام ابو یوسفؒ کے نزدیک فجر میں بھی مقتدی اتباع کرتے ہوئے پڑھے۔م۔

واذا اعلم المقتدى منه ما يزعم به فساد صلاته، كالفصد وغيره، لايجزيه الاقتداء به، والمختار في

القنوت الاخفاء لانه دعاء.

ترجمہ :-اور جب مقتدی کو اپنے امام کے بارے میں کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو اس کے خیال میں نماز کو فاسد کر دیتی ہے جیسے فصد کھلوانا، وغیرہ تو اب اس کے لئے یہ بات جائز نہ ہوگی کہ اس امام کی اقتداء کرے اور قنوت پڑھنے میں مختار مذہب ہے آہستہ پڑھنے کا، کیونکہ یہ تو دعاء ہے۔

توضیح :-اگر مقتدی کو اپنے امام کے متعلق ایسی باتیں معلوم ہو جائے جو اس کے خیال میں مفسد نماز ہے تو وہ کیا کرے

واذا اعلم المقتدی منه ما یزعم به فساد صلاته......الخ

اور جب حنفی مقتدی کو مثلاً شافعی المذہب امام کے متعلق کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے مقتدی کے خیال میں اس کی اپنی نماز فاسد ہو جاتی ہے، مثلاً فصد وغیرہ لینا احناف کے نزدیک ان کاموں سے نماز فاسد ہو جاتی ہے جبکہ شافعی حضرات کے مذہب میں ان سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے، تو حنفی کو اس کی اقتداء صحیح نہ ہوگی۔ف۔ یہ مسئلہ غیر مذہب والوں کی اقتداء کا ہے، والمختار الخ اور قنوت پڑھنے میں مذہب مختار یہ ہے کہ اسے آہستہ پڑھنی چاہئے، کیونکہ حقیقت میں قنوت دعاء ہے۔ف۔ اور دعاء کو آہستہ پڑھنا ہی اولی ہے۔ف۔ مذہب مختار یہ ہے کہ ہاتھ باندھے رہے۔ قاضی خان۔ واضح ہو کہ اس جگہ دو مسئلے قابل بحث ہے (۱) وتر میں کس کی اقتداء کرنی (۲) شافعی المذہب وغیرہ کی اقتداء کرنی، وتر میں شافعی مذہب یا دوسرے مذہب کے امام کی اقتداء اقوال اصح کے مطابق جائز ہے بشرطیکہ ایک ساتھ تین رکعتیں امام پڑھتا ہو۔ت۔

اور اگر فصل کرتا ہو یعنی دو سلام سے پڑھتا ہو تو قول اصح کے مطابق جائز نہیں ہے، اور جب وتر میں اقتداء جائز ہوئی تو دوسری نمازوں میں بھی قول اصح کے مطابق بدرجہ اولی جائز ہوگی بشرطیکہ اس مقتدی کے اپنے مسلک کے مطابق امام سے کوئی ایسا عمل نہ ہوا جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، جیسا کہ بحر الرائق میں بالتفصیل بیان کیا گیا ہے۔د۔اس میں یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ وتر تو حنفی کے نزدیک واجب ہے جبکہ شافعی اماموں کے نزدیک سنت ہے، تو واجب پڑھنے والوں کی اقتداء سنت پڑھنے والے کے پیچھے کس طرح جائز ہوگی، اس کا جواب جلد ہی دیا جائے گا، اسی لئے نیت کے وقت صرف وتر کی نیت کرنی چاہئے اور وتر واجب نہیں کہنی چاہئے، جیسے کہ عیدین میں ہوتا ہے، اور مقتدی بھی قنوت پڑھے اگرچہ شافعی امام رکوع کے بعد پڑھے۔ت۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء کا مسئلہ میرے نزدیک بہت ہی اہم اور ضروری اور قابل تحقیق ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ جو لوگ اس ایمان پر قائم ہیں جس پر رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ واہل بیت تھے، یہانتک کہ فرقہ ناجیہ السنۃ والجماعۃ اور صحیح اعتقاد حق پر ہیں، یہ لوگ اصول یعنی عقائد کی ان باتوں میں متفق ہیں جن پر ایمان کا مدار ہے، اسی طرح فروع یعنی ثواب کے اعمال میں تمام ضروری باتوں پر بھی متفق ہیں، اور دوسرے اعمال ثواب جن میں اللہ تعالیٰ نے اجتہاد پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، اور ہر مجتہد کے لئے اس کا اجتہاد قبولیت اور ثواب کے اعتبار سے قبول فرمایا ہے ان میں مجتہدوں کے اجتہاد پر ہیں، یعنی کسی بھی ایک مجتہد کے اجتہاد پر عمل کرتا ہے مثلاً شافعیؒ ہے تو کیا نماز ایک کو دوسرے کے پیچھے اقتداء کر کے جماعت کرنا جائز ہے یا نہیں، تو ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ شیخ ابوالیسر نے فرمایا ہے کہ حنفی کی اقتداء شافعی کے پیچھے جائز نہیں ہے، کیونکہ مکحول نسفیؒ نے کتاب الشعاع میں لکھا ہے کہ رکوع اور قومہ کے وقت رفع یدین کرنا ایک عمل کثیر ہے، مفسد نماز ہے، لیکن ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ قول مختار کے مطابق یہ عمل کثیر نہیں ہے، اور صاحب ہدایہؒ نے قنوت فجر کے مسئلہ کی دلیل سے اقتداء کو جائز کہا ہے۔ الفتح۔

لیکن قاضی خان وغیرہ نے یہ شرط لگائی ہے کہ شافعی کے پیچھے حنفی کی اقتداء اسی صورت میں جائز ہوتی ہے جبکہ وہ اختلافی

صورتوں میں احتیاط کرتا ہو، مثلاً قبلہ کی جانب سے اپنا منہ موڑے ہوئے نہ ہو، اور فصد یا پچھنا لگانے کے بعد نیا وضوء کر لیا ہو، اور کپڑے پر لگی ہوئی منی کو پورے طور پر دھو چکا ہو، اور متعصب نہ ہو، اور اپنے ایمان میں شک کر کے یوں نہ کہتا ہو کہ میں انشاء اللہ مومن ہوں بلکہ یقین کے ساتھ مومن ہوں، شیخ السلام عینیؒ نے کہا ہے کہ ان شرطوں کا تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ بالکل حنفی ہو جائے تب اس کی اقتداء جائز ہو۔ع۔ اور یہ جو شرط لگائی ہے کہ متعصب نہ ہو تو تعصب کا انتہائی درجہ تو یہ ہے کہ وہ فاسق ہو، مگر فاسق کے پیچھے بھی تو نماز جائز ہے۔ عف۔ اور قبلہ سے رخ موڑنا تو خود شافعیؒ کا بھی مذہب نہیں ہے۔ مع۔ اور شافعیہ یقینی طور سے اہل السنہ میں داخل ہیں ان کے بارے میں ایمان میں شک کرنے والا کہنے کا کیا مطلب ہے۔م۔ یوں تو جو کوئی اپنے ایمان میں شک کرے، ان کے انشاء اللہ کہنے کا تو مطلب اس جملہ سے برکت حاصل کرنا ہوتا ہے، یا ایمان پر خاتمہ کی امید رکھنا ہوتا ہے۔ الفتح۔ اور عقائد میں یہ بات تحقیق کے ساتھ بتائی جا چکی ہے کہ ان میں اور ہم میں حقیقت میں کوئی اختلاف ہی نہیں ہے، صرف لفظی وہم ہے۔م۔

پھر محیط میں کہا ہے کہ وتر کی اقتداء میں یہ شرط ہے کہ شافعی امام تین رکعتوں کے پڑھنے میں فصل نہ کرے یعنی ایک ہی سلام سے پڑھے اور دو سلام سے نہ پڑھے، امام ابو بکر الرازیؒ نے کہا ہے کہ اگر وہ فصل کرے یعنی دو سلاموں سے نماز پڑھے جب بھی تو اقتداء جائز ہے، کیونکہ یہ مسئلہ ہے جس میں اجتہاد بھی کیا گیا ہے، جیسا کہ کسی ایسے امام کی اقتداء کر لے جس کے اجتہاد میں نکسیر سے وضوء نہیں ٹوٹتا ہے اس لئے اس امام نے فصد لینے کے بعد دوسرا تازہ وضوء نہیں کیا تو اس کی اقتداء جائز ہے، کیونکہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے لہٰذا اس شخص کے حق میں طہارت باقی ہے، اور اکثر مشائخ نے کہا ہے کہ نکسیر اور پچھنے کی صورت میں اقتداء جائز نہیں ہے۔ مفع۔ اور شیخ الاسلام خواہر زادہؒ نے کہا ہے کہ ان صورتوں میں ناجائز ہونے کا حکم اسی وقت ہوگا جب کہ ان باتوں کے ہونے کا اس حنفی مقتدی کو علم یقینی حاصل ہو، یہانتک کہ اگر اسے پچھنے لگاتے دیکھا گیا اس کے بعد وہ نظر سے غائب ہو گیا، اور اتنی دیر غائب رہا کہ اگر وضوء کرنا چاہتا تو کر لیتا تو ایسی صورت میں صحیح بات یہی ہے کہ اس کی اقتداء جائز ہے۔ الفتح۔ یہی قول اصح ہے۔ع۔

اور اگر یہ صورت ہوئی کہ حنفی نے کسی شافعی شخص کو اپنا آلہ تناسل چھوتے یا عورت کو ہاتھ لگاتے دیکھا جس سے اس کے نزدیک وضوء ٹوٹ جاتا ہے، اس کے بعد نیا وضوء کئے بغیر وہ شافعی امام بنا تو حنفی کے لئے اکثر مشائخ کے نزدیک اس کی اقتداء جائز ہے، کیونکہ مقتدی کی رائے میں اس کا وضوء باقی ہے، اور یہی قول اصح ہے، اور فقیہ ابو جعفر ہندوانی اور ایک جماعت کے نزدیک مذہب مختار یہ ہے کہ جائز نہیں ہے، کیونکہ امام کے اعتقاد کے مطابق امام بے وضوء ہے، اور ہمارے استاد شیخ سراج الدینؒ تو امام ابو بکر الرازیؒ کے قول کا اعتقاد رکھتے تھے۔ الفتح۔ یعنی بہر حال اقتداء جائز ہے۔م۔ بلکہ ایک مرتبہ کہا کہ مقتدی کی رائے کے معتبر ہونے کی متقدمین میں سے کسی کی روایت نہیں ہے، میں نے اس کے جواب میں یہ مسئلہ یاد دلایا کہ اندھیری رات میں تحری کر کے نماز پڑھنے والے کے لئے اپنی ہی رائے پر عمل کرنے کا حکم شرعی ہے، چنانچہ اگر نماز کی حالت میں مقتدی کو امام کے الٹے رخ پر ہونا معلوم ہو جائے تو اس مقتدی کی نماز فاسد ہو جائے گی۔ الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ تحری قبلہ کے مسئلہ سے یہ مسئلہ نکالا گیا ہے کہ مقتدی کی رائے کا اعتبار ہے، اس لئے خلاصہ کلام یہ ہوا کہ جمہور متاخرین حنفیہ کے نزدیک حنفی کی اقتداء شافعی، مالکی اور حنبلی کے پیچھے اسی وقت جائز ہوگی جبکہ مقتدی کی رائے میں امام میں ایسی بات نہیں پائی جا رہی ہو جس سے نماز فاسد ہوتی ہو، مثلاً امام شافعیؒ وغیرہ کے نزدیک خون نکل آنے سے وضوء نہیں ٹوٹتا ہے اس لئے اگر شافعی المذہب امام نے نیا وضوء نہیں کیا تو حنفی کے لئے اس کی اقتداء جائز نہ ہوگی، اور امام ابو بکر الرازیؒ وغیرہ کے نزدیک جائز ہے، اسی قول کو شیخ سراج الدین قاری الہدایہ استاد ابن الہمام نے اختیار کیا ہے، اور علماء شافعیہ میں سے متقدمین وغیرہم کا بھی یہی قول ہے، چنانچہ عینیؒ نے مختصر المزنیؒ سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ اصول اعتقاد میں متفق اور فروع عملیات میں

مختلف ہیں ان کے پیچھے اقتداء کرنا بلا کراہت جائز ہے، مغنی حنبلیہ میں اس کے ساتھ یہ بھی شرط لگائی ہے کہ وہ کسی رکن کو ترک بھی نہ کرتا ہو۔

اور میں مترجم کہتا ہوں کہ ہمارے متقدمین کے قول سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے، چنانچہ مصنفؒ نے جو یہ مسئلہ ذکر کیا ہے کہ اگر امام فجر کی نماز میں قنوت پڑھے تو مقتدی خاموشی اختیار کرلے، اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوئی کہ اقتداء جائز ہے، اور قاضی خانؒ نے جتنی شرطیں لگائی ہیں ان میں سے کسی شرط کی بھی قید نہیں لگائی ہے کیونکہ ان تمام شرطوں کا تو مطلب یہ ہوا کہ وہ امام پہلے حنفی ہو جائے تب اس کی اقتداء جائز ہو گی، اس لئے حق وانصاف کی بات یہ ہے کہ اقتداء مطلقاً جائز ہے، اب اختلاف جو کچھ ہو گا وہ صرف اجتہادی مسئلہ میں ہو گا کیونکہ ہم نے تو لوگوں کا متفق علیہ اور اجماع بتایا ہے کہ شافعی مالکیہ اور حنبلی بلکہ تمام اہل حدیث مثلاً امام بخاری وغیرہ وابن جریر وطبرانی حتی کہ علماء ظاہر یہ سب اہل السنۃ والجماعۃ میں داخل اور برحق ہیں، اور یہ سب کے سب قرآن اور احادیث اہل السنۃ کو اپنی دلیل بناتے ہیں اور عقائد حقہ کے ساتھ ہیں، پھر ان ہی اصول سے اجتہاد کرتے ہوئے کوئی ایک حکم پر پہونچا اور دوسرے کا اجتہاد دوسرے حکم پر ہوا، اور دونوں ہی کا اجتہاد اپنی اپنی جگہ مقبول اور سب کے لئے اجر وثواب کا من اللہ وعدہ بھی ہے اس وقت تک کے لئے جب تک کہ ان کا اعتقاد برحق اور وہ سنت کی اتباع کرنے والے ہوں، لیکن اجتہادی مسائل تو ظنی ہیں اس بناء پر بالاجماع کسی بھی مجتہد کے متعلق قطعی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا ہے کہ دوسرے حضرات غلطی پر ہیں ایسا دعویٰ تو کسی نے بھی نہیں کیا ہے، کہ دوسرے سارے اجتہادی مسائل غلط اور مذہب شافعی مثلاً غلط باطل اور گمراہ ہے، بلکہ بالاجماع یہ سارے مذاہب برحق ہیں اور ہر ایک میں اجتہادی غلطی ہونے کا احتمال ہے، چنانچہ جس طرح شافعیؒ کے اجتہادات ہیں اسی طرح حنفی کے بھی اجتہادات ہیں، صرف تقلید کے لئے اتنا کہا گیا ہے کہ اپنے گمان کو ایک طرف رکھنے سے قوت اور مضبوطی حاصل ہوتی ہے، اس بناء پر یہ مسئلہ بالکل صاف ظاہر ہو گیا کہ وضوء میں خون نکلنے سے وضوء کے نہ ٹوٹنے کا بھی احتمال ہو سکتا ہے، اور یہ بھی احتمال ہو گیا کہ یہی اجتہاد صحیح ہو، یہاںتک کہ جس شخص نے اس کو اختیار کرلیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ صحیح ہونے کا احتمال رکھتا ہے، اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول اور مستحق ثواب ہے۔

الحاصل بندگی اور عبودیت کا مدار یہ ہوا کہ جس نے اپنے واسطے جو اختیار کیا وہی اس کے حق میں شریعت اور مذہب ہے، یہاںتک کہ اگر کسی حنفی نے سردی کے سبب سے خون نکل آنے کے باوجود وضوء نہیں کیا اور امام شافعیؒ کے اجتہاد کو بہانہ بنایا کہ یہ تو صحیح ہے تو یقیناً وہ شخص گنہگار ہے اور جیسا کہ امام شافعی کے نزدیک وضوء میں نیت کرنی فرض ہے تو کسی شافعی نے سردی کی زیادتی کی وجہ سے مستقلاً وضوء نہ کر کے یہ بہانہ بنالیا کہ غسل کرنے میں تو اعضاء وضوء پر پانی پہونچ گیا اور ایسی حالت میں امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وضوء ادا ہو جاتا ہے مستقلاً وضوء کی ضرورت نہیں ہوتی ہے اس نے بھی نیت کے ساتھ وضوء نہیں کیا تو وہ گنہگار ہو گا، لیکن اگر کوئی حنفی بغیر نیت وضوء اور بے ترتیبی کے ساتھ وضوء کر کے نماز میں حاضر ہو گیا تو اس کے متعلق بالاتفاق یہی کہا جائے گا کہ وہ ایسی طہارت کے ساتھ اللہ کے دربار میں حاضر ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے قبول کرنے کا فرشتوں کو حکم عام دے دیا ہے، یعنی اجتہاد کے مطابق عمل کرنے کی وجہ سے اسے ثواب ہے، اور اگر کسی شافعی نے وضوء کیا تھا اور خون نکل آیا اور وہ نیا وضوء کئے بغیر مسجد میں حاضر ہوا تو اس کے متعلق بالاتفاق یہی کہا جائے گا کہ وہ ایسی طہارت کے ساتھ حاضر ہوا ہے جو مقبول ہو گی، پس دونوں آدمی نماز میں حاضر ہیں، اور ہر ایک کے بارے میں یہی کہا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کی طہارت قبول کرلی ہے، یہاںتک کہ اس کی نماز اسی طہارت سے مقبول ہو گی، اور جزئی اور فردعی اعمال میں تو یہی مقصود بھی ہے، بس جبکہ ہر ایک کی نماز اپنی جگہ صحیح ہو تو اس کے پیچھے نماز بھی یقیناً صحیح ہو گی، امام ابو بکر الرازیؒ کا یہی قول ہے۔

معترضین نے اس جگہ یہ اعتراض پیدا کیا ہے کہ ہر ایک کی رائے میں دوسرے کی طہارت صحیح نہیں ہے، تو اس کی رائے کا اعتبار ہو گا، لہذا کسی کی بھی اقتداء صحیح نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ محض مغالطہ کی بات ہے، صحیح بات یہ ہے کہ ہر ایک کے

نزدیک دوسرے کی طہارت اس کے اپنے حق میں صحیح نہیں ہے لیکن دوسرے کے حق میں تو صحیح ہے کیونکہ پہلے ہی یہ بات کہی جاچکی ہے کہ مثلاً حنفی شافعیؒ کے اجتہاد کو غلط نہیں جانتا ہے بلکہ یقینی طور سے وہ یہ جانتا ہے کہ یہ اجتہاد بھی اللہ تعالی کے نزدیک مقبول اور اس پر ثواب کا وعدہ ہے، اور اپنے بارے میں عبودیت کے خلاف ہونے سے طہارت نہیں جانتا ہے، تو مقتدی کی رائے اپنی بارے میں ہے، دوسرے کسی کے بارے میں نہیں ہے، اور جب وہ دوسرے کو مقبول طہارت پر دوسرے کے موافق جانتا ہے تو اس سے کچھ خرابی نہ ہوئی، اس کے علاوہ جب بالاتفاق دوسرا شخص اللہ تعالی کے نزدیک مقبول طہارت پر ہے اور اس کی نماز صحیح ہے تو خود بیچارے کے نہ سمجھنے سے کیا خرابی لازم آتی ہے، بلکہ یہ تو عجب خبط و خرابی ہے کہ دوسرے کو اجتہادی طہارت پر جو مقبول ہوا کرتی ہے جانتا ہے پھر یہ بھی کہتا ہے کہ وہ شخص بغیر طہارت کے ہے یعنی ناپاک ہے، اس کے علاوہ اس نے کس طرح یہ گمان کرلیا کہ دوسرا بغیر طہارت ہے، کیونکہ آج تک کسی کا مذہب یہ نہیں ہے کہ دوسرے کا اجتہاد ہمیشہ غلط ہوتا ہے تو اس نے کس طرح یہ یقین کرلیا کہ جس اجتہاد پر دوسرے کی طہارت ہے وہ غلط ہے، حد یہ ہے کہ اپنے اجتہاد کو قوی گمان سے تو صحیح جانے لیکن دوسرے کے اجتہاد کو اپنے ضعیف گمان سے صحیح جانے، لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہونے میں تو دونوں کو قطعی برابر تسلیم کرے گا، اور جمہور کو جو یہ اشتباہ ہوا ہے کہ مقتدی کی رائے اس کے حق میں معتبر ہے اور ابن الہمامؒ نے اس کو اندھیری رات میں قبلہ کے واسطے تحری کر کے اپنی اپنی تحری کی جانب اس کے بغیر کے امام کا رخ معلوم ہو نماز پڑھے تو جائز ہے۔

اور اگر امام کا رخ مقتدی کے خلاف ہونا معلوم ہو تو جائز نہیں ہے، اس مسئلہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ مقتدی کی رائے کا اعتبار ہوتا ہے، تو اس میں خلل ہے، یہ کہ قبلہ تو ہر شخص کے واسطے یقینی اور تحقیقی ہے اور وہ کوئی اجتہادی جہت نہیں ہے، اسی لئے تو قبلہ کسی مجتہد کی صورت میں قبلہ عین جہت تحری ہے، اس لئے مقتدی کے حق میں امام قبلہ سے دوسرے رخ پر ہے، پس خلاصہ یہ ہوا کہ مقتدی کی رائے کا ایسی صورت میں اعتبار ہوا جو اجتہادی نہیں ہے اور تم ایسی صورت اختیار کرتے ہو جو اجتہادی ہے دونوں صورتوں میں بہت فرق ہوا کہاں یہ اور کہاں وہ، اس کا کچھ اعتبار نہیں، پس حق بات وہی ہے جو شیخ سراج الدینؒ نے کہی ہے کہ اس مسئلہ میں متقدمین سے کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ مقتدی کی رائے کا اعتبار ہے۔

پس یہ بات صحیح ہوئی کہ ہر حالت میں اجتہادی مسائل میں کسی بھی شرط کے بغیر ہی اقتداء جائز ہے، جبکہ کوئی رکن فوت نہ ہو، اور جائز نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے جبکہ خود صحابہ کرامؓ میں ایک کے نزدیک خون کے نکلنے سے وضوء ٹوٹتا ہے تو دوسرے کے نزدیک نہیں ٹوٹتا ہے اسی اجتہاد کی بناء پر جو وہ کرتے تھے، اس کے باوجود ان میں سے کسی نے بھی یہ خیال تک نہیں کیا کہ فلاں کے پیچھے نماز صحیح ہوتی ہے اور فلاں کے پیچھے صحیح نہیں ہوتی ہے، اور اس طرح جماعت میں انتشار پھیلا کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہو، حالانکہ اصلی مجتہد تو وہی تھے، اور یہاں تو مجتہدوں میں اتنی شرائط ہیں، اور یہ بات کس طرح جائز ہوگی کہ اہل السنۃ والجماعۃ سے ہوتے ہوئے جماعت سے کناہ کش ہو جائیں، بالخصوص ایک رکن عظیم میں جو نماز ہے، اور یہ کس طرح ممکن ہے کہ مثلاً حضرت غوث اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ جو بالاتفاق حنبلی مذہب تھے کوئی حنفی ان کے ساتھ مسجد میں کھڑا ہو کر یہ کہدے کہ میری رائے میں اس امام کی نماز فاسد ہے، اس لئے ان کے پیچھے میرا اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے، اور اس میں بھی کچھ شک نہیں ہے کہ مومنوں کے درمیان الفت کا ہونا ان کے ایک بڑے رکن یعنی نماز میں ہے، کیا کوئی یہ نہیں دیکھتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نماز کے لئے صف بندی کراتے تو ان کے کندھے ملانے کو فرماتے اور ان کے درمیان شگاف اور خلا رکھنے کو سختی کے ساتھ منع فرماتے، اور دھمکی دیتے کہ خلا رہنے سے تمہارے دلوں میں پھوٹ ڈال دی جائے گی، پس جب لوگ نماز کے بارے میں اتنے اختلافات رکھیں گے تو جماعت کس طرح قائم ہوگی، اور جس کسی نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ مختلف الخیال لوگوں کا مل کر ایک ساتھ جماعت کرنی جائز نہیں ہے، تو گویا اس نے یہی فتویٰ دیا مومنوں کے درمیان آپس میں اختلاف پیدا ہوا اور بڑھتا رہے، جبکہ یہ قطعاً حرام ہے، اور مسلمانوں کا آپس میں متفق رہنا فرض ہے، اسی بناء پر بندہ مترجم نے اس مقام پر کافی بحث کی ہے، اور اپنے کلام کو طول دیا ہے، واللہ

تعالی ہو الموافق للصواب۔ ومنہ الہدایہ والرشاد۔ م۔
حنفی کا ایسے شخص کے پیچھے اقتداء کرنا جائز ہے جو وتر کو سنت جانتا ہو، کیونکہ وتر کا واجب ہونا قوی نہیں ہے بلکہ قول ضعیف ہے، اس مسئلہ کو مختصر البحر المحیط میں ذکر کیا ہے، عینی میں ایسا ہی ہے، اس میں یہ اشکال ہے کہ تجنیس وغیرہ میں ذکر کیا ہے کہ فرض نفل کی نیت سے ادا نہیں ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی نے برسہابرس پانچوں نمازیں پڑھتا رہا مگر اسے یہ بھی خبر ہو کہ ان میں کچھ فرض بھی ہیں اور کچھ نفل بھی ہیں مگر یہ خبر نہ ہو کہ ان میں کون فرض ہے اور کون سی نفل ہے تو اس کی نماز بالکل نہیں ادا ہوئی، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اوقات اور نمازوں کی تعیین ضروری ہے، اس مسئلہ کے مطابق حنفی کی وتر نماز ادا نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ اس کی نیت یا تو مطلق ہے یا نفل کی نیت ہے، اور جب مقتدی کی رائے کا اعتبار ہو تو اس کے خیال میں امام وتر ہی میں نہیں ہے، اس لئے نماز جائز نہیں ہونی چاہئے، اور یہ بات صاف ظاہر ہے۔ مختصر الفتح۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ اقتداء کے جائز ہونے پر تو اتفاق ہے، پس دونوں باتوں میں سے ایک بات پر بحث کی جائے، یا تو فرض کے لئے نیت کی تعیین ضروری نہیں ہے، مگر یہ تو امام ابو حنیفہؒ سے مروی ہے، پس دوسری بات یعنی یہ کہ مقتدی کی رائے کا اعتبار ہے، تو یہ قابل تسلیم نہیں ہے اور نہ اس میں امام اعظم صاحبؒ اور متقدمین سے کوئی تصریح آئی ہے، جیسا کہ بندہ مترجم نے اوپر اس کی تحقیق کر دی ہے، تو جواز کی وجہ اب یہ ہے کہ وتر ایسا مسئلہ ہے جس میں مختلف پہلوؤں سے علماء نے اختلاف کیا ہے، جو شخص اسے سنت جانتا ہے وہ بھی اجتہاد سے وجوب ثابت ہو جانے کو سخت یا برا نہیں جانتا ہے، اس لئے اگر کوئی وتر میں وجوب کی نیت کرے تو بالکل یقین کے ساتھ یہ نیت نہیں کرے گا، کیونکہ وہ یہ جانتا ہے کہ اجتہاد سے سنت کا حکم ہونا بھی ممکن ہے لہذا وہ سنت کو بالکل غلط نہیں جانے گا، اسی طرح اگر امام وتر میں سنت کی نیت کرے تو یہ نیت بھی بالکل یقین کے ساتھ نہیں کرے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اجتہاد سے وجوب کا حکم ہونا بھی ممکن ہے، اس طرح یہ بات صاف طور سے معلوم ہو گئی کہ امام و مقتدی میں سے کسی کی نیت دوسرے کے مخالف نہیں ہے، صرف ایک جانب قوت میں کچھ زیادتی اور دوسری جانب میں کچھ کمی ہے، یعنی امام کے اعتقاد میں سنت اور وجوب دونوں میں سے ایک یعنی سنت کا رجحان ہے اس کے واجب ہونے کے گمان کے ساتھ، اور مقتدی کو وجوب کی طرف رجحان ہے اس کے سنت گمان ہونے کے ساتھ، اس طرح دونوں میں اتحاد پایا گیا، اسی وجہ سے ایسی اقتداء جائز ہے، بخلاف ظہر کا فرض ادا کرنے والے کے کہ اس کے لئے نفل پڑھنے والے امام کی اقتداء کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ متقدمین فقہاء سے تصریحاً منقول ہے کیونکہ یہ مسئلہ اجتہاد سے ثابت نہیں ہوا ہے کہ ظنی ہو بلکہ مقتدی کو مکمل یقین کے ساتھ اپنا فرض ادا کرنا ہے، اور امام کو بھی یقین کے ساتھ نفل نماز پڑھنی ہے اسی لئے اس صورت میں اقتداء صحیح نہیں ہوگی۔ اچھی طرح یاد رکھیں۔ م۔ پھر قول صحیح یہ ہے کہ امام کی طرح مقتدی بھی قنوت پڑھے، قاضی خان۔ البتہ بلند آواز سے یا پست آواز سے کس طرح پڑھنی چاہئے تو اس کا جواب ظاہر الروایۃ میں مذکور نہیں ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک امام جہر کرے اور مقتدی کو اختیار ہے کہ چاہے آمین کہے یا زور سے یا آہستہ سے پڑھتا رہے، اور شیخ ابو بکر محمد بن الفضل نے کہا ہے کہ دونوں ہی آہستہ پڑھیں ۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ جب امام بلند آواز سے پڑھے تو صحیح حدیث کے مطابق مقتدیوں کو آمین ہی کہنا چاہئے تھا، بالخصوص اس وجہ سے کہ قنوت کو قرآن کریم کے مشابہ کہتے ہیں، اور جب امام نے آہستہ پڑھا تو مقتدی بھی لامحالہ آہستہ پڑھے۔ م۔ ہاتھ باندھے رہے اور دعاء کی طرح ہاتھوں کو نہ اٹھائے، مبسوط میں اسی قول کو اصح کہا ہے۔ مع۔ پھر ظہیریہ میں کہا ہے کہ ہمارے مشائخ کے نزدیک مختار مذہب یہ ہے کہ درود نہیں پڑھے۔ ھ۔ بعضوں نے پڑھنے کو بھی کہا ہے، اور ابو اللیث کا قول مختار یہی ہے۔ المحیط۔ م۔ ہم نے نسائی کی روایت سے ایک حدیث میں حضرت حسنؓ کی قنوت کے آخر میں بالتصریح درود کو ذکر کیا ہے۔ م۔ ابن

الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے منہ نہیں موڑنا چاہئے۔ الفتح۔ اسی بناء پر بحر الرائق میں کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ دینا چاہئے۔ م۔
حضرت ابن عمرؓ جب وتر کے بعد بھی نماز پڑھنا چاہتے تو اس میں مزید ایک رکعت ملا کر وتر کو باقی نہ رکھتے، اور حسب خواہش نماز پڑھتے رہتے پھر جب اس سے فراغت حاصل کرتے تو وتر پر اپنی نماز وتر سے ہی ختم کرتے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ رات کی نماز کو وتر پر ختم کرو۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت ابن عمرؓ کا عمل جامع ترمذی وغیرہ کی مرفوع حدیث کے موافق ہے۔ م۔ جمہور کے نزدیک وتر کی نماز نہیں ٹوٹتی ہے۔ ع۔ کیونکہ کوئی نفل نماز ایک رکعت یا تین رکعتوں کی نہیں ہوتی ہے، اور ایک رات میں دو وتر نہیں پڑھی جاتی ہے۔ الفتح۔ جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں ہے، اور ترمذی نے اپنی اس روایت کو حسن بھی کہا ہے، لیکن مختلف حدیثوں میں توفیق دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ صرف ایک رکعت کو جائز نہیں کہا جائے، البتہ اگر وتر کے آخر میں صرف ایک رکعت اور ملالی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے، لیکن یہ بات ضروری ہے کہ وتر پڑھتے ہی صرف سو جائے اور بات چیت اور کوئی کام وغیرہ ایسا نہ کیا ہو جس سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، مگر حنفیہ کے قواعد اور اصول کے یہ خلاف ہے، جتنے صحابہ کرام رات کی ابتداء میں ہی وتر کی نماز پڑھ لیتے تھے تو ان کا مقصد اس بات پر احتیاط ہو کہ وہ آخر شب میں بیدار ہونے پر یقین نہیں رکھتے تھے ایسا نہ ہو کہ ساری رات نیند میں گذر جائے اور وتر چھوٹ جائے یہانتک کہ صبح ہو جائے، اس موقع کی مکمل بحث بہت طویل ہو سکتی ہے، فی الحال ترک کی جاتی ہے۔ م۔
ابو علی النسفیؒ کے نزدیک رمضان میں وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنی افضل ہے، اور دوسروں کے نزدیک گھر میں افضل ہے۔ ع۔ حضرت ابی بن کعبؓ کے عمل سے یہی حاصل ہوتا ہے۔ م۔ رمضان کے علاوہ بھی وتر کی جماعت جائز ہے۔ الذخیرہ۔ مکروہ ہے۔ القدوری۔ جماعت نہ کرے۔ المبسوط۔ اگر کسی نے غلطی سے پہلی یا دوسری رکعت میں قنوت پڑھ لی تو تیسری رکعت میں نہیں پڑھنی چاہئے۔ الذخیرہ۔ قنوت پڑھتے ہوئے **اذا السماء انشقت** پڑھنے کی مقدار کھڑا ہونا چاہئے۔ المحیط۔ فع۔ صحیح حدیث ہے **افضل الصلوة طول القنوت**۔ بمعنی قیام۔ یعنی بہتر نماز وہ ہے جس میں دیر تک قیام ہو، بعضوں نے سجدوں کی زیادتی کو افضل کہا ہے کیونکہ بندہ کو رب عزوجل سے سب سے زیادہ قربت سجدہ کی حالت میں ہوتی ہے، جیسا کہ صحیح حدیث میں موجود ہے، اور اول اصح ہے۔ واللہ اعلم۔

باب النوافل

السنة ركعتان قبل الفجر و اربع قبل الظهر و بعدها ركعتان و اربع قبل العصر و ان شاء ركعتين و ركعتان بعد المغرب و اربع قبل العشاء و اربع بعدها وان شاء ركعتين.

ترجمہ:- نفل نمازوں کا بیان:- سنت نماز دو رکعت ہے فجر سے پہلے اور چار رکعت ظہر سے پہلے اور ظہر کے بعد دو رکعتیں، اور چار رکعتیں عصر سے پہلے اور اگر چاہے تو دو ہی رکعتیں، اور دو رکعتیں مغرب کے بعد، اور چار رکعتیں عشاء سے پہلے اور چار رکعتیں اس کے بعد، اور اگر چاہے تو دو ہی رکعتیں۔

توضیح:- باب نوافل نماز کا، سنت مؤکدہ، سنت فجر سے پہلے، ظہر سے پہلے
ظہر کے بعد، عصر کے پہلے، مغرب کے بعد، عشاء سے پہلے، عشاء کے بعد

باب النوافل...... الخ

. باب نفل نمازوں کے بیان میں نفل سے مراد ہر وہ نماز ہے جو فرائض سے زائد ہو، اس بناء پر نفل میں وتر اور سنت نمازیں سب کی سب شامل تھیں، مگر چونکہ وتر ایک قول کے مطابق واجب ہے یا فرض عملی ہے اس لئے اسے پہلے بیان کر دیا گیا ہے، پھر اس جگہ سنن کو اس لئے مقدم کیا ہے کہ ان میں مؤکدات بھی داخل ہیں جو واجب کے قریب ہوتی ہیں، سنت سے مراد وہ عمل ہے

جسے رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ کیا مگر کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیا ہو۔ فع۔ اگر کسی نے کسی بھی سنت کے ساتھ حقارت کا اظہار کیا تو وہ کافر ہو گا، اگر سنت کی کوئی تعظیم تو کرتا ہو مگر بلا عذر اسے چھوڑ بھی دیتا ہو تو قول صحیح کے مطابق گنہگار ہو گا۔ محیط السرخسی۔ ع۔

لیکن اس قول پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ واجب کے ترک ہونے پر انسان گنہگار ہوتا ہے، اور حدیث صحیح میں ہے کہ جس اعرابی نے کہا تھا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو رسول برحق بنا کر بھیجا ہے کہ میں ان فرائض میں نہ زیادتی کروں گا اور نہ اس میں کمی کروں گا، تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا افلح ان صدق یعنی یہ اگر اپنی بات میں سچا ہے تو وہ کامیاب ہو گیا۔ ف۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درست ہے کہ صرف سنت کے ترک کرنے پر گناہ نہیں ہے لیکن فرائض کا حق ادا کرنے میں جو قصور ہو گا اس کو پورا کرنے کے لئے جو سنتیں ادا کی جاتی ہیں ان سے قصور کی تلافی کی جائے گی، جیسا کہ ایک حدیث سے ثابت ہے اور اگر سنن نہیں ہوں گی تو عذاب ہو گا۔ م۔ فقہاء نے کہا ہے کہ اگر کسی ملک کا کوئی عالم ایسا ہو کہ اسی کے فتویٰ پر عمل ہوتا ہو تو اس مجبوری کی بناء پر فجر کی سنت کے علاوہ دوسری سنتوں کو چھوڑ دینا اور نہ پڑھنا جائز ہے۔ النہایہ۔ ع۔ ف۔

ہمارے نزدیک وہ تمام سنتیں جو فرائض کے ساتھ ادا کی جاتی ہیں وہ بائیس ہیں، ان میں سے موکدہ ۱۲ ہیں ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مصنفؒ نے کہا ہے، السنۃ یعنی سنت مؤکدہ وغیر مؤکدہ مستحبہ یہ ہیں رکعتان قبل الفجر فجر کی فرض نماز سے پہلے دو رکعتیں ہیں۔ ف۔ جو صبح صادق کے بعد پڑھی جائیں گی، اور بالاتفاق یہ سب سے افضل ہیں، یہانتک کہ فتاویٰ المرغینانی میں امام اعظمؒ سے اس کے متعلق واجب کی بھی روایت کی گئی ہے۔ ع۔ یہانتک کہ حسنؒ نے ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ اگر کوئی شخص بلا عذر ان رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھے گا تو نماز جائز نہ ہو گی، اگر کوئی عالم اس قدر مشغول ہو کہ پورے علاقے کے فتووں کا جواب وہی دیتا ہو تو اس کو تمام سنتوں کو چھوڑ دینا جائز ہے سوائے فجر کی ان سنتوں کے۔ فع۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ یہ سنت واجب کے قریب ہے۔ المنافع۔ اسی طرح بلا عذر سواری پر اسے پڑھنا اصح قول میں جائز نہیں ہے۔ ت۔ د۔

رسول اللہ ﷺ نے ان رکعتوں کو حضر و سفر، سراً اور علانیۃ کبھی بھی نہیں چھوڑا ہے، جیسا کہ صحیحین اور ان کے علاوہ دوسری کتابوں میں بھی حضرت علیؓ سے مروی ہے، اور رسول اللہ ﷺ ان دو رکعتوں سے بڑھ کر کسی دوسری نفل کی نگہداشت نہیں فرماتے تھے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے صحیحین اور دوسری احادیث میں مذکور ہے، اور فرمایا ہے کہ اگرچہ تم کو سواریوں کے گھوڑے روند ڈالیں تم ان کو پڑھنا نہ چھوڑو، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے ابوداؤد میں مروی ہے، یہ رکعتیں دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بہتر ہیں۔ النسائی۔ اگر کسی نے رات کا گمان کرتے ہوئے دو رکعتیں پڑھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صبح صادق ہو چکی ہے تو اس سلسلہ میں اگرچہ متقدمین فقہاء سے کوئی قول منقول نہیں ہے لیکن متاخرین نے کہا ہے کہ وہ رکعتیں فجر کی سنت کے قائم مقام ہو جائینگی۔ الحیط۔ ھ۔ فع۔ اور اصح یہ ہے کہ قائم مقام نہ ہوں گی۔ التجنیس۔ د۔ بندہ مترجم کے نزدیک قول اول اظہر ہے، اور قول دوم میں احتیاط کا پہلو زیادہ ہے، لیکن طلوع فجر کے بعد دو رکعت سنت فجر سے زیادہ پڑھنی مکروہ ہے، اس بناء پر قول اول ہی اصح ہونا چاہئے، اسی لئے فتح القدیر اور عینی نے اسی قول کو قائم رکھا ہے۔ م۔

ان رکعتوں میں مسنون قراءت مختصر پڑھنا ہے اس دلیل سے کہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہؓ سے جتنے اقوال منقول ہیں ان میں ہے کہ نماز صبح کی اذان و اقامت کے درمیان فجر صادق کے ظاہر ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ دو مختصر رکعتیں پڑھتے تھے، یہانتک کہ میرے دل میں یہ بات آتی کہ شاید آپ نے سورہ فاتحہ نہیں پڑھی، اس کے بعد اگر میں جاگتی ہوتی تو مجھ سے باتیں کرتے ورنہ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے، یہانتک کہ نماز کے لئے اقامت کی جاتی۔ الصحیحین وغیرھما۔

ان میں جو قراءت آپ فرماتے تھے ان میں سے اکثر پہلی رکعت میں ﴿قُولُوا آمَنَّا بِاللهِ وَ مَا اُنزِلَ اِلَيْنَا﴾ پوری آیت اور دوسری رکعت میں ﴿قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا﴾ پوری آیت پڑھتے تھے جس کا ثبوت مسلم کی وہ روایت ہے جو ابن عباسؓ سے مروی ہے ﴿رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا اَنزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ﴾ اور دوسری رکعت میں بحوالہ حدیث ابو ہریرہؓ

جو ابوداؤد میں ہے، یا پہلی رکعت میں ﴿قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْن﴾ اور دوسری میں قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ بحوالہ حدیث ابوہریرہؓ جو مسلم میں ہے اور حدیث ابن مسعودؓ جو ترمذی اور نسائی میں ہے، خلاصہ میں یہی اقوال لکھے ہیں۔ ھ۔ اور یہ فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی شخص سنت فجر پڑھ لے تو دائیں کروٹ پر لیٹ جائے، اس کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے ابوہریرہؓ سے کی ہے، حضرت ام المومنینؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ سنت اور فرض کے درمیان اچھی باتیں کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عمل سنت ہے، مگر عوام کو باتیں کرنے سے منع کرنا ہی بہتر ہے۔ واللہ اعلم۔ م۔

فجر کی سنت اول وقت اور گھر میں پڑھنی چاہئے، اگر صبح صادق ہونے کے بعد کسی نے دو رکعتیں دو مرتبہ پڑھیں تو عمل مکروہ ہوگا مگر فجر کی سنت آخری نماز مانی جائے گی، جب کوئی سنت وقت پر ادا نہ کی جاسکے تو اس کی قضاء نہیں کی جاتی ہے سوائے فجر کی سنت کے کہ جب فرض کے ساتھ قضاء ہوں تو آفتاب نکلنے کے بعد زوال تک فرض کے ساتھ قضاء کی جائے، اس کے بعد فرض کی قضاء تو واجب ہے لیکن سنت ساقط ہو جائے گی۔ محیط السرخسی۔ یہی قول صحیح ہے۔ البحر۔ اور اگر فرض کے بغیر قضاء ہوں تو شیخین کے نزدیک ان کی قضاء نہیں ہے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک قضاء ہے۔ محیط السرخسی۔ حضرت قیسؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے اور نماز قائم کی تو میں نے آپ کے ساتھ فجر کی فرض نماز پڑھ لی، پھر جب آپ لوٹے تو بھی مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا اے قیس! کیا ایک ساتھ دو نمازیں پڑھنی چاہتے ہو، میں نے عرض کیا کہ میں اس سے پہلے فجر کی دو سنتیں نہیں پڑھی تھیں وہ اب پڑھنی چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ اب کچھ مضائقہ نہیں ہے، یہی صحیح معنی ہے۔ م۔

حضرت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے فجر کی دونوں رکعتیں نہ پڑھی ہوں وہ انہیں طلوع آفتاب کے بعد پڑھ لے، ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، امام مالکؒ نے ایک حدیث روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ سے فجر کی دونوں رکعتیں قضاء ہو گئیں تو انہوں نے آفتاب نکل جانے کے بعد انہیں ادا کرلی، ایک صحیح حدیث ہے کہ جب کسی نماز کی اقامت کہی جائے تو پھر سوائے فرض کے کوئی نماز نہیں ہے۔ بخاری۔ عرض کیا گیا کہ یارسول اللہ ﷺ فجر کی دو رکعت سنت بھی نہیں، فرمایا دو رکعت سنت بھی نہیں، اس کی روایت اسناد حسن کے ساتھ ابن عدی نے کی ہے، اس کے برخلاف کسی نے اتنا اور بھی بڑھایا الا رکعتی الفجر مگر فجر کی دو رکعتیں، یعنی فجر کی اقامت کے وقت دو رکعت سنت جائز ہے، لیکن بیہقیؒ نے کہا ہے کہ اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے، اسے شیخ الاسلام اللہ حنفی نے شرح موطا میں اور قسطلانی نے شرح بخاری میں لکھا ہے، اور اس جملہ کو موضوعات میں داخل کیا ہے۔ م۔

عبداللہ بن مالک بن بحینہؓ سے روایت ہے کہ نماز کی جب اقامت کہی جارہی تھی اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دو رکعتیں پڑھتے ہوئے دیکھ کر فرمایا کہ کیا صبح کی چار رکعتیں پڑھو گے، بخاری، مسلم اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، عبداللہ بن سرجسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے مسجد میں داخل ہو کر ایک کونہ میں دو رکعتیں پڑھیں پھر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں شامل ہوگیا، رسول اللہ ﷺ نے سلام پھیر کر فرمایا اے فلاں! تم نے دونوں نمازوں میں سے کس نماز کا اعتبار کیا ہے یعنی اپنی تنہا پڑھی ہوئی یا وہ جو میرے ساتھ پڑھی ہے، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے۔

ابو سلمہؓ سے روایت ہے کہ کچھ لوگ اقامت سن کر بھی کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے، اتنے میں رسول اللہ ﷺ باہر تشریف لائے تو انہیں دیکھ کر فرمایا کیا ایک ساتھ ہی دو نمازیں، کیا ایک ساتھ ہی دو نمازیں، اور یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے، مالکؒ نے اس کی روایت کی ہے، ان مذکورہ روایتوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فجر کی اقامت کے بعد سنت نہیں پڑھنی چاہئے، اگرچہ نماز پڑھ کر بھی جماعت میں شامل ہوسکے حالانکہ ہمارے میں اس کے خلاف تصریح موجود ہے، اور اس مسئلہ میں اختلاف نہیں ہے کہ اگر گھر میں پڑھ کر مسجد میں داخل ہو کر ایک ہی رکعت پالے تو بھی جائز ہے، اور انشاء اللہ اس کی مزید بحث بعد میں ہوگی۔ م۔

السنة رکعتان قبل الفجر و اربع قبل الظهر و بعدها رکعتان......الخ

اور چار رکعتیں ظہر سے پہلے۔ف۔ سنت موکدہ ہیں ایک سلام سے جو مرتبہ میں فجر کی دو رکعت سنت سے کم ہیں، اور دوسری سنتوں سے افضل ہیں، قول اصح کے مطابق۔فع۔ حدیث میں ہے کہ جس کسی نے ظہر سے پہلے کی چار رکعت اور ظہر کے بعد کی چار رکعت اور ظہر کی چار رکعتوں کی محافظت کی یعنی انہیں ادا کرتا تو اللہ اس پر دوزخ کی آگ حرام فرمادے گا، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے ام حبیبہؓ سے مرفوعاً اس کی روایت کی ہے، اگر جماعت کھڑی ہو جانے کی وجہ سے کوئی ان رکعتوں کو پہلے نہ پڑھ سکے تو عامہ مشائخ کے نزدیک جب تک وقت باقی ہے اسے پڑھ لے۔ یہی قول صحیح ہے۔المحیط۔

اس کی دلیل حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جب ظہر سے پہلے چار رکعتیں نہیں پڑھیں تو ان کو ظہر کے بعد ادا کر لیا، ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، پھر حقائق میں ہے کہ شیخینؒ کے نزدیک ظہر کے بعد کی دو رکعتیں پڑھ لینے کے بعد ان چار رکعتوں کو ادا کرلے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک دو رکعت سے پہلے ہی ان رکعتوں کو ادا کرلے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔ السراج۔ اگر ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں سنت پڑھ لیں مگر دو رکعتوں کے بعد قعدہ نہیں کیا تو استحساناً جائز ہے۔المحیط۔ شیخین کا یہی قول مانا گیا ہے۔المضمرات۔ وبعدها رکعتان اور ظہر کے بعد دو رکعتیں۔ف۔ سنت موکدہ ہیں حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر فرض نماز کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے، اس لئے یہ تمام دو رکعتیں سنت موکدہ ہوئیں۔م۔

و اربع قبل العصر و ان شاء رکعتین......الخ

اور چار رکعتیں عصر سے پہلے۔ف۔ یہ سنت غیر مؤکدہ ہیں۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو عصر سے پہلے چار رکعتیں پڑھے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے کہ ان کے درمیان میں مقرب فرشتے اور مومنین پر سلام سے فصل کر کے دو دو رکعت کرتے، جیسا کہ ترمذی میں ہے، اور حضرت علیؓ سے دوسری حدیث میں ہے کہ عصر سے پہلے دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ اگر چاہے تو عصر سے پہلے دو رکعتیں پڑھے۔ف۔ یعنی دونوں ہی طریقوں سے سنت ادا ہو گی۔واضح ہو کہ ابن الہمامؒ کی تحقیق کے مطابق مغرب کے پہلے بھی دو رکعتیں مباح ہیں۔م۔

و رکعتان بعد المغرب و اربع قبل العشاء و اربع بعدها وان شاء رکعتین......الخ

اور مغرب کے بعد دو رکعتیں۔ف۔ سنت موکدہ ہیں، رسول اللہ ﷺ انہیں گھر میں پڑھنے کا حکم دیتے، کعب بن عجزہ سے نسائی میں یہ روایت موجود ہے، باتیں کرنے سے پہلے پڑھنے کی جلدی کرے۔الرزینؒ والاربع قبل العشاء اور عشاء سے پہلے چار رکعتیں۔ف۔ یہ مستحب ہیں سنت نہیں ہیں واربع بعدها اور چار رکعتیں عشاء کے بعد وان شاء الخ اور اگر چاہے تو دو ہی رکعتیں پڑھے۔ف۔ یہ سنت موکدہ ہیں، لیکن دو رکعتیں متعین ہیں، اور چار رکعتوں میں دو رکعتیں بھی داخل ہو جائیں گی، اگر یہ کہا جائے کہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عشاء کی نماز پڑھ کر میرے یہاں تشریف لاتے تو چار یا چھ رکعتیں پڑھتے، جب کہ سنن ابی داؤد میں ہے، میں کہتا ہوں کہ اس حدیث سے صرف یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت ام المومنین صدیقہؓ کے یہاں اس طرح کیا ہے، مگر اس سے ہیشگی سمجھ میں نہیں آتی ہے، اس جگہ تو ان نمازوں کے ساتھ مواظبت ثابت کرنی چاہئے تھی، تاکہ سنت کے معنی ثابت ہوں، کیونکہ سنت تو بغیر مواظبت اور مداومت کے نہیں ہوتی ہے، اسی لئے مصنف نے لکھا ہے۔

والاصل فيه قوله عليه السلام: من ثابر على ثنتى عشرة ركعة فى اليوم والليلة بنى الله له بيتا فى الجنة، وفسر على نحو ما ذكر فى الكتاب غير انه لم يذكر الاربع قبل العصر، فلهٰذا سماه في الاصل حسنا وخير لاختلاف الاثار والافضل هو الاربع، ولم يذكر الاربع قبل العشاء، ولهٰذا كان مستحبا لعدم المواظبة، وذكر فيه

رکعتین بعد العشاء وفي غيره ذكر الاربع فلهٰذا خيرالا ان الاربع افضل خصوصا ابي حنيفة على ماعرف من مذهبه.

ترجمہ:۔اور ان نمازوں کے سنت ماننے میں اصل یہ حدیث ہے کہ جس شخص نے دن اور رات میں بارہ رکعتوں پر مداومت کی اللہ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادے گا، اور اس کی تفسیر اسی طرح بیان کی جیسی کہ مصنفؒ نے ابھی بیان کی ہے، فرق صرف اتنا سا ہے کہ عصر سے پہلے کی چار رکعتوں کو ذکر نہیں فرمایا ہے، اسی لئے اس کا نام امام محمدؒ نے الاصل میں حسن رکھا ہے، اور آثار میں اختلاف ہونے کی وجہ سے اس میں اختیار دیا گیا ہے، لیکن افضل چار ہی رکعتیں ہیں، اور عشاء سے پہلے کی چار رکعتیں بھی ذکر نہیں کی گئی ہیں، اسی لئے چار رکعتیں مستحب ہوئیں، مواظبت نہیں پائی جانے کی وجہ سے، اور اس حدیث میں عشاء کے بعد کی دو رکعتوں کو ذکر کیا گیا ہے، اور اس حدیث کے ماسوا دوسری حدیث میں چار رکعتیں ذکر کی گئی ہیں، اسی لئے اس میں بھی اختیار دیا گیا ہے، مگر یہ کہ چار ہی رکعتیں افضل ہیں بالخصوص امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک، جیسا کہ ان کے مذہب کے بارے میں معلوم ہوا ہے۔

توضیح:۔ان مذکور نمازوں کو سنت کہنے کے بارے میں اصل حدیث

والاصل فيه قوله عليه السلام: من ثابر على ثنتي عشرة ركعة في اليوم والليلة بني الله......الخ

ان نمازوں کے مسنون ہونے کے بارے میں یہ حدیث اصل ہے کہ جس نے دن و رات میں ان بارہ رکعتوں پر مداومت کی اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں گھر بنا کر دے گا، یہ حدیث ام المؤمنین ام حبیبہؓ سے بخاری کے علاوہ باقی ائمہ صحاح نے مختلف سندوں اور الفاظ سے روایت کی ہے، ان میں سے ایک یہ ہے، **مامن عبد مسلم يصلي لله في كل يوم ثنتي عشره ركعة تطوعا من غير الفريضه الا بني الله له بيتا في الجنة**، یعنی جو مسلمان بندہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہر روز بارہ رکعتیں فرض نمازوں سے زائد پڑھے گا تو بالضرور اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنادے گا۔ف۔ حاصل یہ ہے کہ وہ بالضرور بلند مرتبوں کا مستحق ہے۔

الحاصل۔ مصنفؒ کی روایت میں ثابر بمعنی واجب سے مواظبت کا مفہوم نکلتا ہے اور دوسری روایت میں ان رکعتوں کا فرض نمازوں سے زائد ہونے کی تصریح بھی ہے، وفسر الخ اور رسول اللہ ﷺ نے بارہ رکعتوں کی تفسیر فرمائی ہے اسی کی مانند کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ف۔ چنانچہ صحیح مسلم ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایت میں ۱۲ کی تفسیر یہ ہے کہ اس طرح پڑھے ظہر سے پہلے چار رکعتیں اور ظہر کے بعد دو رکعتیں اور مغرب کے بعد دو رکعتیں اور عشاء کے بعد دو رکعتیں اور صبح کی نماز سے پہلے دو رکعتیں۔ع۔ چونکہ کتاب میں اس سے زیادہ بیان کی گئی ہیں اس لئے مصنفؒ نے کہا ہے غیر انه فرق صرف اتنا سا ہے کہ۔ف۔ حدیث میں دو نمازوں کا ذکر نہیں ہے، اول لم يذكر الخ عصر سے پہلے کی چار رکعتوں کو ذکر نہیں فرمایا ہے۔ف۔۔ یعنی مواظبت کی حدیث میں مذکور نہیں ہے، ورنہ دوسری حدیث مترجم نے تو ذکر کر دی ہے، فلهٰذا الخ اسی لئے امام محمدؒ نے کتاب الاصل میں قبل عصر کی چار رکعتوں کو حسن کہا ہے۔ف۔ اور سنت نہیں کہا، وخیر اور روایات کے مختلف ہونے کی وجہ سے اختیار دیا ہے۔ف۔ کہ جی چاہے تو چار پڑھے یا دو ہی پڑھے، اسی بناء پر دونوں روایتیں اوپر ذکر کی ہیں۔

والافضل هو الاربع، ولم يذكر الاربع قبل العشاء، ولهٰذا كان مستحبا لعدم المواظبة......الخ

اور افضل یہی ہے کہ چار پڑھے۔ف۔ رہی دوسری نماز ولم يذكر الخ اور عشاء سے پہلے چار رکعتوں کا ذکر نہیں ہے، ولهٰذا الخ اس لئے یہ چار رکعتیں مستحب ہوئیں۔ف۔ اور سنت نہ ہوئیں لعدم الخ کیونکہ ان پر ہمیشگی نہیں پائی گئی ہے۔ف۔ السنة ركعتان سے جو کتاب کو شروع کیا ہے اس سے مسنون طریقہ مراد ہے، اور یہ مراد نہیں ہے کہ اس پر رسول اللہ ﷺ نے مواظبت فرمائی ہے، اس مثابرہ کی حدیث میں تو عشاء کے بعد صرف دو رکعتوں کا ذکر ہے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے وذکر

فیه الخ حدیث مذکور میں عشاء کے بعد دو رکعتیں بیان کی گئی ہیں مگر دوسری حدیث میں چار ذکر ہے۔ف۔ چنانچہ حضرت براء بن عازبؓ نے مرفوعاً روایت کی ہے کہ جس نے ظہر سے پہلے چار رکعتیں پڑھیں گویا اس نے رات بھر عبادت کی، اور جس نے عشاء کے بعد چار رکعتیں پڑھیں گویا اس نے لیلۃ القدر میں چار رکعتیں پائیں، سعید بن منصور نے اپنی سنن میں اس کی روایت کی ہے، اسی طرح بیہقیؒ نے عائشہؓ کا قول نقل کیا ہے، مگر یہ قول حضرت عائشہؓ کا اپنا نہیں ہو سکتا ہے اس لئے یہ کہنا ہوگا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر یہ کہا ہوگا۔ مفع۔

فلهٰذا سماه فی الاصل حسنا وخیر لاختلاف الاثار والافضل هو الاربع......الخ

اسی لئے کتاب میں اختیار دیا ہے کہ چار رکعتیں پڑھے یا دو ہی پڑھ لے الا ان الاربع الخ لیکن پوری چار رکعتیں ہی پڑھنی افضل ہیں خصوصا الخ بالخصوص امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اس بناء پر جو ان کے مذہب کے متعلق معلوم ہوا ہے۔ف۔ کہ رات میں چار رکعتیں پڑھنی افضل ہیں۔ف۔ امام اعظمؒ کا یہ مذہب سنن کے علاوہ نوافل میں ہے، لیکن مصنفؒ نے یہ ذکر کر کے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ یہ چار رکعت سنت میں ثابت نہیں ہیں، کیونکہ حضرت براء اور عائشہؓ سے صرف لوگوں کو اس فضیلت پر آمادگی نکلی ایسا نہیں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی پڑھتے تھے بلکہ اس سے بڑھ کر دلیل ام المومنین عائشہؓ کی یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عشاء کے بعد میرے پاس آئے تو ضرور چار یا چھ رکعتیں پڑھیں، جیسا کہ میں مترجم نے اوپر ذکر دیا ہے، اسی لئے ابن الہمامؒ نے چھ رکعتوں پر ہی اعتماد کیا ہے، لیکن میرے نزدیک چار ہی قابل اعتماد ہیں، مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ ہر جگہ پڑھتے ہوں اگرچہ ظاہر یہی ہے کہ آپ پڑھتے ہی ہوں گے، جیسا کہ ابن عباسؓ کی حدیث میں اپنی خالہ میمونہؓ کے یہاں رات کو رہنے میں صحیح بخاریؒ میں بھی یہ چار رکعتیں ہی مذکور ہیں، اور یہی حدیث عبداللہ بن الزبیرؓ سے بھی ہے، جیسا کہ اسے احمد، بزار اور طبرانی نے روایت کیا ہے، لیکن صحیح مسلم میں حضرت ام المومنین عائشہؓ سے دو رکعتیں مذکور ہیں، سمجھ لیں۔

اگر کہا جائے کہ مثابرہ کی مذکور حدیث سے بھی تو تحریض فضیلت پر آمادگی ظاہر ہوتی ہے، میں مترجم نے اس سے پہلے، ظہر مغرب اور عشاء کے بعد دو دو رکعتوں پر مداومت ثابت کی ہے، اس طرح ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے دس رکعتیں یاد رکھیں ظہر سے پہلے دو ظہر کے بعد دو مغرب کے بعد اپنے گھر میں دو اور عشاء کے بعد اپنے گھر میں دو اور نماز فجر سے پہلے دو، جیسا کہ صحاح ستہ کی حدیثوں میں ہے، اور جمعہ کے بعد بھی دو رکعتوں کا ذکر ہے، ان میں محافظت کا لفظ مواظبت اور مداومت کی دلیل ہے، اس پر امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک دس رکعتیں ہیں، اور اعلی درجہ میں بارہ رکعتیں ہیں، اور عبداللہ بن سفیان نے حضرت عائشہؓ سے ابن عمرؓ کی حدیث کی طرح روایت کی ہے جسے ترمذیؒ نے صحیح کہا ہے، اور دوسری روایت حضرت عائشہؓ سے ظہر سے پہلے چار رکعتیں ہیں، صحیح مسلم اور ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور یہ اصح ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ ابن عمرؓ کی حدیث تو اس سے زیادہ اصح ہے، اسی لئے ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ابن عمرؓ نے ظہر سے پہلے دو رکعت تحیۃ المسجد روایت کی ہیں اور چار رکعتیں گھر میں پڑھی تھیں، میں کہتا ہوں کہ یہ بات قیاس سے بعید ہے کہ گھر کی سنن کو بھی ذکر فرمائیں، اور ابو ہریرہؓ کی حدیث میں ظہر کے قبل دو سلام سے چار رکعتیں ہیں۔

والاربع قبل الظهر بتسلیمة واحدة عندنا کذا قاله رسول الله ﷺ و فیه خلاف الشافعی.

ترجمہ:-اور ظہر کے پہلے ایک سلام سے چار رکعتیں ہیں ہمارے نزدیک، اور ایسا ہی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے، لیکن امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔

توضیح:-ظہر کے قبل ایک سلام سے چار رکعتیں سنت ہیں، اختلاف ائمہ، احادیث سے دلیلیں

والاربع قبل الظهر بتسلیمة واحدة عندنا......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔ف۔ امام مالکؒ واحمدؒ کا بھی اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک دو سلاموں سے ہیں، ابوہریرہؓ کی حدیث کی بناء پر اس کا جواب دیا گیا ہے کہ ان میں سے ایک سلام وہ مراد ہے جو التحیات میں ہے، کیونکہ حضرت ابوایوبؓ کی حدیث میں ہے کہ ان چار رکعتوں میں سلام نہیں ہے، اس کی روایت ابوداؤد نے کی ہے اور ترمذیؒ نے بھی اپنی شمائل میں اور ابن ماجہؒ نے بھی روایت کی ہے، لیکن ابوداؤد اور ابن خزیمہؒ نے اسے ضعیف کہا ہے۔

اور یہ بات بھی بہت ممکن ہے کہ دونوں احادیث میں اس طرح توفیق دی جائے کہ چار رکعتیں کبھی ایک سلام سے اور کبھی دو سلام سے بلکہ کبھی صرف دو ہی رکعتیں پڑھتے تو اس طرح اختلاف ختم ہو جائے گا، لیکن چار رکعتیں افضل ہوگی، اور شاید کہ دو رکعت میں اور دو سلام سے محتمل تہمت ہے، اسی لئے صحیح مسلم کی حدیث میں جو حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے مروی ہیں ان پر ہی اعتماد کیا ہو، اور ایک سلام سے ہونا ہی بظاہر قابل اعتماد ہے، البتہ اگر ابوہریرہؓ کی حدیث تفسیر ہو تو دو سلام اور ایک سلام دونوں طرح سے پڑھنے سے سنت ادا ہو گئی، اور اسی پر شیخ ابن الہمامؒ نے اطمینان کیا ہے، میرے استاد شیخ دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ دو رکعتیں اور چار رکعتیں دونوں میں ہی سنت عام ہے، یہی جواب ظاہر اور بہتر ہے، اور صرف چار کے قول میں زیادہ احتیاط ہے واللہ اعلم م۔

ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ جس نے مغرب کے بعد چھ رکعتیں پڑھیں اس کا نام اوابین میں لکھا جائے گا، اس کے بعد یہ آیت تلاوت کی اِنَّهُ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْراً، اور ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مغرب کی فرض نماز کے بعد دو رکعت سنت اور چار رکعتیں دوسری (نفل) پڑھے گا تو اس کے لئے یہ فضیلت پوری ہو جائے گی، اب مغرب کی فرض نماز سے پہلے کی دو رکعتیں تو اس کے متعلق ابن حبان کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ نے انہیں پڑھی ہیں، اور بخاری کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح فرمایا ہے کہ جو چاہے پڑھے اس کراہت سے بچنے کے لئے کہ لوگ اس کو سنت ٹھہرا دیں، اور حضرت انسؓ سے صحیحین میں ہے کہ مغرب کی اذان کے وقت کچھ صحابہ کرام اتنی تیزی کے ساتھ دو رکعت سنت پڑھ لیتے کہ اجنبی آنے والا یہ سمجھتا کہ جماعت ہو گئی، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ گمان اس وجہ سے ہے کہ لوگ مغرب کے بعد سنتیں پڑھتے ہیں، اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مغرب کے بعد مسجد میں سنتوں کے پڑھنے کی اجازت ہے حالانکہ مذکورہ بالا حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے گھروں میں پڑھنے کا حکم دیا ہے، اور ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ خود رسول اللہ ﷺ کا بھی ہمیشہ یہی عمل تھا، تو ممکن ہے کہ یہ حکم زیادہ ثواب حاصل کرنے کے لئے دیا گیا ہو۔

خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس سے مغرب سے پہلے دو رکعت پڑھنا مستحب معلوم ہوتا ہے، لیکن طاؤس نے کہا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا گیا تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کسی کو پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا ہے، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے، اور طحاویؒ نے کئی صحیح سندوں سے اور ابن ابی شیبہؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے کہ جو کوئی مغرب سے پہلے سنت پڑھتا تو حضرت عمرؓ اس کو کوڑے مارتے تھے، اور ابراہیم نخعیؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ وابوبکرؓ اور عمرؓ میں سے کوئی بھی یہ نماز نہیں پڑھتے تھے، لہٰذا حسن روایت پر عام صحابہ کرام کا عمل ہوگا اسی کو ترجیح ہوگی، اور طبرانیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ ہم نے المومنین ازواج مطہراتؓ سے مغرب کے قبل نماز پڑھنے کے متعلق پوچھا تو سب نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ نہیں پڑھتے تھے، کسی نے یہ جواب دیا ہے کہ حضرت انس کی حدیث سے ثبوت ہوتا ہے جس سے نفی کی حدیث پر ترجیح ہوگی تو اس جواب کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ محققین کا یہ کہنا ہے کہ ایسی نفی جس کی دلیل موجود ہو وہ اثبات کے برابر حکم میں ہوتی ہے، اور یہاں بھی یہی بات ظاہر ہے کہ اگر حکم ثابت ہی ہوتا تو عوام میں بھی ایسے ظاہر اور ثابت ہونا چاہئے تھا۔ اس بناء پر ابن الہمامؒ نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مغرب ———— سے پہلے کی یہ دو رکعتیں مباح ہیں، مکروہ نہیں ہیں، کیونکہ کراہت کی لئے کوئی مستقل دلیل چاہئے، اور مغرب کے فرض کی تاخیر کی دلیل کوئی قوی نہیں ہے کیونکہ اتنی معمولی سی تاخیر نماز میں جائز ہے، جیسا کہ قنیہ میں ہے۔

میں مترجم جواب دیتا ہوں کہ حضرت عمرؓ کا منع کرنا اور مارنا ہی کراہت کے ثابت کرنے کے لئے کافی دلیل ہے، جبکہ اس پر عمل ترک کردیا گیا تھا، عینیؒ نے کہا ہے کہ ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے، اب اس سوال کا جواب باقی ہے کہ فرض کے فوراً بعد سنتیں ہیں یا دوسرے کچھ وظائف پڑھ لینے کے بعد ہیں، تو ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ صرف اللھم انت السلام ومنک السلام وتعالیت یا ذوالجلال والاکرام کی مقدار فصل ہونا چاہئے، یا بقدر ان کلمات کے ہو، میں مترجم کہتا ہوں کہ مسجد میں فرائض پڑھ کر گھروں میں جانے تک کی مقدار خود تاخیر ہے، اور اتنی تاخیر بھی مسنون ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

قال ونوافل النهار ان شاء صلى بتسليمة ركعتين وان شاء اربعا و تكره الزيادة على ذلك فامانافلة الليل قال ابوحنيفة ان صلى ثمان ركعات بتسليمة جاز و تكره الزيادة على ذلك وقالالايزيد بالليل على ركعتين بتسليمة وفى الجامع الصغير لم يذكر الثمانى فى صلوة الليل و دليل الكراهة انه عليه السلام لم يزد على ذلك ولو لاالكراهة لزاد تعليما للجواز.

ترجمہ:- اور نوافل النہار یعنی دن کی نفل نمازوں کو اگر چاہے تو ایک سلام سے دو رکعتیں پڑھے اور اگر چاہے تو چار رکعتیں پڑھے، اور اس سے زیادہ پڑھنا مکروہ ہے، لیکن رات کی نفل نمازوں کے بارے میں ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ اگر چاہے تو ایک سلام سے آٹھ رکعتیں پڑھ لے کہ یہ بھی جائز ہے، لیکن اس سے زیادہ مکروہ ہے، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ رات کے وقت ایک سلام سے دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھے، اور جامع الصغیر میں رات کی نماز میں آٹھ رکعتوں کو ذکر نہیں کیا ہے، اور کراہت کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آٹھ رکعتوں پر زیادتی نہیں فرمائی ہے، اگر یہ زیادتی مکروہ نہ ہوتی تو جواز کی تعلیم کی غرض سے ضرور زیادتی فرماتے۔

توضیح:- دن کے وقت نفل نمازیں، رات کی نفل نمازیں، دلیل

قال ونوافل النهار ان شاء صلى بتسليمة ركعتين وان شاء اربعا......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے کہ دن میں چار رکعتوں سے زیادہ نفل نماز مکروہ ہے۔ ف۔ بالاتفاق کیونکہ کسی حدیث میں اس سے زیادہ ثبوت نہیں ہے۔ ع۔ فاما نافلہ اللیل الخ رات کی نفل نمازوں کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ایک سلام سے آٹھ رکعتیں بھی جائز ہیں، مگر اس سے بھی زیادہ کرنا مکروہ ہے۔ ف۔ قدوری نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، لیکن شمس الائمہ سرخسیؒ نے فرمایا ہے کہ اس سے زیادہ بھی مکروہ نہیں ہے، قول اصح کے مطابق، اور نہایہ میں کہا ہے کہ یہی قول اصح ہے۔ عف۔ لیکن چار رکعتیں ہی اولیٰ ہیں، وقالا الخ اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ ایک سلام سے دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھے۔ ف۔ کیونکہ یہی افضل سنت ہے، اور اگر ایک سلام سے چار رکعتیں بھی پڑھ لیں تو بھی بلا کراہت جائز ہے، لیکن اس سے زیادہ مکروہ ہے۔ الجامع۔ المبسوط۔ عامۃ الکتب۔ اور قاضی خان نے کہا ہے کہ اگر آٹھ رکعتیں ایک سلام سے پڑھیں تو ابو حنیفہؒ کے نزدیک چار سلاموں کے قائم مقام ہوں گی، اور صاحبینؒ کے کے نزدیک چار رکعتوں تک تو بلا کراہت دو سلاموں کی قائم مقام ہیں، اور باقی مکروہ ہیں۔ مع۔ الحاصل چار رکعتیں امام اعظمؒ کے نزدیک افضل اور صاحبینؒ کے نزدیک بلا کراہت جائز ہیں، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ اور امام صاحب کے نزدیک آٹھ تک جائز ہیں۔ م۔

وفى الجامع الصغير لم يذكر الثمانى فى صلوة الليل ......الخ

اور جامع صغیر میں امام محمدؒ نے رات کی نماز میں آٹھ رکعت کے مسئلہ کو ذکر نہیں کیا ہے۔ ف۔ بلکہ صرف چھ تک کو جائز لکھا ہے۔ ع۔ شاید اس دلیل کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے نو رکعت ایک سلام سے پڑھی ہیں اس میں چھ رکعتیں نفل اور تین رکعتیں وتر کی ہوتی ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔ م۔

و دلیل الکراھۃ انہ علیہ السلام لم یزد علی ذلک ولو لاالکراھۃ لزاد تعلیما للجواز......الخ

آٹھ سے زیادہ ہونے پر مکروہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ ایک سلام سے آٹھ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھی تھی، اگر اس نے زیادہ مکروہ نہ ہوتی تو کم از کم جواز کو بتلانے ہی کے لئے کچھ اور بڑھا کر دکھادیتے۔ ف۔ اور صحیح مسلم کی طویل حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نور کعتیں اس طرح پڑھتے کہ ان میں صرف آٹھویں رکعت میں بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر وحمد ودعا کرتے اور بغیر سلام کئے اٹھ کر نویں رکعت پڑھ کر قعدہ کرتے اور اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء ودعاء کر کے سلام پھیرتے کہ ہمیں سنادیتے تھے۔ مفع۔ اس سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ آٹھ رکعتوں سے زیادہ مکروہ نہیں ہے، جس کو امام سرخسی نے صحیح کہا ہے لیکن اس سے استدلال مشکل ہے کیونکہ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ آٹھ میں بھی قعود نہیں کیا بلکہ آٹھویں کے بعد کیا ہے، اس سے یہ لازم آتا ہے کہ آٹھویں میں قعدہ بھی نہیں ہونا چاہئے، حالانکہ تمام مشائخ اس بات پر متفق ہیں کہ نفل میں ہر دو رکعت کے بعد قعدہ واجب ہے، یہاںتک کہ اگر بھول کر بھی دوسروں میں بیٹھے بغیر کوئی کھڑا ہو جائے تو اس پر لازم آتا ہے کہ قیام پورا ہونے کے بعد قعدہ کرنے کے لئے لوٹ آئے، اور قعدہ کرے۔ الفتح۔

والافضل فی اللیل عند ابی یوسف و محمد مثنی مثنی و فی النھار اربع اربع وعند الشافعی فیھما مثنی مثنی وعند ابی حنیفہ فیھما اربع اربع للشافعیؒ قولہ علیہ السلام صلوۃ اللیل والنھار مثنی مثنی.

ترجمہ:- اور افضل ہے رات کے وقت امام ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک دو دو رکعتیں اور دن کے وقت چار چار رکعتیں، اور دونوں اوقات میں امام شافعیؒ کے نزدیک دو دو رکعتیں، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دونوں اوقات میں چار چار رکعتیں، امام شافعیؒ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ رات اور دن دونوں وقتوں کی نماز دو دو رکعتیں ہیں۔

توضیح:- دن اور رات میں سنت کی افضل مقدار اس میں ائمہ کا اختلاف ان کے دلائل، چاشت کی نماز

والافضل فی اللیل عند ابی یوسف و محمد مثنی مثنی و فی النھار اربع اربع......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ امام شافعیؒ کی متدل حدیث کو ائمہ اربعہ نے ذکر کیا ہے، لیکن ترمذیؒ نے کہا ہے کہ شعبہؒ کے شاگردوں میں کسی نے موقوفاً یعنی ابن عمرؓ کا یہ قول ذکر کیا ہے اور کسی نے اسے مرفوعاً روایت کیا ہے یعنی وہ روایت خود حضور ﷺ نے بیان فرمائی ہے، اور دوسرے ثقہ راویوں نے اس حدیث کی روایت کی ہے۔ والنھار کا لفظ نہیں کہا ہے، یعنی صرف رات کی نماز دو دو رکعت روایت کی ہے، اور صحیحین کی روایت میں بھی صرف صلوۃ اللیل مثنی مثنی ہے اس میں دن کا ذکر نہیں ہے، اور نسائیؒ نے کہا ہے کہ میرے نزدیک یہ حدیث درست نہیں ہے اگرچہ سنن کبریٰ میں کہا ہے کہ اس کی اسناد عمدہ ہے، کیونکہ اسناد کے عمدہ ہونے سے یہ بات لازم نہیں آتی ہے کہ اس حدیث میں کسی دوسری حیثیت سے کوئی خرابی نہیں ہے، اسی بناء پر علوم الحدیث میں حاکم نے اس حدیث کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے کہ اس کے راوی تو ثقہ ہیں مگر اس میں علت ہے ایسی کہ اس کے بیان سے کلام بہت طویل ہو جائے گا اس لئے چھوڑ دیتا ہوں، ان کا کلام ختم ہو گیا، اور ابن عمرؓ سے امام طحاویؒ نے روایت کی ہے کہ وہ رات میں دو دو رکعت اور دن میں چار چار پڑھتے، اس لئے یہ تو بہت ہی عقل سے بعید بات ہے کہ خود اپنی روایت کی مخالفت کریں۔ مفع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ کلام کا ماحصل یہ نکلا کہ اس حدیث سے استدلال درست ہی نہیں ہے، پھر میں کہتا ہوں کہ رات کی نماز دو دو رکعت کا تو دوسری حدیث سے ثبوت ہوتا ہے، ان میں سے حضرت عائشہؓ کی مرفوعاً حدیث ہے کہ جب کوئی تم میں سے رات کو اٹھے تو دو مختصر رکعتوں سے اپنی نماز شروع کرے، اس کی روایت مسلم نے کی ہے، پھر بعد کو جس قدر چاہے طویل کردے۔ ابوداؤد۔ ان میں سے اور ایک حدیث یہ ہے کہ ابن عمرؓ سے مرفوعاً مروی ہے

کہ رات کی نماز دو رکعت ہے۔ صحیحین۔ اور ایک حدیث ابن عباسؓ جبکہ اپنی خالہ ام المومنین میمونہؓ کے یہاں رسول اللہ ﷺ کی نماز دیکھنے کو سوئے تھے، اور رسول اللہ ﷺ کے بائیں جانب جاکر نماز میں شریک ہوئے تھے اور آپ نے بائیں ہاتھ سے ابن عباسؓ کا دایاں کان پکڑ کر دائیں طرف کھڑا کر دیا تھا، اسی بات کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ پھر پڑھیں دو رکعت پھر دو رکعت پھر دو رکعت، پھر دو رکعت پھر دو رکعت پھر وتر پڑھی، میں کہتا ہوں کہ اس طرح یہاں کل دس رکعتیں ہوئیں۔ م۔

اور ایک روایت میں کہا ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی تیرہ رکعتیں نماز کی شمار کیں پھر کروٹ سے لیٹ رہے یہانتک کہ سوگئے، پھر بلالؓ نے آکر فجر کی نماز کی اطلاع دی تو کھڑے ہو کر نیا وضوء کئے بغیر مختصر سی رکعتیں پڑھیں، پھر نکل کر فجر کی فرض نماز پڑھائی، اس وقت دعا میں آپ فرماتے تھے **اللهم اجعل في قلبي نورا وفي بصري نورا وفي سمعي نورا وعن يميني نورا وعن يساري نورا وتحتي نورا وامامي نورا و خلفي نورا واجعل لي نورا،** یہ حدیث مختلف سندوں سے صحاح ستہ میں موجود ہے۔

واضح ہو کہ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ تیرہ رکعتوں کے علاوہ سنت فجر کی دو رکعتیں تھیں، اور ابوداؤد کی روایت میں حضرت عائشہؓ سے بھی ایک حدیث میں یہ موجود ہے کہ آپ نے تیرہ رکعتوں سے زیادہ کی وتر نہیں کی ہے، اسی طرح بخاری میں بھی حضرت عائشہؓ سے ہی دوسری روایت اس طرح ہے کہ دس رکعت نماز اور ایک رکعت وتر اور دو رکعت فجر کی سنت ہے اس میں فجر کی سنت کے ساتھ تیرہ رکعتیں ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اسی روایت کو ترجیح ہے، اور اسی پر حکم قرار پایا ہے، یہانتک کہ ابن عباسؓ سے بھی تیرہ رکعتیں فجر کی سنت کے ساتھ مروی ہیں، مختصر فتح القدیر، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ روایت صحیح مسلم میں اس طرح ہے **كانت صلوة رسول الله** ﷺ **عن الليل عشر ركعات ويوتر بسجدة و يركع ركعتي الفجر فتلك ثلث عشر ركعة،** یعنی رات میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی دس رکعتیں ہوتیں اور ایک سجدہ (رکعت) کے ساتھ وتر کرتے اور دو رکعت فجر کی نماز پڑھتے، اس طرح یہ کل تیرہ رکعتیں ہوتیں، اسے صحاح ستہ نے روایت کیا ہے، اول تو اس روایت میں وتر کی ایک ہی رکعت قرار دی ہے، اگرچہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ آخری دو رکعت سے اسے ملالیا ہوگا، پھر میں کہتا ہوں۔

پھر میں مترجم کہتا ہوں کہ ظاہراً بات یہ ہے کہ تمام روایتیں درست ہیں اور ان میں کسی بھی ثقہ راوی کو وہم نہیں ہوا ہے، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ پہلی تیرہ رکعتیں وتر سمیت رات کی نماز تھیں، اور فجر کی دو رکعتیں اس کے علاوہ تھیں، پھر کمی کر کے گیارہ رکعتیں وتر سمیت رہیں پھر جب رسول اللہ ﷺ کی عمر کچھ اور زیادہ ہوگئی تو ان رکعتوں میں اور بھی کمی آگئی، یہانتک کہ خود حضرت عائشہؓ کی حدیث میں سات رکعتیں وتر کے ساتھ ہوگئیں، اور ام سلمہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ تیرہ رکعتیں پڑھتے جب عمر زیادہ ہوگئی اور بدن میں کچھ کمزوری آگئی تو سات رکعتیں پڑھیں، اس کی روایت ترمذی اور نسائی نے کی ہے۔ واللہ تعالی اعلم۔ م۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ سات میں چار سنت نماز اور تین وتر ہیں، اس بناء پر اگر کوئی عمر دراز ہو تو اس کے لئے رات کی مسنون نماز سات ہی ہوگی، اور ابوداؤد کی حدیث میں جو حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آپ ایتار کرتے چار اور تین سے یعنی سات رکعتوں سے اور چھ و تین سے اور آٹھ سے اور دس و تین سے، اور آپ سات سے کم اور تیرہ سے زیادہ ایتار نہیں کرتے تھے، اس روایت کا تقاضا یہ ہوا کہ ان میں سے ہر ایک سے سنت ادا ہو جائے گی، اور چار سے کم تہجد نہیں ہے، اور شمس الائمہؒ نے جو مبسوط میں کہا ہے کہ کم از کم دو رکعتیں بھی ہیں، تو واللہ اعلم یہ روایت کہاں سے لائے ہیں، خلاصہ فتح القدیر۔

میں کہتا ہوں کہ ایک حدیث میں اس طرح بھی تو آیا ہے کہ جو چاہے کہ پانچ سے ایتار کرے وہ کرے، تو اسی سے یہ بیان کیا ہے کہ تین وتر اور دو تہجد کی ہیں، اور میں نے اس کے متعلق باب الوتر میں بحث کی ہے، لیکن حق بات یہ ہے کہ چار سے کم تہجد

نہیں ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، یہ بات اور بھی معلوم ہونی چاہئے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے یہ ثابت ہوا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے پہلے حصہ، درمیانی حصہ اور آخری حصہ یہانتک کہ سحر تک ہر حصہ میں ایتار کیا ہے، اور شیخ استاد محققؒ نے فائدہ کی ایک بات یہ بھی بتائی ہے کہ رات کے پہلے حصہ میں ایتار یا وتر پڑھنا رمضان کے مہینہ سے تھا اس لئے تحقیق کے مطابق تراویح ہی تہجد ہے جو رمضان کی فضیلت کی وجہ سے اگلے حصہ سے ہی شروع ہو جاتی ہے، میں کہتا ہوں کہ تحقیقی بات یہ ہے کہ یہی قول اصح ہے، فاللہ اعلم۔ م۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ پر تہجد کی نماز پڑھنی اور رات کی عبادت واجب تھی تو اب ہم لوگوں کے حق میں یہ نمازیں مستحب ہیں، اور اگر آپ پر نفل تھیں تو ہمارے حق میں سنت ہیں، لیکن اس میں علماء کی رائے بہت مختلف ہے، مختصر فتح القدیر، اور اگر آپ پر واجب تھی پھر منسوخ ہو گئی اور اس کے باوجود پڑھتے رہے تو اب ہم لوگوں کے لئے سنت ہو گئی ہے، خلاصہ بحث یہ ہوا کہ رات کی عبادت اور تہجد گذاری اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ درجہ کا کام ہے، اللہ تعالیٰ ہی جسے ایسی نیک بختی حاصل کرنے کی توفیق دیدے وہی کر سکتا ہے، پھر ان فوائد مذکورہ میں یہ بات معلوم ہو گئی کہ تہجد کی نماز دو رکعت کر کے ہی ثابت ہے پھر بھی دو سے زیادہ کر کے پڑھنے میں کراہت ثابت نہ ہو گی، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہو کہ اسے افضلیت کا درجہ حاصل نہ ہو۔ م۔

ولهما الاعتبار بالتراويح ولابى حنيفة انه عليه السلام كان يصلى بعد العشاء اربعا روته عائشةؓ وكان يواظب على الاربع فى الضحى ولانه ادوم تحريمة فيكون اكثر مشقة وازيد فضيلة.

ترجمہ:- اور صاحبینؒ کی دلیل دو دو رکعت کر کے پڑھنے میں تراویح کا اعتبار کرنا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کے بعد چار رکعتیں پڑھتے تھے اس کی روایت حضرت عائشہؓ نے کی ہے، اسی طرح یہ کہ آپ ہمیشہ چاشت کی نماز چار رکعتوں سے ہی پڑھتے تھے، اور اس لئے بھی کہ چار رکعت کے تحریمہ کا اثر کافی دیر تک رہتا ہے اس وجہ سے اس میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے تو فضیلت بھی اس کی زیادہ ہوتی ہے۔

توضیح:- چاشت کی نماز، امام صاحب اور صاحبین کے دعوے اور ان کی دلیلیں

ولهما الاعتبار بالتراويح......الخ

اور صاحبینؒ کے نزدیک رات کے وقت دو دو کر کے ہی نماز پڑھنی افضل ہے تراویح پر قیاس کرتے ہوئے۔ ف۔ کیونکہ بالاتفاق تراویح کی نماز دو دو رکعت کر کے ہی پڑھی جاتی ہے اور یہی افضل بھی ہے، بلکہ اصل میں استدلال حضرت ابن عمر و عائشہؓ و ابن عباسؓ کی احادیث سے ہے جو دو دو کر کے پڑھنے کے بارے میں پہلے روایت کی جا چکی ہیں۔ م۔ کیونکہ عبادات میں افضلیت کو ثابت کرنا قیاس سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ثبوت سے ہے یا توقیفی ہے، عقلی نہیں ہے، جو رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل سے ہی معلوم کیا جاتا ہے۔ ع۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ اسی پر فتویٰ دیا جائے کہ رات میں دو دو کر کے پڑھنا ہی افضل ہے جیسا کہ صاحبینؒ کا قول ہے۔

ولابى حنيفة انه عليه السلام كان يصلى بعد العشاء اربعا روته عائشةؓ......الخ

اور ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کے بعد چار رکعت پڑھتے تھے، اس کی روایت ام المومنین عائشہؓ نے فرمائی ہے۔ ف۔ جیسا کہ اس کی روایت ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے، اور اس کی پوری وضاحت اوپر گذر چکی ہے، لیکن صحیح مسلم میں عبداللہ بن شقیقؒ کی روایت ام المؤمنین سے ہے کہ بعد عشاء گھر میں آکر دو رکعتیں ہیں، عینیؒ نے کہا ہے کہ یا تو راویوں کو وہم ہوا ہے یا ام المؤمنینؓ نے مختلف اوقات کی بات بتائی ہے، واللہ اعلم۔ مع۔

و کان یواظب علی الاربع فی الضحی ولانہ ادوم تحریمۃ......الخ

رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی نماز چار رکعت ہی ہمیشہ پڑھی ہے۔ف۔ اور جس قدر چاہتے زیادہ فرماتے،اس کی روایت عائشہؓ سے امام مسلمؒ نے کی ہے،اس سے تو دن میں چار رکعتوں کے پڑھنے کا ثبوت مل گیا۔اور ابو یعلیٰ موصلی کی روایت میں ہے کہ چاروں رکعتوں میں فصل نہیں فرماتے تھے،جیسا کہ عینی میں ہے۔میں کہتا ہوں کہ سلام وکلام میں فرق ہے لیکن ایک حدیث میں ہے جسے عروہؓ نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک کو خود چھوڑ دیتے مگر یہ چاہتے کہ لوگ اس پر عمل کریں،اور یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے چاشت کی نماز کبھی نہیں پڑھی ہے لیکن میں پڑھتی ہوں،ترمذی کے علاوہ بقیہ ائمہ حدیث نے اس کی روایت کی ہے،اور عبد اللہ بن شقیق کی روایت میں حضرت عائشہؓ سے رسول اللہ ﷺ کی چاشت پڑھنے سے انکار ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے،اس طرح موافقت کی بہتر صورت یہی ہے کہ آپ نے اسی نماز کو کچھ دنوں تک متواتر پڑھ کر چھوڑ دیا ہے، پھر نہیں پڑھا۔ لیکن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ آپ پڑھتے تو ہم یہ کہنے لگے کہ اب کبھی نہیں چھوڑیں گے، پھر چھوڑ دیتے تو ہم پھر کہتے کہ اب کبھی نہ پڑھیں گے یہ روایت بھی ترمذی نے بیان کی اور اسے حسن بھی بتایا ہے، اور ام ہانیؓ کی حدیث میں آٹھ رکعتوں کا بیان ہے، جیسا کہ صحیحین وغیرہما میں ہے،امام احمدؒ اور دوسروں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے، اور وصیت والی روایت میں ابو ہریرہؓ سے دو رکعتیں ہیں،اس کی روایت بخاری کے علاوہ بقیہ ائمہ محدثین نے کی ہے، جیسے کہ ابو ذرؓ کی اس حدیث میں بھی دو رکعتیں بیان کی گئی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ انسان کے ہر عضو پر صدقہ لازم آتا ہے، مسلم اور ابو داؤد نے اس کی روایت کی ہے،اور ابو ہریرہؓ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جس نے چاشت کی دو رکعتوں کی پابندی کی اس کے گناہ بخشدیئے جائیں گے، اگرچہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہوں اس کی روایت بھی ترمذی نے کی ہے،اور جو لوگ صلوۃ الضحی پر مداومت کریں گے، جنت کے باب الضحی سے پکارے جائیں گے کہ وہ اللہ کی رحمت سے داخل ہوں،اس کی روایت بھی ابو ہریرہؓ نے مرفوعاً کی ہے،اس نماز کے لئے جو وقت مختار ہے وہ چوتھائی دن چڑھ جانے پر ہے، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث زید بن ارقم سے ثابت ہے جو اوابین کی نماز میں ظاہر ہے۔م۔ع۔ت۔

منیہ میں لکھا ہے کہ اس کے لئے کم سے کم دو اور صحیح قول میں چار رکعتیں اور افضل آٹھ رکعتیں ہیں،اور آخری حد بارہ رکعتیں ہیں، معلوم ہونا چاہئے کہ منیہ کی روایت بھی صحیح اور ثابت ہے،اس مسئلہ میں تحقیق یہ ہے کہ چاشت کی نماز پر رسول اللہ ﷺ کی مداومت نہ تھی بلکہ کبھی کچھ دنوں تک برابر پڑھتے رہتے پھر کچھ دنوں کے لئے بالکل چھوڑ دیتے،اسی وجہ سے اسے سنت نہیں بلکہ مستحب کہتے ہیں،اور چونکہ اکثر اس میں چار رکعتوں کا بیان آیا ہے اس لئے دن میں چار رکعت ہی افضل ہے۔م۔ ولانہ ادوم الخ اور دن میں چار رکعت افضل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کا تحریمہ بہت دیر تک باقی رہ جاتا ہے اس لئے درمیان میں فراغت نہ ہونے سے مشقت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ف۔ اور جس عبادت میں مشقت زیادہ ہوتی ہے اس میں ثواب بھی زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ ایک حدیث سے یہ ثابت بھی ہے، لہٰذا چار رکعت ہی ثواب میں دو کی بہ نسبت زیادہ ثواب کی ہوئیں اور فضیلت میں بھی بڑھ کر ہوئیں۔

ولہٰذا لو نذر ان یصلی اربعا بتسلیمۃ لایخرج عنہ بتسلیمتین، وعلی القلب یخرج والتراویح تؤدی بجماعۃ فیراعی فیھا جھۃ التیسیر، و معنی مارواہ شفعا لاوترا، واللہ اعلم.

ترجمہ:۔اسی لئے اگر کسی نے یہ نذر مانی کہ میں چار رکعتیں ایک سلام سے ادا کروں گا تو وہ شخص دو سلاموں سے پڑھنے سے اس نذر سے فارغ نہ ہوگا، لیکن اس کے برعکس کرنے سے فارغ ہو جائے گا،اور تراویح کی نماز چونکہ جماعت کے ساتھ ادا کی جاتی ہے اس لئے اس میں عوام کی آسانی کا خیال رکھا جاتا ہے،اور امام شافعیؒ نے جو حدیث بیان کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ رات کی نماز جوڑ جوڑ یعنی جفت ہے طاق نہیں ہے۔

توضیح:- نماز تراویح، طلوع فجر سے فرض کی ادائیگی تک کلام کرنا، طول قیام، کثرت سجود تحیۃ الوضوء، سفر کی تیاری کے وقت دو رکعت نماز، اس سے واپسی پر دو رکعت، استخارہ کی نماز صلوۃ التسبیح، دعاء استخارہ، نوافل کے اوقات، سنت اور فجر، اور چار رکعت ظہر سے پہلے خرید و فروخت میں مشغول، چار رکعت والی نماز میں دو رکعت کے بعد بیٹھنا

ولهٰذا لو نذر ان يصلي اربعا بتسليمة لايخرج عنه بتسليمتين......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ تراویح میں دو رکعت کر کے پڑھنے کی فضیلت جماعت سے پڑھنے کی وجہ سے ہے کہ اس سے عوام کو فائدہ ہوتا ہے۔ف۔ اسی بناء پر اگر تراویح کو کوئی تنہا پڑھے تو اس کے لئے چار چار رکعتیں افضل ہیں، جب کہ اس طرح پڑھنے کی قوت بھی ہو۔م۔ اور حدیث میں جو آیا ہے کہ **صلوة الليل مثنى مثنى فاذا اردت ان تنصرف فاركع بسجدة توترلك ماقد صليت** یعنی رات کی نماز دو دو رکعت ہے، جب تم پھرنا چاہو یعنی صبح کے خوف سے فراغت چاہو تو ایک رکعت پڑھ لو کہ وہ تمہاری پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دیگی، بخاری نے اس کی روایت کی ہے، اس حدیث سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ رات کی نماز کو وتر پر ختم کرنا چاہئے، یہ مراد نہیں ہے کہ تمام نماز طاق رکعت سے ہی پڑھی جائے، اسی لئے مصنفؒ نے امام شافعیؒ کے جواب میں کہا ہے۔

و معنى ماروٰه شفعا لاوترا، والله اعلم.

اور امام شافعیؒ نے جو حدیث بیان کی ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ رات کی نماز جوڑی جوڑی یعنی جفت ہے، طاق نہیں ہے، واللہ اعلم،ف۔ یعنی پہلے جفت، جوڑی جوڑی پڑھتے جائیں پھر آخر میں ایک پڑھ لے کہ اس سے سب طاق بن جائے گی، ابن الہمامؒ نے اس جگہ یہ خیال کیا ہے کہ اس حدیث سے بہتر دلیل کی صورت اس حدیث سے ہے جو صحیحین میں ہے کہ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے حضرت عائشہؓ سے حضرت علیہ السلام کی رات کی نماز کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ رمضان ہو یا غیر رمضان ہو آپ کبھی بھی گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، اس طرح سے کہ چار رکعتیں پڑھتے اتنی عمدہ کہ ان کی خوبی و درازی کو نہ پوچھو، پھر چار پڑھتے اور ان کی خوبی و درازی کو بھی نہ پوچھو آخر حدیث تک، اس سے استدلال اس طرح سے ہے کہ چار چار علیحدہ علیحدہ تھیں ورنہ ایک بار ہی یوں کہدیا جاتا کہ آٹھ ایسی پڑھتے کہ ان کی خوبی و درازی کو مت پوچھو، اور کبھی ایسا کرتے اور کبھی دو دو کر کے پڑھتے، اور اس میں بہت بحث کی ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، اور شافعیہؒ اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ پہلے دو رکعت مختصر سی پڑھتے پھر چار دو دو کر کے چار رکعت رکوع اور سجود کی خوبی اور طویل قراءت سے پڑھتے اس کے بعد پھر چار رکعت دو دو کر کے پہلے سے بھی زیادہ طویل، اس میں پہلی چار اور دوسری چار میں درازی کا فرق ہے، اس کے علاوہ دوسری روایتیں قولی اور فعلی ہر قسم کی دو دو رکعت ہونے پر نص ہیں۔ فاللہ تعالیٰ اعلم۔۔م۔

چند ضروری مسائل

(۱) طلوع فجر کے بعد فرض پڑھنے تک گفتگو مکروہ ہے۔ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اچھی گفتگو کو اس سے مستثنیٰ کرنا چاہئے، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام حضرت عائشہؓ سے باتیں کرتے تھے جیسا کہ پہلے گذر گیا ہے۔م۔
(۲) دیر تک کھڑے ہو کر نماز پڑھنی، زیادہ سجدہ کرنے سے بہتر ہے، یہی بہتر ہے۔ البدائع۔ اس میں امام محمدؒ کا اختلاف ہے۔(۳) نفل کو چھپا کر کرنا، اس کے ظاہر کرنے سے افضل ہے۔
(۴) رات کی نفل نماز دن کی نفل نماز سے بہتر ہے کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ فرض کے بعد وہ نماز افضل ہے

جو رات میں ادا کی گئی ہو، مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔

(۵) آخر رات اپنے پہلے حصہ سے ثواب میں زیادہ ہے۔

(۶) مسافر بلا عذر سنتوں کو نہ چھوڑے، منیۃ المفتی۔

(۷) کوئی شخص رات کو جاگے تو اس کے لئے مستحب ہے کہ آنکھیں مل کر نیند دور کرے۔

(۸) مسواک کرے اور آسمان کو دیکھ کر یہ آیت پڑھے اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ اَلَّذِیْنَ پوری آیت، جیسا کہ صحیحین میں موجود ہے۔

(۹) رات کی عبادت میں اتنا ہی اختیار کرے جتنا وہ آخر تک نباہنے کی صلاحیت رکھتا ہو، بغیر کسی کم و ترک کے۔

(۱۰) مستحب نمازوں میں تحیۃ الوضوء کی دو رکعتیں ہیں، ان کی فضیلت باب الوضوء میں گذر گئی ہے۔

(۱۱) اور ایک مستحب نماز تحیۃ السفر (سفر شروع کرنے سے پہلے دو رکعتیں) ابن ابی شیبہ نے اس کی روایت کی ہے۔

(۱۲) اور دو رکعتیں سفر سے واپس آنے پر مسجد میں، جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے۔

(۱۳) اور دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی، جیسا کہ صحیحین میں ہے، اس کے بارے میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ سنت ہیں۔

(۱۴) اور بر روزانہ دو رکعتیں ایک مرتبہ کافی ہیں۔

(۱۵) اگر امام نماز فرض پڑھا رہا ہو یا مؤذن اذان کہنے لگا تو بالاتفاق تحیۃ المسجد معاف ہے۔ مع، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر امام خطبہ کی حالت میں ہو تو صحیح حدیث کی بناء پر مختصر سی دو رکعتیں جائز ہیں، مگر میرے نزدیک اس میں اشکال بھی ہوتا ہے البتہ اگر امام اتنی دیر خاموش ہو جائے (تو پھر کوئی حرج نہیں ہے) واللہ اعلم۔

(۱۶) اور مستحب نمازوں میں سے استخارہ کی دو رکعتیں۔

(۱۷) اور صلوۃ التسبیح کی چار رکعتیں۔

(۱۸) اور ایک ضعیف حدیث میں صلوۃ الحاجۃ کی دو رکعتیں بھی ہیں۔ مع۔ البحر۔

(۱۹) اور لکھا ہے کہ شب برات یعنی ماہ شعبان کی پندرہویں تاریخ میں رات کو عبادت کی حدیث موضوع ہے، جیسا کہ علم الشہور میں ہے، اور ابن وجیہ نے کہا ہے کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کچھ صحیح روایت نہیں ہے۔ مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ ترمذی میں روایت موجود ہے لیکن اس کے موضوع ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، اور شاید کہ موضوع ہو جیسا کہ عینیؒ نے فرمایا ہے، واللہ اعلم۔ م۔

(۲۰) دونوں عیدوں کی راتوں میں عبادت کرنی مستحب ہے۔ ع۔

(۲۱) میں کہتا ہوں کہ شب قدر میں رات کو جاگ کر عبادت میں مشغول رہنا صحیح اور معروف ہے، اور ان شاء اللہ اس کی مزید بحث کتاب الصوم میں آئے گی، واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کے یہاں ان کی برکت کی دعا کی خواہش پر دو رکعتیں پڑھی تھیں، اس میں احتمال ہے کہ شاید ان کے لئے یہ مخصوص ہوں، واللہ اعلم۔

نماز استخارہ

تمام نیک کاموں میں خواہ وہ ضروریات میں سے ہوں یا عبادات میں سے ہوں۔ المرقاۃ۔ مگر عبادات میں مثلاً حج اور جہاد وغیرہ چونکہ خود ہی بلاشبہ بہتر ہیں اس لئے نفس کام کے لئے تو استخارہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس واسطے کرنا چاہئے کہ ابھی کرنا چاہئے یا نہیں، غنیۃ المستملی الحلبی، اور دوسرے کاموں میں جو اہتمام کے لائق اور کامیاب نادر الوجود ہو جیسے سفر کرنا، عمارت بنانا۔ وغیرہ۔ لیکن کھانے اور پینے وغیرہ جیسے کاموں کے لئے نہیں کرنا چاہئے۔ اللمعات۔ کہ جب کوئی اہم کام پیش آئے تو نفل دو

رکعتیں پڑھ کر یہ کہے اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْتَخِیْرُكَ بِعِلْمِكَ وَ اَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَ اَسْاَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِیْمِ، فَاِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ اَقْدِرُ وَ تَعْلَمُ وَلاَ اَعْلَمُ وَاَنْتَ عَلاَّمُ الْغُیُوْبِ، اَللّٰھُمَّ اِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ اَنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ خَیْرٌ لِّیْ فِیْ دِیْنِیْ وَمَعَاشِیْ وَ عَاقِبَةِ اَمْرِیْ اَوْ عَاجِلَ اَمْرِیْ اَوْ آجِلِهٖ فَاصْرِفْهُ عَنِّیْ وَ اصْرِفْنِیْ عَنْهُ وَاقْدِرْ لِیَ الْخَیْرَ حَیْثُ كَانَ ثُمَّ ارْضِنِیْ بِهٖ۔ مسلم اور سنن اربعہ نے جابر بن عبداللہؓ سے روایت کی ہے، اس سے اتنا اور بھی زیادہ کیا ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ، ابن حبان نے ابو سعید خدریؓ سے اور اگر نکاح میں استخارہ مقصود ہو تو عورت کے باپ کے نام کے ساتھ عورت کا نام بھی بیان کرے، ابن حبان اور حاکم نے ابوایوب انصاریؓ سے، صحیح احادیث میں استخارہ کی تعلیم کرنے کا حکم اور اس کے چھوڑ دینے پر بد بختی کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ الحصن۔ استخارہ سات بار تک کرے، پھر دل میں جو بات جم جائے وہی بہتر ہو گی جیسا کہ اس کی روایت ابن السنی نے انسؓ سے کی ہے، غنیۃ المستملی لحلبی۔

نماز حاجت

اگر اللہ تعالیٰ کی طرف یا بظاہر کسی آدمی کی جانب کوئی حاجت ہو تو اچھی طرح وضوء کر کے دو رکعت نفل پڑھ کر اس طرح دعا مانگے کہ پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیج کر یوں کہے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَلِیْمُ الْكَرِیْمُ سُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ، اَسْاَلُكَ مُوْجِبَاتِ رَحْمَتِكَ وَعَزَائِمَ مَغْفِرَتِكَ وَالْعِصْمَةَ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَالْغَنِیْمَةَ مِنْ كُلِّ بِرٍّ وَالسَّلَامَةَ مِنْ كُلِّ اِثْمٍ (مض، ت) لا تدع لی ذنبا الا غفرته ولاهما الا فرجته ولاحاجة هی لك رضاً الا تغیثها یاارحم الرحمین. ت.

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت کے بعد یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَیْكَ بِنَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰی رَبِّیْ فِیْ حَاجَتِیْ هٰذِهٖ لِتَقْضِیْ لِیَ اَللّٰهُمَّ فَشَفِّعْهُ فِیَّ. ت. س. ق.

صلوۃ التسبیح

جو کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا عباس بن مطلبؓ کو بہت بڑا عطیہ رحمت فرماتے ہوئے کہا کہ جب آپ نے اسے کر لیا تو اللہ تعالیٰ آپ کے گناہوں کو اگلے اور پچھلے، پرانے اور نئے، بھولے اور چوکے اور عمداً کئے ہوئے خواہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ، خواہ پوشیدہ ہوں یا ظاہر سب بخشدے گا، وہ یہ ہے کہ آپ چار رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ ہر رکعت میں سورہ الحمد اور ایک سورہ پڑھ کر جب قراءت ختم کر لیں تو کھڑے کھڑے سبحان اللہ والحمدللہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر پندرہ مرتبے پڑھیں، پھر رکوع کرے اور رکوع کی حالت میں اسی تسبیح کو دس بار پڑھیں (یعنی سبحان ربی العظیم پڑھ لینے کے بعد) پھر رکوع سے سر اٹھا کر اسے دس بار پڑھیں پھر سجدہ کریں اور اسی سجدہ میں دس بار اسے پڑھیں (یعنی سبحان ربی الاعلیٰ پڑھ لینے کے بعد) پھر سجدہ سے سر اٹھا کر اسے دس بار پڑھیں پھر دوسرا سجدہ کریں اسی حالت میں پھر اسے دس بار پڑھیں، پھر دوسرے سجدہ سے سر اٹھا کر کھڑے ہونے سے پہلے دس بار اسی کو پڑھیں یہانتک ایک رکعت میں پچھتر بار تسبیح ہوئی، اسی طرح چاروں رکعتیں پڑھیں، اگر آپ سے ہو سکے تو ہر روز ایک بار پڑھ لیں، اور اگر نہ پڑھ سکیں تو ہر جمعہ میں ایک بار پڑھیں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ہر مہینہ میں ایک بار پڑھیں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ہر سال میں ایک بار پڑھیں، اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم عمر بھر میں ایک بار تو پڑھ لیں، اس کی روایت ابوداؤد، ابن ماجہ، حاکم، ابن حبان نے ابن عباسؓ سے مرفوعاً کی ہے، اور اسی کی روایت ابن ماجہ اور ترمذی نے ابو رافعؓ سے کی ہے، اور اسی باب میں عبداللہ بن عمر اور فضل بن عباسؓ سے بھی روایتیں ہیں، ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور دار قطنی نے اسے اصح قرار دیا ہے۔

واضح ہو کہ اس طرح پڑھنے میں دوسرے سجدے سے سر اٹھانے کے بعد دس بار کہنا مذکور ہے، اور بعض حنفیہ نے فتاویٰ میں

اس سے بچنے کے لئے دس بار کو قراءت سے پہلے کہنے کے لئے لکھا ہے، مگر میں مترجم کے نزدیک یہ لغو بات ہے، کیونکہ جلسہ استراحت کے بارے میں صحیح حدیث موجود ہے، لہٰذا یہ اجتہادی مسئلہ ہوا، زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فرائض میں احتیاطاً نہیں بیٹھنا چاہئے، اور میں مترجم نے افعال نماز میں اس طرف پہلے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ استراحت بوڑھے آدمیوں اور ضعیفوں کے واسطے ہے، اس طرح یہ اختلاف در حقیقت صرف بہتر اور مختار ہونے کے بارے میں ہے، اس کے برخلاف جو حضرات صلوٰۃ التسبیح میں اپنا قول پیش کرتے ہوئے مداخلت کرتے ہیں وہ توامر توقیفی (شریعت کی طرف سے مقرر کردہ امر) کو بدل دیتے ہیں، لیکن حضرت عبداللہ بن المبارک اور دوسرے صالحینؒ سے یوں بھی منقول ہے، بہر صورت اصح طریقہ وہی ہے جو ابھی حدیث میں ذکر کیا گیا ہے۔م۔ مطلق نفل کو ہر وقت ادا کرنا مستحب ہے، محیط السرخسی، یعنی مکروہ اوقات کے علاوہ یعنی بعد فجر بعد عصر اور وقت طلوع وغروب اور ٹھیک دوپہر کے وقت۔م۔

مختلف مسائل

شمس الائمہ حلوائیؒ نے کہا ہے کہ (۱) افضل یہ ہے کہ تراویح کے ماسوا ساری سنتیں اور نوافل گھر ہی میں پڑھی جائیں۔ النہایہ۔ یہی صحیح ہے، لیکن زمانہ کے لحاظ سے عوام مسجد ہی میں فرائض کے بعد پڑھیں اور خواص بھی ان کے اطمینان کے لئے پڑھیں تو کوئی حرج نہ ہوگا، بظاہر اسی وجہ سے کافی میں اسے لکھا ہے۔م۔

(۲) چار رکعت کی سنتوں میں جو ظہر اور جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد میں ہیں درمیان قعدہ میں (یعنی دوسری رکعت میں) درود نہ پڑھی جائے (۳) اسی طرح تیسری رکعت میں کھڑے ہو کر ثنا سبحانک اللھم آخر تک نہ پڑھی جائے، بخلاف دوسری چار رکعت والی نفل نمازوں کے۔ الزاہدی۔ (۴) اگر فجر کی سنت یا ظہر سے پہلے کی سنت کے بعد کوئی خرید فروخت میں مشغول ہو تو اسے سنت دوبارہ پڑھنی چاہئے، (۵) اور ایک لقمہ یا گھونٹ کھانے پینے سے یہ سنت باطل نہ ہوگی۔ الخلاصہ۔

لیکن باتیں کرنے سے ثواب کم ہو جائے گا۔ النہایہ۔ اور صحیح یہ ہے کہ اچھی باتوں سے کچھ کمی نہ ہوگی، جیسا کہ ہم نے پہلے بھی بیان کر دیا ہے۔م۔ (۶) اگر کوئی چار رکعت نفل میں دو رکعتوں کے بعد قصداً نہیں بیٹھا تو شیخین کے نزدیک استحساناً فاسد نہ ہوگی (۷) اور امام صفار نے ذکر کیا ہے کہ سجدہ سہو کرے اور امام محمدؒ کے نزدیک قیاس کے مطابق نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر تین رکعتیں ہوں تو اصح قول کے مطابق فاسد ہوگی (۸) اور وتر نماز امام اعظمؒ کے قول کے مطابق استحساناً فاسد نہیں ہوگی، لیکن قیاس کے مطابق فاسد ہوگی، اور اسی کو قبول کیا گیا ہے۔ الخلاصہ۔

فصل فی القراءۃ

والقراءۃ فی الفرض واجبة فی الرکعتین، وقال الشافعی فی الرکعات کلها لقوله علیه السلام: لا صلاۃ الا بقراءۃ، وکل رکعة صلاۃ، وقال مالك فی ثلاث رکعات اقامة للأکثر مقام الکل تیسیرا، ولنا قوله تعالی ﴿فاقرء وا ما تیسر من القرآن﴾ والأمر بالفعل لا یقتضی التکرار، وإنما أوجبنا فی الثانیة استدلالا بالأولی لأنهما تتشاکلان من کل وجه، فأمر الأخریان تفارقانهما فی حق السقوط بالسفر، وصفة القراءۃ وقدرها فلا تلحقان بهما.

ترجمہ:۔ فصل، قراءت کے بیان میں، فرض کی دو رکعتوں میں قراءت قرآن پاک واجب ہے، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ تمام رکعتوں میں واجب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بغیر قراءت کے نماز نہیں ہے، اور ہر رکعت نماز ہوتی ہے، اور امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ تین رکعتوں میں کافی ہے، اکثر رکعتوں کو کل کے قائم مقام کرتے ہوئے، آسانی کی غرض سے، اور ہماری دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے کہ تم قرآن سے اتنا پڑھو جو آسان ہو، اور کسی کام کے کرنے کا حکم اس کے بار بار کرنے کا

تقاضا نہیں کرتا ہے، اور ہم نے دوسری رکعت میں بھی اس لئے ضروری کہا ہے کہ وہ تو بالکل پہلی جیسی ہوتی ہے، کیونکہ یہ دوسری رکعت ہر طرح سے پہلی کے مشابہہ ہوتی ہے، لیکن آخری دونوں پہلی سے بہت علیحدہ ہوتی ہیں، کہ وہ سفر میں ساقط ہو جاتی ہیں اسی طرح سنت قراءۃ میں بھی اور اس کی مقدار میں بھی پہلے سے مختلف ہوتی ہیں، اس لئے آخری دونوں رکعتیں پہلی دونوں رکعتوں کے ساتھ ملحق نہیں ہو سکتی ہیں۔

توضیح:۔ قراءت کے بیان میں، فرض نماز میں قراءت، دلائل، صفت قراءت، مقدار قراءت

والقراءۃ فی الفرض واجبۃ فی الرکعتین......الخ

فرض نماز کی دو رکعتوں میں قراءت واجب ہے۔ف۔ یعنی فرض کی دو رکعتوں میں قراءت قرآن تو اصل میں فرض ہے، لیکن پہلی دو رکعتوں میں قراءت کرنی واجب ہے اپنے مذہب میں صحیح قول یہی ہے، اور اصل میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ الفتح۔ اور تحفہ وغیرہ میں اسی قول کو صحیح کہا ہے۔ مع۔ اور قدوری وغیرہ کا مذہب یہ ہے کہ بلا تعین دو رکعتوں میں واجب ہے، ایسا ہی البدائع میں بھی ہے، اسی بناء پر اگر کوئی مکمل طریقہ سے قراءت ترک کر دے یا صرف ایک ہی رکعت میں قراءت کرے تو اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، اور اگر کوئی اولین کے بجائے اخیرین میں قراءت کر لے تو اس کی نماز صحیح ہو گی لیکن سجدہ سہو واجب ہو گا ایسا ہی فتح القدیر میں ہے، اور قدوری وغیرہ کے قول کے مطابق سجدہ سہو بھی لازم نہ ہو گا، اگرچہ پہلی دونوں رکعتوں میں قراءت کی تعیین نہیں کی ہے۔م۔

وقال الشافعی فی الرکعات کلھا لقولہ علیہ السلام: لا صلاۃ الا بقراءۃ، وکل رکعۃ صلاۃ......الخ

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ فرض نماز کی ہر رکعت میں قراءت واجب ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ بغیر قراءت نماز نہیں ہے۔ف۔ اس کی روایت مسلم نے کی ہے، اس لئے ہر نماز میں قراءت واجب ہوئی، یہ بات معلوم ہے کہ یہ حدیث آحاد کی قسم میں سے ہے اس لئے اس سے قطعی فرض کا ثبوت نہیں ہو سکتا ہے، ہاں وجوب ہو سکتا ہے، لیکن ہر رکعت کو مستقل نماز کہنا مشکل ہے۔م۔ اور یہی دعویٰ اور دلیل امام مالکؒ کی بھی ہے، لیکن دونوں امام کے قول میں جو فرق ہے اسے مصنفؒ نے اس طرح ذکر کیا ہے۔

وقال مالک فی ثلاث رکعات اقامۃ للأکثر مقام الکل تیسیرا......الخ

اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ صرف تین رکعتوں میں فرض ہے۔ف۔ یعنی اصل میں تو چاروں رکعتوں میں فرض ہے لیکن تین رکعتوں میں ہونا کافی ہے، اقامۃ للاکثر الخ کیونکہ نمازیوں کو آسانی ہونے کے خیال سے اکثر حصہ کو کل کے قائم مقام کا حکم دیا جائے گا۔ف۔ اس لحاظ سے شاید مغرب میں دو ہی رکعت میں قراءت کافی ہو، یہ استدلال امام شافعیؒ و مالکؒ سے صراحۃ منقول نہیں ہے، بلکہ صریح حدیث وہ ہے جو صحیح بخاری اور مسلم اور دوسروں کی کتابوں میں وہ روایت ہے جو اعرابی کے بارے میں منقول ہے، جس نے نماز بری طرح ادا کی تھی، پھر تیسری مرتبہ خود رسول اللہ ﷺ نے تعلیم کی تھی، چنانچہ اس روایت میں ہے کہ جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تو تکبیر کہو پھر تمہیں جتنا قرآن یاد ہے اس میں سے کچھ پڑھو، اور آخر حدیث میں کہ پوری نماز اسی طرح پڑھو۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اول دو رکعتوں میں سورہ فاتحہ سورہ واجب ہے اگر یہی حدیث دلیل ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ آخری دونوں رکعتوں میں بھی سورہ فاتحہ مع سورہ واجب ہو، اور اس کا کوئی جواب نہیں ہے سوائے ان حادیثوں کے جن میں آخری دو رکعتوں میں صرف فاتحہ پڑھنا مروی ہے۔م۔

ولنا قولہ تعالیٰ ﴿فاقرؤا ما تیسر من القرآن﴾ والأمر بالفعل لا یقتضی التکرار......الخ

اور ہماری دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے فاقرؤا الایۃ یعنی قرآن سے جو آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ف۔اس میں لفظ اقرؤاامر کا صیغہ ہے جس سے پڑھنا فرض ثابت ہوتا ہے، والا مر بالفعل الخ اور جو حکم کسی کام کے لئے ہو وہ ایک بار کرنے سے پورا ہو جاتا ہے تکرار کا تقاضا نہیں کرتا ہے۔ف۔اس لئے نماز میں ایک بار اتنا پڑھ لینے سے جس کو قراءت کہہ سکیں فرض ادا ہو گیا، اس پر اگر یہ کہا جائے کہ پھر تو ایک رکعت میں پڑھ لینے سے امر کی تعمیل ہو گئی اب دوسری رکعت میں بھی پڑھنا کیوں فرض کہا جاتا ہے۔جواب یہ ہے کہ بالاتفاق نماز میں قرآن پڑھنا فرض ہے اس بناء پر ایک رکعت میں پڑھنا نص صریح سے ثابت ہوا۔

وانما أوجبنا في الثانية استدلالا بالأولى لأنهما تتشاكلان من كل وجه......الخ

اور دوسری رکعت میں بھی ہم نے اسی وجہ سے واجب یعنی فرض قرار دیا ہے کہ دلالت النص پہلی رکعت کے ساتھ دوسری رکعت کو تقاضا کرتی ہے۔ف۔یعنی پہلی رکعت میں تو صراحۃ النص سے قراءت فرض ہوئی اور دوسری رکعت میں دلالۃ النص سے لانهما الخ کیونکہ پہلی دونوں رکعتیں ہر طرح سے ایک دوسری کی مشابہ ہیں۔ف۔یعنی اصل ارکان میں دونوں بالکل ایک طرح ہیں۔ع۔اس سے ہم نے یہ جان لیا کہ شریعت کی مراد بھی یہی ہے کہ دوسری رکعت پہلی رکعت کے مثل ہو۔ف۔فاما الاخریان الخ لیکن آخری دو رکعتوں کو پہلی دونوں سے کئی باتوں میں مناسبت نہیں ہے، في حق السقوط الخ ان میں سے چند یہ ہیں (۱) کہ آخری دونوں حالت سفر میں ساقط ہو جاتی ہیں جبکہ دونوں ساقط نہیں ہوتی ہیں (۲) اور قراءت کی صفت میں۔ف۔کہ پہلی دونوں میں تو جہراً پڑھی جاتی ہے اور آخری دونوں میں سراً (آہستگی) کے ساتھ پڑھی جاتی ہے (۳) اور قراءت کی مقدار میں۔ف۔چنانچہ آخیرین میں صرف فاتحہ پڑھی جاتی ہے جبکہ اولین میں سورہ بھی ملائی جاتی ہے، فلا تلحقان الخ الحاصل آخری دونوں پہلی دونوں کے ساتھ ملائی نہیں جاسکتی ہیں۔ف۔

خلاصہ یہ ہوا کہ پہلی رکعت تو صیغہ امر فاقرؤا کے ماتحت صراحۃ داخل ہوئی جبکہ دوسری رکعت دلالۃ داخل ہوئی، لیکن آخری دونوں کو پہلی دونوں سے کوئی مناسبت نہ ہوئی، اور بہتر دلیل یہ بھی ہے کہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ پہلے پہل دو رکعتیں فرض ہوئیں پھر حالت حضر یا اقامت میں دو رکعتیں بڑھادی گئیں جبکہ حالت سفر میں وہی دونوں باقی رہ گئیں، جیسا کہ صحیح میں ہے، اس بناء پر قراءت کے لئے پہلی دو رکعتیں متعین ہو گئی تھی، اور صیغہ امر کا اثر ان دونوں پر ظاہر ہو چکا تھا۔لہٰذا آخری دونوں فرض ہونے کے قابل باقی نہ رہیں۔م۔

اور وہ اعرابی صحابی جو نماز کو صحیح طریقہ سے نہیں پڑھ رہے تھے ان کی تعلیم کے سلسلہ میں جو اسی طرح کل نماز میں پڑھنے کی روایت ہے وہ خبر واحد ہے اس لئے اس سے فرضیت قراءت ثابت نہ ہوگی، پھر ہم نماز کو مجمل نہیں کہتے ہیں کہ اس حدیث کو اس اجمال کے لئے بیان کہہ سکیں۔الفتح۔لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن کی قراءت ایک رکعت میں مطلوب ہے یا پوری رکعتوں میں اس لحاظ سے یہ ایک معنی مجمل ہیں، اور قراءت بلاشبہ رکن نماز ہے، اور حضرات ابو سعید خدری وابو قتادہؓ کی حدیث جن کی روایت صحاح نے کی ہے ان سے اس بات کا فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اخیرین میں قراءت کرتے تھے اس کے برعکس کوئی مرفوع حدیث ایسی نہیں ہے جس میں قراءت کے نہ ہونے کا ثبوت ہو، اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ہمیشہ پڑھنے کا ثبوت ہو جائے تو اس کا حاصل زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ فاتحہ اخیرین میں واجب ہے، لیکن جب صحابہؓ کا قول اس کے خلاف ثابت ہو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ واجب نہیں ہے، اس کی وضاحت اس طرح سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے کہ آپ ہمیشہ ہمیشہ قراءت کرتے تھے اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کسی روایت میں قراءت نہ کرنے کا ثبوت نہیں ملتا ہے، اس کے برعکس ابن ابی شیبہ نے شریک بن ابی اسحٰق السبیعی عن علیؓ وابن مسعودؓ روایت کی ہے کہ ان دونوں صحابہ کرامؓ نے فرمایا ہے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں قراءت کرو، اور آخری دونوں میں تسبیح پڑھو، فع۔یہ اسناد اگرچہ ثقہ راویوں سے ہے مگر منقطع ہے۔م۔امام شافعیؒ کی دلیل اس وقت مکمل ہوگی جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ ہر رکعت کو نماز کہتے ہیں۔

والصلاة فيما روى مذكورة تصريحا فتصرف الى الكاملة، وهي الركعتان عرفا كمن حلف لا يصلي صلاة بخلاف ما اذا حلف لا يصلي وهو مخير في الاخريين، معناه ان شاء سكت وان شاء قرأ وان شاء سبح، كذا روى عن ابى حنيفة وهو المأثور عن علي وابن مسعود وعائشة الا ان الافضل ان يقرأ لأنه عليه السلام داوم على ذلك، ولهذا لا يجب السهو بتركها في ظاهر الرواية.

ترجمہ:-اور وہ روایت جو امام شافعیؒ کی دلیل میں ذکر کی گئی ہے اس میں لفظ "الصلوۃ" تصریحاً موجود ہے، اس لئے یہ لفظ صلوۃ کاملہ کی طرف پھیرا جائے گا، اور صلوۃ سے مراد عرف میں دو رکعتیں ہوا کرتی ہیں، جیسا کہ کسی شخص نے یہ قسم کھائی ہو کہ میں کوئی (صلوۃ) نماز نہیں پڑھونگا، بخلاف اس صورت کے جبکہ قسم کھائی ہو میں نماز نہیں پڑھوگا اور نمازی کو آخری دو رکعتوں میں اختیار ہوگا یعنی اگر وہ چاہے تو اتنی دیر خاموشی رہے اور اگر چاہے تو قراءت کرے اور اگر چاہے تو تسبیح پڑھے، امام ابو حنیفہؒ سے ایسا ہی مروی ہے اور حضرت علیؓ و ابن مسعودؓ و عائشہؓ سے بھی ایسا ہی منقول ہے، مگر یہ کہ افضل یہی ہے کہ قراءت کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی ہے، اسی لئے اس کے چھوٹ جانے سے ظاہر روایت کے مطابق سجدہ سہو لازم نہیں آتا ہے۔

توضیح:-فرض کی آخری دونوں رکعتوں میں نمازی کیا کرے گا، حدیث سے دلیل

والصلاة فيما روى مذكورة تصريحا فتصرف الى الكاملة، وهي الركعتان عرفا......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، لفظ الصلوۃ صلوۃ کاملہ کی طرف پھیرا جائے گا۔ف۔ کیونکہ مطلق لفظ سے اس کا فرد کامل مراد ہوتا ہے، وهي الخ اور عرف میں کم از کم دو رکعتوں کو الصلوۃ بولتے ہیں، کمن حلف جیسے کہ کسی نے قسم کھائی ہو کہ وہ کوئی صلوۃ نہ پڑھے گا۔ف۔ تو دو رکعت پڑھنے سے بھی وہ حانث ہو جائے گا، بخلاف الخ برخلاف اس کے قسم کھاتے ہوئے صرف "لا يصلي" کہا ہو یعنی اس میں لفظ الصلوۃ نہیں کہا تو اس صورت میں البتہ ایک رکعت پڑھنے سے وہ حانث ہو جائے گا، کیونکہ اس میں صراحۃ لفظ الصلوۃ نہیں ہے کہ اس سے صلوۃ کاملہ مراد لی جاسکے، اور عرف شریعت میں نماز دو رکعت سے کم نہیں ہوتی ہے کیونکہ طاق بے جوڑ رکعت سے ممانعت ہے۔ مع۔

وهو مخير في الاخريين، معناه ان شاء سكت وان شاء قرأ وان شاء سبح......الخ

اور نمازی کو آخری دو رکعتوں میں اختیار دیا گیا ہے، معناه الخ اختیار کے معنی یہ ہیں کہ مصلی اگر چاہے تو اخیرین میں خاموش رہے اور چاہے قراءت کرے، اور چاہے تو تسبیح پڑھے، امام ابو حنیفہؒ سے ایسا ہی مروی ہے۔ف۔ یہی ظاہر الروایۃ ہے۔ف۔ وهو المأثور الخ حضرت علی اور ابن مسعودؓ سے تسبیح کرنا ہی مروی ہوا ہے۔ف۔ جس کی روایت ابن ابی شیبہ نے کی ہے، جیسا کہ گذر گیا۔فع۔ اور حضرت عائشہؓ سے بھی۔ف۔ لیکن یہ روایت نہیں ملی۔

الا ان الافضل ان يقرأ لأنه عليه السلام داوم على ذلك، ولهذا لا يجب السهو بتركها في......الخ

مگر افضل صورت یہی ہے کہ اخیرین میں بھی پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت کی ہے، ف، یعنی کبھی کبھی چھوڑ کر اس لئے واجب نہیں ہوئی۔ع۔ ولهذا الخ اسی بناء پر قراءت چھوٹ جانے سے سجدہ سہو واجب نہیں ہوتا ہے، ظاہر الروایت میں۔ف بخلاف الحسن عن ابی حنیفہ کی روایت کے۔ جس کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اخیرین میں خاموش رہنا مکروہ ہے، اگر خاموش رہے گا تو سجدہ سہو واجب ہوگا، ابن الہمامؒ نے ابن ابی شیبہؒ کی منقطع روایت کو امام محمدؒ کی متصل روایت کو حضرت ابن مسعودؓ سے مؤید کر کے کہا ہے کہ آثار سے اسی وقت حجت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ دوسرے صحابہ کرامؓ سے اس کے خلاف ثبوت نہ ہو، ورنہ صحابہ کرامؓ کا اختلاف اس وقت وجوب میں ہوگا تو دلیل احادیث مرفوعہ جس سے مداومت نکلتی ہے اور اس کے مخالف

ترک کا ثبوت نہیں ہوتا ہے وہ دلیل اپنے وجوب کے معنی پر رہے گی، لہٰذا حضرت حسنؒ کی روایت زیادہ محتاط ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اخیرین میں قراءت واجب ہے، اور تعجب یہ ہوتا ہے کہ مشائخ اس مقام پر تو اس طرح کہتے ہیں لیکن جس مسئلہ میں کہ قاری نے امی کو اخیرین میں اپنا قائم مقام بنادیا، اور اس میں امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ یہ صورت جائز ہوگی کیونکہ فرض القراءۃ تو پہلی دو رکعت میں ادا ہو چکا ہے، وہاں بھی مشائخ جواب میں کہتے ہیں کہ قراءت تو ہر ایک رکعت میں فرض ہے اگرچہ وہ دو ہی رکعت میں پڑھ کر ادا کر دی جاتی ہے۔ مختصر الفتح۔

حاصل یہ ہوا کہ ان مشائخ کو اس مسئلہ میں اخیرین میں وجوب قراءت کا قائل ہونا چاہئے تھا، میں مترجم کہتا ہوں کہ حضرت علی وابن مسعودؓ کا وہ اثر جس کا ذکر گذر گیا ہے اس میں اس بات کا احتمال نکل سکتا ہے کہ تسبیح کرنے سے مراد صرف سورہ فاتحہ پڑھنی ہو کیونکہ وہ بھی تو حمد وثنا اور دعا ہے، اور ہمارے نزدیک قول اصح کے مطابق اخیرین میں فاتحہ کے ساتھ سورہ ملانا مکروہ نہیں ہے۔ سمجھ لو۔ اور اب جبکہ حسنؒ کی روایت بہت محتاط مانی گئی ہے تو یوں قراءۃ الفاتحہ مراد لینی چاہئے کیونکہ ابو قتادہؓ کی حدیث جو صحیحین وغیرہ میں ہے اسی بات کا فائدہ ہوتا ہے، یوں بحث کا ماحصل یہ نکلا کہ نماز کی صرف دو رکعت میں قراءت فرض ہے خواہ کوئی بھی دو ہوں، لیکن خاص کر اولین میں پڑھنا واجب ہے، یہانتک کہ اگر کوئی صرف اخیرین میں پڑھے گا تو سجدہ سہو لازم ہوگا۔ علی الصحیح۔ اور اولین میں قراءت کر لینے کے بعد ظاہر مذہب کے مطابق چاہے قرات کرے یا نہ کرے، اور حسنؒ سے امام اعظم کی روایت کے مطابق اخیرین میں قراءت واجب ہے یہانتک کہ ان میں قراءت نہ کرنے سے سجدہ سہو لازم آتا ہے، ابن الہمامؒ نے اسی قول کو احوط کہا ہے، اور عینیؒ کا بھی اسی قول کی طرف میلان ہے، شرح الکنز میں اس بات کی تصریح کر دی ہے، اس بندہ مترجم کے نزدیک قراءت سے سورہ فاتحہ پڑھ لینا صحیح ہے، اور اسی پر فتویٰ دینا چاہئے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

والقراء ة واجبة في جميع ركعات النفل و في جميع ركعات الوتر اما النفل فلان كل شفع منه صلوة على حدة والقيام الى الثالثة كتحريمة مبتدأة و لهذا لايجب بالتحريمة الاولى الاركعتان في المشهور عن اصحابنا ولهذا قالوا يستفتح في الثالثة اى يقول سبحانك اللهم، واما الوتر فللاحتياط، قال ومن شرع في نافلة ثم افسدها قضاها، وقال الشافعيؒ لاقضاء عليه، لانه متبرع فيه ولالزوم على المتبرع، ولنا ان المؤدى وقع قربة، فيلزم الاتمام ضرورة صيانته عن البطلان.

ترجمہ:-اور قراءت واجب ہے نفل کی تمام رکعتوں میں اسی طرح وتر کی تمام رکعتوں میں بھی، نفل میں اس لئے واجب ہے کہ اس کا ہر شفعہ (دو رکعت) مستقل نماز ہے، اور تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہونا ایسا ہے جیسا کہ تکبیر تحریمہ کہنا، اسی بناء پر پہلے تحریمہ سے صرف دو ہی رکعتیں واجب ہوتی ہیں (اس سے زائد نہیں) ہمارے اصحاب کے قول مشہور کے مطابق، اسی بناء پر فقہاء نے کہا ہے کہ تیسری رکعت میں استفتاح کرے گا یعنی سبحانك اللهم پڑھے گا اور وتر کی ہر رکعت میں قراءت احتیاط کی بناء پر ہے، اور جس کسی نے نفل نماز شروع کرنے کے بعد اسے فاسد کر دیا تو وہ اس کی قضاء کرے گا، لیکن امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اس پر قضاء لازم نہ ہوگی کیونکہ وہ شخص اس نماز کے پڑھنے میں تبرع کرنے والا ہے، اور تبرع کرنے والے پر تبرع کرنا لازم نہیں ہوتا ہے، اور ہم احناف کی دلیل یہ ہے کہ جس کام کو وہ ادا کر رہا تھا وہ طاعت میں قربت ہو رہی تھی، اس لئے اسے اس کا پورا کرنا لازم ہوگا، اس قربت کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے۔

توضیح:-نوافل اور وتر میں قراءت کا حکم، نوافل کو شروع کر کے توڑنے کا حکم

والقراء ة واجبة في جميع ركعات النفل و في جميع ركعات الوتر......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے اما النفل الخ نفل کی ہر رکعت میں قراءت اس لئے واجب ہے کہ نفل کی ہر دو رکعت علیحدہ

نماز ہے۔ف۔اگرچہ ایک ساتھ چار رکعتوں کی نیت کرلی جائے والقیام الخ نفل کی تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہونا نئے سرے سے تحریمہ باندھنے کے حکم میں ہے، ولھذا الخ اور چونکہ دو رکعت کا تحریمہ حقیقۃ ہو یا حکماً علیحدہ ہے اسی وجہ سے ہمارے احناف کے مشہور قول میں پہلے تحریمہ پر صرف دو ہی رکعت واجب ہوتی ہے۔ف۔اگرچہ نمازی نے شروع میں چار رکعتوں کی ہی نیت کی ہو، اس لئے اگر اس کے پورا کرنے سے پہلے ہی اسے فاسد کردیا ہو تو اس کو شروع کرلینے کی وجہ سے اس پر صرف دو ہی رکعت کی قضاء لازم آئے گی، اور اگر دو رکعت التحیات تک پوری کرنے کے بعد بلکہ زاہدی اور فتح القدیر کی روایت کے مطابق درود بھی پڑھ کر تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہوا تو اس کا یہ کھڑا ہونا ہی حکماً نیا تحریمہ مانا جائے گا۔

ولھذا قالوا یستفتح فی الثالثۃ ای یقول سبحانك اللھم......الخ

اسی بناء پر مشائخ نے کہا ہے کہ تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے کے بعد استفتاح پڑھے، یعنی سبحانك اللھم آخر تک۔ف۔حالانکہ قیاس تو تھا کہ چار رکعت نفل پڑھنے میں اگر درمیانی قعدہ میں نہ بیٹھا جائے تو فرض چھوٹ جانے کہ وجہ سے نماز فاسد ہو جانی چاہئے جیسا کہ امام زفرؒ کا مذہب ہے، مگر ہم نے اس کو استحساناً ایک نماز مان کر نماز کو صحیح ہونے کا حکم دیا ہے، کیونکہ نفل دو رکعت کی طرح چار رکعت بھی روایت ہے۔ مفع۔اسی استحسان پر قبل ظہر کی چار رکعت سنت میں عمل کیا گیا ہے، بلکہ اس میں تو تیسری رکعت کی ابتداء میں سبحانك اللھم اور پہلے قعدہ کے بعد درود کا بھی حکم نہیں ہے، جیسا کہ گذر گیا ہے۔م۔واما الوتر تو الخ اور وتر کی ہر رکعت میں قراءت کا واجب ہونا تو وہ احتیاط کی بناء پر ہے۔ف۔اگرچہ یہ وتر امام اعظمؒ کے نزدیک واجب ہے اس لئے فرض کا حکم ہونا چاہئے تھا مگر نفل ہونے کی بھی علامتیں اس پر ظاہر ہیں اس لئے ہم نے اس میں بھی احتیاطاً مثل سنت اور نفل کے اس کی ہر رکعت میں قراءت واجب کی ہے کیونکہ یہ قراءت دوسرے ارکان کی طرح ایک ذاتی مقصود رکن ہے بخلاف قعدہ کے۔ مفع۔

ومن شرع فی نافلۃ ثم افسدھا قضاھا......الخ

جس کسی نے نفل نماز شروع کی۔ف۔قصداً اگرچہ مکروہ وقت میں ہو۔ت۔ثم افسدھا الخ پھر اسے فاسد کریا۔ف۔یعنی کسی عذر کی بناء پر کیونکہ اسے بلا عذر فاسد کرنا حرام ہے۔ت۔قضاھا تو وہ اس کی قضاء کرے۔ف۔اس کی قضاء کرنی واجب ہے خواہ عذر کی وجہ سے فاسد کیا ہو یا بغیر عذر۔ت۔نماز ہی کا حکم روزہ، اعتکاف، احرام، حج، عمرہ، اور طواف کا بھی ہے۔د۔البتہ اگر نفل قصداً شروع نہیں کی گئی، بلکہ از خود ہو گئی ہو، یا وہ لازم نہ ہوئی ہو تو اس کی قضاء واجب نہیں ہے، مثلاً کسی نے فرض نماز نہیں پڑھی تھی، اور کسی فرض پڑھنے والے کے پیچھے نفل کی نیت سے شریک ہوا پھر فرض کا خیال کر کے اسے توڑ کر فرض کی نیت سے اس کی اقتداء کرلی تو اس کی قضاء لازم نہ ہوگی، یا اس گمان سے کہ میں خود ہی پڑھ رہا ہوں یا عورت یا بے پڑھے یا بے وضوء کے پیچھے شروع کی پھر فوراً توڑ دی تو اس کی قضاء لازم نہ ہوگی۔ھ۔د۔وقال الشافعی الخ اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ نفل کو شروع کر کے فاسد کردینے سے اس کی قضاء لازم نہیں آتی ہے، کیونکہ نفل پڑھنے کی معاملے میں متبرع یا احسان کرنے والا ہے، اور احسان کرنے والے پر کام لازم نہیں آتا ہے۔ف۔تبرع کے معنی ہیں نیکی اور احسان کرنا، اس لئے اگر کوئی شخص کسی پر احسان کرنا چاہے تو اسے پورا کرنا اس پر لازم نہیں ہوتا ہے۔

ولنا ان المؤدی وقع قربۃ، فیلزم الاتمام ضرورۃ صیانۃ عن البطلان......الخ

ہماری دلیل یہ ہے کہ اس احسان کرنے والے نے جو بس کرلیا ہے وہ اللہ کے نزدیک نیکی شمار کرلی گئی ہے، اور عبادت کی حیثیت پاگئی لہٰذا اسے پورا کرنا ہوگا، ضرورۃ صیانۃ الخ اس عمل کو باطل ہونے سے بچانے کی غرض سے۔ف۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے لَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَکُمْ، یعنی اپنے کو اعمال باطل نہ کرو، اور یہ باطل کرنا مرتد ہو کر بھی ہوتا ہے، اسی طرح اسے فاسد کردینے سے بھی ہوتا ہے، لہٰذا اسے پورا کرنا واجب ہوا، جس کا طریقہ ہے اس کی قضاء کرنا، اب ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ اس

آیت سے باطل کرنا منع ثابت ہوا، یہانتک کہ باطل کرنے سے آدمی گنہگار بھی ہو جاتا ہے، تو پھر اس کی قضاء کس دلیل سے لازم آئی، جواب یہ ہے کہ جس طرح حج اور عمرہ فاسد کر دینے سے ان کی قضاء لازم آتی ہے، اس کی پوری بحث ان شاء اللہ کتاب الصوم میں آئے گی۔ مفع۔

وان صلی اربعا و قرأ فی الاولیین وقعد ثم افسد الاخریین قضی رکعتین، لان الشفع الاول قد تم، والقیام الی الثالثة بمنزلة التحریمة مبتدأة، فیکون ملزما، هذا اذا افسد الاخریین بعد الشروع فیهما، ولو افسد قبل الشروع فی الشفع الثانی لایقضی الاخریین، وعن ابی یوسف انه یقضی اعتبارا للشروع بالنذر ولهما ان الشروع ملزما ما شرع فیه، وما لاصحة له الابه، و صحة الشفع الاول فی النذر لا تتعلق بالثانی، بخلاف الرکعة الثانیة وعلی هذا سنة الظهر، لانها نافلة و قیل یقضی اربعا احتیاطا لانها بمنزلة صلوة واحد.

ترجمہ:- اگر کسی نے چار رکعت نفل کی نیت سے نماز شروع کی اور پہلی دو رکعتوں میں قراءت کی اور دوسری رکعت میں بیٹھا پھر آخری دونوں کو فاسد کر دیا تو وہ صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے گا، کیونکہ پہلا شفع پورا ہو چکا ہے، اور تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہونا گویا اس کے لئے تکبیر تحریمہ کہہ کر شروع کر دینا ہے، اس لئے وہ اس نماز کو بھی اپنے اوپر لازم کرنے والا ہے، یہ حکم اس صورت میں ہوگا جبکہ ان دونوں کو شروع کرنے کے بعد انہیں فاسد کیا ہو، اور اگر دوسرا شفع شروع کرنے سے پہلے اسے فاسد کر دیا ہو تو وہ ان کی قضاء نہیں کرے گا، اور ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ اس کی قضاء کرے گا، شروع کو نذر کے ساتھ قیاس کر کے، اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ شروع کرنے والا لازم کرنے والا ہے اس کو بھی جسے اس نے شروع کیا ہے اور اسے بھی شروع کرنے والا ہے جس کا صحیح ہونا اسی پر موقوف ہے، اور شفع اول کا صحیح ہونا شفع ثانی سے تعلق نہیں رکھتا ہے بخلاف دوسری رکعت کے، اسی اختلاف کے مطابق ظہر کی سنت کا بھی حکم ہے کیونکہ وہ بھی نفل ہے، اور کہا گیا ہے کہ احتیاطاً چار رکعت قضاء کرے گا کیونکہ یہ ایک نماز کے حکم میں ہے۔

توضیح:- چار رکعت نفل شروع کر کے قعدہ اولی کے کھڑے ہونے کے بعد اسے توڑ دینے کا حکم، چار رکعت نفل شروع کر کے شفع ثانی شروع کرنے سے پہلے اسے توڑ دینے کا حکم، قبل ظہر کی سنت کے احکام

وان صلی اربعا و قرأ فی الاولیین وقعد ثم افسد الاخریین قضی رکعتین......الخ

مطلب واضح ہے **هذا اذا** الخ مذکورہ حکم اس صورت میں ہوگا جبکہ دوسرے شفع کو شروع کرنے کے بعد توڑ دیا ہو، اور اگر دوسرے شفع کو شروع کرنے سے پہلے ہی توڑ دیا ہو تو دوسرے شفع کی قضا نہیں کرے گا۔ ف۔ مثلاً دو رکعتوں کے بعد ہی بیٹھے ہوئے سلام پھیر دیا، یا گفتگو کر لی، کیونکہ تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہونے سے ہی وہ رکعت شروع ہو جائے گی، **وعن ابی یوسف**ؒ لیکن امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ اس صورت میں بھی آخری دو رکعت کی قضاء کرے گا **اعتباراً** الخ شروع کرنے کو نذر پر قیاس کر کے۔ ف۔ تو اس روایت کے مطابق ابو یوسف کے نزدیک چاروں رکعتوں کی قضاء کرے گا۔ الفتح۔ یعنی جب چار رکعت کی نیت کر کے نماز شروع کی تو گویا اس نے اپنے اوپر چاروں رکعتوں کی نذر مان لی، اور نذر میں ایسی صورت میں چاروں رکعتوں کی قضاء لازم آتی ہے اس لئے یہاں بھی چاروں کی قضاء کرے۔

ولهما ان الشروع ملزما ما شرع فیه، وما لاصحة له الا به......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ و محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ وہ تو اس چیز کو بھی شروع کرنے والا ہے جسے شروع کر دیا ہے ساتھ ہی ایسی چیز کو بھی شروع کرنے والا ہے کہ یہ چیز اس کے بغیر صحیح نہ ہوتی ہو، مثلاً شروع کرنے سے پہلے تو وہ لازم آئی جسے اس نے شروع کیا ہے یعنی پہلی رکعت ساتھ ہی یہ رکعت چونکہ دوسری رکعت کے بغیر تنہا صحیح نہیں ہوتی ہے اس لئے دوسری کو بھی لازم کر لیا، پس

اس مسئلہ میں تو سب سے پہلے شفع اول کی پہلی رکعت کو اس نے شروع کیا ہے اور فوراً دوسری بھی لازم ہو گئی ساتھ ہی اس نمازی نے دونوں رکعتیں پوری بھی کر دیں لہٰذا دونوں رکعتیں یا پہلا شفع پورا ہو گیا و صحة الشفع الخ اور پہلے شفع کا صحیح ہونا دوسرے شفع کے صحیح ہونے پر موقوف نہیں ہوتا ہے۔ف۔ کہ دوسرا شفع بھی لازم ہو جائے، بخلاف الخ بخلاف دوسری رکعت کے۔ف۔ کہ پہلی رکعت کا صحیح ہونا دوسری رکعت کے صحیح ہونے پر موقوف ہے، اس طرح حاصل یہ ہوا کہ جب پہلا شفع دوسرے شفع کے بغیر صحیح ہو گیا تو اسے نذر پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ چار رکعت کی نذر کردہ نماز تو صرف شروع کرنے سے لازم نہیں ہوتی بلکہ نذر ماننے کی وجہ سے ابتداء ہی سے لازم ہو گئی کیونکہ چاروں ملی ہوئی ہیں، اس جگہ مناسب تر یہی صورت مناسب ہے، برخلاف عینی وعنایہ کے کہ انہوں نے جو کچھ کہا سہواً کہا ہے۔م۔

وعلى هذا سنة الظهر، لانها نافلة و قيل يقضى اربعا احتياطا لانها بمنزلة صلوة واحد......الخ

اسی اختلاف کے مطابق ظہر کی سنت کے بارے میں بھی اختلاف ہے کیونکہ وہ بھی نفل ہے۔ف۔ یعنی فرض سے پہلے اگر چار رکعت سنت کسی نے شروع کی پھر پہلے شفع کو پورا کر کے دوسرا شفع فاسد کر دیا یا دوسرا شروع ہی نہیں کیا تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ شخص چاروں رکعتیں پھر سے پڑھے گا، اور طرفین کے نزدیک پہلی صورت میں صرف دو رکعت کی قضاء کرے گا کیونکہ یہ پہلا شفع مکمل ہو چکا ہے، لیکن دوسری رکعت میں کچھ قضاء نہ ہو گی، اب یہ سوال ہے کہ وہ سنت جو باقی رہ گئی ہے اس کے لئے بعد میں صرف دو رکعت اور پڑھنے سے یعنی دو سلاموں سے سنت ادا ہو جائے گی یا از سر نو پوری چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی تو جواب یہ ہے کہ ہاں بظاہر صرف دو ہی رکعتیں کافی ہو سکتی ہیں، یا از سر نو چار بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔م۔

و قيل يقضى اربعا احتياطا لانها بمنزلة صلوة واحد......الخ

اور بعض مشائخ نے کہا ہے کہ ظہر کی سنت کے مسئلہ میں احتیاطاً چاروں کی قضاء کر لے۔ف۔ بالاتفاق لانها کیونکہ ظہر سے پہلے سنت کی چاروں رکعتیں ایک نماز کے حکم میں ہیں۔ف۔ اس بناء پر نفل کی طرح سے اس کی دو رکعتیں علیحدہ نماز نہیں ہیں، اس لئے اس کی چاروں رکعتوں کی قضاء اسی طرح کی جائے، جس طرح چار رکعت نفل کی نذر مان کر نماز میں آخری دو رکعتیں فاسد کر دینے سے چاروں رکعتوں کی قضاء کرنی ہوتی ہے۔م۔ واضح ہو کہ نفل کی ہر دو رکعت مستقل نماز ہونے کی وجہ سے ظہر کی چار رکعتوں کی سنت دوسری نفلوں سے مخالف ہوتی ہیں اس بناء پر یہ چند مسائل بطور دلیل کے پیش کئے جاتے ہیں۔

اول یہ ہے کہ ظہر کی چار رکعت سنت کے پہلے قعدہ میں التحیات صرف عبده و رسوله تک پڑھی جائے اور درود پڑھے بغیر تیسری رکعت کیلئے کھڑے ہو کر سبحانك اللهم نہیں پڑھی جائے۔

نمبر ۲۔ اگر پہلے قعدہ کی حالت میں نمازی کو اس کے مکان کے متصل پڑوسی کے مکان کی فروخت کئے جانے کی خبر دی گئی اور اس نے فوراً سلام پھیر کر یہ نہ کہا کہ میں حق شفعہ کی بناء پر اسے لینا چاہتا ہوں بلکہ وہ تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا تو اس کا حق شفعہ باطل نہ ہو گا، اس کے برخلاف اگر چار رکعت نفل نماز کی ہو تو اس کا شفعہ باطل ہو جائے گا۔

نمبر ۳۔ اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے قعدہ کی حالت میں طلاق دینے کا اختیار دیا کہ اگر وہ چاہے تو خود کو طلاق دے دے، اور وہ سن کر بھی تیسری رکعت میں چلی گئی تو اس سنت کے مکمل کرنے تک اس کا اختیار باقی رہے گا اس کے برخلاف نفل ہونے کی صورت میں اختیار ختم ہو جائے گا۔

نمبر ۴۔ اگر شوہر نے اپنی بیوی سے خلوت صحیحہ نہیں کی اور تنہا مکان میں ظہر کی سنت پڑھنے لگا، اسی حالت میں اس کی نئی بیوی اس کے قعدہ اولی کی وقت اس کمرہ میں بند کر دی گئی اور شوہر نے اپنی نماز باقی رکھی اور تیسری رکعت پڑھنے لگا یہاں تک کہ نماز مکمل کر لی لیکن اس کے قعدہ اخیرہ ختم ہونے سے پہلے وہ عورت اٹھ کر باہر نکل گئی تو اس کی یہ تنہائی خلوت صحیح نہیں مانی جائے گی جیسا کہ ظہر کے فرض پڑھنے کی صورت میں اس واقعہ کے پیش آنے سے خلوت صحیح نہیں مانی جاتی ہے، چنانچہ اگر اسی وقت شوہر

اسے طلاق دیدی تو اپنے مہر کی وہ مستحق نہ ہوگی اس کے برعکس نفل کی نماز ہونے میں اگر یہ صورت پیش آجائے تو وہ پورے مہر کی حق دار ہوگی۔ فع۔ م۔

یہ چند مسائل اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ ظہر کی چار رکعت سنت سے دو رکعت پڑھ کر چھوڑ دینے کی صورت میں بعد کو پوری چاروں رکعتیں پڑھی جائیں، اور دو سلاموں سے صحیح نہیں مانی جائے، کیونکہ یہ چاروں رکعتیں ایک مستقل نماز ہیں اور نفل نمازوں سے اس سنت کا حکم جدا ہے، یہی قول اصح ہے، جیسا کہ النصاب سے المضمرات میں منقول ہے۔ البحر۔ اور اب عصر اور عشاء سے پہلے کی چار رکعت سنت اور عشاء کے بعد کی سنت کا حکم مثل نوافل کے ہے، یعنی ان میں سے جس شفع کو نمازی فاسد کرے گا صرف اسی کی قضاء لازم آئے گی۔ م۔

اب اس جگہ چار رکعت نفل پڑھنے میں قراءت کرنے یا نہ کرنے کے اعتبار سے کچھ احکام پیدا ہوتے ہیں جن کا مجموعہ سولہ صورتیں اس طرح نکل سکتی ہیں، (۱) چاروں رکعتوں میں قراءت کی تو بالاتفاق نماز جائز ہوگی (۲) چار میں سے کسی ایک رکعت میں بھی قراءت نہیں کی (۳) پہلے شفع میں قراءت ترک کی (۴) صرف دوسرے شفعہ میں ترک کی (۵) صرف پہلی رکعت میں (۶) صرف دوسری رکعت (۷) صرف تیسری رکعت میں (۸) صرف چوتھی رکعت میں (۹) پہلی تین رکعتوں میں (۱۰) پہلی دونوں اور چوتھی میں (۱۱) پہلی رکعت اور تیسری اور چوتھی میں (۱۲) دوسری تیسری اور چوتھی میں (۱۳) پہلی اور تیسری رکعتوں میں (۱۴) پہلی اور چوتھی رکعتوں میں (۱۵) دوسری اور تیسری رکعتوں میں (۱۶) دوسری اور چوتھی رکعتوں میں قراءت ترک کی، تو ان میں سے پہلی پہلی صورت میں تو بالاتفاق نماز صحیح ہوگی اور بقیہ پندرہ صورتیں وہ ہیں جن میں ترک قراءت ہوگی اور ان کے اندر ان کے صحیح اور فاسد ہونے کے بارے میں حنفی تو بالاتفاق نماز صحیح ہوگی اور بقیہ پندرہ صورتیں وہ ہیں جن میں ترک قراءت ہوگی اور ان کے اندر ان کے صحیح اور فاسد ہونے کے بارے میں حنفی تینوں اماموں کے درمیان اختلاف ہے جنہیں مصنفؒ نے آٹھ صورتوں میں ذکر فرمایا ہے۔ ع۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

وان صلى اربعا ولم يقرأ فيهن شيئا اعاد ركعتين وهذا عند ابى حنيفة و محمدؒ و عند ابى يوسف يقضى اربعا وهذه المسألة على ثمانية اوجه والاصل فيها ان عند محمد ترك القراءة فى الاولين او فى احدهما يوجب بطلان التحريمة لانها تعقد للافعال و عند ابى يوسف ترك القرأة فى الشفع الاول لايوجب بطلان التحريمة وانما يوجب فساد الاداء لان القراءة ركن زائد الاترى ان للصلوة وجودا بدونها غير انه لا صحة للاداء الابها و فساد الاداء لايزيد على تركه فلايبطل التحريمة وعند ابى حنيفة ترك القراءة فى الاوليين يوجب بطلان التحريمة و فى احدهما لايوجب لان كل شفع من التطوع صلوة عليحدة و فسادها بترك القراءة فى ركعة واحدة مجتهد فيه فقضينا بالفساد فى حق وجوب القضاء و حكمنا ببقاء التحريمة فى حق لزوم الشفع الثانى احتياطا اذا ثبت هذا نقول اذا لم يقرأ فى الكل قضى ركعتين عندهما لان التحريمة قد بطلت بترك القراءة فى الشفع الاول عندهما فلم يصح الشروع فى الثانى و بقيت عند ابى يوسف فصح الشروع فى الشفع الثانى ثم اذا فسد الكل بترك القراءة فيه فعليه قضاء الاربع عنده.

ترجمہ: -اگر کسی شخص نے چار رکعتیں نفل نماز اس طرح پڑھی کہ ان میں سے کسی ایک میں بھی قراءت نہیں کی تو وہ بعد میں صرف دو رکعتیں ادا کرے گا، یہ حکم امام ابو حنیفہؒ اور محمدؒ کا ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ایسا شخص چاروں رکعتوں کی قضاء کرے گا، اس مسئلہ کی آٹھ صورتیں نکل سکتی ہیں، ان مسائل کی اصل یہ ہے کہ امام محمدؒ کے نزدیک پہلی دونوں رکعتوں یا ان میں سے کسی ایک میں قراءت ترک ہونا اصل تحریمہ کو باطل کر دیتا ہے، کیونکہ تحریمہ باندھنے کا مقصد ہی افعال ادا کرنا ہے، اور (۲) امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شفع اول میں ترک قراءت تحریمہ کے باطل ہونے کو لازم نہیں کرتا ہے کیونکہ قراءت ایک رکن

زائد ہے، کیا نہیں دیکھتے ہو کہ قراءت کے بغیر بھی نماز ہو سکتی ہے، سوائے اس کے کہ اس کے بغیر نماز صحیح نہیں ہوتی ہے، اور اداء کا فساد اس کے ترک سے زیادہ نہیں ہو سکتا ہے اس لئے تحریمہ کو باطل نہیں کرے گا اور (۳) امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک پہلی دو رکعتوں میں ترک قراءت تحریمہ کو لازمی طریقہ سے باطل کر دیتا ہے اور صرف کسی ایک رکعت میں ترک قراءت کرنا تحریمہ کے باطل ہونے کو لازم نہیں کرتا ہے، کیونکہ نفل کا ہر شفع ایک مستقل نماز ہے، اور صرف ایک رکعت میں ترک قراءت سے فاسد ہونے میں اجتہاد کو دخل ہے، اس لئے قضاء کے واجب ہونے کے بارے میں ہم نے فساد کا فیصلہ کیا ہے اور تحریمہ کے باقی رہنے کا ہم نے احتیاطاً حکم دیا ہے شفع دوم کے لازم ہونے کے حق میں، اب جبکہ یہ اصل واضح ہو گیا تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جب نمازی نے کسی رکعت میں بھی قراءت نہیں کی تو طرفینؒ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے گا، کیونکہ ان دونوں حضرات کے نزدیک شفع اول میں ترک قراءت ہوئی ہے، اس لئے دوسرے شفع کو شروع کرنا ہی صحیح نہیں ہوا، لیکن امام ابو یوسفؒ کے نزدیک تحریمہ باقی رہ گیا ہے اس بناء پر شفع ثانی شروع کرنا صحیح ہوا پھر ترک قراءت سے جب پوری رکعتیں فاسد ہو گئیں تو ان کے نزدیک چاروں رکعتوں کی قضا لازم آجائے گی۔

توضیح:- نفل کی چار رکعتیں کسی نے شروع کیں مگر کسی میں قراءت نہیں کی تو کیا حکم ہوگا، مزید تفصیل

وان صلی اربعا ولم یقرأ فیهن شیئا اعاد رکعتین وهذا عند ابی حنیفة و محمدؒ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے اس مسئلہ میں کسی نے چار رکعت نفل نماز کی نیت کی تو ان میں قراءت کرنے اور نہ کرنے کے اعتبار سے اس جگہ کل سولہ احتمالات نکل سکتے ہی، جن میں سے ایک صورت میں بالاتفاق تینوں اکابر احناف کے نزدیک نماز صحیح ہو گی یعنی وہ صورت ہے جبکہ چاروں رکعتوں میں قراءت کرلی ہو، اور بقیہ پندرہ سورتوں میں ان ائمہ کے درمیان اختلاف ہے، ان میں یہ اختلاف ان کے اپنے اصول ہونے کی بناء پر ہوتا ہے، اسی بناء پر ان صورتوں کو مصنفؒ نے آٹھ صورتوں میں بیان کیا ہے، اس جگہ صرف پہلی صورت بیان کر کے اس میں اختلاف واضح کیا گیا ہے، اسی میں تینوں اکابر وائمہ احناف کے اصول مصنفؒ نے خود ہی تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، ان اصول کو ذہن میں رکھ کر تفصیل سمجھنے میں سہولت ہوتی ہے۔

وهذه المسألة علی ثمانیة اوجه والاصل فیها ان عند محمد ترك القراءة فی الاولین......الخ

اس مسئلہ کی آٹھ صورتیں ہوتی ہیں، ف۔ اگرچہ پندرہ صورتیں نکلتی ہیں، مگر حکم کے اعتبار سے آٹھ صورتیں ہوتی ہیں، **والاصل فیها الخ** اس مسئلہ میں امام محمدؒ کی اصل یہ ہے کہ شفع اول کی دونوں رکعتوں یا صرف ایک رکعت میں بھی قراءت چھوڑ دینے سے اس شفعہ کا تحریمہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔ ف۔ اور جب پہلے شفع کے افعال باطل ہو گے تو ان کا تحریمہ ہی باطل ہو گیا۔ ف۔ اور دوسرے شفع کی بنیاد پہلے شفعہ کے صحیح ہونے پر موقوف ہوتی ہے تو پہلے شفع کے تحریمہ کے باطل ہوتے ہی دوسرے شفع کی بنیاد قائم نہ ہو سکی اور تیسری رکعت کے لئے نمازی کے کھڑے ہو جانے سے جو تحریمہ ہو جاتا ہے وہ نہ ہو سکا، لہذا اس شفع دوم کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔ م۔

و عند ابی یوسف ترك القرأة فی الشفع الاول لایوجب بطلان التحریمة......الخ

اور امام ابو یوسفؒ کی اصل یہ ہے کہ شفع میں ترک قراءت سے تحریمہ بالکل باطل نہیں ہوتا ہے بلکہ اس سے تو صرف ایک عمل خراب ہوتا ہے، کیونکہ قراءت اگرچہ ایک رکن ہے مگر رکن زائد ہے، کیونکہ قراءت کے بغیر بھی نماز ہو جاتی ہے۔ ف۔ جیسے گونگے کی نماز بغیر قراءت صحیح ہو جاتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قراءت اسی شخص کے حق میں شرط ہے جو اس پر قادر ہو البتہ بغیر قراءت کے نماز کی ادائیگی صحیح نہیں ہوتی ہے۔ ف۔ اس شخص کے لئے جسے قراءت پر قدرت حاصل ہو۔

و فساد الاداء لایزید علی ترکه فلایبطل التحریمه......الخ

اور اداء کو ترک کر دینے سے اس اداء کا فاسد ہونا بڑھا ہوا نہیں ہوتا ہے۔ف۔ مثلاً نماز کی حالت میں کسی کو حدث ہو جائے تو اس سے نماز کی ادائیگی رک گئی مگر اس کا تحریمہ باطل نہیں ہوتا ہے، اسی بناء پر وضو کر لینے کے بعد اسی تحریمہ پر بناء کرنا یعنی صرف بقیہ نماز پڑھنی کافی ہے، از سر نو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، پس اداء فاسد سے تحریمہ کیوں ٹوٹے گا۔ حاصل یہ نکلا کہ دوسرے شفع کی بنیاد بھی صحیح ہو گی اور چاروں رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی۔

وعند ابی حنیفة ترك القراءة فی الاولیین یوجب بطلان التحریمة و فی احدهما لایوجب......الخ

امام اعظم کی بنیاد یہ ہے کہ شفع اول کی دونوں رکعتوں میں ترک قراءت سے تحریمہ باطل ہو گا لیکن صرف ایک رکعت میں ترک سے تحریمہ باطل نہ ہو گا کیونکہ نفل کی ہر دو رکعت ایک مستقل نماز ہے، اور یہ شفع اس وقت فاسد ہو گا جبکہ دونوں رکعتوں میں ترک قراءت ہو۔ف۔ دونوں رکعتوں میں چھوڑ دینے سے تو بالاتفاق تحریمہ باطل ہو جائے گا، اور ایک رکعت میں چھوڑ دینے سے فساد میں اختلاف ہو جاتا ہے کیونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہو گیا ہے۔ف۔ یعنی بعض علماء کے نزدیک فاسد نہیں ہوتی ہے۔

فقضینا بالفساد فی حق و جوب القضاء و حکمنا ببقاء التحریمة فی حق لزوم......الخ

چنانچہ احتیاطاً فساد کا ہم نے حکم لگایا تا کہ اس کی قضاء کرنی پڑے، اور تحریمہ کے باقی رہنے کا ہم نے حکم لگایا تا کہ اس کے بعد دوسرے شفع کی بنیاد اس پر صحیح ہو سکے۔ف۔ کیونکہ احتیاط کی صورت یہی ہے کہ قضاء واجب ہو اور دوسری احتیاط یہ ہے کہ تحریمہ باطل نہ ہو کہ دوسرا شفع لازم آجائے، اس جگہ اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ دونوں رکعتوں میں بھی ترک قراءت میں اختلاف پایا گیا ہے کیونکہ اس میں اجتہاد کیا گیا ہے، یہانتک کہ بعض علماء کے نزدیک جائز ہے۔

جواب یہ ہے کہ یہ قول بالکل کمزور اور اضعف ہے اس لئے اس کا اعتبار نہیں کیا گیا ہے۔ م۔ ع۔ اذا ثبت الخ جب تینوں ائمہ کرام کے اصول بیان کئے جا چکے تو ہم کہتے ہیں کہ مسئلہ مذکورہ میں کسی رکعت میں بھی قراءت نہیں کی تو امام ابو حنیفہؒ و امام محمدؒ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی کیونکہ پہلے شفع کی دونوں رکعتوں میں قراءت ترک کرنے سے ان دونوں حضرات کے نزدیک تحریمہ باطل ہو گیا اور دوسرے شفع کو شروع کرنا ہی صحیح نہیں ہوا۔ف۔ لہٰذا صرف پہلے شفع کی قضاء لازم آئے گی، و بقیت الخ اور امام ابو یوسفؒ کی اصل پر چونکہ تحریمہ باقی رہ گیا ہے لہٰذا دوسرے شفع کو شروع کرنا بھی صحیح ہو گیا، پھر جب اس نے دونوں شفعوں کو فاسد کیا اس طرح کہ اس نے دونوں میں قراءت ترک کر دی تو اس پر چاروں رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی۔

شرح الوقایہ ج اسے یہ نقشہ نقل کیا گیا ہے، ذیل کے نقشہ میں قراءت کرنے اور نہ کرنے کی احتمالی سولہ صورتوں کو دکھایا گیا ہے۔ ق سے قراءت اور ک سے ترک قراءت کی طرف اشارہ ہے۔

	شفع اول		شفع ثانی	
	رکعت اولی	ثانیہ	ثالثہ	رابعہ
۱	ق	ق	ق	ق
۲	ایضا	ایضا	ک	ایضا
۳	ایضا	ایضا	ق	ک
۴	ایضا	ایضا	ک	ق
۵	ایضا	ک	ق	ایضا

۶	ک	ق	ایضا	ایضا
۷	ایضا	ک	ایضا	ایضا
۸	ایضا	ایضا	ک	ک
۹	ایضا	ایضا	ق	ایضا
۱۰	ایضا	ایضا	ک	ق
۱۱	ایضا	ق	ق	ک
۱۲	ایضا	ایضا	ک	ق
۱۳	ق	ک	ایضا	ایضا
۱۴	ایضا	ایضا	ق	ک
۱۵	ک	ق	ک	ایضا
۱۶	ق	ک	ایضا	ایضا

ولو قرأ في الاولیین لا غیر فعلیه قضاء الاخریین بالاجماع لان التحریمة لم تبطل فصح الشروع في الشفع الثاني ثم فساده بترك القراء ة لایوجب فساد الشفع الاول ولو قرأ في الاخریین لا غیر فعلیه قضاء الاولیین بالاجماع لان عندهما لم یصح الشروع بالشفع الثاني وعند ابي یوسفؒ ان صح فقد اداهما ولو قرأ في الاولیین واحدی الاخریین فعلیه قضاء الاخریین بالاجماع ولو قرأ في الاخریین واحدی الاولیین فعلیه قضاء الاولیین بالاجماع، ولو قرأ في احدی الاولیین واحدی الاخریین علی قول ابي یوسف قضاء الاربع وکذا عند ابي حنیفة لان التحریمة باقیة وعند محمد قضاء الاولیین لان التحریمة قد ارتفعت عنده وقد انکر ابویوسفؒ هذه الروایة عنه و قال رویت لك عن ابي حنیفة انه یلزمه قضاء رکعتین ومحمد لم یرجع عن روایة عنه.

ترجمہ:-اور اگر صرف پہلی دو رکعتوں میں قراءت کی یعنی بقیہ میں نہیں کی تو بالاتفاق اس پر آخری دونوں رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی، کیونکہ اس کا پہلا تحریمہ باطل نہیں ہوا اس لئے دوسرے شفع کو شروع کرنا صحیح ہوا لیکن ان میں قراءت نہ کرنے کی وجہ سے جو فساد لازم آیا ہے اس کی وجہ سے شفع کا فاسد ہونا لازم نہیں آیا ہے، اور اگر صرف شفع ثانی میں قراءت کی اور شفع اول میں نہیں کی تو اس پر بالاتفاق پہلی اور دوسری رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی، کیونکہ طرفین کے نزدیک شفع ثانی کو شروع کرنا ہی صحیح نہیں ہوا، لیکن امام ابویوسف کے نزدیک اگرچہ اخیرین کا شروع کرنا صحیح ہوا تو ساتھ ہی ان دونوں کو اس نے ادا بھی کرلیا ہے۔

(۴) اور اگر پہلی دونوں رکعتوں کے ساتھ آخری دونوں میں سے کسی ایک رکعت میں بھی قراءت کی تو بالاتفاق اسے صرف آخری دونوں رکعتوں کی قضاء کرنی ہوگی، اور اگر آخری دونوں رکعتوں کے ساتھ پہلی دونوں میں سے بھی کسی ایک میں قراءت کی تو بالاتفاق اس پر صرف پہلی دونوں رکعتوں کی قضاء لازم ہوگی، اور اگر پہلی دونوں میں سے ایک اور آخری دونوں میں سے ہی ایک میں قراءت کی تو امام ابویوسفؒ کے نزدیک چاروں رکعتوں کی قضاء لازم آئے گی، اسی طرح امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک بھی ہوگا، کیونکہ پہلا تحریمہ باقی رہ گیا ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک پہلی دونوں کی قضاء لازم آئے گی، کیونکہ ان کے نزدیک پہلی دونوں میں سے ایک رکعت میں ترک قراءت سے تحریمہ باطل ہوگیا لہٰذا صرف ان ہی دونوں کی قضاء لازم آئے گی اور آخری دونوں کی بنیاد بھی قائم نہیں ہوسکی تھی اس لئے ان کی قضاء لازم نہ آئے گی، البتہ امام ابویوسفؒ نے اس کی روایت کو امام ابوحنیفہؒ سے ہونے پر انکار کیا ہے، اور کہا ہے کہ میں نے تو تم کو ابوحنیفہؒ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اس پر دو رکعتوں کی قضاء لازم ہوگی،

اس کے باوجود امام محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ کی طرح روایت کرنے سے انکار نہیں کیا ہے۔

توضیح:-اول دونوں میں قراءت کی، آخر دونوں رکعتوں میں قراءت کی، اول شفعہ کے ساتھ آخری دونوں میں سے ایک میں قراءت کی، اول اور آخری شفع میں سے ایک ایک میں قراءت کی

ولو قرأ في الاولیین لا غیر فعلیه قضاء الاخریین بالاجماع لان التحریمة لم تبطل......الخ

مطلب واضح ہے۔ لان التحریمة الخ پہلا تحریمہ باطل نہ ہونے اور صحیح رہ جانے کی وجہ سے دوسرا شفع شروع کرنا صحیح ہو گیا۔ف۔ مگر اس شفع میں قراءت نہ کر کے اسے فاسد کر دیا اور اس کی وجہ سے پہلا فاسد نہ ہو سکا اس لئے صرف اسی دوسرے کی قضاء کرنی ہوگی۔ف۔ اگر درمیانی قعدہ نہیں کیا ہو تو بالاجماع چار کی قضاء کرے، جیسا کہ مبسوط میں ہے۔ع۔ لان عندهما الخ اور اول شفع میں قرات نہیں کی اور صرف دوسرے شفعہ میں قراءت کی تو پہلے میں قراءت نہ ہونے کی وجہ سے وہ فاسد ہو گئی تو بالاتفاق صرف اولیین کی قضاء لازم ہو گی، کیونکہ ثانی شفعہ کو امام محمدؒ اور امام اعظمؒ کے نزدیک شروع کرنا ہی صحیح نہیں ہوا۔ف۔ اس لئے آخری شفعہ بیکار ہوا اور صرف پہلے شفع کو شروع کرنا صحیح ہوا اس لئے اس کی خرابی سے اسی کی قضاء لازم آئے گی۔م۔

وعند ابی یوسفؒ ان صح فقد اداهما ولو قرأ فی الاولیین واحدی الاخریین......الخ

اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگرچہ دوسرے شفعہ کو شروع کرنا صحیح ہے تو اسے ادا بھی کر لیا۔ف۔ اس لئے اول شفع کی قضاء واجب ہوئی، یہ ترجمہ "ان صح" کا اس صورت میں ہے جب کہ وصلیہ ہو، جیسا کہ بعض حاشیوں میں ہے، اور عینیؒ نے اسے شرطیہ مانا ہے یعنی اگر آخری شفع ہوا تو اسے ادا کر دیا اور اگر صحیح نہیں ہوا تو صرف اول کی قضاء لازم ہوئی، ولو قرأ فی الاولیین الخ اور اگر اول دونوں میں قراءت کی اور اخرین میں سے کسی ایک میں تو بالاجماع اس پر اخیرین کی قضاء لازم ہو گی۔ف۔ کیونکہ اخیرین کا شروع ہونا بالاجماع صحیح ہے، مگر فساد کی وجہ سے قضاء لازم ہوئی ہے ولو فی الاخریین الخ اور اگر برعکس آخری دونوں میں قراءت کی اور پہلی دونوں میں سے کسی ایک میں تو بالاجماع اس پر پہلی دونوں رکعتوں کی قضاء لازم آئیگی۔ف۔ لیکن تخریج میں فرق ہے اس طرح کہ شیخینؒ کے نزدیک تو آخری دونوں رکعتوں کو شروع کرنا صحیح ہو کر وہ ادا ہو گئیں اور پہلی دونوں فاسد ہوئیں اس لئے ان کی قضاء کرے، اور امام محمدؒ کے نزدیک پہلے دونوں رکعتوں میں ایک رکعت کی قراءت چھوڑ دینے سے اس کا تحریمہ باطل ہو گیا جس کی وجہ سے آخری دونوں رکعتیں صحیح نہیں ہوئیں اور بے کار ہو گئیں اب صرف دونوں رکعتوں کی قضاء واجب ہو گی۔

ولو قرأ فی احدی الاولیین واحدی الاخریین علی قول ابی یوسف قضاء الاربع......الخ

اور اگر پہلی دونوں میں سے ایک میں اور آخری دونوں میں سے ایک میں قراءت کی ف تو اس صورت میں اختلاف ہے، یعنی ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق چاروں رکعتوں کی قضاء کرنی ہو گی، اور یہی قول امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی احتیاطاً ہے، کیونکہ ان کے نزدیک تحریمہ باقی ہے۔ف۔ امام اعظمؒ کے نزدیک بھی کیونکہ پہلی دونوں رکعتوں میں سے ایک میں قراءت پائی گئی ہے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک صرف پہلی دونوں رکعتوں کی قضاء واجب ہو گی، کیونکہ امام محمدؒ کے نزدیک تحریمہ باطل ہو گیا ہے ف اس لئے دوسری دونوں رکعتوں کی بناء پر صحیح نہیں ہوئی معلوم ہونا چاہئے کہ امام محمدؒ نے امام اعظمؒ کے نزدیک چار رکعتوں کی قضاء کی جو روایت جامع صغیر میں بیان کی ہے وہ امام ابو یوسفؒ کے توسط سے بیان کی ہے۔ف۔ جب کہ امام محمدؒ نے جامع صغیر تصنیف کر کے ابو یوسفؒ کو سنائی تھی، تو انہوں نے چھ مسائل کے بارے میں فرمایا کہ یہ بھول گئے ہیں، ان میں سے ایک مسئلہ یہی ہے پھر یہ کہا کہ

وقد انکر ابویوسفؒ هذه الرواية عنه و قال رويت لك عن ابی حنيفة انه يلزمه قضاء ركعتين......الخ
میں نے تو تم کو امام ابو حنیفہؒ کے متعلق یہ بتایا تھا کہ اس شخص پر دو رکعتوں کی قضاء لازم ہو گی۔ف۔اس پر امام محمدؒ نے کہا ہے کہ جی نہیں مجھے یاد ہے، اور وہ خود بھول گئے ہیں۔ومحمد لم يرجع الخ اور آخر تک امام محمدؒ ابو یوسف سے اس روایت کرنے میں نہ پھرے کہ امام ابو حنیفہؒ نے چار رکعتوں کی قضاء کے لئے کہا ہے۔ف۔ مبسوط وغیرہ میں ہے کہ ہمارے مشائخ نے امام محمدؒ کی روایت پر ہی اعتبار کیا ہے، لیکن اس صورت میں یہ اعتراض ہوتا ہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ راوی جب اپنی روایت سے انکار کرے تو اس کی روایت حجت باقی نہیں رہتی ہے، اور ہمارا مذہب بھی یہی ہے بخلاف امام محمدؒ وامام شافعیؒ کے جیسا کہ سرخسی اور بزدویؒ نے ذکر کیا ہے۔ع۔ف۔ن۔اس لئے بہتر جواب یہ ہو گا کہ چار کی روایت پر اعتماد کرنا اس روایت کرنے کی بناء پر نہیں ہے بلکہ امام ابو حنیفہؒ کی اصل سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ چار رکعتیں ہی واجب ہوں گی، اس لئے امام محمدؒ کی روایت میں جو حکم مذکور ہوا ہے وہی قابل اعتماد ہے۔ف۔

ولو قرأ في احدى الاولیين لا غير، قضى اربعا عندهما، وعند محمدؒ قضى ركعتين، ولو قرأ في احدى الاخريين لاغير، قضى اربعا عند ابی یوسف وعندهما ركعتين، قال وتفسير قوله عليه السلام: لايصلى بعد صلوة مثلها يعني ركعتين بقراءة وركعتين بغير قراءة، فيكون بيان فرضية القراءة في ركعات النفل كلها.

ترجمہ:۔اور اگر صرف پہلی دونوں رکعتوں میں سے کسی ایک رکعت میں قراءت کی اور کسی میں نہیں تو امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چار رکعتوں کی قضاء کرے، اور امام محمدؒ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے، اور اگر آخری دونوں میں سے کسی ایک رکعت میں قضاء کی اور کسی میں نہیں تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک چار رکعتوں کی قضاء کرے لیکن طرفین کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی تفسیر کہ ایک نماز کے اسی جیسی دوسری نماز نہیں پڑھی جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ دو رکعتیں قراءت کے ساتھ پھر دو رکعتیں بغیر قراءت کے تاکہ نماز نفل کی تمام رکعتوں میں قراءت کی فرضیت کا بیان ہو جائے۔

توضیح:۔اگر کسی نے چار رکعت نفل میں سے صرف پہلی دو رکعتوں میں سے کسی ایک میں قراءت کی یا آخری دو رکعتوں میں سے کسی ایک میں تو کیا حکم ہو گا۔ نفل کی ہر رکعت میں قراءت کا فرض ہونا

ولو قرأ في احدى الاولیين لا غير، قضى اربعا عندهما، وعند محمدؒ قضى ركعتين......الخ
مطلب واضح ہے۔ف۔مذکورہ صورت کی دلیل یہ ہے کہ ابو یوسف کے نزدیک تو اصولی طور سے اور امام اعظمؒ کے نزدیک احتیاطاً چونکہ اس صورت میں تحریمہ باقی رہ جاتا ہے اس لئے چاروں رکعتوں کی قضاء کرے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے، اور دوسری صورت کا مطلب بھی واضح ہے ف لیکن اس کی دلیل یہ ہے کہ پہلی دونوں رکعتوں میں امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگرچہ قراءت نہیں کی لیکن تحریمہ صحیح تھا اسی طرح اخیرین میں بھی صحیح رہ گیا اگرچہ مکمل قراءت نہیں ہوئی اس لئے چاروں رکعتوں کی قضاء کرے گا۔وعندهما الخ اور امام ابو حنیفہ وامام محمدؒ کے نزدیک صرف دو رکعتوں کی قضاء کرے ف کیونکہ پہلا شفع صحیح ہو مگر قراءت نہ ہونے کی وجہ سے تحریمہ باطل ہو گیا اس لئے صرف دو رکعتوں کی ہی قضاء کرے۔

قال وتفسير قوله عليه السلام: لايصلى بعد صلوة مثلها يعني ركعتين بقراءة وركعتين......الخ
امام محمدؒ نے جامع صغیر میں کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان لایصلی بعد صلوة مثلها کہ نماز پڑھ لینے کے بعد پھر اسی جیسی نماز نہیں پڑھی جائے کی تفسیر یہ ہے کہ دو رکعت قراءت کے ساتھ اور دو رکعتیں بغیر قراءت کے نہیں پڑھی جائے، ف، یہاں تک کہ چاروں رکعتیں فرض کی طرح ہو جائیں، بلکہ چاروں رکعتیں قراءت کے ساتھ پڑھے تاکہ فرض کے مثل نہ

ہو۔

فیکون بیان فرضیۃ القراء ۃ فی رکعات النفل کلها......الخ
لہذا یہ حدیث نفل کی تمام رکعتوں میں قراءت کے فرض ہونے کی دلیل ہو جائیگی۔ف۔ حاصل یہ ہوا کہ حدیث کے اس ٹکڑے لایصلی بعد صلوۃ مثلها نفل کی دونوں رکعتیں ایک مستقل نماز ہیں، اور نفل کے دونوں شفع ایک جیسے ہیں، یہ حدیث کے خلاف ثابت ہوا، اس کے علاوہ ظہر میں چار رکعت سنت کے بعد چار رکعتیں فرض ہیں، اور فجر کی نماز میں دو رکعت سنت کے بعد دو رکعتیں فرض ہیں، اور حالت سفر میں ظہر اور عشاء میں دو رکعتیں فرض کے بعد دو رکعتیں سنت ہیں، تو مذکورہ بالا حدیث کی تفسیر امام محمدؒ نے اس طرح کی ہے کہ اس سے مراد قراءت میں ایک جیسا ہونا ہے یعنی فرض کے مثل ویسی ہے اس کے بعد بھی چار رکعتیں کوئی نہ پڑھے کہ دو قراءت کے ساتھ ہوں اور دو بغیر قراءت کے ہوں کہ وہ فرض جیسی ہو جائیں اور چونکہ قراءت ضروری ہوتی ہے اس لئے سب میں قراءت کرے لہذا نفل کی تمام رکعتوں میں قراءت فرض ہوئی۔

اس جگہ بحث کے لئے دو باتیں ہیں (۱) مذکورہ حدیث کو ثابت کرنا، (۲) قراءت کی فرضیت کو ثابت کرنا۔ ابن الہمام اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ یہ روایت رسول اللہ ﷺ سے ثابت نہیں ہوئی ہے بلکہ یہ تو حضرت عمر و ابن مسعودؓ کا قول ہے جیسا کہ ابن ابی شیبہؒ نے روایت کی ہے، اور طحاویؒ نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک نماز کے بعد اس جیسی دوسری نماز پڑھنی مکروہ ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ امام محمدؒ ہم سے اس سے واقف تھے، اس لئے ہو سکتا ہے کہ انہیں کوئی ایسی حدیث پہونچ چکی ہے جس سے انہوں نے ایسا مطلب نکالا ہو، واللہ اعلم۔

یوں تو اس روایت کے ظاہری معنی بالاتفاق مراد نہیں ہے، کیونکہ فجر ظہر وعشاء میں نماز کے مثل نماز پڑھی جاتی ہے، اس لئے اس حدیث کو اس طرح محمول کیا جاتا ہے کہ دو رکعت قراءت سے اور دو رکعت بغیر قراءت کے نہ پڑھی جائے یا اس بات پر حدیث محمول ہے کہ پہلی جماعت کی طرح ایک وقت میں ایک ہی مسجد میں ایک ہی جگہ پر دوسری جماعت نہ ہو، جیسا کہ جامع فخر الاسلام میں ہے، یا اس بات پر محمول ہے کہ ایک مرتبہ جو فرض نماز ادا کرلی گئی ہو اس میں کچھ خرابی آجانے کے صرف خیال سے وہ دوبارہ پڑھی نہ جائے، جیسا کہ ذخیرہ میں ہے، چنانچہ سلمان بن یسارؒ نے روایت کی ہے کہ میں حضرت ابن عمرؓ کے پاس اس وقت آیا جب کہ لوگ نماز پڑھ رہے تھے، تو میں نے کہا ہے کہ آپ ان کے ساتھ نماز کیوں نہیں پڑھ لیتے ہیں فرمانے لگے کہ میں پڑھ چکا ہوں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ لاتصلوا صلوۃ فی یوم مرتین یعنی کسی نماز کو ایک دن میں دو مرتبے نہ پڑھو، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، اور اصل حدیث کو ابن خزیمہ اور ابن حبان نے اپنی اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، یہ روایت اس بات پر محمول ہے کہ جب ایک بار جماعت سے نماز پڑھ لی ہو تو دوبارہ اسے فرض کی نیت سے نہ پڑھے، ورنہ ابن عمرؓ نے خود ایک مرتبہ ایک شخص کو جو تنہا نماز پڑھ کر اس وقت آیا تھا جب جماعت ہو رہی تھی فرمایا ہے کہ اس جماعت میں شریک ہو جاؤ، مالکؒ نے اس کی روایت کی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں ہے کہ یہ حدیث صحیح میں بھی موجود ہے، پھر میرا یہ گمان بھی ہے کہ شاید امام محمدؒ نے اس جملہ کو حدیث اس اعتبار سے کہا ہو کہ حضرت عمرؓ وغیرہ کا یہ قول اپنی رائے سے نہیں ہو سکتا ہے اس لئے ضرور رسول اللہ ﷺ سے سنا ہوا ہے جیسا کہ غیر عقلی اور توقیفی امور کا حکم ہے، بہ شرطیکہ یہ بھی توقیفی ہو، اب دوسری بات قابل بحث یہ ہے کہ اول تو یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، اور اگر ہو بھی تو یہ خبر واحد ہوگی جس سے نفل کی ہر رکعت میں قراءت کی فرضیت کس طرح ثابت ہو سکتی، کیونکہ اس کی اسناد تو قطعی نہیں ہے، اور قطعی بھی ہوتی تو بھی اس میں تو کئی معنوں کا احتمال ہے جیسا کہ ابن الہمامؒ نے ذکر کیا ہے، امام رازیؒ نے کہا ہے ﴿فَاقْرَءُ وْا مَاتَیَسَّرَ﴾ الآیہ، سے نفل نماز میں قرأت کی فرضیت ثابت ہوئی مگر مجمل طریقہ سے کہ یہ حکم تمام رکعتوں کے لئے ہے یا بعض کے لئے تو مذکور حدیث اس کے لئے بیان واقع ہو گئی۔

مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ بات عجب ہے کیونکہ ابھی ذرا پہلے مصنفؒ نے اس بات کی تصریح کردی ہے کہ قراءت فرض کی ایک رکعت میں صریح النص سے اور دوسری میں دلالت النص سے فرض کی گئی ہے، اگر آیت مجمل ہوتی تو شافعیؒ نے جو حدیث بیان کی ہے وہ اس کے لئے بیان ہو جاتی اور تمام رکعتوں میں قراءت فرض ہو جاتی، اور عینیؒ نے کہا ہے کہ فاتحہ سورہ کے ساتھ فرض ہو جاتی، اس کے علاوہ یہ حدیث مرفوع نہیں ہے، میں یہ کہتا ہوں کہ مصنفؒ کے لفظ بیان فرضیت الخ سے انزاریؒ وغیرہ کو یہ شبہہ ہو گیا ہے کہ یہ مجمل آیت کے لئے بیان ہے۔ واللہ اعلم۔

ويصلي النافلة قاعدا مع القدرة على القيام، لقوله عليه السلام: صلوة القاعد على النصف من صلوة القائم، ولان الصلوة خير موضوع، وربما يشق عليه القيام، فيجوز له تركه كيلا ينقطع عنه، واختلفوا في كيفية القعود، والمختار ان يقعد كما يقعد في حالة التشهد، لانه عهد مشروعا في الصلوة.

ترجمہ:- اور نفل نماز کو کھڑے ہونے کی قدرت ہونے کے باوجود بیٹھ کر بھی انسان پڑھ سکتا ہے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے والے کے مقابلہ میں بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز آدھی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ نماز ایک مہیا کی ہوئی نیکی ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے والوں کو تکلیف زیادہ ہوتی ہے اس لئے ایسے شخص کو ترک قیام جائز ہو گیا تاکہ یہ نمازی اس کار خیر کو بالکل نہ چھوڑدے، پھر فقہاء نے اس کے بیٹھنے کی کیفیت میں اختلاف کیا ہے لیکن قول مختار یہ ہے کہ ویسا ہی بیٹھے جیسا کہ تشہد کی حالت میں نمازی بیٹھتا ہے، کیونکہ نماز میں بیٹھنے کا یہی طریقہ معلوم ہے۔

توضیح:- نفل نماز بیٹھ کر۔ حدیث سے دلیل بیٹھنے کی کیا کیفیت ہونی چاہئے

ويصلي النافلة قاعدا مع القدرة على القيام، لقوله عليه السلام: صلاة القاعد على النصف......الخ

نفل نماز کو کھڑے ہونے کی قدرت کے باوجود بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے، ف قول اصح کے مطابق اس میں کچھ کراہت بھی نہیں ہے، جیسا کہ ابن الملک کی شرح المجمع میں ہے، لیکن ثواب آدھا ہوگا۔ الدر۔ لقوله عليه السلام الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کھڑے ہونے والے کی نماز کے مقابلہ میں بیٹھنے والے کی نماز آدھی ہے، ف، صحیح بخاری اور سنن اربعہ میں حضرت عمران بن حصینؓ سے جن کو کہ خونی بواسیر کی بیماری تھی روایت ہے کہ میں نے بیٹھ کر پڑھنے والے کی نماز کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے پوچھا تو فرمایا کہ جس نے کھڑے ہو کر نماز پڑھی اس نے بہتر کیا، اور جس نے بیٹھ کر پڑھی اس کے لئے آدھا ثواب ہوگا، اور جس نے لیٹ کر نماز پڑھی اسے بیٹھ کر پڑھنے والے کے ثواب کا آدھا ملے گا، نوویؒ نے فرمایا ہے کہ ہمارے علماء نے اس روایت کو نوافل پر محمول کیا ہے، لیکن بلا عذر فرض نمازوں میں بیٹھنا جائز نہیں ہے، ہاں عذر ہونے کی صورت میں جائز ہے پھر عذر کی صورت میں ثواب کی کچھ کمی بھی نہ ہوگی، اس قول پر اجماع ہے جیسا کہ شارحین نے ذکر کیا ہے۔ مع۔

ابن ابی شیبہ نے مسیب بن رافعؒ سے روایت کی ہے کہ کھڑے ہونے والے کا ثواب بیٹھنے والے کے لئے آدھا ہے، مگر مجبوری کی صورت میں، اور حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات میں نماز دیر تک کھڑے اور دیر تک بیٹھے ہوئے پڑھتے تھے، سوائے بخاری کے محدثین کی ایک جماعت نے اس کی روایت کی ہے۔ مع۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے فرض نماز بیٹھ کر پڑھی جائے تو ثواب کم نہ ہونے پر بخاری کی کتاب الجہاد سے استدلال کیا ہے، اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ بندہ جب بیمار یا مسافر ہو تو اس مجبوری کی حالت میں اپنے عام حالات میں یا تندرستی اور اقامت میں جو اعمال خیر کرتا تھا، ان سب کا اسے ثواب ملتا رہے گا۔ ف۔

میں کہتا ہوں کہ ظاہر حدیث تو یہ ہے کہ جس قدر اعمال کرتا تھا جنہیں اب نہیں کر سکتا ہے ان سب کا ثواب لکھا جائے گا اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ فرض کا ثواب بھی پورا ہی ملے گا۔ م۔ پھر رسول اللہ ﷺ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ صحیح مسلم میں

عبداللہ بن عمرؓ سے حدیث منقول ہے کہ آپ بیٹھ کر پڑھتے تھے تو فرمایا کہ اس سے کسی کے مثل نہیں ہوں، پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ عینیؒ نے حدیث میں اشکال کی طرف اشارہ کیا ہے، اور ابن الہمامؒ نے تصریح کی ہے کہ حدیث میں تو لیٹے ہوئے کی نماز کا ثواب بیٹھے ہوئے کا نصف مذکور ہے، اور میں نہیں جانتا کہ لیٹنے والے کی نماز فرض کے سوا اور کوئی بھی جائز ہو وہ بھی مدد کی صورت میں، پھر جس حدیث سے فرض میں ثواب کے کم نہ ہونے پر مجبوری کی حالت میں جائز کہا گیا ہے اسی حدیث کو نفل پر محمول کرنے میں اعتراض ہے، اور یہ اس صورت میں ختم ہوگا جب کہ نفل کو بھی لیٹ کر پڑھنا جائز مان لیا جائے مگر مجھے تو اپنی فقہ کی کتابوں میں اس کا جائز ہونا معلوم نہیں ہو سکا ہے، پھر فرض میں ثواب کم نہ ہونے پر جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ بھی مشکل ہے، کیونکہ یہ بات تو ممکن ہے کہ فرض کو بیٹھ کر پڑھنے کا حساب آدھا ہو پھر وہ اللہ کے فضل کی وجہ سے پورا لکھ دیا جائے۔ الفتح۔

بلکہ جتنے اعمال فرض وغیرہ کی مجبوریوں کی وجہ سے اب نہیں کر سکتا ہے جنہیں وہ تندرستی کی حالت میں کرتا تھا اور معمول تھا ان کا بھی اجر اب بغیر عمل کے محض اللہ کے فضل سے لکھا جاتا ہے، اس دعوی پر مسند احمد وغیرہ کی حدیثیں دلیل ہیں جن کو میں مترجم نے اپنی تفسیر کے اٹھارہویں پارہ میں تفصیل سے لکھا ہے، اس لئے مذکورہ مسئلہ کے حل کرنے کے لئے بہترین دلیل حضرت ام المومنین عائشہؓ کی وہ حدیث ہے جو اوپر گذر گئی ہے، م۔

ولان الصلوة خير موضوع، وربما يشق عليه القيام، فيجوز له تركه كيلا ينقطع عنه......الخ

اور نفل کو بیٹھ کر پڑھنے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ یہ خیر موضوع ہے (مہیا کی ہوئی نیکی، کار خیر) ف، یعنی بندہ کے لئے یہ نیکی مہیا کر دی گئی ہے، کہ ہر وقت اسے حاصل کر سکے، جیسا کہ حضرت ابوذرؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ **الصلوة خير موضوع فمن شاء استقبل ومن شاء استكثر**۔ یعنی نماز خیر موضوع ہے یعنی مہیا رکھی ہوئی ہے اس لئے جس کا جی چاہے کم لے اور جس کا جی چاہے زیادہ لے، اس کی روایت احمد، بزار، ابن حبان اور طبرانی نے کی ہے یعنی کمی اور زیادتی آدمی کی اپنی ہمت اور اختیار پر ہے، الحاصل جب نفل ایک خیر ہے جو بندہ کے لئے خاص مہیا کی گئی ہے تو اسے بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہوگا۔ **وربما يشق عليه الخ**، اور اکثر بندہ کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں سخت تکلیف ہوتی ہے تو اس کی آسانی کے لئے اس بات کی اجازت دے دی گئی کہ وہ بیٹھ کر بھی پڑھ لے تاکہ اس پہ نیکی ختم نہ ہو جائے۔

واختلفوا في كيفية القعود، والمختار ان يقعد كما يقعد في حالة التشهد لانه عهد مشروعا......الخ

اور علماء نے نفل کی بیٹھک کی کیفیت کے بارے میں اختلاف کیا ہے، ف، کہ چار زانو ہو کر بیٹھنا اس میں افضل ہے یا کوئی دوسری صورت افضل ہے۔ **والمختار الخ** اور قول مختار یہ ہے کہ اس میں بھی ویسے ہی بیٹھنا چاہئے جیسے عموماً تشہد کی حالت میں بیٹھا جاتا ہے، ف، فقیہ ابواللیث شمس الائمہ سرخسیؒ کا قول مختار یہی ہے، ع، اسی پر فتوی ہے۔ د۔ **لانه عهد الخ** کیونکہ نماز میں بیٹھنے کا یہی طریقہ ثابت ہے، ف، اور مختصر الکرخی میں امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ جیسے چاہے پڑھے، امام محمدؒ کا اور علماء سلف کا بھی یہی قول ہے۔ ع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اولی یہی ہے کہ اسی پر فتوی دیا جائے، کیونکہ التحیات کے لئے بیٹھنے میں بھی اکثر دیر تک بیٹھنے کی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے، سمجھ لیں، م، اگر نفل بیٹھ کر شروع کر کے پھر کھڑے ہو کر کوئی پڑھنا چاہے تو بالاتفاق بلا کراہت جائز ہے، المحیط۔ ف۔ ھ۔

وان افتتحها قائما، ثم قعد من غير عذر، جاز عند ابی حنيفةؒ، وهذا استحسان، وعندهما لايجزيه، وهو القياس، لان الشروع معتبر بالنذر له انه لم يباشر القيام فيما بقي، ولما باشر صحة بدونه، بخلاف النذر، لانه التزمه نصا، حتى لو لم ينص على القيام، لا يلزمه القيام عند بعض المشائخؒ، ومن كان خارج المصر، تنفل على

دابته الى ایّ جهة توجهت، یؤمی ایماء، لحدیث ابن عمرؓ قال رأیت رسول اللہ ﷺ یصلی علی حمار وهو متوجه الى خیبر یؤمی ایماء، ولان النوافل غیر مختصة بوقت، فلو الزمناه النزول والاستقبال تنقطع عنه النافلة او ینقطع هو عن القافلة.

ترجمہ :-اگر کسی نے نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کی پھر بغیر عذر بیٹھ کر پڑھنے لگا تو ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز جائز ہو گی، اور یہ بطور استحسان ہو گا، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہ ہو گی، یہی قیاس ہے کیونکہ شروع کرنے کو نذر پر قیاس کیا گیا ہے، اور امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ کھڑے ہونے کے بعد جو نماز باقی رہ گئی ہے اسے ابھی تک نمازی نے شروع نہیں کی اور کھڑا نہیں ہو ہے، اور جس میں وہ کھڑا ہو چکا ہے وہ بھی کھڑے ہوئے بغیر صحیح ہو جاتی بخلاف نذر کی ہوئی نماز کے کیونکہ اس نے کھڑے ہونے کو اپنے اوپر صراحۃً واجب کیا ہے یہاں تک کہ اگر اس نے نذر کے وقت کھڑے ہو کر پڑھنے کی نذر نہ کی ہوتی تو بعض مشائخ کے نزدیک اس پر کھڑا ہونا واجب نہ ہوتا اور وہ شخص جو شہر سے باہر ہو وہ اپنے جانور پر بیٹھ کر اسی رخ نفل نماز پڑھ سکتا ہے جس رخ پر جانور جا رہا ہو اور اشارہ سے نماز پڑھے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی ہوئی حدیث کی وجہ سے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو گدھے پر سوار ہو کر نماز پڑھتے ہوئے اس حال میں دیکھا ہے کہ آپ شہر کی طرف تشریف لے جا رہے تھے اور اشارہ سے نماز پڑھ رہے تھے، اور اس وجہ سے بھی کہ نفل نمازیں کسی بھی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی ہیں، اب اگر ہم اس پر سواری سے اتر کر اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کو لازم کر دیں تو اس میں نفل نماز چھوٹ جائے یا وہ خود قافلہ سے بچھڑ جائے۔

توضیح :- نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کرنے کے بعد بیٹھ کر پڑھنے کا حکم
سواری پر نفل نماز پڑھنے کا حکم اور حدیث سے دلیل

وان افتتحها قائما، ثم قعد من غیر عذر، جاز عند ابی حنیفةؒ، وهذا استحسان......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے وعندهما الخ اور صاحبینؒ کے نزدیک نفل نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر پڑھنے کے بعد بقیہ حصہ کو بیٹھ کر پڑھنا جائز نہیں ہے، اور یہی قیاس کا تقاضا بھی ہے، کیونکہ اس نماز کے شروع کرنے کو نذر کے ساتھ قیاس کیا گیا ہے، ف جیسے کہ نذر مان لینے سے نفل نماز ذمہ میں لازم ہو جاتی ہے اسی طرح نفل نماز بھی شروع کرنے سے لازم ہو جاتی ہے اس لئے جس طرح کھڑے ہو کر نفل پڑھنے کی نذر کرنے سے اسے بیٹھ کر پڑھنے سے ادا نہ ہو گی، اسی طرح نفل کو بھی ایک مرتبہ کھڑے ہو کر بقیہ حصہ کو بیٹھ کر پڑھنے سے وہ ادا نہ ہو گی۔ مع۔

له انه لم یباشر القیام فیما بقی، ولما باشر صحة بدونه، بخلاف النذر، لانه التزمه نصا......الخ

امام ابو حنیفہؒ کی دلیل استحسان یہ ہے کہ اس نفل کو پڑھنے والا باقی نماز میں کھڑا نہیں ہوا ہے، اور جتنے حصہ وہ کھڑا بھی ہوا وہ بھی تو بغیر کھڑے ہوئے یعنی بیٹھ کر پڑھنی صحیح ہے، اس کے بعد وہ باقی نماز نفل میں کھڑا نہیں ہوا جو کہ اول کے لئے بھی ضروری نہ تھی، لہٰذا اس کے حق میں کھڑا ہونا اور بیٹھ کر پڑھنا دونوں برابر ہیں۔ بخلاف النذر الخ بخلاف نذر نماز کے کہ اس نے اس نماز کو اپنے اوپر کھڑے ہو کر پڑھنے کو صراحۃً لازم کیا ہے، ف، حاصل بحث یہ ہوا کہ نذر ماننے والے نے نماز شروع کرنے سے پہلے ارکان نماز کو اپنے اوپر لازم کیا ہے، اس طرح اس نے اپنے اوپر ان میں سے ایک رکن قیام کو بھی اپنے اوپر لازم کر لیا ہے، بشرطیکہ اس نے یوں نیت کی ہو کہ اللہ کے واسطے مجھ پر چار رکعت نفل نماز کھڑے ہو کر پڑھنی واجب ہے، اس طرح اس نے اپنے اوپر قیام کو صریحاً واجب کیا ہے۔

حتی لو لم ینص علی القیام، لا یلزمه القیام عند بعض المشائخؒ......الخ

یہاں تک کہ اگر اس نے کھڑے ہو کر پڑھنے کی تصریح نہ کی ہو تو بعض مشائخ کے نزدیک اس پر کھڑے ہو کر پڑھنی لازم

ہو گی۔ف۔ان بعض مشایخ سے مراد فخر الاسلام بزدویؒ اور ان کے موافقین ہیں، اس لئے کہ شرح جامع صغیر میں کہا کہ اگر مطلقاً نذر مانی اور کہا کہ اللہ تعالی کے مجھ پر چار رکعت نفل نماز واجب ہے تو اس پر اسے کھڑے ہو کر پڑھنا لازم نہ ہو گا اور یہی صحیح ہے ۔ مع۔ذرا یہ خیال نہیں کرتے کہ اگر کھڑا ہونا از خود لازم ہوتا تو اس کی تصریح لغو ہو جاتی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر نفل نماز بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہو، تو اس کے پورے کی طرف کس طرح حکم لگایا جائیگا جس کی صورت یہ ہو گی کھڑے ہو کر پڑھی جائے، تو اس کا کمال قیام سے ہوا۔م۔اگر کسی نے تھک کر چھڑی یا دیوار پر ٹیک لگائی ہو تو نماز جائز ہو گی۔ھ۔مگر صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے۔ع۔

اگر کسی نے یہ نذر مانی ہو کہ میں سوار ہو کر نفل پڑھوں گا تو اصل میں لکھا ہیکہ جائز نہیں ہے کرخیؒ نے لکھا ہے کہ جائز ہے، اور اگر بے وضوء یا بغیر قراءت کے پڑھنے کی نذر مانی ہو تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک نماز تو لازم ہو جائیگی اور یہ قید لغو قرار دی جائیگی، اگر مکروہ اوقات میں نفل نماز شروع کی ہو تو نماز توڑدے اور بعد میں اس کی قضاء کرے، اور اگر بعد میں بھی مکروہ وقت میں ہی نماز قضاء کی تو اس کے ذمہ سے نماز واجب ساقط ہو جائیگی۔مع۔

ومن كان خارج المصر، تنفل على دابته الى اى جهة توجهت، يؤمى ايماء......الخ

اور اگر کوئی شخص شہر سے باہر ہو اور اپنے سواری کے جانور پر نفل نماز پڑھے تو جانور کا رخ جدھر ہو اسی طرح رخ کر کے اپنی نفل اشارہ سے ادا کرے، ف اور رکوع میں سجدہ کی نسبت سے کم جھکے۔ لحدیث ابن عمرؓ ابن عمرؓ کی حدیث کی دلیل کی وجہ سے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہے کہ گدھے پر سوار ہو کر خیبر کی طرف منہ کئے ہوئے اشارہ کے ساتھ نماز پڑھتے جارہے تھے، مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، دار قطنی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس روایت میں حمار کا لفظ ہونا راوی عمرو بن یحییٰ المازنی کی غلطی ہے، کیونکہ مشہور روایتوں میں لفظ راحلہ، (سواری) یا بعیر (اونٹ) کے ساتھ ہے، یعنی اپنی سواری پر یا اونٹ پر تھے۔

اس باب میں کئی صحابہ کرام سے احادیث منقول ہیں، چنانچہ حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ اپنی ضرورت سے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا تو میں نے دیکھا کہ آپ اپنی سواری پر مشرق کی طرف منہ کر کے نماز ادا فرما رہے تھے رکوع میں جتنا جھکتے سجدہ میں اس سے بہت کم جھکتے تھے، ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کی سند حسن صحیح ہے، اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے، اور حضرت جابرؓ نے فرمایا ہے کہ آپ اپنی سواری پر ہر طرف پڑھتے تھے اور رکوع سے زیادہ سجدہ میں جھکتے، اس کی روایت ابن حبان نے کی ہے، اور بخاری کی روایت میں اتنا اور زیادہ ہے کہ پھر آپ جب فرض نماز پڑھنا چاہتے تو اس سے اتر کر قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھتے، حدیث عمرو بن ربیعہ میں یہ معنی صحیحین کی روایت سے تصریحاً منقول ہے.

ولان النوافل غير مختصة بوقت، فلو الزمناه النزول والاستقبال تنقطع عنه النافلة......الخ

اور نفل نماز پڑھنے کا جواز سواری کے جانور پر اس وجہ سے جائز ہے کہ نفل نمازیں کسی وقت کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔فلو الزمناہ الخ اگر ہم نمازی پر سواری سے اترنے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے پڑھنے کو لازم کر دیں تو نمازی نفل نمازیں نہیں پڑھ سکے گا، اس طرح وہ شخص نوافل کی خیر موضوع سے محروم ہو جائیگا، یا وہ خود قافلہ سے بچھڑ جائے گا، ف کہ اگر اتر کر قبلہ رخ ادا کرتا رہے۔

اما الفرائض مختصة بوقت والسنن الرواتب نوافل، وعن ابى حنيفةؒ انه ينزل لسنة الفجر، لانها آكد من سائرها، والتقييد بخارج المصر ينفى اشتراط السفر والجواز فى المصر.

ترجمہ:-اور فرائض تو وقت کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں، اور سنن راتبہ بھی نفل ہیں، اور ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ فجر کی سنت کے لئے سواری سے اتر کر پڑھے، کیونکہ یہ سنت دوسری تمام سنتوں سے زیادہ موکدہ اور اہم ہے، اس میں شہر سے باہر

ہونے کی قید حالت سفر میں ہونے کی نفی کرتی ہے اور شہر میں بھی جائز ہونے کو بتاتی ہے۔

توضیح:- فرض اور سنت موکدہ کو سواری پر ادا کرنے کا حکم، مجبوریاں، چند ضروری مسائل

اما الفرائض مختصة بوقت والسنن الرواتب نوافل، وعن ابی حنیفةؒ انه ینزل لسنة الفجر......الخ

لیکن فرض نمازیں تو وہ خاص وقتوں کے ساتھ مخصوص ہیں۔ف۔اس لئے مجبوری نہ ہونے کی صورت میں وقت کے اندر استقبال قبلہ کے لازم ہونے میں کوئی حرج اور تکلیف نہیں ہے،اور اتر کریا قبلہ کی طرف منہ کر کے پڑھنے میں نقصان ہو تو فرائض بھی سواری پر جائز ہیں، جیسا کہ خلاصہ میں ہے کہ سواری کے جانور پر بھی عذر کی حالت میں فرائض جائز ہیں،ایسی صورت میں سواری کو قبلہ رخ کھڑا کرے اور اگر ممکن نہ ہو تو جدھر بھی ہوسکے یہاں تک کہ قبلہ کی طرف پیٹھ کر کے پڑھے، کیونکہ موجودہ صورت میں وہی سمت اس کا قبلہ ہے اس آیت پاک کی بناء پر ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ الآیہ، مجبوریاں یہ ہوسکتی ہیں مینہ اور کیچڑ ایسی کہ سجدہ میں منہ دھنس جائے، چور، ڈاکو، بیماری، عورت، بوڑھا ہونا، خواہ ساتھ میں کوئی مددگار ہو یا نہ ہو اور درندہ اور سانپ کا خوف۔الخلاصہ۔

پھر ایک مرتبہ ایسی نماز پڑھ لینے کے بعد اسے دوبارہ پڑھنا ضروری نہیں ہے،المحیط، یہ حکم اس صورت میں ہوگا کہ جانور خود سے چل رہا ہو، لیکن اگر اسے چلانا پڑے پھر اگر اس میں عمل کثیر ہو تو بھی جائز نہ ہوگی،اور اگر عمل قلیل ہو تو جائز ہوگی،اگر محمل کے ایک کنارہ میں نماز پڑھی اور وہ خود اتر سکتا تھا تو نماز جائز نہ ہوگی جب کہ سواری ٹھہری ہوئی ہو، یعنی اونٹ کھڑا ہو یا بیٹھا ہو،اور اگر محمل کے نیچے لکڑیاں لگا کر اسے زمین پر ٹیک دیا جائے تو وہ تخت کے درجہ میں ہو جائیگی،اور نماز جائز ہو جائیگی،المحیط،ف،ت۔

اگر ایک محمل میں دو مرد ہوں اور نفل نماز شروع کر دی ہو اس طریقہ سے کسی ایک دوسرے کی اقتداء کر لی ہو تو جائز ہوگی، اور اگر اس کی ایک جانب میں ایک مرد ہو اور دوسری میں کوئی دوسرا ہو اور دونوں حصے ایک دوسرے سے منبدھے ہوئے ہو تو بھی جائز ہوگی ورنہ جائز نہ ہوگی،اور یہ بھی کہا گیا کہ اگر دونوں ایک اونٹ پر ہوں تو بہر حال جائز ہوں گی۔ع۔ لیکن فرض نماز میں یہ صورتیں جائز نہ ہوں گی،البتہ عذر کی صورت میں جائز ہوگی،ت،م۔

اور اگر بیل گاڑی ہو یا اس جیسی کوئی دوسری سواری ہو تو اگر اس کا کوئی کنارہ جانور پر ہو تو وہ سواری خواہ کھڑی ہو یا چل رہی ہو بہر حال ایسی سواری پر نماز کے حکم میں ہے اس لئے فرض بھی اس پر مجبوری کی صورت میں جائز ہوگی،اور اگر گاڑی کا کنارہ جانور پر نہ ہو تو وہ مثل تخت کے ہے اس لئے اس کے کھڑی ہونے کی صورت میں اس پر فرض بھی جائز ہوگی۔ف۔ع۔ت۔اور فرض نمازوں کے حکم میں واجب نمازیں مثلاً نذر، نفل کی قضاء،امام اعظم کے نزدیک وتر اور وہ سجدہ تلاوت جو زمین پر واجب ہوا ہو اور نماز جنازہ بھی ہیں۔ع ت،اور نفل نماز تو محمل اور گاڑی پر بہر حال جائز ہے۔ت۔ خواہ عذر ہو یا نہ ہو،اور کھڑی ہو یا چل رہی ہو۔م۔ مگر جماعت اسی صورت میں جائز ہوگی جب کہ ایک ہی محمل پر سب ہوں۔د۔

والسنن الرواتب نوافل، وعن ابی حنیفةؒ انه ینزل لسنة الفجر، لانها آکد من سائرها......الخ

اور موکدہ سنتیں بھی نفل ہی کے حکم میں ہیں،ف لہٰذا وہ بھی نفل کے طور پر سواری پر جائز ہیں. وعن ابی حنیفہؒ الخ اور ابو حنیفہؒ سے یہ بھی مروی ہے کہ فجر کی سنت کے لئے سواری سے اتر پڑے کیونکہ یہ دوسری تمام سنتوں سے زیادہ اہم ہے۔ف،ابو شجاعؒ نے کہا ہے کہ اس کے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ فجر کی سنت کے لئے اتر جانا اولی ہے،اور حسنؒ کی روایت میں سنت الفجر واجب ہے۔ع۔ متن کی پوری بحث کا حاصل یہ ہوا کہ شہر سے باہر جانور پر نفل جائز ہے،جانور کا رخ خواہ جدھر بھی ہو،اشارہ سے رکوع وسجدہ کرے،درمختار میں ذکر کیا ہے کہ اگر پورا سجدہ کر لیا تو اسے بھی اشارہ کے حکم میں سمجھا جائیگا۔

والتقیید بخارج المصر ینفي اشتراط السفر والجواز في المصر......الخ

اور شہر سے باہر کی قید لگانا سفر کی شرط اور شہر کے اندر جائز ہونے کی نفی کرتا ہے، ف یعنی اصل مسئلہ میں یہ قید لگائی ہے کہ شہر سے باہر ہو اس سے دو باتوں کا ثبوت ہوا (ا) یہ کہ حالت سفر کا ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ شہر سے باہر ہونا کافی ہے اگرچہ وہ مقیم ہو اور دیہات میں بھی جائز ہے جیسا کہ خلاصہ میں ہے، اور شہر سے باہر ہونے کی صورت میں مقیم و مسافر سب برابر ہیں، یہی قول صحیح ہی، پھر اصل میں لکھا ہے کہ آبادی دو فرسخ دور ہونا چاہئے، اور مرغینانیؒ نے لکھا ہے کہ اصح قول یہ ہے کہ جہاں سے مسافر کو قصر کرنا جائز ہو جاتا ہے، وہاں سے سواری پر نفل جائز ہے، مع، یعنی آبادی سے باہر۔م۔ دوسری بات یہ ثابت ہوئی کہ شہر کے اندر جائز نہیں ہے، یعنی مطلقاً، اور کہا گیا ہے کہ شہر سے باہر شروع کر کے پڑھتے ہوئے اگر شہر میں داخل ہو گیا تو سواری ہی پر اشارہ سے نماز مکمل کرے، اور اکثر مشائخ کے نزدیک اسے اتر جانا چاہئے، ع، ف، ت۔

وعن ابی یوسفؒ انه یجوز فی المصر ایضا، و وجه الظاهر ان النص ورد خارج المصر، والحاجة الی الرکوب فیه اغلب، فان افتتح التطوع راکبا ثم نزل یبنی، وان صلی رکعة نازلا ثم رکب استقبل، لان احرام الراکب انعقد مجوزا للرکوع والسجود لقدرته علی النزول، فاذا اتی بهما صح، واحرام النازل انعقد لوجوب الرکوع والسجود، فلایقدر علی ترک ما لزمه من غیر عذر، وعن ابی یوسفؒ انه یستقبل اذا نزل ایضا، و کذا عن محمدؒ اذا نزل بعد ما صلی رکعة، والاصح هو الظاهر.

ترجمہ:- اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ شہر کے اندر بھی جائز ہے، اور ظاہر الروایۃ کی وجہ یعنی آباد میں جائز نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ روایت جو منقول ہے وہ تو آبادی کے باہر جانے کے لئے ہے، اور وہاں سواری کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، اگر کسی نے نوافل کو سواری کی حالت میں شروع کیا پھر اس سے اتر گیا تو وہ بناء کرے یعنی بقیہ نماز پوری کر لے، اور اگر کسی اس کے برعکس یعنی زمین پر نماز شروع کی پھر سواری پر سوار ہو گیا تو وہ نماز کو بالکل ابتداء سے ہی پڑھے یعنی استقبال کرے، کیونکہ سوار کا احرام تو ایسا تھا کہ اس سے رکوع اور سجود پورے طور پر کر لے کیونکہ اسے اتر کر ادا کرنے کی پوری قدرت حاصل تھی، اب جب کہ اس نے دونوں کاموں کو ادا کر لیا تو صحیح رہا، اور اس شخص کا احرام جو زمین پر اترا ہوا (کھڑا موجود) ہے رکوع و سجود کے واجب ہونے کے لئے منعقد ہوا ہے، تو ایسا شخص بلا عذر اس چیز کو اب چھوڑنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے جس کو اس نے اپنے اوپر لازم کیا ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے روایت مذکور ہے کہ وہ سواری پر سے اتر کر بھی استقبال کرے گا، ایسا ہی امام محمدؒ سے مروی ہے جب کہ ایک رکعت پڑھ کر سواری سے اترا ہو، ظاہر الروایۃ میں یہی اصح ہے۔

توضیح:- سواری سے نماز کی حالت میں نیچے اترنا، چند ضروری مسائل

وعن ابی یوسفؒ انه یجوز فی المصر ایضا، و وجه الظاهر ان النص ورد خارج المصر......الخ

امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ شہر میں بھی سواری پر نماز جائز ہے، ف یعنی بلا کراہت اور امام محمدؒ کے نزدیک ساتھ جائز ہے، ان ع ف۔ و وجه الظاهر الخ اور ظاہر الروایۃ میں آبادی میں ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نص جو پائی گئی ہے وہ آبادی سے باہر جائز ہونے کی ہے، اور آبادی کے مقابلہ میں یا پھر سواری کی ضرورت بڑھی ہوئی ہوتی ہے، ف اس لئے شہر کے اندر کو اس پر قیاس نہیں کر سکتے۔م۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ امام ابو یوسفؒ کی دلیل جو ابن بطالؒ نے ذکر کی ہے اس میں بھی نص ہو سکتی ہے جو حضرت انسؓ کی روایت سے بخاری میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ازقة المدینة (مدینہ کی گلیوں) میں حمار (گدھے) پر نماز پڑھی ہے اس طرح سے کہ اشارہ سے نماز پڑھتے تھے ابو یوسفؒ نے اپنی اسناد کے ساتھ روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ گدھے پر سوار ہو کر سعد بن عبادہؓ کی عیادت کو جاتے اور اس پر نماز پڑھتے جاتے تھے، جواب دیا گیا کہ یہ حدیث شاذ ہے، اور جس چیز میں ابتلائے عام ہو

(یا عموم بلوی ہو) اس میں حدیث شاذ قابل قبول نہیں ہوتی ہے، معف، مگر میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ جواب ضعیف ہے، جیسا کہ مخفی نہیں۔م۔

فان افتتح التطوع راكبا ثم نزل يبني، وان صلى ركعة نازلا ثم ركب استقبل......الخ

اگر نمازی نے سواری پر نفل نماز شروع کی پھر اتر پڑا تو بناء کرے یعنی صرف بقیہ نماز پوری کر لے، اور اگر بر عکس کیا یعنی زمین پر ایک رکعت پڑھی ہو (یا رکعت پوری نہ پڑھی ہو جب بھی۔ع) پھر سوار ہو گیا تو بالکل ابتداء سے پڑھے۔ف یہ حکم ظاہر الروایہ میں بالاتفاق۔

لان احرام الراكب انعقد مجوزا للركوع والسجود لقدرته على النزول......الخ

اس دلیل سے کہ سواری کا تحریمہ تو اس انداز سے شروع ہوا تھا وہ حقیقتاً رکوع اور سجدہ کو جائز رکھے گا، کیونکہ ایک سوار کو سواری سے اترنے کی ہر وقت قدرت رہتی ہے، ف اس لئے اس کے تحریمہ میں بالفعل (فی الفور) وجوب رکوع و سجود نہ تھا مگر (بالقوہ یعنی) اس بات کی قدرت موجود تھی کہ رکوع و سجدہ سے باطل نہ ہو۔ فاذا اتى الخ تو جب اس نے رکوع و سجدہ کر لیا یعنی سواری سے اتر گیا تو اس کا یہ فعل صحیح رہا۔

واحرام النازل انعقد لوجوب الركوع والسجود، فلايقدر على ترك ما لزمه من غير عذر......الخ

اور جو زمین پر موجود ہے اس کا تحریمہ باندھا گیا تھا رکوع اور سجدہ کے واجب ہونے کے لئے، ف کیونکہ تحریمہ سے نفل نماز واجب ہو جاتی ہے اور حقیقتاً رکوع اور سجدہ کر سکتا ہے اس لئے اس نے تحریمہ باندھا ہی ہے رکوع و سجود کو واجب کرنے کے لئے. فلا يقدر الخ تو اب اسے اس بات کا اختیار باقی نہیں ہے کہ بغیر کسی عذر صحیح کے اس چیز کو چھوڑ دے جو اس پر لازم ہو چکی ہے، ف یعنی بغیر کسی عذر شرعی کے رکوع و سجود کو ترک نہیں کر سکتا ہے جب کہ سواری پر سوار ہو کر اس رکوع و سجود کو چھوڑ کر اشارہ کرنا ہوگا، اس لئے سوار ہو کر بناء کرنا صحیح نہ ہوگا، م، ان دونوں عملوں یعنی سواری سے اتر کر پڑھنے میں اور زمین سے سواری پر جا کر پڑھنے کے درمیان فرق کرنے کی وجہ یہاں بتائی گئی ہے یہی صحیح ہے، اور بعضوں نے جو فرق عمل قلیل و کثیر کا نکال کر کیا ہے وہ باطل ہے۔ مع.

وعن ابى يوسفؒ انه يستقبل اذا نزل ايضا، وكذا عن محمدؒ اذا نزل بعد ما صلى ركعة......الخ

اور ظاہر الروایۃ کے علاوہ امام ابو یوسفؒ سے روایت ہے کہ جب سواری سے اترے تو بھی ابتداء سے پڑھے، ف خواہ کوئی رکعت پڑھ لی ہو یا نہیں۔ وكذاعن محمدؒ الخ اور امام محمدؒ سے بھی ایسی ہی روایت ہے جب کہ ایک رکعت پڑھ کر اترے، ف کیونکہ اس طرح ضعیف پر قوی کی بناء ہے۔ع۔ والاصح الخ اور اصح وہی ظاہر الروایہ ہے، ف اس جملہ میں دو احتمال ہوتے ہیں (۱) صاحبین سے ثابت اصح وہی ظاہر الروایہ ہے، (۲) اصح حکم وہی ہے جو ظاہر الروایہ میں ہے، لیکن پہلا احتمال غالب تر ہے۔

چند ضروری مسائل

(۱) جانور پر نماز پڑھنی جائز ہے، اگرچہ اس کی زین ناپاک ہو ضرورت کے پیش نظر اکثر مشائخ کا یہی قول ہے، علی الصحیح۔ع، ف، ت۔ (۲) اگر جانور از خود چل رہا ہو تو اسے چلانا جائز نہیں ہے۔ (۳) اور کوڑا اٹھا کر مارنا اور اسے چونکے دینا مفسد نماز نہیں ہے، ذخیرہ میں ایسا ہی ہے۔ (۴) جوامع الفقہ میں ہے کہ دونوں پیر سے متواتر مار کر چلانا نماز کو فاسد کر دیتا ہے۔ع۔ (۵) اگر کوئی فرض اور نفل دونوں کی نیت جمع کر کے پڑھے تو وہ نماز فرض مانی جائی گی۔ت۔ (۶) اگر دو رکعت بغیر وضوء یا بغیر تلاوت کے پڑھنے کی نذر مانی تو وضوء اور قراءت دونوں ہی لازم ہوں گی، یہی قول مختار ہے۔ (۷) اگر کسی نے کسی خاص جگہ پر عبادت کرنے کی نیت کر کے اسے دوسری جگہ ادا کر لی تو جائز ہو جائیگی۔ (۸) اگر عورت نے کسی وقت میں نماز یا روزے کی نیت کر لی مگر اس

وقت کے آنے پر وہ حائضہ ہوگئی تو اس پر قضاء واجب ہے۔(۹) اور اگر حیض کے آنے کے دن میں نیت کی تو نماز وغیرہ لازم نہ ہوگی، کیونکہ ایسے وقت میں پڑھنا یا روزہ رکھنا گناہ کا کام ہے۔ف۔ت۔

فصل فی قیام رمضان

یستحب ان یجتمع الناس فی شهر رمضان بعد العشاء، فیصلی بهم امامهم خمس ترویحات، کل ترویحة بتسلیمتین، ویجلس بین کل ترویحتین مقدار ترویحة، ثم یوتر بهم، ذکر لفظ الاستحباب، والاصح انها سنة، کذاروی الحسن عن ابی حنیفةؒ، لانه واظب علیها الخلفاء الراشدون، والنبی علیه السلام بین العذر فی ترکه المواظبة، وهو خشیة ان تکتب علینا، والسنة فیها الجماعة، لکن علی وجه الکفایة، حتی لوامتنع اهل المسجد عن اقامتها کانوا مسیئین، ولو اقامها البعض، فالمتخلف عن الجماعة تارك للفضیلة، لان افراد الصحابةؓ یروی عنهم التخلف.

ترجمہ:۔ فصل۔ قیام رمضان کے بارے میں۔ یہ بات مستحب ہے کہ لوگ (مسلمان) رمضان کے مہینہ میں عشاء کے بعد اکھٹے ہوں، اور ان کا امام انہیں پانچ تراویح نماز پڑھائے، ہر ترویحہ دو سلام کے ساتھ ہو اور ہر دو ترویحہ کے درمیان ایک ترویحہ کی مقدار بیٹھے، پھر انہیں وتر کی بھی نماز پڑھائے ماتنؒ نے اس جگہ لفظ استحباب ذکر کیا ہے حالانکہ اصح یہ ہے کہ یہ سنت ہیں، حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے ایسی ہی روایت کی ہے کیونکہ ہمارے خلفائے راشدینؓ نے ان پر مداومت کی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں ہمیشہ نہ پڑھنے سے معذوری کا اظہار فرمایا ہے وہ یہ کہ ہم پر یہ فرض کردی جائیگی ان کی ادائیگی میں جماعت کا ہونا سنت ہے لیکن علی الکفایہ کے طور پر، یہاں تک کہ اگر کسی مسجد والوں نے ان کے پڑھنے سے انکار کردیا تو وہ سب گنہگار ہونگے لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگوں نے ادا کرلی تو جماعت سے پیچھے رہ جانے والی افراد فضیلت کے چھوڑنے والے کہے جائیگے، کیونکہ کچھ صحابہ کرامؓ سے بھی اس سے پیچھے رہ جانا ثابت ہے۔

توضیح:۔ فصل قیام رمضان کی، تعداد رکعات، جماعت تراویح، دلیل

فصل فی قیام رمضان...... الخ

قیام رمضان سے مراد رمضان کی رات میں عبادت پر قیام کرنا ہے چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں کو قیام رمضان کی ترغیب دیتے اور اس میں کسی کے نیکی کے مخصوص کام کے لئے حکم نہ فرماتے بس عمومی طریقہ سے اس طرح فرماتے کہ جس نے قیام کیا رمضان کا صرف ایمان کی بناء پر یعنی حق یقین کر کے اور از راہ احتساب کے یعنی صرف ثواب کی امید دکھاوے کے خیال کے بغیر تو اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دئے جائینگے، تمام ائمہ ستہ نے اس کی روایت کی ہے، مبسوط میں ہے کہ فرقہ رافضیہ کے علاوہ ملت اسلامیہ کے تمام فرقوں نے قیام رمضان کے ثابت اور شروع ہونے پر اتفاق کیا ہے، رافضیہ اس کے منکر ہیں۔ مع۔

یستحب ان یجتمع الناس فی شهر رمضان بعد العشاء، فیصلی بهم امامهم خمس ترویحات......الخ

مستحب ہے کہ لوگ ماہ رمضان میں عشاء کے بعد مجتمع ہوجائیں، ف یعنی عشاء کی فرض نماز پڑھ کر جمع ہوں، خواہ مسجد میں ہوں یا کسی اور جگہ، مرد ہوں یا عورتیں۔ **فیصلی بهم الخ** امام ان لوگوں کو پانچ ترویحے پڑھائے، ف اس سے زیادہ جماعت مکروہ ہے، خلاصہ۔

کل ترویحة بتسلیمتین، ویجلس بین کل ترویحتین مقدار ترویحة، ثم یوتر بهم......الخ

ہر ترویحہ دو سلام کے ساتھ، ف اور ہر سلام دو رکعتوں کے بعد، اس طرح یہ کل بیس رکعتیں ہوں گی۔ **ویجلس الخ** اور

ہر دو ترویحے کے درمیان ایک ترویحہ کی مقدار بیٹھے، پھر امام ان کو وتر کی نماز پڑھائے، ف۔ معلوم ہونا چاہئے کہ قدوریؒ نے اس مسئلہ میں جو باتیں اشارے میں بیان کی ہیں ان میں سے ہر ایک سمجھنے کے لائق ہے، تاکہ اعتراض کرنے والوں کے اعتراضات ختم ہو جائیں، وہ باتیں یہ ہیں (۱) استحباب (۲) سماعت (۳) استراحت (۴) وقت (۵) قدر قراءت، مع ہر ایک کے متعلقات، مصنفؒ نے کہا ہے کہ ذکر لفظ الاستحباب قدوریؒ نے لفظ استحباب ذکر کیا ہے، ف یعنی قولہ یستحب الخ، میں۔

والاصح انها سنة، كذا روى الحسن عن ابي حنيفةؒ ، لانه واظب عليها الخلفاء الراشدون......الخ

اصح قول یہ ہے کہ تراویح سنت ہے ف لیکن قدوریؒ وغیرہ قدماء مشائخ کبھی لفظ مستحب سے بہت خوب معنی لیتے، اس طرح اس میں واجب بھی داخل ہو جاتا، اس بناء پر عجب نہیں کہ یہاں بھی اسی معنی میں ہو، یعنی لوگوں کا اس وقت یہاں جمع ہونا بہت خوب اور بڑی فضیلت کی بات ہے، اور یہ سنت ہے، کذا روی الخ حسنؒ نے بھی ابوحنیفہؒ سے اس طرح روایت کی ہے، ف کہ تراویح سنت ہے، لانه واظب الخ کیونکہ خلفائے راشدینؓ نے اسی پر مداومت فرمائی ہے، ف، اور مداومت پائے جانے سے سنت کا حکم ثابت ہوتا ہے، اور چونکہ حدیث میں ثابت ہے کہ میری اور میرے خلفائے راشدین مہدین کی سنت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو، اس جملہ سے خلفائے راشدین کی مواظبت رسول اللہ ﷺ کی مواظبت کے حکم میں ہے۔

والنبي عليه السلام بين العذر في تركه المواظبة، وهو خشية ان تكتب علينا......الخ

اور رسول اللہ ﷺ تراویح کو ہر روز نہ پڑھنے کے سلسلہ میں اپنی مجبوری خوف کی بتائی اور یہ وجہ بیان فرمائی ہے کہ مجھے اس بات کا خوف ہوتا ہے کہ امت پر یہ فرض نہ کر دی جائے، ف، جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم وغیرہ میں ہے، خلفائے راشدین سے مراد حضرت (۱) ابو بکر الصدیقؓ (۲) عمر فاروقؓ (۲) عثمان غنیؓ (۳) علی مرتضیٰؓ ہیں، لیکن اس خبر میں جن خلفائی راشدین کی مواظبت کا تذکرہ ہے وہ صرف آخری تین خلفائے راشدین ہیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور ابو بکر صدیقؓ کے زمانہ تک تو تنہا ہی پڑھی جاتی تھی، عینیؒ نے کہا ہے کہ سنت ہونے کے واسطے استدلال کے لئے بہترین اور اعلیٰ دلیل حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر ہر رمضان کا روزہ فرض کیا ہے، اور رمضان کا قیام سنت کیا ہے پس جس نے رمضان کا روزہ رکھا اور رمضان کا قیام کیا حسبۃً للہ تو وہ اپنے گناہ سے ایسا پاک ہو گیا جیسے اس دن کہ ماں نے اسے جنا تھا، اس کی روایت احمد، نسائی، ابن ماجہ نے کی ہے ترجمہ ختم ہوا۔

لیکن اس حدیث سے تو مطلقاً صرف قیام کے مسنون ہونے کا ثبوت ہوتا ہے، اب رکعات کی تعداد کی تحقیق باقی ہے، ابن الہمامؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دو روز مسجد میں پڑھائی اور تیسرے روز امت پر فرض ہو جانے کے خوف سے نہیں نکلے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات تک یہ معاملہ اسی حالت پر رہا، جیسا کہ بخاری میں ہے، پھر حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کو جمع کیا، چنانچہ عبدالرحمٰنؓ نے روایت کی ہے کہ میں رمضان کی رات میں حضرت عمرؓ کے ساتھ مسجد کی طرف نکلا تو لوگوں کو دیکھا کہ وہ متفرق خود سے پڑھ رہے تھے، کہ کچھ بالکل تنہا پڑھ رہے تھے، اور کچھ لوگوں کے پیچھے تھوڑے تھوڑے لوگ تھے، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں بہتر سمجھتا ہوں کہ ان کو میں ایک قاری (حافظ) کے پیچھے جمع کر دوں، اس کے بعد ابی بن کعبؓ کے پیچھے سب کو جمع کر دیا، پھر کسی دوسری رات تشریف لا کر منظر دیکھ کر فرمایا کہ یہ تو اچھی بدعت ہے، اور وہ رات جس میں تم سوتے ہو اس سے افضل ہے، یعنی آپ نے آخیر رات کے بارے میں فرمایا، کہ لوگ رات کے پہلے حصہ میں قیام کرتے تھے اور اس کی روایت سنن اربعہ نے کی ہے، اور ترمذی نے اس کی تصحیح کی ہے۔

ان کا یہ اجتماع ۲۳ رکعتوں پر تھا، یعنی تراویح کی بیس رکعتوں کے ساتھ تین رکعت وتر کی، جیسا کہ یزید بن رومانؒ کی روایت سے موطا میں ہے، اور سائب بن یزیدؓ سے بیہقیؒ نے روایت کی ہے، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے لیکن ابن عباسؓ سے جو ابن ابی شیبہ، طبرانی اور بیہقیؒ نے رسول اللہ ﷺ کا بیس رکعتوں پر قیام کرنے کی روایت کی ہے، اس کے راوی ابراہیم بن عثمان

اجماعی ضعیف ہیں، اور وہ حضرت عائشہؓ کی اس صحیح حدیث کے مخالف ہے جس میں یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ گیارہ رکعتوں سے زیادہ قیام نہیں کرتے تھے نہ رمضان میں نہ غیر رمضان میں، جیسا کہ صحیح میں ہے۔
یہاں تک کہ پوری بحث کا حاصل یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خود تو جماعت کے ساتھ عملی طور پر گیارہ رکعتیں ہمیشہ پڑھتے رہے اور امت پر فرض کا حکم نازل ہو جانے کے خوف سے آپ نے زیادہ نہیں فرمایا ورنہ بڑھاتے جاتے تو جماعت اسی گیارہ پر آپ کی عملی مداومت پائی گئی تو اتنی رکعتیں یقیناً سنت پائیں پھر خلفائے راشدینؓ خود ۲۰ رکعتیں پڑھتے رہے اور سبھوں کو ان کی اتباع کرنے اور لازم پکڑے رہنے کا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حکم دئے جانے کی بناء پر یہ بیس رکعتیں ہی خلفائے راشدین کی سنت ٹھہریں، اس طرح ۲۰ رکعتوں میں سے ۸ رکعتیں رسول اللہ ﷺ کے سنت فعلیہ ہوئیں اور باقی خلفائے راشدین کی سنت ہیں لہذا یہ مستحب ہوئیں، اور مشائخ کے کلام سے یہ ظاہر ہے کہ پوری ۲۰ رکعتیں سنت ہیں، لیکن دلیل کا تقاضا تو وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کیا ہے، اسی صورت میں قدوریؒ کا یہ قول کہ وہ مستحب ہے زیادہ بہتر ہے، فتح القدیر کی مختصر عبارت کا ترجمہ ختم ہوا۔
اب میں مترجم کہتا ہوں کہ رکعتوں کی تعداد تو عقلی بات نہیں بلکہ شریعت کی طرف سے بتائی ہوئی یا توفیقی ہوتی ہے اس لئے بالضرور حضرت عمرؓ کا لوگوں کو بیس رکعتوں پر جمع کرنا اور ابی بن کعب اور دوسرے صحابہ کرامؓ کا اسے بآسانی قبول کر لینا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ تعداد اور اس کا ثبوت رسول اللہ ﷺ سے پایا گیا ہے اس طرح ابن ابی شیبہ و طبرانی کی وہ روایت جو ابن عباسؓ سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بیس رکعتیں پڑھائی ہیں، قوی ہو جائیگی، اور ام المومنین حضرت عائشہؓ کی حدیث کہ آپ نے رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ سے زیادہ نہیں کیا اس کے مخالف نہیں ہے جب کہ تہجد اور تراویح علیحدہ ہوں، اور مشائخ حنفیہؒ کا ظاہر کلام یہی ہے پس تراویح کی ۲۰ رکعتیں پڑھائیں اور تہجد میں گیارہ سے زیادہ نہیں کیا اور خود رسول اللہ ﷺ سے تیرہ رکعتیں ثابت ہیں، لیکن ابن الہمامؒ نے اس بات کو ٹھہراؤ آنے اور استقرار پائے جانے سے پہلے زمانہ پر محمول کیا ہے اور بندہ مترجم نے ابتدائی حالت پر جیسا کہ گذرا پھر کمی ہوئی، یہاں تک کہ صرف ساتھ رکعتیں رہ گئیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے، لیکن یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہئے کہ گیارہ رکعتیں وتر کے ساتھ مل کر ہوئیں اور جب تراویح وتر کے ساتھ پڑھائی تو وتر دو مرتبے ہوئی جب کہ وتر دو مرتبے نہیں ہوتے اس کے علاوہ قیام اللیل سے مراد تراویح ہے جو رمضان میں رات کے پہلے حصہ میں پڑھ لی گئی، اسی واسطے حضرت عائشہؓ سے یہ ثابت ہوا ہے رسول اللہ ﷺ نے رات کے ہر حصہ میں وتر کی نماز پڑھی ہے یعنی اول شب میں درمیانی شب میں اور آخری شب میں یہاں تک کہ سحر تک بھی پڑھی ہیں، لہذا تحقیقی بات وہی ثابت ہوئی جو شیخ ابن الہمامؒ نے کہی ہے (کہ رسول اللہ ﷺ نے دو روز تو مسجد میں پڑھائی اور تیسرے روز امت پر فرض ہو جانے کے خوف سے آپ نہیں نکلے)، اسی طرح ہمارے شیخ محققؒ نے بھی مجھ سے یہی فرمایا ہے۔
سب کا ماحصل یہ نکلا کہ بیس رکعتوں میں رسول اللہ ﷺ کی سنت قولی اور فعلی اور خلفائے راشدین کی سنت اور تمام مسلمانوں کا اتفاق سب جمع ہیں اور اگر کسی نے صرف آٹھ رکعتوں پر اکتفاء کیا تو اس نے رسول اللہ ﷺ کے ارشاد اور خلفائے راشدین کی سنت اور جماعت مسلمین سے مخالفت کی، جس کا کم سے کم اثر کراہت اسائت ہے، اسی واسطے حسنؒ نے ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ تراویح کو چھوڑنا جائز نہیں ہے، اور صدر شہیدؒ نے کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔
عینیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے اور امام شافعی اور امام احمدؒ متفق علیہ مذہب بیس رکعت ہے، اور قاضیؒ نے تو اسے جمہور علماء کا قول نقل کیا ہے، ابن قدامہ حنبلؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ نے ایک شخص کو حکم دیا اور اس نے اس بناء پر رمضان میں بیس رکعتیں پڑھائیں، اور کہا ہے کہ یہ بات اجماع کے درجہ میں ہے، جوامع الفقہ میں کہا ہے کہ تراویح میں جماعت واجب ہے، امام حمید الدینؒ نے کہا ہے کہ مستحب ہے۔ع۔

والسنة فيها الجماعة، لكن على وجه الكفاية، حتى لو امتنع اهل المسجد عن اقامتها......الخ

تراویح میں سنت تو جماعت ہے، لیکن بطور کفایہ کے ہے، ف یعنی تراویح میں جماعت کرنی سنت کفایہ ہے، یہی قول اکثر مشائخ کا ہے، الذخیرہ، اور یہی صحیح ہے، محیط السرخسی، ھ. حتی لو امتنع الخ یہاں تک کہ اگر ایک مسجد کے تمام نمازی جماعت تراویح سے باز رہیں تو وہ لوگ سب بہت برا کرنے والے ہوں گے۔ ولو اقامها البعض الخ لیکن اگر ان میں سے کچھ لوگوں نے بھی جماعت سے پڑھ لی تو جن لوگوں نے اس میں شرکت نہیں کی وہ فضیلت کے تارک کہے جانے کے مستحق ہوں گے، ف امام احمد اور کچھ علماء نے کہا ہے کہ جماعت مستحب اور افضل ہے، اور عام علماء کے نزدیک یہی بات مشہور ہے اور مبسوط میں کہا ہے کہ یہی قول اصح واوفق ہے، اور علی بن موسی الشافعیؒ نے اسی پر اجماع کہا ہے۔ ع۔

فالمتخلف عن الجماعة تارك للفضيلة، لان افراد الصحابةؓ يروى عنهم التخلف......الخ

کیونکہ بعض حضرات صحابہ کرامؓ ایسے بھی گذرے ہیں جن کے متعلق یہ روایت کی جاتی ہے، کہ وہ تراویح کی جماعت میں شریک نہیں ہوئے، ف اور تنہا پڑھ لی، چنانچہ طحاوی اور بیہقیؒ اور ابن ابی شیبہؒ اس کو حضرت ابن عمرؓ و سالم و قاسم سے اور طحاوی نے ابراہیم و عروہ و سعید بن جبیر اور نافعؒ سے اس کی روایت کی ہے، اور مجاہدؒ نے کہا ہے کہ ابن عمرؓ سے ایک شخص نے رمضان میں جماعت کے متعلق پوچھا تو فرمایا کہ تم نے قرآن پڑھا ہے انہوں نے کہا جی ہاں تو فرمایا کہ اپنے گھر میں پڑھا کرو، اس کی روایت طحاویؒ نے کی ہے، فع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ خود حضرات خلفائے راشدین عمر و عثمان اور علیؓ سے شرکت ثابت نہیں ہے، اس بناء قاری قرآن اور فقہ کے لئے تنہا طمانینت قلبی کے ساتھ پڑھنا افضل ہے، کمافی قاضی خان۔ م۔ پھر جماعت کو مسجد میں قائم کرنا افضل ہے، اسی پر اعتماد ہے۔ ع۔ اور گھر میں بھی جماعت افضل ہے لیکن مسجد کی فضیلت سے کم، قاضی خان۔ پھر تراویح مردوں اور عورتوں سب پر سنت ہے۔ ت۔ لیکن جماعت صرف مردوں کے لئے ہے، اور عینیؒ نے عروہ بن الزبیرؓ سے روایت ذکر کی ہے جس میں حضرت عمرؓ کا مردوں کو علیحدہ جماعت اور عورتوں کو علیحدہ جماعت سے پڑھنے کا ذکر کیا ہے، اور میں مترجم کہتا ہوں کہ ہمارے زمانہ میں عورتوں کا ذی رحم امام ہو یا تنہا پڑھیں، اگرچہ یہ کہا جائے کہ صرف عورتوں کی جماعت قول اصح کی مطابق مکروہ نہیں ہے، م۔

والمستحب فی الجلوس بین الترویحتین مقدار الترویحة، وكذا بين الخامسة وبين الوتر لعادة اهل الحرمين، واستحسن البعض الاستراحة على خمس تسليمات، وليس بصحيح، وقوله ثم يوتر بهم يشير الى ان وقتها بعد العشاء قبل الوتر، وبه قال عامة المشايخ، والاصح ان وقتها بعد العشاء الى آخر الليل قبل الوتر وبعده، لانها نوافل سنت بعد العشاء، ولم يذكر قدر القراءة، واكثر المشائخ على ان السنة فيها الختم مرة، فلا يترك لكسل القوم بخلاف ما بعد التشهد من الدعوات حيث يتركها، لانها ليست بسنة، ولا يصلى الوتر بجماعة فی غير شهر رمضان، عليه اجماع المسلمين، والله اعلم.

ترجمہ:- اور دو ترویحوں کے درمیان ایک ترویحہ کی مقدار بیٹھنا مستحب ہے، ایسا ہی پانچویں ترویحہ اور وتر کے درمیان بھی، کیونکہ اہل حرمین (مکہ اور مدینہ والوں) کی عادت یہی ہے، اور بعض لوگوں نے پانچ سلاموں پر (دس رکعتوں کے بعد) بھی بیٹھنے کو اچھا سمجھا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، اور ماتنؒ کا ثم یوتر بهم کہنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اس تراویح کا وقت ہی عشاء کے بعد اور وتر سے پہلے ہے، اور عامہ مشائخ نے یہی کہا ہے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ اس کا وقت عشاء کے بعد سے آخر رات تک ہے، کیونکہ یہ ایسی نفلیں ہیں جو عشاء کے بعد ہی مسنون کی گئی ہیں ماتنؒ نے مقدار قراءۃ کو بالکل ذکر نہیں کیا ہے، مگر اکثر مشائخ کا یہ فرمانا ہے کہ اس پوری تراویح میں کم از کم ایک بار ختم قرآن کرنا مستحب ہے، لہٰذا قوم کی سستی کی وجہ سے اسے نہیں چھوڑنا چاہئے، بخلاف تشہد کے بعد دعاؤں کے کہ انہیں چھوڑا جاسکتا ہے، کیونکہ وہ سنت نہیں ہیں، اور رمضان کے مہینہ کے علاوہ وتر کی نماز جماعت کے ساتھ دوسرے وقت میں نہیں پڑھی جائے، اسی پر تمام مسلمانوں کا اجماع ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

توضیح:-تراویح کی جماعت، دلیل، دوترویحہ کے درمیان بیٹھنا، وقت تراویح، مقدار تراویح

اور مقدار قراءت، رمضان اور وتر کی جماعت، امام کا شدومد میں لحن کرنا، جس مسجد میں ختم نہ ہو سکے، صحیح پڑھنا اور اچھی آواز سے پڑھنا، اجرت پر حافظ امام کو لانا، ایک مسجد میں تراویح دوبارہ ہونا، دو مسجدوں میں ایک امام کی تراویح، مقتدیوں کی تراویح میں دو امام کا ہونا، تراویح کی قضاء، وتر کے بعد کسی دو رکعت کا یاد آجانا، تعداد رکعات میں شبہ ہونا، فرض تنہا پڑھ کر تراویح کی جماعت میں شریک ہونا، تراویح میں شرکت نہ کی اور وتر میں شرکت کی، دو ترویحے فوت کر کے وتر میں شرکت کی، تراویح میں نیت کرنا، چھوٹا ختم، تراویح بیٹھ کر، امام بیٹھا اور مقتدی کھڑا، ایک سلام سے چار رکعتیں درمیانی قعدہ نہ کرنا، مقدار تشھد بیٹھنا، چھ یا آٹھ رکعتیں ایک سلام سے اور ہر دو رکعت پر قعدہ کرنا، کل تراویح ایک سلام سے، مقتدی رکوع کے وقت شریک ہو، چھوٹی ہوئی رکعتیں

والمستحب فی الجلوس بین الترویحتین مقدار الترویحة......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، ف ترویحہ میں بیٹھنے کے بعد اختیار ہے کہ چاہئے تو اس میں سبحان اللہ پڑھے یا لا الہ الا اللہ پڑھے یا درود پڑھئے چاہے خاموش رہے، جو کرے وہی بہتر ہے، قاضی خان، مگر دو رکعت نفل پڑھنا مکروہ کیونکہ بدعت ہے اور امام کی مخالفت بھی ہے، جوامع الفقہ۔ع۔ لیکن بیہقیؒ نے اسناد صحیح سے روایت کی ہے کہ لوگ حضرت عمرؓ کی خلافت کے زمانہ میں بھی قیام کرتے اور کسی ایسے کو جو نفل پڑھنا چاہتا منع نہیں کرتے تھے، ابن الھمامؒ نے فرمایا ہے کہ مدینہ والے تنہا چار رکعتیں پڑھ لیتے، اور اہل مکہ طواف کرتے اور اس کی دو رکعتیں پڑھتے، الفتح، پانچویں ترویحہ اور وتر کے درمیان استراحت کرنا اہل الحرمین کی مخالفت ہے، سرخسیؒ نے یہی فرمایا ہے۔ع۔

واستحسن البعض الاستراحة علی خمس تسلیمات، ولیس بصحیح......الخ

بعضوں نے پانچ سلاموں کے بعد (دسویں رکعت کے بعد) استراحت کرنے کو اچھا سمجھا ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، ف بلکہ جمہور کے نزدیک مکروہ ہے، الکافی، اور یہی صحیح ہے، الخلاصہ۔ وقولہ ثم الخ مصنفؒ کا یہ قول کہ ثم یوتر بھم سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کے بعد اور تراویح سے پہلے ہے۔ وبہ قال الخ عامہ مشائخ کا یہی قول ہے، ف اور مشائخ بخاری کا بھی یہی قول ہے، اور یہی قول صحیح ہے، الذخیرہ۔ع۔

والاصح ان وقتھا بعد العشاء الی آخر اللیل قبل الوتر وبعدہ، لانھا نوافل سنت بعد العشاء......الخ

اور اصح قول یہ ہے کہ تراویح کا وقت عشاء کے بعد آخر رات تک ہے خواہ وتر سے پہلے ہو یا بعد ہو۔ لانھا الخ کیونکہ تراویح بھی نوافل ہیں، جو عشاء کے بعد مقرر کی گئی ہیں، ف اور اس کی تاخیر تہائی رات تک مستحب ہے، ت، یہ اس بناء پر ہے کہ تراویح تہجد کے علاوہ نماز ہے اور رمضان میں دوبار قیام اللیل ہے۔م۔ اور صحیح یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد مکروہ نہیں ہے، کیونکہ شب بیداری میں آخری رات کا حصہ افضل ہوتا ہے، الفتح۔

ولم یذکر قدر القراءۃ، واکثر المشائخ علی ان السنة فیھا الختم مرة......الخ

مصنفؒ نے قراءت کی مقدار بیان نہیں کی ہے، لیکن اکثر مشائخ کا یہ فرمانا ہے کہ تراویح میں ایک بار ختم کرنا سنت ہے، ف یعنی ہر رکعت میں تقریباً دس آیتیں پڑھے، اور یہی بات حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے، اور یہی صحیح بھی ہے، التبیین، اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے کہا ہے کہ یہی احسن ہے۔ع۔ ہمارے زمانے میں افضل یہ ہے کہ اتنی قراءت ہو کہ مقتدیوں کو بار نہ ہو، المحیط۔ اس بناء پر سراج میں جو ذکر کیا ہے کہ دو ختم میں فضیلت ہے اور تین ختم میں افضلیت ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے، م، تلاوت کے وقت اسی طرح ارکان کی ادائیگی میں بھی جلدی کرنا مکروہ ہے، السراجیہ، اکیس تاریخ تک ختم کرنا مکروہ ہے، قاضی

خان، اور ستائیس کو ختم کرنا چاہئے، المحیط، ختم قرآن کے بعد تراویح کو چھوڑ دینا مکروہ ہے، السراج۔

فلا يترك لكسل القوم بخلاف ما بعد التشهد من الدعوات حيث يتركها......الخ

لہٰذا قوم کی سستی کی بناء پر ایک ختم نہیں چھوڑنا چاہئے۔ **بخلاف الخ** بخلاف التحیات کے بعد کی دعاء کے کہ ان کو ترک کردے کیونکہ وہ سنت نہیں ہیں، ف اگر التحیات کے بعد کے دعاء پڑھنی مقتدیوں پر جبر محسوس ہوتی ہو تو ان کو ترک کر دینا چاہئے، لیکن درود پڑھنا امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ واجب ہے اس لئے وہ بھی احتیاطاً پڑھ لینی چاہئے، النہایہ۔ **بقدر اللهم صل على محمد**۔ ت۔ لیکن یہ مسئلہ قابل غور ہے، کیونکہ جو چیز مستحب یا سنت صحابی ہو وہ قوم کی سستی کی وجہ سے نہیں چھوڑی جا سکتی ہے، اور جو چیز سنت رسولؐ سے ہو وہ چھوڑ دی جائے، چنانچہ مسند احمد میں حضرت ابن مسعودؓ سے اور صحیحین میں ابوہریرہؓ سے التحیات کے بعد رسول اللہ ﷺ کا ہمیشہ دعاء کرنا ثابت ہے، العینی۔

ولا يصلي الوتر بجماعة في غير شهر رمضان، عليه اجماع المسلمين، والله اعلم......الخ

اور وتر نماز رمضان کے مہینہ کے علاوہ دوسرے دنوں میں جماعت سے نہیں پڑھی جائے، ف، اور رمضان میں جماعت سے پڑھنی افضل ہے، یہی صحیح ہے، قاضی خان، نہیں بلکہ تنہا گھر میں، اور یہی مذہب مختار ہے، التبیین، لیکن اول اصح ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ م۔ **عليه اجماع المسلمين الخ** اسی پر مسلمانوں کا اجماع ہے، **والله تعالى اعلم**۔

چند ضروری مسائل

(۱) اگر امام قراءت کے شدومد میں لحن کرے (یعنی قراءت کے جوش اور مستی میں صحیح طور پر قراءت نہ کرے اور اس کی ادائیگی اور تلفظ کو غلط کردے) تو چاہئے کہ مسجد میں نماز نہ پڑھائے کہیں اور کی راہ لیں، (کہ وہ امامت کا مستحق نہیں ہے)۔ (۲) اسی طرح اگر اور کوئی شخص جو صحیح تلفظ ادا کرنے کا خیال نہ کر کے صرف خوش آوازی کا خیال رکھتا ہو یا جسے صحیح طور پر تلاوت کرنی نہ آتی ہو۔

(۳) اگر کسی کی متعین یا محلّہ کی مسجد میں ختم قرآن کا انتظام نہ ہو اسے اختیار ہے کہ دوسری جگہ جا کر سن لے، المحیط۔

(۴) ایسے شخص کو ختم کرانے میں ترجیح دی جائے جو صحیح طور پر قرآن پڑھ سکتا ہو، صرف خوش آواز ہونے کی وجہ سے ترجیح نہیں دی جائے، اجرت پر کسی حافظ کو امام بنانا مکروہ ہے۔

(۵) ایک مسجد میں دوبار تراویح مکروہ ہے، قاضی خان۔

(۶) امام کو دو مسجدوں میں پوری پوری تراویح پڑھانا جائز نہیں ہے، محیط السرخسی، اسی پر فتویٰ ہے، المضمرات۔ (۷) مقتدیوں کے لئے حرج نہیں ہے، تاتارخانیہ۔

(۸) افضل یہ ہے کہ ایک ہی امام پڑھائے، اور اگر دو اشخاص پڑھاتے ہوں تو مستحب یہ ہے کہ ہر ایک پوری ترویحہ سنائے، یہی صحیح ہے۔

(۹) یہ بات جائز ہے کہ ایک ہی شخص فرض کے ساتھ وتر کو بھی پڑھائے اور تراویح کوئی دوسرا شخص پڑھائے، السراج۔

(۱۰) تراویح اگر چھوٹ جائے تو اس کی قضاء نہیں ہے نہ جماعت کے ساتھ اور نہ تنہا، یہی صحیح ہے، قاضی خان۔

(۱۱) وتر کے بعد اگر یہ یاد آجائے کہ اس کی دو رکعتیں چھوٹ گئی ہیں تو انہیں تنہا پڑھ لے، المحیط۔

(۱۲) سلام پھیرنے کی بعد مقتدیوں میں کچھ لوگوں نے کہا دو رکعتیں ہوئیں اور کچھ لوگوں نے کہا کہ تین رکعتیں ہوئیں تو جو خیال امام کا ہو اسی پر عمل کرے، اور اگر خود امام کو شک ہو تو جس کا قول اس کے نزدیک سچ ہو اس پر عمل کرے، قاضی خان۔

(۱۳) جس نے فرض تنہا پڑھی ہو وہ بھی تراویح کی جماعت میں شریک ہو سکتا ہے۔

(۱۴) اور اگر تمام لوگوں نے فرض کی جماعت چھوڑ دی ہو تو وہ تراویح کی جماعت نہیں کر سکتے۔

(۱۵) اگر کسی نے تراویح بالکل نہیں پائی یا دوسرے کے ساتھ پڑھ لی تو اس کے لئے بھی یہ صحیح ہے کہ اس امام کے پیچھے وتر کی جماعت میں شریک ہو جائے، القنیہ۔

(۱۶) اگر کسی کی کئی رکعتیں چھوٹ گئیں تو اگر ان کے ادا کر لینے بعد کے وتر کی جماعت چھوٹ جانے کا خطرہ ہو تو انہیں نہ پڑھے، بعد میں ادا کر لے۔

(۱۷) تراویح کی ہر رکعت کے لئے نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، قاضی خان، السراجیہ۔ (۱۸) اگر پورا ختم مقصود نہ ہو تو بہتر یہ ہے کہ الم ترکیف سے آخر تک سورتیں پڑھ لی جائیں، التجنیس۔

(۱۹) بلاعذر تراویح بیٹھ کر پڑھنی مستحب نہیں ہے، اور صحیح یہ ہے کہ جائز ہے مگر ثواب آدھا ہو گا۔

(۲۰) اگر امام کسی عذر کی وجہ سے یا بلاعذر بیٹھ کر پڑھاتا ہو اور مقتدی سب کھڑے ہو کر پڑھتے ہوں تو بالاتفاق جائز ہے، مگر مستحب یہ ہے کہ مقتدی سب بھی بیٹھ جائیں۔

(۲۱) اگر امام نے ایک سلام سے چار رکعتیں پڑھ لیں اور درمیان میں نہیں بیٹھا تو وہ صرف دو رکعتیں ہی شمار ہوں گی، یہی صحیح ہے۔

(۲۲) اور اگر درمیان میں دو رکعتوں کے بعد مقدار تشہد بیٹھ چکا ہو تو عامہ مشائخ کے نزدیک وہ دو شفع ہوں گی یہی صحیح ہے۔

(۲۳) اور اگر چھ یا آٹھ رکعتیں پڑھیں اور ہر دو رکعت پر بیٹھتا رہا تو صحیح قول یہی ہے کہ دو رکعت ایک شفع ہو نگی، قاضی خان۔

(۲۴) اگر پوری بیس رکعتیں ایک سلام سے پڑھیں پس اگر ہر دو رکعت پر بیٹھتا رہا تو پوری سمجھی جائینگی، اور اگر صرف آخر میں بیٹھا تو صحیح قول کے مطابق ایک شفع نماز ہو گی، السراج و قاضی خان۔

(۲۵) یہ بات مکروہ ہے کہ مقتدی شروع سے بیٹھا رہے مگر جب امام رکوع کرنے کے قریب ہو تو کھڑا ہو کر اس میں شامل ہو جائے، قاضی خان۔

(۲۶) اگر درمیان میں دو رکعتیں تراویح کی چھوٹ جائیں تو امام کے سلام کے بعد جلد پڑھ کر جماعت میں شامل ہو جائے، جیسا کہ خلاصہ میں ہے۔

باب ادراك الفريضة

ومن صلى ركعة من الظهر، ثم اقيمت يصلي اخرى صيانة للمؤدى عن البطلان، ثم يدخل مع القوم احرازا لفضيلة الجماعة، وان لم يقيد الاولى بالسجدة، يقطع ويشرع مع الامام، هو الصحيح، لانه بمحل الرفض والقطع للاكمال، بخلاف ما اذا كان في النفل، لانه ليس لا كمال، ولو كان في السنة قبل الظهر والجمعة، فاقيم او خطب يقطع على راس الركعتين، يروى ذلك عن ابي يوسف وقد قيل يتمها.

ترجمہ:- باب فریضہ پانے کے بیان میں جس نے ظہر کی ایک رکعت نماز پڑھ لی اتنے میں وہیں پر جماعت کے لئے اقامت کہی گئی تو اسے چاہئے کہ ایک رکعت پڑھ کر ملا لے پڑھی ہوئے ایک کو باطل ہو جانے سے بچانے کے لئے پھر مقتدیوں کے ساتھ شامل ہو جائے، جماعت کی فضیلت حاصل کر لینے کے لئے، اور اگر پہلی رکعت کو اس نے سجدہ سے مقید نہ کر لیا ہو تو اسی وقت نیت توڑ دے، اور امام کے ساتھ شریک ہو جائے، کہ یہی صحیح ہے، کیونکہ وہ موقع اس وقت تک چھوڑ دینے کا تھا، اور اس جگہ نماز کا باطل کرنا نماز کو کامل کرنے کے لئے نہیں ہے، اور اگر ظہر یا جمعہ سے پہلے کی سنت میں مشغول ہو اور اقامت کہہ دی گئی ہو یا خطبہ جانے لگا ہو تو دو رکعتوں کے پورا ہونے پر سلام پھیر کر نماز ختم کر دے یہ حکم امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے، اور یہ بھی کہا گیا کہ

اسے پوری کرلے۔

توضیح:-باب فریضہ پانے کے بیان میں
نماز ظہر کسی نے تنہا شروع کی پھر اس کے لئے اقامت کہی گئی
ظہر کی ایک رکعت پڑھ لی تھی کہ جماعت کھڑی ہوگئی، اقامت کی مراد

باب ادراك الفريضة......الخ

باب فریضہ پانے کے بیان میں، کسی نے فرض پڑھنے کے قصد سے نماز شروع کی اتنے میں اقامت کہی گئی تو اسے ختم کردے، توڑدے، ت۔

ومن صلى ركعة من الظهر، ثم اقيمت يصلى اخرى صيانة للمؤدى عن البطلان......الخ

اور جس نے ظہر کی ایک رکعت پڑھ لی یعنی سجدہ کے ساتھ پھر جماعت شروع کی گئی تو دوسری رکعت بھی پڑھ لے ف۔ یہی قول امام شافعیؒ واحمدؒ کا ہے، ع، صیانۃ الخ تاکہ جو رکعت پڑھ لی ہے وہ باطل ہونے سے محفوظ رہے، ثم یدخل الخ پھر مقتدیوں کے ساتھ مل کر کھڑا ہو جائے۔ احراز الخ جماعت کی فضیلت پانے کے لئے۔

وان لم يقيد الاولى بالسجدة، يقطع ويشرع مع الامام، هو الصحيح......الخ

اور اگر اس نے ظہر کی پہلی رکعت کو سجدہ کے ساتھ نہ ملایا ہو تو فوراً نماز چھوڑدے اور امام کے ساتھ شروع کردے کہ یہی صحیح قول ہے، ف، اسی کو فخر الاسلامؒ نے اختیار کیا ہے، شیخ محمد ابراہیم میدانی کے نزدیک دو رکعت پڑھ کر توڑے اور اسی قول کو شمس الائمہ نے پسند کیا ہے، مع، اور مصنفؒ کے قول کے قریب ترین ہے۔

لانه بمحل الرفض والقطع للاكمال، بخلاف ما اذا كان فى النفل، لانه ليس لا كمال......الخ

کیونکہ بغیر سجدہ کے رکعت توڑے جانے کا محل ہے۔ والقطع الخ اور نماز کی نیت کو باطل کر دینا اس وقت ایک مصلحت دینی کی وجہ سے ہے یعنی نماز کو مکمل طور پر ادا کرنے کے لئے ہے۔ بخلاف الخ بخلاف اس کے جب کہ وہ نفل پڑھ رہا ہو کیونکہ اس کا توڑنا کامل کرنے کی غرض سے نہیں ہے۔

ولو كان فى السنة قبل الظهر والجمعة، فاقيم او خطب يقطع على راس الركعتين......الخ

اور اگر وہ شخص قبل ظہر یا جمعہ کی سنت ادا کر رہا ہو پھر اقامت ہوئی یا خطبہ شروع کیا گیا تو دو رکعت پوری کر کے توڑدے، ف بعد میں چار رکعت ادا کرلے، اسی قول کو ابن الہمامؒ نے ترجیح دی ہے، م، یہ قول امام ابو یوسفؒ سے بیان کیا جاتا ہے۔ وقد قیل الخ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس نماز کو مکمل کرلے، ف یہ ہی اصح قول ہے، محیط السرخسی، یہی صحیح ہے، السراج، واضح ہو کہ اقامت سے مراد امام کا نماز شروع کرنا ہے مؤذن کی اقامت مراد نہیں ہے، یہاں تک کہ اگر مؤذن نے اقامت کہی اور تنہا نماز پڑھنے والے نے اس وقت تک رکعت کا سجدہ نہیں کیا تھا تو بلا خلاف دو رکعت پوری کرلے۔ النہایہ۔ اور جگہ بھی ایک ہو، یہاں تک کہ اگر گھر میں نماز پڑھ رہا ہو اور مسجد میں اقامت ہوئی یا مسجد میں تھا اور دوسری مسجد میں اقامت ہوئی تو نماز کو بالکل نہ توڑے۔ التبیین۔

اور اگر نفل پڑھ رہا ہو تو بھی نہ توڑے، یہ سب باتیں اس بناء پر ہیں کہ نفل شروع کرنے سے واجب ہو جاتی ہے، اور نماز کو باطل کر دینا بھی حرام ہے، لیکن جب تک پہلی رکعت کا سجدہ ادا نہ کیا ہو تو وہ ابھی نماز نہیں ہوئی ہے اس لئے اسے توڑدینا جائز ہے۔ مصنفؒ کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے کہ قطع کرنا ہی اولی ہے جہاں تک ممکن ہو، یہاں تک کہ ظہر کی سنت میں دو رکعت پر قطع کرنا ممکن ہے، کیونکہ اس طرح عمل کو باطل کرنا جو کہ حرام ہے لازم نہیں آتا ہے، اور یہ شاید اس حدیث اذا اقیمت

الصلاۃ فلا صلاۃ الا المکتوبۃ کے پیش نظر ہے یعنی جب کہ نماز کی اقامت کہی جائے تو سوائے فرض کے دوسری کوئی نماز نہیں ہے، جیسا کہ بخاری میں ہے۔

یہ اعتراض نہیں کیا جائے کہ اقامت ہو جانے کے بعد دوسری نماز شروع نہیں کرینگے کیونکہ عبد اللہ بن بحینہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دو رکعت پڑھتے دیکھا حالانکہ اقامت کہہ دی گئی تھی تو فرمایا کہ الصبح اربعا الصبح اربعا کیا صبح کے وقت چار رکعتیں ارے کیا صبح کے وقت چار رکعتیں، اس کی روایت بخاری، مسلم اور نسائی نے کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اقامت سے امام کا شروع کرنا مراد نہیں ہے جیسا کہ نہایہ اور عینی میں کہا ہے بلکہ مؤذن کی اقامت مراد ہے اس سے زیادہ صریح روایت ابو سلمہؓ کی ہے کہ کچھ لوگوں نے اقامت سنی پھر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے، پس ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ کیا دو نمازیں ایک ساتھ ہی، کیا دو نمازیں ایک ساتھ ہی اور یہ صبح کی نماز کا واقعہ ہے ہے، مالکؒ نے اس کی روایت کی ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو ہر حال میں مانع ہے کہ سجدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو۔ تو میں کہتا ہوں کہ میں نے فتح القدیر اور عینیؒ میں اس مسئلہ میں کوئی کلام نہیں پایا ہے، جس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ اس فرمان باری تعالی ﴿لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ﴾ سے اس بات پر نص سے ثبوت ہوتا ہے کہ اعمال کو باطل کرنا منع ہے، لیکن حدیث میں قطع کا ثبوت مل جاتا ہے اس لئے منع کے حکم کو دو رکعتوں پر خاص کر دیا تا کہ عمل کو باطل کرنا لازم نہ آئے، تا کہ حتی الامکان حدیث پر بھی عمل ہو جائے اور قرآن کے بھی خلاف نہ ہو، واللہ تعالی اعلم۔

پھر اس بات میں توقف اور تامل ہے کہ آیت ﴿لَاتُبْطِلُوْا اَعْمَالَکُمْ﴾ سے عام حکم ہے، لیکن اس سے پہلے ابن الہمامؒ نے کئی احتمالات پیدا کئے کہ باطل ہونا ارتداد کی صورت میں یا اس جیسی دوسری کسی صورت میں ہو، اسے قطع کرنا جائز نہیں ہے، البتہ اس کو کامل کرنے کے لئے قطع کرنا جائز ہے، (ا) جب کہ سواری کا جانور بدک جائے، یا عورت کے کھانے یا سالن کی پکتی ہوئی ہانڈی ابل جائے، یا ایک درہم کا مال چوری ہوتا ہو، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، الحاصل فرائض کی تکبیر اولی میں بہت زیادہ فضیلت ہے، اور عینیؒ کے فرمانے کے متعلق کہ جب دنیاوی حقیر مال کے لئے قطع کرنا جائز ہے تو دینی فضیلت حاصل کرنے کے لئے تو بدرجہ اولی جائز ہوگا، یہاں تک کہ ائمہ کے مذہب تو معلوم ہو چکے، لیکن بندہ مترجم کے نزدیک ایسی حالت میں لوگوں کو چاہئے کہ احتیاط سے کام لیں تا کہ آیت واحادیث کی مخالفت سے کوئی گناہ وغیرہ لازم نہ آئے، اور عنقریب فجر کی سنت کے متعلق بحث آئیگی، انشاء اللہ تعالی۔ م۔

وان کان قد صلی ثلاثا من الظھر یتمھا، لان للاکثر حکم الکل، فلا یحتمل النقض، بخلاف ما اذا کان فی الثالثۃ بعد ولم یقیدھا بالسجدۃ حیث یقطعھا، لانہ بمحل الرفض، ویتخیر ان شاء عاد فقعد وسلم، وان شاء کبر قائما ینوی الدخول فی صلاۃ الامام، واذا اتمھا یدخل مع القوم والذی یصلی معھم نافلۃ، لان الفرض لا یتکرر فی وقت واحد، فان صلی من الفجر رکعۃ ثم اقیمت یقطع ویدخل معھم، لانہ لو اضاف الیھا اخری تفوتہ الجماعۃ، وکذا اذا اقام الی الثانیۃ قبل ان یقیدھا بالسجدۃ، وبعد الاتمام لا یشرع فی صلوۃ الامام لکراھیۃ النفل بعدہ، وکذا بعد المغرب في ظاھر الروایۃ، لان التنفل بالثلاث مکروہ، وفي جعلھا اربعا مخالفۃ لإمامہ.

ترجمہ:- اور اگر ظہر کی تین رکعتیں پڑھ چکا ہو تو اسے پورا کر لے کیونکہ اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے لہٰذا اب اس نماز کے توڑنے کو برداشت بھی نہیں کر سکتا ہے، بخلاف اس صورت کے جب کہ وہ اس وقت تک تیسری رکعت میں ہو، اور اس کو سجدہ سے مقید نہیں کیا ہو، کہ اسے توڑ دے گا، کیونکہ یہ توڑنے کا موقع اور محل ہے، اور اسے اس بات کا اختیار دیا جائیگا کہ اگر وہ چاہئے تو لوٹ آئے اور بیٹھ جائے اور سلام پھیر دے، اور اگر چاہئے تو کھڑے کھڑے اس نیت سے تکبیر کہہ دے کہ امام کے ساتھ جماعت

میں شریک ہونا ہے، اور جب اپنی نماز ظہر پوری کر چکا تو دوسرے لوگوں کے ساتھ نماز میں داخل ہو جائے، اور اب جو کچھ بھی نماز ان کے ساتھ پڑھیگا وہ نفل ہو جائیگی، کیونکہ ایک وقت میں فرض بار بار ادا نہیں کی جاتی ہے، اور اگر فجر کی ایک رکعت نماز پڑھ چکا ہو پھر اقامت کہی گئی ہو تو اسے توڑ کر لوگوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جائے کیونکہ اگر اس میں دوسری رکعت اور بھی ملائیگا تو اس کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا موقع ختم ہو جائے، اسی طرح اس وقت بھی (توڑ دے گا) جب کہ دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو چکا ہو، اس رکعت کو سجدہ کے ساتھ ملانے سے پہلے تک۔ لیکن دونوں رکعتوں کو پوری کر لینے کے بعد امام کے ساتھ جماعت میں اب شریک نہیں ہوگا، کیونکہ فجر نماز کے بعد نفل نماز مکروہ ہے، یہی حکم مغرب کے بعد بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق، کیونکہ تین رکعت نفل نماز بھی مکروہ ہوتی ہے، اور اسے چار پوری کر لینے کی صورت میں امام کی مخالفت لازم آتی ہے۔

توضیح:۔ کوئی شخص ظہر کی تین رکعتیں پڑھ چکا ہو تو جماعت میں شریک ہونے کی صورت تنہا نماز پڑھ کر جماعت میں شریک ہونا، فجر کی ایک رکعت کے بعد جماعت کھڑی ہوئی

وان کان قد صلی ثلاثا من الظهر يتمها، لان للاكثر حكم الكل، فلا يحتمل النقض......الخ

اور اگر فرض ظہر کی تین رکعتیں پڑھ چکا ہو تو اس نماز کو مکمل کر لے، ف اور فرض پورا ہو گیا۔ لان للا کثر الخ کیونکہ اکثر کو کل کا حکم دیا جاتا ہے، لہذا اسے قطع نہیں کیا جا سکتا ہے، ف یعنی تین رکعتیں پڑھ لینے سے گویا اس نے نماز مکمل کر لی ہے اب وہ نہیں ٹوٹ سکتی ہے، اس کے بعد جماعت کا ثواب اور اس کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے اس میں نفل کی نیت سے شریک ہو جائے۔ م۔

بخلاف ما اذا كان فى الثالثة بعد ولم يقيدها بالسجدة حيث يقطعها، لانه بمحل الرفض......الخ

بخلاف اس صورت کے جب کہ وہ ابھی تک تیسری رکعت ہی میں ہو، اور اس تیسری کو سجدہ سے مقید نہ کیا ہو، کہ اسے اس صورت میں توڑ دے، کیونکہ توڑنے کا محل ہے، ف اب اسی طریقہ سے اختلاف ہے کہ کس طرح نیت توڑی جائے، اس لئے مصنفؒ نے فرمایا کہ ویخیر الخ اسے ان دو باتوں میں سے ایک کا اختیار ہوگا۔ (۱) اگر چاہئے تو بیٹھ جائے اور سلام پھیر دے۔ (۲) اور اگر چاہئے تو کھڑے کھڑے ہی اس نیت سے کہ اب میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھوں گا تکبیر کہہ دے، ف یہ دوسری صورت ہی مختار ہونا اصح ہے، المعراج، اور محیط میں کہا ہے کہ اصح قول یہ ہے کہ کھڑے کھڑے ایک سلام پھیر دے، کیونکہ یہ صورت نماز توڑنے کی ہے، نماز سے تحلیل اور فارغ ہونے کی نہیں ہے کہ بیٹھ کر سلام پھیرا جائے، ہ، ع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ نماز کے تحریمہ سے فارغ ہونے کے لئے حدیث میں بتایا گیا ہے کہ سلام پھیر دے، اس لئے صحیح قول وہی معلوم ہوتا ہے جو مصنفؒ نے کہا ہے واللہ اعلم، بلکہ امام سرخسیؒ نے تو بیٹھنے کو لازم کر دیا ہے، مسئلہ کو اچھی طرح یاد رکھو۔ م۔

واذا اتمها يدخل مع القوم والذى يصلى معهم نافلة، لان الفرض لا يتكرر فى وقت واحد......الخ

اور جب ظہر کی نماز پوری کر چکے تو مقتدیوں کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جائے، اور ان کے ساتھ جو کچھ بھی پڑھے گا وہ نفل نماز ہو گی۔ ف۔ لہذا نفل کی نیت کے ساتھ ان میں شامل ہو جائے۔ لان الفرض الخ کیونکہ ایک وقت میں دوبار فرض نماز نہیں پڑھی جا سکتی ہے، ف۔ لیکن ظہر کے بعد نفل نماز پڑھنی جائز ہے، اس لئے جماعت کا ثواب اور نفل کا ثواب پانے کے لئے جماعت میں شریک ہو جائے کیونکہ حضرت زید بن الاسودؓ کی حدیث میں ان دو اشخاص کو جو جماعت میں شریک نہیں ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اب ایسا نہ کرنا، جب تم نے اپنے گھر میں نماز پڑھ لی پھر مسجد میں آئے جماعت ہو رہی ہو تم دوبارہ جماعت کے ساتھ پڑھ لو کہ یہ تمہارے واسطے نفل ہو جائیگی، اس کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا

ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، اور حضرت ابوذرؓ کی حدیث میں ہے ایسے امراء اسلام کے بارے میں جو نماز کو اپنے وقت سے بہت بعد پڑھیں گے فرمایا کہ تم نماز کو اپنے وقت پر پڑھ لو پھر ایسے امراء کے پیچھے تم جو نماز پڑھو گے اس کو نفل کر لو، اس کی روایت مسلم نے کی ہے، یہ حکم عصر اور فجر یعنی ایسی نمازوں کے علاوہ ہے جن کے بعد نفل نہیں ہوتی ہے۔ اور ابن عمرؓ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ فجر اور عصر کا ان سے استثناء ہے اس کی روایت دار قطنی نے کی ہے جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔

فان صلی من الفجر رکعة ثم اقیمت یقطع ویدخل معهم، لانه لو اضاف الیها اخری......الخ

پھر اگر فجر کی نماز کی ایک رکعت بھی پڑھ لی تو وہ جماعت کی فضیلت پانے سے محروم ہو جائیگا، ف، فجر کے فرض تو وہ پورا پڑھ چکا ہے۔ وکذا اذا الخ اسی طرح اس وقت بھی نماز کو توڑ دے گا جب کہ وہ دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا ہو، لیکن اس رکعت کے سجدہ میں جانے سے پہلے تک۔ ف۔ کیونکہ سجدہ میں چلے جانے کے بعد دونوں رکعتیں پوری ہو کر نماز بھی پوری ہو جائیگی۔ وبعد الاتمام الخ اور اس نماز فجر کو ادا کر لینے کے بعد وہ امام کی نماز یعنی جماعت میں شریک نہ ہو نماز فجر کے بعد نفل نماز مکروہ ہونے کی وجہ سے۔

وکذا بعد المغرب فی ظاهر الروایة، لان التنفل بالثلاث مکروه، وفی جعلها اربعا......الخ

اسی طرح مغرب کے بعد بھی ظاہر الروایۃ کے مطابق، ف جیسا کہ ابن عمرؓ کی حدیث دار قطنی میں گذر گئی ہے، امام مالکؒ کا یہی قول ہے۔ لان التنفل الخ کیونکہ تین رکعت نفل نماز مکروہ ہے، اور اسے چار کر لینے سے امام کی مخالفت لازم آتی ہے، ف لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ نے فرمایا ہے کہ چار رکعتیں پوری کر لے، اور امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ تین ہی رکعت پر سلام پھیر دے، اسی قول کو شمس الائمہ سرخسیؒ نے بھی پسند کیا ہے، ع، کیونکہ صاحبینؒ کے نزدیک وتر نفل ہے اور تین ہی رکعتیں ہیں، اور مغرب کی بارہ میں دار قطنی کی حدیث جو اوپر ذکر کی گئی ہے شاید کہ وہ معلول ہے، واللہ اعلم، قاضی خان نے نفل میں تین رکعتوں کے پڑھنے کو حرام کہا ہے، لیکن یہ قول نامقبول، مردود ہے، عینیؒ، اور وتر کے واجب ہونے کا قول اگر ضعیف ہو تو تین رکعت کی نفل حرام نہیں بلکہ مکروہ تحریمی ہے بلکہ قہستانیؒ نے تو اسے صراحۃً مکروہ تنزیہی کہا ہے، پھر امام کی اقتداء اور فضیلت جماعت اور عام حکم حدیث کے معارضہ سے وہ بھی بے اثر ہو گئی ہے، فافہم۔ م۔ فخر الاسلامؒ نے کہا ہے کہ اگر نماز شروع کر دے تو احتیاطاً بجائے تین کے چار رکعت ہی پڑھ لینی چاہئے۔ مع۔

ومن دخل مسجدا قد اذن فیه، یکره له ان یخرج حتی یصلی، لقوله علیه السلام: "لا یخرج من المسجد بعد النداء الا منافق". او رجل یخرج لحاجة یرید الرجوع، قال: الا اذا کان ینتظم به امر جماعة، لانه ترک صورة تکمیل معنی، وان کان قد صلی وکانت الظهر والعشاء، فلاباس بان یخرج، لانه اجاب داعی الله مرة الا اذا اخذ الموذن فی الا قامة، لانه یتهم لمخالفة الجماعة عیانا، وان کانت العصر او المغرب او الفجر، خرج وان اخذ المؤذن فیها، لکراهیة النفل بعدها.

ترجمہ:- اور جو شخص کسی ایسی مسجد میں داخل ہوا جس میں اذان دی جا چکی ہو تو اس کے لئے اس مسجد سے نماز پڑھے بغیر نکلنا مکروہ ہوگا رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ مسجد میں اذان دی جانے کے بعد منافق یا ایسے شخص کے سوا جو کسی ضروری کام سے جا کر پھر واپس آنے کا ارادہ رکھتا ہو منافق ہی نکلتا ہے، مگر وہ شخص جو کسی مسجد کی جماعت کا ذمہ دار ہو، کیونکہ بظاہر اس کا نکلنا ترک ہے مگر یعنی اس کی تکمیل ہے، اور اگر اس نے نماز پڑھ لی ہو اور وہ نماز ظہر اور عشاء کی ہو تو اس کے نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ اس نے ایک مرتبہ اذان دینے والے کی دعوت قبول کر لی ہے، (نماز پڑھ لی ہے) مگر جب کہ مؤذن نے اقامت بھی شروع کر دی ہو، کیونکہ اس وقت کھل کر اس پر جماعت کے چھوڑنے کی تہمت لگ جائیں گی، اور اگر وہ وقت عصر، مغرب یا فجر کا ہو تو نکل جائے اگرچہ موذن نے اقامت شروع کر دی ہو، کیونکہ ان نمازوں کے بعد نفل مکروہ ہے۔

توضیح :-اذان کے بعد مسجد سے نکلنا، حدیث سے دلیل

ومن دخل مسجدا قد اذن فیه، یکره له ان یخرج حتی یصلی......الخ

ف۔ یہ حکم اس صورت میں ہے کہ اس نے پہلے سے نماز نہیں پڑھ لی ہو، کیونکہ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم مسجد میں ہو اور اذان دی جائے تو تم میں سے کوئی بھی وہاں سے نہ نکلے یہاں تک کہ نماز پڑھ لے، اس کی روایت احمدؒ نے کی ہے، اور ابوہریرہؓ کے سامنے اذان کے بعد ایک شخص مسجد سے نکل گیا تو ابوہریرہؓ نے کہا کہ اس نے ابوالقاسم ﷺ کی نافرمانی کی، مسلم اور سنن اربعہ نے اس کی روایت کی ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ جب موذن اذان دے تو مسجد سے تم نہ نکلو یہاں تک کہ نماز پڑھ لو، اسحٰق بن راہویہ نے اپنی مسند میں اتنے اچھے جملے کی زیادتی کی ہے، ابن عبدالبرؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول مرفوع کے درجہ میں ہے، اور کہا ہے کہ علماء ایسی موقوف روایتوں کے بارے میں اختلاف نہیں کرتے تھے، مع۔

لقوله علیه السلام: "لا یخرج من المسجد بعد النداء الا منافق". او رجل یخرج لحاجة......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمانے کی وجہ سے کہ مسجد سے اذان کے بعد منافق نکلتا ہے یا وہ شخص جو واپس آنے کی نیت سے اپنی خاص ضرورت سے نکلتا ہے، ف۔ یہ حدیث سعد بن المسیبؒ سے ابوداؤد اور عبدالرزاقؒ نے مرسلاً روایت کی ہے، اور اسی قسم کی حضرت عثمانؓ سے ابن ماجہ نے مرفوعاً روایت کی ہے، مع، ان روایتوں سے یہ ثابت ہو گیا کہ اذان کے بعد مسجد سے کوئی نہ نکلے، الا اذا الخ سوائے چند صورتوں کے جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کے ہاتھ میں کسی جگہ نماز کی جماعت کا انتظام کرنا ہو، ف اس طرح سے کہ اس کے نہ جانے سے دوسری جماعت میں خلل پڑنے کا احتمال ہو۔

لانه ترك صورة تکمیل معنی، وان کان قد صلی و کانت الظهر و العشاء......الخ

کیونکہ یہ نکلنا بظاہر نماز کو چھوڑنا ہے مگر حقیقت میں نماز باجماعت کو مکمل کرنا ہے، ف اسی طرح اپنے محلہ کی مسجد کے لئے جب کہ اس میں نماز نہ ہوئی ہو، لیکن افضل یہی ہے کہ نہ نکلے، ع، ھ، ف، اسی طرح اپنی حدیث وفقہ کے استاد کی جماعت یا وعظ کے لئے نکلنا بالاتفاق جائز ہے، مع، یا کسی ضرورت سے مگر واپسی کی نیت سے، جیسا کہ حدیث میں ہے، اور ان مسائل میں سے یہ بھی ہے کہ وان کانت قد صلی الخ اور اگر وہ اس وقت کی وہ نماز پڑھ چکا ہو اور وہ نماز ظہر یا عشاء کی ہو، تو نکلنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لانه اجاب الخ کیونکہ اس نے ایک مرتبہ دعوت نماز دینے والے کی دعوت قبول کر لی ہے، الا اذا الخ مگر جب کہ اقامت بھی کہنا شروع کر دے، ف تو اب وہاں سے نکلنا مکروہ ہے۔

لانه یتهم لمخالفة الجماعة عیانا، وان کانت العصر والمغرب او الفجر......الخ

کیونکہ بظاہر دیکھنے والوں کی نظر میں اسے جماعت کی مخالفت کرنے کی تہمت لگائی جائیگی، ف اور اس جگہ نفل پڑھنے کی ممانعت بھی نہیں ہے بلکہ اس کا حکم ہے۔ وان کانت الخ اور اگر یہ نماز عصر یا مغرب یا فجر ہو تو نکل جائے اس صورت میں پہلے ایک بار پڑھ چکا ہو، اگرچہ مؤذن نے اقامت بھی شروع کر دی ہو۔ لکراهة الخ کیونکہ ان نمازوں کے بعد نفل پڑھنی مکروہ ہے، ف اور وہاں بیکار بیٹھے رہنے سے نکل جانا ہی بہتر ہے، اسی بات کی طرف کتاب میں اشارہ ہے۔ م۔

ومن انتهی الی الامام فی صلوة الفجر وهو لم یصل رکعتی الفجر، ان خش ان تفوته رکعة ویدرك الاخری، یصلی رکعتی الفجر عند باب المسجد، ثم یدخل، لانه امکنه الجمع بین الفضیلتین، وان خشی فوتها دخل مع الامام، لان ثواب الجماعة اعظم، والوعید بالترك الزم، بخلاف سنة الظهر حیث یترکها فی الحالین، لانه یمکنه اداؤها فی الوقت بعد الفرض، هو الصحیح، وانما الاختلاف بین ابی یوسفؒ ومحمدؒ فی تقدیمها

علی الرکعتین وتاخیرھا عنھما، ولا کذلک سنۃ الفجر علی ما نبین ان شاء اللہ تعالیٰ.

ترجمہ:- اگر کوئی شخص صبح کی سنت پڑھے، بغیر مسجد میں امام تک پہونچ گیا (جماعت میں پالیا) اور اسے یہ اندازا ہوا کہ سنت پڑھ لینے سے جماعت کی ایک رکعت چھوٹ جائیگی مگر دوسری مل جائیگی تو وہ مسجد کے کنارے دروازہ کے پاس دو رکعتیں سنت کی پڑھ لے اس کے بعد اندر چلا جائے اور شریک جماعت ہو جائے کیونکہ اس کے لئے دونوں فضیلتوں کو جمع کرنا ممکن ہو گیا ہے اور اگر اسے دوسری رکعت کے بھی فوت ہو جانے کا خطرہ ہو تو (فوراً) امام کے ساتھ ہو جائے، کیونکہ جماعت کی فضیلت بہت بڑی ہے، اور جماعت چھوڑنے کی وعید الزم ہے، بخلاف ظہر کی سنت کے کیونکہ اس کی سنت کو دونوں حالتوں میں چھوڑ دے گا، کیونکہ اسے فرض کے بعد مگر وقت کے اندر ہی ادا کر سکتا ہے، یہی قول صحیح ہے، اب امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے درمیان آپس میں یہ اختلاف ہے کہ بعد فرض پہلے کس سنت کو ادا کرے گا یعنی بعد کی دو رکعتوں کو پہلے پڑھے گا اور پہلی چار کو بعد میں یا اس کے برعکس، مگر فجر کی سنت میں یہ بات نہیں ہے جیسا کہ ہم اسے انشاء اللہ عنقریب ہی بیان کر دینگے۔

توضیح:- فجر کی سنت مسجد میں فجر کی جماعت کے وقت ظہر سے پہلے کی سنت اور ظہر کی جماعت

ومن انتھی الی الامام فی صلوۃ الفجر وھو لم یصل رکعتی الفجر......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، فجر کی سنت ہنوز نہیں پڑھی ہے، ف اس وقت دو صورتیں ممکن ہیں۔ نمبر ا یہ ہے کہ ان خشی الخ اور اسے اس بات کا خوف ہوا کہ ایک رکعت چھوٹ جائیگی مگر دوسری مل جائیگی۔ یصلی الخ تو وہ شخص مسجد کے دروازہ کے پاس ہی سنت پڑھ کر جماعت میں شریک ہو جائے۔

لانہ امکنہ الجمع بین الفضیلتین......الخ

کیونکہ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ دونوں فضیلتوں (سنت کی ادائیگی اور جماعت پانے کی فضیلت) کو جمع کرلے، ف کیونکہ فجر کی سنت کے فضائل اوپر گذر چکے ہیں، م، اور حدیث میں ہے کہ جس نے فجر کی ایک رکعت پائی اس نے فجر پائی، النہایہ۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ عصر و فجر میں ایک رکعت کے پانے پر نماز پانا جو حدیث میں آیا ہے اسی سے شوافع اور کچھ دوسرے فقہا فرماتے ہیں کہ اگر ایک رکعت فرض پڑھ لینے کے بعد آفتاب نکل آئے یا ڈوب جائے تو بقیہ نماز بھی پوری پڑھ لے، لیکن بندہ مترجم کے نزدیک اس حدیث کی صحیح تاویل یہ ہے کہ اگر حائضہ عورت بالکل آخر وقت میں پاک ہوئی یا کوئی کافر اسلام لایا یا کوئی پاگل اور دیوانہ ہوش میں آگیا اور اس نے نماز کا وقت پایا تو ان پر اس نماز کی قضاء واجب ہو گی، پس حدیث مذکور سے اس بات کا بیان ہو رہا ہے کہ نماز لازم ہونے کے لئے پوری دو یا چار کا وقت موجود ہونا ضروری نہیں ہے، کیونکہ اگر آخری جزو بھی کوئی پالے گا تو اس پر اس نماز کی ادائیگی لازم ہو جائیگی، جیسا کہ حنفیہ کا اصول ہے، اور یہ ایسی لطیف تاویل ہے جو میں نے کسی دوسری جگہ نہیں پائی ہے (گویا منجانب اللہ مجھ پر الہام ہوئی ہے) فالحمد للہ رب العلمین، مگر بعد میں میں نے دیکھ لیا کہ امام طحاویؒ نے یہی تاویل کی ہے، م۔

وان خشی فوتھا دخل مع الامام، لان ثواب الجماعۃ اعظم، والوعید بالترک الزم......الخ

دوسری صورت یہ ہے وان خشی الخ کہ اگر اسے دوسری رکعت کے بھی چھوٹ جانے کا خدشہ ہو، ف اگرچہ آخری بیٹھک (قعدہ) پالینے کی امید ہو جب بھی دخل مع الامام تو امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جائے، لان ثواب الخ کیونکہ اول تو جماعت سے پڑھنے کا ثواب بہت زیادہ ہے، ف یہاں تک کہ تنہا پڑھنے والے کے مقابلہ میں ۲۷ درجہ ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ والوعید الخ دوم جماعت چھوٹ جانے کی وعید کا مستحق ہو جاتا ہے، ف کیونکہ وعید سے بچنا سب سے بڑھ کر ضروری ہے، خاص کر سنت کے ادا کرنے مقابلہ میں۔ د۔ یہ وعید وہی ہے جو جماعت کے باب میں گذری ہے، کہ جماعت سے منافق ہی

بچھڑتا ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے گھروں کو آگ سے جلا کر خاک کر ڈالنے کا ارادہ فرمایا تھا، وغیر ذلک، مفع، اور اگر آنے والے کو اس بات کا اندازہ نہ ہو سکے کہ فی الحال کون سی رکعت پڑھی جا رہی ہے تو سنت کو چھوڑ کر وہ جماعت میں شریک ہو جائے، الخلاصہ، اگر اس بات کا اندازہ ہو جائے کہ ابھی پہلی رکعت ہے مگر مسجد کے دروازہ پر سنت پڑھنے کی جگہ نہ ہو تو اندر ہی پڑھ لے ورنہ کسی ستون کے پیچھے پڑھ لے، اور فخر الاسلامؒ نے کہا ہے کہ سب سے زیادہ مکروہ یہ ہے کہ صف کے برابر پڑھے، محیط میں ہے کہ کہا گیا ہے کہ یہ سب مکروہ ہیں، کیونکہ یہ سب جگہیں ایک مسجد کے حکم میں ہیں، مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ فجر کی سنت کے متعلق واجب ہونے کا بھی گمان ہے، جیسا کہ حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے، ویسے کے قریب اور اس کی قوت میں ہونے کے تو سبھی قائل ہیں، اور دین کے معاملہ میں لوگوں کی سستی ظاہر ہے جس کی طرف اس جگہ کتاب میں اس طرح اشارہ کیا ہے کہ سنت تو گھر پر ہی پڑھنی چاہئے تھی، مگر بغیر پڑھے امام تک یعنی جماعت کے قریب جا پہونچا جہاں فرض نماز پڑھی جا رہی ہے، اب اگر لوگ ایسی صورت میں سنت کو چھوڑ دیا کریں تو گویا وہ اس کے عادی ہو جائینگے، اور سنت کو چھوڑ دینا ان کا معمول ہو جائیگا، حالانکہ عبداللہ بن سرجسؓ کی حدیث میں یہ تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز میں مشغول تھے کہ ایک شخص نے آکر مسجد کے ایک کونہ میں فجر کی سنت پڑھ لی پھر جماعت میں شریک ہو گیا تو آپ نے سلام کے بعد فرمایا کہ تم نے اپنی کس نماز کو فرض مانا ہے، اپنی تنہا نماز کو یا اسے جو ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے، اس کی روایت مسلم، ابوداؤد اور نسائی نے کی ہے، اس حدیث سے اس بات کی تاکید ہوتی ہے کہ اقامت کے بعد فرض نماز کے سوا دوسری کوئی نماز نہیں ہے جیسا کہ بخاری نے روایت کی ہے، لیکن میں نے جو بات پہلے بیان کر دی ہے اس کی بناء پر ائمہ کرام نے فجر کی سنت کے بارے میں اس کے وجوب کے خوف کی وجہ سے اسی بات کو برداشت کیا ہے کہ اس سنت کو حتی الامکان نہیں چھوڑنا چاہئے۔ م۔

بخلاف سنة الظهر حيث يتركها في الحالين، لانه يمكنه اداؤها في الوقت بعد الفرض......الخ .

بخلاف سنت ظہر کے چاروں رکعتوں کو دونوں حالتوں میں چھوڑ دے گا، ف جماعت کی رکعتیں پانے کی امید ہو یا نہ ہو بہر صورت جماعت میں شریک ہو جانا چاہئے، لیکن ترمذی کی وہ حدیث جو حضرت عائشہؓ سے ظہر کی چار رکعت کی قضاء کے بارے میں اوپر لکھ دی ہے، اس کی وجہ سے اس سنت کو ترک کرنے کی گنجائش نکلتی ہے۔ **لانه يمكنه الخ** کیونکہ ان چاروں رکعتوں کو فرض کے بعد بھی وقت کے اندر ادا کرنا ممکن ہے، یہی صحیح ہے، ف اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ **وانما الاختلاف الخ** اختلاف تو امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے درمیان اس جگہ صرف اتنا ہے کہ پہلے چاروں رکعتوں کو آخری دو دو رکعتوں سے پہلے پڑھے گا یا بعد میں۔ **ولا كذالك الخ** لیکن یہ بات فجر کی سنت میں نہیں ہے، جیسا کہ انشاء اللہ ہم عنقریب بیان کرینگے، ف بلکہ ان میں اختلاف موجود ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ظہر کی پہلی چار رکعت سنت کو دو رکعت پر مقدم کرنا چاہئے، ع، یہی قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے، المحیط، یہی قول مختار ہے، العتابیہ، یہی اصح ہے، مبسوط شیخ الاسلام، مع، اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ گذر گیا۔ م۔

والتقيد بالاداء عند باب المسجد يدل على الكراهة في المسجد اذا كان الامام في الصلاة، والافضل في عامة السنن والنوافل المنزل، هو المروى عن النبي ﷺ، واذا فاتته ركعتا الفجر لا يقضيهما قبل طلوع الشمس، لانه يبقى نفلا مطلقاً، وهومكروه بعد الصبح، ولا بعد ارتفاعها عند ابي حنيفةؒ وابي يوسفؒ، وقال محمدؒ: احب الي ان يقضيهما الى وقت الزوال، لانه عليه السلام قضاء هما بعد ارتفاع الشمس غداة ليلة التعريس.

ترجمہ:- اور فجر کی سنت کو مسجد کے دروازہ پر اداء کرنے کی قید کے ساتھ مقید کرنے سے اس بات پر دلالت ہوتی ہے کہ جب امام نماز پڑھا رہا ہو اس وقت مسجد میں سنت پڑھنی مکروہ ہے، اور دوسری تمام سنتوں اور نفلوں کو اپنے گھروں میں پڑھنا، افضل ہے۔ اور رسول اللہ ﷺ سے یہی مروی ہے، اور جب کسی کی فجر کی دو رکعت سنت چھوٹ جائیں تو انہیں آفتاب نکلنے سے پہلے نہ

پڑھے، کیونکہ اس وقت اس کی حیثیت مطلق نفل کی رہ جاتی ہے اور ایسی نفل صبح کے بعد مکروہ ہوتی ہے، اسی طرح امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک آفتاب کے نکل جانے سے بعد بھی نہ پڑھے، لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ میرے نزدیک یہ بات بہت محبوب ہے کہ ان دونوں رکعتوں کو زوال کے وقت تک ادا کر لینی چاہئے، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں رکعتوں کو آفتاب بلند ہو جانے کے بعد لیلۃ التعریس کی صبح کو ادا کیا ہے۔

توضیح:- سنتوں اور نفلوں کے پڑھنے کی بہترین جگہ، فجر کی سنت کا چھوٹ جانا حدیث سے دلیل، فجر کی سنت کے قضاء کا وقت

والتقید بالاداء عند باب المسجد یدل علی الکراھۃ فی المسجد اذا کان الامام......الخ

فجر کی سنت کو مسجد کے دروازہ پر ادا کرنے کی قید سے مقید کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سنت فجر کو مسجد کے اندر ادا کرنا مکروہ ہے، جب کہ امام نماز میں مشغول ہو، ف اور اگر امام نماز میں نہ ہو تو تراویح کو مسجد میں پڑھنے کی تصریح ہے، ف بلکہ حضرت انسؓ کی حدیث میں مغرب سے پہلے کی دو رکعتوں کو بھی مسجد میں پڑھنا ثابت ہے، شاید کہ یہ حکم پہلے ہو، بعد میں باقی نہ رہا ہو۔م۔

والافضل فی عامۃ السنن والنوافل المنزل، ھو المروی عن النبی ﷺ......الخ

اور تقریباً تمام سنتوں اور نفلوں کو گھر ہی میں ادا کرنا افضل ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے یہی مروی ہے، ف، جیسا کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی حدیث میں تصریح ہے، اس کی روایت بخاری اور مسلم دونوں نے کی ہے، بلکہ اپنی مسجد نبوی سے بھی اسے افضل ہی فرمایا ہے، اس کی روایت ابوداؤد وغیرہ نے کی ہے، حالانکہ آپ کی مسجد نبوی میں پڑھنے کا ثواب دوسری عام مسجدوں کے مقابلہ میں پچاس ہزار گونہ ثواب زیادہ ہوتا ہے، جیسا کہ صحیح میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ وہ ثواب فرض نمازوں کا ہے، اس مسئلہ میں مصنفؒ ھدایہ کا قول ہی اصح ہے، واللہ اعلم۔

واذا فاتتہ رکعتا الفجر لا یقضیھما قبل طلوع الشمس، لانہ یبقی نفلا مطلقا......الخ

اور امام محمدؒ نے جامع صغیر میں فرمایا ہے کہ جب نمازی کی صبح کی سنت چھوٹ جائے تو وہ اسے آفتاب نکلنے سے پہلے قضاء نہ کرے۔ لانہ یبقی الخ کیونکہ دو رکعتیں محض نفل ہو کر رہے گی، جب کہ فجر کے بعد محض نفل مکروہ ہوتی ہے، ف اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر یہ سنت رہتی تو مکروہ نہ ہوتی ہے، م، اور شمس الائمہ نے فقیہ اسمٰعیل سے یہ نقل کیا ہے کہ فرض سے پہلے دو رکعت سنت کی نیت سے نماز شروع کرنے کے بعد پھر فرض کی نیت کر کے امام کے ساتھ جماعت میں شریک ہو جانے سے وہ واجب ہو جاتی ہے، لیکن عینیؒ نے اس کا انکار کیا ہے کہ زیادات میں اس بات کی تصریح ہے کہ فرض کے بعد نذر واجب بھی مکروہ ہے۔

ولا بعد ارتفاعھا عند ابی حنیفۃؒ وابی یوسفؒ، وقال محمدؒ: احب الی ان یقضیھما......الخ

اور امام ابو حنیفہ وامام ابو یوسفؒ کے نزدیک آفتاب نکل جانے کے بعد بھی قضاء نہ کرے، ف الحاصل فجر کی سنت جب بغیر فرض کے چھوٹ جائے تو شیخینؒ کے نزدیک آفتاب نکلنے سے پہلے بھی اور نکل جانے کے بعد بھی اس کی قضاء نہیں ہے۔ وقال محمد الخ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ میں تو اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ زوال کے وقت تک سنت کی قضاء کر لی جائے، ف اور اگر نہ پڑھے تو کوئی گناہ نہیں ہے، حلوائی اور فضلیؒ نے کہا ہے کہ شیخین کے نزدیک پڑھ لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، الحاصل ائمہ کے درمیان کوئی اختلاف باقی نہ رہا، المحیط، ع، مزنیؒ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور احمدؒ کی یہ بھی یہی ایک روایت ہے، اور آفتاب نکلنے سے پہلے پڑھنے میں کوئی حرج ہے یا نہیں، تو اس کتاب کے ظاہر سے اسی بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

اور حضرت قیسؓ کی حدیث بھی اسی قول کے موافق ہے، کہ رسول اللہ ﷺ اپنے کمرہ سے نکل کر برآمدے میں تشریف لائے تو اسی وقت اقامت کہی گئی تو میں نے آپ کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ لی، جب آپ واپس جانے لگے اور مجھے پڑھتے ہوئے پایا تو فرمایا مھلاً یا قیس اصلا تان معاً یعنی اے قیس رک جاؤ کیا ایک ساتھ تم دو نمازیں پڑھو گے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میں نے صبح کی سنت نہیں پڑھی ہے، تو فرمایا فلا اذاً تو کچھ حرج نہیں ہے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، ابن الہمامؒ نے اس پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ممانعت کی حدیث میں تو فجر کی نماز کے بعد سے آفتاب کے نکلنے تک کی ہے، جیسا کہ صحاح میں ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ ممانعت کی حدیث ہی اصح ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اب بھی اس وقت فرض نمازوں کی قضاء جائز ہے، اس بناء پر یہ حدیث مخصوص ہوگئی، کیونکہ فجر کے بعد ہر قسم کی نماز سے ممانعت ثابت نہیں ہوئی بلکہ فرائض کے علاوہ دوسری نمازوں کی، اور جب وہ حدیث مخصوص ہوگئی تو قیسؓ کی حدیث سے فجر کی سنت بھی مخصوص ہو سکتی ہے، جیسا کہ اصول کی کتابوں میں یہ بات طے شدہ ہے، ابن الہمامؒ نے اوقات نماز کی بحث میں یہ فرمایا ہے کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ فقہاء نے کس دلیل سے فرض نمازوں کو مخصوص کیا ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ میرے نزدیک تحقیقی بات یہ ہے کہ صبح کی نماز کے بعد ہر ایسی نماز سے ممانعت ہے جو شارع اور شریعت کی طرف سے نہ ہو بلکہ اختیاری جواز میں ہو، لہٰذا فرض اور فجر کی سنت میں کوئی حرج باقی نہ رہا اور صرف نوافل منع کر دی گئیں، اگر یہ سوال کیا جائے کہ اگر کسی نے فجر کے فرض کے بعد دو رکعت نماز پڑھنے کی نذر مانی ہو تو بظاہر نذر ماننے سے نماز کو واجب مان کر ادا ہو جانا چاہئے حالانکہ زادۃ الزیادات میں صراحۃً ناجائز لکھا ہے ایسا کیوں ہے، جواب یہ ہے کہ نذر ماننے کو پہلے سے اس وقت میں پڑھنے کی ممانعت کا حکم معلوم ہے اس کے باوجود اس نے جان بوجھ کر قصداً نذر مانی تو ایسا ہوا گویا اس فرض کے بعد اس نے اسی وقت نماز پڑھنے کی نذر مانی ہو تو جب یہ دوسری صورت جائز نہیں تو پہلی صورت بھی جائز نہ ہوگی، کیونکہ دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں ہے، بخلاف فرائض کے اسی سے قضاء فرض نماز کا حکم ہو گیا، واللہ تعالیٰ اعلم، اس بناء پر اگرچہ فجر کی سنت کا وہ حکم اپنی جگہ پر یعنی باقی نہیں رہا پھر بھی اس پر مطلق نفل کا حکم جاری نہ ہو سکا، اسی لئے شیخ فضلیؒ اور حلوائیؒ کے کہنے کے مطابق امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس کے ادا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ حضرت قیسؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور امام محمدؒ کے نزدیک مستحب ہے، م۔

لانه عليه السلام قضاء هما بعد ارتفاع الشمس غداة ليلة التعريس......الخ

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی سنت کو لیلۃ التعریس کی صبح میں آفتاب نکلنے کے بعد قضاء کیا تھا، ف جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ کے متعدد صحابہ کرامؓ کی حدیثوں میں مذکور ہے، اگر یہ سنت اپنے وقت سے فوت ہو جانے کے بعد قضاء نہ ہو سکتی تو آپ قضاء نہ کرتے، اور ظہر سے پہلے کی چار رکعت سنت آپ نے وقت کے اندر فرض کے بعد پڑھ لی ہے۔

ولهما ان الا صل فى السنة ان لا تقضى، لاختصاص القضاء بالواجب، والحديث ورد فى قضائهما تبعا للفرض، فبقى ماوراء ه على الاصل، وانما تقضى تبعا له وهو يصلى بالجماعة او وحده الى وقت الزوال، وفيما بعده اختلاف المشائخ، واما سائر السنن سواها لا تقضى بعد الوقت وحدها، واختلف المشائخ فى قضائها تبعاً للفرض، ومن ادرك من الظهر ركعة ولم يدرك الثلاث، فانه لم يصل الظهر بجماعة.

ترجمہ:- اور شیخینؒ کے نزدیک سنت کے بارے میں اصل حکم یہ ہے کہ اس کی قضاء نہ کی جائے، کیونکہ قضاء کرنے کا حکم واجب کے ساتھ مخصوص ہے، اور فجر کی سنت کی قضاء کرنے کے بارے میں جو حدیث ہے اس میں تو سنت کو فرض کے ساتھ فرض کے تابع کر کے قضاء کا حکم ہے لہٰذا اس کے ماسوا تمام سنتوں کا حکم اپنی جگہ پر باقی رہ گیا، اور فجر کی وہ سنت قضاء ہو جانے کی صورت میں فرض کے تابع کر کے ہی قضاء کی جائیگی زوال سے پہلے تک خواہ فرض نماز جماعت کے ساتھ ادا کی جارہی ہو یا تنہا

ادا کی جا رہی ہو، اور اس وقت تک کے بعد پڑھنے میں مشائخ کا اختلاف ہے، لیکن اس سنت کے فجر کے علاوہ دوسری سنتیں وقت کے بعد قضاء کی نہیں جاتی ہیں، اور فرض کے تابع ہو کر ان کے قضاء کرنے میں مشائخ کا اختلاف ہے، اور جس نے ظہر کی جماعت میں سے صرف ایک رکعت پائی یعنی اور تین رکعتیں نہیں پائیں تو یہ کہا جائیگا کہ اس نے ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا نہیں کی ہے۔

توضیح:- فجر کی سنت کے علاوہ دوسری سنتوں کو قضاء ہو جانے کی صورت میں ادا کرنے کا حکم، ظہر کی ایک رکعت جماعت سے پانے اور تین رکعت نہ پانے کی صورت میں کہا جائیگا کہ اس نے جماعت نہیں پائی ہے

ولهما ان الا صل فی السنة ان لا تقضی، لاختصاص القضاء بالواجب......الخ

مطلب واضح ہے، قضاء کرنے کا حکم واجب کے ساتھ مخصوص ہے ف چنانچہ اصول فقہ کی کتابوں میں قضاء کی تعریف یہ لکھی گئی ہے کہ حکم سے جو چیز واجب ہوئی ہو اس کے مثل کو حوالہ کرنا، اور کوئی سنت حکم کے ذریعہ واجب نہیں کی جاتی ہے، اس لئے اس کی قضاء بھی نہیں ہے۔

ابن الہمامؒ نے اعتراض کیا ہے کہ یہ تو اصطلاح ہوئی یہاں تک کہ اگر قضاء کی ایسی تعریف کی جائے جو اسے شامل ہو تو ایسا اعتراض نہ ہوگا، اور کہا ہے کہ یہ کہنا اولی ہے کہ جس سبب سے ادا واجب ہوتی ہے یہاں تک کہ جب ادا کا مطالبہ اپنے وقت پر پورا نہ کیا تو وہ آہستہ مؤخر ہو کر دوسرے وقت کے لئے باقی رہا، اور سنت کی ادائیگی کے وقت ہی ایسا کوئی مطالبہ نہ تھا تو اس کے لئے قضاء میں بدرجہ اولی مطالبہ نہ ہوگا، یہ فتح القدیر کی اس جگہ کی عبارت کا خلاصہ ہوا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ اس سے قضاء کا واجب ہونا لازم نہ ہوگا، اور ہم اس کی قضاء کو واجب نہیں کہتے مگر ادا کا کچھ سبب ضرور تھا، اگرچہ واجب کرنے والا نہ تھا، وہی قضاء کا باعث ہے، اس کے علاوہ امام صاحبؒ کے نزدیک فجر کی سنت واجب کے حکم میں ہے تو یہی حکم اس کی قضاء میں بھی باقی رہے گا جو اس کی اداء میں تھا، اور آخری وجہ یہ ہے کہ مستحب رہے، فافہم، حدیث لیلۃ التعریس جس سے سنت کی قضاء کا ثبوت ہوتا ہے اس کا جواب یہ دیا ہے۔

والحديث ورد فی قضائهما تبعا للفرض، فبقی ماوراء ہ علی الاصل......الخ

اور لیلۃ التعریس کی حدیث میں جو فجر کی سنت کا حکم مذکور ہے وہ تو فرض کے تابع ہونے کی وجہ سے ہے اس بناء پر اس کے ماسوا جتنی سنتیں ہیں تمام کا حکم اپنی جگہ پر باقی رہ گیا ہے، ف چونکہ یہ حدیث خلاف قیاس ہے اس لئے جیسی وارد ہوئی ویسی ہی باقی رہے گی، بلکہ ظہر میں فرض سے پہلے کی چار رکعتیں جو سنت ہیں ان کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جائے گا۔

وانما تقضی تبعا له وهو یصلی بالجماعة او وحده الی وقت الزوال......الخ

اور فجر کی سنت جس کا بیان ہو اوہ زوال ہی کے وقت تک فرض کے تابع کر کے قضاء کی جائیگی خواہ فرض نماز جماعت سے ادا کی جا رہی ہو یا تنہا منفردا، ف اس مسئلہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے۔ وفيما بعده الخ اور زوال کے بعد فرض کے ساتھ اس کے پڑھے جانے کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے، ف یعنی بعض علماء نے کہا ہے کہ قضاء کرے یہی امام شافعیؒ کا ایک قول ہے، اور بعض علماء نے اس کا انکار کیا ہے، محیط میں صرف دوسرا قول ذکر کیا گیا ہے، مع، گویا یہی اصح قول ہے، اور یہی قول امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا دوسرا قول ہے، اور ایک قول امام احمدؒ کا بھی ہے، ع۔

واما سائر السنن سواها لا تقضی بعد الوقت وحدها، واختلف المشائخ فی قضائها......الخ

فجر کی سنت کے ماسوا دوسری کوئی بھی وقت کے بعد تنہا قضاء نہیں کی جائیگی، ف اس میں تینوں اماموں کا اتفاق

ہے۔ واختلف الخ اور فرض کے تابع کر کے ان کو قضاء کرنے میں مشائخ کا اختلاف ہے، ف یعنی عراقیوں کے نزدیک جب فرض کے ساتھ قضاء ہوں کہ جس طرح مسنون اذان اورا قامت قضاء کی جائیگی، اسی طرح سنت بھی فرض کے تابع کر کے قضاء کی جائیگی، اور خراسانیوں کے نزدیک قضاء نہیں کی جائیگی، اور یہی اصح ہے، مع۔

ومن ادرك من الظهر ركعة ولم يدرك الثلاث، فانه لم يصل الظهر بجماعة.

اور جس نے ظہر میں سے ایک رکعت پائی اور تین رکعتیں نہیں پائیں تو اس نے جماعت کے ساتھ ظہر کی نماز نہیں پڑھی، ف مسئلہ میں تینوں اماموں کا اتفاق ہے، ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا کس وقت کہنا درست ہوگا، بعض صرف ایک رکعت پانے پر یہ بات صادق آتی ہے یا نہیں تو جواب یہ دیا گیا ہے کہ حقیقتاً تو اسی وقت کہنا صحیح ہے جب کہ چاروں رکعتیں جماعت کے ساتھ پڑھی گئی ہوں، اور نماز کا قصہ بھی نہ چھوٹا ہو، ویسے صرف جماعت پانا تو اس وقت بھی کہنا صحیح ہے جب کہ ایک رکعت بلکہ صرف قعدہ پالینے سے بھی کہنا صحیح ہے لہٰذا اس دوسری صورت میں یہ کہا جائیگا کہ اس نے بالاتفاق ظہر کی نماز جماعت نہیں پڑھی ہے بلکہ صرف جماعت کا ثواب پایا ہے، خواہ جمعہ کی فرض نماز ہو یا کوئی دوسری نماز ہو، لیکن جمعہ کے بارے میں امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جس نے جمعہ کے دن صرف قعدہ پایا وہ امام کے سلام کے بعد کھڑا ہو کر ظہر کی نیت سے چار رکعت فرض پڑھ لے کیونکہ جمعہ کے لئے جماعت ایک شرط ہے جو اس نے نہیں پائی ہے اس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ جب تو اس نے جماعت کا ثواب بھی نہیں پایا لیکن یہ وہم اس دلیل سے باطل ہے جو منصفؒ نے بعد میں بیان کی ہے۔

وقال محمد: قد ادرك فضل الجماعة، لان من ادرك آخر الشيء فقد ادركه، فصار محرزا ثواب الجماعة، لكنه لم يصلها بالجماعة حقيقة، ولهٰذا يحنث به في يمينه لايدرك الجماعة، ولا يحنث في يمينه لا يصلي الظهر بالجماعة، ومن اتى مسجدا قد صلى فيه، فلا باس بان يتطوع قبل المكتوبة ما بدأ له مادام في الوقت، ومراده إذا كان في الوقت سعة، وان كان فيه ضيق تركه قيل هذا في غير سنة الظهر والفجر، لان لهما زيادة مزية، قال عليه السلام في سنة الفجر: صلوها ولوطردتكم الخيل، وقال في الاخرى: من ترك الاربع قبل الظهر لم تنله شفاعتي، وقيل هذا في الجميع، لانه عليه السلام واظب عليها عند أداء المكتوبات بالجماعة، ولا سنة دون المواظبة، والأولى ان لا يتركها في الاحوال كلها، لكونها مكمّلات للفرائض الا اذا خاف فوت الوقت.

ترجمہ:- اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اس شخص نے جماعت کی فضیلت پالی کیونکہ کوئی شخص جب کسی چیز کے آخری حصہ کو پاتا ہے تو یوں کہا جاتا ہے کہ اس نے اسے پالیا ہے، لہٰذا وہ شخص جماعت کے ثواب کو پانے والا ہو گیا، لیکن اس نے حقیقۃً جماعت نہیں پائی ہے، اسی بناء پر وہ شخص اپنی قسم میں حانث نہ ہوگا جس نے یہ قسم کھائی ہو کہ وہ جماعت سے نماز نہیں پڑھیگا، اور جو شخص کسی مسجد میں اس وقت پہونچا جب کہ اس میں جماعت ہو چکی ہو تو اسے اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اپنی فرض نماز سے پہلے نفل پڑھ لے وقت کا خیال رکھتے ہوئے جتنی چاہے، اور اگر وقت میں تنگی ہو تو اسے چھوڑ دے، کہا گیا ہے کہ یہ حکم ظہر اور فجر کی سنتوں کے علاوہ دوسری سنتوں کے لئے ہے کیونکہ ان دونوں نمازوں کی ایک خاص اہمیت ہے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فجر کی سنت کے بارے میں فرمایا ہے کہ اسے پڑھا کرو اگرچہ تمہیں تمہارے دشمن کے گھوڑے بھگائیں، اور دوسری سنت (ظہر) کے بارے میں فرمایا ہے کہ جس نے ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں چھوڑ دیں اسے میری شفاعت حاصل نہ ہوگی، کہا گیا ہے کہ یہ حکم تمام سنتوں کے بارے میں ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے تو فرائض کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے وقت ان سنتوں پر مواظبت اور مداومت کی ہے، اور بغیر مداومت کے سنت ثابت ہی نہیں ہوتی ہے، اور اولی یہ ہے کہ ان سنتوں کو عام حالات میں نہ چھوڑے کیونکہ یہ سنتیں تو فرض نمازوں کی کمی کو پوری کرنے والی ہیں، البتہ اس وقت چھوڑ دے جب کہ وقت کے نکل جانے کا خوف ہو۔

توضیح:-جماعت ہو جانے کے بعد مسجد میں آنے والا نفل پڑھے یا نہیں
فجر اور ظہر کی سنتوں کی فضیلت، تنہا نماز پڑھنے والے کی سنتیں

وقال محمد: قد ادرك فضل الجماعة، لان من ادرك آخر الشيء فقد ادركه.....الخ

امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اس نے جماعت کا ثواب پالیا، ف اس لئے جمعہ میں بھی جماعت کا ثواب پایا، اور ظہر وجمعہ دونوں میں بالاتفاق جماعت کا ثواب پایا۔ لان من الخ کیونکہ جس نے کسی چیز کا آخری حصہ پالیا اس نے اس چیز کو پالیا اس لئے جماعت کا پورا ثواب پایا۔ لکنه الخ لیکن اس نے نماز در حقیقت جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی، ف بعض حصہ پڑھا ہے، اس مسئلہ کی اس تفصیل کا فائدہ قسم وغیرہ میں ظاہر ہوگا چنانچہ مصنفؒ نے کہا ہے۔ ولهذا الخ اسی بناء پر اس تھوڑے سے حصہ کے پانے کی وجہ سے وہ اپنی قسم میں جھوٹا ہو جائیگا، کہ لایدرك الجماعة ف یعنی کسی نے قسم کھائی کہ آج تم ظہر کی جماعت نہ پاؤ گے اگر تم جماعت پالو تو میرا غلام آزاد ہے اس کے بعد وہ دوسرا شخص مسجد میں نماز پڑھنے کے خیال سے آیا، لیکن اسے صرف ایک ہی رکعت ملی بلکہ ایک قعدہ ملا تو اس نے جماعت پائی اس وجہ سے قسم کھانے والا جھوٹا ہو گیا، اور اس کا غلام آزاد ہو گیا۔

ولا يحنث في يمينه لا يصلي الظهر بالجماعة.....الخ

اور اس قسم کھانے میں کہ آج تم ظہر کو جماعت سے نہیں پڑھو گے، ف اگر جماعت سے پڑھ لو تو میرا غلام آزاد ہے، اس کے بعد وہ دوسرا شخص جلدی سے جماعت کے خیال سے مسجد آیا مگر صرف ایک ہی رکعت جماعت سے ملی، تو فیصلہ یہ ہوگا کہ اس آنے والے نے جماعت کے خیال سے نماز نہیں پڑھی، لہٰذا وہ شخص جھوٹا نہ ہوا۔ م۔ اسی طرح اگر اس نے تین رکعتیں پائی ہوں، اور ایک رکعت نہیں پائی تو بھی یہی کہا جائیگا کہ اس نے ظہر جماعت کے ساتھ نہیں پڑھی، لہٰذا قسم کھانے والا جھوٹا نہ ہوا، یہی قول اظہر اور اصح ہے۔ خلافاً للسرخسيؒ، عف، ظہر کی طرح ہر چار رکعت والی نماز کا یہی حکم ہوگا، ت، امام شافعیؒ کا یہی مذہب ہے، ع، قعدہ پانے والے کو بھی بالاتفاق جماعت کا ثواب ملے گا مگر تکبیر اول پانے کا ثواب اس سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہوگا، کیونکہ حدیث میں اس کی فضیلت کا مستقل ثبوت ہے، م۔

ومن اتى مسجدا قد صلي فيه، فلا باس بان يتطوع قبل المكتوبة ما بدا له مادام في الوقت.....الخ

امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص کسی ایسی مسجد میں آیا کہ اس میں نماز ہو چکی ہے مگر آنے والے کو جماعت نہیں ملی تو اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ فرض پڑھنے سے پہلے جتنی نفل پڑھنی چاہے وقت کا خیال رکھتے ہوئے پڑھ لے۔ ومراده الخ اس میں امام محمدؒ کی مراد یہ ہے کہ جب تک وقت میں گنجائش ہو، وان كان الخ اور اگر وقت میں تنگی ہو تو نفل چھوڑ دے، ف۔ ظاہر کلام تو اختیاری نفل میں ہے، مگر فقہائے کرام نے اس میں سنتوں کو بھی داخل فرمادیا ہے، اسی لئے کہا قيل هذا الخ کہا گیا ہے کہ یہ حکم ظہر اور فجر کی سنتوں کے ماسوا کے لئے ہے، ف کہ چاہے تو پڑھ لے لیکن ظہر اور فجر کی سنتوں کو پڑھنے کی زیادہ تاکید ہے۔ لان لهما الخ کیونکہ دوسری سنتوں کے مقابلہ میں ان دونوں سنتوں کی افضلیت بہت زیادہ ہے۔

قال عليه السلام في سنة الفجر: صلوها ولو طردتكم الخيل، وقال في الاخرى: من ترك.....الخ

یعنی ان دونوں رکعتوں کو مت چھوڑو اگرچہ دشمنوں کے سوار تم کو ہانک کر لے جانا چاہیں، اور ابوداؤد کی روایت میں ہے لَا تَدَعُوهُمَا وَلَوْ طَرَدَتْكُمُ الْخَيْلُ یہ حدیث فجر کی سنتوں سے متعلق تھی۔ وقال في الاخرىٰ الخ اور ظہر سے پہلے کی چار رکعتوں سے متعلق فرمایا ہے کہ جس نے ظہر سے پہلے کی چار رکعتیں چھوڑ دیں اس کو میری سفارش حاصل نہ ہوگی، ف یہ روایت بے اصل ہے اس کا کچھ وجود نہیں ہے، البتہ ام حبیبہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ جس نے ظہر کے قبل چار رکعتیں اور ظہر کے بعد کی چار رکعتوں کی حفاظت کی اس پر اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ حرام کر دینگے، اس کی روایت ابوداؤد، ترمذی، نسائی

اور ابن ماجہ نے کی ہے۔

وقیل هذا فی الجمیع، لانه علیه السلام واظب علیها عند أداء المکتوبات بالجماعة......الخ

اور کہا گیا ہے کہ حکم تمام سنتوں کے بارے میں ہے، ف جب کہ تنہا پڑھے تو چاہے سنت پڑھے یا نہ پڑھے۔ **لانه علیه السلام الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرائض کو جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے وقت ان سنتوں پر مداومت فرمائی ہے، ف تنہا پڑھنے کے وقت نہیں **ولاسنة الخ** اور بغیر مواظبت کے سنت ثابت نہیں ہوتی ہے، ف لہٰذا تنہا پڑھنے والے کے حق میں یہ نمازیں بطور سنت ثابت نہیں ہوئیں، بلکہ نفل میں تو اختیار ہوگا، صدر الاسلام کا یہی قول ہے، ع۔

والأولی ان لا یترکها فی الاحوال کلها، لکونها مکملات للفرائض الا اذا خاف فوت الوقت......الخ

مصنفؒ نے فرمایا **والاولی الخ** اولیٰ یہ ہے کہ ان سنتوں کو کسی حال میں نہ چھوڑے کیونکہ یہ سنتیں فرض نمازوں کی کمی کو پوری کرنے والی ہیں، مگر اس وقت چھوڑ دے کہ وقت میں کمی ہو گئی ہو، اور وقت نکل جانے کا خوف ہو، ف کسی حال سے مراد وقت کی تنگی اور زیادتی، تنہائی اور جماعت ہے، اور بعض نے کہا ہے کہ اسی میں مسافرت کی حالت اور اقامت کی حالت بھی داخل ہے، لیکن سفر کی حالت میں بہت سے مشائخ کے نزدیک یہ سنتیں چھوڑ دے، اور حالت سفر میں اگرچہ سواری پر یہ نمازیں پڑھی جا سکتی ہیں، اور اس میں کوئی اختلاف بھی نہیں ہے بلکہ گفتگو اس بات میں ہے کہ جو برائی اور اساءت اس کے بارے میں ہو سکتی تھی وہ مسافر کو نہ ہوگی، خلاصہ فتح القدیر۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر ترک کرنا جائز ہے پھر بھی ترک نہ کرنا اولیٰ، کیونکہ اس پر مداومت کی وجہ سے جنت کا وعدہ اور دنیا اس کی تمام چیزوں سے بہتری اور جہنم کی آگ سے نجات اور دوسرے فضائل اور کمالات تمام باتوں کو یقینی طور سے امید وار ہو جاتا ہے، اور ان نمازوں کو جو فرائض کو مکمل کرنے والی عبارت سے تعبیر کیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ابوداؤد وغیرہ کی حدیث میں اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض آدمی نماز سے ایسی حالت میں فارغ ہوتے ہیں کہ اس کی ادا کی ہوئی نماز میں سے صرف آدھی نامہ اعمال میں لکھی جا سکی ہے اور کسی کی تہائی اس طرح کم و پیش لکھی جاتی ہے یہاں تک کہ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ بعضوں کے نامہ اعمال میں کچھ بھی نہیں لکھا جاتا ہے، اور دوسری حدیثوں میں قیامت کے دن فرض نمازوں کے حساب و کتاب کے وقت ان میں کمی پا کر ان کی تلافی کرنے کے لئے نوافل کو تلاش کیا جائیگا، اگر نوافل کی نیکی اسکے اعمال میں ہوگی تو اس سے وہ کمی پوری کی جائیگی، ورنہ عذاب ہوگا، اسی وجہ سے یہ کہا گیا ہے کہ دن بھر میں ۲۰ رکعتیں فرض و واجب کی مجموعۃ ہوتی ہیں تو ماہ رمضان مبارک کی اہمیت کے پیش نظر اسی تعداد میں تراویح کی بھی ۲۰ رکعتیں رکھی گئی ہیں تاکہ فرض کی ہر ایک رکعت میں کمی کی تلافی کے لئے تراویح کی رکعت ہو سکے۔ م۔

ومن انتهی الی الامام فی رکوعه، فکبر وقف حتی رفع الامام رأسه، لا یصیر مدرکا لتلك الرکعة خلافا، لزفرؒ هو یقول: ادرك الامام فیما له حکم القیام، ولنا ان الشرط هو المشارکة فی افعال الصلاة، ولم یوجد لا فی القیام ولا فی الرکوع، ولو رکع المقتدی قبل امامه، فادرکه الامام فیه جاز، وقال زفرؒ لایجزیه، لان ما اتی به قبل الامام غیر معتد به، فکذا ما یبنی علیه، ولنا ان الشرط هوالمشارکة فی جزء واحد کما فی الطرف الاول، والله اعلم.

ترجمہ: -اگر کوئی شخص جماعت پانے کے لئے امام کے رکوع کی حالت میں مسجد پہونچا، اور تکبیر کہہ کر کھڑا رہا اتنے میں امام نے اپنا سر رکوع سے اٹھالیا تو اسے اس رکعت کا پانے والا نہیں مانا جائیگا، مگر امام زفرؒ کا اس میں اختلاف ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ مقتدی نے امام کو ایسی حالت میں پایا ہے جس کو کھڑے ہونے کا حکم حاصل ہے، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اس موقع میں دونوں کا ایک حالت میں شریک ہو جانا شرط ہے جو نہ رکوع کی حالت میں پایا گیا اور نہ قیام کی حالت میں اس لئے رکوع کے پانے کا حکم نہیں

دیا جائیگا، اور اگر کسی مقتدی نے امام کے رکوع میں جانے سے پہلے رکوع کر لیا لیکن بعد میں امام نے اسے اسی حالت میں پالیا تو اسے جائز مان لیا جائے گا، اور اس موقع پر امام زفرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ عمل صحیح نہیں مانا جائیگا، کیونکہ اس نے امام سے پہلے جتنی دیر رکوع کیا وہ بے اعتبار رہا اس پر بقیہ حصہ کی بناء کرنا بھی صحیح نہ ہوگا، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ دونوں کی ایک حالت میں شرکت ضروری ہے اگرچہ ایک ہی جزء میں ہو جیسا کہ شروع حصہ میں ہو، واللہ اعلم۔

توضیح:- امام کو رکوع کی حالت میں پانا، امام کو قیام کی حالت میں پایا اور رکوع میں نہیں گیا قیاس سے دلیل، امام سے پہلے رکوع، قیاس سے دلیل، فروع، امام رکوع میں اور تکبیر امام سے پہلے سر اٹھانا، امام کے دوسرے گمان سے سجدہ، مقتدی کی تین تسبیح سے پہلے امام نے سر اٹھایا نماز عید میں امام کو رکوع میں پایا، امام سے پہلے سلام، امام نے قنوت چھوڑ دیا، کافر کو نماز جماعت میں

ومن انتهى الى الامام فى ركوعه، فكبر وقف حتى رفع الامام رأسه......الخ

اور جو شخص امام تک اس وقت پہونچا جب کہ وہ رکوع میں تھا، پہونچ کر تکبیر تحریمہ کہنے کے بعد وہ کھڑا رہ گیا اور امام کو رکوع میں شریک نہ ہوا، ف خواہ وہ اس وقت رکوع کر سکتا ہو یا نہیں کر سکتا ہو حتی رفع الخ یہاں تک کہ امام نے رکوع سے اپنا سر اٹھا لیا۔

لا يصير مدركا لتلك الركعة خلافا لزفرؒ هو يقول: ادرك الامام فيما له حكم القيام......الخ

تو اس شخص کو اس رکوع کا پانے والا نہیں مانا جائیگا، ف اور اگر اس وقت پہونچا جب کہ امام کھڑا ہو اور اس نے احرام باندھ لیا اس کے بعد امام رکوع میں گیا مگر کسی وجہ سے یہ رکوع میں نہ جا سکا یا رکوع نہیں پایا تو بالاتفاق ایسے شخص کو لاحق کہا جائے گا اور اسے یہ رکعت مل گئی، اور اگر یہ اس وقت پہونچا جب کہ امام نے رکوع سے سر اٹھا لیا پھر اس نے تحریمہ باندھا تو بالاجماع یہ رکعت اسے نہیں ملی اور اگر پہونچ کر تحریمہ کے بعد امام کو رکوع میں پالیا تو بالاجماع یہ رکعت اسے مل گئی، یہی وہ صورت ہے جو مصنفؒ نے ذکر کی ہے، اس میں ہمارے اور امام شافعیؒ کے نزدیک اس نے رکعت نہیں پائی۔ خلافاً لزفرؒ الخ اس مسئلہ میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے، وهو يقول الخ زفرؒ کا فرمانا ہے کہ اس شخص نے امام کو ایسی حالت میں جس کو حکماً قیام مانا جاتا ہے، ف یعنی رکوع کو قیام سے مشابہت اس لئے یوں کہا جائے گا کہ گویا اس شخص نے گویا رکوع پالیا جب کہ رکوع کے بعد قیام میں پالیا پس یہ رکعت اسے مل گئی یہی قول امام ثوری، ابن المبارک اور ابن ابی لیلیٰ کا بھی ہے۔

ولنا ان الشرط هو المشاركة فى افعال الصلاة، ولم يوجد لا فى القيام ولا فى......الخ

اور ہماری دلیل تو یہ ہے کہ امام اور مقتدی میں موافقت ہو جانا یعنی ایک ساتھ ایک عمل میں شریک رہنا کافی ہے ف یہاں تک کہ صحیح مسلم کی حدیث میں ہے کہ امام اسی واسطے ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے اس لئے تم اس کی مخالفت نہ کرو، جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو اور جب پڑھے تو تم خاموش ہو کر سنو، آخر تک۔

ولم يوجد لا فى القيام ولا فى الركوع......الخ

اور اس قسم کی شرکت امام و مقتدی کے درمیان نہیں پائے گئی نہ تو حالت قیام میں اور نہ حالت رکوع میں، ف بلکہ رکوع سے سیدھے کھڑے ہو کر سجدہ میں جاتے وقت، لہٰذا اس رکعت کا اسے سجدہ کے علاوہ اور کوئی رکن نہیں ملا، اس لئے یہ رکعت اسے بالکل نہ ملی، حدیث میں ہے کہ جب تم آؤ اور ہم سجدہ میں ہوں تو سجدہ میں شریک تو ہو جاؤ مگر اسے شمار کرو، اور جس نے رکعت پائی اس نے نماز پائی، ابوداؤد نے اسکی روایت کی ہے، یعنی جس نے رکوع پایا اس نے نماز کی ایک رکعت پائی اسے ایک رکعت شمار کرے اور صحیح مسلم میں اس کی تصریح ہے، سجدہ میں شرکت واجب ہے لیکن اگر نہ کرے تو نماز نہ فاسد ہوگی اور نہ سجدہ سہو لازم آئے

گا، النہر۔

ف: اس حدیث میں رکعت کو نماز کہا گیا ہے، اسی وجہ سے امام شافعیؒ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ہر رکعت نماز ہے اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ نماز بغیر قراءت کے نہیں ہے اس لئے ہر رکعت میں قراءت واجب ہوئی، میں مترجم کہتا ہوں کہ بقول اصح امام ابو حنیفہؒ کا مذہب یہی ہے کہ دو رکعتوں میں قراءت فرض ہے اور دو رکعتوں میں واجب ہے، یہ بات یاد رکھیں۔ م۔

مقتدی کے رکوع کرتے ہوئے امام نے سر اٹھانا شروع کر دیا تو اگر چہ ان دونوں کے درمیان ایک عمل میں محض تھوڑی سی شرکت پائی گئی یعنی ان دونوں کے دو رکوع کے درمیان تھوڑی سی شرکت پائی گئی تو اس نے رکعت پالی، یہی قول اصح ہے، ع۔

ولو ركع المقتدى قبل امامه، فادركه الامام فيه جاز......الخ

اگر مقتدی نے اپنے امام سے پہلے رکوع کر دیا، ف اور اسی حالت پر رہا تو اتنے میں امام نے اس کو رکوع کی حالت ہی میں پالیا، یعنی امام نے جب رکوع کیا تو اس کا مقتدی رکوع میں پہلے سے تھا اس رکوع میں دونوں ایک وقت میں پائے گئے گویا رکوع میں امام کا شریک ہو گیا تو رکوع جائز ہو گیا، ف اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مقتدی کو ایسی حرکت کرنی جائز ہو گئی بلکہ اس حرکت نامناسبہ کے باوجود مقتدی کی نماز فاسد نہ ہوئی، یعنی اگر چہ برا کیا پھر بھی نماز جائز رہے گی۔

وقال زفرؒ لايجزيه، لان ما اتى به قبل الامام غير معتد به، فكذا ما يبنى عليه......الخ

اور امام زفرؒ نے کہا ہے کہ مقتدی کے لئے یہ رکوع کافی نہیں ہوگا، کیونکہ مقتدی نے امام سے پہلے جتنی دیر بھی رکوع کیا وہ بالکل بے اعتبار رہا اس لئے اس پر جتنے حصہ کی بھی بنیاد رکھی گئی وہ سب بھی بیکار گئی، ف گنتی کے لائق نہیں ہے یعنی امام کے رکوع کر لینے کے بعد بھی جتنی دیر وہ رکوع میں رہا وہ بھی شمار کے لائق نہیں ہے، کیونکہ یہ دوسرا حصہ پہلے حصہ پر مبنی ہے، اور جو چیز کسی فاسد چیز پر مبنی ہو وہ بھی فاسد ہو جاتی ہے۔

ولنا ان الشرط هو المشاركة فى جزء واحد كما فى الطرف الاول، والله اعلم.

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ شرط تو کسی جزء میں دونوں کی بیک وقت شرکت ہے جیسا کہ پہلے حصہ میں ہے، ف یعنی جب کہ ابتداء میں امام کے ساتھ شرکت کر کے رکوع کرے پھر امام سے پہلے سر اٹھا دے تو بالاتفاق یہ جائز ہے کیونکہ ایک وقت میں دونوں کی شرکت پائے گئی، اس لئے فاسد نہ ہوئی اگر چہ اس حرکت کے بارے میں بھی سخت وعید آئی ہے، چنانچہ حدیث میں ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ خبردار جو شخص امام سے پہلے اپنا سر اٹھالیتا ہے کیا وہ اس بات سے نہیں ڈرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سر کو گدھے کا سر کر دے۔

چند ضروری مسائل

امام جب رکوع میں ہو تو اکثر علماء کے نزدیک مقتدی کی شرکت کے لئے صرف ایک تکبیر کافی ہے اگر اس تکبیر سے رکوع کی نیت کی ہو گی تو یہ نیت لغو قرار دی جائیگی اور تحریمہ کے لئے اسے تصور کر لیا جائیگا، (یعنی یہ سمجھا جائیگا کہ اس نے اس تکبیر سے تحریمہ کی نیت کی ہے اور رکوع کی نہیں کی ہے) فع۔ اگر کسی نے امام سے پہلے اپنا سر اٹھالیا تو چاہئے کہ لوٹ جائے خواہ رکوع میں ہو یا سجدہ میں اور دوسرے کا شمار نہیں ہوگا، ف، اگر مقتدی کو سر اٹھا کر یہ گمان ہوا کہ امام دوسرے سجدے میں ہے اگر اس نے دوسرا سجدہ اور متابعت دونوں باتوں کی نیت کی تو متابعت مان لی جائیگی، اور اگر صرف دوسرے سجدہ کی نیت کی تو دوسرا سجدہ ہوگا، یہاں تک کہ امام نے سر اٹھا کر دوسرا سجدہ کیا اور مقتدی کو اسی سجدہ کی حالت میں پایا تو جائز ہے، ع، ف۔

امام نے رکوع یا سجود سے سر اٹھالیا لیکن مقتدی نے اس وقت تک تین تسبیح ادانہ کی ہو تو بھی وہ امام کے ساتھ سر اٹھا کر اس کی متابعت کر لے، اگر کسی نے امام کو عید کی رکوع کی حالت میں پایا تو اسے چاہیئے کہ فوراً رکوع میں شریک ہو کر عید کی زائد تین

تکبیریں اسی رکوع میں کہہ لے، کسی نے امام سے پہلے سلام پھیر دیا اور امام نے اتنی دیر کی کہ آفتاب نکل آیا تو مقتدی کی نماز صحیح ہوگی اور صرف اس امام کی نماز باطل ہوگئی، امام نے قنوت پڑھ کر رکوع بھی کر لیا لیکن مقتدی کی قنوت ہنوز ختم نہیں ہوئی تھی اس لئے اگر اسے امید ہے کہ اس کو ختم کر کے بھی رکوع مل جائیگا تو قنوت پوری کر کے رکوع میں شریک ہو ورنہ قنوت کو چھوڑ کر رکوع میں چلا جائے۔ف۔

اور فتح القدیر میں اس موقع پر متابعت امام وغیر متابعت کے متعلق کچھ وہ باتیں لکھی ہیں جن کو ہم وتر کی بحث میں لکھ چکے ہیں، اور لکھا ہے کہ کافر نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھی تو اس کے اسلام لانے کا حکم دیا جائے گا، کیونکہ جماعت کی نماز صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص ہے، بخلاف حج اور روزہ کے، لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ جماعت کے اسلام کے ساتھ مخصوص کرنے کے معاملہ میں تامل اور غور کی ضرورت ہے میں کہتا ہوں کہ ہماری جماعت میں سوا مسلمان کے کسی کے شریک ہونے کا احتمال ہی نہیں لہذا اس میں نظر اور تامل کرنا بے کار ہے۔م۔

باب قضاء الفوائت

چھوٹی ہوئی نمازوں کو قضاء کرنے کا باب

من فاتته صلوة قضاها اذا ذكرها، وقدمها على فرض الوقت، والاصل فيه ان الترتيب بين الفوائت وفرض الوقت عندنا مستحق، وعند الشافعيؒ مستحب، لان كل فرض اصل بنفسه، فلا يكون شرطا لغيره، ولنا قوله عليه السلام: من نام عن صلاة او نسيها فلم يذكرها الا وهو مع الامام، فليصل التى هوفيها، ثم ليصل التى ذكرها بعد التى صلى مع الامام.

ترجمہ: جس شخص کی نماز قضاء ہوگئی ہو تو جب بھی اسے یاد آئے اسے پڑھ لے مگر وقتی فرض سے پہلے اسے پڑھے، اس مسئلہ میں اصل بات یہ ہے کہ چھوٹی ہوئی نمازوں اور وقتی نمازوں کے درمیان ہمارے نزدیک ترتیب کا ہونا ضروری ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک یہ ترتیب مستحب ہے، کیونکہ ہر فرض نماز اپنی جگہ پر اصل ہے، اس لئے کوئی بھی دوسری کے لئے شرط نہیں ہو سکتی ہے اور ہماری دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو شخص نماز پڑھتے وقت سوتا ہوا رہ گیا یا اسے بھول گیا مگر وہ بھولی ہوئی اسی وقت یاد آئی جب کہ امام کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہو، تو جس نماز کو وہ پڑھ رہا ہو اسے پڑھ کر ختم کر ڈالے پھر اس نماز کو پڑھے جس کو اس نے یاد کیا ہے، پھر اس نماز کو دوبارہ پڑھ لے جسے اس نے امام کے ساتھ پڑھی ہے۔

توضیح:- چھوٹی ہوئی نمازوں کی قضاء کا باب۔ چھوٹی ہوئی نماز کی قضاء کرنے کا وقت۔ چھوٹی ہوئی نمازوں کے درمیان اور وقتی فرض کے درمیان ترتیب۔ حدیث سے دلیل

باب قضاء الفوائت...... الخ فائتہ نمازوں کے قضاء کرنے کا بیان۔

فائتہ ایسی نماز کو کہتے ہیں جو اپنے وقت سے جاتی رہے، اگر کوئی قصداً نماز کو چھوڑ دے تو وہ کبیرہ گناہ کا مجرم ہوگا، اسے توبہ کرنی چاہئے اس کے بعد معافی ہوگی یا حج کرنے سے معاف ہوگا ساتھ ہی قضاء بھی کرے، اور اگر عذر کی وجہ سے ہو تو قضاء کر لینے سے معاف ہوگا، عذر اور مجبوریوں کی مختلف وجہوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دشمنوں کی زیادتی ہو، جیسا کہ خندق کی لڑائی میں رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی چار وقتوں کی نمازیں فوت ہوگئی تھیں اس بناء پر کہ دشمنوں نے چاروں طرف سے ان حضرات کو گھیر رکھا تھا بعد میں آپ ﷺ نے سب کی قضاء فرمائی تھی، اسی طرح دردزہ میں دایہ جو دیکھ بھال کے لئے ہوتی ہے اس کے اٹھ کر جانے سے اس عورت یا بچہ جو ہونے والا ہے اس کی جان کا خطرہ ہو، تو یہ نماز میں تاخیر کر سکتی ہے، پھر وقت ملتے ہی پورے

شرائط اور ارکان کے ساتھ بجالانا ضروری ہے۔ اعادہ کے معنی ہیں کسی خرابی اور خلل کے وجہ سے اس کام کو وقت کے اندر دوبارہ کرنا، قضاء کے معنی ہیں وقت گذرنے کے بعد واجب شدہ جیسی چیز بجالانا، ن، د، ع۔

من فاتته صلوة قضاها اذا ذكرها، وقدمها على فرض الوقت......الخ

جس شخص کی نماز فوت ہو گئی ہو اسے اسی وقت قضاء کرے یا جب یاد آجائے اور اسے وقتی فرض سے پہلے ادا کرے۔ ف۔ اسی طرح اگر سو جانے کی وجہ سے فوت ہو گئی ہو تب بھی، اور یہاں نماز سے فرض مراد ہے خواہ فرض اعتقادی ہو جیسے فرائض پنجگانہ یا فرض عملی ہو جیسے وتر ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق، لہذا وتر اور فجر کی نمازوں کے درمیان بھی ترتیب واجب ہے، اور مطلقاً واخص ہے یہاں تک کہ اگر کسی نے بغیر انکار کے نماز عمداً ترک کر دی بطور فسق کے تو اس کی قضاء بھی اجماعاً واجب ہے، امام مالکؒ اور شافعیؒ کا یہی قول ہے، ابن حبیبؒ نے کہا ہے کہ اس طرح ترک سے تو وہ مرتد ہو گیا فاسق سے بڑھ گیا۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ امام شافعیؒ جب عمداً ترک قضاء کرنے کو واجب کہتے ہیں تو یہ بات اس پر دلیل ہے کہ ان کے نزدیک عمداً ترک کرنے والا کافر نہیں ہوتا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں، اسی طرح وقتی فرض پر قضاء کو مقدم کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ وقتی فرض پر قضاء کو مقدم کئے بغیر وقتی نماز ادا نہ ہو گی، البتہ ترتیب ساقط ہو جانے کی صورت میں ادا بھی ہو سکتی ہے، جس کی تفصیل عنقریب آئیگی۔ م۔

والاصل فيه ان الترتيب بين الفوائت وفرض الوقت عندنا مستحق......الخ

اس جگہ اصل بات یہ ہے کہ قضاء شدہ نمازوں اور وقتی فرض کے درمیان ترتیب رکھنا ہمارے نزدیک مستحق ہے، ف یعنی فرض عملی ہے، اس لئے اگر ظہر عصر اور مغرب کی نمازیں قضاء ہو گئیں، اور عشاء کے وقت ان کو ادا کرتا ہے تو اسی ترتیب سے یعنی پہلے ظہر پھر عصر پھر مغرب تاکہ قضاء نمازوں میں ترتیب ہو جائے اس کے بعد وقتی فرض یعنی عشاء کو پڑھے، یعنی مذہب امام نخعی، مالک، احمد، اسحٰق، لیث وغیرھمؒ کا ہے۔ مع۔

وعند الشافعيؒ مستحب، لان كل فرض اصل بنفسه، فلا يكون شرطا لغيره......الخ

اور شافعیؒ کے نزدیک ترتیب مستحب ہے، ف یہی مذہب طاؤس وابو ثورؒ وغیرہ کا ہے، ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ یہی قول اصح ہے۔ لان كل فرض الخ امام شافعیؒ کی دلیل یہ ہے کہ ہر فرض بذات خود اصل ہے، اس لئے دوسرے فرض کے لئے وہ شرط نہ ہو گا، ف البتہ کسی دلیل کے ساتھ ہو سکتا ہے جیسے عام عبادتوں کے لئے ایمان اور اعتکاف کے لئے روزے کا ہونا شرط ہے مگر حدیث کی دلیل کی وجہ سے، عف، اور جواب یہ ہے کہ وقتی صحیح ہونے کے لئے فائتہ کو ہم شرط نہیں کرتے بلکہ ہمارے نزدیک فائتہ مقدم واجب ہے، جب کہ وقتیہ مؤخر واجب ہے، یہاں تک کہ جب وقت کی تنگی کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو وقتی نماز مقدم ہو جائیگی اور اسے پہلے ادا کرنا ہو گا اس کے بعد قضاء پڑھنی ہو گی، جیسا کہ اس کی تفصیلی بحث آئندہ ہو گی۔ م۔ الہداد۔ اگر نفل پڑھتے ہوئے فائتہ فرض یاد آجائے تو اسے پوری کر لینی چاہئے، کیونکہ فرض واجب میں جو ترتیب واجب ہوئی ہے وہ خلاف عقل وقیاس ثابت ہوئی ہے، محیط السرخسیؒ۔

ولنا قوله عليه السلام: من نام عن صلاة او نسيها فلم يذكرها الا وهو مع الامام......الخ

اور ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے جو شخص نماز سے غافل ہو کر سو گیا یا اسے بھول گیا اور اس کا خیال نہ رہا اور وہ اس وقت یاد آئی جب کہ دوسری نماز امام کے پیچھے پڑھ رہا ہو تو اسی کو پوری کر لے جسے پڑھ رہا ہو اس کے بعد اسے پڑھے جو چھوٹی ہوئی یاد آئی ہو اس کے بعد امام کے ساتھ جو نماز پڑھی ہو اسے دوبارہ پڑھ لے، ف اسی کے مطابق امام احمدؒ کا قول ہے، اس حدیث کو دار قطنی نے ثقہ راویوں سے حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعاً روایت کی ہے، لیکن امام مالکؒ نے موقوفاً یعنی ابن عمرؓ کے قول کی روایت کی ہے، دار قطنی وابو زرعہ نے اسی قول کو صحیح کہا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ثقہ راوی کبھی مرفوع اور کبھی موقوف روایت کیا کرتے ہیں اس لئے دونوں روایتیں صحیح ہیں، مف، نہایہ وغیرہ نے اس مقام پر چند مشکلیں ذکر کی ہیں، جن کو حل کرنا مشکل ہے

جیسا کہ عینیؒ نے تفصیل کے ساتھ ذکر کیا ہے۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ میرے نزدیک تحقیق یہ ہے کہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے فرمایا ہے کہ نمازوں کے اوقات اور ان کی ادائیگی میں ترتیب قطعی ہے، اب اگر کسی وجہ سے کوئی نماز بروقت ادا نہیں کی جاسکی تو بعد میں جب بھی پڑھی جائے اس وقت ادائیگی میں ترتیب کو باقی رکھنا ضروری ہے، ان کے ادا کرنے کی ترتیب اس طرح سے ہوگی کہ مثلاً حج ادا کرتے ہوئے عرفات کے مقام میں ظہر اور عصر دو وقتوں کی نماز ایک ساتھ پڑھی جاتی ہے وہاں اگر کوئی شخص عصر کو پہلے پڑھ کر بعد میں ظہر ادا کرے تو جائز نہ ہوگی اس لئے ترتیب وقت کے مطابق پہلے ظہر بعد میں عصر پڑھنی ہوگی، اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ سوجانے یا بھول جانے کی وجہ سے کوئی نماز اگر اپنے وقت پر پڑھی نہیں جاسکی تو یاد آتے ہی ادا کرنی چاہئے کہ یہی اس کا وقت ہے، اور ایک روایت میں ہے اس کے ادا کرنے کے علاوہ اس کا دوسرا کوئی کفارہ نہیں ہے، جیسا کہ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے، پس جب یہ وقت اور یہ کفارہ شریعت کی طرف متعین ہو گیا تو اب اداء کے لحاظ سے بھی اور وقت کے لحاظ سے بھی فوت شدہ نماز کو وقتیہ پر مقدم کرنا ضروری ہو گیا، مگر چونکہ یہ وقت اس کا حقیقی نہیں ہے اسی بناء پر آفتاب کے نکلتے یا ڈوبتے ہوئے نماز نہیں پڑھی جاسکتی ہے، اسی وجہ سے اب اسے قصداً تارک نماز نہیں کہا جاسکتا ہے، اسی لئے فقہاء کرام نے فرمایا ہے کہ قضاء نماز زندگی میں کسی وقت بھی پڑھی جاسکتی ہے سوائے ان تین وقتوں کے جن میں نماز ممنوع ہے، یعنی طلوع، غروب، اور ٹھیک دوپہر کے وقت۔
اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مصنفؒ نے جس حدیث سے استدلال کیا ہے وہ فرض کا بیان ہے یعنی اداء میں ترتیب وقت اور عمل دونوں اعتبار سے ضروری ہے، پھر وقت پر نہ پڑھنے کی صورت میں یعنی قضاء ہو جانے سے عمل کی ترتیب ضروری رہی، لیکن اس میں یہ احتمال باقی رہ گیا کہ شاید ترتیب ساقط ہو جائے تو مذکور حدیث سے وہ احتمال بھی ختم ہو گیا، پھر خبر الواحد ہونے کی وجہ سے اس کا درجہ فرض اعتقادی کا نہ ہو کر صرف فرض عملی رہ گیا، لہٰذا یہ قول اصح ہوا، واللہ سبحانہ وتعالے اعلم۔ م۔ فرض کی قضاء فرض اور واجب کی واجب اور سنت کی قضاء سنت ہے۔ البحر۔

ولو خاف فوت الوقت، يقدم الوقتية، ثم يقضيها، لان الترتيب يسقط بضيق الوقت، وكذا بالنسيان وكثرة الفوائت كيلا يؤدّى الى تفويت الوقتية، ولوقدم الفائتة جاز، لان النهى عن تقديمها لمعنى فى غيرها، بخلاف ماذاكان فى الوقت سعة، وقدم الوقتية حيث لايجوز، لانه اداها قبل وقتها الثابت بالحديث.

ترجمہ:-اگر وقت کے ختم ہو جانے کا خوف ہو تو وقتیہ کو پہلے پڑھ لے پھر چھوٹی ہوئی کی قضاء کرے کیونکہ وقت کے تنگ ہو جانے سے ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، اسی طرح بھولنے سے اور چھوٹی ہوئی نماز کی تعداد زیادہ ہو جانے سے بھی ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، تاکہ ان قضاء نمازوں کے ادا کرتے کرتے وقتیہ نماز کے فوت ہو جانے کی نوبت نہ آجائے، اور اگر فائتہ نماز کو پہلے پڑھ لیا تو بھی جائز ہوگا کیونکہ اس کو تنگی کی حالت میں پہلے پڑھنے سے منع کرنے کی وجہ وہ ہے جو اس میں نہیں ہے بلکہ غیر میں ہے بخلاف اس صورت کے جب کہ وقت میں گنجائش موجود ہو پھر بھی وقتیہ کو مقدم کر دیا ہو کہ اس صورت میں جائز نہ ہوگا، کیونکہ اس نے وقتیہ کو ایسے وقت میں ادا کیا ہے جو اس کے اس اصلی وقت سے پہلے ہے جن کا حدیث سے ثبوت ہوا ہے۔

توضیح:-فائتہ نماز کے ذمہ میں باقی رہتے ہوئے وقتیہ کو ادا کرنا جب کہ وقت کے نکل جانے کا خوف ہو، اور اس صورت میں جب کہ وقت میں گنجائش ہو

ولو خاف فوت الوقت، يقدم الوقتية، ثم يقضيها، لان الترتيب يسقط بضيق الوقت......الخ
اگر وقت کے نکل جانے کا خوف ہو تو پہلے وقتیہ کو ادا کرے پھر چھوٹی ہوئی نماز کو قضاء کرے ف اس پر اجماع ہے، ع، مثلاً عشاء کی نماز قضاء ہو گئی، اور فجر کا وقت بھی اتنا تھوڑا سا باقی رہا کہ عشاء کی نماز پڑھ کر فجر پڑھنے کا وقت نہیں ملیگا بلکہ آفتاب

طلوع ہو جائیگا تو ایسی صورت میں فجر ہی کی نماز پہلے پڑھ لے۔ لان الترتیب الخ کیونکہ (۱) وقت کے تنگی کی وجہ سے ترتیب ختم ہو جاتی ہے، (۲) اسی طرح سے بھول جانے سے بھی (۳) اسی طرح قضاء نمازوں کی زیادتی کی وجہ سے بھی ترتیب ختم ہو جاتی ہے تاکہ وقتیہ کے بھی چھوٹ جانے اور قضاء ہو جانے کا خطرہ نہ رہے، ف کتنی تعداد میں قضاء جمع ہو جانے سے انسان سے ترتیب کا وجوب ختم ہو جاتا ہے، تو ان کی تعداد چھ یا اس سے زیادہ، اس کے ساقط ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ بات فرض قطعی ہے کہ وقتیہ کو جان بوجھ کر دیر کر کے یا قضاء کر کے نہیں پڑھنا چاہئے، اور فوت شدہ کو پہلے پڑھنا یہ فرض عملی ہے، ایسی صورت میں جب کہ وقت بالکل تھوڑا سا رہ جائے یا چھوٹی ہوئی نمازیں بہت سی باقی رہ گئی ہوں اتنی تعداد میں کہ ان کو ادا کرتے کرتے وقتیہ کے بھی فوت ہو جانے کا ڈر ہو جائے تو فرض قطعی کو فرض عملی سے پہلے ادا کرنا ضروری ہوگا، بندہ مترجم کو اس عبارت کا یہی مطلب سمجھ میں آیا ہے، میں نے کسی بھی شارح کو اس موقع پر اس بحث میں پڑتے ہوئے نہیں پایا ہے، واللہ اعلم۔ م۔ اگر فوت شدہ نمازیں تین چار وقتوں کی ہوں اور وقت میں اتنی گنجائش نہ ہو کہ ان سبھوں کو پڑھ لینے کے بعد بھی وقتیہ نماز پڑھی جا سکے تو قول اصح یہ ہے کہ وقتیہ پہلے پڑھی جائے، المجتبی۔ مگر اس تصحیح میں نظر اور تامل ہے۔ م۔

پھر وقت کی تنگی کا اعتبار غالب گمان سے ہونا کافی ہے یا حقیقۃ تنگ ہونا ضروری ہے، یعنی وقتیہ کے ادا کر لینے کے بعد کسی کو یہ معلوم ہوا کہ وقت کی تنگی کا جو خطرہ تھا وہ غلط تھا یعنی اس وقت قضاء اور ادا تمام نمازیں پڑھی جا سکتیں تھیں، تو فتاوی الحجہ اور التبیین اور المجتبی میں ہے کہ حقیقۃً تنگی کا اعتبار ہوگا لہذا جو وقتیہ نماز پڑھی جا چکی ہے وہ بے اعتبار ہو گئی، پھر اگر اتنا وقت باقی رہ گیا ہو کہ عشاء اور فجر ادا کر سکتے ہیں تو پہلے عشاء کی بعد میں فجر کی نماز پڑھ لینی چاہئے اور اس سے پہلے کی پڑھی ہوئی فجر نماز باطل سمجھی جائیگی، اور اگر اب یہ گمان ہوا کہ صرف وقتیہ یعنی فجر ہی کا وقت باقی رہ گیا ہے اس خیال سے پھر فجر ادا کی مگر دوبارہ معلوم ہوا کہ یہ گمان بھی غلط تھا کیونکہ وقت میں گنجائش پہلے زیادہ تھی تو پھر فجر باطل ہو گئی، پھر اسی طرح ادا کرتا جائے یہاں تک کہ اگر دونوں نمازوں کے لئے وقت ہو یا بالترتیب ادا کرے، اور اگر صرف وقتیہ پڑھنے کا ہی احتمال باقی رہ جائے تو وہی پڑھے، لیکن اگر بعد کو گمان غلط ثابت ہو جائے تو پھر باطل ہو جائیگی، فتح القدیر اور بحر الرائق میں اسی قول کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ کسی فرض کو ادا کر لینے کے بعد اسے باطل کرنے کے لئے کسی قطعی دلیل کا ہونا ضروری ہے، اور یہ ترتیب تو ایسی ضروری چیز ہے جو قطعی نہیں ہے بلکہ اس کے ساقط ہونے کا ہر وقت احتمال باقی رہتا ہے تو زیادہ راجح صورت یہ تھی کہ اس مسئلہ میں غالب گمان پر بنیاد رکھنی چاہئے تھی چنانچہ مصنفؒ کے کلام سے اسی بات کا پتہ بھی چلتا ہے لیکن جزوی روایتیں اسکے مخالف ہیں، اور بہت ممکن ہے کہ شیخ ابن الہمامؒ نے وہاں ترتیب کے مستحب ہونے کو زیادہ راجح کہا ہے اور اس مسئلہ میں ترتیب کے صرف فرض ہونے کے سلسلہ کے مسائل بیان کئے ہیں، پھر وقت کی تنگی اور وسعت میں مستحب وقت کا اعتبار کرنا ہوگا اس دلیل سے کہ اگر کسی نے عصر کی نماز پڑھنی شروع کی اتنے میں ظہر کا نہ پڑھنا اور ذمہ میں باقی رہنا یاد آگیا ساتھ ہی آفتاب کی روشنی میں زردی بھی مائل ہو چکی ہے تو اسے چاہئے کہ نیت باقی نہ کرے اور عصر کی نماز پوری کر لے یہ اسی بات پر صریح دلیل ہے کہ مستحب وقت کا اعتبار ہے ورنہ عصر کی نیت باطل کر دینی چاہئے تھی، قاضی خان میں ہے کہ وقت کی تنگی کا اعتبار شروع کے وقت ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر ظہر کی قضاء کا ہونا یاد ہو اس کے باوجود عصر کی نماز شروع کر دی اور نماز باطل کر دی اتنی کہ وقت تنگ ہو گیا تو اس کا اعتبار نہیں ہے اور عصر کی پڑھی ہوئی نماز جائز نہ ہوگی البتہ اگر اسے تنگی کے وقت میں نیت توڑ کر باطل کر دے تو پھر سے نماز شروع کر کے پڑھے۔ مع۔

ولو قدم الفائتة جاز، لان النهی عن تقدیمها لمعنی فی غیرها......الخ

اور اگر نمازی نے وقت کی تنگی کے باوجود فائتہ کو بھی پہلے پڑھ لیا تو بھی نماز جائز ہو جائیگی، ف یعنی فائتہ نماز ادا ہو جائیگی، ساتھ ہی وقتیہ نماز کے وقت کو کھونے کا اس پر گناہ لازم ہوگا، حاصل یہ ہے کہ ایسا کام کرنا حرام ہے اس کے باوجود پڑھی

ہوئی قضاء نماز صحیح ہوگی. لان النهی الخ کیونکہ ایسی تنگی کی حالت میں فائتہ کو پہلے پڑھ دینے سے جو ممانعت ہے وہ ایسے معنی کی وجہ سے ہے جو کسی غیر شیء میں ہے، ف یعنی وقتیہ کو کھونا، لہذا وقتیہ کو کھونے سے چھوٹی ہوئی نماز کی ادائیگی میں کچھ نقصان نہیں ہوا البتہ وقتیہ کو کھونے سے اس پر بڑا گناہ لازم آیا، تو یہ دوسری بات ہے۔

بخلاف ما اذا کان فی الوقت سعة، وقدم الوقتیة حیث لایجوز، لانه اداها قبل وقتها......الخ

بخلاف اس صورت کے جب وقت میں گنجائش ہو اس کے باوجود وقتیہ کو پہلے پڑھ لیا تو یہ نماز صحیح نہ ہوگی، لانه اداها الخ کیونکہ اس نے وقتیہ کو ایسے وقت میں ادا کیا ہے جو اس کے لئے حدیث سے ثابت شدہ مقررہ وقت سے پہلے ہے، ف یعنی حدیث کی روشنی میں تو وقتیہ کے لئے وہ وقت ہے جو فائتہ کے ادا کر لینے کے بعد ہو، جیسے عرفات میں عصر و ظہر جمع کرنے میں عصر کا وہ وقت ہے جو فرض ظہر پڑھ کر ہو یہاں تک کہ اگر کوئی عصر پڑھ کر ظہر پڑھے گا تو نماز جائز نہ ہوگی، اسی طرح فائتہ سے پہلے وقتیہ پڑھنے کا وقت ہی نہیں ہے، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہوا ہے، اس جگہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ وقتیہ کے اوقات تو قرآن پاک یا حدیث متواتر سے ثابت ہیں ایسی صورت میں خبر واحد سے اس کا منسوخ ہونا لازم آتا ہے جو صحیح نہیں ہوتا ہے، اس کا جواب نہایہ میں اس طرح دیا گیا ہے کہ ترتیب فائتہ کے سلسلہ کی حدیث خبر واحد نہیں بلکہ خبر مشہور ہے۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ دعوی مردود ہے کیونکہ اس کے مرفوع ہونے ہی میں تو شک ہے اس لئے یہ اس مشہور کس طرح ہو سکتی ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کے صحیح جواب کے لئے وہی تحقیق صحیح ہے جو پہلے گذر چکی ہے، یعنی مثلاً ظہر کی نماز کے بعد عصر کی نماز کو پڑھنا قرآن اور حدیث متواتر سے ثابت ہے، اور جب ظہر کی نماز اپنے وقت سے قضاء ہو کر عصر کے وقت میں آگئی کیونکہ بہر صورت اسے ادا کرنا تو ضروری ہے اس لئے وقت کی وہ ترتیب تو ختم ہوگئی لیکن افعال اور اعمال کی ترتیب کو باقی رکھنا تو اب بھی اس کے لئے ممکن ہے اس بناء پر اس پر عمل کرنا بھی واجب ہوا البتہ اس صورت میں جب کہ یہ بھی ممکن نہ ہو مثلاً وقت میں صرف عصر کی نماز پڑھی جا سکتی ہو تو ترتیب بالکل ساقط ہو جائیگی، لیکن اس جگہ اصل بحث میں تو بات ہے کہ وقت میں دونوں کے پڑھنے کی گنجائش ہو ایسی صورت میں عملی ترتیب لازم ہے، اور ظہر کی قضاء نماز پڑھنے میں جتنا بھی وقت لگا وہ وقت اگر چہ بظاہر عصر کا وقت تھا لیکن باطن میں وہ عصر کی ادا سے خارج ہوا لہذا اس وقت میں عصر کی اداء صحیح نہ ہوئی بلکہ صحیحین کی حدیث اور اس کتاب کی حدیث سے جو دار قطنی کی روایت سے ہے معلوم ہوا کہ یہ وقت بھی ظہر کا وقت ہے اس اعتبار سے کہ یاد آتے ہی بجالانا اس کے ادا کرنے کے درجہ میں ہے، اسی لئے فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر قضاء کا ذمہ میں باقی ہونا بالکل ہی یاد نہ ہو تو اس وقت عصر کی نماز صحیح ہوگی۔

اس بیان سے یہ بات بھی ظاہر ہوئی کہ قصداً چھوڑنے اور غفلت سے چھوٹ جانے میں کیا فرق ہے، کہ عمداً چھوڑنے سے اس چھوڑنے کا گناہ ذمہ میں باقی رہے گا، اور غافل شخص نے جاگنے کے ساتھ ہی ادا کر لی تو گناہ معاف ہے، اس سے یہ بات بخوبی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر مصنفؒ دلیل کو ان الفاظ میں **لانه اداها فی وقت لهالم یسعها اداء بشغله بغیرها** میں فرماتے تو مطلب بہت ہی واضح ہو تا یعنی اس نے وقتیہ کو وقتیہ کے ایسے وقت میں ادا کیا جو اس کے ادا کی گنجائش نہیں دیتا تھا اس وقت کے دوسری نماز کے افعال میں مشغول ہونے کی وجہ سے، اس لئے کہ یہ وقت تو حقیقت میں عصر ہی کا ہے مگر اس میں عصر کی اداء جائز نہیں سمجھی گئی ہے کیونکہ فرضیت ترتیب افعال سے وہ قضاء کے افعال کے لئے کر دیا گیا ہے، اچھی طرح مسئلہ سمجھ لیں۔ م۔

چند ضروری مسائل

دیوانہ کی دیوانگی ختم ہونے کے بعد اس پر دیوانگی کی حالت کی قضاء لازم نہیں آتی ہے جیسے کہ مرتد پر حالت ارتداد کے۔ اور دار الکفر کے مسلمانوں پر جب تک کہ انہوں نے نماز کے واجب ہونے کو کسی سے سیکھا یا جانا ہو۔ بغیر نشہ کے بے ہوش پر جب کہ

ایک رات اور دن سے زیادہ بیہوش رہا ہو۔ اور مریض پر جب کہ اسے اشارہ سے پڑھنے کی بھی طاقت نہ تھی۔ قضاء واجب نہ ہو گی۔ مسافر پر حالت سفر کی قضاء دو رکعتیں اور حالت حضر کی قضاء چار رکعتیں ہیں، البحر۔

کسی نے وضوء کا خیال رکھ کر ظہر کی نماز پڑھی پھر وضوء کر کے عصر کی نماز پڑھی پھر اسے خیال آ گیا کہ ظہر نماز کے وقت وضوء نہ تھا اور بغیر وضوء کے نماز پڑھ لی ہے تو بھولنے کے حکم کے مطابق اس کی ترتیب اس کے ذمہ سے ساقط سمجھی جائیگی۔ اور اب صرف ظہر کی قضاء کرے بخلاف عرفہ کے میدان کی نماز کے، محیط السرخسی۔

اگر جمعہ میں فجر کی قضاء یاد آئی اب اگر اسے یہ امید ہو کہ پہلے فجر کی قضاء نماز پڑھ کر جمعہ کی نماز اسے مل سکتی ہے تو بالاتفاق نماز ختم کر کے ایسا ہی کر لے، اور اگر جمعہ کی نہیں بلکہ ظہر کی مل سکتی ہے تو بھی شیخین کے نزدیک ایسا ہی کرے۔ لیکن امام محمدؒ کا اس میں اختلاف ہے، اور اگر ظہر بھی نہیں مل سکتی ہو تو بالاجماع جمعہ کی نماز پوری کرے، السراج۔

اگرچہ وقت تنگ رہ گیا ہو پھر بھی اتنی امید ہو کہ قضاء نماز پڑھ کر وقتیہ کو بھی مختصر قراءت اور افعال کے ساتھ پڑھ سکتا ہے تو ایسی صورت میں ترتیب کا خیال رکھنا ضروری ہے اور اسی قدر مختصر نماز پڑھ لے جس سے نماز جائز ہو جاتی ہو، التمرتاشی۔ اگر وقت کی تنگی یا بھول جانے کی وجہ سے ترتیب ساقط ہو گئی پھر وقت میں وسعت پالی اور اس وقت قضاء نماز یاد آ گئی تو بالاتفاق اس کی ترتیب لوٹ جائیگی، الاشباہ والنہر بحوالہ درایہ۔ جب تک انسان نماز کو بھولا ہوا ہو اس کی ترتیب ساقط رہتی ہے لیکن یاد آتے ہی ترتیب لازم ہو جاتی ہے۔ الخلاصہ۔

ولو فاتته صلواتٌ رتبها في القضاء كما وجبت في الاصل، لان النبي عليه السلام شغل عن اربع صلوات يوم الخندق، فقضاهن مرتبا، ثم قال صلوا كما رأيتموني اصلي، الا ان يزيد الفوائت على ستة صلوات، لان الفوائت قد كثرت، فتسقط الترتيب فيما بين الفوائت بنفسها كما يسقط بينها وبين الوقتيه، وحد الكثرة ان تصير الفوائت ستا بخروج وقت الصلاة السادسة، وهو المراد بالمذكور في الجامع الصغير وهو قوله.

ترجمہ:- اگر کسی کی کئی نمازیں چھوٹ گئی ہوں تو وہ ان کی قضاء کرتے وقت انہیں ترتیب سے ادا کرے جیسا کہ اصل میں واجب ہوئی ہوں، اس لئے کہ غزوہ خندق میں رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں چھوٹ گئی تھیں، تو آپ نے انہیں ترتیب کے ساتھ ادا کیا تھا، اس کے بعد آپ نے یہ بھی فرمایا کہ تم لوگوں نے مجھے جس طرح پڑھتے ہوئے دیکھا ہے اس طرح تم بھی پڑھا کرو، مگر اس وقت جب کہ فائتہ نمازیں چھ سے زیادہ ہو جائیں کیونکہ فائتہ نمازیں زیادہ ہو گئی ہیں اس لئے خود ان فائتہ نمازوں میں بھی ترتیب ساقط ہو گئی، جیسا کہ فائتہ اور وقتیہ کے درمیان ترتیب ساقط ہو جاتی ہے، اور زیادتی کی حد یہ ہے کہ فائتہ چھ ہو جائیں چھٹی نماز کے وقت کے نکلتے ہی، جامع صغیر میں مذکور ہے اس کی یہی مراد ہے، اور وہ یہ ہے (جو آئندہ آئیگی)۔

توضیح:- اگر کئی نمازیں چھوٹ گئی ہوں تو ان کے پڑھنے کے ترتیب کا ہونا، ترتیب کا ساقط ہونا، لوٹ آنا، حدیث سے دلیل، ترتیب کا ساقط ہونا

ولو فاتته صلواتٌ رتبها في القضاء كما وجبت في الاصل، لان النبي عليه السلام شغل عن......الخ

اگر کسی کی کئی نمازیں فوت ہو گئیں تو ان کی قضاء کرتے ہوئے اسی ترتیب سے قضاء کرے جیسے کہ اصل میں واجب ہوئی ہیں۔ لان النبی علیہ السلام الخ اس دلیل سے کہ رسول اللہ ﷺ خندق کی لڑائی کے موقع پر جو کہ پانچویں ہجری میں کفار سے ہوئی تھی چار نمازیں وقت پر ادا نہ فرما سکے یہاں تک وہ سب قضاء ہو گئیں بعد میں آپ نے انہیں اسی ترتیب سے ادا کیا جس ترتیب سے وہ قضاء ہوئی تھیں، ف جیسا کہ امام احمدؒ و ترمذی اور نسائی نے حضرت ابن مسعودؓ سے اور نسائی و ابن حباب نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے حدیث نقل کی ہے، اور حضرت ابو سعیدؓ کی حدیث میں ہے کہ اس وقت تک یہ حکم نازل نہیں ہوا تھا، ﴿فَإِنْ

خفتم فرجالاً او رکباناً﴾ یعنی جب کافروں کی طرف سے اچانک حملہ کا خوف ہو تو پیادہ پا اور سوار نماز پڑھو۔

الحاصل اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ نے بالترتیب نماز قضاء کر کے دکھادی، جس میں اس میں دونوں باتوں کا احتمال ہے کہ یہ طریقہ واجب ہو یا مستحب پھر فرمایا صلوا کما الخ کہ رسول اللہ ﷺ نے تصریح کے ساتھ اس حکم میں فرمادیا ہے کہ تم نے مجھے جس طرح مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے تم بھی اسی طرح پڑھا کرو، جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت مالک بن الحویرثؓ کی حدیث میں ہے پس ان دونوں حدیثوں کے مجموعہ سے یہ بات حاصل ہوئی کہ اس طرح ترتیب کے ساتھ پڑھنا واجب تھا کیونکہ اس میں صلو ہے جو امر کا صیغہ ہے اور وہ وجوب کے لئے ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ مصنفؒ کے اس قول ثم قال سے زبردست شبہ اس بات کا ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی حدیث ہے، اگر وہ اس طرح فرمادیتے وقد قال تو وہ شبہ پیدا نہ ہوتا، اس موقع پر ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ آپ نے نماز میں جتنے کام کر کے دکھائے ہیں ان میں ہر کام کا واجب ہونا ضروری نہیں ہے، اسی بناء پر ان میں کی سنتیں، آداب اور نوافل اپنی جگہ رہیں وہ واجب نہیں ہوئیں، بلکہ جو واجب رہیں، اس بناء پر ترتیب کا واجب ہونا ثابت نہ ہو سکا، خلاصہ فتح القدیر۔

اگر کسی کے ذمہ ایک سے زیادہ فائتہ نمازیں باقی ہوں اور وقت میں وقتیہ کے علاوہ بقیہ نمازوں میں سے چند کے پڑھ لینے کی گنجائش موجود ہو تو جب تک ان چند نمازوں کو وہ نہ پڑھ لے گا وقتیہ کو پڑھنا صحیح نہ ہوگا، مثلاً فجر کی نماز کے وقت یہ بات یاد آئی کہ اس نے عشاء اور وتر کی نماز نہیں پڑھی ہے وہ باقی رہ گئی ہیں اور وقت میں اندازہ سے صرف پانچ رکعتوں کے پڑھنے کی امید اور گنجائش ہو تو وہ پہلے وتر کی تین رکعتیں پڑھ لے اس کے بعد صبح کی دو رکعتیں پڑھ لے، پھر آفتاب نکل جانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھ لے، اور اگر عصر کے وقت فجر اور ظہر کی قضاء یاد آئی تو پہلے ان دونوں کی قضاء کرے اس کے بعد عصر کی پڑھ لے لیکن اس وقت میں صرف آٹھ رکعتوں کے ہی پڑھنے کی امید ہو تو ظہر اور عصر کی پڑھ لے، اور اگر صرف چھ رکعتوں کے پڑھنے کی گنجائش ہو تو فجر اور عصر کی نمازیں پڑھ لے۔ قاضی خان۔ اور اگر تمام چھوٹی ہوئی نمازوں کو وقتیہ کے ساتھ پڑھنے کی گنجائش ہو تو ترتیب وار قضاء ادا کرنے کے بعد وقتیہ کو ادا کرے، اس طرح ترتیب ساقط نہیں ہوگی۔

الا ان یزید الفوائت علی ستة صلوات، لان الفوائت قد کثرت، فتسقط الترتیب......الخ

مگر جب کہ فوت شدہ بڑھ کر چھ تک ہو جائیں، ف تو اب زیادہ کی تعداد تک پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی ترتیب ساقط ہو جائیگی، یہی صحیح قول ہے، محیط السرخسی، **لان الفوائت الخ** کیونکہ قضاء نمازیں کثرت تک پہونچ چکی ہیں، **فتسقط الخ** تو خود قضاؤں کے درمیان ترتیب ساقط ہو جائیگی، جیسا کہ فائتہ اور وقتیہ نمازوں میں ترتیب ساقط ہو جاتی ہے۔

وحد الکثرة ان تصیر الفوائت ستا بخروج وقت الصلاة السادسة......الخ

اور کثرت کی حد یہ ہے کہ قضاء نمازیں (اعتقادیہ۔ وتر نہیں۔ ت)۔ **ستا یخروج الخ** کہ وہ عدد چھٹے وقت کے نکلنے کے ساتھ ہے، ف یہاں تک کہ پانچ اعتقادی فرض نمازوں کے علاوہ ایک اور فرض کے وقت کے نکل جانے ساتھ قضاء ہو جائیں تو ترتیب ساقط ہو جائیگی، یہی مراد ہے اس عبارت کی جو فی الجامع الخ میں مذکور ہے وہ عبارت وہی ہے جو ف مصنفؒ نے لکھی ہے۔ (آئندہ)۔

وان فاتته اکثر من صلوات یوم ولیلة، اجزأته التی بدأ بها، لانه اذا زاد علی یوم ولیلة، تصیر ستا، وعن محمدؒ انه اعتبر دخول وقت السادسة، والاول هو الصحیح، لان الکثرة بالدخول فی حد التکرار، وذلک فی الاول.

ترجمہ:- اور اگر کسی کی ایک دن اور ایک رات سے زیادہ کی نمازیں فوت ہو گئی ہوں تو اس نے جس نماز سے شروع کی تھی وہ جائز ہو جائیگی، کیونکہ وہ جب ایک دن اور رات سے زیادہ ہو جائیگی تو وہ چھ کی تعداد میں ہو جائیگی، امام محمدؒ سے ایک رایت یہ بھی

ہے کہ اس میں چھٹے وقت کے داخل ہونے کا اعتبار ہوگا، لیکن پہلا قول جو بیان کیا جاچکا ہے وہی صحیح ہے، کیونکہ کثرت تو حد تکرار میں داخل ہونے سے ہوتی ہے، اور یہ بات پہلے قول میں پائی جاتی ہے (چھٹے وقت کا نکل جانا)۔

توضیح :-زیادتی کی وہ حد جس سے فائتہ کے درمیان ترتیب ختم ہو جاتی ہے

وان فاتته اكثر من صلوات يوم وليلة، اجزأته التي بدأ بها، لانه اذا زاد على يوم وليلة......الخ

اگر فوت ہو گئیں کسی کی ایک دن اور ایک رات کی نمازوں سے زیادہ تو اس کی وہ نماز جائز ہو جائیگی جس سے اس نے ابتداء کی تھی، ف اس طرح اس سے چھ نمازیں مراد ہوئیں، لانه اذا زاد الخ کیونکہ جب ایک دن اور ایک رات سے زیادہ فوت ہوگی تو وہ چھ ہو ہی جائیں گی۔

وعن محمدؒ انه اعتبر دخول وقت السادسة، والاول هو الصحيح......الخ

اور امام محمدؒ سے ایک روایت یہ بھی آئی ہے کہ انہوں نے چھٹی نماز کے داخل ہونے کا اعتبار کیا ہے، ف اس کے نکلنے کے وقت کا اعتبار نہیں کیا ہے - مگر صرف داخل ہونے سے قضا نہیں ہو سکتی ہے جب تک کہ اس کو ادا کئے بغیر وقت ختم نہ ہو جائے، اسی لئے کہا ہے۔ والاول الخ پہلا قول ہی صحیح ہے، ف چھٹی وقت کے بغیر ادا کئے نکل جانے کا اعتبار ہوتا ہے، ف جب کہ چھٹی کا وقت بغیر ادا کئے ہوئے نکل جائے تو دن رات کی پانچ نمازوں کے بعد چھٹی نماز کا وقت دوبارہ آجانے سے کل چھ ہو جائیگی۔ م۔ اس سلسلہ میں ایک معتبر قول یہ ہے کہ جب سے نماز چھوٹنی شروع ہوئی ہے اس وقت سے درمیان کے چھ اوقات ہونے چاہئے اگرچہ فائتہ کے بعد کی نمازوں کو اپنے اوقات میں ادا پڑھ چکا ہو، اور بعضوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اس میں معتبر قول یہ ہے کہ قضاء نمازیں مجموعۃً چھ ہو گئی ہوں اگرچہ وہ متواتر نہ ہوں بلکہ متفرق طور پر ہوں۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ ظاہر ہوگا کہ جب کسی نے مثلاً تین نمازیں چھوڑدیں اس طرح سے کہ ایک دن کی ظہر اور ایک دن کی عصر اور ایک دن کی مغرب لیکن یہ تینوں دن ترتیب وار نہ ہوں اور یہ بھی معلوم نہ ہو کہ ان میں سے پہلی کون سی ہے، تو پہلے قول کے مطابق ترتیب ساقط ہو جائیگی، کیونکہ ان قضاء شدہ نمازوں کے درمیان جو اوقات پائے گئے وہ بہت زیادہ ہیں، اور دوسرے قول کے مطابق ترتیب ساقط نہ ہوگی کیونکہ ان قضاء شدہ نمازوں کی تعداد بذات خود چھ نہیں ہوئی ہیں لہٰذا وہ اس طرح پڑھے ظہر پھر عصر پھر ظہر پھر مغرب پھر عصر پھر ظہر۔ لیکن قول اول اصح ہے۔ التبیین۔

اور دوسرے قول میں احتیاط بہت زیادہ ہے۔ قاضی خان۔ اور یہی زیادہ راجح ہے۔ الفتح۔ اسی قول کو ابن الہمامؒ نے ترجیح دی ہے، اور کہا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب معلوم ہے کہ اگر کسی کو اپنے ذمہ کی قضاء یاد ہو اس کے باوجود اس نے تنگی وقت اور مجبوری کے بغیر وقتیہ پڑھ لی تو یہ نماز فاسد ہوئی مگر اس کا فساد ابھی ایک بات کے ہونے تک موقوف ہے کہ آئندہ کا حال دیکھا جائے کہ اگر اس نے آئندہ فائتہ کے یاد رہتے ہوئے مزید وقتیہ پانچ نمازیں پڑھ لیں اور چھٹی نماز کا وقت آگیا تو یہ سب صحیح ہو گئیں، اس بناء پر اس قول کے مطابق چھ اوقات کا تخلل نہیں پایا جاتا ہے الخ الفتح۔

اگر کسی نے ایک ماہ کی نماز نہیں پڑھی، اس کے بعد متواتر کافی دنوں تک پڑھتا رہا پھر اس نے ایک نماز چھوڑ دی اس طرح پہلی تمام چھوٹی ہوئی نمازیں قدیمہ کہلائیں اور وہ بالاتفاق ترتیب کو ذمہ سے ساقط کر دیتی ہیں، اور دوسری ایک چھوٹی ہوئی جدید یا نئی ہوئی، اس میں مشائخ کا اختلاف ہے، الکافی۔

ولو اجتمعت الفوائت القديمة والحديثة، قيل يجوز الوقتية مع تذكر الحديثة لكثرة الفوائت، وقيل لا تجوز، ويجعل الماضي كان لم يكن زجرا له عن التهاون، ولوقضى بعض الفوائت حتى قل مابقي، عاد الترتيب عند البعض وهو الاظهر، فانه روى عن محمدؒ فيمن ترك صلاة يوم وليلة، وجعل يقضي من الغد مع كل وقتية فائتة، فالفوائت جائزة على كل حال، والوقتيات فاسدة ان قدمها لدخول الفوائت في حد القلة، وان اخرها

فكذلك الا العشاء الاخير، لانه لا فائتة عليه في ظنه حال ادائها.

ترجمہ :-اگر بہت سی نمازیں ذمہ میں اکٹھی ہو گئیں جن میں پرانی اور نئی بھی ہیں تو کہا گیا ہے کہ وقتیہ نماز جائز ہو گی نئی قضاء کے یاد رہتے ہوئے بھی، چھوٹی ہوئی نمازوں کی زیادتی کی وجہ سے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وقتیہ جائز نہ ہو گی اور پچھلی نمازوں کو ایسا سمجھ لیا جائیگا کہ وہ گویا باقی نہیں رہیں اس کی سستی برتنے کی وجہ سے اس پر سرزنش کے طور پر، اور اگر چھوٹی ہوئی نمازوں میں سے اس نے کچھ پڑھ لیں یہاں تک کہ جو باقی رہیں وہ بالکل تھوڑی رہ گئیں تو بعض فقہاء کے نزدیک اس کی ترتیب لوٹ آئیگی، اور یہی قول اظہر ہے، کیونکہ امام محمدؒ سے اس شخص کے بارے میں روایت ہے جس نے ایک دن اور ایک رات نماز چھوڑ دی ہو، اس کے بعد دوسرے دن سے ہر وقتیہ نماز کے ساتھ ایک فائتہ بھی پڑھنے لگا تو اس کی تمام فائتہ نمازیں جائز ہو جائیگی ہر حال میں لیکن وقتیہ کو اگر پہلے پڑھ لیا ہو تو وہ سب فاسد ہو گی، فائتہ نمازوں کے حد قلت میں داخل ہو جانے کی وجہ سے، اور اگر انہیں مؤخر کر دیا تو بھی یہی حکم ہو گا سوائے عشاء کی نماز کے کیونکہ اس نماز کے ادا کرتے وقت اس کے اپنے گمان میں اس پر کوئی قضاء باقی نہیں رہی ہے۔

توضیح :-پرانی اور نئی قضاء نمازیں کسی کے ذمہ جمع ہو گئیں
قضاء نمازوں میں سے بعض کو ادا کیا یہاں تک کہ وہ چھ سے کم ہو گئیں

ولو اجتمعت الفوائت القديمة والحديثة، قيل يجوز الوقتية مع تذكر الحديثة......الخ

اگر پرانی اور نئی قضاء مل کر بہت سی جمع ہو گئیں تو ایک قول کے مطابق ان نمازوں کے یاد رہتے ہوئے بھی وقتی نمازوں کو ادا کر لینا جائز ہے، کیونکہ قضاء نمازوں کی تعداد زیادہ ہو چکی ہے، ف اسی قول پر فتوی بھی ہے۔ الکافی۔ یہی قول اصح ہے، المحیط، وقیل الخ اور دوسرا قول یہ بھی ہے کہ نئی قضاء نمازوں کے یاد رہتے ہوئے وقتیہ جائز نہ ہو گی، الکافی۔

ويجعل الماضي كان لم يكن زجرا له عن التهاون......الخ

اور پرانی قضاء نمازوں کو اس کی ادائیگی میں لاپروائی اور سستی کرنے کے جرم میں دھمکی اور زجر کے طور پر ذہن سے بھلا دیا جائیگا، ف یہی قول اصح ہے، المجتبی، اس طرح اصل میں ترتیب ساقط کر دی گئی ہے، لیکن زجر و توبیخ کے طور پر استحسانا ناجائز ہونے کا حکم دیا جائے، م۔

ولو قضى بعض الفوائت حتى قل مابقي، عاد الترتيب عند البعض......الخ

اور اگر قضاء نمازوں میں سے کچھ ادا کرنے کی وجہ سے باقی تعداد میں کم ہو گئیں، ف یعنی کثرت کی مشروط حد کم ہو گئی یعنی تعداد میں چھ سے کم رہ گئیں تو قول اصح یہ ہے کہ ترتیب نہیں لوٹے گی۔ الخلاصہ۔ اور امام ابو حفص الکبیرؒ نے فرمایا ہے کہ اسی پر فتوی ہے، المحیط، وعاد الترتيب الخ بعض کے نزدیک ترتیب لوٹ آئیگی۔

وهو الاظهر فانه روى عن محمدؒ فيمن ترك صلاة يوم وليلة، وجعل يقضي من الغد......الخ

یہی قول زیادہ ظاہر ہے، ف یعنی دلیل کے اعتبار سے بھی اور روایت کے اعتبار سے بھی یہی اظہر ہے۔ ع۔ کیونکہ کثرت تو اس مجبوری سے ترتیب کو ساقط کرنے والی تھی کہ ان کے ادا کرنے میں وقتیہ کو بھی کرنا لازم آتا ہے۔

فانه روى عن محمدؒ فيمن ترك صلاة يوم وليلة، وجعل يقضي من الغد مع كل وقتية فائتة......الخ

تو امام محمدؒ سے روایت ہے ایسے ایک شخص کے بارے میں جس نے ایک دن رات کی نماز قضاء کی وجعل الخ اور اس نے دوسرے دن سے ہر وقتی نماز کے ساتھ ایک قضاء نماز بھی پڑھنی شروع کی تو فالفوائت الخ قضاء نمازیں بہر حال جائز ہیں، ف خواہ انہیں وقتیہ سے پہلے پڑھے یا بعد میں۔ والوقتيات الخ اگر وقتیہ نمازوں کو قضاء نماز سے پہلے پڑھ لے گا تو وہ فاسد

ہو جائیں گی کیونکہ فائتہ نمازیں تو تعداد میں کم ہو چکی ہیں، ف اس لئے ان سے پہلے کوئی بھی وقتیہ ادا نہ ہو گی۔

وان اخرها فكذلك الا العشاء الاخير، لانه لا فائتة عليه فی ظنه حال ادائها......الخ

اور اگر وقتیہ کو فائتہ کے بعد پڑھے تو بھی فاسد ہو گی، ف کیونکہ دوسری فائتہ تو ابھی بھی باقی ہیں، جو اس بات کی مستحق ہیں کہ ترتیب کے لازم ہونے کی وجہ سے پہلے پڑھی جائیں، م۔ الاالعشاء الخ سوائے عشاء اخیر یعنی عشاء کے (کہ مغرب کو عشاء اول بھی کہا جاتا ہے) ف کہ عشاء فاسد نہ ہو گی، لانہ لا فائتۃ الخ کیونکہ اس کے گمان کے مطابق اس کے ادا کرنے کے وقت اس پر کوئی قضاء نماز باقی نہیں ہے، ف اور اس کا یہ گمان معتبر بھی ہے، جیسے کسی نے ظہر کی نماز پڑھی اس حال میں کہ اسے فجر نماز کا باقی رہ جانا یاد بھی تھا اس لئے اس کی ظہر کی نماز فاسد ہو گی پھر فجر کی نماز قضاء کی اور عصر کی نماز پڑھ لی حالانکہ اسے ظہر کا باقی رہنا یاد ہے تو عصر کی نماز جائز ہو گی. کیونکہ اس کے ادا کرتے وقت اس کے گمان میں کوئی نماز باقی نہیں ہے، التبیین۔

اس مسئلہ سے اس طرح استدلال کیا گیا ہے کہ جب پہلے دن فجر سے عشاء تک کی نمازیں قضاء کی نیت سے پڑھ لیں اور دوسرے دن فجر کی نماز کے ساتھ فجر کی بھی قضاء کی تو یہ وقتیہ بہر حال فاسد ہو گی اس بناء پر اب کل فوت شدہ نمازیں تعداد میں چھ ہو گئیں، اس لئے ترتیب ساقط ہو گئی، پس ظہر کے وقت خواہ وقتیہ کو پہلے پڑھے یا پیچھے پڑھے نماز جائز ہو گی، لیکن ناجائز ہونے کی وجہ یہی ہو گی کہ ظہر پڑھ لینے سے پھر پانچ رہ جائیگی، اور ترتیب لازم آجائیگی، اس سے معلوم ہوا کہ تعداد میں کمی آجانے سے ترتیب لازم آتی، ابن الہمامؒ نے اعتراض کیا ہے کہ ترتیب ساقط نہیں ہوئی تھی، کیونکہ چھٹی نماز کے نکل جانے سے ترتیب ساقط ہوتی لیکن اس سے پہلے اس نے ایک قضاء نماز پڑھ لی ہے اس لئے فی الحال پانچ ہی باقی رہ گئی ہیں، پھر یہ بھی کہا یہ مسئلہ تو بطور گواہی کے ہے، اس لئے ہم نے یہ فرض کر لیا کہ اس موجودہ مسئلہ میں متقدمین سے کوئی روایت منقول نہیں ہے، لیکن دلیل تو موجود ہے کہ قضاء کی زیادتی ہو جانے سے ترتیب کا وجوب ختم کر دیا جاتا ہے کہ بہت زیادہ قضاء نمازوں پڑھتے ہوئے وقتیہ نماز پڑھنے کا بھی وقت ختم نہ ہو جائے اور بالآخر وقتیہ نماز کو ادا کرنا ناممکن ہو جاتا، بلکہ وہ بھی قضاء ہو جاتی، اسی ایک مجبوری کی وجہ سے ایک واجب حکم یعنی ترتیب کے ساتھ ادا کرنا ساقط ہو گیا اب جب کہ یہ عذر باقی نہ رہا تو اس ترتیب کا حکم اپنی جگہ پر لازم آگیا۔

اب میں مترجم یہ کہتا ہوں کہ جو تحقیق فرضیت کی ترتیب کے موقع پر میں نے لکھی ہے اس میں غور کرنے سے بلاشبہ یہی قول معلوم ہوتا ہے کیونکہ فرض تو یہ ہے کہ پہلے قضاء کو بجالا کر ادا کا حکم بجالایا جائے لیکن زیادہ جمع ہو جانے کی وجہ سے وہ حکم رک گیا ہے، کسی دوسری مجبوری یا عذر کی وجہ سے نہیں رکا ہے اور جب عذر نہ رہا تو فرضیت کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی اور حکم لوٹ آیا، اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حکم کبھی ساقط نہیں ہوتا ہے، لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ فرض کا ساقط ہونا ایک دوسرے نص سے ہو گا، اور قضاء کی زیادتی کے وقت بلاشبہ دقت اور پریشانی ہو گی، لیکن یہ وقت ایک منصوص دلیل ختم کی گئی ہے، لہذا نص کا مقابلہ نص سے ہی ہوا ہے، اور جب وہ قضاء شدہ آہستہ آہستہ تھوڑی رہ گئیں تو حرج والی نص دوسرے کے لئے معارض اور مقابل نہ رہ سکی پس فرضیت کی نص پر حکم ہو گا، اور یہ کسی طرح بھی دفع کے قابل نہ رہی، واللہ تعالیٰ اعلم، م۔

اگر کسی نے ذمہ میں قضاء باقی رہنے نماز کو یاد آجانے کے باوجود ادا نہیں کیا بلکہ مؤخر کر دیا باوجودیکہ اس کی قضاء کر سکتا تھا اس کے متعلق اصل میں یہ حکم مذکور ہے کہ یہ مکروہ ہے، کیونکہ جس وقت وہ یاد آئی ہے وہی وقت اس کی ادائیگی کا صحیح وقت ہے، اور نماز کو ایسے وقت سے مؤخر کرنا بلا خلاف مکروہ، المحیط، بلکہ قطعاً حرام ہے، پھر مکروہ کی کیا وجہ ہوئی جس کی تحقیق اس مترجم نے اس سے پہلے لکھدی ہے، م۔

ومن صلى العصر وهو ذاكر انه لم يصل الظهر، فهي فاسدة الا اذا كان في آخر الوقت، وهي مسألة الترتيب وإذا فسدت الفرضية لايبطل اصل الصلاة عند ابی حنيفةؒ وابی يوسفؒ، وعند محمد تبطل، لان

التحریمة عقدت للفرض، فاذا بطلت الفرضیة بطلت التحریمة اصلا، ولھما انھا عقدت لاصل الصلوة بوصف الفرضیة، فلم یکن من ضرورة بطلان الوصف بطلان الاصل، ثم العصر یفسد فسادا موقوفا حتی لوصلی ست صلوات، ولم یعد الظھر، انقلب الکل جائزا، وھذا عند ابی حنیفة، وعندھما یفسد فسادا باتا لاجواز لھا بحال، وقد عرف ذلک فی موضعه.

ترجمہ:- جس شخص نے عصر کی نماز پڑھی یہ یاد رکھتے ہوئے کہ اس نے ظہر کی نماز نہیں پڑھی ہے تو یہ نماز فاسد ہوگی، مگر اس صورت میں صحیح ہوگی جب کہ وقت بالآخر ہو رہا ہو، اور یہ ترتیب کا مسئلہ ہے، اور جب کسی نماز کی فرضیت فاسد ہو جائے تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ اصل نماز باطل نہ ہوگی، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک باطل ہو جائیگی کیونکہ فرض ہی کی نیت سے تحریمہ باندھا گیا تھا، پس جب اس کی فرضیت باطل ہو گئی تو تحریمہ ہی باطل ہو گیا، اور ان دونوں یعنی شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ تحریمہ تو نفس نماز کے لئے باندھا گیا تھا اس طرح سے اس میں فرضیت کی صفت تھی لہٰذا وصف کے باطل ہو جانے سے اصل باطل قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں ہے، ثم عصر کی نماز جو فاسد ہو گی اس کا فساد موقوف ہو گا یعنی فوراً فاسد نہ ہو گی، یہاں تک کہ اگر چھ وقتوں کی نماز پڑھتا رہا مگر ظہر کی نماز دوبارہ نہیں پڑھی تو ساری نمازیں اب جائز ہو جائیگی، اور یہ حکم صرف امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک یہ سب مکمل طور پر اس طرح فاسد ہو جائیگی کہ ان میں جائز ہونے کا کسی حال میں احتمال بھی نہ رہے گا، اور یہ بات اپنی جگہ (باب الصلوۃ) میں پہلے بتا چکی ہے۔

توضیح:- ظہر کی نماز باقی رہ جانے کے خیال رہتے ہوئے بھی عصر کی نماز کسی نے پڑھ لی، اختلاف ائمہ، ان کے دلائل

ومن صلی العصر وھو ذاکر انه لم یصل الظھر، فھی فاسدة الا اذا کان فی آخر......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، **الا اذا کان الخ** مگر جب کہ عصر کے بالکل آخر وقت میں یہ یاد آئے، ف کہ اس وقت سے مستحب وقت تک صرف نماز عصر کی گنجائش ہو، اسی طرح اس صورت میں بھی کہ اس پر جو ترتیب لازم ہے یہ بات بھی نہ جانتا ہو جب بھی نماز عصر فاسد نہ ہو گی۔م۔

وھی مسألة الترتیب وإذا فسدت الفرضیة لایطل اصل الصلاة عند ابی حنیفة وابی یوسف......الخ

اور یہ تو وہی ترتیب کے واجب ہونے کا مسئلہ ہے، ف اس مسئلہ کو یہاں پر آئندہ مسئلہ کی تمہید کے طور پر ذکر کیا ہے یعنی **واذا فسدت الخ** اور جب ترتیب کے فرض ہونے کی وجہ سے عصر کی نماز فاسد ہو گئی تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ابھی توقف رہے گا (فساد کا فوری حکم نہیں ہوگا) کہ اگر اس کے بعد اور بھی پانچوں نمازیں فاسد کیں تو چھ کی کثیر تعداد جمع ہو جانے کی وجہ سے یہ ترتیب ساقط ہو جائیگی اور یہ عصر اور اس کے بعد کی پانچوں نمازیں سب صحیح ہو جائیگی، اور اگر پانچ کے درمیان ظہر کی نماز قضاء کر لی تو سب فاسد ہو کر نفل ہو جائیگی، اس تفصیل کی بناء پر ان شیخین میں اتنی بات میں تو اتفاق ہے کہ اصل نماز بہر صورت بالکل برباد نہ ہو گی، م.

وعند محمد تبطل، لان التحریمة عقدت للفرض، فاذا بطلت الفرضیة بطلت التحریمة......الخ

اور امام محمدؒ کے نزدیک اصل نماز ہی بے کار ہو گئی، ف یہاں تک کہ چھوٹی ہوئی نماز کے یاد آنے کے بعد اگر وہ قہقہہ مار دے تو وضوء نہیں ٹوٹے گا، ف **لان التحریمة الخ** اس دلیل سے کہ اس نے تو فرض نماز کے لئے باندھا تھا، پس جب اس کی فرضیت ختم ہو گئی تو تحریمہ بالکل جڑ سے ختم ہو گیا، ف لہٰذا یہ نماز ہی باقی نہ رہی، اس کا جواب یہ ہے کہ تحریمہ میں اوصاف مختلف ہوا کرتے ہیں یعنی کبھی فرض ہونے کا کبھی سنت ہونے کا تو کبھی نفل ہونے کا اسی بناء پر تحریمہ فرض اور تحریمہ سنت کہلاتا ہے تو جب اس

سے فرض یا سنت ہونے کی صفت مٹادی گئی تو کم از کم نفس تحریمہ تو باقی رہ گیا، اور وہی نفل ہونے کے لئے کافی ہے، اسی وجہ سے مصنفؒ نے لکھا ہے۔

ولهما انها عقدت لاصل الصلوة بوصف الفرضية، فلم يكن من ضرورة بطلان الوصف......الخ

اور شیخینؒ کے نزدیک یہ تحریمہ فرضیت کے وصف کے ساتھ اصل نماز کے لئے منعقد ہوا ہے، ف لہٰذا اس تحریمہ کے ساتھ فرضیت اس کا ایک وصف ہوا، فلم یکن الخ اس لئے وصف فرضیت کے باطل ہونے سے اصل تحریمہ کا باطل ہونا کوئی ضروری بات نہیں ہے، ف مگر جب کہ کوئی دلیل قائم ہو، اور یہاں کوئی دلیل بھی نہیں ہے، پھر اصل تحریمہ کے باقی رہنے پر ظاہری طور سے نماز کا پایا جانا ہی دلیل ہے۔ م۔ اسی طرح فرض ترتیب کے باب کے شروع میں حضرت ابن عمرؓ کی ذکر کی ہوئی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کیونکہ اس میں نماز کے پوری کرنے کا حکم ہے، ف، الحاصل شیخینؒ کے موافق عصر میں ظہر کی قضاء یاد آجانے کے بعد عصر کی فرض نماز کے ادا ہو جانے کا حکم تو ختم ہو گیا مگر اس کی اصل نماز باقی ہے۔

اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ختم ہونے یا فاسد ہونے کا حکم کیا بالکل قطعی فوری دیا گیا ہے یا ابھی اس میں کچھ توقف کرنا ہوگا، مسئلہ میں یہ دوسرا اختلاف ہے، چنانچہ اس موقع پر امام ابو یوسفؒ امام محمدؒ کے موافق ہیں اس بات میں کہ بالکل قطعی اور فوری فساد کا حکم دیا جائیگا، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک بات پر یہ فساد موقوف رہے گا، چنانچہ مصنفؒ نے فرمایا ہے:

ثم العصر يفسد فسادا موقوفا حتى لو صلى ست صلوات، ولم يعد الظهر......الخ

پھر عصر کی نماز جو مسئلہ مذکورہ میں فاسد ہوئی اس میں فساد کا توقف کے طور پر آیا ہے اور فوری طور پر نہیں آیا، ف یعنی اس کے فاسد ہو جانے کا فیصلہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس میں تھوڑا انتظار اور توقف ہے۔ حتی لو صلی الخ یہاں تک کہ اگر اس نے اس کے بعد اس عصر کو ملا کر چھ نمازیں اپنے اپنے وقت پر اداء کیں اور اس وقت تک ظہر کی قضاء نماز نہیں پڑھی تو نقلب الکل الخ یہ سب نمازیں بدل کر جائز ہو جائیگی، ف تو وہ پڑھی ہوئی عصر بھی ان کے ساتھ جائز ہو جائیگی۔

وهذا عند ابی حنيفةؒ، وعندهما يفسد فسادا باتا لاجواز لها بحال، وقد عرف ذلك فی موضعه......الخ

یہ حکم امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے، ف بطور قیاس کے نہیں بلکہ استحسان کے کیونکہ عصر کے بعد مغرب بھی قضاء نمازوں کے ساتھ پڑھی تو وہ بھی فاسد ہو گی مگر اس میں بھی جو فساد ہوگا اس میں بھی توقف کی ضرورت ہو گی، اسیطرح عشاء بھی، پھر دوسرے دن فجر و ظہر اور عصر پڑھی، تو اب کل چھ نمازیں ہو گئیں اور مغرب کا وقت آگیا تو سب نماز فاسد ہو جائینگی اور ترتیب کا حکم باقی نہ رہے گا، پس اول عصر سے رکھی گئی تو سب صحیح ہو گئیں، اور اگر چھ نماز ہونے تک نوبت نہیں پہنچی بلکہ اس کے بیچ میں ظہر میں قضاء نماز پڑھ لی تو عصر کی نماز قطعی طور سے ہو گئی۔

وعندهما يفسد فسادا باتا لاجواز لها بحال، وقد عرف ذلك فی موضعه......الخ

اور امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک پہلی عصر جو فاسد ہوئی اس کے فاسد ہونے پر قطعی فیصلہ کر لیا گیا، یعنی لاجواز لها الخ اب وہ کسی حال میں جائز نہ ہو گی، ف مگر امام محمدؒ کے نزدیک وہ بالکل بے کار ہوئی، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک وہ نفل ہو جائے گی، م۔ قد عرف الخ یہ بات تو اپنے مقام پر معلوم ہو چکی ہے، ف یعنی کتاب الصلوۃ مبسوط میں ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز چھوٹ گئی اور اس کے بعد کی پانچ وقت تک کی پانچ نمازیں اپنے اپنے وقت پر پڑھ لیں تو صاحبینؒ کے نزدیک پانچوں نمازیں فاسد ہوں گی، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ابھی ان کے بارے میں فیصلہ کرنا باقی ہے یعنی توقف کرنا ہے۔ ع۔ اس کے بعد اگر ایک وقتیہ پڑھ لی تو سب صحیح ہو جائیگی، اور اگر چھوٹی ہوئی قضاء نماز پڑھ لی تو سب یقینی طور پر فاسد ہو کر نفل ہو گئیں۔ م۔ شمس الائمہ نے فرمایا ہے کہ علماء کی یہی ایک پہیلی ہے کہ ایک ایسی نماز جو پانچ نمازوں کو فاسد کرتی ہے، اور ایک نماز ایسی ہے جو پانچ نمازوں کو صحیح کرتی ہے۔ مع۔

ولوصلی الفجر وهو ذاكر انه لم يوتر، فهي فاسدة عند ابی حنيفةؒ خلا فا لهما، وهذا بناء على ان الوتر واجب عنده سنة عندهما، ولاترتيب فيما بين الفرائض والسنن، وعلى هذا اذا صلى العشاء، ثم توضأ، وصلى السنة، و الوتر، ثم تبين انه صلى العشاء بغير طهارة، فانه يعيد العشاء والسنة دون الوتر، لان الوتر فرض على حدة عنده، وعندهما يعيد الوتر ايضا لكونه تبعا للعشاء، والله اعلم.

ترجمہ:-اگر کسی نے وتر نماز نہ پڑھنے کو یاد رکھنے کے باوجود فجر کی نماز پڑھ لی تو وہ نماز امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فاسد ہو گی، لیکن صاحبینؒ کا اس میں اختلاف ہے، یہ اختلاف اس بناء پر ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وتر نماز واجب ہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک سنت ہے اور فرائض اور سنن میں ترتیب کا خیال نہیں ہوتا ہے، اسی قاعدہ کی بناء پر اگر کسی نے عشاء کی نماز پڑھ کر نیا وضوء کیا اور سنت اور وتر پڑھ لی پھر اسے خیال آیا کہ اس نے عشاء کی نماز بغیر طہارت کے پڑھی تھی ایسی صورت میں وہ عشاء اور سنت کا اعادہ کرے گا لیکن وتر کا اعادہ نہیں کرے گا کیونکہ امام صاحب کے نزدیک وتر ایک مستقل عملی فرض ہے اور شیخین کے نزدیک وتر کا بھی اعادہ کرے گا کیونکہ وتر کی نماز عشاء کی تابع ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔

توضیح:-فجر کی نماز میں وتر کے باقی رہ جانے کا خیال آنا، عشاء کی نماز پڑھ کر کسی نے وضوء کیا پھر سنت اور وتر پڑھی بعد کو یاد آئی کہ بلا وضوء عشاء پڑھی تھی تو کسی نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہے یا نہیں

ولوصلی الفجر وهو ذاكر انه لم يوتر، فهي فاسدة عند ابی حنيفةؒ خلا فا لهما......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے **لاترتیب فیما الخ** صاحبین کے نزدیک وتر سنت ہے اور سنن اور فرائض کے درمیان ترتیب لازم نہیں ہوتی ہے، ف مگر فرض قطعی (عشاء) اور فرض عملی (وتر) کے درمیان ترتیب واجب، لیکن یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ ترتیب ساقط ہونے کے لئے جن چھ فرائض قطعی کی ضرورت ہے ان میں وتر شامل نہیں ہوں گی حالانکہ اس کا کوئی مستقل وقت بھی نہیں ہے۔م۔

وعلی هذا.........الخ

اسی اصل کہ امام اعظمؒ کے نزدیک واجب اور صاحبینؒ کے درمیان سنت تابع ہے کی بناء پر اگر عشاء کی نماز پڑھی پھر وضو کر کے سنت و وتر نمازیں پڑھیں پھر اسے یہ بات یاد آئی کہ اس نے عشاء کی فرض نماز بغیر وضوء کے پڑھی تھی **فعنده الخ** امام اعظمؒ کے نزدیک عشاء اور وتر دونوں کو دوبارہ پڑھ لے اور وتر کو دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ان کے نزدیک وتر ایک مستقل فرض (عملی) ہے، ف یعنی اعتقادی فرض نہیں۔

وعندهما يعيد الوتر ايضا لكونه تبعا للعشاء، والله اعلم......الخ

اور صاحبینؒ کے نزدیک وتر کو بھی دوبارہ پڑھے کیونکہ یہ بھی تو عشاء کے تابع سنت ہے، واللہ تعالے اعلم، واضح ہو کہ مفتی کو یہ چاہئے کہ اجتہادی مسائل بیان کرنے کے بعد واللہ تعالے اعلم کہدے یہ مستحب ہے اور ایمانی قطعی عقائد میں ایسا نہیں کہنا چاہئے، ایسا ہی بزرگوں نے کہا ہے۔م۔

چند ضروری مسائل

(۱) ایک شخص ایک نماز بھول گیا کہ کونسی نماز قضاء ہوئی اور سوچنے کے بعد بھی دلی رجحان کسی بات کی طرف نہیں ہوتا ہے تو ہمارے نزدیک ایک دن اور ایک رات کی نمازیں قضاء کرلے، الظہیریہ، فقیہؒ نے فرمایا ہے کہ ہم اسی قول کو اختیار کرتے ہیں، الینابیع۔ ھ۔ یہی مختار ہے۔ جوامع الفقہ۔ اور امام شافعی وامام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ع۔

(۲) ایک دن کی ظہر ایک دن کی عصر ایک دن کی مغرب کی نمازیں قضاء ہوئیں، اور یہ بھول گیا کہ ان میں سے پہلی کونسی

ہے، اور تحری کرنے پر بھی کوئی رائے قائم نہ ہو سکی تو کہا گیا ہے کہ اس کے ذمہ سے ترتیب ساقط ہے، اور اب وہ جس طرح چاہئے پڑھے، یہی قول اصح ہے۔ المحیط۔ اور یہی قول مختار ہے۔ جوامع الفقہ۔ ع۔

(۳) ایک شخص نے عصر کی نماز شروع کی درمیان میں آفتاب غروب ہو گیا، اس کے بعد ایک شخص نے اس کی اقتداء کر لی تو یہ اقتداء صحیح ہو گی بشرطیکہ امام مقیم اور مقتدی مسافر نہ ہو، التاتارخانیہ۔

(۴) کسی شافعی المذہب کی کئی نمازیں قضاء ہوئیں وہ اگر حنفی المذہب ہو کر انہیں پڑھنی چاہے تو حنفی کی حیثیت سے پڑھے، الخلاصہ، اور شیخ الاسلام خجندیؒ نے کہا ہے کہ وہ جس مسلک کے مطابق پسند کرے پڑھ لے۔ ع۔ دلیل کے اعتبار سے یہی اصح ہے۔ واللہ اعلم۔ م۔

(۵) ایک شخص کے مسلک کے مطابق تیمم کرتے وقت صرف پہونچے تک مسح کرنا ضروری ہو اور وتر کی نماز ایک ہی رکعت ہو اور وہ اسی کے مطابق اپنا عمل کرتا رہا اس کے کچھ دنوں بعد اس کی تحقیق یہ ہو گئی کہ تیمم میں کہنیوں تک مسح کرنا چاہئے، اور یہ کہ وتر کی تین رکعتیں واجب ہیں، تو پچھلے دنوں کی نمازوں کا اعادہ اس پر ضروری ہے یا نہیں، جواب یہ ہے کہ وہ ان نمازوں کو دوبارہ نہیں پڑھے گا، اور اگر وہ ایسے اعمال از خود کرتا رہا کسی سے ان کی تحقیق نہیں کی تھی، اب جو کسی سے دریافت کی تو اس کا خیال بدل گیا، یعنی کہنیوں تک تیمم میں مسح اور تین رکعتوں کا وتر میں کا قائل ہو گیا تو اب وہ گذشتہ دنوں کی نمازوں کی قضاء کرے، الذخیرہ، ھ۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ بات واضح ہے کہ اس زمانہ میں جن عوام کو غیر مقلد علماء آمین بالجہر وغیرہ کا کوئی مسئلہ بتلاتے ہیں تو جب تک اہل السنت کے عقیدہ کے بالکل خلاف نہ ہو اور جزوی اعمال میں ائمہ اہل السنہ سے بالکل خارج نہ ہو تب تک اس کی نماز وغیرہ جائز ہو گی، اس سے دشمنی یا اس پر طعن تشنہ جائز نہیں ہے، کیونکہ کسی مومن سے دشمنی رکھنی یا اس پر طعن کرنا قطعی حرام ہے، اور آپس میں نفاق قائم کرنا گناہ کبیرہ ہے، لیکن جس عالم نے جان کر ایسا مسئلہ بتلایا کہ اس سے عام مسلمانوں میں نفاق پیدا ہو تو وہی اس فساد کا پیدا کرنے والا ہوا۔ م۔

(۶) دار الکفر میں جو شخص ایمان لایا لیکن وہاں نماز، روزہ وغیرہ احکام شریعت سے واقف نہ ہوا تو اس پر قضاء لازم نہیں ہے اور اگر وہ اسی حال میں مر گیا تو اس پر عذاب نہ ہو گا۔ قاضی خان۔ یہ حکم اس صورت میں ہو گا کہ اس کے لئے ہجرت کر کے دار السلام آنا ممکن نہ ہوا یا مسائل پر واقف نہ ہو سکا۔ م۔

(۷) اور جو شخص دار السلام میں مسلمان ہوا تو اس کا عذر قابل قبول نہ ہو گا، اور استحساناً اس پر قضاء لازم ہو گی، قاضی خان، ت۔

(۸) شرعی احکام پہونچانے میں ایک مرد کا ہونا کافی ہو گا، اور حسنؒ نے امام اعظمؒ سے روایت کی ہے کہ جب تک ایسے نو مسلموں کو دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں احکام کی تبلیغ نہ کر دیں اس پر شریعت کے ایسے احکام فرض نہ ہوں گے۔ محیط السرخسی۔

(۹) کسی شخص کو اپنے ذمہ نمازیں باقی رہنے کی یاد نہ ہو، پھر بھی وہ شخص قضائے عمری پڑھنی چاہتا ہے، اگر وہ نقصان اور کراہت کے احتمال کی بناء پر ہو تو بہتر ہے ورنہ نہیں، اور صحیح قول یہ ہے کہ بعد فجر اور بعد عصر، کے ماسوا جائز ہے، بہت سے اسلاف نے فساد کے شبہہ ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے۔ المضمرات۔ وہ نماز کی ہر رکعت میں فاتحہ اور سورہ پڑھے۔ الظہیریہ۔

(۱۰) اور حدیث میں ایک نماز کو دوبارہ پڑھنے کی جو ممانعت آئی ہے وہ اس بات پر محمول ہو گی کہ اس میں کسی قسم کے فساد کا شبہ نہ ہو کیونکہ جس نماز میں کراہت پائی جارہی ہو اسے مکرر پڑھنا بالاتفاق جائز ہے، م۔

(۱۱) بلاشبہ نفل نمازوں کے پڑھنے کے مقابل میں قضاء نمازوں کا پڑھ لینا زیادہ بہتر اور اہم بھی ہے، مگر مؤکدہ سنتوں اور صلوٰۃ التسبیح وغیرہ کو نہیں چھوڑنا چاہئے۔ المضمرات۔

(۱۲) قضاء نمازوں کو گھر میں پڑھنا چاہئے مسجد میں نہیں۔ الوجیز للکردی۔ شاید کہ یہ حکم صرف اس صورت میں ہو جب کہ قضاء تنہا پڑھی جارہی ہو جماعت سے نہیں۔ م۔

(۱۳) کسی شخص نے اپنے بیٹے کو حکم دیا کہ میری طرف سے قضاء نمازیں پڑھ لو اور روزے رکھ لو، تو جائز نہیں ہے۔ تاتارخانیہ۔

(۱۴) قضاء نماز کو یاد آتے ہی ادا کرنا واجب ہے۔ م۔ محیط السرخسی۔

(۱۵) لیکن بال بچوں کے واسطے محنت اور مزدوری اور دوسری مجبوریوں کی وجہ سے قول اصح کے مطابق تاخیر کرنا جائز ہے۔ ت۔

(۱۶) سجدہ تلاوت اور نذر مطلق اور رمضان کی قضاؤں کو فوری طور سے ادا کرنا واجب نہیں ہے بلکہ اس میں گنجائش ہے، لیکن شمس الائمہ حلوائیؒ نے فی الفور واجب فرمایا ہے۔ د۔

(۱۷) جس شخص کے ذمہ قضاء باقی ہوں اس نے مرتے وقت وصیت کی کہ میرے ترکہ میں سے ایک تہائی سے میری طرف سے کفارہ ادا کیا جائے تو ہر فرض نماز اور وتر اور ہر روزہ کے واسطے نصف صاع (تقریباً دو کلو) گیہوں (گندم) دیئے جائیں۔

(۱۸) اور اگر کچھ مال نہ چھوڑا ہو تو اس کی طرف سے حیلہ یہ ہوگا کہ نصف صاع گیہوں کسی سے قرض لے کر ایک نماز کے عوض ایک مسکین کو دیئے جائیں، پھر وہ مسکین کسی وارث کو صدقہ دیدے پھر وہ وارث اس کو میت کی دوسری نماز کی طرف کفارہ دیدے پھر وہ مسکین وارث کو صدقہ دیدے پھر وارث مردہ کی تیسری نماز کی طرف سے کفارہ میں دیدے، اسی طرح کرتا رہے یہاں تک کہ تمام نمازوں کی طرف سے کفارہ ادا ہو جائے۔ الخلاصہ۔ اور فتاوی الحجہ میں ہے۔

(۱۹) کہ اگر مردہ نے وارث کو وصیت نہیں کی مگر اس کے کسی وارث نے احسان اور نیکی کے طور پر اس کا کفارہ دینا چاہا تو جائز ہے، اور ہر نماز کی طرف سے نصف صاع گیہوں دیدے۔

(۲۰) اور شیخ حمیر الوبری اور یوسف بن محمدؒ سے سوال کیا گیا کہ بالکل بوڑھے پھوس کو جس طرح اپنی زندگی میں روزے کی طرف سے فدیہ دینا پڑتا ہے کیا وہ نماز کی طرف سے بھی فدیہ دیا کرے تو فرمایا کہ نہیں، التاتارخانیہ۔

(۲۱) مفید میں ہے کہ اگر کوئی نماز یا کوئی رکن کسی نماز میں بھول گیا اور اسے یاد نہیں آتا ہے کہ وہ کونسی نماز تھی تو بلا اختلاف وہ ایک دن اور ایک رات کی نماز دہرادے، ع۔ اور فتاوی اہل سمرقند میں ہے۔

(۲۲) کہ اگر کسی کی پہلی دونوں رکعتوں کی قراءت چھوٹ گئی ہو تو احتیاطاً فجر و مغرب اور وتر، اور اگر چاروں کی ہو تو ظہر و عصر اور عشاء کو دوبارہ پڑھ لے باقی کو پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے، المحیط۔

(۲۳) قصداً نماز چھوڑنے والے کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسے قید کیا جائے۔ الکافی۔ ف۔

(۲۴) اگر کسی کی دو دنوں کی ظہر کی نماز چھوٹ گئی اور اس نے اس کے اداء کے وقت دن کو متعین نہیں کیا تو مذہب کے مطابق بغیر تعیین کے جائز نہ ہوگی۔ ع۔ لہٰذا نیت کرتے وقت یوں کہے کہ اپنے ذمہ کے پہلے دن کے یا آخری دن کے ظہر کی قضاء پڑھتا ہوں۔

اسی طرح (۲۵) اگر بہت سی نمازیں قضاء ہو گئی ہوں تو سب سے پہلے دن کی یا آخری دن کے ظہر کی یا جو بھی باقی ہو اس کی نیت کر لے، یہی قول اصح ہے، اسی طرح مختلف رمضانوں کے روزوں میں نیت کرے، اور چونکہ تاخیر کرنا گناہ کی بات ہے لہٰذا دوسرے کے سامنے ظاہر نہ کرے۔ الدر۔

(۲۶) اگر کوئی مسافر ایک ماہ تک مغرب کی نماز میں بھی قصر کے خیال سے دو رکعتیں پڑھتا رہا تو مغرب کی تمام نمازیں فاسد ہو گئیں، اس لئے پہلے دن کی مغرب فاسد ہو کر اس کے بعد کی مسلسل پانچ نمازیں فاسد ہو کر دوسرے دن کی عشاء سے بقیہ

نمازیں جائز ہوں گی لیکن اب ہر روز کی صرف مغرب فاسد رہے گی جس کا اعادہ کرنا ہوگا۔ع۔

(۲۷) جمعہ کے دن کسی نے گھر میں ظہر کی نماز پڑھ لی تو اس کا حکم موقوف رہے گا کہ اگر اس کے بعد بھی جمعہ کی نیت سے مسجد کی طرف چلا تو وہ اب باطل ہو جائیگی، اور اگر نہیں گیا یہاں تک کہ وقت بھی ختم ہو گیا تو وہ صحیح رہے گی، اس کی نظیر میں معذور اور مستحاضہ وغیرہ میں بہت سے مسائل ہیں، جو معذور کے بیان میں گذر گئے ہیں، وہاں دیکھ سکتے ہیں۔م۔

(۲۸) ایک نابالغ شخص عشاء کی نماز کے بعد سو گیا اور فجر کے بعد بیدار ہوا اس حال میں کہ اسے احتلام ہو گیا تھا تو اس پر عشاء کی بھی نماز قضاء کرنا لازم ہو گی۔ف۔

اس کے برخلاف (۲۹) اگر ایک لڑکی طلوع فجر سے پہلے حائضہ ہوئی تو اس پر عشاء کی قضاء نہ ہو گی۔

(۳۰) اور اگر فجر کے بعد جاگی اور اسی وقت حیض ظاہر ہوا تو مختار قول یہ ہے کہ عشاء کی بھی قضاء کر لے، قاضی خان۔

(۳۱) قضاء کرتے وقت اگر اس نے ایسی نماز کی قضاء ہو جس میں قراءت آہستہ کی جاتی ہو تو اس کو آہستہ ہی پڑھنا واجب ہے خواہ وہ امام ہو یا تنہا ہو۔

(۳۲) اور اگر وہ ایسی نماز ہو جس میں جہر واجب ہے تو جماعت کے ساتھ قضاء کرتے وقت امام جہر کرے۔

(۳۳) اور اگر تنہا پڑھ رہا ہو تو اکثر متاخرین کے نزدیک ادا پر قیاس کرتے ہوئے جہر افضل ہے اور مصنف ہدایہؒ کے نزدیک اخفاء واجب ہے، اور بندہ مترجم کے نزدیک بھی دلیلوں سے اسی کی تائید ہوتی ہے، جیسا کہ جہر اور اخفاء کے افضل ہونے کے بیان میں گذرا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

باب سجود السھو

سجدۂ سہو کا باب

یسجد للسھو فی الزیادۃ والنقصان سجدتین بعد السلام، ثم یتشھد ثم یسلم، وعند الشافعیؒ یسجد قبل السلام، لماروی انہ علیہ السلام سجد للسھو قبل السلام، ولنا قولہ علیہ السلام: لکل سھو سجدتان بعد السلام، وروی انہ علیہ السلام سجد سجدتی السھو بعد السلام، فتعارضت روایتا فعلہ، فبقی التمسک بقولہ سالما.

ترجمہ:- نماز کی حالت میں کسی نامناسب کام زیادہ کرنے یا کم کرنے کی صورت میں سلام کے بعد دو سجدے کرے پھر تشہید پڑھے اس کے بعد سلام پھیرے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک سلام سے پہلے ہی سجدہ کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے متعلق روایت ہے کہ آپؐ نے سلام سے پہلے سجدہ کیا ہے، اور ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ سہو کے لئے سلام کے بعد دو سجدے ہیں، اور یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کئے ہیں، اس طرح آپ کے عمل کے بارے میں دونوں روایتوں کے درمیان تعارض پیدا ہو گیا اور آپ کا فرمان باقی رہ گیا جس سے حجت قائم کی گئی۔

توضیح:- باب سہو کے سجدوں کا۔ سجدہ کے واجب ہونے کی شرطیں۔ سجدہ کے وقت سجدہ کی تعداد سجدہ کے بعد تشہد اور سلام۔ حدیث سے امام شافعیؒ کی دلیل۔ اور حدیث سے حنفیہ کی دلیل

باب سجود السھو...... الخ

بھول کی وجہ سے سجدہ کرنے کے بیان میں یعنی ان سجدوں کے بیان میں جو نماز میں خاص قسم کی بھول ہو جانے سے واجب ہوتے ہیں، اس لئے اب غلطیوں یا بھول کو بیان کرنا ضروری ہے جو یہ ہیں۔م۔ بھول یا سہو خواہ نماز فرض میں ہو یا نفل میں ہو سجدۂ سہو واجب ہو گا۔ المحیط۔ اس میں اصل یہ ہے کہ جو چیز بھولی گئی ہے وہ یا تو عمل ہو گا یا اس کی جگہ ہو گی، پھر جو عمل چھوٹا ہے وہ یا تو

فرض ہو گایا واجب ہو گایا سنت ہو گا، اب اگر وہ عمل فرض ہو تو دیکھا جائے گا کہ اس کی تلافی اور تدارک قضاء کرنے سے ہو سکتا ہے یا نہیں، اگر ہو سکتا ہو تو قضاء کرلے، ورنہ نماز فاسد ہو جائے گی، اور سنت ہو تو اس کے لئے زائد سجدہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، اور نہ نماز فاسد ہوتی ہے اور اگر واجب ہو اور بھول کر چھوٹ گیا ہو تو اس کمی کو سجدہ کر کے پورا کرلے، اور اگر قصداً چھوڑا ہو تو دوبارہ پڑھے بغیر یہ کمی پوری نہ ہو گی۔ التاتارخانیہ۔ البحر۔

البتہ اس قاعدہ سے چار صورتیں مستثنیٰ ہیں (۱) پہلا قعدہ قصداً چھوڑا ہو (۲) پہلے قعدہ میں قصداً رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجدی (۳) قصداً قعدہ اخیرہ کے بعد یہ سوچتا رہا کہ تین رکعتیں ہوئیں یا چار ہوئیں اتنی دیر تک سوچتا رہا کہ اس میں ایک رکن ہو سکتا ہو (۴) پہلی رکعت میں مثلاً ایک سجدہ سہو سے چھوٹا تھا اس کو قضاء کرنے میں قصداً نماز کے اخیر تک تاخیر کی، تو کہا گیا ہے کہ ان چاروں صورتوں میں سجدہ سہو سے نقصان کی تلافی نہ ہو گی۔ النہر۔

يسجد للسهو في الزيادة والنقصان سجدتين بعد السلام، ثم يتشهد ثم يسلم......الخ

سہو کا سجدہ کرے۔ ف۔ وہ نماز خواہ فرض ہو یا نفل ہو، غیر جنس کا کوئی فعل خواہ زیادہ کرنے کی وجہ سے ہو یا کمی کرنے کی وجہ سے ہو۔ ف۔ مگر فرض کی کمی پوری ہو جانی شرط ہے اور واجب کی شرط نہیں ہے۔ **سجدتين الخ** دو سجدے کرے۔ ف۔ آخری قعدہ کے ختم ہونے پر۔ سلام کرنے کے بعد۔ ف یہی قول مختار ہے۔ ویسے سلام کے قبل بھی جائز ہے، ظاہر الروایۃ میں، اس کی وجہ سے آخری قعدہ جو کرنا تھا وہ باقی رہ گیا، کیونکہ ایک مرتبہ جو پہلے پڑھ لیا تھا وہ بے اعتبار ہو گیا؛ اسی لئے پھر تشہد پڑھے، پھر نماز ختم کرنے کے لئے سلام پھیرے۔ ف الحاصل احناف کے نزدیک سلام کر کے سجدہ سہو کرے۔

وعند الشافعيؒ يسجد قبل السلام، لماروي انه عليه السلام سجد للسهو قبل السلام......الخ

اور امام شافعیؒ کے نزدیک قول مختار یہ ہے کہ سلام سے پہلے سجدہ کرے۔ ف اگرچہ سلام کے بعد بھی جائز ہے، **لماروى الخ** اس حدیث کی بناء پر جس میں یہ بات روایت کی گئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام سے پہلے سجدہ کیا ہے۔ ف جیسا کہ عبد اللہ بن مالک بن بحینہؓ کی اس حدیث میں ہے جیسے صحاح ستہ نے روایت کی ہے ظہر میں درمیانی قعدہ سے سہو کرنے میں، اور اس کے آخر میں ہے کہ جب لوگ نماز پوری ہونے کے بعد سلام کے لئے منتظر تھے اتنے میں رسول اللہ ﷺ نے تکبیر کہہ کر دو سجدے کئے سلام پھیرنے سے پہلے، ف یہ تو رسول اللہ ﷺ کا ایک عمل تھا۔

ولنا قوله عليه السلام: لكل سهو سجدتان بعد السلام، وروى انه عليه السلام سجد سجدتي......الخ

اور ہماری دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے کہ ہر سہو کے لئے سلام کے بعد دو سجدے ہیں، اور یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کئے۔ ف: یہ حدیث صحاح ستہ میں حضرت ذوالیدینؓ سے مروی ہے، اور اس کے آخر میں ہے کہ آپ نے وہ دونوں رکعتیں پڑھیں جن سے سہو کیا تھا (یعنی جنہیں آپ پڑھنی بھول گئے تھے) اس کے بعد سلام کیا پھر تکبیر کہہ کر سجدہ سہو ادا کیا، اور صحیح مسلم، ابوداؤد اور نسائی کی روایت میں ہے کہ عصر کی تین رکعتیں ہی پڑھ کر آپ نے سلام پھیر دیا تھا آخر تک، اسی میں یہ بھی ہے کہ آپ نے ایک رکعت پڑھ کر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کئے نماز سے فارغ ہونے کا سلام پھیرا، الحاصل ان دونوں حدیثوں میں سلام پھیرنے کے بعد ہی سجدہ کرنے کا عمل مذکور ہے۔

فتعارضت روايتا فعله، فبقي التمسك بقوله سالما......الخ

اس طرح رسول اللہ ﷺ کے فعل کی دونوں روایتوں میں تعارض ثابت ہوا، ف اسی لئے امام مالکؒ نے یہ اختیار کیا ہے کہ اگر کسی کمی کی وجہ سے سجدہ سہو کرنا پڑھے تو وہ سلام سے پہلے اور زیادتی کی وجہ سے کرنا ہو تو سلام کے بعد۔ اس تعارض کی وجہ سے دونوں پر عمل ترک کرتے ہوئے۔ آپ کی جو قولی حدیث ہے اس سے استدلال کیا گیا ہے اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے **فبقي التمسك الخ** آپ کے قول سے استدلال کرنا باقی رہ گیا ہے، اور اس میں کوئی معارضہ بھی نہیں ہے۔ ف اسی کو ہم احناف نے

اختیار کیا ہے، کہ ہر سہو کے لئے سلام کے بعد دو سجدے ہیں۔

اب اس جگہ یہ باتیں تحقیق طلب ہیں:

(۱) اس حدیث کی تحقیق (۲) اس کا کوئی معارضہ ہے یا نہیں۔

اسکے سلسلہ میں تحقیق یہ ہے کہ اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے اسمٰعیل بن عیاش کی سند سے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا ہے، اور اسمٰعیل بن عیاش کی وہ حدیث جو اہل الشام سے ماخوذ ہو وہ صحیح ہوتی ہے۔

اسناد کی تفصیل اس طرح ہے، (۱) اسمٰعیل بن عیاش عن (۲) عبید اللہ بن عبید الکلاعی عن (۳) زہیر بن سالم العنسی عن (۴) عبدالرحمٰن بن جبیر بن نفیر عن (۵) ثوبانؓ قال قال رسول اللہ ﷺ لکل سہو سجدتان بعد السلام۔ اس میں (۲) عبید اللہ بن الکلاعی۔ کاف کے فتحہ کے ساتھ۔ یہ صدوق ہیں۔ ت۔ اور شامی ہیں۔ یحیٰی بن معینؒ وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے۔ (۳) زہیر بن سالم العنسی۔ نون کے ساتھ۔ ابوالمخارق یہ شامی ہیں۔ ان کو ابن حبانؒ نے ثقات میں لکھا ہے۔ (۴) عبدالرحمٰن بن جبیر۔ ثقہ ہیں۔ ابوزرعہ، نسائی، ابن حبان، ابوحاتم اور محمد بن سعدؒ نے ان کی توثیق کی ہے۔ اور بخاریؒ نے باب الادب میں روایت کی ہے۔

الحاصل یہ حدیث صحیح ہوئی، اسی طرح بخاری کے باب التوجہ نحو القبلہ میں ابو مسعودؓ کی حدیث میں مرفوعاً مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخر میں یہ فرمایا ہے کہ جب مجھے نسیان ہو جائے (نماز میں کبھی بھول جاؤں) تو یاد دلاؤ اور جب کوئی تم میں سے اپنی نماز میں شک کرے تو صحیح بات جاننے کے لئے وہ تحری کرے اور اس کے مطابق اپنی نماز مکمل کرے، پھر سلام پھیر کر دو سجدے کرے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ سہو اور شک کے باب میں یہ حکم عام ہے، اور کوئی عالم بھی سہو، شک زیادتی اور نقصان کے درمیان فرق کا قائل نہیں ہے لہٰذا یہی حکم ایسے تمام کاموں کے لئے ہے، یہ خلاصہ فتح القدیر ہے، شک، سہو اور نسائی فقہاء کی اصطلاح میں سب کے ایک ہی معنی ہیں، اور ظن کے معنی گمان قوی، اور وہم کے معنی گمان ضعیف کے ہیں۔ د۔

(۲) دوسری بات کہ اس حدیث کا کوئی معارض ہے یا نہیں، تو صحیح میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت ہے کہ اگر تم میں سے کسی کو نماز میں یہ شک ہو جائے کہ اب تک تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار، تو شک کی بات چھوڑ کر جتنے پر یقین ہو تو اسی کو قبول کرے، (اسی حساب سے پڑھتے ہوئے) سلام کے قبل دو سجدے کرے، بخاری وغیرہ، اس کے مقابل عبد اللہ بن جعفریؓ کی مرفوع حدیث ہے کہ جو شخص نماز میں شک کرے وہ سلام کے بعد دو سجدے کرے، اس کی روایت ابوداؤد، نسائی، ابن خزیمہ اور امام احمدؒ نے کی ہے، اور بیہقی نے کہا ہے کہ اس کی اسناد میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور ایک حدیث ابو مسعودؓ کی اوپر گذری ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ شک کے سلسلہ کی ان حدیثوں میں قولی معارضہ ہے، اور سہو کے سلسلہ میں حضرت ثوبانؓ کی حدیث کسی معارضہ کے بغیر ہے، جو ثابت ہو چکی ہے، لہٰذا اسی پر عمل ہے، اور چونکہ سجدہ سہو کا حکم کمی کی تلافی کے لئے ہے لہٰذا وہ سلام کے قبل ہوں یا بعد سلام ہوں ہر طرح جائز ہیں، اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے دونوں طرح عمل کر کے دکھلا دیا، اور یہی ظاہر الروایۃ ہے، مگر حضرت ثوبانؓ کی حدیث کی وجہ سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ سلام کے بعد ہی سجدے کئے جائیں۔ مف۔ اور اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے جسے مصنفؒ خود ہی اب بیان کر رہے ہیں۔

ولان سجود السهو مما لايتكرر، فيؤخر عن السلام حتى لو سهى عن السلام ينجبر به، وهذا الخلاف فى الاولية ، ويأتى بتسليمتين هو الصحيح صرفاً للسلام المذكور الى ما هو المعهود، ويأتى بالصلوة على النبى عليه السلام والدعاء فى قعدة السهو، هو الصحيح لان الدعاء موضعه آخر الصلوة.

ترجمہ:- اور اس وجہ سے بھی کہ سجدہ سہو نماز میں ایک ایسا عمل ہوتا ہے جو مکرر نہیں کیا جاتا ہے لہٰذا اسے سلام کے بعد ہی کیا جائے تاکہ اگر سلام میں بھول ہو جائے تو اس کی بھی اس سجدہ سے تلافی ہو جائے، اور پہلے یا بعد کا یہ اختلاف صرف اولویۃ (یعنی بہتر کیا ہے) میں ہے، اور دو سلام کرے، یہی قول صحیح ہے، تاکہ یہ سلام اس معروف و مشہور سلام کے طریقہ کے مطابق

ہو جائے، اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے اور دعاء کرے اسی قعدہ میں جس میں سجدہ سہو کرنا ہو، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ دعاء کی جگہ نماز کا آخری حصہ ہے۔

توضیح:- مترجم کی طرف سے توضیح۔ سجدہ سہو کے بعد سلام کی تعداد۔ درود اور دعاء کا مقام

ولان سجود السهو مما لايتكرر، فيؤخر عن السلام حتى لو سهى عن السلام ينجبر به......الخ

اور سجدہ سہو سلام کے بعد اس لئے بھی ہوگا کہ یہ فعل تو ایسا ہے جو نماز میں مکرر نہیں کیا جاتا ہے، لہذا سلام کے بعد ہی ہونا بہتر ہوگا تاکہ اگر سلام پھیرنے میں سہو ہو جائے تو یہ بھی ایک ہی سجدہ سہو سے پورا ہو جائے، ف اس کی وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ ایک شخص نے نماز پوری کرلی لیکن سلام کے قریب اسے یہ شک ہو گیا کہ میں نے تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار اور اسی سوچ میں اسے اتنی دیر لگ گئی کہ جتنی دیر میں ایک رکن ادا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے یہ بات لازم آگئی کہ سلام پھیرنا جو واجب ہے اس میں تاخیر ہو گئی، تو اس تاخیر کی تلافی بھی اسی سجدہ سہو سے ہو جائے، اب ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر سلام پھیرنے سے پہلے ہی سجدہ سہو کر چکا ہوگا تو اس وقت یہ بات لازم آئیگی کہ دوبارہ سجدہ سہو کرے۔

وهذا الخلاف في الاولية ، وياتي بتسليمتين هو الصحيح صرفاً للسلام......الخ

اور ہمارے اور امام شافعیؒ کے درمیان یہ اختلاف صرف اولویۃ میں ہے، ف یعنی ہمارے نزدیک سلام کے بعد اولی ہے اور امام شافعیؒ کے نزدیک قبل سلام میں بہتری ہے، ورنہ بالاتفاق دونوں صورتیں جائز ہیں جیسا کہ احناف میں سے قدوریؒ نے اور شافعیہ میں سے صاحب الحاوی وغیرہ نے تصریح کی ہے۔ مع۔ **وياتي بتسليمتين** الخ اور وہ سلام کرے، ف ایک داہنی طرف اور ایک بائیں طرف، اور شیخ الاسلام خواہر زادہ اور فخر الاسلامؒ نے کہا ہے کہ ایک ہی سلام پھیرے، اصل میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے، یہاں تک کہ شیخ الاسلامؒ نے کہا ہے کہ اگر دو سلام پھیر دے تو اس کے بعد وہ سجدۂ سہو نہیں کر سکتا ہے، محیط میں کہا ہے کہ یہی اصوب ہے، کافی میں کہا ہے کہ یہی صواب ہے، لیکن شمس الائمہ اور صدر الاسلامؒ نے دو سلام کو اختیار کیا ہے، اور فقیہ ابو اللیثؒ نے کہا ہے کہ ایک سلام کہنے والا بدعتی ہے، اور کہا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ابو یوسفؒ کے نزدیک دو سلام ہی کہے۔

هو الصحيح صرفاً للسلام المذكور الى ما هو المعهود......الخ

دو سلام کا قول ہی صحیح ہے، اس دلیل سے کہ احادیث میں جس سلام کا ذکر ہے اس سے وہی مراد ہے جو عام طور پر معہود اور معروف ہے، ف معہود اور معروف سلام تو یہی ہے کہ دونوں طرف سلام کیا جاتا ہے لہذا یہی طریقہ ان احادیث کے لئے زیادہ موافق اور مناسب ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ شیخ الاسلام کا یہ قول انتہائی تعجب خیز ہے کہ دونوں طرف سلام کرنے سے نماز سے خارج ہو جائے گا، اس لئے سجدۂ سہو نہیں کر سکتا ہے، حالانکہ اس بات پر مکمل اتفاق ہے کہ جس شخص پر کوئی رکن یا نماز کا سجدہ تلاوت باقی ہو وہ دونوں سلام کے باوجود یاد آنے پر انہیں ادا کر سکتا ہے، نیز حضرت ذوالیدینؓ وغیرہ میں یقینی طور سے دونوں سلام کے بعد سجدہ سہو کا ذکر ہے، لہذا اصح قول وہی ہے جسے مصنفؒ نے صحیح فرمایا ہے، واللہ تعالے اعلم۔

وياتي بالصلوة على النبي عليه السلام والدعاء في قعدة السهو، هو الصحيح......الخ

اور درود اور دعاء کو سہو کے قعدہ میں (قعدہ اخیرہ) میں پڑھے، ف فخر الاسلامؒ کا یہی مختار قول ہے **هو الصحيح** الخ۔ یہی بات صحیح ہے، **لان الدعاء** الخ کیونکہ دعاء کرنے کی جگہ اور موقع تو نماز کا آخری حصہ ہوتا ہے، ف، اور سجدہ سہو سے پہلے اس کی نماز پوری نہیں ہوتی ہے، لیکن طحاویؒ کے نزدیک دونوں قعدوں میں ان چیزوں کو پڑھے، ف، میرے خیال میں امام طحاویؒ کا قول جو بھی منقول ہو وہ دونوں باتوں کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف درود کے لئے ہے، کیونکہ ان کا مذہب یہ ہے کہ ہر تشہد کے بعد

درود بھی ہے، دعاء بھی پڑھنی ان کا مذہب نہیں ہے، جیسا کہ عینیؒ نے اس کی تصریح کی ہے، اور قاضی خان وظہیریہ میں کہا ہے کہ یہی قول احوط ہے، یعنی درود دونوں تشہد کے ساتھ مگر دعاء تو صرف قعدہ (اخیرہ یا) سہو میں ہونی چاہئے، اچھی طرح سمجھ لیں، پھر بہت ممکن ہے کہ ایک ہی سلام کے بعد سجدہ سہو کرنا پڑے، اسی لئے فقہاءؒ نے یہ بات پسند کی ہے کہ اکثر جاہل، جلد باز شخص جلدی سے فوراً بات کرنے لگے جس سے اس کی نماز فاسد ہو جائے، اور محیط میں ہے کہ ایک سلام کر کے تکبیر کہے، اور سجدہ کر کے تسبیح پڑھے، پھر تکبیر کہتا ہوا سر اٹھا کر دوبارہ تکبیر کہہ کر دوسرا سجدہ کرے، پھر بیٹھ کر تشہد پڑھے، پھر نماز سے فارغ ہونے کے لئے سلام کہے۔ ھ۔ اب یہاں سے ان باتوں اور غلطیوں کا بیان شروع ہوتا ہے جن سے سجدہ لازم آتا ہے۔

قال ویلزمه السهو اذا زاد فی صلوته فعلا من جنسها لیس منها، وهذا یدل علی ان سجدة السهو واجبة هو الصحیح، لانها تجب لجبر نقصان تمکن فی العبادة، فتکون واجبة کالدماء فی الحج، واذا کان واجبا لایجب الا بترك واجب او تاخیره او تاخیر رکن ساهیا، هذا هو الاصل، وانما وجبت بالزیادة لانها لاتعری عن تاخیر رکن او ترك واجب.

ترجمہ:- اور نمازی کو سہو لازم ہو جاتا ہے جب کہ اس نے اپنی نماز میں کوئی ایسا عمل زیادہ کیا ہو جو نماز کی جنس سے نماز میں نہیں ہے، ماتن کا یہ جملہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ سہو واجب ہے، یہی صحیح بھی ہے، کیونکہ یہ سجدہ عبادت میں جو کمی ہو جاتی اسی کو پورا کرنے کے لئے واجب ہوتا ہے تو یہ سجدہ اسی طرح واجب ہوگا جس طرح حج کے کاموں میں قربانیاں لازم ہوتی ہیں اور جب سجدہ کا واجب ہونا ثابت ہو گیا تو یہ صرف واجب ہی کو بھول کر چھوڑ دینے یا تاخیر کر دینے یا کسی رکن کو مؤخر کر دینے سے لازم ہوگا، سجدہ کے واجب ہونے کے سلسلہ میں یہی قاعدہ ہوا، اور کسی عمل کی زیادتی سے اس لئے سجدہ واجب ہوتا ہے کہ لامحالہ یہ زیادتی رکن کی تاخیر یا ترک واجب سے خالی نہ ہوگی۔

توضیح:- سجدہ سہو کے واجب ہونے کی دلیل

قال ویلزمه السهو اذا زاد فی صلوته فعلا من جنسها لیس منها......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف اس عبارت سے زیادتی کا بیان ہے اور کمی کی وجہ سے بھی سجدہ لازم آتا ہے جس کا بیان سامنے آتا ہے، **وهذا یدل الخ** متن کا یہ قول کہ سہو لازم ہو جاتا ہے اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ سجدہ سہو واجب ہوتا ہے، ف کیونکہ سہو کا ہونا تو خود ظاہر ہے، پھر اس کے لازم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا حکم یعنی سجدہ کرنا لازم یعنی واجب ہوگا، م، اور یہی صحیح قول ہے۔

لانها تجب لجبر نقصان تمکن فی العبادة، فتکون واجبة کالدماء فی الحج......الخ

کیونکہ سجدۂ سہو اس نقصان کو پورا کرنے کے لئے واجب ہوتا ہے جو عبادت میں کمی ہو، لہٰذا یہ خود بھی واجب ہوگا، ف کیونکہ اگر کمی پوری نہ ہو تو نماز کو دوبارہ پڑھنا واجب ہے، تاکہ پوری کمی پوری ہو جائے، اس لئے سجدہ بھی واجب ہوگا جس سے کمی پوری ہوتی ہے۔ م۔ محیط۔ مبسوط۔ ذخیرہ اور بدائع میں بھی وجوب ہی مذکور ہے، اور یہی قول امام مالک اور احمدؒ کا ہے لیکن فتاوی مرغینانی میں ہے کہ کرخیؒ کے نزدیک سنت ہے، مع، قدوریؒ نے کہا ہے کہ عام اصحاب کے نزدیک سنت ہے۔ف۔ صحیح یہ ہے کہ کمی کی تلافی تو یقیناً واجب ہے، اور اس کی تلافی کے لئے یا تو سجدہ سہو ہو ورنہ اسی ناقص عمل کو دوبارہ کیا جائے، اسی لئے سجدۂ سہو واجب ہوا۔ **کالدماء الخ** جیسے حج میں قربانیاں واجب ہوتی ہیں۔ف۔ حدث کی حالت میں کسی نے طواف کعبہ کیا تو اس پر جرمانہ میں قربانی لازم ہوگی، **واذا کان الخ** اور یہ سجدہ کرنا واجب ثابت ہوا۔ ت۔

لایجب الا بترك واجب او تاخیره......الخ

اور یہ سجدہ سہو کسی واجب کو چھوڑنے یا واجب کی ادائیگی میں تاخیر کرنے یا نماز کے کسی رکن کو تاخیر کرنے سے ہی واجب ہوگا،ف یا کسی واجب کو مقدم کر دینے یا مکرر کرنے یا کسی واجب کو متغیر کر دینے سے واجب ہوگا۔ک۔ ساھیا بھول کر ایسا ہو،ف یعنی قصداً نہ ہو،اور رکن میں صرف تاخیر یا تقدیم تو سجدہ سے پوری ہو سکتی ہے،اور ترک کر دینا جائز نہیں ہے۔

هذا هو الاصل، وانما وجبت بالزيادة لانها لاتعرى عن تاخير ركن او ترك واجب......الخ

دہ سہو لازم ہونے کے لئے یہی اصلی قاعدہ مقرر ہے،مگر اس میں زیادہ کرنے کا ذکر نہیں فرمایا ہے۔وانما وجبت الخ اور کسی رکن یا واجب کی زیادتی سے بھی اسی لئے سجدہ سہو لازم آتا ہے کہ اس زیادتی سے یقیناً کسی رکن کی تاخیر یا واجب کا ترک کرنا لازم آئیگا۔ف پھر چونکہ رکن کو اپنی جگہ پر ادا کرنا واجب ہے تو یہ بھی ایک ترک واجب ہوا،اسی لئے یہ کہا گیا کہ قاعدہ یہ معلوم ہوا کہ کسی قسم کا بھی واجب بھول کر ترک کر دینے سے سجدہ سہو واجب ہوتا ہے،جیسا کہ کافی میں ہے،پھر سجدہ سہو بجالانا اس شرط کے ساتھ واجب ہوتا ہے کہ وقت اور جگہ بھی اس کے لائق اور مناسب ہو،اسی بناء پر اگر کسی کی صبح کی نماز میں سجدہ سہو لازم تھا اور اس نے ادا نہ کیا یہاں تک کہ پہلے سلام پھیرتے ہی آفتاب نکل آیا،تو اس سے یہ سجدہ ختم ہو گیا،اسی طرح قضاء نماز پڑھتے ہوئے سجدہ سہو لازم آیا تھا مگر اس نے سجدہ نہیں کیا یہاں تک کہ آفتاب ڈوبنے کی سرخی آگئی تو اس سے بھی سجدہ ختم ہو گیا،اسی طرح جمعہ کے سہو میں جمعہ کا وقت نکل گیا تو بھی سجدہ ساقط ہو گیا،اسی طرح اگر سلام کے بعد ایسا فعل پایا گیا جس کے بعد بناء کرنا جائز نہیں ہوتا ہے تو بھی سجدہ سہو ساقط ہو گیا،واضح ہے کہ سجدہ کرنے کی نیت سے ہی سلام کرنا شرط نہیں ہے بلکہ سہو کے یاد ہونے کے باوجود اس ارادے سے سلام پھیر دیا کہ سجدہ سہو نہ کروں گا تو بھی اس پر سجدہ سہو کرنا لازم ہوگا،اور اس کا پہلا ارادہ لغو مانا جائیگا،جیسا کہ فتح القدیر میں ہے،اور جن نمازوں میں وقت کی کمی کی وجہ سے سجدہ سہو ادا نہ کیا جا سکا ہو وہ نماز پوری نہ ہوگی بلکہ اسے دوبارہ پڑھنا واجب ہوگا۔م۔

قال ويلزمه اذا ترك فعلا مسنونا كانه اراد به فعلا واجبا الا أنه اراد بتسميته سنة ان وجوبها بالسنة قال اوترك قراءة الفاتحة لانها واجبة اوالقنوت اوالتشهد اوتكبيرات العيدين لانها واجبات فانه عليه السلام واظب عليها من غير تركها غير مرة وهى امارة الوجوب ولانها تضاف الى جميع الصلوة فدل انها من خصائصها وذلك بالوجوب ثم ذكر التشهد يحتمل القعدة الاولى والثانية والقراءة فيهما وكل ذلك واجب وفيها سجدة السهو هو الصحيح.

ترجمہ:-اور اس نمازی کو سجدہ سہو اس وقت لازم ہوگا جب کہ اس نے کوئی فعل مسنون چھوڑا ہو،قدوریؒ نے اس سے فعل واجب مراد لیا ہے،مگر انہوں نے اسے سنت کا نام دیا ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے،اور کہا او چھوڑا ہو سورہ فاتحہ کا پڑھنا کیونکہ وہ واجب کام ہے یا دعاء قنوت کا یا تشہد کا یا عیدین کی زائد تکبیروں کو کیونکہ یہ ساری باتیں واجب ہیں،کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان کاموں پر مداومت فرمائی ہے اور ایک مرتبہ بھی انہیں نہیں چھوڑا ہے،یہی بات تو واجب ہونے کی نشانی ہے،اور اس لئے بھی کہ یہ باتیں پوری نماز کی طرف نسبت کی جاتی ہیں،اس صفت نے یہ بات بتائی کہ یہ تمام چیزیں نماز کی خصوصیتوں میں سے ہیں،اور اس طرح ان چیزوں کا مخصوص ہو جانا وجوب ہی کی وجہ سے ہو سکتا ہے،پھر قدوریؒ کا اس جگہ تشہد کو مطلقاً ذکر کرنا قعدہ اولیٰ اور قعدہ اخیرہ دونوں کا احتمال رکھتا ہے اسی طرح ان دونوں میں تشہد کے پڑھنے کا بھی احتمال رکھتا ہے،اور ان میں سے ہر کام واجب ہے،اور ان سب کے ترک سے سجدۂ سہو لازم ہوتا ہے۔یہی بات صحیح ہے۔

توضیح:-سہو کی تفصیل

قال ويلزمه اذا ترك فعلا مسنونا كانه اراد به فعلا واجبا الا أنه اراد بتسميته.....الخ

قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ سہو لازم ہو جاتا اس وقت جب کہ کوئی فعل مسنون چھوڑا ہو، کانه اراد الخ گویا فعل مسنون کہہ کر قدوریؒ نے فعل واجب مراد لیا ہے الا انه الخ مگر واجب کو مسنون کہنے سے ان کا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اس وجوب کا ثبوت سنت سے ہوا ہے، ف اس طرح یہ بات بھی بتادی کہ سنت سے جو فعل واجب ثابت ہو اس کے چھوڑنے سے بھی سجدۂ سہو واجب ہوتا ہے، او ترك الخ یا سورۃ فاتحہ کی قراءت چھوڑی، کیونکہ نماز میں سورۃ فاتحہ پڑھنی واجب ہے۔

او القنوت او التشهد او تكبيرات العيدين لانها واجبات فانه عليه السلام واظب......الخ

یا وتر کی دعائے قنوت یا التحیات یا عید الفطر اور عید الاضحیٰ کی زائد تکبیریں چھوڑیں۔ لانها واجبات الخ کیونکہ یہ چیزیں واجبات میں سے ہیں، فانه عليه السلام الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ان چیزوں پر مداومت فرمائی ہے، ان کو ایک بار چھوڑے بغیر بھی، ف یعنی بغیر اس کے کہ ان کے ایک بار بھی چھوڑنے کا ثبوت ہو، وهى امارة الخ یہ بات واجب ہونے کی علامت ہے، ف یعنی ایسی علامت ہے جس سے وجوب کو پہچان کر اس کے موافق عمل کرنا واجب ہے، کیونکہ اگر یہ چیزیں واجب نہ ہوتیں تو کم از کم امت کو ان کے چھوڑنے کی اجازت ہونے کے لئے بھی ایک دو بار ترک فرماتے۔

ولانها تضاف الى جميع الصلوة فدل انها من خصائصها وذلك بالوجوب......الخ

اور اس دلیل سے بھی کہ یہ چیزیں پوری نماز کی طرف نسبت کی جاتی ہیں، ف اور یہ کہا جاتا ہے کہ وتر کی دعاء قنوت یا نماز کا تشہد یا نماز عید کی تکبیریں۔ فدل انها الخ اس سے یہ معلوم ہوا کہ یہ چیزیں جس کی طرف منسوب ہیں اس کی مخصوصات میں سے ہیں، اور یقیناً اس کی خصوصیت واجب ہونے کی وجہ سے ہی ہوگی، ف کیونکہ جائز چیز تو چھوٹ سکتی ہے، اسی لئے نماز کی بسم اللہ یا نماز کا تعوذ نہیں کہا جاتا ہے، کیونکہ ان کی خصوصیت نہیں ہے۔

ثم ذكر التشهد يحتمل القعدة الاولى والثانية والقراءة فيهما وكل ذلك واجب......الخ

پھر تشہد کو مطلقاً ذکر کرنا پہلے قعدہ اور دوسرے قعدہ کا مجازاً اور دونوں قعدوں میں التحیات پڑھے جانے کا حقیقتاً احتمال رکھتا ہے، ف پس عموم مجاز کی وجہ سے سب کا احتمال رکھتا ہے وكل ذلك الخ ان میں سے ہر ایک کام واجب ہے، ف یعنی کسی اور ایک کو چھوڑنے سے ترک واجب لازم آئیگا، کیونکہ تشہد کے ترک کے سلسلہ میں کلام ہو رہا ہے، چنانچہ کہا ہے۔

وفيها سجدة السهو هو الصحيح......الخ

کہ ان سب کے ترک میں سجدۂ سہو لازم ہوگا هو الصحيح الخ یہی صحیح ہے، ف حتی کہ قعدہ اخیرہ اگرچہ فرض ہے لیکن اسے چھوڑ کر کوئی پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے تو پانچویں کے لئے سجدہ کرنے سے پہلے تک چوتھی کی طرف لوٹ کر بیٹھ جائے گا، اور سجدہ سہو کرے گا۔

ولوجهر الامام فيما يخافت او خافت فيما يجهر تلزمه سجدتا السهو لان الجهر فى موضعه والمخافتة فى موضعها من الواجبات واختلف الرواية فى المقدار والاصح قدرما تجوزبه الصلوة فى الفصلين لان اليسير من الجهروالاخفاء لا يمكن الاحتراز عنه وعن الكثير ممكن وما تصح به الصلوة كثير غيران ذلك عنده آية واحدة وعندهما ثلث آيات وهذا فى حق الامام دون المنفرد لان الجهر والمخافتة من خصائص الجماعة.

ترجمہ:- اگر امام نے اس نماز میں جو آہستہ پڑھی جاتی ہے زور سے پڑھ دیا یا جو زور سے پڑھی جاتی ہے اسے آہستہ پڑھ دیا تو دونوں صورتوں میں سہو کے دونوں سجدے اس پر لازم ہوں گے، کیونکہ آہستہ کے موقع میں آہستگی سے اور زور کے موقع میں زور سے پڑھنا واجبات میں سے ہے، اس آہستہ اور زور کی مقدار کی تعین کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں، لیکن قول اصح یہ ہے کہ دونوں صورتوں ہی میں جس مقدار سے نماز صحیح ہو جا سکتی ہو، کیونکہ زور اور آہستہ کے کم درجہ کے اندر احتراز کرنا ممکن نہیں ہے، لیکن زیادہ کے معاملہ میں احتراز کرنا ممکن ہے، اور کتنی مقدار سے نماز صحیح ہو سکتی ہے اس میں کئی اقوال ہیں چنانچہ امام ابو حنیفہؒ

کے نزدیک ایک آیت کا ہونا کافی ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک تین آیتیں ہیں، یہ بیان امام کے بارے میں ہے مقتدی کے بارے میں نہیں ہے اسی طرح تنہا پڑھنے والے (منفرد) کے لئے بھی نہیں ہے، کیونکہ زور سے پڑھنا اور آہستگی سے پڑھنا جماعت کی خصوصیتوں میں سے ہے۔

توضیح:-چند ضروری مسائل

عیدین کی تکبیروں کے بعد تکبیر چھوڑ دینا۔ دوسری رکعت میں عیدین کی تکبیروں کو چھوڑنا۔ بڑھانا۔ بے موقع کہنا۔ سلام بائیں جانب۔ رکوع کے بعد قومہ نہیں کیا۔ ایک ہی سجدہ کے بعد بیٹھ گیا۔ ترک تعدیل ارکان۔ سجدہ بھول گیا اور اس کی ادائیگی میں تاخیر کی۔ تیسری رکعت کیلئے کھڑے ہونے میں تاخیر۔ قراءت میں تاخیر۔ فرض کی پہلی دونوں اور نفل کی تمام رکعتوں سے قراءت چھوڑ دی۔ فاتحہ کی ایک آیت چھوڑ دی۔ فاتحہ کو دوبار پڑھا۔ سورہ میں سے کچھ پڑھ کر فاتحہ پڑھی۔ فاتحہ کے بعد ایک بڑی آیت یا تین آیتیں چھوڑ دیں۔ یا رکوع میں یاد کیا۔ قرآن کو رکوع یا سجود یا قومہ یا جلسہ یا تشہد میں پڑھا، آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ میں تاخیر، فرض کی آخری رکعتوں میں فاتحہ مکرر یا فاتحہ مع سورہ۔ کل یا تھوڑا تشہد کا حصہ چھوڑ دیا۔ قیام میں قبل قراءت یا بعد قراءۃ تشہد۔ رکوع و سجود و قومہ میں تشہد۔ آخری رکعتوں میں تشہد۔ قعدہ میں تشہد کی بجائے فاتحہ۔ قعدہ اولی میں مکرر تشہد۔ بغیر تشہد پڑھے سلام۔ رکوع کی بجائے سجدہ یا برعکس۔ دو رکوع یا تین سجدے۔ ایک رکعت میں ایک سجدہ بھولا اور دوسرے میں یاد آیا۔

ولو جهر الامام فيما يخافت او خافت فيما يجهر تلزمه سجدتا السهو لان الجهر......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، **تلزمه سجدة السهو الخ** تو اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا، ف خواہ نماز ادا ہو یا قضاء فرض ہو یا عید وغیرہ واجب ہو، **لان الجهر الخ** کیونکہ جہر کے موقع میں جہر اور اخفاء کے موقع میں اخفاء بھی واجبات میں سے ہے، ف لہٰذا اس کے ترک سے سجدہ سہو لازم آئیگا، کتنی مقدار ہونے سے سجدہ سہو لازم آئیگا اس کا جواب اس طرح دیا ہے، **واختلف الخ** مقدار کے بارے میں ائمہ سے مختلف روایتیں منقول ہیں۔

والاصح قدر ما تجوز به الصلوة فى الفصلين لان اليسير من الجهر والاخفاء لا يمكن......الخ

قول اصح یہ ہے کہ اتنی مقدار ہو کہ جس سے نماز جائز ہو یہ مقدار دونوں صورتوں میں معتبر ہے ف یعنی اخفاء کے بجائے جہر یا جہر کے بجائے اخفاء ہوا تنی مقدار میں ہو کہ جس سے نماز جائز ہو جاتی ہو، **لان اليسير الخ** کیونکہ تھوڑا سا جہر کر دینا یا اخفاء کر دینا تو ایسی مجبوری ہے جس سے بچنا ممکن نہیں ہے، البتہ زیادہ مقدار سے بچنا ممکن ہو سکتا ہے۔

وما تصح به الصلوة كثير غير ان ذلك عنده آية واحدة وعندهما ثلاث آيات......الخ

اور جس مقدار سے نماز صحیح ہو جاتی ہے وہ مقدار یقیناً زیادہ ہوتی ہے۔ **غير ان الخ** البتہ اس مقدار کثیر کے بارے میں ائمہ کے درمیان یہ اختلاف ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ایک آیت ہے اور صاحبینؒ کے نزدیک تین آیتیں ہیں، ف پھر مسئلہ میں امام کی قید لگانے کا فائدہ یہ ہے کہ **وهذا فى حق الخ** سہو کے بارے میں یہ حکم امام کے بارے میں ہے منفرد کے لئے نہیں ہے، **لان الجهر الخ** کیونکہ جہر و اخفاء کا حکم تو جماعت کی خصوصیت میں سے ہے، ف اور منفرد پر اگرچہ اخفاء کا ان نمازوں میں جو فاتحہ پڑھی جاتی ہیں واجب ہے بلکہ مصنف کے نزدیک تو جہر یہ نمازوں کی قضاء میں بھی جہر واجب، لیکن ظاہر الروایہ میں اس پر سجدہ سہو نہیں ہے۔ مفع۔

چند ضروری مسائل

بسم اللہ اور تعوذ اور آمین میں سجدہ سہو واجب نہیں ہے اگرچہ جہراً ہو، اور رفع یدین اور ان تکبیروں میں ایک حالت سے دوسری حالت میں جاتے وقت کہی جاتی ہیں سوائے عیدین کی دوسری رکعت میں تکبیر زائد کے بعد کی وہ تکبیر جو رکوع میں جاتے

وقت کہی جاتی ہے، چونکہ یہ بھی ان زوائد میں ہی حکما مانی جاتی ہے اس لئے اس کے ترک پر بھی سجدہ سہو واجب ہوگا۔ ھ۔ف۔ آنے والی تمام صورتوں میں سجدہ سہو واجب ہوتا ہے، تکبیرات عیدین میں سے بعض یا کل کے چھوڑ دینے پر۔ف۔ یا بڑھائی یا امام نے بے موقع کہی۔ البدائع۔ مگر ان چھوٹی ہوئی تکبیروں کو مقتدی رکوع میں کہہ لے، یا بائیں طرف پہلے سلام پھیر دیا۔ف۔ یا رکوع سے کھڑا نہ ہوا یعنی قومہ نہیں کیا، یا قول اصح کے مطابق ایک سجدہ کے بعد سیدھا نہیں بیٹھا، المحیط میں اس کا اختلاف ہے، یا تعدیل ارکان نہیں کی، جیسا کہ البدائع نے اس کو صحیح کہا ہے۔

یا نمازی کوئی سجدہ بھول گیا تھا، اور اس کو ادا کرنے میں آخر نماز تک تاخیر کی، کیونکہ بالکل چھوڑ دینے سے تو نماز فاسد ہی ہو جائیگی، یا تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے میں دیر کی اس طرح پر کہ التحیات کے بعد اللھم صل علی محمد تک پڑھ لیا، قول اصح کے مطابق، یا اس فکر میں رہ گیا کہ میں نے تکبیر تحریمہ کہی یا نہیں، یا میں ظہر کی نماز میں ہوں یا عصر کی نماز میں یا کسی اور فکر میں رہ گیا اتنی دیر کہ اس میں ایک رکن ادا کیا جا سکتا ہو، اس کے برخلاف اس میں پہلے کسی نماز کی بابت کچھ سوچتا رہا، تو اگرچہ دیر تک اس طرح رہا اسے سہو نہیں کہا جا سکتا، یا حدث ہو گیا اور وضوء میں یہ سوچتا رہا کہ تین رکعتیں پڑھیں یا چار اور اتنی دیر کی کہ وہ ایک رکن کی ادائیگی کی مقدار میں ہے تو اس پر بھی سجدہ سہو ہے، جیسا کہ محیط میں ہے، یا قراءت کو فرض کے پہلے کی دو رکعتوں یا ایک رکعت سے مؤخر کر دیا، یا فرض کی پہلی دونوں رکعتوں یا نفل کی تمام رکعتوں سے پوری فاتحہ یا اکثر چھوڑی کم نہیں اور نہ فرض کی آخری دونوں رکعتوں میں قول و مذہب کی بناء پر یا قول اصح پر فاتحہ یا قول احوط کے مطابق آخری دونوں رکعتوں میں۔ف۔ یا فاتحہ کو صورت پر مکمل کیا، اگرچہ اکثر ہو، سورۃ کے بعد نہیں، یا سورہ میں سے ایک بھی حرف پڑھ کر سورۃ فاتحہ پڑھی، یا فاتحہ کے بعد ایک بڑی آیت یا تین چھوٹی آیتیں چھوڑ دیں یا رکوع میں یاد کیا تو اس میں حکم ہے کہ کھڑا ہو کر پڑھ کر رکوع کرے البتہ سجدہ سہو لازم آئیگا، یا آیت قرآن کو رکوع یا سجود یا قومہ یا جلسہ یا تشہد میں پڑھا، یا آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کرنے میں تاخیر کی تو اس پر بہر صورت سجدہ سہو ہے، اور اگر فرض کی آخری رکعتوں میں فاتحہ کو مکرر پڑھا یا فاتحہ اور سورہ پڑھی تو قول اصح کے مطابق اس پر سہو نہیں ہے، اور سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے جب التحیات چھوڑ دی ہو پوری یا تھوڑی اسی طرح قعدہ اولی میں ہو یا قعدہ اخیرہ میں ہو اسی طرح فرض میں ہو یا نفل میں اگر قیام میں قراءت سے پہلے تشہد پڑھا تو اس پر سجدہ سہو نہیں ہے اور اگر قراءت کے بعد پڑھا تو لازم ہوگا اور یہی قول اصح ہے، جیسا کہ اجناس الناطفی میں محمدؒ سے مروی ہے، لیکن ظہیریہ کا اس میں اختلاف ہے، اور رکوع، سجود اور قومہ میں تشہد سے سہو نہیں ہے۔ع۔ اگر اخیر میں پڑھا تو سہو نہیں ہے۔ محیط السرخسی۔

اگر قعدہ میں تشہد پڑھنے کے بجائے سورۃ فاتحہ پڑھی تو اس پر سہو ہے۔ المحیط۔ اگر قعدہ اولی میں تشہد مکرر پڑھ دیا تو اس پر سہو ہے جیسے رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجا، تو سجدۂ سہو ہے کیونکہ تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہونے میں تاخیر کر دی ، التبیین۔ف۔ اسی پر فتوی ہے۔ المضمرات۔

اگر تشہد پڑھنا بھول کر سلام پھیر دیا اس کے بعد یاد آیا تو پھر سے نماز کی ہیئت میں لوٹ کر تشہد پڑھ لے، اور شیخینؒ کے نزدیک اس پر سہو لازم ہے۔ المحیط۔ اگر رکوع کے بجائے سجدہ کیا یا اس کے برعکس سجدہ کیا، اگر ایسا کوئی فعل ہو جس میں کوئی ذکر مسنون نہیں ہے تو اس کے ترک سے سہو نہیں ہے، جیسے بائیں ہاتھ پر دائیں ہاتھ باندھنا۔ المحیط۔ دو رکوع یا تین سجدے کئے تو سہو ہے، اور عمداً ایسا کرنے سے سجدہ سہو کافی نہیں ہے، جیسا کہ مجتبی میں ہے، اور شافعیؒ نے کہا ہے کہ کافی ہے اور وہ سجود عذر ہے، اگر بھول کر ایک سجدہ کیا اور دوسرا دوسری رکعت میں یاد آیا تو اسی وقت کر لے اور ترتیب چھوٹنے کی وجہ سے سجدہ سہو لازم آئیگا، العینی۔ معلوم ہونا چاہئے کہ سہو کا حکم تو فرض، نفل، جمعہ اور عیدین سب کے لئے برابر ہے، مگر ہمارے مشائخ نے فرمایا ہے کہ عیدین اور جمعہ میں امام سجدۂ سہو ادا نہ کرے، تاکہ لوگ فتنہ میں نہ پڑیں۔ المضمرات۔ بحوالہ المحیط۔

قال وسهو الامام يوجب على المؤتم السجود لتقرر السبب الموجب فى حق الاصل ولهذا يلزمه حكم

الاقامة بنية الامام فان لم يسجد الامام لم يسجد المؤتم لانه لايصير مخالفا وما التزم الاداء الامتا بعا فان سها المؤتم لم يلزم الامام ولا المؤتم السجود لانه لو سجد وحده كان مخالفا لا مامه ولوتابعه الامام ينقلب الاصل تبعا.

ترجمہ :-اور کہا کہ امام کے بھولنے سے مقتدی پر بھی سجدہ سہو لازم آتا ہے، کیونکہ اصل یعنی امام کے حق میں سجدہ سہو کو واجب کرنے والا سبب ثابت ہو چکا ہے، اسی وجہ سے امام کی نیت اقامت کر لینے کی وجہ سے مقتدی پر بھی اقامت کا حکم لازم ہو جاتا ہے، اب اگر امام نے سجدہ سہو نہ کرے تو مقتدی بھی نہ کرے، کیونکہ وہ اپنے امام کی مخالفت نہیں کر سکتا ہے، حالانکہ اس نے شروع سے اپنے اوپر یہی لازم کیا ہے کہ امام کے تابع رہے گا، اور اگر مقتدی کوئی سہو کرے تو امام پر سہو لازم نہ ہوگا اور نہ خود مقتدی پر، کیونکہ اگر وہ مقتدی تنہا سجدہ کرے گا تو اسے اپنے امام کی مخالفت لازم آئیگی، اور اگر امام اس کی موافقت کرلے تو وہ امام کی بجائے مقتدی ہو جائیگا۔

توضیح :-فرض نفل جمعہ وعیدین میں سجدہ سہو لازم آنا۔امام کا سہو۔ مقتدی مسبوق اور امام کو سہو۔ مقتدی مسبوق کو سہو۔ مقتدی مقیم کو سہو۔ امام کو نماز خوف میں سہو۔ امام کو سہو کے بعد حدث اور خلیفہ مسبوق

قال وسهو الامام يوجب على المؤتم السجود لتقرر السبب الموجب في حق الاصل......الخ

امام کا سہو کرنا مقتدی پر بھی سجدہ واجب کرتا ہے، ف اگرچہ مقتدی مسبوق ہو کہ سہو کے وقت امام کے پیچھے نہ تھا، مگر مسبوق امام کے ساتھ سلام نہ پھیرے بلکہ منتظر رہے یہاں تک کہ جب امام سجدہ کرے تو اس کے ساتھ سجدہ کرلے پھر اپنی باقی نماز ادا کرنے کو کھڑا ہو جائے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ اپنی باقی نماز کے لئے جلدی نہ کرے یہاں تک کہ امام کے سہو کرنے سے مطمئن ہو جائے، ف کیونکہ اگر مقتدی کے کھڑے ہو جانے کے بعد امام بھولا اور اس کی وجہ سے اس نے سجدہ سہو کیا تو مسبوق کو اس کی اتباع کے لئے لوٹنا ہوگا بشرطیکہ اس رکعت کا سجدہ ادا نہ کیا ہو، اور اگر یہ مقتدی نہیں لوٹا یا سجدہ کر چکا ہے تو اخیر میں سجدہ کرے۔ھ۔لتقرر السبب الخ کیونکہ اصل یعنی امام کے حق میں سجدہ واجب کرنے والا سبب محقق ہو چکا ہے، اور عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ جب امام نے سہو کیا تو اس کے مقتدیوں پر بھی سہو ہے، اس حدیث کو شیخ ابن تیمیہؒ نے اپنی شرح میں ذکر کیا ہے۔ع۔

ولهذا يلزمه حكم الاقامة بنية الامام ......الخ

اسی وجہ سے امام کی نیت اقامت کی وجہ سے مقتدیوں پر بھی اقامت کا حکم لازم ہو جاتا ہے، ف اسی لئے اگر کئی مسافروں میں ایک امام ہوا اور باقی مقتدی ہوئے پھر امام نے نماز کی حالت میں اقامت کی نیت کی تو اس کی نماز چار رکعت کی ہو گئی اس لئے مقتدیوں پر بھی پیچھے ہونے کی وجہ سے چار ہی لازم ہو گئیں، اور چار ہی پر سلام پھیرینگے، کیونکہ نماز کو مکمل کر دینے کا جو سبب امام کے لئے ثابت ہوا وہی مقتدیوں پر بھی لازم ہوا۔

فان لم يسجد الامام لم يسجد المؤتم لانه لايصير مخالفا وما التزم الاداء الامتابعا......الخ

پھر اگر امام نے سجدہ نہیں کیا تو مقتدی بھی سجدہ نہ کرے گا، ف یہی قول امام شافعیؒ کے شاگرد مزنی اور بویطیؒ کا اور ایک روایت امام احمد سے بھی منقول ہے لانه يصير الخ کیونکہ اگر مقتدی سجدہ کرے گا تو امام کی مخالفت ہو جائیگی، حالانکہ اس نے امام کے اتباع کرنے کی ہی نیت کی تھی، ، ف اور حدیث میں ہے کہ فلا تختلفوا عليه یعنی امام کی مخالفت نہ کرو، یہی قول عطاء وحسن بصری وابراہیم نخعی کا ہے اور امام ثوری وقاسم وحمادؒ کا مذہب یہی ہے، لیکن امام مالک وشافعی واحمدؒ کے نزدیک مقتدی سجدہ کرے گا۔ مع۔ فان سها الخ اور اگر مقتدی نے سہو کیا تو سجدہ کرنا لازم نہ ہوگا نہ امام پر اور نہ خود مقتدی پر۔ لانه لو سجد الخ کیونکہ

اگر مقتدی تنہا سجدہ کرے اور امام نہ کرے تو وہ امام کا مخالف ہوا۔

ولو تابعه الامام ينقلب الاصل تبعا......الخ

اور اگر امام بھی اس کی متابعت کرلے تو جو اصل تھا وہ تابع ہو جائے گا۔ف اور اس طرح حیثیت کا الٹ جانا امر غلط ہے۔ع۔ درحقیقت یہ جزئیہ اس نص پر مبنی ہے کہ الامامُ ضَامِنٌ الحدیث میں، اور باقی ائمہ کے نزدیک مقتدی خود مستقل ہوتا ہے اور اقتداء کا مطلب ہے صرف ایک ساتھ ادا کرنا، لیکن ہمارے نزدیک امام اپنے تمام مقتدیوں کی نمازوں کا ذمہ دار ہوتا ہے۔م۔ یہاں تک کہ علمائے کرام نے کہا ہے کہ اگر امام تشہد پوری کر کے تیسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے تو جس مقتدی نے اس وقت تک تشہد پوری نہ کی ہو وہ اگرچہ کھڑا ہو گیا ہو پھر بیٹھ کر تشہد پوری کرلے، اگرچہ تیسری رکعت کے جاتے رہنے کا خوف ہو، بخلاف منفرد شخص کے کہ وہ پیچھے نہیں لوٹے گا بلکہ آگے اپنی نماز پوری کرتا رہے گا، کیونکہ وہ کسی کی اتباع کا محتاج نہیں ہے، نیز یہ بات یقینی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سجود سہو کرتے وقت صحابہ کرامؓ نے بھی اس کام میں آپ ﷺ کی اتباع کی تھی اگرچہ ان پر اولا سجدہ سہو لازم نہیں ہوا تھا، پھر لاحق پہلے اپنی چھوٹی ہوئی نماز کو قضاء کرلے پھر امام کے ساتھ سجدہ سہو پائے تو سجدہ کرلے ورنہ نماز کے آخر میں کرے۔

اور اگر اپنی نماز پوری کئے بغیر امام کا ساتھ دے گا تو وہ پھر سے اپنی نماز پوری کر کے سجدہ سہو کرے، اس کے علاوہ کچھ کافی نہ ہوگا، اور اگر اس شخص کو اپنی چھوٹی ہوئی نماز قضاء کرنے میں سہو ہوا تو اس پر سجدہ لازم نہ ہوگا، بخلاف مسبوق کے اور مسافر کے پیچھے مقتدی مقیم کے کہ جب یہ دونوں اپنی باقی نماز پڑھنے کھڑے ہوئے اور اس میں کوئی غلطی کرگئے تو وہ اس کی تلافی کے لئے سجدہ سہو کریں، اور اگر امام پر سجدہ سہو لازم تھا اور اس نے سجدہ کیا تو اس کی اتباع بھی کریں، اس طرح ان دونوں کی نماز میں سجود سہو مکرر واقع ہوگا، یہی مسئلہ کتاب الاصل میں مذکور ہے، اور یہی صحیح بھی ہے، اگر امام کو صلوۃ الخوف میں سہو ہوا ہو تو وہ سجدہ کرے اور دوسرا گروہ اس کی اتباع کرے کیونکہ یہ لوگ مسبوق ہیں اور پہلا گروہ اپنی نماز پوری کر کے سجدہ کرے کیونکہ وہ لوگ لاحق ہیں، اگر امام کو سہو کے بعد حدث لاحق ہوا تو کسی کو اپنا خلیفہ بنادے مگر مسبوق کو خلیفہ نہ بنائے کیونکہ سجدہ سہو سلام کے بعد ہے، اور اگر مسبوق ہی کو خلیفہ بنادیا تو وہ نماز پوری کر کے کسی مدرک کو اپنی جگہ لا کھڑا کرے پھر وہ سجدہ کرے، اور مسبوق ان لوگوں کے ساتھ سجدہ کرے، اور اگر سجدہ نہیں کیا تو نماز کے آخر میں کرے گا، لیکن اصول کی روایت کے مطابق سلام سے پہلے سجدہ کرلینا چاہئے، اور اگر امام کے پیچھے سبھی مسبوق ہو تو سلام کے بعد سجدہ کے قول کے مطابق سب کھڑے ہو کر تنہا اپنی اپنی باقی نماز پوری کریں، اور استحسانا بعد تمام کے سجدہ کریں۔ الفتح۔

ومن سهى عن القعدة الاولى ثم تذكر وهوالى حالة القعوداقرب عاد وقعد وتشهد لان ما يقرب من الشئى يا خذ حكمه ثم قيل يسجد للسهو للتا خير والا صح انه لايسجد كما اذا لم يقم ولو كان الى القيام اقرب لم يعدلانه كا لقائم معنى ويسجد للسهو لانه ترك الواجب وان سهى عن القعده الاخيرة حتى قام الى الخامسة رجع الى القعدة مالم يسجد لان فيه اصلاح صلاته وامكنه ذلك لان مادون الركعة بمحل الرفض قال والغى الخامسة لانه رجع الى شئى محله قبلها فير تفض وسجد للسهو لانه اخرواجبا.

ترجمہ:-اور جو شخص قعدہ اولی کو بھول کر کھڑا ہونے لگا پھر اسے یاد آگیا اس حالت میں کہ بیٹھنے کے قریب تھا تو وہ لوٹ کر بیٹھ جائے اور تشہد پڑھ لے کیونکہ جو چیز کسی چیز کے قریب ہوتی ہے وہ اسی کا حکم لیتی ہے، پھر کہا گیا ہے کہ تاخیر ہو جانے کی وجہ سے سجدہ سہو کرے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ سجدہ نہ کرے گویا کہ وہ کھڑا ہی نہیں ہوا ہے، اور اگر کھڑے ہونے کے قریب ہو تو پرانی حالت پر نہ لوٹے کھڑا ہی رہ جائے کیونکہ وہ کھڑے ہونے والے کے حکم میں ہے اور سجدہ سہو کرلے، کیونکہ اس نے واجب ترک کردیا ہے، اور اگر قعدہ اخیرہ کو بھول کر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا تو جب تک اس رکعت کا سجدہ نہ کرلے اس وقت

تک یاد آجانے سے لوٹ آئے اور بیٹھ جائے کیونکہ اسی طرح کرنے سے اس کی نماز کی اصلاح ہوگی، اور یہ بات اس کے لئے ممکن بھی ہے کیونکہ رکعت سے کم جب تک ہو وہ چھوڑ دینے کا محل ہے، اور پانچویں رکعت کے پڑھے ہوئے حصہ کو لغو مان لے کیونکہ وہ ایسی چیز کی طرف لوٹا ہے جس کا موقع اس رکعت سے پہلے ہے، لہذا اسے چھوڑ دے، اور سجدہ سہو کرلے کیونکہ اس نے ایک واجب کام کو چھوڑ دیا ہے۔

توضیح: اگر قعدہ اولی کو بھول کر اٹھنے لگا اور اسے خیال آگیا قعدہ اخیرہ کو بھول کر اٹھا اور خیال آگیا۔ خیال نہیں آیا

ومن سهى عن القعدة الاولى ثم تذكر وهو الى حالة القعود اقرب عاد وقعد وتشهد......الخ

اور جو شخص قعدہ اولی کو بھول گیا اور اس حالت میں خیال آیا کہ بیٹھنے کے زیادہ قریب تھا تو بیٹھ جائے اور اس میں تشہد پڑھ لے، ف لان ما يقرب الخ کیونکہ جس چیز سے جو چیز قریب ہوتی ہے اسی کا حکم قبول کرلیتی ہے۔ف تو بیٹھنے سے قریب ہونے کے حکم میں ہے، اور قول اصح یہ ہے کہ اگر نچلا حصہ بدن سیدھا اور پیٹھ ٹیڑھی ہو تو اسے بیٹھنے کے قریب سمجھا جائے گا۔ف ثم قيل الخ پھر کہا گیا ہے کہ بیٹھنے میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے سجدہ سہو کرلے۔

والاصح انه لايسجد كما اذا لم يقم ولو كان الى القيام اقرب لم يعد لانه كا لقائم معنى......الخ

لیکن اصح قول یہ ہے کہ سجدہ سہو کی ضرورت نہیں ہے، گویا وہ کھڑا ہی نہیں ہوا ہے۔ف کیونکہ شریعت نے اس کی اس حرکت کو کھڑا ہونا شمار نہیں کیا ہے۔ف ولو كان الخ اور اگر کھڑے ہونے کے زیادہ قریب ہو تو پھر قعدہ کی طرف نہ لوٹے۔لانه كالقائم الخ کیونکہ یہ کھڑے ہونے کے حکم میں ہے، اور سجدہ سہو کرلے، کیونکہ اس نے واجب ترک کیا ہے۔ف یہ قول امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے اور مشائخ بخارا کا یہی مذہب مختار ہے اور ظاہر مذہب یہ ہے کہ جب تک سیدھا نہ کھڑا ہو جائے اس وقت تک لوٹنا چاہئے، اور جب سیدھا کھڑا ہو جائے تو نہ لوٹے، یہی قول اصح ہے، اسی حکم پر وہ حدیث محمول ہے جس میں ہے کہ آپ کھڑے ہوئے تو لوگوں نے تسبیح پڑھی لہذا آپ بیٹھ گئے مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت تک سیدھے کھڑے نہیں ہوئے تھے، اور دوسری حدیث میں جو یہ مذکور ہے کہ آپ بیٹھے نہیں اور لوگوں کو اشارہ کیا کہ کھڑے ہو جاؤ یعنی اس وقت جب کہ سیدھے کھڑے ہو گئے تھے، پھر جس صورت میں بیٹھنا نہیں چاہئے تھا اگر کوئی بیٹھ گیا تو خلاصہ وغیرہ میں کہا ہے کہ قول صحیح یہ ہے کہ نماز فاسد ہو جائیگی، مگر بندہ مترجم کے نزدیک یہ قول ضعیف ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے گناہ تو ہو سکتا ہے مگر نماز کے فاسد ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ رکعت سے کم بڑھانے سے نماز فاسد نہیں ہوتی ہے۔ جیساکہ بیان کیا جا چکا ہے۔ لہذا قول راجح بلکہ ارجح فاسد نہ ہونا ہے، مخ، فتح القدیر۔اور یہی قول حق ہے۔البحر۔پھر اگر مقتدی نے التحیات نہیں پڑھی اور امام نے پڑھی ہو تو مقتدی پر لوٹ آنا واجب ہے، اگرچہ سیدھا کھڑا ہو گیا ہو، اور اگرچہ تیسری رکعت کے چھوٹ جانے کا خوف ہو، جیساکہ فتح القدیر میں گذرا ہے، یہاں تک تو قعدہ اولی کے سلسلہ میں بحث تھی۔

وان سهى عن القعدة الاخيرة حتى قام الى الخامسة رجع الى القعدة مالم يسجد......الخ

اور اگر قعدۂ اخیرہ میں بیٹھنا بھول کر کھڑا ہو گیا یہاں تک کہ پانچویں رکعت کے لئے سیدھا کھڑا ہو گیا تو اس قعدہ کی طرف اس وقت تک لوٹ آنا چاہئے جب تک کہ پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، لان فيه الخ کیونکہ اس کے لوٹ آنے ہی میں اس کی نماز کی اصلاح ہے، اور یہ اصلاح اس سے ممکن ہے، کیونکہ پوری رکعت سے کم میں تو چھوڑ دئے جانیکی گنجائش باقی رہتی ہے۔ف لہذا چھوڑ کر لوٹ آئے۔

والغى الخامسة لانه رجع الى شئى محله قبلها فيرتفض وسجد للسهو لانه اخر واجبا......الخ

اور پانچویں رکعت کو لغو کردے، لانه رجع الخ کیونکہ وہ ایسے کام کے لئے لوٹا ہے جو اس سے پہلے ہونا چاہئے، لہذا اس

رکعت کو چھوڑ دے۔ ف یعنی وہ قعدہ اخیرہ ہے، و سجد اور سجدہ سہو ادا کر لے، لانہ اخر الخ کیونکہ اس نے واجب کو مؤخر کیا ہے۔ ف مراد یہ ہے کہ واجب قطعی میں جو فرض یعنی قعدہ اخیرہ ہے اس میں تاخیر کر دی ہے۔ الکافی۔ مف۔

وان قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا خلافا للشافعيؒ لانه استحكم شروعه في النافلة قبل اكمال اركان المكتوبة ومن ضرورته خروجه عن الفرض وهذا لان الركعة بسجدة واحدة صلوة حقيقة حتى يحنث بها في يمينه لايصلي وتحولت صلا ته نفلا عند ابي حنيفه وابي يوسفؒ خلافا لمحمدؒ على مامر فيضم اليها ركعة سادسة ولولم يضم لاشئ عليه لانه مظنون ثم انما يبطل فرضه بوضع الجبهة عند ابي يوسفؒ لانه سجود كامل وعند محمدؒ برفعه لان تمام الشئ بآخره وهوالرفع ولم يصح مع الحدث وثمرة الاختلاف تظهر فيما اذا سبقه الحدث في السجود بنى عند محمدؒ خلافا لابي يوسفؒ.

ترجمہ:- اور اگر پانچویں رکعت کو سجدہ سے مقید کر دیا تو پڑھی ہوئی چار رکعتوں کی فرضیت ختم ہو گئی، یہ ہمارے نزدیک ہے مگر اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، ختم ہونے کی ہماری دلیل یہ ہے کہ اس کا نفل نماز کو شروع کرنے کا عمل پختہ ہو گیا ہے اور ابھی تک فرض نماز کے پورے ارکان مکمل نہیں ہوئے، حالانکہ نفل کے لئے یہ لازم ہے کہ فرض کی ادائیگی سے پورے طور پر فارغ ہو چکا ہو، ایک رکعت ایک سجدہ کے ساتھ ہونے سے ہی حقیقۃً ایک نماز ہے، یہاں تک کہ ایک ایسا شخص جس نے یہ قسم کھائی ہو کہ وہ نماز نہیں پڑھیگا، اس کے صرف ایک رکعت میں سجدہ ملا لینے سے ہی وہ قسم میں حانث ہو جائے گا، پھر اس کی پڑھی ہوئی فرض نماز نفل سے بدل گئی ہے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کا یہی مذہب ہے لیکن امام محمدؒ کا اختلاف ہے جیسا کہ بیان گذر گیا ہے اور اب وہ مزید ایک رکعت پڑھ لے جو چھٹی رکعت ہو گی، اس کے باوجود اگر یہ رکعت نہیں ملائی تو بھی اس پر کچھ لازم نہ ہو گا، کیونکہ یہ رکعت مظنون ہے، پھر نماز کی فرضیت باطل ہو گی پیشانی کو زمین میں رکھتے ہی ابو یوسفؒ کے نزدیک کیونکہ یہی مکمل سجدہ ہے، اور امام محمدؒ کے نزدیک سر کو زمین سے اٹھا لینے سے نماز فاسد ہو گی، کیونکہ کسی چیز کا مکمل ہونا اس کے آخر کے اعتبار سے ہوتا ہے، جو سر کے اٹھا لینے سے ہوتا ہے، اور حدث کے ساتھ سر اٹھانا صحیح نہیں ہے، صاحبینؒ کے آپس کے اختلاف کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہو گا جب کہ نمازی کو سجدہ کی حالت میں حدث ہو گیا ہو تو وہ شخص امام محمدؒ کے قول کے مطابق بناء کرے گا، بخلاف ابو یوسفؒ کے کہ ان کے نزدیک بناء نہیں کرے گا۔

توضیح: اگر قعدہ اخیرہ کئے بغیر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا یہانتک کہ اس کا سجدہ بھی کر لیا۔ اختلاف ائمہ۔ ان کے دلائل

وان قيد الخامسة بسجدة بطل فرضه عندنا خلافا للشافعيؒ لانه استحكم شروعه.....الخ

اگر پانچویں رکعت کو پانچویں رکعت سے مقید کر دیا تو اس کا فرض باطل ہو گیا ہمارے نزدیک، بخلاف امام شافعیؒ کے۔ ف اور امام مالک اور محمد رحمہم اللہ کے۔ ع۔ لانہ استحکم الخ ہماری دلیل ہے کہ فرض نماز کے مکمل ہونے سے پہلے ہی نفل نماز کی ابتداء ہو گئی اور یہ بھی پختگی کے ساتھ، اس لئے لازمی طریقہ سے فرض کی نماز سے باہر ہو جائیگا۔ ف اس طرح سے کہ نفل مستحکم ہو گئی ہے۔

وهذا لان الركعة بسجدة واحدة صلوة حقيقة حتى يحنث بها في يمينه لايصلي......الخ

یہ بات یعنی نفل کے اندر استحکام اس طرح سے ہوا کہ رکعت جو صرف ایک سجدہ کے حکم میں ہوتی ہو وہی در حقیقت نماز ہے۔ حتی یحنث الخ یہاں تک کہ اگر کسی نے یہ قسم کھائی کہ یہ نماز نہیں پڑھے گا تو صرف ایک رکعت میں ایک سجدہ ملانے سے ہی وہ حانث ہو جائیگا۔ ف جبکہ یہاں رکعت ایک سجدہ کے ساتھ باقی رہ گئی تو حقیقی نماز پالی گئی، جو کہ نفل ہے، اس بناء لامحالہ

فرض کی نیت سے نکل گیا اور جو نماز پڑھی اس کی فرضیت کا درجہ کم ہو گیا۔

وتحولت صلاته نفلا عند ابی حنیفه وابی یوسف خلافا لمحمد علی مامر ......الخ

یعنی اس کی فرض نماز نفل نماز سے بدل گئی، یہ حکم امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف کے نزدیک ہے۔ برخلاف امام محمد کے قول کے جس کی وجہ پہلے بیان کی گئی ہے۔ف کہ شیخین کے نزدیک وصف کے باطل ہونے سے اصل تحریمہ باطل نہیں ہوتا ہے تو اگرچہ فرضیت باطل ہو گئی ہے مگر نماز باقی رہ گئی جس کی حیثیت نفل کی رہیگی، لیکن امام محمد کے نزدیک تحریمہ ہی باطل ہو جاتا ہے۔فیضم الیها رکعة سادسة الخ اس بناء پر شیخین کے نزدیک ایک رکعت اور بھی ملالے تاکہ پوری چھ رکعتیں نفل ہو جائیں۔ف اگرچہ یہ وقت فجر وعصر ہی کا ہو تاکہ نفل کی رکعت جوڑی بن جائے اور بے جوڑ باقی نہ رہے۔

ولو لم یضم لاشئی علیه لانه مظنون ثم انما یبطل فرضه بوضع الجبهة عند ابی یوسف......الخ

اس کے باوجود اگر مزید ایک رکعت نہیں ملائی تو اس پر کوئی جرمانہ نہ ہوگا۔ لانه مظنون الخ کیونکہ وہ مظنون ہے۔ف کیونکہ یہ نفل بغیر نیت کے شروع ہو گئی ہے اس لئے اس کی قضاء لازم نہ ہوگی، اور صحیح یہ ہے کہ اس پر سجدۂ سہو بھی لازم نہیں ہے۔ف ثم انها الخ فرض کے باطل ہونے کا حکم ابو یوسف کے نزدیک اسی وقت دیا جائیگا جبکہ پانچویں رکعت کے سجدہ کے لئے زمین پر سر رکھا، کیونکہ یہ مکمل سجدہ ہو گیا ہے۔ف کیونکہ سجود کے معنی ہیں حقیقت میں پیشانی رکھنی۔

وعند محمد برفعه لان تمام الشئی بآخره وهو الرفع ولم یصح مع الحدث......الخ

اور امام محمد کے نزدیک اس وقت باطل ہونے کا حکم دیا جائیگا جبکہ سر اٹھالے، کیونکہ کسی چیز کے تمام ہونے کا حکم اس کے آخر میں دیا جاتا ہے۔ف جبکہ سجدہ کی ابتداء سر کا ٹیکنا ہے اور آخر سر اٹھانا ہے۔ف سر اٹھاتے ہی سجدہ تمام ہو گیا، اور اس کا فرض باطل ہو گیا۔ولم یصح الخ اور یہ سر اٹھانا حدث کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ف اس لئے یہ بات ضروری ہوئی کہ سر اٹھانے تک طہارت باقی ہے، فتوی کے لئے امام محمد کا قول مختار ہے، جیسا کہ فخر الاسلام نے کہا ہے۔ ن ع ف۔ اور مصنف نے بھی آگے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وثمرة الاختلاف تظهر فیما اذا سبقه الحدث فی السجود بنی عند محمد خلافا لابی یوسف......الخ

اس اختلاف کا نتیجہ اس صورت میں ظاہر ہوگا کہ جب سجدہ کی حالت میں اسے حدث ہو گیا ہو۔ف تو امام ابو یوسف کے نزدیک اس کی فرضیت باطل ہو چکی۔بنی عند محمد الخ اس لئے امام محمد کے نزدیک فرض پر بناء جائز ہے، کیونکہ ابھی تک سجدہ پورا نہیں ہوا ہے، کیونکہ حدث کے رہتے ہوئے سجدہ پورا نہیں ہوا ہے لہذا وہ نیا وضوء کر کے آئے اور بیٹھ کر قعدہ میں تشہد پڑھے، اور سلام کر کے سجدہ سہو ادا کرے، پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیرے، اب اس کا فرض پورا ہوا، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے۔ ھ۔ عود کرنے اور نہ کرنے میں امام کا اعتبار کیا جائیگا، چنانچہ اگر امام نے عود کیا اور قوم کو معلوم نہ ہو سکا اور انہوں نے پانچویں رکعت کا سجدہ کرنے سے بھی ان مقتدیوں کی نماز باطل نہ ہوگی، بشرطیکہ امام نے بغیر سجدہ کے قعدہ اخیرہ کی طرف لوٹ آیا ہو، د۔ یہ تمام صورتیں اس صورت کی ہیں کہ قعدہ اخیرہ نہ کیا ہو۔

ولو قعد فی الرابعة ثم قام ولم یسلم عاد الی القعدة مالم یسجد للخامسة وسلم، لان التسلیم فی حالة القیام غیر مشروع وامکنه الاقامة علی وجهه بالقعود لان ما دون الرکعة بمحل الرفض، وان قید الخامسة بالسجدة ثم تذکر ضم الیها رکعة اخری، واتم فرضه، لان الباقی اصابة لفظ السلام وهی واجبة، وانما یضم الیها اخری لتصیر الرکعتان نفلا، لان الرکعة الواحدة لا تجزیه لنهیه علیه السلام عن البتیرا، ثم لا تنوبان عن سنة الظهر هو الصحیح، لان المواظبة علیها بتحریمة مبتدأة.

ترجمہ: اور اگر چوتھی رکعت میں بیٹھا مگر سلام پھیرے بغیر کھڑا ہو گیا تو جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو بیٹھ جائے

اور سلام پھیر دے، اس لئے کھڑے کھڑے سلام پھیرنا مشروع اور ثابت نہیں ہے بالخصوص اس صورت میں جبکہ بیٹھ کر سلام پھیرنا جو شروع طریقہ ہے اس کے لئے ممکن بھی ہے، کیونکہ رکعت سے کم چھوڑی جاسکتی ہے، اور اگر پانچویں رکعت کو سجدہ سے مقید کر دیا یعنی سجدہ بھی کر لیا، پھر اسے یاد آیا تو اس رکعت کے ساتھ ایک رکعت اور بھی ملالے اور اپنا فرض پورا کرلے کیونکہ صرف لفظ سلام کہہ کر فارغ ہونا ہی ایک کام باقی ہے جو کہ واجب ہے، اور اس دوسری رکعت کو قصداً پڑھنے کا مقصد یہ ہے کہ فرض کے بعد کی دو رکعتیں اس کے لئے نفل نماز ہو جائے، کیونکہ صرف ایک رکعت اس کے لئے کسی کام کی نہ ہوگی کیونکہ صرف ایک رکعت بُتَیْراً کہلاتی ہے اور اس کے پڑھنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، اور یہ فاضل دو رکعتیں اس کے لئے فرض کے بعد کی دو رکعتوں کے قائم مقام نہیں ہوں گی، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ مستقل نیت سے پڑھی ہے۔

توضیح: اگر چوتھی رکعت میں بیٹھ کر بھی سلام پھیرے بغیر کھڑا ہو گیا پانچویں رکعت کا سجدہ نہیں کیا یا کر لیا

ولو قعد فی الرابعة ثم قام ولم یسلم عاد الی القعدة مالم یسجد للخامسة وسلم......الخ

اگر چوتھی رکعت میں مقدار تشہد بیٹھا پھر پانچویں رکعت کے لئے کھڑا ہو گیا لیکن سلام نہیں پھیرا، اس طرح سلام پھیرنے میں تاخیر کر دی، تو قعدہ کے لئے لوٹ آئے جب تک پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو، پھر سلام پھیر دے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا اور سجدہ سہو کیا۔ ع۔ اور اگر قعدہ کی طرف نہیں لوٹا اور کھڑے ہی کھڑے سلام پھیر دیا تو فرض نماز کے صحیح ہونے کا حکم دیا جائیگا، لیکن سلام پھیرنے کے لئے یہ ثابت شدہ طریقہ کے خلاف ہے۔

لان التسلیم فی حالة القیام غیر مشروع وامکنه الاقامة علی وجهه بالقعود......الخ

کیونکہ کھڑے ہونے کی حالت میں سلام پھیرنا شروع نہیں ہے، اور جس طرح شروع ہے اسی طرح کرنا بیٹھ کر ممکن ہے۔ ف لہذا بیٹھ جائے اور پانچویں رکعت کا جتنا حصہ پڑھا ہے وہ کسی شمار میں نہ آئیگا۔ **لان ما دون الخ** کیونکہ رکعت سے کم ہونے سے چھوڑا جاسکتا ہے۔ ف۔ پھر کیا مقتدی حضرات بھی امام کی اتباع کریں؟ تو جواب یہ ہے کہ ہاں اتباع کریں چنانچہ اگر امام قعدہ کے لئے لوٹ آئے تو وہ لوگ بھی اس کے ساتھ لوٹ آئیں، اور اگر وہ قصداً نفل نماز پوری کرتا رہے تو یہ مقتدی بھی اس کی پیروی کرتے جائیں، مگر صحیح قول وہ ہے، جو امام ابو بکر البلخیؒ نے ہمارے ائمہ اصحاب سے ذکر کیا ہے کہ مقتدی حضرات اس بدعت میں امام کی پیروی نہ کریں، بلکہ انتظار کریں، پھر جب وہ پانچویں کے سجدہ سے پہلے سلام کرنے کے لئے لوٹ آئے تو وہ اس کی اتباع کرلیں، اور اگر وہ پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کرلے تو یہ لوگ اسی وقت سلام پھیر دیں، ظاہر ہے کہ اگر آخری قعدہ کرنے سے پہلے کھڑا ہو جائے تو لوگ اس کی اتباع نہ کریں۔ المحیط والتمر تاشی۔ مف۔ یہ احکام اس وقت ہوں گے کہ پانچویں رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو۔

وان قید الخامسة بالسجدة ثم تذکر ضم الیها رکعة اخری، واتم فرضه......الخ

اور اگر امام نے پانچویں رکعت کا سجدہ بھی کرلیا پھر اسے یاد آیا۔ **ضم الیها الخ** تو پانچویں کے ساتھ ایک رکعت مزید ملالے۔ ف مبسوط سے ایسا کرنا یعنی رکعت ملانا واجب ثابت ہوتا ہے۔ ع۔ اگرچہ فجر، عصر، اور مغرب کی نمازیں ہوں۔ مف۔ **وتم فرضه** اور اس کا فرض پورا ہو گیا۔ **لان الباقی الخ** کیونکہ اب تو صرف سلام پھیرنا ہی واجب باقی رہ گیا ہے۔ ف الحاصل اس وقت نہ کوئی رکن چھوٹا نہ کوئی فرض چھوٹا، پس فرض نماز پوری ہو گئی، صرف ایک واجب باقی رہا جس کو مکمل کرنے کے لئے سجدہ سہو ہے۔

وانما یضم الیها اخری لتصیر الرکعتان نفلا، لان الرکعة الواحدة لا تجزیه......الخ

اور دوسری رکعت ملانے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ نفل کی دو رکعتیں پوری ہو جائیں، کیونکہ صرف ایک رکعت تنہا جائز نہیں ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بُتیرا (اکیلی ناقص) سے منع فرمایا ہے۔ ف جیسا کہ باب الوتر میں ابن عبد البر کی تمہید سے گذر

گیا ہے۔ ز۔اب سوال یہ ہے کہ یہ پڑھی ہوئی دو رکعتیں ظہر کی آخری دو رکعت سنت کے قائم مقام ہوں گی یا نہیں؟ تو فرمایا۔ثم لا ینوبان الخ پھر یہ دونوں رکعتیں ظہر کی دو رکعت سنت کے قائم مقام نہ ہوں گی۔ یہی قول صحیح ہے۔لان المواظبة الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دو رکعتیں ہمیشہ مستقل نیت اور تحریمہ سے پڑھی ہیں۔

ویسجد للسهو استحسانا لتمكن النقصان فى الفرض بالخروج لا على الوجه المسنون وفى النفل بالدخول لا على الوجه المسنون ولو قطعها لم يلزمه القضاء لانه مظنون ولواقتدى به انسان فيهما يصلى ستا عند محمدؒ لانه المؤدى بهذه التحريمة وعندهما ركعتين لانه استحكم خروجه عن الفرض ولو افسده المقتدى لا قضاء عليه عند محمد اعتبارا بالامام وعند ابى يوسفؒ يقضى ركعتين لان السقوط بعارض يخص الامام.

ترجمہ:-اور دلیل استحسان کی بناء پر سجدہ سہو کر لے کیونکہ فرض کی ادائیگی میں یہ کمی آگئی ہے کہ اس نماز سے مسنون طریقہ سے فارغ نہیں ہوا ہے، اور نفل میں اس وجہ سے کہ اس میں مسنون طریقہ سے داخل نہیں ہوا ہے، اور اگر اس نفل کو باطل کر دے تو اس کی قضاء لازم نہیں آئیگی، کیونکہ وہ مظنون ہے، اور اگر اس نمازی کی ان دونوں رکعتوں میں کسی نے اقتداء کر لی تو امام محمدؒ کے مذہب کے مطابق چھ رکعتیں پڑھے، کیونکہ اس تحریمہ سے چھ ہی رکعتیں ادا کی گئیں ہیں، اور شیخینؒ کے نزدیک دو ہی رکعتیں پڑھے کیونکہ اس سے اس کا نکلنا مستحکم ہو گیا ہے، اور اگر مقتدی نے اسے فاسد کر دیا ہو تو امام محمدؒ کے مسلک کے مطابق امام پر قیاس کرتے ہوئے اس مقتدی پر بھی قضاء لازم نہ ہو گی، لیکن امام ابو یوسفؒ کے مسلک کے مطابق وہ دو رکعتوں کی قضاء کرے گا، کیونکہ کسی عارض کی وجہ سے ساقط ہو جانا صرف امام کے لئے ہے۔

توضیح:-اگر نفل مظنون کو کسی نے قطع کر دیا تو اس کی قضاء لازم نہ ہو گی نفل مظنون میں اگر کسی نے اقتداء کی تو کتنی رکعتیں پڑھنی ہو نگی

ویسجد للسهو استحسانا لتمكن النقصان فى الفرض بالخروج لا على الوجه المسنون......الخ

اور دلیل استحسان سے سجدۂ سہو کرے، ف یہی مذہب مختار ہے، الکفایہ، لتمكن النقصان الخ کیونکہ فرض اور نفل دونوں نمازوں میں کمی واقع ہو گئی ہے، فرض میں اس وجہ سے کہ مسنون طریقہ سے فرض سے نکلنا میسر نہ ہوا، ف یعنی لفظ سلام کہہ کر نکلنا جو واجب طریقہ تھا وہ نہ ہو سکا یہی قول امام محمدؒ کا ہے، وفى النفل الخ اور نفل میں اس وجہ سے کہ مسنون طریقہ سے شروع نہیں کیا جا سکا ہے، ف یعنی بطریقہ واجب نہ ہوا، بقول امام ابو یوسفؒ۔ف۔ ولو قطعها الخ اور اگر اس نفل کو قطع کر دیا تو قضاء لازم نہ ہو گی، لانه مظنون الخ کیونکہ وہ مظنون ہے۔ف کیونکہ اسے مستقل تحریمہ سے شروع نہیں کیا گیا ہے بلکہ فرض کے گمان سے پانچویں کو شروع کیا تھا، حالانکہ اس پر کوئی فرض باقی نہیں رہ گیا تھا۔

ولو اقتدى به انسان فيهما يصلى ستا عند محمدؒ لانه المؤدى بهذه التحريمة......الخ

اور اگر اس نفل میں اس نمازی کے ساتھ کسی نے نماز کی شرکت اقتداء کی تو امام محمدؒ کے نزدیک مقتدی پوری چھ رکعتیں ہی پڑھے کیونکہ اس تحریمہ سے اتنی تعداد (چھ رکعتیں) ادا کی گئیں ہیں، ف جیسے شیخینؒ کے نزدیک قعدہ اخیرہ بھول کر چھ رکعتیں پڑھنے کی صورت میں مقتدی چھ پڑھیگا، جیسا کہ محیط میں ہے۔ع۔

وعندهما ركعتين لانه استحكم خروجه عن الفرض......الخ

اور شیخینؒ کے نزدیک صرف دو رکعتیں پڑھیگا۔ف صحیح یہ ہے کہ اس مسئلہ کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ کا قول متقدمین کی کتابوں میں مذکور نہیں ہے، بلکہ صرف ابو یوسفؒ کا قول مذکور ہے، البتہ خلاصہ میں مصنفؒ کے اس قول کے مطابق مذکور ہے۔مع۔شاید کہ یہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر قیاس ہے، جیسا کہ مصنفؒ نے آئندہ اشارہ فرمایا ہے۔

لانه استحکم خروجه عن الفرض ولو افسده المقتدی لا قضاء علیه عند محمد......الخ

کیونکہ فرض سے اس کا نکلنا یقینی اور مستحکم ہو گیا، ولوافسده الخ اگر مقتدی نے اسے فاسد کر دیا تو امام محمدؒ کے نزدیک امام کی قضاء پر قیاس کرتے ہوئے اس پر بھی قضاء نہیں ہو گی، ف کیونکہ امام پر قضاء نہیں ہے، اس لئے اگر مقتدی پر ہو تو ایسی مثال ہو گی جیسے فرض پڑھنے والے کی اقتداء نفل پڑھنے والے کے پیچھے ہو، وعند ابی یوسف الخ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک، ف اس پر قضاء ہے، یقضی الخ یعنی وہ دو رکعتیں قضاء کر لے، کیونکہ کسی مجبوری سے قضاء کا ساقط ہونا امام کے لئے مخصوص ہے، ف وہ مجبوری یہ ہے کہ امام نے تو فرض کے ادائیگی کے خیال سے نماز شروع کی تھی حالانکہ یہ اس کا بھول تھا، بخلاف مقتدی کے کہ اس نے تو اپنے خاص ارادہ کے ساتھ اقتداء کی ہے، اور اصل یہ ہے کہ صلوۃ مظنونہ مقتدی پر لازم نہیں ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک لازم ہے، اور نفل بغیر عوض اور جرمانے کے ثابت نہیں ہے بشرطیکہ اس کے کرنے کا پختہ ارادہ ہو اسی بناء پر نابالغ اور احمق پر ارادہ کے تصور سے بھی لازم نہیں ہوتا ہے، جیسا کہ فخر الاسلامؒ نے یہ بات نوادر سے نقل کی ہے، اور یہاں امام ابو یوسفؒ کے قول پر فتوی دیا ہے، مع۔

ف۔ پھر یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اگر عصر میں قعدہ اخیرہ کے بعد پانچویں رکعت پڑھ لے یا فجر میں تیسری یا مغرب میں چوتھی تو بھی ایک ایک رکعت ملالے، کیونکہ فجر اور عصر کے بعد ایسی نفل سے ممانعت کی گئی ہے جو ارادہ کے ساتھ شروع کی گئی ہو، میں مترجم کہتا ہوں کہ لایتحری احدکم الخ کی حدیث اس پر دلالت کرتی ہے کیونکہ ان اوقات میں بالقصد پڑھنے سے منع فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ بغیر ارادہ نفل شروع ہو جانے سے اس کو پورا کر دینا ممنوع نہیں ہے، اور یہی اصح ہے۔م۔

قال ومن صلی رکعتین تطوعا فسهی فیهما وسجد للسهو ثم اراد ان یصلی اخریین لم یبن لان السجود یبطل لوقوعه فی وسط الصلوة بخلاف المسافر اذاسجد للسهو ثم نوی الاقامة حیث یبنی لانه لولم یبن یبطل جمیع الصلوة ومع هذا لوادی صح لبقاء التحریمة ویبطل سجود السهو هو الصحیح ومن سلم وعلیه سجدتا السهو فدخل رجل فی صلوته بعد التسلیم فان سجد الامام کان داخلا والا فلاوهذا عند ابی حنیفه وابی یوسفؒ.

ترجمہ:- امام محمدؒ نے جامع صغیر میں کہا اور جس شخص نے نفل نماز کی دو رکعتیں پڑھیں اور ان میں غلطی کر دی نتیجہ کے طور پر سجدۂ سہو بھی کر لیا اس کے بعد اگر وہ یہ چاہے کہ ان کے ساتھ ہی دو رکعتیں اور بھی پڑھ لے تو وہ ایسا نہیں کر سکتا، یعنی بناء نہیں کر سکتا ہے کیونکہ سجود سہو نماز کے بیچ میں ہونے کی وجہ سے اس زائد کو باطل کرتا ہے بخلاف مسافر کے جبکہ اس نے سجدہ سہو کرنے کے بعد ہی اقامت کی نیت کر لی تو وہ اس پر بناء کرتے ہوئے بقیہ نماز اقامت پڑھ سکتا ہے اگر بناء کرنے اور دو رکعت پڑھ لے تو اس کی نماز بھی صحیح ہو جائیگی کیونکہ اس کا تحریمہ تو ہنوز باقی ہے ساتھ ہی اس کا سجود سہو باطل ہو جائیگا، یہی صحیح ہے۔

توضیح:- مسافر نے سجدہ سہو کرنے کے بعد اقامت کی نیت کر لی ہو تب بھی اس پر بناء کر سکتا ہے

نمازی نے سلام پھیرا اور اس پر سجدہ سہو باقی ہے، اسی حالت میں دوسرے نے اس کی اقتداء کر لی دلیل قیاسی

قال ومن صلی رکعتین تطوعا فسهی فیهما وسجد للسهو ثم اراد ان یصلی اخریین لم یبن......الخ

امام محمدؒ نے جامع صغیر میں کہا کہ جس شخص نے دو رکعت نماز پڑھی اور اس میں سہو کر لیا اس بناء پر اس کا سجدہ ادا کر لیا پھر دو رکعتیں اور بھی پڑھ لے تو وہ اس وقت نہیں پڑھ سکتا ہے، ف یعنی اسے بناء کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ فع۔ لان السجود الخ کیونکہ سجدہ سہو اسے باطل کرتا ہے، کیونکہ سجدہ سہو نماز کے درمیان آجائے گا جو کہ ثابت نہیں البتہ بخلاف المسافر الخ بخلاف مسافر کے جب کہ اس نے سہو کی وجہ سے سجدہ کیا پھر سلام پھیرنے سے پہلے اقامت کی نیت کر لی، ف اس نیت کی وجہ

سے اب اس پر چار رکعتیں ہو گئیں اس وجہ سے اسے مزید دو رکعتیں پڑھنی ہو نگی اگر چہ یہاں درمیان میں سجدہ سہو واقع ہو جائیگا۔

لانہ لولم یبن یبطل جمیع الصلوۃ ومع ھذا لوادی صح لبقاء التحریمۃ ویبطل.....الخ

کیونکہ اگر مسافر بناء نہیں کرے گا تو اس کی پوری نماز ہی باطل ہو جائیگی، ف لیکن نفل پڑھنے والے کی پوری باطل نہ ہو گی، ومع ھذا الخ اس کے باوجود کہ نفل پڑھنے والے کو بناء نہیں کرنی چاہئے اگر وہ بناء کرے اور نماز پڑھنا شروع کردے تو وہ بھی صحیح ہو جائے گی، کیونکہ ابھی تک اس کا تحریمہ باقی ہے، ف جب کہ تحریمہ کا باقی رہنا ہی شرط ہے، یہ تو غیر ظاہر الروایۃ ہے۔ع۔ ویبطل سجود الخ اور سجدۂ سہو جو کیا تھا وہ باطل ہو گیا، یہی قول صحیح ہے۔ف۔ یہی قول مختار ہے۔المحیط۔ لہٰذا سجدہ سہو دوبارہ کرلے، اسی طرح مسافر بھی آخر میں دوبارہ کرلے۔التبیین۔ ھ۔

ومن سلم وعلیہ سجدتا السھو فدخل رجل فی صلوتہ بعد التسلیم.....الخ

ایک ایسے شخص نے جس پر سجدہ سہو باقی تھا نماز سے فارغ ہونے کے لئے سلام پھیرا، فدخل رجل الخ اتنے میں ایک اور شخص اس مصلی کی نماز میں داخل ہوا، ف یعنی اس کی اقتداء کرلی تو یہ اقتداء اسی حالت میں صحیح مانی جائیگی جب کہ امام اس سلام کی وجہ سے نماز سے فارغ نہ ہوا ہو، اور اس کا فارغ ہونا سجدہ کرنے پر موقوف ہے۔

فان سجد الامام کان داخلا والا فلا وھذا عند ابی حنیفہ وابی یوسفؒ.....الخ

اس طرح سے کہ اگر اس امام نے سجدہ سہو ادا کرلیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ ابھی تک اس کی نماز کا کچھ باقی ہے تو یہ مقتدی اس نماز میں داخل ہو گیا، و الا فلا، اور اگر امام نے سجدہ سہو ادا نہیں کیا تو وہ نماز سے فارغ ہو گیا اور مقتدی نماز میں داخل نہیں ہوا، وھذا عند الخ اور یہ حکم اس تفصیل کے ساتھ امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے۔

وقال محمدؒ ھو داخل سجد الامام اولم یسجد لان عندہ سلام من علیہ السھو لا یخرجہ عن الصلوۃ اصلا لانھا وجبت جبرا للنقصان فلا بد ان یکون فی احرام الصلوۃ وعندھما یخرجہ علی سبیل التوقف لانہ محلل فی نفسہ وانما لا یعمل لحاجتہ الی اداء السجدۃ فلا یظھر دونھا ولا حاجۃ علی اعتبار عدم العود ویظھر الاختلاف فی ھذا وفی انتقاض الطھارۃ بالقھقھۃ وتغیر الفرض بنیۃ الاقامۃ فی ھذہ الحالۃ.

ترجمہ:-اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ وہ اب تک نماز کی حالت میں باقی ہے امام نے سجدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو کیونکہ ان امام محمدؒ کے نزدیک اصل یہ ہے کہ جس شخص کے ذمہ سجدہ سہو باقی ہو اس کا سلام پھیر دینا اسے نماز سے مطلقاً خارج نہیں کرتا ہے، کیونکہ سجدہ سہو نماز کی کمی کو پورا کرنے ہی کے لئے واجب ہوا ہے اس لئے یہ ضروری ہے پورا کرنے والا احرام کی حالت میں باقی ہو، لیکن امام اعظم اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک سلام اسے نماز سے خارج کر دیتا ہے مگر ذرا انتظار کے ساتھ، کیونکہ سلام تو خود ہی حلال کرنے والا (نماز سے خارج کر دینے والا) ہوتا ہے، اسی وجہ سے اس جگہ اپنا عمل (تحلیل کا) نہیں کرتا ہے کہ نمازی کو سجدہ سہو ادا کرنے کی ضرورت ہے، پس بغیر سجدہ کے یہ روک ظاہر نہ ہو گی، اور جب کہ وہ سجدہ سہو ادا نہیں کرتا ہے تو اسے سلام کے عمل کو روکنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی ہے، ائمہ کے اس اختلاف کا نتیجہ ایک تو اسی مثال سے ہو گا، اس کے علاوہ اسی حالت میں قہقہہ مار کر ہنسنے سے وضوء کا ٹوٹنا، اور اقامت کے نیت سے فرض کی رکعتوں کا بدل جانا ہے۔

توضیح:-امام پر سجدہ سہو باقی رہنے کی صورت میں دوسرے کا اس کی اقتداء کرنا اس میں امام محمدؒ اور شیخینؒ کے درمیان اختلاف اور ان کی دلیلیں

وقال محمدؒ ھو داخل سجد الامام اولم یسجد لان عندہ سلام من علیہ السھو.....الخ

امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اقتداء کرنے والا بہر حال اپنے امام کی نماز میں داخل ہوا ہے، خواہ وہ امام سجدہ سہو کرے یا نہ کرے،

لان عنده الخ کیونکہ امام محمدؒ کے نزدیک ایسے شخص کا سلام پھیرنا جس پر سہو لازم ہے اسے نماز سے مطلقاً خارج نہیں کرتا ہے، یعنی اس کے لئے انتظار کرے یا انتظار نہ کرے، **لانها وجبت الخ** کیونکہ سجدہ سہو تو اس لئے واجب کیا گیا تاکہ نماز میں غلطی کی وجہ سے جو کمی واقع ہو گئی ہے وہ اس کے ذریعہ پوری ہو جائے، **فلابد الخ** لہٰذا یہ بات ضروری ہو گئی کہ یہ پوری کرنے والا نماز کے احرام میں ہو۔

ف۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ ترجمہ عینیؒ کے موافق ہے، لیکن میرے نزدیک **فلابد ان یکون الخ** کا بہتر ترجمہ یہ ہوگا، پس ضروری ہے کہ وہ نماز کی حالت میں ہو، اس طرح دلیل کا خلاصہ یہ ہوگا کہ جس نے سلام پھیر دیا اس پر اب بھی سجدہ سہو باقی اور واجب ہے، اب واجب ہونا اسی صورت میں مفید ہوگا جب کہ وہ نماز کے احرام میں بھی موجود ہو اور سلام پھیر دینے کی وجہ سے نماز سے خارج نہ ہوا ہو، تاکہ وہ اس سجدہ کو ادا کر سکے جو اس پر واجب ہے، کیونکہ یہ سجدہ تو خود نماز کی اندرونی کمی کو پورا کرنے والا ہے، اور ایسی بات نہیں ہے کہ نماز کے ساتھ علیحدہ سے سجدہ بھی واجب ہے، تاکہ نماز کے بعد اس واجب کو ادا مفید ہو، اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس شخص کو سلام نماز سے خارج نہیں کرے گا۔

وعندهما یخرجه علی سبیل التوقف لانه محلل فی نفسه وانما لا یعمل لحاجته.....الخ

اور شیخین کے نزدیک سلام اسے خارج کر دیگا مگر ذرا توقف کے ساتھ، ف یعنی سلام کے ذریعہ نماز سے خارج ہونا اسی وقت معلوم ہوگا کہ امام سجدہ نہ کرے چنانچہ اگر اس نے سجدہ نہیں کیا تو مقتدی نماز سے خارج ہو گیا۔

لانه محلل فی نفسه وانما لا یعمل لحاجته الی اداء السجدة فلا یظهر دونها.....الخ

کیونکہ سلام تو خود ہی نماز سے تحلیل (فارغ) کر دینے والا ہے، ف جیسا کہ حدیث میں ہے **تَحلیلُهَا التَّسلیمُ**، مگر کسی خاص مجبوری کی وجہ سے اس کا اثر ظاہر نہ کرنا ممکن ہے، **وانما لایعمل الخ** اور اس مسئلہ میں سلام اپنا کام یعنی نماز سے فارغ کر دینے کا نہیں کرتا ہے کہ نمازی کو سجدہ سہو ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ **فلایظهر الخ** تو بغیر سجدہ کے یہ رکاوٹ ظاہر نہ ہو گی، ف اور سلام کا کام ظاہر ہو جائے گا **ولاحاجة الخ** اور عود نہ کرنے کی صورت میں کوئی حاجت نہیں ہے، ف یعنی اس صورت میں کہ وہ سلام کے بعد سجدہ سہو ادا نہ کرے تو کچھ حاجت ثابت نہ ہو گی، لہٰذا سلام کے اثر کو کوئی چیز روکنے والی نہ ہو گی۔ م۔ پس یہ اختلاف اصل ہے اور نتیجہ ہے اس کا جن صورتوں میں وہ ظاہر ہو گا، ان صورتوں کو اس طرح بیان کیا جا رہا ہے۔

ویظهر الاختلاف فی هذا وفی انتقاض الطهارة بالقهقهة.....الخ

اس اختلاف کا فائدہ ایک اسی مذکور مسئلہ میں ہے، ف یعنی ایسا شخص جس پر سجدۂ سہو باقی تھا اس کی کسی نے اقتداء کر لی اس کے سلام پھیر دینے کے بعد تو امام محمدؒ کے نزدیک اقتداء صحیح ہو گی، اور شیخینؒ کے نزدیک اگر سلام کے بعد امام نے سجدہ بھی کر لیا جب تو یہ اقتداء صحیح ہو گی ورنہ نہیں، **وفی انتقاض الخ** قہقہہ سے نماز کے لوٹ جانے میں، ف یعنی اگر اسی حالت میں امام قہقہہ مار کر ہنس پڑے تو امام محمدؒ و زفرؒ کے نزدیک اس کا وضوء ختم ہو جائیگا اور شیخین کے نزدیک وضوء ختم نہ ہو گا، اور مقتدی کا بھی یہی حکم ہو گا، ع۔ ف۔

وتغیر الفرض بنیة الاقامة فی هذه الحالة.....الخ

اور مسافر کا اسی حالت میں اقامت کی نیت سے فرض کا متغیر ہو جانا ہے، ف، یعنی امام مسافر نے قصر کی دو رکعت سے نماز کے اندر اقامت کی نیت کر لی جب کہ اس پر سجدہ سہو ادا کرنا لازم باقی تھا، اس کے بعد سلام پھیر دیا تو امام محمدؒ و زفرؒ کے نزدیک چونکہ اسی نماز قصر میں اقامت کی نیت کر لی ہے، اس لئے اب اس پر چار رکعت نماز لازم ہو گئی ہے، اور شیخینؒ کے نزدیک اس کی نماز میں کوئی فرق نہیں آئیگا، یعنی دو ہی رکعت لازم رہ جائیگی، اور چار لازم نہ ہو گی، خواہ امام سجدۂ سہو کرے یا نہ کرے۔

ومن سلم یرید به قطع الصلوة وعلیه سهو فعلیه ان یسجد لسهوه لان هذا السلام غیر قاطع ونیته تغییر

للمشروع فلغت.

ترجمہ:-اور کسی ایسے شخص نے جس پر سجدہ سہو باقی تھا نماز سے فارغ ہونے کی نیت سے سلام پھیر دیا پھر بھی اس پر لازم ہوگا کہ سجدہ سہو ادا کرے، کیونکہ یہ سلام باقی نماز ختم نہیں کرتا ہے، چونکہ اس کی نیت شروع اور ثابت شدہ معاملہ کو بدل ڈالنا ہے اس لئے یہ نیت لغو اور بے اثر ہو جائیگی۔

توضیح:-ایسے شخص نے کہ جس پر سجدہ سہو باقی ہے اگر نماز سے فراغت کے لئے سلام پھیر دیا ہو، نماز عشاء میں سہو اور آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ نہیں کیا ایک رکعت کا سجدۂ نمازی چھوڑ کر سلام پھیر دیا، شک اور اس کی قسمیں

ومن سلم یرید به قطع الصلوة وعلیه سهو فعلیه ان یسجد لسهوه......الخ

مطلب واضح ہے، وعلیه سهو الخ حالانکہ اس پر سجد سہو باقی ہے، ف تو وہ بالاتفاق اس نیت کی وجہ سے نماز سے فارغ نہ ہوگا، فعلیه ان یسجد الخ تو اس پر واجب ہے کہ اپنے سہو کا سجدہ کرلے، ف قبل اس کے کہ اُٹھ کر پھر جائے یا کسی سے بات کرے یا مسجد سے نکل جائے، جیسا کہ اصل میں ہے۔ع۔ یعنی کسی مفسد نماز پائی جانے سے پہلے، صرف اُٹھنا مفسد نہیں ہے جب تک کہ بیٹھ قبلہ کی جانب نہ ہو جائے۔ع۔م۔ل

لان هذا السلام غیر قاطع ونیته تغییر للمشروع فلغت......الخ

کیونکہ یہ سلام نماز ختم نہیں کرتا ہے، ف بالاتفاق کیونکہ شیخین کے نزدیک سلام سے اگرچہ نمازی نماز سے نکل جاتا ہے، مگر سجدہ کی ضرورت ابھی تک ہے اس لئے تحریمہ باقی ہے اس وقت کے لئے کہ اس کے کسی دوسرے عمل سے یہ معلوم ہو جائے کہ تحریمہ ختم کر دیا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس کی نیت کو کافی ہونا چاہئے، تو جواب یہ ہوگا، ونیته الخ چونکہ اس کی نیت یہ ہے کہ شروع کام کو بدل دے اس لئے اس کی نیت ہی لغو ہو جائیگی۔

چند ضروری مسائل

ایک شخص نے عشاء کی نماز میں سہو کیا اور آیت سجدہ پڑھی مگر سجدہ نہیں کیا کسی اور رکعت میں صرف ایک سجدہ کیا اور دوسرا چھوڑ دیا پھر سلام پھیر دیا، تو اس جگہ چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) یہ سب کام بھول کر ہوئے ہوں۔(۲) سب کام قصداً کئے ہوں۔(۳) سجدہ تلاوت تو نسیاناً ہوا ہو لیکن نماز کا سجدہ عمداً چھوڑا ہو۔(۴) نماز کا سجدہ بھول سے چھوٹ گیا ہو لیکن تلاوت کا سجدہ قصداً چھوڑا ہو۔ پس پہلی صورت میں بالاتفاق نماز فاسد نہ ہوگی کیونکہ وہ سلام پھیرنے کے باوجود تحریمہ سے فارغ نہیں ہوا ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ اس پہلی صورت میں ایک شرط یہ ہوگی کہ نمازی سجدہ کو گفتگو وغیرہ (مفسد نماز) سے پہلے قضاء کر چکا ہو۔م۔ اور دوسری اور تیسری صورت میں بالاتفاق نماز فاسد ہوگی، اور چوتھی صورت میں ظاہر الروایۃ کے مطابق نماز فاسد ہوگی، المحیط، اگر سجدہ سہو میں سہو کیا ہو تو اس سے بالاتفاق سجدۂ سہو واجب نہیں ہوتا ہے۔ التہذیب۔

اگر سجدہ سہو کے کرنے اور نہ کرنے میں اشتباہ ہو رہا ہو تو اپنی تحری پر عمل کرے یعنی اگر اس بات پر دل جم جائے کہ میں نے کر لیا ہے تو اب دوبارہ نہ کرے، ورنہ کرلے، اور اگر نماز میں کئی بار سہو کئے ہوں تو صرف ایک بار سجدۂ سہو کرلے، الخلاصہ، اگر رات کی سنت اور نفل نمازوں میں امامت کی اور قصداً قراءت آہستگی سے کی تو برا کیا اور اگر سہو آگیا تو اس پر سجدہ سہو لازم ہے، قاضی خان، اگر وتر یا تراویح میں جہر نہیں کیا تو سجدہ سہو لازم ہے، التاتارخانیہ بحوالہ التتمہ۔ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب

کہ جماعت سے نماز پڑھی ہو۔م۔
اگر امام کو سہو ہو گیا پھر وضوء ٹوٹ گیا اور اس نے کسی اور کو اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تو اس کا خلیفہ اس سہو کے لئے سلام کے بعد سجدہ کرے، اور اگر خلیفہ نے نماز کے آخری حصہ میں سہو کیا ہو تو یہی دو سجدے دونوں کے واسطے کافی ہیں۔اور اگر امام نے خلیفہ مقرر کر دینے کے بعد سہو کیا تو اس سے کچھ واجب نہ ہو گا، الذخیرہ، اگر ظہر کا سلام پھیرنے کے بعد کیا کہ اس پر نمازی ایک سجدہ باقی ہے، پھر اس نے کھڑے ہو کر از سر نو چار رکعتیں پڑھیں تو وہ فاسد ہو گی، کیونکہ وہ ابھی تک اس سلام کی وجہ سے پہلی نماز سے خارج نہیں ہوا ہے، اس لئے نئی نیت صحیح نہ ہو گی، کیونکہ اس نے فرض کے ساتھ نفل کو ملایا ہے، جیسے مغرب کی دو رکعتیں پڑھ کر اس خیال سے سلام پھیر دیا کہ نماز پوری ہو گئی ہے، پھر یاد آنے پر اس نے از سر نو پوری تین رکعتیں پڑھ لیں، اب اگر ایک رکعت پڑھ کر ہی مقدار تشہد بیٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر دو رکعتیں پڑھ لیں تو پہلی نماز ہی مغرب کی نماز کی حیثیت سے صحیح ہو گئی اور باقی دو رکعتیں نفل ہو جائیگی، اور اگر نہیں بیٹھا تو پہلی اور دوسری سب فاسد ہو گئیں، کیونکہ پہلی نماز کے بعد اس نے سلام نہیں پھیرا تھا اس لئے دوسری نئی نماز شروع ہی نہیں ہوئی، الفتح، پھر ان دونوں نمازوں کے فاسد ہونے کے بعد اگر نئے سرے سے مغرب شروع کرے تو صحیح ہو جائیگی۔م۔

شک کا بیان

معلوم ہونا چاہئے کہ شک کی دو قسمیں ہوتی ہیں اول یہ کہ نماز کے اندر ہو۔اور اس کی بھی کئی صورتیں ہوتی ہیں۔(۱) ادا کی ہوئی مقدار میں یا تحریمہ میں یا طہارت کا کوئی فرض چھوٹ جانے میں اور اس جیسی، یا کسی دوسری نماز کے متعلق موجودہ نماز میں کچھ خیال آگیا جس کی وجہ سے ایک رکن کی مقدار سوچتا رہا، دوم یہ کہ نماز سے باہر شک ایسا ہوا ہو جن کا تعلق نماز سے ہے، اب اس جگہ پہلی قسم میں سے مقدار کا شک ذکر کیا ہے عبارت آرہی ہے۔

ومن شك فى صلوته فلم يدراثلثا صلى ام اربعاوذلك اول ماعرض له استأنف لقوله عليه السلام اذاشك احد كم فى صلاته انه كم صلى فليستقبل الصلوة وان كان يعرض له كثيرا بنى على اكبر رايه لقوله عليه السلام من شك فى صلوته فليتحر الصواب.

ترجمہ:-جس شخص کو نماز میں اس بات کا شک ہو گیا کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار رکعتیں اور ایسا اتفاق پہلی مرتبہ ہوا ہو تو وہ پھر سے نئی نماز شروع کر دے، کیونکہ رسول اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ تم میں سے کسی کو شک ہو جائے کہ اس نے کتنی رکعتیں پڑھی ہیں تو وہ نماز کو پھر سے پڑھے، اور اگر ایسا اکثر ہوتا رہتا ہو تو اس کا گمان جدھر زیادہ ہو اسی کے مطابق نماز پوری کرے کیونکہ اس کے بارے میں بھی رسول اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ جس کو نماز میں شک ہو جائے تو وہ ٹھیک بات جاننے کے لئے دل سے تحری کرے۔

توضیح:-شک کا بیان۔نماز میں شک کیا کہ تین پڑھیں یا چار۔حدیث سے دلیل

ومن شك فى صلوته فلم يدر أثلاثا صلى ام اربعا وذلك اول ماعرض له استأنف......الخ

جس شخص نے اپنی نماز میں اس طرح کا شک کیا کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار رکعتیں پڑھیں، ف تو اس میں دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ایسا شک اسے پہلی بار ہوا ہو، ف اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی بھر میں کبھی بھی شک نہیں کیا یا اس نماز میں یہ پہلا شک ہے بلکہ اس کا معنی یہ ہیں کہ یہ اس کی اکثری عادت نہیں ہے، یہی معنی زیادہ بہتر ہے، المحیط، استانف الخ تو اس صورت میں یہ حکم ہو گا کہ وہ شخص پھر سے نماز پڑھے۔

لقوله عليه السلام اذاشك احدكم فى صلاته انه كم صلى فليستقبل الصلوة......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس قول کے وجہ سے کہ جب تم میں کوئی اپنی نماز میں شک کرے کہ اس نے کتنی پڑھیں ہیں تو نماز کو از سر نو پڑھے، ف یہ مرفوع حدیث مجھے نہیں ملی ہے، لیکن ابن سیرینؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ جب میں شک کرتا ہوں کہ میں نے کتنی پڑھیں ہے تو اعادہ کر لیتا ہوں، حضرت سعید بن جبیرؒ نے ایسے شخص کے حق میں جس نے یہ نہیں جانا کہ تین پڑھیں ہیں یا چار پڑھیں حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اگر ٹھیک سے یاد نہ ہو تو نماز کو دوبارہ پڑھ لے، جریر نے منصورؒ سے روایت کی ہے کہ سعید بن جبیرؒ نے مجھے فتوی دیا ہے کہ میں تو فرض کو دوبارہ پڑھ لیتا ہوں، اسمٰعیل بن ابی خالد نے شعبیؒ سے روایت کی ہے کہ دوبارہ پڑھ لے، لیث نے طاؤسؒ سے روایت کی ہے کہ جب تم یہ نہ جانو کہ کتنی بار پڑھی ہے تو ایک بار دوہرا لو، اگر اس کے بعد بھی التباس ہو تو پھر دوبارہ نہ پڑھو۔

ان تمام آثار کو ابن ابی شیبہؒ نے مصنف میں روایت کیا ہے اور یہی شریح اور ابن الحنفیہؒ سے روایت کی ہے، عف، پھر اگر حدیث ثابت نہ ہو تو مذکورہ آثار ہی اس مسئلہ میں کافی ہیں، لیکن یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہئے کہ ان سے اعادہ کا حکم بطور وجوب کے ثابت نہ ہوگا، بلکہ تحری کرنا یا سب سے کم مقدار پر بھروسہ کرنا ہوگا، جیسا کہ آئندہ بیان کیا جائے گا، اور شاید اصل مذہب بھی ہے، اسی بناء پر عینیؒ نے لکھا ہے کہ امام قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ ہمارے اصحاب یعنی امام ابو حنیفہؒ اور ان کے شاگردوں کا قول ہے کہ شک کرنے والا تحری کرے، اور اس میں کوئی تفصیل نہیں فرماتے ہیں، اور یہی اصول کے روایت ہے۔ انتہی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تحری کرنا واجب ہے، لیکن اعادہ کرنے کا حکم تو ان مذکورہ آثار کی وجہ سے اولی ہے، جب کہ عادت نہ ہو یا اکثر نہ ہو۔ م۔ وان کان الخ اور اگر یہ شک بہت ہوتا رہتا ہو تو اپنی غالب رائے پر اعتماد کرے اور اسی پر عمل کرے، ف یعنی دل سے ٹھیک بات کے لئے معلوم کرے، اسی کو تحری کرنا کہتے ہیں۔

لقوله علیه السلام الخ یعنی جو کوئی نماز میں شک کرے تو وہ ٹھیک بات کے لئے دل سے تحری کرے، ف اور اس پر بناء کرے یعنی بقیہ نماز پڑھ لے، اسی کی روایت بخاری اور مسلم نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ اذا شك احد کم فی صلوته فلیتحر الصواب فلیتم علیه لیسلم ثم لیسجد سجدتین، یعنی جب کوئی تم میں شک کرے تو ٹھیک بات کے لئے تحری کرے اور اسی کے مطابق اپنی نماز مکمل کرے، پھر سلام پھیرے اور دو سجدے کرے، یہ الفاظ بخاری کے باب التوجہ الی القبلہ کے ہیں اس حدیث سے تحری کا حکم صاف اور واضح ہے، لیکن یہ حکم اسی وقت تک کے لئے ہے جب کہ تحری کے وقت کوئی بات واضح ہو، اور کسی مقدار پر اس کا دل جم جائے۔

وان لم یکن له رأی بنی علی الیقین لقوله علیه السلام من شك فی صلوته فلم یدر أ ثلثا صلی ام اربعا بنی علی الاقل والا ستقبال بالسلام اولی لانه عرف محللا دون الکلام ومجرد النیة تلغو وعند البناء علی الاقل یقعد فی کل موضع یتوهم آخر صلاته کیلا یصیر تارکا فرض القعدة واللہ اعلم۔

ترجمہ:۔ اور اگر کوئی رائے قائم نہ ہو سکے تو وہ یقینی مقدار پر بنیاد رکھے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جسے اپنی نماز میں شک ہو جائے اور وہ یہ طے نہ کر سکے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار تو وہ کم مقدار پر بناء کرے، اور سلام پھیر کر از سر نو پڑھنا اولی ہے، کیونکہ سلام ہی کو نماز کے لئے محلل جانا گیا ہے، اور بات کرنے کو نہیں اور صرف نیت لغو سمجھی جائیگی، اور کم مقدار پر بناء کرنے کی صورت میں ہر ایسی رکعت پر وہ بیٹھتا جائے جس میں اس کے آخری قعدہ ہونے کا احتمال ہو سکے، تا کہ وہ شخص فرض قعدہ کو چھوڑنے والا نہ ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

توضیح:۔ آخری قعدہ اور تشہد سے فارغ ہو کر شک۔ سلام کے بعد نماز سے باہر ظہر اور عصر ہونے میں شک۔ نماز فجر میں شک۔ سجدہ کی حالت میں اول اور دوم رکعت ہونے میں شک، چار رکعت والی

نماز میں شک۔ شک کی حالت میں غور و فکر۔ نماز میں حدث یا سر کا مسح نہ کرنے میں شک۔ رکن ادا کیا اور تکبیر تحریمہ میں شک۔ حدث ہوا کہ نہیں، کپڑے کو نجاست لگی یا نہیں، سر کا مسح کیا تھا یا نہیں۔ مقیم و مسافر ہونے میں شک۔ امام کو دوسری رکعت کے دوسرے سجدہ میں شک ہوا کہ ایک ادا ہوئی یا دو یا تیسری اور چوتھی ہونے میں شک۔ اور مقتدیوں کو دیکھا۔ ظہر کے سلام کے بعد کسی عادل شخص نے خبر دی کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں، امام کو شک ہو اور دو عادل کی خبر۔ امام اور قوم میں اختلاف ہوا۔

وان لم يكن له رأى بنى على اليقين لقوله عليه السلام من شك في صلوته فلم يدر أثلثا صلى......الخ

اور اگر اس کی کچھ ذاتی رائے نہ ہو سکے یعنی اس کی تحری کسی بات پر نہیں تھی تو وہ یقین پر بناء کرے۔ف مثلاً دو اور تین رکعت میں شک ہو تو دو ہونے میں تو کوئی شک نہیں ہے یعنی یقیناً اس سے کم نہیں ہے، لہٰذا اسی پر بناء کرے، لقوله عليه السلام الخ اس حدیث کی وجہ سے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس شخص نے اپنی نماز میں شک کیا اور یہ نہ جانا کہ تین پڑھیں یا چار تو کمتر پر بناء کرے۔ف اس حدیث کی روایت مسلم، ابوداؤد اور نسائیؒ نے حضرت ابو سعید الخدریؓ سے کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے کہ جب تم میں کوئی نماز میں سہو کرے اور یہ نہ جانے کہ ایک رکعت پڑھی ہے یا دو رکعت تو ایک پر بناء کرے، اور اگر نہ جانے کہ تین رکعتیں پڑھیں یا چار تو تین پر بناء کرے اور سلام سے پہلے دو سجدے کرلے، ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے، اس کی روایت ابن ماجہ اور حاکم نے کی ہے۔

اور بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس فرمان میں کہ سلام سے پہلے دو سجدے کرلے ان کے دو احتمال ہیں، اول یہ ہے کہ نماز سے خارج ہونے کے لئے جو سلام کہا جاتا تھا اس سے پہلے سہو کے دو سجدے ادا کرے، لیکن اس میں سجدہ سہو کا طریقہ مذکور نہیں ہے، اور اس دوسری حدیث میں ہے کہ سلام پھیر کر دو سجدے کر کے تشہد پڑھے، جیسا کہ گذرا۔ اور دوسرا احتمال یہ ہے کہ سہو کا سجدہ اس طرح ادا کرے کہ سلام پھیرنے سے پہلے کرلے، اس طرح یہ حدیث امام مالکؒ کے قول کی تائید کرے گی، کہ جب نماز میں بھول کر کوئی زیادتی ہو جائے تو سلام کے بعد سجدہ سہو کرلے، اور اگر نماز میں کمی کا احتمال ہو تو سلام سے پہلے سجدہ سہو کرلے، اور اس سے کچھ پہلے یہ بات گذر گئی ہے کہ شک و سہو ہونے کی صورت میں سجدہ کے طریقہ میں بالاجماع کچھ بھی فرق نہیں ہے، اس بحث کا خلاصہ گذر چکا ہے، اور واضح ہو کہ ہمارے علماء نے حضرت ابو سعید خدری اور عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی حدیثوں کو اس حال پر محمول کیا ہے جب کہ تحری کرنے سے کسی طرف دلی رجحان قائم نہ ہو سکے کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں تحری کرنے کا حکم صریحاً موجود ہے، پھر اگر تحری سے کسی طرف رجحان ہو جائے تو اس پر عمل واجب ہے، لیکن اگر اس شخص کو ایسا واقعہ بہت ہی کم پیش آتا ہو تو حضرت ابن عمرؓ وغیرہ کے اثر کے پیش نظر اولی اور عمدہ بات یہ ہوگی کہ نئے سرے سے نماز پڑھے، مگر یہ بات اسی وقت ممکن ہے جب کہ مشکوک نماز سے آدمی نکل گیا ہو، جیسا کہ التبیین میں ہے۔م۔

والاستقبال بالسلام اولى لانه عرف محللا دون الكلام ومجرد النية تلغو......الخ

اور نئے سرے سے سلام پھیر کر پڑھنا اولی ہے، ف یعنی مشکوک نماز سے سلام پھیر کر از سر نو تکبیر کہہ کر نماز شروع کرنا اور اگر اس درمیان میں کوئی کلام کرلیا یا مفسد نماز کوئی کام کرلیا تو بھی نماز سے باہر ہو گیا لہٰذا بالکل ابتداء سے پڑھے مگر سلام سے فارغ ہونا ہی اولی ہے، (بہ نسبت کلام کرنے یا کسی اور کام کرنے کے) لانه عرف الخ کیونکہ شریعت میں نماز سے خارج ہونے کا طریقہ سلام ہی سکھایا اور بتایا گیا ہے، اور کلام کر کے فارغ ہونا نہیں بتایا گیا ہے، ف بلکہ کلام کرنے کے متعلق تو یہ معلوم ہوا ہے کہ اس

سے نماز فاسد ہو جاتی ہے، اور قصداً ایسا کرنا اپنے تحریمہ کی حرمت کو ختم کرنا ہے بخلاف سلام کرنے کے، کیونکہ حدیث میں ہے تحلیلها التسلیم۔ اس سے یہ بات تصریحاً معلوم ہوئی کہ نماز کے احرام سے خارج کرنے والا سلام ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ فوری طور سے بیٹھ جائے پھر سلام پھیر دے، جیسا کہ التبیین میں ہے، پھر اس سوال کا جواب دیا کہ کسی نے اس موقع پر کلام بھی نہیں کیا بلکہ نئی نماز کی نیت کرلی تو کیا حکم ہوگا، جواب دیا کہ

ومجرد النية تلغو وعند البناء على الاقل يقعد فى كل موضع يتوهم آخر صلاته......الخ

اور صرف نیت لغو ہو جائے گی، ف یعنی پہلے تحریمہ سے خارج نہ ہوگا چنانچہ اگر صرف نئی نیت سے چار رکعتیں مزید پڑھ لے تو یہ سب بھی فاسد ہو جائینگی، لہٰذا از سر نو تمام رکعتیں پڑھنی ہوگی، اور یہ احکام اس صورت میں ہوں گے جب کہ شاذونادر ایسا ہوتا ہو، مگر جب اکثر شک وشبہ ہونے لگا، اور اس نے تحری کی، نتیجہ میں جو بات دل میں جمی اسی کے مطابق نماز پوری کرلی تو وہ اب سجدہ سہو کریگا یا نہیں؟ تو جواب یہ ہوگا کہ ہاں کرنا ہوگا جیسا کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے جو کہ بخاری میں مذکور ہے، اور ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اگرچہ یقینی طور سے ٹھیک بات بھی معلوم ہو جائے تو بھی صرف شک ہونے کی صورت کے بارے میں بعض حدیثوں میں سجدہ سہو کا ہونا لازم قرار دیا ہے، جس کی وجہ اس صورت پر محمول ہو سکتی ہے کہ ٹھیک تعداد معلوم ہونے میں اتنی دیر ہوئی جس میں ایک رکن ادا ہو سکتا ہو تو اتنی تاخیر ہونے سے سجدہ سہو لازم ہوگا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابن مسعودؓ کے روایت میں صراحۃً یہ مذکور ہے کہ تحری کے بعد سجدہ سہو واجب ہے اور شیخ ابن الہمامؒ کا یہ خیال کہ "یقیناً ٹھیک ثابت اور متحقق ہوگئی" کہنا صحیح نہیں ہے کیونکہ جس کے بعد یقینی طور سے صحیح اور حقیقت معلوم ہو جائے وہ شک نہیں بلکہ وہم ہوتا ہے ورنہ کسی بات پر شک ہونے کے باوجود یقین کرلینا ممکن نہیں ہے، صرف تحری کرنے سے دل پر کوئی بات جم سکتی ہے مگر وہ تیقن ہو سکتا ہے اور یقین نہیں ہو سکتا ہے، ان دونوں باتوں میں فرق ہوتا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں، پھر جس صورت میں تحری پر بناء کیا ہے مثلاً تین یا چار ہونے میں شک ہوا اور تحری کے بعد اس کا تین ہونا دل پر جما، اس صورت میں اور ایک رکعت پڑھ کر قعدہ اخیرہ کرے گویا وہ بغیر شک کے پڑھتا ہے، اور اگر تحری سے کسی بات پر دل نہ جما تو ان میں سے کم کو بنیاد بنا کر اپنی نماز مکمل کرے، اور اس پر کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن نماز کو ایسی حالت میں تمام کرے گا کہ نہ تو بالکل صحیح بات معلوم ہوئی اور نہ ہی اس کے قریب ترین تک معلوم ہو سکی، اسی لئے مصنفؒ نے کہا کہ وعند البناء الخ کم مقدار رکعت کو بناء کرنے کی صورت میں جب کبھی آخری رکعت یا قعدہ اخیرہ ہونے کا احتمال ہوتا رہے وہ بیٹھتا رہے۔

كيلا يصير تاركا فرض القعدة والله اعلم......الخ

تاکہ وہ فرض قعدہ کو نہ چھوڑ دے، ف: ایک یا دو ہونے میں شک ہوا، اور تحری کرنے کے باوجود کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تو ایسی صورت میں کم مقدار فی الحال ایک ہے ایک رکعت اور پڑھ کر اسے بیٹھ جائے اور قعدہ اولی سمجھے، اور یہ بالاتفاق ہوگا، ویسے مشائخ میں یہ اختلاف ہے کہ شک کے وقت جب کہ دو رکعتوں کا بھی شک تھا تو اسی وقت درمیانی قعدہ ہو جانا چاہئے، اس لئے بعضوں کے نزدیک شک پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس وقت بھی بیٹھ جائے، اور اس کو قبول کیا گیا، جیسا کہ بحر میں ہے، اور بعض کے نزدیک نہیں، یہ اس لئے کہ جب شریعت نے اسے ایک رکعت مان لی ہے تو دو ہونے کا جو شک تھا وہ کمزور ہو کر اب وہم کے حکم میں ہو گیا، لیکن آخری قعدہ چونکہ فرض ہے، اس لئے اس کی رعایت باقی رکھی گئی، اس کے بعد شریعت کے حکم کے مطابق پھر دو رکعت پڑھنے کے بعد آخری قعدہ پایا گیا جب کہ اس کے وہم کے مطابق اب ایک ہی رکعت کے مطابق چوتھی رکعت ہو جائے گی، اس لئے اس رکعت پر بھی بیٹھ جائے تاکہ اگر حقیقت میں یہی قعدہ آخیرہ ہو تو یہ فرض قعدہ متروک نہ ہو جائے، بظاہر احتیاط کے تقاضا کے مطابق یہ واجب ہے، لیکن صحیح بات واللہ اعلم یہ ہوگی کہ یہاں استحسان ہوگا، کیونکہ جب شریعت نے کم سے کم پر بناء کرنے کا حکم دیدیا ہے تو فرض قعدہ اسی کو مانا جائے گا جو اس حساب کے مطابق ہوگا، اگرچہ شریعت نے عفو و درگذر کرتے ہوئے ایسا

کیا ہو کیونکہ قعدہ کا فرض ہونا خلاف عادت کام نہیں ہے، مزید تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں ہے اگرچہ تفصیل طلب مسئلہ ہے، فاللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ م۔

اور جس صورت میں تحری یا کم مقدار پر عمل کرنا ہے اس میں سہو کے دو سجدے کر لینے چاہئے۔ ف۔ اگر آخری قعدہ اور تشہد سے فارغ ہو کر یا سلام کے بعد شک ہوا تو نماز کے جائز ہونے کا حکم دیا جائیگا، اور اس شک کا اعتبار نہ ہوگا، الخلاصہ، اگر نماز سے باہر کسی نے شک کیا کہ میں نے آج ظہر کی نماز پڑھی ہے یا نہیں پس اگر ظہر کا وقت ابھی باقی ہو تو اس پر اس نماز کا لوٹانا واجب ہے، اور اگر وقت نکل چکا ہو اس کے بعد شک ہوا تو اس کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، المحیط۔ اگر فجر کی نماز میں شک ہوا کہ میں پہلی رکعت میں ہوں یا تیسری میں ہوں تو کوئی رکعت بھی پوری نہ کرے بلکہ فوراً تشہد کی مقدار بیٹھ جائے پھر کھڑے ہو کر دو رکعتیں پڑھے اور ہر رکعت میں فاتحہ اور سورہ بھی پڑھے، اور آخر میں سجدہ سہو کر لے، اگر کسی کو پہلی یا دوسری رکعت کے ہونے کا سجدے کی حالت میں شبہ ہوا تو وہ دونوں سجدے پورے کر لے کیونکہ وہ رکعت پہلی ہو یا دوسری بہر صورت دو سجدے کرنے ہی ہیں، پھر دوسرے سجدے سے سر اٹھا کر مقدار تشہد بیٹھ کر پھر کھڑا ہو کر ایک رکعت اور پڑھے، اور اگر فجر کی نماز میں سجدہ کی حالت میں شک ہوا کہ اس نے دو رکعتیں پڑھی ہیں یا تین، پس اگر یہ پہلا سجدہ ہو تو اس کی اصلاح ممکن ہے، کیونکہ اگر حقیقت میں اس نے دو رکعتیں پڑھ لی ہیں تو اس پر ان دونوں سجدوں کو پورا کرنا لازم ہوگا، اور اگر وہ تیسری رکعت ہوئی تو امام محمدؒ کی نزدیک فاسد نہ ہوگی کیونکہ پہلا سجدہ جس میں یاد آیا ہے وہ کالعدم ہو گیا ہے، جیسا کہ پہلا سجدہ میں حدث ہو جانے سے ہوتا ہے، اور اگر یہ شک دوسرے میں ہوا تو نماز فاسد ہو گئی۔

اگر فجر میں شک ہوا کہ یہ دوسری یا تیسری ہے اور تحری کرنے کے بعد بھی کسی بات کا یقین نہیں ہوا تو اگر وہ کھڑا ہو تو فوراً بیٹھ جائے، اور قعدہ کے بعد ایک رکعت پڑھ کر قعدہ کرے، اور اگر بیٹھا ہو تو بھی تحری کرے، اگر اس دوسری رکعت کا ہونا سمجھ میں آئے تو بقیہ حصہ پوری کرے، اور اگر تحری سے تیسری رکعت کا ہونا سمجھ میں آئے تو پھر قعدہ میں تحری کرے اور اگر تحری کرنے سے یہ سمجھ میں آئے کہ وہ دوسری رکعت میں نہیں بیٹھا ہے تو نماز فاسد ہو گئی، اور اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آسکی تو بھی نماز فاسد ہو گئی، اور یہی حال چار رکعت والی نمازوں میں ہے چنانچہ اگر اسے شک ہوا کہ یہ چوتھی یا پانچویں ہے تو جس طرح ابھی فجر میں ذکر کیا گیا ہے کہ وہ قعدہ میں چلا جائے پھر ایک رکعت پر تشہد پھر ایک رکعت پر قعدہ۔ اور اگر وتر کی دوسری یا تیسری رکعت میں شک ہوا تو اس رکعت کو مکمل کرلے اور اس میں قنوت پڑھ کر قعدہ کے بعد ایک رکعت پڑھے، اور اس میں بھی قنوت پڑھے، یہی قول مختار میں ہے۔ الخلاصہ۔ اور شک کی تمام صورتوں میں خواہ تحری پر عمل کیا ہو یا کمتر پر بناء کی ہو سجدۂ سہو کرے۔ الفتح۔ البحر۔

اگر نماز میں یہ شک کیا کہ تین رکعتیں پڑھیں یا چار پڑھیں اور کچھ دیر اسی فکر میں رہا، پھر یقین آیا کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں، پس اگر فکر کرتے وقت قراءت یا تسبیح پڑھتا رہا اور ادائے رکن کی مقدار بھی خاموش نہیں رہا تو اس پر سجدۂ سہو لازم نہیں ہوگا۔ اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ ایک رکعت یا سجدہ سے ہی مشغول رہا یا رکوع یا سجود میں تھا اور اس قدر دیر لگائی کہ تفکر میں حالت متغیر ہونے لگی تو اس پر استحساناً سجدۂ سہو لازم ہے، المحیط، الذخیرہ، ھ۔ ت۔ د۔

اگر نماز کی حالت میں نمازی کو یہ گمان غالب ہوا کہ اسے حدث ہو گیا ہے یا اس نے وضوء میں سر کا مسح نہیں کیا تھا اور اسی بات پر اسے اتنا یقین بھی رہا کہ اس کو شک نہیں ہے، پھر اسے پورا یقین حاصل ہوا کہ اس نے حدث نہیں کیا، یا اس نے سر کا مسح کر لیا تھا تو شیخ ابو بکرؒ نے فرمایا ہے کہ جس حالت میں اسے حدث یا مسح نہ کرنے کا یقین تھا اس حالت میں اگر اس نے کوئی رکن ادا کیا تو وہ نئے سرے سے نماز پڑھے ورنہ اپنی نماز پوری کر لے، القاضی خان، اگر کسی کو یہ تو معلوم ہے کہ اس نے رکن ادا کر لیا ہے مگر اس بات میں شک ہے کہ اس نے تکبیر تحریمہ کہی یا نہیں یا اسے حدث ہوا یا نہیں یا اس کے کپڑوں کو نجاست لگی ہے یا نہیں، پس اگر

ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہو تو پھر سے نماز پڑھ لے ورنہ اپنا کام کرتا جائے اور نماز پوری کرلے، اور اس پر وضوء کرنا یا کپڑا دھونا لازم نہ ہوگا۔ الفتح۔ فتاوی عتابیہ میں ہے کہ نماز میں شک ہوا کہ وہ مقیم ہے یا مسافر ہے تو وہ چار رکعتیں پڑھے اور دوسری رکعت ختم کر کے احتیاطاً قعدہ کرے۔ التاتارخانیہ۔

امام نے دو رکعتیں پڑھائیں اور جب دوسری رکعت کا دوسرا سجدہ کیا تو اسے شک ہوا کہ میں نے ایک رکعت پڑھی یا دو پڑھیں، یا اسے تیسری اور چوتھی ہونے میں شک ہوا تو اس نے کن انکھیوں سے پیچھے کے مقتدیوں کو دیکھا کہ اگر وہ لوگ کھڑے ہوتے ہیں تو میں بھی کھڑا ہو جاؤں گا اور اگر بیٹھے ہیں تو بیٹھا رہ جاؤں، اور اسے اس طریقہ پر یقین رہا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس پر سجدہ سہو بھی لازم نہیں ہے، المحیط، اگر کسی نے تنہا نماز پڑھی یا امامت کی جب اس نے سلام پھیرا تو ایک عادل مرد نے خبر دی کہ تم نے اس نماز ظہر میں تین رکعتیں پڑھی ہیں تو فقہاء نے کہا ہے کہ اگر خود اس نمازی کے نزدیک چار پڑھنے کا یقین ہو تو خبر دینے والے کی خبر پر کوئی توجہ نہ دے۔ المحیط۔ ویسے امام محمدؒ نے کہا ہے کہ میں تو ہر حال میں ایک عادل مرد کے کہنے پر ہمیشہ اعادہ کر لیتا ہوں۔ الظہیریہ۔

اور اگر امام کو شک ہو اور دو عادل مردوں نے اسے خبر دی ہو تو ان کی خبر کو مان لے۔ اور اگر نمازی کو خود خبر دینے والے کے عادل ہونے اور نہ ہونے میں شک ہو تو امام محمدؒ سے روایت ہے کہ احتیاطاً دوبارہ پڑھ لے، اور اگر دو عادل مرد کی بات پر یقین نہ ہو اور شک باقی رہ جائے تو یقیناً دہرالے، اور اگر خبر دینے والا عادل نہ ہو تو اس کی بات بالکل مقبول نہ ہوگی۔ المحیط۔ اگر امام اور مقتدیوں کے درمیان اختلاف ہو اپس اگر امام کو اپنی بات پر پختہ یقین ہو تو اعادہ کی ضرورت نہیں ہے، ورنہ ان کے کہنے کی بناء پر اعادہ کرلے۔ اگر حج کے ارکان ادا کرنے میں شک ہوا تو ظاہر الروایۃ کے مطابق وہاں بھی کم مقدار پر بناء کرے۔ د۔

باب صلوة المرض

اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعد ايركع ويسجد لقوله عليه السلام لعمران بن حصينؓ صل قائما فان لم تستطع فقاعدافان لم تستطع فعلى الجنب تؤمى ايماء ولان الطاعة بحسب الطاقة.

ترجمہ:- بیمار کی نماز کا باب۔ بیمار جب کھڑے ہونے سے عاجز ہو جائے تو وہ بیٹھ کر رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمران بن حصینؓ کو فرمایا ہے کہ تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے ہو تو بیٹھ کر اور اگر بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو پہلو پر لیٹ کر اشارہ کرتے ہوئے نماز پڑھو، اور اس لئے بھی کہ عبادت طاقت کے مطابق ہوتی ہے۔

توضیح:۔ قیام سے عاجز۔ حدیث سے دلیل
رکوع و سجود سے عاجز بیٹھ کر اور اشارہ سے نماز پڑھنے کا طریقہ

باب صلوٰة المريض...... الخ مریض کی نماز کا بیان۔

اذا عجز المريض عن القيام صلى قاعدا يركع ويسجد......الخ

جب بیمار عاجز ہو جائے۔ ف نماز سے پہلے یا نماز کے اندر۔ ت۔ عن القیام الخ کھڑے ہونے سے۔ ف یعنی مکمل طریقہ سے لیکن سجدہ کرنے کی طاقت ہو، اگرچہ ٹیک لگا کر ہو۔ م۔ ف۔ صلی قاعدا الخ تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔ ف اگرچہ ٹیک لگا کر بیٹھنا ہو، یرکع الخ اس حال میں رکوع اور سجدہ کرتا رہے۔ ف جب کہ ان دونوں کاموں کی طاقت حاصل ہو۔ م۔ عاجز ہونے سے مراد یہ ہے کھڑے ہونے سے اسے عذر ہو جائے یہی قول اصح ہے۔ التمرتاشی۔ اور اسی پر فتوی ہے، الظہیریہ۔ ع۔ الدرایہ۔ چنانچہ اگر نمازی کو کھڑے ہونے سے بیماری کے بڑھنے یا دیر میں اچھا ہونے کا خوف ہو یا سر چکراتا ہو۔ التبیین۔ یا سخت درد ہونے لگتا

ہو۔الکافی۔یا کھڑے ہو کر پڑھنے میں پیشاب وغیرہ عذر جاری ہو جاتا ہو، لیکن بیٹھ کر پڑھنے میں نہ ہو تاہ۔ھ۔ف۔ تو ان صورتوں میں کھڑانہ ہونا جائز ہے۔م۔اور اگر کھڑے ہونے سے ایک طرح کی تکلیف ہو تو کھڑانہ ہونا جائز نہیں ہے۔الکافی۔اور اگر پورے طور پر کھڑانہ ہو سکتا ہو بلکہ تھوڑا سا کر سکتا ہو، مثلاً کھڑے ہو کر تھوڑی قراءت کر سکتا ہو یا فقط تکبیر تحریمہ تک کھڑا ہو سکتا ہو تو جس قدر بھی کھڑا ہو سکتا ہو اتنا ہی کھڑا ہو، پھر جب بے برداشت ہونے لگے بیٹھ جائے، شمس ائمہ حلوائیؒ نے کہا ہے کہ یہی مذہب صحیح ہے اگر وہ اتنا بھی چھوڑ دے تو مجھے اس کی نماز کے جائز نہ ہونے کا خطرہ ہے۔الخلاصہ۔

اس قدر کھڑے ہونے کی مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ اسے سجدہ کرنے کی بھی قدرت ہو، اور اگر تکیہ کے سہارے کھڑا ہو سکتا ہو تو یہ صحیح ہے کہ اسی طرح کرے، اس کے سوا دوسری صورت جائز نہ ہوگی، اسی طرح جب چھڑی پر یا کسی شخص پر ٹیک دے کر کھڑا ہو سکتا ہے تو اسی طرح کرنا ضروری ہے، التبیین، اور اگر بیمار اپنے گھر میں تو کھڑا ہو کر پڑھ سکتا ہے لیکن مسجد جانے کے بعد کھڑا نہیں ہو سکتا ہے تو اصح یہ ہے کہ مسجد جا کر پڑھے۔الخلاصہ۔اور اسی پر فتوی ہے۔العینی۔ لیکن اس کے خلاف ہندیہ میں کہ مختار یہ ہے کہ گھر میں کھڑے ہو کر پڑھے، اور اسی پر فتوی دیا جائے۔المضمرات۔میں مترجم کہتا ہوں کہ جس نے جماعت کے سنت ہونے کا خیال کیا اس نے فرض قیام کو نہ چھوڑا، جیسے مضمرات میں ہے۔اور جس نے جماعت کے واجب ہونے کا خیال کیا اور یہ بھی خیال کیا کہ اقتداء بشرط قدرت فرض ہے تو جانے کا حکم دیا، جیسا کہ خلاصہ میں ہے تو اس میں شک نہیں ہے کہ مسئلہ مشکل ہے۔م۔بیٹھ کر نماز پڑھنے کی صورت میں قول اصح یہ ہے کہ چار زانو یا التحیات کی بیٹھک جیسی صورت جس میں اسے آسانی ہو بیٹھے۔السراج۔اور یہی صحیح ہے۔التحفہ۔ع۔

اور اگر سیدھا بیٹھنا ممکن نہ ہو، تکیہ یا دیوار یا آدمی پر ٹیک لگانے پر مجبور ہو تو اسی طرح بیٹھنا واجب ہے۔الذخیرہ۔ایسی صورت میں لیٹنا جائز نہ ہوگا۔یہی قول مختار ہے۔التبیین۔مذکورہ مثالوں سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جس مریض کو تحریمہ وغیرہ میں جہاں تک بھی کھڑے ہونے کی قدرت ہو وہاں تک کھڑا ہونا لازم ہے، لیکن اس لزوم کے لئے ایک شرط یہ ہے کہ اسے سجدہ کرنے کی بھی قدرت ہو، جیسا کہ عنقریب بیان کیا جائے گا، اور جب اتنا بھی کھڑے ہونے سے مجبوری ہو تو بیٹھ کر رکوع اور سجدے کے ساتھ پڑھے۔م۔

لقوله عليه السلام لعمران بن حصين صل قائما فان لم تستطع فقاعدافان لم تستطع......الخ

دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمران بن حصینؓ سے فرمایا جنہیں بواسیر کی بیماری تھی کہ تم کھڑے ہو کر نماز پڑھو، اگر تمہیں اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر پڑھو، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو کروٹ پر اشارہ سے پڑھو، ف اس حدیث کو امام مسلم کے علاوہ تمام اصحاب صحاح نے روایت کیا ہے، البتہ نسائیؒ کی روایت میں علی الجنب کی جگہ مستقبلا کا لفظ ہے، یعنی اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو چت لیٹ کر پڑھو، اس سے ظاہر ہوا کہ خواہ کروٹ سے ہو یا چت ہو کر دونوں طرح جائز ہے، جبکہ بیٹھنا ممکن نہ ہو، اور اس حالت میں رکوع و سجود کا طریقہ اشارہ سے کرنا ہوگا، یہ دلیل تو حدیث سے ثابت ہوئی، اور اب دوسری دلیل یہ ہے۔

ولان الطاعة بحسب الطاقة......الخ

بیٹھ کر پڑھنا بیمار کے لئے اس لئے بھی جائز ہے کہ اپنی طاقت کے مطابق مالک کی فرمانبرداری کا اظہار ہے۔ف بعض لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ عقلی دلیل ہے بلکہ فرمان خداوندی ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا﴾۔اور اسی جیسی دوسری آیتوں کی توضیح ہے، کہ وسعت کے مطابق عبادت فرض کی ہے۔لہٰذا بیمار کو بیٹھ کر جائز ہے، اور کھڑا ہونا اگرچہ دقت سے اگرچہ کھڑا ہونا ممکن لیکن اس فرمان باری تعالیٰ ﴿مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ سے ایسی پریشانی اور مشقت جس سے حرج ہو جائے دور کر دیا ہے۔لہٰذا بغیر مشقت اور حرج کے ہی جائز ہو گیا، اور یہ شرعی دلیل بھی قوی ہے، اور نسائی کی روایت میں آیت سے اس طرف اشارہ ہے۔م۔

قال فان لم يستطع الركوع والسجود اومي ايماء يعني قاعدا لانه وسع مثله وجعل سجوده اخفض من ركوعه لانه قائم مقامها فاخذ حكمها ولا يرفع الى وجهه شيء يسجد عليه لقوله عليه السلام ان قدرت ان تسجد على الارض فاسجد والافاوم براسك وان فعل ذلك وهو يخفض رأسه اجزاه لوجود الايماء وان وضع ذلك على جبهته لا يجزيه لانعدامه.

ترجمہ:-اگر رکوع اور سجدہ کی طاقت نہ رکھتا ہو تو وہ اشارہ سے پڑھے گا۔ یعنی بیٹھ کر اشارہ سے پڑھے گا۔ کیونکہ یہی کام اس کی وسعت اور طاقت میں ہے، پھر اپنے سجدہ کو رکوع سے زیادہ جھکائے گا، کیونکہ یہ اشارہ ان دونوں کاموں کو رکوع اور سجدہ کے قائم مقام ہوگا لہذا ان دونوں کا حکم قبول کرے گا، اس کی پیشانی کے قریب ایسی کوئی چیز اٹھا کر نہیں لی جائیگی جس پر وہ سجدہ کرے، کیونکہ رسول اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ اگر تم کو طاقت ہو تو زمین پر سجدہ کر سکو تو سجدہ کرلو، ورنہ تم اپنے سر سے اشارہ کرلو، اس کے باوجود اگر اس شخص نے کوئی چیز اٹھا کر پیشانی کے قریب کرلی ساتھ ہی اپنے سر کو بھی جھکائے رکھا تو بھی اس لئے کافی ہوگی، کیونکہ اشارہ بھی پایا گیا، اور اگر اس چیز کو اٹھا کر اپنی پیشانی پر رکھ دیا تو یہ کام جائز نہ ہوگا اشارہ نہ پائے جانے کی وجہ سے۔

توضیح:-مریض کے سجدہ کے واسطے کوئی چیز اونچی کرنی۔ حدیث سے دلیل
پیشانی پر کوئی چیز رکھ لی۔ سجدہ کرنے کی قوت تو ہے مگر پیشانی پر زخم ہے

قال فان لم يستطع الركوع والسجود اومي ايماء يعني قاعدا......الخ

قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ اگر مریض کو رکوع اور سجود کی طاقت نہ ہو۔ ف جیسے کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے بلکہ صرف بیٹھے رہنے کی طاقت ہو، قاضیخان، اولی ایماء الخ تو بیٹھ کر ہی اشارہ سے پڑھ لے، یعنی بیٹھے ہوئے رکوع اور سجدہ کا اشارہ کرے لان وسع الخ کیونکہ یہی اشارہ سے رکوع و سجود کرنا ایسے شخص کے اختیار میں ہے، لہذا وہ بیٹھے ہوئے اشارہ سے نماز ادا کرے گا، پھر چونکہ اشارہ میں رکوع و سجدہ میں اشتباہ ہو رہا تھا اس لئے فرمایا۔

وجعل سجوده اخفض من ركوعه لانه قائم مقامها فاخذ حكمها......الخ

اور اپنے سجدہ کو رکوع کے مقابلہ میں زیادہ پست کرے۔ (جھکادے) ف جیسے حقیقی سجدہ حقیقی رکوع کی بہ نسبت زیادہ جھکا ہوا ہوتا ہے، لانہ قائم الخ کیونکہ یہ اشارہ رکوع اور سجدے کے قائم مقام ہوتا ہے۔ فاخذ الخ اس لئے اشارہ نے رکوع اور سجدہ کا حکم پالیا ہے، ف اسی لئے رکوع اشارہ سے سجدہ کا اشارہ زیادہ پست ہوا، اور یہ واجب ہے، اسی بناء پر اگر دونوں کے لئے برابر جھکا تو نماز جائز نہ ہوگی، جیسا کہ بحر میں ہے، اور یہ شخص سجدہ سہو بھی اشارہ سے ہی کرے گا، المحیط۔

ولا يرفع الى وجهه شيء يسجد عليه لقوله عليه السلام ان قدرت ان تسجد على الارض......الخ

اور کوئی چیز اس کے سجدہ کرنے کے لئے اونچی کر کے پیشانی تک نہیں پہونچائی جائے، ف یعنی اس نے خود یا کسی دوسرے نے کوئی تکیہ وغیرہ اونچا کر کے اس کی پیشانی پر لگادیا تا کہ سجدہ ادا ہو جائے تو جائز نہ ہوگا۔ لقوله عليه السلام الخ کیونکہ رسول اللہ علیہ کا فرمان ہے کہ اگر تم کو زمین پر سجدہ کرنے کی قوت ہو تو کرو ورنہ اپنے سر سے اشارہ کرلو۔ ف حدیث کے اندر اس طرح کہنے کی وجہ یہ ہے کہ امام ابو بکر البزارؒ نے مسند میں اور بیہقی نے المعروفہ میں ابو بکر الحنفی کے واسطے سے روایت کی ہے، قال الحنفي سفيان الثوری حدثنا ابوالزبير عن جابر ان النبی علیہ عاد مريضا الخ یعنی حضرت جابرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ علیہ ایک بیمار کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ وہ تکیہ پر نماز پڑھ رہے ہیں اس لئے آپ نے اس تکیہ کو لے کر پھینک دیا اس کے بعد اس نے ایک لکڑی پکڑی تا کہ اس پر نماز پڑھیں تو آپ نے وہ بھی پھینک دی اور فرمایا کہ اگر تم کو طاقت ہو تو زمین پر نماز پڑھو ورنہ اشارہ کرو اور اپنے سجدے کے اشارہ کو رکوع کے اشارہ سے زیادہ جھکاؤ۔ امام بزارؒ نے کہا ہے کہ میں نہیں

جانتا سوائے ابو بکر الحنفی کے کسی اور نے اس روایت کو ثوریؒ سے روایت کیا ہے، اور ابو بکر الحنفی کی موافقت عبد الوھاب اور عطاء نے کی ہے کہ ثوریؒ سے روایت کی ہے۔ انتہی۔
ابو بکر الحنفی ثقہ راوی ہیں۔ الفتح۔ اور باقی اسناد تو صحاح کی اسنادوں سے ہے، اب جب کہ ابو بکر الحنفی بھی ثقہ ہیں اور متابعت بھی موجود ہے تو یہ اسناد صحیح ہو گئی۔ م۔ اور طبرانی نے معجم میں ایسی حدیث جابرؓ کے مانند ابن عمرؓ کی حدیث کی روایت کی ہے۔ ع۔
حدیث کا مطلب یہ ہو گا کہ تکیہ کو اٹھا کر وہ پیشانی سے لگاتے تھے، اور عینیؒ نے کہا ہے کہ اس میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ شاید تکیہ زمین پر ہو، مگر میں کہتا ہوں کہ یہ احتمال غلط ہے، کیونکہ اگر تکیہ زمین پر ہو تو وہ بالا جماع زمین کے حکم میں ہے، اس طرح رسول اللہ ﷺ نے جو زمین پر سجدہ کرنے کے لئے فرمایا ہے وہ اس احتمال کو غلط کر دیتا ہے، لہٰذا اس کا مطلب صرف یہی ہو گا کہ وہ تکیہ اٹھا کر پیشانی سے لگایا کرتے تھے۔ م۔ اگر تکیہ زمین پر ہو اور اس پر مریض سجدہ کرتا ہو تو اس کی نماز جائز ہو گی۔ الخلاصہ۔ ھ۔ گویا اسے سجدہ کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ م۔

وان فعل ذلك وهو يخفض رأسه اجزاه لوجود الايماء......الخ
اگر مریض نے اٹھائے ہوئے تکیہ وغیرہ پر سجدہ کیا اور ساتھ ہی اپنا سر بھی جھکاتا ہے تو وہ اس کے لئے کافی ہو گا، اشارہ پایا جانے کی وجہ سے۔ ف اور اس کے حق میں یہی اشارہ سجدہ کے قائم مقام ہے۔ م۔ لیکن اس نے برا کیا۔ المضمرات۔ **وان وضع الخ** اگر مریض نے اس چیز کو اپنی پیشانی پر رکھدیا تو جائز نہ ہو گا، کیونکہ اس صورت میں اشارہ نہیں پایا گیا ہے، ف یہی قول اصح ہے۔ الخلاصہ۔ اگر کسی کو زمین پر سجدہ کرنے کی قوت ہے، مگر وہ پیشانی میں زخم ہونے کی وجہ سے سجدہ نہیں کر سکتا ہے تو اس صورت میں اسے اشارہ کرنا جائز نہ ہو گا، بلکہ اسے ناک پر سجدہ کرنا واجب ہے۔ الذخیرہ۔ اگر ناک پر بھی زخم ہو اور پیشانی پر کسی صورت سے بھی سجدہ کرنا ممکن نہ ہو تب اشارہ کرنا جائز ہو گا، پھر اشارہ کے لئے تھوڑا جھکنا بھی کافی ہے، اگرچہ زیادہ بھی ممکن ہو۔ مع۔ م۔

وان لم يستطع القعود استلقى على ظهره وجعل رجليه الى القبلة واومى بالركوع والسجود لقوله عليه السلام يصلي المريض قائما فان لم يستطع فقاعدافان لم يستطع فعلى قفاه يؤمي ايماء فان لم يستطع فالله تعالى احق بقبول العذرمنه وان استلقى على جنبه ووجهه الى القبلة جازلمارويناه من قبل الاان الا ولى هوالا ولى عندنا خلافا للشافعي لان اشارة المستلقى تقع الى هواء الكعبة واشارة المضطجع على جنبه الى جانب قدميه وبه تتادى الصلوة.

ترجمہ:- اور اگر بیمار کو بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو وہ چت لیٹ جائے۔ اور اپنے پیروں کو قبلہ کی طرف کر دے اور رکوع اور سجدہ کے لئے اشارہ کرے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ بیمار کھڑے ہو کر نماز پڑھے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو بیٹھ کر اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو چت لیٹ کر اشارہ سے پڑھے، اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو، تو اللہ تعالیٰ ہی اس کی مجبوری کو دیکھنے والا اور قبول کرنے والا ہے، اور اگر وہ اپنے پہلو پر لیٹ گیا اور اپنے چہرہ کو قبلہ کی طرف کیا تو یہ بھی جائز ہو گا، اسی حدیث کی وجہ سے جو ہم نے اس سے پہلے روایت کی ہے، مگر یہ کہ پہلی صورت زیادہ بہتر ہو گی، ہمارے نزدیک۔ اس میں شافعیؒ کا اختلاف ہے، کیونکہ چت لیٹنے والے کا اشارہ کعبہ کی ہوا کی طرف ہو گا، اور پہلو پر لیٹنے والے کا اشارہ اس کے قدموں کی طرف ہو گا، اسی کے ساتھ نماز ادا ہوتی ہے۔

توضیح:- لیٹ کر نماز، اور اس کا طریقہ۔ حدیث سے دلیل۔ کروٹ پر مریض لیٹا

وان لم يستطع القعود استلقى على ظهره وجعل رجليه الى القبلة واومى بالركوع......الخ
اگر بیمار کو بیٹھ کر بھی نماز پڑھنے کی طاقت نہ ہو۔ جیسا کہ کھڑے ہونے کی، رکوع اور سجدہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو اپنی

پشت کے بل چت لیٹ جائے۔ اور اپنے پاؤں کو قبلہ کی طرف کردے۔ف یعنی پاؤں پھیلا کر رکھے۔ف۔ بلکہ گھٹنوں کو کھڑے کرکے رکھے، کیونکہ قبلہ کی طرف پاؤں پھیلانا مکروہ ہے۔ واومی الخ اور رکوع و سجود کے لئے اشارہ کرے۔ف اور اس کے سر اور مونڈھوں کے نیچے ایک تکیہ رکھنا چاہئے، اتنا کہ وہ بیٹھنے والے کے مشابہ ہو جائے، تاکہ اسے رکوع اور سجود کے لئے اشارہ کرنا ممکن ہو۔الکافی۔ ورنہ اس کے بغیر تو تندرست بھی اشارہ نہیں کرسکتا ہے تو مریض سے کیونکر ممکن ہوگا۔ف۔

لقوله عليه السلام يصلي المريض قائما فان لم يستطع فقاعدافان لم يستطع فعلى قفاه يؤمى......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس قول کی وجہ سے کہ مریض بھی کھڑے ہو کر پڑھے، اگر نہ پڑھ سکے تو بیٹھ کر پڑھے، اس طرح بھی نہ پڑھ سکے تو گدی کے بل لیٹے اور اشارہ سے پڑھتا رہے، اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو اللہ تعالی سے معافی کی درخواست کرے کہ وہ ہی اس لائق ہے کہ مجبوری کی درخواستوں کو قبول فرمائے۔ف۔جب کہ خدا کے بندے بھی ایسے معذوروں کو معاف رکھتے ہیں۔اب گفتگو یہ ہے کہ یہ حدیث تو کسی کتاب میں نہیں پائی جاتی ہے۔فع۔البتہ عمرانؓ کی حدیث میں جو نسائی سے مروی ہے صراحۃً مذکور ہے، اور اگر یہ کہا جائے کہ صحیح بخاریؒ وغیرہ کی روایت میں تو کروٹ کا ذکر ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ کچھ تعارض نہیں ہے، بلکہ بیماروں کی بیماریاں مختلف قسموں کی ہوتی ہیں، اس لئے مرض کی حیثیت سے کبھی چت اور کبھی کروٹ پر بھی لیٹنا جائز ہے جیسا کہ حضرت عمران بن حصینؓ کو بواسیر کا مرض ہو جانے کی وجہ سے چت لیٹنا آسان نہ تھا اس لے انہیں کروٹ پر لیٹنے کو کہا گیا، اور ہم بھی اس بات کے قائل ہیں، اسی لئے۔

وان استلقى على جنبه ووجهه الى القبلة جازلمارويناه من قبل الاان الا ولي هوالا ولى......الخ

کہ اگر مریض کروٹ پر لیٹا اس طرح پر کہ اس کا منہ قبلہ کی طرف ہے تو جائز ہوگا۔لمارو ینا الخ اس حدیث کی بناء پر جو ہم نے پہلے روایت کی ہے۔ف۔یعنی عمرانؓ کی حدیث۔کیونکہ مصنفؒ نے صرف کروٹ کی روایت بیان کی ہے، الحاصل چت ہو یا کروٹ دونوں صورتیں جائز ہوگی، مگر صرف اتنا سا فرق ہوگا کہ ہمارے نزدیک پہلی صورت دوسری کی بہ نسبت اولی ہوگی۔ف۔ یعنی چت لیٹنا اولی ہے۔

خلافا للشافعي لان اشارة المستلقي تقع الى هواء الكعبة واشارة المضطجع على جنبه......الخ

بخلاف امام شافعیؒ کے۔ف کیونکہ امام شافعیؒ کے نزدیک کروٹ پر لیٹنا اولی ہے، بہر حال یہ اختلاف علماء صرف اولی ہونے میں ہے اور ہمارے نزدیک چت رہنا ہی اولی ہے، لان الاشارۃ الخ کیونکہ چت لیٹنے کا اشارہ کعبہ کی ہوا کی طرف ہوتا ہے، ف قبلہ حقیقت میں وہ مقام ہے جہاں پر کعبہ کی عمارت بنی ہوئی ہے اور اس کی عمارت قبلہ نہیں ہے بلکہ عمارت کے علاوہ جو جگہ ہے اسی کو یہاں لفظ ہوا سے تعبیر کیا ہے کیونکہ ہواء خالی جگہ کے معنی میں ہے عمارت کے علاوہ۔پس چت رہنے والے کا اشارہ اسی ہوا کی طرف ہوتا ہے جو اصل قبلہ ہے اس لئے یہی اولی ہوا۔

واشارة المضطجع على جنبه الى جانب قدميه وبه تتادى الصلوة.

اور کروٹ پر لیٹے رہنے والے کا اشارہ اس کے دونوں قدموں کی جانب ہوتا ہے، ف اس لئے بدن کی توجہ ہوئی حاصل یہ ہوا کہ امام شافعیؒ نے بدن کے ظاہری توجہ کے خیال کو اہمیت دیتے ہوئے اس کو اولی کہا ہے جیسے کہ میت سے ہوتا ہے، اور ہم لوگوں نے حالت نماز کی توجہ کو اولی رکھا ہے، مع۔

وبه تتادى الصلوة......الخ

اسی کے ساتھ نماز ادا ہوتی ہے۔ف۔ یعنی اشارہ سے۔ک۔ یعنی کعبہ کی ہوا کی طرف توجہ کرنے سے ادا ہوتی ہے، ع، پھر اگر کروٹ پر لیٹے تو داہنی طرف اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو بائیں کروٹ پر قبلہ رخ ہو کر۔السراج۔ والقنیہ یعنی عام احادیث میں جملہ فعلی جنبہ پایا جاتا ہے، کہ کروٹ داہنی ہو یا بائیں ہو، ف ع، واضح ہو کہ چھ موقعوں میں لٹانا شریعت سے ثابت ہے۔

(۱) بیمار کو نماز کے وقت خواہ چت ہو یا کروٹ ہو۔ (۲) موت کے وقت کہ شمال و جنوب (اتر دکھن) لٹا کر چہرہ قبلہ کی طرف کر دیا جائے لیکن متاخرین نے اس موقع پر چت لٹانے کو پسند کیا ہے اس خیال سے کہ اس طرح آسانی سے روح نکلتی ہے۔ (۳) جب اسے نہلانے کے لئے تختے پر لٹایا جائے، ہمارے آئمہ سے اس بارے میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی ہے جس سے کیفیت کی تصریح ہوتی ہو، لیکن مشہور طریقہ چت لٹانے کا ہے۔ (۴) میت کی نماز کی حالت میں چت لٹانا۔ (۵) قبر میں چت لٹانا مگر دائیں پہلو پر قبلہ کی طرف چہرہ جھکا ہوا۔ مع۔ (۶) تہجد پڑھنے والا فجر کی سنت کے بعد دائیں کروٹ پر لیٹنا۔ م۔

فان لم يستطع الايماء براسه اخرت عنه ولا يؤمى بعينه ولا بقلبه ولا بحاجبيه خلافا لزفرؒ لما روينا من قبل ولان نصب الابدال بالراى ممتنع ولا قياس على الراس لانه يتادى به ركن الصلوة دون العين واختيها وقوله اخرت عنه اشارة الى انه لاتسقط الصلوة عنه وان كان العجز اكثر من يوم وليلة اذا كان مفيقا وهو الصحيح لانه يفهم مضمون الخطاب بخلاف المغمى عليه.

ترجمہ:- اور اگر اپنے سر سے بھی اشارہ کرنے کی طاقت نہ ہو تو نماز مؤخر کر دی جائے گی، اس حالت میں اپنی آنکھوں سے یا اپنے دل سے یا اپنے بھوؤں سے اشارہ نہ کرے، اس میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے اس روایت کی بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، اور اس وجہ سے کہ اپنی رائے سے کسی کو بدل مقرر کر دینا منع ہے، اور سر کے حکم پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ سر تو وہ حصہ ہے جس سے نماز کا رکن ادا کیا جاتا ہے، آنکھ اور بھوؤں سے تو کوئی بھی ادا نہیں کیا جاتا ہے، اور قدوریؒ کا یہ فرمانا کہ اس سے نماز مؤخر کر دی جائے گی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس بیمار سے ایسی بیماری کی حالت کی بھی نماز معاف یا ساقط نہیں کی جائے گی، اگرچہ اس کی یہ مجبوری ایک دن اور ایک رات سے بھی زیادہ ہو، جب کہ وہ افاقہ یعنی ہوش میں ہو، یہی صحیح قول ہے، کیونکہ وہ اللہ کے خطاب کے مضمون کو سمجھ رہا ہے، بخلاف اس شخص کے جس پر بیہوشی طاری ہو۔

توضیح:- لیٹ کر نماز، اور اس کا طریقہ، حدیث سے دلیل، کروٹ پر لیٹ کر سر کے اشارہ سے عاجز، آنکھ اور دل اور بھوؤں سے اشارہ کرنا، عاجز رہنے کی مدت، اس کا اندازہ، مترجم کی طرف سے وضاحت

فان لم يستطع الايماء براسه اخرت عنه ولا يؤمى بعينه ولا بقلبه ولا بحاجبيه......الخ

اگر بیمار کو سر سے بھی اشارہ کرنے کی طاقت نہ ہو تو اس سے نماز موخر کر دی جائے گی، اور وہ اپنی آنکھوں سے دل سے اور بھوؤں سے اشارہ نہیں کرے گا۔ ف۔ ظاہر الروایۃ کے موافق ہے، اور غیر ظاہر الروایۃ میں امام ابو حنیفہؒ سے صرف بھوؤں سے اشارہ کرنا جائز بتایا گیا ہے، اور امام محمدؒ سے آنکھوں سے جائز ہونے کے بارے میں شک ہے اور دل سے اشارہ کرنے میں ناجائز ہونے کی روایت ہے، اور بھوؤں کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے اس بارے میں مختلف روایتیں ہیں، ایک روایت تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق ہے، اور دوسری میں امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے مثل ہے کہ پہلے آنکھوں کہ نہ ہونے کی صورت میں بھوؤں سے پھر دل سے جائز ہونے کی روایت مذکور ہے۔ مع۔ جیسے امام زفرؒ کا قول ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے کہا ہے خلافا لزفرؒ بخلاف امام زفرؒ کے قول کے۔ ف۔ کہ ان کے نزدیک ان چیزوں سے اشارہ جائز ہے، جیسا کہ حسن بن زیادؒ کے نزدیک ہے، مگر جب سر سے اشارہ کی طاقت ہو جائے تو ان نمازوں کو دوبارہ پڑھ لے۔ مع۔ اور ظاہر الروایۃ میں ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے **لما روينا** الخ اس حدیث کی بناء پر جس کی ہم نے پہلے روایت کر دی ہے۔ ف۔ یعنی آپ کا یہ فرمان **والا فاوم براسک** یعنی رکوع اور سجدہ کی قدرت نہ ہو تو سر سے اشارہ کرو۔ فع۔ مگر اس قول میں تامل ہے کیونکہ اس میں سر کے سوا دوسری چیزوں سے ممانعت نہیں ہے۔ جواب یہ ہے کہ دوسری چیزوں سے اشارہ کرنے کے لئے کچھ ثبوت چاہئے، جبکہ کسی دوسری روایت میں اس کا ذکر نہیں ہے۔ م۔

ولان نصب الابدال بالرای ممتنع ولا قیاس علی الراس لانه یتادی به رکن الصلوة......الخ

اور اس وجہ سے بھی کہ اپنی رائے سے کسی چیز کو بدل مقرر کرنا منع ہے۔ف۔ یعنی سر سے اشارہ کرنے کا تو ثبوت ہے اور سر کے بدلے آنکھوں وغیرہ سے اشارہ کرنا تو اپنی رائے سے سر کا بدل ٹھہرانا ہوا، حالانکہ اس کی ممانعت ہے، اس جگہ کی عبارت میں "واو" موجود نہ ہوتا تو بظاہر بہتر ہوتا کیونکہ پہلی دلیل اور یہ دوسری دلیل اس صورت میں دونوں دلیلوں کا خلاصہ دلیل ہو جاتا دو دلیلیں باقی نہ رہتیں، کیونکہ نص میں تو سر سے اشارہ کرنا ثابت ہے، اور سر کے بجائے اپنی رائے سے بدل ٹھہرانے کی ممانعت ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس جگہ رائے سے نہیں بلکہ سر کے ساتھ قیاس کرتے ہیں تو جواب دیا کہ **ولاقیاس الخ** اور سر کے حکم پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، کیونکہ سر سے تو نماز کا ایک رکن ادا ہوتا ہے، نہ آنکھ سے اور اس کی اختین یعنی بھوؤں سے اور دل سے۔ف۔

حاصل یہ ہے کہ آنکھ، بھوؤں اور دل کے اور سر کے درمیان بہت فرق ہے کیونکہ سر کے ذریعہ سے ایک رکن یعنی سجدہ ادا کیا جاتا ہے، اسلئے اس سے سجدہ کی بجائے اس سے اشارہ نص میں قرار پایا ہے، اور ان تین چیزوں سے سجدہ ادا نہیں کیا جاتا ہے، اس لئے سر کے حکم پر ان کے حکم کو قیاس کرنا قیاس مع الفاروق ہے جو کہ جائز نہیں ہے، پھر جب دل، آنکھ اور بھوؤں سے اشارہ کرنا جائز نہ ہوا اور سر سے اشارہ کرنے کی طاقت نہیں ہے تو ایسے بیمار سے نماز مؤخر کر دی جائے گی، یہی ظاہر الروایۃ ہے اور اسی پر عمل بھی ہے۔

وقوله اخرت عنه اشارة الى انه لاتسقط الصلوة عنه وان كان العجز اكثر من يوم وليلة......الخ

امام قدوریؒ کا یہ کہنا کہ اخرت عنہ یعنی اس سے نماز مؤخر کی جائے گی اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایسے بیمار سے نماز ہمیشہ کے لئے ساقط یا معاف نہیں کی جائے گی۔ف۔ بلکہ فی الحال ادا نہ کرنے کی مہلت اللہ کی طرف سے دی گئی ہے انتہائی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے۔

وان كان العجز اكثر من يوم وليلة اذا كان مفيقا وهو الصحيح لانه يفهم مضمون الخطاب......الخ

اگرچہ ایک رات اور ایک دن سے زیادہ عاجزی اور بیماری رہی ہو بشرطیکہ وہ ہوش و حواس میں ہو۔ف۔ اور باتیں سمجھتا ہو۔م۔ اسی قول کو امام کرخیؒ نے اپنی مختصر میں ذکر کیا ہے، یہی قول بعض مشائخ کا بھی ہے، اسی بناء پر اگر اسے تندرستی ہو گئی اور ادا کرنے کے لئے وقت پایا تو اس پر ان نمازوں کی قضاء لازم ہے، اور اگر وہ خود قضاء بھی نہ کر سکا لیکن آخری وقت میں اس نے ان نمازوں کی طرف سے کفارہ ادا کرنے کے لئے اپنے مال میں وصیت کی تو اس کے ورثہ فدیہ ادا کریں۔ یہی قول صحیح ہے۔ف۔ لیکن شیخ الاسلام خواہر زادہ، فخر الاسلام بزدوی اور قاضی خان کا قول مختار یہ ہے کہ اگر اس کے ذمہ ایک دن اور ایک رات کی نماز باقی ہے تو قضاء لازم ہے اور اگر اس سے زیادہ کی باقی ہو تو قضاء واجب نہیں ہے، اور کہا ہے کہ یہی صحیح ہے۔ الینابیع۔ اور فتاویٰ الظہیر یہ میں کہا ہے کہ یہی ظاہر الروایہ ہے اور اس پر فتویٰ بھی ہے۔ ع۔ ھ۔

اس مسئلہ کے استدلال کی بناء پر جو نوادر میں امام محمدؒ سے مروی ہوا کہ جس شخص کے دونوں ہاتھ کہنیوں سمیت اور پاؤں ٹخنوں سمیت کٹے ہوئے ہوں تو اس پر نماز کی قضاء لازم نہیں ہے، اگرچہ لوگوں کی گفتگو وغیرہ کو وہ سمجھتا ہو۔ قاضی خان۔ لیکن اصح قول یہ ہے کہ اس پر نماز واجب ہے۔ف۔ ت۔ لہٰذا ایک دن رات تک تو قضاء واجب ہو گی اور اس سے زیادہ واجب نہ ہو گی، جیسے کہ بیہوشی اور دیوانگی میں حکم ہے۔ المحیط۔ مگر مصنفؒ نے قدوری اور کرخیؒ کے قول مختار کے مطابق زائد کی بھی قضاء کو واجب کہا ہے۔

لانه يفهم مضمون الخطاب بخلاف المغمى عليه......الخ

کیونکہ یہ بیمار جبکہ افاقہ اور ہوش میں ہے تو نماز کی اداء کے حکم کو سمجھتا ہے۔ف۔ لہٰذا ادا کا حکم اس پر عائد ہوا جس سے اس

کے ذمہ ادا کا وجوب ہو گیا مگر فی الحال انتہائی مجبوری پائے جانے کی وجہ سے اس کے قادر ہونے تک اسے مہلت دی گئی ہے، **بخلاف المغمى عليه** بر خلاف اس شخص کے جس پر بیہوشی طاری ہو گئی ہے۔ف۔ تو وہ اداء کے خطاب ہی کو نہیں سمجھتا ہے اس لئے وہ مخاطب نہیں ہے، کیونکہ اس کیلئے عقل اور ہوش کا پایا جانا شرط ہے، اسی وجہ سے شمس الائمہ سرخسیؒ وغیرہ کے نزدیک کم ہو یا زیادہ اس سے سب معاف کر دئے گئے ہیں، لیکن قابل قبول مذہب یہ ہے کہ رات اور دن سے زائد ہو تو ساقط ہے اور ایک رات دن تک کی قضاء واجب ہے، مگر یہ حکم احتیاط کی بناء پر ہے، اور میرے نزدیک انتہائی غور کے بعد اس کا راز یہ ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کو جب یمن بھیجا جا رہا تھا اس موقعہ پر یہ کہا گیا تھا کہ ان پر دن رات میں پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں، جیسا کہ بخاری میں ہے، اور یہ وقت ۲۴ چوبیس گھنٹوں کا ہوتا ہے خواہ دن بڑا ہو اور رات چھوٹی ہو یا اس کے برعکس ہو اور جو بھی موسم ہو بہر حال اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ ہو گا، ان میں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کے اوقات تو حقیقت میں اداء کی نشانیاں اور علامات ہیں جو اصل اسباب نہیں ہے، یہانتک کہ جن علاقوں میں ۲۲ گھنٹوں کے دن اور اور صرف دو گھنٹوں کے لئے رات ہوتی ہے یا مثلاً عشا کا وقت نہ ملے اس طرح سے کہ مغرب میں شفق کے غائب ہوتے ہیں فجر طلوع ہو جائے یا مثلاً کئی ہفتہ یا مہینہ کے بعد آفتاب غروب ہو تو وہاں بھی پانچوں فرض نمازیں اور رمضان کے روزے فرض ہوتے ہیں، وہ بھی اسی حساب سے کہ چوبیس گھنٹوں میں پانچ نمازیں اور ۲۴ گھنٹوں میں ۱۴ گھنٹے روزہ اور باقی وقت افطار کا ہو، پھر ۲۴ گھنٹوں کے بعد سے یہ عمل شروع ہو، کیونکہ اگر غروب آفتاب مثلاً چھ ماہ کے بعد ہو، بلکہ فرض کیا جائے کہ ایک ہی ہفتہ کے بعد ہو تو اس مدت میں پانچ ہی نمازیں نہیں اور نہ اس طویل مدت تک ایک روزہ کسی شخص سے ممکن ہے، اور نہ چھ ماہ کی رات میں ان کے دنیاوی سب کاروبار بند رہتے ہیں، بلکہ ان ہی ۲۴ گھنٹوں پر مدار ہے، اور خود خروج دجال کی حدیث میں اندازہ کر کے نماز وغیرہ کاموں اور عبادتوں کے بجالانے کی تصریح ہے، اور یہ حدیث اس معنی کی ادائیگی میں ایک صریح نص ہے۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس حساب میں ۲۴ گھنٹوں کے مجموعی اوقات ایک وقت ہے جس میں پانچ وقتوں کی نمازیں ادا کرنی ہیں، پھر دوسرے ۲۴ گھنٹوں میں دوسری پانچ نمازیں ہوں گی، لیکن ان ۲۴ گھنٹوں میں سے ظہر، عصر، وغیرہ اس تفصیل جو زوال آفتاب، سایہ مثل، دوگنا سایہ وغیرہ کو علامت بنا کر کی گئی اور یہ روئے زمین کے بالکل بیچ کے حصہ یعنی عرب حجاز کے لئے مقرر کی گئی ہے جہاں کے باشندے ناخواندہ اور امی تھے، ان کے درمیان ہمیشہ کے لئے یہی علامت رہی، اور لطیف نظریہ ہے کہ جن ملکوں میں دن ورات کے درمیان بہت زیادہ تغیر تبدل ہوتا ہے چونکہ علم خداوندی میں ان میں اسلام کی تعلیم ایسے وقت کے لئے مؤخر رکھی گئی کہ علوم ریاضی کی ترقی اور عروج سے ان کو گھڑی بنوا دی جائے گی اس طرح اس میں اس بات کی کوئی تفصیل نہیں ہے کہ حکم صرف وقت نزول قرآن کے لئے ہے، حضرت علیؓ نے خروج دجال کے واقعہ میں اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ تم اس وقت کی نمازوں کے لئے وقت کا اندازہ کرو، حالانکہ جن کو خطاب کیا گیا ہے ان کا وجود اس وقت بالکل نہ ہو گا، شاید اس قرآن سے مقصود اندازہ حاصل کرنے کے لئے تعلیم حاصل کرنا اور اس کی طرف اشارہ کرنا تھا، اور عام تعلیم شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے انداز سے دی جائے جسے کم سے کم علم والا جاہل بھی سمجھ جائے کیونکہ انتہائی عبادت اور خلوص عقیدت سے قلب ایک عقل کی کلی سے منور ہو جاتا ہے، نتیجہ کے طور پر بغیر بیان اور تعلیم کے ہی زائد علوم کی حاجت پوری ہو جاتی ہے۔ الحاصل اس وقت ۲۴ گھنٹوں کے پورے حصہ میں پانچوں نمازیں مکمل وظیفہ اور عمل ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کی تفصیل ہوتی ہے۔

اب اصل مسئلہ کو بیان کیا جاتا ہے کہ جب بیہوشی کا وقت ایک رات اور ایک دن سے زیادہ نہ گذرا ہو بلکہ اسی وقت کے اندر افاقہ ہو گیا تو گویا اس نے اتنا وقت پالیا جس میں اسے ایک وظیفہ یعنی پانچ وقتوں کی نمازوں کے لئے خطاب کیا جا سکتا ہے یعنی اس پورے وقت میں اسے اتنا ہوش وحواس ہوا جس میں وہ پانچوں فرض نمازوں کا وقت پایا جائے تو اس شخص پر ان نمازوں کی ادائیگی فرض ہوئی، البتہ چونکہ اس پورے وقت سے بہت سا حصہ گذر چکا ہے اس لئے اس بات کا احتمال نکل آیا کہ کیا باقی وقت میں پوری

فرض نمازوں کا اسے ذمہ دار بنادیا جائے گا، جیسے کہ حدیث میں ہے کہ جس نے عصر کی ایک رکعت پائی اس نے عصر پالی، یعنی اگرچہ چاروں رکعتوں کے ادا کرنے کا وقت نہیں پایا، لیکن جب اس کا وقت پالیا تو اس کے ذمہ ادائیگی واجب ہو گئی، لہذا قضاء کے طور پر ادا کرے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے یہاں بھی اسے پانچوں نمازوں کے لئے خطاب کیا گیا، اس بناء پر اداء قضاء کے طریق پر ہو گی، اس لئے اس شخص پر جس کو دن رات کی بیہوشی نہ ہوئی ہو احتیاطا پانچ وقت کی نمازوں کی قضاء کا حکم دیا گیا، حالانکہ حقیقت میں وہ پانچ نمازوں کے تفصیلی اوقات میں بیہوش تھا اسی بناء پر وہ اس لائق نہ تھا کہ اسے ان نمازوں کی ادائیگی کے لئے خطاب بھی کیا جاسکے، برخلاف ایسے بیمار کے جو باہوش وحواس ہو کہ اسے مخاطب کیا جاسکتا ہے کیونکہ ذمہ دار بننے کے لئے جو شرط ہے یعنی ہوش وحواس وہ پائی گئی۔

مصنفؒ نے اسی بات کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ لانه يفهم مضمون الخطاب ، بخلاف المغمى عليه، کیونکہ وہ شخص جو بیہوش پڑا ہے اتنی بات سمجھ ہی نہیں سکتا ہے کہ اسے ادائیگی نماز کے لئے کہا جاسکے، لہذا اس پر باہوش وحواس بیمار کو قیاس کرنا کسی طرح درست نہ ہو گا، کیونکہ بیمار کے بارے میں تو یہ فرض کیا گیا ہے، کہ وہ باہوش ہے یعنی اسے عقل وسمجھ حاصل ہے، لہذا اس کے ذمہ ادائیگی لازم ہو جائے گی، البتہ وہ فی الحال اس کی ادائیگی سے مجبور ہے اس لئے اس کی ادائیگی کی تاخیر میں گنہگار نہ ہو گا، اور اس طرح ایسے شخص کو مخاطب بنانے کا فائدہ یہی حاصل ہو گا کہ اس سے کہا جائے گا کہ جب بھی یہ مجبوری دور ہو ان نمازوں کی قضاء کرے، طاقت اور موقع پالینے کے بعد بھی تاخیر کرنے سے قول اصح کے مطابق مکروہ تحریمی ہو گا، اور اگر تاخیر اتنی ہو جائے کہ موت کا وقت ہو جائے تو اس پر لازم ہو گا کہ ان نمازوں کے کفارہ کی ادائیگی کے لئے اپنے ورثہ کو وصیت کر دے۔

اسی مسئلہ سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اس کو ایسے شخص پر جس کے چاروں ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے ہوں قیاس کرنا درست نہ ہو گا، اول تو اس لئے کہ قول اصح کے مطابق اس پر بھی نماز کے واجب ہونے کا حکم ہے، دوم یہ کہ چاروں ہاتھ پاؤں کٹے کا عذر وقتی طور پر نہیں ہے جو ایک وقت کے بعد ختم ہو جائے گا بلکہ وہ پاگل اور دیوانہ کے حکم میں ہے، کیونکہ مخاطب اسی شخص کو بنایا جاتا ہے جو خطاب کے لائق بھی ہو۔ اور ایسا مجبور ہے جو مردہ کی طرح ہے یا بیہوشی کے مانند ہے جو کسی طرح خطاب کے لائق نہیں ہوتا ہے، البتہ حائضہ عورت اگرچہ بظاہر اس لائق ہے کہ اسے مخاطب بنایا جاسکے پھر بھی اس کے ماہواری کے دنوں کی قضاء کا حکم اس لئے نہیں ہوتا ہے کہ اس سے ایک زبردست پریشانی میں اسے مبتلاء کرنا لازم ہو گا کیونکہ یہ ہو اس کے ہمیشہ کا معمول رہے گا اور وہ ہمیشہ نماز کی قضاء کی فکر میں مبتلاء رہیگی اور یہی وجہ ہے کہ اسے مخاطب سمجھتے ہوئے رمضان کے روزوں کی قضاء کا حکم دیا جاتا ہے کہ وہ تو پورے سال میں صرف ایک بار لازم ہوتے ہیں جن میں چند چھوٹے ہوئے دنوں کی قضاء پورے سال میں کبھی بھی ادا کر سکتی ہے، بخلاف اس بیمار کے جس کا بیان ہو رہا ہے کہ اس کا حال اور اس کی مجبوری حائضہ کے روزہ کی جیسی ہے بلکہ اس سے بھی کم اس لئے اس پر قضاء کا حکم کرنے سے کوئی بڑا حرج لازم نہیں ہوتا ہے، اس پوری بحث کے بعد یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنفؒ نے جس قول کو صحیح فرمایا ہے حقیقت میں بھی وہی اصح وارجح ہے، اس کے باوجود فتاویٰ الظہیر یہ سے اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ مشائخ قول مرجوح کو ہی ترجیح دیتے ہیں اس طرح سے کہ اس پر قضاء لازم آئے گی بشرطیکہ زندگی میں کبھی بھی اسے اتنی طاقت مل جائے یا صحت لوٹ آئے جس میں وہ ادا کر سکے، ورنہ فدیہ کی وصیت کرنی اس پر لازم آئے گی البتہ اگر ایک دن اور رات سے زیادہ عاجز رہا تب قضاء واجب نہ ہو گی، یہ قول عمل کے اعتبار سے آسان ہے اور تقلید کے لئے اسی کو قبول کر لینا کافی ہے، اچھی طرح مسئلہ کو سمجھ لیں، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔م۔

اگر کسی بیمار کو بیماری کی وجہ سے ایسی زبردست اونگھ اور نیند کا غلبہ ہوتا ہو کہ اس کے لئے رکعتوں کی گنتی اور سجدوں کو یاد رکھنا مشتبہ اور مشکل ہو تو اس پر نماز ادا کرنا لازم نہیں ہے۔ت۔ اور اگر ایسے شخص نے کسی غیر کے بتانے اور مدد سے نماز ادا کر لی تو

اسے ادا ہو جانا چاہئے۔ القنیہ۔ د۔ یعنی دوسرا آدمی اسے گنتی بتاتا رہا، پس اگرچہ غیر کی قدرت سے آدمی کو بقول امام اعظمؒ قدرت نہیں ہوتی یہانتک کہ اداء لازم نہیں رہی پھر اگر ادا کرلے تو کیا ادا کا حکم دیا جائے گا، یا نہیں، تو دلیل شرعی کے ظاہر پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہاں ادا ہو گئی۔ م۔ جب بیمار کے ذمہ سے نماز کے اصل ارکان ہی مثلاً قیام، رکوع اور سجود ہی شرعاً ساقط ہو جاتے ہیں تو شرائط نماز جو خارج میں ہوتے ہیں وہ بدرجہ اولیٰ ساقط ہوتے ہیں، پھر ظاہر الروایۃ کے موافق بیمار کے تندرست ہو جانے کے بعد بھی ایسی نمازوں کو دوبارہ پڑھنا بھی لازم نہیں ہے۔ البدائع۔ نماز میں جہاں تک آدمی کھڑا ہو سکتا ہو اتنا کھڑا ہونا فرض ہے، اور اس سے پہلے باب کے شروع میں میں نے اشارہ کیا تھا کہ کھڑے ہونے سے عاجز ہونے میں وہی کھڑا ہونا معتبر ہوگا جس کے ساتھ سجدہ کرنا بھی ممکن ہو، ورنہ نہیں، اسی کی تفصیل میں مصنفؒ آئندہ فرمارہے ہیں۔

وان قدر على القيام ولم يقدر على الركوع والسجود لم يلزمه القيام و يصلي قاعدا يؤمي الايماء لان ركنية القيام للتوسل به الى السجدة لما فيها من نهاية التعظيم فاذا كان لايتعقبه السجود لايكون ركنا فيتخير والافضل هو الايماء قاعدا لانه اشبه بالسجود وان صلى الصحيح بعض صلوته قائما ثم حدث به مرض اتمها قاعدا يركع و يسجد او يؤمي ان لم يقدر او مستلقيا ان لم يقدر لانه بنى الادنى على الاعلى فصار كا لاقتداء ومن صلى قاعدا يركع ويسجد لمرض ثم صح بنى على صلاته قائما عند ابى حنيفةؒ و ابى يوسفؒ و قال محمدؒ استقبل بناء على اختلافهم فى الاقتداء وقد تقدم بيانه.

ترجمہ:- اگر بیمار کھڑے ہونے پر قادر ہو لیکن رکوع اور سجود پر قادر نہ ہو تو اس پر کھڑا ہونا لازم نہ ہوگا، اس لئے وہ بیٹھ کر اشارہ سے نماز پڑھے، کیونکہ کھڑے ہونے کو ایک مستقل رکن بنانا اس لئے تھا کہ اسی کے وسیلہ سے سجدہ ادا ہو جائے کیونکہ ایسے سجدہ میں انتہائی تعظیم ہے، پس جبکہ ایسا قیام ہو جس کے بعد سجدہ کرنا نہ ہو وہ رکن کی حیثیت سے باقی نہیں رہے گا، لہذا اسے اختیار ہوگا، ایسی صورت میں بیٹھ کر اشارہ کرنا بہتر ہوگا۔ کیونکہ بیٹھ کر سجدہ کا اشارہ کرنا حقیقی سجدہ سے بہت مشابہ ہوگا، اور اگر تندرست انسان نے نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر پڑھا اور اسی حالت میں اسے بیماری لگ گئی تو وہ اسے بیٹھ کر پوری کرے رکوع اور سجدہ کرتے ہوئے یا اگر رکوع اور سجدہ پر قدرت نہ ہو تو اشارہ سے پڑھے، اور اگر بیٹھ کر بھی پڑھنے کی طاقت نہ ہو تو چت لیٹ کر پڑھے اس لئے کہ اس نے ادنیٰ کی اعلیٰ پر بناء کی ہے، اس لئے اقتداء کے مانند ہو گیا، اور اگر کسی نے اپنی بیماری کی وجہ سے رکوع و سجدہ کرتے ہوئے بیٹھ کر نماز پڑھی، پھر وہ اچھا ہو گیا تو وہ امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کھڑے ہو کر اپنی بقیہ نماز پوری کرلے اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ وہ نئے سرے سے پڑھے، یہ اختلاف ان اماموں کے اس اختلاف پر مبنی ہے جو اقتداء میں ہے، اور اس کا بیان گذر چکا ہے۔

توضیح:- کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت ہو مگر رکوع و سجود کی نہ ہو، اور اگر تندرست آدمی نے کچھ نماز کھڑے ہو کر پڑھی اچانک بیمار ہو گیا ہو، بیماری میں بیٹھ کر کوئی نماز پڑھتا تھا کہ اچانک کھڑے ہونے کی طاقت ہو گئی

وان قدر على القيام ولم يقدر على الركوع والسجود لم يلزمه القيام......الخ

اگر بیمار کو کھڑے ہونے کی تو طاقت ہو مگر رکوع اور سجود۔ ف۔ بلکہ صرف سجود کی ہی طاقت نہ **لم يلزمه الخ** جب بھی اس پر کھڑا ہونا لازم نہ ہوگا۔ ف۔ بلکہ چاہے تو کھڑے ہو کر پڑھے اور اگر چاہے بیٹھ کر پڑھے، جبکہ بیٹھ کر پڑھنا اس کے لئے افضل ہوگا، اسی لئے فرمایا و يصلي الخ اور بیٹھ کر اشارہ کے ساتھ پڑھے۔ ف۔ یعنی رکوع اور سجدہ کو اشارہ سے ادا کرلے، لان ركنية الخ اور کھڑا ہونا اس لئے ضروری نہ رہا کہ کھڑا ہونا اسلئے رکن بنایا گیا ہے کہ اس کے وسیلہ سے سجدہ ادا ہو جائے لما فيها الخ کیونکہ ایسے سجدہ میں انتہائی تعظیم ہے۔ ف۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی۔ فاذا كان الخ اور اب جبکہ قیام ایسا ہو جس کے بعد

سجدہ حقیقی نہ ہو سکے تو وہ قیام رکن نہ رہا اسی بناء پر ایسے نمازی کو کھڑے ہونے اور نہ ہونے کے درمیان اختیار دیا گیا ہے۔ف۔اور اب قیام کرنے اور نہ کرنے کی دو صورتوں میں سے کون سی صورت افضل ہوگی‘ تو جواب دیا:

والافضل هو الايماء قاعدا لانه اشبه بالسجود وان صلي الصحيح بعض صلوته قائما......الخ

اور افضل تو یہی ہے کہ بیٹھ کر اشارہ سے سجدہ کرے۔ف۔یعنی کھڑانہ ہو لانہ اشبہ الخ کیونکہ بیٹھ کر سجدہ کو اشارہ سے ادا کرنا حقیقی سجدہ کے زیادہ مشابہ ہے۔ف۔بخلاف کھڑے ہو کر اشارہ سے سجدہ کرنے کے، کہ اس کیفیت میں زمین سے بہت دور رہنا ہوتا ہو، اب اگر اس کی بیماری پہلے سے نہ ہو بلکہ نماز کے اندر پیدا ہوئی ہو، تو فرمایا وان صلی الخ اور اگر ایسے تندرست نے جس کو کھڑے ہونے کی ایسی مجبوری نہ ہو جو بیان کی گئی ہے، اگرچہ وہ کسی اور شکل میں بیمار ہو، پس اگر ایسے شخص نے اپنی نماز کا کچھ حصہ کھڑے ہو کر ادا کیا پھر وہ کھڑے ہو کر پڑھنے سے عاجز ہو گیا۔ف۔یعنی خواہ اسی وقت مرض پیدا ہو گیا ہو یا بیماری اس طرح ظاہر ہو رہی ہو کہ کھڑے ہونے سے مجبور ہو گیا اتمھا الخ تو وہ بیٹھ کر اپنی نماز پڑھ لے یرکع الخ اور وہ رکوع و سجود ادا کرتا رہے۔ف۔بشرطیکہ ان دونوں کو کر سکتا ہو، ویومی الخ یا رکوع و سجدہ کو اشارہ سے ادا کرے اگر انہیں حقیقۃً نہ کر سکتا ہو۔ف۔لیکن بیٹھ سکتا ہو او مستلقیا الخ یا بیٹھنے کی بھی طاقت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھے۔ف۔اس میں چت لیٹنا افضل ہے اور کروٹ پر لیٹنا جائز ہے، بشرطیکہ چت لیٹنا ممکن ہو ورنہ جس طرح لیٹنا ممکن ہو وہی صورت بہتر ہوگی، پھر اگرچہ کھڑے ہو کر نماز شروع کی ہو مگر اس کمزوری کی وجہ اسی حالت میں پوری کرنی جائز ہے۔

لانه بني الادني على الاعلى فصار كالاقتداء......الخ

کیونکہ اس نے ادنی کی بناء اعلیٰ پر کی ہے اس لئے اس کا حکم اقتداء جیسا ہوا۔ف۔اسی بناء پر اعلیٰ یعنی فرض پڑھنے والے کی نماز پر ادنیٰ یعنی نفل پڑھنے والے کی بناء کرنا اور اس کی نفل کو اعلیٰ پر مبنی کرنا بالاجماع جائز ہے، اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی نماز شروع کرتے وقت تو مجبوری تھی مگر نماز ہی کے درمیان کچھ طاقت آگئی تو اس صورت میں اختلاف ہوگا، کیونکہ اس طرح اعلیٰ کو ادنیٰ پر بناء کرنا لازم آئے گا، اسی لئے فرمایا ہے:

ومن صلي قاعدا يركع ويسجد لمرض ثم صح بني على صلاته قائما عند ابي حنيفة......الخ

اور جو شخص کہ بیٹھ کر پڑھتا ہو وہ رکوع اور سجدہ کرے بشرطیکہ کر سکتا ہو۔ف۔یعنی کھڑے ہونے سے تو عاجز ہو کر بیٹھا ہو مگر رکوع و سجود دونوں رکنوں کو حقیقتاً ادا کرتا ہو لمرض الخ یہ بیٹھنا کسی بیماری کی وجہ سے ہو، پھر وہ تندرست ہو گیا۔ف۔یعنی جس مجبوری کی وجہ سے اس نے بیٹھ کر نماز شروع کی تھی وہ اچانک کم ہو گئی یا دور ہو گئی، اگرچہ وہ اب بھی بیمار ہو، تو ایسی صورت میں بنی علی صلاته الخ تو امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک کھڑا ہو کر اپنی نماز پر بناء کر لے۔ف۔یعنی بقیہ نماز پوری کر لے۔

و قال محمدؒ استقبل بناء على اختلافهم في الاقتداء وقد تقدم بيانه......الخ

لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ وہ دوبارہ شروع سے پڑھے، بناء علی الخ موجودہ اختلاف اماموں کے اس اختلاف کی بناء پر ہے جو اقتداء کے مسئلہ میں ہے وقد تقدم الخ جبکہ اس کا بیان گذر چکا ہے۔ف۔یعنی امامت کے بیان میں۔

جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر امام بیٹھا ہو اور مقتدی کھڑے ہوں تو امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے جس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ قوی کی بناء ضعیف پر ہے اور یہ جائز نہیں ہے، لیکن اس بندہ مترجم کے نزدیک شاید اسی کی دوسری وجہ بھی ہو، کیونکہ اتنی سی وجہ کافی نہیں ہے۔ واللہ اعلم۔ بہر حال امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے لیکن شیخینؒ کے نزدیک جائز ہے، اسی طرح نماز کو بیٹھ کر شروع کرنے کے بعد کھڑے ہو کر پڑھنے کو جائز کہنا شیخینؒ کے نزدیک تو درست ہے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، پھر اس قاعدہ کی نماز میں یہ شرط ہے کہ رکوع اور سجدہ حقیقی ہو تب تو بناء کرنا جائز ہے ورنہ نہیں۔

وان صلی بعض صلوته بایماء ثم قدر علی الرکوع والسجود استأنف عندهم جمیعا لانه لایجوز اقتداء الراکع بالمومی فکذا البناء ومن افتتح التطوع قائما ثم اعیٰی لاباس ان یتوکأ علی عصا او حائط اویقعد لان هذا عذر، وان کان الاتکاء بغیر عذر یکره لانه اساءة فی الادب و قیل لایکره عند ابی حنیفةؒ لانه لو قعد عنده یجوز من غیر عذر فکذا لایکره الاتکاء وعندهما یکره لانه لا یجوز القعود عندهما فیکره الاتکاء وان قعد بغیر عذر یکره بالاتفاق و تجوز الصلوة عنده ولاتجوز عندهما وقد مرفی باب النوافل.

ترجمہ:-اگر کسی بیمار نے اپنی کچھ نماز اشارہ سے پڑھی پھر وہ رکوع اور سجدہ ادا کرنے پر قادر ہو گیا تو تمام ائمہ کے نزدیک وہ بالکل شروع سے نماز پڑھے گا، کیونکہ رکوع کرنے والے کے لئے اشارہ سے پڑھنے والے کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، اسی طرح بناء کرنا بھی جائز نہیں ہے، اور جس نے کھڑے ہو کر نفل نماز شروع کی پھر عاجز ہو گیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کسی چھڑی پر یا دیوار پر ٹیک لگائے یا بیٹھ جائے، کیونکہ یہ مجبوری کی وجہ سے ہے، اور اگر بغیر عذر کے ٹیک لگائے تو مکروہ ہے کیونکہ یہ بے ادبی ہے، اور کہا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ نہ ہوگا، کیونکہ اگر وہ بیٹھ جائے تب بھی بغیر عذر کے جائز ہے، اسی طرح ٹیک لگانا بھی مکروہ نہیں ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے کیونکہ ان حضرات کے نزدیک بیٹھنا جائز نہیں ہے، اس لئے ٹیک لگانا بھی مکروہ ہے، اور اگر کسی عذر کے بغیر ہی شروع کرنے کے بعد بیٹھ جائے تو بالاتفاق مکروہ ہوگا، اور امام صاحب کے نزدیک نماز تو جائز ہو جائے گی، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگی یہ بحث نوافل کے بیان میں گذر گئی ہے۔

توضیح:- بیمار نے کچھ نماز اشارہ سے پڑھی تھی کہ اسے رکوع اور سجدہ کرنے پر قدرت ہو گئی نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کی اور تھک کر بیٹھ گیا، کوئی بے عذر بیٹھ گیا، نفل بیٹھ کر شروع کی پھر کھڑا ہو گیا، نفل میں اشارہ، چار رکعتیں بیٹھ کر پڑھیں اور قعدہ اولیٰ بھول گیا، دوسری رکعت کے آخری سجدہ سے جب سر اٹھا کر قیام کیا یعنی بیٹھ کر پڑھی، اور پڑھنے سے پہلے اپنے سہو کا علم ہو گیا، بیمار نے چوتھی رکعت کے آخری سجدہ سے جب سر اٹھایا تو اس کو تیسری رکعت گمان کر کے قرأت کی اور رکوع و سجدہ کیا، تیسری رکعت کو دوسری رکعت سمجھ کر قراءت کی پھر خیال آگیا کہ تیسری ہے، مریض کو قرأت و تسبیح و تشہد، بیمار اور تندرست میں فرق، مریض قبلہ کی طرف رخ کرنے سے عاجز ہو اور وہاں پر کوئی دوسرا نہ ہو، مریض کا بستر ناپاک ہو اور وہ بول بھی نہیں سکتا ہو، رمضان کا روزہ رکھ کر بیٹھ کر اور افطار میں کھڑے ہو کر پڑھ سکتے ہیں، مریض اور وقت سے پہلے نماز، بغیر قراءت اور بغیر وضوء، مرد پر مریضہ بیوی کو وضو کرنا، بغیر حدث کے رکن ادا نہ ہونا، حالت مرض کی قضاء صحت کی نماز مرض میں، نمازی کا اپنے پاس دوسرے کو رکوع و سجود سے خبردار کرنے کو بٹھانا، مریض اور جمعہ کا دن

وان صلی بعض صلوته بایماء ثم قدر علی الرکوع والسجود استأنف عندهم جمیعا......الخ

اگر کسی نے نماز کا کچھ حصہ اشارے سے پڑھا۔ف۔ یعنی رکوع اور سجدہ کو بیماری کی وجہ سے اشارہ سے کیا ہو ثم قدر الخ پھر وہ حقیقی رکوع و سجود پر قادر ہو گیا استانف الخ تو تینوں اماموں کے نزدیک بالاتفاق نئے سرے سے نماز پڑھے، لانہ لایجوز الخ کیونکہ جو شخص رکوع کرنے پر قادر ہو اس کے لئے اشارہ سے رکوع کرنے والے کی اقتداء کرنی صحیح نہیں ہے، اس لئے جب شروع ہی میں اس کی اقتداء صحیح نہیں ہے تو اس پر بناء کرنا بھی صحیح نہ ہوگا۔ف۔ اس موقع پر ایک قاعدہ اور اصل یہ ہے کہ جس جگہ اقتداء جائز ہے وہاں بیمار نمازی کو اپنے حال میں بھی بناء کرنا جائز ہے، اور جس جگہ جائز نہیں ہے وہاں اپنے حق میں بھی جائز نہیں ہے مع۔ جامع الفقہ میں اسی مسئلہ مذکورہ میں لکھا ہے کہ اگر وہ شخص رکوع اور سجدہ کو پہلے سے اشارہ کے ساتھ کرنے پر قادر ہو گیا ہو تو اسی تحریمہ پر اپنی نماز مکمل کرے۔ف۔ الجوہرہ۔ اسی طرح اگر لیٹ کر اشارہ سے پڑھتا ہو پھر وہ اشارہ کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو تو قول مختار کے مطابق نئے سرے سے پڑھے۔ الفتح۔ یہ پوری تفصیل فرض نماز کے سلسلہ میں تھی، اور اب نفل کے مسائل بیان کر رہے ہیں۔

ومن افتتح التطوع قائما ثم اعیی لاباس ان یتوکا علی عصا او حائط اویقعد لان ھذا عذر......الخ

اور جس نے نفل نماز کھڑے ہو کر شروع کی پھر وہ تھک گیا۔ف۔اگرچہ پورے طور پر بیمار یا عاجز نہیں ہوا پھر بھی لاباس الخ اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ کسی چھڑی یا دیوار پر ٹیک لگائے یا دیوار پر بیٹھ جائے، لان ھذا الخ کیونکہ نفل میں تھکان کا ہونا بھی ایک عذر ہے۔ف۔اس لئے ٹیک دینا اور بیٹھنا دونوں ہی کام جائز ہیں، اور عذر نہ ہونے کی صورت میں دونوں میں اختلاف ہے، اسی لئے فرمایا وان کان الاتکاء الخ کہ اگر بغیر عذر ٹیک لگایا جائے تو مکروہ ہوگا کیونکہ یہ بے ادبی میں داخل ہے۔ف۔یعنی بے ادبی میں داخل ہے، اور مذکورہ روایت بالاتفاق ہے وقیل الخ اور کہا گیا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، کیونکہ امام احمدؒ کے نزدیک بغیر عذر کے بیٹھ گیا تو جائز ہوگا۔ف۔یہ اصح قول کے مطابق بیان کیا گیا ہے، جیسا کہ فخر الاسلامؒ نے بیان فرمایا ہے فکذا الخ تو اسی طرح ٹیک لگانا بھی مکروہ نہ ہوگا۔ف۔کیونکہ یہ تو بیٹھ جانے سے کم عذر ہے وعندھما یکرہ الخ لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ ہے، کیونکہ صاحبینؒ کے نزدیک بغیر عذر کے بیٹھنا جائز نہیں ہے اس لئے ٹیک لگانا بھی مکروہ ہے۔ف۔مگر فخر الاسلامؒ نے تصریح کی ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک ٹیک لگانا مکروہ ہے اور بیٹھنا مکروہ نہیں ہے۔ف۔مگر قدوریؒ نے لکھا ہے کہ

وان قعد بغیر عذر یکرہ بالاتفاق و تجوز الصلوۃ عندہ ولاتجوز عندھما وقد مر فی باب النوافل.

اور اگر بغیر عذر کے بیٹھ گیا تو بالاتفاق مکروہ ویجوز الخ اور امام اعظمؒ کے نزدیک اس کی نماز جائز ہوگی لیکن صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہ ہوگا۔وقد مر الخ اور یہ مسئلہ نوافل کے بیان میں گذر چکا ہے۔ف۔اور وہاں یہ لکھا ہے کہ صحیح قول کے مطابق بغیر عذر بیٹھنا امام اعظمؒ کے نزدیک مکروہ نہیں ہے، جیسا کہ فخر الاسلامؒ نے مبسوط میں تصریح کی ہے، اور محیط میں کہا ہے کہ یہ استحسان ہے، اس لحاظ سے یہ نئی بات بتائی کہ امام اعظمؒ کے نزدیک لفظ کراہت خلاف اولیٰ کے معنی میں ہے، اسی وجہ سے نماز جائز ہو جائے گی، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے، اور تضعیف کی وجہ سے بناء کرنا جائز نہیں ہے، اور لفظ مکروہ سے عموم مجاز مراد لینا جائز ہے، اور چونکہ دوسرے شارحین کی نظر اس نکتہ پر نہیں گئی اس لئے وہ پریشان ہو گئے، حالانکہ خلاصہ کلام یہ ثابت ہوا کہ عذر کی حالت میں ٹیک لگانا اور بیٹھنا بالاتفاق جائز ہے، اور بغیر عذر کے ٹیک لگانا تو بالاتفاق مکروہ ہے اور بیٹھنا بھی مکروہ ہے، مگر صاحبینؒ کے نزدیک مکروہ تحریمی اور امام اعظمؒ کے نزدیک بھی قیاس کے مطابق یہی ہونا چاہئے تھا مگر استحساناً مکروہ تحریمی نہیں ہے البتہ خلاف اولیٰ ہے یعنی مکروہ تنزیہی ہے، اچھی طرح ان مسائل کو یاد رکھو۔واللہ تعالیٰ اعلم۔م۔

اور اگر بیٹھ کر نفل نماز شروع کی پھر کھڑا ہو گیا تو بالاتفاق جائز ہے۔ع۔نفل نماز میں اگر رکوع اور سجدہ کی قدرت ہو تو اشارہ سے پڑھنا جائز نہیں ہے۔التاتارخانیہ۔اگر چار رکعتیں بیٹھ کر پڑھیں اور درمیان میں جب بیٹھا تو تشہد بھول کر قراءت کی اور رکوع کیا تو وہ بقیہ نماز اسی اعتبار سے پوری کرے کیونکہ اس کا اس طرح بیٹھنا قیام کے حکم میں ہوگا۔القاضی خان۔البتہ آخر میں سجدہ سہو کر لے، اور اگر دوسری رکعت کے دوسرے سجدہ سے سر اٹھا کر کھڑا ہونے کا ارادہ کیا یعنی بیٹھ کر پڑھنے کا اور ابھی پڑھا بھی نہ تھا تو اسے اپنا سجدہ سہو یاد آ گیا تو وہ تشہد پڑھنا شروع کرے۔القاضی خان۔بیمار نے جب چوتھی رکعت کے آخری سجدہ سے سر اٹھایا اگرچہ اشارہ سے سجدہ کیا ہو تو اسے تیسری رکعت گمان کر کے قراءت و رکوع اور سجدہ کیا اگرچہ اشارہ سے ہو تو نماز فاسد ہو گئی، اور اگر اس نے تیسری رکعت کو دوسری رکعت سمجھ کر قراءت کی پھر اسے خیال آیا کہ یہ تیسری رکعت ہے تو اب تشہد پڑھنے کا خیال نہ کرے بلکہ قراءت شروع کر دے اور آخر میں سجدہ سہو کرے۔المحیط۔بیمار کو چاہئے کہ اپنی نماز میں قراءت و تسبیح اور تشہد ایک تندرست کی طرح پڑھے، اور اگر اس طرح پڑھنے سے مجبوری محسوس ہو تو پھر چھوڑ دے۔التاتارخانیہ۔

بیمار اور تندرست کے درمیان ان باتوں ہی میں فرق ہوگا جن کے کرنے سے وہ مجبور اور عاجز ہو ورنہ وہ بھی بقیہ کام تندرست کی طرح ہی کرے گا، اگر بیمار قبلہ پہچانتا ہو لیکن اس طرف منہ کرنے سے عاجز ہو اور کوئی اسے قبلہ رو کر دینے والا نہ ہو

توجس رخ پر ہو اس رخ پر پڑھ لے اگر کوئی ایسا موجود ہو جو اسے قبلہ رو کر سکتا ہے مگر اسے ایسا کرنے کو نہیں کہا اور نماز پڑھ لی تو وہ نماز صحیح نہ ہو گی، اسی طرح جب بستر ناپاک ہو پھر بھی کسی شخص کو بدلنے کو نہیں کہا تو نماز جائز نہ ہو گی، اور کسی ایسے کو نہیں پایا تو جائز ہو گی۔ المحیط۔ اور اگر بستر بدلنے کے بعد نماز سے فارغ ہونے سے پہلے اس کے بھی ناپاک ہونے کا اندیشہ ہو یا بدلنے سے دقت ہوتی ہو تو اسی ناپاک بستر پر ہی پڑھ لے۔ القاضی خان۔ اگر کوئی ایسا بیمار ہو رمضان کے روزے رکھے تو بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے لیکن اگر روزہ نہ رکھے اور افطار کر لے تو کھڑے ہو کر نماز پڑھ سکتا ہے، ایسی صورت میں وہ روزے رکھے اور بیٹھ کر نماز پڑھے۔ محیط السرخسی۔

اگر کسی بیمار نے وقت سے پہلے نماز پڑھ لی خواہ قصداً ہو یا بھول کر ہو اس ڈر سے کہ تاخیر کرنے سے اسکی مخصوص بیماری اس کی نماز میں حارج ہو گی تو یہ نماز صحیح نہ ہو گی، اسی طرح اگر بغیر قرات یا بغیر وضوء پڑھ لی تو بھی جائز نہ ہو گی، اور اگر قراءت کرنے سے عاجز ہو تو بغیر قراءت کے اشارے سے پڑھے،، کسی مرد پر یہ لازم نہیں ہے کہ اپنی بیمار بیوی کو وضوء کرائے۔ المحیط۔ اگر کوئی شخص کوئی رکن بغیر حدث کے ادانہ کر سکتا ہو تو وہ رکن اس سے معاف ہو جاتا ہے، مثلاً سجدہ کرنے سے اس کے زخم سے خون بہنے لگتا ہے اور باقی افعال وہ اچھی طرح ادا کر سکتا ہے تو اسے چاہئے کہ بیٹھ کر اشارہ سے رکوع و سجدہ کرے، اور اگر اس نے کھڑے ہونے یا بیٹھنے میں رکوع کیا اور سجدہ کے لئے بیٹھ کر اشارہ کیا تو جائز ہے، مگر پہلی صورت بہتر ہے۔ المحیط۔ اسی طرح اگر کھڑے ہونے میں پیشاب یا زخم جاری ہو جاتا ہے یا قراءت نہیں کر سکتا ہے، لیکن بیٹھ کر پڑھنے میں ایسی باتیں نہیں ہوتی ہیں تو وہ بیٹھ کر ہی پڑھے۔ السراجیہ۔ اگر کھڑے ہو کر پڑھنے میں دشمن کا ڈر ہو یا خیمہ میں رہنے کی وجہ سے پیٹھ سیدھی نہیں ہو سکتی ہو اور باہر کیچڑ یا پانی ہے تو وہ بیٹھ کر ہی نماز پڑھ لے، بیمار کی جتنی نمازیں قضاء ہوئیں ان کو صحت کے بعد تندرستوں کی طرح ادا کرے اور اگر بیمار کی طرح پڑھ لی تو جائز نہ ہو گی۔ محیط السرخسی۔ اور تندرستی کے زمانہ کی قضاء نمازوں کو بیماری کی حالت میں جس طرح ادا کر سکتا ہو کر لے، خواہ بیٹھ کر یا اشارے سے۔ السراجیہ۔

اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کو اپنے قریب اس لئے بٹھائے کہ وہ اس کی نماز کی غلطیوں رکوع، سجدہ،، سہو وغیرہ سے مطلع کرتا رہے تو اس صورت میں یہ کام جائز ہو گا جبکہ اس کے بغیر صحیح پڑھنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ القنیہ۔ مریض کو چاہئے کہ وہ ظہر کی نماز میں اتنی تاخیر کرے کہ امام جمعہ سے فارغ ہو جائے، ورنہ نماز مکروہ ہو گی، یہی قول صحیح ہے۔ المضمرات۔

ومن صلى في السفينة قاعدا من غير علة اجزاه عند ابى حنيفةؒ والقيام افضل و قالا لايجزيه الا من عذر لان القيام مقدور عليه فلا يترك وله ان الغالب فيها دوران الراس وهو كالمتحقق الا ان القيام افضل لانه أبعد من شبهة الخلاف والخروج افضل ما امكنه لانه اسكن لقلبه والخلاف فى غير المربوطة والمر بوطة كالشط هو الصحيح.

ترجمہ: - اگر کسی شخص نے کسی مجبوری کے بغیر کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھ لی تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز صحیح ہو جائے گی، اگرچہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنی افضل ہے، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ بغیر عذر کے ایسی نماز جائز نہ ہو گی، اس لئے کہ اسے کھڑے ہونے کی قدرت حاصل ہے لہذا کھڑے ہونے کو نہ چھوڑے، اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ کشتی کی سواری کے وقت عموما مسافروں کا سر چکراتا ہے، لہذا اس عذر کو حقیقۃ واقع مان لیا گیا ہے، اگرچہ کھڑا ہونا ہی افضل ہے، کیونکہ جہانتک ممکن ہو ایسا کرنے سے اختلاف کے شبہ سے آدمی دور نکل جاتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے دل کو سکون میسر ہوتا ہے، یہ اختلاف مذکور اس صورت میں ہے جبکہ کشتی رواں ہو بندھی ہوئی نہ ہو، اور بندھی ہوئی کشتی حکم میں کنارے کے ہے، یہی قول صحیح ہے۔

توضیح: - چلتی ہوئی کشتی میں نماز، بندھی ہوئی کشتی میں نماز، دریا کے بیچ میں کشتی ٹھہری اور ہوا سے اسے

حرکت ہونے لگی، کشتی کے اندر جماعت، دو کشتیوں میں جماعت، امام کشتی کے اندر اور مقتدی زمین کے کنارے پر یا اس کے برعکس ہونے کی صورت میں، کشتی کا گھوم جانا، کنارہ پر نماز اور کشتی کے گھومنے سے سامان کے برباد ہونے کا خوف

ومن صلی فی السفینة قاعدا من غیر علة اجزاه عند ابی حنیفة والقیام افضل......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے وقالا الخ اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ بغیر عذر کے اس کی نماز ادا نہ ہوگی۔ف۔یہی قول امام مالک امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے لان القیام الخ کیونکہ کھڑے ہونے کی جب تک طاقت ہے اس سے معافی نہ ہوگی۔ف۔برہان میں کہا ہے کہ یہی قول اظہر ہے۔د۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابو حنیفہؒ کا قول واضح اور بزرگوں کی اتباع کے زیادہ موافق ہے، جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔م۔ولہ الخ اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ کشتی میں اکثر مسافروں کے سر چکراتے ہیں وھو الخ اور یہ بات ایسی ہے گویا ابھی محقق اور ثابت ہے۔ف۔جیسے سفر میں قصر کی نماز کی اجازت اس وجہ سے ہے کہ اس میں عموماً لوگوں کو دقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، بس اگر ظاہر میں کسی کو مشقت نہ بھی ہو تو بھی اسے قصر ہی کرنی ہے، اس طرح کشتی میں سر چکرانا اکثر ہوتا ہے اس لئے یہ حکم ہر شخص کے حق میں ثابت ہوگا کیونکہ وہ عذر ہر وقت موجود ہے، اسی لئے اسے بیٹھ کر پڑھنا جائز ہے۔

الا ان القیام افضل لانہ ابعد من شبھة الخلاف والخروج افضل......الخ

لیکن کھڑے ہو کر پڑھنا اس حیثیت سے افضل ہے کہ یہ صورت اختلاف کے شبہ سے بھی بہت دور ہے۔ف۔یعنی علماء اجتہاد کا اختلاف ہے کہ بغیر عذر قیام کو ترک کر دینا جائز نہیں ہے تو اس اختلاف سے ایک قسم کا یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید بیٹھنا جائز نہ ہو، تو بہتر ہوگا کہ کھڑا ہو کر پڑھے تاکہ شبہ سے دور رہے، اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کشتی میں نمازی کو قبلہ کی طرف رخ کرنا ہر حالت میں فرض ہے، اور جدھر کشتی گھومے وہ فوراً قبلہ رخ گھوم جائے، کیونکہ یہ ممکن ہے، بخلاف جانور پر سواری کے، یہ دلیل شمس الائمہ سرخسیؒ نے ذکر کی ہے۔مع۔پھر یہ حکم عام ہے، خواہ کشتی میں سے باہر نکل سکتا ہو یا نہ نکل سکتا ہو یا نہیں، والخروج افضل الخ اور جہاں تک ممکن ہو کشتی سے باہر نکل آنا افضل ہے، کیونکہ اس صورت میں سب سے زیادہ سکون اس کے قلب کو حاصل ہوا ہے۔ف۔لیکن اگر کشتی سے باہر نکل سکتا ہے پھر بھی نہیں نکلا اور اسی میں نماز پڑھ لی تب بھی نماز جائز ہوگی، ابن حزمؒ نے محلی ابن سیرینؒ کی حدیث سے ذکر کیا ہے کہ ہمیں صحابی سردار نے کشتی میں نماز پڑھائی اس حالت میں کہ ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اگر ہم چاہتے تو کشتی سے باہر بھی نکل سکتے تھے، مجاہدؒ نے فرمایا ہے کہ ہمیں جنادہ بن ابی امیہ (اگر ازدی ہیں تو صحابی ہیں، اور اگر شامی ہیں ابو عبد اللہ تو تابعی ثقہ ہیں لیکن مجاہد کی روایت مقوی اول ہے۔۱۲المترجم۔) نے کشتی میں نماز پڑھائی اس طرح سے کہ ہم لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اگر چاہتے تو کھڑے بھی ہو سکتے تھے مع۔

والخلاف فی غیر المربوطة والمربوطة کالشط ھو الصحیح

یہ اختلاف کشتی میں بے عذر بیٹھے ہوئے نماز جائز ہوگی یا نہ ہوگی ایسی کشتی کے بارے میں ہے جو کہ بندھی ہوئی نہ ہو۔ف۔یعنی کنارے پر لنگر ڈالے ہوئے نہ ہو، والمربوطة الخ کیونکہ جو کشتی کے کنارے پر بندھی ہوئی ہو دریا کے کنارے کی زمین کے مثل ہے یہی صحیح قول ہے۔ف۔اگرچہ عامہ مشائخ کے نزدیک بندھی ہوئی اور کھلی ہوئی کشتی کا حکم برابر ہے کیونکہ لفظ مطلق ہے یعنی سفینہ مربوطہ بندھی ہوئی کی قید نہیں ہے، لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے، صحیح قول یہ ہے کہ اگر کشتی رواں ہو تو سر چکرانے کی صورت میں ہو تو بالاجماع بیٹھ کر جائز ہے، اور اگر سر کا چکر نہ ہو تو بھی امام اعظمؒ کے نزدیک جائز ہے، اگرچہ صاحبینؒ کے نزدیک جائز نہیں ہے، اور اگر کشتی بندھی ہوئی ہو تو بالاجماع بیٹھ کر جائز نہیں ہے۔المجتبیٰ۔الدرایہ۔وغیرہ۔اور اگر کشتی بیچ دریا میں

ٹھہری ہوئی ہو تو اصح قول یہ ہے کہ اگر ہوا سے اسے بہت زیادہ حرکت ہو تو وہ بھی جاری اور رواں کے حکم میں ہے، اور اگر تھوڑی حرکت ہو تو وہ کنارے پر بندھی ہوئی کے حکم میں ہے۔ التمر تاشی۔

اگر عذر ہو تو بالاجماع ہر صورت میں بیٹھنا جائز ہے، محیط میں ہے کہ کشتی میں اشارہ سے رکوع اور سجدہ جائز نہیں ہے اگرچہ فرض ہو یا نفل ہو مگر جبکہ عذر ہو، ایک کشتی میں جماعت کرنا جائز ہے، اسی طرح دو کشتیوں میں بھی جائز ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ دونوں ملی ہوئی ہوں، جیسے دو جانوروں پر نفل کی جماعت جائز ہے اس صورت میں کہ وہ آپس میں بندھے ہوئے ہوں، امام کشتی پر ہو اور مقتدی کنارے زمین پر ہوں، یا اس کے برعکس ہو اور ان کے درمیان راستہ یا دریا کا حصہ حائل نہ ہو تو جائز ہے، ورنہ جائز نہیں ہے، اگر کشتی کے گھومنے پر جماعت والے قبلہ رخ ہو جائیں ایسی صورت میں جو مقتدی امام سے آگے بڑھ جائے تو اس کی نماز فاسد ہو گی ورنہ نہیں، اگر کوئی شخص دریا کے کنارے نماز پڑھ رہا ہو کہ اسی حالت میں دریا کے اندر کشتی گھومی جس سے خود اسے یا اس کے سامان کے ڈوبنے یا چوری ہونے کا خوف ہو تو اس کے لئے اپنی نماز کی نیت توڑنی جائز ہو گی، جیسے اس وقت جبکہ جانور بدک کر بھاگے یا جانور چرواہے نمازی کو اپنے جانور پر درندہ کا خوف ہو یا کسی دشمن کی طرف سے خطرہ ہو یا کسی اندھے آدمی کے کنویں یا گڑھے میں گرنے کا خوف ہو یا کسی چھت سے گرنے یا ڈوب جانے یا جل جانے کا خوف ہو تو نماز توڑنی جائز ہے، اکثر مشائخ نے ایسے وقت میں مال کا اندازہ ایک درہم یا اس سے زیادہ مالیت سے لگایا ہے، اور کفایہ میں ہے کہ ایک دانگ کے بدلے قید کیا جاسکتا ہے تو نماز توڑنی بدرجہ اولیٰ جائز ہو گی۔ مع۔

ومن اغمي عليه خمس صلوات او دونها قضى وان كان اكثر من ذلك لم يقض وهذا استحسان والقياس ان لاقضاء عليه اذا استوعب الاغماء وقت صلوة كامل لتحقق العجز فشبه الجنون وجه الاستحسان ان المدة اذا طالت كثرت الفوائت فيحرج في الاداء و اذا قصرت قلّت فلا حرج والكثير ان تزيد على يوم وليلة لانه يدخل في حد التكرار والجنون كالا غماء كذا ذكره ابو سليمان بخلاف النوم لان امتداده نادر فيلحق بالقاصر ثم الزيادة تعتبر من حيث الاوقات عند محمدؒ لان التكرار يتحقق به وعندهما من حيث الساعات هو الماثور عن عليؓ و ابن عمرؓ والله اعلم بالصواب.

ترجمہ:- اگر کسی پر ایسی بیہوشی طاری ہوئی جو مسلسل پانچ وقت یا اس سے کم نمازوں کے وقت تک باقی رہی تو ہوش آنے کے بعد ان سب کی قضاء کرے، اور اگر ان سے بھی زیادہ وقت کی بیہوشی ہو تو ان کی قضاء لازم نہ ہو گی، یہ حکم استحسان کے طور پر ہے، لیکن قیاس کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر پورا ایک وقت بیہوشی میں گذر جائے تو اس کی بھی قضاء نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس پر عاجزی متحقق ہو چکی ہے اور اب دیوانگی کے مشابہہ ہو جائے گی، استحسان کی وجہ یہ ہے کہ جب مدت زیادہ ہو جاتی ہے تو اس میں بہت سی فائتہ نمازیں جمع ہو جاتی ہیں اس کی وجہ سے ان کی ادا کرنے میں نمازی کو سخت حرج ہونے لگتا ہے، اور جب مدت کم ہو گی تو اس مدت کی قضاء نمازوں کی ادائیگی میں اتنی دقت نہ ہو گی اور حرج نہ ہو گا، زیادہ کی مقدار یہ ہوتی ہے کہ وہ ایک دن اور ایک رات سے بھی زیادہ ہو جائے اس صورت میں نماز میں تکرار ہونا شروع ہو جائے گا، اور دیوانگی کا حکم بھی بیہوشی جیسا ہی ہے، ابو سلیمانؒ نے ایسا ہی ذکر کیا ہے، بخلاف نیند کے کیونکہ یہ تو شاذ و نادر ہی اتنی زیادہ دیر کے لئے کسی پر طاری ہوتی ہے، اس لئے نیند کو عذر قاصر کے ساتھ ملا دیا جائے گا پھر زیادتی کا اعتبار امام محمدؒ کے نزدیک وقت کے اعتبار سے ہو گا کیونکہ تکرار اسی سے ثابت ہوتی ہے، اور شیخینؒ کے نزدیک ساعات (گھنٹوں) کے اعتبار سے ہو گی، حضرت علیؓ اور ابن عمرؓ سے یہی منقول ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

توضیح:-پانچ یا اس سے کم نمازوں کے وقت میں بیہوشی، پانچ نمازوں کے وقت سے زائد بیہوشی، جنون ہونا، اثر سے دلیل

ومن اغمی علیه خمس صلوات او دونها قضی وان کان اکثر من ذلک لم یقض......الخ
جس شخص پر بیہوشی طاری ہوئی یعنی کسی نشہ وغیرہ کے بغیر پانچ نمازوں تک یا ان سے کم تو ان نمازوں کی قضاء کرے وان کان الخ اور اگر بیہوشی پانچ نمازوں سے بھی زیادہ دیر تک کے لئے ہو تو اس پر قضاء لازم نہ ہوگی۔ف۔۔ جبکہ بیہوشی مسلسل ہو یا درمیان میں صرف دو ایک بات کرنے کا ہوش آگیا ہو کہ اس قلیل وقت کا ہوش میں آنا بے اعتبار ہوتا ہے، اور اگر کسی معین وقت پر مثلاً صبح کے وقت تھوڑا افاقہ ہو جاتا ہے تو پہلی بیہوشی اسی وقت تک کی شمار ہوگی، اس کے بعد دوسری بیہوشی شروع ہو جائے گی۔التبیین۔ھ۔امام احمدؒ کے نزدیک زائد وقت ہونے میں بھی خواہ جتنی بھی زیادہ ہو سب کی قضاء لازم آئے گی۔

وهذا استحسان والقیاس ان لاقضاء علیه اذا استوعب الاغماء وقت صلوة کامل......الخ
قضاء کرنے کا یہ حکم استحسان کے طور پر ہے، والقیاس الخ کیونکہ قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ بیہوشی کی حالت میں نماز قضاء نہیں ہونی چاہئے جبکہ بیہوشی پوری ایک نماز کے وقت تک رہی ہو، کیونکہ اس شخص کی عاجزی ثابت ہوگئی ہے، لہذا بیہوشی دیوانگی کے مشابہ ہوگئی۔ف۔یہ بعض فقہاء کا قول ہے، اور بہت دیر تک کی دیوانگی میں قضاء نہیں چاہئے، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، البتہ اگر کسی گناہ کا کام کرنے کی وجہ سے بیہوشی ہوئی ہو تو قضاء واجب ہوگی۔الحلیہ۔معلوم ہونا چاہئے کہ عذر تین طرح کا ہوتا ہے (۱) دیرپا جیسے بچپن تو اس کی وجہ سے بالاتفاق فرض لازم نہیں ہوتا ہے (۲) کم وقت کا جیسے نیند کہ وہ بالاتفاق فرضیت سے مانع نہیں ہوتی ہے (۳) درمیانی درجہ کا جیسے دیوانگی اور بیہوشی، اگر یہی عذر دراز ہو جائے تو اسے پہلی قسم دیرپاء میں شامل کر لیا جائے گا اس بناء پر نماز کی قضاء معاف ہو جائے گی، اور اگر تھوڑے وقت کے لئے ہو تو اسے دوسری قسم میں داخل کر لیا جائے گا، اس بناء پر نماز کی قضاء معاف نہ ہوگی یعنی قضاء واجب ہوگی، پھر دراز ہونے کی حد یہ ہے کہ ایک رات اور دن سے بھی بڑھ جائے یہاںتک کہ چھٹی نماز کا وقت نکل جائے۔النافع۔پھر قول اصح یہ ہے کہ دیوانگی میں بھی اسی صورت میں قضاء ساقط ہوگی جبکہ وہ ممتد اور دیرپا ہو۔مع۔اس بناء پر مصنفؒ نے اس معنی میں جنون سے تشبیہ دی ہے کہ قیاس تو یہ ہے کہ تھوڑی دیر کی دیوانگی میں بھی ایک کامل نماز تک ہو تو نماز ساقط ہوتی ہے، اگرچہ استحسانا ایک دن اور رات تک واجب ہے مگر جبکہ چھٹی نماز کا وقت نکل جائے اور اس کی تعداد بہت زیادہ کی حد تک ہو جائے۔م۔

وجه الاستحسان ان المدة اذا طالت کثرت الفوائت فیحرج فی الاداء......الخ
استحسان کی وجہ یہ ہے کہ بیہوشی کی مدت جب دراز ہو جائے گی تو بہت زیادہ نمازیں قضاء ہو کر جمع ہو جائیں گے، اس سے وہ شخص حرج میں مبتلاء ہو جائے گا۔ف۔جبکہ اللہ تعالیٰ نے حرج کو اس امت سے اٹھالیا ہے، پس یہ معلوم ہوا کہ زیادہ جمع ہونے سے قضاء واجب نہ ہوگی۔

واذا قصرت قلّت فلا حرج والکثیر ان تزید علی یوم ولیلة لانه یدخل فی حد التکرار......الخ
اور جب مدت تھوڑی ہوگئی تو وہ شخص حرج میں مبتلاء نہ ہوگا۔ف۔یعنی قضاء واجب ہوگی۔

میں مترجم کہتا ہوں اس سے اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ اصل بات تو یہ کہ ہر قسم کی قضاء واجب ہوتی ہے البتہ زیادہ ہو جانے کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں، ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اغماء (بیہوشی ایسا مرض ہے کہ اس کی وجہ سے ایک عقلمند انسان بھی اپنی عقل استعمال نہیں کر سکتا ہے حالانکہ حقیقت میں وہ عقل باقی رہتی ہے، اس بناء پر ایسا شخص وجوب اداء کی صلاحیت رکھتا ہے البتہ قدرت پانے میں صرف خلل ہو جاتا ہے، اس لئے نماز کی تاخیر لازم آتی ہے ایسی بات نہیں ہوتی ہے کہ اصل میں

نماز واجب ہی نہیں ہوتی ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ قیاس سے مراد یہ ہے کہ ظاہر اور سرسری وجہ سے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ قضاء نماز مطلقاً ساقط ہو جائے، اور استحسان یعنی ذرا باریک بینی سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ بالکل بھی ساقط نہ ہو جیسا کہ بدائع میں بیان کیا ہے۔ مف۔

یہ توجیہ اس صورت میں بہتر مانی جاسکتی ہے جبکہ حقیقت میں بیہوشی کے عالم میں عقل و سمجھ باقی رہ جاتی ہو، مگر آدمی نماز کے افعال ادا کرنے میں قدرت نہیں پاتا ہے اس بندہ مترجم کے نزدیک کابوس ایک ایسے مرض کا نام ہے جس میں آدمی کو نیند میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی شخص نے اسے دبالیا ہے اور گویا خواب دیکھنے والا اس کی ڈراؤنی شکل سے ڈر کر آواز نکالتا ہے اور اس کے بوجھ سے لیا جاتا ہے (۱) وغیرہ جیسی بیماری میں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے، مگر مرض اغماء میں جس کا ترجمہ بیہوشی ہے یہ بات مشکل سے مانی جائے گی کیونکہ یہ تو ہدایت کے خلاف ہے، اس جگہ بہترین جواب یہ ہوگا کہ قیاس تو چاہتا ہے کہ ایک ہی وقت گذرنے سے بھی نماز ساقط ہو جائے جیسا کہ شمس الائمہؒ کا قول مختار ہے اس صورت میں کہ مریض اشارہ سے عاجز ہو چکا ہو، دیوانگی کی مشابہت کی وجہ سے، لیکن احتمال مشابہت خواب ہے، یہانتک کہ امام محمدؒ مثل خواب کے کسی حال میں ساقط اور معاف نہیں فرماتے ہیں، اب استحسانا تھوڑی مقدار تک تو ہم نے واجب کہا ہے، کیونکہ چند اوقات کی نماز قضاء کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے البتہ زیادہ مقدار ہو جانے کی صورت میں اس پریشانی میں مبتلاء ہو جانے کی وجہ سے ساقط ہونے کا حکم دیا ہے۔

والكثير ان تزيد على يوم وليلة لانه يدخل في حد التكرار والجنون كالا غماء......الخ

قلیل، اور کثیر کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کثرت کی مقدار یہ ہے کہ ایک دن رات سے قضاء نمازیں زیادہ ہو جائیں کیونکہ زیادہ ہو جانے سے وہ نمازیں مکروہ ہونے لگیں گی۔ ف۔ جبکہ چھٹی نماز کا وقت گذر جائے والجنون الخ اور دیوانگی مثل بیہوشی کے ہے، ابو سلیمانؒ نے ایسا ہی ذکر کیا ہے۔ ف۔ یہ موسیٰ بن سلیمان گرگانی ہیں جو امام محمدؒ کے شاگرد ہیں نوادر میں کہا ہے بخلاف النوم الخ بخلاف نیند کے کہ وہ اغماء کے مثل نہیں ہے، کیونکہ نیند کا اتنی زیادہ تک باقی رہنا انتہائی کم وقوع ہے اس لئے نیند کو عذر قاصر کے حکم میں کر دیا جائے گا۔ ف۔ اور اغماء و جنون کو عذر ممتد (دیرپا) کے حکم میں کہا جائے گا، جیسے بچپن مگر اسی وقت کے اغماء یا جنون کی حالت ممتد ہو یعنی ایک دن رات سے زیادہ ہو ثم الزيادة الخ پھر زیادہ مقدار ہونے کا اعتبار امام محمدؒ کے نزدیک اوقات کے حساب سے ہے، کیونکہ اسی کے ساتھ تکرار پائی جائے گی۔ ف۔ یہانتک کہ جب چھٹی نماز کا پورا وقت نکل گیا تو اب کثیر کی مقدار میں داخل ہو گئی، مثلاً ظہر کی ابتداء سے بیہوشی طاری ہوئی اور دوسرے دن کے ظہر کے نکل جانے کے بعد وہ زیادہ کہی جائیں گی، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہی قول اصح ہے۔ ف۔ یہی صحیح ہے۔ مع۔

وعندهما من حيث الساعات هو المأثور عن عليؓ و ابن عمرؓ والله اعلم بالصواب.

اور شیخینؒ کے نزدیک ساعات سے شمار ہے۔ ف۔ یہانتک کہ ان کے نزدیک ظہر سے بیہوشی دوسرے روز کے آفتاب نکل جانے کے بعد ہی سے زیادہ شمار ہونے لگیں گی۔ حاصل یہ ہوا کہ ہمارا قول مختار استحسان ہے وهو المأثور الخ اور یہی حضرات علی و ابن عمرؓ سے بھی مروی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ف۔ محمد بن الحسنؒ نے کہا ہے اخبرنا ابو حنيفةؒ عن حماد عن ابراهيم النخعي عن ابن عمرؓ انه قال الخ یعنی ایک دن رات جس کسی کو بیہوشی طاری ہوئی تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ وہ قضاء کرے، عبد الرزاق نے ثوری عن بن ابی لیلیٰ عن نافع عن ابن عمرؓ روایت کی کہ ابن عمرؓ کو ایک مہینہ بے ہوشی طاری رہی تو چھوٹی ہوئی نمازوں کو صحیح ہو جانے کے بعد بھی نہیں پڑھا، ابراہیم الحربی نے کتاب غریب الحدیث میں عبد اللہ عن نافع روایت کی ہے کہ ابن عمرؓ کو ایک رات دن بیہوشی رہی اس سے صحت پانے کے بعد ان کی قضاء نہیں پڑھی اور ان کے بعد سے پڑھنی شروع کیں، حضرت علیؓ سے تو کتب حدیث میں کوئی روایت نہیں ملتی ہے، البتہ دار قطنی نے اس کو عمار بن یاسرؓ سے روایت کیا ہے۔ مف۔ اگر آدمی یا درندہ کے ڈر سے کوئی ایک دن رات سے زیادہ بیہوش رہا تو بالاجماع اس کی قضاء ساقط ہے، اگر شراب یا بھنگ یا کسی دوا سے ایک

دن رات سے زیادہ عقل جاتی رہے تو ان کی قضاء ساقط نہ ہوگی۔ الخلاصہ۔ اگر کوئی ایک دن رات سے زیادہ سو گیا تو وہ ان نمازوں کی قضاء کرے۔ محیط السرخسی۔

باب فی سجدة التلاوة

باب:- سجدہ تلاوت کے بیان میں

قال سجود التلاوة فی القرآن اربعة عشر فی اخر الاعراف وفی الرعد والنحل و بنی اسرائیل و مریم والاولی من الحج والفرقان والنمل والم تنزیل و صٓ و حم السجدة والنجم واذا السماء انشقت واقرأ كذا كتب فی مصحف عثمان وهو المعتمد والسجدة الثانية فی الحج للصلوة عندنا و موضع السجدة فی حم السجدة عند قوله لا يسامون فی قول عمرو هو الماخوذ للاحتياط.

ترجمہ:- قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں سجود تلاوت چودہ ہیں، سورہ اعراف کے آخر میں، اور سورہ رعد میں، سورہ نحل میں، بنی اسرائیل، مریم، اور سورہ حج کی پہلی جگہ ہیں اور سورہ فرقان اور نمل، الم تنزیل، ص، حم السجدہ، نجم، اذا السماء انشقت اور سورہ اقراء میں، اسی طرح مصحف عثمان میں لکھا ہے کہ اور اسی پر اعتماد ہے، اور ہمارے نزدیک سورہ حج میں دوسری آیت سجدہ نماز کے لئے ہے، اور حم السجدہ میں سجدہ کی جگہ حضرت عمرؓ کے قول کے مطابق لفظ لا یسئمون پر ہے، احتیاط کی بناء پر اسی قول کو قبول کیا گیا ہے۔

توضیح:- باب تلاوت کے سجدوں کا بیان، شرط وجوب، آیت سجدہ محدث، جنبی اور مریض نے پڑھی یا سنی، پرندہ سے یا آواز سے سنی، سوتے میں سنی، سوتے میں پڑھی، دوسرے نے خبر دی، آیت سجدہ لکھنے سے، فارسی میں آیت سجدہ پڑھی، بہرے شخص نے پڑھی، سجدہ تلاوت کی تعداد، سجدہ کے مقامات، صرف لفظ اسجد کسی نے پڑھا بغیر اقترب پڑھنے کے، ہجوں سے بغیر ملانے والے حروف کے پڑھنا

باب فی سجدہ الخ سجدہ تلاوت کا بیان، اسی سجدہ کے واجب ہونے کی اصل یہ ہے کہ ہر وہ شخص جس نماز کی ادائیگی یا قضاء واجب ہونے کی صلاحیت ہے اس پر سجدہ تلاوت واجب ہے ورنہ نہیں۔ الخلاصہ۔ اسی بناء پر کافر یا دیوانہ یا نابالغ یا حائضہ یا نفاس والی نے اگر ان آیتوں کی تلاوت کی تو ان پر سجدہ واجب نہ ہوگا۔ الزاہدی۔ لیکن اگر ان لوگوں سے عاقل بالغ مرد نے سنی تو اس پر سجدہ تلاوت واجب ہوگا اگر کسی پرندکو پڑھتے ہوئے یا کہیں سے آواز سنی تو بھی اس سننے پر سجدہ واجب نہ ہوگا اور اگر کسی سوتے ہوئے شخص سے آیت سنی تو قول صحیح کے مطابق سجدہ واجب ہوگا۔ الخلاصہ۔ اور جب سونے والے کو یہ بتایا گیا کہ تم نے خواب میں آیت سجدہ کی تلاوت کی ہے تو قول اصح کے مطابق اس پر بھی واجب ہو جائے گا، النصاب۔ آیت سجدہ لکھنے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے۔ قاضی خان۔

فارسی میں آیت سجدہ کسی نے پڑھی تو اس پر بھی سجدہ واجب اور سننے والے کو جب کسی نے خبر سنائی تو قول صحیح کے مطابق اس پر بھی سجدہ واجب ہوگا۔ محیط السرخسی۔ الخلاصہ اور عربی میں آیت سجدہ تلاوت کی تو مطلقاً واجب ہے، اور بہرے نے پڑھی تو اس پر بھی واجب ہے۔ الخلاصہ۔

قال سجود التلاوة فی القرآن اربعة عشر فی اخر الاعراف وفی الرعد والنحل......الخ

قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ قرآن کریم میں تلاوت کے سجدے چودہ ہیں (۱) اعراف کے آخر میں، ف سورہ کے ختم پر ﴿يُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ﴾ (۲) سورہ رعد میں مف وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ الاية (۳) سورہ نحل میں ف وَلِلّٰهِ

يَسْجُدُ مَافِي السَّمٰوٰت الاية (۴) بنو اسرائیل میں۔ف۔ ﴿يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ وَ يَقُوْلُوْنَ﴾ الایہ پر (۵) سورہ مریم میں ﴿خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا﴾ (۶) پہلا سجدہ سورہ حج میں ہے۔ف۔ ﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ الآیۃ، لیکن اسی سورہ حج کا دوسرا سجدہ جو آخری حصہ میں ہے وہ امام شافعیؒ کے مذہب میں ہے اور ہمارے نزدیک اس سے سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے، اس بناء پر اس دوسرے سے سجدہ انکار ثابت نہیں ہوا اسی وجہ سے جن روایت سے اس کا ثبوت ہوتا ہے اس کے خلاف بھی نہیں ہوا، ویسے مشہور تو یہی ہے کہ دوسرا سجدہ ہی نہیں ہے اس بناء پر ان احادیث کی تاویل کرنی ہوگی جن سے ثبوت ہوتا ہے۔م۔ (۷) سورہ فرقان میں ہے۔ف۔ ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ﴾ الآیہ (۸) سورہ نمل میں ہے۔ف۔ ﴿وَ يَعْلَمُ مَا تُخْفُوْنَ وَ مَا تُعْلِنُوْنَ﴾ (۹) سورہ الٓم تنزیل السجدہ میں ہے۔ف۔ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّسَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ والایۃ (۱۰) سورہ ص میں فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا (۱۱) سورہ حمٓ سجدہ میں ف لَا يَسْاَمُوْنَ پر سجدہ کرے (۱۲) سورہ والنجم میں ف۔ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا۔

(۱۳) سورہ اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ میں۔ف۔ قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُوْنَ (۱۴) سورہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں۔ف۔ وَ اسْجُدْ وَ اقْتَرِبْ۔ع۔ اگر بغیر اقترب کے صرف اسجد پڑھا تو بھی سجدہ واجب ہوتا ہے۔البحر۔ اگر آیات سجدہ کو کوئی صرف ہجوں سے پڑھے بغیر حروف ملانے کے تو واجب نہیں ہوگا۔السراجیہ۔

الحاصل ان چودہ مقامات میں سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے کذا کتب الخ اسی طرح ان چودہ مواقع میں حضرت عثمانؓ کے مصحف میں سجدے لکھے ہوئے ہیں۔ف۔ یعنی حضرت عثمانؓ کو اپنے زمانہ خلافت میں جب یہ خبر ملی کہ دور کے اسلامی ممالک میں کچھ لوگ قراءت قرآن میں اختلاف کرتے ہیں تو آپ نے حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کو جمع کر کے مشورہ کیا اور سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ مصاحف لکھوا کر ان ملکوں میں بھیج دئے جائیں، تاکہ لوگ اسی کے مطابق تلاوت کریں پس جس ملک میں جو مصحف پہنچا وہی مصحف عثمان کہلایا، اور کبھی اسی کو مصحف امام بھی کہتے ہیں، اس جگہ مصنفؒ کی یہی مراد ہے، کہ مصحف عثمانؓ میں اسی طرح ان آیات کے موقعوں میں حاشیہ پر سجدہ لکھا ہوا ہے، وہو المعتمد، کہ وہی مصحف معتمد ہے۔ف۔ تو ہمارے لئے یہی اجماعی دلیل کافی ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک سورہ حج میں دو سجدے ہیں، اس کے متعلق مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ

والسجدة الثانية فى الحج للصلوة عندنا و موضع السجدة فى حم السجدة عند قوله......الخ

اور سورہ حج میں دوسرا سجدہ ہمارے نزدیک سجدہ نمازی ہے۔ف۔ کیونکہ اس میں فرمان باری تعالیٰ ہے وَارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا معنی ہوئے کہ تم رکوع اور سجود کرو، اور مراد یہ ہے کہ نماز پڑھو، جیساکہ اس دوسری آیت میں ہے ﴿وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ یعنی اے مریم! تم سجدہ اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ یعنی بالاتفاق یہ کہ نماز پڑھا کرو، پس اس سے سجدہ نماز مراد ہے، جبکہ ہماری گفتگو سجدہ تلاوت میں ہے، امام شافعیؒ کی دلیل حضرت عقبہ بن عامرؓ کی حدیث ہے کہ سورہ حج کو دو سجدوں سے فضیلت دی گئی ہے، اس کی روایت احمدؒ، ابوداؤد، ترمذیؒ، اور حاکمؒ نے کی ہے، اور حضرت عمرو ابن العاصؓ کی حدیث جو ابوداؤد اور ابن ماجہ سے مروی ہے اور آثار میں حضرت عمرؓ کا فعل ہے کہ نماز صبح میں سورہ حج میں دو سجدے کئے، اس کی روایت ابن ابی شیبہ اور بیہقی اور طحاویؒ نے صحیح سندوں سے کی ہے، اسی طرح یہ عمل حضرت ابو موسیٰؓ اور ابوالدرداءؓ عبداللہ بن مسعود و عمار بن یاسر اور ابن عباسؓ کا ہے، جیساکہ طحاوی و بیہقی اور حاکم کی کتابوں میں ہے، اس کا جواب عینیؒ اور ابن الہمامؒ کی طرف سے مختصراً یہ ہے کہ حضرت عقبہؓ کی حدیث کے متعلق ترمذیؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد کچھ قوی نہیں ہے، اور حضرت عمروؓ بن العاصؓ کی حدیث کی اسناد میں عبداللہ بن منین (نون سے) مجہول راوی ہیں، اور عبدالحقؒ نے فرمایا ہے کہ یہ حجت کے لائق نہیں ہے، اور مذکورہ آثار کا جواب یہ ہے کہ امام شافعیؒ تو آثار کو حجت مانتے ہی نہیں ہیں، اور ہمارے نزدیک اگرچہ حجت ہیں لیکن ان کی تاویل یہ ہے کہ دو سجدے اس طرح کئے کہ پہلا سجدہ تلاوت ہے اور دوسرا سجدہ نمازی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ سچی بات یہ ہے کہ حدیث حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے، آثار کی یہ تاویل کمزور ہے،،اور میرے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ واللہ اعلم کہ دوسرا سجدہ ہمارے نزدیک سجدہ تلاوت کے طور پر واجب نہیں ہے، بلکہ اس میں ہمیں امر کے صیغہ کے ساتھ خطاب ہے، جس کی اصل فرمانبرداری تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور ادب یہ ہے کہ اگر طہارت ہو تو اسی وقت سجدہ کریں، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ بندہ مومن جب سجدہ کرتا ہے تو شیطان شرمندہ اور غمزدہ ہو جاتا ہے کہ ہائے مجھے سجدہ کا حکم ہوا پر میں نے نہ کیا، اور اسے حکم ہوا اور یہ بجالایا، اس لئے سجدہ کرلے تاکہ معلوم ہو کہ نماز میں اسی طرح رکوع اور سجدہ کیا جائے، ایسا ہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے کہا ہے کہ سورہ حج میں پہلا سجدہ تو عزیمت یعنی واجب ہے، اور دوسرا سجدہ تعلیم ہے اس کی روایت طحاوی نے ایسی اسناد سے کی ہے جو حسن ہے یہ اس بات پر صریح ہے کہ پہلا سجدہ تلاوت کا ہے اور دوسرا سجدہ نمازی تعلیم کا بطریق ادب ہے، جبکہ ہماری گفتگو واجبی سجدہ تلاوت میں ہے، اس سے معلوم ہو گیا ہے ہمارے ائمہ سے جو روایت ہے کہ دوسرا سجدہ نمازی ہے، اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہاں سجدہ نہیں ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ وہاں کا سجدہ بطریق تلاوت نہیں بلکہ بطریق تعلیم ہے، اسی لئے امام طحاویؒ نے ابن عباسؓ کے اثر کو بیان کرنے کے بعد کہا ہے کہ ہم ابن عباسؓ کے اسی قول کو قبول کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہمارا قول حضرت عقبہ بن عامرؓ کی حدیث اور آثار صحابہ کرامؓ سب کے موافق ہے، اور ہم اثر ابن عباسؓ کے موافق یہ معنی مراد لیتے ہیں کہ سورہ حج میں دو سجدے ہیں مگر پہلے سجدے کو تلاوت میں شمار نہیں کرتے ہیں۔ م۔ پھر سورہ صٓ میں امام شافعیؒ کے نزدیک سجدہ واجب نہیں ہے اس کی بحث آرہی ہے۔ م۔

وموضع السجدة فی حم السجدة عند قوله لا یسأمون فی قول عمرو هو الماخوذ للاحتیاط.....الخ

اور سورہ حم السجدہ میں سجدہ کی جگہ لَا یَسْاَمُوْنَ پر ہے۔ ف۔ اس سے پہلے کی آیت پر نہیں ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ کا قول قدیم تھا، اور مصنفؒ نے کہا ہے کہ فی قول عمرؓ الخ حضرت عمرؓ کے قول میں۔ ف۔ یعنی حضرت عمرؓ نے اسی مقام پر سجدہ کا حکم دیا ہے، لیکن یہ اثر غریب ہے، کتابوں میں نہیں ملتا ہے، البتہ اسی کے مثل حضرت ابن عباسؓ سے عبدالرزاق اور ابن شیبہؒ نے روایت کی ہے۔ فع۔ اور اسی قول کو ہم نے احتیاطاً قبول کیا ہے۔ ف۔ کیونکہ اگر اس سے پہلے کے حصہ کو ہم موقع سجدہ مان لیں تو بھی ادا ہو جائے گا کیونکہ اتنا مؤخر کرنے سے کوئی حرج نہیں ہے، جو حرج کہ اس کے مقدم کرنے میں ہو سکتا ہے، کہ سجدہ باقی رہ جائے گا، اور ادا نہ ہو گا، امام شافعیؒ کا جدید قول یہی ہے، اور ان کے مذہب میں صحیح و مختار بھی ہے۔ مع۔

والسجدة واجبة فی هذه المواضع علی التالی والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم یقصد لقوله علیه السلام السجدة علی من سمعها وعلی من تلاها وهی کلمة ایجاب وهو غیر مقید بالقصد واذا تلا الامام آیة السجدة سجدها و سجدها الماموم معه لا لتزامه متابعته.

ترجمہ:۔ ان مذکورہ آیتوں پر سجدہ واجب ہوتا ہے تلاوت کرنے والے پر بھی اور سننے والے پر بھی خواہ اس نے سننے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سجدہ اس شخص پر لازم ہے جس نے اسے سنا ہو اور اس شخص پر بھی جس نے اس کی تلاوت کی ہو، اس فرمان کے اندر ایک کلمہ "علی" ہے جو حکم کو لازم کرنے کے موقع پر لایا جاتا ہے، اور اس حکم میں ارادہ کی کوئی قید نہیں ہے، اور جب امام آیت سجدہ کی تلاوت کرے تو اسے سجدہ سے ادا کرلے ساتھ ہی اس کے مقتدی پر سجدہ کریں کیونکہ مقتدی نے اس امام کی اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔

توضیح:۔ کن لوگوں پر سجدہ تلاوت واجب ہوتا ہے، واجب ہونے کی دلیل جب امام نے آیت سجدہ تلاوت کی ہو

والسجدة واجبة فی هذه المواضع علی التالی والسامع سواء قصد سماع القرآن اولم.....الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے وھی کلمة ایجاب الخ اور حضور کا فرمان کلمہ ایجاب ہے۔ ف۔ یعنی جب یوں کہا جائے کہ علی السامع اس پر جو سنے تو اس کی ظاہری مراد یہی ہوتی ہے کہ اس پر واجب ہے، اور یہاں حکم مطلق رکھا ہے سننے والے کے لئے، کہ یہ ارادہ کی قید سے مقید نہیں ہے۔ ف۔ چنانچہ یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ صرف اسی پر سجدہ واجب ہے جس نے اسے سننے کا ارادہ کیا ہو، بلکہ مطلقاً کہا ہے کہ جس نے اسے سن لیا ہو، خواہ ارادہ کر کے سنا ہو یا بغیر ارادہ کے سنا ہو بہر صورت اس پر سجدہ واجب ہو گا، شیخ نوویؒ نے فرمایا ہے کہ بالاتفاق شافعیہؒ کے نزدیک سجدہ تلاوت سنت ہے، ہمارے مبسوط میں ہے کہ کہ سنت موکدہ ہے، اور یہی ہمارا مذہب ہے، اس بناء پر کہ بعضوں نے واجب میں اسے شامل قرار دیا ہے۔ مع۔ ظاہر مذہب میں واجب ہے۔ م۔ لیکن سواری پر اشارہ کر کے ادا کرنے سے ادا ہو جاتا ہے۔ ف۔ اور نماز کے اندر رکوع کے ساتھ ہی ادا ہو جاتا ہے جبکہ سجدہ تلاوت کی ادائیگی کی نیت کی ہو، اور سجدہ کے ساتھ بغیر نیت کے ادا ہو جاتا ہے۔ ت۔

واضح ہو کہ سجدہ تلاوت کی قسمیں ہیں (۱) جن میں صراحۃً سجدہ کا حکم ہے جیسے وَاسْجُدُوْا لِلّٰہِ وَاعْبُدُوْا یعنی تم اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرو اور اس کی عبادت کرو (۲) جن میں کافروں کے سجدہ نہ کرنے پر ملامت (۳) جن پیغمبروں کے سجدہ کرنے سے موافقت ہے، پس صریح حکم سے واجب، اسی طرح کافروں سے مخالفت اور پیغمبروں سے موافقت بھی واجب ہے، لیکن دلالت ظنی اور وقت تلاوت سے بھی مخصوص ہے، اس لئے فرض نہیں بلکہ واجب ٹھہرا، اور جب رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو سننے والوں نے بھی کیا، ابن ابی شیبہؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ سجدہ اس پر لازم ہے جس نے اسے سنا ہے، ہر سننے والے پر لازم ہے خواہ اس نے سننے کا ارادہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن حضرت عثمانؓ نے فرمایا ہے کہ سجدہ اسی پر ہے جس نے کان لگا کر سنا ہو، بخاریؒ نے اسے تعلیقاً بیان کیا ہے، اس اثر کا قصہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ نے سننے کے باوجود سجدہ نہیں کیا اور یہ بات کہی، اس کی روایت عبد الرزاقؒ نے سند صحیح کے ساتھ کی ہے، اس اثر کی تاویل یہ ہے کہ جو شخص سننے کے لئے طہارت کے ساتھ تیار بیٹھا اس پر فی الفور سجدہ لازم ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہاں تلاوت کنندہ پر وجوب ہونے میں مطلقاً و مخصوص طریقہ سے سورہ صٓ میں مذکور ہے، اول یہ کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ سجدے لازم نہیں کئے ہیں ہاں جب ہم چاہیں اور خطبہ روک کر خود سجدہ نہیں کیا، اور لوگوں کو روکا، الموطا، تاویل یہ ہے کہ فوراً واجب نہیں ہوتا ہے۔ الفتح۔ حضرت عمرؓ نے نماز میں سورہ حج پڑھی اور دو سجدے کئے، طحاویؒ نے اس کی روایت کی ہے۔ م۔ دوم یہ ہے کہ زید بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کو سورہ نجم سنائی مگر آپ نے سجدہ نہیں کیا جیسا کہ صحیحین میں ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ سجدہ اسی وقت نہیں کیا (بعد میں کیا ہو گا) سوم یہ کہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ سجدہ صٓ عزائم سجود میں سے نہیں ہے، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سجدہ کرتے اور فرماتے تھے کہ سیدنا داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں اس کی روایت بخاری اور سنن اربعہ نے کی ہے اور ابو سعید الخدریؓ نے کہا ہے کہ ایک خطبہ میں سورہ صٓ پڑھی اور اتر کر سجدہ کیا، اور دوسرے جمعہ میں پڑھی اور لوگ سجدہ کے لئے تیار ہونے لگے تو فرمایا کہ یہ تو ایک پیغمبر کی توبہ ہے، لیکن میں نے دیکھا کہ تم سجدہ کرنے کے لئے تیار ہو پھر منبر سے اتر کر سجدہ کیا، اس کی روایت ابو داؤدؒ اور حاکمؒ نے کی ہے۔

جواب یہ ہے کہ شکر میں فرائض تک داخل ہیں ایسی صورت میں واجب ہونے میں تو کوئی قباحت نہیں ہے، اور حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث میں تاویل یہ ہے کہ خطبہ کے بعد اس کو ادا کرنا چاہتے ہوں گے، فی الفور نہیں، یعنی چونکہ داؤد علیہ السلام نے توبہ کا سجدہ کیا تو فوراً سجدے میں گر گئے، اور ہم تو شکر کے طور پر بجالاتے ہیں، اس لئے ہم پر فوراً واجب نہیں ہے صحیحین کی حدیث ابن عباسؓ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سورہ النجم پڑھی یعنی مکہ میں ہجرت سے پہلے تو اس وقت کے حاضرین نے جن میں مومن و کافر اور جن و انس تھے سب نے سجدہ کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام سننے والے پر واجب ہے، فقہاءؒ کے

اقوال کا یہ ماحصل ہے، لیکن تحقیقی نظر ڈالنے سے یہ جانبین کی دلیلیں مشکل ہیں، اس میں سنت ہونے کے بھی آثار پائے جاتے ہیں اسی طرح سے وجوب کی بھی علامتیں پائی جاتی ہیں۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ایک اعتبار سے سنت موکدہ کہنا اظہر اور اسہل ہے، اور واجب کہنے میں زیادہ احتیاط پر عمل ہے، کیونکہ جب کسی چیز کے بارے میں واجب اور سنت کہنے میں احتمالات ہوں تو واجب کہنے سے ہی انسان اسے ادا کر کے فارغ الذمہ ہو سکتا ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

اس بیان میں چند فوائد ہیں (۱) یہ کہ سورہ صٓ میں بھی سجدہ تلاوت ہے (۲) جمعہ کے خطبہ میں سورہ قٓ کی طرح سورہ صٓ بھی مسنون ہے (۳) خطبہ میں آیت سجدہ پڑھنا اور فوراً اتر کر سجدہ کر لینا بھی جائز ہے، اگر امام فوراً سجدہ نہ کرے تو مقتدی بھی نہ کریں (۵) سورہ نجم اور مفصلات سورتوں میں بھی سجدہ ہے، لیکن امامؒ کے نزدیک نہیں ہے (۶) نماز سے خارج ہونے کی صورت میں سجدہ کی ادائیگی میں تاخیر جائز ہے۔

واذا تلا الماموم لم یسجد الامام ولا الماموم فی الصلوۃ ولا بعد الفراغ عند ابی حنیفۃؒ و ابی یوسفؒ و قال محمدؒ یسجد ونہا اذا فرغوا لان السبب قد تقرر ولامانع بخلاف حالۃ الصلوۃ لانہ یؤدی الی خلاف وضع الامامۃ او التلاوۃ ولھما ان المقتدی محجوز عن القراءۃ لنفاذ تصرف الامام علیہ و تصرف المحجور لا حکم لہ بخلاف الجنب والحائض لا نہما منہیان عن القراءۃ الا انہ لا یجب علی الحائض بتلاوتہا کما لا یجب بسماعہا لانعدام اھلیۃ الصلوۃ بخلاف الجنب۔

ترجمہ:- اور اگر مقتدی نے آیت سجدہ تلاوت کی تو نہ امام سجدہ کرے اور نہ خود مقتدی، اسی طرح نہ نماز میں اور نہ نماز کے بعد، امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک، لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ نماز سے فارغ ہونے کے بعد سب لوگ سجدہ کریں گے، کیونکہ سبب پایا جا چکا ہے، اور اب اس کی ادائیگی میں کوئی مانع بھی نہیں رہا، بخلاف نماز کی حالت کے کیونکہ اس سے امامت یا تلاوت کی حالت کے خلاف ہونا لازم آئے گا، اور شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مقتدی کو تو قراءۃ کرنے سے روک دیا گیا ہے، کیونکہ امام کے اختیارات اس پر نافذ ہیں، اور ایسے شخص (محجور جس کو تصرف سے روک کر دیا گیا ہو) کے تصرف کا کوئی حکم نہیں ہے، بخلاف جنبی اور حائض کے کہ یہ دونوں ممنوع ہیں یعنی قراءت کرنے سے انہیں منع کیا گیا ہے، پھر حائضہ عورت اگر تلاوت کر لے تو اس کی اپنی تلاوت سے بھی اس پر سجدہ لازم نہ ہوگا جیسا کہ آیت سجدہ کے سننے سے اس پر سجدہ لازم نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اس میں نماز کی صلاحیت ہی نہیں ہے، بخلاف جنبی کے۔

توضیح:- اور جب مقتدی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی، جنب اور حائض نے نماز میں تلاوت کی، نابالغ نے تلاوت کی، نشہ سے مست انسان نے رکوع یا سجدہ میں تلاوت کی، نفل نماز میں آیت سجدہ پڑھی، پھر نماز فاسد ہو گئی، نماز کے باہر سے آیت سجدہ کی تلاوت سنی تو کیا احکام ہوں گے

واذا تلا الماموم لم یسجد الامام ولا الماموم فی الصلوۃ ولا بعد الفراغ عند ابی حنیفۃ......الخ

اگر امام نے سجدہ کی آیت تلاوت کی تو سجدہ کر لے۔ف۔ یعنی نماز میں فوراً سجدہ کر لے ورنہ گنہگار ہوگا۔ت۔ وسجدھا الخ اور مقتدی بھی امام کے ساتھ سجدہ کرے۔ف۔ اگرچہ وہ نماز آہستہ سے پڑھنے والی (سریہ) ہو اور امام سے اسے نہ سنا ہو۔مف۔ کیونکہ یہ تو مقتدی کے خود پڑھنے کے جیسا ہوگا۔م۔ اور لالتزامہ الخ اس لئے کہ مقتدی نے امام کی متابعت اپنے اوپر لازم کر رکھی ہے۔ف۔ اس وقت جبکہ اس نے امام کی اقتداء کی نیت کی تھی۔م۔ لیکن امام کے لئے سری نماز میں آیت سجدہ پڑھنا مستحب نہیں ہے۔ الجوہرہ۔ اور اگر امام نے سجدہ نہیں کیا یہانتک کہ سلام پھیر دیا تو جب تک کلام وغیرہ منافی نماز کوئی فعل نہ

کرے تب تک لوٹ کر سجدہ کرے، اس کے بعد دوبارہ تشہد پڑھے اور سلام پھیر دے، اور اگر نہ کیا تو امام یا مقتدی کسی سے وہ سجدہ ادا نہیں ہو سکتا ہے جیسا کہ عنقریب آئے گا۔

واذا تلا الماموم لم یسجد الامام و لا الماموم فی الصلوٰة و لا بعد الفراغ عند ابی حنیفة......الخ

اور اگر مقتدی نے آیت سجدہ کی تلاوت کی۔ف۔ یعنی امام کے پیچھے بالاتفاق قراءت سے ممانعت کے باوجود آیت سجدہ پڑھ دی تو **لم یسجد الامام الخ** امام نماز میں سجدہ نہیں کرے گا، اگرچہ اس نے آیت سجدہ پوری سن لی ہو، اسی طرح مقتدی بھی۔ف۔ بالاتفاق **و لا بعد الخ** اور فراغت کے بعد بھی کوئی اس سجدہ کو ادا نہیں کرے گا، **عند ابی حنیفةؒ الخ** مگر یہ مذہب امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کا ہے۔ف۔ اور یہی مذہب امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بلکہ عام علماء کا ہے۔ مع۔ **و قال محمدؒ** اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ جب نماز سے فارغ ہو جائیں تو مقتدی اور امام سب سجدہ کریں۔ف۔ بشرطیکہ انہوں نے سنا ہو **لان السبب الخ** کیونکہ سبب سجدہ یعنی آیت سجدہ کو سننا تو ثابت ہو چکا ہے، اور نماز سے باہر کوئی بھی بات سجدہ ادا کر لینے سے مانع نہیں ہے۔ف۔ تو اب ادا کرنا واجب ہے **بخلاف الخ** بخلاف نماز کی حالت کے۔ف۔ کہ اسی حالت میں مانع کی وجہ سے جائز نہیں ہے **لانه یودی الخ** کیونکہ ایسا کرنے سے امام کی حیثیت یا تلاوت کی اہمیت کے خلاف ہونا لازم آئے گا۔ف۔ وضع کے معنی رکھنا، پس امامت کی وضع یعنی امامت اس طرح رکھی گئی اور مقرر ہوئی کہ امام کے ساتھ اہتمام کیا جائے یعنی جو باتیں اس کی امامت اور افضلیت کی ہیں ان کی پیروی ہو، وضع تلاوت کا مطلب یہ ہے کہ تلاوت کرنے والے کے سجدے پر سننے والے تمام اس کا ساتھ دیں، اگر آیت سجدہ تلاوت کرنے والا مقتدی سجدہ کرے اور اس کے ساتھ دوسرے مقتدی اور امام بھی سجدہ کر لیں تو یہ وضع تلاوت کے خلاف ہوگا، پس اس مانع کی وجہ سے نماز میں نہیں بلکہ خارج نماز واجب ہوگا۔ف۔ یہ دلیل ایسی صورت میں مکمل مانی جائے گی جبکہ اس تلاوت کرنے والے کی تلاوت معتبر بھی ہو تاکہ اس کا اثر پیدا ہو۔

ولهما ان المقتدی محجور عن القراءة لنفاذ تصرف الامام علیه......الخ

اور شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ مقتدی کو تو اس حالت میں تلاوت قرآن سے مجور کر دیا گیا ہے کیونکہ اس پر امام کا تصرف جاری ہیں۔ف۔ اگر وہ مجور نہ ہوتا تو عاقل بالغ پر غیر یعنی امام کا تصرف کیوں جاری ہوتا **و تصرف المحجور الخ** اور مجور کے تصرف کا کچھ حکم نہیں ہے۔ف۔ یعنی ایسا شخص کے کام کرنے کے اختیارات اس سے چھین لئے گئے ہوں، اس بناء پر اگر اس کام کو وہ کرتا ہو تو اس کام کا کچھ اثر نہیں ہوتا ہے، اسی بناء پر شرعاً یہ حکم ہے کہ اگر قاضیؒ کسی شخص کو کسی مصلحت کی بناء پر مجور کر دیا پھر اس نے اپنا مال کسی خریدار کے ہاتھ فروخت کر دیا تو یہ فروخت بے اثر اور بے فائدہ ہوں گے کیونکہ بیع و فروخت کا حکم یہ ہوتا ہے کہ بیچنے والے کو قیمت کی ملکیت اور خریدار کو مال کی ملکیت شرعاً حاصل ہوتی ہے، لیکن یہاں کچھ بھی حاصل نہ ہوگا، اس کے تفصیلی مسائل اور احکام کتاب الحجر میں انشاء اللہ آئیں گے۔

الحاصل جب امام کی قراءت ہی مقتدی کی قراءت ہوتی ہے اور مقتدی کو قراءت پر پابندی لگا دی گئی ہے اور امام ہی اس کا متولی اور ضامن ٹھہرا تو مقتدی کا پڑھنا بالکل بے فائدہ ہوا کہ اس سے نہ مقتدی پر سجدہ واجب ہوگا اور نہ کسی سننے والے پر واجب ہوگا، کیونکہ مقتدی کو اس حالت میں تلاوت کی نہ اہلیت ہی رہی اور نہ لیاقت ہی رہی۔ م۔

بخلاف الجنب و الحائض لا نهما منهیان عن القراءة الا انه لا یجب علی الحائض بتلاوتها......الخ

بخلاف جنبی کے خواہ مرد ہو یا عورت اور حائضہ کے۔ف۔ ان لوگوں کو مجور نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا ان کے عمل کا اثر ہوگا **لانهما منهیان الخ** کیونکہ ان دونوں کو قراءت سے صرف منع کیا گیا ہے۔ف۔ ممنوع اور مجور میں فرق یہ ہے کہ ممنوع یعنی وہ شخص جسے کسی کام سے منع کیا گیا ہو اگر اس کو کر لے تو وہ حرام کہلائے گا مگر اس کا اثر ظاہر ہوگا مثلاً ایسی بیع کا عمل جس میں شرعاً کوئی خرابی ہو تو اسی بیع پر قائم رہنا شرعاً حرام ہوگا، بلکہ پہلے سے ٹھیک اور صحیح کرنا ہوگا پھر اس میں تصرف کرنا ہوگا، اس کے باوجود اگر

اس نے اسی خرابی یعنی بیع فاسد پر قائم رہ کر ایک دوسرے کی چیز پر قبضہ کر لیا تو اس فروخت کا اثر یعنی ملکیت حاصل ہو جائے گی، بخلاف مجور کے کہ بیع سے قبضہ کے بعد بھی ملکیت حاصل نہ ہوگی، کیونکہ حجر تو سبب نہیں کر سکتا ہے اس مثال سے یہ بات ظاہر ہوئی کہ جنبی اور حائض چونکہ مجور نہیں ہیں بلکہ صرف ممنوع ہیں تو ان کی تلاوت سجدہ کے لئے سبب بن جائے گی اور اس کا اثر ظاہر ہوگا، اور اس میں یہ دونوں (جنبی اور حائض) برابر ہیں۔

الا انه لا يجب على الحائض بتلاوتها كما لا يجب بسماعها......الخ

مگر اس بات میں ان دونوں جنبی اور حائض کے درمیان یہ فرق ہے کہ حائض پر اپنی تلاوت سے اپنے اوپر سجدہ واجب نہ ہوگا، جیسے کہ حائض پر دوسرے کی آیت سجدہ سننے سے سجدہ واجب نہیں ہوتا ہے **لانعدام الخ** کیونکہ اس حائضہ میں نماز پڑھنے کی صلاحیت ہی معدوم ہے **بخلاف الجنب الخ** برخلاف جنبی کے۔ف۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، کیونکہ اس میں صلاحیت نماز موجود ہے، جس کی توضیح یہ ہے کہ سجدہ تلاوت واجب ہونے کے لئے نماز پڑھنے کی صلاحیت کا موجود ہونا معتبر ہے، خواہ ادا ہو یا قضاء اور حائضہ عورت میں نماز کی دونوں (ادا اور قضاء　) میں سے کوئی ایک بھی صلاحیت نہیں ہے، بخلاف جنبی کے اس پر نماز لازم ہے اور اگر غسل نہ کیا تو قضاء واجب ہے، اسی لئے اس پر سجدہ تلاوت خود اس کی تلاوت سے بھی اور غیر کی تلاوت سننے سے بھی واجب ہوگا۔

الحاصل جنبی اور حائضہ دونوں کی تلاوت سے سجدہ لازم آتا ہے، کیونکہ ان دونوں کو تو تلاوت سے صرف منع کیا گیا ہے، لیکن مقتدی کی تلاوت ہی نہیں ہے کیونکہ وہ مجور ہے اور اس پر پابندی ہے۔م۔ تاج الشریعہ نے شرح الہدایہ میں کہا ہے کہ اس کے علاوہ مقتدی کے اور جنبی وحائض کے درمیان، ہم یہ بھی فرق بیان کر سکتے ہی کہ مقتدی کو تو کم ہو یا زیادہ ہر قسم کی قراءت سے ممانعت ہے، لیکن جنبی اور حائض کو ایک آیت سے کم پڑھنا جائز ہے، جیسا کہ طحاویؒ نے ذکر کیا ہے، اور جب آیت سے کم پڑھنا جائز ہوا تو سجدہ واجب ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے، کیونکہ آیت سجدہ میں سے پوری سے کم بھی پڑھ لے تو سجدہ واجب ہوگا، شمس الائمہ سرخسیؒ نے شرح کتاب الصلوت میں یہ مسئلہ ذکر کیا ہے، اور یہی ظاہر مذہب ہے۔ع۔ حائض کے ہی حکم جیسا نفاس والی کافر و نابالغ اور پاگل کا بھی حکم ہے۔ف۔ فتاوی الصغری، الجوہرہ، لیکن شیخ الاسلام خواہر زادہؒ نے ذکر کیا ہے کہ مجنون کی تلاوت سے سننے والے پر سجدہ نہیں ہے، اور نابالغ میں اس طرح اعتبار ہونا چاہئے کہ اگر وہ تمیز دار ہو تو اس سے سن کر سجدہ واجب ہوگا ورنہ نہیں۔ف۔ نشہ سے جو شخص مست ہو وہ جنبی کے حکم میں ہے۔ محیط السرخسی۔ رکوع یا سجدے میں کسی نے تلاوت کی تو وہ مقتدی کی تلاوت کے حکم میں ہوگا، اگر کسی نے نفل میں آیت سجدہ پڑھی پھر نماز فاسد ہو گئی تو اگر یہ فساد حیض آجانے یا مرتد ہو جانے کی وجہ سے ہو تو سجدہ ساقط ہوگا اور نہ سجدہ کرے، اور اگر سجدہ کر چکا تھا پھر نماز فاسد ہوئی تو قضاء میں اعادہ نہ کرے۔ المحیط۔ قاضی خان۔

ولو سمعها رجل خارج الصلوة سجدها هو الصحيح لان الحجر ثبت فى حقهم فلا يعدوهم وان سمعوا وهم فى الصلوة سجدة من رجل ليس معهم فى الصلوة لم يسجدوها فى الصلوة لانها ليست بصلاتية لان سماعهم هذه السجدة ليس من افعال الصلوة و سجدو ها بعدها لتحقق سيبها ولو سجدوها فى الصلوة لم يجزهم لانه ناقص لمكان النهى فلا يتادى به الكامل قال واعادوها لتفرد سببها ولم يعيدوا الصلوة لان مجرد السجدة لاينا فى احرام الصلوة وفى النواد رانها تفسد لانهم زادوا فيها ماليس منها و قيل هو قول محمدؒ.

ترجمہ:- اگر کسی شخص نے آیت سجدہ امام یا مقتدی سے نماز کے علاوہ حالت میں سنی تو وہ سجدہ ادا کر لے، یہی قول صحیح ہے، کیونکہ قراءت سے مجور ہونا تو صرف مقتدیوں کے بارے میں ثابت ہوا ہے اس لئے یہ حکم ان سے متجاوز ہو کر دوسروں تک نہ جائے گا، اور اگر لوگوں نے نماز کی حالت میں ایسے شخص سے آیت سجدہ سنی جو ان کے ساتھ نماز میں نہیں ہے تو یہ لوگ نماز کی

حالت میں اس سجدہ کو ادا نہیں کریں گے، کیونکہ یہ سجدہ نمازی سجدہ نہیں ہے، کیونکہ ان لوگوں کا اس آیت سجدہ کو سننا نماز کے افعال میں سے نہیں ہے، لیکن نماز کے بعد اس سجدہ کو ادا کر لیں گے، کیونکہ اس کا سبب یعنی سننا متحقق ہو چکا ہے، اور اگر اس سجدہ کو نماز ہی کی حالت میں ادا کر لیں تو بھی وہ ان کے لئے کافی نہ ہوگا، کیونکہ یہ ناقص ادا ہوا ہے، کیونکہ ان لوگوں کو تو اس کی ادائیگی سے منع کر دیا گیا ہے، اس لئے جس طرح پورا ادا ہونا چاہئے وہ ادا نہ ہوگا، اور اس سجدہ کو وہ لوگ دوبارہ ادا کریں گے، کیونکہ اعادہ کا سبب ثابت ہو چکا ہے، لیکن نماز کو دوبارہ ادا نہ کریں، کیونکہ صرف سجدہ نماز کے احرام کے مخالف نہیں ہے، لیکن نوادر میں ہے کہ وہ نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ان نمازیوں نے اپنی اس نماز میں ایک ایسی چیز کا اضافہ کر دیا ہے جو اس نماز کا حصہ نہیں ہے، اور کہا گیا ہے کہ یہ قول امام محمدؒ کا ہے۔

توضیح:- کسی نے نماز کی حالت میں غیر نمازی سے آیت سجدہ سنی یا ایسے نمازی سے سنی جو دوسری نماز میں ہے، تنہا شخص نے یا امام نے آیت سجدہ پڑھی اور سجدہ کیا، پھر باہر سے بھی سنی، سجدہ کا بہتر وقت کون سا ہے، آیت سجدہ اور رکوع، سجدہ تلاوت کو رکوع کی حالت میں ادا کرنے کی نیت

ولو سمعها رجل خارج الصلوة سجدها هو الصحيح لان الحجر ثبت في حقهم......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے سجدها الخ تو وہ سجدہ کرلے۔ف۔ بشرطیکہ امام سے سن کر اسی نماز میں شامل نہ ہو گیا ہو الجوہرہ۔ **هو الصحيح الخ** یہی قول صحیح ہے، کیونکہ مجبور ہونے کا حکم مقتدیوں کے حق میں ثابت ہوا ہے اس لئے یہ حکم ان سے متجاوز نہ ہوگا۔ف۔ لہٰذا غیروں پر اس کا اثر ظاہر نہ ہوگا **وان سمعوا** اور اگر ایسے لوگوں نے سنا جو نماز کی حالت میں ہوں خواہ امام کی حیثیت سے یا مقتدیوں کی حیثیت سے آیت سجدہ کو ایسے شخص سے جو ان کے ساتھ نماز میں نہیں ہے۔ف۔ تو ان پر سجدہ واجب ہوگا لیکن **لم يسجدوها الخ** یہ لوگ نماز میں اس سجدہ کو ادا نہ کریں۔

لانها ليست بصلاتية لان سماعهم هذه السجدة ليس من افعال الصلوة و سجدوها بعدها......الخ

کیونکہ یہ سجدہ نمازی سجدہ نہیں ہے، کیونکہ ان کا اس سجدہ کو سن لینا کچھ نماز کے افعال میں سے نہیں ہے۔ف۔ کیونکہ نماز کا حق تو ایسا ہے کہ اس حالت میں اللہ کے درمیان میں بالکل ڈوبا ہوا رہے، اور ادب و توجہ و حضوری قلب سے اس طرح سنے کہ نماز کے باہر کی کوئی بات بھی نہ سنے، ایسے میں سن لینا خلاف ادب کام ہوا، اور نماز کا یہ فعل نہیں رہا، لیکن نماز کے بعد اس سجدہ کو ادا کرلیں، **لتحقق سببها** کیونکہ اس سجدہ کا سبب یعنی سننا پایا جا چکا ہے۔

ولو سجدوها في الصلوة لم يجزهم لانه ناقص لمكان النهي فلا يتادى به الكامل......الخ

اور اگر ان لوگوں نے نماز ہی میں سجدہ ادا کرلیا تو یہ ادا کافی نہ ہوگا **لانه ناقص الخ** کیونکہ یہ ادا تو ناقص ہے ممانعت کی وجہ سے اس لئے جس طرح اسے پورا ادا ہونا چاہئے ویسا نہ ہو سکا۔ف۔ اور جو چیز ناقص ادا ہوتی ہے اسے دوبارہ کرنا واجب ہو جاتا ہے، اسی لئے فرمایا **واعادوها الخ** اور اس سجدہ کو دوبارہ ادا کر لینا چاہئے کیونکہ دوبارہ ادا کرنے کا سبب ثابت ہو چکا ہے۔ف۔ یعنی ناقص ادا کرنا ہی اگر اعادہ کا سبب ہے تو اعادہ کرلیں، اور علامہ عینیؒ نے **تقرر سببها** کی شرح میں لکھا ہے کہ اس سے مراد غیر مجور شخص سے سننا مراد ہے، لہٰذا یہ ضمیر سجدہ کی طرف لوٹی جو کہ سہو ہے، اور صحیح یہ ہے کہ یہ ضمیر اعادہ کی جانب لوٹ رہی ہے، جیسا کہ بندہ مترجم نے ترجمہ کیا ہے۔م۔

ولم يعيدوا الصلوة لان مجرد السجدة لاينا في احرام الصلوة......الخ

اور اس نماز کا اعادہ نہ کریں۔ف۔ اس نماز میں جس میں خارج میں سنا ہوا سجدہ ادا کرلیا ہو **لان مجرد الخ** کیونکہ صرف یہ تلاوت کا سجدہ ادا کردینا نماز کے احرام کے مخالف نہیں ہے۔ف۔ اس لئے نماز میں خلل نہ ہوگا اور اسی لئے اسے دوبارہ پڑھنے کی

ضرورت نہیں ہے بلکہ نہیں پڑھنی چاہئے۔م۔اور قول صحیح کے مطابق اکثر اماموں کا یہی مذہب ہے۔الخلاصہ۔ع۔ھ۔

وفي النوادر انها تفسد لانهم زادوا فيها ماليس منها و قيل هو قول محمد......الخ

اور نوادر میں روایت ہے کہ نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ ان لوگوں نے اپنی نماز میں ایسا سجدہ بڑھادیا جو نماز میں سے نہیں ہے وقیل هو الخ اور بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ نماز کا فاسد ہونا امام محمدؒ کا قول ہے۔ف۔اور صحیح قول یہ ہے کہ بالاتفاق فاسد نہیں ہے، جیسا کہ شیخ الاسلامؒ نے شرح مبسوط میں لکھا ہے۔ع۔

واضح ہو کہ نوادر کی روایت اس بات کی دلیل ہے کہ اگر نماز میں کوئی عمداً کسی فعل کو زیادہ کرے تو نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ سہواً زیادہ کرنا تو بالاتفاق مفسد نہیں ہے، جیسا کہ سہو کے بیان میں گذر گیا ہے، اچھی طرح محفوظ رکھ لیں، اگر منفرد یا امام نے خود آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا، پھر اسی کو خارج سے سنا، تو ظاہر الروایۃ میں اسے دوبارہ پڑھنا ضروری نہیں، اور اگر پہلے نماز کے باہر سے سنا پھر خود بھی وہ آیت تلاوت کی تو بھی فتاویٰ السراج میں یقین کے ساتھ کہا ہے کہ اعادہ نہیں ہے۔النہر الفائق۔

سجدہ تلاوت کے واسطے افضل حکم یہ ہے کہ سجدہ کرنے اور سجدہ کے بعد باقی سورہ یا کچھ دوسری سورت کو پڑھ کر رکوع کرے، اگر آیت سجدہ تلاوت کر کے فوراً کر دیا اس نیت سے کہ سجدہ تلاوت ادا ہو جائے گا تو جائز ہوگا، اور ہم لوگ اسی قول کو قبول کرتے ہیں، اور اگر آیت سجدہ تلاوت کرنے کے بعد کچھ اور بھی آیتیں پڑھ لیں تو اب رکوع کی حالت میں اس سجدہ کو ادا نہیں کیا جا سکتا ہے، اس سجدہ کو ادا کرنے کے لئے نیت کی تو اظہر یہ ہے کہ جائز نہ ہو، جیسے کہ رکوع سے اٹھ کر نیت کی تو بالاجماع جائز نہیں ہوگا، واضح ہو کہ اوپر میں یہ بتایا گیا کہ نماز سے باہر کے آدمی نے نمازی سے آیت سجدہ سنی تو اس پر سجدہ واجب ہے، اب یہاں اسی کی ایک دوسری صورت بیان کر رہے ہیں

فان قرأها الامام و سمعها رجل ليس معه في الصلوة فدخل معه بعد ما سجدها الامام لم يكن عليه ان يسجدها لانه صار مدر كالها بادراك الركعة وان دخل معه قبل ان يسجدها سجدها معه لانه لو لم يسمعها سجدها معه فهنا اولى وان لم يدخل معه سجدها لتحقق السبب و كل سجدة و جبت في الصلوة فلم يسجدها فيها لم تقض خارج الصلوة لانها صلاتية ولها مزية الصلوة فلاتتا دى بالناقص.

ترجمہ:-اگر امام نے آیت سجدہ تلاوت کی اور اسے ایسے شخص نے بھی سن لیا جو اس کے ساتھ نماز میں شریک نہیں ہے، اور امام کے سجدہ تلاوت ادا کر لینے کے بعد وہ شخص امام کی نماز میں شریک ہو گیا تو اب اس پر اس سجدہ کو ادا کرنا ضروری نہ ہوگا، کیونکہ اس رکعت کو پا کر وہ بھی سجدہ کو حکماً ادا کرنے والا مانا جائے گا، اور اگر امام کے سجدہ ادا کرنے سے پہلے اس کے شریک ہو گیا تو بھی یہ بھی امام کے ساتھ سجدہ کرے گا، کیونکہ اگر یہ اس آیت سجدہ کو نہ سنتا جب بھی تو اس کے ساتھ سجدہ کرتا تو اس صورت میں بدرجہ اولی سجدہ کرلے گا، اور اگر یہ شخص امام کے ساتھ شریک نہ ہوا تب بھی اس سجدہ کو ادا کرے گا سبب متحقق ہو جانے کی وجہ سے، اور ہر وہ سجدہ جو نماز میں واجب ہوا ہو اگر نماز میں اسے ادا نہ کر سکا ہو تو وہ نماز سے علیحدہ قضاء نہیں کیا جائے گا، کیونکہ جو سجدہ لازم ہوا ہے نماز کا سجدہ ہے اور اسے نماز کے ساتھ ایک خاص خصوصیت ہے اس لئے وہ ناقص طور پر ادا نہ ہوگا۔

توضیح:-اگر کسی ایسے شخص نے جو ابھی تک نماز میں داخل نہیں ہوا ہے امام سے آیت سجدہ سن لی اور امام کے سجدہ تلاوت کو ادا کر لینے کے بعد نماز میں شریک ہو گیا، یا امام کے سجدہ کرنے سے پہلے شریک ہوا، امام سے خارج نماز آیت سجدہ سنی اور پھر اقتداء نہیں کی، نماز میں سجدہ واجب ہوا اور اس میں سجدہ ادا نہیں کیا دلیل ایک نماز میں آیت سجدہ سنی اور دوسری نماز میں اسے ادا کیا وقت وجوب

آیت سجدہ پڑھ کر نماز میں داخل ہوا اور اسی آیت کو پڑھا اور سجدہ کیا

فان قرأها الامام و سمعها رجل ليس معه فى الصلوة فدخل معه بعد ما سجدها الامام......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے لم يكن عليه الخ تو اب اس پر سجدہ واجب نہیں رہا کہ سجدہ کرے۔ف۔اصل میں اسی طرح مطلقاً مذکور ہے، لیکن یہ اس صورت میں کہ اس نے یہی آخری رکعت پائی ہو، اگرچہ رکوع میں ملا ہو لانه صار الخ کیونکہ یہ شخص رکعت پانے سے اس سجدہ کو پانے والا ہو گیا۔ف۔اور اگر اس نے وہی رکعت نہیں بلکہ دوسری رکعت پائی تو فراغت کے بعد سجدہ ادا کر لے،الکافی۔ھ۔فع۔

وان دخل معه قبل ان يسجدها سجدها معه لانها لو لم يسمعها سجدها معه......الخ

اور اگر امام کے سجدہ کرنے سے پہلے وہ امام کے ساتھ داخل ہو گیا تو امام کے ساتھ سجدہ کرے کیونکہ اگر وہ آیت سجدہ کو سنتا بھی نہیں تو بھی اس صورت میں امام کے ساتھ اس پر سجدہ واجب تھا، اس لئے اب تو بدرجہ اولی واجب ہو گا وان لم يدخل الخ اور اگر امام کے ساتھ وہ نہ ہوا تو اس سجدہ کو ادا کر لے، لتحقق الخ کیونکہ سبب تو پایا جا چکا ہے یعنی اب سنا۔ف۔اور اگر امام نے بالکل ہی سجدہ نہیں کیا تو صرف یہی شخص نماز سے فراغت کے بعد ادا کرے۔م۔

وكل سجدة وجبت فى الصلوة فلم يسجدها فيها لم تقض خارج الصلوة......الخ

اور ہر وہ سجدہ جو نماز کی تلاوت میں واجب ہوا پھر اسے نماز میں ادا نہیں کیا تو پھر وہ نماز سے باہر ادا نہ ہو گا۔ف۔مگر اس صورت میں جبکہ نماز فاسد ہو جائے کسی مجبوری کی وجہ سے، سوائے حیض اور مرتد ہونے کے، اور اگر خارج ہونے کی بجائے نماز سے فارغ ہونے کے بعد فساد ہو تا استثناء کی ضرورت نہ ہوتی لیکن خارج کہنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ سلام سے فارغ ہونے کے بعد جب تک کسی کلام وغیرہ سے خارج نہ ہو اس وقت تک قضاء کر سکتا ہے اگرچہ فارغ ہو گیا ہو، پھر اگر نماز سے خارج ہو گیا اور سجدہ نہ کیا تو اب اس کا کفارہ صرف توبہ ہے۔البدائع۔لانها صلوتية الخ کیونکہ یہ سجدہ تو نماز کا ہو گیا، نمازیہ سجدہ کو نماز کی فضیلت حاصل ہے اس لئے وہ ناقص سے ادا نہ ہو گا۔ف۔کیونکہ اس نماز سے خارج ہو کر غیر نمازی حالت میں سجدہ ہو گا تو وہ ناقص ہو گا، اور اگر کسی دوسری نماز میں بالقصد ادا کرے گا تو وہ نماز ہی فاسد ہو جائے گی، کیونکہ سجدہ اگرچہ نماز کا عمل ہوتا ہے مگر یہ سجدہ اس نماز کا حصہ نہیں ہے، البتہ اگر اسی آیت کو اس نماز میں تلاوت کر لے تو یہ دوسرا سجدہ ہو جائے گا، اور پہلا سجدہ چونکہ نمازیہ ہے ہو چکا ہے، اب اس سجدے میں داخل نہ ہو گا۔م۔سجدہ تلاوت فی الفور واجب نہیں ہوتا ہے، یہی قول مختار ہے۔ف۔لیکن نماز میں فی الفوز لازم ہوتا ہے۔ت۔بدائع وغیرہ کی عبارت میں اس قسم کی تطبیق بہتر ہے۔م۔

ومن تلا سجدة فلم يسجدها حتى دخل فى صلوة فاعادها و سجد اجزته السجدة عن التلاوتين لان الثانية اقوى لكونها صلاتية فاستتبعت الاولى و فى النوادر يسجد اخرى بعد الفراغ لان للاولى قوة السبق فاستوتا قلنا للثانية قوة اتصال المقصود فترجحت بها وان تلاها فسجد ثم دخل فى الصلوة فتلاها سجد لها لان الثانية هى المستتبعة ولا وجه الى الحاقها بالاولى لانه يؤدى الى سبق الحكم على السبب.

ترجمہ:-جس نے کوئی آیت سجدہ تلاوت کی، اور اسے ادا کئے بغیر نماز شروع کر دی، پھر اسی ایت کی نماز میں تلاوت کی اور نماز ہی میں اسے ادا کر دیا تو یہی ایک سجدہ دونوں تلاوتوں کے لئے کافی ہو گا، کیونکہ دوسرا نمازیہ ہونے کی وجہ سے زیادہ قوی ہو کر اس لئے پہلا سجدہ اس کے تابع ہو جائے گا، لیکن نوادر میں ہے کہ وہ فارغ ہونے کے بعد اور بھی ایک سجدہ ادا کر لے گا، کیونکہ پہلے سجدہ کو اس کے پہلے ہونے کی وجہ سے ایک خصوصیت اور قوت ہے اس لئے دونوں اپنی اپنی خصوصیت کی وجہ سے برابر ہو گئے، ہم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ دوسرے سجدہ کو ایک خاص خصوصیت حاصل ہے اس طرح سے کہ اسے اصل مقصود کے ساتھ قو

اتصال حاصل ہے لہٰذا اس کو ترجیح حاصل ہوگی، اور آیت سجدہ ادا کرے گا، کیونکہ یہی دوسرا سجدہ بعد میں آنے والا ہے اور اسے پہلے سجدہ کے ساتھ ملانے کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ حکم سبب سے مقدم ہوگیا۔

توضیح:- خارج نماز آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا اور پھر نماز میں وہی آیت پڑھی، تلاوت کرنے والے نے خارج نماز آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا اور نمازی نے اس کی متابعت کی نیت سے سجدہ کیا۔

ومن تلا سجدة فلم يسجدها حتى دخل في صلوة فاعادها و سجد اجزته السجدة......الخ

اور جس شخص نے آیت سجدہ تلاوت کی۔ف۔ یعنی نماز سے باہر، اور اسے ادا نہیں کیا۔ف۔ کیونکہ تاخیر کرنا جائز ہے، حتی دخل الخ یہانتک کہ کسی نماز میں داخل ہوگیا (نماز شروع کردی)۔ف۔ خواہ فرض ہو یا نفل ہو فاعادها الخ پھر اسی آیت سجدہ کو نماز میں دوبارہ پڑھا اور سجدہ کیا تو یہی سجدہ دونوں تلاوتوں کے لئے کافی ہوگیا۔ف۔ اگرچہ اس نے نماز سے پہلے سجدہ ادا کرنے کی نیت نہ کی ہو۔ الخلاصہ۔

لان الثانية اقوى لكونها صلاتية تتبعت الاولى و في النوادر يسجد اخرى......الخ

کیونکہ دوسرا سجدہ تو پہلے سجدہ سے زیادہ قوی ہے، کیونکہ وہ نمازیہ ہے اس لئے اس نے پہلے سجدہ کو اپنے تابع کرلیا، یہی ظاہر الروایۃ ہے و في النوادر الخ اور نوادر میں مذکور ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد دوسرا سجدہ ادا کرے، کیونکہ پہلے سجدہ کو پہلے واجب ہونے کی وجہ سے ایک قوت حاصل ہے اس لئے دونوں سجدے قوت میں برابر ہوگئے، ف، اور پہلا جب کمزور نہ رہا تو نمازیہ سجدہ اسے اپنے پیچھے نہ لگا سکتا ہے، اس لئے فراغت کے بعد اسے ادا کرے۔

قلنا للثانية قوة اتصال المقصود فترجحت بها......الخ

اسکا ہم یہ جواب دیتے ہیں کہ دوسرے سجدے یعنی صلوتیہ کو مقصود سے متصل ہونے کی قوت ہے اسلئے صلوتیہ کو ترجیح حاصل ہوگی۔ف۔ اتصال مقصود سے مراد ادائے سجدہ ہے۔ع۔ک۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ سجدہ نمازیہ کو تو فوراً ادا کرنا ضروری ہوتا ہے، اس لئے یہ متصل بہ مقصود ہوا، اور دوسرے سجدہ کو فوری ادا کرنا واجب نہیں ہوتا ہے، اس لئے پہلے کے پیچھے لگ گیا۔م۔

وان تلاها فسجد ثم دخل في الصلوة فتلاها سجد لها لان الثانية هي المستتبعة......الخ

اور اگر خارج نماز اس کی تلاوت کر کے سجدہ کیا پھر نماز میں داخل ہو کر اسی آیت سجدہ کی تلاوت کی تو حکم یہ ہوگا۔ سجد لها اس کے واسطے سجدہ کرے۔ف۔ کیونکہ مجلس بدل گئی ہے اور تلاوت کی وجہ سے سبب وجوب پیدا ہوا، اس لئے یہ دوسرا سجدہ پہلے سجدے کے تابع نہ ہوگا۔ لان الثانية کیونکہ دوسرا سجدہ جو نمازی ہے یہی تو اپنے پیچھے لگانے والا تھا تو یہ قوی سجدہ اس ضعیف سجدہ کے تابع نہ ہوگا جو خارجی ہے۔ اب اگر یہ کہا جائے کہ اسے بھی پہلے سجدے کے ساتھ کردیتے ہیں تو گویا یہ بھی خارجی سجدہ ہو جائے گا، تو اس صورت میں پہلے سجدہ ادا کرنے کے ساتھ ادا ہو جائے گا، جبکہ اسی کے ساتھ اسے ملا دیا جائے۔ جواب دیا کہ ہم الحاق نہیں کرتے۔

ولا وجه الى الحاقها بالاولى لانه يؤدى الى سبق الحكم على السبب......الخ

اور پہلے سجدہ کے ساتھ اسے لاحق کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ف لاحق کرنا ممنوع ہے۔ لانه يودى الخ اس لئے کہ اسکا حاصل یہ نکلے گا کہ سبب سے حکم مقدم ہو جائے۔ یعنی یہاں سبب تو تلاوت ہے۔ اور تلاوت کے بعد ہی ادائے سجدہ کا حکم واجب ہوتا ہے، اور اس جگہ تلاوت پیچھے۔ اب اگر پہلے سجدہ کے ساتھ ملا کر اس سجدہ کی ادا ہو جائے تو سب سے پہلے حکم موجود ہونا لازم آئے گا جو ممنوع اور صحیح نہیں ہے۔م۔

ایک شخص بیٹھا تلاوت کرتا ہے اس نے آیت سجدہ پڑھ کر سجدہ کیا اور وہاں ایک نمازی نے سن کر نماز میں اس کی متابعت کی نیت سے سجدہ کرلیا تو یہ نماز فاسد ہو جائے گی، البتہ اگر نماز سے باہر ہو تو مستحب ہے کہ تلاوت کرنے والے کی اتباع کرے اور اس سے پہلے سر نہ اٹھائے۔ الخلاصہ۔ اور اگر سننے والے کئی افراد ہوں تو تلاوت کرنے والے کے پیچھے صف باندھ کر اس کی امامت میں سجدہ کریں۔ فع۔ البحر۔ واضح ہو کہ سجدہ تلاوت کی صفتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کئی سجدے جمع ہو کر ایک دوسرے میں داخل ہو جاتے ہیں، یہانتک کے کبھی ایک ہی سجدہ سب کے لئے کافی ہو جاتا ہے، اگرچہ تلاوت اور سماع دونوں سے مل کر وجوب ہوا ہو، مگر شرط یہ ہے کہ آیت اور مجلس دونوا ں متحد ہوں، اور اگر ایک بھی مختلف ہو جائے تو تداخل کا حکم نہ ہوگا، المحیط۔ اسی لئے فرمایا ہے۔

ومن كرر تلاوة سجدة واحدة فى مجلس واحد اجزته سجدة واحدة فان قرأها فى مجلسه فسجدها ثم ذهب ورجع فقرأها سجدها ثانية وان لم يكن سجد للاولى فعليه سجدتان والاصل ان مبنى السجدة على التداخل دفعا للحرج وهو تداخل فى السبب دون الحكم وهو اليق بالعبادات والثانى بالعقوبات وامكان التداخل عند اتحاد المجلس لكونه جامعا للمتفرقات فاذا اختلف عاد الحكم الى الاصل ولا يختلف بمجرد القيام.

ترجمہ:- اگر کسی شخص نے ایک ہی مجلس میں ایک ہی آیت سجدہ کی بار بار تلاوت کی تو اخیر میں ایک سجدہ کرلینا اس کے لئے کافی ہوگا، اور اگر پڑھ کر اسی مجلس میں سجدہ کر کے کہیں چلا گیا پھر لوٹ کر اسی آیت کی تلاوت کی تو وہ دوسری مرتبہ پھر سجدہ کرے گا، اور اگر پہلی مرتبہ پڑھ کر سجدہ تو ادا نہیں کیا مگر کہیں جاکر دوبارہ آکر تلاوت کی تو اس صورت میں اسے دو سجدے ادا کرنے ہوں گے، اس مسئلہ کا قاعدہ یہ ہے کہ حرج کو دور کرنے کے خیال سے سجدہ کی بنیاد تداخل پر رکھی گئی ہے، یہ تداخل سبب میں ہوگا لیکن حکم میں نہ ہوگا، عبادت کے مواقع میں یہی بات زیادہ لائق ہے، اور دوسرے کا تعلق سزاؤں سے ہے، اور تداخل کا ہونا اسی وقت ممکن ہوگا جبکہ مجلس ایک ہو، کیونکہ مجلس متفرقات کے لئے جامع ہوا کرتی ہے، اور جب مجلس مختلف ہو جائے تو حکم بھی اپنی اصل پر لوٹ آئے گا اور مجلس صرف کھڑے ہونے سے نہیں بدلتی ہے۔

توضیح:- سننے والے کئی افراد ہوں، ایک مجلس میں ایک ہی آیت کئی بار پڑھی گئی ہو، مجلس بدلی ہوئی ہو

ومن كرر تلاوة سجدة واحدة فى مجلس واحد اجزته سجدة واحدة......الخ

اور جس کسی نے ایک ہی آیت سجدہ کو ایک ہی مجلس میں مکرر تلاوت کی ہو۔ف۔ تو تداخل ہو جائے گا، یہانتک کہ اجزته الخ اس کو ایک ہی سجدہ کرنا کافی ہوگا۔ف۔ خواہ مقدم ہو یا مؤخر ہو۔م۔ اسی طرح اگر ایک ہی جلسہ میں کسی نے خود تلاوت کی اور وہی آیت دوسرے کی تلاوت سے سنی تو بھی یہی حکم ہوگا، جیسا کہ المحیط میں ہے، کیونکہ حضرت موسیٰ اشعریؓ بصرہ کی مسجد میں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیتے اور مکرر آیت سجدہ پڑھنے کے باوجود ایک ہی بار کے سجدے پر اکتفاء فرماتے تھے، حضرت حسن و حسینؓ کے معلم یعنی ابو عبد الرحمٰن السلمیؒ تابعی بھی بار بار ایک آیت کو پڑھواتے اور ایک ہی سجدہ کرتے تھے۔ مع۔ یہ حکم اس وقت ہوگا جبکہ مجلس ایک ہو۔

فان قرأها فى مجلسه فسجدها ثم ذهب ورجع فقرأها سجدها ثانية......الخ

اور اگر مجلس بدل گئی اس طریقہ سے کہ آیت سجدہ کو اپنی مجلس میں پڑھ کر سجدہ کیا پھر کہیں جاکر واپس آیا۔ف۔ یہانتک کہ مجلس بدل گئی فقرأها الخ پھر اسی آیت کو پڑھا تو دوبارہ سجدہ کرے اور پہلا کیا ہوا سجدہ کافی نہ ہوگا کیونکہ مجلس بدل گئی ہے، بخلاف

اس کے اگر مجلس نہیں بدلتی تو پہلا سجدہ ہی کافی ہوتا، جیسے ایک مجلس میں سب کے آخر میں ایک سجدہ کرے تو وہ کافی ہو جائے گا، بر خلاف مجلس بدل جانے کے کہ سب کے آخر میں بھی ایک سجدہ کرنے سے کافی نہ ہوگا، اسی بناء پر فرمایا ہے۔

وان لم یکن سجد للاولی فعلیه سجدتان والاصل ان مبنی السجدة علی التداخل......الخ

اور اگر اس نے پہلی مجلس کا سجدہ ادا نہیں کیا تو اب اس پر دو سجدے لازم ہوں گے۔ف۔ جیسے کہ دوسری آیت ہو، اگرچہ ایک ہی مجلس ہو، تو ہر ایک کے واسطے علیحدہ سجدہ واجب ہو، لیکن حرج کے خیال کی بناء پر استحسانا تداخل ہو جاتا ہے، پھر تداخل کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ سبب میں تداخل ہو جائے، دوسرے یہ کہ ہر سبب موجب رہے لیکن ہر ایک کا جو حکم ہے وہ ایک دوسرے میں داخل ہو جائے، اسی کو حکم میں تداخل ہونا کہا جاتا ہے، اب یہاں جو تداخل ہو رہا ہے مصنفؒ اسی کو بیان فرما رہے ہیں۔

وهو تداخل فی السبب دون الحکم وهو الیق بالعبادات والثانی بالعقوبات......الخ

اور یہ تداخل جو سجدہ تلاوت میں ہے یہ سبب میں تداخل ہے نہ حکم میں۔ف۔ اور یہاں سجدہ کا سبب تلاوت کرنا ہے یا اس کا سننا ہے، اور اس کا حکم یہاں سجدہ کا واجب ہونا ہے، پس یہاں مجلس ہوئی تو تلاوت یا سماعت مکرر ہونے کی وجہ سے تداخل ہو کر ایک ہی سماعت کے حکم میں یا ایک ہی تلاوت کے حکم میں قرار دی گئی، اسی لئے ایک ہی سجدہ واجب ہوا اس لئے تداخل سبب بنا، اور اگر سبب میں تداخل نہ ہوتا بلکہ ہر تلاوت یا سماعت سے ایک مستقل سجدہ واجب ہوتا، پھر اداء سجدہ جو کہ حکم ہے اس وقت مختلف اداء میں تداخل ہوتا، یہانتک کہ ایک اداء سبب فعل کے منزل میں ہوتی، اس طرح تداخل ہو جاتا، اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی رہا لیکن یہاں تداخل کو سبب قرار دیا۔

وهو الیق بالعبادات والثانی بالعقوبات وامکان التداخل عند اتحاد المجلس لکونه جامعا......الخ

اور عبادت کے ساتھ یہی تداخل زیادہ مناسب ہے۔ف۔ یعنی سبب میں تداخل مان لینا عبادات کے ساتھ مناسب ہے، اس لئے اگر سب کو علیحدہ اور مستقل مان لیا جائے تو ہر ایک سبب سے ایک مستقل واجب ہوگا، تو ایک ہی آیت کی تعلیم کرنے میں ہر بار کی تلاوت سے متعدد سجدے لازم آئینگے، پھر ہم نے یہ دیکھا کہ اس میں ایک حرج عظیم لازم آتا ہے، جب کہ شریعت نے حرج کو اٹھا دیا ہے اس لئے ایک ہی سجدہ سب کے قائم مقام کافی نظر آیا، لیکن شریعت نے عبادات میں احتیاط کو بھی واجب کیا ہے، عبادات کا مطلب یہ ہوا کہ ہر بار کے لئے علیحدہ سجدہ کیا جائے، اور جب حرج کا خیال کرنے کی وجہ سے تداخل کو حکم قرار دیا تو احتیاط کو چھوڑ دیا، یہ خرابی اس وجہ سے لازم آئی کہ تداخل حکمی ٹھہرایا گیا ہے، اور اگر ہم تداخل سببی رکھیں تو تمام اسباب تلاوت وسماعت کے ایک کے حکم میں ہو جائینگے، اس لئے ایک ہی فعل سجدہ واحد پایا گیا، اور کوئی حرج بھی لازم نہیں آیا، الحاصل اس جگہ تداخل سببی زیادہ لائق ہوا۔

والثانی بالعقوبات وامکان التداخل عند اتحاد المجلس لکونه جامعا للمتفرقات......الخ

اور تداخل حکمی عقوبات کے زیادہ لائق ہے، ف یعنی شریعت نے جو سزائیں مقرر کی ہیں ان میں ہر سبب کو موجب مان کر ان کے احکام میں تداخل ٹھہرانا اولی ہے کیونکہ عقوبات میں احتیاط کرنے کو کچھ واجب نہیں کیا گیا ہے بلکہ شبہہ پانے کی صورت میں حدود اور مقررہ سزاؤں کو ختم کر دینا ہے شرعی فیصلہ ہے، جس میں راز کی یہ بات ہے کہ سزائیں اور عقوبات تو لوگوں کو دھمکانے اور مرعوب کرنے کے لئے ہوا کرتی ہیں، اور اصل مغفرت تو سچی توبہ پر موقوف ہے، بس مختلف اسباب موجبہ پائے جانے کے باوجود ان کا اثر ایک ہی رہ جائے تو باقی اللہ تعالی کے عفو و کرم کی طرف منسوب ہونگے، اس کے علاوہ شریعت کی مصلحت تو ایک سے ہی حاصل ہو جاتا ہے، بخلاف اس کے جب اسباب مختلف ہوں مثلاً چوری کرنا، زنا کرنا تو ہر ایک کی سزا ہوگی جیسے اس صورت میں جبکہ آیات سجدہ مختلف ہوں، پھر تداخل سبب کا نتیجہ سجدہ میں یہ ہوگا کہ آیت سجدہ کسی نے تلاوت کی اور سجدہ ادا

کر لیا، پھر اسی مجلس میں اسی آیت سجدہ کی تلاوت کی تو وہی سجدہ کافی رہے گا، اور تداخل حکم کا نتیجہ سزاؤں میں یہ ہوگا کہ کسی نے زنا کیا اور اسے حد لگائی گئی پھر زنا کیا تو پھر حد جاری کی جائیگی، اور اگر ایک زنا کیا اور حد جاری نہیں کی گئی تھی کہ اس نے پھر یکے بعد دیگرے کئی زنا اور کر لئے اس کے بعد اگر اس پر حد جاری کرنے کا حکم ہو تو صرف ایک حد جاری ہوگی، اور احکام میں تداخل ہو جائیگا۔

شمس الائمہ سرخسیؒ نے سجدہ میں تداخل کی وجہ ضعیف سمجھی، بلکہ فرمایا ہے کہ سجدہ کا واجب ہونا اس آیت کی تعظیم اور احترام کے لئے ہے جو ایک مجلس میں ایک مرتبہ ادا کرنے سے پورا ہو جاتا ہے، اسی لئے اسی مجلس میں دوبارہ سجدہ کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ نظیر تو رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنے میں ایک قول کے مطابق ہے، فافہم، م۔
خلاصہ یہ ہوا کہ تمام سجدوں کا مدار حرج کا خیال رکھتے ہوئے تداخل سببی پر ہے۔

وامكان التداخل عند اتحاد المجلس لكونه جامعا للمتفرقات فاذا اختلف عاد الحكم......الخ

اور شرعاً اس تداخل کا ممکن ہونا اسی صورت میں ہوگا جب کہ مجلس متحد بھی ہو، لکونه جامعا الخ کیونکہ مجلس تو مختلف چیزوں کو جمع کرتی ہے، ف یعنی شرعی مسائل اور نظائر میں شریعت نے ایک مجلس ہونے کے بارے میں یہ اعتبار کیا ہے کہ ایک مجلس بہت سی مختلف قسموں کی جامع ہوتی ہے اسی بناء پر عقد تو ایجاب اور قبول دونوں کے پائے جانے سے بندھ جاتا ہے (مکمل ہو جاتا ہے) حالانکہ دونوں کے پائے جانے کی کیفیت ہوتی ہے کہ مثلاً عقدہ نکاح میں زید نے ہندہ کو کہا کہ میں نے تجھے ہزار درہم مہر کے عوض اپنے نکاح میں لیا، اس جملہ کہنے سے اس وقت صرف ایجاب پایا گیا، اور اس کا قبول آئندہ ہوگا یعنی ہندہ جواب میں کہے کہ میں نے قبول کیا، اس میں ایجاب کا زمانہ قبول کے زمانہ سے پہلے پایا گیا اور ایجاب کے زمانہ میں قبول کا زمانہ مستقبل ہے اور قبول کے وقت ایجاب کا زمانہ ماضی ہو چکا ہے پھر جب ایک تو ایک زمانہ میں دوسرا دوسرے زمانہ میں ہو تو دونوں کا ملنا کیونکر تصور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ دونوں متفرق ہیں، لیکن شریعت نے مجلس کے اتحاد کو جامع قرار دیا یعنی زید و ہندہ اگر اسی مجلس میں ہوں تو ایک ہی دونوں کے ایجاب و قبول کو جمع کر دے گی، اسی طرح عقد بیع میں بائع اور مشتری کا ایجاب و قبول بھی ایک مجلس میں جمع ہو جانے سے عقد ہو جاتا ہے، اسی طرح جس نے زنا کیا اس کا چار بار اقرار کرنا حد جاری کرنے کو لازم کر دیتا ہے، پس اگر کسی بندہ خدا سے زنا صادر ہو جائے اور وہ اپنے گناہوں سے توبہ کرے اور اس امید سے اپنے اوپر حد جاری کرنی چاہی کہ اللہ تعالے معاف کرے، اس خیال کے بعد وہ مسلمانوں کے حاکم کے پاس ایک ہی مجلس میں چار بار اقرار زنا کر لے تو اسے صرف ایک ہی اقرار مانا جائے گا کیونکہ ایک ہی مجلس ہونے کی وجہ سے یہ چاروں اقرار مل کر ایک ہو گیا اور اگر چار مجلسوں میں ایک ہی اقرار کیا تو اب چار بار ہو گئے اس بناء پر حد لازم ہو جائیگی، اور مجلس کے متحد اور مختلف ہونے کا بیان عنقریب انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

اب مسئلہ کی توضیح یہ ہے کہ اگر ایک ہی آیت سجدہ کو بار بار تلاوت کرنے کی ضرورت پیش آئے تو ہر بار کے لئے ایک ایک سجدہ لازم کرنے سے ایک حرج لازم آئے گا جبکہ شرعاً حرج کو اٹھایا گیا ہے۔ لیکن عبادات کے مواقع میں احتیاط کرنا بھی لازم ہے، اس لئے ہم کہتے ہیں کہ تلاوت تو سبب ہے اور ادائے سجدہ کا واجب ہونا تلاوت کا حکم ہے، پس اگر ہر بار کی تلاوت علیحدہ علیحدہ سبب رہے تو احتیاط کا تقاضا یہی ہوگا کہ ہر بار کا سجدہ جدا جدا لازم ہو، اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ تمام سجدوں میں تداخل ہو جائے یہاں تک کہ ایک ہی سجدہ سے سب ادا ہو جائیں، لیکن یہ بات احتیاط کے خلاف ہے اور اگر ہر بار کی تلاوت ہی متداخل کر لیں یعنی یہ فرض کر لیا جائے کہ ساری تلاوتیں ایک ہی کے درجہ میں ہیں تو ان سے ایک ہی سجدہ واجب ہوگا، اس طرح حرج بھی نہ ہوگا اور احتیاط کے خلاف بھی نہ ہوگا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام تلاوتوں کو ملا کر ایک تلاوت کے برابر شمار کرنا شرعاً کب جائز ہوگا، تو جواب یہ ہوگا کہ جب ساری تلاوتیں ایک ہی مجلس میں ہوں تو وہی ایک مجلس سب کو جمع کر لے گی، جیسے وہ عقد میں یا چار بار زنا کے اقرار میں کرتی ہے، پس تلاوتوں کا تداخل ہونا ایک مجلس ہونے کی صورت میں ممکن ہوا، تو ہم نے کہا ہے کہ جب ایک ہی مجلس میں ایک ہی

آیت سجدہ کو کئی بار کوئی تلاوت کرلے تو تلاوتیں ایک دوسرے میں داخل ہو کر ایک ہی سجدہ واجب ہوگا تاکہ شرعاً حرج دور ہو جائے۔

فاذا اختلف عاد الحکم الی الاصل ولا یختلف بمجرد القیام......الخ

پھر جس صورت میں کہ مجلس مختلف ہو نگی حکم بھی اپنے اصل کی طرف لوٹ جائیگا، ف یعنی ہر تلاوت کے واسطے علیحدہ علیحدہ سجدہ واجب ہوگا، کیونکہ مجلس تو ایک نہیں ہے جو اسباب کو متحد کردے، اس لئے ہم نے کہا ہے کہ مختلف مجلسوں میں کئی سجدوں کی آیتیں تلاوت کیں تو ہر آیت کے واسطے اسکا سجدہ واجب ہوگا، پھر یہ بھی جاننا چاہئے کہ تلاوت کرنے والا جس جگہ ہے خواہ کھڑا تلاوت کرتا ہو یا بیٹھا تلاوت کرتا ہو وہ اس کی مجلس ہوگی، اور اگر اسی جگہ اسی کام میں ایک ہی آیت بار بار تلاوت کی تو حقیقتاً مجلس ایک ہی ہے اور بعض صورتوں کو شریعت نے حکماً ایک ہی جگہ مان لیا ہے جیسے چھوٹی کوٹھری یا مسجد میں ایک کونہ سے دوسرے کونہ میں چلا گیا تو ایک مجلس کے حکم میں ہوگا، اور اگر اسی جگہ بیٹھا رہا لیکن تلاوت چھوڑ کر وہیں پر کھڑا ہو کر کھانا کھاتا رہا، پھر اسی جگہ تلاوت شروع کردی، تو اب حکماً دوسری مجلس ہو جائیگی۔

ولا یختلف بمجرد القیام......الخ

اور اگر بیٹھ کر تلاوت کرنے والا صرف کھڑا ہو گیا تو اس سے مجلس نہیں بدلے گی، اور اگر کھڑے ہو کر باتیں کیں یا کئی لقمے کھالئے یا اسی قسم کا اور کوئی کام کیا تو اس سے مجلس بدل جائے گی، اسی لئے کہا ہے کہ اگر تلاوت کرنے والا صرف کھڑا ہو جائے کسی مقصد کے بغیر تو مجلس نہیں بدلے گی۔

بخلاف المخیرۃ لانہ دلیل الاعراض وھوالمبطل ھنا لک وفی تسدیۃ الثوب یتکرر الوجوب وفی المنتقل من غصن الی غصن کذلک فی الاصح وکذافی الدیاسۃ للاحتیاط ولوتبدل مجلس السامع دون التالی یتکرر الوجوب علی السامع لان السبب فی حقہ السماع وکذااذاتبدل مجلس التالی دون سامع علی ماقیل والاصح انہ لا یتکرر الوجوب علی السامع لما قلنا۔

ترجمہ:- بخلاف مخیّرہ کے (اس عورت کے جسے طلاق لینا کا اختیار دیا گیا ہو) کیونکہ اس کا کھڑا ہو جانا اس اختیار کو ناپسند کرنے کی دلیل ہے، اور اس جگہ اس اختیار کو باطل کرنے والا ہوگا، اور کپڑا بنتے ہوئے ادھر سے اُدھر ہونے سے وجوب سجدہ مکرر ہو جائے گا، اور ایک شاخ سے دوسری شاخ پر منتقل ہو جانے سے قول اصح کے مطابق ایسا ہی حکم ہوگا، ایسا ہی کھلیان میں غلہ روندنے (مالش) کے وقت احتیاط کی وجہ سے، اور اگر سننے والے کی مجلس بدل جائے لیکن تلاوت کرنے والے کی نہ بدلے تو بھی ایسا ہی حکم ہے جیسا کہ کہا گیا ہے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ سامع پر بھی وجوب بار بار نہ ہوگا اس دلیل کی بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کردی ہے۔

توضیح مجلس بدلنے کی صورتیں، سننے والے کی مجلس بدلی، تلاوت کرنے والے کی مجلس بدلی

بخلاف المخیرۃ لانہ دلیل الاعراض وھوالمبطل ھنالک......الخ

بخلاف مخیّرہ (اسم مفعول) اس عورت کے جسے اختیار دیا گیا ہ، ف یعنی کسی شوہر نے اپنی بیوی کو جو بیٹھی ہوئی تھی اس بات کا اختیار دیا کہ اگر تم چاہتی ہو تو اپنے نفس کو اختیار کرو (طلاق دے دو) تو اس وقت اس عورت کو اسی مجلس تک اختیار رہے گا چنانچہ اگر اس نے اسی مجلس میں کہا کہ میں نے اپنے نفس کو اختیار کیا تو طلاق واقع ہو گئی، اور اگر عورت نے کھڑے ہو کر کہا تو واقع نہ ہو گی، اس سے اس بات کا وہم پیدا ہوا کہ کھڑے ہونے سے مجلس بدل جاتی ہے، تو مصنفؒ نے اس کا جواب دیا کہ صرف کھڑا ہونا مجلس کو نہیں بدلتا ہے جب تک کہ کسی مقصد کے ساتھ نہ ہو، اور اس مخیّرہ کے مسئلہ میں جو کھڑا ہونا اختیار کو باطل کرتا ہے وہ اس

وجہ سے۔ لانه دلیل الخ کہ یہ کھڑا ہونا اس بات کی ناپسندیدگی کی دلیل ہے، ف یعنی عورت نے اختیار لینے سے اعراض کیا اور منہ موڑا ہے، پس یہ صرف کھڑا ہونا اعراض کے طریقہ سے نہیں ہے۔ وهو مبطل الخ اور اعراض کرنا یہاں اختیار کو باطل کر دیتا ہے، ف اس طرح عورت کا اختیار جاتا رہا، پس طلاق اس لئے نہیں ہوئی کہ عورت نے ایسی چیز کی ناپسندیدگی سے منہ موڑ لیا ہے، اور اس وجہ سے نہیں کہ کھڑے ہونے سے مجلس بدل گئی ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر وہ کھڑی رہتی اور اسی حالت میں اسے اختیار دیا جاتا اور وہ بیٹھ جاتی تو اس کا اختیار باقی رہ جاتا کیونکہ اس حالت میں بیٹھ جانا اعراض کی دلیل نہیں مانی جاتی ہے۔

وفی تسدية الثوب يتكرر الوجوب وفی المنتقل من غصن الی غصن كذلك فی الاصح......الخ

اور کپڑا بنتے وقت تانا تاننے کی آمد و رفت میں سجدہ بار بار واجب ہوتا رہے گا، اسی طرح ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چلتے رہنے سے بھی مکرر ہوگا، فی الاصح الخ یہی اصح قول ہے، ف اور یہی حکم زمین جوتتے وقت کا بھی ہے۔ الکافی۔ و كذا فی الدياسة الخ اور یہی حکم کھلیان روندنے (غلہ ملنے) میں ہے، ف۔ واضح ہو کہ مجلس نہیں بدلے گی بلکہ ایک ہی رہے گی، اگر بہت دیر ہو یا ایک لقمہ کھانا کھالے یا ایک گھونٹ پانی پی لے یا صرف کھڑا ہو جائے بلا مقصد یا ایک دو قدم چلے یا چھوٹی کوٹھری ہو یا مطلقاً مسجد کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک چلا جائے اگرچہ جامع مسجد ہو، اور جہاں سے اقتداء صحیح ہو یا کشتی میں سوار ہو کر چلے نماز پڑھے یا بغیر پڑھے، یا جانور پر نماز کی حالت میں ہو یا سوار ہو کر چلنے سے پہلے اتر پڑھے یا عمل قلیل ہو یا تسبیح و تہلیل یا قراءۃ القرآن، یا بیٹھے ہوئے سوتا رہے، یا پہلی رکعت میں بار بار پڑھے اصح قول کے مطابق ایسا ہی ہے کہ اس عرصہ کی ساری رکعتیں ایک مجلس کے حکم میں ہیں، الخلاصہ۔

اور جن صورتوں میں مجلس بدلتی ہے ان میں سے چند یہ ہیں بڑے گھر میں ایک کنارے سے دوسرے کنارے میں جانا۔ جانور پر بغیر نماز کے تلاوت کرنا۔ درمیان تلاوت میں کلام کرنا۔ قاضی خان کی روایت کے مطابق تین قدم چلنا، اور المحیط کی روایت کے مطابق چار قدم چلنا۔ چلتے ہوئے پڑھنا۔ بڑے دریا اور جھیل میں تیرنا۔ اور صحیح قول کے مطابق چھوٹے سے حوض محدود میں۔ یا چکی کے چاروں طرف گھومنا۔ اور زیادہ کھانے سے و پینے میں بھی استحسانا تبدیل ہے، کروٹ سے سونا۔ بیچنا اور اسی جیسے دوسرے کام۔ نماز کے لئے تحریمہ باندھنا۔ نماز سے خارج ہونا۔ یہاں تک کہ اگر تلاوت میں تحریمہ نماز باندھا اور بار بار پڑھا تو بار بار سجدہ بھی واجب ہوگا، اور نماز کے بعد سلام پھیر کر دوبارہ تلاوت کی تو دوسرا سجدہ واجب ہوگا، اگر مجلس واحد میں رہا مگر اس نے کہا کہ میں اب نہیں پڑھوں گا، پھر تلاوت شروع کر دی تو ایک ہی مجلس رہی، اور ایک ہی سجدہ کافی ہوگا، جیسا کہ کافی میں ہے۔ م۔

ولوتبدل مجلس السامع دون التالی يتكرر الوجوب علی السامع......الخ

اور اگر سننے والے کی مجلس بدل گئی، اور تلاوت کرنے والے کی نہیں بدلی۔ یتکرر الخ تو سننے والے پر سجدہ مکرر واجب ہوگا، جب کہ اس نے آیت سجدہ مکرر سنی ہو، لان السبب الخ کیونکہ اس کے حق میں سجدہ واجب ہونے کا سبب تلاوت کا سننا ہے، ف اور اس کا سننا دو مجلسوں میں ہوا ہے، اور تلاوت کرنے والے کے حق میں سبب تلاوت کرنی ہے، اس لئے ایک مجلس ہونے سے اس پر ایک ہی سجدہ واجب ہوا، یہاں تک کہ اگر اس کی مجلس بدل گئی تو بالاتفاق تلاوت کے مکرر ہونے کی وجہ سے اس پر سجدہ بھی مکرر ہی واجب ہوگا۔

و كذااذاتبدل مجلس التالی دون سامع علی ماقيل والاصح انه لا يتكرر الوجوب علی......الخ

اس طرح جب تلاوت کرنے والے کی مجلس بدلے لیکن سننے والے کی نہ بدلے، ف تو بھی سننے والے پر مکرر سجدہ واجب ہوگا، علی ما قیل کہے ہوئے قول کے مطابق، ف یعنی بعض مشائخ جن میں فخر الاسلامؒ بھی ہیں یہی کہا ہے۔ مع۔ اور کافی میں بھی بظاہر اسی قول کو ترجیح دی گئی ہے، ف، والاصح الخ لیکن اصح قول یہ ہے کہ سننے والے پر ایک سے زیادہ وجوب نہ ہوگا، اس

بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کی ہے،ف یعنی اس کے حق میں وجوب کا سبب تلاوت نہیں ہے، تاکہ تلاوت کے مجلس بدلنے کا اس کے بارے میں اعتبار ہو، بلکہ اس کے بارے میں علیحدہ سبب ہے یعنی سماع ہے،اور اگر سماع کی مجلس نہیں بدلی تو مکرر وجوب نہ ہوگا،م، اور یہی اکثر مشائخ کا قول ہے اور ہم نے اسی قول کو قبول کیا ہے ہے۔العتبابیہ۔ھ۔

لہٰذا اسی پر فتویٰ ہوگا۔م۔اگر مباح وقت میں آیت سجدہ پڑھی گئی ہو اور مکروہ وقت میں اسے ادا کیا گیا تو یہ سجدہ ادا کرنے سے ہو جائے گا،اگر آیت سجدہ تلاوت کرنے کے بعد ہی کسی خوف کی بناء پر سواری پر سوار ہو گیا،اگر اس کے بعد بھی خوف پر باقی ہو اور اسی حالت میں سجدہ کر لیا تو ادا ہو جائیگا،اور اگر امن ہو چکا ہو تو ادا نہ ہوگا، محیط السرخسی، سجدہ تلاوت کے ادا ہونے کی شرطیں نماز کی ہی شرطیں ہوتی ہیں سوائے تحریمہ کے۔اس سجدہ کا رکن زمین پر پیشانی رکھنی ہے یا جو چیز اس کے قائم مقام ہو، جیسے فوراً رکوع کر لینا، یا بیمار اور رسوار کے لئے اشارہ کرنا بشر طیکہ سواری پر تلاوت کرنے سے واجب ہوا ہو، اور وہ اتر کر بھی ادا ہو سکتا ہے، برخلاف اس سجدہ کے جو زمین پر واجب ہوا ہو، تو وہ سواری پر ادا نہ ہوگا،البتہ خوف کی حالت میں ادا ہو جائیگا۔جس چیز سے نماز فاسد ہوتی ہے اسی سے سجدہ تلاوت بھی فاسد ہو جاتا ہے، مثلاً قصد اُحدث کرنا، کسی طرح کا کلام یا قہقہہ وغیرہ تو ان چیزوں سے نماز کے مثل سجدۂ تلاوت بھی فاسد ہو جاتا ہے پھر اسے دوبارہ ادا کرنا واجب ہوتا ہے،البتہ صرف سجدہ تلاوت ادا کرتے وقت قہقہہ مارنے سے وضوء نہیں ٹوٹتا ہے جب کہ نماز میں قہقہہ مارنے سے نماز کے ساتھ وضوء بھی ٹوٹ جاتا ہے،اسی طرح عورت کی محاذات (بغل میں کھڑے ہو جانے) سے بھی سجدہ فاسد نہیں ہوتا ہے،اگر سجدۂ تلاوت ادا کرتے وقت کوئی سو گیا تو صحیح قول کے مطابق طہارت باطل نہیں ہوئی۔م۔ھ۔

ومن ارادالسجود كبرولم يرفع يديه وسجد ثم كبر و رفع رأسه اعتبار ا بسجدة الصلوة وهوالمروى عن ابن مسعودؓ ولاتشهد عليه ولاسلام لان ذلك للتحلل وهويستدعى سبق التحريمة وهى منعدمة قال ويكره ان يقرأ السورة فى صلوة اوغيرها ويدع آية السجدة لانه يشبه الاستنكاف عنها.

ترجمہ:-جو کوئی سجدہ تلاوت ادا کرنا چاہے تو وہ بغیر ہاتھوں کو اٹھائے تکبیر کہے اور سجدہ ادا کرے پھر تکبیر کہتا ہوا اپنا سر اٹھالے، نمازی سجدہ کا اعتبار کرتے ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایسا ہی مروی ہے، اس سجدہ کی ادائیگی میں اس شخص پر نہ تشہد پڑھنا ضروری ہے اور نہ سلام پھیرنا، کیونکہ یہ سلام تو نماز کے احرام سے حلال ہونے کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ یہ تو اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ اس سے پہلے تحریمہ باندھا گیا ہو، جبکہ اس میں تحریمہ بھی نہیں ہوتا ہے،اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ یہ بات مکروہ ہے کہ کوئی شخص نماز کے اندر یا اس کے باہر کوئی ایسی سورہ پڑھے جس میں آیت سجدہ موجود ہو پھر صرف آیت سجدہ کو چھوڑ دے یا نہ پڑھے۔

توضیح:-سجدۂ تلاوت بجالانے کا طریقہ

ومن ارادالسجود كبرولم يرفع يديه وسجد ثم كبر و رفع رأسه اعتبار ا بسجدة الصلوة......الخ

جو شخص سجدہ کرنا چاہے۔ف تو وہ اللہ تعالےٰ کے واسطے سجدہ،اور مستحب یہ ہے کہ کھڑا ہو جائے۔ظ۔اور تکبیر کہے،اور اپنے دونوں ہاتھوں کو نہ اٹھائے،ف تکبیر بلند آواز سے کہے،ط،یہ تکبیر بظاہر مسنون ہے،التبیین. وسجد،اور ایک بار گی زمین پر سر رکھ کر سجدہ کرے،ف یا اشارہ اور رکوع کرے، جن صورتوں میں جائز ہے،م،اور سجدہ میں سبحان ربی الاعلی تین بار پڑھے، یہی قول صحیح ہے،ق،ثم کبر الخ پھر تکبیر کہے،ف بلند آواز سے،ظ،ورفع الخ سر اٹھاتے ہوئے،ف مستحب یہ ہے کہ تکبیر کہتا ہوا سیدھا کھڑا ہو جائے اس کے بعد بیٹھے،ظ، سجدہ کا یہ مستحب اور جامع طریقہ ہے، اعتبار الخ سجدۂ نماز پر قیاس کرتے ہوئے،ف اس لئے اگر کسی نے بغیر تسبیح پڑھے اعتدال کے ساتھ سر کو زمین پر رکھ کر کھڑا ہو جائے تو ادنیٰ درجہ میں جائز ہے، جیسے

کہ نماز کے سجدہ میں ہے۔

وهو المروى عن ابن مسعودؓ ولاتشهد عليه ولاسلام لان ذلك للتحلل.....الخ

حضرت ابن مسعودؓ سے یہی طریقہ منقول ہے، ف یہ روایت نہیں ملی البتہ حضرت ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہم لوگوں کو قرآن پاک سناتے، اور آیت سجدہ پڑھتے تو تکبیر کہہ کر سجدہ کرتے اور ہم لوگ آپ کی اقتداء میں سجدے کرتے، اسے ابوداؤد اور ابن ابی شیبہؒ نے ابراہیم نخعیؒ وابو قلابہ و محمد بن سیرین و شعبی و حسن وعطاء وابن سیرین اور ابو عبدالرحمٰن السلمی سے ہمارے مذہب کے مطابق روایت کی ہے، یعنی اس بات کے ساتھ، ولاتشهد الخ اس پر نہ التحیات ہے اور نہ سلام ہے، ف اور تابعین کی جماعت سلام نہیں پھیرتے تھے، ع، ن، امام مالکؒ کا یہی قول ہے اور امام شافعیؒ کے مذہب میں اصح قول یہ ہے کہ سلام پھیرنا شرط ہے، مع، اور راجح قول یہی ہے کہ نہ تشہد ہے اور نہ سلام ہے۔

لان ذلك للتحلل وهو يستدعى سبق التحريمة وهى منعدمة.....الخ

کیونکہ سلام تو احرام سے حلال ہونے کے لئے ثابت ہے، وهو يستدعى الخ اور حلال ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلے سے تحریمہ قائم ہو، ف تاکہ اس سے تحلیل کرے، جب کہ یہاں تحریمہ بالکل معدوم ہے، ف اور تکبیر جو کہی جاتی ہے وہ تحریمہ کے لئے نہیں بلکہ سجدہ میں جانے کی ہوتی ہے۔

قال ويكره ان يقرأ السورة فى صلوة اوغيرها ويدع آية السجدة.....الخ

امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ نماز یا غیر نماز میں سجدہ کی سورۃ پڑھنی اور اس میں سے سجدہ کی آیت چھوڑ دینی مکروہ ہے، ف یعنی مکروہ تحریمی ہے۔ ف۔ د۔ لانه يشبه الخ کیونکہ ایسا کرنے سے سجدہ سے منہ موڑنے کے مشابہہ ہو جاتا ہے، ف حالانکہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی بندۂ مومن آیت سجدہ پڑھ کو سجدہ کرتا ہے اس وقت اس کا شیطان ایک طرف ہو کر روتے ہوئے کہتا ہے کہ ہائے افسوس کہ آدمی کو سجدہ کا حکم ہوا تو اس نے سجدہ کیا جس کے نتیجہ میں اس کے لئے جنت ہے، اور مجھے بھی حکم ہوا مگر میں نے انکار کر دیا اور نتیجہ میں میرے لئے دوزخ ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور معلوم ہونا چاہئے کہ شیطان کا اس طرح رونا اپنی ندامت کے لئے نہیں ہے بلکہ آدمی سے عداوت اور اپنی خواہش کے پوری نہ ہونے کی بناء پر ہے۔ م۔ حضرت ابو سعیدؓ نے یہ خواب دیکھا کہ میں سورۂ صٓ لکھتا ہوں تو جب میں آیت سجدہ پر پہنچا تو میں نے دیکھا کہ دوات و قلم اور ہر وہ چیز جو موجود تھی سب سجدے میں چلی گئی تو میں بھی سجدہ میں چلا گیا، پھر میں نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا تو اس کے بعد سے آپ برابر سورۂ صٓ میں سجدہ کیا کرتے تھے، اس کی روایت امام احمدؒ نے کی ہے، اور امام احمدؒ نے ایک صحابی کے واقعہ کا درخت کے سجدہ کرنے اور سجدہ میں حمد ثنا اور دعاء کرنے کا رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا تو آپ نے بھی سجدہ کیا، اور درخت نے کہا تھا وہی سجدہ میں فرماتے تھے، میں نے یہ حدیث اپنی کتاب تفسیر کے سجدۂ بنی اسرائیل میں ذکر کر دی ہے۔ م۔

ولا بأس بان يقرأ اية السجدة ويدع ماسواها لانه مبادرة اليها قال محمدؒ احب الى ان يقرأ قبلها آية او آيتين دفعا لوهم التفضيل واستحسنوا اخفاءها شفقة على السامعين والله اعلم.

ترجمہ:۔ اور اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی شخص صرف آیت سجدہ پڑھتا ہے اور بقیہ کو چھوڑ تا رہے، کیونکہ ایسا کرنے سے سجدہ کی طرف رغبت ظاہری ہوتی ہے، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ بات بہت پسند آتی ہے کہ آدمی سجدہ سے ایک آیت پہلے اور ایک آیت بعد کی تلاوت کرے، آیت سجدہ کی فضلیت کے وہم کو دور کرنے کے لئے، اور سامعین پر شفقت کے خیال سے آیت سجدہ آہستہ پڑھنے کو فقہاء نے پسند کیا ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

توضیح:- صرف آیت سجدہ پڑھ کر بقیہ کو چھوڑ دینا، آیت سجدہ کو آہستگی کے ساتھ پڑھنا، کسی مشغولیت کی وجہ سے آیت سجدہ کسی نے نہیں سنی، دعائے سجدۂ تلاوت، سجدہ کی ابتداء میں نیت، سجدہ کے واسطے طہارت، امام سجدہ پڑھ کر بھول گیا پھر رکوع میں یاد آیا، سجدہ شکر، سجدہ بے سبب، نماز کی ادائیگی کے بعد سجدہ

ولا بأس بان يقرأ اية السجدة ويدع ماسواها لانه مبادرة اليها......الخ

اس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آدمی صرف آیت سجدہ کو تلاوت کرے اور باقی کی تلاوت نہ کرے، لانه بادرة الخ اس لئے کہ اس سے تو سجدہ کی طرف رغبت اور پیش قدمی ثابت ہوتی ہے، ف اور سرّیہ نماز میں اسے مستحب نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ امام اچانک قیام میں سے سجدہ میں چلا جائے گا تو مقتدی پریشانی میں مبتلا ہو جائینگے کیونکہ وہ تو رکوع میں جانے کے لئے تیار ہوں گے اور آیت سجدہ کی تلاوت کا انہیں علم نہیں ہے، اس لئے ان میں انتشار پیدا ہو جائیگا، م۔

قال محمدؒ احب الى ان يقرأ قبلها آية او آيتين دفعا لوهم التفضيل......الخ

امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ بات بہت زیادہ پسند ہے کہ آیت سجدہ کے پہلے کی چند آیتیں بھی پڑھ لی جائیں تاکہ یہ وہم نہ ہو کہ آیت سجدہ کو دوسری آیتوں پر فضیلت ہے، ف حالانکہ وہ سب قرآنی آیتوں کے ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں، اور اگر ایسا نہیں کیا تو اس میں کوئی گناہ کی بھی بات نہیں ہے، الخلاصہ۔

واستحسنوا اخفاء ها شفقة على السامعين والله اعلم......الخ

علماء نے آیت سجدہ کو سننے والوں سے چھپا کے اور آہستہ پڑھنے کو مستحسن سمجھا ہے، ف پھر اگر آس پاس کے حاضرین کے متعلق یہ اندازہ ہو کہ وہ لوگ بھی سجدہ ادا کرنے کے لئے باوضوء اور تیار بیٹھے ہیں، اور انہیں سجدہ ادا کرنے سے ناگواری نہ ہوگی تو زور سے ہی آیت سجدہ بھی پڑھ لینی چاہئے، اور اگر وہ لوگ یا تو بے وضوء ہو یا سن کر سجدہ ادا نہ کرنے کا احتمال ہو یا ان پر گرانی ہوگی تو آہستہ ہی پڑھنی چاہئے، یہ حکم عام ہے خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر ہو، الخلاصہ، معلوم ہونا چاہئے فرض نمازوں میں جن میں قراءت جہراً کی جاتی ہے ان میں سجدہ کی آیتوں کو سننے والوں کی ناگواری کے خیال وغیرہ سے آہستہ پڑھنا جائز نہیں ہے، کیونکہ ان نمازوں میں جہراً پڑھنا واجب ہے، اور خلاصہ میں جو کچھ موجود ہے وہ تنہا پڑھنے والے کے لئے ہے یا نفل نمازوں کے لئے ہے، واللہ اعلم بالصواب، م۔

جو شخص کسی کام میں ایسا مشغول ہو کہ اس نے آیت سجدہ پڑھنے کی آواز نہیں سنی تو غالب رائے یہ ہے کہ تنبیہ کے خیال سے اس پر بھی سجدہ واجب ہو، د، نماز کے علاوہ حالت میں یا فرض کے علاوہ سجدہ میں یہ دعا بھی پڑھی جاسکتی ہے، اَللّٰھُمَّ اُکْتُبْ لِی عِندكَ بها اَجراً وَضع عَنى بها وزراً وَاجعَلها لِى عِندكَ ذخراً وتَقبلهَا منى كما تَقبلتها مِن عبدكَ دَاوُد۔ یہ حدیث الشجرۃ میں مذکور ہے، اوپر اس کا اشارہ ہو چکا ہے، یہ مقام کچھ لطائف واشارات کا ہے، م، قول اصح یہ ہے کہ نماز کے سجدہ سے ہی عامہ مشائخ کے نزدیک بغیر نیت کے سجدہ تلاوت ادا ہو جاتا ہے، لیکن اگر فوراً نہ کر سکا اور تاخیر ہو گئی تو پھر نیت کرنی شرط ہے، جیسا کہ رکوع کے ساتھ ادا ہونے کے لئے نیت کا ہونا شرط ہے، بعض بزرگوں سے بغیر وضوء کے بھی اس سجدہ کا ادا ہو جانے کا قول پایا گیا ہے، جیسا کہ ابن ابی شیبہؒ نے روایت کی ہے اور ابراہیم نخعیؒ نے اس سجدہ کے لئے تیمم کرنے کو جائز قرار دیا ہے، مع، شاید یہ حکم اس لئے دیا ہو کہ فوراً سجدہ ادا ہو جائے، م، اگر امام آیت پڑھ کر اسے ادا کرنا بھول گیا اور اسے رکوع میں خیال آیا تو فوراً سجدے میں چلا جائے، پھر اٹھ کر رکوع کرے، اور آخر میں سجدہ سہو ادا کرلے، جیسا کہ الحاصل میں موجود ہے، ع، اور اگر سجدہ میں یاد آئے تو فوراً تلاوت کی بھی نیت کرلے، لیکن الاصل کی جو روایت بیان کی گئی ہے اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ رکوع میں

پہنچ کر ادائے سجدہ کی نیت صحیح نہ ہو گی، م۔

چند ضروری مسائل

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک سجدہ شکر کرنا مکروہ تنزیہی ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک عبادت شکر باعث ثواب ہے جس کی صورت یہ ہو گی کہ اللہ تعالے نے بندہ کو رزق یا اولاد یا مال یا کوئی بھی گم شدہ چیز یا دفع بلا یا شفائے بیمار یا اس جیسی کوئی نعمت جو گناہ کا ذریعہ نہیں ہے عطا فرمائی تو مستحب یہ ہے کہ طہارت کی حالت میں سجدہ تلاوت کی طرح قبلہ رخ ہو کر شکر کا ایک سجدہ حمد وثناء کے ساتھ ادا کرے، السراج، اور لوگوں کو اس سے نہیں روکا جائے گا، کیونکہ سجدۂ شکر میں عبادت اور عاجزی پائی جاتی ہے، اور صاحبینؒ کے ہی قول پر فتوی ہے، الحجہ، یہی قول صحیح ہے، اس سجدہ کے بارے میں بھی روایت موجود ہے، جیسے امت کے واسطے شفاعت وغیرہ کے عطاء ہونے کے وقت ہوا تھا، م، البتہ جو سجدہ کے بے سبب ہو نیکی اور تقرب نہیں ہے، مگر وہ مکروہ بھی نہیں ہے، لیکن نماز سے فارغ ہونے کے بعد جو کچھ لوگ سجدہ کرتے ہیں اسے اس درجہ سے مکروہ کہا گیا ہے کہ جاہل عوام اسے بھی ایک مستقل سنت سمجھ لیں گے، اور شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی بھی نفل کی ادائیگی سے اس کی اہمیت ضرورت سے زیادہ عوام کے نظر میں ہونے لگے اسے مکروہ کہا جاتا ہے، الزاہدی، اصول فقہ میں اس قاعدہ کو تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس قاعدہ کے بناء پر ہمارے زمانہ کے بہت سے مباح کام جنہیں جاہلوں نے اہمیت کے ساتھ کرنا شروع کر دیا ہے وہ مکروہ ہو جاتے ہیں، سمجھ رکھیں، واللہ تعالے اعلم۔ م۔

باب صلوة المسافر

السفر الذی یتغیر به الاحکام ان یقصد مسیرة ثلاثة ایام ولیالیها بسیر الابل ومشی الاقدام لقوله علیه السلام یمسح المقیم کمال یوم ولیلة والمسافر ثلاثة ایام ولیالیها عمت الرخصة الجنس ومن ضرورته عموم التقدیر وقدر ابویوسفؒ بیومین واکثر الیوم الثالث والشافعیؒ بیوم ولیلة فی قول وکفی بالسنة حجة علیهما والسیرالمذکورهو الوسط وعن ابی حنیفةؒ التقدیر بالمراحل وهوقریب من الاول ولا معتبر بالفراسخ هو الصحیح.

ترجمہ:- باب۔ مسافر کے نماز کے احکام۔ وہ سفر جس سے شرعی احکام بدلتے ہیں یہ ہے کہ اس میں تین دن اور تین رات کا چلنے کا ارادہ کرے یہ حال خواہ اونٹ کے چال سے ہو یا پیدل چلنے کے اعتبار سے ہو، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے وجہ سے کہ مقیم مسح کرے گا پورا ایک دن اور ایک رات، اور مسافر تین دن اور تین رات یہ حکم عام جنس مسافر کو شامل ہے، اور رخصت کے عام ہونے کی ضرورت سے عموم تقدیر ہے، اور امام ابو یوسفؒ نے مکمل تین دن اور تیسرے دن کے اکثر حصہ کا اندازہ لگایا ہے، اور امام شافعیؒ نے ایک دن اور ایک رات کا ایک قول کے مطابق اعتبار کیا ہے، ہمارے لئے مذکور حدیث دونوں اقوال پر حجت لانے کے لئے کافی ہے، مذکور چال سے مراد درمیانی ہے، اور ابو حنیفہؒ سے اندازہ کے بارے میں مراحل کا اعتبار ہے یہی قول پہلے قول کے قریب ہے، اور فرسخ کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اور یہی قول صحیح ہے۔

توضیح:- باب، مسافر کی نماز، مقدار مدت، معتبر سفر کے واسطے، شمار روز موسم کے اعتبار سے، رفتار کا وقت، حدیث سے دلیل عمومیت، دنوں کے اعتبار سے رخصت، فرسخ کے اعتبار سے رخصت

باب صلوة المسافر...... الخ یہ باب مسافر کی نماز کے بیان میں ہے۔

اس باب کو علیحدہ اور مستقلاً اس لئے بیان فرمایا ہے کہ سفر کی وجہ سے شریعت میں کئی احکام بدل جاتے ہیں جیسے نماز میں

رکعتوں کی کمی، روزہ افطار کرنا یعنی اس حالت میں فی الفور نہ رکھنا اور موزوں کے مسح مدت تین دن رات بڑھ جانا، اور جمعہ اور عیدین اور قربانی کا واجب نہ رہنا، اور آزاد عورت کو بغیر محرم کے ایسے سفر میں نہ جانا، ھ، العنایہ۔

السفر الذی یتغیر بہ الاحکام ان یقصد مسیرۃ ثلثۃ ایام و لیالیھا بسیر الابل......الخ

وہ سفر جس سے احکام بدل جاتے ہیں، ان یقصد الخ یہ ہے کہ تین دن اور تین رات کے چلنے کا ارادہ کرے، ف یعنی اتنی مسافت کا ارادہ کرے جو تین رات کے سفر میں طے ہو، بسیر الابل اونٹ کی رفتار کے ذریعہ یا قدموں کی چال سے، ف یا بیل گاڑی کی چال سے، ف، ایسا ارادہ اس شخص کا معتبر ہوگا جس کا ارادہ کرنے کی صلاحیت ہو، دن سے مراد ہر ملک کے سال میں سب سے چھوٹے موسم کا ارادہ معتبر ہے، جیسے ہمارے یہاں سخت سردی کے موسم میں سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے، ھ، فع، اور صحیح قول یہ ہے کہ صبح سے رات تک چلنا شرط نہیں ہے، بلکہ ہر روز صبح سے زوال کیوقت تک مرحلہ پر پہونچ کر آرام کر کے تین رات دن میں طے ہو، تو یہی سفر کی مسافت ہوگی، السراج، المحیط، ع، اور آرام کا وقت بھی رفتار میں شمار ہے، ع، بلکہ حاصل یہ ہے کہ سفر کی مسافت وہ ہے جو اس استراحت کے ساتھ چل کر تین دن رات میں طے ہو،، تو رات کا وقت رفتار کے حصہ میں نہیں بلکہ رفتار کو باقی رکھنے اور ممکن ہونے کے لئے جو آرام کرنا لازم ہے اس کا وقت ہے، لیکن اس صورت میں جو مسافر کہ تیسرے دن زوال آفتاب کے بعد وطن پہونچے وہ مسافر نہ ہوگا حالانکہ شمس الائمہ سرخسیؒ نے کہا ہے کہ قول صحیح یہ ہے کہ نیت کرنے سے وہ مسافر ہو گیا، جیسا کہ عینی میں ہے، م۔

لقولہ علیہ السلام یمسح المقیم کمال یوم و لیلۃ والمسافر ثلثۃ ایام و لیالیھا......الخ

کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مقیم مسح کرے پورے ایک رات دن اور مسافر مسح کرے تین دن اور تین راتیں، ف یہ صحیح حدیث تو موزوں پر مسح کرنے کے واسطے ہے، لیکن اس سے یہ مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ مسافر کا ایک سفر تین دن اور رات کا ہوگا۔

عمت الرخصۃ الجنس و من ضرورتہ عموم التقدیر......الخ

یہ اجازت عام جنس کو شامل ہے، ف یعنی کسی مسافر کی خصوصیت نہیں ہے، بلکہ کوئی بھی مسافر ہو سب کو یہ عام اجازت ہے۔ و من ضرورتہ الخ اور رخصت کے عام ہونے کی ضرورتوں سے عموم تقدیر ہے، ف یعنی جبکہ اجازت ہر مسافر کے لئے عام ہے تو ہر ایک کے لئے تین دن اور تین رات کی مدت کی ضرورت ہے، ورنہ لازم آئے گا کہ کچھ مسافر تین دن رات مسح نہ کرے، حالانکہ حدیث میں تمام مسافروں کے لئے اجازت ہے، حاصل یہ کہ کم سے کم مقدار سفر بھی تین دن رات ہو، کیونکہ اگر مقدار کم ہو تو حدیث کی مخالفت لازم آتی ہے، مثلاً زید کا وطن ایسے دو علاقوں میں ہے جن میں دونوں کا فاصلہ ہے تو اگر دو دن مقدار سفر ہو تو پہلے دن جب زید ایک وطن سے دوسرے وطن کو چلا تو اسے تین دن رات مسح کی اجازت مسافر ہونے کی وجہ سے حاصل ہوئی اور جب دوسرے دن وہ وطن پہنچ گیا تو اب اسے پاؤں دھونا لازم آگیا، پس اس مسافر کو تین دن رات مسح کی اجازت حاصل نہ ہوئی، حالانکہ پہلے ہی دن اسے اجازت حاصل ہو گئی تھی، اور یہ بات بھی لازم آئی کہ کچھ مسافر تین دن رات مسح نہیں کرینگے، حالانکہ حدیث میں تو ہے کہ ہر مسافر تین دن رات مسح کر سکتا ہے، اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ سفر کی کم از کم مدت تین دن اور رات سے کم نہیں ہے۔

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ تمہارے نزدیک تیسرے دن زوال کے وقت جو مسافر وطن میں پہنچ گیا اسے مسافر رہنا چاہئے جیسا کہ سراج کا مسئلہ گذر چکا ہے، حالانکہ وہ گھر پہنچ کر مسافر باقی نہیں رہتا ہے کہ وہ پاؤں دھوئے گا اور مسح نہیں کرے گا اس طرح اس مسافر نے تین رات سے کم مدت تک مسح کیا ہے، ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس اعتراض سے بچنے کی صرف یہ صورت ہے کہ یہ شخص مسافر ہی نہیں ہے، مگر شمس الائمہؒ نے فرمایا ہے کہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ نیت کرتے ہی مسافر ہو گیا، اور مسافر ہے، میں

مترجم کہتا ہوں کہ روزانہ کی چال میں جس طرح اسے نماز کے قصر کا حکم ہے اسی طرح اس دن منزل پر پہونچ کر بھی تھکان کی وجہ سے رات میں اسے قصر کی اجازت ہے، اب ظاہر ہے کہ تیسرے دن جب وہ زوال کے وقت اپنے وطن میں پہونچ گیا تو اس تھکان کا اعتبار اس رات تک ہونا چاہئے، اسی لئے قصر کا حکم ہونا چاہئے لیکن اس کو مجبوری پیش آگئی ہے کہ وہ اب اپنے وطن میں نیت کے بغیر ہی مقیم ہو چکا ہے، تو جیسے ایک مزدور اپنے وطن میں مقیم رہتے ہوئے تھک جاتا ہے اس کے باوجود اس کے لئے قصر کا حکم نہیں ہے، ویسے ہی اس مسافر کے لئے بھی قصر کا حکم نہیں ہے، بس یہی موقع اجتہاد کا ہے۔ فاللہ تعالےٰ اعلم۔ م۔

وقدر ابویوسفؒ بیومین واکثر الیوم الثالث والشافعیؒ بیوم ولیلة فی قول، وکفی بالسنة حجة......الخ

اور امام ابویوسفؒ نے کہا ہے کہ سفر کی مقدار پورے دو دن اور تیسرے دن کا زیادہ حصہ ہے، والشافعیؒ الخ اور امام شافعیؒ نے ایک قول میں ایک دن اور ایک رات مقرر کی ہے، اور دوسرے قول میں دو دن اور دو راتیں مقرر کی ہیں، وکفی الخ، ہمارے لئے مذکور حدیث ہی دونوں اقوال کے خلاف حجت کے لئے کافی ہے، ف مذکور حدیث سے مراد وہ حدیث ہے جس میں مقدار مسح بیان کی گئی ہے، واضح ہو کہ سفر کے متحقق ہونے میں اوسط چال معتبر ہے، حالانکہ اس سے پہلے اونٹ اور قدم کی چال سے حساب بتایا ہے، اس لئے منصفؒ نے فرمایا ہے۔

والسیر المذکور هو الوسط وعن ابی حنیفةؒ التقدیر بالمراحل وهو قریب من الاول......الخ

اور جو چال بیان کی گئی ہے اس سے یہی اوسط چال مراد ہے، وعن ابی حنیفةؒ الخ اور ابو حنیفہؒ سے مرحلوں کا اندازہ مروی ہے، ف یعنی تین مرحلے ہیں، ع، یعنی جیسے عرف میں تین منزل کا شمار کرتے ہیں، وهو قریب الخ یہ قول بھی پہلے قول کے زیادہ قریب ہے، ف کیونکہ ہر روز ایک منزل چلنے کا معمول ہے بالخصوص چھوٹے دنوں میں تو یہی تین رات اور تین دن کا اندازہ ہوا، ع، اور عامہ مشائخ نے فرسخ سے اندازہ کیا ہے، المرغینانی، یعنی فرسنگ جیسے دھیان کہتے ہیں، اس کے لئے چھتیس ہزار قدم اور ہر قدم نصف ذراع پر یا تین میل پر ایک پتھر کا نشان بناتے تھے جیسے آج کل ہر میل پر ہوتا ہے۔ م۔ بلکہ فراسخ سے اندازہ بعض مشائخ کہتے ہیں، پھر آپس میں اختلاف کرتے ہیں، بعض نے مقدار سفر ۲۱ فرسخ، اور بعض ۱۹، اور بعض نے ۱۵ قرار دی ہے، اور درایہ شرح ہدایہ میں ہے کہ ۱۸ پر فتوی ہے، اور جوامع الفقہ میں کہا ہے کہ یہی قول مختار ہے، اور مجتبی میں کہا ہے کہ خوارزم کے اکثر علماء کا فتوی ۱۸ پر ہے، مع، لیکن مصنفؒ نے ان سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔

ولا معتبر بالفراسخ هو الصحیح......الخ

اور فراسخ سے اندازہ کا کچھ اعتبار نہیں ہے، اور یہی قول صحیح ہے، ف اس وجہ سے کہ جو راہ سخت دشوار گذر ہے وہ تین دنوں میں ۔۱۵ فرسخ سے بھی کم طے ہوئی ہے، مگر نص حدیث سے وہ قصر کرے گا حالانکہ فراسخ کے اندازہ پر قصر نہ ہوگا، اس لئے نص سے معارضہ ہوا اسی وجہ سے اعتبار ساقط ہے، اور اس تقدیر پر کہ تین روز کی رفتار کو معتبر مانا ہے تو اگر کوئی شخص تین منزل کو تیز رفتاری کے ساتھ ایک ہی دن میں دوڑ کر طے کرے تو بھی وہ قصر کرے گا، اس سے ظاہر ہوا کہ قصر کا اعتبار صرف اس مسافت اور فاصلہ پر ہے جو اوسط چال سے تین روز میں طے ہو۔

یہاں پھر اشکال پیدا ہوا کہ جب اس فاصلہ کو ایک روز میں طے کر کے وطن آگیا تو یہاں مسح نہیں کرے گا، اس طرح اس مسافر نے تین دن اور رات سے کم مسح کیا، مف، اور شیخ نے ایک دقیق کلام کو بہت تفصیل سے بیان کر دیا ہے اور دعوی کیا ہے کہ اگر یہ تفریع صحیح ہو تو استدلال بے کار ہو جاتا ہے، اور تین دن رات کے لئے دوسری دلیل نہیں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر استدلال اس طرح ہو کہ اصلی اعتدال پر مسافر کی مقدار تین دن رات کی رفتار ہے، مسح کے جائز ہونے کی وجہ سے، اور تیسرے دن وطن واپس آجانا یا نیت بدل کر مقیم ہو جانا یا حد سے زائد تیز رفتار کے ساتھ راستہ طے کرنا عارضی باتیں ان کی وجہ سے کلام نہیں ہے۔ م۔

ولا يعتبر السير في الماء معناه لا يعتبر به السير في البر، فاما المعتبر في البحر فما يليق بحاله كما في الجبل قال وفرض المسافر في الرباعية ركعتان لايزيد عليهما وقال الشافعيؒ فرضه الاربع والقصر رخصة اعتباراً بالصوم ولنا ان الشفع الثاني لايقضى ولايأثم على تركه وهذا آية النافلة.

ترجمہ:-اور پانی میں چلنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ تری کی چال پر خشکی کی چال کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، اور تری میں وہی چال معتبر ہو گی جو اس کے حال کے لائق ہو، جیسا کہ پہاڑ میں چلنے میں ہے، اور کہا ہے کہ مسافر کی چار رکعتوں کی فرض نمازیں دو رکعتیں ہو گی، نمازی دو سے زیادہ نہیں کرے گا، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ مسافر کی بھی چار رکعتیں ہی فرض ہوں گی، لیکن اسے قصر کے ساتھ نماز پڑھنے کی رخصت ہو گی رمضان کے روزے پر اعتبار کرتے ہوئے، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ چار رکعتوں میں سے صرف آخری دو رکعتوں کی تو قضاء نہیں کی جاتی ہے اور نہ اس کے چھوڑنے پر کوئی گنہگار ہوتا ہے، اور یہ بات اس کے نفل ہونے کی نشانی ہے۔

توضیح:-تری میں مسافت کا اعتبار، مسافر کی نماز حنفیہ کی قیاسی دلیل

ولا يعتبر السير في الماء معناه لا يعتبر به السير في البر......الخ

اور پانی میں چال کا اعتبار نہیں ہے، ف یہ غرض نہیں کہ تری میں سفر کا اندازہ تری کی چال سے نہ ہو گا، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تری کی چال قیاس کر کے خشکی کی رفتار معتبر نہ ہو گی، ف یعنی پانی کی چال اور اس بہاؤ اس کام کے لئے معتبر نہیں ہے کہ خشکی کا سفر اس پر قیاس کیا جاسکے۔م۔ جیسے خشکی کے رفتار پر پانی کے سفر کا اندازہ نہیں ہوتا ہے، الجوہرہ۔

فاما المعتبر في البحر فما يليق بحاله كما في الجبل......الخ

اور تری میں وہ چال معتبر ہے جو اس کے حال کے مناسب ہو، جیسے پہاڑ میں، ف وہی چال معتبر ہو گی جو اس کے مناسب ہو، م، اور سمندری اور تری کی راہ میں بھی کشتی کی تین دن کی رفتار کی دوری معتبر ہو گی، ایسے وقت کی رفتار معتبر ہو گی جب کہ ہوا اوسط درجہ پر چل رہی ہو، نہ تو بالکل بند ہو اور نہ طوفانی چل رہی ہو، اور پہاڑ میں بھی تین دن ہی کی مسافت معتبر ہو گی، اگرچہ خشکی یا ہموار زمین میں وہ ایک ہی دن کی رفتار ہو، اگر منزل تک پہونچنے کے دو راستے ہوں ایک پانی کا جو تین روز میں طے ہوتا ہو تو اس راستے سے جانے سے وہ مسافر ہو گا، اور دوسرا خشکی کا جو دو روز میں طے ہوتا ہے تو وہ مسافر نہ ہو گا، اور اگر اس کے برعکس ہو تو خشکی کے راستے سے وہ مسافر ہو گا، اور پانی کی راہ سے مسافر نہ ہو گا، الجوہرہ، قاضی خان، البحر، ھ، حاصل یہ ہوا کہ منزل تک کی دو یا زیادہ راہوں میں سے جس راہ کو آدمی اختیار کرے گا اسی کی مدت کا اعتبار ہو گا، ف۔

قال وفرض المسافر في الرباعية ركعتان لايزيد عليهما......الخ

قدوریؒ نے فرمایا ہے کہ مسافر کا فرض چار رکعت والی نماز میں دو رکعتیں ہیں، ف یعنی مسافر کی نماز میں قصر نہیں ہے بلکہ مغرب و فجر میں مقیم اور مسافر سب برابر ہیں، اور ظہر، عصر اور عشاء میں مقیم چار رکعتیں لیکن مسافر پر صرف دو رکعتیں ہی فرض ہے، اس طرح ہمارے نزدیک مسافر پر ان نمازوں میں دو رکعتیں ہی فرض ہے نہ ان سے کم، اسی بناء پر کہا ہے۔ **لايزيد عليهما الخ** مسافر ان دو رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھے، ف کیونکہ جو کوئی اپنے فرض کو اپنے ارادہ سے گھٹائے گا یا بڑھائے گا وہ باطل پر ہے، م.

وقال الشافعيؒ فرضه الاربع والقصر رخصة اعتباراً بالصوم......الخ

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ف اسی طرح امام مالک اور احمدؒ نے بھی فرمایا ہے کہ **فرضه الاربع الخ** مسافر کے لئے بھی چار ہی رکعتیں فرض ہیں ساتھ **هي القصر رخصة** قصر کرنا دو رکعت پر اس کے حق میں جائز ہے اور اسے اجازت ہے، ف ان کا یہ قول **اعتباراً بالصوم** روزہ پر قیاس کرنے کی بناء پر ہے، ف چنانچہ مسافر پر بھی روزہ فرض ہے لیکن اسے راستہ کی تکلیف کی بناء پر

افطار کی اجازت ہے، اسی لئے اگر کوئی شخص تکلیف برداشت کرتے ہوئے سفر میں روزہ رکھ لے تو بالاتفاق وہ ادا ہوگا، بلکہ افضل ہی ہے، اور اگر مشقت کی بناء پر افطار کرلے تو بھی اس کی اجازت ہے، لیکن سفر سے فارغ ہو کر حالت اقامت میں ان روزوں کی قضاء کرنی ہوگی، اسی طرح سفر میں چار رکعتیں افضل ہونی چاہئیں، ورنہ دو رکعتوں پر قصر کرنا جائز ہے، لیکن اس پر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ روزہ کی اجازت کے بعد تو اس پر قضاء واجب ہے، اور نماز کے قصر کرنے میں جو دو رکعتیں چھوٹی ہیں ان کی تو قضاء واجب نہیں ہوتی ہے تو ایسے قیاس کے کیا معنی ہوئے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ

ولنا ان الشفع الثاني لايقضى ولايأثم على تركه وهذا آية النافلة......الخ

اور ہماری دلیل ان کے خلاف یہ ہے کہ چار رکعتوں میں آخری دو رکعتیں قضاء نہیں کی جاتی ہیں، ف یعنی بالاتفاق کوئی مسافر سفر کے بعد قصر کے سلسلہ چھوٹی ہوئی دو دو رکعتوں کی قضاء نہیں کرتا ہے۔ ولایاثم الخ اسی طرح قضاء نہ کرنے پر کوئی گنہگار بھی مانا نہیں جاتا ہے، ف اس بات پر تمام اماموں کا اجماع اور اتفاق ہے، اور یہ تو ان کے نفل ہونے کی علامت ہے، ف کیونکہ نفل ہی کا حکم ہے کہ چاہو تو پڑھو اور نہ چاہو تو نہ پڑھو، اس سے یہ نتیجہ نکلا کے آخری دو رکعتیں فرض نہیں ہے، اور مسافر کے لئے صرف دو ہی رکعتیں فرض ہیں، اور فرض کی دو ہی رکعتیں ہیں تو ان کے ساتھ رکعتیں ملا بھی نہیں جاسکتی ہیں، اور آخری دو رکعتیں مسافر کے ذمہ بھی نہیں رہیں، کہ ان کی قضاء لازم آئے۔

بخلاف الصوم لانه يقضى وان صلى اربعا وقعد في الثانية قدر التشهد اجزته الاوليان عن الفرض والاخريان له نافلة اعتبارا بالفجر ويصير مسيئا لتاخير السلام.

ترجمہ:- بخلاف روزہ کے کیونکہ اس کی قضاء کرنی ہوتی ہے، اور اگر نمازی مسافر نے چار رکعتیں اس طرح پڑھیں کہ دوسری رکعت میں تشہد کی مقدار بیٹھ گیا تو اس کے لئے پہلی دو رکعتیں فرض کی حیثیت سے جائز ہو جائینگی اور آخری دونوں رکعتیں اس کے لئے نفل ہو جائینگی، فجر کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے، البتہ سلام میں تاخیر ہو جانے کی وجہ سے گنہگار ہوگا۔

توضیح:- مسافر کے چھوڑے ہوئے روزوں کی قضاء واجب ہوتی ہے جبکہ نماز کی قصر کی دو رکعتوں کی قضاء نہیں ہوتی ہے، مسافر دو رکعتوں کے بعد بیٹھا جبکہ تنہا چار رکعتیں پڑھ لیں

بخلاف الصوم لانه يقضى وان صلى اربعا وقعد في الثانية قدر التشهد اجزته الاوليان عن الفرض......الخ

بخلاف روزہ کے کہ اس کی قضاء کی جاتی ہے، ف تو روزہ مسافر پر بھی فرض ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ نفل ہوتا تو اس کی قضاء نہ ہوتی ہے، اس طرح مسافر اور مقیم دونوں پر روزہ برابر فرض ہوتا ہے، صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ مسافر پر قضاء کرنے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں ہوتا ہے، اور مقیم پر بے عذر قضاء کرنے کی وجہ سے سخت گناہ ہوتا ہے، اس لئے مسافر کی نماز پر روزہ کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوتا ہے، م، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا ہے کہ سفر میں دو ہی رکعتیں فرض ہیں ان کے علاوہ صحیح نہیں ہیں، حسنؒ نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسافر قصداً چار رکعتیں پڑھ لے تو اعادہ ضروری ہے، امام اوزاعیؒ نے کہا ہے کہ اگر سہواً چار رکعتیں پڑھ لے تو سجدہ سہو کرے، ہمارا مذہب حضرت عمرو علی وابن مسعود و جابر و ابن عباس وابن عمرؓ کے مذہب کے موافق ہے۔

اور امام محی السنۃ بغوی شافعیؒ نے کہا ہے کہ اکثر علماء کا یہی قول ہے، خطابیؒ نے کہا ہے کہ قصر کرنا ہی بہتر ہے تاکہ اختلاف سے انسان بچ سکے، ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ دو ہی رکعتوں پر رسول اللہ ﷺ وابو بکر و عمرؓ نے عمل کیا ہے، لہٰذا اسی پر عمل ہے، یہی ایک روایت امام مالکؒ اور امام احمدؒ سے بھی ہے، قاضی اسمٰعیل مالکیؒ نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے، قرآن مجید کے نصوص میں سے یہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿لَاجُنَاحَ عَلَيكُم ان تَقصُرُوا مِنَ الصّلٰوةِ اِن خِفتُم﴾ الایۃ، اگر تم کو خوف ہو اور اس وجہ سے نماز سے قصر کرو تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے الخ، اس آیت سے یہ اطمینان دیا گیا ہے کہ قصر کرو اور گناہ مت سمجھو، جیسے صفا و مروہ کے

درمیان سعی میں لوگ گناہ سمجھتے تھے، اسی لئے اللہ تعالے نے فرمایا ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا﴾، حالانکہ یہ سعی واجب ہے، نیز آیت میں قصر سے مراد حتی الامکان ارکان نماز میں کفایت کرنا ہے، جیسے اس فرمان باری تعالی میں ہے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾، یعنی خوف کی حالت میں سوار و پیادہ جیسے ممکن ہو پڑھو، اسی طرح لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ میں بھی قولہ اِنْ خِفْتُمْ سے خوف کی حالت میں یہ بات جائز ہوئی کہ نماز کے قیام ور کوع و سجود میں کمی کریں، مثلاً بیٹھ جائیں یا سوار ہو کر پڑھیں یا اشارہ سے پڑھیں یا چلتے ہوئے پڑھیں جبکہ متواتر نہ ہو، اس میں اختلاف کے ساتھ، اور احادیث کی نصوص میں سے ایک حدیث ام المؤمنین عائشہؓ سے ہے کہ نماز پہلے دو ہی رکعتیں فرض ہوئیں، اور سفر میں وہ اس طرح رہیں، مگر حضر میں چار پڑھیں، اس کی روایت بخاریؒ اور مسلمؒ نے کی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ شب معراج میں پنجوقتی فرض سوائے مغرب کے دو ہی رکعتیں فرض ہوئیں، جیسا کہ فتح الباری وغیرہ میں ہے۔

دوسری حدیث حضرت ابن عباسؓ کی ہے کہ اللہ تعالی نے تمہارے پیغمبر ﷺ کی زبان پر حضر کی حالت میں چار رکعتیں، سفر میں دو رکعتیں اور خوف میں ایک رکعت نماز فرض فرمائی ہے، طبرانی نے بھی اس کی روایت کی ہے، تیسری حدیث حضرت عمرؓ کی ہے، جس میں ہے کہ نماز سفر، نماز عید وبقر عید و جمعہ سب دو دو رکعتیں ہیں، یہ نمازیں پوری ہیں قصر نہیں ہیں، جو رسول اللہ ﷺ کی زبان سے مروی ہے، اس کی روایت نسائیؒ، ابن ماجہؒ اور ابن حبانؒ نے کی ہے، چوتھی حدیث حضرت ابن عمرؓ سے ہے کہ جس میں تصریح کے ساتھ کہا ہے کہ ہمیں حکم کیا گیا ہے کہ ہم سفر میں دو رکعتیں پڑھیں، نسائیؒ نے اس کی روایت کی ہے، پانچویں حدیث ابوہریرہؓ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ سفر میں پوری نماز پڑھنے والا ایسا ہے جیسے حضر میں قصر کرنے والا ہے، دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور یعلی بن امیہ کی حدیث میں حضرت عمرؓ کے واسطے سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا صدقہ ہے اسے قبول کرو، اس کی روایت مسلم اور سنن اربعہ نے کی ہے، اس میں قبول کا حکم واجب ہے، اور حجۃ الوداع کی مشہور حدیث میں ہے کہ دو رکعتیں پڑھا کر اعلان کروا دیا کہ اے اہل مکہ تم اپنی نمازیں پوری کر لو کہ ہم قوم سفر ہیں یعنی مسافر لوگ ہیں۔ مع، البتہ حضرت عائشہؓ سے منقول ہے کہ وہ خود سفر میں بھی چار رکعتیں پڑھتی تھیں، جیسے کہ حضرت عثمانؓ نے کہا تو عروہؒ نے فرمایا ہے کہ عائشہؓ نے عثمانؓ کی طرح تاویل کی ہے، اور بیہقیؒ اور دار قطنیؒ نے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی ہے کہ عروہؒ نے کہا ہے کہ اے خالہ جان اگر آپ قصر کریں، تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اے میری بہن کے پیارے بیٹے مجھے پوری نماز پڑھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ و عثمانؓ کے نزدیک قصر کرنا تکلیف و مشقت ہونے کی بناء پر تھا، اس لئے جس پر مشقت محسوس نہ ہو تو وہ پوری پڑھے، مفع، لیکن حضرت عثمانؓ سے یہ تاویل مشکل ہے، کیونکہ ابن عمرؓ نے کہا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھا تو آپ نے کبھی دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھیں، یہاں تک کہ آپ نے وفات پائی، اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ بھی سفر میں رہا تو آپؓ نے بھی کبھی زیادہ نہیں پڑھی تھیں یہاں تک کہ آپ نے وفات فرمائی اور حضرت عمرؓ کے بھی میں سفر میں ساتھ رہا تو انہوں نے بھی دو رکعتوں پر زیادتی نہیں فرمائی یہاں تک کہ انہوں نے بھی وفات فرمائی، پھر میں حضرت عثمانؓ کے ساتھ بھی رہا تو انہوں نے بھی زیادہ نہیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے بھی وفات پائی۔ اس کی روایت بخاری نے کی ہے، اس روایت میں حضرت عثمانؓ کے بارے میں صراحۃً وفات تک قصر کرنا مروی ہے، اور صحیح بات یہ ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت عثمانؓ نے صرف حج میں پوری رکعتیں پڑھی تھیں، چنانچہ ابتدائی خلافت کے زمانہ ایک مرتبہ منیٰ میں پوری نماز پڑھی اس پر صحابہ نے انکار فرمایا تو حضرت عثمانؓ نے فرمایا کہ میں نے یہاں آ کر ایک گھر بسا لیا ہے شادی کر لی ہے، اور میں رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر کوئی کسی شہر میں تاہل کرے تو وہ مقیم کی طرح نماز پڑھے، جیسا کہ اسکی روایت احمدؒ نے کی ہے۔

وان صلی اربعا وقعد فی الثانیۃ قدر التشہد اجزتہ الاولیان عن الفرض......الخ

۱۰، اگر مسافر نے چار رکعتیں پڑھ لیں، ف اور مقیم امام کی اقتداء نہ کی ہو، یا سلام سے پہلے اس نے اقامت کی نیت نہ کئے بغیر

چار رکعتیں پڑھ لی ہوں، وقعد الخ اور دو رکعت کے بعد مقدار تشہد بیٹھ چکا ہو۔ اجزته الخ تو پہلی دو رکعتیں اس کے لئے فرض ہو جائینگی، والاخریان الخ اور پچھلی دو رکعتیں اس کے لئے نفل بن جائیں گی، فجر پر قیاس کرتے ہوئے، ف کہ جب فجر کی چار رکعتیں پڑھیں اور درمیان میں قعدہ کر لیا تو پہلی دو رکعتیں فرض کے طور پر اور آخری دو رکعتیں اس کے لئے نفل کے طور پر ہو جائینگی اور نماز صحیح ہو جائیگی۔

ویصیر مسیئا لتاخیر السلام......الخ

البتہ فرض کا سلام پھیرنے میں تاخیر کرنے کی وجہ سے گناہ کرنے والا ہوگا، ف جب کہ اس نے قصداً ایسا کیا ہو، لہذا اسے قصداً ایسا کرنا حلال نہیں ہے، اور اگر اس نے ایسا سہواً کیا تو آخر میں سجدۂ سہو کر لے، اور برائی باقی نہ رہی، واضح ہو کہ فجر میں قصداً چار رکعتیں پڑھنی نیت کا ایک گناہ ہے اور فتور ہے، اس کے باوجود اس کی نیت لغو قرار دی جائیگی، اور قیاساً نماز فاسد ہونی چاہیے، اور اگر اس نے فرض کے دو رکعتیں پڑھ کر سمجھ کر عمداً دو رکعتیں اور بھی بڑھا لیں تو سلام کی تاخیر سے اور فجر کے بعد قصداً نفل پڑھنے سے گنہگار ہوگا، جس کے لئے اسے توبہ کرنی چاہئے اور اگر ایسا سہواً کیا تو سہو کا سجدہ کرے اور گناہ نہ ہوگا، بس اس بناء پر مسافر کی چار رکعتیں پڑھنی، لیکن اس سے قصداً چار رکعتیں پڑھنی یقینی طور سے گناہ کا کام نہیں ہو سکتا، لیکن یہاں سلام کی تاخیر سے برائی ہوگی، جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے، گناہ نہ ہوگا جیسا کہ دوسروں نے کہا ہے، کہنے والوں نے یہ بات ذہن میں نہیں رکھی کہ فجر میں تو دو رکعتیں اجماعی فرض ہیں لیکن مسافر کی فرض دو رکعتیں اجتہادی اور اختلاف ہیں، یہاں تک کہ امام مالک وامام شافعی اور امام احمدؒ کے نزدیک چاروں رکعتیں ہی فرض واقع ہوں گی، لیکن ہمارے نزدیک ایسا نہیں ہے، بلکہ صرف دو ہی رکعتیں فرض ہوتی ہیں، اب جب کہ درمیان میں قعدہ کر لیا تو فرض پورا ہو گیا۔ م۔

وان لم یقعد فی الثانیة قدرها بطلت لاختلاط النافلة بها قبل اکمال ارکانها واذا فارق المسافر بیوت المصر صلی رکعتین، لان الاقامة تتعلق بدخولها فیتعلق السفر بالخروج عنها وفیه الاثر عن علیؓ لو جاوزنا هذا الخص لقصرنا.

ترجمہ:- اور اگر دوسری رکعت میں مقدار تشہد نہیں بیٹھا تو اس کی نماز باطل ہو جائیگی، فرض کے ارکان کو مکمل کرنے سے پہلے اس میں نفل نماز کو ملا دینے کی وجہ سے، اور جب مسافر اپنے شہر کے گھروں سے دور ہو گیا تو وہ دو رکعتیں پڑھنی شروع کر دے، اس لئے کہ اقامت کا حکم اس علاقہ میں داخل ہونے سے شروع ہو جاتا ہے لہذا وہاں سے نکلنے سے ہی سفر کے احکام شروع ہو جائینگے، اور اس بارے میں حضرت علیؓ یہ اثر بھی موجود ہے کہ اگر میں اس خص سے آگے بڑھ جاؤں گا تو قصر کروں گا۔

توضیح:- مسافر نے چار رکعتیں پوری پڑھ لی، اور قعدہ اولی میں نہیں بیٹھا، مترجم کی توضیح، چار رکعت نماز میں مسافر کا فرض، مغرب میں قصر کیا، اور عشاء پڑھی، سنتوں میں قصر، نماز کے واسطے وقت محض قصد، سفر بلا نیت، نیت اقامت، ریل پر سفر، مقام شروع قصر، دلیل، حکم سفر کی مدت، اعتبار نیت اقامت

وان لم یقعد فی الثانیة قدرها بطلت لاختلاط النافلة بها قبل اکمال ارکانها......الخ

اگر مسافر دو رکعت پر مقدار تشہد نہیں بیٹھا، ف یا اس نے پہلی دونوں میں کسی میں قراءت چھوڑ دی ہو تو نماز باطل ہو جائیگی، لاختلاط الخ فرض نماز کے ارکان مکمل کرنے سے پہلے اس میں نفل نماز کے مل جانے کی وجہ سے، ف کیونکہ قعدہ اخیرہ ایک رکن فرض ہے، معلوم ہونا چاہئے کہ چار رکعت نماز میں مسافر کا فرض صرف دو رکعتیں ہوتی ہیں، لیکن فجر اور مغرب میں مسافر اور مقیم دونوں برابر ہوتے ہیں، چنانچہ اگر کسی مسافر نے مغرب میں بھی قصر کر لیا، پھر اس نے عشاء پڑھی اور وہ

صاحب ترتیب بھی ہے تو عشاء کی نماز بھی اس کی فاسد ہو گی مگر موقوف رہے گی، اور نہ جاننے کا عذر اس جگہ مقبول نہیں ہے، م، سنتوں میں قصر نہیں ہے، محیط السرخسی، اور قول مختار یہ ہے کہ چلتی ہوئی حالت میں اور خوف کی حالت میں نہ پڑھے بلکہ امن کی حالت میں منزل پر پڑھے، الوجیز، اسی قول کی طرف ابن الہمامؒ کا رجحان ہے، اور یہی قول احسن ہے، م، واضح ہو کہ انسان صرف سفر کے ارادہ سے ہی مسافر نہیں ہو جاتا ہے یہاں تک کہ تین منزل کا ارادہ کرے، اور جب اس کا مسافر بننا ہو گیا تو پھر کسی جگہ پر بھی اقامت کی نیت کر لینے سے مقیم ہو جاتا ہے، اور اگر اپنے وطن میں آگیا تو بغیر نیت کے بھی مقیم ہو جائے گا۔

اور اگر مسافر نے نکلتے وقت تین منزل کا ارادہ نہ کیا ہو تو اسے کبھی بھی مسافروں کی سہولت حاصل نہ ہو گی، اور وہ آہستہ آہستہ ہزاروں کوس کا سفر طے کرے، مثلاً کوئی شخص اپنے بھاگے ہوئے غلام یا قرض دار کو تلاش کرتے ہوئے گھر سے نکلا اور وہ آہستہ آہستہ بہت دور بھی نکل گیا لیکن اس نے کبھی بھی لمبے سفر یا تین منزل پر جا کر تلاش کرنے کا ارادہ نہیں کیا تو اسے شرعی مسافر نہیں کہا جائے گا، پھر جس نے تین منزل کا قصد کیا وہ اسی وقت سے قصر کرنا شروع کر دے گا، اگر چہ اسے یہ نہیں معلوم ہو کہ کہاں جانا ہے، اس سلسلہ میں ارادہ کی پختگی کی شرط نہیں ہے بلکہ گمان غالب ہونا ہی کافی ہے، اگر اس نے تین منزل سے پہلے سفر کا ارادہ فسخ کر دیا اور لوٹ آیا تو وہ اب مقیم ہو گیا لہٰذا پوری چار رکعتیں پڑھے گا، قصر نہیں کرے گا، پھر سفر کا ارادہ کرنے کے لئے لیاقت اور صلاحیت کا ہونا بھی ضروری ہے یہاں تک کہ اگر ایک نابالغ اور ایک نصرانی دونوں سفر کو نکلے اور دونوں کے بعد نابالغ بالغ ہو گیا یعنی اس کی عمر پوری ہو گئی، اور وہ نصرانی مسلمان ہو گیا تو یہ نابالغ اب پوری نماز پڑھے گا، کیونکہ ارادہ کرنے کی صلاحیت اس میں ابھی ہوئی ہے لیکن سفر کی تین منزلوں میں سے اب صرف ایک ہی منزل باقی ہے، اور نصرانی جو ابھی مسلمان ہو گیا ہے یہ قصر کرے گا کیونکہ ابتدائی سفر میں ہی وہ نیت کرنے کا اہل تھا، ھ، فع۔

ریل پر جو لوگ سفر کرتے ہیں جو وہ منزل پیدل جانے میں تین منزل فاصلے سے ہو تو اس راہ میں قصر کرنا ہو گا، اگر چہ وہ اس فاصلہ کو وہ دو ہی گھنٹہ میں طے کر لے، یہی مذہب ہے، اور اسی پر فتوی ہے۔ م۔ پھر جب غالب گمان میں تین منزل یا زیادہ ارادہ کر کے نکلا یہاں تک کہ مسافر ہو گیا تو وہ اب کس جگہ سے قصر کرنا شروع کرے اس کا بیان شروع کیا جا رہا ہے۔

واذا فارق المسافر بیوت المصر صلی رکعتین، لان الاقامۃ تتعلق بدخولھا......الخ

جب مسافر نے گھر سے نکل کر شہر کے گھروں کو چھوڑا تو وہاں سے دو رکعتیں پڑھے، ف یعنی جوں ہی شہر کی آبادی پیٹھ کی طرف ہوئی اور اس جگہ کسی وقتی فرض نماز کا وقت آگیا تو اب قصر کرے اور دو ہی رکعتیں اس پر اس سے کچھ زیادہ چھوٹی بستیاں ہو تو ان سے بھی گذر جانا شرط ہے، اس کے برخلاف اگر فنائے شہر کے قریب گاؤں ہوں تو قصر کرنے کے لئے ان سے گذرنا شرط نہیں ہے، الحیط، ھ، چراگاہ بھی شہر کے حصہ میں شمار کی جاتی ہے، ف خلاصہ یہ ہوا کہ فناء شہر تو اس حد تک ہے جہاں شہر کے متعلق ضروریات ہو مثلاً چراگاہ، گھوڑ دوڑ کی جگہ وغیرہ، بس چراگاہ کی آبادی سے بڑھ جانا شرط ہے، اور فنائے شہر سے گذر جانا شرط نہیں ہے، م، اسی طرح سفر سے کوئی واپس ہو تو آبادی کے حد میں داخل ہو جانے کے بعد سے ہی پوری چار رکعتیں پڑھنی ہو گی، التبیین، اگر کوئی زمانہ میں کسی محلہ شہر کے قریب تھا اب وہ الگ ہو گیا ہو تو اس سے گذر جانے کے بعد قصر کرے، الخلاصہ۔

لان الاقامۃ تتعلق بدخولھا فیتعلق السفر بالخروج عنھا وفیہ الاثر عن علیؓ لو جاوزنا ھذا الخص......الخ

وجہ یہ ہے کہ اقامت کا حکم تو ان گھروں یعنی شہر کے آبادی کے اندر داخل ہونے پر متعلق ہوتا ہے، **فتعلق الخ** تو سفر کا حکم ان گھروں سے باہر چلے جانے سے ہی متعلق ہو گا، ف لہٰذا آبادی سے باہر ہوتے ہی اس کی فرض نماز چار کے بجائے دو رکعتیں ہو جائینگی، **وفیہ الاثر الخ** اور اس باب میں حضرت علیؓ سے ایک قوی اثر بھی ہے، یعنی ایک فرمان منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر ہم اس خص سے آگے بڑھ جائیں تو قصر کرینگے، ف حالانکہ آپ بصرہ سفر کے ارادہ ہی سے نکلے تھے، اور آبادی سے باہر ہونے سے پہلے ظہر کی چار رکعتیں پڑھ لیں، اور وہ بات فرمائی جو مصنفؒ نے ذکر کی ہے اس اثر کو ابن ابی شیبہؒ نے عباد بن

العوام سے اور عبد الرزاقؒ نے سفیان ثوریؒ سے پھر عباد اور سفیان دونوں نے داؤد بن ابی ہند سے اور انہوں نے ابو الحرب ابن ابی الاسود الدیلی سے روایت کی ہے کہ حضرت علیؓ بصرہ سے نکلے آخر تک۔ مع۔ یہ اسناد جید ہے خص۔ نرکل کا جھونپڑا۔ خاء منقوطہ اور صاد مہملہ کے ساتھ۔ م۔

اس باب میں حضرت انسؓ کی حدیث کافی ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کے نماز مدینہ میں چار رکعتیں پڑھیں اور ذوالحلیفہ میں عصر کی دو رکعتیں پڑھیں بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ ع۔ اگر یہ کہا جائے کہ شہر کی آبادی سے باہر ہوتے ہی فنائے شہر شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ قول مختار کے مطابق فنائے شہر غلوہ (وہ فاصلہ جہاں تک نیزہ پھینکنے سے جا سکے) تک ہوتا ہے، اور فنائے شہر بھی شرعاً شہر سے ملا ہوا ہوتا ہے یہاں تک کہ وہاں عیدین اور جمعہ کی نمازیں ادا کرنی جائز ہے حاصل کلام یہ ہے کہ فنائے شہر سے گذرنے سے پہلے نماز کو قصر کر کے پڑھنا جائز نہ ہونا چاہئے، جواب یہ دیا گیا ہے کہ فنائے شہر کو شہر کے حکم میں رکھنا شہر کے باشندوں کی ضرورت کی بناء پر ہوتا ہے، مطلقاً نہیں، اور قاضیخان میں کہا گیا ہے کہ اگر شہر اور فنائے شہر کے درمیان ایک غلہ سے کم فاصلہ ہو، اور درمیان میں کوئی کھیت نہ ہو تو اس فناء سے آگے بڑھ جانا ہی معتبر ہے، ورنہ صرف شہر کی آبادی سے ہی بڑھنا معتبر ہے۔ فع۔

ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة اوقریة خمسة عشریوما او اکثر وان نوی اقل من ذلك قصر لانه لابدمن اعتبار مدة لان السفر یجامعه اللبث فقدرناها بمدة الطهر لانهما مدتان موجبتان وهوماثورعن ابن عباس وابن عمرؓ والاثر فی مثله کالخبر والتقیید بالبلدة والقریة یشیر الی انه لاتصح نیة الاقامة فی المفازة وهو الظاهر.

ترجمہ:- اور مسافر برابر سفر کے حکم پر باقی رہے گا یہاں تک کہ وہ کسی شہر یا دیہات میں پندرہ یا اس سے زیادہ دن تک رہنے کی نیت کرلے، اور اگر ان سے کم کی نیت کی تو وہ قصر ہی کرے گا کیونکہ ٹھہرنے کے لئے کسی مدت کا اعتبار کرنا ضروری ہے، کیونکہ سفر کے ساتھ ٹھہراؤ بھی موجود ہوا کرتا ہے، اس لئے ہم اس مدت کے لئے مدت طہر کا اندازہ کیا، کیونکہ ان دونوں ہی مدتوں واجب کرنے والی ہیں، یہی بات حضرت ابن عباس اور ابن عمرؓ سے منقول ہے، اور ایسے مسائل میں اثر بھی خبر کے حکم میں ہوتا ہے، عبارت کو شہر اور دیہات کے ساتھ مقید کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اقامت کی نیت جنگل چٹیل میدان میں صحیح نہیں ہوتی ہے، اور یہی بات ظاہر الروایۃ ہے۔

توضیح:- اقامت کے واسطے معتبر مدت، اثر سے دلیل
جنگل و میدان میں اقامت کی نیت، نیت اقامت کی شرط

ولایزال علی حکم السفر حتی ینوی الاقامة فی بلدة اوقریة خمسة عشریوما او اکثر......الخ

سفر کے حکم پر باقی رہے گا، ف وہ شخص جو ایک مرتبہ مسافر ہو چکا ہے یا جسے مسافر قرار دیا جا چکا ہے **حتی ینوی الخ** یہاں تک کہ اقامت کی نیت کرلے، ف بشرطیکہ اسے نیت کرنے کی لیاقت بھی ہو اور جگہ بھی اس لائق ہو **فی بلدة الخ** مثلاً شہر یا گاؤں میں ہو، ف یعنی امن کی آبادی میں ٹھہرنے کا ارادہ کیا ہو، **بقدر الخ** پندرہ یا اس سے زیادہ دنوں کی نیت کی ہو، ف یہاں تک کہ پندرہ دنوں سے کم نہ ہو، بشرطیکہ مقدار سفر طے کر لینے کے بعد ہو، ف، ھ۔

وان نوی اقل من ذلك قصر لانه لابدمن اعتبار مدة لان السفر یجامعه اللبث......الخ

اور پندرہ دنوں سے کم ٹھہرنے کا ارادہ ہو تو قصر کرتا رہے، **لانه لابدالخ** یعنی نماز کے اتمام کے لئے یعنی پوری چار رکعتیں پڑھنے کے لئے کسی نہ کسی مقدار کو کسی جگہ پر بھی متعین کرنا ضرور ہوگا، ف ورنہ اپنی مرضی سے کسی بھی مقام پر خواہ کم ہو یا زیادہ

اقامت کر لینے سے نماز مکمل نہیں پڑھی جا سکتی ہے۔ **لان السفو الخ** کیونکہ سفر کے ساتھ اقامت بھی تو لازمی ہوتی ہے، ف اسی بناء پر سفر کرنے کے بعد منزل پر اتر کر دوسرے سفر شروع کرنے تک بقیہ اوقات ٹھہر کر اپنی ضروریات پوری کرنی ہوتی ہے، تو اگر تھوڑی اقامت پر بھی نماز پوری پڑھنی پڑھے تو اس منزل پر بھی پوری پڑھنی چاہئے حالانکہ بالاجماع مسافر اپنی کسی منزل پر بھی پوری نماز نہیں پڑھتا ہے بلکہ قصر ہی کرتا ہے، اس لئے یہ سوال ہوتا ہے کہ آخر وہ کون سی مقدار سفر ہے جہاں ٹھہر کر مسافر اپنی نماز پوری کرے، اس کی تحقیق میں احادیث و آثار صحابہ میں روایتیں بھی مختلف ہیں اس لئے اجتہاد کرنے کی ضرورت ہوئی۔

فقدرناها بمدة الطهر لانهما مدتان موجبتان......الخ

پس ہم نے اقامت کی مدت کو طہر کی مدت پر قیاس کیا، ف اور طہر کی کم از کم مدت کے پندرہ دن ہوتے ہیں، اور ان دونوں باتوں میں ایک قدر مشترک یعنی وجہ اتفاق بھی موجود ہے وہ یہ ہے **لانهما مدتان الخ** کہ یہ دونوں مدتیں واجب کرنے والی ہیں، ف چنانچہ ایام حیض جن میں نمازیں ساقط ہو گئی تھیں ان کے بعد ایام طہر آتے ہی ان نمازوں کو واجب کر دیتے ہیں اسی طرح اقامت بھی اس مسافر پر نماز کی اس مقدار کو واجب کر دیتی ہے جو سفر میں ساقط تھی، اور طہر کو ختم کرنے والی چیز یعنی حیض کی بھی کم از کم مدت تین دن ہوتی ہے اور اقامت کو بھی ختم کرنے والی چیز یعنی سفر کے لئے بھی کم سے کم مدت تین منزل ہے (یا تین دن ہے) اس طرح ہم نے ان دونوں کو ساقط کرنے والی مدت میں متفق پایا اور دونوں کے موجب بھی برابر یعنی پندرہ دن ہی پائے اسی لئے ان ہی پندرہ دنوں کا ہم نے فیصلہ کیا۔ مع۔

وهو ماثور عن ابن عباس وابن عمرؓ والاثر فی مثله كالخبر......الخ

اور یہی مقدار حضرات ابن عمر اور ابن عباسؓ کے قول سے مروی ہے، ف طحاوی نے دونوں کی روایت کی ہے، ف اور ابن عمرؓ کے اثر کو امام ابن ابی شیبہ اور امام احمدؒ نے روایت کیا ہے، مع، چونکہ ان مقداروں کی تعیین عقلاً نہیں کی جاتی ہے بلکہ شرعاً اور سن کر کی جاتی ہے، **والاثر فی مثله الخ** اس لئے صحابی کا قول ایسے معاملات میں رسول اللہ ﷺ کے قول کے مثل سمجھا جاتا ہے، ف کیونکہ یہ بات ہمیں یقینی طور سے معلوم ہے کہ صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے سن کر یہ مدت بیان کی ہے، پھر اصل مسئلہ میں یہ قید لگائی ہے کہ یہ نیت کسی شہر یا گاؤں میں ہو۔

والتقييد بالبلدة والقرية يشير الى انه لاتصح نية الاقامة فی المفازة وهو الظاهر......الخ

اور شہر اور گاؤں کی قید لگانے سے اس بات کی طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ جنگل یا میدان یا غیر آباد علاقہ میں اقامت کی نیت صحیح نہیں ہے، اور یہی ظاہر الروایۃ ہے، ف اور ظاہر الروایۃ میں ہے کہ اقامت کی نیت صرف اپنے مقام میں صحیح ہوتی ہے، اور اپنا مکان مٹی یا پتھر کے گھروں میں ہوتا ہے، خیمے اور بالوں اور کمبلوں کے مکانوں میں نہیں ہے، القاضی خان، پھر یہ اقامت کی جگہوں کے لئے ہے جہاں نیت کی ضرورت ہوتی ہے، ورنہ وطن میں داخل ہوتے ہی اقامت کی نیت کے بغیر ہی از خود مسافر مقیم ہو جاتا ہے، اقامت کی نیت کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ تین روز کے سفر کے بعد ہو کیونکہ اگر تین دن نہیں چلا اور واپسی یا ترک سفر کا ارادہ کر لیا ہو تو وہ مسافر باقی نہ رہا اس لئے اب پوری نماز پڑھے، اگرچہ وہ میدان یا جنگل میں ہو، جیسا کہ فخر الاسلام نے ذکر کیا ہے، ع۔

گذشتہ عبارت سے بہتر یہ ہے کہ جس شخص کو مسافر کا حکم ہو گیا وہ اس وقت تک مسافر رہے گا مدت سفر پوری کرنے سے پہلے وطن لوٹ آنے کا ارادہ کر لے، اگرچہ اس وقت جنگل میں ہو یا مدت سفر پوری کر کے اپنے وطن میں آ جائے، یا مدت سفر پوری ہونے کے بعد وہ دوسرے مقام میں داخل ہو کر تنہا اس مقام میں پندرہ دن یا زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرے بشرطیکہ وہ مقام دار الحرب کا نہ ہو، اور خود وہ شخص لشکر کے ماتحت نہ ہو، اور کسی کے تابع ہو، مثلاً کسی کا غلام یا کسی بیوی کی نہ ہو، اور نہ اس کی نیت

میں کوئی تردد ہو۔م۔واضح ہو کہ اقامت کی نیت مفید اور کار آمد ہونے کے لئے بھی پانچ شرطیں (۱) سفر چھوڑدے کیونکہ اگر چلتا رہا اور اقامت کی نیت بھی کی تو یہ نیت صحیح نہ ہوگی (۲) وہ جگہ اقامت کے لائق ہو کیونکہ اگر جنگل، میدان، صحراء، سمندر، ویران جزیرے میں اقامت کی نیت کی تو بھی صحیح نہ ہوگی (۳) ایک ہی جگہ میں پندرہ دن رہنے کی نیت ہونی چاہئے، کیونکہ اگر دو جگہ ملاکر پندرہ دن کی نیت ہو تو اقامت کی نیت درست نہ ہوگی اس لئے قصر کرنی ہوگی (۴) مدت کے پورے پندرہ دن رات ہونے چاہئے، اس سے کچھ بھی کم ہونے سے نیت معتبر نہ ہوگی (۵) رائے مستقل ہونی چاہئے یعنی ذرہ برابر اس میں تردد نہ ہو، المعراج، ھ، خیمے تو بوجھ ہوتے ہیں مستقل رہنے کے مکان نہیں ہوتے اس طرح صرف میدان میں اقامت کی نیت صحیح نہیں ہوسکتی، جیسا کہ محیط میں ہے، ہر وہ شخص جو کسی دوسرے کا اتنا تابع ہو کہ دوسرے کی بات ماننے پر مجبور ہو اور اس کے تابع ہو تو اس کی اقامت کی نیت سے سب مقیم اور اس کی مسافرت کی نیت سے سب مسافر ہوجائینگے اگر انہیں اپنے ساتھ لے آیا ہو، محیط السرخسی، پس جب کہ لشکر کے سردار نے اقامت کی نیت کرلی اس کے ماننے والے جتنے میدان میں ہیں سب مقیم ہوجائینگے، الکافی۔

اور اصل بات اور قاعدہ یہ ہے جو شخص اپنے اختیارات سے اقامت کرسکتا ہے وہ اپنی ہی نیت سے مقیم ہوگا، اور جو اقامت کرنے میں مستقل اور مختار نہیں ہے وہ اپنی نیت سے مقیم بھی نہ ہوگا، جیسے کہ مدخولہ ہمبستر بیوی، یا نقد مہر پائی ہوئی بیوی اپنے شوہر کے تابع اور غلام اپنے آقا کے اور شاگرد اپنے استاد کے مزدور اجرت پانے والا شخص اپنے مالک کے اور تنخواہ پانے والا سپاہی اپنے سردار لشکر کے اختیار میں ہوتے ہیں، اور ظاہر الروایۃ کے مطابق یہ لوگ اپنی نیت سے مقیم نہیں ہوسکتے ہیں، ایسا شخص جو مقروض ہونے کی وجہ سے جیل خانہ میں بند ہو یا اس کے ساتھ ساتھ اس کا قرض خواہ مسلسل رہتا ہو تو ایسی صورتوں میں اس قرض خواہ کی نیت کا اعتبار ہوگا اس شرط کے ساتھ کہ قرض دار واقعۃً مفلس و محتاج ہو، یا ادا نہ کرنے کی اس نے ضد باندھ لی ہو، کیونکہ اگر وہ ادائیگی پر قدرت رکھتا ہو تو خود اسی کی نیت اقامت وسفر کا اعتبار ہوگا، اور اگر تابع کو اپنے متبوع سردار کی نیت اقامت کی واقفیت نہ ہو تو قول اصح یہ ہے کہ مقیم کا حکم اس پر لازم نہ ہوگا، جس طرح بھی وہ نماز پڑھ لے اس کے اعادہ کی ضرورت نہ ہوگی، اگر کوئی تاجر کسی ضرورت سے کسی شہر میں داخل ہوا اور وہاں اس ضرورت کے پورا کرنے کیلئے پندرہ دن ٹھہرنے کی نیت کی تو وہ مقیم نہ ہوگا، کیونکہ یہ نیت پختہ نہیں ہے بلکہ دو باتوں پر موقوف ہے (۱) ضرورت پوری ہو کہ وہ ٹوٹ جائے (۲) ورنہ وہ ٹھہرا رہے، ھ۔

اس نیت کی تفصیل اس طرح ہوگی کہ ضرورت پوری کرنے تک پندرہ دن ٹھہروں گا اور اگر اس کے درمیان ہی میں کام پورا ہوگیا تو چلا جاؤں گا، اس لئے یہ نیت تردد والی ہوئی، اور اگر پندرہ دنوں کی نیت تو یقینی ہے اور اگر کام نہ ہوا تو مزید اور ٹھہروں گا اس طرح نیت صحیح ہوگی، م، اگر کوئی دار الحرب میں امان لے کر گیا اور اقامت کی جگہ میں اقامت کی نیت کی تو صحیح ہوگی، الخلاصہ، اگر کوئی قیدی جیل سے بھاگ گیا اور کسی غار میں پندرہ دن چھپے رہنے کی نیت کرلی تو نیت معتبر نہ ہوگی، الخلاصہ، اگر کشتی یا جہاز میں اقامت کی نیت کی تو نیت صحیح نہ ہوگی، اور یہی حکم کشتی کے مالک اور ملاح کا بھی ہے، البتہ اگر کشتی ان کے وطن کے قریب ہو تو اپنی اصلی اقامت کی بناء پر مقیم ہوگا، المحیط، ھ، امام شافعیؒ کے نزدیک مدت اقامت چار دن ہیں حالانکہ حضرت انسؓ کی حدیث جو صحاح ستہ میں ہے اس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ کے سفر میں دس دن قیام کے باوجود واپس ہونے تک برابر قصر کی دو رکعتیں ہی پڑھنے کی روایت ہے، اس جگہ سفر سے حجۃ الوداع کا سفر مراد ہے، کیونکہ فتح مکہ کے زمانہ میں تو ۱۹ دنوں کا قیام تھا، پھر بھی قصر فرماتے رہے، جیسا کہ بخاریؒ نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے، ملخص الفتح۔

ولو دخل مصرا علی عزم ان یخرج غدا او بعد غد ولم ینو مدة الاقامة حتی بقی علی ذلك سنین قصر لان ابن عمرؓ اقام باذر بیجان ستة اشهر وكان یقصر وعن جماعة من الصحابةؓ مثل ذلك واذا دخل العسكر ارض الحرب فنووا الا قامة بها قصروا وكذا اذا حاصروا فیها مدینة او حصنا لان الداخل بین ان یهزم فیفر وبین ان

یهزم فیقر فلم تکن دار اقامة.

ترجمہ:-اور اگر مسافر کسی شہر میں اس ارادہ سے داخل ہوا کہ کل یا پرسوں ہی یہاں سے واپس چلا جاؤں گا اور پوری مدت اقامت کی اس نے نیت نہیں کی، اگر اسی طرح نیت کرتے ہوئے وہاں دو برس بھی رہ گیا تو بھی وہ قصر نماز ہی پڑھتا رہے گا، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ نے آذربیجان میں چھ ماہ تک مسلسل اقامت کی تھی پھر بھی قصر فرماتے رہے، اور صحابہ کرامؓ کے بہت سے لوگوں سے بھی اسی طرح کی روایت مذکور ہے، اور جب مسلمانوں کا لشکر دار الحرب میں داخل ہو گیا، اور وہاں قصر کی نیت کر لی اسی طرح جب کہ دار الحرب کا کسی شہر کا یا کسی قلعہ کا محاصرہ کر لیا ہو، کیونکہ ان حالات میں یہ بے یقینی ہے کہ اگر خود شکست کھائے تو بھاگ کھڑے ہوں اور اگر دشمنوں کو شکست دیدیں تو مزید کچھ دن ٹھہر جائیں، اس بناء پر یہ اقامہ اور ٹھہراؤ کا علاقہ نہ ہوا۔

توضیح:-اگر کوئی شخص کسی شہر میں نیت اقامت کے بغیر برسوں رہ گیا صحابہ کرامؓ کے فعل سے دلیل، لشکر اسلام دار الکفر میں اقامت کی نیت کے ساتھ

ولو دخل مصرا علی عزم ان یخرج غدا او بعد غد ولم ینو مدة الاقامة حتی بقی علی ذلك......الخ

ترجمہ سے مطلب ظاہر ہے، ف اس جگہ مصنفؒ نے جو عزم کا لفظ بیان کیا ہے اس سے مومن کا واقعی سچا حال ذکر کر دیا ہے، کیونکہ جب اس کا مکمل عزم کل پرسوں جانے کا ہو گا تب ہی وہ قصر کے حکم میں رہے گا، ورنہ مسئلہ کی اصل بنیاد تو صرف اس بات پر ہے کہ اس کی نیت مدت اقامت میں پختہ نہیں ہے، اور یہ بہانہ بازی اور حیلہ گری کے طور پر نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں اس کا ارادہ آج اور کل کا ہی ہے، م، ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ تمام علماء نے اس بات پر اجماع کیا کہ مسافر ایسی صورت میں برابر قصر کرتا رہے گا یہاں تک کہ وہ اس بات پر فیصلہ کر لے کہ مجھے ٹھہرنا ہی ہے، اس طرح خواہ جتنے برس بھی گذر جائیں، ابن المنذرؒ نے اسی جیسی باتیں کہی ہیں، مع.

لان ابن عمرؓ اقام باذربیجان ستة اشهر وکان یقصر ......الخ

کیونکہ ابن عمرؓ نے آذربیجان میں متواتر چھ ماہ اقامت کی اور اتنے دنوں تک وہ قصر ہی کرتے رہے، ف اس کی روایت عبد الرزاق اور بیہقیؒ نے صحیح اسناد سے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ہم پر برف گرنی شروع ہوئی اس وقت ہماری ایک جماعت آذربیجان میں رکے اور پھنسے ہوئے مسلسل چھ ماہ تک قصر کے ساتھ نماز پڑھتے رہے، اس بیان میں اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت ابن عمرؓ نے تنہا قصر کی نماز نہیں پڑھی بلکہ ان کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت بھی تھی، عبد الرزاقؒ نے حسنؒ بصری سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ حضرت عبد الرحمٰن بن ہمرہؓ کے ساتھ ملک فارس کے کئی شہروں میں کئی سال تھے تو وہاں عبد الرحمٰنؓ جمعہ کی نماز نہیں پڑھتے تھے، اور دو رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھتے تھے، حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کی ہے کہ ملک شام میں دو ماہ تک عبد الملک بن مروان کے ساتھ رہے اور صرف دو ہی رکعتیں پڑھتے رہے، ف، ع۔

وعن جماعة من الصحابةؓ مثل ذلك ......الخ

حضرت عمرؓ کے مثل ہی صحابہ کی ایک جماعت سے مروی ہے، ف اسی وجہ سے امام مسلمؒ نے صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے نو مہینوں تک قصر کرنے کی روایت کی ہے، بیہقیؒ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے پچاس دنوں تک اقامت میں نماز میں قصر اور ماہ رمضان کے روزوں میں افطار کرنے کی روایت کی ہے، یہی فتوی ابن عباسؓ کا ابن ابی شیبہ وغیرہ میں موجود ہے، مع، خلاصہ یہ ہوا کہ بہت زیادہ روایتیں ایسی موجود جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ امام شافعیؒ کے شاگرد امام مزنیؒ نے بھی امام شافعیؒ کے قول کو چھوڑ کر عام علماء کی موافقت کی ہے، م، ع۔

واذا دخل العکسر ارض الحرب فنووا الاقامة بها قصروا وکذا اذا حاصروا فیها مدینة......الخ

اور جب مسلمانوں کا لشکر کفار کے ملک میں داخل ہو کر اقامت کی نیت کرلے جب بھی نماز میں قصر کرے، ف یہی قول امام مالک واحمدؒ کا ہے، ع، وکذا اذا الخ اسی طرح جب دار الحرب میں جاکر وہاں کسی شہر یا کسی قلعہ کا محاصرہ کرلیا ہو، ف تو بھی اقامت کی نیت صحیح نہ ہوگی اس لئے نماز میں قصر کرنی ہوگی۔

لان الداخل بین ان یھزم فیفروبین ان یھزم فیقر فلم تکن دار اقامۃ......الخ

کیونکہ داخل ہونے والا لشکر ف دو حال سے خالی نہ ہوگا، کہ شکست پاجائے یا بھاگ کھڑا ہو، ف ٹھہر نہ سکے، یا دشمنوں کو شکست دے تو وہیں ٹھہر جائے، ف اس تردد کی حالت میں اقامت کی نیت درست نہیں ہوسکتی ہے، فلم تکن الخ اسلئے وہ مقام اقامت کا نہ ہوا، ف لہٰذا وہاں صرف نیت کافی نہ ہوگی، جیسے دار السلام میں جنگل جاکر اقامت کی نیت صحیح نہیں ہوتی ہے، بلکہ نیت یقینی نہیں ہوتی ہے، کیونکہ وہ تو دل میں یہ ارادہ کئے بیٹھے ہیں کہ پندرہ دنوں کے اندر شکست کا منہ دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوں گے، اس بات کو نیت میں تردد کہا جاتا ہے، اسی بناء پر فقہاء نے کہا ہے کہ جو شخص کسی علاقہ میں کسی خاص مقصد کے ساتھ گیا اور اس کے علاوہ اس کی دوسری کوئی غرض نہ ہو تو اگرچہ پندرہ دنوں کے رہنے کی نیت کی ہو تو وہ قصر ہی کرے گا اور اتمام نہیں کرے گا، اور جو قیدی کہ کافروں کے پنجہ سے نکل بھاگا ہو اور کسی غار وغیرہ میں پندرہ دن چھپے رہنے کی نیت کی ہو پھر بھی وہ قصر کرے گا اتمام نہیں کرے گا، الفتح، اور اگر دار الحرب میں لشکر نے کوئی شہر فتح کیا اور اسے اپنا مستقل رہائشی علاقہ بنالیا ہو تو وہ پوری رکعتیں نماز کی پڑھے گا، اور اگر صرف ایک ڈیڑھ مہینہ رہنے کی نیت کی ہو تو وہ قصر کرے گا، التجنیس، ھ۔

وکذا اذا حاصروا اھل البغی فی دارالاسلام فی غیر مصر اوحاصر وھم فی البحر لان حالھم مبطل عزیمتھم وعند زفرؒ یصح فی الوجھین اذا کانت الشوکۃ لھم للتمکن من القرار ظاھر اوعند ابی یوسفؒ یصح اذا کانوا فی بیوت المدر لانہ موضع اقامۃ ونیۃ الاقامۃ من اھل الکلاء وھم اھل الاخبیۃ قیل لاتصح والاصح انھم مقیمون یروی ذلک عن ابی یوسفؒ لان الاقامۃ اصل فلا تبطل بالانتقال من مرعی الی مرعی.

ترجمہ:- ایسا ہی جب کہ اسلامی لشکر نے دار الاسلام میں شہر کے علاوہ کسی اور جگہ باغیوں کا محاصرہ کرلیا ہو، یا دریا میں ان کا محاصرہ کیا ہو، کیونکہ ان کی حالت ان کے ارادہ کی پختگی کو باطل کررہی ہے، لیکن امام زفرؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں ان کی نیت صحیح ہوگی، بشرطیکہ شوکت اور قوت لشکر اہل اسلام کو حاصل ہو، کیونکہ بظاہر لشکر ٹھہرنے کا موقع حاصل ہے، اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی صحیح ہے لیکن اس شرط کے ساتھ وہ مٹی کے گھروں میں ہوں، کیونکہ ایسے گھر بھی رہنے کے لائق ہوتے ہیں، اور اہل کلاء یعنی خیموں کے باشندوں کے اقامت کی نیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ صحیح نہیں ہوتی ہے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ یہ لوگ مقیم ہوتے ہیں امام ابو یوسفؒ سے اس طرح کی روایت کی جاتی ہے، کیونکہ انسان کے لئے اقامت اصل ہے لہٰذا ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ کی طرف منتقل ہونے سے باطل نہیں ہوتی ہے۔

توضیح:- اگر اسلامی لشکر نے دار الاسلام میں شہر سے باہر باغیوں کا محاصرہ کیا ہو

خانہ بدوش لوگوں کی نیت اقامت

وکذا اذا حاصروا اھل البغی فی دارالاسلام فی غیر مصر اوحاصر وھم فی البحر......الخ

مطلب واضح ہے، ف یعنی آبادی کے علاوہ جنگل اور پہاڑ وغیرہ جیسے کسی مقام میں باغیوں کا محاصرہ کیا ہو، اوحاصروھم الخ یا سمندر میں ان کا محاصرہ کیا، اور وہاں پندرہ دن اقامت کی نیت کی تو بھی قصر پڑھیں، الحاصل دار الکفر میں خود سر عربی کافروں کا محاصرہ خواہ شہر میں ہو یا جنگل میں، اور دار الاسلام میں باغیوں کا محاصرہ جو شہر کے باہر ہو یا سمندر میں ہو دونوں صورتوں میں نیت اقامت صحیح نہیں ہے۔ م۔

لان حالھم مبطل عزیمتھم......الخ

کیونکہ ان کے ظاہری حالات ان کے ارادہ کی پختگی کو باطل کرتے ہیں، ف کیونکہ ان کا ارادہ تو یہ ہے کہ ان دشمنوں کو مغلوب کرنا ہے مگر اس کے برعکس ہونا بھی تو ممکن ہے، کیونکہ شکست کھانے کی صورت میں تو مجبوراً ہٹنا پڑے گا، اس طرح خود ان کی حالت ایسی ہے کہ اس سے ان کے ارادہ میں پختگی معلوم نہیں ہوتی ہے۔ مع۔ اس دلیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر باغیوں کو خود ان کے شہر میں بھی گھیر لیں تو بھی اقامت کی نیت صحیح نہیں ہوگی، العنایہ، یہ قید تو متن کے تمام کتابوں میں مذکور ہے، اور اس کا فائدہ ظاہراً یہی ہے کہ اگر باغیوں کو شہر یا گاؤں میں محاصرہ کیا تو اقامت کی نیت صحیح ہونی چاہئے، لیکن حالت کی مخالفت کی وجہ سے نیت کا صحیح نہ ہونا بھی ظاہر ہے۔

وعند زفرؒ یصح فی الوجھین اذا کانت الشوکۃ لھم للتمکن من الفرار ظاھرا......الخ

اور امام زفرؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں نیت صحیح ہوگی، ف یعنی دار الاسلام کے صحراء میں باغیوں کا محاصرہ ہو یا دار الحرب میں کافروں کا محاصرہ ہو۔ اذا کانت الخ بشرطیکہ طاقت وقوت لشکر اسلام اور اہل عدل کو ہو، کیونکہ بظاہر ان کو وہاں رہنے کے لئے قوت موجود ہے، ف اس لئے ظاہری حالت کا اعتبار کرتے ہوئے اقامت کی نیت صحیح ہوگی۔

وعند ابی یوسفؒ یصح اذا کانوا فی بیوت المدر لانہ موضع اقامۃ......الخ

اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک بھی صحیح ہے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ اسلامی لشکر (کم از کم) مٹی کے گھروں میں موجود ہوں کیونکہ ایسے گھروں میں بھی مستقل آبادی رہتی ہے، ف بخلاف چھوٹے اور بڑے خیموں کے، ابن الہمامؒ نے اعتراض کیا ہے کہ اس صورت میں بھی نیت کے اندر تردد باقی رہتا ہے یعنی خواہ خیمہ میں آباد ہوں یا مٹی اور پتھر کے گھروں میں ہے، اس طرح گھروں میں بھی کچھ خصوصیت نہ رہی، ف۔

ونیۃ الاقامۃ من اھل الکلاء وھم اھل الاخبیۃ......الخ

اور اقامت کی نیت کرنا اہل الکلاء کا، ان سے مراد ہی خیمے والے ہیں ف کہ ان کی نیت صحیح ہوگی یا نہیں، کلاء کے لفظی معنی ہیں ہری گھاس اور اہل الکلاء سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کا دار مدار جانور پر ہو اس لئے وہ جہاں گھاس پانی دیکھتے ہیں وہیں جنگلوں میں کمبلوں کے یا سرکیوں کے جھونپڑے کے طور کھڑے کر لیتے، جس دن وہاں کی گھاس ختم ہو جاتی تو پھر آگے بڑھ کر اسی جیسی مناسب جگہ تلاش کر کے منتقل ہوتے اور اسی طرح عارضی طور پر آباد ہو جاتے، اس مفہوم کے بعد اب جانور والوں ہی کی کچھ خصوصیت مقصود نہیں بلکہ ان سے مراد خانہ بدوش ہیں کہ کہیں بھی دیہات والوں کی طرح مستقل جم کر نہیں رہتے بلکہ منتقل ہوتے رہتے ہیں، عینی میں تحفہ سے نقل کیا ہے کہ عرب کے بدو اور کرد قوم اور ترکمان اور ایسے ریوڑ والے جو بالوں کے خیموں میں رہا کرتے اور جا بجا پھرتے رہتے ہیں، اگر ایسے لوگوں نے کسی جگہ پندرہ دن اقامت کی نیت کی تو قیل لا یصح الخ کہا گیا ہے کہ ان کی نیت صحیح نہ ہوگی، ف کیونکہ وہ صحراء میں ہیں جو اقامت کی جگہ نہیں ہوتی ہے، ع، ماحصل یہ ہوا کہ یہ لوگ ہمیشہ مسافر ہیں اور ہمیشہ قصر پڑھیں، اور روزے افطار کریں، اور اگر سالہا سال کے بعد کسی گاؤں میں آباد ہو جائیں تو پچھلے برسوں کے رمضان کے روزوں کی قضاء ان پر لازم ہوگی، اور مشکل ظاہر ہے، لیکن یہ قول صحیح نہیں ہے۔

والاصح انھم مقیمون یروی ذلک عن ابی یوسفؒ لان الاقامۃ اصل......الخ

اور قول اصح یہ ہے کہ یہ لوگ مقیم ہیں، ف یعنی ابتداء سے یہ لوگ مسافر نہیں ہیں، صدر الشریعہؒ نے کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے، یروی ذلک الخ امام ابو یوسفؒ سے اسی طرح روایت کی گئی ہے، ف محیط میں ہے کہ اسی پر فتوی ہے، تحفہ میں ہے کہ ان کو مقیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ صحراء میں رہنا ہی ان کی عادت ہوتی ہے، مع، لان الاقامۃ الخ کیونکہ اقامت تو اصل ہے، ف اور سفر میں اپنا عارضی عمل ہے، لہذا اصل میں یہ لوگ مسافر نہیں ٹھہرے، بلکہ اصل میں مقیم ہوئے، اور جب اقامت کا حکم باطل

ہوا تو سفر کا حکم لائق ہو گا.

فلا تبطل بالانتقال من مرعی الی مرعی......الخ

تو یہ اقامت جو اصل ہے وہ صرف ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ جانے سے باطل نہیں ہو گی، ف بلکہ سفر سے باطل ہو گی، یہاں تک کہ اگر انہوں نے ایک جگہ سے ایسی دوسری جگہ کا ارادہ ہو جس کا راستہ تین دن کا ہو تو یہ بھی مسافر ہونگے۔ المحیط۔ ہمارے اسی قول کے مثل امام شافعیؒ کا بھی قول ہے، ع، حاصل یہ ہوا کہ دارالاسلام کے صحراء میں اگر کسی شہر یا گاؤں کے رہنے والے نے اقامت کی نیت کی تو صحیح نہیں ہو گی، اور جو لوگ صحراء میں رہنے کے عادی ہیں ان کا وہی گھر ہے اس لئے وہ مقیم ہوئے، انہیں نیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لہذا یہ پوری نمازیں پڑھیں گے، اور رمضان میں فرض روزے رکھیں مگر جمعہ اور عید ان پر لازم نہیں ہے کیونکہ ان کے لئے تو شہر کا ہونا شرط ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر گاؤں کے مسافر نے صحراء میں اسی جگہ پندرہ دن اقامت کی نیت کی جہاں خانہ بدوش موجود ہوں تو بھی صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ لوگ اگرچہ مقیم ہیں لیکن اس بات کا ہر وقت احتمال رہتا ہے کہ کسی وقت اور کسی روز بھی دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں، اور امام ابو یوسفؒ کے فرمان کے مطابق مٹی کے گھر بھی نہیں ہیں، م، بعض صورتوں میں مسافر کا فرض بدلتا رہتا ہے۔

وان اقتدی المسافر بالمقیم فی الوقت اتم اربعا لانه یتغیر فرضه الی اربع للتبعیة کما یتغیر بنیة الاقامة لاتصال المغیر بالسبب وهوالوقت وأن دخل معه فی فائتة لم تجزه لانه لایتغیر بعد الوقت لانقضاء السبب کما لا یتغیر بنیة الاقامة فیکون اقتداء المفترض بالمتنقل فی حق القعدة اوالقراء ة.

ترجمہ:- اگر مسافر نے مقیم امام کی وقتیہ نماز میں اقتداء کی تو وہ پوری چار رکعتیں پڑھے گا، کیونکہ امام کی اتباع کرنے کی وجہ سے اس کی قصر نماز بدل کر پوری چار رکعتیں ہو جاتی ہیں جیسا کہ اقامت کی نیت کرنے کی وجہ سے بدل جاتی ہیں، کیونکہ تغیر دینے والا جو وقت ہے سبب سے متصل ہو گیا ہے، اور اگر قضاء نماز میں مسافر نے مقیم کی اقامت کی نیت کی تو یہ اقتداء صحیح نہ ہو گی، کیونکہ وقت کے بعد نہیں بدلتی ہیں، سبب کے ختم ہو جانے کی وجہ سے جیسا کہ اقامت کی نیت سے نہیں بدلتی ہیں لہذا یہ ایسا ہو گا کہ کوئی فرض پڑھنے والا نفل پڑھنے والے کے پیچھے ہو قعدہ یا قراءت کے حق میں۔

توضیح:- مسافر مقتدی اور امام مقیم وقتیہ نماز میں، فائتہ نماز میں، وقت میں اقتداء اور سلام کے بعد وقت ختم، مقتدی مسافر نے فاسد اقتداء کی، اقتداء کر کے سو گیا، دو رکعتوں کے بعد اقتداء کی، مسافر امام اور مقتدی مقیم اور امام کو حدث اور خلیفہ مقیم، مسافر امام اور مقتدی مسافر و مقیم، پھر قعدہ مقدار تشہد، اس وقت کچھ مقتدیوں کا کلام کرنا، اور امام کی نیت اقامت، امام مسافر نے ایک رکعت پڑھی، پھر ایک مسافر نے اقتداء کی، اور ختم ہونے سے پہلے اقامت کی نیت، مسافر مدرک نے فراغت سے پہلے نیت کی، مسافر لاحق نے امام کے فراغ سے پہلے نیت کی، لاحق نے اقتداء فاسد کی، نماز میں وقت نکل گیا اور نیت، مقیم نے دو رکعتیں پڑھیں اور وقت نکل گیا، اس وقت مسافر کی اقتداء، مسافر نے سلام پھیرا جبکہ اس پر سجدہ سہو ہے، سجدہ کی طرف لوٹنے سے پہلے اقامت کی نیت، مسافر نے اول وقت میں نماز پڑھی، پھر اس وقت نیت کی، قبل ادائے نماز نیت

وان اقتدی المسافر بالمقیم فی الوقت اتم اربعا لانه یتغیر فرضه الی اربع للتبعیة کما یتغیر......الخ

اگر مسافر نے وقت کے اندر مقیم کی اقتداء کی تو وہ چار رکعتیں پوری کرے، ف خواہ شروع سے شریک ہونے والا ہو، یا لاحق ہو (شروع سے شریک ہو کر درمیان کی یا آخری چھوٹ گئی ہو) یا مسبوق ہو، (ابتدائی نماز چھوٹی ہو) یہاں تک کہ دو رکعتوں کے بعد شامل ہوا تو بھی چار رکعتیں ہی پڑھے، پس اس اقتداء کے صحیح ہونے کے لئے ابتداء میں وقت اداء کا موجود ہونا ضروری ہے، اگر انتہاء میں نکل جائے تو اقتداء سے چار تمام کرے، **لانه یتغیر الخ** کیونکہ مسافر کی فرض نماز اتباع لازم ہونے کی وجہ سے

دو رکعت سے بڑھ کر چار رکعتیں ہو جاتی ہیں ف چونکہ امام کی اتباع انتہائی ضروری بلکہ لازم ہوتی ہے، **کما یتغیر الخ** جیسے کسی جگہ عارضی طور سے پندرہ دنوں کی اقامت کی نیت سے حکم بدل جاتا ہے۔

لاتصال المغیر بالسبب وھو الوقت......الخ

اس لئے کہ تغیر دینے والا سبب یعنی وقت سے متصل ہو گیا ہے، ف یعنی نماز کی ادائیگی کا سبب اسی تغیر کے ساتھ ہے تو گویا سبب نے چار رکعت کی ادا واجب کی ہے، لہٰذا اگر سبب کے ساتھ تغیر دینے والا متصل نہ ہو تو سبب یعنی وقت تو صرف دو رکعتیں فرض کر چکا ہے پھر اگر وہ تغیر دینے والا کارآمد نہ ہوگا، چنانچہ مصنف نے فرمایا ہے۔

وإن دخل معه في فائتة لم تجزه لانه لایتغیر بعد الوقت لانقضاء السبب کما لا یتغیر بینة......الخ

اور اگر مسافر کسی مقیم کے ساتھ قضاء نماز میں مقتدی ہوا تو جائز نہ ہوگا **لانه لایتغیر الخ** کیونکہ مسافر کا فرض وقت کے بعد متغیر نہ ہوگا، ف کیونکہ فرض کا سبب تو وقت ہے، اور اقتداء وغیرہ جو تغیر دیتا ہے وہ سبب سے مل کر کارآمد ہوتا ہے، اس لئے قضاء میں کارآمد نہ ہوگا، **لانقضاء الخ** کیونکہ سبب تو گزر چکا جیسے قضاء نماز اقامت کی نیت سے نہیں بدلتی ہے، ف حالانکہ نیت اقامت سے بھی تغیر ہوتا ہے، البتہ اسی صورت میں جب کہ وقت کے اندر ہو، اور اگر نماز وقت سے گذر کر قضاء ہو گئی ہو تو وہ وقت اسے دو ہی رکعت میں محدود و متعین کر دیتا ہے، اس لئے نیت اقامت سے ان دو ہی رکعتوں کی قضاء واجب ہوگی، پس جب قضاء میں اقتداء کچھ تغیر نہیں دیکھتی ہے **توفیکون اقتداء الخ** تو نتیجہ یہ ہوگا کہ قضاء میں اقتداء گویا فرض پڑھنے والے کی نفل پڑھنے والے کے ساتھ اقتداء ہوئی قعدہ یا قراءت کے حق میں، ف کیونکہ درمیانی قعدہ امام کے حق میں تو فرض نہیں ہے، اور مسافر مقتدی کے حق میں فرض ہے، المبسوط۔ ع۔

یہ اس صورت میں جب کہ مسافر نے شروع سے اقتداء کی ہو، اور اگر آخر دو رکعتوں میں ملا ہو تو ان دونوں رکعتوں میں امام کی قراءت نفل ہے، لیکن مقتدی کی قراءت فرض ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتداء دو باتوں میں سے ایک بات میں لازم ہے یا تو قعدہ کے اعتبار سے جب کہ مقتدی شروع سے ہو، یا قراءت کے اعتبار سے جب کہ اخیر میں شریک ہوا ہو۔

چند ضروری مسائل

اگر نماز کے وقت میں اقتداء کی لیکن سلام پھیرنے سے پہلے وقت نکل گیا تو بھی مسافر کی نماز فاسد نہ ہوگی، کیونکہ اقتداء تو وقت کے ساتھ مل کر چار رکعتوں کو واجب کر چکا ہے، لیکن اگر مسافر نے کسی طور سے اقتداء کو فاسد کر دیا تو اب دو ہی رکعتیں پڑھے، لیکن اگر نفل کی نیت سے کوئی شریک ہوا تو چار رکعتوں ہی کی قضاء واجب ہوگی، اگر وقت کے اندر اقتداء کر کے سو تارہ گیا ایسے کو لاحق کہتے ہیں وہ بیدار ہو کر لاحق کے حکم کے مطابق چار رکعتیں پڑھ لے۔ اور اگر دو رکعتوں کے بعد اقتداء کی ہو تو مسبوق کے حکم کے مطابق چار رکعتیں نماز پڑھے، اگر مقیم نے مسافر امام کی اقتداء کی اس کے بعد امام کو حدث ہو گیا اور اس نے کسی مقیم کو اپنا خلیفہ بنایا تو اس کے پیچھے مسافر امام کا فرض بدل کر چار رکعتیں نہ ہوں گی، یہاں تک کہ اگر خلیفہ نے یعنی مقیم نے دو رکعتوں پر قعدہ نہیں کیا تو سب کی نماز فاسد ہو جائیگی، مسافر امام کے پیچھے مسافر اور مقیم ہر قسم کے مقتدی ہیں اب امام نے دو رکعتوں پر مقدار تشہد قعدہ کر لیا اور ابھی تک سلام نہیں پھیرا تھا کہ کسی مسافر نے گفتگو کر لی یا اٹھ کر چلا گیا، اس کے بعد امام نے اقامت کی نیت کی تو امام کا فرض اب چار رکعتیں ہو جائیگی، اور جن مقتدیوں نے گفتگو نہیں کی ان کا فرض بھی چار رکعتیں ہو جائیگی، اسے چاہئے کہ وہ چار رکعتیں ہی پوری کرے، اور جو مسافر گفتگو کر کے نماز سے فارغ ہوا اس کی بھی نماز صحیح ہو گئی، اس لئے کہ اس کی نماز فرض پوری ہونے کے بعد امام نے اقامت کی نیت کی ہے یہاں تک کہ اگر امام کی نیت کے بعد مسافر نے گفتگو کی تو اس کی نماز فاسد ہوگی، الفتح۔

امام مسافر نے ایک رکعت پڑھی اس وقت ایک مسافر داخل ہوا اور اس مسبوق نے نماز سے فارغ ہونے سے پہلے اپنی نماز کے دوران اقامت کی نیت کرلی تو وہ چار رکعتیں ہی پڑھیں، اسی طرح شروع سے شریک ہونے والا مدرک بھی، اور لاحق کا حکم یہ ہوگا کہ اگر امام کے فارغ ہونے سے پہلے نیت کرے تو وہ چار رکعتیں پڑھیں، اور اگر فراغت کے بعد نیت کرے تو نہیں، اگر لاحق نے اپنی اقتداء فاسد کرلی تو وقت کے اندر چار رکعتیں پڑھے ورنہ دو رکعتیں ہی پڑھے، محیط السرخسی، اگر نماز پڑھتے ہوئے وقت نکل گیا اس کے بعد اقامت کی نیت کی تو یہ نماز دو ہی رکعتیں رہے گی، الخلاصہ، اگر مقیم نے دو رکعتیں پڑھی تھیں کہ وقت نکل گیا پھر کوئی مسافر داخل ہوا تو اس کی اقتداء صحیح نہ ہوگی جیسا کہ کتابوں میں عام ہے، م،ع، اگر ایسے مسافر نے سلام پھیرا کہ ابھی اس پر سجدہ سہو باقی ہے، اگر سجدہ سہو ادا کرنے کے خیال کرنے سے پہلے اقامت کی نیت کرلی تو اس کا سجدۂ سہو ختم ہوگیا اور نماز پوری ہوگئی، اب وہ نہیں بدلے گی، اور اگر سجدۂ سہو کی طرف لوٹ گیا اس کے بعد اقامت کی نیت کی تو نیت صحیح ہوگی، اور یہ نماز اب چار رکعتوں کی ہو جائیگی، اگر مسافر نے نماز کو ابتدائے وقت میں دو رکعتیں ادا کرلیں اور وقت باقی رہ گیا تھا کہ اس نے اقامت کی نیت کرلی تو اس کا فرض اب نہیں بدلے گا، اور اگر ابھی نماز نہ پڑھی ہو کہ تو چار رکعتیں ہو جائیگی۔ قاضی خان۔

وان صلى المسافر بالمقيمين ركعتين سلم واتم المقيمون صلاتهم لان المقتدى التزم الموافقة فى الركعتين فينفرد فى الباقى كالمسبوق الا انه لايقرأفي الاصح لانه مقتد تحريمة لافعلا والفرض صار مُؤدًّى فيتركها احتياطا بخلاف المسبوق لانه ادرك قراء ة نافلة فلم يتأدى الفرض فكان الايتان اولى قال ويستحب للامام اذا سلم ان يقول اتموا صلاتكم فانا قوم سفر لانه عليه السلام قاله حين صلى باهل مكة وهو مسافر.

ترجمہ:- اور جب مسافر امام مقیم مقتدیوں کو دو رکعت نماز پڑھادے تو (مقدار تشہد قعدہ کرچکنے بعد) سلام پھیر دے اور جتنے مقیم مقتدی ہو وہ اپنی نمازیں پوری کرلیں، کیونکہ مقتدی مقیم نے امام کو مسافر جان کر صرف دو رکعتوں میں موافقت اپنے اوپر لازم کی ہے چار رکعتوں میں نہیں اس لئے باقی دو رکعتوں میں مثل مسبوق کے ہوگا، مگر یہ کہ قول اصح کے مطابق قراءت نہیں کرے گا، کیونکہ مقتدی مقیم تو تحریمہ کے اعتبار سے مقتدی ہے فعل کے اعتبار سے نہیں ہے، اور نماز میں جن دو رکعتوں میں قراءت فرض تھی وہ ادا ہو چکی ہیں، اس لئے اس مستحب قراءت کو احتیاطاً چھوڑنا لازم ہے، بخلاف مسبوق کے کہ اس نے قراءت نفل پائی ہے اس لئے اس نے فرض قراءت ادا نہیں کی ہے، تو اس قراءت کو ادا کرلینا ہی اولی ہوگا، کہا اور امام کے لئے یہ مستحب ہے کہ وہ جب سلام پھیرے تو اس طرح کہے کہ آپ لوگ اپنی اپنی نمازیں پوری کرلیں کیونکہ ہم لوگ تو مسافر قوم ہیں، کیونکہ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ جملہ اس وقت فرمایا تھا جب آپ نے مسافر کی حیثیت سے مکہ والوں کو نماز پڑھائی تھی۔

توضیح:- مسافر امام کے مقیم مقتدیوں کا حکم، دلیل، امام مسافر کو سلام کے بعد یہ کہنا چاہئے کہ میں مسافر ہوں اس لئے آپ لوگ اپنی نمازیں پوری کرلیں، حدیث سے دلیل

وان صلى المسافر بالمقيمين ركعتين سلم واتم المقيمون صلاتهم......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے فینفرد الخ تو باقی دو رکعتوں میں وہ مثل مسبوق کے خود تنہا ہوگا، ف یعنی وہ باقی نماز کے پڑھنے میں مثل تنہا پڑھنے والے کے ہوتا ہے، الا انہ الخ لیکن دونوں کے درمیان صرف اتنا فرق ہے کہ مقتدی مقیم قول اصح میں قراءت نہیں کرے گا، ف لیکن مسبوق قراءت کرتا ہے۔

لان المقتدى التزم الموافقة فى الركعتين فينفرد فى الباقى كالمسبوق الا انه لايقرأ......الخ

کیونکہ مقتدی مقیم تو تحریمہ باندھنے کی وجہ سے مقیم ہے اور عمل نماز کی وجہ سے نہیں ہے، ف کیونکہ امام کا فعل تو سلام سے ختم ہو چکا ہے، البتہ ابتداء سے تحریمہ میں اقتداء کی تھی اس وجہ سے وہ لاحق کے مشابہ ہو گیا ہے، اور لاحق پر قراءت ہوتی ہے تو

حاصل یہ نکلا کہ وہ ایک اعتبار سے لاحق کے مشابہ ہے اس لئے قراءت حرام ہے، اور دوسرے اعتبار سے مسبوق کے مشابہ ہے اس لئے قراءت جائز ہے۔

والفرض صار مؤدّی فیتر کھا احتیاطا بخلاف المسبوق لانه ادرك قراءة نافلة......الخ

اور نماز کی جن دو رکعتوں میں قراءت فرض تھی وہ تو ادا ہو چکی ہیں، ف اس لئے مسبوق کی مشابہت کی وجہ سے بھی آخری دو رکعتوں میں قراءت مستحب ہے، لیکن لاحق کے مشابہت کی وجہ سے حرام معلوم ہوتی ہے، فیتر کھا الخ تو احتیاطاً اس مستحب قراءت کو چھوڑنا لازم ہے، بخلاف الخ بر خلاف مسبوق کے، ف کہ مسبوق نہیں چھوڑ سکتا ہے، لانه ادرك الخ کیونکہ مسبوق نے نفل قراءت پائی ہے، ف اس لئے کہ مسبوق نے جب آخری دو رکعتیں پائی ہیں تو قراءت کے حق، میں مسبوق کی بھی یہ آخری نماز ہوئی۔ فلم یتأد الخ تو ابھی اس کی فرض قراءت ادا نہیں ہوئی. فکان الخ لہٰذا اسے قراءت کرنا ہی اولیٰ ہوا، ف یعنی اس بات کو ترجیح ہوئی کہ اس قراءت کو پڑھے، اور یہ قراءت چونکہ فرض ہے اس لئے پڑھنا فرض ہوا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس مسئلہ میں اجتہاد سے کام لیا گیا ہے اور اجتہاد کی بعد ہی کچھ نتیجہ نکالا گیا ہے اس لئے اس فرض کو قطعی نہیں کہا جاسکتا ہے بلکہ یہ فرض صرف عملی کہلائیگا، جیسا کہ مخفی نہیں ہے، اور قاضی خان وغیرہ نے اس بات کی تصریح بھی کی ہے کہ جس مقتدی کو یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا امام مقیم ہے یا مسافر تو اس کی اقتداء صحیح نہ ہوگی، عینی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس کی مراد یہ ہے کہ نماز سے پہلے بھی اور سلام کے بعد بھی کسی وقت اسے معلوم نہ ہو سکا ہو کہ امام کیسا ہے یعنی مسافر ہے یا مقیم، شرح الاشاد میں کہا ہے کہ امام کو چاہئے کہ نماز شروع کرنے سے پہلے ہی عام اعلان کردے کہ میں مسافر ہوں، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس اعلان سے مسبوق کو کس طرح خبر ہوگی (کہ وہ تو دیر سے ہی آتا ہے) اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا:

ویستحب للامام اذا سلم ان یقول اتموا صلاتکم فانا قوم سفر......الخ

امام کے لئے مستحب ہے کہ سلام پھیرنے کے بعد کہدے کہ آپ لوگ اپنی نماز پوری کرلیں کیونکہ ہم لوگ مسافر ہیں، **انمّوا صلوتکم فانا قوم سفر**، ف مستحب یہ ہے کہ یہی جمع کا کلمہ کہے اگرچہ امام تنہا مسافر ہو، **لانه علیه السلام الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی کلمہ فرمایا تھا جب کہ آپ نے مکہ والوں کو نماز پڑھائی تھی اور آپ مسافر تھے، ف ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ نے یہ روایت کی ہے، اور ترمذی نے اسے صحیح کہا ہے، فع، بس اتنی سی اطلاع اقتداء صحیح ہونے کے لئے شرط ہے جو فتاوی قاضی وغیرہ میں مذکور ہے، اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ مقتدی بننے کے لئے شروع ہی میں امام کا حال جاننا شرط ہے، کیونکہ مبسوط میں ہے کہ ایک شخص نے ایک گاؤں میں کچھ لوگوں کو ظہر کی دو رکعتیں نماز پڑھائیں، لوگوں کو اس کی خبر نہیں تھی کہ امام مسافر ہے یا مقیم ایسی صورت میں سب کی نماز فاسد ہو جائیگی خواہ وہ مقیم ہوں یا مسافر ہوں کیونکہ جو شخص اپنے مقام اقامت میں ہوگا اس کے حال سے یہی ظاہر ہوگا کہ وہ مقیم ہے، اور ظاہری حالت کے اوپر ہی تمام کاموں میں عمل ہوتا ہے، اور عمل کرنا واجب بھی ہے، البتہ اگر اس کے خلاف ظاہر ہو جائے تو دوسری بات ہوگی، اور اگر انہوں نے امام سے اس کا حال پوچھ لیا اور اس نے بتلا دیا کہ میں مسافر ہوں تو اس کے جان لینے کے بعد ان کی نماز جائز ہو جائیگی، انتہی۔

اگر امام کے سلام پھیرنے سے پہلے مقتدی کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک اپنی رکعت کا سجدہ نہ کیا ہو کہ امام نے اقامت کی نیت کرلی، تو مقتدی کو چاہئے کہ اس رکعت کو چھوڑ کر امام کی متابعت کرے، اگر وہ امام کی متابعت نہیں کرے گا یہاں تک کہ وہ امام سجدہ بھی کرلے تو مقتدی کی نماز فاسد ہو جائیگی، اور اگر اس نے سجدہ بھی ادا کرلیا ہو اس کے بعد امام نے اقامت کی نیت کی تو مقتدی تنہا اپنی نماز پوری کرلے یہاں تک کہ اگر اس وقت امام کی متابعت کرے گا تو بھی اس کی نماز فاسد ہو جائیگی۔ الفتح۔

واذا دخل المسافر فی مصره اتم الصلوة وان لم ینو المقام فیه لانه علیه السلام و اصحابه رضوان الله علیهم کانوا یسافرون و یعودون الی اوطانهم مقیمین من غیر عزم جدید.

ترجمہ:۔ اور جب مسافر اپنے شہر میں داخل ہو جائے تو وہ اپنی نماز پوری پڑھے اگرچہ وہاں اس نے اقامت کی نیت نہیں کی ہو، کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرامؓ سفر کرتے اور اپنے وطن کو لوٹ آتے تو اقامت کی حالت میں لوٹتے، کسی نئے ارادہ کے بغیر۔

توضیح:۔ مسافر کا وطن میں آنا، حدیث سے دلیل، وطن کی تفصیل وطن اصلی کی تعریف، وطن اقامت کی تعریف

واذا دخل المسافر فی مصره اتم الصلوة وان لم ینو المقام فیه......الخ

اور جب مسافر اپنے وطن میں داخل ہو جائے تو وہ اپنی پوری نماز پڑھے اگرچہ اس میں اقامت کی نیت نہ کی ہو۔ ف۔ وطن میں نیت اقامت شرط نہیں ہے، بلکہ بغیر نیت کے بھی مقیم ہو جاتا ہے۔ م۔ پھر یہ داخل ہونا عام ہے، خواہ اس طرح ہو کہ ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتا ہو، اور راستہ میں وطن پڑتا ہو، اس میں داخل ہوتا ہوا گذرا، اور داخل ہونے کے بعد جب دوسرے شہر کو نکلا تو ضرور ہے کہ وہیں سے اس شہر تک مدت سفر کا فاصلہ ہو، خواہ اس طرح کہ کسی ضرورت کے لئے آیا اس نیت کے ساتھ کہ سفر کو جاؤں گا، اور خواہ اس طرح کہ سفر کو جارہا تھا کہ راستہ میں نیت بدلی اور واپس ہو کر آگیا، لیکن محیط میں ہے کہ اگر سفر کو نکلا اور تین دن کا فاصلہ پورا کرنے سے پہلے اس نے سفر کا ارادہ ختم کر دیا اور واپسی کی نیت کر لی تو واپسی میں جہاں بھی ہوا اقامت کی نماز پڑھتا رہے، اور اگر تین دن کا فاصلہ پورا طے کر چکا ہو یعنی کم سے کم مقدار جس سے وہ مسافر ہو چکا ہو پھر وطن کے شہر کے قریب سے گذرنے لگا اور اس وقت اس شہر میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو جب تک اس کی آبادی میں داخل نہ ہوا ہو مسافرت کی نماز پڑھے اور اگر داخل ہونے کے بعد یہ ارادہ کیا کہ مزید کچھ روپے لے کر یا ایک بار اور بھی اہل خانہ کو دیکھ کر سفر کروں گا تو بھی وطن کے اندر اقامت کی یعنی پوری رکعتیں پڑھے گا، یہانتک کہ اگر کشتی میں ظہر کی نماز مسافر کی حیثیت سے شروع کی تھی کہ اچانک کشتی چھوٹ گئی یہانتک کہ نماز سے فارغ ہونے سے پہلے آبادی میں داخل ہو گئی اس لئے وہ اب پوری نماز یعنی چار رکعتیں پوری پڑھے۔ م۔ مع۔

لانه علیه السلام و اصحابه رضوان الله علیهم کانوا یسافرون و یعودون الی اوطانهم مقیمین......الخ

کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام سفر کرتے اور اپنے وطن میں واپس تشریف لاتے اس حالت میں وہ مقیم ہوتے تھے کسی نئے ارادہ کے بغیر ہی۔ ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ وطن میں رہنے کے لئے نیت اقامت شرط نہیں ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ مصنفؒ یہ روایت کہاں سے لائیں ہیں، اور اس مضمون کے لئے تو کوئی شاہد بھی نہیں ہے، پھر عینیؒ کے شارحین کے کلام اور ان کے اعتراضات مع جوابات ذکر کئے ہیں۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مجھے اس بات پر سخت تعجب ہے کہ ان علماء شارحین پر یہ روایت کس طرح مخفی رہی، حالانکہ یہ بات اور مقام تو ایسا کوئی مشکل بھی نہیں ہے، اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا سفر کرنا تو معلوم ہے، اور ان کا اپنے وطن میں مقیم کی حیثیت سے داخل ہونا بھی معلوم اور مروی ہے، کیونکہ وطن میں کبھی قصر کرنا کسی فرد سے ثابت اور مروی نہیں ہے، حالانکہ پندرہ دن ٹھہرنے سے پہلے پھر مسافر ہونا بھی مروی ہے، پس اگر اس کے لئے نئی نیت ہی شرط ہوتی یعنی وطن میں مقیم ہونے کے واسطے نئے ارادہ کا ہونا شرط ہوتا تو رسول اللہ ﷺ کم از کم ایک بار تو اسے ضرور ہی بیان فرماتے، اس لئے کہ مسافر کا فرض دو رکعت اور مقیم کا فرض چار رکعتیں ہیں، اور یہ احتمال کہ شاید دل میں ارادہ کر لیا ہو اصول شریعت کے بالکل برخلاف ہے، کیونکہ شرعاً رسول اللہ ﷺ پر تو لوگوں کو تعلیم دینی فرض تھی صرف اپنے ارادہ قلبی پر کفایت کرنی تو کافی نہیں تھی اب جبکہ کسی روایت میں نہیں آیا کہ وطن پہنچ کر مقیم ہونے کیلئے نیا ارادہ اور نئی نیت شرط ہے، حالانکہ صحابہ کرامؓ تو بہت زیادہ سفر

کرتے رہتے تھے، اور واپس تشریف لاتے اور یہ موقع لوگوں کو بتانے کا بھی بہت زیادہ تھا، اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ایسی کوئی شرط نہیں تھی، البتہ اس بات کا ضرور احتمال تھا کہ جب سفر کرتے ہوئے درمیان میں وطن آجائے اور اس سے ہو کر گذرنا پڑے تو کیا اس ضرورت میں بھی پوری ہی پڑھے گا یا قصر کرے گا، مگر ہم نے اس کا جواب اس طرح پایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا مسافر کی صفت کے ساتھ وطن میں تشریف لانا کبھی بھی معلوم نہیں ہو سکا ہے، لہٰذا ہم نے اسی کو قبول کرلیا، اس کے علاوہ بعض صحیح احادیث میں ثابت ہے کہ سفر سے وطن واپس تشریف لانے کے بعد وطن میں قیام کے دنوں میں پوری نمازیں چار رکعتوں کے ساتھ پڑھتے تھے، یہ روایت اس بات پر قوی دلیل ہے کہ وطن میں جتنے دن بھی اقامت ہو خواہ کم یا زیادہ اس کے لئے نیت اقامت کی شرط نہیں ہوتی ہے، اچھی طرح سمجھ لیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

واضح ہو کہ وطن کی دو قسمیں ہوتی ہیں، (۱) وطن اصلی (۲) وطن اقامت، محققین کا یہی قول ہے، اور یہی صحیح بھی ہے، الکفایہ، وطن اصلی ایسی آبادی جہاں انسان پیدا ہوا ہو، اور وہ جگہ بھی جہاں کی اس کی اہلیہ ہو اور مستقلاً وہاں زندگی بسر کرنے کا ارادہ کیا ہو، پھر اگر مسافر نے ایک شہر میں نکاح کیا اور وہاں مستقل بود باش اور رہائش کی نیت نہیں کی تو قول کے مطابق وہ مسافر رہے گا، اور دوسرے قول میں مقیم ہو گیا۔ الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حضرت عثمانؓ اس قول کی بناء پر اپنی خلافت کے سات برس بعد مکہ میں نکاح کر کے خود کو مقیم سمجھ کر حالت اقامت کی نماز پڑھتے رہے، حالانکہ اس سے پہلے قصر کی نماز دو رکعتیں ہی پڑھتے رہے، جیسا کہ ابن ابی شیبہؒ کی روایت میں ہے، اس قول کی اصل یہ حدیث ہے کہ جو شخص جس شہر میں شادی کرے وہاں وہ مقیم کی نماز پڑھے، لیکن یہ مترجم کہتا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ نے صرف اس حدیث کو عام قرار دیتے ہوئے مقیم کی نماز پڑھی، اور یہ بات نہیں ہے کہ تاہل یعنی شادی کر لینے سے مکہ کو اپنا وطن قرار دیا کیونکہ یہ تو تمام صحابہ کرامؓ کے لئے ممنوع رکھا گیا ہے کہ وہ ہجرت سابقہ کو توڑ کر مکہ کو پھر اپنا وطن قرار دیں چنانچہ سوائے سعد بن خولہؓ کے کسی نے بھی اپنی ہجرت سابقہ کو باطل قرار دے مکہ کو اپنا وطن قرار دیا ہو، اور ایک صحیح کی حدیث میں کہ **اللهم امض لاصحابي هجرتهم ولكن البائس سعد بن خوله**، یعنی حضرت سعد بن خولہؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ افسوس فرماتے تھے کہ فتح مکہ کے بعد ہجرت سابقہ کو ختم کرتے ہوئے مکہ میں چلے آئے تھے، پس یہ بات بخوبی معلوم ہوگئی کہ جب کسی شہر میں اس ارادہ سے شادی کی ہو کہ یہاں اقامت کی نیت کرلے، اور گذشتہ حدیث اس بات پر محمول ہوگی کہ جب اس شہر میں شادی کر لینے کے بعد مستقل بس جائے خواہ خود اپنے پرانے وطن میں زیادہ رہے یا وہاں رہے، بخلاف اس صورت کے کہ جب بیوی کو وہاں سے لے آئے جیسے حضرت عثمانؓ نے کیا تھا، فافہم۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

پھر اس وطن اصلی کے لئے سفر پہلے ہونا بالاجماع ضروری نہیں ہے۔ المحیط۔ اور اب دوسرا وطن جو وطن اقامت ہے جہاں سفر کرتے ہوئے پندرہ دن یا اس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کر کے ٹھہر گیا ہو۔ الفتح۔ تو وطن اسی وقت تک باقی رہتا ہے جبتک وہاں موجود رہے۔ م۔ اور ظاہر الروایۃ میں اس وطن کے واسطے بھی پہلے تین دنوں کی مسافرت کا ہونا شرط نہیں ہے۔ شرح للامیر۔ البحر۔

ومن كان له وطن فانتقل منه واستوطن غيره ثم سافر فدخل و طنه الاول قصر لانه لم يبق وطنا له الا يرى انه عليه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمكة من المسافرين وهذا لان الاصل ان الوطن الاصلي تبطل بمثله دون السفرو وطن الاقامة تبطل بمثله و بالسفر و بالاصلي واذا نوى المسافر ان يقيم بمكة و منى خمسة عشر يوما لم يتم الصلوة لان اعتبار النية في موضعين يقتضي اعتبارها في مواضع وهو ممتنع لان السفر لايعرى عنه الا اذا نوى ان يقيم بالليل في احدهما فيصير مقيما بدخوله لان اقامة المرء مضافة الى مبيته.

ترجمہ :-اور جو شخص اپنے پرانے وطن سے منتقل ہو گیا اور کسی دوسرے علاقہ کو اپنا وطن بنالیا پھر اس دوسرے وطن سے سفر کرتا ہوا اپنے قدیم وطن میں داخل ہوا تو وہاں بھی وہ قصر ہی کرے گا، کیونکہ وہ علاقہ اس کا وطن باقی نہیں رہا ہے، کیا یہ بات دیکھی نہیں جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مکہ میں رہتے ہوئے خود کو مسافروں میں شمار کیا، اور یہ اس لئے ہوا کہ قاعدہ اس جگہ یہ ہے کہ وطن اصلی اپنے ہی جیسے وطن اصلی سے باطل ہو جاتا ہے، لیکن سفر سے باطل نہیں ہوتا ہے، اور وطن اقامت اپنے ہی جیسے وطن اقامت سے اور سفر سے اور وطن اصل سے باطل ہو جاتا ہے، اور جبکہ مسافر نے مکہ اور منیٰ میں پندرہ دنوں تک رہنے کا ارادہ کیا ہو تو وہ اپنی نماز پوری نہیں پڑھے گا، بلکہ قصر کرتا رہے گا، کیونکہ دو جگہوں میں نیت کا معتبر ہونا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کئی مقامات میں نیت معتبر ہو جائے، جبکہ یہ بات ممتنع ہے کیونکہ سفر تو اس سے خالی نہیں ہوتا ہے، مگر جبکہ وہ اس بات کی نیت کرلے کہ ان دونوں مقامات سے کسی ایک متعین جگہ میں رات کو رہے گا، لہذا اس جگہ میں داخل ہوتے ہی مقیم ہو جائے گا، کیونکہ انسان کی اقامت کی نسبت اس کی رات گذارنے کی طرف ہوتی ہے۔

توضیح :- جس نے وطن اصلی کو چھوڑ کر دوسری جگہ کو وطن بنالیا ہو پھر کسی وقت وہ پرانے وطن میں آئے، حدیث سے دلیل، وطن اصلی کے باطل ہونے کا حکم وطن اقامت کے باطل ہونے کا حکم، مکہ یا منیٰ میں پندرہ روز ٹھہرنے کی نیت کرنی، دلیل

ومن كان له وطن فانتقل منه واستوطن غيره ثم سافر فدخل و طنه الاول قصر......الخ

جس شخص کا کوئی وطن تھا۔ف۔ یعنی وطن اصلی تھا فانتقل الخ پھر اس وطن سے وہ منتقل ہو گیا اور کسی دوسری جگہ وطن بنالیا۔ف۔ یہانتک کہ اس جگہ سے اپنے تعلقات اور معاملات ختم کرلئے ثم سافر الخ پھر اس نئے وطن سے اس نے سفر شروع کیا فدخل الخ اور وہاں سے اپنے پرانے وطن میں داخل ہوا، تو وہ نماز میں قصر کرے۔ف۔ یعنی بحیثیت مسافر کے ہی وہاں رہے، البتہ اگر پندرہ دن یا ان سے زیادہ دنوں تک وہاں رہنے کی نیت کرلے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بغیر نیت کے وہاں قصر ہی کرے گا۔

لانه لم يبق وطنا له الا يرى انه عليه السلام بعد الهجرة عد نفسه بمكة من المسافرين......الخ

کیونکہ وہ علاقہ تو اب اس کا وطن نہیں رہا ہے الا یری الخ کیا یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے بعد مکہ میں اپنے آپ کو مسافروں میں شمار فرمایا، ف، چنانچہ نماز میں قصر کرنے کے بعد فرمایا کہ اے مکہ والوں اپنی نمازیں پوری کرلو کہ ہم تو قوم مسافر ہیں، اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ ترک وطن کر لینے کے بعد وطن قدیم بھی وطن باقی نہیں رہتا ہے۔م۔ اور وطن سے منتقل ہونے سے مراد ہے کہ اپنی بیوی اور بال بچوں سمیت وطن میں منتقل ہو جائے، اور اگر پہلے وطن میں اس کا مکان، زمین باقی رہ جائے تو امام محمدؒ نے اصل میں اشارہ کیا ہے کہ وہ وطن ہنوز باقی رہ گیا، اور اگر اس نے اہل و عیال کو منتقل نہیں کیا بلکہ دوسرے شہر میں دوسرا گھر بنالیا تو دوسرا وطن ہو گیا، اور پہلا بھی باقی رہ گیا، اس لئے ان دونوں میں سے جہاں کہیں بھی وہ شخص پہنچے گا پوری نماز پڑھے گا، اور وہ مقیم ہی رہے گا۔ ھ۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ جب صحابہ کرامؓ نے مکہ سے ہجرت کی تو ان کے مکانات اور ان کی زمینیں موجود تھیں، پھر بھی تو وہ ان کا وطن باقی نہ رہا تھا، جواب یہ ہے کہ کافروں نے ان چیزوں پر قبضہ کرلیا اور اس وقت وہ علاقہ دارالحرب ہو گیا تھا اس لئے مسلمانوں کی تمام جائیداد ان کافروں کے قبضہ میں آگئی تھیں، اور صحیح اور حق بات یہ ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ کی ہجرت مکمل ہو گئی تھی اس کے باوجود کہ ان کے بچے وغیرہ مکہ میں تھے جیسا کہ صحیح میں حضرت نعیمؓ کے قصہ اور مکہ والوں کو کچھ راز کی باتوں پر مطلع کرنے کے قصہ سے ظاہر ہے، لیکن وہ تو مجبوری کی بناء پر ہوا تھا۔م۔

وهذا لان الاصل ان الوطن الاصلى تبطل بمثله دون السفر......الخ

اور یہ بات کہ وطن قدیم کو ترک کر دینے سے وہ وطن باقی نہیں رہتا ہے اس بناء پر ہے کہ اس ایک جگہ ایک قاعدہ مقرر کیا ہوا ہے کہ ان الوطن الاصلی الخ کہ وطن اصلی ختم ہو جاتا ہے اس جیسا وطن بنا لینے سے، اور سفر سے ختم نہیں ہوتا ہے۔ ف۔ یعنی جس حیثیت سے ایک کو وطن اصل کہا جا رہا تھا اگر اسے چھوڑ کر اسی جیسا اسی حیثیت کا دوسرا وطن بنا لیا جائے تو پہلا وطن اور اس کا حکم ختم ہو جاتا ہے۔

و وطن الاقامة تبطل بمثله و بالسفر و بالاصلي......الخ

اور وطن اقامت اور اس کا حکم ختم ہو جاتا ہے اسی جیسا کوئی وطن اقامت بنا لینے سے، اور اس جگہ سے سفر کر جانے سے اور وطن اصلی میں داخل ہو جانے کی وجہ سے۔ ف۔ اس لئے اگر سفر میں کسی جگہ پندرہ دن اقامت کر لی تھی پھر اسے چھوڑ کر اور دوسری جگہ پندرہ دن اقامت کر لی تو پہلا وطن اقامت ختم ہو گیا، اب اگر پھر پہلی جگہ جائے تو وہاں قصر کرے، یا وہاں سے سفر کیا تو بھی وہ ختم ہو جائے گا، یا وہاں سے اپنے وطن میں داخل ہوا ہو تو بھی وہ وطن مٹ جائے گا۔ م۔

واذا نوى المسافر ان يقيم بمكة و منى خمسة عشر يوما لم يتم الصلوة......الخ

اور جب مسافر نے مکہ اور منیٰ میں اقامت کرنے کی نیت کی۔ ف۔ یعنی ایسی کسی بھی دو جگہوں میں رہنے کی نیت کی کہ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ مستقل ہو۔ محیط السرخسی۔ خمسة عشر الخ پندرہ دن تک۔ ف۔ یعنی ایسے دو مقاموں میں پندرہ دن رہنے کی نیت کی لم یتم الخ تو وہ نماز پوری نہیں پڑھے گا (بلکہ قصر کرے گا) لان الاعتبار الخ کیونکہ دو جگہوں کے درمیان نیت کے معتبر ہو جانے کا تقاضا تو یہ ہو جاتا ہے کہ پھر کئی مقامات میں بھی نیت معتبر ہو جایا کرے۔ ف۔ یعنی اگر دو مقامات میں ملا کر پندرہ دن کی اقامت کی نیت سے مقیم ہو سکتا ہو تو پھر دو مقامات سے زائد مقامات میں بھی ملا کر مقیم ہونے کو جائز سمجھا جائے۔ المبسوط۔ ن۔ وهو ممتنع الخ مگر یہ بات کبھی جائز نہیں ہو سکتی ہے۔ ف۔

کیونکہ اس سے تو یہ بات لازم آتی ہے کہ آدمی کبھی بھی مسافر نہ ہو، کیونکہ مسافر کے لئے بھی کسی نہ کسی منزل پر ٹھہرنا ضروری ہے، پس سفر میں کئی مقامات پر اقامت ضروری ہوئی لان السفر الخ کیونکہ سفر میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ف۔ اب اگر تم مسافر کی ہر ہر منزل کی اقامت کو جمع کرو تو اکثر وہ اقامت پندرہ دنوں سے بھی بڑھ جائے گی، اس طرح کئی مقامات میں پندرہ دنوں کی اقامت سے وہ مسافر نہ رہے بلکہ مقیم ہو جائے۔ ن۔ م۔ اس تفصیل سے یہ نتیجہ نکلا ہے کہ ایک سے زائد مقامات کی اقامت معتبر نہیں ہو گی، بلکہ ایک ہی مقام میں پندرہ دنوں کی اقامت ہو تو وہ معتبر ہو گی، لہٰذا دو مستقل مقامات پر جیسا کہ مکہ اور منیٰ میں ہے پندرہ دنوں کی اقامت بھی جائز نہ ہو گی۔

الا اذا نوى ان يقيم بالليل في احدهما فيصير مقيما بدخوله......الخ

ہاں معتبر ہونے کی صورت یہ ہو گی کہ یہ نیت کرلے کہ دن بھر جہاں بھی گزار دوں مگر رات فلاں جگہ ہی میں گزاروں گا، محیط السرخسی۔ فيصير الخ لہٰذا اس جگہ میں داخل ہوتے ہی مقیم ہو جائے، ف۔ حاصل یہ ہے کہ جب اقامت کی نیت اس طرح صحیح ہو گئی تو پھر اسی وقت سے مقیم کہا جائے گا اور کب سے پوری نماز ادا کرنے کا حکم دیا جائے گا، تو اگر وہ شخص اس علاقہ میں اس جگہ پہلے پہنچا ہو جہاں سے اسے رات نہیں گزارنی ہے، بلکہ یہاں سے پھر دوسری جگہ جانا ہو گا تو آنے کے بعد بھی وہ مسافر رہے گا بلکہ اس کے بعد بھی رات کو دوسری جگہ پہنچنے تک مسافر رہے گا، اور وہاں پہنچتے ہی مقیم ہو جائے گا اور نماز میں پوری چار رکعتیں پڑھے گا۔ الخلاصہ وغیرہ۔

لان اقامة المرء مضافة الى مبيته......الخ

کیونکہ آدمی جس جگہ رات گزارتا ہے اسی کی طرف مقیم ہونے کی نسبت کی جاتی ہے، اور اگر وہ شخص پہلے اسی جگہ پہنچا جہاں رات رہنے کی نیت کی ہے تو وہ مقیم ہو گیا، اس کے بعد اگر کہیں آگیا تو وہ اب مقیم کی نماز یعنی چار رکعتیں ہی پڑھے گا کیونکہ وہ مقیم

ہو کر وہاں سے نکلا ہے اور رات کو وہیں آنا ہے۔م۔یہ سب احکام اس صورت کے ہیں جبکہ دونوں مقامات خود مستقل ہوں جیسے کہ مکہ اور منیٰ ہیں، اور اگر وہ دونوں ایسے ہوں کہ کوئی ایک دوسرے کے ماتحت ہوں یہانتک کہ اس جگہ کے لوگوں کو نماز جمعہ و عیدین کے لئے وہاں جانا واجب ہو تو ان دونوں میں پندرہ دن کی اقامت کی نیت سے مقیم ہو جائے گا، کیونکہ یہ دونوں جگہیں دو ہو کر بھی حکماً ایک ہی ہیں۔المفید۔التحفہ۔ع۔محیط السرخسی۔ھ۔

حاصل یہ ہے کہ تابع وہ جگہ ہے جہاں سے لوگوں پر دوسرے کے جمعہ میں حاضر ہونا واجب ہو، اور اگر جگہ ایسی نہ ہو تو وہ تابع نہیں ہے بلکہ مستقل ہیں، اور متن کا مسئلہ ایسے ہی دو مواقع کے ہیں جو اپنی جگہ پر مستقل ہوں۔م۔ایام حج کے ذی الحجہ کے پہلے عشرہ میں حاجی جب مکہ میں داخل ہوا اور فوراً وہاں پندرہ دن رہنے کی نیت کرلی پھر بھی وہ مقیم اس لئے نہیں ہوگا کہ چند ہی دنوں میں اسے عرفات جانا ضروری ہے، فع۔ھ۔اور اگر اس نے مکہ عرفات و منیٰ ملا کر یعنی تینوں جگہوں میں ملا کر رہنے کی نیت کی تو صحیح نہیں ہے، اور اگر منیٰ سے واپسی کے بعد مکہ میں اقامت کی نیت کی تو نیت صحیح ہو گی اور وہ مقیم ہو جائے گا۔م۔

ومن فاتته صلوة فی السفر قضاء ها فی الحضر رکعتین ومن فاتته فی الحضر قضاها فی السفر اربعا لان القضاء بحسب الاداء والمعتبر فی ذلك آخر الوقت لانه المعتبر فی السبية عند عدم الاداء فی الوقت.

ترجمہ:-اور جس کی سفر کی حالت میں نمازیں قضاء ہو گئیں ہوں تو انہیں حالت حضر میں دو دو رکعت کر کے ادا کرے گا اور جس کی حالت حضر میں نمازیں قضاء ہو گئیں ہوں وہ انہیں حالت سفر میں پوری چار چار رکعتوں کے حساب سے ادا کریگا، کیونکہ قضاء ادا کے مطابق ہوتی ہے، اور جس اداء کے مطابق قضاء ہوتی ہے اس میں آخر وقت کا اعتبار ہوتا ہے کیونکہ وہ وقت جو نماز کے واجب ہونے کا سبب ہوتا ہے آخری وقت ہی سبب ہونے میں معتبر ہے جب کہ وقت کے اندر ادا نہ کی ہو۔

توضیح:-سفر کی فوت شدہ نماز کو حضر میں ادا کرنا، حضر کی فوت شدہ نماز کو سفر میں ادا کرنا، نماز کی ادائیگی کے لئے وقت کا اعتبار

ومن فاتته صلوة فی السفر قضاء ها فی الحضر رکعتین......الخ

اور جس شخص کی کوئی نماز سفر میں قضاء ہو گئی ہو تو اگر اس کو حضر میں قضاء کرے تو دو رکعت نماز پڑھے، ف۔کیونکہ اس صورت میں اس پر دو ہی رکعتیں فرض ہوئی ہیں، اور وقت جو موجب تھا وہ گذر چکا ہے اس لئے اب فرض بدل نہیں سکتا ہے، م، امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے، ع، **ومن فاتته فی الحضر الخ** اور جس کی نماز حالت حضر میں قضاء ہوئی ہو وہ اگر اسے حالت سفر میں ادا کرنا چاہئے تو پوری چار رکعتیں ہی پڑھے، ف یہ حکم بالاجماع ہے۔**لان القضاء الخ** کیونکہ ادا کے مطابق ہی قضاء کرنی ہوتی ہے، ف یعنی جتنی رکعتیں ادا کرنی تھیں، اگر وہ ادا نہیں کی جا سکیں یہاں تک کہ قضاء ہو گئیں تو اتنی ہی رکعتیں ادا کرنی ہوں گی، یہ حکم تو نماز کے ذاتی ارکان کے بارے میں ہے، بخلاف صفات کے کہ مثلاً بیماری کی وجہ سے کسی کو بیٹھ کر اشارہ سے پڑھنا واجب تھی مگر وہ نہ پڑھ سکا یہاں تک کہ نماز قضاء ہو گئی، اب تندرستی آجانے کے بعد اسے کھڑے ہو کر رکوع اور سجود سے ادا کرنی ہو گی، اسی طرح اگر تندرستی کی حالت کی نماز کو بیماری کی حالت میں ادا کرنے کے لئے جس طرح ممکن ہو بیٹھ کر، اشارہ سے، یہاں تک کہ لیٹ کر بھی پڑھنی جائز ہے بلکہ ادا کر لینی چاہئے، ھ، ع، ف۔

والمعتبر فی ذلك آخر الوقت لانه المعتبر فی السبية عند عدم الاداء فی الوقت......الخ

اور جس ادا کے مطابق قضاء ہوتی ہے اس میں آخری وقت کا اعتبار ہوگا، ف یہاں تک کہ اگر ظہر کے اول وقت میں کوئی مقیم تھا لیکن وقت ختم ہونے سے پہلے وہ سفر کو نکلا یہاں تک کہ آبادی سے باہر ہوتے ہی نماز یاد آئی لیکن اس وقت صرف اتنا سا وقت رہ گیا تھا کہ اس میں صرف ایک رکعت بلکہ اس سے بھی کم ادا کر سکتا تھا تو اس پر دو ہی رکعتوں کی قضاء واجب ہو گی کیونکہ وہ آخر

وقت میں مسافر ہو چکا ہے اور اسی وقت کا اعتبار ہی ہوتا ہے، م۔ **لانه المعتبر الخ** کیونکہ وہ وقت جو واجب ہونے کا سبب ہوتا ہے اس کا آخری وقت ہی سبب ہونے میں معتبر ہوتا ہے جب کہ وقت نماز کے اندر ادانہ کی گئی ہو، ف اور اگر کوئی اول وقت میں ظہر ادا کر کے سفر کو نکلا، اور آبادی سے دور ہو گیا، اور اس وقت بھی ظہر کا آخری وقت باقی رہ گیا تھا تو اب اس پر دو رکعتیں لازم نہ ہو گی کیونکہ وہ تو چار رکعتیں ادا کر چکا ہے اسی طرح اگر کوئی سفر سے واپس آیا اور وطن آنے سے پہلے ابتداء وقت میں اس نے ظہر کی دو رکعتیں پڑھ لیں پھر وہ آبادی میں داخل ہوا تو اس پر بھی اب چار رکعتیں لازم نہ ہو گی کیونکہ وہ تو دو رکعتیں پہلے ہی ادا کر چکا ہے، اور اگر وطن میں داخل ہوتے وقت تک اس نے نماز ادا نہیں کی تھی اور اب صرف ایک رکعت ادا کرنے کا وقت باقی ہے تو اس پر چار رکعتوں کی قضاء لازم ہو گی۔ اور اگر وقت بالکل باقی نہ بچا ہو تو دو ہی رکعتیں اس پر لازم رہے گی۔

یہ سارے مسائل اس بناء پر نکلے کہ آخری وقت کا اعتبار ہوتا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ بندہ جب ایمان لے آیا تو اس کے ذمہ نمازیں، رمضان کے روزے وغیرہ اللہ تعالیٰ کے احکام بجالانا اور منہیات و ممنوعات سے بچے رہنا بھی فرض ہوا، پھر نمازیں ادا کرنی بھی اس طرح لازم نہیں ہو گئیں کہ ایمان لاتے ہی نمازیں پڑھنی شروع کر دے گا بلکہ نمازوں کے پڑھنے کا جو اس نے اقرار کیا ہے انہیں اس طرح ادا کرنا کہ جب کسی نماز کا وقت آئے تو اس وقت ادا کرنے کا حکم اسے دیا گیا ہے، لہٰذا وقت جیسے جیسے آتا جائے گا ویسے ویسے اس پر ادائیگی لازم ہوتی جائیگی، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ہر روز ہر فرض نماز ادا کرنے کے لئے اسے اللہ عزوجل کا حکم ہوتا رہتا ہے، مگر بندہ کو اس کی پہچان وقت سے ہی دی گئی ہے، مثلاً ظہر کا وقت شروع ہوا تو اس نے جان لیا کہ مجھ پر میرے رب عزوجل کا حکم آیا کہ نماز ادا کر لو، جیسے رمضان کا دن آیا اور اس نے سمجھ لیا کہ مجھے روزہ رکھنے کا حکم ملا ہے، لیکن نماز اور روزہ کے درمیان یہ فرض ہے کہ روزہ صبح صادق سے غروب شمس تک پورا کر لینے کے بعد اس کے لئے مزید دوسرا کوئی وقت نہیں بچتا ہے، مگر نماز میں تو مثلاً ظہر کا وقت شروع ہوا اور اس نے پہچان کر نماز پڑھنی شروع کر دی، یہاں تک کہ اطمینان سے ختم کر لینے کے بعد بھی وقت بچ گیا اس کے باوجود دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں کیا گیا ہے، اسی طرح اگر بالکل ابتدائے وقت میں نماز شروع نہ کر کے درمیان وقت سے یا آخر وقت میں ہی نماز شروع کر کے ختم کر لینے سے بھی بہر صورت جائز ہوتی ہے، اسے قضاء بھی نہیں کہا جاتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی خدا کی ناراضگی یا نافرمانی ہوتی ہے۔

اب غور طلب بات یہ ہے کہ مذکورہ تفصیل کی بناء پر ہم اگر یہ سمجھیں کہ وقت کا پہلا حصہ ہی نماز کو واجب کرنے والا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ فوراً بلا تاخیر ابتداء وقت سے نماز شروع کر دینی چاہئے ورنہ تاخیر ہونے سے گناہ ہو گا، اس لئے یہ یقین کر لیا کہ وقت کا پہلا حصہ ہی نماز کو واجب کرنے والا ہے مگر کسی تنگی کے بغیر، یعنی یہ بھی گنجائش رہ جاتی ہے کہ تاخیر کی جائے، اس سے معلوم ہوا کہ یقینی طور سے وقت لازم کرنے والا نہ ہوا اور جب ابتداء وقت میں ادا نہیں کی گئی تو وہ نماز اب بعد کے اجزاء میں واجب ہوئی، اس میں وجوب اس طور پر ہوا کہ اس میں نہ پڑھنے سے اس کے بعد کے اجزاء میں واجب ہو، اسی طرح موجب وقت ہے بدلتا اور ٹلتا رہا، یہاں تک کہ بالکل آخری وقت آیا اس طرح پر کہ اس کے بعد مزید تاخیر کی گنجائش نہیں رہی، در حقیقت پورے طور پر وجوب اسی وقت میں ہوا کہ اب یہ ٹل نہیں سکتا ہے، اسی وجہ سے کہ مصنفؒ نے یقینی طور سے یہ فرمایا دیا کہ اصل میں سبب وقت کا آخری حصہ ہے، اسی قول کو امام کرخیؒ اور دوسرے محققین علماء نے اختیار کیا ہے۔

اب میں مترجم کہتا ہوں کہ ظاہری دلیل کا تو تقاضا یہ تھا کہ آخری وقت جب اتنا سا باقی رہ جائے کہ اس میں صرف اس وقت کا فرض ادا ہو سکے مثلاً ظہر کی چار رکعتیں پوری ہو جائیں، تو یہ آخری حصہ اپنی تنگی کے ساتھ موجب بن جائے، اور یہی قول صحیح بھی ہے، لیکن اگر حائضہ عورت ظہر کے اتنے آخر وقت میں پاک ہوئی کہ صرف ایک رکعت کے ادا کرنے کا وقت باقی رہ گیا، یا اس سے بھی کچھ کم تو بھی ظہر کو قضاء کرنا اس پر واجب ہے، اسی طرح جب کوئی کافر مسلمان ہو یا نابالغ شخص بالغ ہوا کہ دوسری شرائط کے بعد اب صرف اتنا سا وقت باقی رہ گیا کہ اس میں تحریمہ باندھ سکے پھر بھی اس نماز کی قضاء واجب ہے، تو آخری اتنا سا وقت کہ

اس میں تکبیر تحریمہ کہہ سکے یہ صرف بعد کے وقت میں اس نماز کی قضاء کرنے کے لئے موجب ہے، اور اداء نماز کے لئے موجب اس سے مکمل کا اتنا وقت ہے جس میں وہ پوری نماز ادا کر سکے، میرے نزدیک یہی تحقیقی بات ہے، واللہ تعالیٰ اعلم۔

اور قضاء کے واجب ہونے کا راز وہی ہے جسے میں نے اوقات کی تحقیق کرتے ہوئے بیان کر دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۲۴ چوبیس گھنٹوں کے دن اور رات کے درمیانی جو شرعاً ہم پر وظیفہ مقرر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم پانچ اوقات کی نمازیں ادا کریں، ان پانچ اوقات میں سے ظہر، عصر عشاء اور فجر کی شناخت صرف ان ملکوں کے لئے ہے جن میں پانچوں نمازوں کی شناخت موجود ہے کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کچھ مقامات ایسے موجود ہیں جن کے اوقات اس طرح کے نہیں ہوتے ہیں مثلاً امریکہ وغیرہ میں تو ۲۲ گھنٹوں کا دن اور ۲ گھنٹوں کی رات موجود ہے، اس دلیل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ او قات حقیقت میں نمازوں کو واجب نہیں کرتے ہیں کیونکہ حقیقت میں واجب کرنے والا حکم خداوندی ہے، یہاں تک کہ اس حدیث میں جس میں دجال کے آنے کا ذکر ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ اس وقت کا ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا اور پانچوں نمازیں اندازہ سے پڑھنی ہوں گی، اسی لئے حائضہ عورتوں سے ایام حیض کی نمازیں معاف کر دی گئی ہیں، اب اگر اس کا حیض ایسے وقت میں ختم ہوا اور وہ ایسے وقت میں پاک ہو کہ نماز کی دوسری شرطوں کے پائے جانے کے بعد نماز کی ادائیگی کے لئے صرف تکبیر تحریمہ کہنے کا وقت ملا، تو کیا اس صورت میں اس وقت کی نماز بھی اس پر قضاء لازم ہوگی یا نہیں، تو ہمارے فقہاء کرام نے کہا ہے کہ ہاں اس کی قضاء لازم آئے گی اور دوسری نمازوں کی طرح یہ ساقط نہ ہوگی، اس میں بھی وہی راز ہے جو ذکر کیا گیا ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے من ادرك ركعة من الفجر فقد ادرك الفجر۔ الخ اس میں ایک رکعت کا بھی وقت پالینے سے فجر کا وظیفہ (فرض) پانے کو بتادیا ہے کہ فجر کو پالیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس کا اثر قضاء میں ظاہر کے اعتبار سے ہوا ہے، کیونکہ اداء کرتے وقت بھی تو دو رکعتوں کے اداء کرنے کی گنجائش نہیں رہی ہے اب جب کہ ہم نے یہ کہا ہے کہ ایک مکلّف انسان کو ظاہری طور سے وقت کی پابندی لازم ہے، تو جیسے ہی دو رکعت فجر کی ادائیگی کا وقت باقی رہے گا اس پر جلد از جلد تنگی وقت کا لحاظ کرتے ہوئے اس کی ادائیگی لازم ہوگی، اس لئے کہ اب اس کے خیال اور گمان میں اس وقت میں آئندہ زیادتی کی گنجائش نہیں رہی ہے، اور اس خیال سے کہ ان ہی اوقات میں پنجگانہ کی ادائیگی لازم ہوتی ہے اس پر سے اس کی قضاء ساقط نہ ہوگی، اسی بناء پر جہاں تک جلد ممکن ہو بلا تاخیر اس کو ادا کر لینا اور تاخیر نہ کرنا لازم اور تاخیر کرنا مکروہ ہے، ساتھ ہی نمازوں کی ترتیب کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے، یہاں تک کہ اگر پورے چوبیس گھنٹے وہ اس کی ادائیگی میں تاخیر کر دے اور اس کو ادا نہ کرلے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے مکمل وظیفہ کم کر دیا، فافہم، کہ مسئلہ بہت اہم اور باریک ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب ۱۲۔ م۔

والعاصی والمطیع فی سفره فی الرخصة سواء وقال الشافعیؒ سفر المعصیة لایفید الرخصة لانها تثبت تخفیفا فلاتتعلق بما یوجب التغلیظ ولنا اطلاق النصوص ولان نفس السفر لیس بمعصیة وانما المعصیة مایکون بعده اویجاوره فصلح متعلق الرخصة والله اعلم.

ترجمہ:- حالت سفر میں رخصت پانے کے بارے میں گنہگار اور نیک سب برابر ہیں، لیکن امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ گناہ کے لئے سفر رخصت کا فائدہ نہیں دے گا، اس وجہ سے کہ رخصت آدمی کے لئے تخفیف کو ثابت کرتی ہے، اس لئے رخصت ایسی چیز سے متعلق نہ ہوگی جو سختی کو لازم کرتی ہو، اور ہماری دلیل نصوص کا مطلق ہونا ہے، اور اس لئے بھی کہ نفس سفر تو گناہ نہیں ہے، اور گناہ تو وہ کام ہے جو سفر کے بعد ہوگا، یا وہ معصیت سفر کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے، پس سفر اس لائق ہوا کہ رخصت اس سے متعلق ہو جائے۔ واللہ اعلم۔

توضیح:۔ رخصت سفر کے بارے میں نافرمان اور فرمان بردار کا حکم، قرآن کریم اور حدیث سے دلیل، چند مسائل سفر کی قسمیں، سفر واجب کی تعریف، سفر مستحب کی تعریف، سفر مباح، سفر مکروہ، سفر حرام

والعاصی والمطیع فی سفرہ فی الرخصۃ سواء......الخ

اور جو شخص اپنے سفر میں نافرمان ہے اور جو شخص اپنے سفر میں فرماں بردار ہے، دونوں رخصت کے بارے میں برابر ہیں، ف یعنی دونوں کو دو ہی رکعت پر قصر کرنے میں یکساں اجازت ہے، نافرمانی کے سفر کی مثال یہ ہے کہ کوئی آدمی شراب لینے کو تین منزل جاتا ہو، اور فرمانبردار کی مثال یہ ہے کہ علم حاصل دین کرنے کے لئے یا حلال تجارت کرنے کے لئے سفر کرتا ہو، تو دونوں ہی اس سفر کے دوران اور نیت اقامت سے پہلے تک نماز میں قصر کر کے دو دو رکعتیں پڑھیں۔

وقال الشافعیؒ سفر المعصیۃ لایفید الرخصۃ لانہا تثبت تخفیفا فلاتتعلق بما یوجب التغلیظ......الخ

اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ نافرمانی کے سفر سے رخصت حاصل نہیں ہوتی ہے، ف لہذا اسے پوری چار رکعتیں ہی پڑھنی ہوں گی۔ م۔ یہی قول امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی ہے۔ ع۔ لانہا تثبیت الخ اس وجہ سے کہ رخصت تو آدمی پر آسانی پیدا کر دیتی ہے، لہذا اس رخصت کا تعلق ایسی چیز سے نہ ہوگا جو سختی کو واجب کرتی ہو، ف یعنی نافرمانی تو سختی اور عذاب کا سبب بنتی ہے اس لئے اس کے ساتھ رخصت اور تخفیف کا حکم متعلق نہیں ہو سکتا ہے، اور کبھی یہ جواب دیا ہے کہ رخصت تو اللہ کی طرف سے رحمت اور انعام ہے اس لئے عذاب کے مستحق کو رخصت نہیں دی جاسکتی ہے، اس دلیل کا جواب احناف کی طرف سے اس طرح سے دیا جائیگا کہ یہ ایک عقل اور قیاسی بات ہے، جو نص کے مقابلہ میں نہیں آسکتی ہے، اب اگر نص میں اجازت نکلتی ہو تو ہم اپنی رائے سے اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے ہیں، دوسرے یہ کہ دونوں باتیں دو حیثیت سے ہو سکتی ہیں اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

ولنا اطلاق النصوص ولان نفس السفر لیس بمعصیۃ وانما المعصیۃ مایکون بعدہ......الخ

ہماری دلیل نصوص کا مطلق ہونا ہے، ف یعنی جن نصوص میں مسافر کو رخصت ملی ہے ان کے مطلق ہونے کی وجہ سے رخصت کا حکم ہر مسافر کو شامل ہے، اور نص میں فرماں برداری مسافر ہونے کی کوئی قید نہیں ہے، اس لئے ہم نص کو مطلق ہی رکھتے ہیں، ان نصوص میں سے ایک تو آیت پاک ہے ﴿فَمَن كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ﴾ الایہ، یعنی جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو، اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا ہے، کہ تم میں جو سفر طاعت میں ہو، بلکہ مطلقاً سفر کا بیان ہے، ان نصوص میں سے ایک یہ فرمان رسول اللہ ﷺ بھی ہے فرض المسافر رکعتان، یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ مسافر کے لئے دو ہی رکعتیں فرض ہیں، وہ خواہ مطیع ہو یا عاصی ہو.

ولان نفس السفر لیس بمعصیۃ وانما المعصیۃ مایکون بعدہ اویجاورہ......الخ

اور اس وجہ سے بھی کہ نفس سفر میں تو کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، ف اور نماز کو قصر کرنے کا سبب یہی نفس سفر ہے، وانما المعصیۃ الخ اور معصیت تو وہ فعل ہے جو سفر کے بعد ہوگا، ف جیسے میں منزل جا کر شراب خریدنا، یعنی اس سفر کے بعد معصیت ہوگی، او یجاورہ الخ یا وہ معصیت سفر کے ساتھ ساتھ ہوتی ہو، ف جیسے والدین کی نافرمانی کے باوجود سفر کرنا، اس طرح اس سفر کے ساتھ ہی گناہ ہے اس میں سفر ایک کام ہے اور گناہ دوسرا کام ہے، دوسری چیز ہے، یہاں تک کہ اگر والدین راضی ہوتے جب بھی یہ سفر یوں ہوتا، اور والدین کی خوشی بھی ساتھ ہوتی، اور رخصت نماز کو قصر کرنے کی نفس سفر سے ہے، فصلح الخ اس بناء پر سفر اس لائق ہوا کہ رخصت کا تعلق اس سے ہو جائے، ف جب کہ نفس سفر میں کوئی معصیت نہیں ہے، اچھی طرح مسئلہ کی باریکی کو سمجھ لو، واللہ تعالے اعلم۔

چند ضروری مسائل

معلوم ہونا چاہئے کہ سفر کے کل پانچ قسمیں ہیں (۱) واجب (۲) مندوب (۳) مباح (۴) مکروہ (۵) حرام، (۱) سفر واجب تو وہ سفر کہلائیگا جو حج فرض یا ہجرت واجب کے لئے کیا جائے (۲) سفر مندوب وہ ہے جو مثلاً حصول علم یا رسو اللہ ﷺ کے مزار مبارک کی زیارت یا مسجد اقصی یا زیارت والدین کے لئے کیا جائے (۳) سفر مباح، جو فعل مباح مثلاً تجارت کے لئے ہو (۴) سفر مکروہ وہ ہے جو بغیر خاص صحیح ضرورت کے ایک شہر سے دوسرے شہر کو ہوتا رہے۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ صرف سیر و تماشا کی غرض سے مکروہ ہے، جیسے ان اوقات کے حالات طور طریقے جاننے کے لئے، البتہ اگر تجارت کے مقاصد اور طریقے جاننے کے لئے ہو تو جائز ہے، (۵) سفر حرام وہ ہے جو کسی گناہ کے مقصد سے کیا جائے تو ہمارے نزدیک ان میں سے ہر ایک سفر میں نماز کا قصر جائز ہے۔

پھر میں مترجم کہتا ہوں کہ سفر مکروہ اور حرام کے لئے جو قصر کی اجازت ملی ہے وہ دراصل اس نافرمانی کے حق میں زیادہ سختی ہے، جیسے کافر کو دنیا میں زیادہ دولت کا ملنا، امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے سفر میں گنہگار ہو اس کو بالاتفاق اس سفر میں اچھے اچھے عمدہ دل پسند کھانے کھانا مباح ہے، حالانکہ وہ ایسی غذا سے گناہ کے کام کرنے کی قوت حاصل کرتا ہے، ابن عربیؒ نے کہا ہے کہ مجھے تعجب کہا ہے کہ جو شخص نافرمان کو سفر میں کھانا نہ ملنے اور مخمصہ (انتہائی مجبوری) کے وقت مردہ کھانے کو مباح کہتا ہے باوجودیکہ وہ شخص گناہ کام میں سرگرم ہو، اور جو جائز کہے اس نے خود غلطی کی۔

قرطبیؒ نے کہا ہے کہ اس مقام میں ابن العربی سے غلطی ہوئی ہے، قول صحیح تو اس کے خلاف ہے، کیونکہ یہ فرمان اگر ایسے وقت میں مردہ نہ کھا کر مر جائے تو یہ اور زیادہ گناہ ہے، لہٰذا اسے مردہ کھانا جائز ہے، بہت ممکن ہے کہ بعد میں وہ توبہ کرے اور اسے توفیق مل جائے جس سے اس کا گناہ معاف ہو جائے، اور مخمصہ کے وقت میں مردہ کھانا صرف جائز ہی نہیں ہے بلکہ واجب ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی ایسے وقت میں مردہ کھانے سے باز رہے اور مر جائے تو وہ قتل نفس کا گنہگار ہوگا، مع، اس عبارت میں علامہ عینیؒ نے رسول اللہ ﷺ کے مزار مبارک کی زیارت کو مستحب لکھا ہے، اور یہی ہمارے فقہاء کرام کی ظاہر عبارت ہے، کہ وہ تمام مستحبات میں افضل اور واجب ہونے کے قریب ہے، اور اس مترجم کے نزدیک جو شخص اس زیارت کا دلی مشتاق ہوگا اس کے نور ایمان کا ظہور ہوگا، اور دوسرے واجبات کی ادائیگی کا جتنا زیادہ شائق ہوگا، تو اس قریب وجوب کا کہیں زیادہ شائق ہوگا، اور مومن کی شان بھی یہی ہے، اللہ تعالے ہم سب کو اس زیارت کی توفیق بخشے، آمین یا ارحم الراحمین۔ م۔

خلیفہ المومنین اگر سفر کرے تو وہ بھی مسافر ہوگا، الخلاصہ یہی قول اصح ہے، اگرچہ بعضوں کا اس میں اختلاف بھی ہے، جیسا کہ ذخیرہ میں ہے، اور منتقی میں ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو گرفتار کر کے یا اغواء کر کے لے بھاگا، اور اسے یہ نہیں معلوم کہ کہاں لے جاتا ہے تو فرمایا ہے کہ وہ اپنی نمازیں پوری کرتا رہے، یہاں تک کہ تین دنوں کا راستہ طے کر لینے کے بعد سے قصر کرنا شروع کر دے، اگرچہ اس کے بعد تھوڑی دور ہی لئے جائے، اور اگر شروع سے ہی قصر کرنا شروع کر دیا تو پھر بھی جائز ہوگا، اس کے بعد اگر تین دن سے کم لے گیا ہو تو ان نمازوں کو دوبارہ پڑھ لے۔ ع۔

پھر اس کے ایک صفحہ کے بعد لکھا ہے کہ اقامت کے نیت کرنے کے بارے میں اس اغواء کرنے والے کی نیت کا اعتبار ہوگا، م، جوامع الفقہ میں ہے کہ جس کی دو بیویاں علیحدہ علیحدہ دو شہروں میں ہوں وہ ان میں سے جس کسی شہر میں داخل ہوگا مقیم ہو جائے گا، محیط میں ہے کہ اگر کسی کی بیوی ایسے شہر میں مر گئی جس میں اس کا اپنا کوئی اور باقی نہیں رہا، البتہ کچھ زمین اور ایک گھر رہ گیا ہے تو ایک قول کے مطابق وہ علاقہ اب اس کا وطن نہیں رہا، لیکن دوسرے قول میں اب بھی وطن باقی ہے، اگر کسی مسافر لڑکی نے کسی شہر میں نکاح کر لیا تو نکاح کرتے ہی وہ مقیمہ بن جائے گی، اگر کسی شخص کو زبردستی شہر سے نکال دیا گیا وہ قیدی کی طرح قصر

کرے، حائضہ جب حالت سفر میں پاک ہو گئی اور وہاں سے منزل مقصود تک سفر کے فاصلہ سے کم رہ گیا ہو تو وہ پوری نماز پڑھے، اور یہی صحیح ہے، اس طرح جب عورت سفر کی حالت میں طلاق سے بائنہ ہو گئی تو جب وہاں سے منزل مقصود تک مقدار سفر سے کم ہو تو پوری پڑھ لے، جمعہ کے دن زوال سے پہلے ہو یا اس کے بعد سفر کرنا مکروہ نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک دونوں صورتوں میں مکروہ ہے، اور امام مالکؒ کے نزدیک جمعہ کے بعد مکروہ نہیں ہے، رمضان کے مہینہ میں سفر اختیار کرنا مکروہ نہیں ہے، مع، یہ تو ظاہری حکم ہے، اور اگر بدنیتی کی بناء پر قصداً رمضان میں افطار کرنے کے لئے ایسا کیا ہو اللہ تعالے دلوں کے حال سے آگاہ ہے۔ م۔

سفر میں حقیقتاً دو نمازوں کو یعنی ظہر عصر اور مغرب وعشاء جمع کرنا جائز نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک جائز ہے، اور ظاہری طور پر دو نمازوں کو جمع کرنا ہمارے نزدیک بھی جائز ہے، یعنی اس طرح سے کہ ظہر کی نماز میں اتنی تاخیر کرے کہ بالکل آخر وقت ہو جائے، اس وقت سواری سے اتر کر ظہر کی نماز پڑھ لے، اتنے میں وقت ختم ہو جائے اور اول وقت میں عصرؑ کی نماز پڑھ لے، اسی طرح مغرب میں اتنی تاخیر کرے کہ وقت ختم ہونے کے قریب ہو جائے، اس وقت سوراای سے اتر کر مغرب کی نماز پڑھ لے، پھر فوراً عشاء کا وقت شروع ہوتے ہی عشاء کی نماز بھی پڑھ لے، بس سفر کی مجبوری کی وجہ سے ظہر اور مغرب کی نماز کو قصداً اتنی دیر سے پڑھنا مباح کہا گیا ہے، اس سلسلہ میں ہماری دلیل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو کبھی نہیں دیکھا ہے کہ آپ نے کوئی نماز بے وقت پڑھی ہو، یعنی اپنے اختیار کے ساتھ سوائے مقام مزدلفہ کے کہ وہاں مغرب اور عشاء کو ملادیا، پھر صبح کی نماز پڑھی، دوسرے روز اس وقت کے قبل وقت یعنی غلس اور تاریکی میں پڑھی، صحیحین میں اور بھی حدیث ہے اور مقام عرفہ کی جمع بین الظہر والعصر کو اس جگہ غالباً شہرت کے وجہ سے بیان نہیں کیا ہے، اور فجر میں بے وقت سے یہ مراد ہے کہ آپ نے وقت معمول یعنی اس وقت جب کہ اب اکثر پڑھا کرتے تھے اس سے بھی پہلے وقت میں نماز پڑھ لی۔

اور صحیح مسلم کی اور ایک حدیث میں ہے کہ لیلۃ التعریس کی نماز فجر قضاء ہو جانے اور صحابہ کرامؓ کے گھبرانے کے بارے میں مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ سو جانے میں کچھ کوتاہی نہیں ہے، اور ہماری روحیں تو اللہ تعالے کے قبضہ قدرت میں ہیں، جب اس نے چاہا ان کو چھوڑا، اور کوتاہی اور قصور تو جاگنے میں ہے کہ نماز کو قصداً تاخیر کرتا رہے، یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت آجائے، یہ حدیث اس بات میں واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے اختیار کے ساتھ بے وقت نماز نہیں پڑھی ہے نیز ایک نماز کو دوسرے وقت میں لے جانا بھی تقصیر اور گناہ کا کام ہے، اللہ تعالے کا یہ فرمان ہے ﴿اِنَّ الصلوۃَ کَانت عَلیَ الْمُوْمِنِینَ کِتَاباً مَوْقُوْتاً﴾ یعنی مومنوں پر اوقات کی تعیین کے ساتھ نماز فرض کی گئی ہے، اور حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ من جمع بین الصلوتین فقد اتی باباً من الکبائر کہ جس نے دو نمازوں کو ایک ساتھ جمع کیا وہ کبائر کے ایک دروازہ پر آیا، شیخ ابن کثیرؒ نے اس کی اسناد کو جید بتایا ہے اسی طرح فرمان خداوندی ہے ﴿فَخَلَفَ مِن بَعدِھِم خَلف اَضَاعُو االصَّلوۃَ﴾ الآیہ۔ یعنی پھر ان نیکوں کے پیچھے ان کے قائم مقام ایسے نالائق ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا، اس کی تفسیر میں عام اسلاف کا قول یہ ہے کہ نماز میں تاخیر کر دی یہاں تک کہ دوسری نماز کا وقت آگیا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ امام شافعیؒ اس آیت میں اس طرح تاویل کر سکتے ہیں کہ یہ ضائع کرنا سے مراد کوتاہی کرنا ہے، اور سفر وغیرہ مجبوری میں شرعی جواز بھی ہے یہاں تک کہ تمہارے نزدیک بھی تاخیر جائز ہے، اس طرح حضرت عمرؓ کے قول کے صریح معنی یہ ہوئے کہ وہ ایک کبیرہ کے دروازہ پر آیا لیکن ابھی تک کبیرہ کے اندر داخل نہیں ہوا یہاں تک کہ اگر اور بھی کچھ سستی کی تو قضاء کرنے میں کبیرہ کا مرتکب ہوگا، بس اس قول سے تو صراحۃً جائز ہونا معلوم ہوا پھر بھی اس میں ہوشیاری اور احتیاط چاہئے، جیسے کہ حدیث میں ہے کہ من حام حول الحمیٰ یوشك ان یقع فیه، یعنی جو شخص شاہی چراگاہ کے گرد گھوما قریب ہے کہ اس

میں واقع ہو جائے، یعنی مجرم ہو جائے گا، لہٰذا اسی بات میں احتیاط ہے کہ اس کے آس پاس بھی نہ جائے اور نماز کا وقت مفروض ہونا عذر کے ساتھ جمع ہونے کے منافی نہیں ہے۔

اور یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ کئی نماز جن کو ایک وقت میں جمع کرنا مطلقاً ممنون ہے مگر اس میں سے مزدلفہ میں جمع کرنا مستثنیٰ ہے، اس طرح ایک عام سے ایک مخصوص کر لیا گیا اس وجہ سے احناف کے عام قاعدہ کے مطابق جب عام ایک بار مخصوص ہو گیا ہو تو دوبارہ اس سے تخصیص دلیل ظنی سے بھی ہو سکتی ہے، یعنی عموماً ہر حالت میں نماز موقت مفروض ہونا قرآن سے ثابت ہوا، پھر اس عام کو تمام احناف نے مشہور حدیث جس میں مزدلفہ اور عرفہ میں جمع کرنے کا ہے، سے مخصوص کر دیا، تو اب تمہارے اصول کے مطابق بھی اے احناف حدیث آحاد سے سفر وغیرہ میں جمع کرنا جائز ہو گیا، اور جمع کرنے کی حدیثیں صحاح میں موجود ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرت انسؓ کی مروی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو جب جلدی چلنا ہی مقصود ہوتا تو ظہر کو تاخیر کرتے اور عصر کے اول وقت میں ظہر اور عصر دونوں کو ملا کر پڑھتے، اسی طرح مغرب میں تاخیر فرماتے یہاں تک کہ مغرب اور عشاء میں جمع کر لیتے جبکہ شفق چھپ جاتا تھا، اور صحیحین کی حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں بجائے لفظ (جبکہ شفق چھپ جاتا تھا) اس طرح ہے کہ بعد اس کے کہ شفق چھپ جاتا تھا، اس میں تو اس بات کی تصریح ہے کہ مغرب گذرنے پر عشاء میں جمع کرتے تھے، شیخ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ شفق کا لفظ مشترک ہے جو سرخی اور اس کے بعد کی سفیدی دونوں پر استعمال ہوتا ہے، اس لئے اس بات کا احتمال رہتا ہے کہ سرخی گذرنے کی بعد کی سفیدی میں پڑھتے ہوں، یہاں تک کہ امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق یہ مغرب کا آخری وقت ہے، پھر سپیدی ختم ہو کر تاریکی شروع ہوتے ہی عشاء کے وقت میں پڑھتے تھے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حق یہ ہے کہ یہ جواب دو وجہ سے کافی نہیں ہے، اول یہ ہے کہ ظہر میں یہ تاویل درست نہیں ہوتی ہے، کیونکہ اس میں عصر کے اول وقت ہونے کی تصریح ہے، اور اس میں تو عصر کے وقت کے داخل ہونے کے بعد جمع کرنا تھا، اس لئے مغرب میں جمع کرنا عشاء کے اول وقت میں ہوگا، دوم یہ کہ وہ احادیث جن میں نماز کے اوقات کا بیان ہے ان میں عشاء کے وقت کی ابتداء شفق کے غائب ہونے کے بعد آیا ہے، اور یہاں بھی شفق کے غائب ہونے کے بعد ہی جمع کرنے کا ذکر ہے، تو بھی عشاء کا اول وقت ہوگا، شیخ ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ تاویل نہ ہو تو حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث اور اس حدیث انسؓ کے درمیان معارضہ ہوگا، اور ہم حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث کو انکے راویوں کے فقیہ ہونے کی بناء پر ترجیح ہوگی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ انصاف کے تقاضا کے مطابق یہ جواب بھی درست نہیں ہے، کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں مقام عرفہ میں جمع کرنے کا ذکر نہیں ہے، اور لیلۃ التعریس میں فجر کو خلاف وقت پڑھنے کا بھی ذکر نہیں ہے، پس جب کلیہ پورا نہ ہوا تو یہ جمع کرنا بھی مذکور نہیں ہے، اس کے علاوہ معارضہ کیوں کیا جائے، جبکہ یہ معلوم ہوا کہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں بلا عذر کا بیان ہے، اور حضرت انسؓ وغیرہ کی حدیث میں عذر سفر کا بیان ہے، لہٰذا معارضہ ختم ہو گیا، البتہ وہ بات اچھی ہے جو شیخ ابن الہمامؒ نے بیان فرمائی ہے کہ بے وقت جمع کرنے کی حدیثوں میں ایک طرح کا اضطراب واقع ہوا ہے، اسی بناء پر حضرت ابن عباسؓ سے رسول اللہ ﷺ مدینہ میں بغیر عذر سفر اور بیخوفی اور بغیر بارش کے پانچ اور سات کو جمع کرنا صحیح مسلم میں مروی ہے، اور اس طرح جمع کرنے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ ترمذیؒ نے فرمایا ہے کہ اس پر اسلاف میں سے کسی کا بھی عمل نہیں ہوا ہے، اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جمع کی حدیثوں میں یقیناً کوئی تاویل ہوئی ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ زیادہ احتیاط بھی اسی میں ہے کہ جمع نہ ہو، اس لئے کہ اس میں تو کچھ شبہ بھی نہیں ہے۔

الحاصل اس بات میں کچھ شک نہیں ہے کہ بالاجماع اسی بات میں زیادہ افضلیت اور اور زیادہ احتیاط بھی ہے کہ جمع نہ کی جائیں تو اب اس مترجم کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ امام اعظمؒ کی تقریر اس مسئلہ میں نہایت بہتر اور عمدہ ہے کہ ایسی تمام احادیث کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بقول حضرت عمرؓ کے جمع کرنے سے اس کام پر نفس دلیر ہو جائے گا، اور آئندہ ترک

سے مرتکب کبیرہ ہونے کا خوف ہے، اور حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث اور آیت کریمہ سے جمع نہ کرنا معلوم ہوتا ہے، اگرچہ تمام حدیثوں میں توفیق دی جاسکتی ہے پھر بھی بلاشبہ زیادہ احتیاط اسی میں ہے کہ جمع نہ کیا جائے، اب یہ بات قابل غور ہے کہ اس طرح احتیاط کرنا کیا واجب ہے یا جائز ہے، تو امام شافعیؒ نے اسے جائز اور افضل فرمایا ہے، ظاہرا اس اعتبار سے کہ اگر ابن عباسؓ کی حدیث منفرد اور تنہا ہے اور اس پر اسلاف کا عمل بھی نہیں ہے تو جمع کرنے کا جو طریقہ ہے وہ بالکل چھوٹ جائے گا لیکن متعدد صحابہ کرام مانند انسؓ وابن عمرؓ وغیرہم کے جو ظہر وعصر ومغرب وعشاء کے درمیان جمع کرنے کی روایت کرتے ہیں، اور حضرات ابن عمرؓ وغیرہما کا اس پر عمل بھی ثابت ہے جس سے اس کا ترک لازم نہیں آتا ہے، لہٰذا احتیاط کرنا ہی افضل ہے، اور امام ابوحنیفہؒ نے اس احتیاط کو واجب فرمایا ہے اس بناء پر کہ دین کے معاملات میں تو یوں ہی احتیاط پر عمل کرنا واجب ہوتا ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ بالفرض تاخیر جائز نہ ہو تو قضاء کہلائیگی، اور عمداً ایسا کرنا حرام ہوتا ہے، اور اس اعتبار سے کہ آں حضرت ﷺ نے ایک موقع پر فرمایا ہے کہ دَعْ مایُرِیبُکَ اِلیٰ مالایریبك، یعنی جس چیز میں شبہہ آجائے اسے چھوڑ کر ایسا کام کرنا چاہئے جس میں کوئی شبہ نہ ہو، یہ حکم اس مقام پر واجب ہے، اور یہ تحقیق اس مقام کی یہی ہے، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ م۔

باب صلوۃ الجمعة

لاتصح الجمعة الا فی مصر جامع اوفی مصلی المصر ولاتجوز فی القری.

ترجمہ:- باب جمعہ کی نماز کا بیان میں ہے، جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے مگر ایسے شہر میں جو جامع ہو یا شہر جامع کے مصلی میں اور دیہاتوں میں جائز نہیں ہوتی ہے۔

توضیح:- باب جمعہ کی نماز کا، جمعہ کی وجہ تسمیہ

جمعہ کے صحیح ہونے کی شرطیں، جامع شہر میں جمعہ گاؤں میں جمعہ

باب صلاۃ الجمعة......الخ

یہ باب جمعہ کی نماز کے بیان میں ہے، اس کا نام اس لئے جمعہ رکھا گیا ہے کہ اللہ تعالےٰ نے اس دن میں بہت سی خیر کی خصلتیں جمع کردی ہیں، مثلاً اس دن آدم کی تخلیق ہوئی، اسی دن قیامت ہوگی، اس کے فضائل پچاس سے زائد ہیں۔ م۔ اس کی فضیلت بہت زیادہ ہے، سورۃ البروج کی آیت ﴿وَشَاهِدٍ وَّ مَشْهُوْدٍ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے منقول ہے کہ شاہد جمعہ کا دن ہے اور مشہور عرفہ کا دن ہے، بیہقی نے الکبریٰ میں اس کی روایت کی ہے، اور حضرت ابوہریرہؓ نے ایک طویل حدیث میں روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جتنے آفتاب نکلتا ہے ان میں سب سے بہتر دن جمعہ کا دن ہے، اسی دن حضرت آدم علیہ السلام پیدا کئے گئے ہیں اس دن جنت میں داخل ہوئے، اور اسی دن سے جنت سے زمین پر اتارے گئے، اور اس دن قیامت قائم ہوگی، صحیح مسلم۔

اور اس روز آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی، اور اس دن دنیا سے انتقال کیا، جن اور انس کے سوا ہر جاندار جمعہ کے دن صبح سے آفتاب نکلنے تک قیامت کے ڈر سے خوف کھاتا رہتا ہے، موطا اور سنن ابی داؤد، اس دن ایک ایسا بھی وقت ہوتا ہے کہ اس وقت نماز کی حالت میں مسلمان بندہ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کی دعاء کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعاء کو ضرور قبول کرتا ہے، ترمذی، اس وقت کو بڑی مصلحتوں کی بناء پر مبہم اور غیر واضح رکھا گیا ہے، ایسی بناء پر اہل خیر صبح سے غروب شمس تک اس کی تلاش میں رہتے ہیں، (ذکر وفکر ودعاء میں مشغول رہتے ہیں) اس متبرک وقت کے بارے میں علماء کے تیرہ اقوال ہیں اور روایتیں بھی مختلف مروی ہیں، بندہ مترجم کے نزدیک ان میں قول مختار یہ ہے کہ جمعہ میں ایک وقت تو عین نماز جمعہ میں ابتداء سے آخر تک

کوئی وقت جستجو کے لائق ہے، چنانچہ اس حدیث میں بھی بحالت نماز کا اشارہ بھی ہے، اور یہ وقت جمعہ ہی کی کے ساتھ مخصوص ہے، ورنہ حدیث میں تو ہر روز ہی ایک وقت قبولیت دعا کا بتایا گیا ہے، تو جمعہ کو دوسرے دنوں کے مقابلہ میں یہ خصوصیت ہوئی، اور یہ بھی ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ (۱) طلوع فجر سے طلوع شمس تک ہے، اور عبد اللہ بن سلام وغیرہ سے (۲) عصر سے آفتاب کے ڈوبنے تک ہے، (۳) تیسرا قول زوال سے فراغت نماز تک ہے، اور بقیہ اقوال طوالت کے خیال سے چھوڑ دئے جارہے ہیں، م، مع۔

واضح ہو کہ نماز جمعہ فرض قطعی ہے، جو قرآن حدیث اور اجماع سے ثابت ہے، اس کا منکر کافر ہے، قرآن پاک میں ہے ﴿یَا اَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اِذَا نُودِیَ لِلصَّلٰوةِ مِن یَّومِ الجُمُعَةِ فَاسعَوا اِلیٰ ذِکرِ اللّٰهِ وَذَرُوا البَیعَ﴾ الایہ، یعنی اے ایمان والو! جب جمعہ کی نماز کے لئے اذان دی جائے تو ذکر اللہ کی طرف چلو، اور بیع کو چھوڑ دو، اس جگہ اگر ذکر سے مراد نماز ہے تو ظاہر ہے، اور اگر خطبہ مراد ہے تو اس بات کی اہمیت کے ساتھ اشارہ کیا گیا کہ ایسے وقت چلو کہ خطبہ بھی سن سکو، اور جب خطبہ سننا مہتم بالشان اور فرض ہوا تو نماز بدرجہ اولی افضل ہوئی، اور تفسیر میں تو ذکر اللہ سے مراد خطبہ اور نماز دونوں ہیں، اور اس آیت سے اذان کا ثبوت بھی اذان سے ہی ہوا ہے، اگرچہ ابتداء میں مسنون ہوچکی تھی، حدیث میں ہے کہ سوائے چار شخصوں کے ہر مسلمان پر جمعہ جماعت کے ساتھ حق واجب ہے اور وہ چار یہ ہیں (۱) غلام (۲) عورت (۳) نابالغ (۴) بیمار۔ جیسا کہ ابوداؤد نے روایت کی ہے، نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد بخاری اور مسلم کی شرط کے مطابق صحیح ہے، اور تمیم داریؓ کی حدیث میں بھی حق واجب ہے، اور مسافر کا بھی استثناء آیا ہے، اور جمعہ کے چھوڑ دینے پر سخت وعید آئی ہے، یہاں تک کہ بغیر عذر چھوڑ دینے والے کو منافق بھی کہا گیا ہے۔

الحاصل تمام ائمہ کرام حنفیہ شافعیہ سب کے نزدیک جمعہ فرض ہے، اور ہمارے ائمہ نے تصریح کی ہے کہ جمعہ نماز تو ظہر سے بھی زیادہ مؤکدہ ہے، کیونکہ ہمیں جمعہ کے لئے ظہر کا فرض بھی چھوڑ دینے کا حکم ہے، اور جو کوئی اس جمعہ کا انکار کرے وہ کافر ہے، ف، ع، م، جمعہ ہر شخص پر فرض عین ہے، التہذیب، ھ، اس کی ادائیگی کے فرض ہونے کے لئے بارہ شرطیں ہیں، ان میں سے چھ شرطیں تو خود نمازی کے اندر ہونی چاہئیں، (۱) آزاد ہونا یعنی غلام نہ ہونا، (۲) مرد ہونا، اس لئے عورت پر جمعہ کی ادائیگی نہیں ہے، (۳) مقیم ہونا لہذا مسافر پر لازم نہیں ہے (۴) تندرست ہونا یعنی ایسا بیمار نہ ہو کہ جمعہ میں حاضر ہونا بھی تکلیف دہ ہو (۵) پاؤں کا سالم ہونا یہاں تک کہ گٹھیا والے اپاہج پر بالاتفاق جمعہ فرض نہیں ہے، محیط السرخسی، اگرچہ کوئی آدمی موجود ہو اسے لاد کر پہونچا سکے، الزاہدی، (۶) آنکھوں کا سالم ہونا، یہاں تک کہ اندھے پر جمعہ لازم نہیں اگرچہ اسے لے جانے والا کوئی شخص موجود ہو، السراجیہ۔

اور بوڑھا ضعیف بھی بیمار ہی کے حکم میں ہے یعنی اس پر بھی جمعہ نہیں ہے، اور جب بارش بہت ہو، ظالم بادشاہ، حاکم سے چھپا پھرتا ہو، تو جمعہ ساقط ہے، جو کوئی کسی کے پاس یومیہ یا ماہوار پر مزدوری، ملازمت کرتا ہو تو مالک یا افسر کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اسے شہر کے اندر جمعہ میں جانے سے روکے، اگر جامع مسجد وہاں سے قریب ہو تو اس کی مزدوری سے بھی کچھ کم کرنے کا حق نہ ہوگا، اور اگر مسجد دور ہو تو نماز میں جتنی دیر تک مشغول ہوا اتنے دیر کی مزدوری وہ کاٹ سکتا ہے، المحیط، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حکم اس صورت میں ہوگا جب کہ اس نماز کی شرط نہ کی گئی ہو، اگر شرط کرلی ہو تو کسی صورت میں کمی نہ ہوگی، م، غلام مکاتب (جو اپنی قیمت ادا کرنے کا معاملہ مالک سے طے کرچکا ہے) اسی طرح غلام ساعی (یعنی وہ غلام اپنی قیمت کی ادائیگی کی فکر میں پریشان ہو) پر بھی جمعہ فرض ہے، قاضی خان، جن لوگوں پر جمعہ کی ادائیگی فرض نہیں ہے اگر کسی طرح بھی وہ مسجد میں حاضر ہوکر جمعہ ادا کرلیں تو اس وقت کا فرض ادا ہوگیا، الکنز، یعنی اب ظہر باقی نہ رہا، م۔

باقی چھ شرطیں جو نمازی سے علیحدہ ہیں یہ ہیں۔ (۱) شہر ہونا، (۲) جماعت کا ہونا، (۳) بادشاہ کا ہونا، (۴) وقت کا ہونا، (۵)

خطبہ ہونا، (٦) عام اجازت ہونا، ھ، ف، ع، م، ان میں سے ہر شرط کی تفصیل بعد میں بیان جا رہی ہے۔ م۔ **لاتصح الخ** جمعہ کی نماز صحیح نہیں ہوتی ہے مگر ایسے شہر میں جو جامع ہو، ف یعنی جمعہ کی ادائیگی کی بارہ شرطوں میں سے ایک شرط یہ ہے کہ مصر جامع ہو، تفصیل ابھی آئیگی، اور یہی قول حضرت علی کرم اللہ وجہہ وعطاء وحسن بصری وابراھیم نخعی ومجاہد وابن سیرین وسفیان ثوریؒ اور دوسروں کا بھی ہے، مع۔

اوفی مصلی المصر ولاتجوز فی القری......الخ

یا شہر جامع کے مصلی میں، ف یعنی نماز گاہ میں، م، اس سے مراد فنائے مصر ہے، یعنی شہر کا گرد، آس پاس، اور فنائے شہر میں جو مسجد ہوتی ہے جیسے عیدگاہ تو شہر کے نام میں وہ بھی داخل ہے، فناء اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جو شہر کی ضرورتوں اور مصلحتوں کے واسطے بنائی جاتی ہے جیسے گھوڑدور کا میدان کہ اس میں گھوڑوں کو آراستہ کیا جاتا ہے، نشانہ بازی کی تعلیم، نماز عید پڑھنے اور شہر کے مردے دفن کرنے وچراگاہ بنانے وغیرہ کے واسطے بنائی جاتی ہے، خواہ وہ شہر سے بالکل ملی ہو یا نہ ہو، اس کا اندازہ اور تخمینہ ایک غلوہ تک ہے، امام محمدؒ سے نوادر میں یہی اندازہ مذکور ہے، بمف۔

اور منیۃ المفتی میں ہے کہ اس سے ایک فرسخ مراد ہے، مع، ولوالجی نے بھی اسی قول کو فتوی کے لئے پسند کیا ہے، د، لیکن خلاصہ میں ہے کہ غلوہ وغیرہ کے اندازے کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ فناء سے مراد وہ جگہ ہے جو شہر کی مصلحتوں کے واسطے اس کے قریب میں ہو، اور اگر اس کے درمیان میں فاصلہ ہو جیسے کھیت وغیرہ بیچ میں آجائے تو وہاں والوں پر جمعہ ضروری نہیں ہے، اگرچہ آذان کی آواز پہنچتی ہو، قاضی خان میں ہے کہ فقیہ ابو جعفرؒ نے امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسفؒ سے یہی روایت کی ہے، اور اسی قول کو شمس الائمہ حلوائیؒ نے اختیار کیا ہے، ھ، البتہ اگر وہاں کا رہنے والا یا کوئی دیہاتی جمعہ کے دن شہر میں موجود ہو تو اس پر بھی شہر والوں کی طرح جمعہ لازم ہے، مگر جب کہ وہ نماز کے قبل یا بعد میں جانے والا ہو تو اس پر واجب نہیں ہے، پھر بھی اگر پڑھ لے تو ثواب پائے گا، المحیط، والتجنیس، وقاضی خان، پھر کلام کے ظاہر کا تقاضا یہ ہے کہ جمعہ پڑھ کر اس پر ظہر واجب نہیں ہے، اگرچہ جمعہ اس کے لئے نفل تھا، یاد رکھ لیں، م، الحاصل شہر جامع یا فنائے شہر شرط ہے، **ولایجوز الخ** اور جمعہ جائز نہیں ہے قُری یعنی گاؤں میں، ف امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔

لقوله عليه السلام لاجمعة ولاتشريق ولا فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع والمصر الجامع كل موضع له امير وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود وهذا عن ابى يوسفؒ وعنه انهم اذااجتمعو افى اكبر مساجد هم لم يسعهمْ والاول اختيار الكرخى وهو الظاهر والثانى اختيار الثلجى والحكم غير مقصور على المصلى بل يجوز فى جميع افنية المصر لانها بمنزلته فى حوائج اهله.

ترجمہ:۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ نہ جمعہ ہے نہ تشریق ہے نہ فطر ہے نہ اضحیٰ ہے مگر مصر جامع میں، اور مصر جامع کل ایسی جگہ جس کے لئے امیر اور قاضی ہو جو احکام نافذ کرتا ہو، اور حدود قائم کرتا ہو، یہ تعریف امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے، اور ان سے ہی یہ بھی منقول ہے کہ جب شہر والے اپنے شہر کی سب سے بڑی مسجد میں حاضر ہونا چاہیں تو اس میں وہ نہ سما سکیں، اور پہلا قول امام کرخیؒ کا مختار ہے، اور دوسرا قول ثلجیؒ کا مختار ہے، اور جمعہ کے جائز ہونے کا حکم صرف مصلی کے لئے منحصر نہیں ہے بلکہ مصر کے تمام فناؤں میں جائز ہے، کیونکہ وہ تمام جگہیں شہر والوں کے لئے ضروریات کے حکم میں ہیں۔

توضیح:۔ حنفیہ کی دلیل، مصر جامع کی تعریف

لقوله عليه السلام لاجمعة ولاتشريق ولا فطر ولا اضحى الا فى مصر جامع......الخ

ہماری دلیل رسول اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے نہ جمعہ ہے نہ تشریق ہے نہ نماز عید ہے نہ نماز بقر عید ہے، مگر شہر جامع میں، ف

اس جملہ سے اس بات کا انحصار کر دیا ہے کہ سوائے شہر جامع کے اور کہیں بھی جائز نہیں ہے، لیکن اس حدیث میں گفتگو اس طور پر ہے کہ مصنفؒ نے تو اس قول کو۔ رسول اللہ علیہ کا قول بیان کیا ہے، مگر یہ قول حدیث کی کسی کتاب میں نہیں ملا ہے، البتہ ابن ابی شیبہؒ نے حضرت علیؓ کا قول نقل کیا ہے کہ نہیں ہے جمعہ اور نہ تشریق اور نہ نماز فطر اور نہ نماز بقر عید مگر شہر جامع یا شہر عظیم میں، ابن حزمؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے اور عبد الرزاقؒ نے اس کو مسند صحیح کے ساتھ مختصراً روایت کیا ہے، ابن حزم نے کہا ہے کہ حذیفہؓ سے بھی یہی مروی ہے، خواہر زادہؒ نے کہا ہے کہ ابو یوسفؒ نے اسے املاء میں مرفوع روایت کیا ہے، بیہقیؒ نے اس کی مرفوع ہونے کا انکار کیا ہے، مگر ہم تسلیم نہیں کرتے ہیں، اور اگر مان لیں تو یہ موقوف صحیح بمنزلہ مرفوع کے ہے، کیونکہ اس میں رائے کو کوئی دخل نہیں ہے، اور حضرت علیؓ کا اس میں امام مقتداء ہونا ہی ہمارے لئے کافی ہے، مفع۔

بندہ مترجم کہتا ہے کہ اس مقام میں یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ بالا جماع جمعہ کے واسطے چند خاص شرطیں ایسی بھی ہیں جو ظہر میں نہیں ہیں، اور جمعہ کو قائم کرنا غیر کا فرض چھوڑ کر ہی ہوتا ہے اس کے باوجود اگر کسی نے گناہ کی غرض سے جمعہ ترک کر دیا تو اس پر ظہر کی اداء قضاء میں بھی ظہر ہے، اب اس اجماع کے بعد یہ بھی جان لینا چاہئے کہ جمعہ قائم کرنے میں بہت احتیاط کرنا ضروری ہے، پس جمعہ اپنی شرطوں کے ساتھ ایسا ہوا کہ قیاس کو دخل نہیں ہے اس لئے جمعہ ان ہی شرطوں کے ساتھ مشروط رہا جن کے ساتھ رسول اللہ علیہ سے محقق ہوا ہے، کیونکہ جب اجتہاد اور علم شرع کے موافق جمعہ کو واجب نہیں جانا اور ظہر کی نماز ادا کرلی تو بغیر کسی اختلاف کے اس وقت کا فرض ادا ہو گیا، اور اگر ظہر کی نماز چھوڑ کر جمعہ کی نماز پڑھ لی حالانکہ اس میں اس حالت اور ان امور کی رعایت میں قصور ہے جن کے ساتھ رسول اللہ علیہ نے اداء کیا ہے تو جمعہ بھی ادا نہ ہونے سے فرض کا وقت ہی جاتا رہا، اگرچہ وہ اس وجہ سے گنہگار نہ ہو کہ اپنے علم کے مطابق عمل کرنا واجب ہے، اس سے بھی یہ بات صاف ظاہر ہو گئی کہ اس جگہ جمعہ میں احتیاط ہے ظہر کے ترک میں نہیں ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔

پھر اس بات میں بھی اختلاف نہیں ہے کہ رسول اللہ علیہ نے جمعہ اداء کیا تو وہ شہر جامع تھا یا وہ آپ کے حکم سے فنائے شہر میں اداء ہوا ہے تو اس حکم کو ہم اسی بات پر موقوف رکھتے ہیں، لیکن امام شافعیؒ نے دیہات میں بھی جمعہ کو واجب کہا ہے، اس دلیل سے کہ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ رسول اللہ علیہ کی مسجد میں جمعہ ہونے کے بعد جو پہلا جمعہ ہوا وہ صوبہ بحرین کے دیہات جواثا میں ہوا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ قریہ یعنی گاؤں میں بھی جمعہ جائز ہے، اس کا جواب یہ ہے، کہ اس روایت میں لفظ قریہ مذکور ہے اور یہ لفظ جس طرح گاؤں کے معنی میں آتا ہے اسی طرح شہر کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے، اسی بناء پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں بھی یہ لفظ بہت موجود ہے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کو بھی ام القری کہا گیا ہے، اور آیت پاک ہے، ﴿وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰی رَجُلٍ مِنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ﴾ حالانکہ اس میں دونوں قریوں سے مراد مکہ و طائف ہے، اور فرمایا ﴿تِلْكَ الْقُرٰى نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْبَائِهَا﴾. اور فرمایا ﴿تِلْكَ الْقُرٰى اَهْلَكْنَاهُمْ﴾. اور یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ قوم ہود و صالح ولوط و فرعون سب شہری اور شہر کے باشندے تھے، پھر قریہ سے صرف گاؤں کے ہی معنی کس طرح لے سکتے ہیں، بلکہ یہ جو ثا بھی تو ایک شہر جامع تھا، صحاح میں ہے کہ جو ثا صوبہ بحرین میں ایک قلعہ تھا، اور یہ بات بھی صاف ہے کہ وہ مصر جامع مع حاکم و عالم تھا، م، فع۔

والمصر الجامع كل موضع له امير وقاض ينفذ الاحكام ويقيم الحدود......الخ

اور مصر جامع سے مراد ہر ایسا علاقہ ہے جہاں اس کا سردار اور قاضی ہو جو احکام کو نافذ کرتا اور حدود قائم کرتا ہو، ف یعنی احکام جاری کرنے اور شرعی سزاؤں کو قائم کرنے پر قادر ہو، ع یہی ظاہر مذہب ہے، الدرایہ، وھذا الخ اور یہ قول ابو یوسفؒ سے مروی ہے، ف لہٰذا کوئی بڑا شہر ہونا ضروری نہ ہوا کہ اس کے آدمی اس کی بڑی مسجد میں سما نہ سکیں، بلکہ حصن یعنی گڑھی اور قلعہ جس میں سردار اس طاقت کا مالک ہو کہ شرعی احکام جاری کر سکے اور چور کا ہاتھ کاٹنے اور زانی کو حد مارنے پر قادر ہو اور حد،

وغیرہ قائم کر سکے، تو وہ بھی مصر جامع ہے، جیسے کہ جواثا کے حصن یعنی گڑھی قلعہ ہونے سے یہ بات ظاہر ہے کہ مصر جامع سے جو مراد ہے وہ اس پر بھی صادق آتی ہے، م۔

وعنه انهم اذااجتمعو افی اکبر مساجد هم لم یسعهم والاول اختیار الکرخی وهو الظاهر......الخ

اور ابو یوسفؒ سے مصر کی پہچان یہ بھی مروی ہے کہ جہاں کے لوگ اگر وہاں کی سب سے بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو سبھوں کی اس میں سمائی ممکن نہ ہو، ف یہ قول پہلے قول کے مقابلہ میں خاص ہے، کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے کہ اس کی آبادی بھی اتنی زیادہ ہو، م، والاول الخ اس پہلے قول کو امام کرخیؒ نے اختیار کیا ہے، اور یہی ظاہر مذہب ہے، ف پس اسی پر فتوی ہونا چاہئے، والثانی الخ اور دوسرے قول کو ثلجیؒ نے اختیار کیا ہے، ف ثلجی منسوب ہے ثلجی بن عمرو بن مالک بن عبد مناف کی طرف کہ ان کی اولاد میں سے تھے، اور ان کا نام محمد بن شجاع تھا جو امام اعظمؒ کے شاگردوں میں سے کمتر اور حسن بن زیادؒ کے خاص شاگردوں میں سے ہیں، حدیث کو وکیع وابواسامہ واقدی وغیر ھم سے حاصل کیا ہے اور سنہ ۲۹۹ھ میں عصر کی نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں وفات پائی، بہت ساری تصانیف کے مصنف اور مالک تھے، مع، مستصفی میں ہے کہ بہتر قول یہ ہے کہ جس میں دین کی ضرورت کے لوگ یعنی قاضی، مفتی، اور حاکم پائے جائیں، تو وہ مصر جامع ہے، امام ابو حنیفہؒ مروی ہے کہ مصر وہ موضع ہے جس میں گلیاں اور بازار ہوں، وہاں اور ایسا حکم حاکم ہو جو حکومت کے ظالم اور مظلوم کے درمیان انصاف کرے اور ایسا عالم بھی ہو جو واقعات میں فتوے دے، یہی قول اصح ہے، المفید التحفہ۔

اور امام محمدؒ سے روایت ہے کہ امام المسلمین نے جس علاقہ کو مصر کہہ دیا ہے وہ مصر ہو جائے گا، یہاں تک کہ اگر اس نے کسی گاؤں میں اپنا نائب بھیج دیا جو حدود وقصاص قائم کرتا ہو، تو وہ علاقہ بھی مصر ہو جائیگا، اور پھر جب اپنے اس نائب کو وہ بلائے گا تو وہ علاقہ پھر سے گاؤں ہو جائے گا، ابن حزمؒ نے محلی میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے ربذہ میں اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا، ان کے پیچھے حضرت ابوذرؓ اور ان کے دوسرے کچھ اور صحابہ بھی جمعہ کی نماز پڑھا کرتے تھے، قاضی خان نے کہا ہے کہ ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ جس موضع کی آبادی ومکانات اتنے ہو جائیں جتنے کہ مقام منی میں ہیں اور وہاں مفتی و قاضی ہو جو حدود قائم کرے اور احکام نافذ کرے تو وہ مصر جامع ہے، اور اسی قول پر اعتماد ہے، مع، ظاہر المذہب وہی ہے جو مصنف ہدایہؒ نے بیان کیا ہے کہ، الحاصل مصر جامع اور اس کے مصلی میں جمعہ جائز ہے۔

والحکم غیر مقصور علی المصلی بل یجوز فی جمیع افنیة المصر لانها بمنزلته فی حوائج اهله......الخ

اور جمعہ کے جائز ہونے کا حکم صرف مصلی یعنی مسجد فناء پر ہی موقوف نہیں ہے، ف یہاں تک کہ صرف اسی مسجد میں اور صرف اسی جانب عید گاہ ہو جائز ہوتی، بل یجوز الخ بلکہ نماز جمعہ تو مصر کے تمام فناؤں میں جائز ہے، ف خواہ وہاں مصلی ہو یا نہ، اس طرح حاصل کلام یہ ہوا کہ مصر جامع کے باہر مصلی تک یعنی فنائے مصر تک میں جمعہ جائز ہے، لانها بمنزلته الخ کیونکہ فنائے مصر کے تمام کنارے مصلی کے حکم میں ہیں اس شہر والوں کی ضروریات کے اعتبار سے، ف یعنی جیسے عید اور جنازہ کی نماز گاہیں شہر والوں کی ضرورت کے اعتبار سے شہر والوں کے اعتبار سے شہر کے حکم میں داخل ہیں، اسی طرح دوسرے حصوں میں قبرستانوں اور چراگاہوں وغیرہ کے اعتبار سے شہر والوں کی ضروریات کے اعتبار سے داخل شہر ہیں، لہذا قول مختار کے مطابق ہر طرف سے ایک ایک فرسخ تک جمعہ کی نماز جائز ہو گی، م، اگر حاکم اسلام نے گاؤں میں جامع مسجد بنانے کی اجازت دے دی تو امام سرخسیؒ نے کہا ہے کہ وہاں بالاتفاق جمعہ پڑھنے کی اجازت ہے، جامع الرموز۔

ویجوز بمنی ان کان الامیر امیر الحجاز او کان الخلیفة مسافرا عند ابی حنیفةؒ وابویوسفؒ وقال محمدؒ لا جمعة بمنیٰ لانها من القری حتی لایعید بها ولهما انها تمتصر فی ایام الموسم وعدم التعیید لتخفیف ولا جمعة بعرفات فی قولهم جمیعا لانها فضاء وبمنی ابنیة والتقیید بالخلیفة وامیر الحجاز لان الولایة لها اما امیر

الموسم فيلي امور الحج لاغير.

ترجمہ:- اور منی میں جمعہ کی نماز جائز ہوگی اس صورت میں کہ ان حاجیوں کے مجمع پر جو منی میں مجتمع ہو کر پڑھیں وہی سردار ہو جو صوبہ حجاز کا حاکم ہو، یا خلیفہ اسلام خود مسافر کے طور پر یہاں موجود ہو، یہ حکم امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ہے، اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ منی میں جمعہ جائز نہیں ہے کیونکہ منی تو بس ایک گاؤں ہے جس میں بقر عید کی بھی نماز نہیں پڑھی جاتی ہے، اور ان دونوں یعنی شیخین کی دلیل یہ ہے کہ منی کو موسم حج میں شہر بنادیا جاتا ہے، اور وہاں نماز عید کا نہ ہونا تمام حاجیوں کو آسانی دینے کے لئے ہے، اور عرفات کے میدان میں بالاتفاق جمعہ کی نماز نہیں ہے، کیونکہ عرفات تو کھلا میدان ہے، جب کہ منی میں بنے ہوئے مستقل مکانات ہیں، اور خلیفہ یا امیر حجاز کے موجود ہونے کی جو قید لگائی گئی ہے اس لئے کہ ولایت ہی دونوں کو حاصل ہوتی ہے، اور وہ امیر جو موسم حج کے لئے مقرر کیا جاتا ہے وہ صرف حج کے کاموں کا نگہبان ہوتا ہے، کسی اور کام کی ذمہ داری اس پر نہیں ہوتی ہے۔

توضیح:- منیٰ اور عرفات میں جمعہ کی نماز پڑھنی ضروری ہے یا نہیں ائمہ کا اختلاف، ان کے دلائل

ويجوز بمنى ان كان الامير امير الحجاز او كان الخليفة مسافرا عند ابى حنيفةؒ وابويوسفؒ.....الخ

مقام منی میں جمعہ کی نماز پڑھنی جائز ہے، ف مگر ہمیشہ نہیں، بلکہ، ان کان الامیر الخ اس شرط سے کہ ان حاجیوں کے مجمع پر جو منی میں اکٹھے ہو کر جمعہ کی نماز پڑھیں وہی شخص سردار ہو جو صوبہ حجاز کا حاکم ہو، ف اور صرف حج کرانے کے لئے سردار نہ بنایا گیا ہو، او کان الخ یا خلیفہ الاسلام خود مسافر کے طور پر یہاں موجود ہو، جائز ہونے کا یہ قول عند ابی حنیفةؒ الخ شیخین کے نزدیک ہے، لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ منی میں جمعہ صحیح نہیں ہے، ف یعنی وہ جگہ ایسی نہیں جو جمعہ کی نماز کے لئے مشروط ہے، ف یعنی قول امام شافعیؒ اور احمدؒ کا ہے۔

وقال محمدؒ لا جمعة بمنىٰ لانهامن القرى حتى لايعيدبها ولهما انها تمتصر فى ايام.....الخ

کیونکہ منی تو صرف ایک ایسا گاؤں ہے جس میں بقر عید کی نماز بھی نہیں پڑھی جاتی ہے، ف حالانکہ حاجیوں کا اجتماع پہلے وہیں ہوتا ہے، اگر اس جگہ میں جمعہ کی شرطیں پائی جاتی اور وہ جگہ اس لائق ہوتی تو نماز بقر عید وہی پڑھی جاتی، لهما انها الخ اور شیخین کی دلیل یہ ہے کہ منی تو حج کے زمانہ میں شہر بن جاتا ہے، ف کیونکہ اس جگہ ہر قسم کا بازار لگ جاتا ہے، اور خود سلطان یا اس کا نائب و قاضی اس موسم میں وہاں موجود ہوتے ہیں، ع، لہٰذا اس موسم کے سواء وہاں جمعہ نہیں ہے، محیط السرخسی، وعدم التعييد الخ اور نماز عید وہاں نہ پڑھنے کی وجہ لوگوں کو آسانی پہونچانے کے خیال سے ہے، ف کیونکہ لوگ اپنے اپنے افعال حج ادا کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔

ولا جمعة بعرفات فى قولهم جميعا لانها فضاء وبمنى ابنية.....الخ

اور عرفات میں بالاتفاق تمام ائمہ کے نزدیک جمعہ جائز نہیں ہے، انها الخ کیونکہ وہ تو صرف کھلا میدان ہے، ف اس کی حیثیت مصر کی نہیں ہوتی ہے، جب کہ منی میں بنے ہوئے مکانات ہیں، ف وہاں تو صرف نمازیوں، آدمیوں، حاکم اور عالم کی ضرورت رہتی ہے، وہ بھی موسم کے دنوں میں اکٹھے ہو جاتیں ہیں، لہٰذا وہ پورے طور پر مصر ہو جاتا ہے، م، یہی قول امام مالک وامام شافعی وامام احمد واسحٰق وزہریؒ کا ہے۔

والتقييد بالخليفة وامير الحجاز لان الولاية لها اما امير الموسم فيلي امور الحج لاغير.....الخ

مصنفؒ نے جو خلیفہ یا امیر الحجاز کے موجود ہونے کی قید لگائی ہے، ف، منی میں جمعہ جائز ہونے کے لئے، یعنی منی میں ایسی

صورت میں جمعہ جائز ہے جبکہ موسم میں امیر الحجاز یا خلیفہ خود موجود ہو، لان الولایة الخ کیونکہ حکومت اور اختیار تو ان ہی دونوں کی ہے، ف اور عنقریب یہ بات بتائی جائیگی کہ جمعہ کی ادائیگی کے لئے والی حاکم کا ہونا بھی ایک شرط ہے، تو جب اسی مقام پر ولایت خلیفہ کی ظاہر ہے، یا خلیفہ کی طرف سے حاکم حجاز کی ہے تو دونوں میں سے کسی کا ہونا ضروری ہے، لیکن بتانے کی وجہ یہ ہوئی کہ کبھی خلیفہ کی طرف سے کسی ایک شخص کو تمام حاجیوں کا امیر بنادیا جاتا ہے، جو حج کرادیتا ہے، اسی شخص کو امیر الموسم کہا جاتا ہے، تو ایسا شخص صرف حج کے کاموں کا ذمہ دار ہوتا ہے کسی اور کام کا نہیں ہوتا ہے، ف پس اسے جمعہ کی ولایت حاصل نہ ہوگی، م، فخر الاسلامؒ نے یہی ذکر کیا ہے، ع، لیکن اگر امیر الموسم کو خلیفہ یا امیر الحجاز کی جانب سے ولایت کی اجازت ملی ہوئی ہو تو وہ جمعہ پڑھا سکتا ہے، خواہ وہ مقیم ہو یا مسافر ہو، یہی صحیح ہے، البدائع۔

اور یہ معلوم ہونا چاہئے کہ مذکورہ عبارت سے یہ بھی بتانا مقصود ہے کہ خلیفہ جو حاکم اعلیٰ ہوتا ہے وہ اگرچہ مسافر ہو جمعہ قائم کرسکتا ہے، شرح الطحاوی میں اس کی تصریح ہے اسی لئے اگر خلیفہ نے تمام اسلامی ممالک کا دورہ شروع کیا اور مسافر ہوگیا تو وہ ہر شہر میں جمعہ کے دن جمعہ کی نماز پڑھائے گا، کیونکہ جب اس کی اجازت سے دوسرا شخص جمعہ قائم کرسکتا ہے تو وہ خود بدرجہ اولیٰ قائم کرسکتا ہے، الفوائد الظہیریہ، جامع صغیر، قاضی خان، م، ع، اب آئندہ جمعہ کی دوسری شرط بیان کی جارہی ہے۔

ولایجوز اقامتها الاللسلطان اولمن امره السلطان لانها تقام بجمع عظیم وقد تقع المنازعة فی التقدم والتقدیم وقد تقع فی غیره فلابدمنه تتمیما لامرهاومن شرائطها الوقت فتصح فی وقت الظهر ولاتصح بعده لقوله علیه السلام اذا مالت الشمس فصل بالناس الجمعة.

ترجمہ:- اور جمعہ کو قائم کرنا خود بادشاہ یا اسی شخص کے جسے بادشاہ نے حکم دیا ہو کے علاوہ کسی اور کے لئے جائز نہیں ہے، کیونکہ جمعہ کی نماز تو ایک بڑے مجمع کے ساتھ قائم کی جاتی ہے، اس مجمع عظیم ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان آگے بڑھنے اور بڑھانے کے سلسلہ میں یا اس کے علاوہ کسی اور سلسلہ میں جھگڑا کھڑا ہوسکتا ہے تو جمعہ کا کام پورا ہونے کے لئے سلطان یا اس کے قائم مقام کا ہونا ضروری ہوا، اور جمعہ کی شرطوں میں سے ایک شرط وقت کا ہونا بھی ہے، اس لئے ظہر کے ہی وقت میں جمعہ کی نماز ادا کرنی ہوگی، وقت گذرنے کے بعد نہیں، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جب آفتاب ڈھل جائے تو لوگوں کو جمعہ کی نماز پڑھادو۔

توضیح:- اقامت جمعہ کے لئے سلطان یا جسے وہ حکم دے کہ رہنے کی شرط وقت جمعہ، حدیث سے دلیل

ولایجوز اقامتها الاللسلطان اولمن امره السلطان لانها تقام بجمع عظیم......الخ

جمعہ قائم کرنا جائز نہیں ہے مگر سلطان کے لئے، ف یعنی جس کو سلطنت حکومت و قدرت حاصل ہو، اولمن الخ یا اس کے لئے جسے سلطان نے حکم اور اجازت دے دی ہو، ف جیسے امیر یا قاضی یا خطیب جب کہ ان کو جمعہ قائم کرنے کی اجازت حاصل ہو، لانها تقام الخ کیونکہ جمعہ کو ایک بہت بڑے مجمع میں قائم کیا جاتا ہے، وقد تقام الخ، اور کبھی امامت کے سلسلہ میں خود بڑھنے یا لوگوں کی طرف سے بڑھانے میں جھگڑا واقع ہوسکتا ہے، ف ایک کہے کہ میں امامت کروں گا اور دوسرا کہے کہ نہیں میں امامت کروں گا، ع۔

وقد تقع المنازعة فی التقدم والتقدیم وقد تقع فی غیره فلابدمنه تتمیما لامرها......الخ

اور آگے بڑھانے میں، ف اسی طرح ایک جماعت کہے کہ یہ امامت کرے گا اور دوسری جماعت کہے یہ امامت کرے گا، اسی طرح ایک شخص کہے میں امامت کروں گا اور جماعت کہے کہ ہم لوگ فلاں کو امام بنائینگے، اسی طرح کبھی تقدم اور تقدیم میں جھگڑا

ہو سکتا ہے، م۔ وقد تقع الخ اور کبھی اس کے علاوہ دوسرے وجہوں سے بھی جھگڑا ہو سکتا ہے، ف مثلاً یہ کہے کہ ہماری مسجد میں جمعہ کی نماز ہوا کرے گی، یا ایک گروہ آکر اپنی نماز پڑھالے، اور دوسرا اس کی مزاحمت کرے، یا جلدی یا دیری میں جھگڑا کرے، یا اسی جیسا کوئی اور قسم کا جھگڑا ہونے لگے کیونکہ مجمع کثیر میں جب بڑا سرپرست نہ ہو تو ہر شخص اپنی رائے کا مالک بنے گا، اور شیطان کو بھی عوام میں سے ایسے بہت مل جائے گے، جن پر اس کو لڑائی کے لئے آمادہ کرنے کا اور بیہودہ مشورے دے کر اپنے قابو میں لانے کا موقع مل جائیگا، اور انجام کار مومنوں کے درمیان نفاق اور کشت وخون قتل وقتال پھیل جائیں گے، حالانکہ جمعہ قائم کرنے کی بڑی مصلحتوں میں سے یہ بھی ہے کہ خلیفہ وقت انہیں اکٹھے کر کے انکے دلوں میں الفت قائم رکھے، اس کے برخلاف یہاں لوگ خودرائی میں مبتلا ہو کر خون کی ندی بہائیں اور تعلقات خراب کریں۔

فلابدمنه تتميما لامرها......الخ

لہٰذا جمعہ کا کام پورا ہونے کے لئے سلطان یا اس کے قائم مقام کا ہونا ضروری ہوا، ف خواہ وہ بادشاہ عادل یا ظالم ہو، النصاب، یا متغلب ہو یعنی ایسا شخص جسے خلیفہ کی طرف سے اجازت حاصل نہ ہو اور وہ اپنی مرضی اور زور بازو سے کسی کافر سلطنت کو فتح کر کے اس پر اپنی حکومت قائم کرے اسے اپنی سلطنت بنالے، ف، یا سلطان کا نائب ہو جیسے امیر یعنی کسی صوبہ وملک کا حاکم باجازت سلطان، اور جیسے قاضی، کوتوال، انسپکٹر، خطیب وغیرہ، ع، اور ہمارے زمانہ میں صحیح یہ ہے کہ قاضی اور والی اور حکومت کی کسی نمائندہ اور خطیب وغیرہ کو جمعہ قائم کرنے کا حق اسی وقت ملتا ہے جب کہ اس کی ذمہ داری کے کام میں یہ بات بھی لکھ دی گئی ہو، العتابیہ، اگر کسی غلام کو کسی علاقہ کا حاکم اور عامل بنایا گیا اس لئے اس نے لوگوں کو جمعہ کی نماز بھی پڑھادی تو نماز جائز ہو گی، الخلاصہ، اگر کوئی عورت بادشاہ بنی ہو تو وہ خود نماز نہیں پڑھاسکتی ہے البتہ اس کے حکم سے کوئی بھی پڑھاسکتا ہے۔

ف۔ اگر بادشاہ جمعہ میں خود حاضر ہو کر کسی کو پڑھانے کی اجازت دیدے تو جائز ہے۔ قاضی۔ اگر حاکم بیمار ہو تو اس کی اجازت شرط ہے۔ مع۔ اور اگر مر جائے تو اس کا خلیفہ یا قاضی یا اس کا کوئی سرکاری نمائندہ، یا امراء وحکام پڑھائیں، جب تک ان کو ان کی معزولی کا حکم نہ ملے، اور جب کوئی نہ ہو تو لوگوں کے اتفاق سے امام منتخب کیا جائے۔ السراجیہ۔

اگر خلیفہ سے اجازت لینی ناممکن یا بہت مشکل ہو تو جس پر لوگوں کا اتفاق ہو وہی پڑھائے۔ اگر حاکم خطبہ کی اجازت دی مگر نماز پڑھانے سے منع کیا ہو پھر بھی نماز پڑھا سکتا ہے، اور خطبہ ونماز میں سے کسی ایک کی اجازت سے دوسرے کی اجازت سمجھی جائیگی۔ حاکم نے اگر صرف دشمنی اور ظلم کی بناء پر شہر والوں کو جمعہ کی نماز سے منع کر دیا ہو تو وہ لوگ اپنے طور پر متفق ہو کر کسی ایک شخص کو امام منتخب کر کے نماز پڑھ لیں۔ اور اگر یہ ممانعت دشمنی کی وجہ سے نہ ہو تو پھر نہیں پڑھ سکتے، ھ۔

جن ملکوں پر کفار حاکم ہوں وہاں مسلمانوں کو جمعہ قائم کر لینا جائز ہے، اور مسلمانوں کے اتفاق سے کسی ایک شخص کو قاضی منتخب کیا جائے اور مسلمانوں کو اپنا متولی بنانا واجب ہے، معراج الدرایۃ۔ ھ۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس عبارت سے ظاہراً یہی سمجھا جاتا ہے کہ جب مسلمانوں پر اپنا مسلمان والی بنانا واجب ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ متفق ہو کر اپنا قاضی بنائیں، اور جب ایک شخص قاضی مقرر ہو گیا تو وہی ان کو جمعہ بھی پڑھا سکتا ہے۔ یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے واسطے ان کے دین کے لئے بہت ضروری ہے، اسے سمجھ کر یاد رکھنا چاہیے۔ م

جس شخص کو خلیفہ کی طرف سے خطیب مقرر کیا گیا ہو تو وہ کیا خطبہ پڑھنے کو کسی اور کو اپنا نائب مقرر کر سکتا ہے تو اس سوال کے تین جواب ہیں: ۱-ہاں کر سکتا ہے مجبوری ہو یا نہ ہو۔ ۲-ضرورت اور مجبوری کی صورت میں۔ ۳-بالکل نہیں، لیکن فقہاء کی عبارتوں سے قول اول کی تائید ہوتی ہے۔ ف۔ حاکم کی اجازت کی شرط صرف جامع مسجد بنانے کے لئے ضروری ہے، الحجۃ۔ ہمارے زمانہ میں مطلقاً جائز ہے کیونکہ ۹۴۵ھ میں عام اجازت ہو گئی اور اسی پر فتوی ہے، د۔ یہ اجازت عام جس کا ابھی ذکر ہوا مخصوص ہے تو ہندوستان میں صورت اولی وہی ہے جو معراج الدرایہ میں مذکور ہے۔ م

واضح ہو کہ امام مالک وشافعی واحمد رحمہم اللہ کے نزدیک جمعہ کے لئے سلطان کی شرط نہیں بلکہ سنت ہے، اور راجح قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے، کیونکہ اسی میں بہت احتیاطی پہلو ہے، اچھی طرح سمجھ لیں، پھر شرط یہ ہے کہ سلطان اور والی عام اجازت دے، اور اگر اس نے لوگوں کو جمع کر کے مسجد کا دروازہ بند کر دیا تو جمعہ نہیں ہے، اور اگر قلعہ کے اندر مسجد ہے اور دشمن کے خوف سے قلعہ کا دروازہ بند کیا گیا ہے تو جائز ہے۔ ع۔ مف۔ ف۔

ومن شرائطها الوقت فتصح في وقت الظهر ولاتصح بعده لقوله عليه السلام......الخ

اور جمعہ کی شرطوں میں سے ایک وقت بھی ہے۔ ف یعنی ظہر کی اداء کا وقت ہونا، کہ وہی جمعہ کا بھی وقت ہے۔ **فتصح في وقت**۔ لہٰذا جمعہ بھی اداء ظہر کے وقت میں صحیح ہوگا اور اس وقت کے ختم ہونے کے بعد صحیح نہ ہوگا۔ **لقوله عليه السلام الخ**۔ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ یعنی حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ جب آفتاب ڈھل جائے تو لوگوں کو جمعہ پڑھانا۔ ف اس عبارت کے ساتھ اگرچہ یہ روایت نہیں ملی ہے، مگر کتب السیر میں اس کا مضمون ملتا ہے، لیکن اس سے قطع نظر کر کے ایک دلیل حضرت انسؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ اس وقت جمعہ پڑھاتے جب کہ آفتاب ڈھل جاتا تھا۔ مسلم وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، اور یہی قول تمام صحابہ وتابعین کا ہے اور امام شافعیؒ کا مذہب بھی یہی ہے۔

اور شیخ ابن العربیؒ نے کہا ہے کہ تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ زوال سے پہلے جمعہ جائز نہیں ہے، البتہ امام احمدؒ ایک روایت ہے کہ زوال سے پہلے بھی جمعہ جائز ہے، جس کی دلیل حضرت جابرؓ کی یہ روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جمعہ پڑھ کر ہماری طرف نواضح کی طرف جاتے اس وقت کہ آفتاب ڈھلتا ہوتا۔ مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔

اور اس دلیل سے بھی کہ حضرت سلمہ بن الاکوع کی حدیث میں ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جمعہ پڑھ کر پھرتے ایسے وقت میں کہ ایسا سایہ نہ ہوتا کہ ہم ان سے سایہ حاصل کر سکیں۔ بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور اس دلیل سے بھی کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانہ میں قیلولہ نہیں کرتے اور نہ دن کا کھانا کھاتے مگر جمعہ کے بعد۔ اور اس دلیل سے بھی کہ جمعہ بھی عید ہے، لہٰذا زوال سے پہلے نماز جائز ہوگی۔

ان تمام دلائل کا جواب یہ ہے کہ جن حدیثوں میں تصریح ہے مثلاً حضرات انس وسلمہ رضی اللہ عنہما میں زوال کا وقت ہے، اور حدیث جابرؓ کے یہ معنی ہیں کہ جمعہ پڑھنا اور نواضح کی طرف جانا دونوں کام زوال کے وقت ہوتے تھے، اور سلمہؓ کی حدیث میں تو خود اس بات کی دلیل ہے کہ دیواروں کا کچھ سایہ ہوتا تھا، جیسا کہ حضرت سلمہؓ سے خود اول حدیث میں تصریح ہے کہ اور دوسری حدیث میں پہلے وقت تعجیل کا بیان ہے، یہاں تک مدینہ کی چھوٹی چھوٹی دیواروں کا سایہ اتنا نہیں ہوتا تھا کہ اس سایہ میں چل سکیں، اور جلدی میں یہ بھی حکمت ہے کہ جمعہ کے لئے بہت جلدی کرنی زوال سے پہلے بڑی فضیلت کی بات ہے اس لئے بغیر کھانا کھائے حاضر ہو جاتے اور نماز سے جلد فراغت حاصل کر لیتے تا کہ کھا کر قیلولہ کر لیں جسے وہاں کے لوگ قیلولۃ الضحیٰ کہتے ہیں یعنی ٹھیک دوپہر کی تیزی کے وقت کوٹھریوں میں آرام کر لینا، اسی سے کھانا اور قیلولہ کا جواب معلوم ہو گیا۔ حضرت انسؓ اور دوسروں کی منصوص حدیث کے مقابلہ میں عید پر قیاس کرنا باطل ہے، پھر انسؓ کی حدیث میں ہے کہ سردی کی زیادتی کے موسم میں اول وقت میں پڑھتے تھے، اور گرمی کی زیادتی کے زمانہ میں ابراد یعنی ٹھنڈا کر کے پڑھتے تھے، جیسا کہ بخاری میں ہے، الحاصل جمعہ کا حال ظہر جیسا ہے۔ م

ولو خرج الوقت وهو فيها استقبل الظهر ولايبنيه عليها لاختلافهما ومنها الخطبة لان النبي ﷺ ماصلاها بدون الخطبة في عمره وهي قبل الصلوة بعد الزوال به وردت السنة ويخطب خطبتين يفصل بينهما بقعدة به جرى التوارث.

ترجمہ:- اور اگر وقت جمعہ ختم ہو گیا ایسی حالت میں کہ نمازی ابھی تک جمعہ میں مشغول ہے تو از سر نو ظہر کی نماز پڑھے، اور

اس ظہر کو جمعہ پر بناء نہ کرے کیونکہ جمعہ اور ظہر دونوں میں اختلاف ہے، اور ان شرطوں میں سے ایک خطبہ ہونا بھی ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے زندگی میں کبھی بھی بغیر خطبہ کے جمعہ کی نماز نہیں پڑھی ہے، یہ خطبہ زوال کے بعد اور نماز سے پہلے ہونا چاہئے، اسی طرح سنت وارد ہوئی ہے، اور خطبہ دو دے اور ان دونوں کے درمیان ایک قعدہ کر کے فرق کر دے، اسی طرح ابتداء سے ابتک عمل در آمد ہوتا آیا ہے۔

توضیح:- اگر جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے وقت ختم ہو جائے
ادائیگی جمعہ کی ایک شرط خطبہ ہے، حدیث سے دلیل

ولو خرج الوقت وھو فیھا استقبل الظھر ولا یبنیہ علیھا لاختلافھما......الخ

اگر جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے وقت ختم ہو گیا، ف کہ ابھی تک سلام نہیں پھیرا ہے، اگر چہ مقدار تشہد بیٹھ چکا ہو، المحیط، استقبل الخ تو ابتداء سے ظہر کی نماز پڑھے، ف لیکن صاحبینؒ کے نزدیک مقدار تشہد بیٹھ جانے کے بعد وقت نکل جانے سے نماز پوری ہو گئی، اور امام اعظمؒ کے نزدیک فاسد ہو گئی، ولا یبنیہ علیھا الخ اور ظہر کو جمعہ پر بناء نہ کرے، کیونکہ جمعہ اور ظہر دونوں میں اختلاف ہے، ف نام میں، تعداد رکعات میں، آہستہ اور زور سے پڑھنے میں اور شرائط میں اس لئے جمعہ پر ظہر کی بناء جائز نہ ہو گی اس بناء پر ظہر کو شروع سے پڑھے، م، اگر نماز کی حالت میں مقتدی سو گیا اور اس وقت آنکھ کھلی جبکہ وقت نکل چکا تھا تو اس کی نماز فاسد ہو گئی، اور اگر نماز کا وقت باقی ہے تو جمعہ کی نماز پوری کرے، اگر چہ امام فارغ ہو چکا ہو، المحیط، ھ۔

ومنھا الخطبۃ لان النبی ﷺ ماصلاھا بدون الخطبۃ فی عمرہ......الخ

اور جمعہ کی شرطوں میں سے ایک خطبہ بھی ہے، ف باقی اماموں کا بھی یہی قول ہے، لان النبی الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے عمر بھر میں کبھی جمعہ کی نماز بغیر خطبہ نہیں پڑھی ہے، ف اور بیہقیؒ نے بھی یہی ذکر کیا ہے، پس اگر خطبہ واجب نہ ہوتا تو کم از کم بیان جواز کے لئے ایک دوبار آپ خطبہ چھوڑ دیتے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے وجوب کا حکم تو ثابت ہوا، مگر شرط اور واجب ایسا کہ اس کے نہ ہونے سے نماز جائز نہ ہو، اس کے لئے زیادہ بہتر ہے کہ آیت پاک ﴿فَاسعَوا اِلیٰ ذِکرِاللہ﴾ جمعہ کے حکم سے متعلق ہے اور ذکر سے مراد خطبہ ہے اسی کو پہلے بیان کیا گیا ہے، پھر جمعہ پڑھ لینے سے ظہر کی نماز ساقط ہو جاتی ہے اسی صورت سے کہ یہ طریقہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، یعنی یہ کہ آپ نے کبھی بھی خطبہ کے بغیر نہیں پڑھی ہے، اس بناء پر اس بات کا احتمال ہے کہ یہ خطبہ صرف واجب عمل ہو جس کے چھوٹ جانے سے نماز ناقص ہو جاتی ہے اور اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ شرط ہو کہ اس کے چھوٹ جانے سے نماز ہی صحیح نہ ہو، اسی تفصیل میں پوری احتیاط ہے اس لئے اسی پر عمل بھی ہونا لازم ہے اچھی طرح سمجھ لو اس خطبہ میں دو فرض کے علاوہ بہت سی سنتیں اور آداب ہیں بخلاف عید کے کہ یہ تو کسی فرض کے قائم مقام نہیں اس لئے بغیر خطبہ کے بھی جائز ہے، خطبہ کے دو فرض میں سے پہلا فرض یہ ہے کہ:

وھی قبل الصلوۃ بعد الزوال بہ وردت السنۃ......الخ

اس کا نماز سے پہلے اور زوال سورج کے بعد ہونا شرط ہے، ف چنانچہ اگر جمعہ کو خطبہ کے بغیر پڑھایا خطبہ زوال سے پہلے ہی پڑھ لیا تو یہ خطبہ صحیح نہ ہوگا، الکافی، اور زوال کے بعد بھی نماز سے پہلے ہونا شرط ہے۔ بہ وردت الخ اسی طور سے سنت وارد ہوئی، ف اس دلیل سے کہ حضرت سائب بن یزیدؓ کی حدیث جو بخاری میں مذکور ہے، اور ابو موسیٰؓ کی حدیث جو مسلم میں ہے، اور اس دلیل سے بھی کہ اس پر ابتک تمام مسلمانوں کا عمل جاری ہے، اس سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ ہم اسے اپنی جگہ پر باقی رکھے ہوئے ہیں، م، یہاں تک کہ اگر نماز کے بعد خطبہ پڑھا جائے تو وہ صحیح نہ ہوگا، ھ، دوسرا فرض ذکر الٰہی عزوجل ہے اور متن کتابوں کے ظاہر سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ صرف الحمد للہ یا لا الہ الا اللہ یا سبحان اللہ کہہ لینا کافی ہے، جبکہ اسی نیت سے کہا گیا ہو، ھ، اگر

امام کو نماز جمعہ کے اندر اپنی ذمہ کی قضاء نماز یاد آجائے اور ترتیب کے واجب ہونے کی وجہ سے پہلے اس قضاء کو پڑھ لیا تو اس کے بعد خطبہ کو دوبارہ پڑھنا اولی ہے، جیسے کہ عمداً نماز فاسد کر کے دوبارہ پڑھی ہو بعد خطبہ کے نفل نماز شروع کر لی ہو یا حالت جنابت میں خطبہ پڑھا ہو تو اس خطبہ کا اعادہ کر لینا ہی اولی ہے، ف، اگر خطبہ تنہا پڑھا یا فقط عورتوں کی موجودگی میں خطبہ پڑھا ہو تو قول صحیح نہ ہوا، معراج الہدایہ، اور اگر خطبہ میں ایک ہی مرد حاضر ہوا اور نماز کے وقت تین اکٹھے ہو گئے تو خطبہ صحیح مان لیا جائے گا، خلاصہ۔

اگر خطبہ کے درمیان قوم سو گئی یا سب ہی بہرے ہوں یعنی سننے والا ایک بھی نہ ہو تو بھی خطبہ مانا جائیگا، ع، صحیح حدیث میں ہے کہ امام کے دینی سمجھ دار ہونے کا تقاضا یہ ہے کہ خطبہ مختصر کرے لیکن نماز طویل کرے اور ابن الہمامؒ نے اس کے معنی ذکر کئے ہیں، م۔

ویخطب خطبتین یفصل بینهما بقعدة به جری التوارث......الخ

اور دو خطبے پڑھے ان دونوں کے درمیان بیٹھ کر ان میں فرق اور جدائی ظاہر کر دے، به جرى التوارث اسی عمل کے ساتھ توارث پایا گیا ہے، ف یعنی ہر طبقہ میں یکے بعد دیگرے بزرگوں سے یہی عمل چلا آیا ہے، ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ عطاء بن ابی رباحؒ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ منبر پر انتقال پانے تک کبھی نہیں بیٹھے، اور آپ ہمیشہ ہی خطبہ کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے، سب سے پہلے خطبہ میں جو بیٹھے وہ حضرت عثمانؓ ہیں کہ آخر عمر میں جب عمر زیادہ ہو گئی اور کمزوری بڑھ گئی تو تھوڑی دیر بیٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے، مغیرہ بن شعبہؓ اپنے خطبہ میں نہیں بیٹھتے تھے، ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ آج کل جو امام اور خطیب کیا کرتے ہیں اسی پر تمام لوگوں کا عمل ہے، شمس الائمہ سرخسیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ قعدہ استراحت ہے، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ یہ شرط ہے۔

امام نوویؒ نے لکھا ہے کہ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھ جانا جمہور علماء کے نزدیک سنت ہے، یہاں تک کہ امام طحاویؒ نے فرمایا ہے کہ سوائے امام شافعیؒ کے کسی نے بھی اسے شرط نہیں کہا ہے، مع، اس بیٹھک کی مقدار چھوٹی تین آیتیں یا بڑی ایک آیت پڑھنے کے ہے، الجوہرہ، یہی ظاہر الروایۃ ہے، السراج، ع، اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے کہا ہے کہ جب اتنا بیٹھ جائے کہ ہر عضو اپنے ٹھکانے پر آجائے تو بلا توقف کھڑا ہو جائے، یہی مذہب مختار ہے، العنایہ، اور اگر نہ بیٹھا تو اس نے برا کیا، یہی اصح قول ہے، القنیہ، پھر ہمارے نزدیک اگر ایک ہی خطبہ پڑھا تو جائز ہو گیا، حضرات عطاء ومالک، اوزاعی واسحق وابو ثور وغیرہم رحمھم اللہ کا یہی قول ہے، لیکن امام شافعیؒ کے نزدیک ایسے دو خطبے واجب ہیں جن کے درمیان جلسہ بھی ہو کہ یہ شرط ہے، مع، اور اب پندرہ سنتوں کا بیان آرہا ہے۔

ويخطب قائما على الطهارة لان القيام فيها متوارث ثم هي شرط الصلوة فيستحب فيها الطهارة كالاذان ولو خطب قاعدا وعلى غير طهارة جاز لحصول المقصود الا انه يكره لمخالفة التوارث وللفصل بينها وبين الصلوة.

ترجمہ:- اور پاکی کی حالت میں کھڑے ہو کر خطبہ دے، کیونکہ اس میں کھڑے ہونے کا عمل ابتک جاری ہے، چونکہ یہ خطبہ نماز جمعہ کی شرط ہے اس لئے خطبہ پڑھنے میں طہارت مستحب ہے، جیسے اذان میں، اور اگر امام نے بیٹھ کر خطبہ دیا ناپاکی کی حالت میں تو بھی خطبہ جائز ہو جائے گا، مقصود حاصل ہونے کے وجہ سے، مگر عام مسلمانوں کے معمول کے خلاف ہونے کی وجہ سے مکروہ ہوگا، اور خطبہ اور نماز کے درمیان فصل ہو جانے کی وجہ سے بھی۔

توضیح:- خطبہ پڑھنے کی حالت، خطبہ کی سنتیں اور آداب جمعہ، ضروری مسائل، خطیب کے علاوہ کسی دوسرے کو امامت کرنی، امام کو خطبہ کے بعد حدث ہوا اور دوسرے کو خلیفہ بنایا، نماز

شروع کرنے کے بعد حدث ہوا، جمعہ کے لئے جانا

ویخطب قائما علی الطهارة لان القیام فیها متوارث......الخ

خطبہ کی پندرہ سنتوں میں سے پہلی سنت پاکی کی حالت میں کھڑے ہو کر خطبہ دینا، ف اس میں دو باتیں بیان کی گئی ہیں، (۱) کھڑے ہونا، (۲) طہارت کے ساتھ ہونا، لان القیام الخ کیونکہ خطبہ میں کھڑا ہونا تمام مسلمانوں کا معمول ہے، ف اور صحاح میں بھی مذکور ہے، م، ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ قیام کی مخالفت کرنا مکروہ ہے، اور روایت ہے کہ کعب بن عجرہؓ مسجد میں داخل ہوئے اور اس وقت ابن ام الحکم بیٹھ کر خطبہ دے رہے تھے تو فرمایا کہ اس خبیث کو دیکھو کہ خطبہ دیتا ہے حالانکہ اللہ پاک نے فرمایا ہے ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْلَهْوًا انفَضُّوا اِلَيهَا وَتَرَكُوكَ قَائِماً﴾۔ یعنی جب انہوں نے کسی تجارت یا لہو کو دیکھا تو اس کی جانب چل دیئے، اور آپ کو کھڑا چھوڑ گئے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، لیکن جب کعبؓ اور دوسروں نے اس نماز کے فاسد ہونے کا حکم نہیں دیا تو معلوم ہو گیا کہ یہ ان کے نزدیک شرط نہیں ہے، الفتح۔

ثم هی شرط الصلوة فیستحب فیها الطهارة کالاذان......الخ

ھر خطبہ چونکہ جمعہ کی نماز کے لئے شرط ہے تو خطبہ پڑھنے میں طہارت مستحب ہے مثل اذان کے، ف اس طرح خطبہ طہارت کے بغیر اگرچہ جائز ہے مگر مکروہ ہے، یہی قول امام مالک واحمدؒ کا اور امام شافعیؒ کا بھی قدیم قول ہے، اور قول امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کے قول کے جدید میں جائز نہیں ہے، ع۔

ولو خطب قاعدا وعلی غیر طهارة جاز لحصول المقصود الا انه یکره لمخالفة......الخ

اگر خطیب نے بیٹھ کر خطبہ دیا، ف یا لیٹ کر، ق، او علی غیر طهارة الخ یا بغیر طہارت کے تو بھی جائز ہے، مقصود حاصل ہو جانے کی وجہ سے، ف جیسے محدث کی اذان مقصود (عام اطلاع) حاصل ہو جانے کی وجہ سے، اور امام ابو یوسفؒ سے، نوادر میں مذکور ہے کہ جنبی کی اذان دوبارہ دلوائی جائے، اور اس کے خطبہ کو دوبار کہنا اولی ہے، محیط اور دونوں مبسوط میں ہے کہ خطبہ ذکر ہے، اور محدث اور جنبی کو سوائے قراءت قرآن کے ذکر سے ممانعت نہیں ہے، اور خطبہ اپنی ذات کے اعتبار سے نماز کے مثل نہیں ہے، یہاں تک کہ اس خطبہ میں استقبال قبلہ نہیں کیا جاتا ہے نیز اس میں کلام کرنے سے خطبہ فاسد بھی نہیں ہوتا ہے، مع، **الا انه یکره الخ** لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے، ف کہ کوئی بیٹھ کر یا جنابت کی حالت میں یا بغیر وضوء کی حالت میں خطبہ دے، **لمخالفة التوارث**، توارث کی مخالفت کی وجہ سے، ف کیونکہ معمول اور توارث تو کھڑے ہو کر ثابت ہے بس بیٹھنا اس کے مخالف ہوا۔

وللفصل بینها وبین الصلوة......الخ

اور خطبہ اور نماز کی کے درمیان فاصلہ ہونے کی وجہ سے، ف جبکہ امام خطبہ کے بعد غسل یا وضوء کرنے میں مشغول ہو گا، اگرچہ امام اور خطیب کا ایک ہونا بھی شرط نہیں ہے کہ یہ دو کام دو آدمی کر سکتے ہیں، لیکن مختلف کرنا بھی مکروہ ہے، اسی طرح جنبی کا مسجد میں داخل ہونا خود بھی مکروہ تحریمی ہے، م، امام شافعیؒ کے نزدیک بیٹھ کر خطبہ دینا جائز نہیں ہے، اور امام مالک وامام احمدؒ کے نزدیک ہماری طرح جائز مگر مکروہ ہے، اگر خطیب خطبہ پڑھ کر گھر گیا اور گھر میں وضو کر کے آیا اور نماز پڑھائی تو جائز ہو گی، اور اگر گھر میں کھا پی لیا یا جماع کر کے غسل کیا تو دوبارہ خطبہ پڑھے، المرغینانی، مع، میں مترجم کہتا ہوں کہ پھر تو جنابت کا خطبہ بیکار ہوا مگر ایک صورت صحیح رکھنے کی یہ ہے کہ کسی دوسرے کو نماز پڑھانے کی اجازت دے دے، اور قول اظہر یہ ہے کہ صرف غسل کا حکم وضوء کے مثل ہے، یہاںتک کہ خطبہ بھی دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ واقعات سے سمجھا گیا ہے، م، امام شافعیؒ کے نزدیک بدن، کپڑا اور جگہ کی پاکی نئے قول کے مطابق شرط ہے، اور امام احمدؒ کے نزدیک نہیں ہے، مع، اور خطبہ کی سنتوں او آداب میں سے یہ بھی ہیں (۱) قوم کا امام کی طرف متوجہ ہونا، اور اگر امام کے قریب دائیں بائیں مقتدی ہوں تو خطبہ سننے کے لئے

اس کی طرف رخ کرلینا، الخلاصہ، (۲) قبل خطبہ کے آہستہ سے اعوذ باللہ پڑھ لینا (۳) خطبہ ایسے انداز اور آوازوں سے پڑھنا کہ قوم سن سکے مگر حد سے زیادہ نہ ہو، عامہ مشائخ کے نزدیک قوم بھی اول سے آخر تک خطبہ سنے، اس لئے امام سے قریب ہونا افضل ہے، یہی صحیح ہے المحیط جو کوئی بھی مقتدی امام سے دور ہو وہ خاموش رہنے کے حکم میں قریب رہنے والے کے حکم میں ہے، اگرچہ اسے خطبہ سننے میں نہ آتا ہو (پھر بھی متوجہ رہے اور خاموشی کے ساتھ سنتا رہے) یہی قول مختار، احوط اور اصح ہے، الجواہر و المحیط، ھ (۴) الحمد للہ سے شروع کرنا کیونکہ اس کے بغیر خطبہ مجذوم مقطوع (اور دم کٹا ہوا ہے) (۵) جس طرح ممکن ہو اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کرنا (۶) دونوں شہادت یعنی اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمدا رسول اللہ کہنا (۷) رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا (۸) وعظ و نصیحت کرنا (۹) قرآن پڑھنا جو چھوٹی تین آیتیں یا بڑی ایک آیت ہو، الجوہرہ (۱۰) دوسرے خطبہ میں حمد و ثنا اور درود بھی دوبارہ پڑھنا (۱۱) دوسرے خطبہ میں مسلمان مردوں / اور عورتوں کے لئے دعاء کرنا۔

(۱۲) دوسرے خطبہ میں **الحمدللہ نحمدہ ونستعینہ ونستغفرہ ونعوذباللہ من شرورانفسا، من یھد اللہ فلامضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ واشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد اعبدہ ورسو لہ ارسلہ بالحق بشیرا ونذیرا بین یدی الساعۃ ومن یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعص اللہ ورسولہ فانہ لایضرالا نفسہ ولایضراللہ شیئا،** پڑھنا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے خطبوں میں سے ہے، م، اس میں عموماً جو زیادتی کی گئی ہیں وہ یہ کہ خلفاء راشدین اور عمین مکرمین (دونوں چچا) کا ذکر کیا جائے کہ یہ بات اچھی پسندیدہ معروف و معمول ہے، التجنیس، مگر بادشاہوں کی جھوٹی تعریف سخت مکروہ ہے (۱۳، ۱۴) رسول اللہ ﷺ خطبہ کے لئے منبر پر چڑھ کر بیٹھ جاتے یہاں تک کہ مؤذن اذان سے فارغ ہو جاتا، پھر کھڑے ہو کر آپ خطبہ پڑھتے پھر بیٹھ جاتے اس میں کچھ گفتگو نہیں فرماتے پھر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے، اس طرح دو خطبے ہو جاتے، حضرت ابن عمرؓ سے صحاح میں ہے، م، ع، ھ۔

(۱۵) خطبہ کو درمیانہ اور نماز کو اس سے طویل کرنا، فع، اس حدیث کی بناء پر جو مسلم اور ابوداؤد میں حضرت ابووائلؓ سے مروی ہے کہ خطبہ کو کوتاہ کرو، اور نماز کو دراز کرو، لیکن حضرت جابر بن سمرۃؓ کی حدیث میں دونوں درمیانہ ہونے کا تذکرہ ہے، اس کی روایت مسلم اور سنن اربعہ نے کی ہے، اس خطبہ کے درمیان خطیب کو کلام کرنا مکروہ ہے، مگر جبکہ امر بالمعروف ہو، الفتح، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابورفاعہ عدویؓ کے دین پوچھنے پر خطبہ چھوڑ کر ابورفاعہ کے پاس آکر سکھلایا پھر واپس جاکر خطبہ پورا کیا جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے، اور اسلمیؓ کو جلدی سے دو رکعت پڑھ لینے کا حکم دیا ہے، الصحیح، اور حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ کے خطبہ کے وقت آنے پر نصیحت فرمائی، جیسا کہ صحیح میں ہے، م،

چند ضروری مسائل

خطیب کے علاوہ دوسروں کو نماز نہیں پڑھانی چاہئے، الکافی، اگر امام کو خطبہ کے بعد حدث ہو اور وہ کسی دوسرے کو اپنا خلیفہ بنانا چاہئے کسی ایسے شخص کو بنائے جو خطبہ میں شریک ہو ورنہ نہ بنائے، اور اگر نماز شروع کرنے کے بعد حدث ہوا ہو تو جسے مناسب سمجھے بنادے، التہذیب، اور اگر وہ شخص خطبہ کے کچھ حصہ میں بھی حاضر رہا ہو تو صحیح ہوگا، اور اصل میں ہے کہ جائز نہ ہوگا، اور اگر ایسے شخص کو نماز کا حکم دیا جو خطبہ میں شریک نہ تھا مگر اس نے کسی دوسرے کو کہہ دیا جو خطبہ میں شریک تھا تو تمام صحیح ہو جائیگی، اور مختصر الحاکم میں ہے کہ جائز نہ ہوگی، مع۔

حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جس نے جمعہ کے دن اپنی بیوی سے جماع کیا پھر جمعہ کو گیا (یعنی پہلی جماعت میں) تو گویا اس نے اونٹ کی قربانی کی، اور جو دوسری ساعت میں گیا گویا اس نے گائے قربانی کی، اور جو کوئی تیسری ساعت میں گیا اس نے مینڈھے کی قربانی کی، اور کوئی چوتھی ساعت میں گیا گویا اس نے ابدی مرغی اللہ کی راستے صدقہ

کر دی، اور جو کوئی پانچویں ساعت میں گیا گویا اس نے ایک انڈے کا صدقہ کیا، پھر جب امام خطبہ کے لئے باہر آیا تو فرشتے حاضر ہو کر ذکر سنتے ہیں، صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ جمعہ کے دن مسجد کے ہر دروازہ پر فرشتے موجود ہوتے ہیں جو ہر آنے والے کو اول پھر اول یعنی بالترتیب لکھتے جاتے ہیں، پھر امام جب بیٹھ جاتا ہے تو صحیفے، رجسٹر لپیٹ کر ذکر سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں، حضرت اوس بن اوس ثقفیؓ سے روایت ہے کہ جس نے غسل کرایا (یعنی اپنی بیوی کو) اور اول وقت میں بغیر کسی سواری کے پیدل چل کر آیا اور امام کے قریب بیٹھ گیا، کوئی لغو کام نہیں کیا، اور کان لگا کر سنا یعنی خطبہ تو اس کے لئے ہر قدم کے بدلے ایک سال کا ثواب، اس پورے سال کے روزے اور قیام شب کیساتھ ہے، سنن اربعہ نے اس کی روایت کی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حدیث کے فوائد میں سے پہلا یہ ہے کہ اونٹ کا صدقہ گائے کے مقابلہ میں افضل ہے، کیونکہ مسکینوں اور غریبوں کو اس سے زیادہ فائدہ ہوگا، اور گائے کی قربانی بکری اور مینڈھے کے بالمقابل افضل ہے، مذہب میں یہی قول صحیح ہے، اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے جو مینڈھوں اور دنبوں کی قربانیاں کی ہیں وہ ان کے افضل ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس وقت وہاں مالی تنگی بھی تھی اور گائے بھی کمیاب تھی، اسی لئے اونٹ کی قربانی افضل ہونے کے باوجود جسے یہ میسر آسکا اسی نے اس کی قربانی کی اور وہ گائے کے مقابلہ آسانی سے پایا بھی جاتا تھا، اسے ذہن نشین کرلیں، دوسرا مستحب ہے دن نکلتے ہی جماع کرنا پھر غسل کرنا پھر سویرے سویرے جمعہ کے لئے نکل جانا تیسرا مستحب عورت کو نہلانا ہے، چوتھا پیدل آنا ہے۔

پانچواں فائدہ یہ حاصل ہوا کہ خطبہ کے وقت فرشتے بھی حاضر ہوتے ہیں، چھٹا امام سے نزدیک ہو کر بیٹھنا افضل ہے، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں مرفوعاً مروی ہے کہ تم ذکر میں حاضر رہو اور امام سے نزدیک بیٹھو، کیونکہ دور رہتے ہوتے آدمی بہت دور ہو جاتا ہے یہاں تک کہ جنت میں داخل ہونے کے باوجود اس میں پچھڑ جائیگا، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، ساتواں، لغو کام نہ کرنا، آٹھواں سننے کے لئے کان لگا کر رکھنا اور متوجہ رہنا، حضرت عمرو بن العاصؓ کی حدیث میں ہے کہ جو کوئی بھی جمعہ میں خاموشی اور سکوت کے ساتھ حاضر ہوا اور کسی مسلمان کی گردن نہیں پھاندی اور نہ کسی کو تکلیف دی تو یہ جمعہ اس کے لئے اگلے جمعہ تک کے لئے گناہوں کا کفارہ ہے، تین زائد دنوں تک کے ساتھ، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے اور صحیحین کی حدیث میں کفارہ ہونا ثابت ہے، اور ابوداؤد میں حضرت علیؓ کی حدیث میں ہے کہ شخص خطبہ سننے کے مقام سے دور ہو اور خاموش بیٹھا رہے، لغو کام نہ کرے تو اس کو ثواب ہے اور جو خاموش نہ رہے اس کو دو حصہ گناہ ہے جیسے یہاں خاموش سننے والے کو دو حصہ ثواب ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث میں ہے کہ جس نے جمعہ کے دن اپنے پاس والے سے کہا کہ چپ رہو تو اس نے لغو کیا، صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، ان تمام احادیث میں ذکر سے مراد خطبہ ہے جیسا کہ اس آیت پاک فاسعوا الیٰ ذکر اللہ الایہ میں ہے۔ م۔

فان اقتصر علی ذکر اللہ جاز عند ابی حنیفۃؒ وقالا لابد من ذکر طویل یسمی خطبۃ لان الخطبۃ ھی الواجبۃ والتسبیحۃ والتحمیدۃ لاتسمی خطبۃ وقال الشافعیؒ لا یجوز حتی یخطب خطبتین اعتبارا للمتعارف ولہ قولہ تعالی فاسعوا الی ذکر اللہ من غیر فصل وعن عثمانؓ انہ قال الحمدللہ فارتج علیہ فنزل وصلی.

ترجمہ:۔اگر کسی نے صرف ذکر اللہ پر اکتفاء کیا تو بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہوگا، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ اتنا طویل ذکر ہونا بھی ضروری ہے جسے خطبہ کا نام دیا جاسکے، کیونکہ خطبہ واجب ہے، اور تسبیح اور تحمید کو خطبہ نہیں کہا جاتا ہے،، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ جب تک کہ دو خطبے نہ ہو جائز نہ ہوگا، کیونکہ عوام میں یہی متعارف ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ آیت پاک فَاسْعَوا اِلٰی ذِکرِ اللہ۔ اللہ کی ذکر کی طرف سعی کرو بغیر کسی تفصیل کے ہے، اور حضرت عثمانؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے

ایک مرتبہ صرف الحمد للہ کہا اور ان پر کپکپی آگئی اس لئے منبر سے اتر گئے اور نماز پڑھادی۔

توضیح:- خطبہ کی مقدار۔ قرآن سے دلیل

فان اقتصر علی ذکر اللہ جاز عند ابی حنیفة.....الخ

اگر خطیب نے صرف ذکر اللہ کیا تو بھی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جائز ہے، ف بشر طیکہ خطبہ ہی کی نیت سے کہا ہو، شکر وغیرہ کی نیت سے نہ کہا ہو، ھ، ع، کم از کم مقدار ایک بار تسبیح کہنا یا لا الہ الا اللہ کہنا یا الحمد للہ کہنا ہے، المبسوط، وغیرہ، ع، اور صرف اللہ کہنا اگرچہ لغت کے اعتبار سے ذکر ہے مگر خطبہ تو کلام ہوتا ہے، م، اور کافی میں ہے کہ الحمد للہ کو مکرر کہنا شرط ہے، تاکہ اس کا نام خطبہ ہو، ع۔

وقالا لابد من ذکر طویل یسمی خطبة لان الخطبة ھی الواجبة والتسبیحة.....الخ

اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ اتنا طویل ذکر ہو جسے خطبہ کہا جاسکے، ف عامہ علماء کا یہی قول ہے، امام ابو بکر الرازیؒ نے فرمایا ہے کہ صاحبینؒ کے نزدیک کم سے کم مقدار جسے خطبہ کہا جاسکے وہ ہے جو التحیات للہ سے عبدہ ورسولہ کے آخر تک کہنے کے برابر ہے، ع، شاید کہ کافی کا مسئلہ صاحبینؒ کے قول کے وجہ سے ہے، م، لان الخطبة الخ کیونکہ خطبہ تو واجب ہے، یعنی جسے خطبہ کہہ سکیں، والتسبیحة الخ اور ایک تسبیح یعنی سبحان اللہ اور ایک تحمید یعنی الحمد للہ کا نام خطبہ نہیں ہوتا ہے، ف پس اگر ایسے کلام کو اگرچہ بار بار کہا جائے خطبہ نہ ہوگا۔

وقال الشافعیؒ لا یجوز حتی یخطب خطبتین اعتبار ا للمتعارف.....الخ

اور شافعیؒ نے کہا ہے کہ جب تک دو خطبے نہ پڑھے صحیح نہ ہوگا، اعتباراً الخ متعارف عمل کی بناء پر۔ ف کیونکہ عرف میں اسے خطبہ نہیں کہتے ہیں، اور شاید یہ مراد ہو کہ متعارف شرعی یہی ہے، لہٰذا قول صحیح یہ ہوا کہ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ میں ذکر مجمل ہے اس لئے حدیث میں اس سلسلہ میں جو بیان کیا گیا ہے وہی اجمال کا بیان ہے، اور شریعت میں بھی یہی متعارف ہے، لہٰذا اسی کا اعتبار ہوگا، جواب دیا گیا ہے کہ ذکر مجمل نہیں ہے، بلکہ معلوم ہے لہٰذا کم از کم مقدار جسے ذکر کہہ سکیں وہی شرط ہوگا، اور دو خطبہ کی مقدار طویل ہونا مسنون ہے۔

ولہ قولہ تعالی فاسعوا الی ذکر اللہ من غیر فصل.....الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ ہے، ف سعی کرو ذکر الٰہی کی طرف، من غیر فصل الخ بغیر کسی تفصیل کے، ف کہ وہ ذکر کثیر ہو یا قلیل، لہٰذا وہ مطلق رہا، اس بناء پر کم از کم مقدار بھی کافی ہوگی اور حکم کی فرمان برادری ممکن ہے، اب اگر ہم ذکر کے ساتھ کثیر کی بھی شرط لگائیں تو آیت کو صرف ظنی دلیل سے متغیر کرنا لازم آئیگا، جو جائز نہیں ہے، ع، ف۔

میرے نزدیک تو اس پر یہ اعتراض لازم آتا ہے کہ مان لیا کہ ذکر اللہ مطلق ہے اور اس سے مراد بالاتفاق خطبہ ہے، اور خطبہ سے شرعی معنی خطبہ ہی مقصود ہیں، اور متعارف شرعی وہی مقدار ہے جو بیان ہوئی، یہ بات خود عینیؒ نے کہی ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ خطبہ سے لغوی معنی مراد ہوں گے، کہ خطاب سے لغت کا مفہوم لیا جاتا ہے مگر دلیل کے ساتھ، میں مترجم کہتا ہوں کہ صلوٰۃ سے شرعی معنی لئے گئے ہیں نہ لغوی، یوں ہی خطبہ میں ہے۔

اس مترجم کے نزدیک اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ فرمان باری تعالیٰ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ سے مراد امام شافعیؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک خطبہ ہے اس دلیل سے کہ ہمارے اسلاف صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے بھی یہی تفسیر کی ہے اور احادیث میں بھی ایسا ہی پایا گیا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ خطبہ ہی ذکر اللہ ہے، لیکن آیت میں مقصود خطبہ نہیں ہے، بلکہ مقصود اس سے ذکر اللہ

ہے، لیکن آیت میں مقصود خطبہ نہیں ہے، بلکہ مقصود ذکر ہے، جو خطبہ میں پڑھا جاتا ہے، اور جمعہ کی نماز کے لئے شرط بھی ذکر اللہ ہی ہے خواہ خطبہ کے طور پر یا کسی اور طور پر ہو، اور مخصوص خطبہ شرط نہیں ہے، اس بناء پر صاحبینؒ کا یہ کہنا کہ الخطبةُ هی الواجبةُ صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ صحیح ہے الذکر هو الشرط یعنی شرط تو ذکر ہے، اس طرح ذکر قلیل ہو یا کثیر جس قدر بھی ہو اسی سے فرض شرط ادا ہو جائیگا، امام ابو بکر الرازیؒ کے کہنے کے مطابق مقدار واجب اس ذکر کے التحیات ہے، یہاں تک کہ الحمد اللہ بار بار اتنا پڑھتے رہنے سے واجب ادا ہو جائیگا، اور اگر فقط ایک بار الحمد للہ کہا تو فرض ادا ہو جائیگا، عینیؒ نے لکھا ہے اور ظاہر الروایۃ میں تین آیتوں کے اندازہ سے واجب ہے اس لئے الحمد للہ ہی کو اسی قدر مکرر کرنے سے واجب ادا ہو جائیگا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر صرف ایک بار لا الہ الا اللہ خطبہ کے لئے کہا تو اس کو دوبارہ کہنا واجب ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک اتنا دراز کلام ہونا شرط ہے جسے کلام کہا جاسکے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک اتنا دراز کلام ہونا تو شرط نہیں ہے البتہ دو خطبے ہونا واجب ہے، اور کہا گیا ہے کہ شرط بھی ہیں، اچھی طرح سمجھ لیں، واللہ تعالیٰ اعلم، م۔

وعن عثمانؓ انه قال الحمدلله فارتج علیه فنزل وصلی......الخ

اور حضرت عثمانؓ کے متعلق مروی ہے کہ انہوں نے ایک بار الحمد اللہ کہا، ف اور آگے نہ کہہ سکے زبان بند ہو گئی جبکہ خلافت پانے کے بعد پہلی مرتبہ خطبہ کے لئے کھڑے ہوئے، فنزل وصلی مجبوراً منبر سے اتر گئے اور نماز پڑھادی، ف اس سے معلوم ہوا کہ اگر صرف الحمد للہ کہنا کافی نہ ہوتا تو اتنے پر اقتصار نہ کرتے، عینی وغیرہ نے کہا ہے کہ اس طرح صرف فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے، حدیث میں نہیں ہے، اور قاسم بن ثابت نے کتاب غریب الحدیث میں اسے بغیر اسناد کے ذکر کیا ہے، محقق ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس کے لئے قطعی آیت تو فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ہے، اس سے صرف ذکر مراد ہے، خواہ خطبہ کے طور پر ہو یا کسی اور طور پر ہو، اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ فرمایا تھا، پھر خطبہ خواہ واجب ہوا یا سنت ہوا بہر صورت شرط نہیں ہوا، اس طرح پر کہ اس کے بغیر نماز جائز نہ ہو، اور لفظ ذکر معلوم ہو مجہول نہیں ہے، لہٰذا فقط ذکر شرط ہوا، اس تحقیق کے بعد اب حضرت عثمانؓ کے قصہ کو دلیل میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، مف، یہ تقریر وہی تقریر ہے جو مترجم نے اوپر کی تھی، فالحمد للہ کہ ہماری اپنی تحقیق شیخ محققؒ کی تقریر کے موافق ہو گئی، پھر امام ابو بکر الرازی کا کلام ظاہر اور کافی ہے اسی مفہوم میں کہ مقدار خطبہ واجب ہے، اور یہی قول احوط ہے، واللہ تعالیٰ اعلم، م، دونوں خطبے طوال مفصل کی ایک سورہ کی مقدار ہوں، البدائع، اس سے زیادہ طویل خطبہ کرنا مکروہ ہے۔ البحر۔

ومن شرائطها الجماعة لان الجمعة مشتقة منها واقلهم عند ابی حنیفةؒ ثلثة سوی الامام وقالا اثنان سواه قالؒ والاصح ان هذا قول ابی یوسفؒ وحده له ان فی المثنی معنی الاجتماع وهی منبئة عنه ولهما ان الجمع الصحیح انما هو الثلاث لانه جمع تسمیة ومعنی والجماعة شرط علی حدة وکذا الامام فلایعتبر منهم.

ترجمہ:- اور جمعہ کی شرطوں میں سے جماعت ہونا بھی ہے، کیونکہ یہ لفظ جمعہ جماعت سے مشتق ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جماعت کے لئے کم از کم تین آدمیوں کا امام کے علاوہ ہونا شرط ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک امام کے ماسوا صرف دو آدمیوں کا ہونا کافی ہے، اور مصنفؒ نے کہا ہے کہ قول اصح یہ ہے کہ یہ قول امام ابو یوسفؒ کا ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ دو میں بھی جماعت کے معنی پائے جاتے ہیں، اور جمعہ جماعت کی خبر دیتا ہے، اور طرفین یعنی امام اعظم وامام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ صحیح طور پر جمع تو تین ہی ہے، کیونکہ یہی تین کے عدد نام اور معنی دونوں کے اعتبار سے جمع ہے اور جماعت کا ہونا علیحدہ شرط ہے، اور اسی طرح امام ہونا ایک علیحدہ شرط ہے، لہٰذا امام کا شمار جماعت میں نہ ہوگا۔

توضیح:- جماعت، جماعت کی تعداد، ائمہ کا اختلاف، ان کے دلائل

ومن شرائطها الجماعة لان الجمعة مشتقة منها......الخ

جمعہ کی شرطوں میں سے ایک جماعت بھی ہے، لان الجمعة الخ کیونکہ جمعہ جماعت سے مشتق ہے، ف یعنی الجمعہ والجماعۃ مصدر سے جمعہ مشتق ہے، اصول فقہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ شرعی ناموں کو لغوی معنی کے ساتھ جہاں تک ثبوت ہو لیناواجب ہے، جیساکہ تیمم کی بحث میں گذر چکا ہے، م۔

واقلهم عند ابی حنیفةؒ ثلاثة سوی الامام وقالا اثنان سواه......الخ

ابو حنیفہؒ کے نزدیک جماعت کے تعداد کم سے کم امام کے علاوہ تین آدمیوں کا ہونا ہے، ف یعنی امام کے ساتھ کل چار آدمی ہونے چاہئے، لیکن خطبہ میں بھی ان کا حاضر ہونا شرط نہیں ہے، ف یہی قول امام زفر ولیث واوزاعیؒ کا ہے اور مزنیؒ کا مذہب مختار ہے، مع، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام کے علاوہ دو ہونا شرط ہے۔

قالؒ والاصح ان هذا قول ابی یوسفؒ وحده له ان فی المثنی معنی الاجتماع......الخ

مصنفؒ نے کہا ہے کہ قول اصح یہی ہے کہ مذکورہ قول صاحبینؒ کا نہیں بلکہ صرف امام ابو یوسفؒ کا ہے، ف اور امام محمدؒ کا قول امام اعظم کے قول کے موافق ہے، یہ قول حسن بصریؒ کا ہے، اور امام احمد وابو ثور اور سفیان ثوریؒ سے دونوں قول مروی ہیں، مع، له ان الخ امام ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ تثنیہ یعنی دو میں اجتماع کے معنی موجود ہیں وهی منبئة الخ لفظ جمعہ خود اجتماع کو بتا رہا ہے ،ف یعنی جمعہ کے لغوی معنی آگاہ کرنے کے ہیں کہ اجتماع ہونا چاہئے اور جب کہ دو میں ایک دوسرے کے ساتھ اجتماع ہو تو لغوی معنی کا تقاضا پورا ہو گیا، میں مترجم کہتا ہوں کہ شاید ابو یوسفؒ کے نزدیک امام کے ساتھ جماعت کا ہونا جمعہ کے لئے کافی ہو، امام سے علیحدہ نہ ہو، م۔

ولهما ان الجمع الصحیح انما هو الثلاث لانه جمع تسمیة ومعنی......الخ

اور طرفین امام ابو حنیفہ اور امام محمدؒ کی دلیل یہ ہے کہ حقیقت میں تو جمع تین ہی کو کہا جاتا ہے، لانه جمع الخ کیونکہ تین کا عدد نام اور معنی دونوں اعتبار سے جمع ہے، ف واحد تثنیہ کے بعد جمع نام آتا ہے اور معنی میں بھی جماعت ہے، لہٰذا لفظ رجال جو جمع ہے اس کو تین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے رجال ثلاثۃ اور رجال اثنین نہیں بولتے ہیں، اور امام کے ساتھ مل کر جماعت نہیں بنائی جائے۔

والجماعة شرط علی حدة وکذا الامام فلایعتبر منهم......الخ

اور جماعت کا ہونا ایک علیحدہ شرط ہے فلایعتبر الحاصل جماعت ہونے میں امام کا شمار نہ ہو گا، ف۔ پس امام کے علاوہ کم از کم تین کا ہونا شرط ہے امام شافعیؒ کے نزدیک کم از کم چالیس مردوں کی شرط ہے حضرت کعب بن مالکؓ کی حدیث کی وجہ سے کہ اسعد بن زرارہ نے مدینہ میں پہلا جمعہ چالیس آدمیوں کے ساتھ پڑھایا تھا، جیسا کہ ابن ماجہ نے روایت کیا ہے، جواب یہ ہے کہ اول تو یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کے تشریف لانے سے پہلے ہوا تھا، پھر اس سے اس بات کی کوئی دلیل نہیں ملتی کہ اس سے کم ہونے میں جائز نہ ہو گی، دوسری دلیل حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ چالیس یا اس سے زائد ہونے میں جمعہ کی نماز ہو گی، بیہقی نے اس کی روایت کی ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث ضعیف ہے، اس کے علاوہ کم ہونے پر ممانعت نہیں ہے، البتہ اس کے مفہوم چالیس ہونا سمجھا جاتا ہے مگر مفہوم حجت نہیں ہوتا ہے، تیسری دلیل حضرت ابو امامہؓ کی حدیث جو مرفوع ہے کہ جمعہ چالیس کے ساتھ صحیح ہے جواب یہ ہے کہ یہ حدیث موضوع اس کی کوئی اصلیت نہیں، امام بخاری و مسلمؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ

جمعہ کا خطبہ پڑھ رہے تھے کہ شام سے اناج لے کر ایک قافلہ آیا تو لوگ اس کا مال یعنی غلہ لینے کے لئے مسجد سے باہر آئے، صرف بارہ آدمی آپ کے ساتھ نماز میں رہ گئے، اس میں اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی ﴿وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا انْفَضُّوْا اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَائِمًا﴾ امام ابو بکر ارازیؒ نے کہا ہے کہ اس قوم کے واپس آنے کا کوئی ذکر نہیں ہے اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں رہتے ہوئے کبھی بھی جمعہ کی نماز نہیں چھوڑی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بچے ہوئے صرف بارہ کے ساتھ ہی نماز پڑھی، اس سے یہ معلوم ہوا کہ چالیس آدمی کی شرط اس طرح کی لگانی کہ چالیس کے بغیر نماز ہی صحیح نہ ہوگی باطل ہے، بیہقی اور دار قطنی کی روایت میں ہے کہ صرف چالیس آدمی آپ کے ساتھ رہ گئے تھے، یہ روایت صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح وہی ہے جو صحیحین میں ہے، واضح ہو کہ بخاری کی روایت میں ہے کہ نماز سے وہ لوگ واپس ہوگئے، لیکن مسلم کی روایتوں میں ہے کہ خطبہ سے واپس ہوگئے۔ لہذا بخاری کی روایت میں نماز سے مراد خطبہ ہے، اور خطبہ ہر نماز سے اطلاق بلکہ نماز کے لئے انتظار کو نماز کہنا صحاح میں تو عام ہے۔ م۔ ف۔ ع۔

وان نفر الناس قبل ان يركع الامام ويسجد الا النساء والصبيان استقبل الظهر عند ابي حنيفةؒ وقالا اذا نفروا عنه بعد ما افتتح الصلوة صلى الجمعة فان نفروا عنه بعد ما ركع وسجد سجدة بنى على الجمعة خلافا لزفرؒ هو يقول انه شرط فلابدمن دوامه كالوقت ولهما ان الجماعة شرط الانعقاد فلايشترط دوامها كالخطبة ولابي حنيفةؒ ان الا نعقادبالشروع في الصلاة ولايتم ذلك الابتمام الركعة لان مادونها ليس بصلوة فلابدمن دوامها اليها بخلاف الخطبة فانها تنافي الصلوة فلايشترط دوامها ولامعتبر ببقاء النسوان وكذا الصبيان لانه لاتنعقد بهم الجمعة فلا تتم بهم الجماعة.

ترجمہ:- اور اگر امام کے رکوع اور سجود میں جانے سے پہلے سارے مقتدی سوائے عورتوں اور بچوں کے بھاگ جائیں تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک امام شروع سے ظہر کی نماز پڑھ لے گا، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ اگر امام کے نماز شروع کرنے کے بعد امام کو چھوڑ کر بھاگے ہوں تو وہ جمعہ کی نماز ہی مکمل کر لے گا اور اگر امام کے رکوع اور سجود ادا کر لینے کے بعد بھاگے ہوں تو بھی جمعہ پر وہ بناء کرے گا یعنی بقیہ نماز پوری کرے گا، اس مسئلہ میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے، وہ کہتے ہیں کہ چونکہ افراد کا پایا جانا بھی ایک شرط ہے، لہذا دوسری شرطوں کی طرح اسے بھی آخر نماز تک باقی رہنا ضروری ہوگا جیسا کہ وقت ایک شرط ہے، اور صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ جماعت تو جمعہ کے منعقد ہونے کے لئے ایک شرط ہے اس لئے اس شرط کا آخر نماز تک باقی رہنا شرط نہیں ہے، مثل خطبہ کے، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل ہے کہ جمعہ کی نماز شروع کرنے سے ہی اس کا انعقاد ہوتا ہے، اور ایک رکعت پوری کرنے سے ہی اس نماز کا انعقاد پورا ہوتا ہے، کیونکہ ایک رکعت سے کم کوئی نماز نہیں ہوتی ہے، لہذا جماعت کا رکعت کے پورے ہونے تک ضروری ہوا، بخلاف بغیر خطبہ کے کہ خطبہ تو نماز کے منافی اور علیحدہ چیز ہے، اس لئے اس کے ہمیشہ باقی رہنے کی شرط نہیں لگائی جاتی ہے، اور عورتوں کے باقی رہ جانے کا کوئی اعتبار نہیں کیا جاتا ہے، ایسا ہی نابالغ بچوں کے رہ جانے کا بھی کوئی اعتبار نہیں ہوتا ہے ایسا ہی بچوں کے رہنے کا بھی اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ ان سے جمعہ منعقد نہیں ہوتا ہے تو ان کے نہ ہونے سے شرط جماعت بھی پوری نہ ہوگی۔

توضیح:- جمعہ میں لوگ امام کو چھوڑ کر ادھر ادھر چلے گئے
ائمہ کے اختلاف اور ان کے دلائل

وان نفر الناس قبل ان يركع الامام ويسجد الا النساء والصبيان استقبل الظهر......الخ

اگر نمازی حضرات ادھر ادھر چلے گئے، ف پس اگر جمعہ کے نماز شروع کرنے سے پہلے چل دئے یہاں تک کہ امام کے علاوہ تین مرد باقی نہ رہے تو بالاتفاق اب جمعہ کی نماز باقی نہیں رہی (ظہر پڑھنی ہوگی) اور اگر شروع کرنے کے بعد ایسا ہوا کہ چلے گئے،

قبل ان یرکع الخ اس سے پہلے کہ امام رکوع و سجود کرے، ف اور تین مرد تک نہ رہے، مگر عورتیں اور بچے رہ گئے، ف تو جمعہ ختم ہو گیا، استقبل الخ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نئے سرے سے ظہر کی نماز پڑھ لے، ف جبکہ جانے والے واپس نہ آئیں یا ظہر کی نماز پڑھ لینے کے بعد آئیں، یہ حکم اس صورت میں ہو گا کہ انہوں نے شروع کر کے سجدہ نہ کیا ہو۔

وقالا اذا نفر واعنه بعد ما افتتح الصلوٰة صلی الجمعة فان نفر واعنه بعد ما رکع......الخ

اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ وہ لوگ جنہیں نماز میں شریک رہنا ضروری تھا وہ امام کو چھوڑ کر بھاگ جائیں اور اس کے بعد امام نے نماز شروع کر لی تھی تو امام جمعہ کی نماز پڑھ لے، فان نفر واعنه الخ اور اگر وہ امام کے رکوع و سجود اور ایک سجدہ کر لینے کے بعد امام کو نماز میں چھوڑ کر بھاگ گئے تو وہ جمعہ پر بناء کرے، ف جمعہ کی بقیہ نماز پوری کر لیں، اس مسئلہ میں امام اعظمؒ اور صاحبینؒ سب کا اتفاق ہے، المضمرات۔

خلافا لزفر هو يقول انه شرط فلابد من دوامه كالوقت......الخ

بخلاف امام زفرؒ کے قول کے، ف کہ ان کے نزدیک اس صورت میں بھی ظہر کی نماز پڑھیں، وهو يقول الخ اور امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ جماعت تو شرط ہے اس لئے آخری تک اسے باقی رہنا چاہئے جیسے وقت، ف کہ وقت بھی شرط ہونے کی وجہ سے ختم تک رہنا ضروری ہے، یہاں تک کہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک سلام کے قبل خارج ہو تو جمعہ فاسد ہو جائے گا۔

ولهما ان الجماعة شرط الانعقاد فلايشترط دوامها كالخطبة......الخ

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ جماعت تو صرف جمعہ منعقد ہونے کی شرط ہے، ف مکمل ادائیگی کی شرط نہیں ہے، لہٰذا اس جماعت کی شرط کو اول سے آخر تک باقی رہنا ضروری نہیں ہے، مثل خطبہ کے، ف کہ بالاتفاق خطبہ شرط ہے مگر نماز کے آخر تک خطبہ کے جاری رہنے کا کوئی بھی قائل نہیں ہے، لہٰذا امام نے جب نماز شروع کی جماعت اس وقت موجود تھی تو جمعہ منعقد ہو گیا، پھر سجدے میں جانے سے پہلے وہ بھاگ جائیں یا بعد میں بھاگیں اس سے کوئی فرق نہ ہو گا، یعنی امام اپنے جمعہ کی نماز مکمل کر لے۔

ولابی حنیفةؒ ان الانعقاد بالشروع فی الصلاة ولایتم ذلك الابتمام الركعة......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ نماز شروع کرنے سے ہی جمعہ انعقاد ہوتا ہے، ف بلاشبہ جمعہ کے ختم تک تو جماعت شرط نہیں ہے، بلکہ صرف اس کے منعقد ہونے کے لئے شرط ہے، لیکن نماز کا منعقد ہونا کب ہوتا ہے، تو صاحبینؒ نے کہا ہے تکبیر تحریمہ سے نماز شروع کی اور منعقد ہو گئی، اور امام اعظمؒ نے فرمایا ہے کہ ابھی نماز منعقد نہیں ہوئی۔ ولا یتم ذلك الخ اور جب تک کہ ایک رکعت پوری نہ ہو جائیگی نماز پورے طور پر منعقد نہ ہو گی، ف اور رکعت تو اسی وقت پوری ہوتی ہے، جب کہ ایک رکعت کا سجدہ پورا کر لیا ہو گا، اگرچہ ایک ہی سجدہ کیا ہو جب بھی نماز منعقد ہو جائیگی، لان مادونها الخ کیونکہ رکعت سے کم تو نماز میں شمار نہیں ہے، ف یہاں تک کہ اس کو توڑ دینا جائز ہے۔ فلابد الخ لہٰذا یہ ضروری ہوا کہ نماز شروع کرنے کے بعد سے رکعت تک جماعت باقی رہے، ف یعنی رکعت تک جماعت باقی رہے، اس وقت اپنی نماز پوری کر لے اگرچہ جماعت بھاگ گئی ہو۔

بخلاف الخطبة فانها تنافی الصلوة فلایشترط دوامها......الخ

بخلاف خطبہ کی شرط کے کیونکہ خطبہ تو نماز منافی اور علیحدہ کام ہے، دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے ہیں، لہٰذا خطبہ نماز کے آخر تک باقی نہیں رہ سکتا ہے، ف اس جگہ یہ وہم ہو سکتا ہے کہ جب رکعت سے کم ہونے سے نماز منعقد نہیں ہوتی ہے تو نفل کو شروع کر کے توڑ دینے سے اس کی قضاء نہیں ہونی چاہئے جب تک کہ رکعت تک پڑھ کر نہ توڑ دے، اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نماز پانے کی دو حالتیں ہوتی ہیں اول یہ کہ تحریمہ پایا گیا ہو تو اس اعتبار سے وہ نماز ہے، اور چونکہ نماز نام ہے قراءت، رکوع اور سجود کا تو اس اعتبار سے نماز نہیں پائی گئی ہے، اور نفل توڑنے کے مسئلہ میں ہم نے پہلی صورت کا اعتبار کر کے نماز کے قضاء کو

واجب کہا ہے، ایسا ہونے سے نماز اپنی کوتاہی اور قصور سے یقینی طور سے بچ جائے گا، اور جمعہ کے مسئلہ میں ہم نے دوسری صورت کا اعتبار کیا ہے تاکہ ظہر پڑھ لینے سے بالیقین فرض ادا ہو جائے گا، اس فرق کو یاد رکھیں، م، ع۔

ولامعتبر ببقاء النسوان وكذا الصبيان لانه لاتنعقد بهم الجمعة فلا تتم بهم الجماعة......الخ

اور عورتوں کو اور بچوں کے باقی رہ جانے کا کوئی اعتبار نہ ہوگا، لانہ لاتنعقد الخ کیونکہ صرف عورتوں اور بچوں کے ساتھ پڑھنے سے وہ معذور نہیں ہوتا ہے، اس وجہ سے ان کے ہونے سے شرط جماعت پوری نہ ہوگی، ف بخلاف ان کے اگر مسافر یا بیمار اور دوسرے منعقد موجود ہوں جن پر جمعہ کی نماز لازم نہیں ہوتی ہے یا جنہوں نے خطبہ نہیں سنا تھا تو ان کی موجودگی معتبر ہوگی، کیونکہ ان کی وجہ سے جمعہ کی شرط پوری ہو جائیگی۔ مع۔

ولاتجب الجمعة على مسافر ولا امرأة ولا مريض ولا عبدولا اعمى لان المسافر يحرج فى الحضور وكذا المريض والاعمى والعبد مشغول بخدمة المولى والمرأة بخدمة الزوج فعذروادفعاللحرج والضررفان حضروا فصلوا مع الناس اجزاهم عن فرض الوقت لانهم تحملوه فصاروا كا لمسافر اذا صام .

ترجمہ:- اور جمعہ کی نماز ان لوگوں پر واجب نہیں ہوتی ہے، مسافر، عورت، بیمار، غلام، اور اندھا، کیونکہ مسافر کو مسجد جانے میں حرج لازم آسکتا ہے، اسی طرح بیمار اور اندھے کو بھی حرج ہو سکتا ہے، اور غلام تو اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہتا ہے اور عورت اپنے شوہر کی خدمت میں مصروف رہتی ہے، لہٰذا ان سب کے حرج کا خیال رکھتے ہوئے انہیں معذور سمجھا جائے گا، انہیں تکلیف اور پریشانی میں مبتلا ہونے سے بچانے کے لئے، اس کے باوجود اگر یہ معذورین مسجد میں آکر لوگوں کے ساتھ ہو کر جمعہ کی نماز پڑھ لیں تو ان کی یہ نماز وقتیہ نماز کے لئے کافی ہوگی، کیونکہ ان لوگوں نے حرج و مشقت کو برداشت کیا ہے اس لئے یہ ایسے مسافر کے طرح ہو گئے جس نے حالت سفر میں روزے رکھ لیئے ہوں۔

توضیح:- جن لوگوں پر جمعہ ضروری نہیں ہے، اور اگر وہ پڑھ لے تو کیا حکم ہوگا

ولاتجب الجمعة على مسافر ولا امرأة ولا مريض ولا عبد ولا اعمى......الخ

اور جمعہ واجب نہیں ہے ف یعنی اصل جمعہ اگرچہ ہر شخص پر فرض عین ہے مگر اس کی ادائیگی واجب نہیں ہے، کسی مسافر پر، ف یہاں تک کہ اگر وہ جمعہ کی نماز کے لئے مسجد بھی نہ جائے تو گنہگار نہ ہوگا، جب کہ ظہر کی نماز پڑھ لے، کسی عورت پر، کسی بیمار پر، ف مشقت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے، اور نہ کسی غلام پر، ف ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے، اور اگر مالک نے اجازت دے دی ہو تو غلام کو اختیار ہوگا چاہئے جمعہ پڑھے اور نہ چاہئے تو ظہر پڑھ لے، الذخیرہ، مگر مکاتب پر واجب ہے، ھ، ع، اور نہ اندھے پر، ف اگر اس کو لے جانے والا بھی موجود ہو۔

لان المسافر يحرج فى الحضور وكذا المريض والاعمى والعبد مشغول......الخ

کیونکہ مسافر کو جمعہ میں حاضر ہونے میں پریشانی ہوگی۔ وکذا المریض الخ اور حرج بیمار اور اندھے میں بھی ہے، ف کیونکہ جانے میں تکلیف ہوگی، اگر اندھے کو لے جانے والا مل جائے تو قول اصح یہ ہے کہ اس وقت بھی جانا واجب نہیں ہے، کیونکہ خود اس میں قدرت نہیں ہے، جیسے بیمار جبکہ وہ سواری پائے، اگر کسی نے خود کو جمعہ کے دن بیمار کر لیا مثلاً دست آور دوا کھالی تو قول اصح یہ ہے کہ اگر اسے بھی نماز کے وقت مسجد جانے میں حرج ہو تو وہ بھی معذور ہوگا، مع، والعبد الخ اور غلام اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہتا ہے، ف یہاں تک کہ اس کے آقا کو یہ حق ہے کہ اس غلام کو جمعہ کے نماز میں جانے کی اجازت دے یا نہ دے، الذخیرہ، مگر ظہر کے واسطے منع نہیں کر سکتا ہے، م۔

والمرأة بخدمة الزوج فعذروا دفعا للحرج والضرر ......الخ

اور عورت اپنے آقا کی خدمت میں مشغول رہتی ہے، ف کیونکہ دیانۃً اس پر شوہر کی خدمت واجب ہے، اور اگر شوہر نہ ہو تو بھی ان انہیں جماعت میں شرکت سے منع کیا گیا ہے، م، فعذروا الخ پس یہ لوگ حرج اور تکلیف وغیرہ کے خیال سے معذور اور معاف رکھے گئے ہیں۔

فان حضروا فصلوا مع الناس اجزاهم عن فرض الوقت لانهم تحملوه......الخ

اگر یہ لوگ شرکت سے معافی کے باوجود نماز میں حاضر ہو جائیں، ف یعنی اپنا حرج اور ضرر کو برداشت کرتے ہوئے شوق کے جذبہ میں حاضر ہو گئے، اور لوگوں کے ساتھ جمعہ کی نماز پڑھ لی تو اس وقت کے فرض یعنی ظہر کے عوض جمعہ کی نماز کافی ہو جائیگی، ف اس پر تمام علماء سلف وخلف کا اجماع ہے، ابن المنذرؒ نے اسے ذکر کیا ہے، لیکن عورتوں کے بارے میں شرکت نہ کرنے کا فتویٰ ہو چکا ہے اس کی مخالفت کی وجہ سے وہ گنہگار ہو گی، اور عورتوں کے علاوہ اگر صرف باقی معذوروں کی جماعت ہوئی اور اور لوگ نہ ہوئے تو بھی جائز ہو گی، م، ھ، ف، ع۔

انهم تحملوه فصاروا كا لمسافر اذا صام ......الخ

کیونکہ ان لوگوں نے حرج ومشقت کو برداشت کیا تو وہ ایسے مسافر کے مانند ہو گئے جس نے حالت سفر میں بھی روزہ رکھ لیا، ف تکلیف کے پیش نظر مسافر کو افطار کی بھی اجازت ہے کہ روزہ رمضان کی قضاء کرے، اس کے باوجود اگر مسافر نے روزہ رکھ لیا تو افضل ہو گا، کیونکہ اس مسافر نے مقیم سے زیادہ تکلیف اٹھائی ہے، اسی طرح اگر ان لوگوں نے بھی تکلیف اٹھا کر جمعہ کی نماز پڑھ لی تو جائز ہو جائیگی، م، ع۔

ويجوز للمسافر والعبد والمريض ان يؤم فى الجمعة وقال زفرؒ لايجزيه لانه لافرض عليه فاشبه الصبى والمرأة ولنا ان هذه رخصة فاذا حضروايقع فرضا على ما بينا اما الصبى فمسلوب الاهلية والمرأة لاتصلح لامامة الرجال وتنعقدبهم الجمعة لا نهم صلحوا للامامة فيصلحون للاقتداء بطريق الاولى ومن صلى الظهر فى منزله يوم الجمعة قبل صلوة الامام ولا عذر له كره له ذلك وجازت صلاته وقال زفرؒ لايجزيه لان عنده الجمعة هى الفريضة اصالة والظهر كالبدل عنها ولامصير الى البدل مع القدرة على الاصل ولنا اصل الفرض هوالظهر فى حق الكافة هذا هو الظاهر الاانه مامور باسقاطه باداء الجمعة وهذا لانه متمكن من اداء الظهر بنفسه دون الجمعة لتوقفها على شرائط لا تتم به وحده وعلى التكمن يدورالتكليف.

ترجمہ:- اور مسافر غلام اور بیمار کے لئے یہ جائز ہے کہ جمعہ کی امامت کریں، اور امام زفرؒ نے فرمایا کہ جائز نہ ہو گی، کیونکہ ان پر جمعہ واجب نہیں ہے لہٰذا یہ لوگ نابالغ اور عورت کے مشابہ ہو گئے، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ جمعہ کی نماز ان پر فرض نہ کر کے ان کو رخصت دی گئی ہے، اس لئے وہ جب مسجد میں آہی جائیں تو یہ نماز ان پر فرض ہو جائیگی، جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کر دیا ہے، مگر نابالغ میں تو اہلیت ہی نہیں ہوتی ہے، اس کی اہلیت چھین لی گئی ہے، اور عورتیں تو مردوں کی امامت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی ہے، اور ان سے جمعہ منعقد ہو جاتا ہے اس لئے کہ یہ امامت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو بدرجہ اولی اقتداء کی بھی صلاحیت رکھیں گے، اور جس نے جمعہ کے دن اپنے گھر میں ظہر کی نماز امام کی نماز جمعہ سے پہلے پڑھ لی جب کہ اسے کوئی مجبوری بھی نہ ہو تو یہ ظہر اس کے لئے مکروہ ہو گی لیکن نماز جائز ہو جائیگی، اور امام زفرؒ نے فرمایا ہے کہ یہ نماز اسکے لئے جائز نہ ہو گی، کیونکہ ان کے نزدیک تو اصل کے طور پر جمعہ فرض ہے اور ظہر تو اس کے لئے جمعہ کے قائم مقام کی طرح ہے اور جب تک کہ اصل پر قدرت ہو بدل کی اجازت نہیں ہوتی ہے، اور ہماری دلیل یہ ہے کہ اصل فرض تمام لوگوں کے حق میں ظہر ہے،

جمعہ نہیں ہے ہمارے ائمہ ثلثہ کا، یہی ظاہر مذہب ہے، البتہ اسے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کی نماز ادا کر کے ظہر کو اپنے ذمہ سے ساقط کر دے، یہ بات یعنی ظہر کو اصل ماننا اس لئے ہے کہ وہ تو تنہا خود ظہر کی نماز پڑھ سکتا ہے، لیکن جمعہ کو تو وہ ادا کرنے پر یا ذمہ سے ساقط کرنے پر تنہا قادر نہیں ہو سکتا ہے کیونکہ اس کو مکمل ادا کرنا بہت سی شرطوں پر موقوف ہے، جو اس سے تنہا ادا نہیں ہو سکتی ہیں، حالانکہ قدرت کے اعتبار ہی سے شرعاً تکلیف دی جاتی ہے۔

توضیح:۔ مسافر، غلام اور مریض کا جمعہ کی امامت کرنا

امامت کی صلاحیت، جمعہ کے دن گھر میں ظہر کی نماز، دلیل

ویجوز للمسافر والعبد والمریض ان یؤم فی الجمعۃ......الخ

مسافر وغیرہ معذوروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ جمعہ کی امامت کریں، ف یہی قول امام شافعیؒ اور دوسروں کا بھی ہے، وقال زفرؒ الخ اور امام زفرؒ نے کہا ہے کہ ان میں سے کسی کا امام ہونا صحیح نہیں ہے، لانہ لافرض الخ کیونکہ ان میں سے کسی پر بھی جمعہ فرض نہیں ہے لہٰذا ان میں سے ہر ایک شخص حکم کی اعتبار سے ایک عورت اور ایک نابالغ کے جیسا ہے، ف جبکہ عورت اور نابالغ کی امامت بالاتفاق جائز نہیں ہے.

ولنا ان ھذہ رخصۃ فاذا حضروایقع فرضا علی ما بینا......الخ

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ ان پر فرض نہ ہونا بطور رخصت ہے (نااھل ہونے کی وجہ سے نہیں ہے) ف یعنی اصل جمعہ تو ہر ایک پر فرض عین ہے اور مسافر وغیرہ کو جمعہ کی ادائیگی کے واسطے حاضر ہونے میں مشقت تھی اس لئے حاضر نہ ہونے کی اجازت مل گئی ہے، فاذا حضروا الخ اب جبکہ یہ لوگ حاضر ہو ہی گئے، ف اور مشقت برداشت کرلی، تو نماز ان سے فرض سے ادا ہو گی، اور نفل ادا نہ ہو گی جیسا کہ ہم نے بیان کر دیا ہے، ف یہاں تک کہ اگر کوئی عورت بھی حاضر ہو جائے تو اس کا بھی فرض ہی ادا ہو جائیگا، لیکن ان لوگوں کو نابالغ اور عورت پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے، اماالصبی الخ کیونکہ مثلاً نابالغ تو اس وجہ سے کہ اس میں امامت کی صلاحیت ہی نہیں ہے، اور عورت ف تو اگرچہ وہ عورتوں کی امامت کر سکتی ہے مگر مردوں کی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔

وتنعقدبھم الجمعۃ لا نھم صلحوا للامامۃ فیصلحون للاقتداء بطریق الاولی......الخ

مسئلہ: وینعقد الخ اور مسافر و غلام و مریض تو ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کسی موقع سے صرف یہی لوگ جمعہ کی نماز کے مسجد آجائیں اور صرف ان ہی لوگوں کو امام نماز پڑھا دے تو سب کی نماز صحیح ہو جائیگی کیونکہ امامت کی ان میں ذاتی طور پر پوری صلاحیت رہتی ہے لہٰذا یہ لوگ مقتدی بننے کے بھی بدرجہ اولی لائق ہیں.

ومن صلی الظھر فی منزلہ یوم الجمعۃ قبل صلوۃ الامام ولا عذر لہ کرہ لہ ذلک وجازت......الخ

اور جس شخص نے جمعہ کی دن اپنے مقام پر ظہر کی نماز پڑھ لی ہے، ف اگر یہ نماز امام جمعہ کے فارغ ہونے کے بعد ہوئی ہو تو بالاجماع ہو گی، کیونکہ جمعہ تو فقط ایک جگہ یا اس کے قریب میں ایک جگہ ہوتی ہے، اور اگر اس نے ظہر پڑھی ہو قبل صلوۃ الخ امام کی نماز سے پہلے، ف اور ابھی تک امام جمعہؒ فارغ نہ ہوا ہو، اور واقعۃً کچھ عذر بھی ہوا ہو تو بھی بالاتفاق جائز ہو گی، اور امام سے پہلے ہی ظہر کی نماز پڑھ لی ہو، ولاعذرلہ الخ حالانکہ اس پڑھنے والے کو کوئی عذر بھی نہ ہو تو اس کے لئے یہ نماز مکروہ ہو گی، ف یعنی حرام ہو گی، ف، لیکن اس کی نماز جائز ہو گی، ف یہ قول امام ابوحنیفہؒ او ظاہر الروایۃ کے مطابق صاحبینؒ کا ہے، اور ابو ثور کا اور امام شافعیؒ کا قول قدیم ہے، مع۔

وقال زفرؒ لایجزیہ لان عندہ الجمعۃ ھی الفریضۃ اصالۃ والظھر کالبدل عنھا......الخ

اور امام زفرؒ نے فرمایا ہے کہ جائز نہیں ہے، ف یہی قول غیر ظاہر الروایۃ میں امام محمدؒ اور مالکؒ اور شافعیؒ اور احمدؒ کا ہے، مع، اور امام محمد کے اقوال میں یہی قول اصح ہے، الینابیع، لان عندہ الخ کیونکہ زفرؒ کے نزدیک اصل فرض تو جمعہ ہے، والظھر الخ اور ظہر تو جمعہ کے بدل کے حکم میں ہے، ف اور پورا بدل بھی نہیں ہے کیونکہ دو رکعت کا بدل چار رکعت نہیں ہے، بلکہ اس روز جمعہ کا فرض ہونا اس طرح نہیں ہے کہ یا تو ظہر پڑھو یا اس کے بدلے ظہر پڑھو بلکہ جمعہ نہ ملے تو ظہر پڑھو، اسی لئے کہا ہے، ولا مصیر الخ اور یہ بات مسلم ہے کہ جب تک کہ اصل پر عمل نہ ہو اس کے بدل کے طرف متوجہ ہونا ممکن نہیں ہوتا ہے۔

ولنا انّ اصل الفرض ھوالظھر فی حق الکافۃ ھذا ھو الظاھر الا انہ مامور باسقاطہ باداء......الخ

اور ہماری دلیل تو یہ ہے کہ تمام لوگوں کے حق میں وقتی فرض تو ظہر ہے، ھذا ھو الخ یہی ظاہر مذہب ہے، ف یعنی ہمارے تینوں ائمہ کرام کا ظاہر مذہب یہی ہے، ع۔ الا انہ مامور الخ مگر اتنی بات ہے کہ جس کسی کو قدرت اور طاقت حاصل ہے اسے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ جمعہ کو ادا کر کے اس ظہر کو اپنے ذمہ سے ساقط کردے، ف لہٰذا ہر اس شخص کو فرض ادا کرنے کی قدرت حاصل ہے اس پر یہ لازم آتا ہے کہ ظہر کو اپنے ذمہ سے فارغ کردینے کے لئے جمعہ کی نماز پڑھ لے، م۔

وھذا لانہ متمکن من اداء الظھر بنفسہ دون الجمعۃ لتوقفھا علی شرائط لا تتم بہ......الخ

ظہر کی نماز کو ہم نے اس بناء پر اصل کہا ہے کہ ہر شخص اپنے طور پر ظہر کی نماز پڑھ کر عند اللہ اس سے سبکدوش ہوسکتا ہے، اس کی ادائیگی میں کسی کا کوئی محتاج نہیں رہتا ہے،، اس کے برخلاف جمعہ کی نماز ہے کہ کوئی شخص بھی تن تنہا جمعہ کی نماز پڑھ کر اس سے سبکدوش نہیں ہوسکتا ہے۔ لتوقفھا الخ کیونکہ جمعہ کی ادائیگی تو ایسی شرطوں کے پائے جانے پر موقوف ہے جنہیں کوئی شخص اپنے طور پر پوری نہیں کرسکتا ہے، ف لہٰذا جمعہ کی ادائیگی پر کوئی قدرت نہیں رکھتا ہے۔

وعلی التمکن یدور التکلیف......الخ

حالانکہ من عند اللہ انسان اسی وقت کسی کام کے لئے مکلف بنایا جاتا ہے جب کہ وہ اس کی ادائیگی پر قدرت بھی رکھتا ہو، ف یعنی ہر آدمی پر وہی طاعت واجب اور اسی قدر واجب ہوتی ہے جس کی ادائیگی پر اسے قدرت اور قابو بھی ہو، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جمعہ کی نماز ہر شخص پر کس طرح فرض ہوگی، جبکہ اس کی شرطوں کو پوری کرنا آدمی کے قابو سے باہر ہو بلکہ ایسے کئی آدمیوں کے اکٹھے ہونے کے بعد ہی نماز ادا ہوسکتی ہے جبکہ ان لوگوں میں بھی ادائیگی کی پوری شرطیں پائی جاری ہوں تب اس پر فرض ہوتا ہے کہ جمعہ کی نماز ادا کرلے، م۔

اس پر ابن الہمامؒ نے اعتراض کیا ہے کہ اگر یہ دلیل مکمل ہو تو اس سے لازم آئیگا کہ کسی شخص پر بھی جمعہ لازم نہ ہو، حالانکہ وہ تو ہر شخص پر لازم ہے، اس طرح یہ دلیل بہت ہی ضعیف ثابت ہوئی، میں مترجم کہتا ہوں کہ ہم نے مان لیا ہے کہ ہر شخص پر جمعہ کی نماز فرض ہے لیکن طاقت کے مطابق کیونکہ طاقت تو بالاجماع شرط ہے، اس بناء پر اگر وہ جگہ شہر جامع نہ ہو یا وہاں امام نہ ہو تو بظاہر وہاں کوئی فرض جمعہ یا ظہر واجب نہ ہونی چاہئے حالانکہ ظہر سے خالی نہیں ہے کیونکہ ظہر کی طاقت ہے، لہٰذا اصل فرض ظہر کی نماز ہوئی، اب اس کی ادائیگی کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اگر جمعہ پڑھنے کی پوری قدرت ہو تو جمعہ ہی پڑھ کر سبکدوش ہو، ورنہ ظہر پڑھ لے، نیز اگر کوئی شخص جمعہ کی ساری شرطیں اپنے اندر پاتا ہو اس کے باوجود عمداً وہ جمعہ میں شرکت نہ کرکے گھر پر ظہر ہی کی نماز پڑھ لیتا ہے تو یہی کہا جائیگا کہ بلاعذر ترک جمعہ کرنے کی وجہ سے وہ گنہگار تو ضرور ہوا اس کے باوجود اس کا وقتی فرض ادا ہوگیا۔

حاصل یہ نکلا کہ وجوب ذمہ اور وجوب اداء میں فرق ہے، اور بلاشبہ مذکورہ دلیل تام اور مکمل ہے، جیسا کہ ظاہر ہے، شیخ ابن الہمامؒ نے مزید یہ فرمایا ہے کہ اس موقع میں عمدہ دلیل یہ ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ اگر جمعہ کا وقت نکل جائے تو اس کی قضاء چار رکعت ظہر کی نیت سے پڑھنی چاہئے، اگر ظہر کا وقت اصلی وقت کا نہ ہوتا تو قضاء میں ظہر کی نیت متعین نہ ہوتی، میں مترجم کہتا

ہوں کہ جمعہ ہر شخص پر فرض ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ ایک ہی وقت میں جمعہ اور ظہر دونوں کی نمازیں فرض نہیں ہیں تو اس کا بھی یہی نتیجہ نکلا کہ اصل فرض ظہر ہی ہے، البتہ جس شخص میں جمعہ کی ادائیگی کی شرطیں مکمل طور پر پائی جائیں اس کے ذمہ جمعہ ہی فرض ہے، اس کے بعد اگر کوئی پوری شرطیں پانے اور جمعہ کی ادائیگی کی طاقت کے باوجود عمداً جمعہ نہ پڑھے اور ظہر ادا کرلے تو وہ شخص جمعہ نہ پڑھنے کی بناء پر گناہ گار تو ضرور ہوا پھر بھی اس کے ذمہ سے ظہر کی ادائیگی کا فرض پایا گیا اور وہ فارغ الذمہ ہوگیا، یہی دلیل اور مسئلہ برحق ہے، واللہ تعالے اعلم۔

اس دلیل سے ایک بات اور یہ معلوم ہوئی کہ ادائیگی کے اعتبار سے جمعہ کی تاکید بہت زیادہ ہے، لیکن فرضیت کے اعتبار سے ظہر اصل ہے، یہاں تک کہ اگر جمعہ کا وقت نکل جائے تو ظہر کی ہی نماز پڑھنی ہوگی، اس اختلاف ائمہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے فجر نماز کا ذمہ میں باقی رہنا یاد آجائے تو زفرؒ کے نزدیک وہ جمعہ کی نماز پوری کرلے جبکہ ترتیب کا وقت نہ ہو، اور دوسرے ائمہ کے نزدیک اس وقت وہ فجر اور ظہر پڑھ لے، ع۔

فان بدا له ان يحضرها فتوجه اليها والامام فيها بطل ظهره عندابى حنيفةؒ بالسعي وقالا لايبطل حتى يدخل مع الامام لان السعي دون الظهر فلا ينقضه بعدتمامه والجمعة فوقها فينقضها وصار كما اذا توجه بعد فراغ الامام وله ان السعي الى الجمعة من خصائص الجمعة فينزل منزلتها فى حق ارتفاض الظهر احتياطا بخلاف مابعد الفراغ منهالانه ليس بسعي اليها.

ترجمہ:- اگر گھر میں ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد اس کے دل میں یہ آیا کہ جمعہ کی نماز کے لئے چلا جائے اور پڑھ لے، اس خیال کے بعد وہ نماز کے لئے روانہ ہوگیا ایسے وقت میں کہ امام جمعہ کی نماز میں مشغول تھا تو اس شخص کی گھر پر پڑھی ہوئی نماز امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک روانگی کے ساتھ ہی باطل ہو جائیگی، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ نماز جمعہ میں امام کے ساتھ ہو جانے کے بعد اس کی نماز باطل ہوگی اس کے پہلے نہیں، کیونکہ سعی کا عمل ظہر کی نماز کے مقابلہ میں کمتر مرتبہ کا ہے، لہٰذا ایک بار نماز ظہر تمام ہو جانے کے بعد وہ سعی اسے باطل نہیں کرسکتی ہے، لیکن جمعہ کا مرتبہ ظہر سے زیادہ ہے اس لئے جمعہ کی نماز ظہر کی نماز کو ختم کردے گی، اور حکماً ایسا ہوگیا گویا امام کے فارغ ہونے کے بعد روانہ ہوا ہو، اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ جمعہ کے لئے سعی کرنا جمعہ کی خصوصیات میں سے ہے لہٰذا اس سعی کا حکم بھی جمعہ کے حکم کے مرتبہ میں احتیاطاً رکھا جائیگا، ظہر کو باطل کرنے کے معاملہ میں، بخلاف اس صورت کے جبکہ امام نماز سے فارغ ہو چکا ہو کیونکہ اس وقت جمعہ کے لئے سعی نہیں ہوگی۔

توضیح:- اگر ظہر کی نماز گھر میں پڑھنے کے بعد جمعہ بھی پڑھنے کا خیال آیا اور اس کے لئے گھر سے روانہ ہوگیا

فان بدا له ان يحضرها فتوجه اليها والامام فيها بطل ظهره عندابى حنيفةؒ بالسعي......الخ

اگر دل میں آگیا کہ جمعہ کی نماز میں شریک ہو جائے، ف حالانکہ وہ گھر میں ظہر کی نماز پڑھ چکا ہے، یعنی ظہر کی نماز پڑھنے کے ارادہ کیا کہ جمعہ کی نماز میں شرکت کرے اور اسی نیت سے وہ گھر سے نکلا، اور اگر یہ نکلنا کسی دوسری نیت سے ہو تو بالاتفاق اس کی پڑھی ہوئی نماز ظہر باطل نہ ہوگی، یا نہیں نکلا جب بھی باطل نہ ہوگی، اور اگر جمعہ کا ارادہ کیا اور جمعہ کی نماز کے لئے روانہ ہوگیا، ف اگر امام اس وقت جمعہ سے فارغ ہو چکا تو بھی بالاتفاق ظہر کی نماز باطل نہ ہوگی، اور اگر نماز کے لئے ایسے وقت میں نکلا کہ امام ابھی تک نماز جمعہ میں مشغول ہے، بطل ظهره الخ تو چلنے کے ساتھ ہی امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اس کی ظہر باطل ہو جائیگی، ف یعنی جب کہ گھر سے باہر ہو جائے، یہی قول صحیح ہے، ف اگر جمعہ پانے کی امید نہ ہو، یہی قول صحیح ہے، المحیط، اور اگر کسی وجہ سے اس دن امام نے جمعہ کی نماز نہ پڑھائی ہو تو قول صحیح یہ ہے کہ ظہر کی نماز باطل نہ ہوگی، ع۔

وقالا لایبطل حتی یدخل مع الامام لان السعی دون الظهر فلا ینقضه بعدتمامه......الخ

اور صاحبینؒ نے کہاہے کہ جب تک کہ وہ شخص امام کے ساتھ نماز میں شریک نہ ہو جائے اس کی پڑھی ہوئی ظہر کی نماز باطل نہ ہوگی، ف یہاں تک کہ تحریمہ بھی باندھ لے، ع، جیسے کہ کوئی مسجد میں ظہر کی پڑھ کر بیٹھا ہوا ہو تو بالاتفاق اس کے ظہر کی نماز اسی وقت باطل ہوگی کہ امام کے ساتھ نماز میں شامل ہو گیا ہو، البحر۔ پھر اگر قعدہ میں ملا تو امام احمدؒ سے روایت یہ ہے کہ وہ اب ظہر پڑھ لے، دلیل یہ کہ حدیث میں ہے کہ نے جمعہ کی ایک رکعت پائی اس نے جمعہ پایا، اس سے سمجھا گیا کہ جس نے ایک رکعت سے بھی کم پائی یعنی کوئی رکعت نہ پائی تو اس نے جمعہ نہیں پایا، یہ مسئلہ ادراک الفریضہ کے بیان میں گذر چکا ہے، م، **لان السعی الخ** صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ سعی جو جمعہ کی نماز کے لئے ہو وہ ظہر کے فرض نماز مقابلہ میں کمتر درجہ کا ہے، اس لئے جب ظہر کی نماز مکمل ادا ہو چکی ہے تو اسے صرف سعی الی الجمعہ نہیں توڑے گی، لیکن جمعہ خود ظہر کے مقابلہ میں اہم اور بڑھ کر ہے اس لئے اگر جمعہ کو پالے گا تو وہ جمعہ اس ظہر کو باطل کر دے گا اس کے قبل باطل نہیں کرے گا، ف اور اگر امام کے ساتھ نماز میں نہ ہو سکا تو صرف سعی ظہر کو باطل نہیں کرے گی۔

وصار کما اذا توجه بعد فراغ الامام......الخ

اور ایسا ہو گیا کہ جیسے امام کے فارغ ہونے کے بعد وہ نماز کے لئے نکلتا، ف۔ کہ بالاتفاق اس صورت میں سعی اس نماز کو باطل نہیں کرتی ہے کیونکہ یہ سعی بے کار وبے فائدہ ہے۔

وله ان السعی الی الجمعة من خصائص الجمعة فینزل منزلتها فی حق ارتفاض الظهر......الخ

اور امام اعظمؒ کی دلیل یہ ہے کہ **سعی الی الصلوٰۃ** تو جمعہ کی نماز کی خصوصیات میں سے ہے ف جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ۔ ذکر الٰہی کی طرف سعی کرو، لیکن دوسری نماز میں سعی سے ممانعت اور صرف مشی یعنی چلنے کی اجازت ہے، جیسا کہ ابوھریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب نماز قائم کر دی جائے تو تم اس کے لئے سعی کرتے ہوئے نہ آؤ یعنی دوڑتے ہوئے، بلکہ اس حال میں آؤ کہ مشی کر رہے ہو یا چلتے ہوئے آؤ، اور تم پر آہستگی و وقار ہو، اور وہاں نماز کا جتنا حصہ پاؤ اسے پڑھ لو، اور جتنا حصہ چھوٹ جائے اسے مکمل کر لو، ائمہ ستہ نے اس کی روایت کی ہے، ع، پس جبکہ سعی نماز جمعہ کی خصوصیات سے ٹھہری تو اگرچہ سعی کا مقصد حاصل نہ ہو تب بھی احتیاط کی جائے **فینزل منزلها الخ** تو ظہر کی نماز کو باطل کرنے کے لئے احتیاط کے طور پر سعی کو جمعہ کے قائم مقام کیا جائے، بخلاف اس صورت کے جب کہ امام کے فارغ ہونے کے بعد اس نے سعی کی ہو، تو یہ سعی جمعہ کے قائم مقام نہیں ہوگی، کیونکہ یہ سعی تو حقیقت میں جمعہ کی طرف نہیں ہوئی۔

ف میں مترجم کہتا ہوں کہ آیت پاک فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ میں سعی سے دوڑ کی چال مراد نہیں ہے بلکہ دوڑ کی چال سے جیسے کہ دوسری نماز میں ممانعت ہے ویسے ہی جمعہ میں بھی یہ چال ممنوع ہے چنانچہ خود عینیؒ نے بھی بعد میں قنیہ سے نقل کیا ہے کہ سعی یعنی تیز چال، دوڑتے ہوئے چلنا ہمارے اور دوسرے عام فقہاء کے نزدیک واجب نہیں ہے بلکہ اس کے مستحب ہونے میں بھی اختلاف ہے، اور قول اصح یہ ہے کہ وقار کی چال چلی جائے، انتہی، اس جگہ سعی کی خصوصیت پر جو دلیل ذکر کی گئی ہے وہ مکمل نہ ہوئی، عینیؒ نے اسرار امام ابو موسی سے نقل کیا ہے کہ نماز جمعہ چونکہ ایک خاص مقام پر ادا ہوتی ہے تو اس کو ادا کرنا ممکن نہیں ہے مگر اسی صورت میں کہ آدمی اس جگہ پر جائے اس بناء پر اس راہ سے گذرنا اور چلنا جمعہ کے ساتھ مخصوص ہوا، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی دلیل اولی ہے، واللہ اعلم، م۔

ابن الہمامؒ نے کہا ہے اس کی پوری تقریر یوں ہوگی کہ جس نے گھر پر ہی ظہر کی نماز پڑھ لی، اسے اس کے پورے کرنے کے بعد بھی یہی حکم ہے کہ اسے توڑ کر جمعہ کی نماز کے لئے چلا جائے، کیونکہ اس دن جمعہ کی ادائیگی فرض ہے اس لئے جیسے ہی اس نے اپنا قدم نکالا اس نے ظہر کو توڑنے میں قدم رکھا، اس کے بعد اگر اس نے جمعہ کی نماز نہیں پائی تو بھی اسے احتیاطاً یہی حکم ہوگا کہ

اس کے ظہر کی نماز ٹوٹ گئی، انتہی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ تقریر اچھی ہے، لیکن اس کے اس جملہ میں تامل ہے کہ ظہر ادا کر لینے کے بعد بھی اسے اس بات کا حکم ہے کہ ظہر کی نماز باطل کر دے، بلکہ اس طرح کہنا اسے زیادہ بہتر ہوگا، کہ اس طرح کہا جائے کہ جب تک کہ امام فارغ نہیں ہوا اس پر یہی فرض ہے کہ امام کے ساتھ ہی نماز ادا کرے یعنی چل کر جائے، اب جب کہ اس فرض کے لئے چلا تو اس نے ظہر کی جو نماز پڑھی تھی وہ نہ پڑھنے کے برابر کالعدم ہو گئی، کیونکہ اس ایک وقت میں دو فرض نمازیں ادا جمع نہیں ہو سکتی ہیں، اور وہ دوبارہ درست نہ ہو جائیگی، اگرچہ جمعہ کی نماز نہ پاسکا ہو، فافہم، واللہ تعالی اعلم۔ م۔

ویکرہ ان یصلی المعذورون الظھر بجماعۃ یوم الجمعۃ فی المصر وکذا اھل السجن لمافیہ من الاخلال بالجمعۃ اذھی جامعۃ للجماعات والمعذور قد یقتدی بہ غیرہ بخلاف اھل السواد لانہ لا جمعۃ علیھم ولو صلی قوم اجزاھم لاستجماع شرائطہ۔

ترجمہ:- اور مکروہ ہے مصر میں جمعہ کے دن کہ ظہر کی نماز کو مختلف معذورین مل کر جماعت کے ساتھ پڑھ لیں اسی طرح سے قیدیوں کے لئے بھی، کیونکہ ایسا کرنے سے جمعہ میں خلل ڈالنا لازم آتا ہے کیونکہ جمعہ کی نماز تمام جماعتوں کو جمع کرنے والی ہوتی ہے، اور معذور کی جماعت میں کبھی غیر معذور بھی شریک ہو سکتا ہے بخلاف دیہات والوں کے کیونکہ ان کے لئے تو جمعہ کی نماز ہی نہیں ہے، اس کے باوجود اگر کچھ لوگ مصر میں اس طرح جماعت کے ساتھ نماز پڑھ لیں تو ان کی نماز بھی جائز ہوگی شرطوں کے اکٹھے ہو جانے کی بناء پر۔

توضیح:- معذور اور قیدیوں کا جمعہ کا دن ظہر کو جماعت سے پڑھنا
ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ کی نماز ہونا

ویکرہ ان یصلی المعذورون الظھر بجماعۃ یوم الجمعۃ فی المصر......الخ

مکروہ ہے کہ معذورین پڑھیں، ف اور جن کو جمعہ نماز نہیں ملی ہے، ف، الظھر الخ نماز ظہر کو شہر کے اندر، وکذا اھل السجن اسی طرح قید خانہ والے بھی، ف مکروہ ہے کہ جمعہ کی دن ظہر کی نماز جماعت سے پڑھیں۔

لمافیہ من الاخلال بالجمعۃ اذھی جامعۃ للجماعات......الخ

کیونکہ ان کا اس طرح جماعت کے ساتھ پڑھنا جمعہ کی جماعت میں خلل پیدا کرنا ہوا کیونکہ جمعہ تو تمام جماعتوں کا جامع ہے، ف اس بناء پر کہ جمعہ صرف ایک مقام کے علاوہ جائز نہیں ہے، الفتح، اگر یہ کہا جائے کہ معذور پر تو جمعہ لازم نہیں ہے تو پھر خلل کس طرح ہوا، تو اس کا جواب اس طرح دیا کہ:

والمعذور قد یقتدی بہ غیرہ بخلاف اھل السواد لانہ لا جمعۃ علیھم......الخ

معذور کے ساتھ کبھی غیر معذور بھی اقتداء کر لیتا ہے۔ ف

اسی طرح غیر معذور کے اقتداء کرنے سے جمعہ میں خلل ہوگا، بخلاف الخ بخلاف گاؤں والوں کہ ان پر تو جمعہ کی نماز لازم نہیں ہے، ف اور معذور پر تو جمعہ لازم تھا مگر عذر کی وجہ سے وہ ساقط ہو گیا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ ممانعت تو اس روایت کے مطابق ہے کہ ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ جائز نہیں ہے، لیکن امام سرخسیؒ وغیرہ کے نزدیک مختار روایت یہ ہے کہ کئی جگہ جائز ہے، ایسی صورت میں مکروہ ہونے کی دلیل یہ ہوگی کہ ظاہری طور پر ایسا معلوم ہوگا کہ اس طرح جمعہ کا معارضہ اور مقابلہ معلوم ہوتا ہے، الفتح، امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ایک شہر میں کئی جگہ جمعہ ادا کرنا جائز اور یہی صحیح ہے، اور سرخسیؒ نے کہا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ کے مذہب میں ہی قول صحیح ہے، اور ہم اسی کو قبول کرتے ہیں، البحر، اور اسی پر فتوی رہے گا، الصدر۔

پھر ایک مسجد سے دوسری مسجد تک کچھ فاصلہ رکھنے کا اعتبار ہے یا نہیں، تو میں نے اس کا نہیں دیکھا ہے، لیکن فتح القدیر عینی

اور بحر الرائق وغیرہ میں عام الفاظ استعمال کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں کوئی قید نہیں ہے، اور حرج کو ختم کرنے کے لئے علامت تلاش کرلی گئی ہے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں مقام جمعہ صرف ایک ہی تھا، مگر اہل قبا حوالی مدینہ میں بھی پڑھتے تھے، اور صحیح حدیث میں ہے کہ جمعہ ہر اس شخص پر ہے جو باہر سے لوٹ کر رات اپنے گھر میں گذارے، اور بحر الرائق میں آبادی سے اتنی دور تک والوں پر جمعہ لازم ٹھہرایا ہے، لیکن یہ بات مخفی نہیں ہے کہ اگر کئی جگہ جمعہ ہو تو فناء والے اپنے یہاں پڑھ لیں اور شہر کے اندر ہر محلہ والا اپنی اپنی مسجد میں پڑھ لیا کرے، اور اس ترجیح کی کوئی ضرورت نہیں رہی، اچھی طرح سمجھ لیں، واللہ تعالے اعلم، خلاصہ یہ ہوا کہ شہر میں جمعہ کے دن صرف جمعہ کی جماعت ہونی چاہئے اس کے علاوہ معذورین وغیرھم کی بھی جماعت مکروہ ہے خواہ جمعہ کی جماعت سے پہلے ہو یا بعد میں ہو، اگرچہ اس دن کسی وجہ سے امام نے جمعہ کی نماز نہ پڑھائی ہو، قاضی خان۔

ولو صلى قوم اجزاهم لاستجماع شرائطه......الخ

ممانعت کے باوجود اگر کسی قوم نے اس دن جماعت سے ظہر کی نماز پڑھ لی تو ان لوگوں کی یہ نماز صحیح مانی جائیگی، کیونکہ اس میں جماعت کی شرطیں پائی گئیں، ف اس لحاظ سے ان کی جماعت ہوگئی البتہ دوسرے عوارض کی وجہ سے جو جمعہ کے حق سے متعلق تھی اس کی خلاف ورزی کرنے کی وجہ سے مکروہ ہوگئی۔ م۔

ومن ادرك الامام يوم الجمعة صلى معه ما ادركه وبنى عليها الجمعة لقوله عليه السلام ما ادركتم فصلوا وما فاتكم فاقضوا وان كان ادركه في التشهد اوفي سجود السهو بنى عليها الجمعة عندهما وقال محمدؒ ان ادرك معه اكثر الركعة الثانية بنى عليها الجمعة وان ادرك اقلها بنى عليها الظهر لانه جمعة من وجه ظهر من وجه لفوات بعض الشرائط في حقه فيصلي اربعا اعتبارا للظهر ويقعد لا محالة على رأس الركعتين اعتبارا للجمعة ويقرأ في الاخريين لا حتمال النفلية ولهما انه مدرك للجمعة في هذه الحالة حتى يشترط نية الجمعة وهي ركعتان ولا وجه لماذكر لانهما مختلفان فلايبني احدهما على تحريمة الآخر.

ترجمہ:- اور جس نے امام کو جمعہ کے دن (نماز جمعہ پڑھتے ہوئے) پالیا، اسی وقت اس کا شریک ہو جائے، اسی پڑھی ہوئی نماز پر جمعہ کی باقی نماز کی بنیاد رکھ کر نماز پوری کرے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم نماز کا جتنا حصہ پاؤ اسے پڑھ لو اور جو چھوٹ گئی اسے ادا کرلو، اور اگر امام کو تشہد پڑھتے ہوئے یا سجدہ سہو ادا کرتے ہوئے پایا ہو تو شیخینؒ کے نزدیک جمعہ کی بقیہ نماز کو اسی پر بناء کرتے ہوئے پوری کرے لیکن امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ اگر دوسری رکعت کا اکثر حصہ پایا ہو تو اس پر جمعہ کی بناء کر کے پوری کرلے اور اگر اس سے کم پایا ہو تو اس پر ظہر کی بناء کر کے پوری کرے، کیونکہ وہ نماز ایک اعتبار سے جمعہ ہے، تو دوسرے اعتبار سے ظہر بھی ہے، کیونکہ اس کے حق میں جمعہ کی کچھ شرطیں چھوٹی ہوئی ہیں، لہذا ظہر کا اعتبار کرتے ہوئے چار رکعتیں پڑھ لے، اور دو رکعتوں پر لامحالہ بیٹھے جمعہ کا اعتبار کرتے ہوئے اور آخری دو رکعتوں میں قراءت بھی کرلے نفل نماز ہونے کے احتمال میں؛ اور شیخینؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس نے اس حالت میں جمعہ کی ہی نماز پائی اسی لئے تو اس میں جمعہ کی نیت کرنے کی شرط کی جاتی ہے کہ یہ دو رکعتیں ہیں، اور ابھی جو باتیں بیان کی گئیں ان کی کوئی وجہ نہیں ہے کیونکہ جمعہ اور ظہر دونوں حقیقتاً اور حکماً دو نمازیں ہیں اس بناء پر ایک کو دوسرے کے تحریمہ پر بناء نہیں کی جا سکتی ہے۔

توضیح:- جمعہ کی نماز میں امام کو پایا، جمعہ کی رکعتوں کی تعداد

ومن ادرك الامام يوم الجمعة صلى معه ما ادركه وبنى عليها الجمعة......الخ

اور جس شخص نے جمعہ کی نماز میں امام کو پالیا، تو جتنی نماز اس کے ساتھ پائے اتنی پڑھ لے، ف پھر ایک رکعت یا زیادہ پائی تو

اسی پر جمعہ کی بناء کرے، ف یعنی اپنی نماز جمعہ پوری کر لے، اور یہ بالاتفاق ہے، لقوله عليه السلام الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم جس قدر پاؤ اس کو توپڑھ لو اور جو فوت ہو گئی ہو اسے قضاء کرلو، ف اس کی روایت احمدؒ اور ابن حبانؒ نے حضرت ابو ھریرہؓ سے کی ہے، اور صحاح ستہ میں "فاتمّوا" یعنی جو فوت ہو گئی ہو اسے تمام کرلو، اور نسائی کی حدیث میں جو ابو ھریرہؓ سے مروی ہے کہ جس نے جمعہ سے ایک رکعت پائی اس نے جمعہ پایا، اس طرح "قضاء کرلو" دونوں کے ایک ہی معنی ہوئے۔

وان كان ادركه في التشهّد اوفي سجود السهو بنى عليها الجمعة عندهما......الخ

اور اگر امام کو تشہد یا سجدہ سہو میں پایا، ف تو اختلاف ہے، بنى عليها الخ یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک جمعہ تمام کرے، ف اور اس نے جماعت کی فضیلت پائی مگر پورا جمعہ امام کے ساتھ نہیں پایا، وقال محمدؒ الخ اور امام محمدؒ نے فرمایا ہے، ف اور امام مالکؒ و شافعیؒ نے کہا ہے کہ، ان ادرك الخ اگر امام کے ساتھ اس نے دوسری رکعت کا زیادہ حصہ پایا تو اس پر جمعہ کو مکمل کرلے، ف پس اگر رکوع پایا ہو تو اکثر رکعت پائی، اور اگر اس نے امام کے ساتھ دوسری رکعت کا کم حصہ پایا تو اس پر ظہر کی بناء کرے، ف یعنی رکوع کے بعد امام کے ساتھ شریک ہوا تو اس نے وہ رکعت نہیں پائی، لہٰذا امام کے سلام پھیرنے کے بعد ظہر کی چار رکعتیں پڑھ لے، اور جماعت کا ثواب مل گیا، کیونکہ اس کی نماز ایک وجہ سے جمعہ ہے، ف یہاں تک کہ جمعہ کی نیت کرنی ضروری ہے، ع، وظهر من وجه الخ اور ایک وجہ سے ظہر ہے، اس کے حق میں جمعہ کی بعض شرطوں کے فوت ہو جانے کی وجہ سے ف اور وہ شرط جماعت کی ہے کیونکہ جماعت ختم ہو چکی ہے، کیونکہ امام یقیناً فارغ ہو چکا ہے، توجب ہم نے اس کی نماز میں دو وجہیں پائیں فيصلي اربعا الخ تو وہ ظہر کا خیال کر کے چار رکعتیں پڑھے گا۔

ويقعد لا محالة على رأس الركعتين اعتبارا للجمعة ويقرأفي الاخريين لا حتمال النفلية......الخ

اور جمعہ کے لحاظ سے دو رکعتوں پر لازمی طور پر قعدہ کرلے، ف چونکہ جمعہ میں دو رکعتوں پر قعدہ فرض ہے، اور ظہر کے اعتبار سے آخری دو رکعتیں بھی فرض ہیں، لیکن جمعہ کی لحاظ سے آخری دونوں رکعتیں نفل ہیں، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ويقرأفي الخ اور نفل کا احتمال ہو جانے کی وجہ سے آخری دونوں رکعتوں میں قراءت کرے، ف کیونکہ نفل کی ہر رکعت میں قراءت ضروری ہوتی ہے، یہ تفصیل امام محمدؒ کے قول کے مطابق ہے۔

ولهما انه مدرك للجمعة في هذه الحالة حتى يشترط نية الجمعة......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ و ابو یوسفؒ کی دلیل یہ ہے کہ اس حال میں وہ جمعہ پانے والا ہے، یہاں تک کہ جمعہ کی نیت کرنا شرط ہے، ف چنانچہ اگر جمعہ کی نیت نہیں کی تو اس کی اقتداء صحیح نہیں ہوگی، پس اس نے جمعہ پالیا، وهي ركعتان الخ اور جمعہ کی تو دو ہی رکعتیں ہیں ولا وجه الخ اور امام محمدؒ نے ذکر کیا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں ہے، ف کہ احتیاط کرتے ہوئے جمعہ اور ظہر دونوں پر عمل کرے، لانهما الخ کیونکہ یہ دونوں نمازیں مختلف ہیں، لہٰذا ایک کو دوسرے کے تحریمہ پر مبنی نہیں کیا جائے، ف یہاں تک کہ اگر جمعہ کی نماز پڑھتے ہوئے وقت نکل جائے تو اس پر ظہر کی نماز نہیں کی جاسکتی ہے، بلکہ از سر نو ظہر کی چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی، السرخسی۔

واذا خرج الامام يوم الجمعة ترك الناس الصلوة والكلام حتى يفرغ من خطبته قالؒ وهذا عند ابى حنيفةؒ وقالالاباس بالكلام اذا خرج الامام قبل ان يخطب واذانزل قبل ان يكبر لان الكراهة للاخلال بفرض الاستماع ولا استماع هنابخلاف الصلوة لانهاقد تمتد ولابى حنيفةؒ قوله عليه السلام اذا خرج الامام فلاصلوة ولا كلام من غير فصل ولان الكلام قد يمتد طبعا فاشبه الصلوة.

ترجمہ :- اور جب امام جمعہ کے دن اپنی جگہ سے نکل آئے تو لوگ اپنی نماز اور کلام چھوڑ دیں یہاں تک کہ امام اپنے خطبہ سے فارغ ہو جائے، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام خطبہ دینے سے پہلے جب نکلے تو اس وقت کلام میں کوئی حرج نہیں ہے، اور جب

تکبیر کہنے سے پہلے اترے، کیونکہ خطبہ سننے کے لئے کان لگانا جو فرض تھا اس میں خلل پڑھنے کی وجہ سے کراہت تھی، اور اس وقت تو کوئی بات سننے کی کان لگانے کی نہیں ہے، بخلاف نماز کے کہ کبھی یہ دراز ہو جاتی ہے، اور ابو حنیفہؒ کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان ہے، کہ جب نکل آئے تو نہ نماز ہو گی نہ کلام اس میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی گئی ہے، اور اس لئے بھی کہ کبھی طبعی طور پر کلام طویل ہو جاتا ہے لہٰذا نماز کے مشابہ ہو گیا۔

توضیح:-جب امام منبر کی طرف جانے لگے تو صلوۃ و کلام امام ابو حنیفہؒ کی دلیل، چند ضروری مسائل

واذا خرج الامام یوم الجمعة ترك الناس الصلوة والكلام حتى يفرغ من خطبته......الخ

اور جب امام جمعہ کے دن نکلے، ف حجرہ سے یا منبر کی طرف جائے، تو لوگ نماز چھوڑ دیں ف یعنی نفل اور سنت نمازوں کو، بخلاف قضاء کے، اور کلام کو بھی، ف اگرچہ نیک کام اور امر بالمعروف ہو، یہاں تک کہ امام خطبہ دے کر فارغ ہو جائے، ف، ابن بطالؒ نے شرح الصحیح میں لکھا ہے کہ جمہور علماء کا یہی قول ہے، قال وهذا الخ مصنف ھدایہؒ فرمایا ہے کہ یہ قول امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے، ف یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے۔

وقالا لاباس بالكلام اذا خرج الامام قبل ان يخطب واذا نزل قبل ان يكبر ......الخ

اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ جب امام خطبہ شروع کرنے سے پہلے باہر آئے تو کلام کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، واذا نزل الخ اور جب نماز کی تکبیر کہنے سے پہلے امام منبر سے اترے، ف امام شافعی اور امام احمدؒ کا یہی قول ہے، ع، لان الكراهة الخ کیونکہ فرض خطبہ سننے میں خلل پڑھنے کی وجہ سے کراہت کا حکم دیا گیا ہے۔

ولا استماع هنا بخلاف الصلوة لانها قد تمتد......الخ

جب کہ ابھی کچھ سننا نہیں ہے، ف، یہاں تک کہ جب خطبہ شروع کرے گا تب مکروہ ہو گی، پھر اگر یہ اشکال پیش کیا جائے کہ اس وقت نفل نماز بھی مکروہ نہیں ہونی چاہئے، کیونکہ اس سے سننے میں بھی خلل نہیں ہوتا ہے، حالانکہ وہ تو بالاتفاق مکروہ ہے، جواب یہ ہے کہ کلام اور صلوہ میں یہ فرق ہے کہ کلام میں متکلم کو اختیار ہے جہاں پر جس وقت چھوڑنا چاہے چھوڑ سکتا ہے، بخلاف الصلوة الخ بخلاف نماز کے کہ یہ تو کبھی بہت دراز بھی ہو جاتی ہے۔

ولابی حنيفةؒ قوله عليه السلام اذا خرج الامام فلاصلوة ولا كلام من غير فصل......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ امام جب نکل آئے تو نہ نماز ہے اور نہ گفتگو ہے، ف اس سے ممانعت صاف ظاہر ہوتی ہے من غير فصل الخ کسی تفصیل کے بغیر، ف کہ خطبہ شروع کرنے کے بعد ہو یا کب ہو، لہٰذا ہر حال میں نماز و کلام امام کے حجرہ سے نکل آنے کے بعد مکروہ ہے، اگر یہ سوال ہو کہ یہ حدیث کس جگہ کی ہے، تو تفصیلی جواب یہ ہے کہ خواہر زادہؒ نے کہا ہے کہ اسے رسول اللہ ﷺ کا قول قرار دینا سخت غلطی ہے، بلکہ یہ کلام زہریؒ کا ہے، جیسا کہ مالک نے زہریؒ سے روایت کیا ہے، اور طحاویؒ نے ابوالدرداءؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ سورہ پڑھا، میں نے ابی بن کعبؓ سے پوچھا کہ کب نازل ہوئی، تو مجھے اشارہ سے چپ کیا پھر فراغت کے بعد فرمایا آج تمہاری نماز سے نہیں مگر تم تو لغو کیا، میں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ ابی بن کعبؓ نے سچ کہا ہے، احمدؒ وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے۔ مع، لیکن یہ تو کوئی خاص دلیل نہیں ہے، کیونکہ خطبہ کے وقت تو بالاتفاق سب منع ہے، م، ابن ابی شیبہؒ نے حضرت علی و ابن عباس اور ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ یہ لوگ امام کے نکلنے کے بعد نماز اور کلام کو مکروہ جانتے تھے، ہمارے نزدیک ایسی صورت میں صحابی کی تقلید واجب ہے، الفتح۔

ولان الکلام قد یمتد طبعا فاشبه الصلوة......الخ

اور اس وجہ سے کلام مکروہ ہے کہ کلام بھی خواہش نفس کے مطابق کبھی طویل ہو جاتا ہے اس لئے کلام بھی نماز کے مشابہ ہو گیا، ف اس طرح نماز کی طرح مکروہ ہوا، زہریؒ نے فرمایا ہے کہ جب امام خطبہ میں ہو اس وقت کوئی آئے تو فوراً بیٹھ جائے اور نماز نہ پڑھے، ابن ابی شیبہؒ نے اس کی روایت کی ہے، حضرت ابو ھریرہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی ہے کہ جب امام خطبہ میں ہو اس وقت اگر ساتھی سے کہا کہ خاموش ہو جاؤ تو اس نے لغو کیا، جیسا کہ ائمہ ستہ نے روایت کی ہے، اس میں اس بات کا شارہ ہے کہ جب امر بالمعروف جو خود واجب کام ہے وہ بھی اس وقت منع ہے تو سنت اور تحیۃ المسجد پڑھنا بدرجہ اولی منع ہے، اس حدیث صحیح سے کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے خطبہ کے دوران ایک شخص آیا تو فرمایا کہ اے فلاں کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں، اس پر آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعتیں پڑھ لو، اور ان میں جلدی کرو، یعنی قرءات وغیرہ میں طول نہ کرو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت آپ نے اپنا خطبہ روک لیا تھا، جیسا کہ امام احمدؒ کی حدیث میں ہے جو کہ معتمر عن ابیہ میں ہے کہ پھر آپ منتظر رہے، یہاں تک کہ وہ نماز سے فارغ ہو گئے، دار قطنیؒ نے کہا ہے کہ یہ مرسل صحیح اور درست ہے، ہمارے نزدیک مرسل حدیث بھی حجت ہے، اسی لئے صحیح حدیث میں جو عام حکم آیا ہے کہ جب تم میں سے کوئی ایسے وقت آئے کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو، تو دو رکعت پڑھیں اور ان میں جلدی کرے، معنی یہ ہوا امام کے واسطے یہ ثابت شدہ سنت ہے کہ وہ اس وقت خاموش رہے، مختصراً لفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر امام کے بارے میں یہی حکم مان لیا جائے تو امام آخری وقت تک خطبہ دینے سے معذور رہے گا کیونکہ نمازیوں کی آمد کا سلسلہ تو آخر وقت تک قائم رہتا ہے جس سے زبردست حرج لازم آئیگا، لہٰذا اس کا سب سے بہتر جواب یہ ہو گا کہ اس وقت تک خطبہ کی حالت میں نماز سے ممانعت نہ تھی بلکہ اجازت تھی جو بعد میں نہیں رہی اور ممانعت ہو گئی، اور واضح ہو کہ شارحین حدیث کی رائے یہ ہے کہ یہ دو رکعتیں تحیۃ المسجد کی تھیں، پھر اس وقت یہ سوال کرنا کہ اے فلاں کیا تم نے نماز پڑھ لی ہے یہ تو جان کر ان جان بننے کی صورت ہے کیونکہ تحیۃ المسجد تو اسی مسجد کے علاوہ کسی اور جگہ پڑھنے کا تو احتمال بھی ہو سکتا ہے، اور اسی بناء پر یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ دو رکعتیں سنت مراد ہو جو مجبوری کے موقع پر بجائے چار کے دو رکعتیں ہی رہ گئی ہوں، جیسا کہ عینیؒ کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے جو اقوال جمع کرتے وقت فرمایا تھا، بہر صورت جواب میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خطبہ کو روک کر ان صحابی کو سنت سے پڑھنے کی تاکید ان کی کسی وجہ سے خصوصیت تھی جیسا کہ بعض علماء کا قول ہے یا یہ کہا جائے کہ یہ حکم منسوخ ہے، اب میرے نزدیک ہر شخص کے لئے امام کو خاموش ہو جانے کی کہنے کی کوئی صورت نہیں ہے، اس دلیل سے کہ ایسا کرنے میں سخت حرج لازم آئے گا، واللہ تعالے اعلم، م۔

چند ضروری مسائل

خطبہ کی حالت میں کلام کرنا مکروہ ہے اگرچہ امر بالمعروف یا نہی عن المنکر یا تسبیح ہو، ف، قول اصح یہ ہے کہ تسبیح اور اس جیسی چیزیں مکروہ نہیں ہیں، ع، میرے نزدیک قول اول اصح ہے کیونکہ سننا اور خاموش رہنا دونوں واجب ہیں، محیط السرخسی میں کہا ہے کہ یہی اصح ہے اگرچہ خطبہ نہ سنا جاتا ہو، ھ، یہی بات مختار اور زیادہ احتیاط والی ہے کہ خاموش رہے ع، ش، ھ۔ کھانا یا پینا جو نماز میں حرام ہے وہ خطبہ بھی حرام ہے، الخلاصہ، رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجنا مکروہ ہے، شرح الطحاوی، بہتر صورت یہ ہے کہ دل دل میں پڑھ لیا کرے، جیسے کہ چھینک آنے پر دل میں حمد پڑھنا چاہئے فم۔ اگر کسی شخص سے کوئی غلط کام دیکھ کر ہاتھ کے اشارہ سے منع کیا یا کسی بات کے جواب میں سر ہلا دیا تو قول صحیح یہ ہے کہ کوئی حرج نہیں ہے، المحیط، یہ بات مخفی نہیں رہنی چاہئے کہ اگر جماعت

ں کسی نے کچھ پوچھا تو اس نے معصیت کا کام کیا، اور اگر سر ہلا کر اس کا جواب دیا تو اس کے فعل لغو میں اس کی مدد کی، لہٰذا بہتر طریقہ وہی ہے جو حضرت ابی بن کعبؓ سے گذرا یعنی کچھ بھی جواب نہ دے، مگر جبکہ معصیت کا کلام نہ ہو تو سر ہلانے میں کوئی حرج نہیں۔م۔

لکھنا، کتاب فقہ پڑھنا، چھینک یا سلام کا جواب دینا مکروہ ہے، ف، ھ، اس صورت میں کہ سن سکتا ہو، اور اگر نہیں سنتا ہے تو بھی خاموشی پسندیدہ کام ہے، م، امام کے قریب ہونے کے لئے لوگوں کی گردنیں اس وقت نہ پھاندے جبکہ خطبہ پڑھا جا رہا ہو، اور اس سے پہلے اگر اگلی صف میں جگہ چھوڑ کر پیچھے بیٹھے ہوں تو کوئی حرج نہیں ہے، اور اگر عین خطبہ کے وقت آیا ہو تو مسجد میں جہاں ہو وہی بیٹھ جائے کیونکہ خطبہ کی حالت میں چلنا اور آگے پڑھنا بھی ایک عمل ہے، قاضی خان، بھیک مانگنے کے واسطے گردنیں پھاند نیں بالاجماع ہر حالت میں مکروہ ہے، البحر، اور اگر مانگنے والا فقیر نہ گردن پھاندے نہ ہٹ کرے نہ نمازیوں کے سامنے گذرے اور ایسی چیز کا سوال کرے جس سے چارہ نہ ہو تو سوال کرنا اور دینا دونوں کام حلال ہیں، اور اس کی یہ صفت نہ ہو تو دینا جائز نہیں ہے، الوجیز للکر دری، خطبہ کی حالت میں دوزانو یا چارزانو بیٹھے، لیکن التحیات کی حالت کی بیٹھنا مستحب ہے، المضمرات، المعراج، کمان یا عصا پر خطیب کا ٹیک لگانا مکروہ ہے، الخلاصہ، المحیط، البتہ جو شہر تلوار کے زور سے فتح ہوا ہو وہاں تلوار لٹکانی مستحب ہے، شرح الطحاوی۔

واذا اذن المؤذنون الاذان الاول ترك الناس البيع والشراء وتوجهوالى الجمعة لقوله تعالى فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ واذا صعدالامام المنبر جلس واذن المؤذنون بين يدى المنبر بذلك جرى التوارث ولم يكن على عهد رسول الله ﷺ الا هذاالاذان ولهذا قيل هو المعتبر فى وجوب السعى وحرمة البيع.

ترجمہ:- اور جب مؤذن حضرات اذان اول دیں تو لوگ خرید و فروخت کو چھوڑ کر جمعہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے کہ اللہ ذکر کی طرف سعی کرو، اور کاروبار کو چھوڑ دو، اور جب امام منبر پر چڑھ جائے تو بیٹھ جائے تو مؤذن منبر کے سامنے اذان دے، شروع سے یہی عمل چلا آرہا ہے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں اس اذان کا طریقہ نہ تھا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ وہی اذان معتبر ہے سعی کے واجب ہونے اور کاروبار کے حرام ہونے میں۔

توضیح:- جمعہ کے دن کس اذان پر خرید و فروخت منع ہے

کشتی پر جمعہ کیلئے مسجد جاتے ہوئے خرید و فروخت، منبر پر خطیب کے جاتے وقت اذان

واذا اذن المؤذنون الاذان الاول ترك الناس البيع والشراء وتوجهوالى الجمعة......الخ

اور جب مؤذنوں نے پہلی اذان دی، تو لوگ خرید و فروخت کو چھوڑ دیں، وتوجّھوا الخ اور لوگ جمعہ کی طرف متوجہ ہو جائیں، لقولہ تعالیٰ الخ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وجہ سے یعنی تم لوگ ذکر الٰہی کی طرف جاؤ اور خرید و فروخت چھوڑ دو، ف یہاں اس حکم سے فوراً مراد ہے یعنی فوراً چھوڑ دو، ایک بات توجہ کرنے کی یہ ہے کہ مصنفؒ نے صیغہ جمع کے ساتھ موذنوں کہا ہے۔ کیوں؟ تو عینیؒ نے ذکر کیا ہے کہ کہنے کی عادت کے مطابق ایسا کہدیا گیا ہے، کیونکہ شہر کے کناروں میں سنانے کا یہی دستور تھا، کہ ان کناروں میں مؤذنین رہتے تھے۔ع۔ اور صاحب النہایہؒ مصنف کے قول سے کہ بذلک جری التوارث کہ ایسا ہی طریقہ چلا آیا ہے، یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ بدعت حسنہ ہے، اسی طرح سے بڑی مسجد میں خطیب کے سامنے بھی بدعت حسنہ ہے، اور شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے کہا کہ پنج وقتی فرض میں بھی خبر عام ہونا بھی ضروری کام ہے اس لئے یہ شہرت صرف جمعہ کی خصوصیت نہ رہی، الشامی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر شہر میں ایک ہی جگہ کے جمعہ کو جائز کہا جائے جیسا کہ ھدایہ کی عبارت سے ظاہر ہے، تو جمعہ کے

لئے شہر کے کناروں میں کئی اذانوں کی ضرورت ظاہر ہے، تاکہ اهل فناء یعنی شہر کے آس پاس کے لوگوں کو بھی اطلاع ہو جائے، بخلاف پنجوقتی نمازوں کے کہ ان کے لئے جامع مسجد میں آنا تو ضروری نہیں ہے، اور صحیح روایتوں کے مطابق ہر مسجد میں جمعہ جائز ہو تو کئی موذنوں کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ دیہات والے تو اپنی مسجد میں پڑھ لینگے، یا شہر کے کناروں کی آوازیں ان دیہاتی علاقوں میں بھی پہنچ جائینگی، اور جب جمعہ میں ضرورت نہیں رہی تو ہر فرض کے لئے بدرجہ اولی نہیں رہی، سمجھ لیں۔ م۔ دوسری بات قابل توجہ یہ ہے کہ اذان کے وقت کاروبار کی ممانعت ہے، اور ممانعت اور حرمت کے باوجود اگر کسی نے اس وقت کاروبار کر لیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ اور دوسروں کے نزدیک بھی یہ کاروبار صحیح مان لیا جائے گا، لیکن امام مالکؒ اور احمدؒ اور ظاہریہ کے نزدیک وہ باطل ہوگا، اس میں حرمت کے وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ اس میں مشغول ہونے کی وجہ سے سعی کا عمل رُک جائیگا، اسی لئے اگر کوئی شخص کشتی میں جامع مسجد کی طرف جاتے ہوئے راستہ میں خرید و فروخت کی گفتگو کرتا جائے تو یہ گفتگو حرام نہ ہوگی، جیسا کہ تصریح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے وقت میں دو اذانیں ہوتی تھیں، ایک خطبہ کے وقت رسول اللہ ﷺ (خطیب) کے سامنے، دوسری اذان اقامت نماز شروع کرتے وقت کہ اسے بھی شریعت میں اذان ہی کہا جانے لگا ہے، پھر جب حضرت عثمانؓ کی خلافت میں نمازیوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو آپ نے ایک اور اذان زوراء کے مقام پر دلوائی، یہ اذان اگرچہ اخیر میں دی گئی ہے بلکہ مقرر ہوئی، لیکن یہی اذان اولی اور سب سے مقدم کہی جاتی تھی، اور صحابہ کرامؓ مین سے کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے، اس سے یہ سمجھا گیا کہ سب کا اس پر اجماع ہو گیا، مصنفؒ نے تصریح کی ہے کہ اسی اذان پر کاروبار چھوڑ دینا اور چلنا واجب ہے، کیونکہ بالاتفاق اب یہی اذان پہلی اذان کہی جانے لگی ہے۔ م۔

واذا صعد الامام المنبر جلس واذن المؤذنون بين يدى المنبر بذلك جرى التوارث......الخ

اور جب امام منبر پر چڑھ کر بیٹھ جائے، تو موذن منبر کے سامنے اذان کہیں، **بذلك جرى الخ** اسی دستور کے مطابق اذان ہوتی آرہی ہے، **ولم يكن الخ**، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں صرف یہی اذان ہوئی تھی، ف یعنی رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں یہی پہلی اذان تھی، چنانچہ سائب بن یزیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد نبوت میں اور حضرت ابو بکر صدیق اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے دور خلافت میں جمعہ کے دن کی پہلی اذان وہ تھی جب امام منبر پر بیٹھ جائے، لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور مسلمانوں کی زیادتی ہوگئی تو تیسری اذان زوراء کے مقام پر شروع ہوگئی، بخاری اور سنن اربعہ نے اس کی روایت کی ہے، بخاری کی ایک اور روایت میں ہے کہ دوسری اذان زیادہ کی اور ابن ماجہ کی روایت میں ہے کہ زوراء کے ایک احاطہ میں جو بازار میں تھا۔

ولهذا قيل هو المعتبر فى وجوب السعى حرمة البيع......الخ

اسی لئے کہا گیا ہے کہ سعی واجب ہونے اور بیع کے حرام ہونے میں اسی اذان کا اعتبار ہوتا ہے، ف یعنی اللہ تعالی نے فرمایا ہے کہ ﴿إِذَا نُودِيَ لِلصَّلٰوةِ مِن يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ﴾، یعنی جب جمعہ کے لئے بلایا جائے تو اللہ تعالی کے ذکر کی طرف چل پڑو، اور بیع چھوڑ دو، اس سے جمعہ کی اذان کے وقت چلنا واجب ہوا اور بیع میں مشغول رہنا حرام ہوا، جمعہ کے دن تین اذانیں ہوتی ہیں اس طرح سے کہ دو اذانیں ہیں اور ایک اقامت ہے، علماء اسے بھی اذان ہی کہہ دیتے ہیں۔

اب سوال یہ ہوا کہ ان میں کونسی اذان ایسی ہے کہ اس وقت سعی واجب اور بیع حرام ہو جاتی ہے، تو کہا گیا کہ وہ اذان جو منبر کے سامنے دی جاتی ہے اور اب وہ دوسری کہلاتی ہے، لیکن رسول اللہ ﷺ کے وقت میں یہی پہلی اذان تھی اس سے پہلی کوئی اذان نہ تھی، اس لئے اسی اذان سے سعی واجب اور بیع حرام ہے۔ م۔ یہ قول امام طحاویؒ کا ہے، اور فتاوی العتابیہ میں کہا ہے کہ یہی قول مختار ہے، اور یہی قول امام شافعی واحمد اور اکثر فقہاءؒ کا ہے، اور فتاوی مرغینانی اور جوامع الفقہ میں کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے، مع،

میں مترجم کہتا ہوں کہ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آیت ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ﴾ کی نازل فرمائی تو اس وقت اور کوئی اذان نہیں ہوتی تھی سوائے اس اذان کے جواب بھی منبر کے سامنے ہوتی ہے، تو لا محالہ اسی اذان پر سعی کرنے اور بیع چھوڑنے کا حکم ہوگا، اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ صلوۃ سے صرف خطبہ یا خطبہ نماز کے ساتھ مراد ہے، کیونکہ اذان کی آواز پر پہلے بھی خطبہ کا ذکر الٰہی سنایا جاتا ہے، لیکن مصنفؒ نے کہا ہے۔

والاصح ان المعتبر هو الاول اذاكان بعد الزوال لحصول الاعلام به.

ترجمہ:- اور قول اصح یہ ہے کہ پہلی اذان ہی معتبر ہے بشرطیکہ زوال کے بعد ہو، عام لوگوں کو خبر دینے کا مقصد حاصل ہو جانے کی وجہ سے۔

توضیح:- قول اصح یہ ہے کہ پہلی اذان ہی معتبر ہوتی ہے، کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ بیٹھ جانا

والاصح ان المعتبر هو الاول اذاكان بعد الزوال لحصول الاعلام به.

قول اصح یہ ہے کہ اذان اول ہی معتبر ہے، ف یعنی جو اذان کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پہلی کہلاتی ہے جس پر اب بھی عمل جاری ہے، تو اس کے ہوتے ہی سعی واجب اور بیع کی حرمت ثابت ہو جائیگی، اذان کان الخ بشرطیکہ یہ اذان زوال کے بعد ہو، ف اور امام احمدؒ کے قول کے مطابق زوال کے قبل بھی جائز ہے۔ الحاصل ہمارے نزدیک زوال کے بعد جو پہلی اذان ہو وہی معتبر ہوگی خواہ وہ منارہ پر ہو یا منبر کے سامنے ہو، مبسوط میں یہی ہے، اور اسی قول کو شمس الائمہ سرخسیؒ نے اختیار کیا ہے۔ مع۔ وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ﴾ یعنی جمعہ کی اذان دی جائے، تو اس سے مراد اعلام یعنی اطلاع اور خبر دینے ہے، اب یہ معنی ہوگئے کہ جب تم کو جمعہ کے دن حی علی الصلاۃ کہہ کر نماز کے لئے خبر دی جائے تو بیع و شراء (کاروبار) چھوڑ دو، اور سعی کرو، اس جگہ اس مقصد کی خبر دینا ہے جو خواہ منارہ سے اذان اور اعلان ہو یا منبر کے سامنے ہو، کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اگر منبر کے سامنے کھڑے ہو کر آہستہ سے اذان دی جائے تو اکثر علاقوں میں بڑے محلوں کے آخر تک آواز نہیں سنی جائے گی، اس طرح اگر کچھ لوگوں نے اذان کی آواز ہی نہیں سنی تو ان پر فی الفور سب کام چھوڑ چھاڑ کر نماز کے لئے نکل پڑنا کس طرح واجب ہوگا، اور جب یقینی طور پر اس آیت سے اعلام ہی ہوا تو زوال کے بعد جمعہ کے لئے جو سب سے پہلے اذان ہو اس پر حکم مترتب ہونا چاہئے۔ م۔ یہ قول اوفق اور احوط ہے۔ ع۔ واذا فرغ...... الخ اور جب امام خطبہ سے فارغ ہو جائے تب نماز کی اقامت کہی جائے۔ ف۔ جیسا کہ دوسری فرض نمازوں کا حکم ہے۔ ع۔

(۱) اور امام لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائے۔ الوقایہ۔ لہٰذا نماز اور خطبہ دونوں کے لئے ہے کہ امام ہونا چاہئے۔ الکافی۔ اور اگر امام بدل جائے دوسرا شخص آجائے تو بھی ہمارے نزدیک جائز ہے، یہی قول امام مالک اور ایک قول امام احمدؒ کا بھی ہے، لیکن امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔

(۲) خطبہ میں امام کی طرف پیٹھ نہیں کرنی چاہئے، اسی طرح خطبہ دیتے ہوئے کوئی پہلے دعا پھر درود پھر حمد پڑھ دے تو جائز مگر اچھا نہیں ہے۔

(۳) امام کی طرف متوجہ ہونا ابن المنذرؒ کے قول کے مطابق اجماع کے برابر ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس سے منہ موڑ کر بیٹھنا بھی جائز ہے۔ الخلاصہ۔ لیکن ان دنوں نمازیوں کی زیادتی کی بناء پر صف باندھ کر بیٹھنا چاہئے۔

(۴) بادشاہوں کی جھوٹی تعریفیں کرنی حرام ہے، اس کے باوجود خطبہ پورا سننا چاہئے۔

(۵) جمعہ کی نماز میں سورہ فاتحہ کے علاوہ کوئی بھی سورہ جہراً ملانا واجب ہے۔ محیط السرخسی۔

(۶) الحمد پڑھنے پر تو اجماع ہے لیکن باقی قراءت ظہر کی قراءت کے برابر ہونی چاہئے۔ التحفہ۔ کبھی کبھی سورہ جمعہ و منافقون بطور سنت اور برکت کے بھی پڑھ لینی چاہئے۔

(۷) اگر جگہ کی کمی اور نمازیوں کی زیادتی ہو تو ایسی صورت میں نمازی کی پیٹھ پر سجدہ کرنے کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔ قاضی خان۔ یہ قول ہمارا اور امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا ہے جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے، بیہقیؒ نے اسناد صحیح کے ساتھ اس کی روایت کی ہے۔

(۸) امام ابو حنیفہؒ سے یہ بات ثابت ہے کہ ایک شہر میں کئی جگہوں میں جمعہ کی نماز جائز ہے۔ المبسوط۔ اور اظہر روایت ہے کہ دو جگہوں میں جائز نہیں ہے اور اگر پڑھ لیں تو جن کی نماز پہلے ہو گی ان کی صحیح ہو گی۔ جوامع الفقہ۔ اور قول اصح یہ ہے کہ جن لوگوں نے پہلے شروع کی ہو گی ان کی صحیح ہو گی۔

(۹) جمعہ میں اگر ایک رکعت چھوٹ گئی یعنی مسبوق ہو گیا تو وہ امام کے سلام کے بعد اسے اختیار ہے کہ اس کے رکعت پڑھتے وقت قراءت آہستہ کرے یا زور سے جیسے کہ فجر کی نماز میں تنہا پڑھنے والے کو اختیار ہوتا ہے۔ الخلاصہ۔ چونکہ اس خاص مسئلہ کے بارے میں نہ کوئی خبر ہے اور نہ کوئی اثر معلوم ہے اس لئے قراءت آہستہ کرنی اولی ہے، اگرچہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جہراً کرنا افضل ہے۔ م۔ تیل، عطر لگا کر اور اچھے سپید کپڑے پہن کر مسجد میں پہونچنا اور پہلی صف میں بیٹھنا مستحب ہے، معراج الدرایہ۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جمعہ کے قبل بھی چار رکعتیں سنت میں اور بعد میں بھی چار رکعتیں سنت ہیں۔ صحیح مسلم۔ اور حضرت ابن عمرؓ کے متعلق مروی ہے کہ اگرچہ جمعہ کے بعد مسجد میں پڑھتے تو چار رکعتیں اور اگر گھر میں پڑھتے تو دو رکعتیں سنت پڑھتے، اس کی روایت ابو داؤد نے کی ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک چھ رکعتیں سنت ہیں۔ مف۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب خطبہ شروع کرتے تو آپ کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں اور آواز بلند ہو جاتی، اور غصہ تیز ہو جاتا، گویا آپ کسی دشمن کے لشکر سے ڈرانے والے ہیں، ایسا معلوم ہوتا کہ دشمن صبح کو آیا یا شام کو آیا، اور خطبہ میں فرماتے کہ میں اور قیامت ایسے بھیجا گیا ہوں اس وقت آپ اپنے کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی ملا کر اشارہ فرماتے اور اس طرح شروع کرتے **اما بعد خیر الحدیث کتاب اللہ و خیر الھدی ھدی محمد ﷺ و شر الامور محدثاتھا و کل بدعۃ ضلالۃ**، پھر فرماتے کہ میں ہر مومن کے واسطے اس کی اپنی ذات سے بہتر ہوں پس جس نے مال چھوڑا تو وہ اس کے وارثوں کا ہے، اور جس نے قرض کو چھوڑا (یعنی مقروض ہو کر مرا) یا ضائع ہونے والی اور بے سہارا اولاد چھوڑی تو وہ میری ذمہ داری میں ہے، اور مجھ پر ہے، مسلم، نسائی، امام ہشام بنت حارضہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے سن کر ہی سورہ قٓ یاد کی ہے کیونکہ اسے آپ ہر جمعہ کے دن منبر پر پڑھتے تھے، مسلم، ابو داؤد نسائی۔

رسول اللہ ﷺ جمعہ کی نماز قراءت میں ایک روایت کے مطابق جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مسلم میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے بعد سورہ جمعہ اور سورہ منافقون اور کبھی حضرت سمرہؓ سے ابو داؤد کی روایت کے مطابق سورہ **سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى** اور **هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ** پڑھتے، اور ابن عباسؓ سے مسلم وغیرہ میں ہے کہ جمعہ کے دن فجر کی نماز میں الم تنزیل السجدہ اور ہل اتی علی الانسان حین من الدہر پڑھتے، جمعہ کے دن کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ پر کوئی نہ بیٹھے، لیکن اتنا کہہ سکتے ہیں کہ جگہ دو، جگہ کشادہ کرو، یہ حضرت جابرؓ سے مسلم میں ہے، اور یہ حکم صرف جمعہ کے نہیں ہے بلکہ جمعہ ہو یا کوئی اور مجلس ہو، صحیحین میں ابن عمرؓ سے منقول ہے، جمعہ کے دن نماز سے پہلے حلقہ باندھ کر بیٹھنا منع ہے، یعنی مسجد میں۔ ت۔ اگر اونگھ آنے لگے تو مجلس بدل دینی چاہئے۔ ترمذی۔ حضرت ابن عمرؓ سے۔

باب العیدین

وتجب صلوة العيد على كل من تجب عليه صلوة الجمعة و فى الجامع الصغير عيدان اجتمعا فى يوم واحد فالاول سنة والثانى فريضة ولايترك واحد منهما قال وهذا تنصيص على السنة والاول على الوجوب وهو رواية عن ابى حنيفة وجه الاول مواظبة النبى ﷺ ووجه الثانى قوله ﷺ فى حديث الاعرابى عقيب سؤاله هل علىّ غيرهن قال لا الا ان تطوع والاول اصح و تسميته سنة لوجوبه بالسنة .

ترجمہ :-باب عیدین کے بارے میں، عید کی نماز واجب ہوتی ہے ہر اس شخص پر جس پر جمعہ کی نماز واجب ہوتی ہے۔ اور جامع صغیر میں ہے کہ دو عیدیں ایک دن میں جمع ہو گئی ہیں اس طرح سے کہ ان میں سے ایک سنت ہے اور دوسری فرض ہے، ان میں سے ایک بھی چھوڑی نہیں جاسکتی ہیں، اس روایت سے اس بات پر وضاحت ہو گئی کہ یہ سنت ہے، اور اول واجب ہے اور یہی روایت امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے، پہلی روایت کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی ہے، اور دوسری روایت کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا یہ قول اعرابی کی حدیث میں ہے جبکہ انہوں نے یہ سوال کر لیا تھا کہ کیا ان کے علاوہ مجھ پر اور بھی کوئی کچھ نماز ہے، تو آپ نے جوابا فرمایا تھا کہ نہیں مگر یہ کہ تم نفل کے طور پر ادا کر لو، پہلی روایت اصح ہے، اور اسے سنت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کا وجوب سنت سے ثابت ہوا ہے۔

توضیح :-باب عیدین، عید الفطر و عید الضحیٰ کی نماز، عید کی نماز کا وجوب، دلیل

باب العیدین...... الخ یہ باب عید الفطر اور عید الضحیٰ کے احکام میں ہے، اس دن اللہ تعالیٰ کے انواع واقسام کے احسان کے بار بار آنے سے خوشی ہوتی ہے، اسی لئے اس کا نام عید ہوا ہے، حضرت انسؓ نے روایت کی ہے کہ ایک سال میں مدینہ والوں کے لئے کھیل کود کے دو دن ہوا کرتے تھے، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے واسطے ان دونوں دنوں سے بہتر دو دن بدل دیئے ہیں ایک روز عید الفطر، دوسرا دن عید الضحیٰ ابو داؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، اور یہ صحیح حدیث ہے۔ البغوی۔

پہلی عید رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے دوسرے سال پڑھی ہے اسی سال کے شعبان کے مہینہ میں رمضان کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، اور قبلہ بدل گیا، اور حضرت علیؓ نے سیدہ فاطمہؓ سے نکاح کیا اور رسول اللہ ﷺ نے ام المومنین حضرت عائشہؓ سے ہم بستری فرمائی، اور زکوۃ کی فرضیت نازل ہوئی، اس عیدین کی نماز کو پہلے باب جمعہ کی نماز کے بعد لانے کی مناسبت یہ رہی کہ دونوں نمازوں کی جماعتیں بڑی بڑی ہوتی ہیں، دن کے وقت سے پڑھی جاتی ہیں، سوائے خطبہ کے دونوں کی شرطیں بھی برابر ہیں، کہ جمعہ میں خطبہ بھی ایک شرط اور نماز سے پہلے ادا کیا جاتا ہے لیکن عیدین میں خطبہ بعد میں ادا کیا جاتا ہے اور سنت ہے، عیدین میں اذان واقامت بھی نہیں ہوتی جبکہ جمعہ کی فرضیت اعلیٰ اور اقدم ہے، قنیہ میں ہے کہ دیہات میں عید کی نماز پڑھنی مکروہ تحریمی ہے، کیونکہ عید دیہات میں صحیح نہیں ہوتی ہے، اس لئے بے فائدہ کام میں مشغول ہونا لازم آتا ہے۔ مع۔ مصنفؒ نے نماز عید کے بارے میں فرمایا ہے :

وتجب صلوة العيد على كل من تجب عليه صلوة الجمعة و في الجامع الصغير عيدان......الخ

اور نماز عید ہر ایسے شخص پر واجب ہوتی ہے جس پر نماز جمعہ لازم ہوتی ہے۔ ف۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نماز عید واجب ہے، مختصر الکرخی، جوامع الفقہ، منیۃ المفتی اور امام احمدؒ کا ظاہر مذہب یہ ہے کہ یہ فرض کفایہ ہے۔ مع۔ **وفی الجامع الصغیر** الخ جامع صغیر میں امام محمدؒ نے روایت کی ہے کہ ایک دن میں دو عیدیں جمع ہوئی ہیں ان میں پہلی سنت اور دوسری فرض ہے، اور دونوں سے کوئی بھی نہ چھوڑی جائے۔ ف۔ شمس الائمہ سرخسیؒ نے فرمایا ہے کہ عید کے حکم کے بارے میں مذہب مشتبہ رہا کہ وہ واجب ہے یا سنت ہے، جامع صغیر کی اس عبارت میں سنت کا ذکر ہے۔ مع .

قال وهذا تنصيص على السنة والاول على الوجوب وهو رواية عن ابی حنيفة......الخ

مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ اس عبارت سے اس بات کا صریح بیان ہے کہ عید کی نماز سنت ہے۔ف۔یہی مذہب امام مالک و شافعیؒ کا ہے۔ع۔اور یہی اظہر ہے۔السرخسی۔اور یہی صحیح ہے، شیخ الاسلام۔ع۔والاول الخ اور قول اول اس بات میں صریح ہے کہ وہ واجب ہے وهو رواية الخ اور یہی ایک روایت امام ابو حنیفہؒ سے بھی ہے۔ف۔جس کو حسن بن زیادؒ نے امام سے بیان کیا ہے۔

وجه الاول مواظبة النبی ﷺ ووجه الثانی قوله ﷺ فی حديث الاعرابی......الخ

قول اول یعنی واجب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر ہمیشگی فرمائی ہے۔ف۔لیکن اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہ ہمیشگی کرنا اس پر اس وجہ سے ہو کہ یہ دین کے شعائر اور اہم معاملات میں سے ہے کہ اس کو چھوڑنا گمراہی میں سے ہو۔السرخسی۔ووجه الثانی الخ اور دوسرے قول یعنی نماز عید کے مسنون ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا وہ قول جو نجدی اعرابی کی حدیث میں اس سوال کے بعد ہے کہ کیا مجھ پر ان بیان کی ہوئی فرض نمازوں کے علاوہ اور بھی کوئی نماز ہے، تو آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں مگر یہ کہ تم اپنی طرف سے نیکی کے طور پر کرو۔ف۔طلحہ بن عبید اللہؓ سے روایت ہے کہ نجد والوں میں سے ایک شخص دیہاتی پریشان حال جیسا جس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا، اس کی باریک گونجی ہوئی آواز ہم لوگ سن رہے تھے لیکن یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، یہانتک کہ رسول اللہ ﷺ کے قریب ہوا تب سمجھ میں آیا کہ وہ اسلام کے متعلق کچھ پوچھ رہا ہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں، اس جواب پر اس نے پھر سوال کیا کہ کیا ان کے علاوہ اور بھی کچھ نمازیں ہیں، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں مگر یہ کہ تم اپنی طرف سے نیک کام کے طور پر پڑھو، الحدیث، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ف۔اس جگہ اس بات کا احتمال ہے کہ اس وقت تک عید کی نماز واجب نہ ہوئی ہو، اور بعد میں واجب ہوئی ہو۔مع۔

والاول اصح و تسميته سنة لوجوبه بالسنة......الخ

قول اصح ہے۔ف۔یعنی عید کی نماز کا واجب ہونا ہی اصح ہے۔المحیط۔المرغینانی۔القنیہ، اور یہی قول صحیح ہے۔القاضی خان۔البدائع۔مع۔لیکن جامع صغیر جس میں صراحت کے ساتھ سنت کہا ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ و تسميه سنة الخ امام محمدؒ نے جو اس کا نام سنت رکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا واجب ہونا سنت کی دلیل سے ثابت ہوا ہے۔ف۔نماز عید، نماز جنازہ سے مقدم ہے۔ت۔لیکن قول اصح تو اس کے برعکس ہے جیسا کہ دین الاشباہ سے ظاہر ہے، کیونکہ جنازہ بندہ کا حق ہے اور فرض کفایہ ہے، اور عید کے واجب ہونے میں بھی اختلاف ہے، اور ضعف ہے۔م۔

اور حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ آج کے دن ہمارے اس روز میں دو عیدیں جمع ہو گئی ہیں (یعنی عید الفطر اور جمعہ ابو داؤد) پس جو کوئی چاہے اس کے لئے یہ نماز عید نماز جمعہ سے کافی ہو گئی مگر ہم تو جمعہ بھی پڑھیں گے، ابو داؤد نے اس کی روایت کی ہے، اسی جیسی روایت صحیحین میں حضرت عثمانؓ کا فرمان دیہاتیوں کے واسطے ہے، اور عبد اللہ الزبیرؓ نے جمعہ کی نماز نہیں پڑھائی بالآخر لوگوں نے تنہا تنہا نماز ادا کی، ابو داؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، اسی بناء پر کچھ لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اس دن جمعہ کی نماز ہی نہیں ہے، مگر یہ بات بالکل غلط ہے، بلکہ ابن الزبیرؓ نے ظہر کی نماز پڑھی ہے، اور آئندہ بھی اس سلسلہ میں بحث ہو گی۔م۔

ويستحب فی يوم الفطر ان يطعم قبل الخروج الى المصلى ويغتسل ويستاك و يتطيب لما روى انه ﷺ كان يطعم فی يوم الفطر قبل ان يخرج الى المصلى وكان يغتسل فی العيدين ولانه يوم اجتماع فيسن فيه الغسل

والتطیب کما فی الجمعة و یلبس احسن ثیابه لان النبی ﷺ کان له جبة فَنَكٍ او صوف یلبسها فی الاعیاد.

ترجمہ:- اور مستحب ہے عید کے دن عید گاہ جانے سے پہلے کھائے اور غسل کرے اور خوشبو لگائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ عید کے دن تا مصلی میں جانے سے پہلے کچھ کھاتے اور عیدین میں غسل کرتے تھے، اور اس وجہ سے بھی کہ وہ دن لوگوں کے اکھٹے ہونے کا دن ہوتا ہے اس لئے غسل کرنا خوشبو لگانا مسنون سمجھا گیا ہے جیسا کہ جمعہ کے دن کیا جاتا ہے۔

توضیح:- عید الفطر کی نماز سے پہلے کچھ کھانا، عید کے دن کی سنتیں اور آداب

ویستحب فی یوم الفطر ان یطعم قبل الخروج الی المصلی ویغتسل ویستاك و یتطیب......الخ

عید الفطر کے دن عید گاہ جانے سے پہلے کچھ کھالینا مستحب ہے۔ف۔ اس جگہ لفظ مستحب سنت اور مستحب کو شامل ہے۔ مع۔ اور مستحب ہے کہ کھانے کی چیز کچھ میٹھی غذا ہو۔ف۔ اور چھوہارا یا لقمہ طاق یا بے جوڑ کھانا چاہئے۔م۔ کہا گیا ہے کہ یہ حکم دیہاتیوں کے لئے بطور مستحب ہے۔د۔ اور چونکہ یہ کام رسول اللہ ﷺ کی عادت کی قسم سے تھے لہٰذا انہیں مستحب کہا گیا ہے، لیکن حق بات یہ ہے کہ یہ سنت ہیں۔م۔ ویغتسل اور نہائے۔ف۔ فجر کے بعد یہی قول جماعت تابعین اور چار فقہاء ائمہ کرام کا ہے، لفظ مستحب سے سنت مراد لینی صحیح ہے، جیسا کہ کتاب الطہارۃ میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔ مع۔ ویستاك الخ اور مسواک کرے، اور خوشبو لگائے۔ف۔ ایسی خوشبو جس میں رنگ نہ ہو اگرچہ خشک ہو، مشک کو جس کسی نے ناپاک اور نجس کہا ہے اس نے غلط کہا ہے۔ مع۔

لما روی انه ﷺ کان یطعم فی یوم الفطر قبل ان یخرج الی المصلی......الخ

اس حدیث کی بناء پر جس میں بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن مصلی جانے سے پہلے کھاتے تھے۔ف۔ جیسا کہ بخاریؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے کہ طاق عدد میں کچھ چھوہارے کھالیتے تھے، حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ یہ بات سنت ہے کہ آدمی عید گاہ کی طرف پیدل جائے اور گھر سے نکلنے سے پہلے کچھ کھالے، ترمذی نے اس کی روایت کی ہے و کان یغتسل الخ اور یہ بھی مروی ہے کہ آپ عیدین کے دن غسل فرماتے تھے۔ف۔ جیسا کہ ابن ماجہ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کی ہے، یہ بات حضرت سعدؓ نے فرمائی ہے۔

و لانه یوم اجتماع فیسن فیه الغسل والتطیب کما فی الجمعة......الخ

اور اس دلیل سے کہ عید بھی بہت زیادہ تعداد میں لوگوں کے اکھٹے ہونے کا دن ہے، لہٰذا اس میں بھی غسل کرنا خوشبو لگانا مسنون ہوگا، جیسا کہ جمعہ میں ہے۔ف۔ کیونکہ حضرت ام المومنین عائشہؓ نے اسلام کے ابتدائی دنوں میں جمعہ کے دن غسل کے لازم ہونے کی یہ علت بیان کی ہے کہ لوگ مزدوری کے کاموں میں مشغول رہتے اور دن کے کپڑے پہنتے تھے اس کی وجہ سے پسینہ نکلنے سے بدبو بھی ہو جاتی، اسی لئے کہا گیا ہے۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ مستحب ہونے کا تو ثبوت ہو گیا، لیکن عینیؒ نے جو اس کے سنت کہنے کو قول اصح کہا ہے اس کے لئے صرف یہ قیاس کافی نہیں ہے، جیسا کہ مخفی نہیں ہے۔م۔

و یلبس احسن ثیابه لان النبی ﷺ کان له جبة فنك او صوف یلبسها فی الاعیاد......الخ

اور یہ مستحب ہے کہ اپنے اچھے کپڑے پہنے۔ف۔ خواہ نئے ہوں یا دھلے ہوئے ہوں، بہر صورت کپڑے جیسے بھی ہوں، اپنے موجود کپڑوں میں سے اچھے کو پہن لینا مستحب ہے، کیونکہ اس طرح اس مبارک دن کی اہمیت اور اعزاز کا اس نے ارادہ کیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی جوڑا کپڑا ہو اسی کو دھو کر یا دھلا کر پہنا تو بھی ثواب پالیا، اور اگر اچھے قیمتی رکھے ہوئے کپڑوں کو بھی اسی اعزاز و اکرام کے خیال سے پہنے گا تو بھی ثواب پائے گا۔م۔ لان النبی ﷺ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے پاس پاک فنک یا اون کا ایک جبہ تھا اسی کو آپ عید کے دن پہنا کرتے تھے۔ف۔ فنک ایک جانور کا نام ہے جس کے چمڑے

سے چغہ بنایا جاتا ہے جو پہننے میں بہت عمدہ معلوم ہوتا ہے، صوف بال، جو اون سے موٹے ہوتے ہیں، لیکن یہ حدیث غریب ہے۔ ز۔ع۔ف۔ اور امام شافعیؒ کی حدیث حضرت حسین بن علیؓ سے اور بیہقی کی جابرؓ سے اور طبرانی کی اوسط میں ابن عباسؓ سے ثابت ہے کہ رسول اللہ علیہ کے پاس سرخ دھاریوں کی چادر تھی جسے آپ عیدین اور جمعہ میں پہنتے تھے۔ فع۔ برد احمر یا حلہ حمراء یعنی سرخ چادر سے حدیث میں بھی دھاری دار چادر مراد ہے، وہ بالکل سرخ نہ تھی۔ ف۔

ویؤدی صدقة الفطر اغناء للفقیر لیتفرغ قلبه للصلوة ویتوجه الی المصلی ولایکبر عند ابی حنیفة فی طریق المصلیٰ وعندهما یکبر اعتبارا بالاضحی وله ان الاصل فی الثناء الاخفاء والشرع ورد به فی الاضحی لانه یوم تکبیر ولا کذلك الفطر۔

ترجمہ:- اور صدقہ فطر ادا کرے فقیر کو بے فکر کر دینے کے لئے، تاکہ اس کا قلب بھی نماز کے لئے فارغ ہو جائے، اور مصلی (عید گاہ) کی طرف متوجہ ہو جائے (چل پڑے) اور امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کے مطابق مصلی کے راستہ میں تکبیر نہ کہے لیکن صاحبینؒ کے نزدیک عید الاضحیٰ کی طرح عید الفطر میں بھی تکبیر کہے، امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ ذکر میں تو اصل آہستہ کہنا ہی ہے، اور شریعت کے اندر ذکر کو زور سے کہنے کا حکم تو عید الضحیٰ کے بارے میں ہے کیونکہ وہ تو تکبیر ہی کا دن ہے، لیکن عید الفطر میں تو ایسی بات نہیں ہے۔

توضیح:- عید گاہ جاتے ہوئے راستہ میں تکبیر کہنا، ائمہ کا اختلاف اور ان کی دلیلیں

ویؤدی صدقة الفطر اغناء للفقیر لیتفرغ قلبه للصلوة......الخ

اور صدقہ فطر ادا کرے۔ ف۔ یعنی نماز سے پہلے، اغناء الخ فقیر کو بے پرواہ اور بے فکر کر دینے کے لئے تاکہ نماز کے لئے اس کا دل بھی فارغ ہو جائے۔ ف۔ اور عید کے دن جلدی جاگے، اور محلہ کی مسجد میں نماز پڑھ کر اوپر بتائی ہوئی باتوں سے جلد فراغت حاصل کر لے، اور عید گاہ جانے کے لئے جلدی کرے۔ مع۔

ویتوجه الی المصلی ولایکبر عند ابی حنیفة فی طریق المصلی وعندهما یکبر......الخ

اور عید گاہ کی طرف متوجہ ہو۔ ف۔ اور پیدل چلنا مستحب ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ سنت میں سے یہ بھی کہ عید گاہ کو پیدل جائے، اس کی روایت ترمذی اور ابن المنذرؒ نے کی ہے، یہی قول امام شافعیؒ واحمدؒ کا بھی ہے، ویسے سواری بھی جائز ہے، اور جو لوگ عید گاہ جانے سے معذور ہوں ان کے لئے امام وقت کو چاہئے وہ شہر کی ہی کسی مسجد میں ایسا انتظام کر دے جو ان کو نماز پڑھا دے اور یہی افضل ہے۔ یہ قول حضرت علیؓ سے مروی ہے، اور یہی قول امام اوزاعی اور امام شافعی کا بھی ہے کیونکہ بالاتفاق عید کی نماز کئی جگہ جائز ہے۔ مفع۔

عید کی نماز دو جگہ تو بالاتفاق اور بقول محمدؒ تین جگہ بھی جائز ہے، اور بقول امام ابو یوسفؒ جائز نہیں ہے۔ المحیط۔ ھ۔ اور یہی قول اظہر ہے۔ م۔ پھر گھر سے نکلتے وقت حدیث کے مطابق یہ دعا کرے، اللهم انی خرجت الیك مخرج العبد الذلیل، الٰہی میں تیری طرف ذلیل غلام کی طرح نکلا ہوں، اس سے مقصد یہ ہے کہ دریائے رحمت جوش میں آجائے، اس کے بعد سنت یہی ہے کہ گھر سے نکل کر نماز کے لئے جبانہ کی طرف جانا چاہئے، اس جبانہ سے مراد ہے شہر کے باہر جانا اگرچہ وہاں بنی ہوئی کوئی عمارت عید گاہ کے نام سے نہ ہو، اگرچہ شہر کے اندر کسی بڑی مسجد میں تمام لوگوں کی گنجائش موجود ہوں، یہی قول صحیح ہے اور اس پر عام مشائخ کا عمل ہے۔ المضمرات۔ مفع۔

ولایکبر عند ابی حنیفة فی طریق المصلی وعندهما یکبر اعتبارا بالاضحی......الخ

جاتے ہوئے تکبیر (تشریق) کی آواز بلند نہ کرے۔ فع۔ عند ابی حنیفةؒ الخ عید گاہ کے راستہ میں امام ابو حنیفہؒ کے

نزدیک۔ف۔یہ روایت مشائخ ماوراء النہر کی ہے، اور، مختصر الطحاویؒ میں ہے کہ بلند آواز سے تکبیر کہتا ہوا جائے، اس میں کوئی اختلاف ذکر نہیں کیا ہے، امام ابو بکر الجصاصؒ نے شرح المختصر میں کہا ہے کہ امام ابو حنیفہؒ سے نقل کیا جاتا ہے کہ فطر میں جہر نہ کہے۔مع۔ آہستہ تکبیر مستحب ہے، الجوہرہ، وعندہما الخ لیکن صاحبینؒ کے نزدیک تکبیر کہے۔ف۔ یعنی بلند آواز سے کیونکہ آہستہ کہنے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔م۔ جیسا کہ تمام کتابوں میں مذکور ہے، لہٰذا مراد یہ ہے کہ جہر سے تکبیر کہے، اعتبارا الخ عید الاضحیٰ پر قیاس کرتے ہوئے۔ف۔ یعنی جیسا کہ بالاتفاق عید الاضحیٰ میں جہراً تکبیر کہنی چاہئے اسی طرح عید الفطر میں بھی جہراً ہی تکبیر کہے، اور یہی عامہ علماء کا قول ہے۔مع۔اور چاہئے کہ مقتدی بھی امام کی تکبیر کے بعد کہیں جیسا کہ آئندہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے۔

وله ان الاصل فى الثناء الاخفاء والشرع ورد به فى الاضحى لانه يوم تكبير ولا كذلك الفطر......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کے جہر کی ممانعت کی دلیل یہ ہے کہ ذکر و تسبیح میں آہستہ کہنا ہی اصل ہے۔ف۔ یعنی ہر ذکر اپنے اصل کے مطابق آہستہ کہنی چاہئے سوائے اس ذکر کے جس کو شریعت کی طرف سے جہراً کہنے کی تصریح ہو کہ اس میں کوئی خاص مصلحت ہوگی، اس دعوی کی دلیل یہ فرمان باری تعالیٰ ہے ﴿وَاذْكُر رَبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً﴾ یعنی اپنے رب کو اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خفیہ طور پر ذکر کرو، اور حدیث میں ہے کہ بہتر ذکر وہ ہے جو آہستگی کے ساتھ ہو، حدیث میں ہے کہ ان لوگوں کو جو عرفات سے مزدلفہ آتے ہوئے جہراً تکبیر کہہ رہے تھے ان کو فرمایا کہ اپنے نفس پر نرمی کرو، آہستگی سے کہو تم کسی بہرے یا غائب شخص کو نہیں پکار رہے ہو، اس سے اشارۃً یہ بات معلوم ہوئی کہ تکبیر کہنے میں اصل یہی ہے کہ آہستگی سے کہی جائے، اگرچہ کبھی کسی جگہ کسی خاص مصلحت کی بناء پر جہراً بھی کہنے کا حکم دیا گیا ہے، تو جس جگہ شریعت سے جہر کا ثبوت پایا جائے گا وہی جہر کیا جائے گا۔ والشرع ورد به الخ اور عید الاضحیٰ کی تکبیر بالجہر کا ثبوت شریعت میں موجود ہے، کیونکہ وہ پورا دن ہی تکبیر کہنے کا ہے جبکہ عید الفطر کی یہ خصوصیت نہیں ہے۔ف۔ یعنی عید الاضحیٰ میں تکبیرات تشریق کہنا واجب ہے تو زور سے کہنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ جس کو یاد نہ ہو اور بھول گیا ہو اسے بھی یاد آجایا کرے، اسی لئے جہراً کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فقیہ ابو جعفرؒ نے کہا ہے کہ میرا مختار مذہب یہ ہے کہ عوام کو زور سے تکبیر کہتے وقت منع نہیں کرنا چاہئے۔فع۔ عیدگاہ یا مصلی پہنچ کر تکبیر کہنی بند کر دی جائے، مختار غیاثیہ بھی ہے، امام ابو بکر الرازیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے مشائخ کے نزدیک ان دونوں کے علاوہ دوسرے کسی دن بھی زور سے تکبیر کہنی مسنون نہیں ہے البتہ جہاد کے میدان دشمن کے مقابلہ میں، اسی طرح ڈاکوؤں کو ڈرانے کے لئے، اور کہا گیا ہے کہ اسی طرح جبکہ آگ لگ گئی ہو، اسی طرح کوئی ہولناک واقعہ پیش آیا ہو، اور مجمع النوازل میں کہ جب کسی جماعت سے ملاقات ہو یا اتار یا چڑھاؤ پر اترے یا چڑھے تو تکبیر کہے۔مع۔اور عیدگاہ جانے سے پہلے نفل نماز نہیں پڑھی جائے۔

ولايتنفل فى المصلى قبل صلوة العيد لان النبى ﷺ لم يفعل ذلك مع حرصه على الصلوة ثم قيل الكراهة فى المصلى خاصة و قيل فيه وفى غيره عامة لانه ﷺ لم يفعله واذا حلت الصلوة بارتفاع الشمس دخل وقتها الى الزوال اوذا زالت الشمس خرج وقتها لان ﷺ كان يصلى العيد والشمس على قيد رمح او رمحين.

ترجمہ:- عید کی نماز سے پہلے عیدگاہ میں نفل نماز نہیں پڑھی جائے کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے نفل پڑھنے پر فطرۃً حریص ہونے کے باوجود ایسا نہیں کیا ہے، پھر کہا گیا ہے کہ اس کراہت کا حکم صرف مصلی میں نماز پڑھنے کی صورت میں ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مصلی اور غیر مصلی سب کے لئے حکم عام ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا نہیں کیا ہے، اور جب آفتاب بلند ہو کر نماز پڑھنی حلال ہو جائے اس وقت نماز عید کا وقت داخل ہو کر آفتاب کے زائل ہونے تک رہے گا، اور جیسے ہی آفتاب ڈھل جائے گا اس نماز کا وقت بھی ختم ہو جائے گا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ عید کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ آفتاب ایک دو نیزوں

کے برابر او نچا رہتا تھا۔

توضیح :- عید کی نماز کے قبل نفل پڑھنی، حدیث سے دلیل

عید کی نماز کا وقت، حدیث سے دلیل

ولا یتنفل فی المصلی قبل صلوۃ العید لان النبی ﷺ لم یفعل ذلک مع حرصہ علی الصلوۃ .....الخ

مطلب واضح ہے۔ مع۔ حرصہ الخ باوجود یہ کہ رسول اللہ نفل پڑھنے کے بہت حریص ہونے کے باوجود آپ نے اس وقت نفل نہیں پڑھی۔ف۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن (عید الفطر ابوداؤد کے حوالہ سے) باہر نکلے اور لوگوں کو دو رکعتیں نماز پڑھائیں نہ اس کے پہلے پڑھائیں نہ اس کے بعد پڑھائیں، ائمہ ستہ نے اس کی روایت کی ہے۔ت۔ع۔ف۔

ابو مسعودؓ نے لوگوں کے سامنے فرمایا ہے کہ امام سے پہلے کسی کا نماز پڑھنا ثابت یا سنت نہیں ہے۔ نسائی نے اس کی روایت کی ہے، ثم قیل الخ پھر کہا گیا ہے کہ کراہت کا حکم صرف مصلی میں پڑھنے میں ہے۔ف۔ یعنی عید گاہ میں نہ نماز سے پہلے پڑھے اور نہ بعد میں، یہ قول محمد بن مقاتلؒ کا ہے۔ع۔ اور ابن عباسؓ کی حدیث میں جو من قبل و من بعد ہے اس کو اس پر محمول کیا جائے گا کہ وہاں نہیں پڑھی ہے، کیونکہ ابن ماجہؒ نے ابو سعید خدریؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کی نماز سے پہلے کوئی نفل نہیں پڑھتے تھے، پھر جب اپنے گھر آتے تو دو رکعتیں پڑھتے تھے۔الفتح۔

و قیل فیہ وفی غیرہ عامۃ لانہ ﷺ لم یفعلہ .....الخ

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ کراہت کا حکم عام ہے عید گاہ اور دوسری کسی بھی جگہ کے لئے ہے۔ف۔ یعنی عید گاہ میں بھی مکروہ ہے اور اس کے علاوہ کسی بھی جگہ پڑھنا مکروہ ہے، عامہ مشائخ کا یہی قول ہے، اور والوالجیہ میں اسی پر فتویٰ ہے مع۔ لانہ ﷺ الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے کہیں بھی نفل نماز نہیں پڑھی۔ف۔ نہ عید گاہ میں اور نہ عید گاہ کے علاوہ کسی اور جگہ، اس سے کراہت معلوم ہوتی ہے۔ مع۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت جابرؓ کی حدیث سے تو گھر پر دو رکعت پڑھنی مکروہ ہے، لہٰذا وہ دلیل مکمل نہیں ہوئی۔م۔

قاضی خان و تحفہ میں عید کی نماز کے بعد عید گاہ میں بھی نفل نماز پڑھنے کو بغیر کراہت کے جائز کہا ہے۔ مع۔ لیکن صحیح قول یہ ثابت ہوا کہ عید کے قبل مکان یا عید گاہ میں کہیں نہیں اور عید کی نماز کے بعد دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ عید گاہ میں پڑھی جائے تو قاضی خان اور تحفہ کے قول کے مطابق جائز ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ اس میں کراہت ہے کیونکہ سنت کے خلاف ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ گھر پر پڑھی جائے تو صحیح یہ ہے کہ بلا کراہت جائز ہے، اور ابن الہمامؒ کا اسی طرف اشارہ بھی ہے، پھر میں نے دیکھا کہ تنویر نے اسی پر اعتماد کیا ہے۔م۔ عوام کو مطلقاً کسی تکبیر سے خواہ جہراً ہو یا سراً اور نفل نماز بلکہ چودھویں شعبان کی رات کی نفلوں سے نہ روکا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے نیکیوں کی طرف ان کی رغبت کم ہو جائے گی۔د۔ اب یہاں سے عید کی نماز کا وقت بیان کرنا ہے کیونکہ آفتاب نکلتے وقت نماز حرام ہوتی ہے۔

واذا حلت الصلوۃ بارتفاع الشمس دخل وقتھا الی الزوال.....الخ

جس وقت آفتاب نکلنے کے بعد نماز پڑھنی جائز ہو جاتی ہے اسی وقت عید کی نماز پڑھنے کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ف۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے، جن میں امام مالکؒ و احمدؒ بھی ہیں۔ع۔ اس لئے آفتاب کے بلند اور سپید ہونے کے وقت سے شروع ہو کر زوال آفتاب تک رہتا ہے۔ف۔ لیکن زوال کا وقت خارج ہوتا ہے لہٰذا ٹھیک دوپہر ہونے سے پہلے تک ہی اسی کا وقت ہوا۔

واذا زالت الشمس خرج وقتھا لان ﷺ کان یصلی العید والشمس علی قید رمح او رمحین.....الخ

اور جیسے ہی آفتاب کا ڈھلنا شروع ہوا عید کا ختم وقت ختم ہو گیا، لان النبی ﷺ الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ عید کی نماز اس وقت پڑھتے کہ آفتاب ایک یا دو نیزے کے برابر اونچا ہو جاتا۔ ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک نیزہ بلند ہونے کے بعد سے وقت شروع ہوتا ہے، کیونکہ آفتاب نکلتے وقت نماز پڑھنی ممنوع ہے، یہانتک کہ ایک نیزہ آفتاب بلند ہو جائے، جیسا کہ باب الاوقات میں گذرا۔م۔ لیکن یہ حدیث غریب ہے، جیسا کہ زیلعی نے ذکر کیا ہے، اور عبد اللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ لوگوں کے ساتھ میں عید الفطر یا عید الاضحیٰ کی نماز کو نکلا، اور امام نے دیر کی تو اس کے دیر کرنے پر ناراضگی فرمائی اور بیان فرمایا کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس وقت تک فارغ ہو جاتے تھے، حالانکہ یہ وقت تو چاشت کی نماز کا وقت تھا، اس کی روایت ابوداؤد اور ابن ماجہ نے کی ہے، امام نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے۔ مفع۔

ولما شهد وابا لهلال بعد الزوال امر بالخروج الى المصلى من الغد و يصلى الامام بالناس ركعتين يكبر فى الاولى للافتتاح و ثلثا بعدها ثم يقرأ الفاتحة و سورة ويكبر تكبيرة يركع بها ثم يبتدى فى الركعة الثانية بالقرأة ثم يكبر ثلثا بعدها ويكبر رابعة يركع بها و هذا قول ابن مسعودؓ وهو قولنا.

ترجمہ:- اور جب لوگوں نے زوال کے بعد عید کے چاند نکلنے کی گواہی دی تو رسول اللہ ﷺ نے دوسرے دن عید گاہ کی طرف جانے کا انہیں حکم دیا، اور لوگوں کو امام عید کی نماز دو رکعتیں پڑھائے، اور پہلی رکعت میں ایک تکبیر نماز شروع کرنے کے لئے کہے، اس کے بعد اور تین تکبیریں کہے پھر سورہ فاتحہ پڑھے اور سورہ ملائے، اور تکبیر کہہ کر رکوع کرے، پھر دوسری رکعت کر کے قرأت کرے اس کے بعد تین تکبیریں کہے، اور چوتھی تکبیر کہہ کر رکوع کرے، یہ قول حضرت ابن مسعودؓ کا ہے، اور یہی ہمارا قول ہے۔

توضیح:- تعداد رکعت، نماز کی کیفیت، قراءت اور تکبیر

ولما شهد وابا لهلال بعد الزوال امر بالخروج الى المصلى من الغد......الخ

اور آفتاب کے زوال سے وقت ختم ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ جب لوگوں نے زوال کے بعد چاند کے دیکھنے کی گواہی دی تو رسول اللہ ﷺ نے دوسرے دن عید گاہ جانے کا حکم فرمایا۔ ف۔ پس اگر زوال کے بعد بھی وقت باقی رہتا تو اسی دن نماز پڑھا دیتے، کیونکہ بارش وغیرہ کا کوئی عذر نہیں تھا، جس سے دوسرے دن تک نماز کی تاخیر جائز ہو جاتی ہے، اصل حدیث یہ ہے شوال کا چاند دیکھنے کی رات چاند پر ابر چھا گیا تو ہم لوگ اس کی صبح بھی روزہ کی حالت میں اٹھے، پھر آخر دن میں (زوال کے بعد، طحاوی) سواروں کا ایک قافلہ آیا اور رسول اللہ ﷺ کے دربار میں آکر گواہی دی کہ ہم لوگوں نے گذشتہ روز ہی شام کے وقت چاند دیکھا ہے تو رسول اللہ ﷺ نے حکم دیا کہ لوگ آج افطار کر لیں اور آئندہ مکمل اول وقت میں عید گاہ کی طرف نکلیں، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور یہ بھی کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے، اور نوویؒ نے خلاصہ میں کہا ہے کہ اسناد صحیح ہے، اور طحاویؒ کی روایت میں جو "الزوال" ہے اس سے یہ احتمال جاتا رہا کہ آخر دن سے مراد وہ وقت ہو جبکہ نماز جائز نہیں ہوتی ہے۔ مفع۔ پھر جب عید گاہ میں جاکر تکبیر تشریق کہنی ختم کر دی جائے تو پھر وہاں اذان اور اقامت کچھ نہیں ہوگی جس کی دلیل حضرت جابر بن سمرہؓ کی حدیث ہے جو مسلم و ابوداؤد اور ترمذی میں موجود ہے، اگر امام کی فجر کی نماز قضا ہو گئی ہو تو اس سے عید کی نماز میں کوئی ممانعت نہ ہو گی۔ الحجہ۔ ھ۔

و يصلى الامام بالناس ركعتين يكبر فى الاولى للافتتاح و ثلاثا بعدها......الخ

اور امام لوگوں کو دو رکعتیں پڑھائے۔ ف۔ اسی پر اجماع ہے، اس نماز کا طریقہ یہ ہے کہ یکبر الخ کہ پہلی رکعت میں نماز شروع کرنے کے لئے ایک تکبیر (تحریمہ) کہے۔ ف۔ یعنی پہلے تکبیر تحریمہ کہے، پھر ثنا، سبحانک آخر تک پڑھ لے کیونکہ بالاجماع

قراءت قرآن سے پہلے ہی ثناء پڑھنی ہے، اس طرح یہ ثنا تین تکبیروں سے پہلے ہی پڑھنی چاہئے۔ع۔ وثلاثا بعدھا اس کے بعد عید کی نماز کی تین تکبیریں کہے۔ف۔ یعنی ان میں سے ہر تکبیر کے ساتھ ہاتھ اٹھائے، اور ہر دو تکبیر کے درمیان تین تسبیح کے انداز سے وقفہ کرے، یہ قول امام اعظمؒ سے منقول ہے، اور اسی پر فتویٰ ہے۔الغاشیہ۔ ھ۔م۔

ثم یقرأ الفاتحۃ وسورۃ ویکبر تکبیرۃ یرکع بھا ......الخ

پھر فاتحہ پڑھے۔ف۔ یعنی قراءت قرآن مجید کرے اس طرح سے کہ سورہ فاتحہ کو بالاجماع زور سے پڑھنا شروع کرے تو سب سے پہلے سورہ فاتحہ پڑھے، پھر و سورۃ الخ اور ایک سورہ ملائے۔ف۔ یعنی کوئی بھی سورہ ملائے:ف۔ یعنی کوئی بھی سورہ ہو یا کہیں سے رکوع وغیرہ ہو مگر چھوٹی تین آیتوں سے یا بڑی ایک آیت سے کم نہ ہو، ویسے عیدین کے لئے مسنون قراءت یہ سورہ قٓ وَالْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ، سورہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَۃُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ، مسلم اور سنن اربعہ، اور کبھی سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی اور هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَه، مسلم اور سنن اربعہ۔م۔ لیکن ان سورتوں کو ہمیشہ اس طرح پابندی کے ساتھ کوئی نہ پڑھے جس سے عام سننے والوں کو یہ دھوکہ ہونے لگے ان نمازوں میں ان ہی سورتوں کو پڑھنا ضروری ہے۔مع۔ ویکبر تکبیرۃ الخ اور قراءت کے بعد ایک تکبیر کہہ کر رکوع کرے۔ف۔ اس طرح اس میں اس تکبیر تحریمہ کی، تین زائد تکبیریں اور ایک تکبیر رکوع کی مجموعہ پانچ تکبیریں ہوئیں۔ع۔ پھر رکوع اور سجدے پورے کر کے دوسری رکعت کے لئے کھڑا ہو جائے۔

ثم یبتدی فی الرکعۃ الثانیۃ بالقرائۃ ثم یکبر ثلاثا بعدھا ویکبر رابعۃ یرکع بھا......الخ

پھر دوسری رکعت کو قرأت کے ساتھ شروع کرے۔ف۔ اور اس نماز میں جو زائد تکبیریں جو کہنی ہیں انہیں ابھی نہ کہے یہاںتک کہ سورہ فاتحہ وغیرہ پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ثم یکبر الخ فاتحہ اور سورہ ملالینے کے بعد تین تکبیریں کہے۔ف۔ یعنی عید کی زائد تکبیریں۔مع۔ ہاتھوں کو اٹھاتے ہوئے ویرکع الخ پھر چوتھی تکبیر کہتے ہوئے رکوع میں جائے۔ف۔ ان کی زائد تکبیریں واجب ہیں، یہاںتک کہ اپنے اختیار سے چھوڑنے سے یا بھول جانے کی وجہ سے ایک تکبیر کے چھوٹنے کی وجہ سے بھی سجدہ سہو واجب ہوگا، اور زیلعیؒ نے تبیین میں کہا ہے کہ یہ چوتھی تکبیر بھی ان تینوں کے ساتھ ملالی گئی ہے اسی وجہ سے اس تکبیر کے چھوٹنے کی صورت میں بھی سجدہ سہو لازم ہوتا ہے، لیکن کہا گیا ہے کہ قول اصح یہ ہے کہ یہ تکبیر فی نفسہٖ سنت ہے الحاصل کل نو تکبیروں میں سے پہلی تکبیر افتتاح اور رکوع کی دو تکبیروں کے علاوہ باقی زائد تکبیریں ہمارے نزدیک کل چھ ہیں۔م۔

و ھذا قول ابن مسعودؓ وھو قولنا......الخ

یہ قول حضرت ابن مسعودؓ کا ہے۔ف۔ یعنی ان زائد تکبیروں کو مذکورہ صورت سے کہنا، چنانچہ ابن ابی شیبہؒ نے روایت کی ہے **حدثنا ھیثم اخبرنا مجالد عن الشعبی عن مسروق قال کان عبداللہ بن مسعود الخ**، ترجمہ یہ ہے کہ مسروقؒ نے کہا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہمیں عیدین میں تکبیریں سکھاتے تو کل نو تکبیریں جن میں سے پہلی رکعت میں پانچ اور دوسری رکعت میں چار اور دونوں قرأتوں کو ملاتے تھے، چنانچہ پہلی رکعت میں ایک تکبیر تحریمہ اور تین زائد تکبیریں اور ایک رکوع کی، اس طرح کل پانچ ہوئیں اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد تین زائد تکبیریں اور چوتھی رکوع کی۔مع۔

عبدالرزاقؒ نے کہا ہے **اخبرنا سفیان الثوری عن ابی اسحق عن علقمہ والاسود ان ابن مسعودؓ کان یکبر تسعا** کہ علقمہ واسودؒ دونوں نے کہا ہے عبداللہ بن مسعودؓ نو تکبیریں کہتے، پہلی رکعت میں چار قراءت سے پہلے پھر تکبیر کہہ کر رکوع میں جاتے، اور دوسری رکعت میں قراءت سے فارغ ہونے کے بعد چار تکبیریں کہہ کر رکوع کر لیتے، **اخبرنا معمر عن ابی اسحق عن علقمہ والاسود قالا کان عبداللہ ابن مسعود جالسا الخ**، یعنی عبدالرزاقؒ نے اس اسناد سے علقمہ واسود سے روایت کی ہے کہ دونوں نے بیان فرمایا ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیٹھے تھے اور آپ کے پاس حذیفہؓ وابو موسی اشعریؓ بھی بیٹھے تھے کہ سعید بن العاصؓ نے نماز عید کی تکبیروں کے بارے میں پوچھا تو حذیفہؓ نے فرمایا کہ اشعری سے پوچھ لو، اشعریؓ نے

فرمایا کہ تم عبداللہ بن مسعودؓ سے دریافت کرو کہ یہ ہم سب میں مقدم اور بزرگ ہیں اور ہم سب میں زیادہ عالم ہیں، اس لئے انہوں نے پوچھا تو ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ چار تکبیریں کہو پھر قراءت کرو، پھر تکبیر کہہ کر رکوع کرو، پھر دوسری رکعت میں کھڑے ہو کر قراءت کرو پھر قراءت کے بعد چار تکبیریں کہو۔ مفع۔

بلااختلاف یہ سب سندیں صحیح ہیں، یہانتک کہ صحیحین کی سندیں ہیں۔ م۔ ابراہیم نخعی سے کتاب آثار میں نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے ولید بن عقبہؓ کو اسی طرح بتلایا ہے، اور ترمذیؒ نے ابن مسعودؓ کا کلام نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ اسی طرح اور دوسرے کئی صحابہ کرام سے بھی منقول ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ نے اسے صحابہ کرام کی ایک جماعت کے سامنے بیان کیا تو یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے، اس طرح یہ روایت مرفوع حدیث کے حکم میں ہوئی، عینیؒ نے لکھا ہے کہ حضرت ابو موسی اشعریؓ و حذیفہؓ بن یمان و عقبہ بن عامرؓ و ابن الزبیرؓ و ابو مسعود بدریؓ و حسن بصریؒ و ابن سیرینؒ کا یہی قول ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اس میں علقمہؒ اسودؒ اور ابراہیم نخعیؒ کے علاوہ عبداللہ بن مسعودؓ کے تقریباً آٹھ سو شاگردوں کے متفق ہونے سے بہت بڑی جماعت کا متفق علیہ قول ہوا ہے، اور ابن ابی شیبہؒ نے کہا ہے کہ **حدثنا هشيم اخبرنا خالد الحذاء عن عبدالله بن الحارث عن ابن عباس قال ﷺ بنا ابن عباس العيد فكبر تسمع تكبيرات الخ** یعنی عبداللہ بن الحارث نے کہا ہے کہ ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ نے ہمیں عید کی نماز پڑھائی تو حضرت ابن مسعودؓ کے قول کے مطابق نو تکبیریں کہیں، (پوری حدیث) تو ابن عباسؓ کی یہ روایت بھی ابن مسعودؓ کے فرمان کے موافق ہوئی، اس کی مذکورہ سند حسن ہے، مصنفؒ نے فرمایا کہ **هو قولنا الخ** ہمارا بھی یہی قول ہے۔ ف۔ یعنی جس طرح ابن مسعودؓ نے بیان کیا ہے یہی ہمارا مذہب ہے، اسی طرح روایت سفیان ثوری کی اور ایک روایت احمدؒ سے بھی ہے۔ ع۔

و قال ابن عباسؓ يكبر فى الاولى الافتتاح و خمسا بعدها وفى الثانية يكبر خمسا ثم يقرأ و فى رواية يكبر اربعاً وظهر عمل العامة اليوم بقول ابن عباسؓ لامر بنيه الخلفاء فاما المذهب فالقول الاول لان التكبير ورفع الا يدى خلاف المعهود فكان الاخذ بالاقل اولى.

ترجمہ:- اور ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ پہلی ایک تکبیر نماز شروع کرنے کے لئے کہی جائے گی اور اس کے بعد پانچ تکبیریں کہی جائے گی، اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہہ کر قراءت کی جائے گی، ایک اور روایت میں ہے کہ چار تکبیریں کہی جائے گی، اور آجکل حضرت ابن عباسؓ کے قول پر عام لوگوں کا عمل ظاہر ہوا ہے ان کی اولاد و خلفاء کے حکم کی وجہ سے، لیکن پہلا قول مذہب ہے، کیونکہ زائد تکبیریں اور ہاتھوں کو اٹھانا معہود طریقہ کے خلاف ہے، اس لئے کم مقدار کو لینا ہی بہتر ہوگا۔

توضیح:- عید کی زائد تکبیروں کے بارہ میں مذاہب کی تفصیل

و قال ابن عباسؓ يكبر فى الاولى الافتتاح و خمسا بعدها وفى الثانية يكبر خمسا ثم يقرأ......الخ -

اور ابن عباسؓ نے کہا ہے کہ پہلی رکعت میں ایک تکبیر افتتاح کے لئے کہے اور اس کے بعد پانچ تکبیریں کہے۔ ف۔ اور قراءت کے ختم پر ایک تکبیر رکوع کے لئے کہے، تو اس طرح کل سات تکبیریں ہوں گی وفی الثانیۃ الخ اور دوسری رکعت میں پانچ تکبیریں کہہ کر قراءت کرے۔ ف۔ پھر قراءت کے بعد چھٹی تکبیر کہہ کر رکوع کرے اس طرح کل تیرہ تکبیریں ہوں گی۔

و فى رواية يكبر اربعاً وظهر عمل العامة اليوم بقول ابن عباسؓ لامر بنيه الخلفاء......الخ

اور ایک روایت میں ہے کہ چار تکبیریں کہے۔ ف۔ پھر قراءت کرے پھر رکوع میں جانے کے لئے تکبیر کہے، اس طرح کل بارہ تکبیریں ہو جائیں گی، ان دونوں روایتوں کی ابن ابی شیبہؒ نے اسناد کی ہے، اور تیسری روایت ہمارے مذہب کے مطابق اوپر ذکر

کی جاچکی ہے، اس طرح حضرت ابن عباسؓ کی روایتیں مضطرب ہو گئیں لیکن حضرت ابن مسعودؓ کی روایت میں کوئی اضطراب نہیں ہے، اور ابن عباسؓ ان سب میں اقدم اور اعلم بھی ہیں اس لئے اسی ابن مسعودؓ کی روایت کو ترجیح ہو گی۔ م۔ مف۔ ع۔ **وظهر عمل العامة الخ** اور عام لوگوں کا عمل بالعموم ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ظاہر ہوا ہے ان کی اولاد جو خلفاء تھے ان کے حکم کرنے کی وجہ سے۔ ف۔

یعنی اس وقت میں لوگوں کا عمل عموماً حضرت ابن عباسؓ کے قول کے مطابق ہے کیونکہ خلفائے عباسیہ جو حضرت ابن عباسؓ کی اولاد سے ہیں انہوں نے اپنے دادا کے قول کے موافق لوگوں کو عمل کرنے کا حکم دیا، اور نماز عید کے لئے امام یا اس کے خلیفہ کا ہونا شرط ہے اس لئے خلیفہ کے حکم کے مطابق یہ عمل عوام میں پھیل گیا یہانتک کہ امام ابو یوسفؒ نے بغداد میں اسی طرح امام محمدؒ نے بھی خلیفہ ہارون رشید عباسی کو اسی حکم کے موافق نماز پڑھائی کیونکہ یہ مسئلہ اجتہادی ہے تو ان حضرات نے اس حکم کے مطابق نماز پڑھائی اس میں امام کی اطاعت واجب ہوتی ہے، خلفائے عباسیہ نے تو ہر ایک کو اپنے فرسودات اور احکام میں یہی حکم دیا ہے کہ عید کو ابن عباسؓ کے قول کے موافق ادا کریں۔ مع۔ خلاصہ یہ ہوا کہ لوگوں میں اس کے مطابق عملدر آمد پھیل جانے کی یہ وجہ ہوئی تھی یہانتک کہ حنفیہ بھی اسی کے پابند ہو گئے۔

فاما المذهب فالقول الاول لان التكبير ورفع الايدى خلاف المعهود فكان الاخذ بالاقل اولى......الخ

لیکن اصل مذہب احناف وہ پہلا قول ہی ہے۔ ف۔ یعنی ابن مسعودؓ کا قول۔ ف۔ جس میں زائد تکبیروں کی کمی ہے۔ **لان التكبير الخ** کیونکہ معمول کے خلاف زائد تکبیریں کہنا اور ہاتھوں کو اٹھانا سب خلاف دستور و معمول ہے **فكان الاخذ الخ** تو کم سے کم تکبیروں پر عمل کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ ف۔ کیونکہ جتنی کم ہونگی اور ان میں اتفاق ہو تو وہ یقینی ہیں اس میں کوئی شک نہیں رہتا ہے، اسی پر اکتفاء کرنا بہتر ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ کلام کے ظاہر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن مسعودؓ کا قول مختار اور اولی ہے، اور اگر ابن عباسؓ کے قول پر عمل کیا جائے تو بھی جائز ہوگا، ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہمارا قول رسول اللہ ﷺ کی بعض حدیث کے موافق ہے، اور کسی حدیث سے امام شافعیؒ کے قول کی تائید ہوتی ہے، اور یہی بات صحابہ کرامؓ کے اقوال سے بھی معلوم ہوتی ہے، چنانچہ عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عیدین کی پہلی رکعت میں سات تکبیریں اور دوسری رکعت میں قراءت سے رکوع کی دو تکبیروں کے علاوہ پانچ تکبیریں کہتے، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے، حاکمؒ نے روایت کرنے کے بعد کہا ہے کہ اس کی اسناد میں ابن لہیعہ راوی تنہا اور متفرد ہیں، اور امام مسلمؒ نے اس راوی کی روایت سے روایت کی شہادت ذکر کی ہے اور کہا ہے کہ اس باب میں ابن عمر و ابوہریرہؓ سے روایت ہے، لیکن اس کی اسناد میں خرابی ہے، عبداللہ بن عمر ابن العاصؓ سے بھی حضرت عائشہؓ کی حدیث کی مثل مروی ہے، ابوداؤد، ابن ماجہ اور دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے۔

امام نوویؒ نے کہا ہے کہ ترمذیؒ نے کتاب العلل میں کہا ہے کہ میں نے امام بخاریؒ سے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ یہ حدیث صحیح ہے، کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف المزنی عن ابیہ عن جدہ بھی اسی کے مثل روایت کی ہے، ترمذی اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے، ترمذیؒ نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اور اس باب میں سب سے بہتر یہی حدیث ہے، اور علل میں بخاریؒ سے نقل کیا ہے کہ اس باب میں اس سے بڑھ کر صحیح حدیث نہیں ہے، اور میرا قول بھی یہی ہے، اس کی تائید دوسری کئی حدیثوں سے ہوتی ہے، سنن ابی داؤد میں اس کے معارض و مقابل بھی روایت موجود ہے حضرت سعید بن العاص نے ابو موسیٰ اشعری اور حذیفہ بن الیمانؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ عید الاضحیٰ اور عید الفطر میں تکبیریں کس طرح کہتے تھے، تو ابو موسیٰؓ نے فرمایا چار تکبیریں مثل جنازہ کے فرماتے تھے، تب حذیفہؓ نے کہا کہ ابو موسیٰؓ سچ کہا، پھر ابو موسیٰؓ نے فرمایا کہ میں بھی اس طرح چار تکبیریں کہا کرتا تھا جبکہ میں بصرہ میں حاکم کی حیثیت سے تھا، حضرت حذیفہؓ کی تصدیق سے یہ حدیث دو حدیثوں کے

برابر ہوگئی، پھر ابوداؤد نے روایت کے بعد سکوت کیا اور منذریؒ نے مختصر میں بھی سکوت کیا تو یہ ان دونوں کی طرف سے حدیث کی تصحیح یا تحسین ہے، اور اس بات میں شک بھی نہیں ہے کہ یہ حدیث صحیح یا حسن ہے، اور ابن الجوزیؒ نے تحقیق میں گفتگو کی ہے کہ اس کی اسناد میں عبدالرحمٰن بن ثوبان راوی ضعیف ہیں اور ابن معین واحمد سے ان کا ضعیف ہونا نقل کیا ہے، صاحب تنقیح نے اس اعتراض کو رد کر دیا ہے یہ کہہ کر کہ دوسرے بہت سے لوگوں نے ان کی تائید اور توثیق کی ہے، اور ابن معین نے کہا ہے کہ اس راوی میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ اس کی اسناد میں ابوعائشہ راوی کے متعلق ابن القطان نے کہا ہے کہ میں اس کا حال نہیں جانتا ہوں، اور ابن حزم نے کہا ہے کہ مجہول غیر معروف ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کا صحیح جواب یہ ہوگا کہ تہذیب و تقریب میں ہے کہ ابوعائشہؓ جو ابوداؤد کے راوی ہیں وہ ابوعائشہؓ اموی ہیں جو بنوامیہ کے غلاموں میں تھے اور ابوہریرہؓ کے ہم نشیں تھے وہ مقبول ہیں لہٰذا ان پر جہالت کا الزام لگانا اور مجہول کہنا ختم ہوگیا، اس کے علاوہ اصول کے مطابق راوی کا مجہول ہونا کوئی بڑا عیب نہیں ہے۔ م۔ لیکن ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اگر اس الزام کو مان لیں تو ابن لہیعہ کی حدیث بھی ضعیف ہے، بلکہ اس کی اسناد میں اضطراب ہے، یہانتک کہ دار قطنیؒ نے کہا ہے کہ یہ اضطراب ابن لہیعہ کی طرف سے پیدا کیا ہوا ہے، ابن القطان نے دونوں حدیثوں کی صحت سے انکار کر دیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر ہم ظاہری لفظ چھوڑ دیں تو بھی کثیر بن عبداللہ متروک ہیں، امام احمدؒ نے کہا ہے کہ اس بارے میں کوئی حدیث صحیح نہیں ہے۔ الفتح۔ اگر یہ کہا جائے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیث کو تو امام بخاریؒ نے صحیح کہا ہے، عینیؒ نے لکھا ہے کہ ابن معین وغیرہ کافی لوگوں نے اسے ضعیف کہا ہے اور اس میں عبداللہ بن عبدالرحمٰن الطائفی ضعیف ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ ابن حجرؒ نے تقریب میں کہا ہے کہ یہ فی نفسہ صدوق ہیں البتہ انہیں خطاو ہم بھی کرتے ہیں، پھر میں یہ کہتا ہوں کہ وہ حدیث جس میں بارہ تکبیریں بتائی گئی ہیں اور وہ جس میں چھ تکبیریں بتائی گئی ہیں درجہ میں دونوں برابر ہیں، اور امام شافعیؒ نے بارہ تکبیر کی روایت قبول کی جبکہ امام ابوحنیفہؒ نے چھ تکبیر کی روایت پسند کی ہے، اور یہی اولی بھی ہے، کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ خود اور صحابہ و تابعین اور اپنے شاگردوں کی ایک بڑی جماعت کے ساتھ اس پر عمل کرتے رہے، اور ان کی صحیح سندوں کے ساتھ فتوئی بھی دیتے رہے، اس کے علاوہ جن سندوں میں تکبیروں کی زیادتی ہے وہ کم میں اور جن سندوں میں کم تعداد بتائی گئی ہے وہ کم ہے، اس بناء پر جتنی تعداد میں دونوں متفق ہیں وہ تو یقینی ہوئی اور متفق علیہ ہیں، واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

ثم التكبيرات من اعلام الدين حتى يجهربها فكان الاصل فيها الجمع و فى الركعة الاولى يجب الحاقها بتكبيرة الافتتاح لقوتها من حيث الفرضية والسبق و فى الثانية لم يوجد الاتكبيرة الركوع فوجب الضم اليها والشافعى اخذ بقول ابن عباس الا انه حمل المروي كله على الزوائد فصارت التكبيرات عنده خمسة عشر اوستة عشر.

ترجمہ:۔ پھر تکبیریں دین کی اہم چیزوں سے ہیں اس لئے انہیں بلند آواز سے ادا کیا جاتا ہے اس بناء پر ان میں یہی بات اصل قرار پائی کہ اصل اور زائد تمام تکبیروں کو ایک ساتھ ادا کیا جائے، اور اسی بناء پر پہلی رکعت میں ان زائد تکبیروں کو اصل تکبیر یعنی تکبیر اولی کے ساتھ ملا کر کہنا چاہئے کیونکہ یہ تکبیر تحریمہ اپنی جگہ پر فرضیت اور سبقت کی بناء پر قوی ہے، اور دوسری رکعت میں قوی تکبیر سوائے تکبیر رکوع کے نہیں پائی گئی ہے اس لئے ان زائد تکبیروں کو اسی تکبیر سے ملانا واجب ہوا، اور امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے قول پر عمل کیا ہے، البتہ انہوں نے ان تمام تکبیروں کو جو روایات میں پائی گئی ہیں زائد تکبیروں پر محمول کیا ہے، اس طرح ان کے ہاں کل تکبیریں پندرہ یا سولہ ہوئیں۔

توضیح:۔ عیدین کی کل زائد تکبیروں اور ان کے کہنے کے مواقع، اس میں اختلاف ائمہ

ثم التكبيرات من اعلام الدين حتى يجربها فكان الاصل فيها الجمع......الخ

معلوم ہونا چاہئے کہ تکبیریں دین کی اہم نشانیوں میں سے ہیں، اسی بناء پر انہیں بلند آواز سے کہا جاتا ہے۔ف۔ تا کہ دین کا جھنڈا بلند ہو **فكان الاصل الخ** تو اصل کے اعتبار سے ان تمام تکبیروں کو ایک ساتھ ہونا چاہئے۔ف۔ اصل تکبیروں کے ساتھ ہی زائد تکبیریں بھی ہوا کریں، چونکہ یہ تکبیریں دو رکعتوں میں ثابت ہیں، **وفی الركعة الخ** اور پہلی رکعت میں ان تکبیروں کو تکبیر تحریمہ سے ملانا اس لئے واجب ہے کہ فرضیت اور سبقت کے اعتبار سے تکبیر تحریمہ قوی ہے۔ف۔ یعنی تکبیر تحریمہ فرض بھی ہے اور ان تکبیرات سے مقدم بھی ہے اس لئے ان تکبیروں کو اسی تکبیر تحریمہ سے ملانا چاہئے اور رکوع کی تکبیر کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔

و فى الثانية لم يوجد الا تكبيرة الركوع فوجب الضم اليها......الخ

اور دوسری رکعت میں صرف رکوع کی تکبیر قوی ہے اس لئے اسی تکبیر کے ساتھ زائد تکبیروں کو ملانا واجب ہوا۔ف۔ پہلی رکعت کی زائد تکبیروں کے بعد قراءت رکوع و سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد اب دوسری رکعت شروع ہوئی ہے ایسی صورت میں اگر ان زائد تکبیروں کو قراءت سے مقدم کر دیا جائے تو دونوں رکعتوں کی قرائتیں ایک ساتھ نہ ہوں گی جیسا کہ مسروقؒ کی اس روایت سے اشارہ معلوم ہو رہا ہے جو کہ عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے۔م۔ عیدین میں رکوع کی تکبیر واجب ہوتی ہے۔ الانفع۔ اسی طرح عیدین میں لفظ اکبر کہنا ہی واجب ہے چنانچہ اگر اس کے عوض عیدین میں اللہ اجل یا اللہ اعظم کسی نے کہہ دیا تو اس پر سجدہ سہو لازم ہوگا، اور دوسری نمازوں کا یہ حکم نہیں ہے۔المنافع۔ھ۔

والشافعي اخذ بقول ابن عباس الا انه حمل المروى كله على الزوائد فصارت......الخ

اور امام شافعیؒ نے حضرت ابن عباسؓ کا قول اختیار کیا ہے۔ف۔ اس طرح انہوں نے زیادہ تعداد میں تکبیر کو ادا کرنے میں احتیاط سمجھی ہے، کہ کم تعداد تو از خود اس میں داخل ہو جائے گی، **الا انه حمل الخ** ساتھ ہی روایتوں میں جتنی تکبیروں کا ذکر ہے ان تمام کو زائد کہا ہے۔ف۔ مذکورہ تمام تکبیریں بارہ یا تیرہ ہوئیں ان سب کو زائد قرار دیا ہے، مگر تکبیر تحریمہ اور دو رکوع کی دو تکبیریں اسی تعداد سے خارج رہیں۔م۔ **فصارت التكبيرات الخ** اس طرح امام شافعیؒ کے نزدیک کل پندرہ یا سولہ تکبیریں ہوں گی، یعنی اگر صرف زائد تکبیریں ۱۲ ہوئیں تو ان میں مزید تین جمع کرنے پر پندرہ ہو جائیں گی، اور اگر وہ تیرہ تھیں تو مزید تین ملانے سے کل سولہ ہو جائیں گی، دوسری یہ ہے کہ ان شوافعؒ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں قراءت سے پہلے تکبیریں ہوں گی۔م۔

قال ويرفع يديه فى تكبيرات العيدين يريد به ماسوى التكبير فى الركوع لقوله صلى ﷺ لا ترفع الا يدى الا فى سبع مواطن وذكر من جملتها تكبيرات الاعياد وعن ابى يوسف انه لايرفع والحجة عليه مارويناه.

ترجمہ:- اور مصنفؒ نے کہا ہے کہ عیدین کی تکبیروں میں امام اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا کرے، اس سے مراد وہ تکبیریں ہیں جو رکوع کی تکبیروں کے علاوہ ہیں رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ سات مواقع کے ماسوا ہاتھ نہ اٹھائے جائیں اور ان مواقع میں سے عید کو بھی ذکر کیا ہے، اور امام ابو یوسفؒ سے منقول ہے کہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں، ان کے برخلاف ہماری دلیل وہ روایت ہے جو ہم نے ابھی بیان کی ہے۔

توضیح:- تکبیرات عیدین میں دونوں ہاتھوں کو اٹھانا، حدیث سے دلیل، چند ضروری مسائل ہو، دو تکبیر کے درمیان مستحب ذکر، تکبیرات کے درمیان فصل کرنا، اگر مقتدی نے امام کے ساتھ کچھ تکبیریں نہیں پائی ہو، امام کو پہلی رکعت کی، قراءت میں پایا، لاحق کا حکم، مترجم کی طرف سے وضاحت، مسبوق کا حکم، اگر امام کو رکوع میں پایا ہو، مقتدی اور امام کی متابعت، تشہد میں پایا، پوری یا تھوڑی فاتحہ پڑھی، اور یاد آیا کہ تکبیر

نہیں کی، خطبہ اور سورہ پڑھ کر یاد آیا، ایک رکعت چھوٹی، نماز میں رائے بدلنا

قال ویرفع یدیه فی تکبیرات العیدین یرید به ماسوی التکبیر فی الرکوع......الخ

اور مصنفؒ نے کہا ہے کہ عیدین کی تکبیروں میں دونوں ہاتھ اٹھائے یرید به الخ مراد یہ ہے کہ تکبیر رکوع کے علاوہ زائد تکبیریں جو صرف عیدین کی تکبیریں ہیں ان میں ہاتھ اٹھائے۔م۔اگر امام کے مسلک میں ہاتھوں کے اٹھانے کا حکم نہ ہو تو بھی مقتدی اپنے ہاتھ اٹھائے۔الغاشیہ۔لقوله الخ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ صرف سات جگہوں میں ہاتھ اٹھائے جائیں۔ آخر تک. وذکر الخ اور ان سات جگہوں میں سے عید کی تکبیروں کو بھی ذکر کیا ہے وعن ابی یوسفؒ الخ اور امام ابویوسفؒ سے مروی ہے کہ ہاتھ نہ اٹھائے جائیں۔ف۔جیسا کہ کرخی اور ابو بکر الرازی و قدوری و ابونصر البغدادی اور صاحب التحفہ اور حاکم شہیدؒ نے ذکر کیا ہے۔

وعن ابی یوسف انه لایرفع والحجة علیه مارویناه......الخ

اور امام ابویوسفؒ کے خلاف ہماری دلیل وہی ہے جسے ہم نے کچھ پہلے ذکر کر دیا ہے۔ف۔یعنی لایرفع الایدی الخ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ حدیث باب صفة الصلوة میں گذر چکی ہے، مگر اس میں عید کی تکبیروں کا کوئی ذکر نہ تھا۔واللہ اعلم۔بہت ممکن ہے کہ مصنفؒ کو ایسی کوئی روایت مل چکی ہو، اور امام ابویوسفؒ کے قول پر کوئی اشکال نہیں ہے۔مف۔اور ظاہر یہ ہے کہ مصنفؒ نے شرح مبسوط سے نقل کیا ہے، مگر اس سے احتجاج نہیں ہو سکتا ہے۔اچھی طرح سمجھ لیں۔ عینیؒ نے لکھا ہے کہ اگر یہ کوئی کہے تم نے دوسری رکعت کے رکوع کی تکبیر کو زائد تکبیروں سے ملا دیا ہے یہاں تک کہ اس رکعت کے رکوع کی تکبیر کو واجب بھی کہدیا ہے، تو رکوع کی تکبیر میں ہاتھوں کے اٹھانے کے قائل کیوں نہ ہوئے، تو اس کا جواب دیا ہے کہ رکوع کی تکبیر کو واجب کہنے میں ایک حد تک احتیاط ہے، بخلاف ہاتھ اٹھانے کے کہ وہ خلاف قیاس ہے، اس لئے اس میں احتیاط نہیں ہے۔مع۔

چند ضروری مسائل

مبسوط میں ہے کہ دو تکبیروں کے درمیان کوئی بھی ذکر مسنون نہیں ہے۔ع۔اور تین تسبیحوں کے درمیان ان تکبیروں میں فصل کرنا چاہئے، کیونکہ زیادہ بھیڑ کی وجہ سے تکبیروں میں امتیاز رہنا ضروری ہے۔ تفع۔ایک شخص ایسے وقت میں جماعت میں شریک ہوا جبکہ کچھ تکبیریں کہی جا چکی ہیں، اسے چاہئے کہ جتنی تکبیریں پائے اس میں شرکت کر کے باقی تکبیر کہہ کر امام کے ساتھ رکوع میں شرکت کر لے۔ع۔اگر کوئی امام کو پہلی رکعت کی قراءت میں پائے تو اپنے مذہب کے مطابق تکبیرات کہہ لے، جو شخص لاحق ہو گیا ہو وہ چھوٹی ہوئی نماز ادا کرنے میں اتنی تکبیریں کہے جو امام کا مذہب ہے۔ع۔میں مترجم کہتا ہوں کہ ہمارے مذہب میں قراءت سننا فرض ہے اس لئے چھوٹی ہوئی تکبیروں کو امام کی قراءت کے وقت اس طرح کہہ لے جس سے قراءت سننے میں کوئی خلل نہ آئے، ورنہ ایک مسلم فرض کو ایک محتمل واجب کے لئے چھوڑنا لازم آئے گا، اس سے پہلے میں تنبیہ کر چکا ہوں، ویسے میری نظروں سے اس کی تفصیل کہیں نہیں گزری ہے۔واللہ اعلم۔م۔

جس شخص کی ایک رکعت چھوٹ گئی ہو وہ اس کو تنہا ادا کرتے وقت اپنے مذہب کے مطابق تکبیریں کہہ لے۔ع۔اگر امام کو رکوع کی حالت میں پایا اور رکوع کے پانے کا اطمینان ہو تو تکبیریں کہہ لینے کے بعد رکوع میں شریک ہو، اور اگر اطمینان نہ ہو تو رکوع کی حالت میں ان تکبیروں کو بغیر ہاتھ اٹھائے اپنے مذہب کے مطابق تکبیریں کہے کیونکہ وہ مسبوق ہے، اور اگر رکوع میں کچھ تکبیریں کہنے پایا تھا کہ امام نے اپنا سر اٹھا لیا تو وہ بھی امام کی موافقت میں کھڑا ہو جائے کیونکہ ایسا کرنا فرض ہے، اور باقی تکبیریں ختم ہو گئیں، مقتدی کو چاہئے کہ ان تکبیروں کی ادائیگی میں امام کی موافقت کرے اگرچہ حنفی مسلک کے اعتبار سے وہ زائد ہوں، کیونکہ موافقت فرض ہے اور تکبیر کے اعداد میں اختلاف اجتہاد کی وجہ سے ہے۔

اور اگر امام نے اتنی تکبیریں کہیں جو صحابہ کرام کی بتائی تکبیروں سے بھی زیادہ ہو جائیں تو ان میں امام کی موافقت نہ کرے، اور بتائی ہوئی تکبیروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ کل تیرہ ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ سولہ ہے، لہٰذا اتنی تعداد تک موافقت کرے، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ مقتدی امام کے قریب ہو اور براہ راست امام کی آواز اور نشیب و فراز کو سنتا اور دیکھتا ہو، اور اگر دوسرے مکبروں کے توسط سے سنتا ہو تو آواز کے ساتھ کہتا جائے اس خیال سے کہ مکبر نے سننے میں غلطی کی ہو اس لئے پہلے مخالفت کی اور اب موافقت کر رہا ہے، جس کسی نے امام کو تشہد کی حالت میں پایا تو بالاتفاق وہ عید کی قضاء کرے (اگر موقع ملے) بخلاف جمعہ کے، اگر پوری سورہ فاتحہ یا تھوڑی سی پڑھ کر یاد آیا کہ اس نے تکبیر زائد نہیں کہی ہے تو تکبیریں کہہ کر دوبارہ فاتحہ پڑھ لے، اور اگر فاتحہ کے ساتھ سورہ بھی ملا چکا ہو تو صرف تکبیریں کہہ لے، اور قراءت دوبارہ نہ کرے، کیونکہ قراءت پوری ہو چکی ہے، اور اب ان کی ترتیب ساقط ہو گئی ہے، اگر ایک رکعت چھوٹ گئی ہو تو حنفی حضرت ابن مسعودؓ کے قول کے مطابق پہلے قراءت بعد میں تکبیر کہے، یہی ظاہر الروایۃ ہے، اور نوادر میں ہے کہ پہلے تکبیریں کہہ لے پھر قراءت کرے کیونکہ اذکار اور تکبیرات کے سلسلہ میں بالاجماع یہ رکعت اس کی پہلی نماز ہے۔ ھ۔ مف۔

پھر ابن الہمامؒ نے اس شخص کے بارے میں فرمایا ہے جو درمیان نماز میں اپنی رائے بدل لی ہو مثلاً پہلی رکعت میں ابن مسعودؓ کے قول کے مطابق نماز پڑھی، پھر رائے بدل کر حضرت علیؓ یا حضرت ابن عباسؓ کے قول پر نماز پڑھنے لگا تو دوسری رکعت میں نئی رائے کے مطابق ہی نماز پڑھے گا، اب میں مترجم کہتا ہوں کہ تاتارخانیہ میں اس رائے کو جامع کبیر امام محمدؒ سے نقل کیا ہے، لیکن یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جن کو مسائل سمجھنے کی کسی حد تک تمیز بھی ہے کیونکہ مقلد محض کی کوئی رائے معتبر نہیں ہوتی ہے۔ م۔

قال ویخطب بعد الصلوۃ خطبتین بذلک ورد النقل المستفیض یعلم الناس فیھا صدقۃ الفطر واحکامھا لانھا شرعت لا جلہ ومن فاتتہ صلوۃ العید مع الامام لم یقضھا لان الصلوۃ بھذہ الصفۃ لم تعرف قربۃ الا بشرائط لاتتم بالمنفرد.

ترجمہ:- کہا اور نماز کے بعد دو خطبے دے اسی طرح سے مشہور روایت پائی گئی ہے، اس خطبہ میں لوگوں کو صدقہ فطر اور اس کے احکام سکھلائے، کیونکہ اسی مقصد کے لئے خطبہ شروع کیا گیا ہے، اور جس شخص کی نماز عید امام کے ساتھ فوت ہو گئی ہو تو اس کی قضاء نہ کرے، کیونکہ مذکورہ صفتوں کے ساتھ نماز نیکی کا سبب نہیں ہے مگر چند شرطوں کے ساتھ جو تنہا آدمی سے پوری نہیں ہو سکتی ہیں۔

توضیح:- خطبہ، مضمون خطبہ، عربی کے سوا دوسری زبان میں خطبہ نماز کے بعد عیدگاہ سے واپسی کا راستہ، دلیل، کسی نے امام کے ساتھ نماز نہ پائی ہو

قال ویخطب بعد الصلوۃ خطبتین......الخ

مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ نماز کے بعد دو خطبے پڑھے۔ ف۔ عید کی نماز کے بعد خطبہ پڑھنا صحیحین وغیرہ کی حدیثوں میں اس کے بارے میں صراحت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے، اور چاروں خلفائے راشدین اور چاروں فقہائے ائمہ، جمہور سلف اور اہل علم کا یہی قول ہے۔ مع۔ اور اگر اس خطبہ کو نماز سے پہلے پڑھ دیا تو خلاف سنت اور مکروہ ہوگا، خطبہ کو دوبارہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ السرخسی و قاضی خان۔ ف۔

بذلک ورد النقل المستفیض......الخ

روایتیں جو اس سلسلہ میں مشہور ہوئی ہیں اسی طرح کی ہیں۔ ف۔ اسی پر عام عمل بھی ہے اور اسی قسم کی روایت بھی مشہور

ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ نقل و روایت تو ضرور مشائع ہے لیکن اس کیفیت سے کہ دو خطبے ہوں اور ان کے درمیان میں تھوڑی دیر کی بیٹھک ہو یہ قابل تسلیم نہیں ہے، سوائے ابن ماجہ کی ایک روایت کے جو حضرت جابرؓ سے منقول ہے، کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر یا اضحیٰ کو تشریف لے گئے پھر کھڑے ہو کر خطبہ پڑھا پھر ذرا سا بیٹھ کر دوبارہ کھڑے ہوئے، نوویؒ نے کہا ہے کہ عید کے خطبہ میں قابل اعتماد عمل یہ ہے کہ جمعہ کے خطبہ پر اس کا قیاس کیا جائے۔ مفع۔ چونکہ عیدگاہ میں منبر نہ تھا اس لئے بعض روایتوں میں سواری پر سے بھی خطبہ دینا مذکور ہے، اور ابن ابی شیبہؒ اور حنیفہؒ کی روایت ابن مسعودؓ میں بھی ہے کہ ابن مسعودؓ نے ولید بن عقبہ بن معیط کو حکم دیا ہے کہ سواری پر سے خطبہ دیں، لہٰذا درمیان خطبہ میں بیٹھنے کے لئے باضابطہ نقل چاہئے، نہیں تو قابل اعتماد بات یہی ہے کہ اسے جمعہ پر قیاس کر لیا جائے۔ م۔ عید کے دن جبانہ (منبر) کو وہاں لیجانا مکروہ ہے لیکن وہاں مستقلاً بنا لینا قول صحیح کے مطابق مکروہ نہیں ہے۔ الغرائب۔ ھ۔ عید کے لئے خطبہ شرط نہیں ہے۔ الخلاصہ۔

اس کی دلیل حضرت عبداللہ بن السائبؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ ہم اب خطبہ پڑھیں گے، جو کوئی جانا چاہے چلا جائے، ابوداؤد، نسائی ماجہؒ نے اس کی روایت کی ہے، جمع النوازل میں ہے کہ جمعہ و نکاح اور نماز استسقاء کے خطبوں کو الحمد للہ یعنی حمد الٰہی سے شروع کرنا چاہئے۔ ع۔ اور تین خطبوں یعنی حج کو۔ ت۔ اور عیدین کے دو خطبوں اور دوسرے خطبہ کی ابتداء میں مسلسل سات تکبیروں سے شروع کیا جائے، اور منیہ میں ہے کہ امام جب منبر پر جائے تو نہ بیٹھے، اور اس پر سے اترتے وقت چودہ تکبیریں کہی جائیں۔ مع۔

ویعلم الناس فیہا صدقۃ الفطر واحکامہا......الخ

اور عید کے خطبہ میں لوگوں کو صدقہ فطر اور اس کے احکام سکھلائے۔ لانہا شرعت الخ کیونکہ خطبہ اسی لئے دیا جانا مشروع ہوا ہے۔ ف۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ صدقہ فطر واجب اور کس شخص پر اور کب اور کب نکالا جائے، اور کیسے دیا جائے، وغیرہ ذلک۔ مع۔ ھ۔ اگر کہا جائے کہ ہندوستان وغیرہ میں عربی زبان سے خطبہ نہیں دینا چاہئے کہ افہام و تفہیم یعنی عوام کو سمجھانے کا مقصد ختم ہو جاتا ہے کہ وہ عربی بالکل نہیں جانتے ہیں، حالانکہ جمعہ میں تو عربی کے ماسوا دوسری زبان میں جائز نہیں ہوتا ہے یا مکروہ تحریمی ہے جیسا کہ عیدین میں ہے، جواب یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کے لئے اتنی عربی سیکھنی تو لازمی اور فرض ہے جس سے کہ ارکان ایمان کو سمجھ سکے، اس کے باوجود اتنی عربی نہ سیکھ کر خود گنہگار ہوتے ہیں ان کی اس کوتاہی اور گناہ کی اعانت میں خطبہ کی زبان نہیں بدلی جائے گی، اس نکتہ کو یاد رکھیں۔ م۔

پھر نماز ختم ہو جانے کے بعد گھر جاتے وقت جس راستہ سے عیدگاہ کو آئے تھے اسے بدل کر دوسرے راستہ سے جانا چاہئے، کیونکہ حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید کے دن ایک راستہ سے تشریف لے گئے اور دوسرے راستہ سے واپس آئے، ابوداؤد ابن ماجہ اور حاکم نے اس کی روایت کی ہے، جابرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عید الفطر اور عید الاضحیٰ میں ایک راستہ سے جاتے اور دوسرے راستہ سے واپس تشریف لاتے تھے، بخاری نے اس کی روایت کی ہے، اور تجنیس میں ہے کہ اس میں حکمت یہ ہے کہ فرمان بردار بندوں کے لئے زمین اور راستہ بھر گواہی دینگے تو دوسرے راستہ سے آنے سے ان گواہوں میں زیادتی ہو جائے گی۔ معف۔

ومن فاتتہ صلوۃ العید مع الامام لم یقضہا لان الصلوۃ بہذہ الصفۃ لم تعرف قربۃ......الخ

جو کوئی عید کی نماز امام کے ساتھ نہ پڑھ سکے تو وہ اس نماز کی قضاء نہیں کرے گا۔ ف۔ اگرچہ اس مقتدی نے خود نماز فاسد کر دی ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ امام یا اس کے نائب جہاں جہاں ہیں ان میں سے کہیں بھی جماعت نہ ملے تو اس شخص پر قضاء لازم نہیں ہے، لان الصلوۃ الخ اس لئے کہ بیان کی ہوئی صفتوں کے ساتھ نماز قربت الٰہی کا ذریعہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس کی چند دوسری شرطیں بھی پائی جاتی ہوں، اور ان شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ پوری جماعت ہو کہ تنہا آدمی عید کی

نماز نہیں پڑھ سکتا ہے۔ف۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس نماز کو قربت الہی کے لئے عبادت ماننا ہمیں تمام بتائی ہوئی شرطوں کے ساتھ ہمیں معلوم ہوا ہے، اور یہ تمام شرطیں تنہا آدمی سے پوری نہیں ہو سکتی ہیں، پھر بغیر شرطوں کے ایسی نماز کے قربت الہی ہونے کا ہمیں علم نہیں ہے تو اس نماز کی قضاء بھی لازم نہ ہوئی۔

فان غم الهلال و شهدوا عند الامام برؤية الهلال بعد الزوال، صلى العيد من الغدلان هذا تاخير بعذر، و قد ورد فيه الحديث، فان حدث عذر يمنع من الصلوٰة في اليوم الثاني لم يصلها بعده، لان الاصل فيها ان لا تقضى كالجمعة الاانا تركناه بالحديث وقد ورد بالتاخير الى اليوم الثاني عندالعذر.

ترجمہ:- پھر اگر چاند ابر میں چھپ گیا اور لوگوں نے زوال کے بعد امام کے سامنے جاکر چاند ہونے کی گواہی دی تو وہ عید کی نماز دوسرے دن پڑھے گا، کیونکہ نماز میں یہ تاخیر مجبوری کی وجہ سے ہوئی ہے، اور اسی صورت کے بارے میں حدیث مذکور واقع ہوئی ہے، اس کے بعد اگر دوسرے دن بھی کوئی خاص مجبوری ہو جائے تو اب اس کے بعد عید کی نماز نہ ہوگی، کیونکہ اس مسئلہ میں اصل تو یہی ہے کہ قضاء نہیں کی جائے مثل جمعہ کے، مگر ہم نے حدیث کی موجودگی کی بناء پر اس کے خلاف کیا ہے (اور دوسرے دن بھی پڑھنے کی اجازت دی ہے)۔

توضیح:- چاند نکلنے کی تاریخ میں ابر، امام کے سامنے چاند دیکھنے کی گواہی، کسی عذر کی بناء پر دوسرے دن بھی نماز نہ ہو سکی

فان غم الهلال و شهدوا عند الامام برؤية الهلال بعد الزوال......الخ

اگر چاند ابر میں چھپ گیا۔ف۔ جیسے بہت زیادہ گرد و غبار میں چھپ گیا، اور اس بات کا احتمال ہوا کہ شاید چاند نکل آیا ہو مگر نظر نہیں آیا، یہ بات صرف ۲۹ تاریخ کو ہی ممکن ہے، بالآخر کچھ لوگوں نے دوسرے دن روزے رکھ لئے اس کے بعد کچھ لوگوں نے چاند ہونے کی گواہی دی۔وشهد واعند الامام الخ اور لوگوں نے امام کے سامنے زوال کے بعد چاند دیکھنے کی گواہی دی۔ف۔ یا زوال کے قبل ہی گواہی دی مگر ایسے وقت میں اس کے بعد اعلان کر کے لوگوں کو جماعت میں شرکت کے لئے جمع کرنے کا موقع نہ رہا۔ التبیین۔ اور امام نے بھی ان لوگوں کی چاند کی گواہی مان لی تو تمام روزہ دار اپنا اپنا روزہ توڑ دے۔

صلى العيد من الغد لان هذا تاخير بعذر......الخ

اور امام دوسرے دن نماز پڑھے۔ف۔ یعنی جماعت کے ساتھ پڑھے، اور طحاویؒ نے شرح الآثار میں کہا ہے کہ یہ قول امام ابو یوسفؒ کا ہے، اور امام شافعیؒ اور احمدؒ کا اصح قول ہے، اور امام ابو حنیفہؒ و مالکؒ کے نزدیک قضاء نہیں ہے۔ مع۔ اس بناء پر یہ مسئلہ امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق ہوا جو مذہب کے متون کتابوں میں ہے کہ نماز عید الفطر دوسرے دن پڑھی جا سکتی ہے، لان ہذا الخ کیونکہ یہ تاخیر غیر اختیاری یا سماوی عذر کی بناء پر ہے، اور اسی کے بارے میں حدیث مذکور منقول ہے۔ف۔ یہ حدیث عید کے وقت کے بیان میں گذر چکی ہے، اور جب حدیث صحیح ہو گئی اور اس میں کوئی اجتہاد نہیں ہے سوائے اسی ظاہری معنی کے اعتبار سے، اس لئے امام اعظمؒ کا یہی مذہب ہوا، بخلاف اس کے جو زمانہ میں کچھ جاہل یہ گمان کرتے ہیں کہ جو بخاری اور مسلم وغیرہ کی حدیث پائی بغیر کسی قسم کے اجتہاد کے مذہب کا قول مخالف بتلاتے ہیں حالانکہ مذہب اس کے بالکل موافق ہے، لیکن جہلاء اس بات کو نہیں جانتے ہیں۔م۔ اگر لوگوں نے زوال سے پہلے ہی چاند ہونے کی خبر ایسے وقت میں دی لوگوں کا نماز کے لئے جمع ہونا بھی ممکن ہو تو اسی دن نماز پڑھ لینی چاہئے کیونکہ تاخیر جائز نہیں ہے، اور زیلعیؒ نے لکھا ہے کہ عید الفطر کی تاخیر عذر کے بغیر جائز نہیں ہے، اور اگر ایسے دن میں عید کی نماز لوگوں نے پڑھی کہ اس دن بہت زیادہ ابر تھا، مگر ابر کے چھٹنے کے بعد معلوم ہوا کہ زوال کے بعد نماز پڑھی گئی ہے، یا زوال کے بعد کسی طرح یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز کے وقت امام بغیر وضوء کے تھا تو امام دوسرے دن

نماز پڑھادے۔التبیین۔ھ۔اب گواہوں کی تعداد اور کیفیت کا بیان انشاءاللہ تعالی کتاب الصوم میں آئے گا۔م۔

فان حدث عذر یمنع من الصلوۃ فی الیوم الثانی لم یصلھا بعدہ......الخ

اور اگر کوئی عذر پیدا ہو جائے۔ف۔اگرچہ عذر سماوی اور بے اختیار ہو، یمنع الخ جو دوسرے دن بھی نماز عید سے مانع ہو۔ف۔ یا نماز پڑھ کر بعد زوال ظاہر ہوا کہ امام بے وضوء ہو گیا تھا مثلاً کسی جگہ کانٹا لگ گیا اور چھل گیا جس سے ذرا خون نکل کر بہہ گیا تھا لم یصلھا الخ تو اس کے بعد اس نماز کو نہیں پڑھے گا۔ف۔نہ ادا کے طور پر اور نہ قضاء کے طور پر، لان الاصل الخ کیونکہ نماز عید میں اصل تو یہی ہے جمعہ کی طرح اس کی بھی قضاء نہ کی جائے۔ف۔ جبکہ جمعہ کا وقت گذر جائے، اسی طرح جبکہ عید کے دن نماز ادا نہیں کی گئی تو دوسرے دن اس کی بھی قضاء نہ کی جائے الا انا تو کنا الخ مگر ہم نے اس حدیث کی وجہ سے اس اصل کو چھوڑ دیا ہے۔ف۔جب کچھ لوگوں نے زوال کے بعد باہر سے آکر خبر دی کہ چاند ہو گیا ہے تو اسی دن روزے توڑنے اور دوسرے دن نماز کے لئے سب کو اکھٹے ہونے کا حکم دیا تھا، اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عذر سماوی کی وجہ سے دوسرے دن پر نماز مؤخر کرنا جائز ہے۔

وقدورد الخ اور اس حدیث کا بیان اور ثبوت اسی بات کو بتانے کے لئے ہوا تھا کہ جب عذر سمائی پایا گیا تھا اس وقت دوسرے دن تک کی تاخیر جائز ہے، اور اس کے علاوہ سب کا حکم اپنی جگہ پر باقی ہے، لیعنی جب عذر نہ ہو تو تاخیر جائز نہ ہو گی۔ھ۔ع۔م۔ یہانتک عید الفطر کا بیان ختم ہوا، اور اب عید الاضحیٰ کے احکام کا بیان شروع ہو رہا ہے کہ اس کے احکام بھی تقریباً کل کے کل وہی ہیں جو عید الفطر میں بیان کئے جا چکے ہیں، سوائے چند مسائل کے وہ یہ ہیں مثلاً نماز کی تاخیر تکبیر یعنی جلدی کرنے کے، اس کے لئے مصنفؒ نے تنبیہ فرمائی ہے۔

ویستحب فی یوم الاضحی ان یغتسل ویتطیب لماذکرناہ ویؤخر الاکل حتی یفرغ من الصلوۃ لما روی ان النبی ﷺ کان لا یطعم فی یوم النحر حتی یرجع فیاکل من اضحیتہ ویتوجہ الی المصلی وھو یکبر لانہ ﷺ کان یکبر فی الطریق ویصلی رکعتین کالفطر کذلک نقل.

ترجمہ:۔اور عید الاضحیٰ میں مستحب ہے کہ غسل کرے اور خوشبو لگائے اس حدیث کی بناء پر جسے ہم بیان کر چکے ہیں، اور نماز سے فارغ ہونے تک اپنے کھانے کو موخر کر دے اس روایت کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ قربانی کے دن نہیں کھاتے تھے یہانتک کہ اپنی قربانی سے کھاتے تھے، اور تکبیر کہتے ہوئے مصلی کی طرف جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ راستہ میں تکبیر کہتے تھے، اور عید الفطر کی طرح اس عید الاضحیٰ میں بھی دو رکعتیں پڑھے، اسی طرح سے روایت نقل کی گئی ہے۔

توضیح:۔عید الاضحیٰ میں نماز کے بعد کھانا، عید گاہ کے راستہ میں تکبیر کہنا، حدیث سے دلیل

ویستحب فی یوم الاضحی ان یغتسل ویتطیب لماذکرناہ......الخ

اور عید الاضحیٰ کے دن یہ مستحب ہے کہ غسل کرے مسواک کرے اور خوشبو لگائے لما ذکرنا الخ اس دلیل کی وجہ سے جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے۔ف۔ عید الفطر میں ابن ماجہ وغیرہ سے حدیث ذکر کی گئی ہے اور ان کے علاوہ دوسری مستحب باتوں کا بھی بیان ہو چکا ہے، اس عید الاضحیٰ میں عید الفطر کے مقابلہ میں نماز کے لئے نکلنا افضل ہے۔الخلاصہ۔ھ۔ویوخر الاکل الخ اور بقر عید کی نماز سے فارغ ہونے تک کھانے میں تاخیر کرنی چاہئے۔ف۔اور اگر کھالیا تو بھی مکروہ تحریمی نہیں ہے، یہی قول مختار ہے، الکبری۔ھ۔

لما روی ان النبی ﷺ کان لا یطعم فی یوم النحر حتی یرجع فیاکل من اضحیتہ......الخ

کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ بقر عید کے دن نماز سے پہلے کچھ نہیں کھاتے اور نماز سے فارغ

ہونے کے بعد ہی اپنی قربانی سے کھاتے تھے۔ف۔ اس سے معلوم ہوا کہ نماز سے فراغت تک تاخیر کرنا اور قربانی سے کھانا دونوں باتیں مستحب ہیں۔م۔ بریدہؓ سے روایت ہے رسول اللہ ﷺ عید کے دن کچھ کھانے کے بعد ہی نماز کو جاتے جبکہ عید الاضحیٰ کے دن واپس آکر کھاتے تھے، اور قربانی کے جانور سے کھاتے تھے، احمد اور دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے اور ابن القطان نے بھی اسے صحیح کہا ہے، اور ترمذی وابن ماجہ وابن حبان اور حاکمؒ نے واپس آنے تک کی روایت کی ہے۔فع۔ اگر کسی نے قربانی نہ کی ہو تو وہ بھی نہ کھائے کیونکہ یہ بھی ایک مستقل سنت ہے، یہی قول اصح ہے۔م۔ دیہاتی کے لئے جائز ہے، کیونکہ دیہاتوں میں عیدین کی نماز نہیں ہوتی ہے۔ع۔م۔

ویتوجه الی المصلی وهو یکبر لانه ﷺ کان یکبر فی الطریق ویصلی رکعتین کالفطر کذلك نقل......الخ

اور عید گاہ کی طرف جہراً تکبیر کہتا ہوا جائے۔ف۔ بالاتفاق۔ اور مصلی پہونچ کر تکبیر موقوف کردے۔ التحفہ۔ بلکہ جب امام شروع کرے۔ الکافی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ راہ میں تکبیر کہتے تھے۔ف۔ یہ روایت غریب ہے، لیکن بخاریؒ نے روایت کی ہے کہ ابو ہریرہؓ اور ابن عمرؓ دس تاریخوں میں بازار جاتے وقت تکبیر کہتے اور دوسرے لوگ بھی ان کی تکبیر پر تکبیر کہتے تھے۔ مع۔ اس روایت سے عید گاہ کے راستے میں تکبیر کہنے کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔م۔ **ویصلی الخ** اور امام دو رکعتیں پڑھائے۔ف۔ اذان و اقامت کے بغیر ہی، **کالفطر الخ** نماز عید الفطر کی طرح۔ف۔ حضرت جابر بن سمرۃؓ کی حدیث کی بناء پر جو ذکر کی گئی ہے۔م۔ **کذلك الخ** اس طرح نقل کی گئی ہے۔ف۔ صحابہؓ کی ایک جماعت سے مثلاً حضرت عمرؓ و عثمانؓ وغیرہم، اور دوسری مرفوع حدیثوں سے۔ مع۔

ویخطب بعدها خطبتین لانه ﷺ کذلك فعل ویعلم الناس فیها الاضحیة و تکبیر التشریق لانه مشروع الوقت والخطبة ماشرعت الالتعلیمه فان کان عذر یمنع من الصلوٰة فی یوم الاضحی صلاها من الغدو بعد الغدو لا یصلیها بعد ذلك لان الصلوة موقتة بوقت الاضحیة فیقدر بایامها لکنه مسئی فی التاخیر من غیر عذر لمخالفة المنقول.

ترجمہ:- اور نماز کے بعد دو خطبے دے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے بھی ایسا ہی کیا ہے، اور ان دونوں خطبوں میں لوگوں کو قربانی اور تکبیر تشریق کے احکام بتلائے، کیونکہ اس وقت کے لئے یہی شرع ہے، اور خطبہ کو اسی کام کے لئے شروع کیا گیا ہے، اس دن اگر ایسا کوئی عذر سامنے آجائے جو اس دن عید کی نماز پڑھنے سے روک دے تو اس نماز کو دوسرے یا تیسرے دن پڑھ لے، لیکن اس کے بعد نہ پڑھے، کیونکہ یہ نماز تو قربانی کے ساتھ مقید ہے، اس لئے اس کا وقت بھی قربانی کے دنوں تک ہی رہے گا، لیکن بغیر عذر کے نماز کو پہلے وقت میں ادا نہ کرنے والا برا کرنے والا ہے، منقول احادیث وروایات کی مخالفت کرنے کی وجہ سے۔

توضیح:- عید الاضحیٰ کا خطبہ، اور اس کا مضمون، اگر کسی مجبوری سے عید الاضحیٰ کے دن اس کی نماز نہ ہوسکی، امام نے عید الفطر کی نماز بغیر وضوء کے پڑھائی، اور اگر عید الضحیٰ کی نماز بغیر وضوء کے پڑھائی

ویخطب بعدها خطبتین لانه ﷺ کذلك فعل ویعلم الناس فیها الاضحیة......الخ

اور نماز کے بعد امام دو خطبے پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی کیا ہے۔ف۔ جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں ہے۔ت۔ امام جب خطبہ میں تکبیر کہے تو لوگ بھی کہیں اور جب وہ درود پڑھے تو لوگ بھی پڑھیں مگر دل ہی دل میں۔ الحجہ۔ **ویعلم الناس الخ** اور اسی خطبہ میں لوگوں کو قربانی اور تکبیر تشریق کے احکام کی تعلیم کرے، **لانه مشروع،** کیونکہ اس وقت کا شروع طریقہ یہی ہے، **والخطبة الخ** اور خطبہ اسی کام کے لئے شروع کیا گیا ہے۔ف۔ لہذا اس وقت کے لحاظ سے جو مناسب احکام ہوں ان کو سکھلائے، پھر اگر دسویں تاخیر نماز نہ ہوسکی تو کیوں؟ کسی عذر کی وجہ سے یا بغیر کسی عذر کے۔

فان كان عذر يمنع من الصلوة في يوم الاضحي صلاها من الغد وبعد الغد......الخ
تو اگر کوئی قدرتی رکاوٹ ہوئی ہو تو خواہ سماوی ہو یا ارضی ہو جس کی وجہ سے پہلے دن نماز نہیں پڑھی جاسکے تو اس کے بعد دوسرے یا تیسرے دن نماز پڑھے۔ف۔ جبکہ دوسرے دن بھی کوئی عذر پیدا ہو گیا ہو، اور کوئی برائی بھی نہ ہو۔

و لا يصليها بعد ذلك لان الصلوة موقتة بوقت الاضحية فيقدر بايامها......الخ
ان تین دنوں دس گیارہ بارہ تاریخ کے بعد پھر کبھی نماز نہیں ہوگی لان الصلوۃ الخ کیونکہ اضحیٰ کی نماز تو صفت اضحیہ کے ساتھ مقید ہے، اس لئے اس نماز کا وقت اضحیہ یعنی قربانی کے دنوں تک ہی مقید رہے گی۔ف۔ یہ نماز اضحیہ کے تین دنوں ہی میں ہر روز آفتاب نکل جانے کے ذرا بعد سے آفتاب کے زوال سے پہلے تک اس کا وقت رہے گا، اور تیسرے دن کے زوال کے بعد سے وقت ختم ہو جائے گا، اور اگر بغیر عذر کے نماز میں تاخیر ہوئی ہو تو بھی نماز جائز ہوگی، لکنه سيئي الخ لیکن بغیر عذر کے تاخیر میں وہ گنہگار، برا کرنے والا ہوگا، کیونکہ منقول طریقہ کے خلاف کیا ہے۔ف۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدینؓ سے ایسی تاخیر منقول نہیں ہے، ۱۱-۱۲- کی نماز کو تاخیر کے باوجود ہم ادا کہتے ہیں قضا نہیں کہتے ہیں، کیونکہ اپنے وقت کے اندر ہی پڑھی گئی ہے، اور اب نماز اور خطبہ سے فارغ ہونے کے بعد عید الفطر کی طرح دوسرے راستہ سے واپس آئیں اور قربانی کر لیں۔م۔

چند ضروری مسائل

اگر امام نے عید الفطر کی نماز ایسی حالت میں پڑھائی کہ اسے وضوء نہ تھا اور اس کی اطلاع زوال سے پہلے اسے ہو گئی تو نماز کا اعادہ کرے (اگر ممکن ہو) اور اگر زوال کے بعد معلوم ہوا تو دوسرے دن جاکر نماز پڑھ لے، اور اگر دوسرے دن بھی زوال کے بعد معلوم ہوا تو پھر یہ نماز نہیں پڑھی جائے گی بلکہ رہ جائے گی، اور اگر عید الاضحیٰ میں بغیر وضوء کے نماز پڑھادی اور نماز کے بعد لوگوں نے قربانیاں بھی کرلیں پھر اسے زوال کے بعد معلوم ہوا تو قربانیاں جائز ہو گئیں، لیکن دوسرے دن نماز دوبارہ پڑھی جائے گی، یہی حکم اس وقت بھی ہوگا جبکہ وضوء نہ ہونے کی اطلاع دوسرے زوال کے بعد معلوم ہوا ہو تو اب نہ پڑھے، اور اگر دسویں تاریخ زوال سے پہلے اسے وضوء نہ رہنے کی اطلاع ملی اور اسی وقت امام نے عام اعلان بھی کر دیا تو جس نے اس کے جاننے سے پہلے قربانی کرلی ہوگی تو اس کی قربانی جائز ہوگی، اور جس نے جاننے کے باوجود بعد میں قربانی کی تو جائز نہ ہوگی، یہانتک کہ زوال کے بعد جائز ہے۔ قاضی خان۔ھ۔

والتعريف الذى يصنعه الناس ليس بشئى وهو ان يجمع الناس يوم عرفة في بعض المواضع تشبيها بالواقفين بعرفة لان الوقوف عرف عبادة مختصة بمكان مخصوص فلايكون عبادة دونه كسائر المناسك.

ترجمہ:-اور وہ تعریف جسے لوگ کرتے ہیں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ لوگ عرفہ کے دن کسی ایک جگہ اکٹھے ہوتے ہیں عرفہ کے میدان میں لوگوں کے وقوف کی مشابہت کرنے کے لئے، کیونکہ یہ وقوف یعنی اس میدان میں جاکر ٹھہرنے کا ہمیں عبادت کے طور پر معلوم ہونا مخصوص ہے اسی خاص میدان عرفات کے ساتھ، لہٰذا کہیں اور اس طرح کرنا عبادت نہیں ہوگی جیسا کہ دوسری عبادتیں ہیں۔

توضیح:-وقوف عرفہ کی مشابہت کرنا، عرفات کے علاوہ کسی اور جگہ میں

والتعريف الذى يصنعه الناس ليس بشئى وهو ان يجمع الناس يوم عرفة......الخ
ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔ بلا اختلاف اس عمل سے کچھ بھی ثواب نہیں ملتا ہے لان الوقوف الخ کیونکہ اکٹھے ہو کر رہنا اس تاریخ میں اگرچہ بالاتفاق ایک عبادت ہے مگر صرف ایک خاص میدان یعنی عرفات میں اس کے علاوہ کسی اور جگہ اس طرح وقوف کرنا کوئی عبادت نہیں ہے۔ف۔ وہ جگہ عرفات کا میدان ہے جہاں حج کا احرام باندھ کر وقوف کرنا عبادت ہے،

اور وہ خاص میدان ہر جگہ نہیں ہے لہذا دوسرے علاقوں میں اس طرح کھڑا ہونا مخصوص صفت کے ساتھ نہ ہوا لہذا لغو ہوا۔

فلایکون عبادۃ دونہ کسائر المناسک......الخ

تو اس مخصوص جگہ نہ ہونے کی وجہ سے عبادت کا کام نہ ہوا۔ کسائر النسک الخ جیسا کہ حج کے دوسرے کام ہیں۔ف۔ طواف وغیرہ کے مانند، اور اگر کعبہ کے علاوہ کسی اور مسجد کے چاروں طرف کوئی ایسا ہی چکر لگائے جیسا کہ کعبہ کے چاروں طرف لگاتے ہیں تو اس پر کفر کا خوف ہے۔ع۔ اور امام نوویؒ نے یہی حکم مسجد بیت المقدس روضہ اطہر علیہ السلام کے چاروں طرف چکر لگانے والے پر بھی لگایا ہے، اور ملا علی قاریؒ نے مناسک میں کہا ہے کہ جو لوگ رسول اللہ علیہ السلام کے مزار مبارک کے چاروں طرف پھرتے ہیں سب کے سب اجہل الجہلاء بڑے ہی احمق ہیں اگرچہ وہ علماء اور مشائخ کی صورت میں ہوں۔م۔ اور شمس الائمہ سرخسیؒ نے بناوٹی عرفات بنانے کی برائی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ اگر مشابہت کی صورت میں رہے تو احرام کی طرح سر بھی کھول لیں گے اور یہ کوئی نہیں کہے گا کہ یہ تو نصرانیوں کے گرجاؤں کی بت پرستیاں ہیں، اور اگر ایسی ہی تشبیہ ہے تو خانہ کعبہ کے طواف کرنے والوں کی طرح ایک گھر بھی بنا کر اس کے چاروں طرف طواف کریں گے، اور اپنے بازاروں میں دوڑیں گے تاکہ صفا و مروہ کی سعی کرنے والوں کی مشابہت ہو۔ ترجمہ ختم ہوا۔

ان جملوں سے انہیں انتہائی درجہ کے نفرت اور ان لوگوں کی برائی کا اظہار کیا ہے، اور نفس کی مکاریوں اور شیطان کی بہکانے سے متنبہ کیا ہے، مگر تعجب ہے کہ عینیؒ نے بغیر سمجھے ہوئے اس کے جواب دینے کی کوشش میں قلم اٹھایا ہے، حالانکہ یہ عبارت اپنی جگہ لاجواب ہے، امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ایسی چیزوں کی کنجی تو بدعتیوں کے ہاتھوں میں ہے، بہر صورت اس تعریف کو بے فائدہ قرار دینے کے بعد اب یہ سوال ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کا کیا حکم ہے، یعنی مباح ہے یا مکروہ ہے، نہایہ میں تو اسے مباح بتایا ہے، کافی میں کہا ہے کہ بعضوں کا قول ہے کہ یہ مستحب ہے۔ع۔

ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ حق یہ ہے کہ اگر اتفاق سے اس دن نماز استسقاء وغیرہ کسی مشروع کام کرنے کے لئے نکلنا ہو جائے تو مکروہ نہیں ہے، اور اگر صرف اسی مقصد کے لئے نکلنا ہو تو اس وقت غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ تشبیہ کے معنی میں مکروہ ہے۔ الفتح۔ اگر شبیہ کے واسطے نہیں ہے بلکہ اس دن کی بزرگی کی وجہ سے نکلنا ہو تو جائز ہے۔ قاضی خان۔ التمر تاشی۔ع۔ اس کے معنی یہ ہوں گے وہاں جا کر کھڑے نہ ہوں اور سر نہ کھولے۔ الفتح۔ میں کہتا ہوں کہ اصل مسئلہ کتاب میں خود امام محمدؒ نے اشارۃ بلکہ کراہت کی تصریح فرمائی ہے، کہ لیس بشئی کچھ نہیں ہے کا جملہ تو عموماً مطلقاً دینی اور دنیوی دونوں فائدوں سے خالی ہے، کیونکہ ایسا نکرہ جو نفی کے بعد آئے وہ بالاجماع عام ہوتا ہے، اور مباح دنیاوی بھی نہیں ہے، کیونکہ جو بات دنیاوی کاموں میں سے بے فائدہ ہو وہ بالاتفاق حرام ہوتی ہے، جیسا کہ لغو کی بحث میں تصریح کے ساتھ بتائی گئی ہے، اور باب العید کے شروع میں دیہات کی نماز عید کے بیان میں قنیہ کا قول گذر گیا ہے، پس امام محمدؒ نے مبالغہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ کام محض لغو ہے، لہذا امام شمس الائمہ سرخسیؒ نے اور شیخ ابن الہمامؒ نے جو کہا بلاشک وہی تحقیق و صحیح ہے، اور اس کے ماسوا سارے اقوال غلط ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔ والیہ المرجع والماٰب۔م۔

فصل فی تکبیرات التشریق

ویبدأ بتکبیر التشریق بعد صلوۃ الفجر من یوم عرفۃ ویختم عقیب صلوۃ العصر من یوم النحر عند ابی حنیفۃ وقالا یختتم عقیب صلوۃ العصر من اخر ایام التشریق والمسألۃ مختلفۃ بین الصحابۃ فاخذا بقول علیؓ اخذا بالاکثر اذھو الاحتیاط فی العبادات واخذ بقول ابن مسعود اخذا بالاقل لان الجھر با تکبیر بدعۃ.

ترجمہ:- فصل، تکبیرات تشریق کے بیان میں، تکبیر تشریق نویں ذالحجہ کی فجر نماز کے وقت سے شروع کر کے یوم النحر کی

عصر کی نماز کے بعد ختم کر دی جائے یہ امام ابو حنیفہؒ کی مذہب کے مطابق ہے، لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ یوم تشریق کی آخری عصر کی نماز کے بعد ختم کر دی جائے، اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کے درمیان ہی اختلاف تھا، چنانچہ صاحبینؒ نے حضرت علیؓ کے قول کو قبول کیا ہے اکثر وقت پر عمل کرتے ہوئے کہ عبادت میں احتیاط اسی میں ہے، اور امام اعظمؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو قبول کیا ہے کم سے کم مقدار پر عمل کرتے ہوئے کہ تکبیر کو زور سے کہنا بدعت ہے۔

توضیح:۔ فصل، تکبیرات تشریق، ان کے شروع کرنے اور ختم کرنے کا وقت

فصل فی تکبیرات التشریق...... الخ

یہ فصل تکبیرات تشریق کے بیان میں ہے۔ ف۔ تشریق خود تکبیر ہے اس لئے معنی یہ ہوئے کہ ان تکبیرات کے بیان میں جن کا نام تشریق ہے، اور صاحبینؒ کے قول کے مطابق ۱۱-۱۲-۱۳- تاریخ نویں ذی الحجہ کا نام ہے لیکن یہ تکبیریں نویں ذی الحجہ یعنی یوم عرفہ کی فجر نماز کے بعد سے شروع ہو جاتی ہیں، لہٰذا بعض دنوں کے نام سے نسبت ہوئی۔ م۔ ع۔ یہ تکبیر اکثر فقہاء کے نزدیک واجب ہے، لیکن سنت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پر مداومت فرمائی ہے۔ مف۔ التبیین۔ ھ۔

ویبدأ بتکبیر التشریق بعد صلوۃ الفجر من یوم عرفۃ ویختم عقیب صلوۃ العصر......الخ

اور تکبیر تشریق کو شروع کرے۔ ف۔ جہر کے ساتھ بعد صلوۃ الخ عرفہ کے دن کی فجر نماز کے بعد سے۔ ف۔ یعنی نویں ذوالحجہ سے تمام علماء احناف کے اتفاق کے ساتھ ویختم الخ اور یوم النحر یعنی دسویں ذوالحجہ کی عصر کی نماز پڑھ لینے کے بعد۔ ف۔ لیکن ختم میں اختلاف ہے، جو بیان ہوا، عند ابی حنیفۃؒ مذکورہ قول امام ابو حنیفہؒ کا ہے وقالا الخ لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ ایام تشریق کے آخر میں یعنی تیرہویں ذی الحجہ کی عصر کی نماز کے بعد تکبیر کہہ کر۔ ف۔ صاحبینؒ کے قول پر فتوی ہے، اور اکثر زمانوں میں تمام شہروں میں عمل رہا ہے اور اب بھی جاری ہے۔ الخلاصہ۔ التحریر والعنایۃ والاسبیجابی۔ المجتبی الکامل۔ مع۔ اس کے باوجود مصنفؒ نے متن میں امام اعظمؒ کے قول کی التزامی تصحیح کی ہے۔

والمسألۃ مختلفۃ بین الصحابۃ فاخذا بقول علی اخذا بالاکثر......الخ

اور یہ مسئلہ صحابہ کرام میں بھی اختلافی تھا فاخذا الخ چنانچہ صاحبینؒ نے حضرت علیؓ کے قول کو قبول کیا، ابن ابی شیبہؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور یہی قول حضرت عمر و ابن عباس اور عمارؓ کا ہے۔ ع۔ حاکم نے اس کی روایت کی ہے، اور ابن عمر و زید بن ثابت و ابو سعیدؓ کا بھی ہے، دار قطنی نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت عثمانؓ کا، التحریر اور حضرت ابو بکرؓ۔ المفید۔ اور مذہب سفیان ثوری و ابن عیینہ و احمد ابو ثورؒ، اور ایک قول امام شافعیؒ کا بھی ہے، الحاصل صاحبینؒ نے ان مذکورہ صحابہ کرامؓ کا قول قبول کیا ہے اخذا بالاکثر الخ اکثر کو لینے کے طور پر کیونکہ عبادات میں احتیاط کرنے کی یہی صورت ہے کہ اکثر پر عمل کر لیا جائے۔ ف۔ ۱۳ تاریخ تک تکبیر کہہ لینے ہی میں احتیاط ہے، اس طرح کم سے کم مقدار از خود اس میں داخل ہو گئی، اس کے برعکس کمتر کو لینے سے یہ تعداد یقیناً چھوٹ جائے گی، الحاصل اکثر کو ان دونوں نے قبول کیا ہے۔

واخذ بقول ابن مسعود اخذا بالاقل لان الجھر با تکبیر بدعۃ......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ نے حضرت ابن مسعودؓ کے قول کو قبول کیا ہے کم سے کم تعداد کو قبول کرنے کے لئے، اور ابن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں علقمہ اسود نخعی سے یوم النحر کی عصر کی نماز کے ختم کے بعد ثابت ہے اسی لئے کمتر مقدار کو قبول کیا ہے، لان الجھر الخ، کیونکہ تکبیر کہنے کو زور سے ادا کرنے میں بدعت ہوتی ہے۔ ف۔ اور یہی قول امام حسن بصریؒ سے منقول ہے، اور جب ایک چیز مستحب اور بدعت کے درمیان گھری ہوئی ہو تو اسی قول پر عمل کرنا مناسب ہوتا ہے جس سے بدعت کے عمل سے بچا جا سکے، کیونکہ ابن مسعودؓ سے وہ مقدار معلوم ہو گئی ہے جس پر عمل کرنا کافی ہو جائے۔ م۔

والتکبیر ان یقول مرۃ واحدۃ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد ھذا ھو الماثور عن الخلیل صلوات اللہ علیہ وھو عقیب الصلوۃ المفروضات علی المقیمین فی الامصار فی الجماعات المستحبۃ عند ابی حنیفۃ ولیس علی جماعات النساء اذا لم یکن معھن رجلا ولاعلی جماعۃ المسافرین اذا لم یکن معھم مقیم۔

ترجمہ:-اور تکبیر تشریق یہ ہے کہ ایک بار یہ کلمات کہے جائیں اللہ اکبر اللہ اکبر لاالٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر، وللہ الحمد، سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ الصلوات والتسلیم سے یہی کلمات منقول ہیں، ان کو ہر فرض نماز کے بعد مقیم لوگوں پر شہروں میں مستحب جماعتوں کے بعد کہنا ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے، اور عورتوں کی ایسی جماعت کے بعد نہیں جن کے ساتھ ایک بھی مرد نہ ہو، اور نہ صرف مسافروں کی جماعت میں جبکہ ان کے ساتھ مقیم نہ ہو۔

توضیح:-تکبیر تشریق کیا ہے، اس کے عمل کا کیا طریقہ ہے، نمازی نے قصداً حدث کیا یا وہ مسجد سے نکلا، قبلہ کی طرف پیٹھ پھیری بے ارادہ حدث ہوگیا، تکبیرات کے وجوب اور اس کی سنیت کی بحث

والتکبیر ان یقول مرۃ واحدۃ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

اور تکبیر تشریق یہ ہے کہ ایک بار یہ کلمات کہہ دئے جائیں، اللہ اکبر اللہ اکبر.... وللہ الحمد یہ تکبیر حضرت عمر و ابن مسعودؓ سے منقول ہے **ھذا ھو الماثور الخ** سیدنا ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے منقول ہے۔ف۔مبسوط و قاضی خان سے عینیؒ نے ایک قصہ لکھا ہے، لیکن ابن الہمامؒ نے ابن ابی شیبہ و محمدؒ کی روایتیں حضرت علیؓ و ابن مسعودؓ سے نقل کی ہیں، اور کہا ہے کہ اسناد جید ہے، ابن ابی شیبہؒ نے عموم لفظ کے ساتھ روایت کی اس طرح **حدثنا جریر عن منصور عن ابراھیم قال کانوا یکبرون الخ**...... میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ اسناد بلاشبہ صحیح کی اسناد ہے، اور معنی یہ ہے کہ ابراہیم نخعیؒ نے فرمایا ہے کہ صحابہ کرامؓ عرفہ کے دن تکبیر کہتے نماز کے بعد قبلہ رخ ہوکر **اللہ اکبر ...... وللہ الحمد**، یہی حدیث جابرؓ دارقطنی میں رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے، اگرچہ اس کی اسناد ضعیف ہے اور نماز سے فرض ہی متبادر ہے۔مف۔

وھو عقیب الصلوۃ المفروضات

اور یہ تکبیر (قبلہ رخ حالت میں) فرض نماز کے بعد ہے۔ف۔اگر چہ جمعہ کا دن ہو، اور اگر چہ خاص انہیں ایام تشریق کی قضاء ہو، اس بناء پر نماز جنازہ و وتر اور عید اس سے خارج ہوں گی کہ ان کے بعد تکبیر نہیں کہنی چاہئے، لیکن کہا گیا ہے کہ قول اصح یہ ہے کہ عید اس حکم میں داخل ہے۔د۔الخلاصہ۔ھ۔ع۔لہٰذا تکبیر کہنی چاہئے **علی المقیمین**، مقیم لوگوں پر۔ف۔مسافروں پر نہیں، اگر چہ غلام ہوں، جبکہ مقیم ہوں، **فی الامصار** شہروں میں۔ف۔یعنی دیہاتوں میں نہیں، لہٰذا مذکورہ صورتوں میں تکبیر کہنی چاہئے، **فی الجماعۃ الخ** مستحب جماعتوں میں۔ف۔نہ منفرد پر اور نہ صرف عورتوں کی جماعت میں **عند ابی حنیفہ الخ** یہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہے۔ف۔اور سلام پھیرنے کے بعد فوراً تکبیر کہیں۔یہاں تک کہ اگر نمازی نے قصداً حدث کیا یا کسی اور طرح کلام کیا یا مسجد سے نکلا۔تو تکبیر کا حکم ختم ہوگیا۔التہذیب اور اگر قبلہ سے پیٹھ پھیر دی تو بھی ایک روایت کے مطابق تکبیر ساقط ہوگئی لیکن دوسری روایت میں باقی رہی ساقط نہیں ہوئی۔ف۔اور اگر از خود حدث ہوگیا تو اصح قول یہ ہے کہ تکبیر کہے۔طہارت ابھی نہ جائے۔الخلاصہ **ولیس** اور عورتوں کی جماعت پر تکبیر نہیں ہے۔جبکہ ان عورتوں کے ساتھ کوئی مرد نہ ہو۔ف یعنی ان کا امام مرد نہ ہو۔**ولا علی جماعۃ الخ** اور مسافروں کی جماعت پر بھی تکبیر نہیں ہے۔جب کہ ان کے ساتھ مقیم نہ ہو۔ف یعنی امام مقیم نہ ہو۔یہی قول اصح ہے۔ع۔اور قول اصح یہ ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک تکبیر کے لیے بادشاہ اور آزادی کا ہونا شرط نہیں ہے مصنفؒ نے **ھو علی المقیمین** سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تکبیر واجب ہے۔اور مفید و مزید و قاضی خان اور جوامع

الفقہ میں وجوب کی تصریح کی ہے۔ اور مرغینانی وتحریر میں کہا ہے کہ سنت ہے۔ امام مالک وشافعی واحمد کا قول بھی یہی ہے۔ اور قول صحیح یہ ہے کہ واجب ہے۔ کیونکہ یہ شعائر دین میں سے ہے۔ لع۔ ابن الہمامؒ نے دلیل کے اعتبار سے سنت کہنے کو ترجیح دی ہے۔ اور شعائر میں سے ہونا سنت کے خلاف نہیں ہے۔ جیسا کہ شمس الائمہ سرخیؒ نے عید کے بارے میں فرمایا ہے۔ علی ما ذکرہ العینیؒ۔ م۔ یہ تفصیل امام اعظمؒ کے نزدیک ہے۔

وقالا هوعلى كل من صلى المكتوبة لانه تبع للمكتوبة وله مار وينا من قبل والتشريق هو الجهر بالتكبير كذانقل عن الخليل بن احمد ولان الجهر بالتكبير خلاف السنة والشرع وردبه عند استجماع هذه الشرائط الا انه يجب على النساء اذا اقتدين بالرجال وعلى المسافرين عندا قتدائهم بالمقيم بطريق التبعية قال يعقوب صليت بهم المغرب يوم عرفة فسهوت ان اكبر فكبرابو حنيفة دل ان الامام وان ترک التكبير لا يتركه المقتدى وهذا لا نه لا يؤدى فى حرمة الصلوٰة فلم يكن الامام فيه حتما وانما هو مستحب

ترجمہ:۔ اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ تکبیر ہر اس شخص پر لازم ہوتی ہے جس نے فرض نماز پڑھی ہو کیونکہ یہ فرض کے تابع ہے۔ اور امام اعظمؒ کی دلیل وہ ہے ہم نے پہلے بیان کر دی ہے۔ تشریق کے معنی ہیں تکبیر کو بلند آواز سے کہنا۔ جیسا کہ خلیل بن احمدؒ سے منقول ہے۔ اور اس وجہ سے کہ تکبیر کو بلند آواز سے کہنا سنت کے خلاف ہے اور شریعت کا حکم اس میں اس صورت میں پایا گیا ہے جبکہ اس کی تمام شرطیں پائی گئی ہوں۔ اور عورتوں پر تکبیر کہنا اس صورت میں واجب ہے جبکہ وہ مردوں کی اقتداء کریں اور مسافروں پر جبکہ وہ مقیم کی اتباع کریں تابع ہونے کی صورت میں۔ یعقوب امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے ایک مرتبہ کچھ مسافروں کو عرفہ کے دن نماز پڑھائی اور سلام کے بعد تکبیر کہنا بھول گیا تو امام ابوحنیفہؒ نے بلند آواز سے تکبیر کہی۔ اس واقعہ نے اس بات پر دلالت کی کہ امام اگر چہ تکبیر کہنا بھول جائے مقتدی نہ بھولے۔ کیونکہ یہ تکبیر تو تحریمہ صلوٰۃ میں ادا نہیں کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس تکبیر کے کہنے میں امام کا بھی موجود ہونا لازم نہیں ہے بلکہ یہ تو فقط امر مستحب ہے۔

توضیح:۔ عورتوں اور مسافروں پر وجوب تکبیر۔ امام تکبیر کہنا بھول گیا۔ ایام تشریق میں فائتہ نماز۔

وقالا هو الخ اور صاحبینؒ نے کہا ہے کہ تکبیر ہر ایسے شخص پر لازم ہے جو فرض نماز پڑھے۔ ف۔ خواہ وہ شہری ہو یا دیہاتی ہو خواہ مسافر ہو یا مقیم ہو۔ خواہ جماعت سے ہو یا تنہا ہو۔ ع۔ یا عورت ہو۔ ت۔ یہی قول امام مالک وامام شافعیؒ کا بھی ہے۔ لیکن امام احمدؒ کے نزدیک سوائے تنہا شخص کے۔ ع۔ لانه، تبع الخ کیونکہ تکبیر فرض نماز کے تابع ہے۔ ف۔ لہٰذا جو بھی فرض نماز پڑھے وہ تکبیر کہے۔ وله مار وينا الخ اور امام ابوحنیفہؒ کی ایک دلیل تو وہ حدیث ہے جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے۔ ف۔ کہ لاجمعة ولا تشريق ولا فطر والاضحى الافى مصر جامع. اس سے معلوم ہوا تشریق واجب ہونے کے لئے مصر جامع ہونا شرط ہے۔ والتشريق الخ اور تشریق بمعنی تکبیر کو زور سے کہنا ہے۔ خلیل بن احمدؒ سے ایسا ہی منقول ہے۔ ف۔ یہ خلیلؒ فن نحو ولغت کے امام تھے۔ ۱۷۵ھ میں وفات پائی۔ اس طرح امام ابوحنیفہؒ سے ۲۵ برس بعد وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ تکبیر کو جہراً کہنے کا حکم عام نہیں ہے بلکہ اس کے لئے مصر جامع ہونا شرط ہے۔ ولان الجهر الخ اور دوسری دلیل یہ ہے کہ تکبیر کو جہراً کہنا سنت کے خلاف ہے۔ ف۔ یعنی بدعت ہے سوائے ان جگہوں کے جہاں شریعت سے ثبوت مل جائے۔ والشرع الخ اور شریعت میں جہراً تکبیر کا حکم اسی موقع میں ہوگا جہاں یہ تمام شرطیں پائی جارہی ہوں۔ ف۔ یعنی مصر ہو اور مستحب جماعت ہو۔ اور اقامت ہو یعنی سفر کی حالت نہ ہو۔ کیونکہ ہم نے سنت میں تکبیر کا حکم صرف ان ہی مواقع میں پایا ہے۔ لہٰذا حکم اسی پر موقوف رہے گا۔ اور ان شرطوں کے بغیر دوسری جگہ حکم جاری نہ ہوگا۔ الا انه الخ البتہ اگر عورتیں مردوں کی اقتداء میں نماز پڑھیں گی تو ان پر بھی تکبیر

واجب ہو جائیگی۔ف۔ایسی صورت میں وہ آہستگی کے ساتھ تکبیر کہیں گی۔ھ۔ت۔وعلی المسافرین الخ مسافروں پر بھی تکبیر واجب ہوگی جبکہ وہ مقیم امام کی اقتداء کریں۔ف۔الحاصل اقتداء کرنے کی وجہ سے عورتوں اور مسافروں پر بھی تکبیر لازم آجائیگی۔بطریق التبعیة الخ تابع ہونے کی بناء پر۔ف۔یعنی اصل میں تو ان لوگوں پر تکبیر لازم نہیں ہوتی ہے البتہ متبوع یعنی امام پر لازم ہونے کی وجہ سے تابع یعنی مقتدی پر بھی لازم آجائیگی۔جیسا کہ مقیم امام کی اتباع کرنے کی وجہ سے مسافر مقتدی کو پوری نماز پڑھنی ہوتی ہے اور قصر کرنا جائز نہیں ہوتا ہے۔میں مترجم کہتا ہوں کہ اس موقع پر مصنفؒ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ تکبیر واجب ہوتی ہے۔پھر مستحب طریقہ یہ ہے کہ مقتدی سلام پھیرنے کے بعد امام کا ذرا انتظار کرے اگر وہ غافل ہو یا کسی دوسرے ایسے کام میں لگ جانے والا ہو جو تکبیر کے منافی ہوتا ہے اس وقت مقتدی تکبیر کہدے۔التبیینؒ۔امام محمدؒ نے ایک روایت اس طرح بیان کی ہے کہ قال یعقوب الخ یعقوب یعنی امام ابو یوسفؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے ان کو عرفہ کے دن مغرب کی نماز پڑھائی۔ف۔عینیؒ نے کہا ہے کہ ان کو سے مراد مسافر ہیں یعنی مسافروں کو نماز پڑھائی۔میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر حج کی مسافرت مراد ہوتی تو موجودہ صورت میں جبکہ امام اور مقتدی سب مسافر ہوں کسی پر تکبیر لازم نہیں آتی ہے پھر امام اعظمؒ اس بدعت یعنی تکبیر با آواز کہنے کے مرتکب کیوں ہوتے۔اس لئے میرے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ اور ان کے کچھ شاگردوں کو نماز پڑھائی۔مطلب یہ ہوگا کہ میں نے عرفہ کے دن اپنے استاد امام اعظمؒ کے اشارہ اور حکم سے ان کے شاگردوں کو مغرب کی نماز پڑھائی۔فسھوت الخ پس بعد نماز کے میں تکبیر تشریق کہنا بھول گیا۔فکبر الخ اس وقت خود امام ابو حنیفہؒ نے تکبیر کہی۔دل علی الخ تو یہ واقعہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اگر امام تکبیر بھول جائے بلکہ قصداً چھوڑ دے تو مقتدی اسے نہ چھوڑے۔ف۔پس امام اس تکبیر کے لئے لازم نہیں ہے۔لانہ لایؤدی الخ کیونکہ یہ تکبیر تو تحریمہ نماز میں داخل نہیں ہے (جس میں امام کی اتباع لازم ہوتی ہے) فلم یکن الخ پس اس کام کے لئے امام کا وجود لازم نہیں ہے بلکہ فقط مستحب ہے۔ف۔حالانکہ تکبیر کہنی واجب ہے۔اس لئے امام کے پیچھے واجب کا ترک نہ ہوگا۔فائدہ۔ایک زمانہ میں جب امام ابو یوسفؒ اپنی مفلسی کے زمانہ میں بالکل غیر معروف تھے شہرت کوئی نہیں ہوئی تھی اس زمانہ میں امام اعظمؒ اپنی چشم بصیرت سے ان کے مستقبل کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہارون الرشید کے ساتھ فالودہ پی رہے ہو۔اس کے بعد امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ خلیفہ ہارون الرشید نے سب سے پہلے جب مجھے اپنے پاس بلوایا اس وقت وہ فالودہ پی رہے تھے مجھے دیکھ کر میرے سامنے بھی پیش کیا گیا تو مجھے اپنے استاد ابو حنیفہؒ کی پیشگوئی یاد آگئی۔یہ سب کچھ بطور کشف وکرامات تھا۔اس فراست کی بناء پر ابو یوسفؒ کو امام اعظمؒ نے نماز میں اپنا امام بھی بنایا تھا تا کہ ان کے دل سے رعب جاتا رہے۔مگر استاد شفیق اعظم المجتہدین کا رعب اس قدر چھایا کہ کئی نمازیں تکبیرات کے ساتھ پڑھ کر بھی مغرب کے بعد تکبیر کہنی بھول گئے۔اس قصہ میں شاگرد کے ساتھ شفقت کرنے اور ساتھ میں استاد کی عظمت اور جلالت کے لئے بڑی نصیحت ہے۔م۔فع۔اگر ایام تشریق میں پہلی کوئی قضاء پڑھی یا ایام تشریق کی قضاء بعد کو کبھی پڑھی تو تکبیر نہیں کہے گا۔اور مسبوق جب اپنی نماز پوری کرے اس کے بعد تکبیر واجب ہے۔التبیین۔

باب صلوة الکسوف

قال اذا نکسفت الشمس صلی الامام بالناس رکعتین کھیاۃ النافلة فی کل رکعة رکوع واحد وقال الشافعی رکوعان له ماروت عائشةؓ

ترجمہ: باب سورج گرہن کی نماز کا۔مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ جب سورج میں گرہن لگ جائے تو امام لوگوں کو دو رکعتیں نماز پڑھائے نفل نماز کی طرح۔کہ ہر رکعت میں ایک رکوع ہوگا۔اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ہر رکعت میں دو رکوع ہوں گے۔ان کی دلیل وہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت فرمائی ہے۔

توضیح:۔ باب سورج گہن کی نماز۔ نماز کی کیفیت۔ رکعت کی تعداد۔ نماز کسوف کی جماعت کے واسطے لوگوں کو پکارنا۔ شافعیہ کی دلیل۔ باب۔ الخ یہ باب سورج گہن کی نماز کے بیان میں ہے۔

ف۔ معلوم ہونا چاہیئے کہ عید و کسوف اور استسقاء تینوں کی نمازیں بغیر اذان و اقامت کے دن میں ادا کی جاتی ہیں۔ ان میں سے نماز عید واجب ہے اور گہن کی نماز جمہور کے نزدیک سنت ہے ایک ضعیف قول میں واجب بھی ہے اور استسقاء کی نماز میں یہ اختلاف ہے کہ وہ مسنون ہے یا نہیں۔ اس بیان سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان تینوں نمازوں میں کیا مناسبت ہے اور یہ کہ اس مناسبت سے تینوں باب کو ذکر کیا گیا ہے۔ حدیث میں سورج گہن اور چاند گہن وغیرہ کے متعلق بتایا گیا ہے کہ تم جب ان میں سے کسی کو بھی پاؤ تو نماز کے لئے جلدی کرو۔ جیسا کہ صحیح میں ہے۔ ان کے پائے جانے میں یہ مصلحت رکھی گئی ہے کہ ہر انسان کو اپنی موت کا اور ایک دن اس دنیا کو چھوڑ کر جانے کا یقین کامل ہونے کے باوجود اس دنیاوی زندگی اور اس کے ماحول سے طبعًا ایسا مانوس و مالوف اور گھر اہوا رہتا ہے کہ اسے اس بات کا خیال نہیں آتا ہے کہ ہم کس طرح پھنسے ہوئے ہیں اور ہمیں دنیا سے کیا لے کر جانا ہے۔ اور مر جانے سے اس کی موجودہ حالت میں کتنا بڑا تغیر ہوگا یہ ظاہر بھی ہے۔ اگر انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے مطابق عمل کرے تو دن اور رات صبح و شام۔ روشنی اور اندھیرا ہر روز آتے جاتے ادلتے بدلتے رہتے ہیں یہ ساری باتیں ہر سمجھدار کو عبرت دلاتی ہیں اور ہوش میں آنے کے لئے جھنجھوڑتی ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ اِنَّ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الآیہ. اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت اسی ماحول کی ایسی عادی ہوگئی ہے کہ عبرت حاصل کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہے۔ اب ان میں گاہے گاہے انتہائی غیر معمولی حالت جو انسانی طاقت کے باہر ہوتی ہیں مثلاً سورج اور چاند کا گہن میں آنا تو اس وقت تھوڑی دیر کے لئے ذرا چونکتی ہے اس موقع سے اس بات کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے کہ ان تمام چیزوں اور اپنے خالق حقیقی کی طرف بڑھو، ہاتھ پھیلاؤ نمازیں پڑھو۔ تلاوت قرآن کرو۔ اس طرح اپنے انجام پر یقین آسکتا ہے کہ ہمارا حشر کیا اور کس طرح ہوسکتا ہے۔ اس طرح ایمانی کیفیت دل پر جم سکتی ہے نفس کے خطرات اور شیطانی وسوسے دور ہوسکتے ہیں۔ اور حق بات پر انسان جم سکتا ہے۔ شیخ ابن الہمامؒ نے ذکر کیا ہے کہ اگر وہ مطیع و فرماں بردار ہیں تو اپنی نیتوں کے مطابق اٹھائے جائینگے۔ اور اگر بدکار ہیں تو توبہ و استغفار کرینگے۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ وہ کفار یقیناً محروم ہی رہے جو آخرت کے حالات اور اپنے انجام کار سے غافل ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے سر کے پیالہ سے موت باہر نکل آتی ہے۔ اور وہ سر کا پیالہ ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ م۔ نماز کسوف یا سورج گہن کے ثابت اور صحیح ہونے پر امت کا اجماع ہے۔ کسی نے بھی اس کا انکار نہیں کیا ہے۔ اس کے متعلق بے شمار احادیث پائی گئی ہیں اور مشہور ہیں۔ مع۔ اور تمام امت کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ یہ نماز مسجد جامع یا عیدگاہ میں جماعت کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔ فع۔ اس نماز کا وقت وہی ہے جو دوسری نفلوں کے پڑھنے کا ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے مکروہ اوقات بھی ویسے ہی ہیں جیسے دوسری نمازوں کے لئے ہیں۔ عف۔ چنانچہ اگر عصر کے بعد سورج گہن ہو تو اس وقت نماز نہ ہوگی کیونکہ اس وقت نماز مکروہ ہوتی ہے۔ م۔ اور تمام امت کا اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ اس میں جماعت افضل اور سنت ہے۔ الذخیرہ۔ اور تنہا پڑھنا بھی جائز ہے۔ المحیط۔ حاکم وقت کی اجازت سے محلہ کا امام بھی نماز پڑھا سکتا ہے۔ المرغینانی۔ مع۔ اذا انکسفت الخ۔ جب سورج کو گہن لگے تو صلی الامام الخ امام دو رکعتیں نماز پڑھائے۔ ف۔ اور چاہے تو چار رکعتیں۔ المحیط۔ البدائع والمفید۔ والتحفۃ۔ ع۔ مگر دو رکعتیں سنت اور افضل ہیں۔ م۔ نفل کی طرح۔ ف۔ یعنی بغیر اذان و اقامت و خطبہ کے۔ البتہ یہ کہہ کر آواز لگادی جائے۔ الصلوٰۃ جامعۃ۔ جماعت ہونے والی ہے۔ تاکہ لوگ جمع ہوجائیں۔ ف۔ ھ۔ یہ بھی حدیث سے ثابت ہے۔ اس عربی جملہ کے علاوہ جس محاورہ اور زبان میں ہو وہ جائز ہے۔ سوائے اذان کے۔ م۔ ف۔ ھ۔ فی کل رکعۃ الخ ہر رکعت میں صرف ایک رکوع ہے۔ ف۔ جیسے کہ دوسری نمازوں مشہور و معروف ہے۔ وقال الشافعی الخ اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ ہر رکعت میں دو رکوع ہوتے ہیں۔ ف۔ اس طرح سے کہ نماز شروع کرنے کے بعد سورۂ فاتحہ پڑھ کر خوب دراز قرأت کرے اور رکوع میں چلا

جائے۔ اور دیر تک رکوع میں رہ کر پھر سر اٹھا کر دوبارہ قرأت کرے جو پہلی دفعہ سے کم ہو۔ پھر رکوع کرے اور دیر تک رکوع میں رہے مگر پہلی مرتبہ سے کم ہو۔ پھر سر اٹھا کر **سمع اللہ لمن حمدہٗ ربنا لک الحمد** کہے۔ اور سجدہ کرے۔ اسی طرح دوسری رکعت میں بھی کرے یہاں تک کہ آفتاب کا گہن ختم ہو جائے۔ امام مالک واحمد واسحق رحمہم اللہ کا یہی قول ہے۔ بلکہ امام احمد واسحقؒ سے رکوع کا بھی قول ہے۔ مع۔ واضح ہو کہ اس نماز سے دوسری نمازوں کی طرح مقصود اصلی رضائے الٰہی اور مغفرت اور ثواب کا پانا ہے۔ اس لئے اگر کسی شخص نے نماز کسوف کا ارادہ کئے بغیر صرف نفل نمازیں پڑھ لیں اور دوسرے کسی نے نماز کسوف میں سنت کا ارادہ کر کے ایسے طور پر پڑھی کہ وہ سنت کے خلاف اور فاسد مانی گئی تو پہلا شخص اس شخص سے اچھا رہا۔ لہٰذا احتیاط اسی میں ہے کہ یقین کے ساتھ نماز پڑھے تاکہ آئندہ اس کے باطل ہونے کا احتمال بھی نہ رہے۔ اسی لئے امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ ہر رکعت میں صرف ایک رکوع ہو۔ لیکن امام مالکؒ اور امام شافعیؒ وغیرہم نے اس بات پر نظر فرمائی ہے کہ ان اعمال میں علمی طریق کا ہونا ثواب کے لئے کافی ہے اگرچہ عالم سے اجتہاد میں چوک ہو جائے۔ اس بناء پر روایت کے الفاظ پر عمل اختیار فرمایا ہے۔ **لہٗ ماروت الخ** امام شافعیؒ کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضرت عائشہؓ نے روایت فرمائی ہے۔ ف اس روایت کا مضمون وہی ہے جسے ہم نے اس سے پہلے ہر رکعت میں دو رکوع کرنے کو تفصیل سے بتا دیا ہے۔ اور آخر حدیث میں ہے کہ چار رکعتیں اور چار سجدے پورے ہوئے۔ اور آپ کے نماز سے فارغ ہونے سے پہلے آفتاب روشن ہو گیا۔ پھر کھڑے ہو کر آپ **صلی اللہ علیہ وسلم** نے لوگوں کے سامنے خطبہ دیا۔ اس خطبہ میں اللہ جل شانہٗ کے مناسب حال حمد وثناء فرمائی اس کے بعد مزید یہ فرمایا کہ آفتاب و ماہتاب تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے دو نشانیاں ہیں۔ کسی بھی شخص کے مرنے سے یا پیدا ہونے سے انہیں گہن نہیں لگتا ہے۔ اس لئے تم ان میں سے کسی میں بھی گہن پاؤ تو نماز کے لئے جلدی کرو۔ صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے۔ اور صحیحین میں عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے بھی اس جیسی روایتیں موجود ہیں۔ ف۔ آخر حدیث میں چار رکعتوں سے چار رکوع مراد ہیں۔ اکثر و بیشتر رکعات سے رکوع مراد لیا جاتا ہے استعمال عام اکثری ہے۔ واضح ہو کہ اس کسوف کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرزند جن کا نام ابراہیم تھا اور وہ آپ کی باندی حضرت ماریہ قبطیہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے وہ ڈیڑھ برس کی عمر میں انتقال فرما گئے تھے۔ ان ہی کی نسبت یہ فرمایا تھا کہ جنت میں اس کی دودھ پلائی ہے۔ اس زمانہ میں گہن پڑا تھا تو لوگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ابراہیمؓ کے انتقال کی وجہ سے یہ گہن لگا ہے۔ اسی غلط خیال کو دور کرنے کے لئے آپ نے خطبہ دیا تھا۔ م۔ ف۔ واضح ہو کہ اس بحث میں گہن کی حقیقت بیان نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ انسان کی ابتداء و انتہا میں اس سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا ہے۔ اس کے بارے میں نجومی جو کچھ کہتے ہیں۔ اگر اسے کچھ مان بھی لیا جائے تو اس کا حاصل یہی ہوگا کہ کوئی کسی ابر کی رفتار جان لے کہ وہ اس جگہ سے سیدھا اُلٹا پھرتا ہوا فلاں شہر میں جا کر برسے گا اور میں اس کے پیچھے دوڑتا ہوا گیا تھا۔ اور اس کا نقشہ یہ ہے۔ اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ تو صرف محسوس صورت کا نقشہ ہوگا۔ اور اگر وہ حقیقت جو حکمت الٰہیہ کے اسرار میں ہے وہ بیان کی جائے تو وہ علوم روحانی سے متعلق ہوگا۔ اور جب تک کہ نماز روزہ اور ہمیشہ ذکر وغیرہ سے اس کی یہ استعداد حاصل نہ ہوگی کچھ ظاہر نہ ہوگا۔ اور استعداد آ جانے کے بعد اس کے بیان کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ فافہم۔ م۔

ولنا روایۃ ابن عمر والحال اکشف علی الرجال لقربہم فکان الترجیح لروایتہ.

ترجمہ:- اور ہماری دلیل حضرت ابن عمرؓ کی روایت ہے، ایسی باتوں پر واقفیت مردوں کو اپنے امام سے قریب تر رہنے کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے، اس لئے حضرت ابن عمرؓ کی اس روایت کو ترجیح ہوگی۔

توضیح:- احناف کی دلیل احادیث سے

ولنا روایۃ ابن عمر

اور ہم احناف کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کی روایت ہے۔ ف۔ یعنی اس نماز کسوف کو ابن عمرؓ نے جس طرح

روایت کیا ہے اس میں ایک ہی رکوع کرنا بیان کیا گیا ہے، ہم اسی روایت کو قبول کرتے ہیں والحال اکشف الخ اور نماز کی کیفیت کا حال مردوں پر زیادہ واضح ہوتا ہے امام کے قریب تر ہونے کی وجہ سے۔ف۔ جبکہ ام المومنین حضرت عائشہؓ تو عورتوں کی صف میں امام سے بہت دور تھیں اس لئے اس بات کا احتمال زیادہ ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حقیقت میں ایک ہی رکوع کیا ہو مگر معمول کے بالکل خلاف بہت زیادہ طویل اور دیر تک رکوع کیا ہو اس لئے دور کے لوگوں نے تحقیق حال کے لئے بار بار سر اٹھاتے ہوں پھر ناامید ہو کر رکوع میں چلے گئے ہوں اس لئے دور والوں نے مستقلاً دو رکوع ہی سمجھ لئے ہوں، امام محمدؒ نے آثار میں اسی طرح ذکر کیا ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے، اب جبکہ اس نماز کے واقعہ کے دو راوی ہوئے اور دونوں میں تعارض ہوا تو مجبوراً ہم نے ان میں سے ایک کو راجح اور دوسرے کو مرجوح قرار دیا۔

فکان الترجیح لروایة......الخ

چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت کو ترجیح ہوئی۔ف۔ رسول اللہ ﷺ بحیثیت امام کے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے اصل حال سے زیادہ واقف ہوں گے، میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنفؒ نے جس آسانی سے جواب دیا ہے مسئلہ مذکورہ کو اس جواب سے کہیں زیادہ سخت ہے۔

اب میں اللہ عزوجل کی توفیق سے مقام کے مناسب تحقیق کرتا ہوں، کہ گہن یا کسوف کا اطلاق جس طرح سورج گہن پر ہوتا ہے اسی طرح چاند گہن پر بھی ہوتا ہے، اسی طرح لفظ خسوف کا اطلاق بھی دونوں پر ہوتا ہے لیکن عینیؒ نے فرمایا ہے کہ فقہاء کی عبارتوں میں آفتاب گہن کے لئے لفظ کسوف اور چاند گہن ہونے کے لئے لفظ خسوف مخصوص ہے اور یہ افصح قول ہے، اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کے فعل اور قول میں روایتیں متعدد اور مختلف ہیں، ان میں سے کسی میں صرف معمولی نماز کی طرح پڑھنے کا حکم ہے، اور کسی میں دو رکعتیں اور کسی میں طویل قراءت اور ایک میں ایک رکوع اور کسی میں دو رکوع اور کسی میں تین اور چار رکوع یہانتک کہ دس رکوع تک کا بھی ذکر ہے۔

اب ہم ان تمام روایتوں کو مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں، (۱) ایک مشہور صحابی حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں آفتاب کو خسوف ہوا (گہن لگا) تو آپ اس حال میں باہر تشریف لائے کہ آپ کی چادر مبارک لٹکی ہوئی کھنچی جاتی تھی یہانتک کہ مسجد میں پہونچے اور لوگ بھی جلدی جلدی آگئے تو آپ نے انہیں دو رکعتیں پڑھائیں جیسے کہ تم اپنی نماز پڑھتے ہو۔ رواہ البخاری۔ بظاہر اس میں نہ تو نماز کے طویل ہونے کا ذکر ہے اور نہ ایک ہی رکوع ہونے کا جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہؓ سے دو رکعتیں مذکور ہیں۔

(۲) قبیصہ الہلالیؓ سے سورج گہن میں دو رکعتوں کا طویل قیام کے ساتھ ہونا مذکور ہے، اور یہ کہ سلام پھیرنے پر آفتاب کھل گیا تھا، اور آخر میں فرمایا کہ جب ان نشانیوں کو دیکھو تو نماز پڑھو جیسے سب سے قریب کی فرض نماز، ابوداؤد، نسائی و حاکم اور بیہقیؒ نے اس کی روایت کی ہے، اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اگر آفتاب روشن نہ ہوتا یعنی اس کا گہن ختم نہ ہو گیا ہوتا اور زیادہ دیر تک پڑھتے۔

(۳) حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث میں ہے کہ دو دو رکعتیں پڑھتے جاتے تھے اور پوچھتے جاتے تھے کہ کیا گہن ختم ہو گیا، ابوداؤد، ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے اور ابن عبدالبر اور نوویؒ نے اس کی روایت کی تصحیح کی ہے، اور نعمانؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب آفتاب و ماہتاب کو گہن لگے تو قریب کی نماز جو پڑھ چکے ہو اس کی مثل پڑھو، احمد اور حاکمؒ نے اس کی روایت کی ہے، اس کی روایت ایسی دو روایتوں کا ذکر ہے جو فرض کے مانند ہوں اور چاند گہن میں بھی نماز ہے مگر جماعت کی تصریح کے بغیر۔

(۴) حدیث میں عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کا حوالہ مصنفؒ نے دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کھڑے ہوئے تو اس قدر طول

کیا کہ نہیں لگتا تھا کہ رکوع کریں گے پھر رکوع کیا تو اتنا طویل کیا کہ نہیں لگتا تھا کہ سر اٹھائیں گے، پھر اٹھایا تو نہیں لگتا تھا کہ سجدہ کریں گے پھر سجدہ کیا تو نہیں لگتا تھا کہ اس سے اٹھیں گے، پھر اٹھے تو دوسری رکعت میں بھی پہلی رکعت ہی کی طرح کیا اور بالکل صاف ہو گیا، ابوداؤد و نسائی اور ترمذی نے شمائل میں اور حاکم نے اس کی روایت کی ہے اور عطاء بن السائب راوی کو ایوب السختیانی نے ثقہ کہا ہے۔

(۵) سمرہ بن جندبؓ کی حدیث جو کسوف آفتاب کے بارہ میں ہے کہ جب ایک دو نیزہ آفتاب بلند ہو کر سیاہ ہو گیا تھا، اس میں بھی نہایت طویل قیام کا ذکر ہے، اور یہ کہ ہم لوگ آپ سے کچھ نہیں سنتے تھے ایسے ہی رکوع و سجود میں کسی آواز کے بغیر ہی طول کا ذکر ہے، اسی طرح دوسرے رکعت ہے اور دوسرے میں ہے آفتاب صاف و شفاف ہو گیا اور آخر میں خطبہ ہے ابوداؤد و نسائی و ابن ماجہ اور ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ حدیث حسن صحیح ہے، اور اس میں اس بات کی تصریح بھی ہے کہ قراءت بالکل مخفی تھی۔

(۶) حدیث عائشہؓ ہے اس میں خسوف آفتاب اور ہر رکعت میں دو رکوع ساتھ ہی طول قراءت وغیرہ کا ذکر صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، اس کے آخر میں ہے کہ آفتاب و ماہتاب دونوں اللہ کی نشانیاں ہیں کسی کی موت یا حیات سے ان میں گہن نہیں ہوتا ہے، جب ایسا پاؤ فوراً نماز کے لئے دوڑو، اس سے بظاہر یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ ماہتاب میں گہن لگنے کی صورت میں نماز باجماعت مراد ہے اگرچہ اس کی تصریح نہیں کی گئی ہے، اسی طرح دو رکوع کی روایت ابن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے صحیحین میں موجود ہے، اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ مصنفؒ نے حضرت عائشہؓ کی حدیث کے مقابلہ میں جو دوسری روایت کو ترجیح دی ہے وہ قوی نہیں ہے کیونکہ ابن عباس و ابن عمرو بن العاصؓ سے بھی تو مروی ہے اس بناء پر ابن عمروؓ سے ایسی دو حدیثیں روایت کی گئیں ہیں کہ ان میں سے ایک میں ایک رکوع اور دوسری میں دو رکوع مذکور ہیں، پس اگر نماز کسوف کا واقعہ ایک ہی مرتبہ مانا جائے جیسا کہ مصنفؒ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے تو لامحالہ ابن عمروؓ کی اسی حدیث کو جو صحیحین کی ہے اور اس میں دو رکوع کا بیان ہے ترجیح ہوگی، کیونکہ ہر رکعت میں ایک رکوع کی حدیث ابن عمروؓ میں عطاء بن السائب راوی میں کلام ہے اگرچہ ان کے ثقہ ہونے پر اعتماد بھی ہو، اور سمرہ بن جندبؓ کی روایت البتہ صحیح ہے۔

(۷) حضرت جابرؓ کی حدیث میں کسوف کی دو رکعتوں میں چھ رکوع اور چار سجدے مروی ہیں، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت عائشہؓ اور ابن عباسؓ کی حدیثوں میں بھی ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، بلاشبہ بلا اختلاف یہ سب حدیثیں صحیح ہیں، اور تعجب ہے کہ شافعیہ نے معمولی طریقہ فرائض سے دو رکوع کو تسلیم کیا ہے لیکن اس سے زیادہ کو جائز نہیں کہتے ہیں۔

بلکہ۔ھ۔ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث میں ہے کہ کسوف میں رسول اللہ ﷺ نے پڑھا پھر رکوع کیا و، پھر پڑھا پھر رکوع کیا پھر آخر تک، اس روایت میں ہر رکعت میں چار رکوع اور دو سجدے ہیں، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اسی جیسی حضرت علیؓ کی حدیث میں بھی ہے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، پھر اس حدیث میں صرف کسوف کا لفظ ہے، اور سورۃ یا چاند کسی کی بھی تصریح نہیں ہے۔

(۹) حضرت ابی بن کعبؓ کی حدیث میں کہ سورج گہن کے موقع پر دو رکعتیں اس طرح سے کہ ہر رکعت میں طول قراءت اور پانچ رکوع اور دو سجدوں کا ذکر ہے، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور اس کی اسناد میں ابو جعفر الرازی راوی کے بارے میں کلام ہے، پھر بھی یہ حدیث حسن کے درجہ سے کم نہیں ہے، بلکہ ابو محمد الاشبیلی اور ابن القطان اور ابن الموفق اس اسناد کی تصحیح کی ہے۔ مع۔

(۱۰) ابوداؤد نے ہر رکعت میں دس رکوع اور دو سجدے کی بھی روایت کی ہے، اور ابن عبد البرؒ نے اور ابن حزمؒ نے بھی حضرت ام المومنین عائشہؓ سے دس رکوع کی روایت کی ہے۔ مع۔

اب جبکہ ساری روایتیں بالتفصیل معلوم ہو چکیں تو جاننا چاہئے کہ سروجیؒ نے کہا ہے کہ اس نماز کی نقل تو ایک حد تک لازم تھی، اور جب اتنا زیادہ اضطراب پایا گیا تو ہم نے اس میں سے نماز کے اسی طریقہ کو قبول کیا ہے جس کی اصل شریعت میں موجود ہے، یعنی حضرت نعمان و سمرہ و ابن عمرؓ اور عبدالرحمٰن بن سمرہؓ وغیرہم کی حدیث کے موافق، اور فرائض اور سنن سب میں ایک ہی رکوع ہے، عینیؒ نے اعتراض کیا ہے کہ ایک ہی طرح سے نقل اس صورت میں لازم آتی کہ رسول اللہ ﷺ نے صرف ایک ہی مرتبہ کسوف کی نماز پڑھی ہوتی، حالانکہ بعضوں نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے کسوف میں بارہا نماز پڑھی ہے، تو جس نے جیسی نماز دیکھی ویسی بیان کی ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ دس برس کی مدنی زندگی میں سورج گہن چھ مرتبہ ہونا عقل سے بہت دور ہے اور یہ بھی مان لیا جائے تو بھی ہماری رائے بہتر اور اولی ہے، کیونکہ جب آپ کا آخری عمل معلوم نہ ہوا تو تعارض پیدا ہو گیا، پس اس نماز کو ایک عام مسنون نماز قرار دے کر اس کی کیفیت معمولی نمازوں کے موافق ادا کرنا اولی ہوا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شافعیہ کو یہ بات تسلیم نہ ہو کہ چھ بار گہن ہونا بعید ہو وہ بھی صرف دس سال کے عرصہ میں، اب یہ کہنا کہ ان روایتوں میں تعارض پیدا ہوتا ہے تو اس میں کلام ہے، کیونکہ جب بعض اسلاف نے اس بات کی تصریح کر دی کہ کئی بار کسوف کی نماز پڑھی گئی ہے تو تعارض نہیں رہا، لیکن بدائع میں شیخ ابو منصور ماتریدیؒ سے نقل کیا ہے کہ اگر اختلاف روایات کا یہ مطلب ہو کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ پر چاہو نماز پڑھو تو ائمہ مجتہدین کا آپس میں کوئی اختلاف نہ ہوتا، جس سے معلوم ہوا کہ پہلا طریقہ بعد کے طریقہ سے منسوخ ہو گیا ہے۔

اور عینیؒ نے کہا ہے کہ اس مقام پر عمدہ اور صحیح جواب یہ ہے کہ ہر ایک مجتہد نے اسی حدیث کو اختیار کیا ہے جو اس کے طریقہ اور قانون اجتہاد کے موافق ہو، چنانچہ امام ابو حنیفہؒ نے اس کسوف کی نماز کو دوسری عام نمازوں کی کیفیات پر قیاس کر کے ایک رکوع اور دو سجدوں کا حکم دیا ہو اور شوافع میں سے ابو اسحٰق مزوری و ابو طیبؒ نے کہا ہے کہ ہماری احادیث کی بنیاد اور مقصد اصل مستحب ہونے پر ہے کہ کون سا عمل مستحب ہے اور دوسروں کی حدیثوں کی بنیاد جواز پر ہے کہ کون سی صورت جائز ہے اختصار کے ساتھ ختم ہوا، اب میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح کہا جائے کہ نماز کسوف کی ابتداء مدینہ منورہ میں نہیں ہوئی اور تمام صورتیں جائز ہیں، لیکن قول مختار بلکہ احتیاط کرنے کی صورت یہ ہے کہ عموماً لوگوں کے واسطے ہر رکعت میں ایک رکوع کے ساتھ معمولی طور پر ہو، خواہ دو رکعتوں کی نماز ہو یا چار رکعتوں کی تو اولی ہے، کیونکہ اس نماز میں اصل یہ ہے کہ پورے گہن کے وقت میں نماز پڑھتے رہنا ہو، اور احتیاط کی صورت یہ ہو کہ اس کے جائز ہونے میں شک نہ ہو، اچھی طرح سمجھ لیں، واللہ تعالی اعلم۔ م۔

ویطول القراء ة فیهماویخفی عند ابی حنیفة وقالا یجهر وعن محمد مثل قول ابی حنیفة اما التطویل فی القراء ة فبیان الافضل ویخفف ان شاء لان المسنون استیعاب الوقت بالصلوة والدعاء فاذا اخفف احدهما طول الاخر واما الاخفاء والجهر فلهما روایة عائشة انه ﷺ جهر فیها ولابی حنیفة روایة ابن عباس وسمرة ابن جندب والترجیح قدمر من قبل کیف وانها صلوة النهار وهی عجماء.

ترجمہ:- اور دونوں رکعتوں میں قراءت کو طویل کرے اور آہستہ پڑھے، امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک، اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ جہر کرے، اور امام محمدؒ سے امام ابو حنیفہؒ کے قول کے موافق بھی منقول ہے، اور قراءت کو طویل کرنا افضلیت کو بیان کرنا ہے، اور آہستگی کے ساتھ قراءت کرے اگر جی چاہے، کیونکہ اصل مسنون تو یہ ہے کہ اس گہن کے پورے وقت میں نماز اور دعا میں مشغول رہے، اگر ان میں سے کسی ایک کو کم کیا ہو تو دوسری کو زیادہ کر دے، اور نماز کو آہستہ اور زور سے پڑھنے کے سلسلہ میں حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس میں جہر کیا ہے اور ابو حنیفہؒ کی دلیل حضرت ابن عباسؓ اور سمرۃ بن جندبؓ کی روایت ہے، اور ترجیح کی وجہ ہم نے اوپر میں بیان کر دی ہے، اور یہ بھی ہے کہ وہ تو دن کے وقت کی نماز ہے جس میں قراءت آہستہ کی جاتی ہے۔

توضیح:- نماز کسوف میں قراءت، جہر و اخفاء، احادیث سے دلیل

ویطول القراءة فیهما ویخفی عند ابی حنیفة......الخ

اور دونوں رکعتوں میں قراءت طویل کرے۔ف۔ جیسا کہ بعض روایتوں میں ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ بقرہ کے انداز سے اور دوسری رکعت میں آل عمران کے انداز سے پڑھے۔ مع۔ اس کے بعد اگر اور بھی دو رکعتیں پڑھنے کا وقت ہو تو بھی اسی کے انداز سے ہونا افضل ہے، یعنی فقط ایک ہی بار دو رکعتیں پڑھ لینے پر بس کرنا نہیں ہے **ویخفی الخ** اور دونوں میں قراءت کو آہستہ کرے، یہ امام ابو حنیفہؒ کا مذہب ہے۔ف۔ یہی صحیح ہے۔المضمرات۔ اور یہی قول امام مالکؒ و شافعیؒ کا بھی ہے۔ع۔

وقالا یجهر وعن محمد مثل قول ابی حنیفة اما التطویل فی القراءة......الخ

لیکن صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ جہر کرے۔ف۔ اور یہی قول امام احمد کا **وعن محمد الخ** اور امام محمدؒ سے امام ابو حنیفہؒ کے مثل قراءت کرنا ہے بعض اخفاء کے ساتھ۔ف۔ عام روایتوں میں یہی ہے۔البدائع۔ الحاصل اس جگہ دو باتیں ہوئیں (۱) قراءت کو طویل کرنا (۲) اور قراءت میں جہر کرنا **اما التطویل الخ** پس قراءت میں طول دینا تو افضلیت پر عمل کرنا ہے۔ف۔ یعنی رسول اللہ ﷺ کی اتباع کرتے ہوئے قراءت کو طویل کرنا افضل ہے۔ع۔

ویخفف ان شاء لان المسنون استیعاب الوقت بالصلوة والدعاء......الخ

اور اگر چاہے تو قراءت میں تخفیف کرے **لان المسنون الخ** اس لئے کہ اصل مسنون تو یہ ہے کہ کسوف کے وقت کو نماز اور دعا میں مشغول رکھنا چاہئے، اس لئے کسی ایک کو طویل کرے تو دوسرے کو مختصر کرے۔ف۔ اور حق بات یہ ہے کہ قراءت ہی کو طویل کرنا مسنون ہے، اور پورے وقت میں نماز و دعاء کرتے رہنا مستحب ہے، کیونکہ حضرت مغیرہؓ کی حدیث میں ہے کہ پھر جب تم ان چیزوں کو دیکھو تو اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور نماز پڑھو یہانتک کہ آفتاب روشن ہو جائے، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت عائشہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب تم کسوف کو دیکھو تو ذکر الٰہی میں لگ جاؤ یہانتک کہ وہ روشن ہو جائے، اس سے پہلے کے فرض نماز کے مثل پڑھنے کا حکم دیا، اس لئے اگر دوپہر سے پہلے کسوف کی کیفیت ہو تو اس سے پہلے فرض نماز فجر ہے لہٰذا اس کے مثل دو رکعتیں اور اگر زوال کے بعد ہو تو نماز ظہر کے مثل آہستگی کے ساتھ پڑھنا پایا گیا، اسی بناء پر امام اعظمؒ سے چار رکعتیں پڑھنے کی بھی روایت پائی گئی ہے، جیسا کہ محیط میں ہے، بنابریں حق بات وہی ہے جو مصنفؒ نے بیان کی ہے۔ واللہ اعلم۔م۔

اور اب دوسری بات کی تفصیل **واما الا اخفاء الخ** اخفاء اور جہر کے بارے میں۔ف۔ تو اس میں اختلاف ہے **فلهما الخ** چنانچہ صاحبینؒ کی یا فقط ابو یوسفؒ کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں جہراً قراءت کی ہے، اور امام اعظمؒ کی دلیل حضرت ابن عباسؓ اور سمرہؓ کی حدیث ہے۔ف۔ حضرت عائشہؓ کی حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نماز خسوف جہر کیا ہے، بخاری اور مسلم اس کی روایت کی ہے، اور حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ میں نماز کسوف میں جہر سے پڑھنے کا بیان ہے ابوداؤد و ترمذی اور ابن حبان نے اس کی روایت کی ہے، پس معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ کی حدیث میں خسوف سے مراد سورج گہن ہے۔ مع۔ میں کہتا ہوں کہ کسوف و خسوف دونوں گہن میں مستعمل ہیں۔ لہٰذا یہ تاویل بے وجہ ہے ——— بلکہ کسوف مراد خسوف ماہتاب چاند گہن ہے، کیونکہ رات کی نماز جہراً ہوتی ہے۔م۔ اور حضرت ابن عباسؓ کی حدیث یہ ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کسوف کی نماز پڑھی تو آپ سے قراءت کا ایک لفظ بھی نہیں سنا، اس کی روایت احمد، ابو یعلی، ابو نعیم، طبرانی اور بیہقیؒ نے کی ہے، اور سمرہؓ کی حدیث تو اوپر گذر چکی ہے، ترمذی نے اس کی تصحیح بھی کی ہے، **والترجیح الخ** ترجیح اوپر گذر چکی ہے۔ف۔ کہ حضرت عائشہؓ بحیثیت ایک عورت کی روایت کے مقابلہ میں مردوں کی روایت قابل ترجیح ہوگی، کیونکہ عورتوں کی بہ نسبت یہ مرد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نماز میں زیادہ قریب رہتے تھے اس لئے ہر بات کی پوری خبر انہیں مل جاتی

تھی، اور اس کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کسوف کی نماز کا واقعہ صرف ایک ہی مرتبہ پیش آیا تھا، بلکہ ترجیح کی بہترین صورت یہ ہو گی کہ کسوف کی نماز میں اخفاء یعنی آہستگی سے پڑھنا متعین ہے لیکن کبیت الصلوۃ النهار الخ اور دن کی نماز کی قراءت آہستگی کے ساتھ متعین کیوں نہ ہو گی جبکہ کسوف تو دن کی نفل نماز میں سے ہے، اور دن کی نماز عجماء ہوتی ہے۔ ف۔ یعنی اس کی قراءت سنائی نہیں دیتی ہے جیسا کہ جانور عجماء اس لئے کہے جاتے ہیں کہ ان کی باتیں بھی سننے میں نہیں آتی ہیں، یا عجمی انسان کہ اس کی زبان سے بھی صاف بات نہیں نکلتی ہے اور سننے میں نہیں آتی ہے۔ مع۔ مختصر یہ ہے کہ نماز پڑھی جائے۔

ویدعو بعدها حتی تنجلی الشمس لقوله ﷺ اذا رائیتم من هذه الا فزاع شیئا فارغبوا الی الله بالدعاء والسنة فی الادعیة تاخیرها عن الصلوة ویصلی بهم الامام الذی یصلی بهم الجمعة وان لم یحضر صلی الناس فرادی تحرزا عن الفتنة.

ترجمہ:۔ نماز ختم ہو جانے کے بعد امام دعا کرے اتنی دیر کہ آفتاب کا گہن ختم ہو کر روشن ہو جائے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جب تم اس قسم کی کوئی پریشان کن بات دیکھو تو اللہ کی طرف دعا مانگتے ہوئے آگے بڑھو، دعا میں سنت یہ ہے کہ نماز کے بعد کی جائے، ان کو وہی امام نماز پڑھائے جو انہیں جمعہ کی نماز پڑھاتا ہے، اور اگر یہ امام موجود نہ ہو سکے تو پھر لوگ تنہا تنہا نماز پڑھ لیں، فتنہ سے بچنے کے لئے۔

توضیح:۔ نماز کسوف کے بعد دعا، حدیث سے دلیل، شرط امامت و جماعت

ویدعو بعدها حتی تنجلی الشمس لقوله ﷺ اذا رائیتم من هذا الا فزاع شیئا......الخ

اور نماز کے بعد دعا کرے۔ ف۔ خواہ قبلہ رخ بیٹھے یا کھڑے کھڑے خواہ لوگوں کی طرف منہ کر کے، اسی طرح لوگ آمین کہے جائیں، اور یہ زیادہ اچھا طریقہ ہے، اور اگر کھڑے ہو کر کسی عصا وغیرہ پر ٹیک لگا لے تو اور بھی اچھا ہے۔ المحیط۔ اور برابر دعا کرتا رہے، حتی تنجلی الخ یہانتک کہ آفتاب روشن ہو جائے۔ ف۔ کیونکہ دعاء کی مقبولیت کے لئے نماز کو مقدم ہونا ہے۔ مع۔ لقوله الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب تم گھبرا دینے والی چیزوں کو دیکھو تو اللہ تعالیٰ کی طرف دعا کے لئے رغبت کرو۔ ف۔ رواه ابوسلیمان عن محمد باسناده الی الحسن البصری مرفوعا، اور مرسل ہمارے نزدیک حجت ہے۔ مع۔ اور صحیحین کی حضرت مغیرہ بن شیبہؓ کی روایت ہے اس ہی مفہوم کی گذر چکی ہے۔ مفع۔ جب معلوم ہو گیا کہ کسوف و خسوف میں دعا و تضرع کا حکم تو اسی طریقہ سے دعا مانگنی چاہئے جس طرح سے اس کی تعلیم ہوئی ہے۔

والسنة فی الادعیة تاخیرها عن الصلوة......الخ

اور دعا مانگنے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ اس سے پہلے نماز پڑھ لی جائے۔ ف۔ اسی لئے یہاں نماز پہلے پڑھی گئی ہے، اور ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ کون سی دعا زیادہ مقبول ہے، پھر خود فرمایا کہ رات کے آخری حصہ کے درمیان کی اور فرض نماز کے بعد کی، نسائی اور ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، یہ تو فرض کے بعد کی، حضرت معاذؓ کی حدیث میں ہے کہ اے معاذ! میں تم کو دوست رکھتا ہوں اور وصیت کرتا ہوں کہ اس دعا کو کبھی نہ چھوڑنا یعنی ہر نماز کے بعد یہ کہنا اللهم اعنی علی ذکرك وشکرك وحسن عبادتك، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، مغیر بن شعبہؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ہر نماز کے بعد دعا کرتے تھے، بخاریؒ نے اپنی تاریخ اوسط میں اس کی روایت کی ہے۔ مع۔ اگر لوگ جمع ہو کر بغیر نماز کے دعا مانگیں تو بھی کافی ہے، خزانۃ المفتیین۔ ھ۔

ویصلی بهم الامام الذی یصلی بهم الجمعة وان لم یحضر صلی الناس فرادی تحرزا عن الفتنة......الخ

کسوف کی نماز ان لوگوں کو وہی امام پڑھائے جو جمعہ پڑھاتا ہے۔ ف۔ یعنی جس امام کو جمعہ پڑھانے کا اختیار ہے اسی کی امارت

سے یا اسی کی اجازت دوسرا کوئی پڑھا سکتا ہے۔م۔ وان لم یحضر الخ اگر امام حاضر خود نہ ہوا۔ف۔اور نہ کسی دوسرے کو امامت کی اجازت دی تو لوگ تنہا تنہا نماز پڑھ لیں۔ف۔اگر چہ سب اکھٹے موجود ہو چکے ہوں۔المحیط۔تحرزا الخ فتنہ کھڑا ہونے سے بچنے کے لئے۔ف۔میں مترجم کہتا ہوں کہ جمعہ کے بیان میں جس فتنہ کا ذکر کیا گیا ہے کسی بھی مجمع میں فاسق اور باغی اس قسم کا فتنہ نہ کر سکیں۔اچھی طرح سمجھ لیں۔م۔یہاں تک سورج گہن سے متعلق گفتگو ہوئی،اب چاند کے گہن یعنی خسوف کا بیان ہو گا۔

ولیس فی خسوف القمر جماعة لتعذر الاجتماع فی اللیل أو لخوف الفتنة وانما یصلی کل واحد بنفسه لقوله علیه السلام اذا رأیتم شیئا من هذه الاهوال فافزعوا الی الصلوة ولیس فی الکسوف خطبة لانه لم ینقل .

ترجمہ:-اور چاند گہن میں جماعت نہیں ہے،رات کے وقت میں سب کا اکھٹے ہونا انتہائی مشکل بات ہونے کی وجہ سے یا فتنہ کی خوف سے،اس لئے ہر شخص اپنی اپنی نماز پڑھے گا رسول اللہ علیہ السلام کی اس فرمان کی وجہ سے کہ جب ان پریشان کن باتوں کو دیکھو تو گھبراتے ہوئے نماز کی طرف بڑھو،اور اس چاند گہن میں خطبہ نہیں ہے کیونکہ خطبہ منقول نہیں ہوا ہے۔

توضیح:-چاند گہن اور خطبہ،چند ضروری مسائل،اجتماع کے بعد نماز سے پہلے گہن باقی نہ رہا،گہن کچھ کم ہو گیا،گہن لگا پھر بادل چھا گیا،کسوف کی حالت میں غروب،کسوف کے وقت جنازہ آگیا،نماز کے ممنوع اوقات میں گہن لگنا،آفتاب نکلتے وقت گہن لگنا،ہولناک چیزوں کے وقت نماز

ولیس فی خسوف القمر جماعة لتعذر الاجتماع فی اللیل......الخ

اور چاند کے گہن میں جماعت نہیں ہے۔ف۔یہ پوری عبارت امام محمدؒ کے الفاظ ہیں اور کسوف و خسوف دونوں میں مستعمل ہے۔مع۔بعض نسخوں میں کسوف القمر بھی ہے۔م۔ لتعذر الخ خواہ اس وجہ سے کہ رات کے وقت لوگوں کا مجتمع ہونا سخت مشکل ہے یا اس وجہ سے کہ فتنہ کا خوف رہتا ہے۔ف۔کیونکہ رات میں لوگوں کا اکھٹا ہونا فتنہ سے کم ہی خالی ہوتا ہے۔ع۔اور یہ بھی ممکن ہے کہ چاند گہن آدھی رات کے بعد ہو تو اس وقت بالخصوص جمع ہونا مشکل ہو گا۔م۔ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے آفتاب و ماہتاب کی آٹھ رکوع چار سجدوں کے ساتھ نماز پڑھی،دار قطنی بہت ہی عمدہ سند کے ساتھ اس کی روایت کی ہے،یعنی دو رکعتوں کی نماز کے ہر رکعت میں چار رکوع کئے۔م۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام چاند اور سورج کے گہن کے موقع پر چار رکوع اور چار سجدے سے نماز پڑھتے تھے،اس کی روایت بھی دار قطنی نے کی ہے،اس کی اسناد میں سعید بن حفص ہیں جو غیر معلوم شخص ہیں،مگر ان دونوں حدیثوں میں صرف نماز کا بیان ہے،اور جماعت کی تصریح نہیں ہے جبکہ کوئی بھی حدیث ہو اس میں صراحت کے ساتھ بیان ہونا چاہئے۔الفتح۔

اگر یہ کہا جائے کہ آپ نے کسوف میں جماعت سے نماز پڑھی ہے تو خسوف میں بھی یہی مراد ہو گی،ورنہ ایک ہی لفظ میں دونوں جمع ہو جائیں گے،جواب یہ ہے کہ اس میں نماز پڑھنے والے سے مراد خود رسول اللہ علیہ السلام ہیں،یہ لفظ تو آپ ہی کی نماز میں ہے،اور کسوف میں جماعت کے ہونے کا علم دوسری حدیثوں سے ہوا ہے۔م۔

وانما یصلی کل واحد بنفسه لقوله علیه السلام اذا رأیتم شیئا من هذا الاهوال فافزعوا الی الصلوة......الخ

اور خسوف قمر میں بھی یہی ہو گا،یعنی ہر شخص بذات خود تنہا نماز پڑھے گا،اس حدیث کی بنا پر کہ اذا رأیتم الخ یعنی جب تم ان ہولناک چیزوں میں سے کچھ بھی دیکھو تو ڈر کو ختم کرتے ہوئے نماز پڑھنے میں لگ جاؤ۔ف۔صحیحین میں حضرت عائشہؓ کی حدیث میں فاذا رأیتم ذلك فافزعوا الخ اور مغیرہؓ کی حدیث میں ہے فاذا رأیتم شیئا من ذلك فافزعوا الخ،خلاصہ یہ ہے کہ ایسی ہولناک اور پریشان کن چیزوں کے دیکھنے پر نماز کا حکم دیا تو نماز مستحب ہوئی مگر جماعت نہیں ہوئی۔م۔یہی قول امام مالکؒ کا بھی ہے،لیکن امام شافعیؒ واحمد اور اسحٰقؒ کے نزدیک جماعت ہونی چاہئے۔مع۔امام شافعیؒ کے استدلال کے لئے وہ حدیث مناسب

ہے جو حضرت عائشہؓ سے بیان کی گئی ہے، کہ نماز خسوف میں رسول اللہ ﷺ نے جہراً قراءت کی ہے۔ الخ۔ بخاری و مسلم نے اس کی روایت کی ہے، لیکن یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کہ اس میں خسوف چاند گہن سے کسوف سورج گہن مراد ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس صورت میں حضرت ابن عباسؓ کی ظاہر حدیث جو دار قطنی نے جید اسناد سے روایت کی اور نعمان بن بشیرؓ کی وہ حدیث جو اوپر گذر گئی ہے دونوں میں چاند گہن کے وقت جماعت کے ساتھ نماز مراد ہوگی، اور مصنفؒ نے جماعت کی مخالفت میں جو دلیل دی ہے کہ رات کے وقت سبھوں کا اکٹھے ہونا مشکل اور ناممکن ہے، اس میں بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر رات کے ابتدائی وقت میں ہو تو جمع ہو جانا ممکن ہوگا، اور جماعت جائز ہوگی، عینیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ایک قول یہ ہے کہ جماعت جائز ہے لیکن سنت نہیں ہے، اس بناء پر اختلاف یہ ہوگا کہ امام ابو حنیفہ و صاحبین و امام مالکؒ کے نزدیک جماعت مسنون نہیں ہے، لیکن امام شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک سنت ہے۔ م۔

ولیس فی الکسوف خطبة......الخ

اور کسوف میں خطبہ نہیں ہے۔ ف۔ اس بناء پر جب چاند گہن میں جماعت ہی مسنون نہیں ہوئی تو خطبہ بھی نہیں ہوگا، اور سورج گہن میں اگر چہ جماعت مسنون ہے پھر بھی ہمارے نزدیک اور امام مالکؒ کے نزدیک خطبہ نہیں ہے لانہ الخ کیونکہ خطبہ پڑھنا منقول نہیں ہے۔ ف۔ یعنی شہرت کے طور پر منقول نہیں ہے۔ النہایہ۔ بلکہ لوگوں کو ابراہیم بن رسول اللہ ﷺ کی وفات سے گہن کا شبہ ہوا تھا اس شبہ کو دور کرنے کے لئے خطبہ دیا تھا، اور وہ بات باقی نہ رہی۔ الفتح۔ علامہ عینیؒ نے ان تمام باتوں کو اس دلیل سے رد کر دیا ہے کہ حضرت اسماء بنت ابو بکر الصدیقؓ کی حدیث جو بخاری اور مسلم نے روایت کی ہے اور اس میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہونے کے بعد کھڑے ہوئے اور لوگوں کو خطبہ دیا، اس میں آپ نے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کی جو اس کی شان کے مناسب ہے، پھر فرمایا کہ سورج اور چاند تو اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہیں ان میں کسی کی موت و حیات سے گہن نہیں ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ ان گہن سے اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، اور یہ کہ اس سے پہلے ایسی کوئی چیز جو نہیں دیکھی تھی وہ سب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس مقام پر کھڑے ہونے سے دکھلا دی یہاںتک کہ مجھے جنت اور دوزخ بھی دکھلا دئے، اور مجھے اس بات کی وحی کی گئی ہے کہ تم لوگ اپنی قبروں میں امتحان میں ڈالے جاؤ گے، جو فتنہ دجال کے قریب ہوگا، آخر تک، بخاری اور مسلم نے ابن عباسؓ کی حدیث سے خطبہ روایت کیا ہے۔

فقال انی رأیت الجنة الخ، اور اس خطبہ میں یہ بھی ہے کہ میں نے آج جو چیزیں دیکھی ہیں کبھی نہیں دیکھیں۔ آخر تک اور حضرت عائشہؓ سے بخاری کی روایت ہے کہ اے امت محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر غیرت والا اس بات میں کوئی نہیں ہے کہ اپنے غلام یا باندی کو زنا کرتا ہوا دیکھے۔ آخر تک۔ حضرت جابرؓ سے مسلم کی روایت کہ اس وقت میرے سامنے جہنم لائی گئی جب تم نے دیکھا ہوگا کہ میں نماز میں۔ آخر تک۔ امام احمدؒ نے حضرت سمرۃؓ سے، اور ابن حبان نے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کی حدیث سے خطبہ روایت کیا ہے، اور عینیؒ نے کہا ہے کہ نہایہ وغیرہ میں جب نفل کے ہونے کا اقرار لازم آیا تو یہ تاویل کی کہ اس سے خطبہ مقصود نہیں تھا، میں مترجم کہتا ہوں کہ سبحان اللہ! اسے خطبہ کیوں نہیں کہا جائے گا جبکہ اس خطاب میں حمد و ثنا اور وعظ و نصیحت وغیرہ اور جو باتیں اس وقت کے حال کے مناسب تھیں سب بیان فرمادی تھیں، منبر پر چڑھ کر، جیسا کہ امام احمد و نسائی و ابن حبان کی روایتوں میں صراحت کے ساتھ ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنفؒ کے کلام کی بنیاد اس بات پر ہے کہ کسوف ایک ہی مرتبہ ہوا ہے، اور اس میں خطبہ کی جو روایت پائی گئی ہے اس کا مقصد ہے تمام لوگوں کو اس بات پر تنبیہ کرنی کہ یہ کسوف ابراہیم کی موت کی وجہ سے نہیں ہوا ہے، اس کے علاوہ ضمناً کچھ اور باتیں بھی بتادی گئی ہیں اور اگر کسوف کئی بار ہوا اور ہر بار خطبہ بھی ہو تو اس کے لئے ثبوت چاہئے ورنہ صرف احتمالی باتیں ہیں، لہٰذا مصنفؒ کے کلام کے معنی یہ ہوئے کہ اس بات کی کوئی روایت ثابت نہیں ہوئی کہ خطبہ کسوف کی نماز کے

واسطے ہوا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کا جو عمل خطبہ کی صورت میں منقول ہے اس کے مقصد میں احتمال ہے کہ شاید لوگوں کے ذہن میں جو وہم ہے اسے دور کر دیا جائے، اور اس بات کے لئے کوئی ایسی روایت نہیں پائی گئی ہے کہ کسوف کی نماز متعدد بار ہوئی تھی اور ہر بار ایک خطبہ بھی دیا گیا تھا، اس کے بغیر دعوی ثابت نہیں ہو سکتا ہے، البتہ اتنی بات لازم آئے گی کہ یوں کہا جائے کہ اس نماز کے واسطے کوئی خطبہ نہیں ہے، اس کے باوجود اگر امام خطبہ دیدے تو جائز بھی ہے، اور لوگوں کو سننا بھی چاہئے، اچھی طرح سمجھ لیں۔۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

چند ضروری مسائل

اگر اجتماع کے بعد نماز سے پہلے پورا گہن ختم ہو جائے تو نماز نہ پڑھی جائے، اور اگر کچھ گہن ختم ہو گیا ہو تو خواہش ہونے سے نماز پڑھی جا سکتی ہے آفتاب ہوا ہو تو مغرب کا فرض ادا کر لیا جائے، اگر کسوف کے وقت جنازہ آگیا تو نماز جنازہ پہلے پڑھی جائے، اگر ممنوع اوقات میں گہن ہوا ہو تو اس وقت نماز نہ پڑھی جائے، یہاںتک کہ آفتاب اتنا اونچا ہو جائے کہ اس وقت نماز پڑھی جا سکتی ہو تو نماز پڑھ لے، امام مالکؒ اور احمد وغیرہ علماء کا یہی قول ہے، لیکن امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔ مع۔ اگر اس قسم کی گھبرا دینے والی چیزیں سامنے آنے لگیں مثلاً سخت طوفان آندھی، مسلسل زور دار بارش، اور آسمان سرخ ہو جانا، دن میں بے وجہ اندھیرے چھا جانا، مرض وباء وغیرہ کا عام ہو جانا۔ السراجیہ۔ بار بار زلزلہ آتے رہنا، بجلیاں گرنا، تارے ٹوٹنا، رات کے وقت حیرت انگیز روشنی کا پھیل جانا، دشمنوں کا اکثر خوف رہنا۔ التبیین۔ ایسی صورتوں میں ہر فرد تنہا تنہا اپنے گھروں میں نماز پڑھ لے۔ السراجیہ والبدائع۔ اور اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگے، امام شافعیؒ کے نزدیک بھی نماز بغیر جماعت کے ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حکم حدیث کے اس بیان سے ماخوذ ہے کہ **انما هذه الايات يخوف الله بها**، یعنی یہ علامات تو یہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے خوف دلاتا ہے، ابوداؤد اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے، قبیصہ الہلالیؓ کی حدیث سے جس میں جمع کا لفظ لا کر تمام مخلوقات کو شامل کر لیا گیا ہے، اس طرح ان علامات کے وقت نماز پڑھنا اس حدیث سے ثابت ہے لہٰذا نماز بدعت نہ ہوئی، جیسا کہ ابن حجرؒ کے حوالہ سے درمختار میں نقل کر کے نماز بدعت حسنہ قرار دی گئی ہے، کیونکہ جو بات نص سے ثابت ہوا سے بدعت نہیں کہا جا سکتا ہے۔ م۔ واللہ تعالیٰ أعلم۔

باب الاستسقاء

قال ابوحنيفةؒ ليس فى الاستسقاء صلوة مسنونة فى جماعة فان صلى الناس وحدانا جاز و انما الاستسقاء الدعاء والاستغفار لقوله تعالى فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ اِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا الاية و رسول الله ﷺ استسقى ولم ترو عنه الصلوة

ترجمہ:-باب استسقاء کے بیان میں امام ابوحنیفہؒ نے کہا ہے کہ استسقاء میں جماعت کے ساتھ مسنون نہیں ہے، اس لئے اگر لوگ نماز پڑھنی چاہیں تو تنہا تنہا پڑھ سکتے ہیں اور یہ جائز ہے، استسقاء تو دعا اور استغفار کا مجموعہ ہے، اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے کہ میں نے کہا کہ تم اپنے رب سے مغفرت چاہو، یقیناً وہ بہت زیادہ مغفرت کرنے والا ہے، پوری آیت، اور رسول اللہ ﷺ نے پانی پانے کی دعا مانگی، لیکن آپ سے نماز پڑھنے کی روایت نہیں کی گئی ہے۔

توضیح:-باب استسقاء کے احکام، استسقاء کے معنی، استسقاء کا طریقہ، مسجد میں، میدان میں

جانے کی مدت، حالت، امام کا نہ جانا، استسقاء میں نماز، دعاء کے واسطے ہاتھ اٹھانا

باب الاستسقاء...... الخ

باب استسقاء کے احکام میں، مصنفؒ نے صلوۃ الاستسقاء نہ کہہ کر باب استسقاء اس لئے کہا ہے کہ امام اعظمؒ کے نزدیک اس میں نماز پڑھنا مسنون نہیں ہے، بلکہ اس لفظ سے نماز اور دوسری تمام باتوں کو اس میں شریک کر لیا، استسقاء کے معنی میں سیر ابی چاہنا، واضح ہو کہ استسقاء ایسے مقام پر ہوتا ہے کہ جہاں دریا، جھیل اور چشمہ وغیرہ نہ ہوں، جن سے خود پی سکیں اور اپنے جانوروں کو پلا سکیں کھیتی میں پانی دے سکیں یا یہ کہ چیزیں بھی ہوں مگر ضرورت ان سے پوری نہ ہوتی ہو، اور اگر پانی کی پوری ضرورت کافی ہو جاتی ہو تو پھر استسقاء کے لئے نکلنے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ استسقاء کا عمل تو انتہائی ضرورت کے وقت ہوتا ہے، پھر جب استسقاء کرنا ہی ہو تو مستحب ہے کہ امام ان لوگوں کو تین دنوں تک روزے رکھنے اور توبہ کرنے کا حکم دے، پھر چوتھے روز ان کو لے کر نکلے۔ د۔ پھر اگر مکہ میں یا بیت المقدس میں ہو مسجد میں جمع ہوں۔ ف۔

اور اگر دوسری جگہ ہو تو امام ان سبھوں کو لے کر چٹیل میدان کی طرف جائے، اور پانی پانے کے پورا امیدوار ہو کر رحم کی درخواست کرے، اور مائیں اپنے بچوں کو خود سے دور کر دیں، اسی طرح جانوروں کے ساتھ بھی کیا جائے اور نکلنے سے پہلے جس سے جو ممکن ہو صدقہ وخیرات کرے، پھر از سر نو توبہ واستغفار کرے۔ ف۔ مستحب ہے کہ تین دن تک امام کے ساتھ نکلے، اس سے زیادہ منقول نہیں ہے، وہاں منبر نہ لے جائیں، بلکہ پیدل جائیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ذلیل بنے ہوئے اللہ تعالیٰ کے دربار میں سر جھکائے خشوع وخضوع کے ساتھ نکلیں۔ الظہیریہ۔ اگر امام خود نہ جائے تو کسی کو اپنا قائم مقام بنا کر لوگوں کو جانے کی اجازت دے، اگر اجازت نہ دے تو بھی جائز ہے کہ لوگ بلا اجازت چلے جائیں۔ التجرید۔ ضعیفوں، محتاجوں، اپاہج، بوڑھوں اور بوڑھیوں اور بچوں کا واسطہ دے کر اللہ تعالیٰ سے جو ارحم الراحمین ہے پانی کی دعا مانگیں۔ الداریہ۔ ع۔ کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ انما ترزقون بضعفائکم یعنی انہیں محتاجوں ضعیفوں کے وسیلہ سے تم رزق پاتے ہو۔ م۔

قال ابو حنیفةؒ لیس فی الاستسقاء صلوة مسنونة فی جماعة فان صلی الناس وحدانا جاز...... الخ

امام ابو حنیفہؒ نے فرمایا ہے کہ استسقاء کے لئے کوئی نماز جماعت کے ساتھ مسنون نہیں ہے۔ ف۔ معلوم ہونا چاہئے کہ فقہاء کے نزدیک مسنون سے وہ فعل مراد ہوتا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ نے پابندی کے ساتھ کیا ہو، یعنی ہمیشہ کیا ہو، مگر جواز بتانے کے لئے کبھی کبھی ترک بھی کر دیا ہو، استسقاء کی نماز میں اختلاف ہے، ذخیرہ میں ہے کہ اگر تنہا نماز پڑھ لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ ھ۔ اور اگر جماعت کریں تو ابن الہمامؒ نے حاکم شہید کی کافی کی عبارت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ جماعت مکروہ ہے، اور شیخ الاسلام خواہر زادہ سے نقل کیا ہے کہ ہمارے نزدیک جماعت جائز ہے لیکن سنت نہیں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ مصنفؒ کی عبارت سے بھی یہی نکلتا ہے، کیونکہ نفی مفید ہے یعنی ایسی جماعت نہیں ہے جو سنت ہو، تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسی جماعت ہو سکتی ہے جو جائز تو ہو مگر مسنون نہ ہو، اور عینیؒ نے نقل کیا ہے کہ ابن ابی شیبہؒ نے صحیح اسناد کے ساتھ روایت کی ہے کہ مغیرہ بن عبد اللہ استسقاء کے واسطے نکلے تو ابراہیم نخعیؒ بھی ان کے ساتھ نکلے، جب یہ مغیرہ وہاں نماز پڑھنے لگے تو ابراہیمؒ لوٹ آئے، اور حضرت عمرؓ سے روایت کی کہ رسول اللہ ﷺ استسقاء کے لئے نکلے تو استغفار کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا عینیؒ نے لکھا ہے کہ کچھ متعصب لوگوں نے کہا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز استسقاء جماعت کے ساتھ بدعت ہے، حالانکہ امام ابو حنیفہؒ نے ایسی بات ہرگز نہیں کہی ہے، انہوں نے تو صرف سنت ہونے کا انکار کیا ہے، اور جب ان کے نزدیک جماعت سنت نہیں ہے تو بہت ممکن ہے کہ مستحب ہو، اور کم از کم جائز ہی ہو، اور منافع میں ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ نے ایسا کوئی کام کیا بھی تو فقط کر لینے سے سنت نہیں ہو جاتا ہے جبتک کہ اس پر پابندی سے کرنے کا ثبوت نہ ملے، تحفہ میں ہے کہ اگر امام خود تو نہیں نکلا مگر لوگوں کو نکلنے کی

اجازت دے دی تو وہ نکلیں مگر جماعت سے نماز نہ پڑھیں، مگر جب کہ امام نے کسی کو خلیفہ مقرر کر دیا ہو کہ وہ ان کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھادے۔ مع۔ اب مصنفؒ کے کلام کی تفسیر یہ ہے کہ استسقاء میں جماعت کے ساتھ نماز مسنون نہیں ہے۔ ف۔ پھر جب جماعت سنت نہیں ہے مگر جب رسول اللہ ﷺ نے کبھی جماعت کی اور کبھی نہیں کی تو جماعت جائز بلکہ دعاء کے لئے اولیٰ ہے۔

فان صلی الناس وحدانا جاز و انما الاستسقاء الدعاء والاستغفار......الخ

پھر اگر لوگوں نے تنہا تنہا نماز پڑھ لی تو جائز ہے۔ف۔ اور اگر تنہا بھی نہ پڑھی تو بھی جائز ہے **وانما الاستسقاء الخ** استسقاء تو فقط دعا واستغفار ہے۔ف۔ اس میں نماز کچھ ضروری نہیں ہے، لقولہ تعالیٰ الخ یعنی میں نے کہدیا کہ تم اپنے رب سے مغفرت چاہو وہ تو بہت مغفرت کرنے والا ہے۔ف۔ اور استغفار کے لئے نماز شرط نہیں ہوتی ہے **ورسول اللہ الخ** اس دلیل سے کہ رسول اللہ ﷺ نے استغفار کیا حالانکہ آپ سے نماز مروی نہیں ہوئی۔ف۔ یعنی بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ آپ نے سیرابی کے لئے پانی مانگا حالانکہ اس مرتبہ آپ سے نماز منقول نہیں ہے تو معلوم ہو گیا کہ اس کے لئے نماز مسنون اور مشروط نہیں ہے، البتہ دعا کی جلد قبولیت کے واسطے نماز پڑھ لینا افضل اور اولیٰ ہے اس ہی واسطے ہر فرض نماز کے بعد دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے اب اس بات کا ثبوت کہ رسول اللہ ﷺ نے پانی اور رحمت کی بارش کی دعاء کی اس کے باوجود آپؐ نماز نہیں پڑھی تو (۱) حضرت عمرؓ سے ایک طویل روایت میں ہے کہ غزوہ تبوک میں جاتے وقت کہ جہاں پر ہم لوگ ٹھہرے وہاں گرمی اور پیاس کی شدت کی وجہ سے ہم لوگوں کا برا حال تھا، یہانتک کہ بعضوں نے اپنے اپنے اونٹ ذبح کر کے اس کے اوجھ معدہ کے پانی سے اپنے کلیجہ پر چھڑکاؤ کیا، اس وقت میں نے ابو بکر صدیقؓ کے پاس جا کر عرض کیا تو وہ رسول اللہ ﷺ کے دربار میں پہونچے اور عرض کیا کہ ہم لوگ پانی کے بہت محتاج ہو گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر لوگ صبر کرتے تو اس سے بہتر ہوتا، آخر آپ نے دعا کے واسطے دست مبارک اٹھائے حالانکہ اس وقت شدت حرارت سے پورا علاقہ آگ کا گولہ بنا ہوا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ابر کا ٹکڑا بڑھتا ہوا ہم لوگوں کے اوپر آیا اور زبردست بارش کر دی اتنی کہ سارے جانور اور آدمی خوب سیراب ہو گئے اور برتن اور مشکیں بھر لیں، حضرت عمرؓ پھر فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں اس بادل کے ٹکڑے کے پیچھے چلا یہ دیکھنے کے لئے کہ اب وہ کہاں جاتا ہے دیکھا کہ ہمارے لشکر کے بعد وہ ابر لاپتہ ہو گیا اس علاقہ میں نہ نشان تھا اور نہ کوئی قطرہ پانی کا ٹپکا تھا، میں نے یہ حدیث پوری تفصیل کے ساتھ اپنی تفسیر میں لکھ دی ہے۔م۔

(۲) اور انسؓ سے روایت ہے کہ جمعہ کے دن مسجد میں ایک شخص ایسے وقت میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے انہوں نے سامنے آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جانوروں اور اونٹوں کے گلے مر رہے ہیں راستے بند ہو گئے، اس لئے آپ اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ ہم پر رحمت کی بارش برسائے، یہ سن کر آپ نے اپنے دست مبارک اٹھائے اور فرمایا **اللھم اغثنا، اللھم اغثنا، اللھم اغثنا**، اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما، اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما، اے اللہ ہماری فریاد رسی فرما، حضرت انسؓ نے فرمایا کہ اس وقت ہمارے سامنے نہ کوئی ابر تھا اور نہ اس کا کوئی ٹکڑا تھا ہمارے اور سلع پہاڑ کے درمیان کوئی چیز بھی حائل نہ تھی فضاء بالکل صاف تھی اچانک سلع پہاڑ کے پیچھے سے بادل کا ایک ٹکڑا ڈھال کے برابر ظاہر ہوا اور جب آسمان کے بیچ میں آیا اور پھیل کر برسنے لگا، حضرت انسؓ پھر فرماتے ہیں کہ ہم نے اس کے بعد متواتر سات دن آفتاب کی صورت تک نہیں دیکھی، پھر دوسرے جمعہ کو رسول اللہ ﷺ خطبہ پڑھ رہے تھے کہ اس وقت بھی ایک شخص نے سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ جانوروں کے گلے مر رہے ہیں اور پانی کی زیادتی سے راستے بند ہو گئے، اس لئے آپ دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ پانی برسانا بند کر دے، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک اٹھائے اور فرمایا، **اللھم حوالینا ولا علینا، اللھم علی الآکام والضراب وبطون الاودیۃ ومنابت الشجر**، یعنی الٰہی یہ ابر ہمارے ہمارے اطراف میں برسے ہم پر نہ برسے الٰہی، پہاڑوں و

پہاڑیوں اور باطن وادیوں اور درختوں کے جنگلوں میں برسے، حضرت انسؓ نے بیان کیا کہ اس کے بعد وہ بادل حوض کے مانند ہو گیا یعنی آبادیوں کے کناروں میں حلقہ بنالیا، اور آبادیوں کو چھوڑ دیا اور ہم لوگ نماز جمعہ پڑھ کر دھوپ میں چل کر آئے، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی۔ مع۔

یہ روایت مختلف نہایت صحیح سندوں سے مروی ہے، اور عبرت حاصل کرنے والوں کے لئے زبردست معجزہ ہے، اور رحمت الٰہی وکمال قدرت کی دلیل ہے کہ اللہ تعالی کے خزانے غیر متناہی لامحدود ہیں، اور جو کچھ کسی کو عطا فرماتا ہے وہ بہت تھوڑی مقدار ہے، اس حدیث میں رسول اللہ علیہ نے رحمت کی بارش طلب فرمائی مگر اس کے لئے خاص نماز کا بیان کہیں نہیں ہے، بلکہ اس بارے میں تو پہلی ہی حدیث زیادہ صریح ہے۔ م۔ اور رسول اللہ علیہ نے جس کلام سے دعا فرمائی ہے وہ بہترین ہے اولی ہے۔ ف۔ اس کا مزید بیان سامنے آئے گا، ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھائے تو بہتر ہے اور کلمہ کی انگلی سے اشارہ کرے تو بھی صحیح ہے، اور سب لوگ بھی اپنے ہاتھوں کو اٹھائیں کیونکہ دعا کا طریقہ یہی ہے۔ المضمرات۔

وقالا يصلي الامام ركعتين لماروى النبي عليه صلى فيه ركعتين كصلوة العيد رواه ابن عباس قلنا فعله مرة وتركه اخرى فلم يكن سنة وقد ذكر في الاصل قول محمد وحده ويجهر فيها بالقراة اعتبار بصلوة العيد ثم يخطب لماروى ان النبي عليه خطب ثم هي كخطبة العيد عند محمد وعند ابي يوسفؒ خطبة واحدة.

ترجمہ:- اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام دو رکعتیں پڑھائے گا کیونکہ نبی کریم علیہ سے مروی ہے کہ آپ نے اس موقع پر دو رکعتیں پڑھائی ہیں عید کی نماز کی طرح، ابن عباسؓ نے اس کی روایت کی ہے، ہم نے اس کا جواب دیا کہ یہ صحیح ہے کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھی ہے مگر صرف ایک مرتبہ اور دوسری مرتبہ نہیں پڑھائی، اس لئے یہ نماز سنت نہ ہو سکی، اصل میں یہ قول صرف امام محمدؒ کا ذکر کیا گیا ہے، اور اس کی دونوں رکعتوں میں بآواز قراءت کرے، عید کی نماز کا اعتبار کرتے ہوئے، خطبہ بھی پڑھے اس روایت کی بناء پر کہ رسول اللہ علیہ نے خطبہ دیا تھا، پھر امام محمدؒ کے نزدیک یہ خطبہ عید کے خطبہ کے موافق ہونا چاہئے اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک صرف ایک ہی خطبہ ہے۔

توضیح:- دعا کے واسطے ہاتھ اٹھانا، تعداد رکعت، قراءت، خطبہ

وقالا يصلي الامام ركعتين لماروى النبي عليه صلى فيه ركعتين كصلوة العيد......الخ

اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ امام استسقاء میں دو رکعتیں پڑھائے۔ ف۔ پہلی رکعت میں فاتحہ کے بعد سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اور دوسری میں هَلْ اَتَاكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ پڑھانا افضل ہے۔ ع۔ لما روى الخ اس روایت کی وجہ سے کہ رسول اللہ علیہ نے استسقاء میں دو رکعتیں عید کی طرح پڑھائی ہیں، یہ حدیث ابن عباسؓ نے روایت کی ہے۔ ف۔ رسول اللہ علیہ تواضع اور تضرع کی حالت میں نکل کر عید گاہ تشریف لائے، پھر تمہارے خطبہ کی طرح خطبہ نہیں پڑھا بلکہ برابر دعا و تضرع میں رہے، اور دو رکعتیں پڑھیں، جس طرح عید میں پڑھتے تھے، ابو داؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے، ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، یہی قول امام مالکؒ و شافعیؒ اور احمد دوسرے بہت سوں کا ہے۔ مع۔

قلنا فعله مرة وتركه اخرى فلم يكن سنة وقد ذكر في الاصل قول محمد وحده......الخ

ہم کہتے ہیں کہ آپ نے کبھی ایسا کیا اور کبھی چھوڑا ہے۔ ن۔ تو آپ کا کرنا نہ کرنے سے زیادہ نہ ہوا۔ مع۔ تو اس طرح یہ نماز سنت نہ ہو سکی۔ ف۔ کیونکہ سنت ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ کوئی کام زیادہ کیا گیا ہو ویسے کبھی کبھی اسے چھوڑ بھی دیا ہو، لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ جو کام رسول اللہ علیہ سے ایک بار بھی ثابت ہو چکا ہو وہ اگر سنت کی حد تک نہ بھی پہونچا ہو، وہ افضل ضرور ہوگا، قد ذكر الخ اور معلوم ہونا چاہئے کہ اصل یعنی مبسوط میں اس جگہ صرف امام محمدؒ کا قول مذکور ہے۔ ف۔ یعنی امام محمدؒ

کے نزدیک امام دو رکعت نماز پڑھے، اور امام ابو یوسفؒ کا قول مذکور نہیں ہے، لیکن اصح یہ ہے کہ امام ابو یوسفؒ کا قول بھی امام محمدؒ کے قول کے مثل ہے۔ مع۔ اور یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ حاکم نے کافی میں لکھا ہے کہ نماز پڑھنے کی حدیث شاذ ہے۔ ف۔ عینیؒ نے اس کا انکار فرمایا ہے کہ یہ شاذ کیوں کر ہوگی، جبکہ سترہ صحابہ کرامؓ سے مروی ہے، ان میں سے چند یہ ہیں عبداللہ بن زید بن العاصم الانصاری مازنی کی حدیث بخاری، مسلم، ابو داؤد، اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، اور ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے جو ابو داؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، اور ان میں سے ایک حضرت عائشہؓ کی حدیث جو ابو داؤد سے مروی ہے، اور ایک حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے جو پہلے بیان کی جا چکی ہے، اور ایک حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث ہے جو ابن ماجہ اور طحاوی سے مروی ہے، ان سب میں دو رکعتین پڑھنے کی روایت ہے۔ مع۔

ویجهر فیها بالقراۃ اعتبار بصلوۃ العید ثم یخطب لماروی ان النبی ﷺ خطب......الخ

اور صاحبینؒ نے فرمایا ہے کہ ان دونوں رکعتوں میں جہر کے ساتھ قراءت کرے اعتبار الخ عید کی نماز پر قیاس کرتے ہوئے۔ ف۔ کیونکہ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ عید کی نماز کے مثل پڑھی ہے۔ م۔

ثم یخطب لماروی ان النبی ﷺ خطب ثم هی کخطبة العید عند محمد......الخ

پھر خطبہ پڑھے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ نے خطبہ پڑھا۔ ف۔ یہ حدیث ابن ماجہ نے روایت کی ہے، اور یہ خطبہ عید کے مثل ہے امام محمدؒ کے نزدیک۔ ف۔ یعنی دو خطبے ہوں اور درمیان میں تھوڑی سی بیٹھک وعند ابی یوسفؒ الخ ابو یوسفؒ کے نزدیک ایک ہی خطبہ ہے۔ ف۔ زمین پر بیٹھ کر کھڑے ہو کر لوگوں کی طرف منہ کر کے پڑھے، اور مضمرات میں لکھا ہے کہ چاہے ایک ہی خطبہ دے اور چاہے دو خطبے اس طرح دئے کہ ان کے درمیان مختصر بیٹھک کرے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اور مومن مرد و عورت سب کے لئے استغفار کرے۔ ھ۔

ولاخطبة عند ابی حنیفة لانها تبع للجماعة ولا جماعة عنده ویستقبل القبلة بالدعاء لما روی انه صلی اللہ علیه وسلم استقبل القبلة و حول رداءه ویقلب رداءه لما روینا قال هذا قول محمد اما عند ابی حنیفة فلا یقلب رداءه لانه دعا فیعتبر بسائر الادعیة وما رواه کان تفاؤلا.

ترجمہ: ـ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خطبہ نہیں ہے کیونکہ یہ تو جماعت کے تابع ہوتا ہے جبکہ ان کے نزدیک جماعت نہیں ہوتی ہے، اور قبلہ رخ ہو کر دعا کرے کیونکہ رسول اللہ ﷺ قبلہ رخ ہوئے اور اپنی چادر الٹی، اور اپنی چادر الٹے اس روایت کی بناء پر جو ہم نے ابھی روایت کی ہے، مصنفؒ نے کہا ہے کہ یہ قول امام محمدؒ کا ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اپنی چادر الٹے، کیونکہ یہ تو ایک دعا ہے، اس لئے دوسری دعاؤں پر اعتبار کیا جائے گا، اور ایک مرتبہ جو آپ نے ایسا کیا تھا وہ نیک فالی کے لئے تھا۔

توضیح: ـ دعاء کے وقت استقبال قبلہ کرنا، چادر پلٹنا، اس کا طریقہ

ولاخطبة عند ابی حنیفة لانها تبع للجماعة ولا جماعة عنده......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک خطبہ نہیں ہے۔ ف۔ امام مالکؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ ع۔ لانها تبع الخ کیونکہ خطبہ تو جماعت کے تابع ہے جبکہ امام اعظمؒ کے نزدیک جماعت نہیں ہے۔ ف۔ عبارت سے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ جماعت جائز ہی نہیں ہے، کیونکہ جماعت ہونے سے تو خطبہ ہوگا، اور شاید یہ کہ مصنفؒ کی مراد یہ ہو کہ امام اعظمؒ کے نزدیک خطبہ مسنون نہیں ہے، کیونکہ جماعت بھی مسنونہ نہیں ہے، یاد رکھ لیں۔ م۔ ابن عبد البرؒ نے کہا ہے کہ ہمارے اسلاف میں سے فقہاء کے نزدیک خطبہ ثابت ہے۔ ع۔

ویستقبل القبلة بالدعاء لما روی انه صلی اللہ علیه وسلم استقبل القبلة و حوّل رداءه......الخ

اور قبلہ رخ ہو کر دعا کرے۔ف۔لہذا خطبہ کے بعد دعا کے لئے قبلہ رخ ہو جائے **لما روی الخ** کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے مروی ہے کہ آپ قبلہ رخ ہوئے اور اپنی چادر پلٹ دی۔ف۔جیسا کہ صحیحین میں عبداللہ بن زید بن عاصمؓ سے اور مستدرک میں جابرؓ اور طبرانی میں انسؓ سے مروی ہے۔فع۔ **ویقلب الخ** اور اپنی چادر الٹ دے۔ف۔اگر چادر چوکور ہو تو اوپر کا کنارہ نیچے کر دے، اور اگر گول ہو تو دائیں بائیں کر دے۔المبسوط۔اور ذخیرۃ المالکیہ میں ہے کہ جو کنارہ بائیں کندھے پر ہے اسے پکڑ کر پیچھے سے گھما کر دائیں پر لے آئے، اور دائیں کا بائیں پر لے جائیں۔مع۔

قال هذا قول محمد اما عند ابی حنيفة فلا يقلب رداءه......الخ

یہ امام محمدؒ کا قول ہے۔ف۔اور محیط میں ہے کہ یہ قول امام ابو یوسفؒ کا بھی ہے، اور یہی قول امام مالکؒ و شافعیؒ و احمدؒ اور دوسرے فقہاء کا بھی۔مع۔ **اما اعند ابی حنیفة الخ** لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو وہ چادر نہیں پلٹے گا کیونکہ یہ استسقاء دعا ہے لہذا اسے دوسری دعاؤں پر قیاس کیا جائے گا۔ف۔جبکہ دوسری دعاؤں میں چادر نہیں پلٹی جاتی ہے، **وما رواه الخ** اور جو کچھ حدیث میں مروی ہے وہ نیک فالی کے طور پر تھا۔ف۔لہذا یہ مسنون عمل نہیں ہوا، ویسے روایت صحیح ہے، مگر نیک فالی کے طور پر تھی، جو عبادت کی قسم سے نہیں ہے، حضرت جابرؓ کی حدیث میں اس بات کی تصریح ہے کہ آپ نے چادر پلٹی ہے، تاکہ قحط سالی پلٹ کر خوش حالی سے بدل جائے، حاکم نے اس کی روایت کی ہے اور اس کی تصحیح بھی کی ہے، اور حضرت انسؓ کی حدیث میں ہے کہ چادر اس لئے پلٹی تاکہ قحط سالی خوش حالی سے بدل جائے، طبرانی نے اس کی روایت کی ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے **لباس التقوی ذلك خير**، اس میں لباس تقوی کو بہتر فرمایا ہے اور حدیث میں آتا ہے کہ آدمی کی جیسی حالت ہوتی ہے ویسی ہی چادر اس پر ہوتی ہے، تو اس طرح قوم کی چادریں پلٹ دیں، عینیؒ کے ظاہری کلام سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کام میں بھی امام کی اتباع کرنی چاہئے، اگرچہ بظاہر نیک فالی ہی کے لئے ہو، کیونکہ اتباع کرنے میں حکمت اور مصلحت کا معلوم ہونا شرط نہیں ہے۔واللہ اعلم۔

ولايقلب القوم ارديتهم لانه لم ينقل انه امرهم بذلك ولا يحضر اهل الذمة الاستسقاء لانه لاستنزال الرحمة وانما تنزل عليهم اللعنة.

ترجمہ:۔اور قوم اپنی چادروں کو نہ پلٹے کیونکہ ایسی کوئی روایت منقول نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی قوم کو اس بات کا حکم دیا ہو، اور اس استسقاء کے موقع پر اہل ذمہ حاضر نہ ہوں، کیونکہ یہ دعا تو رحمت نازل کرنے کے لئے کی جاتی ہے، جبکہ ان ذمیوں اور کافروں پر لعنت برستی رہتی ہے۔

توضیح:۔دعا کے وقت قبلہ رخ ہونا، چادر پلٹنا، اس کا طریقہ

قوم کا چادر پلٹنا، استسقاء میں ذمیوں کا حکم

ولايقلب القوم ارديتهم لانه لم ينقل انه امرهم بذلك......الخ

اور قوم اپنی چادریں نہ پلٹے۔ف۔لیکن تینوں اماموں کے نزدیک پلٹنا چاہئے امام کی اتباع میں، اور ہمارے قول کے موافق سعید بن المسیب اور عروہؓ سے بھی مروی ہے، اسی طرح ثوری اور لیث وغیرہ کا بھی مسلک ہے **لانه ينقل الخ** کیونکہ یہ منقول نہیں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہو۔ف۔اس پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اگر آپ ﷺ نے ان لوگوں کو حکم نہیں دیا تو اس سے منع بھی نہیں کیا ہے، اور آپ کا کسی کام کو برقرار رکھنا اور اعتراض نہ کرنا بھی جواز کی دلیل ہے، ابن الہمامؒ اور عینیؒ وغیرہ نے اس کا جواب اس طرح دیا ہے کہ آپ قبلہ رخ تھے اور آپ کے متوجہ ہونے سے پہلے قوم نے اپنی چادریں پلٹ دی تھیں اس طرح آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو سکی ہو گی، حالانکہ اس دلیل میں آپ کا جاننا ضروری ہے، ابوداؤد کی وہ حدیث جس

میں چادر پلٹنے کا تذکرہ ہے اسے اس طرح بیان کیا ہے کہ آپ پر سیاہ چادر پڑی ہوئی تھی تو چاہا کہ اس کے نیچے کے کنارہ کو اوپر کر لیں مگر ایسا کرنے میں دشواری محسوس ہونے لگی تو کندھوں پر الٹ دی، اور امام احمدؒ کی روایت میں اس سے زائد اس طرح مذکور ہے، کہ آپ کے اور ساتھ آپ کے صحابہ کرام نے بھی اپنی چادریں پلٹی ہیں، حاکم نے کہا ہے کہ مسلم کی شرط پر اس کی اسناد صحیح ہے، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ آپ کو بھی اس کا علم ہو، اب میں مترجم کہتا ہوں کہ اس جواب میں تامل ہے اور وہ ظاہر بھی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

ولا یحضر اھل الذمۃ الاستسقاء لانہ لاستنزال الرحمۃ وانما تنزل علیھم اللعنۃ......الخ

اور اس دعاء کے موقع پر ذمی وغیرہ نہ جائیں اس میں شرکت نہ کریں۔ف۔ ذمی وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کی ماتحتی میں فرمان برداری کرتے ہوئے رہتے ہیں لیکن مسلمان نہیں ہوتے ہیں، ان کی جانی اور مالی حفاظت سلطان وقت کے ذمہ ہوتی ہے اسی لئے انہیں ذمی کہا جاتا ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ چونکہ یہ لوگ مسلمان نہیں ہے اس لئے استغفار اور باران رحمت کی دعا میں یہ لوگ شرکت نہ کریں، **لانہ لاستنزال الخ** کیونکہ دعا استسقاء تو رحمت نازل ہونے کی دعا ہے۔ف۔ لہٰذا اسی شخص کے لئے مناسب ہے جو رحمت کے قابل ہو، اور ذمی اس کے قابل نہیں ہیں۔

وانما تنزل علیھم اللعنۃ......الخ

ان ذمیوں پر تو لعنت ہی نازل ہوا کرتی ہے۔ف۔ چنانچہ ذمیوں کو اس مجمع سے الگ رکھنا واجب ہے، ابن الہمامؒ نے اعتراض کیا ہے کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں خاصہ اور عامہ، خاصہ یہاں مقصود نہیں ہے، وہ تو دار آخرت کے لئے مخصوص ہے، اور دوسری قسم رحمت عامہ ہے جیسے رزق رسانی، وغیرہ تو استسقاء میں اسی قسم کی رحمت مطلوب ہے کیونکہ وہ باران رحمت کی خواہش ہے، اور باران رحمت تو ساری دنیا کے لئے عام ہے میں مترجم کہتا ہوں کہ ذمی اپنے معبود سے دعا مانگتا ہے، اگرچہ وہ ظاہر میں خدائے تعالیٰ سے دعا مانگے، کیونکہ اس نے اپنے خیال میں اسی کو خدا سمجھ رکھا ہے، ایسا خدا جس کا کوئی شریک بیوی اور اولاد ہے اور یہ لامحالہ کوئی مخلوق ہی ہوگی، پس یہ دعا اسی مخلوق سے ہوئی، اور اللہ تعالیٰ سے نہ ہوئی، اب جبکہ یہ معلوم ہو گیا کہ کافر کی دعا جناب باری تعالیٰ جل شانہ سے نہیں ہے اور نہ وہاں کے لائق ہے تو ان کو وہاں ساتھ نہیں لیا جائے گا، اور نہ ان کی دعاء جو مردود اور مغضوب ہے اس وقت میں شریک کی جائے گی، مظلوم اور کافر وغیرہ کی دعا جو یہاں مقبول ہوتی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کہ وہ معرفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ تک پہونچتی ہے اور دعا کرنے والا اسی اللہ سے دعا کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ایسے لوگوں کی دنیاوی بقاء اور حیات سے متعلق ہیں ان میں اللہ تعالیٰ اس کو معیشت دیتا ہے، اسی لئے ابن الہمامؒ نے لکھا ہے کہ اگر ذمی وغیرہ یہ چاہیں کہ اپنی مخصوص جماعت کے ساتھ اپنی خاص عبادت گاہ میں جمع ہو کر پانی مانگیں تو ان کو ایسا کرنے سے روک دیا جائے گا، کیونکہ ممکن ہے کہ ان کو اس صورت حال سے مدد دی جائے تو عام مسلمانوں کو شبہ پیدا ہو جائے گا۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ یہی قول اولیٰ ہے، اگرچہ عینیؒ نے ان کے اس طرح کے اجتماع اور دعاء کرنے کی کوشش کو جائز قرار دیا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ جواہر مالکیہ میں یہ لکھا ہے کہ اس استسقاء کو نکلنے سے پہلے امام یہ عام حکم کرے کہ لوگ آپس میں خطاؤں کی معافی کرا لیں۔ع۔ اگر نکلنے سے پہلے ان کو باران رحمت دیدی گئی، بارش برس گئی تو شکر کے طور پر نکلنا مستحب ہے۔د۔ اگر اتنی زیادہ بارش ہو جائے جس سے عام نقصان ہونے لگے تو اس کے رک جانے کے لئے دعا کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، جیسا کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں جو کہ صحیحین کی روایت میں ہے اور پہلے بیان کی جا چکی ہے۔م۔

باب صلوۃ الخوف

اذا اشتد الخوف جعل الامام الناس طائفتین طائفۃ علی وجہ العدو و طائفۃ خلفہ فیصلی بھذہ الطائفۃ

رکعة وسجدتین فاذا رفع راسه من السجدة الثانیة مضت هذة الطائفة الی وجه العدو وجاءت تلك الطائفة فیصلی بهم الامام رکعة وسجدتین و تشهد وسلم ولم یسلموا وذهبوا الی وجه العدو وجاء ت الطائفة الاولی فصلوا رکعة وسجدتین وحدانا بغیر قراء ة لانهم لاحقون وتشهد واوسلموا ومضوا الی وجه العدو وجاء ت الطائفة الاخری وصلوا رکعة وسجدتین بقراۃ لانهم مسبوقون وتشهدوا وسلموا.

ترجمہ و توضیح باب، خوف کی نماز، نماز خوف کی کیفیت تعداد رکعت سفر واقامت کی حالت میں

نماز خوف کے بیان میں، عربی زبان میں خوف کے معنی نقصان میں پڑنے کا احتمال ہونا، اور دہشت اور ہیبت کے نہیں ہیں، پس جب کافروں سے مقابلہ ہوگا تو اس وقت دو صورتیں ہوں گی، اور یہ کہ اس بات کا خوف نہ ہو کہ مسلمانوں کی نماز کی حالت میں کفار اچانک حملہ کر دیں گے یا ان سے نقصان پہونچے گا (۲) یہ کہ اس بات کا احتمال ہو، ان دونوں صورتوں میں غالب احتمال کا اعتبار ہوگا، یہانتک کہ اگر دشمن بالکل سامنے اور قریب بھی ہو تو اس وقت بھی غالب گمان کافی ہے، اسی واسطے مصنفؒ نے فرمایا ہے اذا اشتد الخ جبکہ خوف بہت زیادہ بڑھ جائے تو امام اپنے لوگوں کو دو جماعتوں میں بانٹ دے۔ف۔ نماز پڑھنے کے لئے۔م۔ اشتداد خوف کی عبارت قدوری کی ہے، مصنف ہدایہؒ نے اسی عبارت کو اپنالیا ہے، ہمارے عامہ علماء کے نزدیک اشتداد شرط نہیں ہے، چنانچہ مبسوط و تحفہ اور محیط میں نماز خوف کے صحیح ہو جانے کے لئے اشتداد کی شرط کے بغیر صرف دشمن کا سامنے موجود ہونا کافی ہے، شیخ الاسلامؒ نے کہا ہے کہ یہ اشتداد بالکل شرط نہیں ہے، بلکہ سامنے دشمن انسان ہو یا درندہ ہو تو بھی صلوۃ خوف جائز ہے۔ الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اشتداد خوف، خوف کے گمان غالب ہو جانے کے معنی میں ہے، جیسا کہ بیان گذر چکا ہے، اسی لئے جوہر نیرہ میں کہا ہے کہ اشتداد خوف کی صورت یہ ہے کہ دشمن اس طرح حاضر ہو کہ وہ نظر آرہے ہوں، اور اس بات کا خوف ہو کہ اگر ہم سب نماز میں مشغول ہو جائیں تو دشمن حملہ کر بیٹھے گا۔ھ۔ پس دشمن موجود ہونا اسی وجہ سے خوف کے قائم مقام ہے کہ اس سے نقصان کا احتمال ہے، اسی بناء پر اگر دشمن سامنے تو ہو لیکن درمیان میں کافی گہری اور چوڑی نہر ایسی ہو کہ اس سے دشمن کے آجانے کا خوف نہ ہو تو اس وقت نماز خوف درست نہ ہوگی، حاصل یہ ہوا کہ جس صورت میں خوف و گمان غالب ہو تو امام اس طرح نماز پڑھائے کہ لشکر کے دو حصے کرے **طائفة علی وجه الخ** اور ایک حصہ کو دشمن کے سامنے رہنے کے لئے چھوڑ دے۔

و طائفة خلفه فیصلی بهذة الطائفة رکعة وسجدتین فاذا رفع رأسه من السجدة الثانیة......الخ

اور دوسرے حصہ کو اپنے پیچھے مقتدی بنادے **فیصلی الخ** پس اس گروہ کے ساتھ ایک رکعت دونوں سجدوں کے ساتھ پڑھے۔ف۔ جبکہ امام مسافر ہو اور اگر مقیم ہو تو دو رکعت پڑھے۔ محیط۔ **فاذا رفع الخ** پھر جب دوسرے سجدہ سے سر اٹھائے تو یہ جماعت دشمن کا سامنا کرنے کے لئے چلی جائے۔ف۔ یعنی پیدل جائے۔ اس لئے کہ اگر جماعت سوار ہو کر جائے گی تو نماز فاسد ہو جائے گی۔ف۔ اور امام اتنی دیر تک خاموش بیٹھا رہے۔

وجاءت تلك الطائفة فیصلی بهم الامام رکعة سجدتین و تشهد وسلم ولم یسلموا......الخ

اور پہلی جماعت واپس آجائے۔ف۔ جو اب تک دشمن کے مقابلہ میں کھڑی تھی **فیصلی بهم الخ** اب امام ان لوگوں کے ساتھ باقی ایک رکعت اور دو سجدے اور التحیات پڑھ لے، اور خود سلام پھیر دے، مگر وہ جماعت سلام نہ پھیرے **و ذهبوا الی الخ** اور دشمن کے مقابلہ میں چلی جائے **وجاء ت الطائفة الخ** اور پہلی جماعت آجائے **فصلوا رکعة الخ** آکر وہ جماعت اپنی ایک رکعت اور دو سجدے تنہا تنہا بغیر قراءت قرآن کے پڑھ لے، کیونکہ یہ جماعت لاحقوں کی ہے۔ف۔ جبکہ لاحق پر قراءت لازم نہیں ہے، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ فجر کی ہو یا وہ مسافر ہوں یا جمعہ کی یا عیدی کی نماز ہو، اور یہ لوگ مقیم ہوں تو تین رکعتیں

بغیر قراءت پوری کرلیں۔ الفتح۔ وتشهدوا الخ اور تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں پھر دشمن کی طرف چلے جائیں وجاءت الطائفة الخ پھر دوسری جماعت آئے اور قراءۃ کے ساتھ ایک رکعت اور دو سجدے پڑھے، کیونکہ یہ لوگ مسبوق ہیں۔ ف۔ اور مسبوق پر بھی قراءت لازم ہوتی ہے، اور اگر یہ لوگ مقیم ہوں تو تین رکعتیں قراءت کے ساتھ پڑھیں۔ المحیط۔ وتشهدوا الخ اور تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں۔

والاصل فيه رواية ابن مسعود ان البنى عليه السلام صلى صلوة الخوف على الصفة التى قلنا و ابويوسف وان انكر شرعيتها فى زماننا فهو محجوج عليه بما روينا.

ترجمہ:- اس مسئلہ میں حضرت ابن مسعودؓ کی یہ روایت اصل ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خوف کی نماز اسی صف اور کیفیت کے ساتھ پڑھائی جو ہم نے ابھی بیان کی ہے، اور امام ابو یوسفؒ نے ہمارے زمانہ میں اس کے مشروع ہونے کا انکار کیا ہے، مگر ان کے خلاف ہماری دلیل وہی ہے جو ہم نے روایت کردی ہے۔

توضیح:- حدیث سے دلیل

والاصل فيه رواية ابن مسعود ان البنى عليه السلام صلى صلوة الخوف على الصفة التى قلنا......الخ

اس مسئلہ میں اصل ابن مسعودؓ کی حدیث میں کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی کیفیت کے ساتھ نماز پڑھی جو ہم نے بیان کی ہے۔ ف۔ یہ حدیث ابو داؤد نے روایت کی ہے لیکن اول تو اس میں خصیف راوی قوی نہیں ہے، دوم یہ کہ ابو عبیدہؓ نے ابن مسعودؓ سے نہیں سنا ہے، اور مبسوط وغیرہ میں ابن عمرؓ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نجد کے علاقہ میں جہاد کیا، جب دشمن سے مقابلہ ہوا تو ہم ان کے مقابلے میں صف بستہ ہوئے، اس وقت رسول اللہ ﷺ ہمیں نماز پڑھانے کو کھڑے ہوئے، ہم میں سے ایک جماعت آپ کے ساتھ کھڑی ہوگئی اور دوسری جماعت دشمن کے بالمقابل کھڑی ہوگئی، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے ساتھ کی جماعت کو نماز پڑھائی اور جس میں ایک رکوع اور دو سجدے کئے، پھر یہ جماعت وہاں سے نکل کر دشمن کے سامنے کھڑی ہوگئی اور دوسری جماعت نے رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر نماز پڑھی ایک رکوع اور دو سجدے کئے اس کے بعد آپ نے سلام پھیر دیا، پھر دونوں جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر ایک ایک رکوع اور دو سجدہ ادا کئے، ائمہ صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، اور جو صورت کتاب میں ابھی ذکر کی گئی وہ امام محمدؒ نے آثار میں ابن عباسؓ کا قول نقل کیا ہے، اور چونکہ اس نماز میں کسی کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہے اس لئے ابن عباسؓ کا قول بھی مرفوع حدیث کے درجہ میں ہے۔ مفع۔

رسول اللہ ﷺ نے چار جگہوں میں خوف کی نماز پڑھائی ہے (۱) ذات الرقاع (۲) بطن نخلہ (۳) عسفان (۴) ذی قرد، ان میں نماز پڑھنے کی صورتیں مختلف روایت کی گئی ہیں، اور ہر مجتہد نے اپنے اجتہاد سے زیادہ بہتر اور زیادہ راجح قول کو اختیار کیا ہے، اور قدوری وابو نصر بغدادیؒ نے اپنی رائے کے مطابق سب کو جائز کہا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ع۔ م۔ اگر دور سے کچھ سیاہی نظر آئے انہیں دیکھ کر مسلمانوں نے دشمن خیال کرتے ہوئے صلوۃ خوف ادا کرلی مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دشمن کے لوگ نہیں تھے تو وہ نماز باطل ہو جائے گی، اور اگر خیال کے مطابق دشمن کے ہی افراد تھے تو نماز جائز مانی جائے گی، اور جو صورت کتاب میں ذکر کی گئی ہے وہ اس صورت میں ہے کہ ہر شخص ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنے پر اصرار کرتا ہو، اور اگر یہ بات نہ ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ ایک امام ایک جماعت کو پوری نماز پڑھادے پھر دوسری جماعت میں سے ایک شخص باقی لوگوں کو پوری نماز پڑھادے۔ مع۔

معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن پاک میں نماز خوف کی یہ آیت ہے وَاِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَاَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ الاية اور جب تم ان میں موجود ہو اور ان کو نماز پڑھاؤ الخ، اس سے امام شافعیؒ کے شاگرد مزنیؒ وابو یوسفؒ وحسن بن زیادؒ نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے اور مسئلہ بیان کیا ہے کہ نماز خوف جائز ہونے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی موجودگی شرط ہے، لیکن دوسرے علماء کے نزدیک یہ شرط نہیں

ہے، اس لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے و ابو یوسفؒ الخ اور ابو یوسفؒ نے اگرچہ ہمارے زمانہ میں نماز خوف کے صحیح ہونے سے انکار کیا ہے مگر ان کے خلاف ہماری دلیل ان روایتوں سے دی جاتی ہے جو ہم نے روایت کی ہیں۔ ف۔ لیکن یہاں تو صرف ابن مسعودؓ کی روایت مذکور ہے اور اس وقت خود رسول اللہ ﷺ نے پڑھائی تھی لہٰذا اس متن سے مصنفؒ کا مقصد یہ ہے کہ دوسری روایتیں جو اس مقام کے علاوہ ہیں ہمارے پاس موجود ہیں، چنانچہ سعید بن العاصؓ کے ساتھ طبرستان کی فتح میں حضرت حذیفہؓ نے اپنے سردار کی اجازت سے ایک ایک کر کے خوف کی نماز پڑھائی، ابوداؤد اور نسائیؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور عبدالرحمٰن بن سمرہؓ نے کابل پر جہاد کرنے میں نماز خوف پڑھائی ہے، ابوداؤد وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت علیؓ نے لیلۃ الہریر اور صفین میں مغرب کی نماز خوف پڑھائی ہے، بیہقیؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور ابو موسی اشعریؓ اصبہان میں اور سعد بن ابی وقاص نے حضرت حذیفہ و عبداللہ بن عمرو بن العاص و حسن بن علیؓ کے ساتھ طبرستان میں نماز پڑھائی ہے، ان روایتوں سے معلوم ہوا کہ مذکورہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ کے بعد نماز خوف پڑھی ہے۔

اب اگر یہ شبہ پیدا ہو کہ اگر نماز خوف جائز ہوتی تو غزوہ خندق میں رسول اللہ ﷺ کی چار نمازیں کیوں قضاء ہوتیں، جواب یہ ہوگا کہ غزوہ خندق کا واقعہ مقدم ہے اور نماز خوف کا حکم بعد کا ہے، اس کے علاوہ جنگ خندق میں قتال کے علاوہ چارہ ہی نہ تھا، کیونکہ اس میں کافروں کی تعداد بہت زیادہ تھی، الحاصل یہ مذکورہ صریح دلیلیں امام ابو یوسفؒ کے خلاف موجود ہیں، اس لئے مبسوط و ملتقی البحار و مفید اور ابو نصر للبغدادی کی شرح مختصر الکرخی میں واضح طور پر لکھا ہے کہ امام ابو یوسفؒ نے اپنے قول سے رجوع کر لیا ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اصحاب احناف کے نزدیک بالاتفاق نماز خوف جائز ہے، نیز یہ نماز خوف حضر و سفر ہر حال میں جائز ہے یہی قول امام مالک وشافعی واحمدؒ کا ہے۔

فان كان الامام مقيما صلى بالطائفة الاولى ركعتين و بالطائفة الثانية ركعتين لما روى انه صلى الظهر بالطائفتين ركعتين ركعتين.

ترجمہ:- اور اگر امام مقیم ہو تو پہلی جماعت کو دو رکعتیں اور دوسری جماعت کو بھی دو رکعتیں پڑھائے اس روایت کی بناء پر کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی دو جماعتوں میں سے ہر ایک کو دو دو رکعتیں پڑھائیں۔

توضیح:- اگر امام مقیم ہو تو کس طرح نماز پڑھادے، حدیث سے دلیل

فان كان الامام مقيما صلى بالطائفة الاولى ركعتين و بالطائفة الثانية ركعتين......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ ف۔ حدیث مذکور غزوہ ذات الرقاع کے موقع کی ہے جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ پھر نماز کی اذان ہو گئی اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ایک گروہ کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں پھر یہ لوگ پیچھے چلے گئے یعنی دشمن کے سامنے کھڑے ہو گئے، پھر رسول اللہ ﷺ نے دوسری جماعت کو بھی دو رکعتیں پڑھائیں، جابرؓ نے کہا کہ اس طرح پڑھانے سے رسول اللہ ﷺ کی تو چار رکعتیں پوری ہو گئیں لیکن صحابہ کرامؓ کی دو دو رکعتیں ہوئیں، آخر تک، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، لیکن اس میں ظہر کا ذکر نہیں ہے، البتہ ابوداؤد نے سند صحیح کے ساتھ حضرت ابو بکرہؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ظہر کی نماز خوف پڑھی اس طرح سے کہ ایک جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا، اور یہ لوگ دشمنوں کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے، اور دوسری جماعت آئی تو اسے بھی رسول اللہ ﷺ نے دو رکعتیں پڑھائیں اور سلام پھیر دیا، اس طرح رسول اللہ ﷺ کی چار رکعتیں پوری ہو گئیں، اور صحابہ کرامؓ کی دو دو رکعتیں ہوئیں، بیہقیؒ نے ابو بکرہؓ کی حدیث کے مانند جابرؓ سے بطن نخلہ کے بارے میں روایت کی ہے، یعنی اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ ہر جماعت نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا، بعض فقہاء نے صحیح مسلم کی اس حدیث کو جو حضرت جابرؓ سے مروی ہے حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث پر محمول کیا ہے، ان ہی لوگوں میں امام

نوویؒ بھی ہیں، اور بعض فقہاء نے اس کا انکار کیا ہے، اور اسی جماعت میں قرطبیؒ بھی ہیں۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ بیہقیؒ کی حدیث نوویؒ کے قول کی تائید کر رہی ہے، اور محقق ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ تو لازم ہے کیونکہ اس روایت میں اس بات کی تصریح ہے کہ رسول اللہ ﷺ غزوہ ذات الرقاع میں تھے اس لئے مسافر تھے، چونکہ حنفیہ کے نزدیک مسافر کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ نماز میں قصر کو چھوڑ کر اتمام کرے یعنی پوری نماز پڑھے تو مجبوراً یہی کہنا پڑیگا کہ آپؐ نے دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا، جیسا کہ حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث میں ہے، پھر جب آپ نے دوسری جماعت کو بھی نماز پڑھائی تو یہ نماز آپ کی نفل کے طور پر ہوئی، اور مقتدیوں کی فرض ادا ہوئی، اس سے یہ لازم آئیگا کہ نفل والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتداء جائز ہے، یہ صورت بھی حنفیہ کے نزدیک غلط ہے، شیخ الاسلام عینیؒ نے لکھا ہے کہ صرف رسول اللہ ﷺ کو سفر میں بھی پوری نماز پڑھنے کی اجازت تھی، بعضوں نے کہا ہے کہ یہ خصوصیت رسول اللہ ﷺ کی نفل میں تھی کہ آپ کی نفل نماز کے پیچھے دوسروں کا فرض ادا ہو جاتا تھا، عینیؒ نے اس کے علاوہ اور بھی اقوال نقل کئے ہیں۔
بندہ مترجم کے نزدیک یہ تاویل احسن اولی ہے کہ آپ کی نفل نماز میں دوسروں کی فرض نماز ادا ہو جاتی تھی، کیونکہ کہیں بھی تصریح کے ساتھ یہ دلیل نہیں ہے کہ نفل پڑھنے والے کے پیچھے فرض پڑھنے والے کی اقتداء صحیح ہے، اس کے برخلاف مسافر کے فرض نماز کی دو رکعت ہونے کا ثبوت ان احادیث سے بھی ہے، یا اس کی تاویل کی جائے جو طحاویؒ نے حضرت ابو بکرہؓ کی حدیث کے ذکر کرنے کے بعد کہی ہے کہ ایک زمانہ میں ایک فرض کو دو مرتبہ بطور فرض پڑھنا بھی جائز تھا اور مذکورہ واقعہ اسی وقت کا ہے، کیونکہ حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں اس سے ممانعت آئی ہے، اور یہ بات مسلم ہے کہ کسی کام کی ممانعت کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ وہ اس سے پہلے جائز اور مباح تھا۔
لیکن اس جواب پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ یہ دعوی کسی دلیل کے بغیر ہے، اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ ضرورت نے ایسی تاویل کرنے پر مجبور کیا ہے، اور یہی دلیل کافی ہے، پھر اس جواب کا جواب یہ ہے کہ اتنی سی ضرورت اس مسئلہ کے لئے کافی نہیں ہے کہ استنباط پر مجبور کیا ہے کہ اقتداء جائز نہیں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ نہیں بلکہ ابن عمرؓ کی حدیث کی بناء پر فرض کو مکرر پڑھنا ممنوع ہے، لامحالہ یہ حکم ممانعت سے پہلے ہی ہوگا، اچھی طرح سمجھ لیں، واللہ تعالی اعلم۔ م۔
محقق ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ان باتوں کے باوجود اب ایسی کون سی دلیل باقی رہی کہ قوم کے ہر فرد نے خوف کی نماز میں دو رکعتیں پڑھی تھیں، جبکہ یہ قصہ سفر کے وقت کا ہے اور فرض کو مکرر پڑھنے سے ممانعت سے پہلے ہے اور ابھی تک اس بارے میں حدیث سے کوئی دلیل نہیں ملی ہے، البتہ قیاس سے یہ بات کہی گئی ہے کہ جب سفر میں دونوں جماعتوں کے ساتھ آدھی آدھی نماز تقسیم کر دی گئی ہے سوائے مغرب کی نماز کے تو جب حالت اقامت میں نماز خوف کی ضرورت آن پڑے تو یہاں بھی اس طرح آدھی آدھی نماز تقسیم ہوگی، لہذا امام ہر ایک جماعت کے ساتھ دو دو رکعتیں پڑھے گا۔ الفتح۔

ویصلی بالطائفة الاولی من المغرب رکعتین وبالثانیة رکعة واحدة لان تنصیف الرکعة الواحدة غیر ممکن فجعلها فی الاولی اولی بحکم السبق ولایقاتلون فی حال الصلوة فان فعلوا بطلت صلوتهم لانه صلی اللہ علیه وآله وسلم شغل عن اربع صلوات یوم الخندق، ولوجاز الاداء مع القتال لما ترکها.

ترجمہ:- اور امام مغرب کی نماز میں پہلی جماعت کو دو رکعتیں اور دوسری جماعت کو ایک رکعت پڑھائے گا، کیونکہ تین رکعتوں میں سے ایک رکعت کو صحیح طور پر تقسیم کرنا ممکن نہیں ہے، لہذا اس تیسری رکعت کو پہلی جماعت کو سبقت کی بناء پر دیدینا اولی ہے، اور یہ لوگ نماز کی حالت میں قتال نہیں کریں گے، کیونکہ خندق کی لڑائی میں رسول اللہ ﷺ خود بھی چار نمازیں بروقت نہیں پڑھ سکے، اور بعد میں ان کی قضاء کی تھی، اگر لڑائی کی حالت میں بھی نماز خوف درست ہوتی تو آپ ان نمازوں کو

قضاء نہ ہونے دیتے۔

توضیح: -خوف کی حالت میں مغرب کی نماز کی جماعت
نماز کی حالت میں قتال، حدیث سے دلیل

ویصلی بالطائفة الاولی من المغرب رکعتین و بالثانیة رکعة واحدة......الخ

ترجمہ واضح ہے۔ف۔ یہ نماز خواہ سفر کی حالت میں ہو یا اقامت کی لان تنصیف الخ کیونکہ ایک ہی رکعت کو آدھا آدھا کرنا ناممکن ہے۔ف۔اور بہر صورت ایک رکعت زائد کسی ایک جماعت کے ساتھ پڑھنی ہے فجعلنا الخ اس لئے یہ ایک رکعت اور بھی پہلی جماعت کے ساتھ پڑھنی بہتر ہے، اس بناء پر کہ اسے سبقت حاصل ہے۔ف۔ عامة علماء کا یہی قول ہے لیکن ثوریؒ نے پہلی جماعت کو ایک اور دوسری جماعت کو دو رکعتیں پڑھانے کے متعلق فرمایا ہے، امام شافعیؒ نے پہلی صورت کے ساتھ اس دوسری صورت کو بھی جائز رکھا ہے۔ مع۔

واضح ہو کہ دشمن اور درندہ دونوں کے خوف کا ایک ہی حکم ہے، اس خوف کی وجہ سے نماز میں قصر کا فائدہ نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف چلنا ایسی نماز میں جائز ہو جاتا ہے۔ المضمرات۔ مگر وہی چلنا جو اپنے وقت پر ہو۔م۔ اس قاعدہ کی بناء پر اگر امام نے مغرب میں پہلی جماعت کے ساتھ ایک رکت اور دوسری جماعت کے ساتھ دو رکعتیں پڑھیں تو اس کے بارے میں جوہر نیرہ میں لکھا ہے کہ سب کی نماز فاسد ہو گی۔ھ۔ اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ امام کی نماز فاسد نہ ہو گی، کیونکہ اس نے اپنی جگہ سے حرکت تک نہیں کی ہے، میں کہتا ہوں کہ یہی قول صحیح ہے۔ اور جوہر نیرہ کے کلام کے بھی یہی معنی ہیں، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ دونوں جماعتوں کی نماز فاسد ہو گی، کیونکہ پہلی جماعت ایسے وقت میں واپس گئی ہے کہ اسے ابھی جانا نہیں چاہئے تھا، اور دوسری جماعت ایسے وقت میں آکر ملی ہے کہ وہ پہلی جماعت کا حصہ تھا لہذا یہ اول میں داخل ہو گئی اور ایسے وقت میں واپس گئی کہ اسے واپس آنا چاہئے تھا، اس لئے نماز فاسد ہو گئی، اور اصل یہ ہوا کہ جو جماعت آنے کے وقت واپس جائے گی اس کی نماز فاسد ہو گی، اور جو جماعت جانے کے وقت واپس آئے گی اس کی نماز فاسد نہ ہو گی۔ الفتح۔

ولایقاتلون فی حال الصلوة فان فعلوا بطلت صلوتهم......الخ

اور کوئی جماعت بھی نماز کی حالت میں قتال نہ کرے گی۔ف۔ اگر زیادہ لڑائی ہو تو نماز فاسد ہو گی اور اگر تھوڑی ہو فاسد نہ ہو گی جیسے ایک تیر مارنا، اسی طرح دشمن کے سامنے جانے کی بجائے دوسری طرف چلنا یا سواری پر سوار ہونا تو یہ عمل بھی نماز کو فاسد کر دیتا ہے جیسے قتال کرنا۔ت۔د۔ فان فعلوا الخ اب اگر ان لوگوں نے قتال کیا تو اب تک جتنی بھی ناتمام نماز پڑھی ہے سب باطل ہو گئی لانه صلی الله علیه وسلم الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ جنگ خندق کے دن متواتر چار نمازیں نہ پڑھ سکے اگر لڑائی کی حالت میں بھی نماز صحیح ہوتی تو آپ ان نمازوں کو بروقت ادا کر نا نہ چھوڑتے۔ف۔ اس پر یہ اعتراض ہوا کہ خندق کی لڑائی تک خوف کی نماز کا حکم ہی نازل ہوا تھا، جس کی دلیل حضرت ابو سعید الخدریؓ کی حدیث ہے کہ جو خندق کی لڑائی سے متعلق ہے کہ جنگ میں گرفتار رہنے کی وجہ سے ہم لوگ نماز سے روک دئے گئے۔ الخ۔ اور آخر میں ہے کہ یہ واقعہ آیت پاک فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا، کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے، یہ حدیث ابن ابی شیبہ و عبد الرزاق و شافعی و بیہقی دارمی اور ابو یعلی نے روایت کی ہے۔

قاضی عیاضؒ نے کہا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ اس نماز خوف کا حکم غزوہ خندق کے بعد نازل ہوا ہے، محقق ابن الہمامؒ نے جواب دیا ہے کہ اس اعتراض کا یہاں کوئی مقام نہیں ہے، کیونکہ اصل بحث تو یہ چل رہی ہے کہ نماز کی حالت میں قتال کرنا مفسد نماز ہے یا نہیں ہے، اور اس آیت فَإِنْ خِفْتُمْ سے تو اس بات کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے کہ خوف کی حالت میں پیدل چلتے ہوئے اور سواری

پر ہر حالت میں جائز ہے اور ہم بھی اس کے قائل ہیں، اور نماز خوف کے حکم کے بارے میں قول صحیح یہی ہے کہ غزوہ خندق کے اور غزوہ عسفان کے شروع میں نازل ہوا ہے اس دلیل کی بناء پر کہ ابو عیاش الزرقی کی حدیث میں ہے کہ جب مشرکوں نے یہ چاہا کہ نماز میں مشرکوں نے تنگ کرنے کا ارادہ کیا تو ظہر اور عصر کی نماز کے درمیان نماز خوف نازل ہوئی، احمد، نسائی اور قدوریؒ نے اس کی روایت کی ہے ساتھ ہی ترمذیؒ نے بھی حضرت ابوہریرہؓ سے اس کی روایت کی، ساتھ ہی اس کی تصحیح بھی ہے، گذشتہ روایتوں کے اختلاف سے بھی کچھ فرق نہیں ہوتا ہے کیونکہ غزوہ عسفان بھی تو بلاشبہ غزوہ خندق کے بعد ہوا ہے، اور ابو موسیٰؓ غزوہ ذات الرقاع میں تھے، جیسا کہ صحیحین میں ہے، اور احمد اور سنن اربعہ کی روایت کے مطابق ابوہریرہؓ بھی ذات الرقاع میں تھے، اور یہ بات معلوم ہے کہ ابوہریرہؓ غزوہ میں اسلام لائے ہیں جو غزوہ خندق کے بعد ہوا اور اس کے بعد غزوہ ذات الرقاع ہوا۔

اس تمہید کے بعد اب ہم یہ کہتے ہیں کہ قتال کی حالت میں نماز جائز نہیں ہے، کیونکہ اگر جائز ہوتی تو رسول اللہ ﷺ غزوہ میں لڑائی کی حالت میں تمام نمازیں ادا فرمالیتے قضانہ ہونے دیتے، اور جیسا کہ یہ بات مشہور و معروف ہے کہ غزوہ خندق کے بعد نماز خوف کا حکم نازل ہوا ہے، اور آیت پاک میں ہتھیار باندھے نماز پڑھنے کا حکم بھی مذکور ہے مگر اس میں یہ بات جائز نہیں رکھی گئی ہے کہ قتال بھی کرتے جاؤ، جس کا حاصل یہ ہوا کہ نماز کی حالت میں قتال مفسد نماز ہوگا۔ فتح القدیر یے مختصر۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قتال کرنا نماز کے اعمال میں سے نہیں ہے، اسی طرح جو شخص امام کی طرف آنے یا جانے میں صف سے نکل کر سواری پر سوار ہو جائے تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جائے گی۔ الجوہرہ۔

اسی طرح دریا میں تیرتے ہوئے یا پیدل چلتے ہوئے بھی نماز جائز نہیں ہے۔ المضمرات۔ پس اگر بھاگتے ہوئے کچھ ٹھہرنا ممکن ہو تو نماز پڑھ لے، ورنہ ہمارے نزدیک نماز مؤخر کردے، اور نماز خوف میں سہو ہو جائے تو دو سجدے ادا کرنے واجب ہیں۔ المحیط۔ اور حضرت عبداللہ بن انسؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس کی ابوداؤد نے روایت کی ہے کہ جب خالد بن سفیان الہندلی کو لوگ قتل کے لئے لے جا رہے تھے تو انہوں نے چلتے ہوئے میں اشارہ سے نماز پڑھ لی تھی یہ روایت دلیل بنانے کے لائق نہیں ہے کیونکہ یہ تو ان کا اپنا ذاتی فعل بیان کیا اس میں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ایسا کرنا سنت ہے یا صحیح ہے، لہٰذا یہ عمل حجت نہیں بن سکتا ہے، لیکن ہمارے نزدیک صحابی کی تقلید پر عمل کرنا زیادہ ضروری ہے بہ بنسبت اپنے قیاس پر عمل کرنے کے اچھی طرح سمجھ لیں۔ م۔

فان اشتد الخوف صلوا ركبانا فرادى يؤمون بالركوع والسجود الى اى جهة شاء واذا لم يقدروا على التوجه الى القبلة لقوله تعالى فان خفتم فرجالا او ركبانا وسقط التوجه للضرورة وعن محمد انهم يصلون بجماعة وليس بصحيح لانعدام الاتحاد فى المكان.

ترجمہ:- اور جب دشمنوں کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جائے تو لوگ اپنی سواری پر ہی تنہا تنہا نماز پڑھ لیں اس طرح سے کہ رکوع و سجدہ اشارہ سے کرے جس سمت وہ چاہیں (موقع ہو) جبکہ قبلہ کی طرف رخ کرنے پر قدرت نہ ہو کیونکہ فرمان باری تعالیٰ ہے کہ اگر تم کو خوف ہو تو پیدل یا سوار، قبلہ کی طرف رخ کرنا ایک مجبوری کی بناء پر ساقط کیا گیا ہے، اور امام محمدؒ سے مروی ہے کہ وہ لوگ جماعت کے ساتھ ہی نماز پڑھیں گے، مگر یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ ایک جگہ میں سب کا اکٹھے ہو جانا اس وقت معدوم ہوتا ہے۔

توضیح:- خوف بہت زیادہ بڑھ جانے کے وقت میں نماز کی کیفیت، پیدل و سوار، جماعت
دشمن سے بھاگنے کے وقت، دشمن کا پیچھا کرتے وقت سواری پر فرض نماز
تین آدمی اور خوف کی نماز گناہ کے مقصد میں سفر کرتے وقت نماز خوف، حدیث سے دلیل

فان اشتد الخوف صلوا رکبانا فرادی یؤمون بالرکوع والسجود الی ای جهة شاء......الخ
اور اگر خوف بہت بڑھ جائے تو لوگ نماز پڑھ لیں۔ف۔ پیدل کھڑے ہوئے۔الذخیرہ۔یا جبکہ سواری ہوں، تو رکبانا سواری کی حالت ہی میں۔ف۔ جبکہ دشمن کے ہجوم سے اترنا بہت خطرہ کا باعث ہو فرادی الخ تنہا تنہا۔ف۔جماعت کے بغیر یہی ظاہر الروایۃ ہے یومون الخ رکوع اور سجدہ کا اشارہ کرتے ہوئے۔ف۔ قبلہ رخ ہو کر بشرطیکہ ایسا ممکن ہو یاالی ای جهة الخ جس سمت کی طرف چاہیں جبکہ قبلہ کی طرف توجہ کرنا ممکن نہ ہو۔

لقوله تعالی ﴿فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا﴾ وسقط التوجه للضرورة......الخ
اس فرمان باری تعالیٰ کی وجہ سے یعنی اگر تم کو خوف معلوم ہوتا ہو یعنی پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا ہو، تو پیادہ یا سوار ہو کر جس طرح نماز پڑھو، وسقط الخ ضرورت اور مجبوری کی وجہ سے قبلہ کی طرف توجہ رکھنا ساقط ہو گیا وعن محمد الخ اور امام محمد سے نوادر میں روایت ہے کہ سوار حضرات بھی جماعت سے نماز پڑھ لیں ولیس الخ لیکن یہ روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ ایک جگہ میں ہونا شرط ہے وہ اس جگہ موجود نہیں ہے۔ف۔ یعنی امام و مقتدی کی جگہ ایک نہیں ہے اسی بناء پر اگر ایک سواری پر دو سوار ہوں اور پیچھے رہنے والا مقتدی اور آگے کا امام ہو کر جماعت سے نماز پڑھ لیں تو بالاتفاق یہ جماعت صحیح ہو گی۔الفتح۔اور پیدل چلتے ہوئے بالاتفاق جماعت نہیں کر سکتے ہیں، دونوں مسئلوں میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ پیدل کی چال اور رفتار حقیقت میں اس کا ذاتی عمل ہے، لیکن سوار کی رفتار جانور کا فعل اس سوار کا نہیں ہے، مجازاً اسے سوار کا آگے بڑھنا کہا جاتا ہے، سوار اگر خود بھاگ رہا ہو تو اسی طرح پڑھے جیسا کہ بتلایا گیا، لیکن اگر خود دوسرے بھاگنے والے کو پکڑنا چاہتا ہو یا بھگانا چاہتا ہو تو چلتے ہوئے نہیں پڑھے گا کیونکہ اس کی ضرورت نہیں (کہ وہ اتر کر نہیں پڑھ سکتا ہے) سواری پر بھی بارش یا ڈاکوؤں کے خوف سے فرض پڑھنا جائز ہے جبکہ نماز خوف کے بتلائے ہوئے طریقہ پر پڑھنا ممکن نہ ہو، فقہاء امصار کے نزدیک تین آدمی مل کر بھی اس طرح خوف کی نماز پڑھ سکتے ہیں کہ ان میں سے ایک امام اور ایک مقتدی ہو اور ایک دشمن کے سامنے ہو کر حفاظت کر رہا ہو، جبکہ یہی کافی ہو رہا ہو، مرغینانی میں ہے کہ ایسے مسافروں کے لئے خوف کی نماز صحیح نہیں ہے جو گناہ کے کام کے ارادے سے سفر میں ہوں، جیسے حرام لڑائی کے درمیان جائز نہیں ہے۔مع۔

باب الجنائز اذا احتضر الرجل وجه الی القبلة علی شقه الایمن اعتبارا بحال الوضع فی القبر لانه اشرف علیه والمختار فی بلادنا الاستلقاء لانه ایسر لخروج الروح والاول هو السنة ولقن الشهادتین لقوله ﷺ لقنوا موتاکم شهادة ان لااله الا الله والمراد الذی قرب من الموت.

ترجمہ:۔ باب جنازوں کا بیان، جب آدمی محتضر ہو اسے اپنے پہلو پر قبلہ رخ کر دیا جائے قبر میں رکھے جانے کی ہیئات پر قیاس کرتے ہوئے کیونکہ یہ شخص اسی درجہ میں پہونچ چکا ہے، لیکن ہمارے ملک میں مشائخ کا پسندیدہ طریقہ اس کو چت لٹا دینا ہے کیونکہ یہ طریقہ روح نکلنے میں آسان تر ہے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم اپنے مرنے والوں کے سامنے کلمہ شہادت لاالہ الااللہ کی تلقین کرو اس جگہ موتیٰ سے مراد وہ ہے جو مرنے کے قریب پہونچ چکا ہو۔

توضیح:۔ باب جنازوں کا بیان، محتضر قریب المرگ یعنی جس کی موت قریب ہو اس کے احکام، قبلہ کی طرف رخ کر دینا، داہنی کروٹ پر لٹانا، تلقین شہادتین، تلقین کا طریقہ، محتضر کے پاس حائضہ و جنبی کا رہنا، تلقین کا مستحب ہونا، محتضر، اور کلمات کفر کہنا، غرغرہ کے وقت کا ایمان، گناہوں سے توبہ، نیک لوگوں کا موجود ہونا، سورہ یسین پڑھنا، خوشبو لگانا، دفن کے وقت مردہ کی تلقین سننا، موت کے وقت پانی اور شربت

حلق میں ٹپکانا

باب الجنائز......الخ

جنازوں کے بیان میں، جنائز، جیم پر فتحہ کے ساتھ جنازہ کی جمع ہے، میت، مردہ شخص، جیم کے کسرہ کے ساتھ وہ تخت، کھاٹ جس پر مردہ کو رکھتے ہیں۔ مع۔

اذا احتضر الرجل وجه الی القبلة علی شقه الایمن......الخ

جب آدمی محتضر ہوا، یعنی موت کے فرشتے اس کے پاس آگئے یا موت سامنے آگئی، چونکہ اس کیفیت کا جاننا بہت مشکل ہے اس لئے اس کے معنی ہوئے جب موت قریب ہو گئی اور اس کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں یعنی ٹانگیں ڈھیلی پڑ گئیں کہ کھڑی نہیں ہو سکتی ہیں، اور ناک ٹیڑھی ہو گئی، اور کنپٹیاں بیٹھ گئیں، جب یہ علامتیں ظاہر ہو جائیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت، **وجه الخ** تو اس کا چہرہ قبلہ کی طرف کر دیا جائے **علی شقه الخ** اس کی داہنی کروٹ پر۔ ف۔ امام مالک و شافعی و احمدؒ کا یہی قول ہے۔ ع۔

اعتبارا بحال الوضع فی القبر لانه اشرف علیه......الخ

قبر میں رکھے جانے کی ہیئات پر قیاس کرتے ہوئے، کیونکہ یہ شخص قبر کے کنارہ پر آچکا ہے **والمختار الخ** لیکن ہمارے علاقہ میں ماوراء النہر کے علاقہ میں چت لٹا کر رکھنا پسند کیا گیا ہے۔ ف۔ یعنی پاؤں قبلہ کی طرف کر کے، امام الحرمین شافعی نے کہا ہے کہ اسی پر ہم لوگوں کا عمل ہے۔ ع۔ **لانه ایسر الخ** کیونکہ اس طرح روح نکلنے میں بہت آسانی ہو سکتی ہے۔ ف۔ لیکن اس کے بارے میں کوئی نص نہیں ہے، اور نہ عقل سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے، صرف احتمال اور اٹکل کا اعتبار نہیں ہے، اسی بناء پر مصنفؒ نے کہا ہے۔

والاول هو السنة ولقن الشهادتین لقوله ﷺ لقنوا موتاکم شهادة ان لااله الا الله......الخ

کہ پہلی ہی صورت مسنون ہے۔ ف۔ کہ داہنی کروٹ پر لٹا دیا جائے، کیونکہ براء بن معرورؓ نے وصیت کی تھی کہ میرا تہائی مال رسول ﷺ کو دیا جائے، اور موت کے وقت مجھے قبلہ رخ کر دیا جائے، جب رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور آپ سے وصیت کا تذکرہ کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ فطرت کو پا گیا ہے، اور ملنے والی تہائی رقم کے متعلق فرمادیا کہ وہ رقم براء کی اولاد کو دے دی جائے یعنی آپ نے اس مال سے کچھ بھی قبول نہیں کیا، اور حاکم اور بیہقیؒ نے اس حدیث کی روایت کی، تو رسول اللہ ﷺ نے اس بیان سے قبلہ رخ کرنے کی تعریف فرمادی، اور دائیں کروٹ پر لٹانے کے لئے سلسلہ میں تائید کے لئے خواب کی حدیث پیش کی جا سکتی ہے جو اسی کے دوسری صحابی براء بن عازبؓ سے صحیحین میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے **اذا اتیت مضجعك فتوضأ وضوء ك للصلوة ثم اضطجع علی شقك الایمن الخ** کہ تم جب بستر پر سونے کے لئے جانا چاہو تو جیسے نماز کے لئے وضوء کیا جاتا ہے اسی طرح مکمل وضوء کر لو پھر دائیں کروٹ پر لیٹ جاؤ، آخر تک، اور آخر میں یہ بھی ہے کہ اگر تم اسی طرح بستر پر مر گئے تو فطرت پر مرے، اس سے معلوم ہوا کہ اس ہیأت پر مرنا بہت بہتر ہے اور اس حدیث میں قبلہ رخ کرنے کا ذکر اس لئے نہیں ہے کہ شاید ہر شخص کو اس طرح کی خواب گاہ میسر نہ ہو الحاصل دونوں حدیثوں کو ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرنے کے قریب انسان کو قبلہ رخ دائیں کروٹ پر لٹا دیا جائے عطاءؒ نے فرمایا ہے کہ میں نے ہر شخص کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے اس کے خلاف نہیں دیکھا ہے، ابن شاہین نے اس کی روایت کی ہے، ابوداؤد میں حضرت عمر بن قتادہؓ کی حدیث میں ہے **استحلال البیت الحرام قبلتکم احیاء واموانا**، یعنی کبیرہ گناہوں میں سے ہے خانہ کعبہ کو جو بیت الحرام ہے اور تمہاری زندگی اور موت دونوں حالتوں کا قبلہ ہے اسے حلال کر لینا، اس کے علاوہ یہ حالت قبر میں لیٹنے اور مرض میں لیٹنے کے برابر ہے، جبکہ دونوں میں دائیں کروٹ پر قبلہ رخ لیٹنا مسنون ہے۔ مفع۔

جصاصؒ نے فرمایا ہے کہ پھر اگر اس طرح لٹانا اس کے لئے دشوار ہو تو اسے اس کی موجودہ حالت پر چھوڑ دیا جائے۔ع۔
ولقن الخ اور اسے شہادتین کی تلقین کی جائے۔ف۔ یعنی متفق علیہ طور پر مستحب ہے کہ اشھد ان لاالہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ ﷺ اس کو تلقین کریں، اکثر کتابوں میں صرف لاالہ الا اللہ ہے، لیکن بہتر وہی صورت ہے جو مصنفؒ نے بیان کی ہے لقولہ ﷺ الخ اس بناء کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم لوگ اپنے مردوں کو لاالہ الا اللہ کی شہادت کی تلقین کرو۔ف۔ بخاری کے علاوہ تمام افراد صحاح ستہ نے اس کی روایت کی ہے، یعنی محمد رسول اللہ ﷺ کی شہادت کے ساتھ کیونکہ صرف لاالہ الا اللہ کلمہ توحید پورا نہیں ہے، جبتک کہ اس کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نہ ملایا جائے جس کی دلیل حضرت حضرت ابن عباسؓ کی وہ حدیث ہے جو وفد عبدالقیس سے متعلق ہے جن کو رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالی وحدہ لاشریك لہ پر ایمان لانے کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا ہے، اس کی گواہی دے تو اس کے معنی میں دونوں کلمے جمع ہو گئے، اور اسی بناء پر بہت سی کتابوں میں صرف لاالہ الا اللہ کہنے کا ذکر ہے، کیونکہ موت کی ایسی حالت میں جہانتک مختصر ہو بہتر ہے، اب اس حدیث میں مردوں کو تلقین کرنے کا لفظ ہے اس لئے ایک احتمال یہ ہوا کہ مردوں کو دفن کرنے کے بعد اوپر سے ہی قبر میں تلقین کی جائے اور دوسرا احتمال یہ بھی ہوا کہ جب مرنے لگے اس وقت تلقین کی جائے اسی لئے مصنفؒ نے کہا:

والمراد الذی قرب من الموت......الخ

اس جگہ مردوں سے مراد ہر وہ شخص ہے جو مرنے کے قریب ہو گیا ہو۔ف۔ کہ آخر عنقریب مردہ ہونے والا ہے، کیونکہ حقیقت میں مردہ کو تلقین سے اثر نہ ہوگا اس لئے اب یہی مراد ہوگا جو عن قریب مرنے والا ہے۔مع۔ تلقین کی صورت یہ ہوگی مردہ پر غرغرہ لگنے یعنی گھرا لگنے جان کی سے ذرا پہلے اتنی بلند آواز سے کہ وہ سن سکے کوئی شخص اس کے پاس بیٹھ کر خود کہے، تلقین کرے اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمد رسول اللہ، مگر مرنے والے کو کہنے کے لئے کہا نہ جائے کہ تم ایسا کہو، اور نہ اس پر کسی طرح بھی ہٹ کی جائے یا دباؤ ڈالا جائے، اس خوف سے کہ شاید اس کی زبان سے کچھ نامناسب لفظ نکل جائے اس وقت جیسے ہی اس کی زبان سے یہ کلمہ نکل جائے اسے دوبارہ نہیں کہنا چاہئے، البتہ صرف اس صورت میں جبکہ اس کے بعد بھی اس نے کوئی اور بات کہی ہو۔الجوہرہ۔ھ۔

یہ باتیں اس لئے بتائی گئی کہ صحیح حدیث میں ہے کہ جس شخص کا آخری کلام لاالہ الا اللہ ہو وہ جنت میں داخل ہوا۔م۔ اس مجلس میں حائضہ عورت اور جنبی مرد یا عورت کے موجود ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قاضی خان۔فع۔ مستحب یہ ہے کہ تلقین کرنے والا ایسا شخص نہ ہو جس کو اس کی موت سے خوشی ہوتی ہو، بلکہ ایسا شخص ہو جو اس مختصر کے بارے میں ایمان اور خاتمہ بخیر کا گمان رکھتا ہو۔السراج۔ اگر ایسے شخص سے اس وقت کفریہ کلمات نکلے ہوں تو مشائخ نے کہا ہے کہ اس پر کفر کا حکم نہیں لگایا جائے گا، بلکہ مسلمان مردوں کی طرح اس کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا۔الفتح۔ غرغرہ کے وقت لاالہ الا اللہ کہہ کر ایمان لانا بے فائدہ ہے، البتہ ایسے وقت گناہوں سے توبہ مقبول ہے، جیسا کہ ملا علی قاریؒ نے ظہیریہ وغیرہ سے شرح فقہ اکبر میں وضاحت کے ساتھ کہا ہے، اور بندہ مترجم نے اپنی تفسیر میں خوب بسط اور وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔م۔ نیک لوگوں کا اس وقت حاضر ہونا بہتر ہے، اس کے پاس سورہ یٰسین پڑھی جائے، خوشبو موجود رہے، ہمارے نزدیک ظاہر الروایۃ میں قبر پر تلقین نہیں ہے۔ع۔الدرایہ۔ یہ اس لئے کہ ہمارے نزدیک بلا اختلاف مردہ از خود نہیں سنتا ہے۔ف۔

اور اگر وہ سنے بھی تو یہ کلام تو خود اس کا نہ ہوگا جو اس کے لئے مفید ہو سکے، اور اگر مفید ہوتا تو سن کر منافق اور کافر بھی ضرور کہتا، میں مترجم کہتا ہوں کہ شاید اس تلقین سے اسے یاد دلانا مقصود ہو، بشرطیکہ وہ سن سکے، مگر سننا تو اجماع مشائخ کے خلاف ہے۔م۔ مگر ہم تو موت کے وقت بھی اور دفن کے وقت بھی دونوں اوقات میں تلقین کرتے ہیں۔المضمرات۔ اور ابن الہمامؒ کا ظاہر کلام بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے، جس کی دلیل لقنوا موتاکم حدیث ہے، اور عینیؒ نے لکھا ہے کہ شمس الائمہ حلوانیؒ نے کہا

ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ ہم نہ کہتے ہیں اور نہ روکتے ہیں، قاضی خان نے کہا ہے کہ اگر نفع نہیں ہے تو اس سے ضرر بھی نہیں ہے۔
عینیؒ نے کہا ہے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ تلقین کیوں نہیں کی جائے، حالانکہ طبرانیؒ نے ابو امامہؓ سے روایت کی ہے کہ ابو امامہؓ نے فرمایا ہے کہ جب میں مروں تو میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے مردوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا حکم دیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ جب تمہارے مؤمن بھائیوں میں سے کوئی مر جائے، اور تم نے اس کی قبر پر مٹی ڈالی تو چاہئے کہ اس کی قبر کے سرہانے کھڑا ہو کر کہے اے فلاں ابن فلانہ یعنی اس کی ماں کا نام لے کر کہے تو وہ سنے گا البتہ جواب نہیں دے گا، پھر کہے اے فلاں بن فلانہ تو وہ اٹھ کر بیٹھ جائے گا پھر کہے اے فلاں بن فلانہ تو وہ کہے گا مجھے کہو اللہ تم پر رحم کرے، مگر تم کو اس کے جواب کا پتہ نہ چلے گا، پھر کہے کہ تم اس بات کو یاد کرو جس کو۔ کہتے ہوئے تم دنیا سے گئے ہو یعنی اس بات کی گواہی **لاالہ الا اللہ و ان محمد رسول اللہ**، یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلا شبہ محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں، اور تم دنیا میں ان باتوں پر راضی ہو گئے تھے کہ اللہ ہمارا رب ہے، اسلام ہمارا دین ہے، اور قرآن امام یعنی رہبر ہے، یہ سن کر منکر و نکیر میں سے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا، اس کے پاس سے چلو ہمیں وہ یہاں بیٹھنے نہیں دے گا جس نے اسے جواب بتا دیا اور دلیل سکھلا دی ہے یہ سن کر صحابہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ یا رسول اللہ اگر اس کی ماں کا نام نہ جانتے ہوں تو فرمایا کہ اس کی ماں حواء کی طرف منسوب کر دو، اور کہو اے فلاں بن حواء، عینیؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے، لیکن سعید الازدی جس نے ابو امامہ سے روایت کی ہے اس کی جگہ ابن ابی حاتم نے جگہ سپید خالی چھوڑ دی ہے۔
میں مترجم کہتا ہوں کہ علمی دلیل کے اعتبار سے اس جگہ دونوں وجہیں تمام نہیں ہیں، اس لئے کہ بالاتفاق ائمہ و مشائخ حنفیہ کے نزدیک دلیل نص قرآن سے مردے نہیں سنتے ہیں اور ایسی نص سے جو کہ عام ہو اسے مخصوص کرنے کے لئے قطعی دلیل چاہئے، اور یہ حدیث جو ذکر کی گئی ہے اگر صحیح بھی ہوتی تو اس نص صریح کے برابر ہرگز نہ ہوتی، حالانکہ اس کی اسناد کی صحت میں اب بھی کلام باقی ہے، لہٰذا قبر کی تلقین خلاف مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔ الحاصل موت کے وقت تلقین بالاجماع مستحب ہے، اور یہ بھی مستحب ہے کہ مریض کا وہ متولی وہاں پر موجود رہے جو اس پر مہربان اور سمجھ اور معاملہ فہم ہو وہ اسے گناہوں سے اور مظالم سے توبہ کی اور وصیت کی تلقین کرے، اور جب اسے یہ اندازہ ہو جائے کہ اب روح قبض ہو رہی ہے تو اس کے حلق کو شربت اور پانی وغیرہ سے تر کرتا رہے۔ ع۔

فاذا مات شد لحیاہ و غمض عیناہ بذلک جری التوارث ثم فیہ تحسینۃ فیستحسن.

ترجمہ: جب وہ مر جائے تو اس کے جبڑے باندھ دیئے جائیں، اور آنکھیں بند کر دی جائیں، اور آنکھیں بند کر دی جائیں، اسی طرح سے ہمارے تمام بزرگوں کا عمل ہوتا آیا ہے، اور ایسا کرنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ مردے کی صورت کو اچھی شکل میں رکھنا اور دکھانا ہے لہٰذا اسے اچھا ہی سمجھا جائے گا۔

توضیح: -روح نکل جانے کے بعد اس کے جبڑے باندھنا، آنکھیں بند کرنا، جوڑ و بند نرم کرنا، انتقال کے بعد حائضہ اور جنبی کو مردے کے پاس سے ہٹا دینا، پیٹ پر تلوار یا آئینہ رکھنا، موت کے وقت کے کپڑے اتار کر پورا کپڑا اٹھانا، زمین سے تختہ پر لٹانا، اچانک مرنے والے کا حکم، میت کے پاس قرآن، اس کے دوست و احباب کو مطلع کرنا، بازاروں میں آواز، ادائیں فرض تجہیز و تکفین میں جلدی، مری ہوئی عورت کے پیٹ میں زندہ بچہ ہونا

فاذا مات شد لحیاہ و غمض عیناہ......الخ

جب وہ مر جائے تو اس کے جبڑے باندھ دئے جائیں۔ف۔ایک چوڑی پٹی لے کر تھوڑی کے نیچے سے نکال کر دونوں کنارے سر پر بہت آسانی سے باندھ دئے جائیں۔الجوہرہ۔اور اس کی آنکھیں بند کر دی جائیں۔ف۔یہ کلام اس کے اہل وعیال میں سے وہ کرے جو اس پر مہربان ہو۔الجوہرہ۔اور بند کرنے والا یہ دعا پڑھتا ہے بسم اللہ وعلی ملة رسول اللہ، اللهم يسير عليه امره وسهل عليه ما بعده و اسعده بلقائك واجعل ماخرج اليه خيراً مما خرج عنه. التبیین۔یعنی آنکھیں بند ہوئیں اللہ تعالی کے نام اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر، الٰہی اس پر اس کا کام آسان کر دے اور اس کے مابعد کو اس پر سہل کر دے، اور اس کو اپنی دیدار سے نیک بخت بنادے اور جس جگہ گیا ہے اسے بہتر بنادے اس جہاں سے وہاں گیا ہے۔فع۔پھر اس کے جوڑ بند نرم کر دے اور ہاتھوں کو بازوں کی طرف لا کر پھر سیدھا دراز کر دے، اور ہاتھ کی انگلیوں کو ہتھیلی کی طرف لا کر پھر سیدھی کر دے، اور رانوں کو پیٹ کی طرف لگا کر پھر دراز کر دے۔الجوہرہ۔

مصنفؒ نے کہا ہے بذلك جرى الخ ایسا کرنے پر توارث جاری ہے۔ف۔بعد کے زمانہ کے لوگوں کو اپنے پہلے زمانہ کے لوگوں سے ایسا ہی عمل ملا ہے کہ نیچے جبڑے کو اوپر جبڑے سے ملا کر باندھ دیتے ہیں، اور آنکھیں بند کر دیتے ہیں ثم فيه الخ پھر ایسا کرنے میں یہ فائدہ بھی ہے کہ مردے کی صورت کو بہتر بنانا ہوا، فیستحسن تو ایسا کرنا ہی بہتر ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے بھی ابو سلمہؓ کی آنکھیں بند کی تھیں، جیسا کہ مسلم کی حدیث میں ہے۔ع۔اور حدیث میں ہے کہ جب روح نکلتی ہے تو آنکھ کی بینائی اسی کے پیچھے لگتی ہے، مطلب یہ ہے کہ اس کی خوبصورتی پر نظر فریفتہ ہوتی ہے۔م۔وہ جب انتقال کر جائے تو حائضہ اور جس کسی کو نہانے کی ضرورت ہو وہ وہاں سے علیحدہ کر دے جائیں، اور اس کے پیٹ پر تلوار و آئینہ کوئی چیز رکھ دی جائے تاکہ پھول نہ جائے، اور موت کے کپڑے اتار کر اس پر کوئی پورا کپڑا ڈال کر کسی تخت یا تختہ (کھاٹ) پر لٹایا جائے تاکہ زمین کی تری اثر نہ کرے۔المنتقی۔ع۔السراج۔اور جو اچانک مر جائے اس کی تجہیز وغیرہ میں اتنی تاخیر کی جائے کہ اس کی موت بالکل یقینی ہو جائے (کہ کبھی سکتہ وغیرہ بھی ہو جایا کرتا ہے) الجوہرہ، اس وقت اس کے پاس قرآن پڑھنا مکروہ ہے، یہاں تک کہ اسے غسل دیا جائے۔التبیین۔اور مستحب ہے کہ اس کے مسلمان دوست واحباب (ومتعلقین) کو مطلع کرے تاکہ اس کے لئے نماز ودعا کرنے کا حق ادا کرلیں۔الجوہرہ۔اور بازاروں میں اعلان کرانا قول اصح کے مطابق مکروہ نہیں ہے۔محیط السرخسی۔اور اس کے قرضے ادا کرنے میں جلدی کریں۔لیکن تجہیز وتکفین میں تاخیر نہ کریں۔الجوہرہ۔اگر مردہ عورت کے پیٹ میں بچہ حرکت کرتا ہوا نظر آئے تو اس کا پیٹ چیر کر اسے نکال لیا جائے، کہ اس کے علاوہ دوسرا کوئی چارہ نہیں ہے۔قاضی خان۔

فصل فی الغسل

فصل مردہ کے نہلانے کے بیان میں

فاذا ارادوا غسله وضعوه على سويد لينصب الماء عنه وجعلوا على عورته خرقة اقامة لواجب الستر و يكتفى بستر العورة الغليظة هو الصحيح تيسيرا.

ترجمہ:۔فصل، غسل کے بیان میں، جب لوگ اس مردہ کو نہلانے کا ارادہ کریں تو اسے تخت پر رکھ دیں تاکہ اس کا استعمال کیا ہوا پانی بہہ کر نیچے آجائے، اور اس کی شرمگاہ پر کپڑے کا ٹکڑا ڈال دیا جائے، اس کے ستر کو جو واجب ہے اس کے قائم مقام کرتے ہوئے، اس کے ستر کرنے میں صرف عورت غلیظہ (اصل شرمگاہ) کے چھپانے پر اکتفاء کیا جائے، یہی صحیح ہے، غسل دینے میں آسانی کے خیال سے۔

توضیح:۔ زندہ غسل میت، مردہ پر غسل واجب ہونے کی وجہ
غسل کی کیفیت، تختہ پر لٹانا، ستر عورت

فصل فی الغسل......الخ

مردہ کے غسل کے بیان میں، واضح ہو کہ اکثر کتابوں میں مردوں کو غسل دینا زندہ پر حق واجب لکھا ہے جبکہ ابن الہمامؒ نے فرض یعنی عملی فرض کفایہ لکھا ہے، اجماع کے خیال سے، اگرچہ اجماع کا ہونا کہیں بطور نص کے موجود نہیں ہے، اور ابی بن کعبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی موت کا وقت آیا تو فرشتے جنت سے کفن اور حنوط خوشبو لائے،، اور جب ان کا انتقال ہو گیا تو بیری کے پتے کے پانی سے تین مرتبہ نہلایا اور تیسری مرتبہ کافور ملایا، اور طاق کپڑوں میں کفن دیا، اور لحد کھودی، اور اس پر نماز پڑھی، اور کہا کہ آدم کے بعد ان کی اولاد کی یہی سنت ہے، حاکم نے اس کی روایت کی ہے، اور دوسری روایت میں ہے کہ فرشتوں نے کہا ہے کہ اے اولاد آدم آدم کے بعد یہی تمہاری سنت ہے اس لئے تم ایسا ہی کیا کرو، پھر جنازہ کی نماز پڑھی، پھر انہیں قبر میں اتار کر اس پر کچی اینٹیں رکھیں، اور قبر سے نکل کر اس پر مٹی ڈال دی، اور بیہقیؒ نے بھی اس کی روایت کی ہے۔ ع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ظاہر یہ ہے کہ فرشتوں نے آدمی کی صورت میں آکر یہ سب کام کئے، اور بعد میں اولاد آدم پر یہ ظاہر ہوا کہ وہ فرشتے تھے، واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔ اور صحیحین میں حضرت ابن عباسؓ سے اس شخص کا واقعہ بھی مروی ہے جو اونٹنی پر سے گر کر مر گیا تھا، اس میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ اس کو پانی اور بیری کے پتوں سے غسل دو، اور صحاح ستہ میں حضرت ام عطیہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی دختر مطہرہ یعنی حضرت زینبؓ کے نہلانے میں عورتوں کو حکم دیا کہ تم اسے تین یا پانچ یا زیادہ مرتبہ اگر تم مناسب سمجھو تو غسل دو، اور صحیح میں ہے کہ آں حضرت ﷺ کو حضرت ابو بکرؓ نے غسل دیا، اس کے بعد سے برابر لوگوں کا یہی طریقہ چلا آیا ہے، اس طرح یہ فعل غسل زندوں پر واجب ہوا، اور یہ بات کہ مردہ کو غسل دینا کیوں واجب ہوا تو اس کے جواب میں دو قول ہیں ایک یہ ہے کہ حدث کی وجہ سے واجب ہوا ہے، کیونکہ اس کی عقل ختم ہو چکی تھی، اور اگر موت کی نجاست سے غسل ہوتا تو اس سے پاک نہیں ہوتا، دوسرا قول یہ ہے کہ نجاست موت کی وجہ سے غسل واجب ہوا ہے، کیونکہ آدمی بھی ایسا حیوان ہے جس میں خون موجود ہے، تو دوسرے ان جانوروں کی طرح جن میں خون ہوتا ہے یہ بھی موت سے ناپاک ہو جاتا ہے۔ ف۔ یہ قول شیخ ابو عبداللہ ارجانی وغیرہ مشائخ عراق کا ہے، اور دوسرے مشائخ کا بھی یہی قول ہے، اور یہی اظہر ہے۔ ع۔ اور یہی قیاس کے زیادہ مطابق ہے۔ ف۔ اسی وجہ سے اگر کنویں میں مر جائے تو وہ ناپاک ہو جاتا ہے، اور اگر غسل کے بعد کنویں میں گر جائے تو کنواں ناپاک نہیں ہوتا ہے، اور اگر کسی محدث کو لادے ہوئے نماز پڑھ لے تو جائز ہے، لیکن غسل دینے سے پہلے کسی مردہ کو لادے ہوئے اگر کوئی نماز پڑھ لے تو نماز نہ ہو گی، اور اگر غسل کے بعد نماز پڑھی تو جائز ہے۔ محیط۔ البدائع۔

لیکن دونوں اقوال پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس صورت میں تو غسل کے بعد بھی پاک نہیں ہونا چاہیئے، جیسے دوسرے جانور کہ جب خود مر کر ناپاک ہو جائیں تو وہ دھو دینے کے بعد بھی پاک نہیں ہوتے، اسی لئے محمد بن الشجاع الثلجیؒ نے کہا ہے کہ مومن کی یہ کرامت ہے، کہ وہ موت سے بھی ناپاک نہیں ہوتا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ سے مرفوعاً حدیث روایت کی گئی ہے کہ سبحان اللہ ان المومن لاینتجس حیا ومیتا، یعنی ابوہریرہؓ نے کہا تھا کہ میں ناپاک تھا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ سبحان اللہ موت تو کبھی بھی زندگی یا موت میں نجس نہیں ہوتا ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اگر یہ روایت صحیح ثابت ہوتی ہو تو واجب ہو گا کہ یہی کہا جائے کہ اس کا سبب حدث ہے۔ مف۔ م۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابوہریرہؓ کی حدیث کا یہ ٹکڑا ان المومن لاینجس یعنی مومن نجس نہیں ہوتا ہے، یہ حدیث صحیح ہے، جیسا کہ خود ترمذیؒ نے کہا ہے کہ حسن صحیح ہے اور خود صحیح کی روایت میں بھی یہ ٹکڑا موجود ہے، اس کے بعد حیاً و میتاً کی زیادتی کا اگرچہ ثبوت نہ ہو پھر بھی حاصل معنی یہی ہیں کیونکہ مرنے کے بعد بھی مومن ہے، اور چونکہ حدیث مطلق ہے، اس لئے ہم

اسے مقید نہیں کرتے، حالانکہ کوئی نص مقید بھی نہیں ہے، یہی بات قیاس کے بہت قریب اور اصول کے بہت موافق ہے کیونکہ زندگی کی حالت میں اسباب جنابت وغیرہ کے باوجود نجس نہ ہوا بلکہ محدث ہوا تو مرنے کے بعد بورجہ اولی نجس نہ ہوگا، بلکہ صرف محدث ہوگا، کیونکہ یہ قربان یعنی شہید نہیں ہوا ہے پس اگر وہ قربان ہو گیا یعنی شہید کیا گیا ہو تو وہ محدث بھی نہ ہوگا، اسی بناء پر شہید کے لئے غسل کا حکم نہیں ہے، اور دوسرے جانوروں پر اس کا قیاس خلاف اصول ہے، کیونکہ انسان اور دوسرے حیوانات میں روح، عقل اعتقادات کی پاکی وغیرہ باتوں میں بہت زیادہ بلکہ مکمل فرق ہوتا ہے، اور اب صرف خون کی وجہ سے اس پر قیاس خلاف اصول ہے، کیونکہ انسان کی پاکی اعتقادات کی پاکی سے ہے، اسی لئے انسان اگر توحید حق کے اعتقاد سے پاک نہ ہوا تو وہ زندہ بھی نجس ہے، اسی لئے فرمان باری تعالی ہے ﴿اِنَّ الْمُشْرِكِيْنَ نَجَسٌ﴾ اس بناء پر کافر مردہ بھی نجس ہے، اسی لئے یہ مسئلہ کہ اگر بیٹا مومن ہو اور اس کا باپ کافر ہو اور یہ باپ مر گیا تو بیٹا ایسے باپ کو شرعی غسل نہیں دے گا بلکہ اسے کپڑے دھونے کی طرح دھودے گا۔

اب یہ بات کہ غسل کے قبل اگر کوئی کنویں میں داخل ہوگا تو اس کا پانی ناپاک اور اس کے پانی سے وضوء اور نماز جائز نہیں ہے، یہ حکم تو صرف احتیاط کی بناء پر دیا گیا ہے کہ موت کے قریب ترین مگر اس سے کم مرتبہ نیند میں منی اور پیشاب وغیرہ کا نکلنا اکثر اور نہ نکلنا بہت ہی کم ہے اس لئے اکثر حالات کو موجود اور واقعی یا مٹے پاتے یہ حکم دیا گیا ہے، اس کی بہت سی نظیریں بھی موجود ہیں جیسا کہ بیہوشی یا نیند کو ناقض وضوء کہنا، حالانکہ ان چیزوں سے نہ حدث وجنابت ہے نہ نجاست، الحاصل یہی قول بہت صحیح اور قیاس کے بہت موافق اور اظہر ہے کہ مومن مردے کو حدث کی بناء پر غسل دینا واجب ہے واللہ تعالی اعلم بالصواب۔ م۔

اب یہ سوال اس غسل میں نیت غسل زندوں کے غسل کی طرح شرط ہے یا نہیں؟ جواب یہ ہے کہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ شرط نہیں ہے ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ مردے کے پاک ہو جانے کے لئے تو یہ شرط نہیں ہے، لیکن زندہ کے ذمہ سے غسل دینے کی ذمہ داری سے سبکدوشی کے لئے ظاہر یہ ہے کہ شرط ہے، جیسا کہ امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے کہ اگر مردہ پر اتنا پانی برس گیا کہ وہ دھل گیا یا پانی اس پر سے بہہ گیا تو اس طرح دھلنا مردے کے غسل کے قائم مقام نہ ہوگا کیونکہ غسل دینے کی ہماری ذمہ داری باقی رہ گئی ہے، ابن الہمامؒ نے فرمایا ہے کہ اس وجہ سے ہم نے ابھی تک اس کا حق ادا نہیں کیا ہے مشائخ فقہاء نے کہا ہے کہ جو شخص پانی میں ڈوب کر مر گیا ہو وہ ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق تین بار نہلایا جائے، اور امام محمدؒ سے ایک روایت ہے کہ اگر اس کو نکالتے وقت غسل کی نیت کر لی گئی ہو تو دو بار غسل دیا جائے ورنہ تین بار، اس طرح امام محمدؒ نے نیت کے ساتھ نکالنے میں نیت کے ساتھ ہونے کو غسل مان لیا ہے اور ایک روایت یہ ہے کہ ایک بار غسل دینا کافی ہے، گویا اس قول میں مقدار واجب کا بیان کیا ہے۔ الفتح۔

فاذا ارادو اغسله وضعوه على سرير لينضب الماء عنه......الخ

اب جبکہ لوگ مردہ کو غسل دینے کا ارادہ کر لیں تو اسے ایک تخت پر رکھ دیں فينصب الخ تاکہ اس سے پانی بہہ جائے۔ف۔ ائمہ کرام سے اس کی کیفیت کے بارے میں کوئی روایت موجود نہیں ہے، الاسبیجابی، لیکن قول اصح یہ ہے کہ جس طرح لٹانا آسان ہو لٹا دیں۔ الظہیر یہ۔ لیکن بہتر یہ ہے کہ بائیں کروٹ پر لٹایا جائے تاکہ دائیں سے شروع کرنا آسان ہو۔ التحفہ۔ لیکن مشہور ومعروف طریقہ یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پاؤں کر کے چت لٹا دیتے ہیں۔ مع۔ ھ۔

وجعلوا على عورته خرقة اقامة لواجب السترو يكتفى بستر العورة الغليظة هو الصحيح تيسيرا......الخ

اور اس کی شرمگاہ پر کپڑا اڈال دیں اقامة لواجب الستر الخ تاکہ پردہ پوشی کا جو واجب حق ہے وہ پورا ہو جائے، ویکتفی الخ اور صرف سخت شرمگاہ (اصل جگہ کے آس پاس) کی چھپانے پر اکتفاء کیا جائے، یعنی پیشاب وپائخانہ کی جگہ کو۔ع۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے ناف کے نیچے سے گھٹنے تک، یہی قول صحیح ہے۔ المحیط۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس صحت کے قول کے ثبوت میں کمزوری

ہے، لہذا جب مشکل ہوا تو یہ قول ساقط ہو گیا، لہذا ظاہر مذہب ہی اصح باقی رہا۔ م۔

ونزعوا ثيابه ليمكنهم التنظيف، ووضوءه من غير مضمضة واستنشاق، لان الوضوء سنة الاغتسال، غير ان اخراج الماء منه متعذر، فيتركان ثم يفيضون الماء عليه اعتبارا بحال الحيوة.

ترجمہ:۔اور غسل دینے والے اس کے کپڑے اتار دیں تاکہ ان کے لئے اس کی صفائی کا کام آسان ہو اور اس کو کلی اور ناک میں پانی ڈالے بغیر وضوء کرادیں، کیونکہ اس وقت وضوء کرنا غسل کی ایک سنت کو ادا کرنے کے لئے ہے، لیکن اس کے منہ اور ناک میں گئے ہوئے پانی کو باہر نکالنا چونکہ بہت مشکل کام ہے، لہٰذا یہ دونوں کام چھوڑ دئے جائیں، پھر اس کے پورے بدن پر زندگی کے طریقہ کے مطابق پانی بہادیں۔

توضیح:۔مردے کے کپڑے اتارنا، وضو کرانا

ونزعوا ثيابه ليمكنهم التنظيف.....الخ

اور مردے کے کپڑے اتار دیں۔ف۔جن میں وفات پائی ہے، **ليمكنهم الخ** تاکہ لوگوں کے لئے مردہ کو صاف ستھرا کرنا اور نہلانا آسان ہو۔ف۔ مگر امام شافعیؒ کے نزدیک چونکہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں ہی میں غسل دیا گیا تھا اس لئے سنت یہی ہوئی کہ کپڑے نہ اتارے جائیں، جواب یہ ہے کہ اس وقت خود صحابہ کرامؓ کو اس میں تردد ہوا تھا کہ دستور کے مطابق کپڑے اتار دئے جائیں یا انہیں کپڑوں میں غسل دیا جائے، اسی عالم میں ان پر اچانک نیند کا غلبہ ہوا یہانتک کہ سب کی گردنیں لٹک کر سینے کی آگئیں اور مکان کے ایک طرف سے آواز آئی کہ رسول اللہ ﷺ کو کپڑوں سمیت غسل دو، حضرت ام المومنین عائشہؓ فرمایا کرتیں کہ جو بات اب میری سمجھ میں آئی اگر پہلے ہی سمجھ میں آجاتی تو سوائے ازواج مطہرات کے رسول اللہ ﷺ کے دوسرا اور کوئی نہیں نہلاتا۔ابوداؤد۔اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ میں بھی مردوں کو ننگا کر کے نہلانا معروف طریقہ تھا۔البتہ اس طرح کپڑوں میں نہلانا رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی۔مع۔غسل دینے والوں اور ان کے مددگاروں کے سوا دوسروں کو اس وقت پردہ کرنا مستحب ہے۔السراج۔

اس طرح استنجاء کرایا جائے کہ نہلانے والا موٹا کپڑا ہاتھ پر لپیٹ کر شرمگاہوں کو دھوئے، کیونکہ چھونا بھی دیکھنے کی طرح حرام ہے۔الجوہرہ۔مرد عورت کو اور عورت مرد کو غسل نہ دے، اگر مردہ عورت کا نہلانے والا مردوں کے سوا عورتوں میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا غسل ختم ہو جائے گا، البتہ مرد اپنے ہاتھ پر کپڑا لپیٹ کر تیمم کرادے۔الفتح۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ اس مسئلہ سے اس بات کی تصریح ہو گئی کہ مردہ نجس نہیں ہوتا ہے بلکہ حدث ہے کیونکہ نجاست کا تیمم باطل ہے۔م۔ نہلاتے وقت مردہ مرد کی ران کو مرد بھی نہ دیکھے، اسی طرح مردہ عورت کی ران کو نہلانے والی عورت نہ دیکھے۔التاتارخانہ۔

ووضوءه من غير مضمضة واستنشاق، لان الوضوء سنة الاغتسال.....الخ

اس مردہ کو وضوء کرادیں۔ف۔سوائے ایسے بچہ کے جو نماز نہیں پڑھتا تھا۔القاضی خان۔ تو وضوء کرنے والے کو دائیں سے وضوء کرادیں۔المبسوط۔ **من غير الخ** کلی کرائے اور ناک میں پانی ڈالنے کے بغیر۔ف۔ اکثر فقہا کرام کا یہی قول ہے۔ع۔ **لان الوضوء الخ** کیونکہ غسل کی ادائیگی کے لئے ایک سنت وضوء ہے۔ف۔ جس طرح نماز کے لئے وضوء کیا جاتا ہے، بغیر ہاتھ دھلائے۔المحیط۔ **غير ان الخ** ان دونوں وضوء کے درمیان صرف اتنا فرق ہے نماز کے وضوء میں کلی کرنی اور ناک میں پانی ڈالنا سنت ہے لیکن میت کو وضوء کرانے کے لئے یہ دونوں نہیں کئے جائے کیونکہ پانی اندر ڈالنے کے بعد اس کا باہر نکالنا ممکن نہیں ہوتا ہے۔ف۔ یعنی شرعاً ساقط ہو گئے ہیں۔م۔اس لئے چہرہ دھونے سے ہی وضوء شروع ہو گا۔المحیط۔ لیکن بعض علماء نے کہا ہے کہ نہلانے والا شخص اپنی انگلی پر کپڑا لپیٹ کر مردہ کے منہ سے دانت اس کی جڑیں اور تالو وغیرہ ہونٹوں کے ساتھ صاف

کر کے ناک صاف کر دے۔ الظہیریہ۔ اور شمس الائمہ حلوائیؒ نے کہا ہے کہ اسی پر لوگوں کا عمل ہے۔ المحیط۔ صحیح یہ ہے کہ مردہ کے سر کا مسح کیا جائے، اور پاؤں دھونے میں تاخیر نہ کی جائے۔ التبیین۔

ثم یفیضون الماء علیه اعتبارا بحال الحیوۃ......الخ

پھر وہ لوگ مردہ پر پانی بہادیں، اعتبارا بحال الخ حالت حیات پر قیاس کرتے ہوئے۔ ف۔ ہمارے نزدیک نہلانے کے لئے گرم پانی ہونا بھی افضل ہے۔ المحیط۔ اور شافعیہ کی کتاب المحلی میں بھی یہی لکھا ہے، لیکن جواہر المالکیہ میں دونوں کا اختیار ہے یعنی ٹھنڈے سے بھی اور گرم سے بھی جس سے چاہے۔ مع۔ اب اس تختہ کا بیان ہے جس پر غسل دیا جائے گا، اور پانی کی کیفیت کا بیان شروع ہوتا ہے۔

ویجمر سریرہ وترا لما فیه من تعظیم المیت، وانما یوتر لقوله ﷺ: ان الله وتر یحب الوتر، ویغلی الماء بالسدر او بالحرض مبالغة فی التنظیف، فان لم یکن فالماء القراح لحصول اصل المقصود، ویغسل رأسه ولحیته بالخطمی لیکون انظف له.

ترجمہ:- اور اس کے تخت کو طاق بار دھونی دی جائے مردہ کی تعظیم کرنے کے خیال سے، تین بار اس لئے کہا گیا ہے اللہ تعالیٰ خود وترا اور بے جوڑ ہے اور اسی طرح بے جوڑ اعداد کو محبوب رکھتا ہے، اور پانی کو گرم کیا جائے اس میں بیر کی پتیوں یا حرض کو ڈال کر، اس سے اچھی طرح (جلد) صفائی ہو جاتی ہے اگر یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں تو صرف پانی بھی کافی ہے، کیونکہ اس سے بھی مقصد حاصل ہو جاتا ہے، پھر اس کے سر اور ڈاڑھی کے بالوں کو دھویا جائے تاکہ اس کی بہت زیادہ صفائی ہو جائے۔

توضیح:- تختہ کو دھونی دینا، بیر کی پتیوں کے ساتھ جوش دئے ہوئے پانی یا صاف پانی سے، سر اور ڈاڑھی کو خطمی سے دھونا

ویجمر سریرہ وترا لما فیه من تعظیم المیت......الخ

اور تختہ کو طاق بار کسی خوشبو سے دھونی دی جائے۔ ف۔ اس طرح سے کہ ایک شخص لوبان دانی، یا انگیٹھی میں خوشبو کافور وغیرہ ڈال کر تخت کے چاروں طرف تین، پانچ یا سات بار گھمادے۔ ف۔ اس سے زیادہ نہ کیا جائے۔ الاسبیجابی۔ ع۔ لما فیه الخ کیونکہ ایسا کرنے میں مردہ کی عزت افزائی ہے وانما یوتر الخ اور طاق بار اس لئے کیا جائے کہ اس کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ وتر ہے اور وتر کو محبوب رکھتا ہے۔ ف۔ اس کی روایت بزارؒ نے کی ہے۔ ع۔ بلکہ صحیحین کی وہ حدیث جس میں اسمائے الٰہی مذکور ہیں اس کا آخری جملہ یہی ہے، اور حضرت جابرؓ سے مرفوعا روایت ہے کہ جب تم لوگ مردہ کو دھونی دو تو طاق دفعہ دھونی دو، حاکم اور ابن حبانؒ نے اس کی روایت کی ہے۔

مردے کو کل تین مرتبے دھونی دی جاتی ہے، (۱) اس کی روح نکلتے وقت تاکہ کوئی بدبو ہو تو دور ہو جائے، (۲) نہلاتے وقت (۳) کفن پہناتے وقت اس کے بعد دھونی نہیں لگائی جاتی ہے اور نہ قبر میں دی جاتی ہے، کیونکہ حدیث میں اس طرح سے منع کیا گیا ہے کہ تم جنازے کے پیچھے نہ آگ لاؤ اور نہ آواز، یعنی کافروں کی طرح رونا پیٹنا، اور آگ لے جانا بھی ممنوع ہے۔ الفتح۔ م۔

ویغلی الماء بالسدر او بالحرض مبالغة فی التنظیف......الخ

اور پانی جوش دیا جائے۔ ف۔ زعفران یا ورس سے نہیں۔ ت۔ کیونکہ یہ رنگ مردوں کو نہیں چاہئے، بلکہ بالسدر الخ بیر کی پتیوں سے حرض سے۔ ف۔ حرض، اشنان، ایک قسم کی گھاس ہوتی ہے۔ ب۔ مبالغه الخ ایسا کرنا زیادتی صفائی کے خیال سے ہے۔ ف۔ تاکہ خوب اچھی طرف صفائی اور ستھرائی ہو جائے، جیسا کہ کچھ پہلے غسل کے دلائل میں بیان کیا جا چکا ہے، اور بیر کی

پتیوں وغیرہ کے ملانے اور سات بار تک غسل دینے سے صفائی میں مبالغہ کرنا ظاہر ہے، ورنہ ایک بار غسل دینا کافی تھا، اور پانی کو گرم کرنے کا بھی یہی مقصد ہوا الحاصل بیر کی پتی اشنان ڈال کر پانی کو جوش دیا جائے فان لم لکن الخ اگر یہ چیز میسر نہ ہوں تو خالص پانی ہی کافی ہے۔ف۔ یعنی پانی کو جوش دیا جائے، اور اگر جوش دینا ممکن نہ ہو تو اسی طرح کافی ہے لحصول الخ کیونکہ اصل مقصود حاصل ہے۔ف۔ یعنی مردہ کو غسل دینا۔

ویغسل رأسه ولحیته بالخطمی لیکون انظف له......الخ

اور مردہ کا سر۔ف۔ جبکہ اس پر بال ہوں۔التبیین۔ ولحیته الخ اور اس کی داڑھی دھوئی جائے، خطمی دوسری چیز سے دھودیں۔التبیین۔ اور اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو خالص پانی ہی کافی ہے۔ شرح الطحاوی ثم یضجع الخ پھر میت کو اس کے بائیں کروٹ پر لٹادیا جائے۔ف۔ تاکہ غسل کا کام دائیں طرف سے شروع ہو، فیغسل الخ پس ممکن ہونے کی صورت میں پانی اور بیری سے دھویا جائے حتی ان الخ یہانتک کہ دیکھ لیا جائے کہ مردہ کے جسم کا نچلا حصہ جو تخت سے ملا ہوا ہے، وہاں تک پانی پہونچ گیا ہے۔ف۔ تاکہ پورا بدن دھل جائے۔م۔ اس طرح پورا بدن اچھی طرح کم از کم ایک باز دھونا واجب ہے، اور تین بار دھونا سنت ہے۔البدائع۔

ثم یضجع علی شقه الایسر فیغسل بالماء والسدر حتی یری ان الماء قد وصل الی ما یلی التخت منه ثم یضجع علی شقه الایمن فیغسل حتی یری ان الماء قد وصل الی ما یلی التخت منه لان السنة هو البدایة بالمیامن ثم یجلسه ویسنده الیه ویمسح بطنه مسحا رفیقا تحرزا عن تلویث الکفن فان خرج منه شیء غسله ولایعید غسله ولا وضوء ہ لان الغسل عرفناه بالنص وقد حصل مرة ثم ینشفه بثوب کیلا تبتل اکفانه ویجعله ای المیت فی اکفانه ویجعل الحنوط علی رأسه ولحیته والکافور علی مساجده لان التطیب سنة والمساجد اولی بزیادة الکرامة.

ترجمہ و توضیح:۔ مردہ کو دائیں و بائیں الٹ پلٹ کرنا، حدیث سے دلیل، تکیہ لگا کر پیٹ کو ملنا، اگر غسل کے بعد مردہ کے بدن سے کچھ نکلا، کفن کے بعد نکلا، بدن کپڑے سے پوچھنا، حنوط لگانا، سجدہ کے اعضاء پر کافور لگانا

ثم یضجع علی شقه الایسر فیغسل بالماء والسدر حتی یری ان الماء قد وصل......الخ

پھر اس مردہ کو اس کے بائیں کروٹ پر لٹا کر پانی اور بیر کے پتہ سے اتنا دھویا جائے کہ یہ دیکھا جائے کہ پانی اس کے بدن کے اس حصہ تک پہونچ گیا جو تخت سے ملا ہوا ہے، پھر اسے دائیں کروٹ پر کردیا جائے پھر اتنا دھویا جائے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس حصہ تک پانی پہونچ گیا ہے جو تخت سے ملا ہوا ہے۔ف۔ پس پہلے دائیں طرف سے دوسری مرتبہ بائیں طرف سے ہو گیا لان السنة الخ کیونکہ دائیں طرف سے شروع کرنا سنت بھی ہے۔ف۔ حضرت ام المومنین عائشہؓ کی اس حدیث کی وجہ سے جو وضوء کی بحث میں گذر چکی ہے، ایک جماعت نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت ام عطیہؓ کی اس حدیث کی وجہ سے جو حضرت زینبؓ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی سے غسل دینے کے بارے میں ہے، جسے ائمہ صحاح ستہ نے بیان کیا ہے، اس میں یہ ٹکڑا بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم سے فرمایا ہے کہ اس کے داہنے اعضاء اور وضوء کے مواضع سے شروع کرو۔مع۔ الحاصل پہلی اور دوسری مرتبہ تو پانی اور بیری کے ساتھ دھویا جائے، لیکن تیسری مرتبہ پانی اور کافور سے ہو، جیسا کہ محمد بن سیرینؒ نے ام عطیہؓ سے صراحۃ پایا ہے، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اور اس کی اسناد صحیح ہے۔مف۔ اور مردہ کی پیٹھ دھونے کے لئے اسے اوندھا نہ کیا جائے۔ع۔ معلوم ہونا چاہئے کہ نوادر میں امام ابوحنیفہؒ سے روایت ہے کہ جب مردہ کے غسل کا ارادہ کریں تو پہلے اسے بٹھلا کر

پیٹ سے جو کچھ نکلے اسے دھویا جائے، پھر غسل کا کام شروع کیا جائے، امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، لیکن ظاہر الروایت وہی ہے جو مصنف) نے بیان کیا ہے، یعنی پہلے دائیں جانب سے غسل دیا جائے پھر بائیں جانب سے غسل دیا جائے۔

ثم يجلسه ويسنده اليه ويمسح بطنه مسحا رفيقا تحرزا عن تلويث الكفن

پھر وہ غسال مردہ کو بٹھلائے ویسنده الخ اور اس مردہ کے پیٹ کو نرمی کے ساتھ دبائے۔ف۔ تاکہ پیٹ سے اگر کچھ نکلنے والی چیز ہو تو وہ نکل آئے تحرزا الخ تاکہ اس کا کفن گندگی نکلنے سے گندہ نہ ہو جائے فان خرج منه الخ اگر میت کے پیٹ سے کچھ نکل آئے، غسله الخ تو اس کی گندگی کو دھو ڈالے، اور اب اس کا غسل یا وضوء دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ف۔ امام مالک و شافعی اور ثوریؒ کا بھی قول ہے۔ مع۔ لان الغسل الخ کیونکہ اس کے غسل کا حکم تو ہم نے نص سے پایا ہے جو ادا کیا بھی گیا ہے۔ف۔ اس لئے دوبارہ کرنا نہ ہوگا، اور زندوں پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے۔م۔ پھر تیسری مرتبہ اسے پانی اور کافور سے بائیں کروٹ پر لٹا کر دائیں طرف سے غسل دیا جائے، تاکہ پورے بدن پر اچھی طرح سے پانی پہونچ جائے، اب تک اسے تین بار غسل دینے کا کام پورا ہو گیا۔ الفتح۔ اگر اب کفن میں لپیٹنے کے بعد بھی کچھ گندگی نکل آئے تو بلا اختلاف نہ اس کا دھونا ضروری ہے اور نہ اس کا وضوء یا غسل کرانا ضروری ہے۔ مع۔

ثم ينشفه بثوب كيلا تبتل اكفانه ويجعله اى الميت فى اكفانه ويجعل الحنوط على رأسه......الخ

البتہ مردے کے بدن کو کسی پاک کپڑے سے پوچھ لے، کیلا تبتل الخ تاکہ اس کا کفن بھیگ نہ جائے۔ف۔ اس کے بعد کفن کو خوشبو لگا دینا چاہئے اور مردہ کو اسی طرح خوشبو لگا کر کفن پہنا دینا چاہئے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے ویجعله الخ اور مردہ کو اس کے کفن کے کپڑوں میں لپیٹ دینا چاہئے۔ف۔ بس اتنا ہی کام ضروری ہے، لیکن مفید میں ہے کہ خوشبو لگانا مستحب ہے، اسی لئے فرمایا ہے ویجعل الحنوط الخ اور مردہ کے سر اور داڑھی پر حنوط دے، کئی خوشبودار چیزوں کو ملانے سے جو مجموعہ عطر ہوتا ہے اسی کو حنوط کہتے ہیں۔ف۔ یہ خوشبو کسی بھی چیز کی ہو اور عطر کوئی بھی ہو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، البتہ صرف مرد کو زعفران یا ورس نہیں لگانا چاہئے۔ الایضاح۔ اسی لئے عورت کو لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ المحیط۔ اکثر علماء نے مشک لگانے کو بھی جائز کہا ہے۔ع۔ بندہ مترجم کہتا ہے کہ اگر یہ آگ کے ذریعہ سے نہ نکالا گیا ہو تو بہتر ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔م۔ الحاصل کفن پہنانے میں اس کے سر اور داڑھی اور تمام بدن پر حنوط لگا دیا جائے۔ المحیط۔ ھ۔

والكافور على مساجده لان التطيب سنة والمساجد اولى بزيادة الكرامة

ان اعضاء پر لگایا جائے جو سجدہ کرتے وقت زمین پر رکھے جاتے ہیں۔ف۔ پیشانی، ناک، دونوں ہتھیلیاں، دونوں گھٹنے اور دونوں قدموں پر۔ المحیط، لان التطيب الخ اس لئے سب میں خوشبو لگانا سنت ہے۔ف۔ حضرت ام عطیہؓ اور دوسروں کی حدیث کی بناء پر، پس جب تمام بدن پر حنوط مل دیا گیا تو از خود اعضاء سجود پر بھی لگانے کا کام ہو گیا، اس کے بعد ان اعضاء پر خوشبو لگانا اور اضافہ ہو گیا والمساجد اولى الخ یہ سجدہ والے اعضاء زیادتی تعظیم کے زیادہ مستحق ہیں۔ف۔ ان جگہوں کو خوشبو لگانے کے بارے میں بیہقیؒ نے حضرت ابن مسعودؓ سے نقل کیا ہے۔ع۔

ولايسرح شعر الميت ولالحيته ولايقص ظفره ولاشعره لقول عائشةؓ علام تنصون ميتكم ولان هذه الاشياء للزينة وقد استغنى الميت عنها وفى الحى كان تنظيفا لاجتماع الوسخ تحته وصار كالختان.

ترجمہ:- مردہ کے نہ سر کے بالوں میں اور نہ داڑھی میں کنگھی کی جائے، اور نہ اس کے ناخن کاٹے جائیں اور نہ بال تراشے جائیں، حضرت عائشہؓ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم کس بناء پر اپنے مردے کی پیشانی پکڑ کر کھینچتے ہو، اور اس لئے بھی کہ یہ چیزیں زینت کے لئے ہیں، اور مردہ تو اب ایسی زینت سے مستغنی ہو چکا ہے، اور زندگی میں ایسا کرنا تو صفائی کی غرض سے ہوتا تھا کہ بالوں اور ناخنوں کے نیچے میل جم جاتے ہیں، اور یہ چیزیں ختنہ کی طرح ہو گئیں۔

توضیح :- بالوں اور داڑھی میں کنگھی، بال وناخون کاٹنا، حدیث سے دلیل، چند ضروری مسائل، غسل مردہ مرد کو، مردہ عورت کو، لڑکے اور لڑکی کو، اپنی بیوی کو، اپنے شوہر کو، مرد مردہ بیوی کو، غسل دینے والے پر غسل، غسل میں روئی کا استعمال، مردہ کے غسل دینے پر اجرت، جنازہ اٹھانے پر، مردہ کا سڑ جانا، مرد اور عورت کے غسل میں فرق، حائض اور جنبی نہلانے والا، بے وضوء، ثقہ ہونا، مردہ مرد اور صرف عورتیں، مردہ عورت اور صرف مرد، سفر کی حالت میں مردہ، اور پانی نہیں، مردہ مسافر نے تیمم کر کے نماز پڑھی، اس کے بعد پانی ملا، کافر اور مسلمان مردے ملے جلے، اور کوئی پہچان نہیں

ولایسرح شعر المیت ولالحیته ولایقص ظفره ولاشعره......الخ

مردہ کے بالوں یعنی سر کے بالوں اور اس کی ڈاڑھی میں کنگھی نہ کی جائے، **ولایقص الخ** اور نہ اس کے ناخن کاٹے جائیں۔ف۔ مگر ٹوٹے ہوئے ناخن کو علیحدہ کر دینے میں حرج نہیں ہے۔المحیط۔ اور نہ اس کے سر کے بال کاٹے جائیں۔ف۔ نہ مونچھیں کتری جائیں، اور نہ بغل کے بال اکھاڑے جائیں، اور نہ زیر ناف کے بال مونڈے جائیں، بلکہ سب کو اپنی حالت پر دفن کر دیا جائے۔ محیط السرخسی۔

لقول عائشة علام تنصون میتکم ولان هذه الاشیاء للزینة وقد استغنی المیت عنها......الخ

ام المومنین حضرت عائشہؓ کے قول کے وجہ سے کہ تم کیا سوچ کر اپنے مردے کے سر کے بال پکڑ کر کھینچتے ہو۔ف۔ یہ اس لئے فرمایا کہ کچھ لوگ اپنی مردہ عورت کو کنگھی کرتے تھے، عبدالرزاقؒ نے اسناد صحیح سے اس کی روایت کی ہے، ام المومنینؓ نے اس کنگھی کرنے کے کام کو اس سے تشبیہ دی ہے کہ جیسے کسی کی پیشانی کے بال پکڑ کر گھسیٹا جائے۔ف۔ **ولان الخ** اور اس وجہ سے بھی کہ یہ سب کام تو زینت کے واسطے ہوتے ہیں، اور مردہ اب زینت اور بناؤ سنگار سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ف۔ مردہ کو زندہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے، کیونکہ دونوں جہاں کے درمیان بہت فرق ہے۔

وفی الحی کان تنظیفا لاجتماع الوسخ تحتة وصار کالختان......الخ

اور زندہ میں ناخن کترنا اور بال کٹوانا وغیرہ صفائی وستھرائی کے لئے ہوتا ہے، کیونکہ ان کے نیچے میل اور گندگی جمع ہو جاتی ہے۔ف۔ لیکن مردہ میں ایسے کاموں کا اعتبار نہیں ہوتا ہے۔ **وصار کالمختان الخ** ان کاموں کی مثال ختنہ کی سی ہو گئی۔ف۔ کیونکہ زندہ کا ختنہ امر مسنون ہے، لیکن اگر مردہ کا ختنہ کیا ہوا نہ ہو تو ہمارے اور امام شافعیؒ کے نزدیک بالاتفاق ختنہ نہیں کیا جائے گا۔ مع۔ پھر عوام ان چیزوں کو دیکھ کر دار آخرت کے معاملہ میں یعنی زینت کے کام کرنے لگے، حالانکہ وہاں زینت تو نیک اعمال سے حاصل ہوتی ہے۔ م۔ ابو وائلؒ نے کہا ہے کہ حضرت علیؓ کے پاس اس حنوط میں سے جو رسول اللہ ﷺ کو لگایا گیا تھا بچا ہوا تھا تو وصیت کی کہ مجھے بھی اس سے لگایا جائے، ابن ابی شیبہ وحاکم اور بیہقیؒ نے اس کی روایت کی ہے، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے۔ مفع۔

وہ حنوط جو رسول اللہ ﷺ کے واسطے آیا تھا اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں تمام عالم کے شروع سے آخر زمانہ تک کے حنوط سے اشرف الخلائق ﷺ کے واسطے مقدر ہوا تھا، لہٰذا اس میں سے بچا ہوا حضرت علیؓ نے بطور تبرک لیا تھا، حالانکہ وہ حنوط رسول اللہ ﷺ کے بدن سے چھڑ لیا ہوا یا آپ کا استعمال کیا ہوا نہ تھا، تبرک کے یہ معنی لینا میں باریکی ہے اسے اچھی طرح یاد رکھ لیں۔ م۔

چند ضروری مسائل

مردہ کو فقط مرد اور مردہ عورت کو صرف عورت ہی نہلائے، البتہ کوئی لڑکا یا لڑکی اتنی چھوٹی ہو کہ اس کی طرف نظر بد نہیں

اٹھ سکتی ہو تو اسے کوئی بھی نہلا سکتا ہے، یہی صحیح ہے۔ المبسوط۔ اور ابن المنذرؒ نے اجماع نقل کیا ہے کہ بیوی اپنے مردہ شوہر کو غسل دے سکتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک مرد اپنی مردہ بیوی کو غسل نہیں دے سکتا ہے، البتہ قول اصح کے مطابق دیکھ سکتا ہے، اور امام شافعیؒ واحمدؒ اور دوسروں کے نزدیک غسل دینا بھی جائز ہے۔ مع۔ غسال یعنی مردے کے نہلانے والے پر عامہ علماء سلف و خلف کے نزدیک غسل واجب نہیں ہوتا ہے، البتہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ واجب ہوتا ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کی بناء پر کہ جو شخص کسی مردہ کو غسل دے اسے چاہئے کہ وہ خود بھی غسل کرلے، اور جس نے جنازہ اٹھایا ہو اسے چاہئے کہ وضوء کرلے، ابوداؤد اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، پھر ترمذی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، مگر بیہقی اور نوویؒ نے اسے ضعیف کہا ہے، جیسا کہ عینیؒ میں ہے، لیکن میں مترجم کہتا ہوں کہ حدیث کے معنی تو یہ ہیں کہ غسل دینے والے کو چاہئے کہ وہ غسل کرکے پہلے پاک ہو جائے یعنی جنبی کا غسل دینا مکروہ ہے، اور جو شخص جنازہ کو کاندھا دے اسے چاہئے کہ وہ پہلے وضوء کرلے اور ایسا کرنا مستحب ہے، ایک قول اس میں یہ بھی ہے کہ یہ فرمان نبی علیہ السلام ہی نہیں ہے بلکہ خود ابوہریرہؓ کا قول ہے، میں کہتا ہوں کہ قول سے یہی مراد اور یہی معنی ہیں۔ سمجھ لیں۔ م۔

ظاہر الروایات کے مطابق ہمارے نزدیک غسل میں روئی کا استعمال نہیں ہے، اور نوادر میں امام اعظمؒ سے مروی ہے کہ دھنی ہوئی روئی مردہ کے نتھنوں اور منہ میں لگادے، اور بعضوں نے کہا ہے کہ کانوں میں بھی، اور ظہیریہ میں کہا ہے کہ پیشاب یا پائخانہ کے مقیم میں روئی لگانے کو تمام علماء نے برا جانا ہے۔ مفع۔ مردہ کے غسل پر اجرت لینا جائز نہیں ہے، البتہ جنازہ اٹھانے پر مزدوری جائز ہے۔ قاضی خان۔ اگر لاش اتنی سڑ گئی ہو کہ اس کا نہلانا مشکل ہو تو صرف اوپر سے پانی بہادینا کافی ہے۔ العتابیہ۔ مرد کے غسل کی طرح ہی عورت کو غسل دینا ہوتا ہے، عورت کے سر کے بال اس کی پیٹھ پر نہ ڈالے جائیں۔ شرح الطحاوی۔ غسال (نہلانے والا) اگر جنبی یا حائض ہو تو جائز ہے مگر مکروہ ہے۔ الدرایہ۔ بے وضوء ہو تو بالاتفاق جائز ہے۔ القنیہ۔ لیکن پاک ہونا ہی مستحب ہے، اور یہ بھی مستحب ہے کہ وہ شخص مردہ کا سب سے قریبی رشتہ دار ہو۔ الزاہدی۔ اور مزدلفہ ہو کہ اچھائی دیکھے تو بتلادے لیکن اگر اس میں کوئی برائی دیکھے تو بیان کرنا حلال نہیں ہے۔ الجوہرہ۔ اگر اس جگہ پر کوئی دوسرا نہلانے والا موجود ہو تو نہلانے والے کو اجرت مانگنی جائز ہے ورنہ نہیں۔ الظہیریہ۔

اگر کوئی ایسی جگہ مرا ہو کہ وہاں غسل دینے کے لائق کوئی مرد نہ ہو تو عورتوں میں جو اس کی ذی رحم محرم (محرمات) سے ہوں وہ اسے صرف تیمم کرادے، اور اگر غیر محرم عورت ہو تو وہ کپڑا لپیٹ کر تیمم کرادے۔ الدرایہ۔ جیسے کہ کوئی عورت مری اور وہاں صرف مرد ہی ہوں۔ ع۔ اگر کوئی سفر میں ایسی جگہ مرا جہاں پاک پانی نہ ہو تو تیمم کرا کے نماز پڑھادی جائے۔ المحیط۔ پھر اگر پانی مل گیا ہو تو نہلا کر امام ابویوسفؒ کے قول کے مطابق دوبارہ نماز پڑھائی جائے۔ قاضی خان۔ اگر مسلمانوں اور کافروں کے مردے مل جل گئے ہوں یعنی ان میں پہچان نہیں ہو سکتی ہو تو اگر ان میں مسلمانوں کی زیادتی ہو سب کو غسل دیا جائے۔ ع۔

فصل فی التکفین

فصل کفنانے کے بیان میں

السنة ان یکفن الرجل فی ثلثة اثواب ازار و قمیص ولفافة لماروی انه ﷺ کفن فی ثلثة اثواب بیض سحولیة ولانه اکثر ما یلبسه عادة فی حیاته فکذا بعد مماته فان اقتصروا علی ثوبین جاز والثوبان ازار ولفافة وهذا کفن الکفایة لقول ابی بکرؓ اغسلوا ثوبی هذین و کفنونی فیهما ولانه ادنی لباس الاحیاء.

ترجمہ:۔ سنت یہ ہے کہ مرد کو کفن دیا جائے ان تین کپڑوں (۱) ازار (۲) قمیص (۳) اور لفافے میں، اس روایت کی بناء پر کہ رسول اللہ ﷺ بھی تین کپڑوں میں کفنائے گئے جو سحولیہ اور سفید تھے، اور اس لئے بھی کہ آپ اپنی زندگی میں بھی عادت کے

مطابق پہنے رہتے تھے، اس لئے زندگی کی وفات کے بعد بھی یہی اکثر لباس ہوا، اور اگر لوگوں نے صرف دو ہی کپڑوں پر اکتفاء کیا تو وہ بھی جائز ہوگا، دو کپڑوں سے مراد ازار اور لفافہ ہے، یہ کفن کفایت ہے، ابو بکرؓ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ تم میرے ان دو کپڑوں کو دھو دو اور ان ہی میں مجھے کفن دو، اور اس لئے کہ یہی دو کپڑے زندوں کے کم سے کم کپڑے ہیں۔

توضیح:۔ فصل کفنانے کے بارے میں، مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کفن دینا، شوہر کی ذمہ داری ہے بیوی کو کفن دینا، اگر بیوی مالدار ہو اور مردہ شوہر مفلس ہو، مردے کے کفن کے واسطے سوال، لوگوں کے مال سے کفن، اگر کفن میسر نہ ہو، کفن جائز اور کفن ناجائز، نیا پرانا، مرد اور عورت کے کفن میں فرق، مرد کا مسنون کفن، دلیل، کفن کی قسمیں، کفن کفایت، دلیل

فصل فی التکفین......الخ

فصل: کفنانے کے بیان میں، مردوں کو کفن دینا مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اسی لئے قرضہ سے پہلے اس کام کو کرنا ضروری ہے، اگر مردہ خود مالدار تھا تو اسی کے مال سے واجب ہوگا ورنہ جس پر زندگی میں اس کی ذمہ داری تھی، امام ابو یوسفؒ کے نزدیک شوہر پر اس کی بیوی کا کفن لازم ہے اگرچہ عورت خود مالدار ہو اور اسی پر فتوی ہے، جیسا کہ قاضی خان میں ہے، لیکن مالدار بیوی پر اس کے مفلس شوہر کا کفن لازم نہیں ہے۔ بالاجماع۔ المحیط۔ اگر اس طرح کفن نہ مل سکے تو تمام مسلمانوں پر لازم ہے، اور عاجز ہونے کی صورت مسلمانوں پر اس کے کفن کے لئے سوال کرنا لازم ہو جاتا ہے۔ الزاہدی۔ اگر چندہ کر کے کفن دیا اس کے بعد کچھ بچ جائے تو اگر کسی طرح اس کے خاص دینے والے کی تعین ہو سکے تو اسی کو واپس کر دینا چاہئے ورنہ کسی دوسرے محتاج کے کفن میں لگا دے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو صدقہ دیدے۔ قاضی خان۔ اور اگر کسی طرح بھی کفن میسر نہ ہو سکے تو غسل دے کر اس کے اوپر سے اذخر یا کوئی گھاس (پتہ) رکھ کر دفن کر کے قبر پر نماز پڑھی جائے۔ العتابیہ۔ زندگی میں جس کپڑے کا پہننا حلال تھا مرنے کے بعد اس کا کفن دینا بھی جائز ہے، ورنہ نہیں۔ شرح الطحاوی۔ اس بناء پر عورتوں کے کفن میں ریشم، رنگین کسم اور زعفران سے رنگے ہوا کفن بھی جائز ہوگا، البتہ سپید کفن محبوب ہے۔ النہایہ۔ نیا پرانا سب برابر ہے۔ الجوہرہ۔ مرد اور عورت کے کفن میں فرق ہے، دونوں کی تین قسمیں ہیں (۱) کفن سنت (۲) کفن کفایت (۳) کفن ضرورت۔ ک۔ م۔

السنة ان یکفن الرجل فی ثلاثة اثواب ازار و قمیص ولفافة......الخ

مرد کے لئے کفن سنت میں یہ تین کپڑے ہیں ازار، قمیض اور لفافہ، ان تین میں کفنایا جائے۔ ف۔ ازار یعنی تہہ بند لیکن اس سے مراد ہے کہ وہ سر سے پیر تک ہو، قمیض یعنی کرتہ جو گردن سے قدم تک آستین اور کلی کے بغیر ہو، اور لفافہ جو سر سے پیر تک اوپر سے لپیٹا جاتا ہے۔

لماروی انه ﷺ کفن فی ثلثة اثواب بیض سحولیة......الخ

اس حدیث کی بناء پر کہ رسول اللہ ﷺ کو سحولیہ کے تین سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا ہے۔ ف۔ صحاح ستہ نے حضرت عائشہؓ سے اس کی روایت کی ہے، اور سحولیہ ایک جگہ جہاں کے بنے ہوئے کپڑے مشہور تھے۔ مفع۔ اور سنت سے مراد یہ ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ کا کفن تھا۔ م۔ ولانه اکثر الخ اور اس وجہ سے کہ عادۃً اپنی زندگی میں اسی قسم کے کپڑے پہنا کرتا تھا، لہذا مرنے کے بعد بھی یہی اکثر لباس ہوا۔ ف۔ اس بناء پر اس کے وارثوں میں سے کچھ لوگوں نے تین کپڑے اور کچھ لوگوں نے دوسرے کپڑے دینے چاہے تو اگر مال میں گنجائش ہو تو تین کپڑے ہی دیئے جائیں کہ یہی سنت ہے۔ الجوہریرہ۔

فان اقتصروا علی ثوبین جاز والثوبان ازار ولفافة وهذا کفن الکفایة......الخ

پھر اگر لوگوں نے دو ہی کپڑے دیئے تو بھی جائز ہے، وہ دو کپڑے ازار اور لفافہ ہوں گے وهذا الخ اتنے ہی کفن کو کفن

کفایت بھی کہا جاتا ہے لقول ابی بکر الخ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے فرمانے کی بناء پر کہ میرے ان دو کپڑوں کو دھو کر ان ہی میں مجھے کفن دو۔ ف۔ کیونکہ زندہ انسانوں کو نئے کپڑوں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس کی روایت احمدؒ نے کتاب الزہد میں کی ہے، اور عبد الرزاقؒ نے حضرت عائشہؓ سے سند صحیح کے ساتھ اسی جیسی روایت کی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ مسنون کفن میں سے مجھے دو ہی کپڑے دینا اور وہ بھی ایسے کپڑے جن کو میں پہنے ہوئے ہوں، انہیں پہلے دھوڈالنا، کیونکہ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے مجھ سے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو کتنے کپڑوں میں کفن دیا گیا ہے تو میں نے یاد دلایا کہ تین سفید کپڑوں میں جن میں قمیض نہ تھی اور عمامہ بھی نہ تھا، انہوں نے پھر مجھے دریافت فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے کس دن انتقال فرمایا تھا، تو میں نے یاد دلایا کہ دوشنبہ کے دن، پھر فرمایا کہ آج کون سا دن ہے، میں نے کہا آج ہی دوشنبہ ہے، کہ اب سے رات تک مجھے امید ہے، اس کے بعد انہوں نے ایک کپڑے پر نگاہ کی جو ان پر پڑا ہوا تھا، اور اسی میں بیمار تھے اس میں زعفران کے داغ کی خوشبو باقی تھی پھر فرمایا کہ اسے دھوڈالنا اور اس پر اور دو کپڑے بڑھا کر اسی میں مجھے کفن دینا، میں نے کہا یہ تو پرانا ہے، فرمایا کہ نئے کپڑوں کے مردے سے زیادہ ضرورت مند اور مستحق زندہ ہیں۔ الخ۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ دو کپڑوں کے کافی ہونے کی دلیل میں حضرت ابن عباسؓ کی حدیث ہے اس شخص کے بارے میں جو احرام کی حالت میں اونٹنی پر سے گر کر مر گیا تھا، اس میں یہ بھی ہے کہ اس کے دو کپڑوں میں اسے کفن دو، صحاح ستہ والوں نے اس کی روایت کی ہے، لیکن اس میں اس بات کا احتمال رہ جاتا ہے کہ اس مرنے والے محرم کے پاس دو ہی کپڑے یعنی ازار اور چادر ہوں، اس لئے یہ روایت بھی ضرورت کی بناء پر ہوئی۔ مف۔

والازار من القرن الى القدم واللفافة كذلك والقميص من اصل العنق واذا ارادوا لف الكفن ابتدأوا بجانبه الايسر فلفوه عليه ثم بالايمن كما فى حال الحيوة وبسطه ان تبسط اللفافة اولا ثم يبسط عليها الازار ثم يقمص الميت ويوضع على الازار ثم يعطف الازار من قبل اليسار ثم من قبل اليمين ثم اللفافة كذلك وان خافوا ان ينتشر الكفن عنه عقدوه بخرقة صيانة عن الكشف وتكفن المرأة فى خمسة اثواب درع وازار و خمار ولفافة وخرقة تربط فوق ثديها لحديث ام عطيةؓ ان النبى ﷺ اعطى اللواتى غسلن ابنته خمس اثواب ولانها تخرج فيها حالة الحيوة فكذا بعد الممات ثم هذا بيان كفن السنة.

ترجمہ:۔ و توضیح:۔ کفن لپیٹنے کی کیفیت، کفن بچھانے کی کیفیت، میت کو خوشبو، کفن باندھنا کفن کی ضرورت، میت کے لئے عمامہ، قریب البلوغ لڑکے کا کفن، چھوٹے لڑکے اور لڑکی کا کفن

والازار من القرن الى القدم واللفافة كذلك والقميص من اصل العنق......الخ

ازار سر سے قدم تک ہوگی۔ ف۔ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ مشہور ازار کمر سے قدم تک ہوتی ہے اس کے باوجود اس کے خلاف یہ ازار سر سے قدم کیوں ہوگئی مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی، حالانکہ جس محرم کا تذکرہ ہوا اس کی ازار بھی اتنی ہی یعنی کمر سے تھی، اسی طرح حضرت ام عطیہؓ کی حدیث میں بھی اتنی ہی ازار تھی جس کی اس میں تصریح موجود ہے۔ مف۔ واللفافة الخ اور لفافہ یعنی اوپر کی چادر بھی اس طرح کی یعنی سر سے قدم تک ہوگی۔ ف۔ مگر اس میں جیب و آستین اور کلیاں نہ ہوں گی۔ الکافی۔

واذا ارادوا لف الكفن ابتدأوا بجانبه الايسر فلفوه عليه ثم بالايمن كما فى حال الحيوة......الخ

اور جب یہ لوگ مردہ کو کفن میں لپیٹنا چاہیں۔ ف۔ خوشبو دینے کے بعد تو پہلے لفافہ بچھائیں اس کے اوپر ازار اور مردہ کو اس پر لٹا دیں پھر اسے قمیض پہنا دیں، اس وقت اسے خوشبو اور کافور لگا دیں پھر کفن سے ازار کو اس طرح لپیٹیں۔ ابتدؤا الخ بائیں

طرف سے شروع کریں اور بائیں حصہ کو مردہ پر لپیٹ دیں ثم بالایمن الخ پھر دائیں حصہ کو لپیٹیں۔ف۔ تاکہ لپیٹ جانے کے بعد دایاں حصہ اوپر رہے، جیسا کہ زندگی کی حالت میں کیا جاتا ہے، وبسلطه الخ اور کفن اس طرح بچھایا جائے کہ پہلے لفافہ بچھایا جائے، پھر اس پر ازار بچھائی جائے۔ف۔ اور مردہ کو خوشبو اور کافور لگادیں۔المبسوط۔

ثم يقمص الميت ويوضع على الازار ثم يعطف الازار من قبل اليسار......الخ

پھر مردہ کو قمیض پہنا کر ازار پر رکھا جائے، پھر بائیں طرف سے اس پر ازار کو تہ کریں پھر دائیں طرف سے لپیٹ دیں، اسی طرح اس پر سے لفافہ لپیٹ دیں۔ف۔ کہ دایاں حصہ اوپر رہے۔

وان خافوا ان ينتشر الكفن عنه عقدوه بخرقة صيانة عن الكشف......الخ

اور لوگوں کو اس بات کا خوف ہو کہ یہ کفن اس طرح از خود لپیٹا ہوا نہیں رہے گا بلکہ کھل جائے گا، تو اسے کپڑے کے ایک ٹکڑے سے باندھ دیں، تاکہ وہ کفن اوپر سے کھلنے سے محفوظ ہو جائے۔ف۔ بالخصوص عورت کے بارے میں۔ع۔ اور کفن ضرورت وہ ہے کہ جو کچھ میسر ہو جائے، جیسا کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کی شہادت اور کفن ضرورت کا ذکر آتا ہے۔م۔ عبدالرزاقؒ اور بخاریؒ کی وہ حدیث جو حضرت عائشہؓ سے بیان کی گئی اس میں بتایا گیا ہے کہ کفن سنت میں عمامہ نہ تھا، اور فتاویٰ میں ہے کہ متاخرین فقہاء نے عالم کے لئے عمامہ کو اچھا سمجھا ہے، اور عمامہ کے شملہ (لٹکے ہوئے حصہ) کو اس کے چہرہ کی طرف رکھا جائے، جو زندگی میں پشت پر رہتا ہے۔الجوہرہ۔ جو لڑکا قریب البلوغ ہو اس کا کفن بالغوں کے کفن جیسا ہوگا، چھوٹے بچہ کا کفن کم سے کم ایک کپڑا اور چھوٹی لڑکی کا کفن کم از کم دو کپڑے ہوتے ہیں۔التبیین۔

وتكفن المرأة فى خمسة اثواب درع وازار و خمار ولفافة وخرقة تربط فوق ثديها......الخ

اور عورت کو پانچ کپڑوں میں کفن دیا جائے، درع (کرتی) ازار، خمار (اوڑھنی)۔ف۔ جو سر و گردن اور سینہ کو ڈھانکتی ہے، لفافہ اور خرقہ یعنی ایسی پٹی جو اس کی چھاتیوں پر باندھ دی جائے۔

لحديث ام عطية ان النبى ﷺ اعطى اللواتى غسلن ابنته خمس اثواب......الخ

حضرت ام عطیہؓ کی حدیث کی بناء پر کہ جن عورتوں نے رسول اللہ ﷺ کی لڑکی کو نہلایا تھا ان کو آپ نے کفن کے لئے پانچ کپڑے دئے۔ف۔ چنانچہ کہا کہ ہمیں پائجامہ دیا پھر درع پھر خمار پھر چادر اور بعد میں ایک دوسرے کپڑے میں لپیٹ دی گئیں، یہ حدیث ابوداؤد نے لیلیٰ بنت قانف ثقفیہ سے روایت کی ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ام عطیہؓ کی بجائے یہی صحیح ہے، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے اگرچہ ابن القطان نے بعض راویوں کو مجہول کہا ہے، میں کہتا ہوں کہ ابن الاثیرؒ نے کتاب الصحابہ میں ذکر کیا ہے کہ ام کلثومؓ نے سنہ ۹ھ میں حضرت زینبؓ کے ایک سال کے بعد انتقال کیا اور ام کلثوم کو ام عطیہؓ نے غسل دیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ام عطیہؓ نے حضرت زینب اور کلثوم دونوں کو غسل دیا ہے، اور ابن ماجہ نے بھی ام عطیہ سے ام کلثوم کو غسل دینا روایت کیا ہے، اور آخر میں ہے کہ جب ہم سب عورتیں غسل سے فارغ ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی پس آپ نے ہماری طرف اپنا پائجامہ پھینک کر دیا کہ یہ اسے پہنادو، اس روایت کی اسناد صحیح ہے، اور ایسا ہی حضرت زینبؓ کے غسل میں مروی ہے پس ام عطیہؓ کا دونوں صاحبزادیوں کے غسل میں شریک ہونا ثابت ہوا۔مف۔

ولانها تخرج فيها حالة الحيوة فكذا بعد الممات ثم هذا بيان كفن السنة.

اور اس دلیل سے بھی کہ عورت اپنی زندگی میں ان ہی پانچ کپڑوں میں نکلتی ہے، لہٰذا اسی طرح مرنے کے بعد بھی۔ف۔ یہی پانچ کپڑے دئے جائیں جن کو پہن کر وہ اپنے والدین وغیرہ کی ملاقات کو نکلتی تھی، ثم هذا الخ پھر اب کفن سنت کا بیان ہے۔

وان اقتصروا على ثلثة اثواب جاز وهى ثوبان وخمار وهو كفن الكفاية ويكره اقل من ذلك وفى الرجل

یکرہ الاقتصار علی ثوب واحد الا فی حالۃ الضرورۃ لان معصبؓ بن عمیر حین استشهد کفن فی ثوب واحد وهذا کفن الضرورۃ وتلبس المراۃ الدرع اولا ثم یجعل شعرها ضفیرتین علی صدرها فوق الدرع ثم الخمار فوق ذلک، ثم الازار تحت اللفافۃ قال وتجمر الاکفان قبل ان یدرج فیها المیت وترا لانه ﷺ امر باجمار اکفان ابنته وترا والاجمار هو التطییب فاذا فرغوا منه صلوا علیه لانها فریضۃ۔

ترجمہ:-اور اگر لوگوں نے بجائے پانچ کے صرف ان تین کپڑوں پر اکتفاء کیا جو دو کپڑے ازار اور لفافہ کے علاوہ اوڑھنی ہیں تو بھی جائز ہوگا، یہی کفن کفایت ہے، اس سے بھی کم کرنا مکروہ ہے، اور مردوں کے بارے میں صرف ایک کپڑے پر کفایت کرنا مکروہ ہے البتہ مجبوری کی دوسری بات ہے، کیونکہ حضرت مصعب بن عمیرؓ شہید کئے جانے کے بعد وہ صرف ایک ہی کپڑے میں کفنائے گئے، ایسے کفن کا نام کفن ضرورت ہے، عورت کو سب سے پہلے درع پہنایا جائے، پھر اس کے بال دو جوڑے کر کے دونوں اس کے سینے پر درع کے اوپر رکھدئے جائیں پھر اس کے اوپر اوڑھنی ڈالی جائے، پھر ازار پھر لفافہ پہنایا جائے، اور کہا ہے کہ مردوں کو ان کے کفنوں میں لپیٹنے سے پہلے طاق بار دھونی دی جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی صاجزادی کے کفنوں کو طاق مرتبہ اجمار کرنے کا حکم دیا ہے، اور اجمار کے معنی ہیں خوشبو لگانا، اور لوگ جب اس کام سے بھی فارغ ہو جائیں تب اس کی نماز پڑھ دیں کیونکہ یہ کام فرض ہے۔

توضیح:- عورت کا کفن سنت، حدیث سے دلیل، عورت کا کفن کفایت، کفن مکروہ، کفن ضرورت، ایک ہی کپڑے میں کفن، عورت کو کفن پہنانے کی کیفیت، عورت کے بال، کفن کو دھونی دینے کا وقت، کفن کو کتنی بار دھونی دی جائے، حدیث سے دلیل، چند ضروری مسائل، قرضخواہوں کا کفن سنت سے روکنا، ایک مردہ اور ایک زندہ اور ایک ہی کپڑا، ایک کفن میں چند مردے، مردے کے اس وصی نے جسے ترکہ کے بارے میں کہا گیا ہے بے جا تصرف کردیا

وان اقتصروا علی ثلثۃ اثواب جاز وهی ثوبان وخمار وهو کفن الکفایۃ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، وهو کفن الکفایۃ یہ کفن کفایت ہے۔ف۔ یعنی عورت کے بارے میں کفن کفایت اسی قدر ہے ویکرہ الخ اور اس سے کم کرنا مکروہ ہے۔ف۔ مگر جبکہ ضرورت ہو، جیسا کہ آئندہ آتا ہے، مثلاً جہاد وغیرہ میں ایک یا دو کپڑوں کے سوا میسر نہ ہو تو ضرورت کی بناء پر یہی کپڑے دئے جائیں گے۔

وفی الرجل یکرہ الاقتصار علی ثوب واحد الافی حالۃ الضرورۃ......الخ

مرد کے بارے میں ایک ہی کپڑے پر کفایت کرنا مکروہ ہے سوائے ضرورت اور مجبوری کی حالت کے۔ف۔ کہ اس صورت میں جو بھی میسر ہو جائے وہی جائز ہے، اور وہی کفن ضرورت ہے لان مصعبؓ الخ اس لئے معصب بن عمرؓ۔ف۔ جو شرفائے بنی عبد الدار میں سے بہت مالدار یہانتک کہ وہ روزانہ کپڑے کا جوڑا بدلا کرتے تھے، اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لئے مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ کے پاس اس حالت میں تشریف لائے تھے کہ ان کے بدن پر ایک کملی تھی اور جنگ احد کے روز مومنوں کا جھنڈا ان ہی کے ہاتھ میں تھا، یوں تو صحابہ کرامؓ میں سے ایک جماعت نے بھاگنا شروع کردیا تھا مگر اس وقت یہ نہیں بھاگے اور برابر یہ آیت پاک ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ الایۃ پڑھتے رہے، یہانتک کہ شہید ہوگئے، اس وقت صرف ایک دھاری دار کملی چھوڑی لہذا رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق ان کے کفن میں یہی کمبل دی گئی، خباب بن الارتؓ نے کہا کہ جب ہم اس کملی سے ان کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے اور جب پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا، اس

لئے رسول اللہ نے حکم دیا کہ سر ڈھانپ دیا جائے اور پیروں پر اذخر گھاس ڈال دی جائے، صحیحین، اذخر ایک خوشبودار گھاس ہوتی تھی، اسی بناء پر مصنفؒ نے فرمایا۔

وهذا كفن الضرورة ......الخ

اور یہ کفن ضرورت ہے۔ ف۔ اور سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلبؓ کو بھی ایک ہی کپڑے میں کفن دیا گیا تھا۔ ع۔ اسی حدیث سے اس بات کی دلیل ملتی ہے کہ سر کو ڈھانکنا پیروں کے ڈھانکنے سے مقدم ہے، اور یہ کہ گھاس بھی ضرورت کے وقت کفن ہے، واضح ہو کہ حاجی کو حالت احرام میں سر اور چہرہ ڈھانکنا ممنوع ہے لیکن اگر اس حالت میں مر جائے خواہ وہ مرد ہو یا عورت تو اس کو بھی خوشبو لگائی جائے گی، اور اس کا سر اور چہرہ ڈھانکا جائے گا، اگرچہ وہ غلام یا لونڈی ہو، جیسا کہ محیط میں ہے۔ ھ۔

وتلبس المراة الدرع اولاثم يجعل شعرها ضفير تين على صدرها فوق الدرع......الخ

عورت کو کفن پہنانے کا طریقہ یہ ہے کہ **تلبس المرأة الخ** عورت کو پہلے درع پہنائی جائے **ثم يجعل الخ** پھر اس کے بال دو چوٹی کر کے درع سے اوپر کر کے سینہ پر رکھ دی جائیں۔ ف۔ امام شافعیؒ کے نزدیک کنگھی کر کے بالوں کی تین چوٹیاں کی جائیں اور پیٹھ پر چھوڑ دی جائیں، کیونکہ جن عورتوں نے رسول اللہ ﷺ کی صاجزادی کو غسل دیا تھا اسی طرح کیا تھا اس معاملہ میں ظاہر یہ ہے کہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق کیا گیا ہوگا، جواب یعنی کہ اس سلسلہ میں آپ کا ارشاد معلوم نہیں ہو سکا لیکن حضرت عائشہؓ قول موجود ہے جو اوپر گذر گیا ہے، اور مردہ زینت سے بے نیاز ہوتا ہے۔ مع۔ خلاصہ یہ ہوا کہ آدھے آدھے بالوں کی دونوں چوٹیاں اس کے سینہ پر درع کے اوپر رکھ دی جائیں۔

ثم الخمار فوق ذلك ثم الازار تحت اللفافة......الخ

اس کے اوپر اوڑھنی ڈال دی جائے **ثم الازار الخ** پھر لفافہ کے نیچے ازار پہنائی جائے۔ ف۔ یعنی پہلے ازار پہنا کر اس کے اوپر سے لفافہ پہنایا جائے، اور وہ خرقہ یعنی سینہ بند سے ناف تک۔ التبیین۔ بلکہ گھٹنے تک۔ المنافع۔ بلکہ قدموں تک۔ المبسوط والمجتبی۔ اور چھاتیوں پر بندھا ہوا۔ التحفہ۔ مفع۔

قال وتجمر الاكفان قبل ان يدرج فيها الميت وترا لانه ﷺ امر باجمار اكفان ابنته......الخ

اور کہا ہے کہ مردہ کو کفنوں میں لپیٹنے سے پہلے ان کفنوں کو طاق بار اجمار کرلے۔ ف۔ یعنی خوشبودار کرے جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے، **والاجمار الخ** اجمار کے معنی خوشبودار کرنا۔ ف۔ یعنی عود و لوبان کی مانند خوشبو جلا کر اس کے دھوئیں سے کفن کو خوشبودار کرنا **لانه صلى الخ** کیونکہ رسول اللہ نے اپنی صاجزادی کے کفنوں کو طاق مرتبہ اجمار کرنے (خوشبودار کرنے) کا حکم دیا تھا۔ ف۔ علماء مجتہدین میں اس اجمار کرنے کے مستحب ہونے پر اتفاق ہے، جیسا کہ جنازہ کے پیچھے دھوئی دانی کو جلا کر لئے پھرنا بالاتفاق مکروہ ہے، اور مبسوط میں ہے کہ قبر میں دھونی دینا مکروہ ہے، لیکن مصنفؒ نے جو دلیل دی ہے وہ غریب ہے، البتہ بیہقیؒ نے حضرت جابرؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے مردہ کے کفن کو تین بار خوشبو سے بساؤ (اجمار کرو) نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد صحیح ہے، اور ابو یعلی اور ابن حبان نے اس کی روایت کی ہے **فاذا الخ** اب جبکہ لوگ میت کو غسل دے کر فارغ ہو جائیں تو جنازہ کی نماز پڑھ لیں **لانها فريضة الخ** کیونکہ جنازہ کی نماز فرض ہے۔ ف۔ بالاجماع فرض کفایہ ہے۔ ع۔ یعنی اگر کچھ لوگ پڑھ لیں تو سب کی طرف سے کافی ہو جائے گی، اور اگر کسی نے نہ پڑھی تو سب گنہگار ہوں گے۔ م۔

چند ضروری مسائل

میت کے قرض خواہوں کے لئے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اپنے قرض کے مطالبہ کی بناء پر میت کو کفن سنت دینے سے روکے۔ بلکہ ان پر واجب ہے کہ وہ ایسے کپڑے سے جن کو پہن کر وہ عید یا جمعہ کی نماز میں جاتا ہو کفن سنت دینے سے اس کے لئے

رکاوٹ نہ بنیں۔ جوامع الفقہ۔ اور مرغینانی میں ہے کہ اگر میت تھوڑے مال کا مالک ہو اور اس کے ورثہ زائد ہوں تو اس کے لئے کفن کفایہ ہی اولی ہے، اور شافعیہ کے نزدیک اگر ترکہ پر قرضہ غالب ہو، تو قول اصح یہ ہے کہ ایک ہی کپڑے کا کفن دیا جائے، اور ذخیرہ مالکیہ میں جوامع الفقہ کی طرح ذکر کیا گیا ہے، اگرچہ قرضہ غالب ہو، کسی جگہ ایک شخص زندہ اور دوسرا مردہ ہے اور ان کے درمیان کپڑا صرف اتنا سا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی ضرورت پوری ہو سکتی ہو تو زندہ کی ستر پوشی زیادہ ضروری ہوگی اور کپڑا اسی کو لازماً دیا جائے گا، اسی طرح اگر کسی مردہ کو کفن دیا گیا اور وہاں کوئی شخص سردی کی وجہ سے مر رہا ہو تو کپڑا کفن میں نہ دے کر زندہ کی جان بچائی جائے گی، بشرطیکہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت نہ ہو، جیسا کہ اگر کوئی شخص پیاس سے نڈھال ہو، اور دوسری طرف مردہ کو نہلانا ضروری ہو تو پیاسے کو پانی کے استعمال میں ترجیح دی جائے گی، اس کے برخلاف اگر زندہ کو نماز کے لئے وضوء کرنے یا ستر ڈھانپنے کی ضرورت ہو مردہ کا کفن لے کر زندہ کو نہیں دیا جائے گا، کیونکہ وہ ننگے ہو کر اور تیمم کر کے بھی نماز پڑھ سکتا ہے، بوقت ضرورت مثلاً جہاد کے مقتولوں کو دو تین کو ایک کفن میں جمع کرنا شافعیہ کے نزدیک مطلقاً جائز ہے، لیکن ہمارے نزدیک ہر ایک کی شرمگاہ کو فرداً فرداً چھپا کر ایک کفن میں لپیٹا جا سکتا ہے اس کے بغیر نہیں۔ مع۔

میت نے جس شخص کو اپنے ترکہ کا وصی بنایا (منتظم بنایا) اس بناء پر اس نے ترکہ میں سے تابوت اور اس کا غلاف خریدا اور اسے قاریوں اور حافظوں اور مرثیہ کہنے والے شاعروں کے درمیان تقسیم کر دیا، اور جو عورتیں اور مرد رونے کیلئے آتے ہیں ان میں خرچ کیا، اور قبر کو شاندار یادگار بنا دیا اور کوئی دوسری حفاظت عمارت کھڑی کر دی یا اس پر دوسری قبر بنا دی تو ان میں سے کچھ بھی بنانا صحیح نہ ہوگا۔ اور ان سارے اخراجات کا وہ ضامن ہوگا البتہ تابوت کا ضامن نہ ہوگا۔ قاضی خان۔ ع۔ میں کہتا ہوں کہ جس علاقہ میں زمین میں بغیر تابوت کے قبر بنائی جاتی ہو تو قاعدہ کے اعتبار سے وہاں تابوت کا بھی ضامن ہونا چاہئے، جیسا کہ وارثوں کے مسئلہ میں لکھا گیا ہے کہ کسی نے ایسی صورت میں وارثوں کی اجازت کے بغیر خریدا ہو، اصل بات یہ ہے جسے وصی بنایا جاتا ہے اسے تصرف کی اجازت تو ہوتی ہے مگر امانت داری کے ساتھ۔ اچھی طرح سمجھ لیں۔ م۔

فصل فی الصلوۃ علی المیت

واولی الناس بالصلوۃ علی المیت السلطان ان حضر لان فی التقدیم علیہ ازدراء بہ فان لم یحضر فالقاضی لانہ صاحب ولایۃ فان لم یحضر فیستحب تقدیم امام الحی لانہ رضیہ فی حال حیاتہ.

ترجمہ:- فصل، جنازے کی نماز کے بیان میں، جنازے کی نماز پڑھانے کے لئے سب سے زیادہ مستحق بادشاہ ہے بشرطیکہ وہ حاضر ہو کیونکہ اس کی موجودگی میں کسی دوسرے کے پڑھنے سے ان کی توہین اور بے عزتی ہے، اب جبکہ وہ موجود نہ ہو تو قاضی شہر زیادہ مستحق ہوگا، کیونکہ فی الحال وہ صاحب حکومت ہے، اب اگر وہ بھی موجود نہ ہو تو محلہ کے امام کو پڑھانا مستحب ہوگا، کیونکہ وہ مردہ اپنی زندگی میں اس کی امامت پر راضی ہو چکا ہے۔

توضیح:- فصل، جنازے کی نماز کے بیان میں، نماز کی فرضیت امامت کے لئے سب سے زیادہ مستحق شخص

فصل فی الصلاۃ علی المیت......الخ

مردہ پر نماز پڑھنے کے بیان میں، نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، اسی بناء پر کچھ لوگوں نے بھی نماز پڑھ لی خواہ وہ ایک ہو یا جماعت ہو، اور خواہ مرد نے پڑھی ہو یا صرف عورت نے پڑھی ہو تو اس نماز کا فرض ادا ہو گیا اور سب کے ذمہ سے اتر گیا، ورنہ سب گنہگار ہوں گے۔ التاتارخانیہ۔ اس نماز کے لئے جماعت شرط نہیں۔ النہایہ۔ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک قرض دار کے جنازہ پر نماز نہیں پڑھی اور فرمایا صلوا علی صاحبکم یعنی تم ہی لوگ اپنے اس آدمی پر نماز پڑھ لو، اس سے معلوم

ہوا کہ ہر شخص پر نماز فرض نہیں ہے۔ الفتح۔ نماز جنازہ ہر ایسے شخص کی پڑھی جائے گی جو مسلمان ہو، پیدا ہونے کے بعد مرا ہو، خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو خواہ وہ مرد ہو یا عورت، خواہ آزاد ہو یا غلام، اگر چہ اس نے خود قتل کیا ہو، طرفینؒ کے قول کے مطابق، یا وہ سنگسار کیا گیا ہو، یا قصاص میں قتل کیا ہو، اور جن لوگوں کو امام المسلمین سولی دی ہو، یہ قول ابو سلیمانؒ کی روایت کے مطابق ہے، اور جو کسی مال لینے میں قتل کیا گیا ہو۔ الایضاح وغیرہ۔

اگر ولادت کے وقت مر گیا ہو ایسی حالت میں اس کے بدن کا اکثر حصہ پیٹ سے نکل آیا ہو تو اس کی نماز پڑھی جائے گی، اور اگر تھوڑا حصہ نکلا ہو تو اس کی نماز نہیں پڑھی جائے گی۔ البدائع۔ اس نماز کی شرطیں یہ ہیں، میت کی حالت طہارت کی ہو جہانتک ممکن ہو، اور اگر ممکن نہ ہو مثلاً غسل سے پہلے وہ دفن کر دیا گیا ہو، تو اب اسے کھود کر نکالا نہ جائے، اب مجبوراً اس کی قبر پر ہی نماز پڑھ لی جائے۔ التبیین۔ اسی طرح کفن میسر نہ ہونے کی صورت میں اسی طرح بغیر کفن اور نماز کے دفن کرنے کے بعد قبر پر نماز پڑھی جائے، طہارت کے لئے اگر ممکن ہو تو غسل کرنا ہوگا ورنہ مجبوری کی حالت میں تیمم کرادیا جائے گا۔ م۔ اور اگر غسل بغیر صرف تیمم کر کے ہی نماز پڑھی گئی، اس کے بعد پانی مل گیا اور اب غسل بھی دیا گیا تو نماز بھی دوبارہ پڑھ لینی چاہئے۔ التبیین۔ اور ہر وہ چیز جو فرض نماز کے صحیح ہونے کے لئے شرط ہے یعنی طہارت خواہ حقیقی ہو یا حکمی اور استقبال یعنی قبلہ رخ ہونا، اور ستر عورت ہونا اور نیت ہونا، نماز جنازہ کے لئے بھی شرط ہے۔ البدائع۔ پس امام اور مقتدی سب قبلہ رخ ہو کر اللہ تعالیٰ کے لئے اس عبادت کی ادا کرنے کی نیت کریں، اور مقتدی کے لئے صرف امام کی اقتداء کی نیت کرنی بھی کافی ہے۔ المضمرات۔

ان تمام شرطوں میں میت کا مسلمان ہونا پہلی شرط ہے، اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ جنازہ نمازی کے سامنے روبرو ہو، اسی لئے غائب جنازہ کی نماز جائز نہیں ہے، اور اگر سامنے بھی کسی جانور وغیرہ پر رکھا ہوا ہو یا مصلی کے پیچھے ہو تو بھی جائز نہیں ہے، ہاں اگر نماز کے بغیر دفن کیا گیا اس طرح سے کہ بغیر کھودے ہوئے نہیں نکل سکتا ہو تو اس صورت میں یہ شرط ساقط ہو جائے گی۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے حبش کے بادشاہ نجاشی کی نماز مدینہ میں رہتے ہوئے ادا کی تھی، اس کی صورت یہ ہوئی تھی کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے اچانک صحابہ کرامؓ سے فرمایا کہ تمہارے بھائی نجاشی فوت ہو گئے اس لئے اٹھو ان کی نماز پڑھیں، چنانچہ آپ کھڑے ہوئے اور صحابہ کرامؓ بھی آپ کے پیچھے کھڑے ہو گئے، پس آپ نے جنازے کی نماز چار تکبیریں کہیں، اس وقت صحابہ کرامؓ یہ گمان کر رہے تھے کہ نجاشی بادشاہ کا جنازہ آپ کے روبرو رکھا گیا ہے، اس کی روایت ابن حبان نے اپنی صحیح میں حضرت عمران بن حصینؓ سے کی ہے، اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نجاشیؓ کا جنازہ آپ کے سامنے تھا، اگر چہ صحابہ کرامؓ کو نظر نہیں آرہا تھا، اور نجاشیؓ کے جنازے کی نماز کی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ صحاح ستہ میں موجود ہے، اور نسائی کی روایت میں ہے کہ جس دن نجاشیؓ کی وفات کی خبر آئی تو آپ ﷺ نے صرف یہ فرمایا کہ اپنے بھائی کے واسطے استغفار کرو۔ اس باب میں صحیحین میں حضرت جابرؓ سے بھی روایت مذکور ہے۔

اور جب رسول اللہ ﷺ غزوہ تبوک کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر خبر دی کہ مدینہ میں معاویہ بن معاویہ المزنیؓ نے انتقال کیا ہے، کیا آپ ان کی نماز جنازہ پڑھنی چاہتے ہیں تو آپ نے فرمایا کہ ہاں، اس کا پورا واقعہ صحیح بخاری میں مروی ہے، اور طبرانیؒ کی حدیث جو حضرت امامہؓ سے مروی ہے اس میں اس بات کی تصریح ہے کہ (حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ بھی سوال کیا کہ) کیا آپ یہ چاہتے کہ آپ کے واسطے زمین لپیٹ دی جائے، کہ آپ ان کے جنازہ کی نماز پڑھیں تو فرمایا کہ ہاں پس جبرئیل علیہ السلام نے اپنے بازو زمین پر مارے تو معاویہؓ کا جنازہ آپ کے واسطے بلند ہو گیا اور آپ نے نماز پڑھ لی، پھر بخاری میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب آپ نے سلام پھیرا تو دیکھا کہ آپ کے پیچھے فرشتوں کی دو صفیں ہیں اور ہر ایک صف میں ستر ہزار کی تعداد ہے، یہ دیکھ کر آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اس شخص نے یہ مرتبہ کہاں سے پایا، تو جبرئیل علیہ السلام نے کہا یہ شخص سورہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ بہت پسند کرتا تھا، اور اٹھتے بیٹھتے آتے جاتے اسے پڑھتا رہتا تھا، اسی کا یہ اثر

ہے۔
ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ یہ نمازیں اس خصوصیت کی وجہ سے تھیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کا جنازہ روبرو کر دیا گیا تھا، ورنہ بہت سے صحابہ کرامؓ نے آپ کے غائبانہ میں انتقال کیا تھا بالخصوص وہ حضرات جنہیں قراء کہا جاتا تھا، ان کو تو کافروں نے دھوکے سے لاکر قتل کر دیا تھا جس کی وجہ سے آپ بہت مغموم ہوئے تھے یہاںتک کہ ان کافروں پر لعنت بھی فرمائی تھی، اور فرض نمازوں میں قنوت بھی پڑھنے لگے یہاںتک کہ ایک وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو پڑھنے سے روک دئے گئے، اس اہمیت کے باوجود آپ سے ان کے جنازہ کی نماز منقول نہیں ہے، حالانکہ آپ ہر ایک صحابی کے جنازہ کی نماز انتہائی رحم وکرم کے ساتھ پڑھنی چاہتے تھے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ابوہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ایک حبشیہ عورت مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی، ایک مرتبہ آپ نے اسے نہیں پایا تو لوگوں سے دریافت کیا تب بتایا گیا کہ وہ تو مر گئی ہے تو فرمایا کہ بھلا تم نے مجھے خبر کیوں نہیں دی ہے، ابوہریرہؓ نے کہا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے گویا ان کے معاملہ کو حقیر جانا تھا اس لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں دی گئی اور آپ کو اس کی خبر نہیں دی گئی، مگر آپ نے فرمایا کہ میرے ساتھ چلو اور مجھے اس کی قبر بتاؤ، تو لوگوں نے جاکر بتلادی، اس کے بعد آپ نے قبر پر ہی نماز پڑھادی پھر فرمایا کہ یہ قبریں قبر والوں پر تاریکی سے بھری ہوئی ہیں، اور ان پر بھی میری نماز پڑھ دینے سے اللہ تعالیٰ ان کو اہل قبر پر منور کر دیتا ہے، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔

واولی الناس بالصلوۃ علی المیت السلطان ان حضر لان فی التقدیم علیه ازدراء به......الخ

جنازہ کی نماز پڑھانے کے واسطے سب سے زیادہ مستحق بادشاہ ہے اگر جنازہ پر حاضر ہو۔ف۔ایسی صورت میں اسے امام بنانا واجب ہے، کیونکہ اس کی موجودگی میں دوسرے کے امام بننے سے ان کے حق میں خفت اور سبکی ہے۔ف۔حالانکہ بادشاہ وقت اللہ کا سایہ ہے، جو اس کی تعظیم کرے گا اللہ اپنے عزت دے گا، اور جو اس کی اہانت کرے گا اللہ اسے بے عزت کرے گا، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

فان لم یحضر فالقاضی۔ لانه صاحب ولایة فان لم یحضر فیستحب تقدیم امام الحی......الخ

اگر بادشاہ خود نہ آئے تو اس کے بعد قاضی وقت زیادہ مستحق ہے کیونکہ یہ بھی صاحب حکومت ہے۔ف۔یعنی قاضی کو سب پر عام ولایت کا حق حاصل ہے اگرچہ بادشاہ کی طرف سے مقرر کرنے کے بعد ہو، الحاصل ان دونوں کا حق مقرر ہے لہٰذا ان کی تقدیم واجب ہو گئی، فان لم یحضر الخ اگر قاضی شہر بھی نہ آئے تو امام محلہ کو پڑھانا مستحب ہوگا۔ف۔الحی دراصل ایک کنبہ ہوتا ہے اس طرح سے کہ ایک دادا کی اولاد اور اس کی اولاد کی اولاد اور ان کی اولاد، پس کئی پشتیں اور اولاد کے مختلف بطون ہو گئے تو یہ سب ایک قبیلہ ہے جیسے قریش کہ ان میں حی اور بطون وغیرہ سب داخل ہیں، اس جگہ یہ مراد ہے کہ جس کنبہ میں سے یہ شخص تھا ان کی مسجد کا امام اس قوم کی رضامندی سے نماز پڑھاتا تھا اور یہ مردہ بھی اس کے پیچھے پڑھتا تھا، پس مستحب یہ ہے کہ یہی امام اس کی نماز جنازہ بھی پڑھادے، لانه رضیه الخ کیونکہ یہ مردہ جب اپنی زندگی میں اس کے پیچھے نماز پڑھنے اور اس کے امام ہونے پر راضی تھا۔ف۔تو اب مرنے کے بعد بھی اس کی پسند کا امام بہتر ہے، جیسا کہ شریعت سے اس کی مخالفت نہیں کی جارہی ہے۔

قال ثم الولی والاولیاء علی الترتیب المذکور فی النکاح فان صلی غیر الولی او السطان اعاد الولی یعنی ان شاء لما ذکرنا ان الحق للاولیاء.

ترجمہ:- کہا، پھر ولی ہے اور اولیاء کے درمیان زیادہ مستحق ہونے کی وہی ترتیب رکھی جائے گی جو کتاب النکاح میں بیان کی گئی ہے، اس بناء پر اگر ولی یا سلطان کے علاوہ کسی دوسرے نے نماز پڑھادی تو ولی دوبارہ نماز پڑھا سکتا ہے، یعنی وہ اگر چاہے اس بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے کہ اس میں اصل حق اولیاء ہی کا ہے۔

توضیح:-اگر ولی یا بادشاہ وقت کے علاوہ کسی دوسرے نے نماز پڑھادی ہو

قال ثم الولی والاولیاء علی الترتیب المذکور فی النکاح......الخ

پھر میت کا ولی زیادہ مستحق ہے۔ف۔ متن کی اکثر کتابوں میں اسی ترتیب کے ساتھ مسئلہ بیان کیا گیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ سب سے پہلے سلطان پھر قاضی کی ترتیب کو باقی رکھنا واجب ہے، اس کے بعد محلہ کا امام اور اس کو پڑھانا مستحب ہے، اس کے بعد ولی کا حق ہے، حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ سب سے پہلے خلیفہ وقت یعنی سلطان اعظم پھر جو اس شہر کا سلطان ہو پھر قاضی پھر صاحب الشرط یعنی محتسب حاکم پھر سلطان کا قائم مقام، پھر قاضی کا خلیفہ پھر محلہ کا امام پھر میت کا ولی، اسی روایت کو بہت سے مشائخ نے قبول کیا ہے۔النہایہ والدرایۃ۔اور یہی مذہب مختار ہے۔معف۔امام ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ ہر حال میں ولی اولی ہے، امام شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے، اور امام ابو حنیفہؒ کی بھی ایک روایت یہی ہے، کیونکہ نکاح کے مانند یہ حکم بھی ولی سے متعلق ہے، پہلے قول کی وجہ ظاہر الروایۃ کی یہ ہے کہ جب حضرت حسن بن علیؓ نے شہادت پائی تو حضرت حسینؓ نے حضرت سعید بن العاصؓ کو آگے بڑھایا جو کہ معاویہؓ کی طرف سے مدینہ پر حاکم تھے، لیکن انہوں نے ادباً امام بننے میں عذر پیش کیا تو حسینؓ نے فرمایا کہ یہی سنت ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو میں تم کو آگے نہ بڑھاتا، نوویؒ نے کہا ہے کہ امام مالکؒ واحمد واسحٰق کا یہی قول ہے، ان کے علاوہ اور بھی دوسرے صحابہؓ اور تابعینؒ کا قول یہی ہے، اور ان کے نام بھی نوویؒ نے لکھ دئے ہیں، ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ اکثر علماء سلف وخلف کا بھی یہی قول ہے۔معف۔

والاولیاء علی الترتیب المذکور فی النکاح......الخ

میت کے اولیاء اسی ترتیب پر ہوں گے جو نکاح کے بیان میں ذکر کئے گئے ہیں۔ف۔ لیکن نکاح میں عورت کا بیٹا ہی ولی اقرب ہوتا ہے، جب کہ اس جگہ باپ ولی اقرب ہوتا ہے، صحیح روایت کا بھی یہی قول ہے۔ع۔اگر برابر کے دو ولی ہوں جیسے اس کے دونوں سگے یا سوتیلے بھائی ہوں تو ان میں جس کی عمر زیادہ ہوگی وہ مقدم ہوگا، لیکن اسے یہ اختیار نہیں ہے کہ اپنی جگہ کسی اجنبی کو مقرر کردے ہاں اس صورت میں مقرر کر سکتا ہے جبکہ دوسرا بھی اس پر راضی ہو، جیسا کہ اس مسئلہ کو کتاب الصلوۃ میں ذکر کر دیا ہے، اگر شوہر سے بیٹا موجود ہو تو وہ تمام رشتہ داروں کے بعد شوہر کی ولایت ختم ہو جاتی ہے۔الجامع الصغیر۔القاضی خان۔اسی لئے کہا گیا ہے کہ اصل میں رشتہ داری کی بناء پر بیٹا اپنی ماں کا ولی ہے، شوہر نہیں ہے، لیکن جب شوہر اس بیٹے کا باپ ہو تو بیٹے کو مقدم ہونا مکروہ ہے۔البدائع۔ف۔ اگر میت کا ولی نہ ہو تو شوہر اولی ہے اس کے بعد پڑوسی دوسرے اجنبیوں کے مقابلہ میں اولی ہے۔التبیین۔میت کی نماز جنازہ کے بارے میں عورتوں اور چھوٹے بچوں کو کچھ بھی ولایت نہیں ہے۔الجوہرہ۔لیکن میت پر عورت کی نماز جائز ہے۔م۔میت کی نماز صرف ایک بار پڑھی جائے گی، اور دوبارہ اس پر نفل کے طور پر مشروع نہیں ہے۔الایضاع۔اسی بناء پر اگر تمام لوگوں میں وہ قریب ترین ہو تو اس نے نماز پڑھانی شروع کر دی ہو تو کہا گیا ہے کہ مرد اس کی اقتداء کرلیں، لیکن اس میں بندہ مترجم کو تامل ہے، واللہ تعالی اعلم۔م۔

فتاوی کبری میں ہے کہ اگر کسی نے وصیت کی ہو کہ فلاں شخص میری نماز جنازہ پڑھائے تو وصیت باطل ہوگی، اور اسی پر فتوی ہے۔المضمرات۔ھ۔ والعیون وواقعات الصدر الشہید، اور نوادر میں ہے کہ وصیت جائز ہے۔ف۔یہ اس صورت میں ہے کہ سلطان وغیرہ ایسے لوگ موجود ہوں جو امامت کے حق دار ہوتے ہیں، اور ولی ہو، ورنہ وہ وصیت صحیح ہوئی، اور اگر ولی نے اجازت دے دی ہو تو بھی جائز ہونا چاہئے، کیونکہ صالحین کی دعاء قبولیت کے زیادہ قریب ہوتی ہے، اور نوادر کی روایت اسی پر محمول ہے۔م۔اور چونکہ سلطان اعظم یا سلطان یا شہر کے والی یا قاضی میت کے ولی کے مقابلہ میں زیادہ حق دار ہوتے ہیں اس لئے اگر ایسے سلطان وغیرہ نے نماز پڑھ دی تو ولی اب دوبارہ نماز نہیں پڑھ سکتا ہے۔الخلاصہ۔

فان صلی...... الخ پھر اگر ولی یا سلطان یا اس کے مانند کسی نے نماز پڑھ دی۔ف۔ ولی کی اجازت کے بغیر اعاد الولی الخ تو ولی اگر چاہے دوبارہ نماز پڑھ سکتا ہے لما ذکرنا الخ اس بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے کہ حقدار تو میت کا ولی ہوتا ہے ۔ف۔ اور سلطان ووالی وقاضی اوران کے خلفاء کا حق تو ولی سے بھی زیادہ اور مقدم ہوتا ہے، اور خلاصہ میں محلہ کے امام کو بھی حکم میں سلطان کے برابر سمجھا گیا ہے، لیکن اس میں تامل ہے، کیونکہ محلہ کے امام کو آگے بڑھانا واجب نہیں ہے۔م۔

وان صلی الولی لم یجز لاحد ان یصلی بعده لان الفرض یتأدی بالاول والنفل بها غیر مشروع ولهذا رأینا الناس ترکوا عن اخرهم الصلوۃ علی قبر النبی ﷺ وهو الیوم کما وضع.

ترجمہ:- اور اگر ولی نے نماز پڑھ لی تو اب کسی کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ اس کے بعد پھر نماز پڑھے کیونکہ پہلی مرتبہ میں یہی فرض ادا ہو چکا ہے، اور اس نماز میں نفلاً پڑھنا ثابت نہیں ہے، اسی لئے ہم نے ادنی سے اعلی تک تمام لوگوں کو دیکھا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر پر نماز پڑھنا ترک کر دیا ہے، اور آپ تو اپنی قبر میں آج تک ویسے ہی ہیں جیسے کہ اس میں رکھے گئے تھے۔

توضیح:- اگر سلطان یا ولی نے نماز پڑھ لی ہو تو غیر کے لئے نماز کا حکم

وان صلی الولی لم یجز لاحد ان یصلی بعده لان الفرض یتأدی بالاول والنفل بها غیر......الخ

اگر ولی نے نماز جنازہ پڑھ لی تو۔ف۔ اگرچہ تنہا پڑھی ہو لم یجز الخ تو اس کے بعد کسی کے لئے اس جنازہ کی نماز پڑھنی جائز نہیں ہے۔ف۔ اگرچہ اس ولی کے برابر کے دوسرے اولیاء پڑھنا چاہتے ہوں۔ الجوہرہ۔ اس لئے اگر ولی سے اوپر کے مثلاً سلطان وغیرہ نے نماز پڑھ لی ہو جب تو بدرجہ اولی کوئی دوسرا نہیں پڑھ سکتا ہے۔ف۔ لان الفرض الخ کیونکہ پہلی مرتبہ جو نماز پڑھی گئی اس سے فرض کی ادائیگی ہو چکی والنفل بها الخ اور اس نماز میں نفل پڑھنی ثابت نہیں ہے۔ف۔ یعنی جس کا حق مقدم نہ ہو اس کے لئے نفل کے طور پر نماز جنازہ پڑھنا شریعت سے ثابت نہیں ہے۔ ولہذا رأینا الخ اور اس بناء پر کہ یہ نماز نفل کے طور پر نہیں پڑھی جاتی ہے ہم نے تمام لوگوں کو ادنیٰ سے اعلی تک دیکھا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی قبر شریف پر نماز پڑھنی چھوڑ دی ہے۔ف۔ پس اگر نفل نماز جنازہ کی جائز ہوتی تو مزار مبارک پر پڑھنے سے بہتر کون سی عبادت ہو سکتی تھی۔

اگر کسی کو یہ اعتراض ہو کہ قبر پر اب بھی تین دن یا اس کے قریب نماز پڑھنی جائز ہے، جواب یہ ہے کہ اتنی مدت تو اس بناء پر ہے کہ اس تک عموماً جنازہ متغیر نہیں ہوتا ہے لیکن اس کے بعد متغیر ہو جاتا ہے جبکہ صریح نص اس بات پر موجود ہے کہ زمین کسی بھی پیغمبر کے جسم کو نہیں کھاتی ہے، چہ جائیکہ مسرور عالم افضل المرسلین ﷺ کا جسم مبارک۔

ولهذا رأینا الناس ترکوا عن اخرهم الصلوۃ علی قبر النبی ﷺ وهو الیوم کما وضع......الخ

آپ رسول اللہ ﷺ تو آج بھی مرقد اطہر میں ویسے ہی تشریف فرما ہیں جیسے کہ رکھے گئے تھے۔ف۔ پس اگر نماز جنازہ کو نفل کے طور پر پڑھنا جائز ہوتا تو اس پر پڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ اس حکم سے حق دار کو مستثنیٰ کرنا چاہئے کیونکہ جس شخص کا حق ہے اس کے حق میں نماز نفل کے طور پر مشروع رہے گی تاکہ وہ اپنا حق حاصل کر سکے۔ الفتح۔ اس بناء پر دوسرے اجنبیوں کی نفی ہوئی لیکن ولی کے برابر مرتبہ والوں کا حق شاید صرف ولی کے پڑھ دینے سے ساقط ہو گیا، مسئلہ کو سمجھ لیں۔م۔ اب اس سوال کا جواب کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز تو صحابہ کرام نے تنہا تنہا پڑھی تھی جیسا کہ صحیح قول میں ہے، تو یہ بات صرف رسول اللہ کی خصوصیات میں سے تھی، امام ابو بکر البزار اور امام طبرانیؒ نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تو صحابہ کرام کو یہی وصیت فرمائی تھی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اس بات کا بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ حق تعظیم کی وجہ سے صحابہ کرام کے ہر فرد پر یہ بات (بجائے فرض کفایہ ہونے کے) فرض عین ہو اس بناء پر ہر فرد نے اپنا فرض ادا کر دیا، بعض علماء نے کہا ہے کہ قبر پر نماز پڑھنی بھی رسول

اللہ علیہ السلام کی خصوصیات میں سے تھی کہ آپ کی نماز کی برکت سے قبر منور ہو جایا کرتی تھی، ابن حبانؒ نے کہا ہے کہ یہ بات بھی وہم کی پیداوار ہے کیونکہ آپ کی اقتداء میں صحابہ کرامؓ ہوا کرتے تھے۔ مع۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ولی کی نماز کے بعد سلطان کے حق میں تو تصریح موجود ہے، چنانچہ جوہرہ میں ہے کہ اگر میت پر ولی نے نماز پڑھ دی تو اس کے بعد دوسرا کوئی نہیں پڑھ سکتا ہے اور اگر سلطان چاہے کہ اس میت پر نماز پڑھ لے تو اس کو اختیار ہے، کیونکہ سلطان کا مرتبہ تو ولی کے مرتبہ سے بھی مقدم ہے، لیکن ولی کے درجہ کے دوسرے ولی نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ ھ۔ اس بات کی تصریح ہے کہ ولی کے بعد اس شخص کو دوبارہ پڑھنے کا اختیار باقی رہتا ہے جو اس سے حق میں مقدم ہو، مسئلہ کو یاد رکھ لیں۔ م۔

وان دفن المیت ولم یصل علیه صلی علی قبره لان النبی علیہ السلام صلی علی قبر امرأة من الانصار.

ترجمہ:۔ اگر کسی جنازے کو اس کے نماز پڑھے بغیر دفن کر دیا گیا ہو تو اس کی قبر پر نماز پڑھی جائے گی، کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام نے بھی ایک انصاریہ عورت کی قبر پر نماز پڑھائی ہے۔

توضیح:۔ اگر نماز جنازہ پڑھے بغیر مردہ کو قبر میں داخل کر دیا گیا ہو، حدیث سے دلیل

وان دفن المیت ولم یصل علیه صلی علی قبره لان النبی علیہ السلام صلی علی قبر......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے امرأة من الانصار انصاریہ عورت کی قبر پر پڑھی تھی۔ ف۔ ابن حبان نے حضرت یزید بن ثابتؓ کی حدیث سے یہ روایت کی ہے، اس حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی، صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہمیشہ کی شب بیدار اور ہمیشہ کی روزہ دار تھی، یعنی رات کو عبادت کرنے والی دن کو روزہ رکھنے والی تھی، فرمایا کہ ایسا نہ کیا کرو، جو تم میں سے کوئی مرے مجھے ضرور اس کی خبر دو جب تک کہ میں تم میں موجود ہوں، کیونکہ میری نماز اس پر رحمت ہے، اس کے بعد آپ اس عورت کی قبر پر تشریف لائے اور ہم آپ کے پیچھے صف باندھ کر کھڑے ہوگئے، آپ نے اس پر چار تکبیریں کہیں، حاکمؒ نے اس کی روایت کی ہے، امام مالکؒ نے موطا میں مسکینہ عورت کو رسول اللہ علیہ السلام کی اطلاع کے بغیر رات کے وقت دفن کئے جانے اور صبح کو آپ کی اس پر چار تکبیروں سے نماز پڑھنے کی روایت کی ہے۔

صحیحین میں ابوہریرہؓ سے حبشیہ عورت جو مسجد میں جھاڑو دیا کرتی تھی کا قصہ مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام ایک قبر منبوذ (پرانی) پر تشریف لائے اور پیچھے صحابہ کرامؓ نے صف باندھی اور چار تکبیروں کے ساتھ نماز پڑھی، شیخ ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ پھر اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ ولی کے علاوہ جس کسی نے بھی جنازہ کی نماز نہ پڑھی ہو وہ اس کی قبر پر نماز پڑھ سکتا ہے حالانکہ یہ بات مذہب کے خلاف ہے اور اس کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا ہے، سوائے یہ دعویٰ کرنے کے اس کی نماز بالکل نہیں پڑھی گئی تھی لیکن یہ بات عقل سے بہت بعید ہے کیونکہ صحابہ کرامؓ کے بارے میں کسی طرح اس کا گمان بھی نہیں ہو سکتا ہے کہ انہوں نے بغیر نماز پڑھے دفن کر دیا ہو۔ الفتح۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ جواب حق یہ ہے کہ ولی کی نماز کے بعد بھی سلطان کو یہ اختیار باقی رہتا ہے کہ وہ اس جنازہ کی دوبارہ نماز پڑھا دے جیسا کہ جوہرہ میں ہے۔ ھ۔ تو جب رسول اللہ علیہ السلام کے طفیل میں سلطان کو یہ حق حاصل ہوا تو خود آپ کو اختیار اصل حاصل تھا پس آپ کی نماز اصل ہونے کی بناء پر سب کی اقتداء صحیح ہوگئی بلکہ چونکہ لوگوں نے نماز کے لئے آپ سے پہلے اجازت نہیں لی تھی اس لئے وہ نماز ہی باطل ہوگئی، اس کے علاوہ مسکینہ اور حبشیہ کی روایتوں میں ہے کہ آپ نے اپنے صحابہؓ کو اپنے پیچھے صف بستہ کیا تو نماز پڑھنے کا حکم بھی آپ ہی کا تھا، پھر تحقیق یہ ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام کا جنازہ پر نماز پڑھنا ایک خاص خصوصیت رکھتا تھا چنانچہ اس بات کی تصریح ہے کہ آپ کی نماز سے قبریں منور ہو جاتی ہیں، اور آپ کی نماز ان کے لئے رحمت ہے، یہ خصوصیت کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہے، اسی لئے صحیح حدیث میں ثابت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام کسی مقروض کی نماز

جنازہ خود نہیں پڑھتے تھے بلکہ دوسروں کو ارشاد فرمادیتے کہ تم اس کی نماز پڑھ لو، اسی طرح حضرت ماعز بن مالکؓ جو رجم کے ذریعہ ہلاک کئے گئے ان کی نماز بھی آپ نے خود نہیں پڑھی اور لوگوں کو پڑھنے سے منع بھی نہیں کیا اسی طرح اس شخص کی نماز بھی آپ نے خود نہیں پڑھی تھی جس نے خودکشی کی تھی، یہ تمام روایتیں صحاح میں موجود ہیں۔

الحاصل کسی کی نماز جنازہ پڑھ دینا اس کی یقینی طور سے اس کے لئے جنت اور مغفرت کا سبب تھا، اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ عام مسلمانوں کی ایک جماعت کی نماز سے آپ نے اس کے لئے جنت واجب ہونا بیان فرمایا ہے تو آپ ﷺ کی نماز کے مقابلہ میں کون آسکتا ہے، کیونکہ سارے اگلے اور پچھلے کی مجموعی نماز اور دعاء بھی آپ کی نماز کے برابر نہیں ہو سکتی ہے، اور اس دعوی میں کچھ بھی شک نہیں ہے، لہٰذا اس جگہ جو اجتہادی حکم ہوگا وہ صرف آپ کے ماسوا دوسروں کے لئے ہوگا، کیونکہ دوسرے تمام اس خصوصیت کے حکم سے باہر ہیں۔

حاصل کلام یہ ہوا کہ رسول ﷺ کی نماز کے بغیر اگر کسی جنازہ کو دفن کر دیا گیا اور اس جنازہ کے حق میں بے انتہا رحمت الٰہی نازل ہوئی یعنی اللہ تعالی کی طرف سے اپنے حبیب سرور عالم ﷺ کو ارشاد ہوا کہ آپ اس کی نماز پڑھیں تو یہ بالکل درست ہے، اور یہی نماز اصل ہوگی اگرچہ کسی زمانہ وقت میں ہو (مقدم ہو یا موخر ہو) اور سلطان وقت کو آپ ہی کی سنت کے طفیل میں ولی سے بھی تقدم اور ولایت حاصل ہوئی اس طور پر کہ ولی کی نماز پڑھ لینے کے بعد اگر وہ چاہے تو وہ پڑھ سکتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جنازہ اس وقت تک قبر میں اسی طرح ڈھکا ہوا محفوظ ہو جیسا کہ اسے دفن کیا گیا تھا، مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور یاد رکھیں۔ م۔

فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ اگر لوگوں کو مردہ کے بارے میں یہ شک ہو گیا ہو کہ جس طرح اسے دفن کیا گیا تھا وہ اب بھی اسی طرح نہ ہوگا بلکہ وہ پھول اور پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہوگا تو اس کی نماز نہیں پڑھی چاہئے۔ المفید والمزید وجوامع الفقہ۔ اور دوسری تمام کتابیں، اب یہ ایک سوال ہوتا ہے کہ کیا قبر پر نماز پڑھنے کے بارے میں یہ ایک شرط ہے کہ اسے غسل دینے کے بعد دفن کیا گیا ہو، تو اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ ہاں شرط ہے۔ پھر اگر یہ سوال کیا جائے کہ نماز کی صحت کے لئے تو جنازے کا نظر کے سامنے ہونا شرط ہے جبکہ وہ جنازہ قبر میں نظروں سے اوجھل ہے اس کی نماز کس طرح صحیح ہوگی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا غائب ہونا اس نماز کے لئے مانع نہیں ہے کیا یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ دفن سے پہلے بھی تو کفن میں چھپا ہوا تھا۔

پھر یہ تفصیل اسی صورت میں ہوگی جبکہ جنازہ کو غسل کے بعد مگر نماز سے پہلے دفن کیا گیا ہو کیونکہ اگر غسل کے بغیر مگر نماز کے بعد کسی کو دفن کیا گیا ہو تو اگر اس پر اس وقت تک مٹی نہ ڈالی گئی ہو تو اسے نکال کر غسل دے کر دوبارہ نماز پڑھ لی جائے، اور اگر مٹی ڈال دی گئی ہو تو اب نہیں نکالا جائے گا بلکہ قبر پر ہی دوبارہ نماز پڑھ دی جائے، نوادر میں ہے کہ یہ حکم استحسان ہے، اور اگر اس وقت دفن بھی نہیں کیا گیا ہو تو قیاس اور استحسان دونوں کے مطابق غسل دے کر اس پر دوبارہ نماز پڑھی جائے، یہی حکم اس صورت میں بھی ہوگا جبکہ مردہ کو غسل دیتے وقت اس عضو یا پیٹھ وغیرہ پر پانی نہ پہونچا پھر بھی نماز پڑھ دی گئی اور بعد میں پانی میسر ہو گیا یا اس بات کا خیال آ گیا تو اتنے حصہ کو دھو کر غسل پورا کر کے اس پر دوبارہ نماز پڑھ دی جائے۔ المبسوط۔

اگر کسی ایسے شخص نے نماز جنازہ پڑھ دی جسے ولایت کا حق نہ تھا تو بعد میں جسے حق حاصل ہو اگر وہ چاہے تو اس کی قبر پر نماز پڑھ دے (بشرطیکہ وہ شخص پہلی جماعت میں شریک نہ ہوا ہو)۔ المحیط۔ مع۔ اگر جنازہ کا زیادہ حصہ بدن موجود ہو تو بھی اس کی نماز جائز ہے، اس کے بعد اگر دوبارہ باقی حصہ ملا تو نماز دوبارہ نہیں ہوگی۔ مف۔ ھ۔ خلاصہ کلام یہ ہوا کہ اس بات کا ثبوت مکمل ہو گیا کہ قبر پر بھی مردہ کی نماز جائز ہے، تو فرمایا اب اس سوال کا جواب چاہئے کہ وہ کب تک ہو سکتی ہے، محدود وقت میں یا کبھی بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

ویصلی علیه قبل ان یتفسخ والمعتبر فی معرفة ذلك اكبر الرأی هو الصحیح لاختلاف الحال والزمان

والمكان.

ترجمہ:- قبر پر جنازے کی نماز اس کے پھٹنے سے پہلے تک پڑھی جاسکتی ہے، اس بارے میں اعتبار غالب رائے کا ہوتا ہے، یہی قول صحیح ہے کیونکہ حالت اور زمانہ اور مکان کے مختلف ہونے سے پھوٹنے اور پھٹنے میں اختلاف ہوتا ہے۔

توضیح:- قبر پر کب تک نماز پڑھی جاسکتی ہے

ويصلي عليه قبل ان يتفسخ والمعتبر في معرفة ذلك اكبر الرأى هو الصحيح......الخ

جنازہ کے پھٹنے اور ریزہ ریزہ ہونے سے پہلے تک قبر پر نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ف۔ یہ کس طرح معلوم ہو کہ ابھی وہ منتشر نہیں ہوا ہے تو اس کے بارے میں نوادر وغیرہ میں امام ابو یوسفؒ سے تین دنوں تک کی اجازت مروی ہے، لیکن یہ کوئی لازمی بات نہیں ہے، ممکن ہے کہ انہوں نے اپنے کے لحاظ سے یہ اندازہ لگایا ہو، اسی لئے مصنفؒ نے کہا ہے کہ **والمعتبر الخ** جنازہ کے شکستہ ہو جانے کے اندازہ لگانے میں اب تک غالب رائے کا اعتبار ہے، یہی قول صحیح ہے **لاختلاف الخ** حال اور زمانہ اور قبر کی جگہ کے مختلف ہونے کی وجہ سے۔ف۔ یہانتک کہ موٹا اور تازہ جنازہ دبلے پتلے کے مقابلہ میں جلد ہی شکستہ ہو جاتا ہے۔ع۔ یا دریا میں ڈوب گیا یا برسات کا موسم ہو یا زمین بھیگی ہوئی ہو، نرم ہو تو وہ جلد شکستہ ہو گا، اور گرم موسم اور خشک زمین میں دیر تک درست حالت میں رہتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم یقینی شرط نہیں ہے، بلکہ گمان غالب سے اطمینان قلبی ہو جائے، یہانتک کہ اگر شک باقی ہو نماز جائز نہ ہو گی۔م۔

پھر واضح ہو کہ اگر امام بے وضوء ہو تو اس صورت میں نماز دہرائی جائے گی ورنہ نہیں۔الخلاصہ۔ نماز جنازہ میں بغیر عذر بیٹھنا جائز نہیں ہے۔الفتح۔ اور اگر ولی اپنے کسی خاص عذر کی وجہ سے بیٹھ کر امامت کر رہا ہو اور مقتدی کھڑے ہوں تو جائز ہے۔القاضی خان۔ف۔ اور سواری کی حالت میں نماز جنازہ جائز نہیں ہے۔المحیط۔ جن باتوں سے نماز فاسد ہوتی ہے ان سے نماز جنازہ بھی باطل ہوتی ہے، سوائے عورت کے محاذی ہونے کے کہ عام نمازوں کی جماعت میں عورت کے محاذی ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے لیکن نماز جنازہ فاسد نہیں ہوتی ہے۔الزاہدی۔ صحیح حدیث میں ہے کہ جس جنازہ میں مسلمانوں کی تین صفیں ہوں اس کے لئے مغفرت کا وعدہ ہے۔م۔ اس لئے اگر سات آدمی نمازی ہوں تو ان میں سے ایک امام اور پہلی صف میں تین اور دوسری صف میں دو اور تیسری صف میں ایک تنہا کھڑا ہو کر جماعت ادا کرلیں۔التاتارخانیہ۔

مردہ خواہ مرد ہو یا عورت اس کے سینے کے سامنے امام کا کھڑا ہونا بہتر ہے، ویسے جس طرح بھی کھڑا ہو جائے جائز ہے۔ الکافی۔ حضرت انسؓ نے اقرار کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ بھی مرد کے سینہ کے سامنے اور عورت کی سرین کے سامنے کھڑے ہوتے تھے، ابوداؤد، اور ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ مردہ عورت کے درمیان کے سامنے کھڑے ہوئے، ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ درمیان اور وسط سے مراد سینہ ہی ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ دونوں یعنی مرد و عورت کے واسطے سینہ کے سامنے کھڑا ہونا ہی احسن اور اولی ہے، البتہ عورت کے سلسلہ میں ایک حدیث میں سرین کے سامنے کھڑے ہونے کا صراحت کے ساتھ ثبوت ہے کیونکہ حضرت انسؓ کی حدیث میں ایک واقعہ بیان ہے جس سے اس کا جائز ہونا بھی ثابت ہو گیا ہے۔ سمجھ لیں۔م۔ نماز جنازہ میں چار تکبیریں ہیں۔الکافی۔ مشائخ نے ان میں سے ہر ایک تکبیر کو ایک رکعت کے قائم مقام بتایا ہے، الفتح، یہانتک کہ ایک تکبیر بھی چھوٹ جانے سے نماز نہیں ہوتی ہے۔الکافی۔ ایک مرتبہ حضرت انسؓ ایک تکبیر بھول گئے تھے تو یاد دلانے پر انہوں نے فوراً قبلہ رو ہو کر تکبیر کہی اور سلام پھیرا، جیسا کہ بخاری میں ہے۔

والصلوة ان يكبر تكبيرة يحمد الله عقيبها ثم يكبر تكبيرة ويصلي على النبي ﷺ ثم يكبر تكبيرة يدعو

فیها لنفسه وللمیت وللمسلمین ثم یکبر الرابعة ویسلم لانه ﷺ کبر اربعا فی اخر صلوة صلها فنسخت ماقبلها.

ترجمہ:- نماز جنازہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ امام پہلی تکبیر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد ادا کرے پھر دوسری تکبیر کہہ کر رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے پھر تیسری تکبیر کہہ کر اپنے لئے، مردہ کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے دعا کرے، پھر چوتھی تکبیر کہہ کر سلام پھیر دے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی کی آخری نماز میں چار ہی تکبیریں کہی تھیں جس کی وجہ سے اس سے پہلے کی نماز کی تمام صورتیں منسوخ ہوگئی ہیں۔

توضیح:- نماز جنازہ کی کیفیت، نماز جنازہ کی دعا

والصلوة ان یکبر تکبیرة یحمد الله عقیبها ثم یکبر تکبیرة ویصلی علی النبی ﷺ......الخ

نماز جنازہ کی کیفیت یہ ہوگی کہ پہلے تکبیر کہے۔ف۔ یعنی نماز کی نیت کے بعد پہلی تکبیر کہے جو تکبیر افتتاح ہوگی اور وہ شرط بھی ہے۔ف۔اور وہ امام دونوں ہاتھ اٹھائے اس کے ساتھ قوم بھی اٹھائے۔الکافی۔ع۔یحمد الله الخ اسی پہلی تکبیر کے بعد حمد باری تعالیٰ ادا کرے۔ف۔ ظاہر الروایۃ اتنی ہے، یہاںتک کہ الحمد للہ اور اس کے مانند جو کچھ بھی ہو، اور بدائع میں ہے یعنی سبحانك اللهم وبحمدك الخ، پست آواز کے ساتھ بلکہ سوائے تکبیروں کے پوری نماز پست آواز کے ساتھ ہوگی۔التبیین۔اس نماز کے لئے قرآن کی قراءت نہیں ہے، چنانچہ حضرت عمرؓ قراءت نہیں کرتے تھے، جیسا کہ مالکؒ نے اس کی روایت کی ہے، لیکن اگر دعاء کے طور پر صرف سورہ فاتحہ پڑھے تو جائز ہے۔ محیط السرخسی۔ چنانچہ ابن عباسؓ نے سورہ فاتحہ پڑھی اور کہا کہ یہ بھی ایک سنت ہے، جیسا کہ بخاری اور سنن اربعہ نے اس کی روایت کی ہے، اس تفصیل کی بناء پر یہ قراءت فاتحہ واجب نہ ہوگی، اور یہ نماز قراءت کے بغیر ہوئی اور فاتحہ پڑھنا بطور دعا کے ہوا، یہی مذہب محقق ہے۔ واللہ اعلم۔م۔ثم یکبر الخ پھر دوسری تکبیر کہے۔ف۔ہاتھ اٹھائے بغیر، یہی ظاہر الروایہ ہے۔م۔الکافی۔

ویصلی علی النبی ﷺ ثم یکبر تکبیرة یدعو فیها لنفسه وللمیت وللمسلمین......الخ

اور رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے۔ف۔ دعا کی قبولیت کے واسطے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پر درود لازم ہے صحیح حدیث کی بناپر، پھر درود کے الفاظ میں وہی اولی ہے جو نماز میں پڑھی جاتی ہے۔م۔ثم یکبر الخ پھر تیسری تکبیر کہہ کر خود اپنے لئے اور مردہ کے لئے اور سارے مسلمانوں کے لئے دعا کرے۔ف۔ وہ خواہ زندہ ہو یا مردہ ہو چکے ہوں، اور یہ دعا نہایت اخلاص کے ساتھ تہ دل سے کرنی چاہئے، حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کے یہی معنی ہیں کہ تم مردہ کے واسطے دعا میں اخلاص کرو، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ صرف وہ مردہ ہی کے لئے دعا کرو کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے اسی مضمون کی دعا ثابت ہے جو مصنفؒ نے بیان کی ہے۔م۔اس کے لئے کوئی بھی دعا مخصوص نہیں ہے۔ قاضی خان۔ لیکن آخرت پر ایمان سے متعلق ہو۔ف۔م۔

رسول اللہ ﷺ سے یہ دعا مروی ہے، **اللهم اغفر لحینا ومیتنا وشاهدنا وغائبنا وصغیرنا وکبیرنا وذکرنا وانثانا، اللهم من احییته منا فاحیه علی الاسلام ومن توفیته منا فتوفه علی الایمان**۔ھ۔ قاضی خان۔ ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، اور صحیح کہا ہے کہ اس کے علاوہ نسائی اور ابوداؤد نے بھی روایت کی ہے۔ف۔ اگر مردہ چھوٹا بچہ ہو تو یہ کہے **اللهم اجعله فرطا واجعله لنا اجرا وذخرا واللهم اجعله لنا شافعا ومشفعا**، اور اگر چھوٹی بچی ہو تو مذکر الفاظ اور اس کی ضمیروں کے بدلے مونث الفاظ اور ضمیریں لائے، بخاری۔ ایسا ہی السراج سے منقول ہے، یہ حکم اس وقت ہے جبکہ یہ دعا کر سکتا ہو، اور اگر یاد نہ ہو تو جونسی دعا چاہے کرے۔ الجامع الصغیر۔ قاضی خان۔ھ۔

ثم یکبر تکبیرۃ یدعو فیھا لنفسہ وللمیت وللمسلمین ثم یکبر الرابعۃ ویسلم لانہ ﷺ کبر......الخ

پھر چوتھی تکبیر کہہ کر سلام پھیر دے۔ف۔دائیں بائیں (دونوں طرف) اور اس سلام میں پوری قوم کی اور مردہ کی نیت کرے۔الفتح۔نہ کرے۔ قاضی خان۔ چوتھی تکبیر کے بعد سلام سے پہلے کوئی دعا نہیں ہے یہی ظاہر المذہب ہے۔الکافی۔حضرت عوف بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک جنازہ پر نماز پڑھی تو میں نے آپ کا یہ حصہ یاد رکھ لیا اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعطف عنہ، الٰہی تو اسے بخش دے، اور اس پر رحم کردے اور اسے عافیت دے اور اس کو معاف فرما، واکرم منزلہ وسع مدخلہ، اور اس کی رہائش گاہ اپنی خاص رحمت سے مکرم بنا اور جہاں داخل ہوتا ہے اسے وسیع کردے واغسلہ بالماء والثلج والبرد اور اسے پانی اور برف اور اسے غسل دے۔ف۔یعنی تیرے کرم سے اس کی مکمل پاکی اور اس کی راحت کی ٹھنڈک ہو، ونقہ عن الخطایا کما ینقی الثوب الابیض من الدنس، اور اسے غلطیوں اور گناہوں سے صاف ستھرا اور نکھرا ہوا ایسا کردے جیسے میل کچیل سے لتھڑا ہوا کپڑا سفید اور شفاف ہوجاتا ہے، وابدلہ دار اخیرا ام دارہ، اور اس کے دنیاوی گھر سے بہتر اس کو گھر بدل دے، و اھلا خیرا من اھلہ، اور اس کے اہل سے بہتر اس کو اہل دے، وزوجا خیرا من زوجہ اور اس کے جوڑے یعنی بیوی سے بہتر اس کو جوڑا دے، وادخلہ الجنۃ واعذہ من عذاب القبر و عذاب النار اور اسے جنت میں داخل کردے اور اس کو عذاب قبر و عذاب جہنم سے پناہ دے، حضرت عوف بن مالکؓ نے کہا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے اس میت کے لئے ایسی بزرگ اور اعلیٰ درجہ کی دعاء فرمائی تو میری دلی خواہش ہوئی کہ کاش اس کی جگہ میں میت ہوتا، مسلم، ترمذی، اور نسائی نے اس کی روایت کی ہے۔

اور شرح القدوری میں یہ دعاء بھی ہے اللھم اجعل قلوبنا قلوب اخیارنا اللھم آنس وحدتہ وارحم غربتہ وبرد مضجعہ ولقن وسع مدخلہ واکرم منزلہ وتقبل برحمتک حسنتہ واع بعفوک سیاتہ اللھم کن لہ بعد الاحباب حبیبا وبعد الاھل والاقارب قریبا ولدعاء من دعا لہ سمیعا مجیبا اللھم انہ نزل بک وانت خیر منزول بہ فانہ یفتقر الی عفوک وغفرانک وجودک واحسانک وانت غنی عن عذابہ اللھم اللھم تقبل شفا عتنا فیہ ولا تحرمنا اجرہ ولاتفتنا بعدہ وانت ارحم الراحمین۔ مفع۔

الحاصل ہمارے نزدیک جنازہ کی نماز میں چار ہی تکبیریں ہیں لانہ ﷺ الخ کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے جو آخری بار نماز جنازہ پڑھائی ہے اس میں چار بار تکبیریں کہیں تو ان تکبیروں نے پہلے کی تمام تکبیروں کو منسوخ کردیا۔ف۔یعنی اس کے پہلے کی زائد تکبیریں منسوخ ہوکر آخری فعل چار تکبیروں کا باقی رہا، چار تکبیریں اس وجہ سے بھی ہیں کہ نماز جنازہ میں چار تکبیریں چار رکعتوں کے حکم میں ہیں، لہٰذا نص سے ان کو متعین کرنا اور محدود ہونا ضروری ہے۔م۔اور ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آخری جنازہ پر جو تکبیریں کہیں وہ چار تکبیریں تھی، اور عمرؓ نے ابو بکرؓ پر اور ابن عمرؓ نے عمرؓ پر اور حسن بن علیؓ نے علیؓ پر اور ملائکہ نے آدم علیہ السلام پر چار چار تکبیریں کہی ہیں، اس کی روایت حاکم اور دار قطنی و بیہقی اور ابو نعیم نے کی ہے اور ابن حبان نے الضعفاء میں، اور دوسرے طریقوں سے مروی ہے مگر سب ضعیف ہیں، البتہ اکثر صحابہ کرام کا چار تکبیروں پر متفق ہونا دعوی کو تقویت پہونچاتا ہے، ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کا آخری فعل چار تکبیروں کا ہونا دار قطنیؒ نے عمرؓ سے اور ابن عبد البرؒ نے ابو خیثمہؓ سے اور حارث بن اسامہ نے ابن عمرؓ سے اور حازمی نے ناسخ و منسوخ میں انسؓ سے ذکر کیا ہے، لیکن ان کی سندوں میں ضعف ہے۔

ابن حزمؒ نے محلی میں حضرت عمر و علیؓ و زید بن ثابت و عبد اللہ بن ابی اوفی و زید بن ارقم و براء بن عازب و ابن عمر و ابو ہریرہ و عقبہ بن عامر و ابو بکر الصدیق و صہیب و حسن بن علی و عثمان بن عفان رضی اللہ تعالی عنہم سے چار تکبیریں کہنا ذکر کیا ہے، امام محمدؒ نے آثار میں کہا ہے کہ اخبرنا ابو حنیفہ عن حماد بن ابی سلیمان عن ابراھیم النخعی ان الناس الخ، یعنی ابراہیم نخعی

نے کہا ہے کہ جنازے کی نمازوں میں لوگ پانچ، چھ اور چار تکبیریں کہا کرتے یہانتک کہ رسول اللہ علیہ السلام انتقال فرمایا، اور ابو بکر صدیقؓ کی خلافت میں بھی اسی طرح رہا، پھر جب عمرؓ خلیفہ ہوئے تو فرمایا اے اصحاب محمد علیہ السلام ان تکبیروں کے بارے میں جب تم اختلاف کروگے تو تمہارے بعد والوں میں اختلاف پھیل جائے گا، اور ابھی بھی زمانہ جاہلیت لوگوں کے لئے قریب ہے تو تم کسی ایسی بات پر اتفاق کرلو کہ تمہارے بعد والے بھی اس پر اتفاق کرلیں تو بقیہ صحابہ کرامؓ کی رائے اس بات پر متفق ہوگئی کہ یہ دیکھا جائے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے جو آخری نماز جنازہ پڑھائی تھی اس میں کتنی تکبیریں کہی گئی تھیں، اسی پر عمل کیا جائے، تو انہوں نے دریافت کرکے کہا کہ آخری نماز جنازہ میں چار تکبیریں کہی تھیں، یہ اسناد اگرچہ صحیح ہے مگر منقطع ہے کیونکہ ابراہیم نخعیؒ نے عمرؓ کو نہیں پایا ہے، لیکن اس کا منقطع ہونا ہمارے لئے کچھ بھی نقصان دہ نہیں ہے، بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ امام احمدؒ نے اسے اس طرح موصولاً ذکر کیا ہے **حدثنا وکیع حدثنا سفیان عن عامر بن شفیق عن ابی وائل قال جمع عمرؓ الناس فاستشار هم فی التکبیر علی الجنازۃ فقال بعضهم کبر النبی علیہ السلام سبعا وقال بعضهم خمسا وقال بعضهم اربعا فجمع عمرؓ الناس علی اربع کا طول الصلوۃ۔**

اس کی اسناد صحیح اور موصول ہے، اور اس کے آخر میں اس بات کی تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو چار تکبیروں پر متفق کرلیا، سب سے دراز نماز کے مانند، لیکن ابن بطالؒ نے ہمام بن الحارث سے ذکر کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو چار تکبیروں پر جمع کرلیا سوائے بدری صحابہ کے کہ ان کی نمازوں میں پانچ چھ اور سات تکبیریں بھی کہتے تھے، بعض علماء کہتے ہیں کہ تکبیروں کے بارے میں کوئی مقررہ حد اور عدد نہیں ہے، اور انہوں نے ان تمام حدیثوں میں اس طرح توفیق دی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام نے بدری صحابہ اور بنو ہاشم کو فضیلت دی ہے کہ ان کی نمازوں میں سات اور پانچ تکبیریں کہتے اور بقیہ لوگوں کی نماز میں چار تکبیریں کہی تھیں اس وجہ سے یہ ناسخ ہوگئی ہے، کیونکہ ابو ہریرہؓ کا اسلام تو فتح خیبر کے بعد کا ہے، لیکن یہ بات رکھنے کے لائق نہیں ہے کہ اس طرح کہہ کر کسی حکم کو اجتہاد سے منسوخ کرنا لازم آتا ہے حالانکہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ مرفوع حدیثیں جو پہلے ذکر کی جاچکی ہیں اگرچہ ان کی سندیں ضعیف ہیں لیکن اولی تو مختلف سندوں سے ذکر ہونے کی وجہ سے یہ ضعیف بھی حسن ہو چکی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات دنیا میں مشہور اور پھیلی ہوئی ہے، اور اکثر صحابہ کرامؓ سے اس پر بہت زیادہ عمل بھی ثابت ہے سوم امام ابو حنیفہؒ کی اسناد صحیح کے درجہ میں ہے، اگرچہ مرسل ہے پس جب اس کی دوسری حدیث سے تائید ہوگئی تو ضعیف مرفوع حدیث بھی قوی ہوگئی ہے تو معلوم ہوا کہ اسی آخری فعل چار تکبیروں سے رسول اللہ علیہ السلام کا پانچ، چھ اور سات تکبیروں کا ابتداء میں کہنا منسوخ ہوگیا ہے، اور یہی بات حق ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ صاحب المبسوطؒ نے جو منسوخ ہونے کا دعوی کیا ہے اس میں تامل ہے، اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ سب جائز ہوں، اور فن اصول فقہ کی کتابوں میں یہ بات ثابت اور محقق ہے کہ جب تک ان احادیث میں اتفاق کرنا ممکن ہے کسی کو منسوخ نہیں کیا جائے گا، کیونکہ نسخ کا فیصلہ تو انتہائی مجبوری اور لاچاری میں کیا جاتا ہے، اور ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ حضرات ابن مسعودؓ وزید بن ارقمؓ کے نزدیک پانچ بار تکبیریں ہیں، اور ابن حزمؒ نے ابن عباسؓ اور انسؓ اور ابن سیرین اور جابر بن زید سے تین تکبیروں کی بھی روایت کی ہے، ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ ان کی سندیں بہت صحیح ہیں، اور حضرت عمرؓ کے بعد زید بن ارقمؓ جنازہ پر پانچ تکبیریں اور حضرت علیؓ نے بدری صحابی پر چھ تکبیریں اور ابو قتادہؓ نے جنازہ کی نماز میں سات تکبیریں کہیں۔

اور اب میں مترجم کہتا ہوں کہ میرے نزدیک آخری تحقیق یہ ہے کہ حضرت عمرؓ تمام صحابہ کرامؓ کو چار تکبیروں پر مجتمع کرلیا ہے جیسا کہ امام ابو حنیفہؒ کی روایت ابراہیم نخعی سے اور امام احمدؒ کی روایت ابو وائلؓ سے واضح ہے، سوائے بدری صحابہ کرامؓ کے جیسا کہ ابن بطان نے ہمام بن الحارثؓ سے ذکر کیا پس ابن حزمؒ حضرت علی وزید بن ارقمؓ کا جو ذکر کیا ہے وہ بدریوں کے واسطے ہے،

اور ابن عباسؓ وغیرہ سے جو تین تکبیریں ذکر کی ہیں اس کے معنی یہ ہوئے کہ تکبیر تحریمہ کے بعد زائد تین تکبیریں ہیں اس طرح کل چار ہی ہوگئیں، اس کے بعد جب بدری صحابہ کرامؓ اور ان کے جیسے لوگوں کا زمانہ ختم ہوگیا تو گفتگو صرف عام مسلمانوں کے بارے میں رہ گئی ہے، اور اس بارے میں تو چار تکبیروں پر ہی اجماع ہے، اب یہ سوال ہوتا ہے کہ چار تکبیروں سے زائد اب جائز ہیں یہ نہیں تو جب ہم ظاہری وجہ پر غور کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے اپنے فیصلہ کے وقت زمانہ جاہلیت کے قریبی زمانہ میں گزرنے اور آئندہ آنے والوں کے اختلاف کا خوف کر کے تمام لوگوں کو چار تکبیروں پر متفق کر لیا تھا اور زائد کے ناجائز ہونے کی بات کسی نے نہیں کی تھی تو اصل میں زائد کا جائز ہونا بھی معلوم ہوتا ہے، پھر جب ہم اس جملہ پر غور کرتے ہیں کہ **فجمع عمر علی اربع کاطول الصلوۃ** یعنی حضرت عمرؓ نے تمام صحابہ کو چار پر جمع کر لیا جیسا کہ سب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ فرض نمازوں میں سب سے طویل نماز چار رکعتوں والی ہے (کہ اس سے زائد پانچ چھ رکعتوں کی کوئی بھی فرض نماز نہیں ہے جبکہ اس سے کم تین اور دو کی موجود ہیں) جیسا کہ امام احمدؒ کی روایت میں ہے، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ چار تکبیریں نماز کی چار رکعتوں کے برابر ہیں، اور فرض کی رکعتوں متعین اور محدود ہیں تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سے زائد تکبیریں جائز نہیں ہیں، اس کے علاوہ یہ بھی سمجھنے کی بات ہے کہ چار تکبیروں پر اجماع ہونے کے بعد وجہ اجماع کا مذکورہ بالا ہونا جو کہ صراحۃً معلوم ہو چکی ہے اس وجہ پر منحصر نہیں ہے کیونکہ ہمیں اجماع امت پر عمل کرنا واجب اس کی وجہ خواہ کچھ بھی ہو، پس یہی بات ارجح ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ کا آخری عمل چار تکبیروں کے کہنے کا ہے، اور اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے، اور یہ کہ یہ چار تکبیریں چار رکعتوں کے حکم میں ہیں ان میں کمی وبیشی کی گنجائش نہیں ہے، ان تمام باتوں کے باوجود اس پر بھی نظر رکھنی ہے کہ یہ مسئلہ اجتہادی ہوا اسی لئے اگر کوئی پانچ یا ان سے بھی زائد تکبیروں کا قائل ہو ہم اس کی نماز کو فاسد نہیں کہیں گے بلکہ خود اس کے لئے اس کے اجتہاد کی بناء پر صحیح ہے، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

ولو کبر الامام خمسا لم یتابعه الموتم خلافا لزفرؒ لانه منسوخ لما روینا وینتظر تسلیمة الامام فی روایة وهو المختار والاتیان بالدعوات استغفار للمیت والبدایة بالثناء ثم بالصلوة سنة الدعاء ولایستغفر للصبی ولکن یقول اللهم اجعله لنا فرطا واجعله لنا اجر اوذخرا واجعله لنا شافعا ومشفعا.

ترجمہ:- اگر امام نے پانچ تکبیریں کہدیں تو مقتدی اس کی اتباع میں پانچ نہ کہے، البتہ اس میں امام زفرؒ کا اختلاف ہے، نہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان سے زائد منسوخ ہے ان روایتوں کی بناء پر جو ہم نے بیان کر دی ہیں، اور ایک روایت کے مطابق مقتدی اپنے امام کا انتظار کرے گا، اور یہی قول مختار ہے، اور دعائیں پڑھنا تو مردہ کے لئے استغفار کرنا ہے، اور اس نماز کو شروع کرنا ثناء سے اس کے بعد درود کہ یہ تو دعا کے لئے سنت ہے، نابالغ کے لئے استغفار نہ کرے بلکہ یوں کہے **اللهم اجعله لنا فرطا واجعله لنا اجرا و ذخرا واجعله لنا شافعا و مشفعا.**

توضیح:- نابالغ کے جنازہ کی دعاء، شروع سے جو پاگل رہا ہو اس کی دعاء

ولو کبر الامام خمسا لم یتابعه الموتم خلافا لزفر لانه منسوخ لما روینا ......الخ

اگر امام نے جنازہ کی نماز میں پانچ تکبیریں کہہ دیں۔ف۔ تو شافعیہ اور حنابلہ کے برخلاف ہمارے نزدیک نماز صحیح ہوگی۔ مع۔ لیکن اس زائد تکبیر میں مقتدی اس کی اتباع نہیں کرے گا **خلافا لزفر الخ** زفرؒ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ف۔ یہی قول امام احمد اور ظاہریہ کا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ اجتہادی مسئلہ ہے جبکہ ایسے مسئلہ میں امام کی اتباع جو کہ فرض ہے ترک نہیں کیا جاتا ہے جیسا کہ عیدین کی نماز میں اتباع امام کا حکم ہے، اور ہم یہ کہتے ہیں کہ عیدین کے مسئلہ میں مختلف روایتوں میں اجماع اور احتمال نسخ کے طریقہ کے علاوہ اجتہاد کے طریقہ پر عمل ہوا ہے جو عید کے مسئلہ میں مختلف الحال ہے لہٰذا اس عیدین میں چار

تکبیروں سے زائد میں امام کی متابعت نہیں کی جائے گی لانہ منسوخ الخ کیونکہ چار سے زائد تکبیریں بیان کردہ روایتوں کی بناء پر منسوخ ہیں۔ف۔ اور منسوخ احکام میں متابعت نہیں کی جاتی ہے، عینیؒ نے کہا ہے کہ جبکہ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا چار تکبیروں سے زائد پر عمل کرنا بیان کیا جا چکا ہے، ایسی صورت میں اجماع کا دعوی کس طرح درست ہوا، ابن الہمامؒ نے کہا ہے کہ ان صحابہ کرام کا اجتہاد بھی چار تکبیروں سے زیادہ پر تھا، اور ہمارے لئے تو اب بھی چار پر اجماع ہونا ثابت ہے، اور ان سے زائد تکبیروں کو ہم پہلے ہی منسوخ کر چکے ہیں، اس لئے اگر کوئی چار سے زائد تکبیریں کہتا ہے تو اس کی غلطی واضح ہے، اس طرح اب صورت اجتہاد کی باقی نہیں رہی۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ اگر زائد تکبیریں کہنی قطعی غلط بات ہو پھر تو لازمی طور سے نماز فاسد ہو جائے گی، جیسا کہ شافعیہ اور حنابلہ کا قول ہے، بلکہ اس کی وجہ وہی ہوگی جو میں نے بیان کر دی ہے کہ چار تکبیروں پر لوگوں کے اجماع کر لینے کا ثبوت موجود ہے، اور چار سے زائد صورت میں حرام ہونے کو ترجیح ہے اگرچہ اس کے جائز ہونے کا بھی احتمال ہے، اس بناء پر ہم نماز کے صحیح ہونے کو اجتہادی مسئلہ کہتے ہیں اور اس جگہ پہ دونوں باتیں یعنی اتباع امام کا واجب ہونا اور چار پر اجماع کی مخالفت کو ہم مساوی کہتے ہیں اس بناء پر پانچویں تکبیر میں ہم اتباع کرنے کا حکم نہیں دیتے، اب مقتدی پانچویں تکبیر میں اپنے امام کی موافقت نہ کرنے کی صورت میں کیا کرے، تو اس میں روایتیں ہیں ایک روایت میں ہے کہ وہ فوراً سلام پھیر دے۔

وینتظر تسلیمة الامام فی روایة وهو المختار والاتیان بالدعوات استغفار للمیت......الخ

اور دوسری روایت کے مطابق امام کے سلام پھیرنے کا انتظار کرے، یہی قول مختار ہے۔ف۔ یہی اصح ہے، اور اسی پر فتوی ہے۔ الواقعات۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ مقتدی تکبیروں کو براہ راست امام سے سنتا ہو، اور اگر دوسرے لوگوں یعنی تکبیروں سے سنتا ہو تو ان زائد میں بھی اتباع کرے، کیونکہ شاید امام کی تکبیر یہی ہو، اور مکبر نے اس سے پہلے غلطی کی ہو، جیسے عیدین کے بیان میں گذر گیا ہے، الزندویؒ۔ مع۔ الحاصل نماز جنازہ میں ثناء، درود، اور دعا ہے، والاتیان الخ اور دعائیں کرنا مردہ کے لئے مغفرت مانگنا ہوگا ہے۔

والبدایة بالثناء ثم بالصلوٰة سنة الدعاء ولایستغفر للصبی ولکن یقول اللهم......الخ

اس نماز کو ثناء سے شروع کرنا اور اس کے بعد درود کے ساتھ دعا کرنا سنت ہے۔ف۔ کیونکہ حدیث میں ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کرے، پھر رسول اللہ ﷺ پر درود بھیجے پھر جو دعا چاہے کرے۔ ابوداؤد۔ ترمذی۔ پھر ترمذی نے کہا ہے کہ یہ حسن صحیح ہے، ان کے علاوہ نسائی وابن حبان وحاکم نے اس کی روایت کی ہے، اسی بناء پر اگر کوئی سورہ فاتحہ ہی کی غرض سے اس نماز میں پڑھے جس میں قراءت قرآن کی غرض نہ ہو تو وہ پڑھنا جائز ہے، اور اس طرح پڑھنے میں چونکہ میت کے لئے دعا کے زیادہ قبول ہونے کی امید ہے تو میت کے ساتھ اخلاص کا تقاضا یہی ہے اس طرح پڑھنا کوئی ایسا رکن نہیں ہے جس کے ترک سے نماز فاسد ہوتی ہو، اسی بناء پر مصنفؒ نے سنت کے لفظ سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، اور ابن الہمامؒ نے تصریح کر دی ہے۔ م۔

ولایستغفر للصبی ولکن یقول اللهم اجعله لنا فرطا واجعله لنا اجرا وذخرا واجعله......الخ

امام نابالغ کے لئے استغفار نہیں کرے گا۔ف۔ کیونکہ وہ جب گناہ کرتا ہی نہیں ہے تو پھر اس کے لئے استغفار کرنا ہی بے کار ہے ولکن الخ البتہ اس کی جگہ یوں کہے اللهم اجعله الخ الٰہی اس بچہ کو ہم لوگوں کے لئے فارط (پیشرو) بنادے۔ف۔ جو منزل پر پہلے پہنچ کر پانی وغیرہ کا قافلہ کے لئے سامان تیار کر کے رکھتا ہے، واجعله لنا الخ اور اسے ہمارے لئے ثواب اور نیکی کا ذخیرہ کر دے، واجعله لنا الخ اور اسے ہمارے لئے ایسا شفاعت کرنے والا بنادے جس کی شفاعت قبول ہو۔ف۔ بچہ کی دعا کے لئے الفاظ مختصر مگر بہت بہتر ہیں، حدیثوں میں اس قسم کی باتیں بہت سی منقول ہیں کہ بچے اپنے مسلمان والدین کے دامن پکڑ کر انہیں دوزخ میں لے جانے سے منع کریں گے، اور باری تعالیٰ سے اپنے والدین کے لئے شفاعت کریں گے، اور اپنے رب ارحم الراحمین

کے کرم پر بھروسا کر کے عرض کریں گے کہ ہمیں اس بات کی اجازت دی جائے کہ اپنے والدین کو لے کر ہم جنت میں جائیں۔م۔اگر مردہ ہمیشہ ہی یعنی ابتداء سے موت تک دیوانہ ہی رہا تو بھی اس کے لئے یہی دعا ہوگی۔المحیط۔ع۔

ولو كبر الامام تكبيرة او تكبيرتين لايكبر الاتي حتى يكبر اخرى بعد حضوره عند ابي حنيفة و محمد و قال ابويوسف يكبر حين يحضر لان الاولى للافتتاح والمسبوق ياتي به ولهما ان كل تكبير قائمة مقام ركعة والمسبوق لايبتدي بما فاته اذهو منسوخ ولو كان حاضرا فلم يكبر مع الامام لاينتظر الثانية بالاتفاق لانه بمنزلة المدرك .

ترجمہ:۔اگر امام نے ایک دو تکبیریں کہہ دیں تو بعد کو آنے والا فوراً تکبیر نہ کہے یہانتک کہ وہ اس کی موجودگی میں دوسری تکبیر کہے، یہ امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک ہے، اور امام ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ وہ آتے ہی تکبیر کہدے، کیونکہ پہلی تکبیر تو نماز شروع کرنے کے لئے کہی جاتی ہے جسے مسبوق بھی کہتا ہے، اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ جنازے کی ہر ایک تکبیر ایک رکعت کے قائم مقام ہوتی ہے، اور مسبوق چھوٹی ہوئی رکعت کو پہلے ادا نہیں کرتا ہے کیونکہ ایسا کرنا منسوخ ہو چکا ہے، اور اگر وہ موجود رہتے ہوئے امام کے ساتھ تکبیر نہ کہے تو اس کے بعد کے لئے بالاتفاق انتظار نہ کرے، کیونکہ اب وہ شخص مدرک کے حکم میں ہے۔

توضیح:۔امام کی تکبیر کہہ لینے کے بعد شریک ہونے والا

ولو كبر الامام تكبيرة او تكبيرتين لايكبر الاتي حتى يكبر اخرى بعد حضوره......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے۔ف۔اس کی موجودگی میں اور تکبیر ہو جانے کے بعد امام کے ساتھ یہ بھی تکبیر کہے، پھر امام کے فارغ ہو جانے کے بعد جنازہ اٹھائے جانے سے پہلے اپنی چھوٹی ہوئی تکبیر کہے مسبوق کی طرح قضاء کرے۔ھ۔هذا عند ابی حنیفه الخ یہ طرفین یعنی امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کا قول ہے۔ف۔یہی قول امام مالکؒ واحمد واسحٰق کا ہے، بخلاف عیدین کی تکبیر اولی کے کہ اسے رکوع میں جانے تک قضاء کرلے، وقال ابو یوسفؒ الخ اور امام ابو یوسفؒ نے کہا ہے کہ آنے والا آتے ہی تکبیر کہہ کر نماز میں شامل ہو جائے کیونکہ یہ پہلی تکبیر تو نماز شروع کرنے کی ہے اور ہر مسبوق اس پہلی تکبیر کو فوراً ضرور کہتا ہے، ولهما الخ اور طرفین کی دلیل یہ ہے کہ جنازے کی ہر تکبیر ایک رکعت کے قائم مقام ہے، اور مسبوق نمازی آکر چھوٹی ہوئی رکعت پہلے نہیں بلکہ امام کے فارغ ہونے کے بعد قضاء کرتا ہے۔ف۔لہٰذا یہاں بھی اسی طرح کرے گا، اور پہلے ادا نہیں کرے گا۔

اذهو منسوخ ولو كان حاضرا فلم يكبر مع الامام لاينتظر الثانية......الخ

کیونکہ ایسا کرنا منسوخ ہو گیا ہے۔ف۔چنانچہ ابن ابی لیلیٰ نے معاذؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ابتدائی دنوں میں لوگوں میں یہ طریقہ تھا کہ کچھ نماز ہو جانے کے بعد جب کوئی نماز میں شریک ہونا چاہتا تو وہ پہلے مقتدیوں سے پوچھ لیتا کہ کتنی رکعت ہوئی ہے اور وہ اشارہ سے بتادیتا، تو وہ پہلے ان چھوٹی ہوئی رکعتوں کو ادا کرلیتا، پھر ایک مرتبہ حضرت معاذؓ ایسے وقت میں آئے کہ لوگ قعدہ میں تھے، تو وہ بھی قعدہ میں شریک ہو گئے پھر جب رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہوئے تو کھڑے ہو کر باقی نماز قضاء کی، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ معاذؓ نے تمہارے واسطے یہ طریقہ ایجاد کر دیا ہے لہٰذا ان کی اقتداء کرو یعنی جب کوئی آئے اور کچھ نماز اس کی چھوٹ گئی ہو تو وہ امام کے ساتھ شریک ہو کر اس کی آئندہ کی نماز پوری کرے پھر جب امام نماز سے فارغ ہو جائے تب اپنی قضاء نماز کو ادا کرلے، احمد اور طبرانی نے اس کی روایت کی ہے، لیکن ابن ابی لیلیٰ نے معاذؓ سے نہیں سنا ہے اور طبرانی وعبد الرزاق نے اس کو ابو امامہؓ سے سند ضعیف کے ساتھ اور شافعیؒ نے عطاء بن ابی رباح سے مرسل روایت کی ہے،

لیکن بجائے معاذ کے ابن مسعودؓ کا واقعہ ذکر کیا ہے۔
الحاصل ہمارے نزدیک مرسل روایت قابل حجت ہے اور اس کے باوجود اس بات پر اتفاق بھی ہے کہ مسبوق اپنی چھوٹی ہوئی نماز کو پہلے قضاء نہیں کرتا ہے بلکہ امام کے فارغ ہونے کے بعد کرتا ہے، کافی میں کہا ہے کہ ابو یوسفؒ تو کہتے ہیں کہ پہلی تکبیر کی دو حیثیتیں ہیں وہ نماز شروع کرنے کے لئے ہے (۲) ایک رکعت کے قائم مقام ہے، مگر یہاں پہلی حیثیت کو ترجیح اسی بناء پر صرف پہلی تکبیر کے وقت ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، اس اختلاف ائمہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر امام چوتھی تکبیر کہہ چکا ہے اور اس وقت کوئی شامل ہوا تو امام ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق اس کی نماز جاتی رہی، لیکن امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق نماز فاسد نہیں ہوئی۔ف۔ اگر آنے والا ایسے وقت میں پہونچا کہ امام نے چاروں تکبیریں کہہ دی ہوں، لیکن سلام نہیں پھیرا ہو تو ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق اسے اب نماز میں شامل نہیں ہونا چاہئے، لیکن قول اصح یہ ہے کہ وہ شامل ہو جائے، اور اسی پر فتویٰ بھی ہے۔المضمرات۔المحیط۔ پھر جنازہ کے اٹھائے جانے سے پہلے تین تکبیریں پے در پے بغیر کسی دعاء وغیرہ کے کہہ لینی چاہئے، الخلاصہ۔ قاضی خان۔ ھ۔ ائمہ ثلاثہ کا یہی قول ہے۔ع۔
اگر امام نے پہلی تکبیر کہہ لی اس کے بعد کوئی آیا تو امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ کے قول کے مطابق وہ اس وقت تک انتظار کرے کہ امام دوسری تکبیر بھی کہہ لے اس کے بعد وہ نماز میں شامل ہو جائے، لیکن امام ابو یوسفؒ کے قول کے مطابق وہ فوراً تکبیر کہہ کر شامل ہو جائے، ایسی صورت میں وہ مسبوق نہ ہوگا۔ المحیط۔ لیکن اگر اس نے اسی وقت تکبیر کہہ کر داخل نماز ہو گیا تو اس سے اگرچہ نماز فاسد بھی نہ ہوگی مگر اس تکبیر کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوگا لہذا بعد میں تکبیر کہنی ہوگی۔ف۔ اور اگر جنازہ ہاتھوں سے اٹھا لیا گیا پھر بھی اب تک کاندھوں تک نہیں رکھا گیا تو ظاہر الروایۃ کے مطابق اب وہ مسبوق تکبیروں کی قضاء نہ کرے۔ الظہیریہ۔ اور اصح قول یہ ہے کہ اگر کاندھوں پر رکھ لیا گیا ہو تو اپنی نماز ختم کردے۔ف۔

ولو كان حاضرا فلم يكبر مع الامام لاينتظر الثانية بالاتفاق لانه بمنزلة المدرك ......الخ
اور ایک شخص شروع سے صف میں موجود تھا پھر بھی اس نے شرکت نہیں کی یعنی امام کے ساتھ تکبیر نہیں کہی۔ف۔ مثلاً نیت کرتا ہوا رہ گیا یا غافل ہو گیا۔ قاضی خان۔ لاينتظر الخ تو بالاتفاق وہ امام کی دوسری تکبیر کا انتظار نہیں کرے گا، لانه الخ کیونکہ وہ ابھی تک مدرک کے حکم میں ہے یعنی وہ شروع سے شریک ہونے والوں کے حکم میں ہے۔ف۔ جیسے پہلی تکبیر امام کے ساتھ کہہ لینے کے بعد کسی عارضہ یعنی حدث وغیرہ کی بناء پر دوسری اور تیسری تکبیر نہیں پائی تو اب وہ دونوں تکبیر کہہ لینے کے بعد امام کے ساتھ ہو جائے، کیونکہ وہ مسبوق نہیں بلکہ مدرک ہے۔ قاضی خان۔ ھ۔ اگر امام کو حدث ہوا تو اس نے اپنا خلیفہ بنا دیا تو قول صحیح کے مطابق نماز صحیح ہوگی۔ الظہیریہ۔ ھ۔

ويقوم الذى يصلي على الرجل والمرأة بحذاء الصدر لانه موضع القلب وفيه نور الايمان فيكون القيام عنده اشارة الى الشفاعة لايمانه وعن ابى حنيفة انهيقوم من الرجل بحذاء راسه ومن المرأة بحذاء وسطها لان انسؓ فعل كذلك و قال هو السنة قلنا تاويله ان جنازتها لم تكن منعوشة فحال بينها وبينهم.
ترجمہ:۔اور نماز پڑھانے والا خواہ مرد کو پڑھائے یا عورت کو وہ اس مردے کے سینے کے مقابل کھڑا ہو کیونکہ یہی جگہ قلب کی ہے اور اسی میں ایمان کی روشنی رہتی ہے، لہذا اس کے پاس کھڑے ہونے سے اس بات کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ اس کے ایمان کی وجہ سے اس کی سفارش کرتا ہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مرد کو نماز پڑھاتے اس کے سر کے مقابل اور عورت کو نماز پڑھاتے وقت اس کے بیچ کے سامنے کھڑا ہو کیونکہ انسؓ نے ایسا ہی کیا اور یہ فرمایا کہ یہی سنت ہے، ہم اس کی تاویل میں یہ کہتے ہیں کہ اس نعش پر (یعنی پردہ کا انتظام) نہ تھا، لہذا آپ اس طرح کھڑے ہو کر ان کے اور قوم کے درمیان

حائل ہو گئے۔

توضیح:-جنازے کی نماز کے لئے امام کہاں کھڑا ہو

ویقوم الذی یصلی علی الرجل والمرأة بحذاء الصدر لانه موضع القلب......الخ

مرد ہو یا عورت اس کے جنازے کی نماز پڑھانے والا اس کے سینہ کے مقابل کھڑا ہو۔ف۔اور مرد کا جنازہ آگے اور اس کے بعد عورت کا جنازہ ہو، اسی طرح جبکہ کسی کا تنہا جنازہ ہو تو اس کے لئے سینہ کا مقام بہتر ہے۔م۔اور مبسوط میں ہے کہ سینہ کے نیچے کھڑا ہونا بہتر جگہ ہے، طحاویؒ نے بھی اسی قول کو قبول کیا ہے، بہر صورت قلب سے قریب ہونا چاہئے اسی لئے صدر کا لفظ کہا ہے۔م۔لانه موضع الخ اس لئے کہ سینہ ہی تو قلب کا مقام ہے، اور اسی قلب میں نور ایمان رہتا ہے، اس بناء پر سینے کے پاس کھڑے ہونے سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ شفاعت یعنی دعائے استغفار اس کے ایمان کی وجہ سے ہے۔

وعن ابی حنیفة انه یقوم من الرجل بحذاء راسه ومن المرأة بحذاء وسطها......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ سے روایت ہے کہ مرد کے جنازہ میں سر کے سامنے سے اور عورت کے جنازے میں درمیان کے سامنے کھڑا ہو کیونکہ حضرت انسؓ نے اسی طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھائی ہے پھر بتایا کہ یہی سنت ہے۔ف۔یہ حدیث ابوداؤد ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کی ہے، اس حدیث میں ہے کہ عورت کے جنازہ پر سبز نعش تھی، اور آخر میں ہے کہ علاء بن زیاد نے پوچھا کہ اے ابو حمزہ یعنی انسؓ: کیا رسول اللہ ﷺ نماز جنازہ پڑھتے وقت مرد ہونے سے اس کے سر کے قریب اور عورت ہونے سے اس کے سرین کے قریب کھڑے ہوتے تھے، تو انسؓ نے فرمایا کہ ہاں، اور یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ابو غالبؒ نے دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں عورت کے جنازہ پر نعش نہیں ہوتی تھی، اس لئے امام اس کے سرین کے پاس کھڑا ہو کر دوسرے لوگوں سے اس کا پردہ کر لیتا تھا، اس کی روایت احمد، اسحٰق اور ابو یعلی نے کی ہے، لیکن ہند یجےؒ نے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے یہ نعش (پردہ) رسول اللہ ﷺ کی صاجزادی زینبؓ کے واسطے بنائی گئی تھی۔مع۔

قلنا تاویله ان جنازتها لم تکن منعوشة فحال بینها وبینهم......الخ

ہم کہتے ہیں کہ حضرت انسؓ کے کلام کا مطلب یہ ہے کہ عورت کا جنازہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں پردہ دار نہیں ہوتا تھا، اس لئے رسول اللہ ﷺ عورت اور نمازیوں کے درمیان کھڑے ہو کر حائل ہو جاتے تھے۔ف۔اگرچہ جس عورت پر حضرت انسؓ نے نماز پڑھی تھی اس پر سبز پردہ تھا۔

واضح ہو کہ حضرت سمرہ بن جندبؓ کی حدیث میں ہے کہ ایک عورت اپنے نفاس کے درمیان مر گئی تو رسول اللہ ﷺ اس کے جنازہ کے بیچ میں کھڑے ہوئے، ائمہ ستہ نے اس کی روایت کی ہے، اس حدیث میں وسط سے مراد ابو حنیفہؒ کے قول کے مطابق وہ ہے جو مصنفؒ نے ذکر کیا ہے یعنی کمر کے قریب، اور مبسوط وغیرہ میں ہے کہ وسط سے مراد سینہ ہے، کیونکہ سینہ کے اوپر سر اور دونوں ہاتھ ہوتے ہیں، اور اس کے نیچے پیٹ اور دونوں پیر ہوتے ہیں اس طرح درمیانی حصہ سینہ ہوا۔معف۔لیکن عام طور پر مستعمل تو کمر کے معنی میں ہے۔واللہ تعالی اعلم۔

فان صلوا علی جنازة رکبانا اجزأهم فی القیاس لانها دعاء وفی الاستحسان لاتجزیهم لانها صلوة من وجه لوجود التحریمة فلا یجوز ترکه من غیر عذر احتیاطا ولاباس بالاذ ن فی صلوة الجنازة لان التقدم حق الولی فیملك ابطاله بتقدیم غیره وفی بعض النسخ لاباس بالاذان ای الاعلام وهو ان یعلم بعضهم بعضا لیقضوا حقه.

ترجمہ:-اگر لوگوں نے جنازہ کی نماز سواری پر سوار ہو کر پڑھی تو قیاس کے مطابق ان کی نماز جائز ہو گی، کیونکہ یہ نماز حقیقت میں دعا ہے، لیکن استحسان کے مطابق جائز نہ ہو گی، کیونکہ ایک اعتبار سے یہ نماز بھی ہے کیونکہ اس کے لئے تحریمہ ہے،

لہذا حتی الامکان اس قیام کو بلا ضرورت نہیں چھوڑنا چاہئے، اس نماز جنازہ کی امامت کے لئے دوسروں کو اجازت میں کوئی حرج نہیں ہے، اور دوسرے نسخہ میں اس جگہ بالاذن (بغیر الف) کی بجائے (الف کے ساتھ) بالاذان ہے تو اس کے معنی اعلام یعنی خبر دینے کے ہوں گے جس کی صورت یہ ہو گی کہ ایک دوسرے کو دیتے رہیں تاکہ سب مل کر اس کا حق ادا کریں۔

توضیح:- جنازہ کی نماز سوار ہو کر، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق

فان صلوا علی جنازة رکبانا اجزأهم فی القیاس لانها دعاء......الخ

مطلب واضح ہے وفی الاستحسان الخ اور استحسان کے مطابق جائز نہیں ہے۔ف۔ کیونکہ قیام ترک ہوتا ہے لانها صلوة الخ کیونکہ جنازہ میں تحریمہ کرنا پڑھتا ہے لہذا اس کے اعتبار سے یہ نماز ہے۔ف۔ لیکن دوسری وجہ سے صرف دعاء ہے کیونکہ اس میں نماز کے لوازمات ارکان اور قراءت نہیں ہیں، پھر بھی نماز ہونے کی حیثیت اس میں قوی ہے، فلا یجوز الخ تو احتیاط کے تقاضا کے مطابق حتی الامکان بغیر عذر اس کھڑے ہونے کو چھوڑنا جائز نہیں ہوگا۔ف۔ محیط میں اسی پر زور دیا ہے، اور اس کی نماز پڑھے بغیر جنازے سے پھرنا نہیں چاہئے، اسی طرح نماز کے بعد جنازہ کے وارثین کی اجازت کے بغیر دفن سے پہلے واپس نہیں آنا چاہئے، مگر دفن کے بعد بغیر اجازت کے واپس آسکتا ہے۔ المحیط۔ کیونکہ نماز پڑھنے تک انتظار کرنے سے ایک قیراط اور دفن کرنے تک انتظار کرنے سے دو قیراط ثواب ملتا ہے، اور ہر قیراط احد پہاڑ کے برابر ہوتا ہے، جیسا کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے صحیحین میں مروی ہے۔

ولاباس بالاذن فی صلوة الجنازة لان التقدم حق الولی فیملك ابطاله بتقدیم غیره......الخ

اور نماز جنازہ کی امامت کے لئے دوسرے کو اجازت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لان التقدم الخ کیونکہ امامت کرنا ولی کا حق ہے، اس لئے وہ اپنا حق چھوڑ کر دوسرے کو ترجیح دے سکتا ہے، وفی بعض الخ اس جگہ جامع صغیر کے کچھ نسخہ میں لفظ اذان ہے یعنی دوسروں کو اس نماز کے لئے خبر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

وهو ان یعلم الخ اس اذان کی صورت یہ ہو کہ ایک دوسرے کو اس نماز جنازہ میں شرکت کی خبر دیں تاکہ میت کا حق سب مل کر ادا کریں۔ف۔ اگرچہ بازاروں میں اعلان کر دیں، یہی قول اصح ہے۔ المحیط۔ مسلمان کے مسلمان پر یہ حقوق ہیں، سلام کا جواب دینا، مریض کی عیادت کرنا، جنازہ کے پیچھے چلنا، دعوت قبول کرنا، مسلمان کی چھینک پر جبکہ وہ الحمد للہ کہے تو وہ یرحمک اللہ کہنا، جیسا کہ صحیحین کی حدیث میں ہے، عام اطلاع کا کام میت کے لوگ اور اس کے پڑوسی انجام دیں۔ مع۔ جنازہ کی نماز اگر کوئی میدان ہو تو اس میں اور عیدگاہ کے میدان میں اور دوسری جگہوں میں احاطوں میں ہر جگہ برابر جائز ہے۔ المحیط۔ مگر عام لوگوں کے کھیتوں میں زمینوں میں اور راستوں میں مکروہ ہے۔ المضمرات۔ اور جو مسجد جنازہ کی نماز ہی کی نیت سے بنائی گئی ہو اس میں جنازہ مکروہ نہیں ہے۔ التبیین۔

ولا یصلی علی میت فی مسجد جماعة لقول النبی ﷺ من صلی علی جنازة فی المسجد فلا اجر له ولانه بنی لاداء المکتوبات ولانه یحتمل تلویث المسجد وفیما اذا کان المیت خارج المسجد اختلف المشائخ.

ترجمہ:- مسجد جماعت میں جنازہ کی نماز نہیں پڑھی جائے رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ جس نے مسجد میں جماعت کی نماز پڑھی اس کے لئے کوئی اجر نہیں ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ یہ مسجد تو فرائض کی ادائیگی کے لئے بنائی گئی ہے، اور اس لئے بھی کہ اس میں نماز پڑھنے سے مسجد کے گندہ ہونے کا احتمال رہتا ہے، اور اس صورت میں مشائخ کا اختلاف ہے جبکہ جنازہ مسجد سے باہر ہو۔

توضیح:- مسجد میں جنازہ کی نماز پڑھنا، حدیث سے دلیل، میت مسجد سے باہر اور نمازی مسجد کے اندر

ولا یصلی علی میت فی مسجد جماعۃ لقول النبی علیہ من صلی علی جنازۃ......الخ

مسجد جماعت میں کسی میت کی نماز نہیں پڑھی جائے۔ف۔ مگر بارش وغیرہ کے عذر سے جائز ہے۔الکافی، امام مالکؒ کا بھی یہی قول ہے، اور امام شافعیؒ واحمدؒ کے نزدیک بلا عذر بھی جائز ہے، اس دلیل کی بناء پر کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا انتقال ہوا توام المومنین حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ان کا جنازہ مسجد میں داخل کردو تاکہ ازواج مطہرات میں ان کے جنازے کی نماز پڑھ لیں، اور لوگوں کے انکار کرنے پر فرمایا کہ رسول اللہ علیہ نے بیضاء کے دو بیٹے سہیل اور اس کے بھائی کی نماز بھی مسجد میں پڑھی تھیں، مسلم نے اس کی روایت کی ہے۔ مفع۔ اس کا جواب اول یہ ہے کہ اول تو یہ ایک واقعہ ہے کہ جس سے عام حکم کا ثبوت نہیں ہوتا ہے، بہت ممکن ہے کہ اس وقت رسول اللہ علیہ اس وقت مسجد میں معتکف ہوں، یا کوئی اور خاص وجہ ہو، دوم اس واقعہ پر بھی صحابہ کی ایک جماعت نے انکار فرمایا، اس کے بعد یہ معلوم نہ ہو سکا کہ انہوں نے اسے تسلیم کرلیا، اور اپنے انکار سے رجوع کرلیا یا وہ اپنے انکار پر قائم ہی رہے، ان صحابہ کا انکار کرنا اس دعوی کی دلیل ہے کہ جس مسجد میں پنجگانہ جماعت ہوتی ہو اس میں جنازہ کو داخل کرنا سنت اور معمول نہ تھا کیونکہ اگر جائز ہوتا یا معمول ہوتا تو اس پر انکار نہ ہوتا۔ مف۔

اور ہمارے نزدیک مسجد میں نماز جنازہ مکروہ ہے۔ لقول النبیؐ الخ۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن کعبہ کے اندر نماز پڑھی اس کے لئے اجر یعنی ثواب نہیں ہے۔ف۔ ابن عبد البرؒ نے کہا ہے کہ فلا اجر لہ کی روایت درست نہیں ہے بلکہ صحیح روایت فلا شیء لہ ہے، یعنی اس کے لئے کچھ بھی نہیں ہے، یہی لفظ سنن ابی داؤد میں ہے اور ابن ماجہ میں فلیس لہ شئی واقع ہے، یعنی اس کے واسطے کچھ نہیں ہے، خطیبؒ نے فرمایا ہے کہ محفوظ روایت میں فلا شیء لہ ہے، اس سے معلوم ہوا کہ سنن ابی داؤد کے بعض نسخوں میں جو فلا شئی لہ لکھا ہوا ہے وہ کاتب کی غلطی ہے، بالخصوص اس صورت میں جبکہ مصنف ابن ابی شیبہؒ کی روایت میں فلا صلوۃ لہ واقع ہوا ہے یعنی اس کی نماز نہیں ہوئی ہے۔ مع۔ پھر اس کی اسناد میں ابن ابی ذیب نے مولی التومۃ صالحؒ سے انہوں نے حضرت ابو ہریرہؓ سے مرفوعا روایت کی ہے، اور نسائیؒ نے اپنی مستقل اسناد سے یحیی بن معینؒ سے روایت کی ہے، کہ صالح مولی التومہؒ ایک ثقہ شخص ہے لیکن آخری زندگی میں ان کا حافظہ کمزور ہو کر خلط ملط کر دینے کی بیماری لگ گئی تھی، یعنی اپنی اور غیر کی روایت کردہ حدیثوں میں کوئی فرق نہیں کر سکتے تھے، لہذا جن لوگوں نے ان کی اس بیماری لگنے کے زمانہ سے پہلے صحیح حالت میں ان سے جو روایت سنی ہے وہ صحیح اور حجت ہے، اور بالاتفاق ابن ابی ذیبؒ نے صالح مولی تومہؒ سے اس مرض کے لاحق ہونے سے پہلے روایت سنی ہے لہذا ان کی روایتیں مقبول اور حجت ہوں گی۔ مفع۔

اور امام ابو جعفر الطحاویؒ کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ اس باب میں رسول اللہ علیہ سے قولی اور فعلی مختلف روایتیں پائی گئی ہیں اس لئے ان میں گفتگو ضرور ہو گی، چنانچہ حضرت عائشہؓ کی حدیث تسلیم کرلی جائے کہ اس میں کوئی عذر اور کمی نہیں ہے بلکہ معیاری ہے تو بھی اس کے بارے میں یہ کہنا درست ہو سکتا ہے کہ یہ ایسے وقت کی ہے جبکہ اس سے پہلے ممانعت کا حکم نہیں تھا، کیونکہ اگر پہلے سے ممانعت تھی تو پھر ان کی بات بھی تسلیم کرنے میں عذر ہوگا، اور حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں فعل سابق سے ممانعت ثابت ہوتی ہے، لہذا مولی کی حدیث سے حضرت عائشہؓ کی حدیث جو فعلی ہے قولی نہیں ہے منسوخ ہو گئی، اور صحابہ کرام کا اس پر انکار کرنا ہمارے خیال کی تائید کرتا ہے، اس طرح یہ ثابت ہوا کہ اس عمل کی پہلے اجازت تھی بعد میں ممانعت ہو گئی ہے اس لئے اس کے منسوخ ہونے کے ہم قائل ہو گئے ہیں، اور اس کے برعکس یعنی یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ سے پہلے ممانعت ثابت ہوئی پھر حضرت عائشہؓ کی حدیث سے اس کا ثبوت ہو کر یہ عمل مباح ہو گیا ہے، ایسا اس لئے نہیں کہہ سکتے ہیں کہ اس طرح دو مرتبہ منسوخ کہنا پڑے گا جبکہ بلا ضرورت ایسا کہنا ممنوع ہے، اس کے علاوہ حضرت عائشہؓ کی حدیث جسے امام مسلمؒ نے سند کے طور پر بیان کیا ہے اور دار قطنیؒ وغیرہ نے اس پر طعن کیا ہے اور کہا ہے کہ امام مالکؒ وغیرہ کی صحیح روایات میں تو یہ مرسل ہے، اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث کو اس پر ترجیح ہوئی اس بناء پر کہ ابو ہریرہؓ کی وہ حدیث سند مرفوع ہے دوم اس میں ممانعت ہے، اس کے برخلاف حضرت عائشہؓ کی حدیث میں اباحت ہے یعنی مسجد میں جنازہ کی نماز پڑھ سکتے ہیں حالانکہ ممانعت کو

اباحت پر مقدم کرنا اصل معروف ہے، بہر صورت نماز جنازہ کو مسجد سے باہر پڑھنا اولی وافضل ہے تا کہ اختلاف سے بچا جائے، اور عبادات کے باب میں احتیاط کرنا ہی اولی ہے، بالخصوص ایسی صورت میں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث میں جب یہ جملہ ہے کہ وہاں پڑھنے سے کچھ ثواب نہیں ہے۔ مع۔

واضح ہو کہ اگر شافعیہ وغیرہ کا اختلاف اگر اس بات میں ہو کہ میت کو مسجد میں داخل کرنا سنت ہے تو اس کے باطل ہونے میں کچھ شبہ نہیں ہے، جبکہ حضرت عائشہؓ کی حدیث سے یہ بات کسی طرح بھی لازم نہیں آتی ہے اور ایسا کس طرح ہو سکتا ہے جبکہ مدینہ منورہ میں جم غفیر اور بے شمار مخلوق نے انتقال کیا ہے، تو اگر مسجد میں داخل کرنا سنت ہی ہوتا تو سارے نہیں تو اکثر جنازے مسجد میں داخل کئے جاتے اور اس بات کے ہزاروں راوی ہوتے، اور صحابہ کرام اس بات کو کس طرح بھول جاتے اور حضرت عائشہؓ کے فرمانے پر انکار کرتے، یہ بات تو روز روشن کی طرح واضح ہے، اور اگر اختلاف صرف مباح ہونے میں ہے تو یہ درست ہے کہ شوافع کے نزدیک مباح ہے، لیکن ہمارے نزدیک مکروہ ہے، اس کے بعد ہم اپنے اندر یہ دیکھتے ہیں کہ اگر اس سے کراہت سے مراد تحریمی ہو تو اس جگہ حق بات یہ ہے کہ یہ مکروہ تحریمی بھی نہیں ہے، بلکہ میرے نزدیک مکروہ تنزیہی ہے، اب اگر یہی بات ہے تو اس کا حاصل یہ نکلا کہ آپس کا یہ اختلاف اولی ہونے میں ہے، ایسی صورت میں شوافعؒ بھی کہیں گے کہ مسجد میں نماز جنازہ اگر چہ مباح ہے، لیکن مسجد سے باہر ہونا ہی افضل ہے، بالآخر آپس میں کوئی اختلاف باقی نہ رہا، جیسا کہ خطابیؒ نے اس بات کی تصریح کر دی ہے کہ بات بالکل محقق ہو چکی ہے کہ حضرت ابو بکر و عمرؓ کی نماز جنازہ مسجد ہی میں پڑھی گئی ہے، اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان حضرات کی نمازوں میں مہاجرین وانصار سبھوں نے ان میں شرکت کی تھی اور جب ان میں سے کسی نے انکار نہیں کیا تو یہ جائز ہونے کی بڑی دلیل ہے، کلام ختم ہوا اور تفصیل دعوی جواز کی صریح دلیل ہے۔ مف۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ حق بات یہ ہے کہ ان کے نزدیک ایسی نماز جائز بھی تھی اور اس میں کوئی کراہت بھی نہ تھی، کیونکہ جب بیہقی کی روایت کے مطابق حضرت ابو بکرؓ کی اور مؤطا کی روایت کے مطابق حضرت عمرؓ کی نماز میں مسجد میں پڑھی گئی تو یہ جائز نہیں ہے کہ ان حضرات مہاجرین وانصارؓ نے ان افاضل صحابہ کی نماز کا ثواب کھو دیا ہو کیونکہ حضرت ابو بکرؓ کی حدیث میں ثواب کی صراحۃً نفی ہے، ہاں اگر کسی مجبوری کا دعوی کیا جائے، اور عبد الرزاقؒ نے صفیانؒ و معمرؒ سے اور ان دونوں نے ہشام بن عروہؒ سے روایت کی ہے کہ میرے والد نے لوگوں کو ایک جنازے کی نماز کے لئے مسجد سے نکلتے دیکھا تو اس پر انکار کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں کیوں نکلتے ہیں حالانکہ اللہ کی قسم میرے والد کی نماز بھی تو مسجد ہی میں پڑھی گئی ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، اور عروہ بن زبیرؓ نے خواہ اپنے والد حضرت زبیر بنؓ گویا اپنے نانا حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ان میں سے جو بھی مراد ہوں ظاہر ہے کہ ان کی نماز کسی عذر کے بغیر ہی پڑھتے دیکھا ہے ورنہ اس طرح کیوں استدلال کرتے۔

الحاصل حق بات یہ ہی ہے واللہ اعلم کہ جب احادیث ونصوص آپس میں ایک دوسرے سے متعارض ہیں تو ان میں توفیق کی صورت میں عام قاعدوں کے مطابق یہ ہوگی کہ قولی حدیث یعنی حدیث حضرت ابو ہریرہؓ کو ترجیح دے کر یہ کہا گیا ہے کہ بلا عذر میت کو مسجد میں داخل کیا جائے تو ثواب نہیں ہے ولانہ بنی الخ اور اس وجہ سے بھی کہ مسجد جماعت تو فرض کی ادائیگی کے لئے بنائی گئی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ اس صورت میں مسجد کے گندہ ہو جانے کا بھی احتمال رہتا ہے۔ ف۔

لہٰذا کسی عذر کے بغیر جنازہ کو مسجد میں لانا مکروہ ہے، اور یہ کراہت ابن الہمامؒ کے قول اور بظاہر عینیؒ کے کلام کے مطابق صرف تنزیہی ہے، وہ بھی ایسی صورت میں کہ عذر نہ ہو، کیونکہ حضرت عائشہؓ نے سعد بن ابی وقاصؓ کی اور مہاجرین وانصار صحابہ کرام نے بغیر کسی اختلاف اور چہ میگوئیوں کے حضرت ابو بکر و عمرؓ کی اور رسول اللہ ﷺ نے بیضاء کے دونوں بیٹوں کی نمازیں مسجد میں پڑھی ہیں اور کسی کی نہیں پڑھی ہے، لہٰذا اسے عذر ہی کی بناء پر ماننا اور کہنا پڑے گا، اور صحابہ کرام نے حضرت عائشہؓ کے کہنے پر کچھ اعتراض کیا وہ اس وجہ سے کہ صرف امہات المومنین کے لئے جنازہ مسجد میں منگوایا گیا ہے حالانکہ صرف مردوں کی نماز باہر

ہی میں ہو سکتی تھی تو گویا ان کے خیال میں یہ کوئی عذر نہ تھا اس لئے کہ اس میں یہ ممکن تھا کہ جنازہ باہر رکھ کر مسجد میں نماز پڑھ دی جاتی، اسی لئے مصنفؒ نے فرمایا ہے کہ وفیما اذا کان الخ اور اس صورت میں جبکہ جنازہ مسجد سے باہر ہو اور نمازی اندر ہوں تو اس میں مشائخ کا اختلاف ہے۔ف۔اس میں بھی دو صورتیں ممکن ہیں (۱) امام اور تمام نمازی مسجد کے اندر ہوں (۲) یہ امام اور کچھ افراد بھی مسجد سے باہر ہوں، تو خلاصہ میں دونوں صورتوں میں قول مختار کراہت ہی کا بتلایا ہے۔ھ۔ف۔اور شاید کہ آثار صحابہ میں یہ صورت مکروہ نہ ہو، چنانچہ حضرت عروہ بن الزبیرؓ کا قول اسی صورت پر محمول ہے یعنی لوگ مسجد ہی میں سے نماز پڑھ دیتے کہ اس کے لئے نکلنا کوئی ضروری نہ تھا جیسا کہ ابن الہمامؒ نے تاویل کی ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ ممانعت کی حدیث تو صریح نص قولی ہے، اگرچہ اس کے مقابلہ اور معارضہ میں چند افعال ایسے بھی پیش کئے گئے ہیں جن میں جواز کا ثبوت موجود ہے، اس لئے نص پر ہمارا عمل اس وقت ہوگا جبکہ کوئی عذر نہ ہو، اس بناء پر یہ کراہت تنزیہی ہوگی، اور مسجد کے اندر پڑھنے کے افعال کو حجت میں اس وقت پیش کریں گے جبکہ کوئی عذر موجود اور متحقق تھا، اس بناء پر ان احادیث میں اتفاق پایا گیا اور آپس میں کوئی تضاد باقی نہ رہا، بخلاف شوافعؒ کے قول کے کہ وہ بغیر عذر کے بھی جائز فرماتے ہیں کہ ان کے قول کی بناء پر حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث کو چھوڑنا ہی لازم آتا ہے، اور ایسا کرنا حدیث کے ثابت ہو جانے کے بعد درست اور جائز نہیں ہے، اگر کوئی یہ کہے کہ عذر کا دعوی اس جگہ کس طرح ثابت ہوا تو یہ جواب ہوگا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی ممانعت کی حدیث کی بناء پر کیونکہ صحابہ کرامؓ سے یہ ممکن نہیں ہے کہ نبی کا حکم پائے جانے کے بعد وہ اس کی مخالفت نہیں کرسکتے تھے، الا بعذر یعنی عذر کی بناء پر تو ممکن تھا، اور یہ ظاہر ہے، واللہ تعالی اعلم بالصواب۔م۔

ومن استهل بعد الولادة سمي وغسل وصلي عليه لقوله ﷺ اذا استهل المولود صلي عليه وان لم يستهل لم يصل عليه ولان الاستهلال دلالة الحيوة فتحقق في حقه سنة الموتى ومن لم يستهل ادرج في خرقة كرامة لبني آدم ولم يصل عليه لمارويناه ويغسل في غير الظاهر من الرواية لانه نفس من وجه وهو المختار.

ترجمہ:-اور جو بچہ اپنی پیدائش کے وقت رونے کی آواز نکالے (اور مرجائے) تو اس کا نام رکھ کر غسل دیا جائے اور اس کی نماز بھی پڑھی جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو بچہ چلائے اس کی نماز پڑھی جائے اور اگر نہ چلائے تو اس کی نماز نہ پڑھی جائے، اور اس وجہ سے بھی کہ اس کا چلانا اس کی حیات کی علامت ہے، لہذا اس کے حق میں مردوں کے سارے حقوق ثابت ہوں گے، اور جو نہ چلائے اسے کسی کپڑے میں لپیٹ دیا جائے، بنی آدم کی شرافت کا خیال رکھتے ہوئے، اور اس کی نماز بھی نہیں پڑھی جائے اس روایت کی بناء پر جو ہم نے بیان کردی ہے، اور غیر ظاہر الروایت کے مطابق اسے غسل دیا جائے، کیونکہ ایک اعتبار سے کسی حد تک وہ بھی ایک نفس ہے، یہی قول مختار ہے۔

توضیح:-بچہ کی نماز، حدیث سے دلیل، بے جان بچہ پیدا ہوا، اس کا کفن، اور اس کا غسل

ومن استهل بعد الولادة سمي وغسل وصلي عليه لقوله ﷺ اذا استهل المولود......الخ

جس بچہ نے ولادت کے بعد رونے کی آواز نکالی تو اس کا نام رکھا جائے اور اسے غسل دیا جائے، اور اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے۔ف۔اگرچہ رونے کی آواز کے ساتھ ہی وہ مرجائے، اس استہلال سے مراد ہے کوئی ایسی بات جس سے اس کی زندگی اور جاندار ہونے کا پتہ چلتا ہو، جیسے کسی بھی عضو بدن کا حرکت کرنا، یا رونے کی آواز وغیرہ، ان اعضاء میں آدھے سے زائد کا زندہ نکلنا معتبر ہے۔مفع۔البدائع۔المحیط۔

لقوله ﷺ اذا استهل المولود صلي عليه وان لم يستهل يصل عليه......الخ

رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ بچہ نے اگر استہلال کیا تو اس کی نماز پڑھی جائے اور اگر استہلال نہیں کیا تو اس

کی نماز نہیں پڑھی جائے۔ف۔ حضرت جابرؓ کی اصل حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ بچہ کی نماز نہین پڑھی جائے گی اور نہ وہ کسی کا وارث ہوگا اور نہ کوئی اس کا وارث ہوگا، یہانتک کہ وہ استہلال کرے، یعنی آواز سے رولے، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اس کی روایت کی ہے، ترمذی نے آخر میں یہ بھی کہا ہے کہ اصح قول یہ ہے کہ یہ حدیث موقوف ہے، یعنی یہ قول خود حضرت جابرؓ کا ہے، اور حضرت علیؓ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ سقط نا مکمل بچہ کی نماز نہیں ہے یہانتک کہ وہ استہلال کرے۔الخ۔ ابن عدی نے اس کی روایت کی ہے، اور مغیرہ بن شعبہؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ جنازے کے پیچھے سوار اور پیدل سب برابر ہیں، اور بچہ کی نماز پڑھی جائے، اس کی روایت ترمذی، احمد اور نسائیؒ نے کی ہے۔

واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے صاجزادے ابراہیم جو حضرت ماریہ قبطیہ کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے ان کے بارے میں حدیث میں ہے کہ اگر وہ زندہ رہ جاتے تو صدیق نبی ہوتے اور کوئی قبطی کبھی غلام نہ بنایا جاتا اور جنت میں اس کی دودھ پلائی ہوگی، جیسا کہ اس کی روایت ابن ماجہ نے ابن عباسؓ سے کی ہے، اور وہ سولہ ماہ کے ہو کر انتقال کر گئے، پھر صحیح حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ ان صاجزادہ کے انتقال پر روئے، پھر ان کی نماز کے بارے میں روایتیں مختلف ہیں بعض میں ہے کہ ان کی نماز پڑھی اور بعض میں اس کے برعکس ہے کہ نہیں پڑھی، لیکن بیہقی اور نوویؒ نے پڑھنے کی روایتوں کو اصح قرار دیا ہے، جو صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے مروی ہیں۔مف۔ ابن المنذرؒ نے کہا ہے کہ نابالغ کی نماز پڑھے جانے کے بارے میں تمام فقہاء کا اجماع ہے۔ مع۔

ولان الاستهلال دلالة الحيوة فتحقق فى حقه سنة الموتى ومن لم يستهل ادرج......الخ

اور نام رکھنے غسل دینے اور نماز پڑھنے کو لازم کہنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ استہلال کرنا یعنی علامت زندگی کا پایا جانا زندگی کی دلیل ہے، اس لئے مردوں کا جو حکم اور طریقہ اس کے حق میں بھی متحقق ہوگا **ومن لم يستهل الخ** اور جو بچہ نہیں رہا۔ف۔ یعنی اس میں زندگی کی کوئی علامت نہیں پائی گئی **ادرج الخ** اسے صرف ایک ٹکڑے میں لپیٹ دیا جائے: ف۔ یعنی کفن کے طور پر، **كرامة الخ** انسان اور انسانیت کے اعزاز و اکرام کے طور پر، **ولم يصل الخ** اور اس کی نماز نہیں پڑھی جائے گی **لما روينا الخ** اس حدیث کی بناء پر جو ہم نے روایت کردی ہے۔ف۔ یعنی جبتک مولود استہلال نہ کرے تو اس کی نماز نہیں ہے **ويغسل الخ** لیکن غیر ظاہر الروایۃ میں اسے غسل دیا جائے۔ف۔ یہ قول نوادر میں ابو یوسفؒ سے مروی ہے، اور طحاویؒ کا قول مختار ہے **لانه نفس الخ** کیونکہ یہ بھی ایک حد تک نفس ہے۔ف۔ اگرچہ۔ دوسری وجہ بے جان ہونے کی بناء پر اسی کی نماز لازم نہیں کی گئی ہے، یہی قول مختار ہے۔ف۔ اس کی تفصیل کی بناء پر دونوں صورتوں پر ہمارا عمل ہوتا ہے اسی لئے ہم نے ظاہر الروایۃ کے خلاف نوادر کی اس روایت کو ترجیح دی۔ اگرچہ بچہ پورا نہ بنا ہو تو بھی قول مختار یہ ہے کہ غسل دے کر اسے کپڑے میں لپیٹ کر دفن کردیا جائے۔مف۔ اور وہ حشر میں بھی اٹھایا جائے گا۔ الظہیر یہ۔ یہی قول ہمارا اور شوافعؒ کا بھی ہے۔ مع۔ اور بندہ مترجم نے اس آیت پاک اللّٰہُ یَعْلَمُ مَا تَحْمِلُ کُلُّ اُنْثٰی کی تفسیر میں کافی وضاحت سے لکھا ہے۔ م۔

واذا سبى صبى مع احد ابويه ومات لم يصل عليه لانه تبع لهما الا ان يقربا لاسلام وهو يعقل لانه صح اسلامه استحسانا اويسلم احد ابويه لانه يتبع خير الابوين دينا وان لم يسب معه احد ابويه صلى عليه لانه ظهرت تبعية الدار فحكم بالاسلام كما فى اللقيط.

ترجمہ:- اور جب کوئی بچہ اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ قید کیا جائے اور مر جائے تو اس کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ وہ اس وقت تک اپنے والدین کے تابع تھا، البتہ اگر اسے عقل و شعور ہو اور وہ خود اسلام لانے کا اقرار کرتا ہو تو اس کی نماز پڑھی جائے گی، اس لئے کہ اس صورت میں استحسانا اس کا اسلام صحیح مانا جائے گا، یہ کہ اس کے والدین میں سے کسی ایک نے اسلام قبول کر لیا ہو، کیونکہ خیر الابوین دینا (دونوں میں سے جس کا دین بہتر ہو) اس کے ماتحت کر دیا جائے گا، اور اگر اس کے ساتھ اس کے والدین میں سے کوئی ایک بھی قید نہ کیا گیا ہو تو بھی اس کی نماز پڑھی جائے گی، کیونکہ اس کے حق میں دار السلام کا تابع ہونا ظاہر ہو گیا، اس بناء پر اس پر اسلام کا حکم لگایا جائے گا، جیسا کہ گرے پڑے لاوارث بچہ پر حکم لگایا جاتا ہے۔

توضیح:- جس لڑکے کے ماں باپ میں سے ایک بھی اسلام لے آیا ہو اور وہ بچہ مر گیا ہو، یا لاوارث پڑا ہوا مرا بچہ ملا ہو

واذا سبی صبی مع احد ابویہ ومات لم علیہ لانہ تبع لھما......الخ

مطلب واضح ہے لانہ تبع الخ کیونکہ وہ اپنے والدین کے تابع ہے۔ف۔ یعنی جو حکم والدین کا ہے، ان والدین کے تابع ہونے کی وجہ سے اس بچہ کا بھی وہم حکم ہوگا، الا ان الخ مگر یہ کہ وہ لڑکا باشعور ہو اور اپنے اسلام کا اقرار کرتا ہو لانہ صح الخ کیونکہ استحسانا اس کا اسلام صحیح ہو گیا تھا او یسلم الخ یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک مسلمان ہو گیا ہو۔ف۔ اس کے بعد وہ بچہ مر گیا ہو لانہ یتبع الخ کیونکہ والدین میں سے جس کسی کا بھی دین بہتر ہوتا ہے بچہ کو اسی کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ف۔ اس بناء پر موجودہ صورت میں مسلمان ہو جانے والے والدین میں کسی کی بھی ماتحتی میں مسلمان قرار دیا جائے گا اور اس کی نماز پڑھی جائیگی۔

واضح ہو کہ وہ بقول مصنفؒ والدین کے تابع ہے کیونکہ حدیث میں ہے کہ کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ الخ، یعنی ہر بچہ فطرت اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسکو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنالیتے ہیں، یہانتک کہ اس کی زبان ادا کرے خواہ ایمان یا کفر، اس سے معلوم ہوا کہ جبتک بچہ ہے اپنے والدین کے تابع ہے، پھر وہ جب زبان سے ادا کرنے کے قابل ہوگا اس وقت وہ خود ذمہ دار ہوگا، یعنی یا تو اسلام کا کلمہ توحید ادا کرے یا کفر و شرک کا عقیدہ ظاہر کرے اس لئے اگر وہ اسلام لے آیا ہو تو اس کے لئے اس کا سمجھدار ہونا ضروری اور شرط ہے یعنی اسلام کی صفت سمجھتا ہو، اور حدیث میں جو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے اور وہی رب عز و جل اور محمد ﷺ اس کے رسول برحق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے سارے انبیاء و رسل اور ساری کتابیں اور فرشتے اور قیامت اور مردوں کا زندہ ہونا اور جنت و دوزخ سب چیزیں برحق ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقررہ کردہ اچھی اور بری تقدیر سب حق پر ہے، اس سے معلوم ہوا کہ صرف لاالہ الا اللہ بغیر سمجھے ہوئے کہہ لینا یا صرف اسی کے مطلب کو سمجھ لینا معتبر نہیں ہے، جب تک کہ سارا اقرار سمجھ کے ساتھ نہ ہو، اسی بناء پر کہا گیا ہے کہ کسی عورت سے نکاح کر لینے اس سے ایمان کے متعلق سوال کر لینے پر ان مذکورہ باتوں میں سے کسی میں اس سے توقف ظاہر ہوا تو وہ مسلمان نہیں اور نکاح بھی باطل ہے، اس جملہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ عورت اس مفہوم فصاحت اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کرنے میں توقف کرے، کیونکہ ایسا تو اکثر جاہل عوام ادا نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اس کی مراد یہ ہے کہ اگر اس سے یہ دریافت کیا جائے کہ قیامت ہوگی اور مردے زندہ کئے جائیں گے تو کہے ہاں، بیشک، پھر اس سے جب یہ پوچھا جائے کہ حساب و کتاب کے بعد جنت یا دوزخ میں رہنا ہوگا تو بھی کہے کہ ہاں، بیشک۔ اسی طرح ایمان کی کسی بات میں بھی اسے تردد نہ ہو، اور وہ ان تمام کا خود بھی اعتقاد کرے، وہ یہ نہ کہے کہ ہمارے بزرگ اور خاندان والے ایسا کہتے تھے کہ قیامت و جنت و دوزخ ہے اور ہم بھی ان کے کہنے کی بناء پر کہتے ہیں، یا یوں کہے کہ ہمیں کیا معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہیں یا نہیں یا ہوں گی یا نہیں، اگر ایسا ہے تو وہ کافر ہے۔ مفع۔

اگر کسی کو اتنا علم نہ ہوا کہ قرآن وحدیث کے حوالہ سے عقائد کو جان لے، مگر اس نے کسی سے یہ پوچھ کر کہ قرآن میں جنت ودوزخ و قیامت وغیرہ سب حق ہیں خود یقین کر لیا کہ یہ سب برحق ہیں تو وہ مومن ہے، اگرچہ وہ اس بات کا ضرور گنہگار رہے گا کہ اس نے اس کی کوشش چھوڑ دی کہ قرآن وحدیث سے ان باتوں کو معلوم کرتا، یہ بات صرف عقائد کے بارے میں واجب ہیں، لیکن عمل کے لئے جزوی مسائل کے بارے میں اجتہاد کے لئے اگر کسی قوم کے ہر شخص نے سیکھنا چھوڑ دیا تو سب گنہگار ہوں گے، اور اگر کسی نے بھی سیکھ لیا تو سب گنہگار ہونے سے بچ گئے، جیسا کہ شرح العقائد وغیرہ میں ہے۔م۔ پھر نابالغ کے سلسلہ کے یہ احکام اسی صورت میں ہوں گے جبکہ ان کے والدین یا ان میں سے کوئی ایک بھی اس کے ساتھ قید ہوا ہو، وان لم یسب الخ

اور بچہ کے ساتھ ان کے ماں باپ میں سے کوئی بھی قید نہ ہوا ہو۔ ف۔ بلکہ مجاہدین نے اسے کہیں پایا ہو اور قدرتی طور پر بچہ کسی طرح مر گیا ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

لانه ظهرت تبعية الدار فحكم بالاسلام كما في اللقيط......الخ

چونکہ اس کے حق میں دار السلام کا تابع ہونا ظاہر ہو گیا، اس لئے اس کے اسلام کا حکم دیا جائے گا، جیسے بڑے ہوئے بچہ میں ہوتا ہے۔ ف۔ یعنی کسی شخص نے جنگل وغیرہ میں کہیں ایک لڑکا پایا اور اس کا کوئی والی یا وارث معلوم نہ ہوتا ہو، تو اگر یہ دار السلام کے حلقہ میں ملا ہو تو اسے دار اور ملک کے تابع مان کر مسلمان کہدیا جائے گا۔ م۔

واضح ہو کہ کسی کے تابع ہونے کی کئی صورتیں ہوتی ہیں (۱) قوی تبعیت اس میں والدین کی تبعیت ہے، یہاںتک کہ اگر وہ دونوں ہی کافر ہوں تو نابالغ رہنے تک وہ ان کے تابع رہے گا، اور اگر دونوں میں سے ایک ہندو اور دوسرا نصرانی ہو تو وہ نصرانی کے تابع رہے گا، اور اگر ماں نصرانیہ اور باپ مسلم ہو تو مسلمان کے تابع ہوگا، یہ تفصیل دنیاوی احکام کے بارے میں ہیں، اور آخرت کے بارے میں امام ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہی علم ہے کہ ان کا کیا حکم ہوگا، یعنی ہم ان کے دوزخی ہونے کا قطعی حکم نہیں دیتے، مگر امام محمدؒ نے فرمایا ہے کہ میں تو جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ بے گناہ کسی کو عذاب نہیں دے گا، اسی لئے کہا گیا ہے کہ ایسے بچے جنت والوں کے خدمت گار کی حیثیت سے جنت میں رہیں گے، اور مسلمانوں کے بچے تو بالاجماع وہ سب جنتی ہیں اور اس کے بارے میں بہت سی حدیثیں موجود ہیں، اور اب دوسری تبعیت یعنی جبکہ ماں باپ میں سے کسی کی یا ایک کی تبعیت نہ ہو تو اس کے بعد ہدایہ میں تبعیت دار یعنی علامت اسلام کا لفظ لکھا ہے، اور محیط میں لکھا ہے کہ جب بچہ کے والدین میں سے کوئی نہ ہو تو وہ جس کے ہاتھ میں ہوگا اسی کا تابع اسے مانا جائے گا، اور جب کسی کے ہاتھ میں بھی نہ ہو تو وہ ملک کے تابع ہوگا، یہی اولی ہے، کیونکہ جب کفرستان میں جہاد کرنے پر مال غنیمت میں کوئی بچہ ملے اور کسی مجاہد کے حصہ میں آئے تو وہ اس کے اپنے بچہ کے حکم میں ہوگا، اسی بناء پر اگر وہ مر جائے تو اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔ الفتح۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ دار السلام کے تابع ہونے کی بناء پر اس کو مسلمان ہی ٹھہرایا جائے گا۔ م۔

واذا مات الكافر وله ولي مسلم فانه يغسله ويكفنه ويدفنه بذلك امر عليؓ في حق ابيه ابي طالب لكن يغسل غسل الثوب النجس ويلف في خرقة وتحفر حفيرة من غير مراعاة سنة التكفين واللحد ولا يوضع فيه بل يلقى.

ترجمہ:- اور جب کوئی ایسا کافر مر جائے جس کا ولی کوئی مسلم ہو وہ اسے غسل دے گا اور اسے کفن دے گا اور اسے دفن کر دے گا، حضرت علیؓ کو ان کے والد کے بارے میں ایسا ہی حکم دیا گیا تھا، البتہ اسی طرح غسل دیا جائے گا جس طرح کسی ناپاک کپڑے کو دھویا جاتا ہے، اور کسی کپڑے میں لپیٹ کر کوئی گڈھا کھود کر دفن کر دیا جائے گا، ان کاموں کے لئے کوئی بھی مسنون طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا، جو کہ کفن دینے اور قبر میں ڈالنے کے موقع پر کیا جاتا ہے اور اہتمام کے ساتھ قبر میں رکھا بھی نہیں جائے گا بلکہ یوں ہی ڈال دیا جائے گا۔

توضیح:- میت کافر اور ولی مسلمان ہو، میت مسلمان لیکن اس کے قریب رشتہ دار کافر ہوں

واذا مات الكافر وله ولي مسلم فانه يغسله ويكفنه ويدفنه......الخ

اور جب کوئی کافر مرا۔ ف۔ ایسا نہ ہو کہ وہ پہلے مسلمان ہو مگر اب مرتد ہو کر کافر ہوا ہو وله الخ اور اس کافر کا کوئی مسلمان وارث ہو۔ ف۔ یعنی ایسا رشتہ دار ہو کہ اگر وہ کافر مسلمان رہتا تو یہ رشتہ دار اس کا ولی اور وارث ہوتا، ایسی صورت میں یہ دیکھنا ہوگا کہ اس میت کافر کا کوئی اور بھی قریبی رشتہ دار موجود ہے یا نہیں، اگر ہو تو اس مسلمان رشتہ دار کو چاہئے کہ اس مردے کو ان کافر رشتہ داروں کے حوالہ کر کے چھوڑ دے کہ وہ جو چاہیں کریں، اور دور سے چاہے جنازہ کے پیچھے ہو جائے، اور اگر کوئی دوسرا قریبی

رشتہ دار، متولی نہ ہو تو وہ مسلمان رشتہ دار اس کافر میت کو دھو کر کفن میں لپیٹ کر گاڑ دے۔

بذلك امر علیؓ فی حق ابیه ابی طالب لکن یغسل غسل الثوب النجس......الخ

کیونکہ حضرت علیؓ کو ان کے والد (ابو طالب) کے بارے میں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ف۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائیؒ نے حضرت علیؓ سے روایت کی ہے کہ جب ابو طالب نے وفات پائی تو میں رسول اللہ ﷺ کے پاس گیا اور یہ عرض کیا کہ آپ کا بوڑھا چچا گمراہی کی حالت میں مر گیا ہے (یہ سن کر آپ روئے، ابن السعد نے طبقات میں کہا ہے) فرمایا کہ جا کر دھو کر کفن دے کر ابن سعد) اپنے والد کو گاڑ دو، پھر کوئی بات کئے بغیر میرے پاس آؤ، چنانچہ میں انہیں دفن کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ غسل کر لوں چنانچہ میں نے غسل کیا اور آپ نے میرے لئے دعا خیر فرمائی، اس کی روایت ابوداؤد، نسائی، احمد، اسحٰق، ابن ابی شیبہ، بزار اور ابو یعلی نے کی ہے، ابو طالب کا نام عبد مناف تھا اور نبوت کے دسویں شوال کے مہینہ میں انتقال کیا، اور ان سے تین دنوں کے بعد حضرت خدیجہؓ نے وفات پائی۔ لیلۃ المعراج میں پانچوں نمازوں کے فرض ہونے سے پہلے یہ حادثات ہوئے۔ معف۔ ابن کثیرؒ۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ غسل و کفن اور دفن کرے **لکن یغسل الخ** لیکن اس طرح غسل دیا جائے کہ جس طرح ناپاک کپڑے دھوئے جاتے ہیں، اس دھونے میں مسنون طریقہ سے کفن میں لپیٹے اور لحد کئے بغیر ایک گڈھا کھود کر اس میں ڈال دیا جائے۔

ولا یوضع فیه بل یلقی......الخ

لحد میں نہ رکھا جائے بلکہ صرف گڈھے میں ڈال دیا جائے۔ف۔ اور اگر اسلام چھوڑ کر بد دین اور مرتد ہو گیا ہو اس وقت جس مذہب کو قبول کیا ہو اور جن لوگوں کے پاس گیا ہو ان لوگوں کے حوالہ اسے نہ کیا جائے، بلکہ ایک گڈھا کھود کر اس میں کتے کی طرح دھکیل دیا جائے، الخلاصہ۔ع۔ف۔ اور اگر کوئی ایسا شخص مرا کہ وہ خود تو مسلمان ہو چکا ہو لیکن اس کا باپ اور دوسرے تمام رشتہ دار کافر ہوں تو چاہئے کہ وہ ان کو نہ دیا جائے بلکہ مسلمان حضرت اس کی تجہیز و تکفین کریں جیسا کہ حدیث میں ہے کہ یہودی کا ایک جوان لڑکا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا جب وہ بیمار ہوا تو رسول اللہ ﷺ اس کی عیادت کو تشریف لے گئے دیکھا کہ اس کا آخری وقت ہے، اسے فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان لے آؤ، اس وقت اس کے باپ نے اس سے کہا کہ تم ان ابو القاسم کی بات مان لو یعنی محمد ﷺ کا کہا مان کر کلمہ پڑھ لو، فوراً اس نے صدق دل سے کلمہ شہادت پڑھا اور انتقال کر گیا، تب رسول اللہ ﷺ وہاں سے یہ فرماتے ہوئے باہر تشریف لائے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لئے حمد و ثناء ہے جس نے اس نوجوان کو میرے وسیلہ سے جہنم کی آگ سے نجات دی ہے، اور اپنے اصحاب سے فرمایا کہ تم اس کے کام انجام دو، اور اسے یہودیوں کے حوالہ نہیں کیا، مبسوط ذخیرہ وغیرہ نے اس کی تصریح کی ہے۔ معف۔

مسلمان کی قبر میں اسے اتارنے کے لئے اس کا کوئی کافر رشتہ دار اترے تو یہ بات مکروہ ہے، کیونکہ لعنت کی جگہ ہے، اس لئے مسلمان کی قبر کو اس سے پاک رکھنا چاہئے۔ المبسوط والمحیط۔ معف۔ مرا ہوا کافر غسل کے بعد بھی پاک نہیں ہوتا ہے یہانتک کہ اگر وہ تھوڑے پانی میں گر جائے تو وہ پانی نجس ہو جائے گا، اسے تو صرف اس خیال سے دھویا جاتا ہے کہ یہ انسان کے لئے ایک امتیازی طریقہ ہے۔ الحجوبی۔

اگر مسلمانوں اور کافروں کے مردے خلط ملط ہو گئے ہوں مگر ان میں سے مسلمانوں کو پہچاننا ممکن ہو تو ان کو غسل دینا ہوگا اور نماز پڑھنی ہوگی۔ البدائع۔ اور اگر کسی طرح ان کی پہچان نہ ہو سکتی ہو اور مسلمانوں کی زیادتی ہو تو ان کو غسل دیا جائے اور ان کی نماز پڑھی جائے انہیں مسلمان گمان کرتے ہوئے، اور اگر کافروں کی زیادتی ہو تو انہیں صرف غسل دیا جائے مگر نماز نہ پڑھی جائے۔ البدائع وغیرہ۔ لیکن امام مالک و شافعیؒ اور احمدؒ کے نزدیک مسلمانوں کی نیت کرتے ہوئے ان کی نماز بھی پڑھی جائے، اور اگر دونوں برابر ہوں تو نماز پڑھنے کے بارے میں دو روایتیں ہیں، اگر مغرب کے وقت جنازہ آئے تو بالاتفاق مغرب کی فرض نماز جنازہ سے

پہلے پڑھی جائے، نماز عید کی طرح، لیکن دو رکعت سنت یا عید کا خطبہ ہو تو اس سے پہلے جنازہ کی نماز پڑھی جائے، لیکن ایک قول میں بعد میں پڑھنے کا حکم ہے، اگر جمعہ کے دن صبح سویرے جنازہ کی تجہیز و تکفین ہو چکی ہو تو جمعہ کی نماز تک اس کی نماز کو مؤخر کرنا مکروہ ہے، البتہ اگر اس کے دفن میں مشغول ہونے سے جمعہ کی نماز فوت ہونے کا خوف ہو تو تاخیر کرنی چاہئے، نوافل پڑھنے کے مقابلہ میں جنازہ کا ساتھ دینا افضل ہے، اس صورت میں کہ اس پر پڑوسی ہونے کا حق ہو یا رشتہ داری ہو یا مردہ نیک صالح ہو یا عالم ہو ورنہ نوافل میں مشغول ہونا افضل ہے۔

امام شافعیؒ کے نزدیک نماز جنازہ ہر وقت میں جائز ہے لیکن ہمارے اور ثوری اور احمد و اسحٰقؒ کے نزدیک آفتاب نکلتے وقت، زوال کے وقت اور غروب آفتاب کے وقت مکروہ ہے، جیسا کہ ترمذیؒ نے صحیح سندوں سے ان اوقات میں عقبہ بن عامرؓ سے ممانعت کی روایت کی ہے، اس کے باوجود اگر اس کی نماز ان اوقات میں پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی، اور مالکؒ نے صبح کی نماز کے بعد جب تک بالکل سپیدی نہ ہو اور عصر کے بعد جب تک زردی نہ ہو پڑھنے کو جائز کہا ہے۔ مع۔ یہانتک موت کی حالت اور موت کے بعد غسل اور تکفین اور نماز کے مسائل سے فراغت ہو جانے کے بعد اب جنازہ کو اٹھا کر قبرستان تک لے جانے کے مسائل بیان کئے جا رہے ہیں، کیونکہ نماز کا جائز ہونا تو میت کے اپنے احاطہ میں بھی ممکن تھا، یہانتک کہ اگر اسی جگہ نماز نہیں پڑھی تو جنازہ اٹھاتے وقت مندرجہ ذیل طریقوں کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ م۔

فصل فی حمل الجنازة

واذا حملوا الميت على سريره اخذوا بقوائمه الاربع بذلك وردت السنة وفيه تكثير الجماعة وزيادة الاكرام والصيانة وقال الشافعي السنة ان يحملها رجلان يضعها السابق على اصل عنقه والثاني على صدره لان جنازة سعدؓ بن معاذ هكذا حملت قلنا كان ذلك لازدحام الملائكة عليه.

ترجمہ:- جنازہ کو جب لوگ تابوت پر رکھ دیں تو اس کے چاروں پائے پکڑ کر لے چلیں اسی طرح سے سنت و روایت میں آیا ہے، اور اس طرح جماعت کو زیادہ کرنا مقصود ہے نیز اس جنازہ کی زیادتی تعظیم ہے، اور حفاظت بھی ہے، اور امام شافعیؒ نے فرمایا ہے کہ اسے دو آدمی اس طرح اٹھائیں کہ اگلا آدمی اپنی گردن کے پچھلے حصہ پر اٹھائے اور دوسرا پچھلا شخص اسے اپنے سینہ پر رکھے، کیونکہ حضرت سعد بن معاذؓ کا جنازہ اسی طرح اٹھایا گیا تھا، ہم جواب میں یہ کہتے ہیں کہ وہ تو فرشتے کی بھیڑ ہو جانے کی وجہ سے کیا گیا تھا۔

توضیح:- فصل، جنازہ کو اٹھا کر لے جانے کا بیان، جنازہ اٹھانے کی کیفیت

فصل فى حمل الجنازة. واذا حملوا الميت على سريره اخذوا بقوائمه الاربع......الخ

جب لوگ جنازہ کو اٹھائیں۔ ف۔ اس سے مرد مراد ہیں عورتیں مراد نہیں ہیں۔ ۃ۔ على سريره الخ اس کے تخت پر۔ ف۔ یا اس کے مانند چارپائی وغیرہ ہو، اخذوا الخ تو چارپائی کے چاروں پائے پکڑے ہوں۔ ف۔ اس وقت جبکہ چار آدمی موجود ہوں تو ہر ایک اس کا ایک ایک پایہ پکڑے۔ م۔ اکثر علماء کا یہی قول ہے۔ ع۔ بذلك الخ اسی طریقہ سے روایتوں میں آیا ہے وفيه تكثير الخ اور اس میں جماعت کی زیادتی کرنی ہے۔ ف۔ چنانچہ اگر ان کے علاوہ بقیہ افراد واپس بھی آجائیں پھر بھی چار باقی رہ جائیں گے تو بھی ایک جماعت باقی رہے گی، وزيادة الخ اور میت کے اعزاز و اکرام میں زیادتی ہے والصيانة الخ اور میت کی گرنے پڑنے کے خوف سے حفاظت ہے۔ ف۔ اسی لئے سرہانے کی طرف سے بیچ میں ایک شخص نے اور پاؤں کی طرف بیچ میں ایک نے پکڑا تو یہ ہمارے نزدیک مکروہ ہے۔ شرح الطحاوی۔ ۃ۔

وقال الشافعي السنة ان يحملها رجلان يضعها السابق على اصل عنقه والثاني على صدره......الخ

اور شافعیؒ نے کہا ہے کہ سنت یہ ہے کہ جنازہ کو صرف دو ہی آدمی اس طرح اٹھائیں کہ سرہانے کا آدمی جنازہ کو اپنی گردن کی جڑ پر رکھے۔ف۔اور پیٹھ مردے کی طرف اور منہ راستہ کی طرف کرے،اور دوسرا شخص اسے اپنے سینہ پر رکھے۔ف۔اور منہ جنازہ کی طرف ہو، یہانتک کہ پاؤں کی طرف کا حصہ اس کے دونوں کاندھوں کے درمیان سینہ سے ملا ہوا ہو۔

لان جنازة سعد بن معاذ هكذا حملت قلنا كان ذلك لازدحام الملائكة عليه.

اس وجہ سے کہ حضرت سعد بن معاذؓ کا جنازہ اسی طرح اٹھایا گیا تھا۔قلنا الخ ہم جواب دیتے ہیں کہ یہ صورت اس لئے ہوئی تھی کہ سعد بن معاذؓ کے جنازہ پر ملائکہ علیہم السلام کی بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ف۔یہانتک کہ رسول اللہ ﷺ اپنے پنجوں کے بل چلتے تھے،اس جگہ یہ اعتراض ہوتا ہے کہ اتنی زیادہ بھیڑ تو عام انسانوں کو معلوم اور محسوس تو نہیں ہوتی تھی،اور چلنے میں رکاوٹ بھی نہ تھی،البتہ یہ بات تھی کہ فرشتوں کے اٹھالینے کی وجہ سے صرف دو آدمیوں کا اٹھالینا کافی ہوا تھا(ورنہ عام حالات میں دو شخص کا لے جانا انتہائی دشوار تھا)۔ف۔بلکہ کافی اور مکمل جواب یہ ہے کہ صرف دو آدمیوں کا اس طرح جنازہ کو لے چلنے کو ابن سعد نے طبقات میں ضعیف سندوں سے روایت کیا ہے،یہانتک کہ امام نوویؒ نے کہا ہے کہ اس بارے میں کوئی نص ثابت نہیں ہے،اور بیہقیؒ نے بھی اسے ضعیف کہا ہے،البتہ آثار میں ثبوت ہے،جیساکہ طبرانیؒ نے حضرت جابر و سید بن حضیرؓ کا اور بیہقیؒ نے سعد بن وقاصؓ کا جنازہ بین العمودین اٹھائے جانے کی روایت کی ہے اور حضرت عثمان وابن الزبیرؓ سے بھی اسی طرح جنازہ اٹھانے کے آثار روایت کئے ہیں،مگر حق یہ ہے کہ بین العمودین کے یہ معنی ہو سکتے ہیں کہ سر اور پٹی کا ملان جس جگہ ہوتا ہے اسے پکڑا،یا چاروں طرف سے ہر پٹی کو درمیان سے پکڑا،یہی معنی مراد ہونا اس وجہ سے غالب گمان ہے کہ بعض صحابہ کرامؓ سے چاروں طرف اٹھایا جانا بھی مروی ہے،چنانچہ ابو عبیدہؓ نے اپنے والد عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ جو شخص جنازہ کے ساتھ جائے اسے چاہئے کہ تخت کے چاروں کونوں کو اٹھائے،کیونکہ یہ سنت ہے،ابن ماجہ،عبد الرزاق،طیالسی اور بیہقیؒ نے اس کی روایت کی ہے۔

سند کے اعتبار سے اس روایت میں صرف یہ کلام ہے کہ ابو عبیدہؓ نے اپنے والد سے یہ روایت نہیں سنی ہے،مگر ایسا ہونے سے بھی ہمارے نزدیک کوئی نقصان نہیں ہے،لہٰذا اسناد صحیح ہے،اور ابن ابی شیبہؒ نے اس کے مانند ابو الدرداءؓ سے روایت کی ہے، اور ابن الجوزیؒ نے علل میں اسی کے مانند ثوبان وانسؓ سے ضعیف اسناد سے روایت کی ہے،اور طبرانی نے اوسط میں حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ کی حدیث روایت کی ہے کہ جو جنازہ کے چاروں کنارے اٹھائے گا اللہ اس کے چالیس بڑے گناہ بخش دے گا، ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاقؒ نے ابن عمرؓ سے روایت کی کہ انہوں نے جنازہ کے چاروں کنارے اٹھائے،عبد الرزاق نے سند صحیح سے ابو ہریرہؓ سے روایت کی ہے کہ جس نے جنازہ کے چاروں کنارے اٹھائے تو اس نے اپنا حق ادا کر دیا،حدیث میں ہے کہ جو جنازہ کو چالیس قدم اٹھائے گا اللہ تعالیٰ اس کے چالیس کبیرہ گناہوں کو معاف کردے گا،اسی بناء پر علماء نے کہا ہے چاروں طرف سے دس دس قدم اٹھانا چاہئے،اور محمد بن الحسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے کہ ہم سے حضرت منصور بن المعتمر نے بیان کیا ہے کہ جنازہ کو چاروں طرف سے اٹھانا سنت ہے،اس سے ثابت ہوا کہ بلا اختلاف یہی سنت ہے،اور اگر کچھ صحابہ کرام کے عمل کو اسی پر محمول کیا جائے جو امام شافعیؒ کا قول ہے تو وہ سنت نہ ہوگا،سنت کی مخالفت سے بچنے کے لئے کہا جائے گا کہ کسی مجبوری کی بناء پر ایسا کیا گیا ہوگا،اور آخری حد اس کی یہ ہوگی کہ وہ بیان جواز کے لئے کیا گیا ہے،چنانچہ ہم بھی اس کے جائز ہونے کے قائل ہیں۔م۔مفع۔

معلوم ہونا چاہئے کہ تخت کے پاؤں کو کندھے پر بوجھ کی طرح نہیں رکھنا چاہئے بلکہ ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھائے رکھنا چاہئے، اور کندھے سے ٹیک لگانے میں کوئی حرج نہیں ہے،جیساکہ ابو اللیثؒ کی شرح جامع صغیر میں ہے۔ع۔لیکن شرح الطحاوی میں ہے کہ کندھے پر رکھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ھ۔اور مردہ کو پیٹھ پر یا جانور پر لاد کر لے جانا مکروہ ہے۔فع۔اسی طرح گاڑی پر یا بوجھ کی

طرح سر پر لادنا بھی مکروہ ہوگا۔م۔اگر وہ دو تین برس کا چھوٹا بچہ ہو تو اس بات میں مضائقہ نہیں ہے کہ اسے ایک ہی شخص اپنے ہاتھوں پر اٹھالے اور لوگ باری باری لیتے رہیں، اس طرح اس بات میں بھی مضائقہ نہیں ہے کہ سواری پر سوار ہو کر اسے ہاتھ میں لئے رہیں، البحر۔اسی طرح جنازہ کو لے جاتے وقت اس کا سر آگے کی طرف رکھیں۔المضمرات۔

ويمشون به مسرعين دون الخبب لانه ﷺ حين سئل عنه قال مادون الخبب واذا بلغوا الى قبره يكره ان يجلسوا قبل ان يوضع عن اعناق الرجال لانه قد تقع الحاجة الى التعاون والقيام امكن منه وكيفية الحمل ان تضع مقدم الجنازة على يمينك ثم مؤخرها على يمينك ثم مقدمها على يسارك ثم مؤخرها على يسارك ايثارا للتيامن وهذا في حالة التناوب.

ترجمہ:- اور اسے لوگ لے چلیں تیز تیز مگر دلکی چال نہ ہو (جس سے جنازہ اچھلنے لگے) کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے جب سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ خبب سے کم رفتار ہو، اور لوگ جب اس کی قبر پر پہونچ جائیں تو اسے لوگوں کی گردنوں پر سے اٹھانے سے پہلے بیٹھنا مکروہ ہے، کیونکہ اس وقت بھی کبھی لوگوں کو مدد کی ضرورت پڑسکتی ہے، اور کھڑے رہنے میں زیادہ معاونت و مدد ہو سکتی ہے، اور کندھوں پر جنازہ کو اٹھانے کی کیفیت یہ ہوگی کہ اس کے اگلے حصہ کو پہلے اپنے داہنے کندھے پر پھر پچھلے حصہ کو داہنے کندھے پر پھر اس کے اگلے حصہ کو اپنے بائیں کندھے پر پھر اس کے پچھلے حصہ کو بائیں کندھے پر رکھا جائے، داہنے حصہ کو بائیں حصہ پر ترجیح دیتے ہوئے، یہ اس وقت ہوگا جبکہ لوگ باری باری سے اٹھاتے ہوں۔

توضیح:- جنازہ لے چلنے کی کیفیت، حدیث سے دلیل، جنازہ کے پیچھے سوار ہو کر، دھونی، رونے والی عورت کا ساتھ چلنا، نوحہ کرنا، دامن پھاڑنا، پیٹنا، آنسو بہانا، جنازہ کے واسطے کھڑے ہونا، جنازہ کے پیچھے ذکر و قراءت کرنا، ہنسنا، دنیاوی معاملات کی باتیں کرنا، قبر پر پہونچ کر اسے اتارنے سے پہلے بیٹھنا، جنازہ کے اٹھانے میں ترتیب

ويمشون به مسرعين دون الخبب......الخ

اور اس جنازہ کو تیزی کے ساتھ لے چلیں۔ف۔اس کے مستحب ہونے کے بارے میں فقہاء کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ع۔اور تیزی کی حد یہ ہو کہ تخت پر رکھے ہوئے مردہ کو کوئی حرکت نہ ہو۔التبیین۔اسی لئے کہا ہے دون الخبب تیز چال ہونے کے باوجود خبب کی کیفیت نہ ہو۔ف۔اس طرح یہاں چال کی دو صورتیں ہوئیں، ایک تو یہ کہ تیز چال ہو جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی مرفوع حدیث میں ہے کہ جنازہ لے جاتے وقت قدم تیزی کے ساتھ اٹھاؤ، کیونکہ اگر مردہ نیک ہوگا تو اس طرح جلدی کے ساتھ تم اسے اپنی (بہتر اور پسندیدہ جگہ پر) پہونچادوگے، اور اگر وہ بدکار ہو تو تم اسے جلدی سے اپنی گردن سے اتار دوگے۔ بخاری نے اس کی روایت کی ہے، تیز لے جانا سنت ہے۔التحفہ۔مگر اسی حد تک کہ مردہ میں پھڑکنے کی حرکت نہ ہو۔جوامع الفقہ۔ جمہور کا یہی قول ہے۔ع۔آہستگی بھی جائز ہے، اس میں کوئی چال متعین نہیں کی گئی ہے۔المبسوط۔دوسری بات یہ ہے کہ تیزی کے باوجود خبب نہ ہو۔

لانه ﷺ حين سئل عنه قال مادون الخبب......الخ

کیونکہ جب رسول اللہ ﷺ سے لے جانے کی چال کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا کہ خبب سے کم ہو۔ف۔اس کی روایت ابوداؤد اور ترمذی نے کی ہے لیکن اسناد ضعیف ہے، اور ابن عباسؓ نے حضرت ام المومنین میمونہؓ کے جنازہ کے بارے میں فرمایا کہ تم لوگ نعش کو حرکت اور جھٹکا نہ دو جیسا کہ صحیحین میں ہے، اور ابو موسیٰؓ کی حدیث میں ہے کہ اس طرح جنازہ لے جاتے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جنازہ کو نرمی کے ساتھ لے کر چلنا تم پر لازم ہے، جیسا کہ ابن ابی شیبہؒ نے روایت کی ہے لہٰذا تیزی

کے ساتھ لے جانے والی حدیث اوراس کو جمع کرنے سے یہ نتیجہ نکلا کہ جس قدر تیزی کے ساتھ کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ جس سے لاش کو جھٹکا اور اضطراب نہ ہو، تو وہ خبب سے کم تر چال میں داخل ہے، کیونکہ خبب ایک طرح کی کودتے ہوئے ہرکارہ کی چال ہوتی ہے (دلکی) جس سے خواہ مخواہ میت کو اظطراب ہوگا، اس لئے خبب سے منع کرنے کا مطلب مردہ کو اس قسم کی حرکت سے بچانا ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔

جنازہ کے پیچھے سوار ہو کر چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ پیدل چلنا افضل ہے۔ اور اس کے آگے سوار ہو کر چلنا مکروہ ہے۔ قاضی خان۔ اس لئے پیدل چلنا مکروہ نہیں ہے، دھونی یا خوشبو کی جلتی ہوئی دھونی، اور بین کرنے والی عورت کا پیچھے چلنا مکروہ ہے، اور اگر وہ نہیں مانتی تو جنازہ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے، بین کرنا، گریبان پھاڑنا، بدن کو پیٹنا خواہ گھر کے اندر ہو یا چلتے وقت ہو ہر حال میں مکروہ تحریمی ہے، اور صرف آنسو بہانے میں کوئی حرج نہیں ہے، پھر بھی صبر کرنا افضل ہے، جنازہ کو دیکھ کر کھڑے ہو جانے کی کوئی حقیقت نہیں ہے، اگرچہ نماز کی جگہ بیٹھے ہوں، یہانتک کہ جب اسے اتارا جائے تب نماز کے واسطے اٹھنا چاہئے، یہی صحیح ہے۔ ق۔ ھ۔ جنازہ کے پیچھے خاموش رہنا چاہئے، بلند آواز کے ساتھ ذکر و قراءت قرآن کرنا مکروہ ہے، لیکن آہستگی کے ساتھ جائز ہے۔ ط۔ ق۔ اس موقع پر ہنسنا یا دنیاوی باتیں کرنا بدترین فحش کام ہے۔ م۔

واذا بلغوا الی قبرہ یکرہ ان یجلسوا قبل ان یوضع عن اعناق الرجال......الخ

اور جب اس کی قبر تک پہونچیں تو جنازہ کے اتارنے سے پہلے بیٹھ جانا مکروہ ہے، **لانہ قد الخ** کیونکہ جنازہ کے لئے مدد کی ضرورت پڑ جاتی ہے، اور جب کہ کھڑے رہنے کی صورت میں زیادہ مدد دی جاسکتی ہے۔ ف۔ اولی یہ ہے کہ ابو ہریرہؓ نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم جب جنازہ کے پیچھے جاؤ تو مت بیٹھو یہانتک کہ اسے زمین پر اتار لیا جائے،، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، امام احمد و اسحٰقؒ کا بھی یہی مذہب ہے، اور امام مالک و شافعیؒ کے نزدیک بیٹھ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مع۔ امام ابو حنیفہؒ نے ابو یوسفؒ کو فرمایا کہ

و کیفیة الحمل ان تضع مقدم الجنازة علی یمینك ثم مؤخرها علی یمینك......الخ

جنازہ کے اٹھانے کی یہ کیفیت ہوگی کہ جنازہ کے سرہانے کے دائیں حصہ کو اپنے دائیں حصہ پر رکھا جائے، پھر اسی طرح کے پچھلے حصہ کو اپنے دائیں پر رکھا جائے، پھر اگلے حصہ کو اپنے بائیں پر پھر پچھلے حصہ کو اپنے بائیں پر رکھا جائے، کیونکہ داہنے حصہ کو بائیں حصہ پر فضیلت ہے۔ ف۔ یعنی یہ طریقہ اس لئے ہے کہ داہنے سے اٹھانا شروع ہو۔

وهذا فی حالة التناوب......الخ

یہ صورت اسی وقت ممکن ہے جبکہ اٹھانے والوں میں تنظیم اور باری موجود ہو۔ ف۔ اور یہ بات پانچ آدمیوں کی موجودگی سے بھی ہو سکتی ہے، اور اگر صرف چار ہی آدمی ہوں جس حالت میں ہوں اسی حالت میں قبرستان تک لے جائیں۔ م۔ جنازہ کے پیچھے چلنا افضل ہے، اور آگے بھی جائز ہے مگر یہ کہ دور ہو جائے یا سب ہی آگے ہو جائیں تو مکروہ ہوگا، جنازہ کے دائیں اور بائیں نہیں چلنا چاہئے، امام شافعیؒ کے نزدیک آگے چلنا افضل ہے، لیکن صحابہ کرامؓ سے دونوں طریقے مروی ہیں، اور ہم نے معنی پر غور کر کے اس طرح ترجیح دی ہے کہ جس طرح نماز کی حالت میں اسے آگے رکھا جاتا ہے اسی طرح لے جانے میں بھی آگے ہی رکھنا افضل سمجھا ہے۔

فصل فی الدفن

ویحفر القبر ویلحد لقوله ﷺ الحد لنا والشق لغیرنا ویدخل المیت مما یلی القبلة خلافا للشافعی فان عنده یسل سلا لماروی انه ﷺ سل سلا. ولنا ان جانب القبلة معظم فیستحب الادخال منه واضطربت

الروایات فی ادخال النبی ﷺ.

ترجمہ:- فصل، دفن کے بیان میں، قبر کھودی جائے اور لحد بنائی جائے، رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ لحد ہمارے لئے ہے اور شق ہمارے غیروں کے لئے ہے، اور مردہ کو قبر میں اس حصہ سے داخل کیا جائے جو قبلہ کی طرف ہو، اس میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک سیدھا کھینچ لیا جائے گا جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کو کھینچا گیا ہے۔

توضیح:- فصل، میت کے دفن میں، دفن کا فرض ہونا، لحد، حدیث سے دلیل، قبر کی گہرائی کی حد، قبر کی درازی، قبر کی چوڑائی، میت کو قبر میں اتارنے کا طریقہ، عورت کا میت کو اتارنا، مردہ عورت کو اتارنا

فصل فی دفن المیت. ویحفر القبر ویلحد لقولہ ﷺ اللحد لنا والشق لغیرنا......الخ

میت کو دفن کرنا فرض کفایہ ہے۔ السراج۔ ھ۔ اس پر اجماع ہے، ویحفر الخ اور قبر کھودی جائے، اور لحد بنائی جائے۔ ف۔ اس طرح سے کہ قبر کے اندر قبلہ کی طرف اس طرح گڈھا کیا جائے جس میں مردہ داخل کیا جاسکتا ہو، اور یہ حکم مسلمانوں کے لئے ہے لقولہ الخ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی وجہ سے کہ ہمارے واسطے لحد ہے اور غیروں کے لئے شق ہے۔ ف۔ اس کی روایت ترمذیؒ نے ابن عباسؓ سے کی ہے اور اس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت سے ثبوت ہے، نیز مسلم میں حضرت سعدؓ سے مروی حدیث بھی ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے بھی لحد بنائی گئی تھی، اور شق کی صورت یہ ہوگی کہ چوڑی قبر کھود کر اس کے اندر پتلی نالی سے بنا کر اس میں مردہ کو دفن کرتے ہیں اس حدیث کا مطلب یہ ہوگا کہ یہود وغیرہ شق بناتے ہیں، ہمارے لئے لحد ہے پس یہی سنت ہے، ائمہ اربعہ سب اسی کے افضل ہونے پر متفق ہیں، لیکن جب زمین ایسی نرم ہو کہ لحد بنانا ممکن نہ ہو تو شق بھی جائز ہے، اور ایسی صورت میں تابوت بنانا بھی جائز ہے، اور لوہے کا تابوت بنانے میں بھی مضائقہ نہیں ہے، جیسا کہ قاضی خان میں ہے، ہمارے مشائخ نے ہر حال میں عورتوں کے لئے تابوت پسندیدہ قرار دیا ہے، کیونکہ اس میں رکھ کر اتارنے میں بھی عورتوں کے لئے زیادہ پردہ ہے۔ المحیط۔ بہر صورت تابوت میں مٹی ڈالنا اور دائیں بائیں کچی اینٹیں رکھنا اور اوپر کے تختہ کے اندر کے حصہ کو مٹی سے لیپ دینا چاہئے تاکہ لحد کے برابر ہو جائے۔ قاضی خان۔ لیکن مردوں کے لئے نرم مٹی کے علاوہ اچھی زمین میں تابوت بالاتفاق مکروہ ہے۔ مع۔

اور جب زمین میں صرف ریت ہی ریت ہو اس وقت گڈھا کر کے مردہ کو اس میں رکھ کر اوپر سے مٹی ڈالدینی جائز ہے۔ مف۔ قبر کی گہرائی درمیانی قد کے انسان کے سینہ تک ہونی چاہئے، پھر جس قدر زائد ہو سکے افضل ہے۔ الذخیرہ۔ الجوہرہ۔ ھ۔ ع۔ اس مسئلہ میں عورت اور مرد برابر ہیں، امام محمدؒ نے کہا ہے کہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ ع۔ اور لانبائی مردہ کی لانبائی کے برابر ہونی چاہئے، اور چوڑائی آدھی قامت کے برابر ہونی چاہئے۔ المضمرات۔ ھ۔ پکی اینٹوں کو مردہ سے ملا کر رکھنا مکروہ ہے۔ قاضی خان۔

ویدخل المیت مما یلی القبلۃ

اور مردہ کو قبلہ کی طرف سے داخل کیا جائے۔ ف۔ اس طرح سے کہ جنازہ کو قبلہ کی طرف کنارہ پر رکھ کر اسی جگہ سے قبر میں اتارا جائے اس طرح اتارنے والا بھی قبلہ رخ ہو جائے گا۔ الفتح۔ اتارنے کے لئے قبلہ میں کوئی عورت داخل نہ ہو۔ محیط السرخسی۔ اگر مردہ عورت ہو تو اس کو اتارنے کے لئے اس کے ذی رحم محرم زیادہ بہتر ہوں گے۔ الجوہرہ۔ اور اگر نہ ہوں تو غیروں کے مقابلہ میں صرف کسی قسم کے رشتہ دار ہی بہتر ہوں گے، اور اگر وہ بھی نہ ہوں تو غیروں کو ہی اتارنے کی اجازت ہوگی۔ البحر۔ قبر میں اتارنے والے جفت ہوں یا طاق ہوں سب برابر ہیں۔ الکافی۔ مگر مستحب ہے کہ ایسے آدمی قبلہ رخ ہو کر قبلہ کی طرف سے قبر میں اتاریں جو قوی، امین، اور صالح ہوں۔ تاتارخانیہ۔

خلافا للشافعي فان عنده يسل سلا لماروى انه عليه السلام سل سلا......الخ

بر خلاف امام شافعیؒ کے قول کے کہ ان کے نزدیک سلول کر کے یعنی تابوت سے سر کے حصہ کو پکڑ کر کھینچتے ہوئے اتارا جائے۔ف۔ یعنی میت کا جنازہ جس طرح سے قبر میں لٹایا جائے گا، اسی طرح سے قبر کے پائینتی سے رکھا جائے اور تابوت سے مردہ کے سر کی طرف سے تلوار کی طرح سیدھا کھینچ لیا جائے لما روى الخ کیونکہ مروی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام اسی طرح تابوت سے سیدھے نکال کر قبر میں داخل کئے گئے تھے۔ف۔ پس جس طرح سے آپ داخل کئے گئے ہیں وہی طریقہ افضل ہوگا، لیکن یہ چیز دو باتوں پر موقوف ہے، اول یہ کہ اس روایت کا ثبوت ہو، دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا جنازہ مبارک قبلہ کی جانب سے اس حجرہ مبارک میں رکھنا ممکن تھا، پھر اس طرح کیا گیا، اس کے بعد مصنفؒ نے اپنی دلیل دیتے ہوئے فرمایا۔

ولنا ان جانب القبلة معظم فيستحب الادخال منه واضطربت الروايات في ادخال النبي عليه السلام.

ترجمہ:-اور ہماری دلیل یہ ہے کہ قبلہ کی طرف کا حصہ معظم و محترم ہوتا ہے لہٰذا اسی حصہ سے مردہ کو قبر میں ڈالنا مستحب ہے، اور رسول اللہ علیہ السلام کو قبر میں داخل کرنے کا سلسلہ کی روایتیں مختلف ہیں۔

توضیح:-قبر میں قبلہ کی طرف سے داخل کرنے کی ہماری دلیل
رسول اللہ علیہ السلام کو قبر میں داخل کرنے کے سلسلہ کی روایتیں

ولنا ان جانب القبلة معظم فيستحب الادخال منه واضطربت الروايات في ادخال النبي عليه السلام......الخ

اور ہماری دلیل یہ ہے کہ قبلہ کی طرف کا حصہ محترم و معظم ہے اس لئے اسی طرف سے داخل کرنا مستحب ہے۔ واضطربت الخ اور رسول اللہ علیہ السلام کو اتارنے کے بارے میں روایتیں مضطرب ہیں۔ف۔ چنانچہ بعض میں قبلہ رخ کر کے اور بعض میں کھینچ کر کے ہے اسی لئے کسی پر اطمینان نہیں ہو سکتا ہے، اس لئے قیاس سے اس ایک روایت کی تائید حاصل کی جس میں قبلہ کی طرف سے اتارنا مروی ہے، واضح ہو کہ دونوں صورتوں کے جائز ہونے میں اختلاف کچھ بھی نہیں ہے، بلکہ امام مالکؒ کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہیں، البتہ ہمارے نزدیک قبلہ کی طرف اتارنا افضل ہے، اور امام شافعیؒ کے نزدیک تلوار کی طرح سے کھینچ کر اتارنا افضل ہے، جیسا کہ امام شافعیؒ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے رسول اللہ علیہ السلام کے اسی طرح کے دفن ہونے کی روایت کی ہے، اور امام شافعیؒ نے کہا ہے کہ ہمارے کچھ اصحاب یعنی شاگردوں نے ابوالزناد و ربیعہ اور ابوالنصر کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام کو اس طرح دفن ہونے کے بارے میں کوئی اختلاف نہ تھا، اسی طرح حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کو بھی دفن کیا گیا ہے، ابوداؤدؒ نے عبداللہ بن یزیدؓ سے اس کا سنت ہونا روایت کیا ہے، ابن ماجہ نے رسول اللہ علیہ السلام کو سل کر کے (کھینچ کر) اور ابن ابی شیبہ نے اسے انسؓ سے روایت کیا ہے اور اس کی اسناد صحیح ہے، یہ سب امام شافعیؒ کے دلائل ہیں، ان کے علاوہ ابوداؤد نے ابراہیم نخعیؒ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام قبلہ کی طرف سے داخل ضرور کئے گئے مگر سل یعنی کھینچ کر نہیں نکالے گئے ہیں، اس کی روایت ابن ابی شیبہ نے کی ہے۔ اور ابن ماجہ نے حضرت ابو سعیدؓ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام استقبال کے ساتھ قبلہ کی طرف سے داخل کئے گئے۔

اس اسناد میں عطیہ بن سعد العوفی ضعیف ہیں، جواب یہ ہے کہ بخاری نے غیر صحیح میں اور ابوداؤد و ترمذی نے اس سے روایت کی اور وہ صدوق (بڑا سچا) اگرچہ ذرا سی اس سے چوک ہو جاتی ہے، ساتھ النخعیؒ کی مرسل روایت سے اس کی تائید ہو رہی ہے، لہٰذا یہ روایت حضرت ابن عباسؓ کی صریح طور پر معارض ہے، اب ان میں توفیق دینے کی یہی صورت ہو سکتی ہے کہ پہلے تو رسول اللہ علیہ السلام وابو بکرؓ و عمرؓ کو تخت پر سے سل کر کے قبر مبارک کی قبلہ کی جانب اتارا پھر وہاں سے مزار مبارک میں اتارا ہو، پھر عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ علیہ السلام رات کے وقت ایک قبر میں داخل ہوئے تو آپ کے لئے چراغ روشن کیا گیا

پھر مردہ کو قبلہ کی طرف سے لیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم کرے کیونکہ تم بہت اوّاہ (آخرت کو یاد کر کے بہت آہ آہ کرنے والے) تھے، اور قرآن پاک کی بہت زیادہ تلاوت کرنے والے تھے، اور اس پر چار تکبیریں کہیں، ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے، اس کی اسناد میں منہال بن خلیفہ اور حجاج بن ارطاۃ کو امام احمد اور یحییٰ بن سعید و یحییٰ بن معین وغیرہ نے ثقہ قرار دیا ہے، بہر صورت یہ حدیث حسن کے درجہ سے کم نہیں جیسا کہ ترمذیؒ نے بھی اسے حسن کہا ہے، اور عبداللہ ذی البجادین کو رسول اللہ ﷺ نے قبلہ کی طرف سے قبر میں داخل کیا، جیسا کہ الخلال وغیرہ نے اس کی روایت کی ہے، اور حضرت علیؓ نے یزید بن المکفف کو اور محمد بن الحنفیہؒ نے ابن عباسؓ کو قبلہ کی جانب سے داخل کیا ہے، ابراہیم نخعیؒ نے مدینہ والوں کا یہی عمل بیان کیا ہے، اور کہا ہے کہ جب اس کی نرم زمین اس طرح دفن کرنے پر برداشت نہ کر سکی تو انہوں نے سل کرنا اختیار کیا، ابن ابی شیبہؒ نے یہ آثار روایت کئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ جب دونوں طرح کی روایتیں موجود ہیں تو مصنفؒ نے قیاس کے ذریعہ قبلہ کی طرف سے داخل کرنے کو ترجیح دی ہے، اچھی طرح بحث کو ذہن نشین کر لیں۔ م۔ مفع۔

فاذا وضع فی لحده یقول واضعه بسم الله وعلی ملة رسول الله کذا قاله رسول الله ﷺ حین وضع ابا دجانة فی القبر ویوجه الی القبلة بذلك امر رسول الله ﷺ ویحل العقدة لوقوع الامن من الانتشار.

ترجمہ:- اور جب جنازہ کو اس کی لحد میں رکھا جائے تو اس کا رکھنے والا یوں کہے بسم اللہ وعلی ملۃ رسول اللہ ﷺ، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابودجانہؓ کو اسی طرح قبر میں رکھا ہے، اور اس کے چہرہ کو قبلہ کی طرف کر دے، کہ رسول اللہ ﷺ نے اسی بات کا حکم دیا ہے، اور کفن کی گرہ کھول دے کیونکہ اس کفن کے منتشر ہونے سے امن ہو گیا ہے۔

توضیح:- مردہ کو رکھتے وقت کیا کہنا چاہئے، اسے قبلہ رخ کرنا، کفن کی گرہ کھولنا، مردہ عورت کے کام کرنے والے، قبر میں مٹی بچھانی، قبر سے مردہ کو نکالنا اس کے مٹی ہو جانے کے بعد، دوسرے مردہ کو اسی جگہ دفن کرنا، اس جگہ کھیتی وغیرہ کرنا، مردہ کے سرہانے میں تکیہ رکھنا، اس کے نیچے بستر دینا

فاذا وضع فی لحده یقول واضعه بسم الله وعلی ملة رسول الله......الخ

لحد میں رکھے یعنی قبلہ کی طرف سے لاتے ہوئے اور لحد میں رکھتے ہوئے رکھنے والا یوں کہے میں اسے اللہ کے نام سے اور رسول اللہ ﷺ کی ملت پر اسے رکھتا ہوں **کذا قاله الخ** رسول اللہ ﷺ نے ابودجانہؓ کو قبر میں رکھتے ہوئے اسی طرح فرمایا تھا۔ ف۔ شیخ الاسلام خواہر زادہؒ نے مبسوط میں اسی طرح ذکر کیا ہے، اور بدائع وغیرہ میں بھی اسی طرح مذکور ہے، اور مصنفؒ بھی ان کی تقلید کرنے کی وجہ سے ایک الجھن میں مبتلا ہو گئے ہیں، کیونکہ ابودجانہؓ جن کا اصل نام سماک بن خرشہ ہے وہ تو رسول اللہ ﷺ کے بعد جنگ یمامہ میں شہید ہو گئے اس بناء پر اس جگہ ابودجانہؓ کا نام بالکل غلط ہے، اور رسول اللہ ﷺ نے جنہیں قبر میں ڈالا تھا وہ ذوالبجادین تھے، جن کا نام عبداللہ تھا اور غزوہ تبوک میں انتقال کیا۔ العینی۔

یہ دعا کرنا سنت صحیحہ ہے، جیسا کہ ترمذی و حاکم و ابوداؤد اور ابن حبانؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا ہے، اور دوسری روایت میں بسم اللہ وعلی سنۃ رسول اللہ واقع ہے، اور ابوالعلاء العامرؓ نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میرے لئے لحد بناؤ اور مجھے اس میں رکھتے ہوئے یوں کہو **بسم الله وعلی ملة رسول الله ﷺ**، پھر مجھ پر مٹی ڈالدو، اور میرے سر کے قریب سورہ بقرہ کا ابتدائی اور آخری حصہ پڑھ دو کیونکہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے ایسا ہی سنا ہے، طبرانی نے اس کی روایت کی ہے۔ اور مفع۔ **ویوجه الخ** اور مردہ کو قبلہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔ ف۔ یعنی دائیں پہلو پر قبلہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔ الخلاصہ۔ ھ۔

بذلك امر رسول الله ﷺ ویحل العقدة لوقوع الامن من الانتشار......الخ

رسول اللہ ﷺ نے اسی بات کا حکم دیا ہے۔ف۔ حکم دینے کا ثبوت کسی حدیث سے نہیں ملا ہے، کبائر کے شمار میں اس کو فرمایا ہے، واستحلال البیت الحرام قبلتکم احیاء واموا تا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بیت الحرام زندگی اور موت دونوں حالتوں میں قبلہ ہے، جیسا کہ ابوداؤد اور نسائی نے روایت کی ہے، اور ابوسعیدؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ دفن کئے جانے کے وقت قبلہ کی طرف سے اتارے گئے، اور قبلہ کی طرف نسبت کی گئی ہے، جیسا کہ ابن ماجہ نے روایت کی ہے، الحاصل مردہ کے بائیں جانب کچی اینٹوں یا مٹی کے ڈھیلے سے ٹیک کر قبلہ کی طرف متوجہ کر دیا جائے۔ مع۔ **ویحل العقدہ الخ** اور کفن کی گرہ کھول دے۔

چند ضروری مسائل

مردہ عورت کی تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں موت کے وقت سے تابوت پر رکھنے تک کے سارے انتظامات عورتوں کے ذمہ ہوں گے وہی سارے کام انجام دیں گی پھر جنازہ اٹھا کر دفن کرنے تک کے سارے کام مردوں کے ذمہ ہوں گے۔ع۔ قبر میں مٹی بچھانا سنت ہے، الینابع، اور شافعیہ و حنابلہ کی کتابوں میں ہے کہ میت کے سر کے نیچے کچی اینٹ یا پتھر رکھ دئے جائیں، مگر ہمارے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ السروجی، اگر قبر میں بغیر غسل دئے ہوئے یا بائیں کروٹ پر یا سرہانا بجائے پائنتی ہو کر یا بغیر قبلہ رخ کئے ہوئے دفن کر دیا گیا ہو تو مٹی ڈال دینے کے بعد اکھاڑا نہیں جائے گا، ورنہ اٹھا کر سنت طریقہ سے رکھدیا جائے گا، اگرچہ بکسے دیدئے ہوں، اور اگر کوئی مال یا ضروری چیز قبر میں رہ گئی ہو تو صرف اس بات کی اجازت ہے کہ جس طرف وہ مال ہے اسی طرف سے گڈھا کر کے وہ سامان نکال لیا جائے۔ المبسوط۔ اور کہا گیا ہے کہ قبر کھود کر نکال لینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ جوامع الفقہ۔ع۔ اگرچہ مال ایک درہم ہی ہو۔ البحر۔

میں مترجم کہتا ہوں اس طرح کرنا دفن کے بعد سے ایک دن تک ہونا چاہئے، کہ اس لاش میں کوئی تغیر نہ ہوا ہو، ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مزار مبارک میں حضرت مغیرہ بن شعبہؓ کی انگوٹھی اس وقت گر گئی تھی جبکہ یہ بھی آپ کی نعش مبارک کو اتارنے کے لئے اور لوگوں کے ساتھ قبر میں اترے تھے، مجبوراً صحابہ سے اجازت لے کر اس کی مٹی ہٹا کر اپنی انگوٹھی نکال لی اور رسول اللہ ﷺ کی دونوں آنکھوں پر بوسہ دیا، مغیرہؓ اس بات پر ہمیشہ فخر کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے بالکل آخری دیدار کا شرف مجھے حاصل ہے، جب مردہ قبر میں مٹی ہو جائے تو اس قبر میں دوسرے کو بھی دفن کرنا، وہاں کھیتی کرنا، عمارت بنانا، اور ہر قسم کے تمام کام جائز ہیں، زندوں کی طرح مردوں کے سر کے نیچے تکیہ رکھنا مکروہ ہے۔ المرغینانی۔ اور اس کے نیچے کوئی بستر بچھانے کو ابن عباسؓ نے مکروہ کہا ہے، ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، یہی قول ابوموسیٰؓ کا بھی ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ایک آزاد کردہ غلام شقران نے کہا ہے کہ میں نے ایک سرخ کملی رسول اللہ ﷺ کے نیچے قبر میں ڈال دی تھی، ترمذیؒ نے اس کی روایت کی ہے، شقرانؓ بھی رسول اللہ ﷺ کے دفن میں شریک تھے، عیاضؒ نے کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اس سرخ کملی پر آرام فرمایا کرتے تھے، تو شقرانؓ نے انتہائی غمزدہ ہو کر کہا کہ واللہ حضور ﷺ کے بعد اب اس پر کون بیٹھے گا اسے تو کوئی بھی استعمال نہیں کرے گا، اسی لئے قبر میں بچھادی، اور یہ بھی روایت ہے کہ اس کملی کے واسطے حضرت ابن عباسؓ نے اختلاف کیا تھا تو شقرانؓ نے اس اختلاف کو اس طرح ختم کر دیا، مردہ کے پیچھے مٹی وغیرہ سے اس حد تک ٹیک دیا جائے۔ کہ اس کی وجہ سے بعد میں بھی قبلہ سے رخ نہ پھر جائے۔ مع۔

ویسوی اللبن علی اللحد لان ﷺ جعل علی قبرہ اللبن ویسجّی قبر المرأۃ بثوب حتی یجعل اللبن علی اللحد ولایسجی قبر الرجل لان مبنی حالھن علی الستر ومبنی حال الرجل علی الانکشاف ویکرہ الأجر والخشب لانھما لاحکام البناء والقبر موضع البلی ثم بالاجر اثر النار فیکرہ تفاؤلا.

ترجمہ:- اور قبر پر کچی اینٹیں ٹھیک لگادی جائیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر پر کچی اینٹیں لگائی گئی ہیں، اور عورت کی قبر کپڑے سے ڈھانک کر رکھی جائے یہانتک کہ وہ کچی اینٹیں قبر پر رکھدی جائیں، اور مرد کی قبر نہ ڈھانپی جائے، کیونکہ عورت کا حال پردہ ہے لیکن مرد کا حال پردہ پر نہیں ہے، بلکہ کھلم کھلا ہونے پر ہے، اور قبر میں پکی ہوئی اینٹ یا لکڑی استعمال کرنا مکروہ ہے، کیونکہ یہ چیزیں تعمیر کو مضبوط کرنے کے لئے ہوتی ہیں جبکہ قبر تو بربادی کی جگہ ہے، پھر پکی ہوئی اینٹ میں آگ کا کچھ اثر ہوجاتا ہے اس لئے نیک فالی کے طور پر اس قسم کی چیزوں کو استعمال کرنا مکروہ ہے۔

توضیح:- لحد پر کچی اینٹ، عورت کی قبر پر پردہ، پکی اینٹ و لکڑی لحد پر

ویسوی اللبن علی اللحد لان ﷺ جعل علی قبرہ اللبن۔۔۔۔الخ

اور لحد پر کچی اینٹیں تہہ بتہ کھڑی کردی جائیں کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر اسی طرح کچی اینٹیں لگائی تھیں۔ف۔ چنانچہ حضرت جابرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ لحد میں رکھے گئے اور ہم نے اس لحد پر کچی اینٹیں لگائیں اور آپ کی قبر مبارک ایک بالشت کے انداز سے اونچی کی گئی، ابن حبان نے اس کی روایت کی ہے، اور حاکم کی حدیث جو حضرت علیؓ اور ابن حبان کی حدیث جو حضرت عائشہؓ اور صحیح مسلم کی حدیث جو سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے ان سب سے یہ دعوی ثابت ہے، اور ابن ابی شیبہ نے شعبیؒ سے مرسل روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر نرکل لگایا گیا ہے۔ مع۔

اس بندہ مترجم کی رائے یہ ہے کہ اس لحد مبارک کو بند کرنے کے لئے اول تو کچی اینٹیں لگائی گئیں پھر بھی کہیں کہیں کچھ شگاف رہنے پر اسے نرکل لگا کر بند کرایا گیا تھا، اس مطلب کی بناء پر دونوں حدیثوں میں آسانی کے ساتھ مطابقت ہوگئی، بدائع میں بھی کھڑی لگانے کا ذکر ہے، اور یہی قول صحیح ہے، اور "یسوّی اللبن" کی عبارت سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اینٹیں اچھی طرح برابر کر کے لگائی گئیں، عینیؒ نے کہا ہے کہ تمام سوراخ بالکل بند کردئے جائیں، تاکہ مردہ پر مٹی نہ گرے۔ المفید۔ اور کچی اینٹوں کے افضل ہونے پر اجماع ہے۔ مع۔

ویسجّی قبر المرأۃ بثوب حتی یجعل اللبن علی اللحد۔۔۔۔۔الخ

اور عورت کی قبر پر اس وقت تک پردہ رکھا جائے کہ اس پر کچی اینٹیں لگادی جائیں۔ف۔ پھر اس کے بعد پردہ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن مرد کی قبر پر پردہ نہ کیا جائے۔ف۔ یعنی اس کی کچھ ضرورت نہیں ہے، امام مالکؒ واحمدؒ کا یہی قول ہے **لان مبنی الخ** کیونکہ عورتوں کے ہر معاملہ میں پردہ کا خیال رکھا جاتا ہے اس بناء پر اس کے جناہ کے اتارنے اور اندر داخل کرنے میں اس کے چہرہ کے کھل جانے کے خوف سے قبر پر پردہ کردیا جائے **ومبنی حال الرجل الخ** اور مردوں کے معاملہ میں پردہ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، یعنی بے پردگی پر مبنی ہے۔ف۔ یعنی مرد کے لئے اجنبیوں سے پردہ کا حکم نہیں ہے، یہانتک کہ نماز میں مرد کا سر کھلنے سے کوئی حرج نہیں ہے مگر عورت کا سر کھل جانے سے نماز فاسد ہوجاتی ہے، اور صحیح روایت میں ہے کہ سیدہ فاطمہؓ کی قبر مبارک ایک کپڑے سے ڈھانکی گئی اور انکے جنازہ کو نعش سے چھپایا گیا، کیونکہ آپ نے اپنی وفات سے پہلے یہ وصیت فرمائی تھی کہ میرے جنازہ پر کھجور کی شاخوں اور پتوں سے نعش بنانا، اس طرح عورتوں کے بارے میں یہ سنت ہوگئی۔ مع۔ نعش کا مطلب یہ ہے کہ جنازہ پر کمان کی طرح شاخیں لگا کر اس پر سے کپڑے کا پردہ ڈال دیا جائے، اس طرح وہ مردہ عورت پورے طور پر اس میں پردہ میں آجائے۔ م۔

ویکرہ الاجر والخشب لانہا لاحکام البناء والقبر موضع البلی ثم بالاجر اثر النار فیکرہ تفاؤلا۔۔۔۔۔الخ

قبر میں پکی اینٹیں اور لکڑیاں لگانا مکروہ ہے، کیونکہ یہ چیزیں تو عمارت کی مضبوطی کے لئے لگائی جاتی ہیں، جبکہ قبر تو گل کر برباد ہونے کی جگہ ہوتی ہے، اس لئے ان چیزوں کو ایسی جگہ میں لگانا جو رائیگاں ہوجائے وہ اسراف ہے، جو مکروہ ہے، اس طرح یہ

وجہ تو ان دونوں چیزوں کے مطلقاً مکروہ ہونے پر دلالت کرتی ہے ثم بالآجر الخ اور مکروہ ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ پکی اینٹ میں آگ کا اثر ہوتا ہے، اس لئے بدفالی کے خیال سے مکروہ کہا گیا ہے۔ف۔ گویا اس کا آخرت کا گھر آگ کی مدد اور اس کی آمیزش سے تیار ہوا ہے، بخلاف غسل کے لئے گرم پانی کے استعمال کے، کہ طہارت ہے، اور ہمیں یہ معلوم ہے کہ کچھ گنہگار آگ سے پاک کئے جائیں گے، پس اس جگہ گرم پانی سے غسل دینے میں اس طرح کی ایک نیک فالی ہوگی کہ وہ ابھی سے پاک کر دیا گیا ہے، اسی بناء پر لوبان دانی میں آگ جلا کر جنازہ کے پیچھے چلنا مکروہ ہے، اور قاضی خانؒ نے کہا ہے کہ پکی اینٹ لگانی اسی صورت میں مکروہ ہے کہ وہ مردہ سے ملی ہوئی ہو۔ ھ۔ اور یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ قاضی خان کی لگائی ہوئی شرط اس بناء پر ہے کہ آگ کے اثر سے جو چیز بنی ہے وہ میت سے متصل ہے، ایسی صورت میں گرم پانی سے نہلانے اور کسی چیز کو گرم کر کے اس کے ذریعہ سے استعمال عطر لگانے کا اعتراض ہوتا ہے، لہٰذا، بہر صورت جواب وہی ہے جو میں نے بدفال لینی کی وجہ اوپر بیان کی ہے، کہ آخرت کی منزل آگ سے بنی ہے، اس بناء پر یہ حکم عام ہو جائے گا کہ قبر میں کسی جگہ پختہ اینٹ کا ہونا مکروہ ہے، جیسا کہ اصلی وجہ مصنفؒ نے ذکر کی ہے کہ مکروہ کہنے کی مطلق وجہ اسراف ہے جو شرعاً ممنوع ہے، اس قاعدہ کی بناء پر یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر پکی اینٹ اور لکڑی کا کوئی جائز ہو تو مکروہ بالکل نہیں ہونا چاہئے، جیسا کہ تمرتاشی میں ہے کہ اگر کوئی شخص مردہ کو درندہ کے خوف سے بچانے کے لئے یا کفن چوروں کے خوف سے اوپر کے حصہ کو پکی ہوئی اینٹ سے جوڑ دے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

ولاباس بالقصب و فی الجامع الصغیر ویستحب اللبن والقصب لانه ﷺ جعل علی قبره طن من قصب ثم یهال التراب ویسنم القبر ولایسطح ای لایربع لانه ﷺ نهی عن تربیع القبور ومن شاهد قبره اخبر انه مسنم.

ترجمہ:- اور بانس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، اور جامع صغیر میں ہے کہ کچی اینٹ اور بانس کا استعمال مستحب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر بانس کا ایک گٹھا استعمال ہوا ہے، پھر مٹی ڈال کر بھر دی جائے، اور قبر کوہان نما بنائی جائے، بالکل ہموار نہ بنائی جائے، یعنی چوکور نہ بنائی جائے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو چوکور بنانے سے منع فرمایا ہے، اور جس شخص نے بھی آپ کی قبر کی زیارت کی ہے اس نے بتلایا ہے کہ آپ کی قبر کوہان نما ہے۔

توضیح:- قبر پر پکی اینٹ اور بانس استعمال کرنا، قبر میں مٹی ڈالنا

قبر کی مٹی پر زیادتی مٹی ڈالنے کا طریقہ، قبر کی صورت میں دعاء، حدیث سے دلیل

ولاباس بالقصب و فی الجامع الصغیر ویستحب اللبن والقصب......الخ

بانس کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔ف۔ اس سے اس کا مستحب ہونا معلوم نہیں ہوتا ہے، وفی الجامع الخ اور جامع صغیر میں ہے کہ کچی اینٹ اور بانس کا استعمال مستحب ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی قبر مبارک پر بانس کا ایک گٹھا استعمال ہوا تھا۔ف۔ اس کی روایت ابن ابی شیبہؒ نے ابراہیمؒ سے مرسلاً روایت کی ہے، اور اگر اس بانس کی تیار کی ہوئی چٹائی ہو تو ایک روایت میں جائز مگر دوسری روایت میں مکروہ ہے۔ مع۔

ثم یهال التراب ویسنم القبر ولایسطح ای لایربع لانه ﷺ نهی عن تربیع القبور......الخ

پھر قبر میں مٹی ڈال دی جائے۔ف۔ خواہ ہاتھوں سے مٹی ڈال دی جائے یا پھاوڑے وغیرہ سے۔ الجوہرہ۔ اور قبر کی اپنی مٹی سے اس میں زیادہ مٹی ڈالنا مکروہ ہے، حسنؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے اس کی روایت کی ہے۔ التحفہ، المحیط۔ ع۔ اور حدیث میں مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سر کی طرف سے تین لپ مٹی (دونوں ہاتھوں کو ملا کر) ایک قبر میں ڈالی، اس کی روایت ابن ماجہ نے

ابو ہریرہؓ سے کی ہے۔ ع۔ اس لئے مستحب طریقہ کہ دونوں ہاتھوں سے ایک لپ سرہانے پر ڈالتے ہوئے کہے مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ، اور دوسرا بیچ بدن پر یہ پڑھتے ہوئے ڈالے وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ اور تیسرا لپ پاؤں کی طرف ڈالتے ہوئے پڑھے، وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى، یعنی اس آیت کو تینوں بار میں ختم کردے۔ الجوہرہ۔ ہ۔ ع۔

ویسنم القبر ولا یسطح ای لا یربع لانه علیہ السلام نهی عن تربیع القبور......الخ

اور قبر کوہان نما بنائی جائے، یعنی مثل کوہان کے بنائی جائے، اور جمہور علماء اور اکثر شافعیہ کا یہی قول ہے مع ولا یسطح الخ اور مسطح نہ بنائی جائے، ای لا یربع الخ یعنی مربع یا چوکور نہ ہو جیسا کہ چبوترہ ہوتا ہے لانه الخ کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام نے قبروں کو چوکور کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ف۔ اس کی روایت محمدؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے کی ہے۔ فع۔ اور یہ بت پرستوں کے چبوترہ کے مشابہ ہوتا ہے، لہذا ایسا کرنا مکروہ تحریمی ہوگا، اسی بناء پر ظہیریہ میں مسنم بنانے کو واجب کہا ہے، اور قاضی خان میں ایک بالشت کے برابر اونچا اور محیط میں ہے کہ چار انگلی یا ایک بالشت اونچا بنائے۔ م۔ مع۔

ومن شاهد قبره اخبر انه مسنم......الخ

اور جس شخص نے رسول اللہ علیہ السلام کی قبر مبارک کو آنکھوں سے دیکھا ہے اس نے یہی کہا ہے کہ وہ مسنم یعنی کوہان دار ہے۔ ف۔ ابو حنیفہؒ اور بخاریؒ نے نخعیؒ سے اس کی روایت کی ہے۔ فع۔ اور بخاریؒ نے سفیان التمار سے روایت کی ہے کہ میں نے رسول اللہ علیہ السلام کی قبر مبارک کو مسنم دیکھا ہے، اور ابن ابی شیبہؒ اس سے بڑھ کر یہ بھی کہا ہے کہ اسی طرح ابو بکر اور حضرت عمرؓ کی قبروں کو بھی دیکھا ہے یعنی تینوں حضرات کی قبریں مسنم، کوہان دار ہیں، اور ابن شاہینؒ نے محمد بن علی بن الحسین اور قاسم بن محمد وسالم بن عبداللہ سب سے روایت کی ہے کہ تینوں قبریں مسنم ہیں، شعبیؒ نے کہا ہے کہ میں نے شہداء احد کی قبریں مسنم دیکھی ہیں، اور محمد بن الحنفیہؒ وغزالی ورد یانی وغیرہ نے بھی تمام ائمہ کرام سے اس میں اتفاق کیا ہے، اور امام شافعیؒ کے اس قول کو چھوڑ دیا ہے کہ قبر مسطح بنائی جائے، اس دلیل سے کہ مسنم تو اٹھی ہوئی ہوتی ہے، اور حضرت علیؓ نے ابوالتیاحؒ کو یہ کہہ کر بھیجا کہ جو قبر میں مشرف یعنی اونچی ہو اسے برابر کردو، اور جو کوئی صورت بنی ہوئی ہو اسے مٹادو، پھر یہ فرمایا کہ رسول اللہ علیہ السلام نے بھی مجھے اسی طرح اس کام کے لئے بھیجا تھا، جیسا کہ ترمذی نے اس کی روایت کی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں قبروں پر عمدہ عمارت بنادیا کرتے تھے، اور مسنم سے ہماری مراد یہ نہیں ہے بلکہ زمین سے صرف اس قدر اونچی ہو کہ وہ کچھ ممتاز معلوم ہوتی ہو تاکہ اسے قبر پہچان کر اسی کی پیشاب وغیرہ کرکے اہانت نہ کی جائے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، اور امام شافعیؒ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ قاسم بن محمدؒ نے اپنی پھوپھی حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ میں نے عرض کیا کہ اے میری اماں جان مجھے رسول اللہ علیہ السلام اور شیخینؓ کی قبر دکھلا دیجئے تو آپ نے دروازہ کھول دیا جس سے میں نے تین قبریں دیکھیں اور کہا کہ لا شرقة لاطية سلوحة ببطحاء العرصة الحمراء یعنی نہ بلند اور نہ پست بلکہ سرخ میدان کی کنکریوں سے تھیں، ابوداؤد نے اس کی روایت کی ہے، جواب یہ ہے کہ یہاں مسطح سے مراد چوکور نہیں ہے بلکہ مسنم کوہان نما ہے، جیسا کہ تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اور خود قاسم بن محمد سے ابن شاہینؒ کی روایت میں مسنم ہونے کی تصریح ہے جس کا ذکر ہو چکا ہے، اس پر بھی اگر کوئی اعتراض کرے تو بخاریؒ کی روایت میں مسنم ہونے کی تصریح موجود جس سے اس مفہوم کی ترجیح ہوتی ہے، بیہقی اور بغویؒ نے جو یہ کہا ہے کہ ابوداؤد کی روایت اصح اور محفوظ ہونا چاہئے، تو صاحب اللباب نے اسے رد کردیا ہے، اور کہا ہے کہ ان دونوں نے تعصب کی بناء پر ٹھوکر کھائی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی صحیح بخاری کی روایت پر ابوداؤد کی روایت کو ترجیح نہیں دے سکتا ہے، اور ابن قدامہ حنبلیؒ نے کہا ہے کہ بخاریؒ کی روایت اصح ہے۔ مع۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ صحیح جواب تو یہی ہے کہ ابوداؤد کی روایت میں مسطح سے مراد مسنم ہے۔

چند ضروری مسائل

قبر کو کہگل کرنا، چونا سرخی لگانا، پرانی قبر کو لیپنا، زندگی میں قبر صالحین کے مقبرہ میں، قبر پر پانی ڈالنا، قبر پر قرآن اور دعا پڑھنا، قبر کو روندنا، وغیرہ، قبر کی طرف نماز، قبر پر پتھر لگانا، لکھنا، مردہ کا اذان کی آواز سننا، ایک قبر میں دو مرد، تعزیت، تعزیت کے کلمات، معصیت زدہ کا گھر اور مسجد میں بیٹھنا، دروازہ پر بیٹھنا، مردہ کو گھر میں دفن کرنا، مردہ کو منتقل کرنا، دفن کے بعد منتقل کرنا، قبر کو ہموار کر دینا، رات کو دفن کرنا، قبرستان میں جوتے پہن کر چلنا، عورتوں کو قبور کی زیارت کرنا، قبر پر ہاتھ رکھنا، قبر کو مسح کرنا، بوسہ دینا، چھونا، قبر کے پاس سونا، زیارت قبور کی دعا، مردہ کو اس کے اپنے شہر میں منتقل کرنا، مقبرہ کی ہری گھاس کاٹنی، جو کشتی میں مر گیا ہو، قاریوں کو قبر کے پاس بٹھانا، مردہ زندگی میں کسی کا مال نگل گیا اور پاخانہ سے بھی نہیں نکلا تو اس کے مرنے کے بعد پیٹ چاک کرنا، میت کے گھر والوں کا اپنے گھر میں جمع ہونے والوں کو کھانا پکا کر کھلانا، میت کے گھر والوں کے لئے کھانا بھیجنا، مردہ سے منکر و نکیر کا سوال، میت پر لوگوں کے رونے سے عذاب، عید وغیرہ میں مقابر میں کھانا اور چراغ جلانا، قبرستان میں یہودی کی ہڈی ملی، مقابر میں عورت کی ہڈی دیکھنا

(۱) قبر کو لیپنا یا اس پر سرخی چونا لگانا مکروہ ہے۔ المحیط۔ یہی قول امام ثوریؒ و مالک و شافعیؒ کا ہے، اور منیہ میں ہے کہ مختار یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے (۲) اور امام ابو حنیفہؒ نے کہا ہے کہ قبر پر عمارت بنانا مکروہ ہے۔ التبیین۔ ع۔ اور سراجیہ میں ہے کہ مختار یہ ہے کہ مکروہ نہیں ہے۔ الدر۔ میں مترجم کہتا ہوں کہ یہ حکم متون کی عبارت کے مخالف ہے، اور کوئی دلیل شرعی ظاہر نہیں ہے، فاللہ تعالیٰ اعلم۔ م۔ (۳) اگر قبر بہت بوسیدہ ہو گئی ہو تو اسے لیپ دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ الجوہرہ۔ ھ۔

(۴) اور زندگی میں اپنے لئے اگر قبر بنوائی تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اس پر ثواب پائے گا۔ التاتارخانیہ۔ اس لئے اسے مستحب ہونا چاہئے، لیکن یہ کوئی نہیں جانتا ہے کہ اسے کہاں دفن ہونا ہے، اسی لئے مضمرات میں ہے کہ قبرستان میں تنگی کی وجہ دوسرے کو دفن کرنا جائز ہے، اور پہلے جس نے اس میں خرچ کیا ہے وہ خرچ اسے دلوایا جائے۔ م۔ ھ۔ نیک لوگوں کے مقبرہ میں دفن کرنا افضل ہے۔ الجوہرہ

(۵) قبر کی مٹی کو بٹھانے کی غرض سے اس پر پانی چھڑکنے میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن امام ابو یوسفؒ نے اسے مکروہ کہا ہے۔ المحیط۔ (۶) دفن کے تھوڑی دیر بعد وہاں بیٹھ کر قرآن پڑھ دینا اور دعا کرنا مستحب ہے۔ الجوہرہ۔ (۷) قبر کو روندنے یا اس پر بیٹھنے یا سونے یا پیشاب کرنے، پاخانہ کرنے، یا اس پر کوئی علامت بنانے یا اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے یا قبروں میں نماز پڑھنے کو امام ابو حنیفہؒ نے مکروہ کہا ہے۔ التبیین۔ ع۔ مگر قاضی خان نے کہا ہے کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اس پر کچھ لکھ دیا جائے یا علامت کے طور پر پتھر رکھ دیا جائے۔

(۸) حسنؒ نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے کہ قبر کو جب تک لیپا نہ جائے، وہ مردہ اذان کی آواز سنتا رہتا ہے۔ المغنی۔ للحنابلہ۔ ع۔ اگر یہ روایت صحیح ہو تو ہمارے نزدیک یہ سننا سلام کے منزلہ میں ہے۔ م۔

(۹) ایک قبر میں دو مردے کا دفن کرنا مکروہ ہے مگر مجبوری کی بناء پر، قدوری، سرخسی، مرغینانی و ذخیرہ میں ہے کہ ضرورت کی بناء پر پانچ تک کو دفن کرنا اجماعاً جائز ہے، ان میں جو افضل ہو اسے سب سے پہلے یعنی آگے، اس طرح ہر دو کے بیچ میں تھوڑی مٹی ڈال دی جائے۔

(۱۰) تعزیت کرنا مستحب ہے، اور اس کے بارے میں احادیث میں بہت زیادہ ثواب کا وعدہ ہے، مگر جب کہ عورت جوان ہو تو صرف اس کے محارم اس کی ماتم پرسی کریں (۱۱) دفن کے بعد تعزیت کرنا مستحب ہے، مگر جب یہ مصیبت زدہ افراد زیادہ پریشان ہوں تو پہلے بھی تعزیت کرنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ السراج۔

(۱۲) اگر اس تعزیت کے موقع پر سب سے وہی بات کہی جائے جو رسول اللہ ﷺ نے فرمائی ہے، یعنی ان للہ ما اخذ، ولہ ما اعطی و کل شیء عندہ باجل مسمی یعنی اللہ تعالیٰ کا تھا جو اس نے لے لیا اور جو دیا ہے وہ بھی اسی کا ہے، اور ہر چیز کے لئے اس کے نزدیک ایک وقت مقرر ہے (۱۳) مسلمان کے لئے ثواب کی دعا ہے اور مسلم میت کے لئے مغفرت کی دعا ہے (۱۴) اور اگر مردہ کافر شخص ہو تو اس کی مغفرت نہ چاہے، اور (۱۵) اگر دونوں کافر ہوں تو یوں کہنا چاہئے اللہ تعالیٰ تمہاری اس مصیبت میں بھلائی کر دے اور کمی نہ کرے۔ السراج۔

(۱۶) اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ مصیبت زدہ حضرات اپنے گھر یا مسجد میں بیٹھ جائیں تاکہ لوگ تین دنوں تک ان کی تعزیت کو آئیں، اس سے زائد نہیں، مگر اس صورت میں کہ وہ سفر میں تھا اور اب آیا ہو، ویسے یہ ترک کر دینا ہی بہتر ہے (۱۷) اور دروازوں پر بیٹھنا مکروہ ہے (۱۸) عجمی ملکوں میں جو لوگ راستوں پر فرش بچھا کر بیٹھتے ہیں یہ انتہائی بری حرکت ہے۔ الظہیر یہ۔ الخزانتہ۔ ھ۔ ع۔

(۱۹) مردہ کو اس کے لئے اپنے گھر میں دفن نہیں کرنا چاہئے، اگرچہ وہ چھوٹا ہی ہو، بلکہ مسلمانوں کے مقبروں میں لے جانا چاہئے (۲) کیونکہ مردہ کو اس کے اپنے گھر میں دفن کرنا صرف انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے کہ وہ جس جگہ وفات پائیں وہیں دفن کئے جائیں، اور حضرت ابو بکر و عمرؓ کی فضیلت اور خصوصیت رسول اللہ ﷺ کی شرافت کی وجہ سے ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی میں فرمادیا ہے کہ میں اور ابو بکر اور عمر سب ایک ہی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، اسی بناء پر آپ کی وفات کے بعد یہی بات پیش آئی، اسی سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے وحی کے ذریعہ معلوم ہو جانے کی بناء پر اپنے جنازہ کو ایک تابوت میں رکھوا دینے کا حکم دیا تھا تاکہ وہاں سے منتقل کر کے حضرت ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کے مقبرہ میں لائے جائیں۔

(۲۱) مصنفؒ نے تجنیس میں فرمایا ہے کہ اس سے یہ معلوم ہوا کہ مردہ کو منتقل کرنے میں گناہ نہیں ہے، لیکن عام طریقہ سے نقل کرنے میں دفن کرنے میں تاخیر اور بے فائدہ کام کرنا لازم آئے گا، اور یہی بات اس کی کراہت کے لئے کافی ہے اور ایک دو میل تک منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، کیونکہ قبرستانوں میں اتنا فاصلہ ہوا ہی کرتا ہے، مگر مستحب یہ ہے کہ انسان جہاں مرے وہیں کے مقبرہ میں دفن کیا جائے، کہا گیا ہے کہ مگر مقدار سفر سے کم ہو، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مقدار سفر سے دور بھی نقل کرنا مکروہ نہیں ہے (۲۴) اور حضرت سعد ابی وقاص و سعید بن زیدؓ نے عقیق میں انتقال کیا اور چار فرسخ فاصلہ پر مدینہ میں منتقل کئے گئے۔

(۲۵) اور دفن کر دینے کے بعد اس کی قبر کو کھود کر منتقل کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ دفن کئے ہوئے تھوڑی مدت گذری ہو یا زیادہ، شوافعؒ کے نزدیک یہی قول اصح ہے، امام نوویؒ نے اسی کی تصریح کی ہے، (۲۶) مگر جبکہ کوئی عذر ہو، مصنفؒ نے تجنیس میں کہا ہے کہ عذر یہ ہے کہ جیسے زمین مغصوب ہو یعنی کسی غیر زمین میں اس کی اجازت کے بغیر دفن ہوا ہو اور وہ اجازت نہیں دیتا ہو، یا اس کو شفیع یا پڑوسی نے شفعہ کی بناء پر لے لیا ہو، اس لئے جب یہ صورت نہ ہو تو منتقل کرنا جائز نہیں کیا گیا، اسی بناء پر بہت سے صحابہ کرام جو کفرستان میں دفن کئے گئے تھے بعد میں بھی انہیں منتقل نہیں کیا گیا، کیونکہ کوئی عذر نہ تھا، (۲۷) اس کے بعد اگر زمین کا اصل مالک اس میں کھیتی کرنے کے خیال سے اسے برابر کر کے کھیتی کرے تو اسے جائز ہوگا، کیونکہ وہ اپنی زمین کے اوپر اور نیچے ہر جگہ کا حقدار ہے، اور اگر چاہے تو اپنا باطنی حق چھوڑے، (۲۸) اور ایک عذر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس لحد میں کسی کا مال یا کپڑا یا نقد ایک درہم تک گر گیا ہو تو اسے نکالنے کے لئے اس کا کھودنا جائز ہے۔

(۲۹) اگر کسی عورت کا لڑکا کسی مقام میں مرا اور دفن کیا گیا وہ عورت اپنے شہر میں واپس آئی اور اسے صبر نہ ہوا اس لئے اس نے چاہا کہ لاش کو منتقل کر کے لے آئے تو مشائخ نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ اسے اس بات کی اجازت نہیں ہے (۳۰) اور اب

کچھ متاخرین نے اگرچہ اس کی اجازت دی ہے مگر یہ قابل اعتبار نہیں ہے، جیسا کہ فتح القدیر میں ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ شہداء احدؓ اپنے مقام پر ہی دفن کئے گئے، اور صحیح روایت ہے کہ وہ نہر جو قبور شہداء کے قریب سے گذرتی تھی اس کے جاری کرنے کا لوگوں کو ارادہ ہوا تو سید الشہداء حمزہؓ کی انگلی کھل گئی، اس طرح زمانہ ولید بن عبد المالک میں جب رسول اللہ ﷺ کا قبہ مبارک بنایا گیا تو ایک قدم ظاہر ہو گیا اس لے وہ لوگ بہت گھبرا کر کہنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک کھل گیا ہے، لیکن حضرت عروہ بن الزبیرؓ نے کہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قدم مبارک نہیں ہے بلکہ حضرت عمرؓ کا ہے، اگرچہ حمزہ اور حضرت عمرؓ دونوں انصاری شہداء احد[1] میں سے ہیں، ان دونوں کی قبریں چھیالیس برس کے بعد کھودی گئی تھی پھر بھی دونوں ویسی ہی تازہ تھی، گویا کہ کل ہی شہید ہوئے ہوں، اس کے باوجود ان دونوں کو مدینہ منورہ منتقل نہیں کیا گیا، اور اسی بناء پر حضرت عقبہ بن عامرؓ سے صحیح بخاری میں جو روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آٹھ برسوں کے بعد شہداء احد پر ویسی ہی نماز پڑھی جیسی کے میت کی پڑھتے ہیں، اس نماز پڑھنے میں ہم پر کچھ اشکال اسی لئے لازم نہیں آیا کیونکہ ان شہداء احد میں کچھ بھی تغیر نہیں ہوا اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت تھی، یا یہ کہ وہ نماز کی شکل ہو مگر حقیقت میں صرف دعا ہو، کیونکہ سلف و خلف میں سے کسی نے بھی تو ان شہداء پر دوبارہ نفل نماز کی حیثیت سے دوبارہ نہیں پڑھی، اس کی بحث گذر چکی ہے۔

اب اس جگہ اس مسئلہ میں گفتگو ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے جس جگہ وفات پائی خاص اسی جگہ انہیں دفن کرنا صرف ان کی خصوصیت تھی اس وجہ سے شہداء جس میدان میں شہید کئے گئے ہوں انہیں اسی میدان میں خواہ کسی حصہ میں دفن کر دینا کافی ہے اس کے لئے خاص اسی جگہ کا ہونا جہاں اس کی جان نکلی ہو ضروری نہیں ہے (۳۲) عوام کے لئے بظاہر مذہب کے مطابق بہتر اور مستحسن صورت یہ ہے کہ وہ جس شہر میں ہوں وہیں کے مقبرہ میں دفن (۱) کئے جائیں، اس بندہ مترجم کو یہ بات بہت محبوب ہے کہ اس زمانہ میں اپنے علاقہ میں اگلے زمانہ کے صلحاء کا جواز اور پڑوس میں ہونا میسر ہو جائے، واللہ تعالیٰ اعلم ہو الموفق والمعین۔ م۔

(۳۳) رات کے وقت بھی دفن کرنا چاروں ائمہ اور جمہور علماء کے نزدیک بالاتفاق حضرت جابرؓ کی حدیث کی بناء پر جائز ہے، یہ حدیث ابوداؤد نے بخاری و مسلم کی شرط پر نقل کی ہے، اور حضرت ام المؤمنین عائشہؓ و سیدۃ النساء فاطمہؓ اور صحابہ کرام کی ایک جماعت رات کو مدفون ہوئی (۳۴) اور دوسری حدیث حضرت جابرؓ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے رات کے وقت دفن کرنے سے سخت فرمایا ہے یہانتک کہ اس پر نماز پڑھ لی جائے، مگر اس صورت میں جبکہ کوئی خاص ضرورت مجبور کر دے، مسلم نے اس کی روایت کی ہے، یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ بغیر نماز کے دفن کیا جائے بلکہ مفید ہے، کیونکہ انتہائی مجبوری کی حالت میں مثلاً لاش کے بدل جانے کا خوف ہو تو اس صورت میں نماز کے بغیر بھی دفن کر دینا جائز ہے، ظاہر مذہب کے مطابق قبرستان میں جوتے پہن کر چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ قبروں کو روندنا نہ ہو جیسا کہ امام شافعیؒ کے نزدیک ہے۔

(۳۶) عورتوں کے لئے زیارت قبور مکروہ ہے اس حدیث کی بناء پر لعن اللہ زوارات القبور یعنی اللہ تعالیٰ نے قبروں کی زیارت کرنے والیوں پر لعنت کی ہے، ترمذی نے اس کی روایت کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے، اور احمد اور ابن ماجہ نے بھی روایت کی ہے، جمہور علماء کا یہی قول ہے۔ ع۔ اور کہا گیا ہے کہ حضرت بریدہؓ کی حدیث میں ہے کہ میں نے تم کو قبروں کی زیادت سے منع کیا گیا تھا مگر اب زیارت کر لیا کرو، کہ یہ زیارت آخرت کو یاد دلاتی ہے، جیسا کہ صحیح میں ہے، اس اجازت میں عورتیں بھی داخل ہوئیں، اور حضرت عائشہؓ وغیرہا نے بھی زیارت کی ہے۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ ظاہر مذہب قول اولی ہی ہے، اور دلیل کے اعتبار سے بھی وہی قوی ہے، اگرچہ بعض علماء نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے، اور اس بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ مقبرہ میں جا کر جزع فزع کرنا حرام ہے، لہٰذا ظاہر مذہب پر عمل کرنا ہی زیادہ محتاط عمل ہے۔ م۔

(۳۷) فقیہ ابو اللیث نے قبر پر ہاتھ رکھنا خلاف اولی فرمایا ہے، شرف الائمہؒ نے کہا ہے کہ بدعت ہے، اور فقہاء خراسان نے

کہا ہے کہ کوئی قبر کو نہ مسح کرے نہ بوسہ دے نہ چھوئے، اور حافظ ابو موسیٰ اصبہانی نے کہا ہے کہ یہی قول صحیح ہے۔ مع۔ قبر کے پاس سونا اور کوئی بھی ایسا کام کرنا جو سنت میں مروجہ نہیں ہے مکروہ ہے، اور بطریقہ سنت یہی مقصود ہے کہ قبر کی زیارت اور کھڑے ہو کر دعا کی جائے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ جب بقیع میں جاتے تو فرماتے **السلام علیکم دار قوم مومنین وانا ان شاء اللہ بکم لاحقون، اسأل اللہ لی ولکم العافیہ**۔ الفتح۔ ف۔

جوامع الفقہ میں ہے کہ دعا کرنے والا بوقت دعا قبلہ رخ ہو جائے، اگرچہ رسول اللہ ﷺ کی زیارت میں ہو، یہی قول زعفران شافعیؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔ ع۔ امام ابو حنیفہؒ اور آپ کے اصحاب اور سارے مشایخ کے نزدیک بالاتفاق کسی کو یہ قدرت نہیں ہے کہ اپنی آواز کسی مردہ کو سنائے لیکن جب اللہ چاہے تو مردہ سنتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا چاہنا سلام ودعا وغیرہ پہونچنے کا ہمیں شروع سے معلوم ہوا اس لئے اپنے اٹکل سے ہم کسی بھی زائد چیز کو اس میں نہیں بڑھا سکتے ہیں، اور آخرت کی زندگی کو دنیوی زندگی پر قیاس کرنا بالکل غلط ہے، اس مسئلہ میں تمام فقہاء اور علماء امت متفق ہیں۔ م۔ مقتول ومردہ کے لئے اپنی متعین کردہ جگہ کی بجائے قوم کے قبرستانوں میں مدفون ہونا مستحب ہے، اور دفن کرنے سے پہلے دو ایک میل ادھر ادھر لے جا کر دفن کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ الخلاصہ۔ اور اپنے شہر کو منتقل کرنے میں بھی مضائقہ نہیں ہے، لیکن دفن کرنے کے بعد ایسا نہیں کرنا چاہئے، اگرچہ بغیر غسل یا بغیر قبلہ رخ یا الٹی طرف مدفون ہوا ہو، التبیین۔ البتہ اس صورت میں دفن کرنے کے بعد بھی منتقل کرنا جائز ہے جبکہ زمین غصب کی ہوئی ہو، یا کسی نے اس پر شفعہ کا حق کر رکھا ہو۔ القاضی خان۔

ان صورتوں میں مالک کو اختیار ہوگا کہ اگر چاہے اپنی مرضی سے اسے اسی طرح رہنے دے، ورنہ نکالنے کا حکم دے، اور چاہے تو اوپر سے کھیتی وغیرہ کرلے۔ التجنیس۔ اسی طرح جبکہ قبر میں کوئی سامان گر گیا ہو۔ قاضی خان۔ اگرچہ ایک درہم کے برابر ہی ہو۔ ف۔ مقبرہ کی ہری گھاس کاٹنا مکروہ ہے، کیونکہ اس کی تسبیح کرنے سے مردوں کو انس ہوتا ہے اور خشک گھاس لکڑی کے کاٹنے میں مضائقہ نہیں ہے۔ ع۔ قاضی خان۔ جو شخص کشتی میں مر گیا ہو اگر اسے قریب کی زمین پر لا کر دفن کرنا ممکن ہو تو ایسا ہی کرے، ورنہ غسل تکفین اور نماز کے بعد سمندر یا گہرے پانی میں ڈال دیا جائے، قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں کو قبر کے پاس بٹھلانا قول مختار کے مطابق مکروہ نہیں ہے، تجنیس میں ہے کہ اگر مردہ عورت کے پیٹ میں زندہ بچہ کی علامت پائی جا رہی ہو تو پیٹ چاک کر کے بچہ کو نکال لینا چاہئے (ایک موقع پر امام ابو حنیفہؒ نے فتویٰ دیا تھا اس کے بعد وہ بچہ زندہ رہ گیا تھا) اسی طرح اگر زندگی میں وہ کسی کا مال نگل گیا اور وہ پائخانہ سے بھی نہیں نکلا ہو اس کے بعد وہ مر گیا ہو تو اس کا پیٹ چاک کر کے نکالنے میں دو روایتیں ہیں، اور قول ارجح یہی ہے کہ چاک کرنا جائز ہے، اسی کو اس بری حرکت کی بناء پر اس کا حق احترام ختم ہو گیا ہے مردہ کے گھر والوں کا کوئی کھانا پکا کر تعزیت کے لئے آنے والوں اور جمع ہونے والوں کو کھلانا مکروہ تحریمی ہے۔

امام احمدؒ نے حضرت برید بن عبد اللہؓ سے روایت کی ہے کہ ہم لوگ مردہ کے یہاں جمع ہوئے اور ان لوگوں کے کھانا پکانے کھلانے کو نیاحت (آہ وبکاء کرنے) میں شمار کرتے تھے، اس کی اسناد صحیح ہے، پس جب صحابہ کرامؓ اپنے زمانہ میں اس طرح کھانے کھلانے کو نیاحت اور حرام میں شمار کرتے تو یہ بدعت اس زمانہ میں انتہائی قبیح ہے، البتہ اس کے گھر والوں کے لئے ان کے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو اتنا کھانا بھیج دینا مستحب ہے جو ان کے ایک دن رات پیٹ بھر کھانے کے لئے کافی ہو، رسول اللہ ﷺ نے آل جعفر کیلئے تیار کروایا تھا، جیسا کہ ترمذی اور حاکمؒ نے روایت کی ہے اور ان غمزدہ گھر والوں کو کھانے کے لئے اصرار کرے ——— کیونکہ ان کا غم انہیں کھانے سے روکے گا۔ خلاصہ الفتح۔ مردہ سے منکر ونکیر کا سوال قبر ہی میں ہوتا ہے اور عامہ علماء کے نزدیک یہ سوال وجواب اسی امت کے لئے مخصوص نہیں ہے، عامۃ علماء کے نزدیک مردہ کے اوپر اس کے اپنے لوگوں کے رونے کی وجہ سے عذاب نہیں ہوتا ہے ہاں اس صورت میں ہوگا جبکہ اس نے اس کام کی انہیں وصیت کی ہو، جیسا کہ ظہیریہ میں ہے۔ ع۔ اسی طرح اگر وہ اپنی زندگی میں اس سے راضی ہو۔ م۔ عید کے دنوں میں قبرستانوں میں کھانا لے جانا اور

چراغ روشن کرنا وغیرہ کام مکروہ ہیں، خلاصہ میں ہے کہ اگر قبرستان میں کسی یہودی کی ہڈی مل جائے تو اسے توڑنا نہیں چاہئے، اور جمع العلوم میں ہے کہ قبرستان میں عورت کی ہڈی پر بھی نظر کرنا جائز نہیں ہے۔ع۔

باب الشهيد

الشهيد من قتله المشركون او وجد في المعركة وبه اثر اوقتله المسلمون ظلما ولم يجب يقتله دية فيكفن ويصلى عليه ولا يغسل لانه في معنى شهداء احد و قال صلى الله عليه وسلم فيهم زملوهم بكلومهم ودمائهم ولا تغسلواهم.

ترجمہ:-باب، شہید کے بیان میں، شہید وہ شخص ہے جسے مشرکوں نے قتل کر دیا ہو یا لڑائی کے میدان میں اس حال میں پایا گیا ہو کہ اس پر زخم کا نشان ہو، یا مسلمانوں نے اسے ظلماً قتل کیا ہو اور اس قتل کی وجہ سے اس پر دیت لازم نہ ہوئی ہو، ان صورتوں میں اسے کفن دے کر اس پر نماز پڑھی جائے گی لیکن اسے غسل نہیں دیا جائے گا، کیونکہ ایسا مقتول شہداء احد کے حکم میں ہے، اور رسول اللہ علیہ نے ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ان کو ان کے اپنے ہی کپڑوں اور خون میں لپیٹ دو اور انہیں غسل نہ دو۔

توضیح:-باب، شہید کے بیان میں، شہید کی وجہ تسمیہ، شہادت کی قسمیں شہید کی تعریف، شہید ہونے کی شرط، شہادت کی صورتیں

باب الشهيد...... الخ شہید کے بیان میں، ان کا نام شہداء اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ مشہود بالجنہ ہیں، یعنی ان کے جنتی ہونے کا شریعت کی طرف سے وعدہ ہے، یا اس لئے کہ رسول اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ **انی شهيد على هؤلاء**، میں ان لوگوں پر شاہد ہوں یا اس لئے کہ یہ لوگ رسول اللہ علیہ کے ساتھ ہو کر ان لوگوں کے خلاف گواہ ہوں گے جنہوں نے رسول اللہ علیہ کی دعوت سے انکار کیا اور آپ کے ساتھ ناحق لڑے، یہانتک کہ آپ کے صحابہ میں سے یہ لوگ لڑائی میں شہید ہوئے۔م۔مع۔ شہادت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو احکام آخرت کے اعتبار سے شہید ہو، اگرچہ دنیاوی احکام میں اسے غسل وغیرہ دیا جائے، دوسرا وہ جو دنیا اور آخرت دونوں میں شہید ہو، یہانتک کہ اسے غسل نہ دیا جائے اور اس مسئلہ میں اصل شہداء احدؓ ہیں، ان ہی پر قیاس کرنے میں بعض اعتبار سے امام صاحبؒ اور صاحبینؒ میں اختلاف ہے، جو عنقریب معلوم ہوگا، اس کی تین قسمیں ہیں جن میں ایک دوسرے سے اعلیٰ ہیں، جیسا کہ مصنفؒ نے فرمایا ہے۔

الشهيد من قتله المشركون او وجد في المعركة وبه اثر اوقتله المسلمون ظلما......الخ

یعنی امام صاحب اور صاحبینؒ کے درمیان متفق علیہ قول میں، تین صورتوں میں سے پہلی صورت میں **من قتله المشركون الخ** جس مسلمان شخص کو مشرکوں نے قتل کیا ہو۔ف۔ خواہ تلوار بندوق لکڑی پتھر وغیرہ کے ڈھیلے جیسے کسی آلہ سے ہو، یا کسی ذریعہ سے ہو، بشرطیکہ قتل کرنے کا ہی ارادہ ہو۔المحیط۔ یہانتک کہ دشمن نے گھوڑے پر سوار ہو کر یا اسے پیچھے سے ہنکا کر اسے روند دیا یا دھکا دیا یا ٹھوکر یا لات مار کر یا پاؤں یا نیزہ مارا اس طرح سے وہ پانی یا آگ میں یا دیوار پر سے گر کر مر گیا اگرچہ خود نیزہ کی چوٹ گہری نہ ہو، یا پتھر مارا یا آگ پھینکی یا پانی میں ڈبو دیا۔الکافی۔ اور باغیوں اور ڈکیتوں کا حکم بھی مشرکوں جیسا ہے۔معف۔ امام اعظمؒ کے نزدیک شہید کا عاقل، بالغ اور طاہر ہونا شرط ہے، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک شرط نہیں ہے۔م۔

تین صورتوں میں سے دوسری صورت یہ ہے **او وجد الخ** یا وہ لڑائی کے میدان میں اس حال میں ملا کہ اس پر زخم کے نشانات ہوں۔ف۔ یہانتک کہ اس پر آنکھ یا کان یا پیٹ سے خون بہنے یا چلنے کا اثر ہو، اور تیسری صورت یہ ہے کہ **قتله المسلمون الخ** یا اس کو خود مسلمانوں نے قتل کیا ہو۔ف۔ ایسے آلہ اور سامان سے جو دھاری دار یا قتل کرنے کا ہی آلہ ہو اگرچہ شہر میں ہو، **ظلما** ہوا ہو۔ف۔ یعنی ناحق ہو اور حق قصاص کے بغیر ہو اور رجم کا وہ مستحق نہ ہو، ظلم کی شرط کے باوجود ایک شرط یہ بھی ہے کہ **لم**

یجب به الخ اس قتل کی وجہ سے اس پر دیت واجب نہ ہوئی۔ف۔ جیسے کہ غلطی سے قتل اور مشابہ عمد میں دیت واجب ہوتی ہے، بلکہ قصاص ہی واجب ہو، اگرچہ وہ کسی وجہ سے ساقط ہو جائے، جیسا کہ باپ نے اپنے بیٹے کو قصداً ناحق قتل کر دیا ہو، اس کے نتیجہ میں اصولی طور پر اسے بھی قتل کیا جانا چاہئے تھا مگر باپ کے احترام کی وجہ سے اس سے قصاص کا حکم ساقط ہو کر دیت لازم آجاتی ہے، اور جیسا کہ باپ کے علاوہ کسی نے دوسرے شخص کو قتل کیا مگر باہم صلح کرلی گئی تو وہ پھر بھی شہید رہا، پس ان تینوں صورتوں میں اس مقتول شہید کا یہ حکم ہوگا، فیکفن کہ اسے کفن دیا جائے۔ف۔ بلا اختلاف

فیکفن ویصلی علیه ولا یغسل لانه فی معنی شهداء احد......الخ

اور اس کی نماز پڑھی جائے، یہ حکم ہمارے نزدیک ہے لیکن امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے **ولا یغسل** اور اسے غسل نہ دیا جائے یہ حکم بھی غیر اختلافی ہے، کافی وغیرہ میں ہے کہ اس کے علاوہ ایک اور قید بھی ضروری ہے کہ اس نے ارتثاث نہ کی ہو، یعنی اس نے اس زخم کے بعد سے کوئی راحت نہیں پائی اور کھانے پینے کی دوا نہ پائی ہو اور اتنی دیر تک وہ ہوش وحواس میں زندگی گزار نے فرض نماز کا ایک وقت گذر جائے، یا خیمہ میں علاج کے غرض سے آجائے، یہ بھی ارتثاث کے حکم میں ہے اور اگر خیمہ میں علاج کے ارادہ سے نہ لایا گیا ہو تو ارتثاث میں شمار نہ ہوگا۔

واضح ہو کہ اگر لڑائی کے درمیان کھانا پینا کچھ ہوا ہو تو وہ ارتثاث کے حکم میں نہیں ہے البتہ اگر لڑائی کے بعد ہو تو اس سے ارتثاث ہو جائے گا یعنی یہ کہا جائے گا کہ اس نے دنیاوی فائدہ اٹھالیا ہے لہٰذا اب دنیاوی احکام میں وہ شہید نہیں ہے۔م۔فع۔ خلاصہ یہ ہوا کہ شہید آخرت میں زندہ اور اپنے ثواب میں خوش ہے، اور دنیا میں اسے غسل تو نہیں دیا جائے گا مگر اس کی تکفین اور نماز دونوں کام حسب دستور ہوں گے۔

لانه فی معنی شهداء احد و قال صلی الله علیه وسلم فیهم زملوهم بکلومهم ودمائهم......الخ

کیونکہ ایسا مقتول شہداء احد کے حکم میں ہے **وقال ﷺ الخ** اور رسول اللہ ﷺ نے ان شہداء احد کے بارے میں فرمایا ہے۔ف۔ کہ میں ان لوگوں کا شاہد ہوں **زملوهم الخ** کہ ان کو ان کے زخموں اور خونوں کے ساتھ لپیٹ دو، اور ان کو غسل نہ دو۔ف۔ اس کی روایت احمد ونسائی نے عبداللہ بن ثعلبہؓ سے کی ہے، اور جابرؓ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ شہداء احد کو جمع کرتے اور فرماتے کہ ان میں سے قرآن کا زیادہ حافظ ہے، جب آپ کو کسی کا نام بتایا جاتا تو اس کو پہلے لحد میں داخل فرماتے، اور فرمایا کہ میں قیامت میں ان کا گواہ ہوں گا، اور ان کو ان کے خون سمیت دفن کرنے کا حکم دیا، اور انہیں غسل نہیں دیا، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ اور ان کی نماز نہیں پڑھی، بخاری اور ترمذی، ابن عباسؓ نے خونوں اور پرانے کپڑوں میں ان کے دفن ہونے کو بیان کیا ہے، ابوداؤد، اور نوویؒ نے کہا ہے کہ اس کی اسناد مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ مفع۔ الحاصل اس جنگ میں چونکہ مومنین جو حق پر تھے اور کافروں نے انہیں ناحق قتل کیا ہے لہٰذا یہ سب شہید ہوگئے۔م۔

فکل من قتل بالحدید ظلما وهو طاهر بالغ ولم یجب به عوض مالی فهو فی معناهم فیلحق بهم والمراد بالاثر الجراحة لانها دلالة القتل وکذا خروج الدم من موضع غیر معتاد کالعین ونحوه والشافعی یخالفنا فی الصلوة ویقول السیف محاء للذنوب فاغنی عن الشفاعة ونحن نقول الصلوة علی المیت لاظهار کرامته والشهید اولی بها والطاهر عن الذنوب لایستغنی عن الدعاء کالنبی والصبی.

ترجمہ:۔ الحاصل ہر وہ شخص جو کسی دھار دار چیز سے ظلماً قتل کیا گیا، اور وہ پاک ہو بالغ ہو اور اس قتل کی وجہ سے مالی بدلہ واجب نہ ہوا ہو، تو وہ بھی ان (شہداء احد) کے جیسا ہوا، تو اسے بھی ان شہداء کے حکم میں ملالیا جائے گا، اور اثر سے مراد زخم ہے، کیونکہ یہ جراحت قتل پر دلیل ہے، اسی طرح کسی ایسی چیز سے خون نکلنا بھی ہے جہاں سے عام حالت میں نہ نکلتا ہو، جیسے آنکھ اور اس کے مانند کوئی جگہ، لیکن امام شافعیؒ اس پر نماز پڑھنے کے بارے میں ہم احناف سے اختلاف کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ تلوار

خود ہی گناہوں کو بہت زیادہ محو کرنے والی ہوتی ہے، اس لئے ایسا شخص سفارش چاہنے سے بے نیاز ہے، اور ہم لوگ جو اس پر نماز کے قائل ہیں کہتے ہیں کہ مردہ پر نماز پڑھنا اس کی تعظیم و تکریم کو ظاہر کرنے کے لئے ہوتی ہے، اور شہداء تو اس اظہار تعظیم یا اعزاز کا بہت زیادہ مستحق ہے، اور گناہوں سے پاک ہونے سے دعا سے مستغنی نہیں ہو سکتا ہے، جیسے کہ نبی کریم ﷺ اور چھوٹے بچے۔

توضیح:۔ شہید پر نماز نہ پڑھنے میں شافعیہ کی قیاسی دلیل، اور احناف کا جواب

فكل من قتل بالحديد ظلما وهو طاهر بالغ ولم يجب به عوض مالي فهو في معناه......الخ

جو شخص دھار دار چیز سے ظلماً قتل کیا گیا یعنی ناحق طور پر۔ف۔ جبکہ یہ لڑائی مسلمانوں کے درمیان ہو ورنہ کافروں سے جس طرح بھی قتل کیا گیا ہو خواہ دھار دار ہو یا نہ ہو وہو طاهر الخ اور یہ مسلمان مقتول پاک اور بالغ ہو۔ف۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک وہ عاقل و بالغ ہو اور جنابت و حیض و نفاس سے پاک ہو، لیکن صاحبینؒ کے نزدیک یہ شرط نہیں ہے، ولم يجب به الخ اور اس قتل کی وجہ سے مالی عوض بھی لازم نہ ہوا ہو۔ف۔ اور نہ اس نے ارتثاث (کسی قسم کا دنیاوی فائدہ) حاصل کیا ہو، تو ایسا شخص بھی شہداء احد کے مانند ہو۔

فيلحق بهم والمراد بالاثر الجراحة لانها دلالة القتل......الخ

تو ان ہی کے حکم میں اسے ملایا جائے گا۔ف۔ یعنی دنیاوی احکام میں شہداء احد کے ساتھ جو برتاؤ ہوا تھا وہی اس کے ساتھ بھی ہوگا، اس لئے غسل دیئے بغیر اس کو کفن دینا اور نماز پڑھ کر دفن کر دینا ہوگا، والمراد بالاثر الخ اثر سے مراد زخم ہے۔ف۔ یعنی مصنفؒ نے ذرا پہلے جو یہ فرمایا کہ ہے اس میں اثر پایا جا رہا ہو تو اس اثر سے مراد جراحت اور زخمی ہونا ہے۔ لانها دلالة الخ کیونکہ زخمی ہونا دلیل ہے، وكذا الخ اسی طرح عادت کے خلاف جگہ سے خون نکلنا مثلاً ناک کان اور اس جیسی جگہ سے۔ف۔ کان یا پیٹ سے اوپر آکر منہ سے نکلے بخلاف ناک یا پائخانہ کی جگہ یا پیشاب کی جگہ سے خون آنا، کیونکہ ان جگہوں سے نکسیر اور بواسیر وغیرہ جیسی بیماری سے خون نکلتا رہتا ہے، اس لئے یہ قتل کی دلیل نہیں ہے، الزیادات۔ع۔

والشافعي يخالفنا في الصلوة ويقول السيف محاء للذنوب فاغني عن الشفاعة......الخ

اور شافعیؒ نماز کے مسئلہ میں ہم سے مخالف ہیں۔ف۔ کیونکہ یہ فرماتے ہیں کہ شہید پر نماز پڑھنا حرام ہے، النووی۔ اور ہم یہ کہتے ہیں کہ نماز پڑھی جائے گی، یہی قول امام شافعیؒ کے شاگرد مزنیؒ کا ہے، امام احمدؒ و اوزاعیؒ و ثوریؒ و مکحول و سعید بن المسیب و حسن بصری و عکرمہؒ اور عقبہ بن عامر و ابن عباسؓ کا قول ہے۔ ویقول الخ اور شافعیؒ اپنی دلیل میں فرماتے ہیں کہ تلوار تو گناہوں کو بالکل مٹا دیتی ہے، اس لئے تلوار کے نشان نے ایسے شخص کو سفارش اور دعا سے بے نیاز کر دیا ہے۔ف۔ اور بخاری اور ترمذی میں حضرت جابرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول ﷺ نے شہداء کی نماز نہیں پڑھی.

ونحن نقول الصلوة على الميت لاظهار كرامته والشهيد اولى بها......الخ

اور ہم احناف کہتے ہیں کہ میت پر نماز پڑھنا اس کے اکرام اور عزت شان کے لئے ہوتی ہے، اور اس مقصد کے لئے شہید زیادہ مستحق ہے۔ف۔ اور حضرت جابرؓ کا نماز سے انکار مکروہ ہونا اس لئے ہے کہ کسی وجہ سے انہوں نے پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ اس جنگ احد میں ان کے والد، بھائی اور ماموں بھی سارے گئے تھے اس سلسلے میں کچھ ضروری انتظام کے لئے وہ اس جگہ سے مدینہ منورہ واپس آگئے تھے، اور ان کے پیچھے میں رسول اللہ ﷺ نے ان شہداء احد پر نماز پڑھی تھی، اس لئے انہوں نے جو کچھ دیکھا تھا اسی کی روایت کی۔ع۔ اور گناہوں کے مٹادئے جانے سے یہ لازم نہیں آتا ہے کہ اس کی نماز بھی نہ پڑھی جائے۔

والطاهر عن الذنوب لایستغنی عن الدعاء کالنبی والصبی......الخ

اور جو کوئی گناہوں سے پاک ہو وہ دعاء سے مستغنی نہیں ہو جاتا ہے، جیسے انبیاء کرام اور چھوٹے بچے۔ ف۔ اور تحقیقی بات یہ ہے کہ دعا سے صرف گناہوں کی مغفرت نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ گناہ نہ ہونے کی صورت میں درجات کی بلندی اور منزلوں کی رفعت بھی ہوتی ہے، کیونکہ آخرت میں بلندی مراتب کی کوئی حد وانتہاء نہیں ہے۔ م۔ اور عطاء بن ابی رباح تابعیؒ نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے شہداء احد پر نماز پڑھی ہے، ابوداؤدؒ نے اپنے مراسیل میں اس کی روایت کی ہے، اور حاکم نے جابرؓ سے اور امام احمدؒ نے ابن مسعودؓ سے اور دار قطنیؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے شہداء کے بیان میں رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی روایت کی ہے، ابن الہمامؒ نے کسی ایک اسناد کو بھی حسن کے درجہ سے کم ثابت نہیں کیا ہے، جبکہ متعدد ضعیف روایتیں بھی مل کر حسن کے درجہ کو پہونچ جاتی ہیں پھر شداد بن الہاد التابعیؒ نے کہا ہے کہ غزوہ احد میں لشکر جاتے وقت ایک اعرابی آیا اور رسول اللہ ﷺ کے پیچھے چلنے لگا، آخر حدیث تک۔

اس میں یہ جملہ بھی ہے کہ بالآخر اس اعرابی نے شہادت پائی اور رسول اللہ ﷺ نے اس کی نماز پڑھی، نسائی نے اس کی روایت کی ہے، اور عقبہ بن عامرؓ کی حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے آٹھ برس بعد شہداء احد کی اس طرح نماز پڑھی جیسے جنازہ کی نماز پڑھتے تھے، بخاری اور مسلم نے اس کی روایت کی ہے، اور ابومالک غفاریؒ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہؓ کے ساتھ نو شہداء پر نماز پڑھی پھر وہ نو اٹھا لئے گئے، اور حمزہؓ وہیں رہے، پھر دوسرے نو لائے گئے اور حضرت حمزہؓ کے ساتھ رکھے گئے۔ الخ۔ جیسا کہ طحاوی اور دار قطنیؒ نے روایت کی ہے، میں مترجم کہتا ہوں کہ اسی طرح دس بار نماز ہوئی اور ہر نماز میں سات تکبیریں کہی گئیں اس طرح حضرت حمزہؓ پر ستر تکبیریں ہو گئی، جیسا کہ روایتوں میں آیا ہے، اچھی طرح سمجھ لیں، ابن عباس وابن الزبیرؓ سے شہداء احد کی نماز پڑھنے کی روایت موجود ہے۔

اسی طرح شہداء احد کے علاوہ بھی ثابت ہے، چنانچہ ایک اعرابی کے لئے ایک موقع پر غنیمت کا حصہ لگایا گیا تو اس نے کہا کہ میں حضور کے پیچھے اس امید میں لگا تھا کہ میرے حلق پر اس جگہ تیر لگے اور میں شہید ہو کر جنت جاؤں، پھر ایک جہاد میں اس کو اسی جگہ تیر لگا اور وہ شہید ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے جبہ کا اسے کفن دیا اور اس کی نماز پڑھی، اور نماز میں دعاء فرمائی کہ الٰہی! یہ تیرا بندہ تیری راہ میں ہجرت کر کے شہید ہوا ہے، میں اس کا گواہ ہوں، اس کے بعد آپ نے اسے غسل تو نہیں دیا مگر اس کی نماز پڑھائی، اس کی روایت نسائی اور طحاوی نے کی ہے، اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے غزوہ احد کے شہداء کے علاوہ اور دوسروں کی بھی نماز پڑھائی ہے، پھر عقبہ بن عامرؓ کی اس حدیث سے جو بخاری میں ہے اس بات کی تصریح ہے کہ ایسی نماز پڑھی جیسی میت پر پڑھا کرتے تھے، اس لئے ہم ان تمام حدیث میں یہ نہیں کہہ سکتے ہیں ان میں لفظ صلوۃ مطلقاً دعا کے معنی میں ہے بلکہ پوری نماز جنازہ کے معنی ہیں۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ شہید تو زندہ ہوتے ہیں جبکہ نماز مردوں پر پڑھی جاتی ہے، جواب یہ ہے کہ دنیاوی احکام کے اعتبار سے شہید بھی مردہ ہوتا ہے اسی بناء پر شہید کی بیوہ کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ کسی سے بھی نکاح کر لے، اور اس کا ترکہ دوسرے مردوں کی طرح تقسیم کر دیا جاتا ہے کیونکہ وہ میراث بن جاتا ہے، اس کے علاوہ اور بھی دوسرے مسائل میں دوسرے مردوں کے برابر ہوا کرتا ہے، اور ان کو زندہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ آخرت کی زندگی کے اعتبار سے زندہ ہوتا ہے، اس فرمان باری تعالیٰ کے پیش نظر احیاء عند ربھم کہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، البتہ وہ زندگی جس طرح کی اور جس شان کی ہو صحیح قطعی ہے، اور مردہ کو غسل دینا اور اس کی نماز پڑھنا اس کے دنیاوی احکام میں سے ہیں اس لئے اعتراض یا تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ م۔ مفع۔

ومن قتله اهل الحرب او اهل البغی اوقطاع الطریق فبای شیء قتلوه لم یغسل لان شهداء احد ما کان

کلهم قتيل السيف والسلاح واذا استشهد الجنب غسل عند ابی حنيفة وقالا لايغسل لان ما وجب بالجنابة سقط بالموت والثانی لم يجب للشهادة ولا بی حنيفة ان الشهادة عرفت مانعة غير رافعة فلا ترفع الجنابة وقد صح ان حنظلة لما استشهد جنبا غسله الملئكة.

ترجمہ:-اور جسے کسی حربی نے یا باغی نے یاڈاکو نے قتل کیا ہو تو خواہ کسی چیز سے بھی اسے قتل کیا ہو اسے غسل نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ ان شہداء احد میں سے سب کے سب تو صرف تلوار اور ہتھیار ہی کے مقتول نہ تھے، اور اگر کوئی جنبی شخص شہید کر دیا جائے تو اسے غسل دیا جائے گا، یہ حکم امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک ہے کیونکہ صاحبینؒ کے نزدیک اسے بھی غسل نہیں دیا جائے گا، کیونکہ جنبی ہو جانے کی وجہ سے جو اس پر غسل لازم آیا تھا موت سے ساقط ہو گیا، اور دوسرا یعنی موت کی وجہ سے جو غسل لازم آیا تھا وہ شہید ہو جانے کی وجہ سے واجب نہ ہوا، اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ شہید ہونے کو اس حیثیت سے تو جانا گیا ہے کہ وہ مانع ہے لیکن اسے اسی حیثیت سے نہیں جانا گیا ہے کہ وہ رافع ہے، لہٰذا اس کی جنابت کو ختم نہیں کرے گا اس کے علاوہ یہ روایت صحیح طور سے ثابت ہے کہ حضرت حنظلہؓ چونکہ جنابت کی حالت میں شہید کئے گئے تھے فرشتوں نے انہیں غسل دیا تھا۔

توضیح:-ذمی اور مستامن کی تعریف، ذمی یا مستامن نے کسی مسلمان کو ظلماً مار ڈالا، اپنی یا مسلمانوں یا ذمیوں کی جان بچاتے ہوئے کوئی ناحق مارا گیا، ایک جہاز پر کافروں نے آگ پھینکی جس سے اس کے اور دوسرے جہاز کے لوگ بھی مر گئے، کافروں نے مسلمانوں کو بھگایا اور وہ دریا میں گر گئے اور مر گئے، کافروں نے اپنے چاروں طرف گوکہرو بچھادئے جن سے کوئی مسلمان مر گیا، شہید کا کفن، شہید کے کپڑوں میں نجاست، شہید کا خون، حالت جنابت میں شہید، دلیل

ومن قتله اهل الحرب او اهل البغی اوقطاع الطريق فبای شیء قتلوه لم يغسل......الخ

ترجمہ واضح ہے۔ف۔اہل الحرب۔یا حربی سے مراد وہ کفار ہیں جو خود مختار ہوں اور مسلمانوں سے لڑائی جاری رکھے ہوئے ہوں، اہل بغاوت "یا باغی ایسا مسلمان یا ان کی جماعت جو مسلمانوں کے امام سے کسی بات پر ناراض ہو کر اس کی بیعت سے پھر جائیں، اور امام اور اس کے ماننے والیں جنگ کریں، "قطاع الطریق" ڈاکو، ڈکیتی کرنے والے، یہ لوگ جسے مار ڈالیں خواہ کسی چیز سے بھی ہو وہ شہید ہے۔

لان شهداء احد ما كان كلهم قتيل السيف والسلاح......الخ

کیونکہ شہداء احد تو سب کے سب تلوار و ہتھیار سے ہی شہید نہیں گئے گئے تھے۔ف۔شاید ایسا ہی ہو۔واللہ اعلم۔(کہ اس کی تحقیق نہیں ہو سکی ہے) مگر اس کے لئے اتنی بات ہی کافی ہے کہ اس مقتول نے بھی رضائے الٰہی کے حصول میں اپنی جان فدا کی ہے، اور ایسا ہی شخص شہید کہلاتا ہے۔ف۔وہ کفار جو مومنوں کے ملک میں وعدہ اور ذمہ داری کے ساتھ رہتے ہیں جن کو ذمی کہا جاتا ہے یا کوئی حربی کافر امان لے کر ہمارے ملک میں آئے جسے مستامن کہتے ہیں، اگر ان میں سے کسی ذمی یا مستامن نے کسی مومن کو ظلماً قتل کیا تو وہ شہید ہے۔المحیط۔ع۔جو شخص اپنی یا کسی مسلمان کی جان یا مال بچانے میں یا اپنے ذمیوں کی جان بچانے میں ناحق کسی آلہ یا کسی چیز سے قتل ہوا ہو تو وہ بھی شہید ہے۔محیط السرخسی۔کافروں نے مسلمانوں کے ایک جہاز پر آگ پھینکی جس سے اس جہاز کے بعد دوسرے جہاز میں بھی آگ لگی اور اس کے مسافر جل کر ختم ہو گئے تو وہ سب شہید ہو گئے، الخلاصہ۔

اور اگر کافروں نے مسلمانوں کو بھڑکایا یہاںتک کہ وہ دریا کے کنارے پہونچے اور ان میں سے کچھ نے خود کو پانی میں ڈال دیا اور مر گئے تو یہ شہید نہیں ہوئے یعنی دنیاوی احکام کے اعتبار سے، اسی طرح اگر اپنے چاروں طرف گوکہرو (بارودی سرنگ وغیرہ)

بچھادئے جس سے کوئی مسلمان مر گیا۔مف۔ شہید کو اس کے اپنے کپڑوں اور خون میں دفن کر دیا جائے۔ الکافی۔ اگر شہید کے کپڑوں میں نجاست لگی ہو تو دھودی جائے۔العتابیہ۔ خون شہید ناپاک و نجس نہیں ہوتا ہے، ایسا شخص آخرت کے حکم میں بلا اختلاف شہید ہے۔م۔ یہ قول امام ابو حنیفہ کا ہے۔ف۔ کیونکہ ان کے نزدیک طہارت شرط ہے۔

وقالا لایغسل لان ما وجب بالجنابة سقط بالموت والثانی لم یجب للشهادة......الخ

اور صاحبینؒ نے کہاہے کہ اسے غسل نہیں دیا جائے کیونکہ وہ غسل جو جنابت کی وجہ سے لازم ہوا ہے وہ تو موت کی وجہ سے ساقط ہو گیا ہے، اور دوسرا غسل یعنی مرنے کے بعد کا غسل وہ اس کے شہید ہو جانے کی وجہ سے واجب نہیں ہوا ہے۔

ولابی حنیفة ان الشهادة عرفت مانعة غیر رافعة فلا ترفع الجنابة......الخ

اور امام ابو حنیفہؒ کی دلیل یہ ہے کہ شہادتؔ کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوا ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد جو ہر شخص کو غسل دینا لازم آتا ہے اس کی شہادت اس کے غسل کے لئے مانع ہو جاتی ہے، اور ایسی بات نہیں ہے کہ انسان پر غسل لازم ہو جانے کے بعد شہادت اسے ختم نہیں کر دیتی ہے یعنی اسے رفع نہیں کر دیتی ہے، لہٰذا وہ جنابت کو دور نہیں کرے گی وقد صح الخ اور حدیث سے یہ بات صحیح ثابت ہو چکی ہے کہ حضرت حنظلہؓ شہادت پانے کے وقت چونکہ وہ جنبی تھے اس لئے فرشتوں نے انہیں غسل دیا تھا۔ف۔ جس کا قصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ عام اعلان کیا گیا تھا کہ جہاد کے لئے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلو، اعلان سنتے ہی سب لوگ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، ان ہی لوگوں میں حضرت حنظلہؓ بھی ساتھ چلے، بالآخر لڑائی میں یہ حنظلہؓ شہید کر دئے گئے، پھر جب رسول اللہ ﷺ نے ان کی لاش دیکھی تو مسکرائے اور فرمایا کہ ان حنظلہ کو تو فرشتے غسل دے رہے ہیں، اس عجیب بات کی تحقیق کے لئے حضرت حنظلہ کی بی بی سے سوال کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں وہ میرے ساتھ لیٹے ہوئے تھے اتنے میں اچانک جہاد کے لئے اعلان سنتے ہی وہ نکل کھڑے ہوئے، غسل کر کے نکلنے میں انہیں تاخیر کا خوف ہوا تھا، یہ قصہ اسناد صحیح کے ساتھ ابن حبان، حاکم، ابن اسحٰق اور طبرانی نے روایت کی ہے، لہٰذا وہی غسل ملائکہ ان کے لئے کافی ہو گیا جیسا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا غسل کافی ہوا۔ مفع۔

وعلی هذا الخلاف الحائض والنفساء اذا طهرتا وکذا قبل الانقطاع فی الصحیح من الروایة وعلی هذا الخلاف الصبی لهما ان الصبی احق بهذه الکرامة وله ان السیف کفی عن الغسل فی حق شهداء احد بوصف کونه طهرة ولاذنب عن الصبی فلم یکن فی معناهم ولایغسل الشهید دمه ولاینزع عنه ثیابه لما روینا وینزع عنه الفرو والحشو والسلاح والخف لانها لیست من جنس الکفن ویزیدون وینقصون ماشاؤا اتماما للکفن.

ترجمہ۔ اور اسی اختلاف کے مطابق حیض اور نفاس والیوں کا حکم بھی ہے جبکہ وہ دونوں پاک ہو چکی ہوں۔ اسی طرح صحیح روایت کے مطابق خون بند ہونے سے پہلے بھی، اسی اختلاف کے مطابق بچہ کا بھی حکم ہے۔ صاحبین کی دلیل یہ ہے کہ اس شرافت و کرامت کا زیادہ مستحق بچہ ہے اور امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ شہداء احد کے حق میں تلوار ہی غسل کے بجائے کافی ہے۔ اسی وصف کی وجہ سے کہ تلوار گناہوں سے پاک کرنے والی ہے اور بچوں پر تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ اس لئے نابالغ ان شہداء کے حکم میں نہ ہوا، شہید سے اس کے بدن کے خون کو دھویا نہ جائے۔ اسی طرح شہید کے کپڑے نہ اتارے جائیں۔ اس بناء پر جو ہم نے پہلے روایت کی ہے البتہ اس شہید سے پوستین اور روئی وغیرہ سے بھرے ہوئے کپڑے، اور ہتھیار اور موزے اتار لئے جائیں کیونکہ یہ چیزیں کفن کی جنس سے نہیں ہیں، اور کفن کی تعداد پوری کرنے اور باقی رکھنے کے لئے کچھ کر سکتے ہیں اسی طرح کم بھی کر سکتے ہیں۔

توضیح، حائض اور نفساء کا شہید ہونا، شہید بچے کا حکم، شہید کے کپڑے

حدیث سے دلیل، پوستین، ہتھیار، موزہ ٹوپی پائجامہ اور روئی دار کپڑا، شہید کے کفن میں زیادتی و کمی

وعلى هذا الخلاف الحائض والنفساء اذا طهرتا وكذا قبل الانقطاع في......الخ

اسی اختلاف کے مطابق حائض کا حکم بھی ہے، ف جبکہ تین دن یازیادہ خون آچکا ہو ورنہ تین دن سے کم ہونے میں بالاتفاق غسل نہیں ہو گا، الثمر تاشی۔ ع۔ والنفساء الخ اور نفاس والی عورت کا بھی حکم ہے اذا طهرتا جبکہ دونوں اپنے ایام سے پاک ہو چکی ہوں۔ ف۔ توان پر غسل واجب ہو گا، اب اگر غسل سے پہلے دونوں شہید کر دی جائیں تو امام اعظمؒ کے نزدیک حیض و نفاس کا غسل واجب ہے، اور صاحبینؒ کے نزدیک واجب نہیں ہے۔

وكذا قبل الانقطاع في الصحيح من الرواية وعلى هذا الخلاف الصبي......الخ

اسی طرح خون بند ہونے سے پہلے بھی صحیح روایت کی بناء پر۔ ف۔ وہ روایت حسنؒ کے توسط سے امام اعظمؒ کی ہے، کیونکہ موت آجانے سے ایسا ہوتا ہے گویا اس کے خون کے دن بند ہو گئے، وعلى هذا الخ اسی اختلاف کے مطابق نابالغ کا حکم بھی ہے۔ ف۔ کہ امام اعظمؒ کے نزدیک غسل دیا جائے، اور صاحبینؒ کے نزدیک غسل نہیں دیا جائے۔

لهما ان الصبي احق بهذه الكرامة وله ان السيف كفي عن الغسل في حق شهداء احد......الخ

صاحبینؒ کی دلیل یہ ہے کہ نابالغ اس اکرام واحترام کا زیادہ مستحق ہے۔ ف۔ کہ اسے بھی غسل کے بغیر پاک قرار دیا جائے، وله الخ اور امام صاحب کی دلیل یہ ہے کہ شہدائے احد کے حق میں غسل کی طہارت حاصل کرنے کے لئے تلوار بھی کافی ہے، کیونکہ تلوار، گناہوں سے بہت زیادہ پاک کرنے والی ہوتی ہے۔ ف۔ کیونکہ حدیث میں ہے السيف محاء للذنوب یعنی تلوار گناہوں سے بہت زیادہ پاک کرنے والی ہے، جیسا کہ ابن حبانؒ نے روایت کی ہے۔

ولاذنب عن الصبي فلم يكن في معناهم......الخ

لہذا یہ نابالغ بے گناہ ان شہداء کے حکم میں نہ ہوا۔ ف۔ لہذا نابالغ کو غسل دیا جائے، اور یہی اولی ہے۔ الفتح۔ اور ایسے دیوانہ میں جو پیدائشی ہو یہی اختلاف ہے، زع، ولا یغسل شہید سے اس کا خون نہیں دھویا جائے اور نہ اس کے کپڑے اتارے جائیں، لما روينا الخ اس حدیث کی بناء پر جس کی روایت ہم نے پہلے بیان کی ہے۔ ف۔ یعنی زملوهم بكلومهم ودمائهم، الخ بلکہ حضرت ابن عباسؓ کی حدیث کی بناء پر رسول اللہ ﷺ شہدائے احد کے بارے میں حکم دیا کہ ان کے بدن سے لوہا اور پوستین نکال دو، اور ان کو ان کے کپڑے اور خون میں دفن کر دو، ابوداؤد اور ابن ماجہؒ نے اس کی روایت کی ہے۔ ع۔

وينزع عنه الفرو والحشو والسيف والخف لانها ليس من جنس الكفن......الخ

اور شہید کے بدن سے یہ فاضل سامان اتار دیئے جائیں۔ پوستین۔ الحشو روئی وغیرہ سے بھرا کیا ہوا کپڑا السلاح ہتھیار الخف موزے۔ ف۔ ٹوپی، پائجامہ۔ المحیط۔ لانها ليس الخ کیونکہ یہ چیزیں کفن کے جنس سے نہیں ہیں۔ ف۔ اس لئے یہ قاعدہ قرار پایا کہ جو چیز کفن کے جنس میں سے نہ ہو اسے اتار دیا جائے و يزيدون الخ اور کفن کی مقدار باقی رکھنے کے لئے جو سامان سنت سے زیادہ ہو اسے لوگ اتار دیں اور جو کم ہو اسے بڑھا دیں، یعنی کفن سنت پورا ہونا چاہئے۔ الکافی۔ اور فقیہ ابو جعفرؒ نے کہا ہے کہ پائجامہ نہیں اتارنا چاہئے۔ الاسبیجابی۔ والمستحفہ۔ ع۔ اور حنوط لگایا جائے۔ البحر۔

ومن ارتثّ غسل وهو من صار خلقا في حكم الشهادة لنيل مرافق الحيوة لان بذلك يخفف اثر الظلم فلم يكن في معنى شهداء احد، والارتثاث ان يأكل أو يشرب أو ينام أو يداوى أو ينقل من المعركة لانه نال بعض مرافق الحياة، وشهداء احد ماتوا عطاشا والكأس تدار عليهم فلم يقبلوا خوفا من نقصان الشهادة الا اذا حمل من مصرعه كيلا تطأه الخيول لانه ما نال شيئا من الراحة ولو اواه فسطاط اوخيمة كان مرتثا لما بينا ولو بقي

حیا حتی مضی وقت صلوۃ وھو یعقل فھو مرتث لان تلک الصلوۃ صارت دینا فی ذمتہ وھو من احکام الاحیاء.

ترجمہ:۔ان شہداء میں سے جو کوئی ارتثاث پائے اسے غسل دیا جائے، اور وہ ایسا شخص ہوگا جو حکم شہادت میں پرانا ہو گیا ہو زندگی کے منافع پالینے کی وجہ سے کیونکہ اس کے پانے کی وجہ سے اس پر ظلم کا اثر ہلکا ہو گیا ہے، تو اب شہداء احد کے حکم میں نہیں رہا، ارتثاث کی صورت یہ ہوگی کہ کھائے یا پئے یا سوئے یا علاج کرائے یا لڑائی کے میدان سے منتقل کر دیا جائے، کیونکہ ان کاموں کی وجہ سے اس نے زندگی کے کچھ منافع حاصل کر لئے، جبکہ اور شہداء نے ایسی صورت میں وفات پائی تھی کہ پانی کا پیالہ ان کے پاس سے دوسرے تک چکر کھاتا رہا اس کے باوجود شہادت کے مرتبہ میں کمی آجانے کے خوف سے انہوں نے اسے لینا قبول نہیں کیا اور پیاسے رہ گئے۔البتہ اگر ان میں سے کوئی اس کی شہادت گاہ سے اس خیال سے اٹھالیا گیا کہ اسے گھوڑے روند نہ دیں، کیونکہ فقط اتنی سی بات سے اپنی زندگی کا کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کیا، اسی بناء پر اگر لوگوں نے اسے کسی بڑے یا چھوٹے خیمہ میں لا کر رکھ دیا تو وہ مرتث ہوگا، اس بناء پر جو ہم نے پہلے بیان کر دی ہے، اور اگر زخمی ہونے کے بعد بھی وہ ہوش کی حالت میں اتنی دیر زندہ رہ گیا جس میں ایک نماز کا وقت گذر گیا تو وہ بھی مرتث ہے، اس لئے کہ یہ نماز اس کے ذمہ فرض ہو گئی اور یہ بات زندوں کے احکام میں سے ہے۔

توضیح:۔اگر زخمی ہونے کے بعد مرتث ہوا، کھایا پیا، آرام پایا، نماز کا وقت گذرا

ومن ارتث غسل وھو من صار خلقا فی حکم الشھادۃ لنیل مرافق الحیوۃ......الخ

ترجمہ سے مطلب واضح ہے، اویشرب الخ ارتثاث پانے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ کچھ پئے یا سو جائے۔ف۔یا خرید و فروخت کرے یا بہت باتیں کرے یا نماز پڑھ لے۔البدائع۔ع۔اویداوی یا اس کا علاج کیا جائے، یا لڑائی کے میدان سے اسے زندہ منتقل کیا جائے۔ف۔بشرطیکہ یہ تیمارداری کے طور پر ہو۔الذخیرہ۔یا ایک رات دن اپنے گرنے کی جگہ پر زندہ پڑا رہ جائے۔التحفہ۔المحیط۔المفید۔ع۔لانہ نال الخ، کیونکہ اس نے زندگی کی کچھ راحتیں حاصل کر لیں، جبکہ شہدائے احد پیاسے مر گئے، حالانکہ ان سبھوں کے پاس سے پانی کا بھرا پیالہ چکر کھاتا رہا اس کے باوجود درجہ شہادت میں کمی آجانے کے خوف سے اس کا پینا قبول نہیں کیا۔ف۔قصہ ختم ہوا۔ف۔ع۔

الا اذا حمل من مصرعہ کیلا تطاہ الخیول لانہ ما نال شیئا من الراحۃ......الخ

اور اگر اسے اس کے مقتل سے اٹھالیا گیا ہو تا کہ گھوڑے اسے کچل نہ دیں۔ف۔تو یہ منتقل کرنا کچھ نقصان دہ نہیں ہوگا۔لانہ ما نال الخ کیونکہ اس نے مطلقاً کچھ بھی فائدہ حاصل نہیں کیا۔ف۔اس جگہ دلیل میں اہل احد کے بارے میں جو قصہ ہے وہ کیا ہے۔واللہ اعلم۔لیکن یہ روایت کہاں کی ہے، البتہ شعب الایمان میں ابوجہیم بن حذیفہ العدویؓ سے روایت ہے کہ جنگ یرموک کے دن میں نے پانی کا مشکیزہ لے کر مقتولوں میں اپنے چچازاد بھائی کو تلاش کیا کہ اس کے منہ میں پانی ٹپکا دوں بشرطیکہ کچھ بھی اس میں زندگی باقی رہ گئی ہو، یہانتک کہ میں نے انہیں پالیا، اور ان کے چہرہ پر ہاتھ پھیرا، پھر میں نے ان سے کہا کہ پانی پلادوں تو اشارہ سے کہا کہ ہاں، اچانک ایک آواز اور بھی آئی تو میرے چچازاد بھائی نے کہا یہ وہاں لے جائیں، میں نے وہاں جا کر دیکھا تو عمرو بن العاصؓ کے بھائی ہشام بن العاصؓ ہیں، میں نے ان سے کہا کہ پانی پلادوں، اتنے میں اور ایک آواز آہ کی آئی تو ہشام نے اشارہ سے فرمایا کہ اس کے پاس لے جائیں پس میں وہاں تک پہونچا تو دیکھا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے، پھر میں مشکیزہ لے کر ہشام کی طرف آیا تو دیکھا کہ وہ بھی انتقال کر چکے ہیں، پھر میں بہت جلد اپنے چچازاد بھائی کی طرف آیا تو دیکھا کہ وہ بھی انتقال کر چکے، اس کی روایت بیہقیؒ نے کی ہے، حبیب بن ابی ثابتؒ سے روایت ہے کہ حارث بن ہشام و عکرمہ بن ابی جہلؓ و عیاشؓ بن ابی ربیعہؓ جنگ یرموک میں شہید ہوئے تو حارث کے لئے پانی لایا گیا، اتنے میں عکرمہؓ نے اس طرف دیکھا تو حارث نے کہا پانی عکرمہؓ کے پاس لے جاؤ، اس

لئے عکرمہؓ کے پاس لے کر گئے پھر عیاش نے اس طرف نگاہ دوڑائی تو عکرمہؓ نے کہا کہ عیاش کے پاس پانی لے جاؤ، اب عیاش تک پہنچے سے پہلے ہی ان کا انتقال ہو گیا، اس طرح باقی دونوں کے پاس پہونچنے سے پہلے وہ دونوں بھی انتقال کر گئے، اور کسی نے بھی پانی نہیں چکھا، طبرانی، اور بیہقی نے اس کی روایت کی ہے۔ف۔

میں مترجم کہتا ہوں کہ واقدیؒ نے عکرمہؓ کی شہادت کو واقعہ بعلیک میں بیان کیا ہے لیکن یہ لوگ واقدیؒ سے قوی ہیں، واللہ اعلم۔م۔ خارجہ بن زید نے اپنے والد سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جنگ احد کے روز مجھے سعد بن الربیعؓ کے پاس بھیجا کہ شہداء میں جاکر دیکھو، اگر مل جائیں تو کہنا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں سلام کہا اور حال پوچھا ہے، چنانچہ میں مقتولوں میں ڈھونڈھتا پھرا بالآخر اس حال میں پالیا کہ آخری سانس باقی ہے، اور دیکھا کہ ان کے بدن کے تلوار اور تیر وغیرہ کے ملا کر سب ستر زخم ہیں، اس وقت میں نے کہا کہ اے سعد! آپ کو رسول اللہ ﷺ نے سلام کہا ہے اور حال پوچھا ہے، انہوں نے جواب میں کہا رسول اللہ ﷺ کو بھی اور آپ کو بھی سلام ہو، اور رسول اللہ ﷺ سے کہدو کہ آپ پر فدا ہے، اور مجھے جنت کی خوشبو آرہی ہے، اور کہا کہ میری قوم انصار سے کہدو کہ اگر رسول اللہ ﷺ کو ذرہ برابر بھی صدمہ پہونچ جائے تو تمہارے لئے کوئی عذر نہ ہوگا، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ شرح المصفی لعبد الملک۔ع۔

سب سے بڑی طاقت روحی ہوتی ہے جو حضرت مالک بن انسؓ کے چچا حضرت انس بن النضرؓ سے ہوا کہ جنگ یمامہ کے روز کہا کہ مجھے جنت کی خوشبو آتی ہے اور اپنی تلوار کا میان توڑ دیا اور حملہ آور ہو گئے، بہت روکے گئے مگر نہ مانے بالآخر شہید ہو گئے، اجمعین۔م۔

ولو آواه فسطاط اوخيمة كان مرتثا لما بينا ولو بقي حيا حتى مضى وقت صلوة وهو......الخ

اگر زخمی کو بڑے خیمے یا چھوٹے خیمہ میں جگہ ملی تو اس نے ارتثاث پالیا، دنیاوی نفع حاصل کرلیا) اس وجہ سے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ف۔ زندگی کی راحت حاصل ہو گئی، ولو بقی الخ اور اگر زخمی ہونے کے بعد بے ہوش وحواس کے ساتھ اتنی دیر زندہ رہ گیا کہ نماز کا وقت گذر گیا۔ف۔ یعنی جتنے وقت میں نماز واجب ہے۔ع۔ف۔ اس جگہ لفظ حتی سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اشارہ سے نماز پڑھنے پر قادر ہے، فھو مرتث الخ تو اس نے ارتثاث کیا لان تلك کیونکہ یہ نماز اس کے ذمہ قرضہ ہو گئی اور یہ زندوں کے احکام میں سے ہے۔

وقال و هذا مروى عن ابى يوسفؒ ولو اوصى بشئى من امور الاخرة كان ارتثاثا عند ابى يوسفؒ لانه ارتفاق وعند محمد لايكون لانه من احكام الاموات ومن وجد قتيلا فى المصر غسل لان الواجب فيه القسامة والدية فخفف اثر الظلم الا اذا علم انه قتل بحديدة ظلما لان الواجب فيه القصاص وهو عقوبة والقاتل لايتخلص عنها ظاهراً اما فى الدنيا واما فى العقبى وعندابى يوسفؒ و محمدؒ مالايلبث كالسيف ويعرف فى الجنايات ان شاء الله تعالىٰ.

ترجمہ:- اور مصنفؒ نے کہا ہے کہ یہ قول امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے اور اگر آخرت کے معاملات میں سے کسی سے متعلق کوئی وصیت کی تو بھی امام ابو یوسفؒ کے نزدیک ارتثاث ہو جائے گا کیونکہ یہ بھی نفع حاصل کرنا ہے، لیکن امام محمدؒ کے نزدیک وہ مرتث نہیں ہو گا، کیونکہ یہ بات تو مردوں کے احکام میں سے ہے، اور جو شخص کہ شہر میں قتل کیا ہوا پایا جائے اسے غسل دیا جائے، کیونکہ ایسے شخص کے بارے میں زندوں پر قسامت اور دیت لازم آجاتی ہے، جس سے ایک حد تک ظلم کا اثر کم ہو جاتا ہے مگر جبکہ اس بات کا یقین ہو جائے کہ یہ ظلماً ہی ہتھیار سے قتل کیا گیا ہے، کیونکہ ایسی صورت میں تو قصاص لازم آتا ہے اور یہ سزا ہوتی ہے اور بظاہر ایسی صورت میں قاتل قتل کئے جانے سے نہیں بچتا ہے، خواہ دنیا میں (اگر پکڑا جائے) ورنہ آخرت میں، اور امام ابو یوسفؒ و محمدؒ کے نزدیک ایسی چیز سے مارے جانے سے جس کے لگنے کے بعد مرنے میں عموماً دیر نہیں لگتی اس کا حکم بھی تلوار کی

طرح ہے، اس کی تفصیلی بحث انشاء اللہ آئندہ کتاب الجنایات میں آجائے گی۔

توضیح:۔اگر کچھ وصیت کر کے مرا، شہر میں مقتول ملا

وقال و هذا مروی عن ابی یوسفؒ ولو اوصی بشئی من امور الاخرة کان ارتثاثا......الخ

نماز سے متعلق مذکورہ مسئلہ کے بارے میں مصنفؒ نے کہا ہے کہ یہ حکم امام ابو یوسفؒ سے مروی ہے۔ف۔ اور ہمارے نزدیک صرف ایک نماز نہیں بلکہ ایک رات دن ہے۔المجتبی۔ع۔ اور اگر اسے اس حال میں ہوش و حواس باقی نہ ہو تو وہ مرتث نہیں ہے، اگرچہ ایک دن رات سے زیادہ میں زندہ رہ جائے۔ مختصر الکرخی۔ع۔ اور امام محمدؒ نے کہا ہے کہ ایک رات دن تک رہ جانے میں وہ مرتث شمار ہوگا، اگرچہ اسے شعور نہ ہو، کیونکہ شہدائے احد میں کوئی بھی اتنی دیر تک زندہ نہیں رہا تھا۔فع۔ اور اگر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا یا دوسری جگہ چلا گیا، تو وہ مرتث ہوگا۔الخلاصہ۔

ولو اوصی بشئی من امور الاخرة کان ارتثاثا عند ابی یوسفؒ لانها ارتفاق......الخ

اور اگر آخرت کے معاملات سے متعلق کسی چیز کی وصیت کی تو امام ابو یوسفؒ کے نزدیک یہ بھی ارتثاث ہے **لانه الخ** کیونکہ اس میں ثواب پانے کی راحت ہے **وعند محمد الخ** لیکن امام محمدؒ کے نزدیک یہ ارتثاث نہیں ہے کیونکہ یہ تو زندوں کے نہیں بلکہ مردوں کے احکام میں سے ہے۔ف۔ الصدر الشہیدؒ نے فرمایا ہے کہ امور دنیا سے متعلق وصیت میں بالاتفاق ارتثاث ہے، شرح الطحاویؒ میں کہا ہے کہ ابو یوسفؒ نے امور دنیا کے بارے میں ارتثاث کا حکم دیا ہے، اور امام محمدؒ نے امور آخرت کو ارتثاث نہیں کہا ہے، اس لئے حقیقت میں ان کے نزدیک کوئی اختلاف نہیں۔مع۔ بظاہر ان علماء نے امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی ہے، اور وہی اولیٰ ہے، پھر میں نے در المختار میں دیکھا ہے کہ جوہرہ میں اسی کو اصح کہا ہے۔م۔ نیز یہ سب اسی صورت میں ارتثاث ہوں گے جبکہ لڑائی ختم ہو چکی ہو، کیونکہ اگر ہنوز لڑائی جاری ہو تو ایسی صورت میں بھی ارتثاث نہیں مانا جائے گا۔ التبیین۔ف۔ پھر جس نے ارتثاث کا حکم پالیا وہ غسل کے بارے میں تو شہید نہیں مانا جائے گا لیکن آخرت میں شہید ہوگا، (یعنی وہاں شہادت کا درجہ پائے گا۔

ومن وجد قتيلا فی المصر غسل لان الواجب فيه القسامة والدية فخفف اثر الظلم......الخ

اور جو شخص شہر میں مقتول پایا گیا ہو اسے غسل دیا جائے۔ف۔ اگرچہ وہ ہتھیار سے زخمی ہوا ہو، کیونکہ اس قتل میں قسامت اور دیت لازم آتی ہے۔ف۔ قصاص لازم نہیں آتا ہے، اس بناء پر ظلم کا اثر کم ہو گیا ہے۔ف۔ لہٰذا ایسا شخص شہداء احد کے حکم میں نہیں رہا، اس لئے یہ اگرچہ آخرت کے احکام میں شہید ہوگا لیکن دنیاوی احکام میں شہید نہ ہوگا اور اسے غسل دیا جائے گا۔ **الا اذا الخ** مگر جبکہ یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ دھار دار چیز سے ظلماً مارا گیا ہے۔ف۔ مثلاً ڈاکوؤں نے ڈکیتی کی اور وہی اسے قتل کر کے چلے گئے اس جگہ قاتل ظالم کا ہونا معلوم ہے اگرچہ وہ متعین فی الحال نہ ہو اس لئے یہ شہید ہوگا۔

لان الواجب فيه القصاص وهو عقوبة والقاتل لايتخلص عنها ظاهر......الخ

کیونکہ اس قتل میں بدلہ اور قصاص ہی لازم آتا ہے اور یہ سزا ہے۔ف۔ اگرچہ فی الحال قاتل متعین نہیں ہے، **والقاتل الخ** اور قاتل کا اس سزا سے بچ کر نہ نکلنا یقیناً معلوم ہے کہ، اگر مل گیا اور وہ متعین ہو گیا تو دنیا ہی میں ورنہ آخرت میں پکڑا جائے گا۔ف۔ بہر صورت وہ قصاص کے جرم میں گرفتار ہوگا۔مع۔ اور اولیٰ یہ ہے کہ اس طرح کہا جائے کہ اس جگہ یہ بات یقینی معلوم ہے کہ قتل ظلماً ہوا ہے اور اس کی سزا قصاص ہے لہٰذا یہ مقتول شہید ہوگا، بخلاف اس صورت کے جبکہ ظلم کا سبب معلوم نہ ہو، تو اس میں یہ احتمال پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید اسے کسی نے ظلماً قتل کیا ہو اسی طرح یہ احتمال بھی رہ جاتا ہے کہ یہ کسی کا مال چھین رہا ہوگا کسی اور قسم کی زیادتی کر رہا ہو اس کے نتیجہ میں یہ قتل کیا گیا ہو مگر اس وقت قاتل نے اپنے حق میں گواہ پا کر اپنا تحفظ پایا ہو اور

مقتول ظالم کو اس طرح ڈال دیا ہو فافھم۔ اور اگر اسکا قاتل مسلمان ہو تو امام اعظمؒ کے نزدیک شرط یہ ہو گی کہ اسے کسی دھار دار چیز سے قتل کیا ہو تو شہید ہو گا کیونکہ اگر لاٹھی یا بھاری پتھر سے تو اس کے عوض میں قصاص جاری نہ ہو گا۔

وعند ابی یوسف ومحمد...... الخ

اور امام ابو یوسف اور محمدؒ کے نزدیک ایسی کوئی چیز جس سے مر جانے میں دیر نہ لگتی ہو وہ تلوار کے حکم میں ہے ف یہانتک کہ بھاری پتھر اور لاٹھی کے قتل سے جبکہ ظلماً ہو معلوم ہو جائے قصاص واجب ہو گا اور وہ مقتول شہید ہو گا لہٰذا اسے غسل نہیں دیا جائے اسی بناء پر اگر کسی نے کسی پتلی چھڑی سے کسی کو مارا جس سے عموماً انسان نہیں مرتا ہے اگر اتفاقاً کوئی مر جائے تو وہ بالاتفاق شہید نہیں کہلائیگا ویعرف الخ اس کی پوری بحث انشاء اللہ تعالے کتاب الجنایات میں آجائیگی وہیں تفصیلی مسائل معلوم ہو جا ئینگے۔

ومن قتل فی حدا و قصاص غسل و صلی علیه لانه باذل نفسه لا یفاء حق مستحق علیه و شهداء احد بذلوا انفسهم لابتغاء مرضات الله تعالیٰ فلا یلحق بهم ومن قتل من البغاة او قطاع الطریق لم یصل علیه لان علیاً لم یصل علی البغاة.

ترجمہ:- اور جو شخص کسی قصاص میں قتل کیا گیا ہو اسے غسل دیا جائے اور اس کی نماز پڑھی جائے کیونکہ ایسا شخص اپنی جان لگا دینے والا ہے اس حق کو پورا کردینے میں جو اس پر واجب ہوتا تھا اور شہدائے احد کے ساتھ نہیں ملایا جائیگا اور باغیوں اور ڈاکوؤں میں سے جو کوئی قتل کیا گیا ہو اس کی نماز نہیں پڑھی جائیگی کیونکہ حضرت علیؓ نے اپنے باغیوں کی نماز نہیں پڑھی تھی۔

توضیح کوئی شخص حد شرعی میں مارا گیا، امام وقت کی بغاوت میں مارا گیا، ڈکیتی کرتے ہوئے مارا گیا، خودکشی کرلی، گلا گھونٹ کر، دھتورہ کھلا کر، یا پھانسی کے پھندے سے مارا گیا، دریا میں ڈوب کر مر گیا، دیوار کے نیچے دب کر مر گیا، درندہ نے مار ڈالا، رات کے وقت شہر میں قتال کفار یا قصد جہاد میں دست کی بیماری میں، ہیضہ میں، پسلی کی بیماری میں، سل دق میں، طاعون و پلیگ میں، ڈوب کر، جل کر، گر کر، کچل کر، غلطی سے قتل ہو گیا، حلال کمائی کے کسی صدمہ سے

ومن قتل فی حد او قصاص غسل و صلی علیه لانه باذل نفسه لایفاء حق مستحق علیه......الخ

جو شخص کسی حد میں قتل کیا گیا۔ ف۔ مثلاً زنا کے جرم میں سنگسار کر کے مار ڈالا گیا، یا قصاص میں۔ مثلاً کسی کو ناحق قتل کر دیا تھا اس کے بدلے میں قصاصاً قتل کیا گیا، **غسل الخ** تو اسے غسل دیا جائے اور اس پر نماز پڑھی جائے۔ ف۔ جیسا کہ بخاری میں کہ حضرت ماعز بن مالکؓ کے لئے نماز کی روایت ہے **لانه باذل** کیونکہ اس نے اپنی جان اس حق کی ادائیگی میں دیدی جو اس پر واجب ہوا تھا۔ ف۔ چنانچہ وہ اس بناء پر قابل تعریف ہے، لیکن شہداء احد کے طور پر جان دیتا تب شہید کے درجہ پر ہوتا۔

و شهداء احد بذلوا انفسهم لابتغاء مرضات الله تعالیٰ فلا یلحق بهم......الخ

جبکہ شہدائے احد نے تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنے کے لئے اپنی جانیں قربان کی تھیں۔ ف۔ پس اس شخص میں اور ان شہداء کے درمیان بہت بڑا فرق ہے **فلا یلحق الخ** تو یہ مقتول ان شہداء کے ساتھ نہیں ملایا جائے گا۔

ومن قتل من البغاة او قطاع الطریق لم یصل علیه لان علیاً لم یصل علی البغاة......الخ

اور امام وقت کے باغیوں میں سے حالت جنگ میں جو قتل کیا گیا، یا کوئی ڈاکو قتل کیا گیا تو اس کی نماز نہیں پڑھی جائے گی، **لان علیا الخ** کیونکہ حضرت علیؓ نے باغیوں کی نماز نہیں پڑھی۔ ف۔ اس روایت کا ثبوت نہیں ملا ہے، اور ابن سعد وغیرہ نے روایت

کی ہے کہ جب معاویہؓ کے ساتھ صلح کا معاہدہ ہوا، اور حضرت علیؓ کوفہ میں واپس آئے تو آپ کے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے آپ کی مخالفت کی، اور حرد راء میں جمع ہو گئے، تو آپ نے عبد اللہ بن عباسؓ کو ان کے پاس بھیجا، ابن عباسؓ نے ان کے پاس جاکر ان کے شبہات دور کر دئے، اور آیات واحادیث سے ان کو مطمئن کر دیا، جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے توبہ کی، اور بہت سے اسی خیال پر اڑے رہے، اور حروراء سے نہروان جاکر حضرت خباب بن الارت کو شہید کر ڈالا، یہ سن کر حضرت علیؓ ان کے مقابلہ کو تشریف لے گئے، اور لڑائی ہوئی بالآخر خوارج کا سردار مارا گیا، یہ واقعہ سنہ ۳۸ھ کا ہے، وہاں سے پھر کوفہ واپس آئے۔

سروجی نے کہا ہے کہ آپ نے مقتول خوارج کو نہ غسل دیا اور نہ ان کی نماز پڑھی، تو آپ کے سامنے یہ سوال کیا گیا کہ کیا یہ لوگ کافر ہو گئے ہیں، فرمایا کہ نہیں البتہ وہ باغی ہو گئے، اور ہمارا یہ سلوک ان کے ساتھ زجر اور سزا کے طور پر ہے۔ مع۔ اور جس نے خود کو قتل کیا اس کی نماز رسول اللہ ﷺ نے نہیں پڑھی، جیسا کہ حضرت جابر بن سمیرؓ سے صحیح مسلم میں مروی ہے، اور یہی روایت ابو یوسفؒ نے امام ابو حنیفہؒ سے روایت کی ہے، ائمہ ثلاثہ کا یہی قول ہے، لیکن حلوائیؒ نے کہا ہے کہ قول اصح کے مطابق اس کی نماز پڑھی جائے گی، میں مترجم کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کے نماز نہ پڑھنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی نے بھی اس کی نماز نہیں پڑھی، جیسا کہ ایک مقروض کی نماز خود نہیں پڑھی مگر دوسروں کو پڑھنے کی اجازت دی تھی، اسی طرح جنہیں سنگسار کیا گیا یا دھتورہ یا پھانسی سے مار ڈالنا بار بار ثابت ہوا ہو وہ باغیوں اور ڈاکوؤں کے حکم میں ہے۔ الخلاصہ۔

جو شخص ڈوب کر یا دیوار وغیرہ سے دب کر یا گر کر یا درندہ کے پھاڑنے سے مرا ہو اسے غسل دیا جائے اور اس کی نماز پڑھی جائے، اور جو شخص شہر میں رات کے وقت ہتھیار سے یا شہر کے باہر ہتھیار یا بغیر ہتھیار کے مارا گیا ہو اور اس سلسلہ میں کسی پر دیت واجب نہ ہوئی ہو، ہمارے نزدیک شہید ہے۔ مع۔ کفار کے ساتھ قتل کرنے میں یا جہاد کے ارادہ کے بعد کسی طرح مارا گیا وہ آخرت میں شہید ہے، اگرچہ اس نے دنیاوی نفع، ارتثاث پالیا ہو، اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے، اسی واسطے مصنفؒ نے یہ نہیں کہا ہے کہ مرتث شہید نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہا کہ اسے غسل دیا جائے، یعنی فقہی احکام کے اعتبار سے وہ شہید نہیں ہے، فتح القدیر میں اس کی تصریح کی ہے۔

آخرت کے شہیدوں میں سے (۱) ایک مبطون بھی ہے یعنی جسے دست اور پیٹ کے خرابی کی بیماری ہو اور بغیر کسی گناہ کئے وہ مر گیا ہو، اس میں ہیضہ والا بھی داخل ہے۔

(۲) سلول یعنی وہ جو سل اور دق کے مرض میں مرا ہو۔

(۳) ذات الجنب پسلی کی بیماری میں مرا ہو۔

(۴) طاعون کے مرض میں مرا ہو، اس حکم میں ہر قسم کی وباء داخل ہے، جب کہ تقدیر سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی ہو۔

(۵) پانی میں ڈوب کر مرا ہوا۔

(۶) جل کر مرا ہوا۔

(۷) اوپر سے گر کر مرا ہو۔

(۸) کچل کر مر گیا ہو۔

(۹) غلطی سے قتل ہو گیا ہو۔

(۱۰) حلال کمائی کے حاصل کرتے ہوئے کسی بات سے مر گیا ہو۔

(۱۱) اس طرح علم دین حاصل کرتے ہوئے مرا ہو، علامہ سیوطیؒ نے اسی طرح تقریباً تیس شمار کئے ہیں۔

تنبیہ: ڈوب کر یا جل کر مثلاً مرنا قصداً نہ ہو، اور کسی گناہ کے کام کے طلب میں مشغول نہ ہو، یہانتک کہ جو لوگ یوں ہی دریاؤں میں مرنے اور سیر و تماشا میں مبتلا ہوتے ہیں وہ اس لائق ہوتے ہیں کہ انہیں گنہگار اور عاصی کہا جائے، یہی تفصیل اور

دوسرے احکام میں بھی ہے، ساتھ ہی نیک نیتی بھی ہو کیا یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جو لوگ جہاد میں محض نام و نمود اور غنیمت کی لالچ میں جاتے ہیں ان کو حدیث میں صراحت کے ساتھ شہیدوں میں سے خارج کر دیا گیا ہے، فافہم، واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

باب الصلوة فی الکعبة

الصلوة فی الکعبة جائزة فرضها و نفلها خلافا للشافعی فیهما و لمالك فی الفرض لانه علیہ السلام صلی فی جوف الکعبة یوم الفتح ولانها صلوة استجمعت شرائطها لوجود استقبال القبلة لان استیعابها لیس بشرط.

ترجمہ:- باب، کعبہ کے اندر نماز، کعبہ کے اندر فرض ہو یا نفل ہر قسم کی نماز جائز ہے، ان دونوں نمازوں میں امام شافعیؒ کا اختلاف ہے، اور امام مالکؒ نے صرف فرض نماز میں اختلاف کیا ہے، کیونکہ رسول اللہ علیہ السلام نے فتح مکہ کے اندر نماز پڑھی ہے، اور اس وجہ سے بھی کہ وہاں نماز پڑھنے میں نماز کی ساری شرطیں پائی جاتی ہیں کیونکہ استقبال قبلہ بھی پایا جاتا ہے، اور پورے قبلہ کا استقبال شرط نہیں ہے۔

توضیح:- باب، کعبہ میں نماز پڑھنے کا بیان، حدیث سے دلیل، دلیل صحت

باب الصلوة فی الکعبة. الصلوة فی الکعبة جائزة فرضها و نفلها خلافا للشافعی فیها......الخ

کعبہ کے اندر نماز جائز ہے۔ف۔ یعنی منع نہیں ہے فرضها الخ، خواہ نماز فرض ہو یا نفل ہو۔ف۔ اس مسئلہ میں امام شافعیؒ بھی متفق ہیں، البتہ اس صورت میں جبکہ اس کا دروازہ کھلا ہوا ہو اور آگے کوئی سترہ نہ بنایا گیا ہو یا چھت پر موجود ہو تو بھی ہمارے نزدیک نماز جائز ہو گی خلافا الخ لیکن امام شافعیؒ کا اختلاف ہے نماز فرض ہو یا نفل ہو دونوں صورتوں میں۔ف۔ یعنی جب دروازہ کھلا ہوا ہو اور آگے سترہ نہ ہو تو امام شافعیؒ کے نزدیک فرض و نفل کی کوئی بھی نماز جائز نہیں ہو گی، اور اگر دروازہ ہو یا آگے سترہ ہو تو جائز ہو گی، امام نوویؒ نے فرمایا ہے کہ یہی قول صحیح ہے، السروجی۔ مع۔ و لمالك الخ اور امام مالکؒ نے صرف فرض نماز میں اختلاف کیا ہے۔ف۔ یعنی واجبات میں یہانتک کہ طواف کی دو رکعتیں اور سنت فجر اور وتر بھی جو کہ واجب کے برابر ہیں امام مالکؒ کے نزدیک جائز نہیں ہیں البتہ نوافل جائز ہیں، جیسا کہ ذخیرہ مالکیہ میں ہے، اور یہی قول امام احمدؒ کا بھی۔ مع۔

اور ہم احناف کے نزدیک ہر طرح اور ہر قسم کی نماز جائز ہے لانه صلی الخ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن کعبہ کے اندر نماز ——— پڑھی ہے۔ف۔ دو رکعتیں۔ جیسا کہ صحیحین کی حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں صراحت کے ساتھ ذکر ہے، اور واضح ہو کہ جب آپ علیہ السلام حجۃ الوداع میں تشریف لے گئے تو یوم النحر میں کعبہ کے اندر داخل ہوئے مگر نماز نہیں پڑھی صرف دعا کی، پھر دوسرے دن داخل ہوئے تو اندر کے حصہ میں دو رکعتیں پڑھیں، پھر نکل کر باب اور حجر اسود کے درمیان دو رکعتیں پڑھ کر فرمایا کہ یہی قبلہ ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ سے دار قطنیؒ نے اسناد حسن کے ساتھ روایت کی ہے، پس صحیحین میں ابن عباسؓ سے جو روایت ہے کہ صرف دعاء کی وہ حجۃ الوداع میں ایک روز کے داخل ہونے پر محمول ہے، اور یہ خود دار قطنی اور طبرانیؒ نے ابن عباسؓ سے صراحت کے ساتھ روایت کی ہے، اور اسامہ بن زیدؓ سے بھی امام احمد و ابن حبانؒ نے دونوں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کی روایت کی ہے۔

اور حضرت عبد اللہ بن السائبؓ کی روایت میں ہے کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ علیہ السلام نے اپنے دونوں مبارک جوتے اتار کر بائیں طرف رکھے اور نماز میں سورہ المومنون شروع کی، جیسا کہ ابن حبان نے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ معف۔ اور امام مالکؒ کے قول کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ خانہ کعبہ کے اندر نماز پڑھنے سے قبلہ کا کچھ حصہ پیٹھ کے پیچھے ہو جاتا ہے، مگر یہ وجہ کوئی معقول نہیں ہے کیونکہ نص صریح میں اس کا جواز موجود ہے۔

ولانها صلوة استجمعت شرائطها لوجود استقبال القبلة لان استیعابها لیس بشرط......الخ

اور اس کے اندر نماز صحیح ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں پڑھی ہوئی نماز میں وہ تمام شرطیں پائی جاتی ہیں جو نماز کے ہونے

کے لئے ہوا کرتی ہیں۔ف۔ یعنی طہارت، ستر، استقبال قبلہ وغیرہ، اور اب استقبال قبلہ میں تردد صحیح نہیں ہے، لوجود الخ کیونکہ بلاشبہ استقبال قبلہ پایا جاتا ہے، لان استیعابها الخ کیونکہ پورے قبلہ کا استقبال تو شرط نہیں ہے۔ف۔اس لئے کہ ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے، کیونکہ قبلہ تو حقیقت میں وہ فضاء ہے چھت اور اس کی دیواریں قبلہ نہیں ہوتی ہیں، اور ان دلائل کے علاوہ قرآن پاک میں صراحۃً موجود ہے کہ ﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِيْنَ وَالْعَاكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ کہ اے ابراہیم واسمٰعیل دونوں مل کر ہمارے گھر آنے جانے والوں، اور اس میں ٹھہرنے والوں اور رکوع سجدہ کرنے والوں یعنی نماز پڑھنے والوں کے لئے پاک کردو، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس میں نماز پڑھنی صحیح اور جائز ہے، اس لئے اسے پاک رکھو۔م۔ ہمارے نزدیک اس میں نماز باجماعت بھی جائز ہے۔

فان صلى الامام بجماعة فيها فجعل بعضهم ظهره الى ظهر الامام جاز لانه متوجه الى القبلة ولايعتقد امامه على الخطاء بخلاف مسألة التحرى ومن جعل منهم ظهره الى وجه الامام لم تجز صلاته لتقدمه على امامه واذا صلى الامام فى المسجد الحرام فتحلق الناس حول الكعبة وصلوا بصلوة الامام فمن كان منهم اقرب الى الكعبة من الامام جازت صلاته اذا لم يكن فى جانب الامام لان التقدم والتاخر انما يظهر عند اتحاد الجانب.

ترجمہ:۔اگر امام نے خانہ کعبہ کے اندر پہنچ کر جماعت سے نماز پڑھائی اور ان میں سے کسی نے اپنی پیٹھ اپنے امام کی پیٹھ کی طرف کی تو اس کی بھی نماز صحیح ہوگی، کیونکہ وہ قبلہ کی طرف اپنا رخ کرنے والا ہے، اور جو اپنے امام کو بھی خطاء پر نہیں جانتا ہے، برخلاف تحری کے مسئلہ کے اور ان میں سے جس کسی نے اپنی پیٹھ امام کے چہرہ کی طرف کی تو اس کی نماز صحیح نہ ہوگی کیونکہ وہ اپنے امام سے آگے ہے، اور اگر امام نے مسجد حرام میں نماز پڑھی اور تمام نمازی خانہ کعبہ کے چاروں طرف حلقہ بنا کر کھڑے ہوگئے اور سبھوں نے امام کی نماز کی اقتداء میں نماز پڑھی، تو ان میں سے جو شخص امام کے مقابلہ میں کعبہ سے زیادہ قریب ہوگا اس کی نماز بھی صحیح ہوگی بشرطیکہ وہ امام کی جانب میں نہ ہو، کیونکہ آگے ہونا اور پیچھے ہونا اسی صورت میں ظاہر ہوگا جبکہ ایک ہی طرف ہو۔

توضیح:۔کعبہ کے اندر نماز باجماعت

فان صلى الامام بجماعة فيها فجعل بعضهم ظهره الى ظهر الامام جاز......الخ

امام نے مسجد حرام میں نماز پڑھی اور مقتدیوں نے اس کے چاروں طرف حلقہ بنالیا فان صل الخ اور اگر امام نے کعبہ کے اندر جماعت سے نماز پڑھی، اس صورت سے کہ کچھ مقتدیوں نے اپنی پیٹھ امام کی پیٹھ کی طرف کی تو جائز ہے۔ف۔ کیونکہ اقتداء کرنے کے لئے یہ بات شرط ہوتی ہے کہ قبلہ کا استقبال ہو، اور اپنے امام کو غلطی پر نہ سمجھے اور یہ دونوں باتیں یہاں پائی جارہی ہیں لانه متوجه الخ کیونکہ بلاشبہ یہ مقتدی قبلہ کی طرف متوجہ ہے۔ف۔ کیونکہ وہاں جدھر بھی منہ کرے گا عین قبلہ کی طرف منہ ہوگا۔

ولايعتقد امامه على الخطأ بخلاف مسألة التحرى......الخ

اور وہ اپنے امام کو خطاء پر بھی نہیں جانتا ہے۔ف۔ اگر اس وقت یہ اعتراض کیا جائے کہ اس صورت میں جبکہ اندھیری رات میں جہاں سمت قبلہ کا پتہ نہ چلتا ہو، مسافروں نے تحری کر کے جماعت سے نماز پڑھی اور مقتدی کی پیٹھ امام کی پیٹھ کی طرف ہوئی اور مقتدی بھی یہ جانتا ہو، تو ایسی صورت میں مسئلہ یہ ہے کہ مقتدی کی نماز جائز نہیں ہوتی ہے، اب جبکہ یہاں بھی یہی صورت ہورہی ہے تو یہاں بھی نماز جائز نہ ہونا چاہئے، جواب یہ ہے کہ یہاں یقینی طور پر قبلہ کا سمت معلوم ہے، اور امام کے متعلق بھی مقتدی کو قبلہ رخ ہونا یقینی طور سے معلوم ہے۔

بخلاف مسئلة التحرى ......الخ

برخلاف تحری کے مسئلہ کے۔ف۔ کہ وہاں مقتدی کی تحری میں قبلہ ایک رخ پر اور امام کی تحری میں اس کے مخالف رخ پر ہو جاتا ہے یہانتک کہ ایک کی پیٹھ دوسرے کی طرف ہو گئی، پھر ان میں سے ہر ایک دوسرے کی جہت کو غلط جانتا بھی ہے، پس اس صورت میں جبکہ مقتدی اپنی سمجھ کے مطابق امام کو قبلہ کے خلاف سمت پر سمجھ رہا ہو، اور تحری میں ہر ایک کا حقیقی قبلہ وہی ہوتا ہے جس طرف اس کی تحری واقع ہوئی ہو۔

ومن جعل منهم ظهره الى وجه الامام لم تجز صلاته لتقدمه على امامه.....الخ

اور مقتدیوں میں سے جس نے اپنی پیٹھ کو امام کے منہ کی طرف کر دیا تو اس کی نماز جائز نہیں ہے۔ف۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ قبلہ رخ نہیں ہے بلکہ لتقدمه الخ اس وجہ سے کہ وہ امام سے مقدم ہے۔ف۔ کیونکہ یہ صورت اسی وقت ممکن ہو گی جبکہ مقتدی امام سے آگے ہو، اور اگر مقتدی نے اپنا منہ امام کے منہ کی طرف کیا تو نماز جائز ہو گی مگر یہ صورت مکروہ ہو گی، اس لئے اپنے اور امام کے درمیان کچھ پردہ ڈال لے تو کراہت ختم ہو جائے گی۔ الایضاح۔ اور اگر مقتدی کا منہ امام کے بازو اور پہلو کی طرف ہو تو جائز ہے، اور اس کے برعکس ہونے میں بھی۔ العتابی۔ اور اگر خانہ کعبہ کے باہر مسجد الحرام میں امام نے جماعت کی تو بھی جائز ہو گی۔

واذا صلى الامام في المسجد الحرام فتحلق الناس حول الكعبة.....الخ

اور جب امام نے کعبہ کی طرف متوجہ ہو کر مسجد الحرام میں نماز پڑھی اس طرح پر کہ مقتدیوں کی زیادتی کی وجہ سے لوگوں نے خانہ کعبہ کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر کھڑے ہوئے اور سبھوں نے ایک ہی امام کی اقتداء کی۔ف۔ تو ظاہری صورت یہ ہو گی کہ ایک دیوار کی طرف امام کا منہ اور اس کے پیچھے مقتدیوں کی صف ہے، اور دوسری و تیسری اور چوتھی دیواروں کی طرف مقتدیوں کی صفوں کا رخ ہو گا اور سب امام کی اقتداء کئے ہوئے ہوں گے۔

فمن كان منهم اقرب الى الكعبة من الامام جازت صلاته اذا لم يكن في جانب.....الخ

تو جو کوئی امام کی نسبت سے کعبہ کی دیوار سے جو زیادہ قریب ہو گا اس کی بھی نماز درست ہو جائے گی، صرف ایک شرط یہ ہے کہ جس جانب امام ہو وہ اس جانب نہ ہو۔ف۔ کیونکہ ایسا شخص امام سے آگے بڑھا ہوا نہیں کہلائے گا۔ لان التقدم الخ کیونکہ آگے اور پیچھے ہونا تو اسی وقت ظاہر ہو گا جبکہ سب ایک ہی طرف ہوں گے۔ف۔ اور امام کی طرف میں جو امام سے آگے بڑھ کر خانہ کعبہ سے زیادہ قریب ہو گا وہ امام سے آگے بڑھا ہوا ہو گا۔ لہٰذا اس کی نماز فاسد ہو گی، بخلاف ان مقتدیوں کے جو دوسری جانب ہوں۔م۔ اگر امام خانہ کعبہ کے اندر ہو اور دروازہ کھلا ہوا ہو، اور مقتدیوں نے باہر سے اس کی اقتداء کی تو نماز صحیح ہو گی۔ھ۔ت۔

ومن صلى على ظهر الكعبة جازت صلوته خلافا للشافعيؒ لان الكعبة هي العرصة والهواء الى عنان السماء عندنا دون البناء لانه ينقل الا ترى انه لو صلى على جبل ابي قبيس جاز ولا بناء بين يديه الا انه يكره لما فيه من ترك التعظيم وقد ورد النهي عنه عن النبي ﷺ

ترجمہ:- اور جس نے خانہ کعبہ کی چھت پر نماز پڑھی اس کی نماز جائز ہو گئی، امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے، کیونکہ ہمارے نزدیک کعبہ نام ہے اس میدان اور فضاء کا خالی آسمان تک اور اس کی عمارت کا نام نہیں ہے، کیونکہ بدلتا رہتا ہے، اسی لئے تم کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اگر کسی نے ابو قبیس نامی پہاڑ پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی تو بھی درست ہو جائے گی، حالانکہ اس کے سامنے کوئی عمارت نہیں رہتی ہے، البتہ ترک تعظیم کے خیال سے چھت پر پڑھی ہوئی نماز مکروہ ہو گی، اور رسول اللہ ﷺ سے اس کی ممانعت ثابت بھی ہے۔

توضیح:- کعبہ کی چھت پر نماز، دلیل، دیوار کعبہ پر کھڑے ہو کر نماز، امام نے عورتوں کی نیت کی، اور

ایک عورت امام کی محاذی ہو گئی، سجدہ کا محل اور غیر محل میں ہونا، رکعت و سجدہ کے چھوٹنے میں شک، دلیل واجب و بدعت یا سنت و بدعت ہونے میں شک

ومن صلی علی ظهر الكعبة جازت صلوته خلافا للشافعیؒ لان الكعبة هی العرصة......الخ

جس کسی نے عمارت کعبہ پر نماز پڑھی اس کی نماز جائز ہے۔ف۔ یعنی یہ نماز ہو گئی اگرچہ مکروہ ہوئی، امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے۔ف۔ بلکہ امام مالکؒ کا بھی اس میں اختلاف ہونا چاہئے، کیونکہ ذخیرہ المالکیہ میں ہے کہ امام شافعیؒ کے نزدیک عمارت کعبہ کے کچھ حصہ کا استقبال کرنا اور امام مالکؒ کے نزدیک پوری عمارت کا ارادہ کرنا شرط ہے، پس اس بناء پر دونوں حضرات کے نزدیک چھت پر نماز جائز نہ ہو گی، لیکن ہمارے نزدیک جائز ہو گی۔

لان الكعبة هی العرصة والهواء الی عنان السماء عندنا دون البناء لانه ينقل......الخ

کیونکہ ہمارے نزدیک اس کا میدان اور خالی آسمان تک کی فضاء کعبہ ہے، خود اس کی تعمیر شدہ مکان کعبہ نہیں ہے۔ف۔ یعنی اس کی دیوار اور چھت نہیں ہے **لانه ينقل الخ** کیونکہ یہ عمارت اور اس کے پتھر وغیرہ تو اس جگہ سے دوسری جگہ منتقل کئے جاسکتے ہیں مگر دوسری جگہ منتقل کئے جانے کے بعد اسے کعبہ نہیں کہا جاسکتا ہے، **الا ترى الخ** کیا یہ نہیں دیکھتے کہ اگر کسی نے ابو قبیس کی چوٹی پر جو عمارت کعبہ سے بہت اونچی ہے چڑھ کر نماز پڑھی تو جائز ہو جائیگی حالانکہ اس وقت اس کے سامنے عمارت کعبہ نہیں آتی ہے۔ف۔ یہاںتک کہ اگر اس کے سامنے سیدھی لکیر کھینچی جائے تو وہ اس عمارت سے بہت اونچائی پر جائے گی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ فضاء آسمان تک کعبہ ہے، اسی لئے اس کی چھت پر بھی استقبال موجود ہے، اس لئے نماز جائز ہو گی۔

الا انه يكره لما فيه من ترك التعظيم وقد ورد النهی عنه عن النبی ﷺ......الخ

البتہ اتنی بات ہے کہ چھت پر چڑھ کر پڑھنا مکروہ ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے تعظیم کعبہ کو ترک کرنا لازم آتا ہے وقد ورد الخ ور رسول اللہ ﷺ کے کلام سے اس بات کی ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ف۔ جیسا کہ حضرت ابن عمرؓ سے مرفوعا روایت ہے کہ ان سات جگہوں میں نماز جائز نہیں ہے (۱) خانہ کعبہ کی چھت پر اور (۲) قبرستان میں (۳) گھورے میں (جہاں گھر اور محلّہ کے کچرے پھینکے جاتے ہیں) (۴) اور جہاں اونٹ وغیرہ ذبح کئے جاتے ہیں (۵) اور حمام میں (۶) اور جہاں رات کو اونٹ بندھتے ہیں (۷) اور بیچ راستہ میں، ابن ماجہ اور ترمذی نے اس کی روایت کی ہے، اور تنقیح التحقیق میں کہا ہے کہ ابو صالح راوی کی ایک جماعت نے تائید اور توثیق کی ہے، لیکن دوسرے لوگوں نے انہیں ضعیف کہا ہے۔مف۔ خلاصہ یہ ہوا کہ چھت کے اوپر نماز پڑھنی تمام شرطوں کے پائے جانے کی وجہ سے فی نفسہا جائز ہے البتہ بے ادبی ہونے کی بنا پر پڑھنا صحیح نہیں ہے۔م۔

چند ضروری مسائل

اور دیوار کعبہ پر کھڑے ہو کر اس طرح نماز پڑھی کہ منہ اس کی چھت کی طرف ہو تو نماز صحیح ہو گی، لیکن اگر اس طرف پیٹھ ہو جائے تو باطل ہو گی۔مع۔ امام نے عورتوں کی امامت کی بھی نیت کرلی، اور ایک عورت نے امام کے محاذی ہو کر اسی کی جہت میں استقبال قبلہ کیا تو سبھوں کی نماز فاسد ہو جائے گی۔

پہلا فائدہ:- جو سجدہ اپنے وقت اور محل پر ادا ہو اس کی ادائیگی کے لئے نیت کی ضرورت نہیں ہے، اور جب اپنے وقت سے بے وقت ادا کیا جائے تو اس وقت نیت ضروری ہے، موقع سے چھوٹ جانے کا اعتبار اس صورت میں ہو گا جبکہ اس درمیان پوری ایک رکعت ہو جائے۔

دوسرا فائدہ:- جب شک ہو جائے کہ رکعت چھوٹی یا سجدہ چھوٹا تو دونوں کو ادا کرلے، لیکن پہلے سجدہ ادا کرلے، اور اگر رکعت پہلے ادا کرلی تو نماز فاسد ہو گئی۔

تیسرا فائدہ:۔جس چیز میں دلیل سے اختلاف ہو جائے کہ یہ واجب ہے یا بدعت تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اس پر عمل کر لیا جائے، اور جس چیز کے بارے میں سنت یا بدعت ہونے میں شک ہو جائے، تو اسے چھوڑ دیا جائے۔الظہیر یہ۔ محیط السرخسی۔ھ۔

انتهى كتاب الصلاة بحمد الله وبتوفيقه، ويليه كتاب الزكاة.

☆☆☆